I\MONO.
not found.

مقالات حبیب

(حصہ اوّل)

باب (۱) ہندوستان میں احیاء علم وفکر
باب (۲) صحابۂ کرام کی منفردانہ عظمت شان
باب (۳) فرق باطلہ کا تعاقب

تالیف

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی
استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند، سہارنپور، یوپی

ناشر
شیخ الہند اکیڈمی، دارالعلوم دیوبند

جملہ حقوق بحق شیخ الہند اکیڈمی دارالعلوم دیوبند محفوظ ہیں

زیر سرپرستی

حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب دامت برکاتہم
مہتمم دارالعلوم دیوبند

زیر نگرانی

حضرت مولانا بدرالدین اجمل علی القاسمی صاحب
رکن مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند

سلسلہ اشاعت ع۴۱

نام کتاب : مقالات حبیب (حصہ اوّل)
مولف : حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی
استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند
سن اشاعت : ۱۴۳۰ھ — ۲۰۰۹ء
تعداد صفحات : ۳۶۹
ناشر : شیخ الہند اکیڈمی دارالعلوم دیوبند

فہرست ابواب وموضوعات (اجمالی)

- تقریظ حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری ۱۳
- تقریظ حضرت مولانا نور عالم خلیل امینی صاحب ۱۶

(حصہ اوّل) **باب** (۱) ہندوستان میں احیاء علم وفکر

- ہندوستان میں علم اور علماء ۲۱
- ہندوستان میں دو علمی تحریکیں اوران کے اثرات ۴۰
- دار العلوم دیوبند ایک مکتبۂ فکر ایک تحریک ۴۵
- فرزندان دار العلوم دیوبند کی فقہی تصنیفی خدمات ۸۱
- علماء دیوبند- اور جماعت اہل حدیث کی معاندانہ روش ۱۰۵
- آئینہ ان کو دکھایا تو برا مان گئے ۱۲۵
- دار العلوم دیوبند کے خلاف ’’ترجمان دہلی‘‘ کی الزام تراشیوں پر ایک نظر ۱۴۶

(حصہ اوّل) **باب** (۲) صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم کی منفردانہ عظمت شان

- صحابۂ کرام قرآن وسنت کی نظر میں ۲۰۳
- تقدس صحابہ ۲۱۸
- معیار افضلیت ۲۴۵

(حصہ اوّل) **باب** (۳) فرق باطلہ کا تعاقب

- نبیٔ افرنگ کی داستان حیات ۲۷۳
- مرزا قادیانی اپنے عقاید اور دعووں کی روشنی میں ۲۸۸
- مرزا قادیانی کی قرآن حکیم میں تحریف معنوی کی چند مثالیں ۳۰۱
- انقلاب ایران کی حقیقت- قائد انقلاب کے عقاید ونظریات کے آئینہ میں ۳۰۶
- عقاید اہل سنت والجماعت- اور عقائد شیعہ، ایک تقابلی مطالعہ ۳۴۳
- شیعیت کا یہود نواز کردار ۳۵۳
- کیا اثنا عشری مسلمان ہیں؟ ۳۵۷

(حصہ دوم) **باب** (۴) مسائل و دلائل

- عظمت ماہ شعبان ۱۳
- اسلام میں روزہ کی افادیت ۱۹
- تفسیر آیات صیام........................ ۲۶
- عشرۂ ذی الحجہ کے اعمال وفضائل ۳۴
- اسلام کا تصور جہاد ۴۲
- اسلام میں شہید کی حقیقت اور مقام ومرتبہ ۴۷
- جمعیۃ اہل حدیث کان پور کی ایک تحریر پر بحث ونظر........................ ۶۴
- کیا خواتین کا مساجد میں آکر باجماعت نماز پڑھنا درست ہے؟ ۱۳۹
- نکاح وطلاق کا اسلامی ضابطہ ۱۵۳
- نکاح کے شرعی قوانین........................ ۱۶۴
- ایک مجلس کی تین طلاقیں ۱۹۰
- ایک مجلس کی تین طلاقیں تین ہی واقع ہوں گی ۲۴۶
- ایک مجلس کی تین طلاقیں اور روشن خیال دانشوروں کا رویہ ۲۵۵
- طلاق سکران صحابۂ کرام وتابعین عظام کے آثار واقوال کی روشنی میں ۲۶۹
- حرمت مصاہرت ۲۹۱
- حقیقت رجم بحث وتحقیق کے آئینہ میں ۳۴۴

(حصہ سوم) **باب** (۵) گوشۂ سیرت وتاریخ

- سیرت نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام پر ایک نظر........................ ۱۷
- ہادیٔ عالم کی ازدواجی سیرت کا ایک پہلو ۲۰
- ہماری تاریخ کا ایک باب یہ بھی ہے........................ ۳۴
- تاریخ اسپین کا عبرت خیز ورق........................ ۴۰
- اجودھیا کی تاریخی حیثیت........................ ۵۰
- بابری مسجد- حقائق اور افسانے ۶۶
- بابری مسجد تاریخ کے مختلف مراحل میں ۸۹
- نظام امارت فی الہند کی مختصر تاریخ........................ ۱۰۴

(حصہ سوم) باب (٦) تذکرہ ارباب فضل وکمال

- امام ابوحنیفہ اور علم حدیث ۱۱۷
- امام ابوداؤد سجستانی ۱۴۱
- اجودھیا کے مشاہیر علماء ومشائخ ۱۸۹
- شیخ محمد بن عیسیٰ تاج جون پوری ۲۳۰
- قاضی خان ظفر آبادی ۲۴۳
- سید محمد جون پوری اور تحریک مہدویت ۲۵۸
- استاذ الملک ملا محمد افضل جونپوری ۲۷۱
- شاہ طیب بنارسی اور ان کے اسلاف وخلفا ۲۸۴

۱- شیخ الاسلام شیخ فرید بنارسی ۲۸۵

۲- شیخ داؤد بنارسی ۳۰۳

- قطب الاقطاب دیوان محمد رشید جون پوری ۳۴۳
- مولانا سخاوت علی جون پوری ۳۶۹
- شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے سفر حرمین شریفین کی تفصیلی روداد ۳۸۴
- قافلۂ فضل وکمال یعنی مولانا محمد یعقوب نانوتوی صدر مدرس اوّل دار العلوم دیوبند کے مشاہیر تلامذہ.. ۳۹۸
- حضرت شیخ الاسلام کے تین امتیازات ۴۱۹

☆ ☆ ☆

فہرست ابواب وموضوعات

(حصہ اوّل)

- تقریظ حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری ۱۳
- تقریظ حضرت مولانا نور عالم خلیل امینی صاحب ۱۶

باب (۱) ہندوستان میں احیاء علم وفکر

- ہندوستان میں علم اور علماء ۲۱

عرب وہند کے روابط ۲۱

عہد اموی کے چند ہندی علماء ۲۲

عہد غزنویہ کے علماء ۲۴

عہد بلبن میں علوم اسلامی ۲۸

عہد علائی میں علمی ترقی ۲۸

عہد تغلق کے علماء ومدارس ۲۹

جون پور میں علمی نشاط ۳۰

عہد مغلیہ میں علمی سرگرمیاں ۳۲

مرتبین فتاویٰ عالمگیری ۳۵

شاہ ولی اللہ اور ان کے خانوادہ کا کارنامہ ۳۶

شاہ اسحاق وشاہ عبد الغنی کی علمی خدمات ۳۸

مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی کا کارنامہ ۳۸

- ہندوستان میں دو علمی تحریکیں اور ان کے اثرات ۴۰
- دار العلوم دیوبند ایک مکتبۂ فکر ایک تحریک ۴۵

افتتاحیہ ۴۵

پس منظر ۴۶

اصول ومقاصد ۵۰

سند واستناد ۵۲

اسناد سلف کا لازمی اثر ۵۳

عقیدۂ ختم نبوت کا تحفظ ۵۴

ناموس صحابہ کا دفاع ۵۴

ردشرک و بدعت ۵۵
علماء دارالعلوم دیوبند کا مسلک ۵۶
توحید ۵۸
خاتم الانبیاء سیدنا محمد رسول اللہ...... ۵۸
صحابۂ کرام ۵۹
صلحائے امت ۵۹
فقہ اور فقہاء ۶۰
علماء دارالعلوم کا فکری اعتدال ۶۱
فقہ میں سنت کی راہیں ۶۲
فتنۂ ارتداد - اور تحفظ اسلام کے لئے فکر دارالعلوم دیوبند سے مربوط علماء کی سعی مشکور ۶۳
پہلا محاذ ۶۴
دوسرا محاذ ۶۴
تیسرا محاذ ۶۵
دارالعلوم نے ملت کو کیا دیا ۶۶
طبقات مشاہیر علماء دیوبند ۶۷
محدثین ۶۷
مفسرین ۶۸
متکلمین و مؤرخین ۶۸
فقہاء ۶۹
اصحاب تدریس ۶۹
مبلغین اسلام ۷۰
مشائخ اصحاب سلوک ۷۱
مجاہدین و قائدین ملت ۷۲
مناظرین اسلام ۷۲
صحافی و اہل قلم ۷۲
علماء دیوبند اور علم القرآن - ایک سرسری جائزہ ۷۴
● فرزندان دارالعلوم دیوبند کی فقہی تصنیفی خدمات ۸۱
دارالعلوم دیوبند کی عظیم خدمات ۸۱
مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی ۸۲
حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی ۸۳

مفتی اعظم مولانا کفایت اللہ شاہجہاں پوری ثم دہلوی ۸۴
مولانا سید اصغر حسین دیوبندی ۸۵
شیخ الادب والفقہ مولانا اعزاز علی امروہوی ثم دیوبندی ۸۶
مولانا مفتی سید مہدی حسن محدث شاہجہاں پوری ۸۷
مولانا عبدالحق نافع پشاوری ۸۸
مفتی اعظم پاکستان مولانا محمد شفیع دیوبندی ۸۹
حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند ۹۰
مولانا سید بدرعالم میرٹھی ثم مدنی ۹۱
مولانا سید شمس الدین افغانی ۹۲
مولانا عبدالرحیم کیمبل پوری ۹۳
مولانا مفتی محمد اسماعیل بسم اللہ سورتی ۹۳
مولانا حبیب الرحمٰن محدث اعظمی ۹۴
مولانا سید محمد میاں دیوبندی ثم دہلوی ۹۵
مولانا محمد منظور نعمانی ۹۶
مولانا مفتی محمود حسن گنگوہی ۹۷
مولانا سید محمد یوسف محدث بنوری ۹۸
مولانا مفتی نظام الدین اعظمی ۹۹
مولانا شمس الحق فرید پوری ۹۹
مولانا سرفراز خاں صفدر (گجران والا) ۱۰۰
مولانا سید بادشاہ گل پشاوری ۱۰۰
مولانا محمد طاہر مردانی ۱۰۱
مولانا مفتی عبدالحکیم سکھروی ۱۰۱
مولانا مفتی رشید احمد لدھیانوی ۱۰۲
مولانا عبدالشکور ترمذی ۱۰۳
- علماء دیوبند-اور جماعت اہل حدیث کی معاندانہ روش ۱۰۵
علماء دیوبند کا استنادی رشتہ ۱۰۵
علماء دیوبند کا اعتدال ۱۰۶
سلف صالحین کے منہاج کی پیروی ۱۰۶
علماء دیوبند کا مسلک ۱۰۷
توحید-رسالت ۱۰۹

صحابہ۔صلحائے امت ۱۱۰
فقہ اور فقہاء ۱۱۰
جماعت اہل حدیث کا بیجا تشدد ۱۱۲
● آئینہ ان کو دکھایا تو برا مان گئے ۱۲۵
نقل عبارت عالی جاہ نواب صاحب مرحوم ۱۳۳
نقل عبارت مولانا محمد صاحب جونا گڑھی ۱۳۶
طریق محمدی کی مکمل عبارت ۱۳۷
● دار العلوم دیوبند کے خلاف ’’ترجمان دہلی‘‘ کی الزام تراشیوں پر ایک نظر ۱۴۶
شیشے کے گھر میں بیٹھ کے... ..... ۱۴۶
غیر مقلدین خود اپنے اکابر علماء کی نظر میں ۱۴۷
جہاد حریت میں غیر مقلدین کا کردار ۱۵۰
برطانوی آقا کی حمایت میں جہاد کی منسوخی کی ناکام کوشش ۱۵۶
’’ترجمان دہلی‘‘ کے بیان کردہ دلائل پر بحث ونظر ۱۶۲

باب (۲) صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم کی منفردانہ عظمت شان

● صحابہ قرآن وسنت کی نظر میں ۲۰۳
الصحابۃ فی القرآن ۲۰۳
الصحابۃ فی الحدیث ۲۰۹
صحابہ کی تنقیص علمائے امت کی نظر میں ۲۱۳
ایک اہم ترین نکتہ ۲۱۵
● تقدس صحابہ ۲۱۸
معیار صلاح ۲۱۸
صحابہ کی سیرت رسول خدا.....کی سیرت کا جزء ہے ۲۱۸
صحابہ قرآن مجید کی نظر میں ۲۲۱
صحابہ کا مقام حدیث کی روشنی میں ۲۲۹
صحابہ کی عیب جوئی اکبر کبائر میں ہے ۲۳۲
ایک محقق کا غیر تحقیقی رویہ ۲۳۵
ڈاکٹر صاحب کی تحریر پر ایک نظر ۲۳۹
● معیار افضلیت ۲۴۵
خلفاء اربعہ میں سب سے افضل کون ہے؟ ۲۴۵

(الف) فضیلت اختصاصی ۲۴۶
(ب) فضیلت اکتسابی ۲۴۸
فضیلت اکتسابی کی قسمیں ۲۴۹
ثمرۂ فضیلت ۲۵۳
افضل کی تعیین کا طریقہ ۲۵۹
اعمال کی تحقیق اور صدیق اکبر کی افضلیت کا اثبات ۲۶۰
ایک شبہ کا ازالہ ۲۶۹
حضرت عثمان غنی و علی مرتضیٰ میں باہمی فضیلت ۲۷۰

باب (۳) فرق باطلہ کا تعاقب

● نبیٔ افرنگ کی داستان حیات ۲۷۳
نام اور تاریخ پیدائش ۲۷۳
مرزا قادیانی کا خاندان ۲۷۳
مرزا کے والد غلام مرتضیٰ کی عملی حالت ۲۷۴
مرزا کے ایام طفلی ۲۷۴
تعلیمی لیاقت ۲۷۴
انگریزی زبان کی معمولی واقفیت ۲۷۶
کچہری کی منشی گیری ۲۷۷
عہد ملازمت ۲۷۷
مقدمہ بازی کا مشغلہ ۲۷۷
شرکاء کی اراضی پر غاصبانہ قبضہ ۲۷۸
شہرت کی طلب اور سرگرمیٔ مناظرہ ۲۷۹
مرزا جی ایک عارف کامل کے روپ میں ۲۸۰
نبیٔ افرنگ مرض مراق کے شکار تھے ۲۸۰
مرزا جی کی دیگر بیماریاں ۲۸۱
افیون اور شراب کا استعمال ۲۸۲
ٹانک ڈائن کا استعمال ۲۸۲
مرزا جی بحیثیت صاحب کشف ۲۸۳
ایک ہندو لڑکا بحیثیت کاتب وحی ۲۸۳
زر اندوزی کی ایک اور تجویز ۲۸۴

بدمعاملگی اورسخن تراشی ۲۸۵
الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے ۲۸۶
وعدہ خلافی ۲۸۶
- مرزا قادیانی اپنے عقاید اور دعووں کی روشنی میں ۲۸۸
تمہید ۲۸۸
توحید، اور خدا کی ذات وصفات کے متعلق مرزا کے دعوے اور عقاید ۲۹۱
صفات الٰہیہ کے متصف ہونے کے دعوے ۲۹۲
دعوئ وحی، نبوت ومعجزات ۲۹۴
نبئ کریم...... کے ساتھ وحدت ویکسانیت کا دعویٰ ۲۹۴
سید المرسلین...... سے برتر ہونے کا دعویٰ ۲۹۵
حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے حق میں مرزا کی بدزبانی ۲۹۷
جہاد کی حرمت کا اعلان ۲۹۸
مرزائی مذہب میں حج مکہ معظّمہ کی بجائے قادیان میں ۲۹۸
آنجہانی مرزا پر ایمان نہ لانے والے کافر ہیں ۲۹۸
غیر قادیانیوں سے نکاح کفر ہے ۲۹۹
غیر احمدیوں کے پیچھے نماز قطعاً حرام ہے ۲۹۹
- مرزا قادیانی کی قرآن حکیم میں تحریف معنوی کی چند مثالیں ۳۰۱
حرف آغاز ۳۰۱
مثال اوّل ۳۰۴
مثال دوم ۳۰۴
مثال سوم ۳۰۵
- انقلاب ایران کی حقیقت- قائد انقلاب کے عقاید ونظریات کے آئینہ میں ۳۰۶
ضروری تمہید ۳۰۶
قائد انقلاب علامہ خمینی کا مذہب ۳۰۸
مسئلۂ امامت ۳۰۹
عقیدۂ امامت پر ایک نظر ۳۱۲
مذہب اثنا عشری میں ائمہ کا مرتبہ ۳۱۳
دنیا وآخرت ان کے تصرف میں ہے ۳۱۴
ائمہ کو ماضی ومستقبل کا علم ہوتا ہے اور ان کی موت ان کے اختیار میں ہے ۳۱۵
ائمہ گناہ اور بھول چوک سے بَری ہیں ۳۱۶

ائمہ پر فرشتے وحی لے کر نازل ہوتے ہیں ۳۱۶
اللہ کی طرح امام کی معرفت شرط ایمان ہے ۳۱۷
ائمہ رسول کے ہم مرتبہ ہیں اور رسولوں کی طرح ان کی اطاعت بھی فرض ہے ۳۱۷
کائنات کا ذرہ ذرہ امام کے اقتدار کے آگے سرنگوں ہے ۳۱۸
ائمہ کا مرتبہ ملائکۂ مقربین اور انبیاو مرسلین سے بلند تر ہے ۳۱۸
ائمہ سہو و غفلت سے محفوظ ہیں ۳۱۹
ائمہ کی تعلیمات احکام قرآنی کی طرح واجب الاتباع ہیں ۳۱۹
ائمہ سے متعلق علامہ خمینی اور ان کے مذہب اثنا عشریہ کا خلاصہ ۳۲۱
مذکورہ عقاید پر اجمالی نظر ۳۲۲
قرآن حکیم اور شیعہ ۳۲۷
عقیدۂ تحریف قرآن کے سلسلہ میں علامہ خمینی کا رویہ ۳۳۴
قرآن ہر قسم کی ترمیم و تحریف سے پاک ہے ۳۳۸
- عقاید اہل سنت والجماعت - اور عقائد شیعہ، ایک تقابلی مطالعہ ۳۴۳
عقاید اہل سنت والجماعت درباب الٰہیات ۳۴۳
عقاید اثنا عشریہ ۳۴۴
عقاید اہل سنت والجماعت درباب رسالت ۳۴۶
عقاید شیعہ اثنا عشریہ ۳۴۶
عقاید اہل سنت والجماعت ۳۴۸
عقاید اثنا عشریہ ۳۴۸
عقاید اہل سنت والجماعت درباب امامت ۳۴۹
عقاید اثنا عشریہ ۳۵۰
عقاید اہل سنت والجماعت درباب معاد ۳۵۱
عقاید اثنا عشریہ ۳۵۱
- شیعیت کا یہود نواز کردار ۳۵۳
- کیا اثنا عشری مسلمان ہیں؟ ۳۵۷
ایمان و کفر میں فرق و امتیاز ضروری ہے ۳۵۷
اثنا عشری میں اسباب کفر پائے جاتے ہیں یا نہیں؟ ۳۶۰
چند وہ کتابیں جن میں اثنا عشری کے کفر کی تصریح ہے ۳۶۴
اثنا عشری کے کفر پر ایک متفقہ فتویٰ ۳۶۵
ایک اور فتویٰ ۳۶۶

حرفِ تشکر

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی استاذ حدیث دار العلوم دیوبند ایک اچھے صاحب قلم ہیں۔ لکھنے والوں میں ممتاز مقام رکھتے ہیں، ان کے مضامین مقبول ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ قلم کی طاقت، ایک بڑی طاقت ہے، یہ جسے مل جائے قدرت کی جانب سے ایک انعام ہے۔ اس پر جتنا بھی شکر ادا کیا جائے وہ کم ہے۔ ہوشمند لوگوں نے اس کی طاقت سے بڑے بڑے کارنامے سرانجام دیئے ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ دنیا کے عظیم انقلابات میں قلم کا اہم رول رہا ہے۔

اس وقت ہمارے سامنے حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی کی اہم کتاب ''مقالات حبیب'' ہے۔ موصوف نے مختلف اوقات میں، مختلف موضوعات پر جو قیمتی مضامین لکھے ہیں، وہ یکجا کر دیئے گئے ہیں۔ مضامین کی اثر انگیزی کی بات یہ ہے کہ ہر مضمون کو بار بار پڑھنے کو دل چاہتا ہے اور ہر بار ایک نئی تازگی ملتی ہے۔ مجھے اس پر بیحد مسرت ہے کہ کتاب کی افادیت کو دیکھتے ہوئے دار العلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ نے شیخ الہند اکیڈمی سے اس کی طباعت منظور فرمالی ہے جو جلد منصۂ شہود پر آنے والی ہے۔

توقع ہے کہ اسے خاص و عام کے حلقوں میں نمایاں مقبولیت حاصل ہوگی۔

بڑھتا رہے اس راہ میں قدم اور زیادہ
اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

(مولانا) بدر الدین اجمل علی قاسمی (صاحب)
رکن مجلسِ شوریٰ دار العلوم دیوبند
۷/ ذی قعدہ ۱۴۳۰ھ = ۲۷/ اکتوبر ۲۰۰۹÷

پیش لفظ

پیشِ نظر کتاب ''مقالات حبیب'' حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی استاذ حدیث و مدیر اعلیٰ ''ماہنامہ دار العلوم دیوبند'' کے بیش بہا مضامین کا مجموعہ ہے۔ مضامین بڑی محنت اور جانفشانی سے لکھے گئے ہیں جو ضرورت وقت کے عین مطابق ہیں۔ آج کے حالات میں ایسے مضامین کی خاص طور پر ضرورت ہے۔ مولانا کا قلم رواں دواں ہے۔ وہ جس موضوع پر اٹھتا ہے اس کا پورا پورا حق ادا کر دیتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ مجموعہ جو تین جلدوں پر مشتمل ہے اہل علم میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ کتاب کے آغاز میں حضرت مولانا سعید احمد صاحب پالن پوری صدر المدرسین دار العلوم دیوبند اور حضرت مولانا نور عالم خلیل امینی صاحب امینی ایڈیٹر ''الداعی'' و استاذ دار العلوم کی تقریظات بھی ہیں جن سے کتاب کی معتبریت مزید بڑھ جاتی ہے۔ تقریظات میں کتاب کا تعارف علمی و ادبی اور خوبصورت انداز میں کرایا گیا ہے اور اس کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔

مجھے خوشی ہے کہ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کا یہ اہم اور مفید ترین مجموعہ شیخ الہند اکیڈمی سے شائع کیا جا رہا ہے جو علمی و ادبی، اصلاحی، تحقیقی اور معلوماتی اعتبار سے بہت اہم ہے۔ انشاء اللہ اس کے مطالعہ سے ہر مکتب فکر کے اہلِ ذوق حضرات کو فائدہ ہوگا۔

دعا ہے حق تعالیٰ فاضل مؤلف کو صحت و عافیت کے ساتھ زندہ سلامت رکھے اور توفیق مرحمت فرمائے کہ وہ اپنے پاکیزہ قلم سے علم و فن کے شہ پارے پیش کرتے رہیں۔

(مولانا) مرغوب الرحمٰن (صاحب)

مہتمم دار العلوم دیوبند

۷/ ذی قعدہ ۱۴۳۰ھ = ۲۷/ اکتوبر ۲۰۰۹ء

تقریظ

حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری

شیخ الحدیث وصدر المدرسین دار العلوم دیوبند

نحمدُہ و نصلی علی رسولہ الکریم، أما بعد:

ہزار رنگ ہیں نیرنگی حیات میں، اور گل ہائے رنگا رنگ سے ہے زینتِ چمن، ''مقالاتِ حبیب'' ایسے ہی انواع والوان کے مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس ضخیم کتاب کے ٦ ابواب ہیں:

باب اوّل میں ہندوستان میں احیائے علم وفکر کا مفصل تذکرہ ہے، اور مکتب فکر دار العلوم دیوبند کا اور اس کے ابنائے قدیم کا مبسوط تعارف ہے۔ دار العلوم نے ملت اسلامیہ کو کیا دیا؟ اس نے کن کن فتنوں کا تعاقب کیا؟ اس کی تفسیری، حدیثی، فقہی اور اصلاحی خدمات کیا ہیں؟ ان سب باتوں کا تفصیل سے تذکرہ آپ کو اس کتاب میں ملے گا۔

دوسرے باب میں صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی منفردانہ عظمتِ شان کا بیان ہے، یہی حضرات امتِ اسلامیہ کا پہلا قافلہ ہیں، یہی حضرات دین کے ناقل اور محافظ ہیں، انہی کے دوشِ ناتواں پر دین کی تلقّی، اور دعوتِ اسلامی کی ہمہ ہمی کا بوجھ رکھا گیا ہے، اور تاریخ شاہد ہے کہ وہ اس ذمہ داری سے بہ احسنِ وجوہ عہدہ برآ ہوئے ہیں، اور یہ حضرات ہر طرح قابل اعتماد ہیں، کچھ لوگ (شیعہ، غیر مقلدین اور مودودی) ان حضرات کو ان کے لائق مقام نہیں دیتے، بلکہ ان کے حق میں بدگمانی کا شکار ہیں، معلوم نہیں وہ لوگ اپنے دین کے معاملہ میں کس پر اعتماد کرتے ہیں؟ اللہ تعالیٰ پر اور اس کے رسول ...... پر! بے شک دین کا مبنی تو یہی ہے، مگر وسائط کے بغیر ان کی باتیں ہمیں نہیں پہنچی، پس اگر درمیانی کڑیوں پر اعتماد نہ رہے اور اسلاف سے بے تعلقی ہو جائے تو پھر فہم دین کا خدا حافظ! آپ کو اس کتاب سے معلوم ہوگا کہ قرآن وسنت کی نظر میں صحابۂ کرام کا کیا مقام تھا؟ ان کا تقدس اور ان میں

معیار افضلیت کا بھی اس کتاب میں مفصل بیان ہے۔

تیسرا باب: فرقِ باطلہ کے تعاقب میں ہے، سب سے پہلے فرنگی نبی (قادیانی) کی داستانِ حیات ہے، پھر مرزا قادیانی کے عقائد و دعاوی کا بیان ہے، پھر قرآنِ حکیم میں قادیانی تحریفات کی چند مثالیں دے کر انقلاب ایران کی حقیقت واشگاف کی گئی ہے، اس طرح اشہب قلم شیعیت کی طرف چل پڑا ہے، اور آخر میں عقائد اہل سنت والجماعۃ اور عقائد شیعہ کا تقابلی مطالعہ ہے، جو خاصے کی چیز ہے۔

چوتھے باب میں مسائل و دلائل ہیں، اور اس میں کئی معرکۃ الآراء مسائل زیر بحث آئے ہیں۔ مثلاً: (۱) رفع یدین کی بحث (۲) خواتین کا مساجد میں آکر باجماعت نماز پڑھنا (۳) نکاح وطلاق کا اسلامی ضابطہ (۴) ایک مجلس کی تین طلاقیں (۵) سکران (مدہوش) کی طلاق کا حکم (۶) حرمتِ مصاہرت (۷) اور حقیقتِ رجم پر ایک نظر۔ یہ سب مسائل معرکۃ الآراء ہیں، ان میں بھانت بھانت کے نظریات پائے جاتے ہیں۔ مصنف زید مجدہم اس خاردار وادی سے فائز المرام نکل گئے ہیں... علاوہ ازیں: (۱) اسلام میں روزہ کی افادیت (۲) آیاتِ صوم کی تفسیریں (۳) عشرۂ ذی الحجہ کے اعمال وفضائل (۴) اسلام میں شہید کی حقیقت اور فضیلت اور دیگر بہت سے مسائل زیر بحث آئے ہیں اور دلائل کی روشنی میں ان کا فیصلہ کیا گیا ہے۔

پانچواں باب: سیرت وتاریخ کے بیان میں ہے۔ سب سے پہلے ہادئ عالم...... کی ازدواجی زندگی کا بیان ہے، آپ ...... کی ازواج کی کثرت کے سلسلہ میں دو بنیادی نقطے بیان کئے ہیں، پھر ازواج مطہرات کے سوانح ہیں اور بحث کے آخر میں تعدد ازواج کی چار مصلحتیں بیان کی ہیں جو بہت عمدہ بحث ہے۔ پھر پوری سیرتِ نبوی پر اجمالی نظر ڈالی گئی ہے اور آپ ...... کی سیرتِ مقدسہ کی چیدہ چیدہ باتیں ذکر کی ہیں۔ پھر قلم کا رخ تاریخ کی طرف متوجہ ہو گیا ہے۔ سب سے پہلے تاریخ اسپین کا عبرت خیز ورق الٹا ہے، پھر اجودھیا کی تاریخی حیثیت واضح کی ہے اور بابری مسجد سے پردہ اٹھایا ہے، حقائق کیا ہیں اور افسانے کیا؟ کتبوں کی روشنی میں اس کا فیصلہ کیا ہے اور آخر میں بابری مسجد تاریخ کے مختلف مراحل میں: ایک معلومات افزاء مقالہ ہے اور باب کے آخر میں: ہندوستان میں ''نظام

امارت'' کا بیان ہے۔

اور چھٹے اور آخری باب میں: اربابِ فضل وکمال کا تذکرہ ہے، پس یہ بھی گویا پانچویں باب ہی کا حصہ ہے پہلے امام اعظم کا پھر امام ابوداؤد رحمہما اللہ کا ذکر خیر ہے، پھر اجودھیا کے مشاہیر علماء ومشائخ کا تذکرہ ہے اور اجودھیا: ضلع جونپور سے قریب ہے، اس مناسبت سے متعدد جونپوری اکابر کا مفصل تذکرہ ہے، اور سید محمد جونپوری کے تذکرہ میں تحریک مہدویت کا بھی تعارف آگیا ہے۔ پھر جونپور سے متصل ضلع بنارس کے اکابر کا تذکرہ ہے۔

اور آخر میں مُسند الہند حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی قدس سرہ کا ذکر خیر ہے اور ان کے سفر حرمین کی مفصل روداد بیان کی ہے اور بالکل آخر میں، کتاب کے ختم پر، قافلۂ فضل وکمال یعنی حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی قدس سرہ اولین صدرالمدرسین دارالعلوم دیوبند کا اور ان کے مشاہیر تلامذہ کا ذکر خیر ہے، اور یہ ضخیم کتاب حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہ کے تین امتیازات پر ختم ہوئی ہے۔

یہ اس معلومات افزاء کتاب کا ایک سرسری جائزہ ہے اور اس کا مختصر تعارف ہے۔

اور صاحب کتاب حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی (استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند، اور مدیر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند) صاحب قلم مصنف ہیں، آپ کی بہت سی کتابیں منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوچکی ہیں، سیال قلم کے مالک ہیں، جب لکھنے پر آتے ہیں تو لکھتے ہی چلے جاتے ہیں، اور پر مغز لکھتے ہیں۔ آپ یہ کتاب پڑھیں گے تو اندازہ ہوگا کہ ان کی سحر بیانی منفردانہ شان کی حامل ہے، مولانا کا علم پختہ، ذہن استوار اور معلومات وافر ہیں، اس لئے ان کی تحریروں میں قاری کو بڑے کام کے نقطے اور نکتے مل جاتے ہیں، اللہ تعالیٰ حضرت مولانا کے علم وفضل میں برکت فرمائیں، اور ان کی تحریرات سے امت کو بیش از بیش فائدہ پہنچائیں اور اللہ تعالیٰ مولانا دام مجدہم کے اس مجموعۂ مقالات کو قبول فرمائیں اور ان کے فیض کو عام وتام فرمائیں، والسلام

کتبہٗ
سعید احمد عفا اللہ عنہ پالن پوری
خادم دارالعلوم دیوبند
۷/۱۱/۱۴۲۹ھ

تقریظ

حضرت مولانا نور عالم خلیل امینی صاحب

استاذ ادب عربی و رئیس التحریر ''الداعی'' دار العلوم دیوبند

دار العلوم دیوبند کے باکمال وکثیر الافادہ ودیرینہ استاذ اور اُس کے تحریری ترجمان ماہ نامہ ''دار العلوم دیوبند'' کے لائق رئیس التحریر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی کی کتاب ''مقالاتِ حبیب'' میں نے جستہ جستہ دیکھی۔ اِسلامی موضوعات کے تنوُّع اور جامعیّت کے تعلق سے گویا یہ ''دائرۃ المعارف'' اور ''قاموس العلوم'' ہے۔ اِن میں سے اکثر موضوعات، ماہ نامہ ''دار العلوم دیوبند'' کے صفحات میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ کچھ مضامین ایسے ہیں جن پر اُنھوں نے مستقلاً لکھا ہے اور کچھ وقت کے تقاضوں نے اُن سے رقم کروائے ہیں۔ موصوف نے جو کچھ لکھا ہے، خوب صورت اور بھرپور ہے، قاری کو کسی جگہ تشنگی اور بے مزگی کا اِحساس نہیں ہوتا۔ دار العلوم دیوبند، اُس کے فکری اَساس، مسلکی اِعتدال، دین ودعوت کی اُس کی پاسبانی اور اُس کے فضلا کی دینی ودعوتی میدان میں خدمتوں کی بے پناہی پر اتنا اچھا لکھا ہے کہ کہنا چاہیے کہ قلم توڑ دیا ہے۔

اُنھوں نے کتاب کے مشمولات کو چھ ابواب پر تقسیم کرکے قاری کے لیے استفادے کی راہ آسان کردی ہے۔ بابِ اوّل کا عنوان ہے: ''ہندوستان میں احیاے علم وفکر'' بابِ دوم ''صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم کی مُنفردانہ عظمتِ شان'' سے مُعنْوَن ہے۔ بابِ سوم کا موضوع ''فرقِ باطلہ کا تعاقب ہے''۔ بابِ چہارم ''مسائل ودلائل'' سے موسوم ہے۔ بابِ پنجم ''گوشۂ سیرت وتاریخ'' کے موضوعات کو سمیٹتا ہے۔ جب کہ بابِ ششم

میں ’’تذکرۂ اربابِ فضل وکمال‘‘ کے تحت سلف سے خلف تک پچاسوں اربابِ فضل وکمال پر، تفصیل سے لکھا ہے۔

موصوف کے ہاں دینی و علمی مطالعے کی وسعت، تجربہ و درایت کی بہتات، دقتِ نظری، تحلیل و تجزیے کی فراوانی کے ساتھ ساتھ قاری کو زبان کی چاشنی، شگفتگی و شستگی، سلاست اور روانی اور صرف آمد، جس میں آورد کا کوئی شائبہ نہ ہو، کا اِحساس اُن کے علمی موضوعات کی تحریروں کو بھی (جو اپنی خشکی کے لیے مشہور ہوتے ہیں) از اول تا آخر پڑھ جانے کے لیے؛ اِس طرح کرتا ہے کہ بدذوق سے بدذوق اِنسان بھی اُن کی تحریر کو مکمل پڑھے بغیر دست انداز نہیں کرسکتا، قلم کی پختگی اور تحریر کے بانکپن کی وجہ سے ’’فقیہانہ‘‘ یا دوسرے لفظوں میں ادیبوں کے لباسِ خاص ’’ڈریس‘‘ میں نظر آنے والے اردو زبان کے کھلاڑیوں اور مداریوں کی طرف سے پختہ کار اہلِ قلم علما پر بھی ’’مولویانہ‘‘ زبان لکھنے کی سراسر ظالمانہ تہمت لگانے والے انتہائی بے حیا لوگ بھی اُن پر یہ تہمت لگانے کی جرأت نہ کرسکیں گے۔ یہ اردو زبان پر اُن کی معقول گرفت کی بہت بڑی دلیل ہے۔ صحافیانہ سطحیّت، نامہ نگارانہ خشکی اور عاجلانہ وہمہ وقت لکھنے والے شہرت کے رسیا قلم کاروں کی ناپختگی وناہمواری سے اُن کی زبان بالکل مُبَرَّا ہے۔

یہ ہمہ گیر مجموعۂ مقالات قاری کو جہاں علم وفکر، دین ودعوت اور سیرت وتاریخ کا بھرپور درس دیتا ہے وہیں زبان وبیان کی سوغات بھی دیتا ہے۔ جوانوں کے لیے یہ کتاب بہ طورِ خاص ہمّت وحوصلہ اور فکر ونظر کو انتہائی حد تک حرکت دینے اور جمود وکسل مندی سے ہٹا کر نشاطِ کار سے سرشار کرنے والی ہے۔

بہت سے موضوعات پر اُنھوں نے اِتنا مواد اکٹھا کردیا ہے کہ عموماً ایک جگہ اتنا مواد نہیں ملتا۔ دوسری طرف فرقِ باطلہ اور مسالکِ منحرفہ پر اُنھوں نے جو کچھ لکھا ہے، وہ مواد کی کثرت، دلائل کی قوت اور مباحثے کے البیلاپن کی وجہ سے، اپنا جواب آپ ہے۔ مواد جمع کرنے، اسے چھاننے، پھٹکنے، اُس سے نتیجہ نکالنے اور صحیح جگہ میں صحیح طور پر اُس سے کام لینے کا ہنر اُنھیں خوب آتا ہے؛ اِس لیے اُن کی کتاب کا یہ باب بہت مزے دار اور

فکر انگیز ہے۔

موصوف کی متعدد کتابیں دینی وعلمی موضوعات پر شائع ہوکر مقبولِ عام ہوچکی ہیں؛ لیکن اُن کی یہ کتاب، جو درحقیقت کئی کتابوں کا مجموعہ ہے، ان سب سے ظاہراً وباطناً فائق ہے۔ اُن کے شاگردوں اور شاگردوں کے شاگردوں میں بہت سے ایسے لوگ ہوں گے جو نوآموز ہونے کے باوجود ہر سال، یا سال میں کئی بار نئی کتابیں شائع کرتے ہوں گے؛ لیکن موصوف پختہ کار اہلِ قلم واہل علم ہونے کے باوجود، کثرت سے مضامین یا کتابیں نہیں لکھتے؛ کیوں کہ کثرت سے لکھنا کوئی کمال نہیں، اچھا اور مفید لکھنا کمال ہے۔ کثیر التحریر لوگوں کی تحریر میں عموماً لغزشیں اور خامیاں راہ پا جاتی ہیں۔ کم نویس لوگ عموماً طویل غور وفکر، چھان پھٹک اور انتخابِ عمل پر کاربند ہوتے ہیں؛ اِس لیے اُن کی نگارشات، صرف مغز اور گودے سے عبارت ہوتی ہیں۔ مولانا بھی اُنھی خوش قسمت لوگوں میں سے ایک ہیں۔

میں کبھی کبھی سوچتا تھا کہ بہت سے نو واردانِ بساطِ تحریر، روز روز کتابیں اور مقالات چھاپتے رہتے ہیں، مولانا موصوف کہنہ قلم ہونے کے باوجود مناسب وقفے کے بعد ہی کیوں چھپتے ہیں؟ لیکن اُن کے اِس ضخیم مجموعۂ مقالات کو دیکھ کے اندازہ ہوا کہ وہ لعل وگہر کے انتخاب میں خاصا وقت صرف کرتے ہیں اور تحریر کی معنویّت اور اُس کے مواد اور علمی مشمولات کی باطنی قیمت کے ساتھ ساتھ، اُس کی ساختیات، لفظیات، تعبیرات اور طریقۂ ترسیل پر بھی زور دیتے ہیں۔

یقین ہے کہ اللہ کی توفیق سے اُن کی یہ کتاب باذوق قارئین کی طرف سے بے پناہ پذیرائی حاصل کرے گی۔ اللہ تعالیٰ اُنھیں اور قوت وحوصلے سے نوازے اور وہ مزید اچھی اچھی کتابوں سے نسلِ حاضر کو نوازتے رہیں۔ والحمد للّٰہ ربّ العالمین.

نور عالم خلیل امینی

۱۱ر بجے صبح دوشنبہ: ۷/۱/۱۴۳۰ھ ؁ استاذ ادب عربی ورئیس التحریر ”الداعی“
۵/۱/۲۰۰۹ء دار العلوم دیوبند

باب ﴿۱﴾

ہندوستان میں احیاء علم وفکر

ہندوستان میں علم اور علماء

عرب و ہند کے روابط

پیغمبر اسلام ...... کی بعثت سے صدیوں پہلے ہی سے عرب اور ہندوستان کے درمیان تجارتی تعلقات قائم تھے جس کا سلسلہ ظہور اسلام کے بعد بھی جاری رہا، مسلمان عربوں نے سندھ اور ملیبار سے لے کر گجرات تک ساحلی علاقوں میں اپنی نو آبادیاں بنالی تھیں جن کے ذریعہ اسلام اور اسلامی علوم و ثقافت کی شعاعیں سرزمین ہند میں پھیلنا شروع ہو گئی تھیں (۱)

عہد فاروقی میں حضرت حکمؓ بن ابی العاص کی قیادت میں اس وقت کی مشہور ہندوستانی بندرگاہ "تھانہ" پر مجاہدین و مبلغین اسلام کا پہلا قافلہ اترا۔ اس کے بعد تو ساحل ہند کا علاقہ مجاہدین و مبلغین کی مستقل چھاؤنی بن گیا اور تھوڑے تھوڑے وقفے کے ساتھ اسلامی قافلے آتے رہے جن میں دیدار نبوی...... سے مشرف ہستیاں بھی شامل رہیں جن کا خاص مشن ہی یہ تھا کہ جس ملک میں پہنچے قال اللہ و قال الرسول کی صدائے جاں بخش و روح نواز سے اس میں تازہ زندگی پیدا کر دی۔ اس طرح سرزمین ہند آغاز اسلام ہی سے اسلامی علوم سے یک گونہ آشنا ہو چکی تھی۔

---

(۱) بعض اہم اہل علم نے لکھا ہے کہ عرب تاجروں کو تبلیغ و اشاعت کے کام سے کوئی دلچسپی نہ تھی اور نہ وہ ہندوستان کی تمدنی زندگی پر اثر انداز ہو سکے۔ اور بعض حضرات تو یہاں تک لکھ گئے ہیں کہ ان تاجروں کے ذریعہ ایک ہندی بھی حلقہ بگوش اسلام نہیں ہوا — یہ خیال تحقیق کے بالکل خلاف ہے کیونکہ اکثر مؤرخین سندھ، ملیبار، اور گجرات وغیرہ کے بارے میں تصریح کرتے ہیں کہ "انتشر الاسلام فی ہٰذہ المناطق علی ایدی التجار المسلمین" ان علاقوں میں مسلمان تاجروں کے ذریعہ اسلام کی اشاعت ہوئی۔ تفصیل کیلئے دیکھئے "عرب و ہند عہد رسالت میں" قاضی اطہر مبارک پوری۔

عہد اموی کے چند ہندی علماء

خلافتِ راشدہ کے بعد زمام خلافت جب اموی خلفاء کے ہاتھوں میں آئی تو انھوں نے بھی اس دور افتادہ علاقے پر نگاہ رکھی چنانچہ ۹۳ھ (بزمانہ ولید بن عبدالملک) میں محمد بن قاسم ثقفی کو اس خطہ کا حاکم بنا کر بھیجا گیا انھوں نے اپنی اولوالعزمیوں سے پورے سندھ پر اسلام کا پرچم لہرا دیا۔ اس وقت سے یہ علاقہ باقاعدہ اسلامی قلمرو میں شامل ہو گیا اور ۲۵۰ھ تک براہ راست پایۂ تخت بغداد و دمشق سے اس کا تعلق قائم رہا۔(۱)

ظاہر ہے کہ اس طویل مدّت میں تاریخ کے مسلم اصول کے مطابق فاتح قوم کا اثر ونفوذ مفتوح اقوام کے ہر شعبۂ زندگی میں ہوا ہوگا۔ علاوہ ازیں اس مستحکم ارتباط کی بناء پر دونوں ملکوں میں باہم آبادیوں کا تبادلہ بڑے پیمانہ پر ہونا یقینی ہے اس طرح ہندی مسلمانوں کو بلاواسطہ حضرات صحابہ، تابعین، تبع تابعین اور عرب معلّمین سے اسلامی علوم وفنون اور مذہبی تہذیب وتمدن کو اخذ وجذب کی سعادت حاصل ہوئی یہی وجہ ہے کہ تراجم ورجال کی کتابوں میں حجازی، شامی اور عراقی علماء کے دوش بدوش ہندی الاصل علماء ومحدثین بھی نظر آتے ہیں جن میں وہ مبارک ہستیاں بھی ہیں جنھوں نے حضراتِ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی صحبتیں اٹھائیں اور ان سے اخذ فیض کیا مثلاً (۱) شیخ عبدالرحمٰن بن ابوزید بیلمانی (بھیلمان سوراسٹر کی جانب نسبت ہے) جنھوں نے حضرت عثمان غنی، عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن عمر، امیر معاویہ، عمرو بن اوس، عمرو بن عنبسہ، نافع بن جبیر، عبدالرحمٰن بن الاعرج رضی اللہ عنہم سے روایت کی۔ شیخ عبدالرحمٰن سے حضرت عمر بن عنبسہ کے قبولِ اسلام کی روایت سنن نسائی اور طواف وداع سے متعلق حدیث جامع ترمذی میں موجود ہے(۲) (۲) عبدالرحمٰن سندھی ان کے بارے میں امام بخاریؒ نے تصریح کی

---

(۱) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو فتوح البلدان للعلاّمہ بلاذری والعقد الثمین فی فتوح الہند۔ مصنفہ مولانا قاضی اطہر مبارک پوری۔

(۲) العقد الثمین ص ۲۸۷۔

ہے کہ انھوں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے یہ حدیث سنی ہے۔

کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یأکل ولا یتوضاء من اللحم(۱)

(۳) امام ابومعشر نجیح بن عبدالرحمٰن سندھی متوفی ۱۷۰ھ جنھوں نے مدینہ منورہ میں مستقل سکونت اختیار کرلی تھی ان کے صاحبزادے شیخ محمد بن ابومعشر کا بیان ہے۔

کان ابی سند یا اخرم خیاطاً

میرے والد سندھی تھے ان کے کان چھدے ہوئے تھے اور سلائی کا پیشہ کرتے تھے۔

خطیب بغدادی نے لکھا ہے کہ نجیح بن عبدالرحمٰن سندھی نے حضرت ابوامامہ سہل بن حنیف کو دیکھا ہے اور محمد بن کعب قرظی، نافع مولیٰ ابن عمر، سعید مقبری وغیرہ سے سماع کیا ہے۔

وکان اعلم الناس بالمغازی

اور وہ مغازی کے بہت بڑے امام تھے۔

انھوں نے مغازی میں ایک کتاب بھی مرتّب کی تھی(۲) **(۴) حارث بیلمانی** نے حضرت عبداللہ بن عمر سے اکتسابِ علم کیا تھا وغیرہ وہ ہندی الاصل علماء ہیں جنھوں نے براہِ راست حضراتِ صحابہ سے حدیثیں سنی ہیں اور اخذ فیض کیا ہے(۳)

تیسری صدی کے وسط میں اگرچہ سندھ میں عربوں کی بالادستی ختم ہوگئی پھر بھی وہاں کے دوشہروں منصورہ اور دیبل (بھکر اور ٹھٹھ) میں علی الترتیب ۴۱۶ھ و ۷۵۲ھ تک اسلامی ریاستیں قائم رہیں اس طرح یہ سرزمین پہلی صدی ہجری کے آخر ہی سے اسلام اور اسلامی علوم کے حافظ ومحافظ کا گہوارہ بنی رہی۔ اس دور کے مشاہیر علماء محدثین میں خلف بن سالم سندھی ۲۳۱ محمد بن ابوبشر معشر نجیح سندھی م۲۴۴ھ عبد بن حمید کسی (عبدالحمید) م۲۸۲ھ (کچھ کی جانب نسبت ہے) وغیرہ بطور خاص قابل ذکر ہیں جنھوں نے تیسری صدی

---

(۱) تاریخ کبیر ج۳ ص۲۹۵۔

(۲) تذکرۃ الحفاظ ج۱ ص۲۱۲۔

(۳) تفصیل کے لئے ملاحظہ کیجئے العقد الثمین وخلافت امویہ اور ہندوستان مصنفہ قاضی اطہر مبارک پوری۔

ہجری میں اپنی علمی سرگرمیوں سے اس خطۂ ارض کو دارالعلوم بنائے رکھا آخرالذکر بزرگ نے صحیح مسلم کی احادیث کی تخریج بھی کی تھی اور محمد بن ابراہیم دیبلی م ۳۲۲ھ احمد بن عبداللہ دیبلی م ۳۴۳ھ ابوالفوارس احمد بن محمد سندھی م ۳۴۹ھ، محمد بن محمد دیبلی م ۳۵۴ھ ابوالعباس احمد بن محمد منصوری م ۳۷۳ھ وغیرہ چوتھی صدی کے ان رجال علم میں سے ہیں جن سے خود حجاز، عراق اور دمشق و شام کے علماء نے درس لیا ہے۔

اس دور اوّل میں سندھ، دیبل اور ملتان اسلامی علوم و تہذیب کے مرکز رہے۔

عہد غزنویہ کے علماء

ساحلی علاقوں سے اسلامی غلبہ کے ختم ہو جانے کے بعد اسلام نے اپنے اثر و نفوذ کے لئے ایک نئی راہ ڈھونڈ نکالی۔ اور بحری راستہ کے بجائے اس مرتبہ درۂ خیبر کو اپنے داخلہ کے لئے منتخب کیا چنانچہ پانچویں صدی کی ابتداء میں سلطان محمود غزنوی نے لاہور کو اپنے زیر نگیں کر کے اسلامئ ہند کے ایک نئے دور کا آغاز کر دیا۔ درحقیقت وسیع اور منظّم پیمانہ پر اسلام اور اسلامی علوم کا داخلہ اسی وقت سے ہوا کیونکہ دور اوّل میں اسلام کی کرنیں ساحلی علاقوں سے آگے نہ بڑھ سکیں تھیں لیکن اس مرتبہ اس نے رفتہ رفتہ پورے ہندوستان کو اپنی ضیا پاشیوں سے بقعۂ نور بنا دیا۔

جس وقت پنجاب پر غزنی حکومت کا تسلط ہوا اس وقت تمام اسلامی علوم مثلاً تفسیر، حدیث، فقہ، کلام، تصوف وغیرہ مکمل طور پر مدوّن ہو چکے تھے اور غزنی جو محمود کے عہد میں اسلامی عجم کا سب سے بڑا علمی مرکز تھا۔ ان سب علوم کا گہوارہ بن گیا تھا اس لئے پنجاب جو سلطنت غزنی کا ایک ٹکڑا ہو چکا تھا ناممکن ہے کہ دارالحکومت کے ماحول و اثرات سے متاثر نہ ہو۔

اس عہد میں پنجاب کے جس شہر کو علمی و تمدنی مرکز بننے کا شرف حاصل ہوا وہ لاہور ہے۔ چنانچہ فتوحات غزنویہ کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ علماء مشائخ کے قافلے جوق درجوق لاہور کی جانب کھنچے چلے آرہے ہیں۔ اس عہد کے علماء و محدثین میں شیخ اسماعیل لاہوری م

۴۴۸ھ سے اہل ہند کو بطور خاص فیض پہنچا یہ حدیث و تفسیر کے متبحر عالم ہونے کے ساتھ مؤثر البیان واعظ و مذکر بھی تھے بے شمار افراد ان کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے(۱)

اس عہد کے لاہوری علماء میں شیخ عبدالصمد بن عبدالرحمٰن لاہوری م ۴۲۹ھ ہیں جن کا چشمۂ علم سمرقند میں تشنگان علوم نبوی کو سیراب کر رہا تھا(۲) نیز شیخ علی بن عثمان ہجویری، المعروف بہ داتا گنج بخش متوفی ۴۶۵ھ/۱۰۷۲ء جنھوں نے لاہور میں علم و عرفان کی شمع کو اس قوت کے ساتھ روشن کیا کہ آج تک اس کے انوار محسوس ہوتے ہیں۔ شیخ نے متعدد کتابیں بھی تصنیف کیں لیکن اب صرف کشف المحجوب دستیاب ہوتی ہے۔ جس کے متعلق دارو شکوہ لکھتا ہے۔

ہیچ کس را براں سخن نیست و مرشدے است کامل در کتب تصوف بخوبی آں
درزبان فارسی کتابے تصنیف نہ شدہ(۳)

(کسی کو بھی اس کتاب پر اعتراض نہیں یہ ایک مرشدِ کامل ہے فارسی زبان میں فن تصوف پر ایسی کوئی کتاب تصنیف نہیں ہوئی)

ان نابغۂ عصر کے علاوہ شیخ ابوالحسن علی بن لاہوری بھی اس دور کی یادگار ہیں۔ جن کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا عبدالحئی حسنی لکھتے ہیں۔ العالم المحدث كان شيخاً اديباً شاعرًا كثير الحفظ. ان کا فیض بغداد تک عام تھا۔ امام سمعانیؒ نے لکھا ہے کہ میں خود اُن سے نہ مل سکا مگر حافظ ابوالفضل محمد بن ناصر سلامی بغدادی کے واسطہ سے ان کا شاگرد ہوں۔ ۵۲۹ھ میں لاہور میں فوت ہوئے(۴) لاہور ہی کے ایک اور عالم و محدث محمد بن محمد ہیں جنھیں حدیث کے ساتھ فقہ اور فن مناظرہ میں بھی مہارت حاصل تھی۔ امام ابوالمظفر سمعانی ابوالفتح عبدالرزاق المنیعی، ابوبکر بن خلف شیرازی ابواسحاق ابراہیم بن عمر اصبہانی وغیرہ سے انھیں شرف تلمّذ حاصل تھا۔ اور امام ابوسعید عبدالکریم سمعانی صاحب انساب

---

(۱) تذکرہ علماء ہند ص ۲۳ و مقالات سلیمان ج ۲ ص ۴۔
(۲) رجال السند والہند ص ۱۷۰۔
(۳) سفینۃ الاولیاء ص ۱۷۴۔
(۴) نزہۃ الخواطر ص ۸۲ ج ۱۔

الاشراف جیسے علامۃ العصر کے استاذ تھے ۵۴۰ھ کے قریب وفات پائی(۱) انساب الاشراف کے مطالعہ سے اس دور کے مزید ہندی علماء کا پتہ چلتا ہے، مگر بخوف تطویل انھیں کسی دوسرے موقع کے لئے چھوڑ دیا گیا ہے۔

اب تک کے یہ سارے علماء وہ ہیں جن کے علمی فیوض و برکات سے ہندوستان کم اور دیگر بلاد اسلامیہ زیادہ مستفیض ہوئے بالآخر ساتویں صدی ہجری میں امام صنعانی صاحب مشارق الانوار ہندوستان کے لئے باعث فخر ومباہات بن کر جلوہ افروز ہوئے امام موصوف کا اسم گرامی حسن بن محمد ہے ۵۷۷ھ میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم اپنے والد بزرگوار سے حاصل کی پھر یمن، حجاز، عراق وغیرہ جا کر وہاں کے علماءِ کبار سے علم کی تحصیل و تکمیل کی اور لغت وحدیث کے امام قرار پائے۔ حدیث میں مشارق الانوار کے علاوہ مصباح الدجی فی حدیث مصطفیٰ، الشمس المنیر ہ، شرح بخاری اور دو رسالے موضوعاتِ حدیث میں آپ کی علمی یادگار ہیں۔ فن حدیث کے علاوہ لغت اور ادب میں علامہ صنعانی کی درج ذیل تصانیف ہیں۔

(۱) العباب الزاخر ۲۰ جلدوں میں (۲) مجمع البحرین ۱۲ جلدوں میں (۳) الشوارد (۴) کتاب اسماء الاسد (۵) کتاب اسماء الذئب (۶) کتاب الافعال (۷) کتاب المفعول (۸) کتاب الاصفار (۹) کتاب العروض (۱۰) شرح ابیات المفصل (۱۱) بغیۃ الصیدان (۱۲) وشرح القلادۃ السمطیۃ فی توشیح الدریدیہ وغیرہ، امام موصوف نے ۶۵۰ھ میں بغداد میں وفات پائی۔

لاہور کی یہ تمام تر علمی رونق دہلی کے دار السلطنت ہو جانے کے بعد رفتہ رفتہ منتقل ہو کر دہلی سمٹ آئی اور حکومتوں میں متعدد انقلابات کے باوجود اس کے علم و دانش کی محفلیں عرصۂ دراز تک نہ صرف سجی رہیں بلکہ ان کی دلکشی میں روز افزوں ترقی ہوتی رہی۔

سلطنت دہلی کی بنیاد ایسے زمانہ میں رکھی گئی تھی جبکہ تاتاریوں نے وسط ایشیاء کو اپنے

---

(۱) رجال السند والہند ص ۲۳۵۔

(۲) الجواہر المضیہ ج ۱ ص ۲۰۱، الفوائد البہیۃ ص ۵۳، نزہۃ الخواطر ج ۱ ص ۱۰۵۔

پیہم قیامت خیز حملوں سے تہ وبالا کر کے وہاں سیاسی، سماجی اور علمی نظام کو درہم برہم کر دیا تھا اور علماء وفضلاء کی کثیر تعداد اپنے آبائی اوطان کو چھوڑنے پر مجبور ہو گئی تھی۔ بخارا و بغداد کے یہ ٹوٹے ہوئے تارے ہندوستان کی فضائے علم پر آفتاب وماہتاب بن کر چمکے اور دہلی کو اپنے آغاز سفر ہی میں علماء مشائخ کی ایک ایسی جماعت میسر آ گئی جس نے اپنی نواسنجیوں سے پورے ملک کو پُر شور کر دیا۔ سلطان ہند شمس الدین التمش علماء ومشائخ کی صحبت کا بڑا دلدادہ اور گرویدہ تھا جب کسی بزرگ یا عالم کی آمد کی خبر سنتا تو میلوں تک استقبال کیلئے جاتا اور عزت واحترام سے محل شاہی میں مہمان رکھتا(١) سلطان التمش کی اس علم دوستی وعلماء نوازی کا یہ اثر ہوا کہ صدہا علماء، مشائخ اور ادیب اس ملک میں آ کر بس گئے۔

اس عہد میں اپنی علمی وروحانی سرگرمیوں سے جن علماء ومشائخ نے ہندوستان کے وقار کو بلند کیا ان میں سے چند بزرگوں کے نام یہ ہیں۔

(١) شیخ قطب الدین(٢) بختیار کاکی اوشیؒ (٢) قاضی حمید الدین ناگوری (٣) شیخ بدرالدین اسحاق (۴) شیخ جلال الدین تبریزی (۵) شیخ سید نورالدین مبارک غزنوی (٦) قاضی سعید الدین کردی (٧) شیخ نظام الدین ابوالموئد (٨) شیخ بدرالدین غزنوی (٩) نظام الملک کمال الدین جنیدی (١٠) شیخ الاسلام نجیب الدین۔

قاضی حمید الدین ناگوریؒ صاحب تصانیف بزرگ تھے مطالعہ نہایت وسیع بالخصوص تصوف میں بڑی گہری نظر رکھتے تھے۔ رسالہ عشقیہ، طوالع الشموس، لوائح اور شرح اسماء حسنیٰ فن تصوف میں آپ کی تصنیفی یادگار ہیں۔ اس عہد میں دینی درسگاہیں اور روحانی خانقاہیں بھی کثرت سے قائم ہوئیں جن میں مدرسہ معزی مدرسہ ناصری تو حکومت کے زیر انتظام تھے ان کے علاوہ علماء انفرادی طور پر اپنے اپنے مقامات پر تدریس وتعلیم میں سرگرم رہتے تھے۔ مشائخ چشت کی خانقاہوں کے ساتھ مدارس کا ہونا گویا لازمی تھا۔ البتہ سہروردی سلسلہ کی خانقاہوں سے ملحق مدارس کا پتہ نہیں چلتا۔ لیکن اس خانوادہ کے مشہور

---

(١) فتوح السلاطین ص ١٠٩-١١٠۔

(٢) ان بزرگوں کے حالات کے لئے اخبار الاخیار مصنفہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی دیکھئے۔

بزرگ شیخ بہاء الدین(۱) زکریا ملتانی کو تعلیم و تدریس سے نہایت شغف تھا۔ اور انھوں نے اپنی خانقاہ سے ملحق ایک مدرسہ بھی جاری کر رکھا تھا جس میں وہ خود بھی درس دیتے تھے اور دیگر معلّمین کی بھی خاطر خواہ مشاہرہ پر خدمات حاصل کر رکھی تھیں۔

مسجدوں سے ملحق تو مدارس کی اس زمانہ میں نہایت کثرت تھی اور ہر ہر مسجد میں کسی نہ کسی عالم کا درس ضرور ہوتا تھا۔

عہد بلبن میں علومِ اسلامی

ہم گذشتہ صفحات میں ذکر کر آئے ہیں کہ جس زمانہ میں سلطنت دہلی کی بنیاد پڑی اس وقت اکثر بلاد اسلامیہ تاتاریوں کے تاخت و تاراج کی آماج گاہ بنے ہوئے تھے۔ عہد بلبن میں ہلاکو خاں نے اس آگ وخون کے ہنگامہ کو مزید ہوا دی۔ جس نے بغداد کے علمی، سیاسی، معاشرتی نظام کو درہم برہم کر کے رکھ دیا اس لئے اس علاقہ کے باقی ماندہ علماء نے ناچار وہاں سے کوچ کر کے دارالامان ہندوستان کی راہ لی جن کی سلطان بلبن نے بقدر مراتب دل کھول کر عزت افزائی کی۔ اس طرح ہندوستان کی علمی زندگی میں تازہ رُوح دوڑ گئی اور دہلی رشک بغداد و قرطبہ بن گئی۔

اس دور کے مشاہیر علماء ومشائخ میں سے بعض حضرات یہ ہیں۔

(۱) شیخ شمس الدین خوارزمی استاذ حضرت نظام الدین اولیاءؒ (۲) شیخ برہان الدین بلخی (۳) شیخ برہان الدین بزاز (۴) شیخ نجم الدین دمشقی (۵) قاضی رکن الدین سامانہ (۶) شیخ سراج الدین سجزی (۷) شیخ شرف الدین دلوالجی (۸) قاضی ظہیر الدین (۹) قاضی رفیع الدین گازرونی(۲)

عہد علائی میں علمی ترقی

سلطان علاء الدین خلجی خود تو علم سے بے بہرہ تھا مگر اس کا عہد علم وعلماء کی کثرت کی

---

(۱) نزہۃ الخواطر ج ا ص ۱۲۰۔ (۲) تفصیل کیلئے دیکھئے تاریخ فیروز شاہی ص ۶۸ اور اس سے آگے۔

بناء پر علومِ اسلامی کا عہد زرّیں کہلانے کا... مستحق ہے۔ بقول معاصر مورخ ضیاء الدین برنی دارالملک دہلی میں اس وقت چھیالیس علماء ایسے تھے جن کی نظیر دنیا میں ملنی مشکل تھی اوران میں بعض علماء تو امام غزالی وامام رازی کے ہم پایہ وہم مرتبہ تھے۔

اس دور کے اہم علماء ومشائخ میں سے چند کے نام یہ ہیں۔

(۱) شیخ ضیاء الدین سنامی صاحب نصاب الاحتساب (۲) شیخ ظہیرالدین بھکری (۳) شیخ فریدالدین شافعی (۳) سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاء بدایونی (۴) قاضی مغیث الدین بیانوی (۵) شیخ شمس الدین یحییٰ اودھی (۶) شیخ حمیدالدین مخلص (۷) شیخ کمال الدین کوئلی (۸) شیخ علاء الدین صدرالشریعۃ (۹) شیخ فخرالدین ہانسوی (۱۰) شیخ نصیرالدین کڑوی وغیرہ۔

عہد تغلق کے علماء اور مدارس

اس دور میں اگر چہ دور خلجی جیسی علمی شان وشوکت باقی نہیں رہی پھر بھی محمد بن تغلق کی علمی دلچسپیوں کے باعث یہ ایک یادگار عہد تھا دیگر شہروں کے علاوہ صرف دہلی میں اس وقت بقول بعض عرب سیاح ایک ہزار مدارس تھے جن میں فیروز شاہ کا مدرسہ اسلامی علوم کی اعلیٰ ترین درسگاہوں میں تھا جسے دیکھنے کے لئے دور دور سے لوگ آیا کرتے تھے اس کے ساتھ مشہور علماء ومشائخ کی ایک خاصی تعداد دارالملک میں موجود تھی جن کی علمی سرگرمیوں نے اس دور کو بڑی رونق دی تھی مثلاً: (۱) شیخ معین الدین عمرانی انھوں نے تدریس کے علاوہ کنز الدقائق حسامی اور مفتاح پر حواشی لکھے تھے۔ (۲) شیخ علاؤالدین اندرپتی (۳) شیخ ضیاء الدین نخشبی جن کی حسب ذیل تصانیف ان کی وسعتِ معلومات پر شہادت دے رہی ہیں۔

(۱) چہل ناموس (۲) سلک السلوک (۳) گلریز (۴) لذات النساء (۵) شرح دُعاے ثریانی (۶) طوطی نامہ (۴) شیخ عبدالمقتدر دہلوی صاحب قصیدہ لامیہ (۵) مولانا خواجگی (۶) شیخ احمد تھانیسری جنھیں حملۂ تیمور کے وقت گرفتار کر کے تیمور کے دربار میں

پیش کیا گیا وہاں شیخ الاسلام نبیرۂ شیخ برہان الدین مرغینانی صاحب ہدایہ سے کسی بات پر تیز کلامی ہوگئی اور شیخ احمد تھانیسری نے اپنے شاگردوں کو حکم دیا کہ وہ صاحب ہدایہ کی غلطیوں کی نشاندہی کریں۔

عہد بلبن وعلائی کی طرح اس عہد میں بھی ممالک اسلامی سے بکثرت علماء وشعراء آئے اور اپنی علمی کاوشوں اور ادبی سرگرمیوں سے اس عہد کو خوب رونق بخشی۔

الغرض آسمانِ علم کا وہ ہلال جو سندھ وملتان کے افق سے طلوع ہوا تھا اور آٹھویں صدی ہجری میں دہلی کے مطلع سے بدر کامل بن کر پوری سرزمین ہند کو اپنی ضیاء پاشیوں سے منور کردیا تھا یکایک گہن میں آ گیا۔ محمود شاہ کے عہد میں تیمور لنگ قیامتِ صغریٰ بن کر دہلی پر آنازل ہوا اور تین دن تک اس دار العلم والامن کے کوچۂ وبازار میں قتل وغارت گری کا ہنگامہ اس طرح برپا کیا کہ علم وفضل کی ساری محفلیں اجڑ گئیں علماء وفضلاء دہلی چھوڑ کر دوسرے شہروں میں جاکر پناہ گزیں ہوگئے اور باقی ماندہ حضرات اپنی جانوں کے خوف سے روپوش ہوگئے کسی نے سچ کہا ہے۔

خدا شرے برانگیزد کہ خیر مادراں باشد

جون پور میں علمی نشأۃ

دہلی کے یہ ٹوٹے ہوئے تارے جون پور کے مطلع علم سے آفتاب وماہتاب بن کر چمکے یعنی عین انھیں حالات میں جب کہ دہلی کے علمی، تمدنی اور سیاسی گلستاں میں بادسموم کے جھونکے چل رہے تھے۔ دیار پورب کے ایک شہر جونپور میں علم ودانش اور تہذیب وثقافت کے چمنستان میں بہاریں انگڑائیاں لے رہی تھیں۔ تاجدار سلطنت شرقیہ سلطان ابراہیم شاہ شرقی کے عدل گستری، علم پروری اور علماء نوازی سے جونپور مرصع ارباب فضل وکمال بنا ہوا تھا۔ دہلی کے علماء وفضلاء تیمور کی ستیزہ کاریوں سے مضطرب ہوکر جونپور کی جانب چلے آرہے تھے۔ ان میں قاضی شہاب الدین دولت آبادی صاحب تفسیر بحر مواج وغیرہ قاضی نظام الدین مرتب فتاویٰ ابراہیم شاہیہ، شیخ ابوالفتح نبیرۂ شیخ عبد المقتدر دہلوی، قاضی نصیر الدین

گنبدی، شیخ ابوالجلال اسماعیل عباسی، شیخ عیسیٰ بن تاج وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

جونپور کا یہ علمی دور محمد شاہ کے آغاز جلوس ۱۱۳۱ھ تک قائم رہا۔ تا آنکہ(۱) برہان الملک سعادت علی خاں نیشاپوری شیعی نے اپنے زمانہ صوبہ داری میں یہاں کے مدارس اور علماء وفضلاء کی جاگیریں ضبط کرلیں اور اس علمی گلستان کو ویران کردیا۔

اس طویل عرصہ میں اس سرزمین سے ایسے ایسے علماء ومشائخ ابھرے جن کے کارناموں پر ملتِ اسلامیہ آج بھی مفتخر ہے۔ ان باکمال بزرگوں میں مذکورۃ الصدر حضرات کے علاوہ (۱) شیخ محمد بن عیسیٰ جونپوری (۲) ملاّ عبدالملک جونپوری (۳) ملا الہ داد جونپوری صاحب شرح ہدایہ و بیضاوی وغیرہ (۴) سید محمد جونپوری امام فرقۂ مہدویہ (۵) قاضی خاں ظفرآبادی مرشد شیخ عبدالعزیز چشتی جونپوری دہلوی (۶) ملامحمود جونپوری صاحب شمس بازغہ وغیرہ (۷) دیوان محمد رشید جون پوری صاحب مناظرہ رشیدیہ وغیرہ (۸) شیخ بہاء الدین چشتی محدث جون پوری (۹) شیخ حامد عباسی چریاکوٹی ازمرتبین فتاویٰ عالمگیری (۱۰) قاضی محی الدین جون پوری ازمرتبین فتاویٰ عالمگیری وغیرہ اپنے اپنے دور میں سیکڑوں علماء ومشائخ تھے جو علوم ظاہری و باطنی دونوں میں عبقریت کا درجہ رکھتے تھے ان حضرات کے وجود باوجود سے اس دیار میں علوم اسلامی کی خوب ترویج وترقی ہوئی۔

پورب کی طرح ساحلی علاقوں میں بھی اس وقت علمی محفلیں سجی ہوئی تھیں اور علماء ومحدثین پورے اطمینان وسکون سے علمی مشاغل میں مصروف تھے۔ بغرض اختصار تفصیل کو نظرانداز کیا جارہا ہے۔

فتنۂ تیموری کے بعد تقریباً نصف صدی تک حکومت دہلی اختلال وانتشار کا شکار رہی بالآخر ۸۵۵ھ میں بہلول لودھی نے دہلی کے تخت وتاج پر قبضہ کرکے اپنے عزم وثبات اور تدبیر وفراست سے دہلی کی مردہ سلطنت میں ازسرنو جان ڈالدی اور اس کے جانشین سکندر لودھی کے عہد میں قریب قریب وہی استحکام پیدا ہوگیا جو عہد تغلق میں تھا اور دہلی پھر سے علماء، فضلاء، مشائخ، صوفیاء اور شعراء کا مرکز بن گئی۔

---

(۱) فائز مآثر الکرام ج ۱ ص ۲۲۲۔

ملا بدایونی عہد سکندری کے مقتدر علماء کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> شیخ عبداللہ اور شیخ عزیز اللہ بڑے پایہ کے عالم تھے ملتان سے ترک سکونت کر کے دہلی آئے اور علوم معقول کو رواج دیا۔ شیخ عزیز اللہ کے علمی استحضار کا یہ عالم تھا کہ مشکل سے مشکل ترین کتابوں کا درس زبانی دیا کرتے تھے انھیں کے تلامذہ میں میاں قاسم سنبھلی تھے ان دونوں بھائیوں کے علاوہ (۱) شیخ عبدالرزاق جھنجھانوی (۲) مولانا سماء الدین ملتانی نبیرہ مخدوم جہانیاں جہاں گشت (۳) شیخ فتح اللہ اودھی (۴) سید جلال الدین بدایونی (۵) مولانا شعیب دہلوی (۶) میاں حامد جمالی (۷) شیخ رزق اللہ دہلوی (۸) شیخ حسن طاہر دہلوی وغیرہ اس عہد کے مشاہیر علماء و مشائخ میں تھے۔

آخرالذکر بزرگ کو سلطان سکندر نے خود جونپور سے بطور خاص دعوت دے کر بلایا تھا۔

شیخ سید رفیع الدین شیرازی بھی اسی عہد کے نامور محدث تھے جنھوں نے معقولات براہ راست محقق دوانی سے اور حدیث حافظ سخاوی سے حاصل کی تھی۔ سلطان سکندر نے انھیں گجرات سے دہلی بلایا پھر یہاں سے آگرہ منتقل ہوگئے جہاں تادمِ آخر علومِ اسلامیہ کی تعلیم و تدریس میں منہمک رہے۔ شیخ ابوالفتح محدث تھانیسری آپ کے تلمیذ رشید اور جانشین تھے۔

عہد مغلیہ میں علمی سرگرمیاں

۹۳۲ھ میں بابر نے پانی پت کے میدان میں ابراہیم شاہ لودھی کو شکست دے کر مغل سلطنت کی بنیاد رکھی بابر خود ترکی اور فارسی زبان کا فاضل، ادیب اور شاعر تھا تزک بابری اس کے تبحر علمی کی یادگار ہے۔ یہ علماء و فضلاء کی بڑی قدر کرتا تھا اور ہمیشہ اپنے ساتھ اہل علم کی ایک خاص تعداد رکھتا تھا اس عہد کے مشاہیر علماء میں (۱) شیخ الاسلام سیف الدین نبیرہ علامہ سعدالدین تفتازانی، (۲) شیخ حسن متکلم (۳) میر جمال الدین محدث (۴) شیخ عطاء اللہ مشہدی (۵) مولانا شہاب الدین معمائی (۶) شیخ ابوالواجد فارغی (۷) شیخ

زین الدین وغیرہ خصوصی امتیاز کے مالک تھے۔

بابر کے بعد اس کا بیٹا ہمایوں تخت نشین ہوا یہ بھی بڑا علم دوست اور علماء نواز تھا علم ہیئت اور ہندسہ سے اُسے خاص شغف تھا اس کے عہد کے دو نئے مدرسے نہایت مشہور تھے ایک شیخ زین الدین کا مدرسہ آگرہ میں اور دوسرا دہلی کا مدرسہ جس میں شیخ حسن تبریزی مدرس تھے — ہمایوں کی وفات کے بعد ۹۶۲ھ میں اس کا بیٹا جلال الدین اکبر سریر آرائے سلطنت ہوا۔ یہ خود تو پڑھا لکھا نہیں تھا لیکن اپنے آباء واجداد کی طرح علوم وفنون سے کافی دلچسپی رکھتا تھا۔ مگر اس دلچسپی میں علوم دینیہ کا حصہ کمتر ہی تھا۔ اس عہد کے علماء میں (۱) شیخ عبد الحق محدث دہلوی، (۲) شیخ احمد سرہندی الملقب مجدّد الف ثانی، شیخ عبد النبی گنگوہی (۳) ملا عبد القادر بدایونی صاحب منتخب التواریخ (۴) میر فتح اللہ شیرازی (۵) مخدوم الملک ملا عبد اللہ سلطانپوری (۶) ملا نظام الدین بخشی (۷) ابو الفتح گیلانی (۸) شاہ رفیع الدین رنجوی (۹) امری مرتضٰی شریفی (۱۰) شیخ مبارک ناگوری (۱۱) ابو الفضل (۱۲) ابو الفیض فیضی وغیرہ ہر قسم کے علماء وفضلاء تھے جن میں سے اگر ابو الفضل، فیضی وغیرہ نے اکبر کے ذہن ومزاج کو بگاڑ کر دین محمدی کے مقابلہ میں دین الٰہی کے نام پر الحاد وزندقہ پر آمادہ کیا تو اوّل الذکر دو بزرگوں حضرت مجدّد الف ثانی اور شیخ محدث دہلوی نے اپنی مسلسل علمی وعملی کاوشوں سے اس مذہب جدید کی راہ میں توحید خالص اور دین قیم کی ایسی مضبوط ومستحکم دیوار کھڑی کر دی کہ دین الٰہی اکبر کے بنائے ہوئے گھروندے ہی میں محبوس ہو کر دم توڑ گیا۔

شیخ محدث دہلوی کا یہ کارنامہ بھی یادگار رہے گا کہ انھوں نے علم حدیث کو جو شمالی ہند میں ایک عرصہ سے مضمحل ہو گیا تھا نئی زندگی عطاء کی اور علم حدیث کا مرکز ثقل گجرات سے منتقل ہو کر پھر دہلی آ گیا۔

شیخ دہلوی نے حدیث کی تدریس کے ساتھ تفسیر، تجوید، عقائد، فقہ، تصوف، اخلاق، تاریخ، سیر وغیرہ موضوعات پر تقریباً، پانچ درجن کتابیں بھی تصنیف کیں۔

دور اکبری کے ایک عظیم محدث شیخ محمد بن طاہر پٹنی بھی ہیں۔ جنھوں نے گجرات میں بیٹھ کر حدیث نبوی کی بزم آراستہ کی اور درس حدیث کے ساتھ، مجمع البحار، مغنی، تذکرۃ

الموضوعات، قانون الموضوعات جیسی بلند پایہ کتابیں بھی تصنیف کیں اکبر کے انتقال کے بعد ۱۰۱۴ھ میں جہانگیر تخت نشین ہوا، اس نے اپنے عہد حکومت میں دینی درسگاہوں کی جانب بطور خاص توجہ کی جو اکبر کی بے دینی اور بے التفاتی سے کس مپرسی کے عالم میں تھیں۔ جہاں گیر نے تعلیمی ترقی کے لئے یہ حکم جاری کیا کہ اگر کوئی لامعلوم تاجر کسی جگہ انتقال کر جائے یا شہر میں کوئی لاوارث صاحب جائداد فوت ہو جائے تو اس کے اموال خزانہ شاہی میں داخل کرنے کے بجائے مدارس ومساجد کے مصارف وتعمیر میں خرچ کئے جائیں۔ جہانگیر کی اس توجہ سے بہت سے ویران مدرسے دوبارہ آباد ہو گئے عہد جہانگیری کے مشاہیر علماء یہ ہیں۔

(۱) شیخ عبدالحق محدث دہلوی (۲) شیخ مجدد الف ثانی احمد سرہندی (۳) میر سید طیب بلگرامی (۴) شیخ محمد غوثی صاحب گلزار ابرار (۵) شیخ نورالحق محدث بن شیخ عبدالحق محدث دہلوی (۶-۷) شیخ محمد سعید سرہندی وشیخ خواجہ محمد معصوم سرہندی ابناء شیخ مجدّد الف ثانی (۸) شاہ ابوالمعالی۔

شاہجہاں کے زمانہ میں علومِ اسلامیہ کی مزید اشاعت ہوئی۔ دہلی کے علاوہ دیگر شہروں میں بھی علمی مراکز قائم ہوئے جن میں جونپور، لاہور اور احمد آباد میں خصوصی طور پر علمی چرچا تھا۔ ہندوستان سے باہر ہرات و بدخشاں وغیرہ سے طلبہ یہاں تعلیم وتحصیل کی غرض سے آتے تھے۔ دورِ شاہجہانی کے علماء میں (۱) ملاّ یوسف لاہوری (۲) ملاّ عبداللطیف (۳) ملا عبدالسلام دیوی (۴) ملاّ کمال کشمیری (۵) ملا عبدالحکیم سیالکوٹی (۶) ملا محمد ماہ دیوگامی (۷) ملا محمد ارشد جونپوری وغیرہ کو علمی حلقوں میں بڑی شہرت حاصل تھی۔ خود دہلی میں شیخ عبدالحق کے فرزند ارجمند شیخ نورالحق **حدثنا وا خبرنا** کی صدائے جاں نواز سے دہلی کو حیاتِ نو عطا کر رہے تھے۔

شاہجہاں کے بعد اورنگ زیب عالمگیر نے اورنگ شاہی کو زینت بخشی یہ خود ایک متبحر عالم محقق، فقیہ اور صاحب طرز ادیب وانشاء پرداز تھے، انھوں نے مرکزی شہروں کے علاوہ چھوٹے چھوٹے قصبات وقریات میں بھی دینی درسگاہیں قائم کیں ان کے معلّمین

کے وظیفے جاری کئے، جو علماء ذاتی طور پر تدریس وتعلیم کا کام انجام دیتے تھے انھیں اور جو مدرسین سرکاری مدارس سے وابستہ تھے غرض ہر ایک کو بڑی بڑی جاگیریں عطا کر کے فکر معاش سے فارغ البال کر دیا۔ تقریباً پچاس صاحب نظر علماء کی ایک اکیڈمی قائم کر کے فتاویٰ عالمگیری کو مرتب کرایا۔ یہ عالمگیر کا ایسا عظیم فقہی کارنامہ ہے، جسے رہتی دنیا تک یاد رکھا جائے گا اس عظیم کتاب کی ترتیب وتدوین میں جو علماء عظام شریک تھے ان میں سے جن حضرات کے نام مجھے معلوم ہو سکے ہیں وہ یہ ہیں:

مرتبین فتاویٰ عالمگیری

(۱) شیخ نظام الدین برہان پوری صدر مجلس
(۲) قاضی محمد حسین جونپوری محتسب
(۳) شیخ علی اکبر حسینی بن سعد اللہ خاں مرتب
(۴) شیخ حامد چریا کوٹی مرتب
(۵) مفتی محمد اکرام حنفی لاہوری مرتب
(۶) شیخ رضی الدین بھاگلپوری مرتب
(۷) شیخ عبد الرحیم دہلوی مرتب
(۸) مفتی وجیہ الدین گوپامئوی مرتب
(۹) شیخ احمد بن منصور گوپامئوی مرتب
(۱۰) ابو البرکات بن حسام الدین دہلوی //
(۱۱) مفتی محمد جمیل بن عبد الجلیل جونپوری //
(۱۲) ملا ابو الواعظ بن قاضی صدر الدین //
(۱۳) شیخ ابو الخیر ٹھٹھوی //
(۱۴) شیخ نظام الدین بن نور محمد ٹھٹھوی //
(۱۵) شیخ محمد سعید بن قطب الدین سہالوی //
(۱۶) مفتی عبد الصمد جونپوری //
(۱۷) مفتی جلال الدین مچھلی شہری //
(۱۸) قاضی عصمت اللہ بن عبد القادر لکھنوی //
(۱۹) قاضی محمد دولت بن یعقوب فتح پوری //
(۲۰) شیخ محمد غوث کاکوروی مرتب
(۲۱) شیخ سید عبد الفتاح بن ہاشم صمدی مرتب
(۲۲) شیخ سید محمد قنوجی استاذ عالمگیر مرتب
(۲۳) شیخ محمد شفیع //
(۲۴) شیخ محمد فائق //
(۲۵) شیخ وجیہ الرب //
(۲۶) علامہ ابو الفرج معروف بہ سید معدن //
(۲۷) شیخ غلام محمد قاضی القضاۃ لاہور //
(۲۸) قاضی سید عنایت اللہ مونگیری //
(۲۹) شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر(۱) //

---

(۱) الثقافۃ الاسلامیہ تکملہ تذکرۃ علماء ہند، بزم تیموریہ اور ظفر المحصلین وغیرہ کی مدد سے یہ فہرست تیار کی گئی ہے۔

مرتبین فتاویٰ عالمگیری کے علاوہ اس زمانہ کے علماء میں (۱) شیخ غلام نقشبند گھوسوی لکھنوی (۲) شیخ ملا احمد معروف بہ ملا جیون انبیٹھوی (۳) ملا اصغر قنوی (۴) ملا زاہد ہروی (۵) شیخ حاجی صبغۃ اللہ خیر آبادی (۶) شیخ عیسیٰ محدث گوپامئوی (۷) شیخ قطب الدین سہالوی (۸) شیخ لطیف سلطان پوری (۹) قاضی محبّ اللہ بہاری (۱۰) حافظ امان اللہ بنارسی (۱۱) قاضی عبدالباقی جونپوری (۱۲) شیخ کلیم اللہ جہاں آبادی وغیرہ نے کافی شہرت ومقبولیت پائی اوران کا علمی فیض خوب عام ہوا۔

عالمگیر کی وفات کے بعد ۱۱۱۸ھ میں شاہ عالم تخت وتاج کا مالک ہوا، یہ بھی اپنے والد کی طرح عالم وفاضل اور علم دوست حکمراں تھا اسی کے زمانہ میں میر غازی الدین نے دارالسلطنت دہلی میں ایک نیا مدرسہ قائم کیا۔ سید احمد محدث ہروی، مولانا مملوک علی نانوتوی، مولانا ضیاء الدین وغیرہ اس مدرسہ کے نامور اساتذہ میں سے تھے حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ، منشی ذکاء اللہ، ڈپٹی نذیر احمد جیسے علماء روزگار و ماہرین تعلیم اس کے طالب علم رہ چکے ہیں۔

بعد میں اس مدرسہ کو انگریزوں نے دہلی کالج میں تبدیل کر دیا اور پھر ۱۸۷۷ء/ ۱۲۹۴ھ میں اسے بھی ختم کر دیا(۱) عالمگیر کے بعد اگرچہ مغل شاہزادے تقریباً ڈیڑھ صدی تک دلی کے تخت وتاج پر قابض رہے۔ لیکن انگریزوں کی پیہم ریشہ دوانیوں اور سیاسی چالبازیوں کی بناء پر کاروبار سلطنت میں روز بروز ابتری ہی آتی گئی حتیٰ کہ نام کے علاوہ حکومت میں ان کا کوئی عمل دخل باقی نہیں رہا جس کا اثر تعلیمی نظام پر بھی پڑا اور دلی کے مدارس کی رونق مدھم پڑ گئی اور اکثر درسگاہیں بند ہو گئیں۔

شاہ ولی اللہ اوران کی اولاد کا کارنامہ

لیکن اس دور زوال میں بعہد محمد شاہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اسلامی علوم وثقافت کی گرتی ہوئی ساکھ کو برقرار رکھنے کیلئے ہمہ تن مصروف تھے۔ چنانچہ ایک طرف تو

---

(۱) دہلی کے قدیم مدارس ومدرس ص ۱۲۱۔

حجۃ اللہ جیسی انقلاب آفریں کتاب تصنیف کر کے علماء کو ان کے فرائض منصبی کی جانب متوجہ کیا اور اصلاح حال کے نقشے مرتب کئے۔ دوسری جانب اپنے والد شیخ عبدالرحیم کے مدرسہ میں درس قرآن وحدیث کی مجلس آراستہ کی، اور دیکھتے دیکھتے ایک بار پھر اُجڑی ہوئی دلی علم حدیث کا ایک عظیم مرکز بن گئی۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی متوفی ۱۰۵۲ھ کے بعد یہ حضرت شاہ صاحب ہی کا کارنامہ ہے کہ ہندوستان میں فن حدیث پھر سے زندہ ہوگیا۔ درسگاہِ ولی اللّٰہی سے چاروں صاحبزادے حضرت شاہ عبدالعزیز، حضرت شاہ رفیع الدین، حضرت شاہ عبدالقادر اور حضرت شاہ عبدالغنی کے علاوہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی، شاہ محمد عاشق پھلتی، اخوں محمد سعید، خواجہ محمد امین، علامہ سید مرتضیٰ بلگرامی صاحب تاج العروس شرح قاموس، مولانا رفیع الدین مرادآبادی وغیرہ ایسے ایسے اساطین علم پیدا ہوئے جنھوں نے پورے ہندوستان کو قال اللہ وقال الرسول کے آوازہ سے پرشور بنادیا۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادے حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے مسند درس کو سنبھالا اور اپنے والد بزرگوار کے لگائے ہوئے گلستانِ علم کی اس خوش اسلوبی سے آبیاری ونگہداشت کی کہ اسے سدابہار بنادیا۔

اسی عہد زوال میں ملا نظام الدین سہالوی نے فرنگی محل لکھنؤ میں بیٹھ کر اس نصاب تعلیم کو مرتب کیا جو علمی دنیا میں درس نظامی کے نام سے مشہور ہے اور مختصر سے حذف و اضافہ کے ساتھ آج بھی عربی درسگاہوں میں رائج ہے۔ ملا نظام الدین کی درسگاہ سے بھی سیکڑوں علماء وفضلاء پیدا ہوئے جن میں بحرالعلوم عبدالعلی صاحب رسائل الارکان، مولانا عبدالحلیم، ملا حسن، مفتی محمد یوسف، مولانا عبدالحئی اور ان کے تلامذہ میں علامہ ظہیر الحسن شوق نیموی صاحب آثار السنن، مولانا محمد حسن اسرائیلی صاحب تنسیق النظام شرح مسند امام اعظم، مولانا حفیظ اللہ اعظمی وغیرہ اپنے اپنے وقتوں میں علم وفن کے مسلم استاذ تھے۔

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کے وصال کے بعد ان کے نواسے حضرت شاہ اسحاق محدث دہلوی نے مسند تدریس کو سنبھالا اللہ تعالیٰ نے انھیں بھی اپنے اسلاف کرام کی طرح خوب مقبولیت عطا کی اور اکابر علماء ان کے حلقہ درس سے نکلے جن میں مولانا شاہ عبدالغنی

مجددی، مولانا احمد علی محدث سہارنپوری، نواب صدرالدین خاں دہلوی، نواب قطب الدین خاں دہلوی، شیخ محمد محدث تھانوی، مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی، مولانا قاری عبدالرحمٰن پانی پتی، مولانا علی عالم مرادآبادی، مولانا سید میاں نذیر حسین محدث بہاری دہلوی بڑی شہرت ومقبولیت کے مالک ہوئے۔ آخرالذکر بزرگ کے حلقۂ درس سے ہندوستان میں مسلک عدم تقلید کی ترویج ہوئی اوراس مسلک کے بڑے بڑے علماء پیدا ہوئے جن میں نواب صدیق حسن خاں قنوجی بھوپالی، مولانا عبداللہ اعظمی غازی پوری، مولانا شمس الحق ڈیانوی صاحب عون المعبود شرح ابی داوٗد، مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری صاحب تحفۃ الاحوذی، مولانا عبدالمنان وزیرآبادی وغیرہ کبار علماء اہل حدیث میں شمار ہوتے ہیں۔

شاہ اسحاق وشاہ عبدالغنی کی خدمات

حضرت شاہ اسحاق صاحب کی ہجرت مکہ معظّمہ کے بعد حضرت شاہ عبدالغنی مجددی ان کے جانشین ہوئے۔ شیخ مجددی کے درس کو بھی بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت شاہ اسحاق مہاجر مکی اور حضرت شاہ عبدالغنی مجددی مہاجر مدنی کو یہ شرف عظیم عطا فرمایا ہے کہ تمام دنیائے اسلام ان کی زیر بار احسان ہے اورآج جہاں بھی کوئی قال رسول اللہ کہتا ہے ان دونوں بزرگوں کا واسطہ اس میں ضرور ہوتا ہے۔

حضرت شاہ عبدالغنی صاحب کے تلامذہ کی تعداد حدّ شمار سے باہر ہے لیکن ان میں دو صاحب سلسلہ بزرگوں کا فیض سب سے زیادہ عام ہوا۔

حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم اور قطب الارشاد مولانا رشید احمد گنگوہی کا تاریخی کارنامہ

ان میں ایک حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی ہیں اور دوسرے قطب ارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی۔

ان ہردو بزرگوں کا یہ عظیم کارنامہ ہے کہ انھوں نے دیوبند کے ایک چھوٹے سے

مکتب کی سرپرستی ونگرانی فرما کر اسے ایک عظیم علمی تحریک کی حیثیت عطا کردی۔ جسے آج دنیا دارالعلوم دیوبند کے نام سے جانتی پہچانتی ہے۔ دارالعلوم دیوبند کی آغوش تربیت میں پروان چڑھ کر اب تک دس ہزار سے زائد علماء وفضلاء اطراف عالم میں پھیل چکے ہیں۔ جن میں بہت سے افراد بجائے خود ایک مدرسہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پھر دارالعلوم کا یہ فیض ہندوستان تک ہی محدود نہیں رہا بلکہ اس کے ابر گہر بار نے برما، ملیشیا، انڈونیشیا، کابل، بخارا، ایران، ترکستان، افریقہ وغیرہ اور خود علومِ اسلامی کے منبع ومرکز حجاز کو بھی سیراب کیا، فضلاء دارالعلوم کی اس کثیر تعداد میں سے چند حضرات کے نام بطور نمونہ درج ذیل ہیں جس سے دارالعلوم کی ہمہ گیر خدمات کا اندازہ ہوگا۔

(۱) حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی (۲) حضرت مولانا احمد حسن امروہوی (۳) حضرت مولانا فخر الحسن گنگوہی (۴) حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی (۵) حضرت مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب چاندپوری (۶) حضرت مولانا سید انور شاہ محدث کشمیری (۷) حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی فیض آبادی (۸) حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ شاہجہاں پوری دہلوی، (۹) حضرت مولانا عبید اللہ سندھی (۱۰) حضرت مولانا سید اصغر حسین محدث دیوبندی (۱۱) حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی (۱۲) حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن دیوبندی (۱۳) مفسر قرآن مولانا شبیر احمد عثمانی (۱۴) شیخ الادب مولانا اعزاز علی امروہوی (۱۵) مولانا فخر الدین محدث مرادآبادی (۱۶) مولانا سید بدر عالم میرٹھی (۱۷) مولانا محمد ادریس کاندھلوی (۱۸) مولانا سید محمد یوسف بنوری (۱۹) مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی (۲۰) مولانا عبد العزیز محدث پنجابی (۲۱) علامہ محمد ابراہیم بلیاوی (۲۲) مولانا حبیب الرحمٰن محدث اعظمی (۲۳) مولانا محمد منظور نعمانی (۲۴) شمس الحق افغانی وغیرہ۔ جنھوں نے اپنی علمی و دینی سرگرمیوں اور گرانقدر تصنیفات کے ذریعہ برصغیر کو علومِ اسلامیہ کا ایک سدا بہار گلستاں بنادیا اور دارالعلوم کے نقش قدم پر آج سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں درسگاہیں علم دین کی خدمت میں مصروف ہیں۔ جنھیں درحقیقت بالواسطہ دارالعلوم ہی کا فیض کہا جائے گا۔

ہندوستان میں دو علمی تحریکیں اور ان کے اثرات

ہندوستان کی علمی تاریخ سے جو لوگ واقف ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ مسلمانوں کے دور اقتدار میں تعلیم و تدریس کا تمام تر انحصار مسلم حکمرانوں، امراء اور نوابین کی علم پروری، علماء نوازی اور داد و دہش پر تھا، ہر شہر اور قصبات میں سلاطین اور امراء کی جانب سے مدرسے قائم تھے جن کے مصارف کی مکمل ذمہ داری شاہی خزانے پر ہوتی تھی، چنانچہ اجمیر، دہلی، پنجاب، آگرہ، اودھ، بنگال، بہار، دکن، مالوہ، ملتان، کشمیر، گجرات وغیرہ میں اس قسم کی ہزاروں درسگاہیں قائم تھیں، ان باقاعدہ درسگاہوں کے علاوہ علماء شخصی طور پر بھی اپنے اپنے مستقر پر تعلیم و تعلّم کی خدمات انجام دیا کرتے تھے، اور ان علماء کو معاش کی جانب سے بےفکر رکھنے کے لئے دربار شاہی سے مدد معاش کے عنوان سے جاگیریں اور وظائف مقرر تھے۔

مسلمانوں کا یہ نظام تعلیم ۱۸۵۷÷ تک قائم رہا، اس نظام تعلیم میں عام طور پر صَرف نحو، بلاغت، فقہ، اصول فقہ، منطق، کلام، تصوف، تفسیر، حدیث وغیرہ کے علوم و فنون پڑھے پڑھائے جاتے تھے، البتہ حدیث و تفسیر کا فن برائے نام تھا، زیادہ توجہ فقہ و اصول فقہ اور پھر منطق و فلسفہ پر دی جاتی تھی۔

۱۸۵۷÷ میں جب ہندوستان سے مسلمانوں کی حکومت کا چراغ گل ہوگیا، اور مسلمانوں کی بجائے سیاسی اقتدار پر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا تو یہاں کے عام باشندے اور بطور خاص مسلمان ”انّ الملوك اذا دخلوا قرية افسدوها وجعلوا اعزة اهلها اذلة“(۱) کے فطری اصول کا تختہ مشق بن گئے۔

---

(۱) جب بادشاہ کسی آبادی میں داخل ہوتے ہیں تو اسکو برباد اور اسکے باعزت باشندوں کو ذلیل کرڈالتے ہیں۔

اس سیاسی انقلاب نے مسلمانوں کے اقتصادی، تمدنی اور علمی و دینی نظام کو کس طرح پامال کیا اس کی تفصیل سر ولیم ہنٹر نے اپنی کتاب ”آور انڈین مسلمانز“ (ہمارے ہندوستانی مسلمان) میں کسی قدر بیان کی ہے، اس نے ایک جگہ مسلمانوں کی اقتصادی زبوں حالی اور مشکلات پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ۔

> حکومت نے ان کے لئے تمام اہم عہدوں کا دروازہ بند کر دیا ہے۔ دوسرے ایسا طریقۂ تعلیم جاری کر دیا ہے جس میں ان کی قوم کے لئے کوئی انتظام نہیں ہے تیسرے قاضیوں کی موقوفی نے ہزاروں خاندانوں کو جو فقہ اور اسلامی علوم کے پاسبان تھے بیکار اور محتاج کر دیا ہے، چوتھے ان کے اوقاف کی آمدنی جو ان کی تعلیم پر خرچ ہونی چاہئے تھی غلط مصرفوں پر خرچ ہو رہی ہے۔ (۱)

تعلیم کے سلسلہ میں اس نئی حکومت کی پالیسی یہ تھی کہ اس طرح کا تعلیمی نظام رائج کیا جائے جسے پڑھ کر ہندوستانی ذہنی وفکری طور پر بالکل انگریز بن جائیں۔

چنانچہ مسٹر انفنسٹن اپنی یادداشت میں لکھتے ہیں:

> میں علانیہ نہیں تو درپردہ پادریوں کی حوصلہ افزائی کروں گا، اگرچہ مجھے گورنر صاحب سے اس بارہ میں اتفاق ہے کہ مذہبی امور میں امداد کرنے سے احتراز کیا جائے تاہم جب تک ہندوستانی لوگ عیسائیوں کی شکایت نہ کریں، تب تک ان کی تعلیم کے مفید ہونے میں ذرا شبہ نہیں، اگر تعلیم سے ان کی رایوں میں ایسی تبدیلی پیدا نہ ہو سکے کہ وہ اپنے مذہب کو لغو سمجھنے لگیں تاہم وہ اس سے زیادہ ایمان دار محنتی رعایا تو ضرور بن جائیں گے۔ (۲)

اس سلسلے کی تفصیلات کے لئے اسباب بغاوت ہند از سر سید مرحوم، روشن مستقبل از مولوی سید طفیل احمد مرحوم اور نقشِ حیات ج ۲، از شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی قدس

---

(۱) موج کوثر ص ۴۷۔

(۲) روشن مستقبل ص ۹۵۔

سرہ ملاحظہ کی جائیں۔

ان حالات میں مسلم مفکرین ومدبرین کا یہ متفقہ فیصلہ ہوا کہ گورنمنٹ کا قائم کیا ہوا نظامِ تعلیم مسلمانوں کی ضرورت کو پورا نہیں کرسکتا؛ بلکہ یہ اسلامی تہذیب اور کلچر کیلئے تباہ کن اوران کے عقائد واخلاق کے واسطے مہلک ہے، مگراس نظام کی اصلاح کے سلسلے میں ان کی رائیں مختلف ہوگئیں، ایک جماعت نے مسلمانوں کی اس زبوں حالی کا علاج انگریزی علوم وفنون اورتہذیب وتمدن میں تجویز کیا، بالفاظ دیگراس جماعت کا اصل مقصد مسلمانوں کی اقتصادی اصلاح اور دنیوی پستی کا دور کرنا تھا، اس جماعت کے سربراہ اورقائد سرسید احمد مرحوم تھے، اوراس نظریہ کا اولین مظہر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ہے، سرسید مرحوم بھی اگرچہ مذہب کی ضرورت کوتسلیم کرتے تھے مگر دنیوی ترقی کو وہ اولیت دیتے تھے، ان کا خیال یہ تھا کہ دنیوی ترقی کی راہ سے دینی مقاصد تک پہنچا جائے، مرحوم اپنے اس نظریہ کی وضاحت ان الفاظ میں کرتے تھے۔

> ’’فلسفہ ہمارے دائیں ہاتھ میں ہوگا، نیچرل سائنس بائیں ہاتھ میں اور لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا تاج سر پر۔‘‘

ایک موقع پر مرحوم سرسیّد نے اپنے اس نظریہ کی وضاحت ان لفظوں میں کی ہے۔

> ’’دراصل مقصد اس کالج کا یہ ہے کہ مسلمانوں میں عموماً اور بالتخصیص اعلیٰ درجہ کے مسلمان خاندانوں میں یورپین سائنسز اورلٹریچر کورواج دے اور ایک ایسا فرقہ پیدا کرے جو از روئے مذہب کے مسلمان اوراز روئے خون اور رنگ کے ہندوستانی ہوں مگر باعتبار مذاق اور رائے وفہم کے انگریز ہوں۔‘‘ (۱)

مگر وہ اپنے اس منصوبہ میں کامیاب نہیں ہوسکے، چنانچہ تحریکِ علی گڈھ کے معقول وکیل اورسرسید مرحوم کے زبردست حامی شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں ’’وہ مغربی علوم کے ساتھ ایمان کامل اور صحیح مذہبی تربیت کو ضروری سمجھتے تھے، لیکن اس میں انھیں پوری کامیابی

---

(۱) بحوالہ ایڈریس اوراسپیچیں متعلق ایم او کالج دیباچہ ص۲۔

نہیں ہوئی''۔(۱)

اس ناکامی کی تفصیل بیان کرتے ہوئے یہی شیخ اکرام لکھتے ہیں:

''جن لوگوں نے مسجدوں کی چٹائیوں پر بیٹھ کر تعلیم پائی، ان میں تو سرسید، محسن الملک اور وقار الملک جیسے مدبر اور منتظم پیدا ہوئے، جو لوگ انگریزی سے قریب ناواقف تھے اور جن کے لئے مغربی ادب ایک گنج سربستہ تھا انھوں نے نیچرل شاعری اور ایک جدید ادب کی بنیاد ڈالی، اور آب حیات، سخندانِ فارس، شعروشاعری، مسدس حالی جیسی کتابیں تصنیف کرلیں، لیکن جن روشن خیالوں نے کالج کی عالیشان عمارتوں میں تعلیم حاصل کی اور جن کی رسائی مغرب کے بہترین اساتذہ اور دنیا بھر کے علم وادب تک تھی وہ مطمح نظر کی پستی اور کیرکٹر کی کمزوری سے فقط اس قابل ہوئے کہ کسی معمولی دفتر کے کل پرزے بن جائیں''۔(۲)

مزید لکھتے ہیں۔

کسی طرف سے اسلام یا مسلمانوں یا علی گڈھ کے خلاف آواز اٹھے اس پر لبیک کہنے والے سب سے پہلے علی گڈھ سے نکلیں گے۔''(۳)

ایک اقتباس اور ملاحظہ کیجئے۔

''لیکن آپ ان بزرگوں کا معاملہ ان کے ضمیر اور احساس فرض پر چھوڑ دیں، اور ارکانِ اسلام کی ظاہری پابندی کو بھی ایک لمحے کے لئے نظر انداز کردیں تب بھی علی گڈھ کی فضا میں اندر اندر اک عام ایمانی کمزوری اور روحانی کم ہمتی کا سراغ ملے گا، آپ بعض مستثنیات کو چھوڑ کر وہاں کے قابل اور ذہین اساتذہ اور تیز اور ہونہار طلبہ کی باتیں سنیں اور ان کے ذہنی رجحانات کا تجزیہ کریں تو آپ کو احساس ہوگا کہ (اگر وہ قومی نوحہ خوانی کا پرانا اور رسمی لبادہ نہ پہن لیں) تو ان کی سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ آپ انھیں کسی طرح دقیانوسی، قدامت پسند مسلمان نہ سمجھ لیں، یعنی علی گڑھ

---

(۱) موج کوثر ص ۱۴۶۔ (۲) موج کوثر، ص ۱۴۸۔

(۳) ایضاً، ص ۱۵۰۔

ع کالج ہے، امام باڑہ تو نہیں ہے۔''(۱)

مفکرین اسلام کی دوسری جماعت کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ اب ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کی بقاء کا واحد ذریعہ اسلامی تعلیمات ہیں، لہٰذا برٹش گورنمنٹ کی تعلیمی امداد و اعانت سے صرفِ نظر کر کے دینی درسگاہیں اور اسلامی ادارے قائم کیے جائیں، اس جماعت کے سامنے بھی مسلمانوں کی اقتصادی زبوں حالی تھی مگر اس نے اولیت ایمانیات وروحانیات کو دی اس جماعت کے سرخیل اور میر کارواں حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی تھے، اس نقطۂ نظر کا مظہر اولین دارالعلوم دیوبند ہے، شیخ اکرام ان دونوں نظریوں کے اختلاف کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

> ''سرسید کا مقصد مسلمانوں کے دنیوی تنزل کو روکنا تھا اور ارباب دیوبند کی نظر دینی ضرورت پر تھی، پھر سرسیّد طبقۂ امراء کے رکن تھے اور مولانا قاسم جمہور کے نمائندے۔''(۲)

اس نظریہ اور طریقۂ کار پر پیام ندوہ میں ان الفاظ سے تبصرہ کیا گیا ہے۔

''اس حقیقت سے کوئی ہوشمند اور منصف انسان انکار نہیں کرسکتا کہ دارالعلوم دیوبند کے فضلاء نے ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں پھیل کر دین خالص کی جس طرح حفاظت کی ہے، اور اس کو بدعت وتحریف اور تاویل سے محفوظ رکھا ہے اس سے ہندوستان میں اسلامی زندگی کے قیام وبقا واستحکام میں بیش بہا مدد ملی ہے اور آج جو صحیح اسلامی عقائد، دینی علوم، اہل دین کی وقعت اور صحیح روحانیت اس ملک میں نظر آتی ہے اس میں بلاشبہ اس کا نمایاں اور بنیادی حصہ ہے۔

آج کل ہندوستان میں مسلمانوں کے جو دینی ودنیاوی ادارے اور تعلیم گاہیں قائم اور اپنے طور پر خدمات انجام دے رہی ہیں وہ سب درحقیقت انھیں دونوں نقطۂ نظر کی ترجمان ہیں اور اپنے اپنے نظریے کے مطابق مسلمانوں کی علمی، دینی اور دنیاوی تعمیر وترقی میں مصروف عمل ہیں۔

---

(۱) ایضا، ص ۱۵۱۔ (۲) ایضاً، ص ۲۰۱۔

دارالعلوم دیوبند

ایک مکتبۂ فکر - ایک تحریک

(۱) افتتاحیہ

دارالعلوم دیوبند کیا ہے؟ خاصانِ خدا کی دعائے سحر گاہی کا ثمرہ، علمائے حق کے جذبۂ ایثار و قربانی کا مظہر، مجاہدین اسلام کے جہد و اخلاص کی نمایاں علامت، علم و معرفت کا حسین امتزاج، مسلمانانِ برصغیر کے حیات ملّی کی صراط مستقیم، اور لا مذہبیت کے اس دور میں دینی آثار و اقدار اور اسلامی تہذیب و ثقافت کا محافظ و علمبردار۔

دارالعلوم دیوبند کیا ہے؟ تاریخ اسلامی کی اولین درسگاہ ''صفّہ'' کی یادگار اور عکس جمیل، جس کی بنیاد توکل علی اللہ اور خدائے کریم و رحیم کے باحوصلہ بندوں کے مخیّرانہ جذبات پر رکھی گئی۔ جس نے نہ کبھی کسی نواب و رئیس کے مراحم خسروانہ کی جانب نگاہ اٹھائی اور نہ کسی حکمراں اور امیر کی داد و دہش کی پروا کی، جس کا سراپا وجود اپنے ابناء و فرزندوں کو اعتماد علی اللہ اور عرفان خودی کی تعلیم و دعوت دیتا ہے۔

دارالعلوم دیوبند کیا ہے؟ برصغیر ہندو پاک کی وہ واحد اسلامی چھاؤنی جس نے اسلام کے خلاف اٹھنے والے ہر فتنہ کا مؤثر اور کامیاب مقابلہ کیا ہے، خواہ وہ فتنہ آریہ سماج کی طرف سے اٹھایا گیا ہو یا شدھی سنگٹھن کے نام پر، چاہے وہ فتنہ عیسائی پادریوں نے برپا کیا ہو یا انگریزوں کے ظلِ عاطفت میں پرورش پانے والے متنبّی قادیانی نے، خواہ وہ فتنہ رضا خانیت اور نیچریت کے عنوان سے نمایاں ہوا ہو یا سبائیت اور ناصبیت کے لباس میں نمودار ہوا ہو۔

دارالعلوم دیوبند کیا ہے؟ یہ وہ تربیت گاہِ حریت ہے جس نے اسلامیانِ ہند کو ''جمعیۃ علمائے ہند''، جیسی اولوالعزم، باحوصلہ، مدبر اور باشعور جماعت فراہم کی جس نے برطانوی اقتدار کو اس وقت للکارا جب کہ اس کی قلمرو میں آفتاب غروب نہیں ہوتا تھا اور وقت کی اس عظیم طاقت سے اس وقت اعلان جنگ کر دیا جب کہ دوسرے لوگ اس نو وارد آقا کی خوشامد اور رضا جوئی میں لگے ہوئے تھے۔

تاریخ گواہ اور مشاہدہ شاہد ہے کہ برطانوی سامراج کو بایں طاقت وشوکت تگنی کا ناچ نچا دیا اور اپنے جہد وعمل اور قربانیوں کے سلسلے کو اس وقت تک جاری رکھا جب تک اس سفید فام سیاہ دل غاصبوں سے وطن عزیز کا ایک ایک چپہ آزاد نہیں کرا لیا۔

(۲) پس منظر

سقوطِ دہلی کے بعد مسلمانوں کو ان کے دین ومذہب اور تہذیب وثقافت سے بیگانہ اور برگشتہ کر دینے کی غرض سے مظالم کے پہاڑ توڑے گئے، دینی علوم اور ان کے محافظ علماء وفضلاء کو سرزمین ہند سے بے نشان کر دینے کے لیے تشدد اور جارحیت کی حد کر دی گئی۔ ارض ہند جس پر انھوں نے صدیوں حکمرانی کی تھی اپنی تمام تر وسعتوں کے باوجود ان پر تنگ بنا دی گئی، امراء ورؤساء کی جائدادیں ضبط کر کے انھیں نانِ شبینہ کا محتاج بنا دیا گیا، غرضیکہ ظلم وجبر کی جس قدر بھی شکلیں امکان میں تھیں وہ سب مجبور مسلمانوں پر آزمالی گئیں، لیکن خانماں برباد ملت میں ابھی زندگی کی رمق باقی تھی، سب کچھ فنا ہو گیا تھا مگر اسلامی کردار زندہ تھا، دولت وحکومت اور شان وشوکت پر غارت گرانِ فرنگ نے قبضہ کر لیا تھا، مگر دینی حمیت وغیرت محفوظ تھی، اس لیے تمام تر وحشیانہ حرکتوں کے باوجود، دین ومذہب اور ملک ووطن کے ساتھ ان کی وفاداریاں بدلی نہ جا سکیں تو ملک کے اقتدار پر قابض شاطر غاصبوں نے بجائے ظلم وتشدد کے ایک دوسری حکمت عملی تجویز کی جس کی تفصیل مولوی محمد طفیل علیگ کے الفاظ میں یہ ہے:

''حقیقی نبض شناس انگریزوں کی تشخیص پر گورنمنٹ ہند کی حکمت عملی

(پالیسی) ۱۸۷۰ء میں مسلمانوں کے بارے میں تبدیل ہوئی اور سمجھ لیا گیا کہ مسلمانوں کو دبا کر اور برباد کر کے انھیں سلطنت کا خیر خواہ اور وفادار نہیں بنایا جاسکتا۔ چناں چہ سال مذکور میں گورنمنٹ ہند نے مسلمانوں کو جدید طریقۂ تعلیم دینے کا تہیہ کرلیا ہے۔'' (روشن مستقبل ص ۱۲۵)

اس حکمت عملی کے پس پردہ کیا عزائم کارفرما تھے؟ انھیں اچھی طرح سمجھنے اور اس پالیسی کی اصلی حقیقت تک پہونچنے کے لیے ہمیں اور پیچھے لوٹنا پڑے گا، یعنی ۱۸۳۴ء کی اس کمیٹی کی روداد کا جائزہ لینا ہوگا جو یہ طے کرنے کے لیے تشکیل دی گئی تھی کہ ہندوستانی طلبہ کو مشرقی زبان میں تعلیم دی جائے یا انگریزی زبان میں، اس کمیٹی کا اجلاس ۷؍ مارچ ۱۸۳۵ء کو لارڈ میکالے کی صدارت میں ہوا جس میں لارڈ میکالے صدر اجلاس کے ترجیحی ووٹ پر انگریزی زبان میں تعلیم دینے کا فیصلہ ہوا تھا۔ اس فیصلہ پر تبصرہ کرتے ہوئے مولوی محمد طفیل علیگ مرحوم لکھتے ہیں:

> اس فیصلے کی تعریف میں بڑے بڑے راگ الاپے جاتے ہیں، اور کہا جاتا ہے کہ لارڈ میکالے نے اس کے ذریعہ ہندوستان کو آزادی کا فرمان عطا کیا، مگر جو امور اس رائے کے محرک تھے ان میں سے ایک اعلانیہ اور دوسرا خفیہ تھا، اعلانیہ رائے تو وہ تھی جو انھوں نے اپنی رپورٹ میں ان الفاظ میں دہرائی تھی:
>
> ''ہمیں ایک ایسی جماعت بنانی چاہیے جو ہم میں اور ہماری کروڑوں رعایا کے درمیان مترجم ہو اور یہ ایسی جماعت ہونی چاہیے جو خون اور رنگ کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو مگر مذاق اور رائے، الفاظ اور سمجھ کے اعتبار سے انگریز ہو۔'' (روشن مستقبل، ص: ۱۵۰)

لارڈ میکالے کا اصل جذبہ اور مخفی رائے جو ان کے قلب کے نہاں خانے میں چھپی ہوئی تھی وہ تھی جو انھوں نے اپنے والد کو ایک خط میں لکھ کر بھیجی تھی جس میں وہ لکھتے ہیں:

> ''اس تعلیم کا اثر ہندوؤں پر بہت زیادہ ہے کوئی ہندو جو انگریزی داں ہے کبھی اپنے مذہب پر صداقت کے ساتھ قائم نہیں رہ سکتا، بعض لوگ مصلحت کے

> تحت ہندو رہتے ہیں مگر بہت سے یا تو موحد ہو جاتے ہیں یا مذہب عیسوی اختیار کر لیتے ہیں، میرا عقیدہ ہے کہ اگر تعلیم کے متعلق ہماری تجویز پر عمل درآمد ہوا تو تیس سال بعد بنگال میں ایک بت پرست بھی باقی نہ رہے گا۔‘‘

(روشن مستقبل، ص:۱۵۱)

بالفاظ واضح برٹش سامراج کی پالیسی یہ تھی کہ اس طرح کا تعلیمی نظام رائج کیا جائے جسے پڑھ کر ہندوستانی ذہن وفکر کے اعتبار سے انگریز بن جائیں یا کم از کم ایماندار و باوفا رعایا بن جائیں چناں چہ مسٹر انفنسٹن اپنی یادداشت میں لکھتے ہیں:

> میں اعلانیہ نہیں تو درپردہ پادریوں کی حوصلہ افزائی کروں گا، اگرچہ مجھے گورنر صاحب سے اس بارے میں اتفاق ہے کہ مذہبی امور میں امداد کرنے سے احتراز کیا جائے تاہم جب تک ہندوستانی لوگ عیسائیوں کی شکایت نہ کریں تب تک ان کی تعلیم کے مفید ہونے میں ذرا شبہ نہیں اگر تعلیم سے ان کی رایوں میں ایسی تبدیلی پیدا نہ ہو سکے کہ وہ اپنے مذہب کو لغو سمجھنے لگیں تاہم وہ اس سے زیادہ ایمان دار، محنتی رعایا تو ضرور بن جائیں گے۔ (روشن مستقبل، ص:۹۵)

اس سیاسی انقلاب اور جدید تعلیمی نظام نے مسلمانوں کے اقتصادی وتمدنی اور علمی و معاشرتی نظام کو کس طرح پامال کیا اسکی تفصیل سر ولیم ہنٹر نے اپنی کتاب اَوَر انڈین مسلمانز (ہمارے ہندوستانی مسلمان) میں کسی قدر بیان کی ہے۔ کتاب کے چوتھے باب میں انھوں نے مسلمانوں کی اقتصادی حالت اور ان کی مشکلات پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے۔

> مسلمانوں کو حکومت سے بہت سی شکایات ہیں، ایک شکایت یہ ہے کہ حکومت نے ان کے لیے تمام اہم عہدوں کا دروازہ بند کر دیا ہے، دوسرے ایک ایسا طریقہ تعلیم جاری کیا ہے جس میں ان کی قوم کے لیے کوئی انتظام نہیں، تیسرے قاضیوں کی موقوفی نے ہزاروں خاندانوں کو جو فقہ اور اسلامی علوم کے پاسبان تھے بیکار اور محتاج کر دیا ہے، چوتھی شکایت یہ ہے کہ ان کے اوقاف کی آمدنی جو ان کی تعلیم پر خرچ ہونی چاہیے تھی غلط مصرفوں پر

خرچ ہورہی ہے۔

ڈاکٹر ہنٹر نے ان شکایات پر بالتفصیل بحث کی ہے اور مسلمانوں کی حالتِ زار کا نقشہ کھینچا ہے۔'' الخ (موج کوثر ص:۴۷)

یہ تھے قوم وملت کے حالات کہ حکومت وسلطنت ایک قصہ پارینہ بن چکی تھی، جاہ و منصب خواب وخیال ہوگئے تھے، دولت وثروت کے خزانوں پر افلاس ونا داری کا پہرہ تھا، قومی وملی رہنماؤں کی اکثریت موت کے گھاٹ اتاردی گئی تھی یا جیل کی سلاخوں اور انڈمان کے جزیرے میں محبوس کردی گئی تھی، قسمت سے بچے کھچے افراد بتقاضائے مصلحت ہجرت کرگئے تھے یا اپنے اپنے زاویوں میں روپوشی کی زندگی گزارنے پر مجبور تھے۔ اس عالمِ لاچاری وکس مپرسی میں قوم وملت کے لیے اگر کوئی سہارا تھا تو وہ ایمان واعتقاد کا سہارا تھا، مگراب اس پر بھی غارت گرانِ افرنگ ڈاکہ ڈالنے کی خفیہ تدبیریں کررہے تھے اور ملت اسلامیہ ہند زبان حال سے ملتجی تھی

گردش وقت یہ بھی چھین نہ لے ایک تیری یاد کا سہارا ہے

تحریک ولی اللّٰہی کا مرکز ''مدرسہ شاہ عبدالعزیز دہلی'' جہاں سے ملت کو علم ومعرفت اور عزم وحوصلہ کا درس ملتا تھا تباہ کیا جاچکا تھا جب کہ تحریک ولی اللّٰہی کی رگوں میں خون اسی مدرسہ سے پہنچایا جاتا تھا، شاہ ولی اللہ، شاہ عبدالعزیز، شاہ محمد اسحاق اور آخر میں شاہ عبدالغنی مجددی رحمہم اللہ نے اسی مدرسہ کو اپنی اصلاحی وانقلابی سرگرمیوں کا مرکز بنایا تھا اور اس میں بیٹھ کر قوم کی علمی وفکری تعمیر وتشکیل کی خدمت انجام دی تھی۔

سقوطِ سلطنت اور دہلی کی تباہی کے بعد یہ سلسلہ منقطع ہوگیا تو حسب تصریح مولانا عبیداللہ سندھی رحمہ اللہ ''شاہ محمد اسحاق کی مرکزی جمعیت نے جواب حجاز میں مقیم تھی اور امیر حاجی امداداللہ کی رہنمائی میں ہندوستانی کام کرتی تھی، فیصلہ کیا کہ اطراف دہلی میں امام عبدالعزیز کے مدرسہ کے نمونہ پر ایک مدرسہ بنایا جائے چناں چہ مولانا محمد قاسم (نانوتوی قدس سرہ) اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے لیے سات سال تک کوشش کرتے رہے تب کہیں جاکر ۱۵؍محرم ۱۲۸۳ھ یعنی (۳۰؍مئی) ۱۸۶۶ء میں سقوط دہلی کے ۹ سال

بعد مدرسہ دیوبند کی تاسیس ہو سکی“

مولانا سندھی یہ بتا رہے ہیں کہ ”دارالعلوم دیوبند“ کا قیام کسی وقتی جذبہ یا شخصی حوصلہ کی بنیاد پر نہیں بلکہ اس کی تاسیس طے شدہ منصوبہ اور ایک جماعت کی سوچی سمجھی اسکیم کے تحت عمل میں آئی ہے۔ جس کی تائید اس واقعہ سے ہوتی ہے کہ قیام دارالعلوم کے بعد جب شاہ رفیع الدین دیوبندی حج بیت اللہ کے لیے مکہ معظّمہ حاضر ہوئے تو وہاں سیدنا حضرت حاجی امداد اللہ صاحب سے عرض کیا کہ ہم نے دیوبند میں ایک مدرسہ قائم کیا ہے اس کے لیے دعا فرمایئے تو حضرت حاجی صاحب نے فرمایا:

> ”سبحان اللہ! آپ فرماتے ہیں ہم نے مدرسہ قائم کیا ہے، یہ خبر نہیں کہ کتنی پیشانیاں اوقات سحر میں سربسجود ہو کر گڑگڑاتی رہیں کہ خدا وندا ہندوستان میں بقاء اسلام اور تحفظ اسلام کا کوئی ذریعہ پیدا کر، یہ مدرسہ ان ہی سحر گاہی دعاؤں کا ثمرہ ہے، دیوبند کی قسمت ہے کہ اس دولت گراں کو یہ سرزمین لے اڑی۔“ (علمائے حق، ج:۱،ص:۱۷)

یہ ہے ”مدرسہ عربی اسلامی دیوبند“ یعنی ام المدارس دارالعلوم دیوبند کی تاسیس وبناء کا تاریخی پس منظر جس سے صاف ظاہر ہے کہ دارالعلوم دیوبند دراصل اسی شجر طوبیٰ کی ایک سرسبز وشاداب شاخ ہے جسے امام الہند شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے اپنے با فیض مبارک ہاتھوں سے نصب کیا تھا تاکہ شرک وبدعت، جہل ومعصیت کی باد سموم سے نڈھال واماندگانِ راہ اس کے حیات بخش سائے میں آکر زندگی کی تازگی وتوانائی حاصل کرسکیں۔

کعبہ را ویراں مکن اے عشق کانجا یک نفس
گاہ گہہ واماندگانِ راہ منزل می کنند

(۳) اصول ومقاصد

دارالعلوم دیوبند اور اس کے منہاج پر جاری دیگر مدارس دینیہ کے اصول ومقاصد

کو حجۃ الاسلام مولانا نانوتوی قدس سرہ نے اساسی اصول ہشتگانہ کے عنوان سے خود تحریر فرمایا تھا، جو ماہنامہ القاسم کے دار العلوم نمبر (مجریہ ۱۳۴۷ھ) میں شائع ہو چکا ہے۔ مولانا سید محمد میاں دیوبندیؒ ان اصول و مقاصد کا خلاصہ اپنے الفاظ میں یوں بیان کرتے ہیں:

> ''ان اصول کی بناء پر بآسانی کہا جاسکتا ہے کہ دار العلوم اور اس کے ہم صنف دیگر مدارس کے مقاصد حسب ذیل ہیں:
>
> (الف) آزادیٔ ضمیر کے ساتھ ہر موقع پر کلمۃ الحق کا اعلان ہو کوئی سنہری طمع، مربیانہ دباؤ یا سرپرستانہ مراعات اس میں حائل نہ ہو سکے۔
>
> (ب) اس کا تعلق عام مسلمانوں کے ساتھ زائد سے زائد ہوتا کہ یہ تعلق خود بخود مسلمانوں میں ایک نظم پیدا کردے جو ان کو اسلام اور مسلمانوں کی اصل شکل پر قائم رکھنے میں معین ہو اور اس طرح اسلامی عقائد اور اسلامی تہذیب ہمیشہ کے لیے ورنہ کم از کم اس وقت تک کے لیے محفوظ ہو جائے جب تک یہ مرکز اپنے صحیح اصول پر قائم رہے، نیز توکل علی اللہ اور عوام کی طرف سے احتیاج خود کارکنان مدرسہ کو اسلامی شان پر باقی رکھ سکے اور جابرانہ استبداد یا ریاست کا ٹھاٹ ان میں قطعاً نہ پیدا ہو بلکہ ایک جمہوری تعلق ہو جو ایک کو دوسرے کا محتاج بنائے رکھے اور اس طرح آپس میں خود ایک دوسرے کی اصلاح ہوتی رہے۔

(مندرجہ بالا الف و ب کے لیے ملاحظہ ہو اصول ہشتگانہ کی دفعہ ع۶ و ع۷ و ع۸)

> (ج) کارکنان، خدام اور مستفیضین کی جماعت جملہ اثرات سے محفوظ اور مامون رہ کر ولی اللّٰہی مسلک پر شدت سے عمل پیرا رہے جس کے متعلق تمام عالم اسلامی کا اتفاق ہے کہ وہ سنت قویمہ ہے، مسلک اسلاف کے عین مطابق ہے افراط و تفریط سے پاک، صراط مستقیم اور معیار صحیح ہے۔ (ملاحظہ ہو اصل ع۴)
>
> (د) خود داری اور استبداد (جو شرعی نیز تاریخی حیثیت سے بربادیٔ مسلم کا

واحد ذمہ دار ہے) کے برخلاف باہمی مشاورت سے اجتماعی اور جمہوری حیثیت کے ساتھ کام کرنے کا نمونہ مسلمانوں کے سامنے پیش کیا جائے۔ (اس کے متعلق اصل ع۳ میں متعدد ضابطوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔) (علماے حق، ج:۱، ص:۵۴تا۵۶)

الحاصل یہ اصول و مقاصد بتارہے ہیں کہ علم و عرفان کا یہ مرکز اس لیے قائم کیا گیا ہے کہ اس سے دین کے سچے اور مخلص خادم، اسلام کے جانباز و جرأت مند سپاہی تیار کیے جائیں جو اسلامی عقائد و شعائر اور دینی اخلاق و روایات کے داعی و نقیب بنیں اور باطل طاقتوں کی فتنہ سامانیوں سے اسلام اور مسلمانوں کی حفاظت کریں اسی لیے اس کا نظام تعلیم و تربیت امام الہند محدث دہلویؒ کی تحریک دعوت و اصلاح کی بنیادوں پر قائم کیا گیا۔

(۴) سند و استناد

دارالعلوم دیوبند کا سلسلۂ سند مسندِ ہند شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ سے گزرتا ہوا نبی پاک ﷺ سے جاملتا ہے دارالعلوم اور جماعت دیوبندی کے مورثِ اعلیٰ حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ ہی ہیں جن کے علمی و فکری منہاج و طریق پر منتسبینِ دارالعلوم اور بالفاظِ واضح دیوبندی مکتب فکر کی تشکیل ہوئی ہے۔ اس لیے بحمد اللہ دیوبندی مکتب فکر کوئی نو پید جماعت نہیں بلکہ علمی، دینی اور سیاسی احکام و امور میں علمائے دیوبند مسند ہند شاہ ولی اللہ کے توسط سے سلف صالحین سے پوری طرح مربوط ہیں۔

برصغیر میں جب مسلمانوں کے کاروان شوکت پر برطانوی سامراج نے شب خوں مارا، تو حکیم مطلق جل شانہ نے اسلامی تعلیمات واحکام اور تہذیب و ثقافت کو بچانے کے لیے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور ان کی اولاد و احفاد کو آگے کر دیا، ان بزرگوں کے سامنے دو منزلیں تھیں: (۱) مسلمانوں کی لٹی شوکت کیسے واپس لی جائے۔ (۲) اور سیاسی تنزل کے اس دور میں اسلامی علوم و احکام کی گرتی دیوار کو کس طرح سہارا دیا جائے۔ پہلی منزل تک پہنچنے کے لیے محدث دہلویؒ نے معاشی انقلاب، صحابہ سے انتساب اور قوم کو جہد و جہاد کی راہ دکھائی، ان

دونوں امور کو واضح کرنے کی غرض سے حجۃ اللہ البالغہ، مصفّٰی ومسوّیٰ اور ازالۃ الخفاء، جیسی بلند پایہ کتابیں لکھیں اور ان کے پوتے شاہ اسمٰعیل دہلویؒ حضرت سید احمد شہید دہلویؒ اور حضرت شاہ عبدالحیٔ بڈھانوی کے ساتھ عملاً جہاد میں نکلے۔

دوسری منزل تک پہنچنے کے لیے ان محدثین دہلی نے قرآن وحدیث کے درس اور اسلامی علوم وفنون کی اشاعت سے اسلامی اعمال واخلاق کی متزلزل دیوار کو سہارا دیا؛ چناں چہ عین اس وقت میں جب کہ سید احمد شہید اپنے جاں باز رفقاء کے ساتھ میدان کارزار میں دادِ شجاعت دے رہے تھے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز کے نواسے اور تلمیذ وجانشین دہلی کی مسندِ تدریس پر قال اللہ قال الرسول کا غلغلہ بلند کیے ہوئے تھے۔

دارالعلوم دیوبند اسی علم وفکر کا وارث اور محدثین دہلی کے اسی خاندان سے وابستہ ہے اور آج برصغیر ہند و پاک اور بنگلہ دیش میں اہل سنت والجماعت کا مرکز ثقل یہی دارالعلوم اور اس سے وابستہ علمائے دیوبند ہیں۔

(۵) اسنادِ سلف کا لازمی اثر

جن لوگوں نے علم وعمل کے چراغ سلف کے اسناد سے روشن کیے ہوں ان کے ذمے سلف کا دفاع لازمی ہوجاتا ہے اور وہ اس بات کے مکلّف ہیں کہ اپنے اسلاف کے عمومی کردار کو ہر دور میں بے داغ اور آئندہ نسلوں کے لیے بمنزلۂ چراغ ثابت کرتے رہیں اس کے بغیر اسلام ایک مسلسل حقیقت اور ایک زندہ مذہب نہیں رہ سکتا۔

چنانچہ دارالعلوم اور بالفاظ دیگر علمائے دیوبند مکمل طور پر صحابہ کرام سے لے کر محدثینِ دہلی تک اسنادِ اسلام کی ہر کڑی سے پورے وفادار رہے اور سلف صالحین کی اتباع کے اس حد تک پابند رہے کہ چھوٹی سے چھوٹی بدعت کو بھی دین نہ بننے دیا۔ تسلسلِ اسلام اور اسنادِ دین کو کمزور کرنے والے مختلف طبقوں سے دارالعلوم اور اس کے علماء نے اختلاف کیا، تو اس لیے نہیں کہ وہ اختلاف پسند تھے یا انھیں کسی طبقے سے ذاتی بغض تھا بلکہ محض اس لیے کہ اسلام جس مبارک وپاکیزہ سلسلے سے ہم تک پہنچا ہے اس سے پوری وفا کی جائے۔ ان کے الحادی یا

بدعی نظریات کی تردید وتخریب اس لیے ضروری تھی کہ اس کے بغیر اسلام کی تعمیر وبقاء کی کوئی صورت نہیں تھی؛ لیکن ان کی یہ تردید بھی اصولی رہی اور انداز جدل احسن جس کی تعلیم خود قرآن نے دی ہے ”و جادلهم بالتی هی أحسن“ (پ:۱۴)

عقیدۂ ختم نبوت کا تحفظ

اسلام کے اس عظیم بنیادی عقیدہ پر یلغار کی گئی اور انگریز کی خانہ ساز نبوت کے داعی یورپ اور بلاد افریقہ میں تبلیغی مشن کے حسین عنوان سے مسلمانوں کو ارتداد کی دعوت دینے لگے۔ علمائے دیوبند نے مسلمانوں کو اس ارتدادی فتنہ سے خبردار کیا۔ اکابر دارالعلوم کے سرخیل شیخ امداد اللہ مہاجر مکی نے اپنے خلفاء حضرت مولانا اشرف علی اور شیخ مہر علی شاہ گولڑوی کو اس کی سرکوبی کی جانب متوجہ کیا۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن کے شاگرد علامہ انور شاہ محدث کشمیری، شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد محدث عثمانی، مناظر اسلام مولانا مرتضیٰ حسن چاند پوری، مناظر اسلام مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا محمد عالم (آسی) امرتسری، پھر حضرت محدث کشمیری کے تلامذہ میں مولانا سید بدر عالم میرٹھی، مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی، مولانا محمد ادریس محدث کاندھلوی، مولانا محمد یوسف محدث بنوری وغیرہ اساطین علمائے دیوبند میدان میں نکلے اور اپنی گراں قدر علمی تصانیف، موثر تقاریر اور بے پناہ مناظروں سے انگریزی نبوت کے دجل وفریب کا اس طرح پردہ چاک کیا اور ہر محاذ پر ایسا کامیاب تعاقب کیا کہ اسے اپنے مولد ومنشاء لندن میں محصور ہو جانا پڑا۔ علمائے دیوبند کے علمی وفکری مرکز دارالعلوم دیوبند کی زیرنگرانی حریم ختم نبوت کی پاسبانی کی یہ مبارک خدمت پوری توانائیوں کے ساتھ آج بھی جاری وساری ہے۔

ناموسِ صحابہ کا دفاع

ناموسِ صحابہ کے دفاع میں دارالعلوم کے اکابر اور ان کے جانشینوں نے نہایت وقیع اور گراں قدر خدمات انجام دی ہیں؛ چناں چہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے ہدیۃ الشیعہ، اَجوِبہ اربعین وغیرہ، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے ہدایۃ الشیعہ، حضرت مولانا

خلیل احمد سہارنپوری نے مطرقۃ الکرامۃ، اور ہدایات الرشید جیسی بلند پایہ کتابیں تحریر کیں اور اس باب میں محدثین دہلی کے علمی وفکری موقف کی پوری نمائندگی کی گئی جو حضرت شاہ ولی اللہ کی ازالۃ الخفاء، قرۃ العینین، اور حضرت شاہ عبد العزیزؒ کی کتاب تحفۂ اثنا عشریہ سے ظاہر ہے پھر امام اہل سنت والجماعت مولانا عبد الشکورؒ فاروقی لکھنوی دفاع صحابہ کی اس عظیم خدمت میں پوری عمر مصروف رہے اور اس اہم موضوع کے ہر ہر گوشے سے متعلق اس قدر معلومات فراہم کر دیں کہ اب شاید اس پر مزید اضافہ دشوار ہو؛ نیز حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ نے مقام صحابہ پر کامیاب مضامین لکھے اور جب وقت کی سیاسی آندھیوں نے قافلۂ اسلام کی صف اول پر یلغار کی تو حضرت مدنی نے صحابہ کے معیارِ حق ہونے پر وہ مباحث تحریر فرمائے جو عصر حاضر کا سرمایۂ فخر ہیں، ان بزرگوں کے علاوہ مولانا ولایت حسین رئیس دیورہ صوبہ بہار، مولانا محمد شفیع سنگتھروی، علامہ دوست محمد قریشی، مولانا لطف اللہ جالندھری، مولانا قاضی مظہر حسین، مولانا محمد منظور نعمانی، مولانا عبد الستار تونسوی وغیرہ علمائے دیوبند نے اس محاذ پر گراں قدر خدمات انجام دیں۔

شرک وبدعت

اتباع سنت اور حدیث کا انکار کرنے والا گروہ مرکز ملت کے نام سے ایک نئی اصطلاح وضع کر کے قرآن کی تعبیر وتشریح کا اختیار اسے سونپ دیتا ہے کہ یہ نام نہاد مرکز ملت زمانے کے تقاضوں اور امنگوں کے مطابق پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات، صحابہ کے فیصلوں اور اجماع امت کے مسائل سے قطع نظر کر کے جو چاہے فیصلہ کر دے۔ ایک دوسرا گروہ جو زبانی عشق رسول کا بہت دعویدار ہے اور اپنے سوا تمام طبقات اسلام کو قابل گردن زدنی اور دنیا کے ہر کافر ومشرک سے بدتر سمجھتا ہے۔ لیکن عملاً اس کا حال یہ ہے کہ شریعت کے روشن چہرے کو مسخ کر کے دین میں نت نئے اضافے کرتا رہتا ہے اور من گھڑت افکار کو شریعت قرار دیتا ہے جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے رسوم و رواج کو بدعت قرار دیا ہے اور اپنے ہر خطبے میں اس کی برائی بیان فرمایا کرتے تھے۔ آپ

کے صحابہ کرام سے لے کر آج تک علمائے حقانی نے اپنی تبلیغی سرگرمیوں کو سب سے زیادہ ردِ بدعت پر مرکوز رکھا کیوں کہ اسی سے شرک کی راہ نکلتی ہے۔

جانشینانِ محدثین دہلی یعنی علمائے دیوبند نے اس سلسلے میں بھی بہت کام کیا سید احمد شہیدؒ نے اس بارے میں بہت مضبوط موقف اختیار کیا۔ ان حضرات کے بعد اکابر دارالعلوم دیوبند کی باری آئی اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، حضرت مولانا خلیل احمد محدث سہارنپوریؒ، حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ وغیرہ نے شرک و بدعت کے رد میں ناقابل فراموش خدمات انجام دیں اور ماضی قریب میں مولانا حسین علی بچھراواں، مولانا مرتضٰی حسن چاندپوری، مولانا محمد منظور نعمانی، مولانا سرفراز خاں صفدر وغیرہ نے بھی اس محاذ پر نہایت کامیاب خدمات انجام دیں۔ اور آج بھی علمائے دیوبند مبتدعین کے تعاقب میں سرگرم عمل ہیں۔ علمائے دیوبند کے علمی مرکز دارالعلوم دیوبند کی تاریخ سے واقف حضرات جانتے ہیں کہ اس کے فرزند اسلام کی سنت قائمہ کے حامی اور بدعت سے بہت دور ہیں۔ اور ایسے کسی عمل کو جو شاہ راہِ مسلسل سے نہ آئے اسے اسلام کا نام دینے کے لیے تیار نہیں کیوں کہ ان کا موقف اسلام کی سنت قائمہ سے مکمل وفاداری ہے۔ ان کے نزدیک اہل سنت والجماعت وہ لوگ ہیں جو اسلام کی سنت قائمہ سے وابستہ اور جماعت صحابہ کے نقش پا سے دین کی راہیں تلاش کرنے والے ہوں اور بدعات کو فروغ دینے والے نہ ہوں۔ ان حضرات کا یقین ہے کہ بدعت کا دروازہ کھلا رکھنے سے تفریق بین المسلمین لازمی ہوگی کیوں کہ بدعات ہر گروہ کی اپنی اپنی ہوں گی یہ فقط سنت ہے جو تمام مسلمانوں کو ایک لڑی میں پرو سکتی ہے اور ملت واحدہ بنا کر رکھ سکتی ہے؛ اس لیے بدعات کے رد میں علمائے دیوبند کا یہ اہتمام کوئی منفی داعیہ نہیں بلکہ شاہراہ اسلام سے مخلصانہ عقیدت ہے۔

(۶) علمائے دارالعلوم دیوبند کا مسلک

محدثین دہلی اور ان کے چشمۂ علم وعرفان سے سیراب دارالعلوم اور علمائے دیوبند

اپنے مسلک اور دینی رخ کے اعتبار سے کلیتًا اہل سنت والجماعت ہیں پھر وہ خود رَو قسم کے اہل سنت نہیں بلکہ اوپر سے ان کا سندی سلسلہ جڑا ہوا ہے؛ اس لیے مسلک کے اعتبار سے وہ نہ کوئی جدید فرقہ ہیں نہ بعد کی پیداوار ہیں بلکہ وہی قدیم اہل سنت والجماعت کا مسلسل سلسلہ ہے جو اوپر سے سند متصل اور استمرار کے ساتھ کابرًا عن کابرٍ چلا آ رہا ہے۔

علمائے دارالعلوم دیوبند کے اس جامع، افراط وتفریط سے پاک مسلک معتدل کو سمجھنے کے لیے خود لفظ اہل سنت والجماعت میں غور کرنا چاہیے جو دو اجزاء سے مرکب ہے: ایک ''السنۃ'' جس سے اصول، قانون، اور طریق نمایاں ہیں اور دوسرا ''الجماعۃ'' جس سے شخصیات اور رفقائے طریق نمایاں ہیں۔ اہل سنت والجماعت کے اس ترکیبی کلمہ سے یہ بات پورے طور پر واضح ہوتی ہے کہ اس مسلک میں اصول وقوانین بغیر شخصیات کے اور شخصیات بغیر قوانین کے معتبر نہیں کیوں کہ قوانین ان شخصیات ہی کے راستے سے آتے ہیں اس لیے ماخوذ کو لیا جانا اور ماخذ کو چھوڑ دینا کوئی معقول مسلک نہیں ہوسکتا۔

حدیث '' ما أنا علیه و أصحابي '' میں بہتر۷۲ فرقوں میں سے فرقۂ ناجیہ کی نشاندہی فرماتے ہوئے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے معیار حق ان ہی دو چیزوں کو قرار دیا ''ما انا'' سے اشارہ سنت یعنی طریق نبوی یا قانون دین کی طرف ہے اور ''واصحابی'' سے اشارہ الجماعۃ یعنی برگزیدہ شخصیات کی طرف ہے بلکہ مسند احمد اور سنن ابی داؤد میں اصحابی کے بجائے الجماعۃ کا صریح لفظ موجود ہے۔

اس لیے تمام صحابہ، تابعین، فقہائے مجتہدین، ائمہ محدثین اور علمائے راسخین کی عظمت ومحبت، ادب واحترام اور اتباع وپیروی اس مسلک کا جوہر ہے؛ کیوں کہ ساری دینی برگزیدہ شخصیتیں ذات نبوی سے انتساب کے بدولت ہی وجود میں آتی ہیں۔ پھر مختلف علوم دینیہ میں حذاقت ومہارت اور خداداد فراست وبصیرت کے لحاظ سے ہر شعبۂ علم میں ائمہ اور اولوالامر پیدا ہوئے اور امام ومجتہد کے نام سے انھیں یاد کیا گیا۔ مثلاً ائمہ اجتہاد میں امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل وغیرہ، ائمہ حدیث میں امام بخاری، امام مسلم، امام ابوداؤد، امام ترمذی، امام نسائی وغیرہ، ائمہ درایت وتفقہ میں امام ابویوسف، امام

محمد بن حسن، امام خلال، امام مزنی، امام ابن رجب وغیرہ۔ ائمہ احسان واخلاص میں اویس قرنی، فضیل بن عیاض وغیرہ، ائمہ حکمت وحقائق میں امام رازی، امام غزالی وغیرہ، ائمہ کلام میں ابوالحسن اشعری، ابومنصور ماتریدی وغیرہ نیز اس قسم کی اور بھی دینی برگزیدہ شخصیتیں ہیں جن کی درجہ بدرجہ توقیر وعظمت مسلک دارالعلوم دیوبند میں شامل ہے۔

پھر ان تمام دینی شعبوں کے اصول وقوانین کا خلاصہ دو ہی چیزیں ہیں: ”عقیدہ وعمل“ عقیدے میں تمام عقائد کی اساس وبنیاد عقیدۂ توحید ہے اور عمل میں سارے اعمال کی بنیاد اتباع سنت ہے۔

توحید

مسلک دارالعلوم دیوبند میں عقیدۂ توحید پر بطور خاص زور دیا جاتا ہے تاکہ اس کے ساتھ شرک یا موجبات شرک جمع نہ ہوں اور کسی بھی غیر اللہ کی اس میں شرکت نہ ہو۔ ساتھ ہی تعظیمِ اہل اللہ اور اربابِ فضل وکمال کی توقیر کو عقیدۂ توحید کے منافی سمجھنا مسلک کا کوئی عنصر نہیں۔

خاتم الانبیاء سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ

علمائے دارالعلوم دیوبند کا یہ ایمان ہے کہ سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم افضل البشر وافضل الانبیاء ہیں، مگر ساتھ ہی آپ کی بشریت کا بھی عقیدہ رکھتے ہیں۔ وہ آپ کے علو درجات کو ثابت کرنے کے لیے حدودِ عبدیت کو توڑ کر حدودِ معبودیت میں پہنچا دینے سے کلی احتراز کرتے ہیں۔ وہ آپ کی اطاعت کو فرض عین سمجھتے ہیں مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کو جائز نہیں سمجھتے۔

علمائے دارالعلوم دیوبند برزخ میں آپ ﷺ کی حیات جسمانی کے قائل ہیں مگر وہاں معاشرت دنیوی کو نہیں مانتے۔ وہ آپ کے علم عظیم کو ساری کائنات کے علم سے بدرجہا زیادہ مانتے ہیں پھر بھی اس کے ذاتی ومحیط ہونے کے قائل نہیں ہیں۔

صحابۂ کرام

علمائے دارالعلوم دیوبند تمام صحابہ کی عظمت کے قائل ہیں؛ البتہ ان میں باہم فرق مراتب ہے تو عظمت مراتب میں بھی فرق ہے، لیکن نفس صحابیت میں کوئی فرق نہیں اس لیے محبت وعقیدت میں بھی فرق نہیں پڑسکتا پس "الصحابة كلهم عدول" اس مسلک کا سنگ بنیاد ہے۔ صحابہ بحیثیت قرن خیر من حیث الطبقة ہیں اور پوری امت کے لیے معیار حق ہیں۔ علمائے دیوبند انھیں غیر معصوم ماننے کے باوجود ان کی شان میں بدگمانی اور بدزبانی کو جائز نہیں سمجھتے اور صحابہ کے بارے میں اس قسم کا رویہ رکھنے والے کو حق سے منحرف سمجھتے ہیں۔

علمائے دیوبند کے نزدیک ان کے باہمی مشاجرات میں خطا وصواب کا تقابل ہے حق وباطل اور طاعت ومعصیت کا نہیں؛ اس لیے ان میں سے کسی فریق کو تنقید وتنقیص کا ہدف بنانے کو جائز نہیں سمجھتے۔

صلحائے امت

علمائے دارالعلوم دیوبند تمام صلحائے امت واولیاء اللہ کی محبت وعظمت کو ضروری سمجھتے ہیں لیکن اس محبت وتعظیم کا یہ معنی قطعاً نہیں لیتے کہ انھیں یا ان کی قبروں کو سجدہ و طواف اور نذر وقربانی کا محل بنالیا جائے۔

وہ اہل قبور سے فیض کے قائل ہیں استمداد کے نہیں۔ حاضری قبور کے قائل ہیں مگر انھیں عیدگاہ بنانے کو روا نہیں سمجھتے، وہ ایصال ثواب کو مستحسن اور اموات کا حق سمجھتے ہیں مگر اس کی نمائشی صورتیں بنانے کے قائل نہیں۔

وہ تہذیبِ اخلاق، تزکیۂ نفس اور عبادت میں قوتِ احسان پیدا کرنے کے لیے اہل اللہ کی بیعت وصحبت کو حق اور طریق احسانی کے اصول وہدایات کو تجربۃً مفید اور عوام کے حق میں ایک حد تک ضروری سمجھتے ہیں اور اسے شریعت سے الگ کوئی مستقل راہ نہیں سمجھتے

بلکہ شریعت ہی کا باطنی و اخلاقی حصہ مانتے ہیں۔

فقہ اور فقہاء

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ علمائے دیوبند احکام شرعیہ فروعیہ اجتہادیہ میں فقہ حنفی کے مطابق عمل کرتے ہیں بلکہ برصغیر میں آباد کم و بیش پچاس کروڑ مسلمانوں میں نوے فیصد سے زائد اہل سنت والجماعت کا یہی مسلک ہے؛ لیکن اپنے اس مذہب و مسلک کو آڑ بنا کر دوسرے فقہی مذاہب کو باطل ٹھہرانے یا ائمہ مذاہب پر زبانِ طعن دراز کرنے کو جائز نہیں سمجھتے کیوں کہ یہ حق و باطل کا مقابلہ نہیں ہے بلکہ احسن و حسن اور صواب و خطا کا تقابل ہے۔ مسائل فروعیہ اجتہادیہ میں ائمہ اجتہاد کی تحقیقات میں اختلاف کا ہو جانا ایک ناگزیر حقیقت ہے۔ اور شریعت کی نظر میں یہ اختلاف صحیح معنوں میں اختلاف ہے ہی نہیں۔ قرآن حکیم ناطق ہے:

شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوحاً وَالَّذِىْ اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا به إِبْرَاهِيْمَ وَمُوسٰى وَعِيسٰى أَنْ اَقِيمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْه۔ (الشوریٰ)

ظاہر ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دور تک شریعتوں اور منہاج کا کھلا ہوا اختلاف رہا پھر بھی قرآن حکیم اس کو ایک ہی دین قرار دے رہا ہے اور شریعتوں کے باہمی فروعی اختلاف کو وحدتِ دین کے معارض نہیں سمجھتا۔ اگر یہ فروعی تنوع بھی افتراق و اختلاف کی حد میں آسکتے تو پھر "وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ" کا خطاب کیوں کر درست ہوتا۔

لہٰذا جس طرح شرائعِ سماویہ فروعی اختلاف کے باوجود ایک ہی دین کہلائیں اور ان کے ماننے والے سب ایک ہی رشتہ اتحاد و اخوت میں منسلک رہے۔ تحزب و تعصب کی کوئی شان ان میں پیدا نہیں ہوئی؛ اسی لیے وہ "وَكَانُوْا شِيَعاً" کی حد میں نہیں آئے۔ ٹھیک اسی طرح ایک دین حنیف کے اندر فروعی اختلافات اس کی شان اجتماعیت و وحدت میں خلل انداز نہیں ہو سکتے۔

مواقع اجتہاد میں اہل اجتہاد کا اجتہاد بھی دین کا مقرر کردہ اصول ہے۔ اسے دین میں اختلاف کیسے کہا جا سکتا ہے۔ رہا جماعتِ مجتہدین میں سے کسی ایک کی پیروی وتقلید کو خاص کر لینا تو دین کے بارے میں آزادیِ نفس سے بچنے اور خودرائی سے دور رہنے کے لیے امت کے سوادِ اعظم کا طریق مختار یہی ہے، جس کی افادیت وضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ باب تقلید میں علمائے دیوبند کا یہی طرز عمل ہے۔ وہ کسی بھی امام، مجتہد یا اس کی فقہ کی کسی جزئی کے بارے میں تمسخر، سوئے ادب یا رنگ ابطال وتردید سے پیش آنے کو خسران دنیا وآخرت سمجھتے ہیں، ان کے نزدیک یہ اجتہادات شرائع فرعیہ ہیں اصلیہ نہیں کہ اپنی فقہ کو موضوع بنا کر دوسروں کی تردید یا تفسیق وتضلیل کریں؛ البتہ اپنی اختیار کردہ فقہ پر ترجیح کی حد تک مطمئن ہیں۔

مذکورہ بالا امور میں علمائے دیوبند کا یہ طرز عمل اور مسلک ان کی مؤلفات (شروح حدیث، تفسیر، فقہ وکلام وغیرہ) میں پوری تفصیل کے ساتھ مندرج ہیں، جنھیں دیکھ کر خود فیصلہ کیا جا سکتا ہے اس مختصر تحریر میں ان ساری تفصیلات کے اعادہ کی گنجائش نہیں۔

(۷) علمائے دار العلوم کا فکری اعتدال

علمائے دیوبند دین کے سمجھنے سمجھانے میں نہ تو اس طریق کے قائل ہیں جو ماضی سے یکسر کٹا ہو کیوں کہ وہ مسلسل رشتہ نہیں ایک نئی راہ ہے۔ اور نہ وہ اس افراط کے قائل ہیں کہ رسم ورواج اور تقلیدِ آباء کے تحت ہر بدعت اسلام میں داخل کر دی جائے۔ جن اعمال میں تسلسل نہ ہو اور وہ تسلسل خیر القرون سے متصل نہ ہو وہ اعمال اسلام نہیں ہو سکتے۔ یہ حضرات اس تقلید کے پوری طرح قائل ہیں جو قرآن وحدیث کے سرچشمہ سے فقہِ اسلام کے نام سے چلتی آئی ہے۔ قرآن کریم تقلید آباء کی صرف اس وجہ سے مذمت کرتا ہے کہ وہ آباء عقل واہتداء کے نور سے عاری تھے۔ ”اَوَلَو کَانَ آبَاءُ هُم لا یَعْقِلُون شیئاً وَلَا یَهتَدُون“

ائمہ سلف اور فقہائے اسلام جو علم وہدایت کے نور سے منور تھے ان کی پیروی نہ

صرف یہ کہ مذموم نہیں بلکہ مطلوب ہے ہمیں تعلیم دی گئی ہے کہ صرف حضرات انبیاء علیہم الصلاۃ والسلام ہی کی نہیں، صدیقین، شہداء اور صالحین کی راہ پر چلنے چلانے کی ہر نماز میں اللہ سے درخواست کریں؛ کیوں کہ یہی صراط مستقیم ہے۔ ”اِهدِنا الصِّراطَ المُستَقِيم صِراطَ الَّذِينَ أَنعَمتَ عَلَيهِم“

اس منہج اعتدال کی بنا پر علمائے دیوبند مذہبی بے قیدی اور خود رائی سے محفوظ ہیں اور شرک وبدعت کے اندھیرے انھیں اپنے جال میں نہ کھینچ سکے۔

(۸) فقہ میں سنت کی راہیں

برصغیر میں کم وبیش نوے فی صد مسلمان فقہ حنفی پر عامل ہیں۔ فقہ حنفی امام ابوحنیفہؒ کے اجتہادات، ان کے تلامذہ کے استخراجات اور اصحاب ترجیح کے فیصلوں کے مجموعہ کا نام ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قدر بحث وتحقیق اور کانٹ چھانٹ کے بعد فقہ کا کوئی مسئلہ اصولِ شریعت کے خلاف باقی نہیں رہ سکتا۔ مگر اس طریقِ عمل میں ایک پہلو یہ بھی تھا کہ عمل کرنے والے کی نظر ائمہ وفقہاء کی تخریجات تک محدود رہتی، گو وہ عمل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور صحابہ کے طریق سے متجاوز نہ ہوتا؛ مگر عمل کرنے والے کا شعور اتباع سنت کی لذت پوری طرح محسوس نہیں کرسکتا تھا۔ دارالعلوم دیوبند کا یہ عظیم تاریخی کارنامہ ہے کہ اس نے اعمال و عبادات کو ان کے بنیادی مصادر کی طرف لوٹایا۔ احادیث کے دفاتر کھلے، رجال کی گہری نظر سے پڑتال ہوئی، معانی حدیث میں بحث کی گئی، گو ان حضرات کو اس علمی وتحقیقی کاوش سے فقہ کا کوئی مفتی بہ قول اصول شریعت سے معارض نہ ملا تاہم اس راہ تحقیق نے (جو ظاہریت کی تفریط اور اہل بدعت کی افراط سے پاک سلف صالحین کے مقرر کردہ منہاج پر مبنی ہے) ایسی فضا پیدا کردی کہ پہلے جن مسائل پر فقہ سمجھ کر عمل کیا جاتا تھا اب وہی مسائل سنت کی خنک روشنی دینے لگے اور ان اعمال میں اتباع حدیث کی وہ لذت محسوس ہونے لگی جو اس فکری تبدیلی کے بغیر ممکن نہیں تھی۔

علمائے دیوبند نے نہ صرف برصغیر کے مسلمانوں ہی کو سنت کا شعور بخشا بلکہ دیگر بلاد

اسلامیہ مصر و شام وغیرہ بھی ان کے اس فکر سے متاثر ہوئے۔ دیوبندی مکتبۂ فکر کا نصوص فہمی میں منہج مختار یہی ہے، ان کی تالیفات مثلاً فیض الباری شرح بخاری، اللامع الدراری شرح بخاری، فتح الملہم شرح صحیح مسلم، الکوکب الدری شرح جامع ترمذی، معارف السنن شرح جامع ترمذی، بذل المجہود شرح سنن ابی داؤد، اوجز المسالک شرح مؤطا امام مالک، امانی الاحبار شرح معانی الآثار للطحاوی، اعلاء السنن، ترجمان السنۃ، معارف الحدیث وغیرہ میں ان کے اس منہجِ مختار کو دیکھا جاسکتا ہے۔

(۹) فتنۂ ارتداد اور تحفظ اسلام کے لیے فکر دار العلوم سے مربوط علماء کی سعیِ مشکور

برصغیر میں ۱۸۵۷ء کے سیاسی انقلاب کے بعد محدثین دہلی کے پیروکار اکابر دیوبند نے اپنی علمی و دینی بصیرت سے اس حقیقت کا پورا ادراک کرلیا کہ سماجی و اقتصادی تبدیلیاں جب اقتدار کے زیر سایہ پروان چڑھتی ہیں تو دینی و روحانی قدروں کی زمین بھی ہل جاتی ہے اس باب میں عثمانی ترکوں کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ ترک قوم مغربی تہذیب کے طوفان میں اپنے آپ کو سنبھال نہ سکی اور مصطفیٰ کمال کی قیادت میں اپنے ماضی سے کٹ گئی جس کا نتیجہ یہ ظاہر ہوا کہ ترکی کی اسلامی تہذیب، مغربیت میں فنا ہوگئی۔ اور ایک عظیم اسلامی سلطنت کا صفحۂ ہستی سے وجود ختم ہوگیا۔

الحاصل تہذیبِ اسلام کے لیے یہ نہایت نازک وقت تھا۔ تاریخ کے اس انتہائی خطرناک موڑ پر اکابر دیوبند کے سامنے وقت کی سب سے بڑی ضرورت یہ تھی کہ اسلامی تہذیب کو مغربیت کے اس سیلاب سے محفوظ رکھا جائے۔ اور مسلمانوں کے دین و مذہب کا تحفظ کر کے انھیں ارتداد سے بچایا جائے۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے پوری بیدار مغزی و ژرف نگاہی سے ہر اس محاذ کو متعین کیا جہاں سے مسلمانوں پر فکری و عملی یلغار ہوسکتی تھی اور پھر اپنی بساط کی حد تک حکمت و تدبر کے ساتھ ہر محاذ پر دفاعی خدمات انجام دیں۔

پہلا محاذ

غیر منقسم ہندوستان کی غالب اکثریت ایسے مسلمانوں کی ہے جن کے آباء واجداد کسی زمانے میں ہندو تھے۔ انگریزوں نے سیاسی اقتدار پر تسلط جما لینے کے بعد یہاں کے ہندوؤں کو اکسایا کہ یہ مسلمان جو کسی زمانہ میں تمہاری ہی قوم کے ایک حصہ تھے اس لیے اپنی عددی قوت کو بڑھانے کے لیے انھیں دوبارہ ہندو بنانے کی کوشش کرو چناں چہ انگریزوں کی خفیہ سرپرستی میں آریہ سماج کے ذریعہ مسلمانوں کو مرتد کرنے کی تحریک پوری قوت سے شروع ہوگئی۔

اسلام کے خلاف اس فکری محاذ پر حالات سے ادنیٰ مرعوبیت کے بغیر اکابر دارالعلوم نے اسلام کا کامیاب دفاع کیا۔ تقریر وتحریر، بحث ومناظرہ اور علمی ودینی اثر ونفوذ سے اس ارتدادی تحریک کو آگے بڑھنے سے روک دیا بالخصوص علمائے دیوبند کے سرخیل اور قائد وامام حضرت حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے اس سلسلے میں نہایت اہم ومؤثر خدمات انجام دیں برصغیر کی مذہبی وسماجی تاریخ کا ایک معمولی طالب علم بھی حضرت موصوف کی ان خدمات جلیلہ سے پوری طرح واقف ہے۔

تقسیم ہند کے قیامت خیز حالات میں جب کہ برصغیر کا اکثر حصہ خون کے دریا میں ڈوب گیا تھا اس ہولناک دور میں بھی شدھی وسنگٹھن کے نام سے مسلمانوں کو مرتد کرنے کی ایمان سوز تحریک برپا کی گئی۔ اس موقع پر بھی علمائے دیوبند وقت کے خونی منظر سے بے پرواہ ہوکر میدان میں کود پڑے اور خدائے رب العزت کی مدد ونصرت سے ارتداد کے اس سیلاب سے مسلمانوں کو بحفاظت نکال لے گئے۔

دوسرا محاذ

ہندوستان پر انگریزی تسلط کے بعد عیسائی مشنری برصغیر میں اس زعم سے داخل ہوئی کہ وہ ایک فاتح قوم ہیں، مفتوح قومیں فاتح قوم کی تہذیب کو آسانی سے قبول کرلیتی

ہیں۔ انھوں نے پوری کوشش کی کہ مسلمانوں کے دل و دماغ سے اسلام کے تہذیبی نقوش مٹادیں یا کم از کم انہیں ہلکا کر دیں تا کہ بعد میں انھیں اپنے اندر ضم کیا جاسکے۔ اور اگر وہ عیسائی نہ بن سکیں تو اتنا تو ہو کہ وہ مسلمان بھی نہ رہ جائیں۔

اس محاذ پر دارالعلوم اور اکابر دیوبند نے عیسائی مشنری اور مسیحی مبلغین سے پوری علمی قوت سے ٹکر لی اور نہ صرف علم و استدلال سے ان کے حملے پسپا کر دیئے بلکہ عیسائی تہذیب اور ان کے مذہبی ماخذ پر کھلی تنقید کی، اس سلسلے میں حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کی خدمات سے علمی دنیا اچھی طرح واقف ہے۔

تیسرا محاذ

اسی عیسائی ساز اسکیم کے تحت پورے ملک میں انگریزی اسکولوں کا جال بچھا دیا گیا اور اسلامی مدارس کو کمزور کرنے کی غرض سے ان کے لیے دنیوی ترقی کی تمام راہیں مسدود کر دی گئیں۔ اس محاذ پر ضروری تھا کہ قرآن وحدیث کی صحیح تعلیم اور اسلام کے آبرومندانہ ماحول کے لیے عربی مدارس کو ہر طرح کی قربانی دے کر پوری قوت سے باقی رکھا جائے۔ نیز جدید عربی مدارس قائم کیے جائیں اور اس کی امکانی سعی کی جائے کہ کوئی اجنبی بات اسلام کے نام پر اسلام میں گھسنے نہ دی جائے۔ جدید عصری نظریات سلف صالحین سے متوارث فکر وعمل کو کمزور نہ کر سکیں۔

اس محاذ پر بھی دارالعلوم اور اس کے اکابر نے پوری ذمہ داری کا ثبوت دیا اور ہندوستان کے چپے چپے پر عربی درس گاہوں کے ذریعہ علم دین کے چراغ روشن کر دیئے۔ اور اس بات کا بھر پور اہتمام کیا کہ برصغیر میں اسلام اپنی اصل شکل وصورت کے ساتھ نمایاں رہے۔ اس محاذ پر حضرت حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، ان کے رفیق خاص محدث کبیر مولانا رشید احمد گنگوہی، حضرت مولانا خلیل احمد محدث سہارنپوری صاحب بذل المجہود شرح سنن ابی داؤد، حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی اور آزادی کے بعد حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی وغیرہم اکابر دیوبند نے کامیاب جدوجہد کی۔

(۱۰) دارالعلوم نے ملت کو کیا دیا؟

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں بظاہر ناکام ہونے والے شکستہ دل مسلمانوں کی دینی و قومی روایات کا تحفظ کیا، ولی اللّٰہی منہاج پر تعلیمات دین کی وسیع پیمانے پر اشاعت کی، اسلام مخالف تحریکات کی سرکوبی کی، برصغیر اور دیگر براعظموں میں مساجد و مدارس کے ذریعہ قال اللہ وقال الرسول کی صداؤں کو عام کیا، فرنگی سامراج کے ظالمانہ اقتدار کی جڑیں اکھاڑ کر ہندوستان کو آزاد کرایا، اسلام اور پیغمبر اسلام پر کیے گئے ناروا حملوں کا جواب دیا، تفسیر، حدیث، فقہ، کلام اور جملہ علوم وفنون کا عظیم الشان ذخیرہ فراہم کیا، عظمت صحابہ اور عزت اسلاف کا تحفظ کیا، منکرین ختم نبوت کا کامیاب تعاقب کیا، بدعات کی تاریکیوں میں سنت کی مشعلیں روشن کیں اور آئندہ کام کرنے کے لیے سیکڑوں مجاہد، عالم، مفسر، محدث، متکلم، فقیہ، مرشد، مؤرخ، مقرر، خطیب، طبیب، مناظر، صحافی، صوفیا، قراء، حفاظ اور سیاستداں پیدا کیے۔

تعداد فضلائے دارالعلوم دیوبند ۱۲۸۳ھ تا ۱۴۲۱ھ

ہندوستان	۲۰۳۷۹	مصر	۱
پاکستان	۱۵۲۴	یمن	۱
بنگلہ دیش	۲۱۵۴	انڈونیشیا	۱
افغانستان	۱۱۸	ملیشیا	۵۱۸
نیپال	۱۱۹	کمبوڈیا	۱
شری لنکا	۱۹	امریکہ	۱۶
چین	۴۴	افریقہ	۲۳۷
روس	۷۰	برطانیہ	۲۱
ایران	۱۱	سوڈان	۶
عراق	۲	ویسٹ انڈیز	۴
کویت	۲	تھائی لینڈ	۸

سعودی عرب	۲	نیوزی لینڈ	۲
مسقط	۱	فرانس	۱
مالدیپ	۱	فیجی	۷
ترکستان	۲۰	لبنان	۶

تعداد بیرون ملک : ۵۰۷۸

تعداد اندرون ملک : ۳۳۵۳۰

کل تعداد : ۳۸۶۰۸

(۱۱) طبقات مشاہیر علمائے دیوبند

یہ ایک سرسری اور مختصر فہرست ہے جس میں اچھا خاصا اضافہ ہوسکتا ہے

محدثین

(۱) حضرت مولانا احمد علی سہارنپوریؒ
(۲) حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ
(۳) حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ
(۴) حضرت مولانا محمد مظہر نانوتویؒ
(۵) حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ
(۶) حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ
(۷) حضرت مولانا فخر الحسن گنگوہیؒ
(۸) حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ
(۹) حضرت مولانا عبد العلی میرٹھیؒ
(۱۰) حضرت مولانا علامہ انور شاہ کشمیریؒ
(۱۱) حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ
(۱۲) حضرت مولانا محمد اسحاق امرتسریؒ
(۱۳) حضرت مولانا بدر عالم میرٹھیؒ
(۱۴) حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ
(۱۵) حضرت مولانا عبد العزیز گجرانوالہؒ
(۱۶) حضرت مولانا فخر الدین مرادآبادیؒ
(۱۷) حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا سہارنپوریؒ
(۱۸) حضرت مولانا حبیب الرحمٰن محدث اعظمیؒ
(۱۹) حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ
(۲۰) حضرت مولانا ماجد علی جون پوریؒ
(۲۱) حضرت مولانا عبد الغفار مئویؒ
(۲۲) حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ
(۲۳) حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ
(۲۴) حضرت مولانا اشفاق الرحمٰن کاندھلویؒ
(۲۵) حضرت مولانا مفتی سید مہدی حسن شاہجہانپوریؒ
(۲۶) حضرت مولانا عبد الرحمٰن کامل پوریؒ

مفسرین

(۱) حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ
(۲) حضرت مولانا عبدالرحمٰن امروہویؒ
(۳) حضرت حکیم الامۃ مولانا اشرف علی تھانویؒ
(۴) حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ
(۵) حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ
(۶) حضرت مولانا احمد سعید دہلویؒ
(۷) حضرت مولانا حسین علی پنجابیؒ
(۸) حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ
(۹) حضرت مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندیؒ
(۱۰) حضرت مولانا علامہ شمس الحق افغانیؒ
(۱۱) حضرت مولانا غلام اللہ خانؒ
(۱۲) حضرت مولانا قاضی زاہد الحسینیؒ
(۱۳) حضرت مولانا اخلاق حسین قاسمی مدظلہ

متکلمین اسلام

(۱) حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ
(۲) حضرت مولانا رحیم اللہ بجنوریؒ
(۳) حضرت مولانا مرتضیٰ حسن چاندپوریؒ
(۴) حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ
(۵) حضرت مولانا قاری محمد طیب قاسمیؒ
(۶) حضرت مولانا علامہ محمد ابراہیم بلیاویؒ
(۷) حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ
(۸) حضرت مولانا علامہ شمس الحق افغانیؒ
(۹) حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ
(۱۰) حضرت مولانا علامہ خالد محمود مدظلہ
(۱۱) حضرت مولانا قاضی مظہر حسین مدظلہ

مصنّفین ومؤرخین

(۱) حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ
(۲) حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ
(۳) حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ
(۴) حضرت مولانا مناظر احسن گیلانیؒ
(۵) حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ
(۶) حضرت مولانا حبیب الرحمٰن محدث اعظمیؒ
(۷) حضرت مولانا قاری محمد طیب قاسمیؒ
(۸) حضرت مولانا سعید احمد اکبرآبادیؒ
(۹) حضرت مولانا محمد زکریا شیخ الحدیث سہارنپوریؒ
(۱۰) حضرت مولانا سید محمد میاں دیوبندیؒ
(۱۱) حضرت مولانا قاضی زین العابدینؒ
(۱۲) مولانا نورالحسن سیرکوٹیؒ
(۱۳) مولانا یعقوب الرحمٰنؒ
(۱۴) حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ

(۱۵) مولانا سرفراز احمد صفدرؒ

(۱۶) مولانا سید نور الحسن بخاریؒ

(۱۷) مولانا قاضی محمد اطہر مبارک پوریؒ

(۱۸) حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

(۱۹) مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہ

(۲۰) مولانا مفتی محمد یوسف لدھیانویؒ

(۲۱) مولانا وحید الزماں کیرانویؒ

فقہاء

(۱) حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ

(۲) حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن دیوبندیؒ

(۳) حضرت مولانا سعادت علی سہارنپوریؒ

(۴) حضرت حکیم الامۃ مولانا اشرف علی تھانویؒ

(۵) حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلویؒ

(۱۱) حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ میرٹھیؒ

(۱۲) حضرت مولانا مفتی سید مہدی حسن شاہجہانپوریؒ

(۱۳) حضرت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہیؒ

(۱۴) حضرت مولانا مفتی نظام الدین اعظمیؒ

(۱۵) حضرت مولانا مفتی محمد اسمٰعیل بسم اللہ سورتیؒ

(۱۶) حضرت مولانا مفتی احمد سعید اجراڑویؒ

(۱۷) حضرت مولانا فقیر اللہ رائے پوریؒ

(۱۸) حضرت مولانا مفتی محمود سرحدیؒ

(۱۹) حضرت مولانا مفتی جمیل احمد تھانویؒ

(۲۰) حضرت مولانا مفتی محمد یوسف آزاد کشمیرؒ

(۶) حضرت مولانا اعزاز علی امروہویؒ

(۷) حضرت مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندیؒ

(۸) حضرت مولانا مفتی محمد سہول بھاگلپوریؒ

(۹) حضرت مولانا مفتی ریاض الدین بجنوریؒ

(۱۰) حضرت مولانا مفتی محمد فاروقؒ

(۲۱) حضرت مولانا مفتی رشید احمد لدھیانویؒ

(۲۲) حضرت مولانا مفتی عبدالرحیم لاجپوری

(۲۳) حضرت مولانا مفتی عبدالکریم گمتھلویؒ

(۲۴) حضرت مولانا مفتی حبیب الرحمٰن خیر آبادی مدظلہ

(۲۵) حضرت مولانا مفتی ظفیر الدین مفتاحی مدظلہ

(۲۶) حضرت مولانا مفتی منظور احمد مظاہری مدظلہ

(۲۷) حضرت مولانا ابوالقاسم نعمانی مدظلہ

(۲۸) حضرت مولانا مفتی عبدالرحمٰن دہلی مدظلہ

(۲۹) حضرت مولانا مفتی شبیر احمد مدرسہ شاہی مدظلہ

(۳۰) حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام مدظلہ

اصحابِ تدریس

(۱) حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ

(۲) حضرت مولانا سید احمد دہلویؒ

(۳) حضرت مولانا احمد حسن امروہویؒ

(۴) حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ

(۵) حضرت مولانا منفعت علی دیوبندیؒ

(۶) حضرت مولانا عبدالعلی میرٹھیؒ

(۷) حضرت مولانا عبدالمومن دیوبندیؒ
(۸) حضرت مولانا محمد مظہر نانوتویؒ
(۹) حضرت مولانا غلام رسول خاں ہزارویؒ
(۱۰) حضرت مولانا محمد صدیق انبیٹھویؒ
(۱۱) حضرت مولانا محمد مراد پاک پٹنیؒ
(۱۲) حضرت مولانا سید اصغر حسین دیوبندیؒ
(۱۳) حضرت مولانا محمد رسول خاںؒ
(۱۴) حضرت مولانا عبدالحق اکوڑویؒ
(۱۵) حضرت مولانا حمید الدین فیض آبادیؒ
(۱۶) حضرت مولانا کریم بخش سنبھلیؒ
(۱۷) حضرت علامہ محمد ابراہیم بلیاویؒ
(۱۸) حضرت مولانا خیر محمد جالندھریؒ
(۱۹) حضرت مولانا عبدالرحمٰن کامل پوریؒ
(۲۰) حضرت مولانا محمد صدیق کشمیریؒ
(۲۱) حضرت مولانا محمد عبدالسمیع دیوبندیؒ
(۲۲) حضرت مولانا زین العابدین اعظمیؒ
(۲۳) حضرت مولانا محمد یحییٰ سہسرامیؒ
(۲۴) حضرت مولانا مفتی محمد سہول بھاگلپوریؒ
(۲۵) حضرت مولانا محمد اعزاز علی امروہویؒ
(۲۶) حضرت مولانا محمد حسین بہاریؒ
(۲۷) حضرت مولانا شکر اللہ اعظمیؒ
(۲۸) حضرت مولانا علی احمد اعظمیؒ
(۲۹) حضرت مولانا عبدالصمد
(۳۰) حضرت مولانا اختر حسین دیوبندیؒ
(۳۱) حضرت مولانا محمد حیات سنبھلیؒ
(۳۲) حضرت مولانا احمد حسن کانپوریؒ
(۳۳) حضرت مولانا عبدالستار معروفیؒ
(۳۴) حضرت مولانا بشیر احمد بلند شہریؒ
(۳۵) حضرت مولانا معراج الحق دیوبندیؒ
(۳۶) حضرت مولانا فخر الحسن صاحب
سابق صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند
(۳۷) حضرت مولانا نصیر احمد خاں صاحب
صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند
(۳۸) حضرت مولانا نعیم صاحب دیوبندی
(۳۹) حضرت مولانا سالم قاسمی
(۴۰) حضرت مولانا وحید الزماں کیرانویؒ

مبلغینِ اسلام

(۱) حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلویؒ
(۲) حضرت مولانا سید مرتضیٰ حسن بجنوریؒ
(۳) حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلویؒ
(۴) حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ
(۵) حضرت مولانا ابوالوفا شاہجہانپوریؒ
(۶) حضرت مولانا محمد ادریس سکروڈویؒ
(۷) حضرت مولانا سید معظم علیؒ
(۸) حضرت مولانا محمد قاسم شاہجہانپوریؒ
(۹) حضرت مولانا عبدالجبار حصارویؒ
(۱۰) حضرت مولانا محمد علی جالندھریؒ

(۱۱) حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ
(۱۲) حضرت مولانا سید ارشاد احمد فیض آبادیؒ
(۱۳) حضرت مولانا احتشام الحق تھانویؒ
(۱۴) حضرت مولانا عبید اللہ بلیاویؒ
(۱۵) حضرت مولانا محمد عمر پالن پوریؒ
(۱۶) حضرت مولانا سید اسعد مدنی مدظلہ
(۱۷) حضرت مولانا قاری محمد صدیقؒ
(۱۸) حضرت مولانا محمد سالم قاسمی مدظلہ
(۱۹) حضرت مولانا عبد العلیم فاروقی مدظلہ

حضرات مشائخ

(۱) سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ
(۲) قطب ارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ
(۳) حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ
(۴) حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ
(۵) شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ
(۶) حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ
(۷) حضرت مولانا شاہ عبد الرحیم رائے پوریؒ
(۸) حضرت مولانا اسعد اللہ رام پوریؒ
(۹) حضرت مولانا عبد الحق اکوڑویؒ
(۱۰) حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ
(۱۱) حضرت مولانا شاہ عبد الغنی پھولپوریؒ
(۱۲) حضرت مولانا شاہ وصی اللہ فتح پوریؒ
(۱۳) حضرت مولانا مسیح اللہ خاں جلال آبادیؒ
(۱۴) حضرت مولانا قاری فخر الدین گیاویؒ
(۱۵) حضرت مولانا سید میاں اصغر حسین دیوبندیؒ
(۱۶) حضرت مولانا ضرغام الدین فیض آبادیؒ
(۱۷) حضرت مولانا شاہ عبد القادر رائے پوریؒ
(۱۸) حضرت مولانا عبد الغفور عباسی مدنیؒ
(۱۹) حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ
(۲۰) حضرت مولانا مفتی محمد حسنؒ
(۲۱) حضرت مولانا خیر محمد جالندھریؒ
(۲۲) حضرت مولانا قاری محمد طیب قاسمیؒ
(۲۳) حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریاؒ
(۲۴) حضرت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہیؒ
(۲۵) حضرت مولانا عبد الجبار معروفیؒ
سابق شیخ الحدیث مدرسہ شاہی مراد آباد
(۲۶) حضرت مولانا ابرار الحق ہردوئی مدظلہ
(۲۷) حضرت مولانا سید اسعد مدنی مدظلہ
(۲۸) حضرت مولانا قاری محمد صدیقؒ باندوی
(۲۹) حضرت مولانا انعام الحسن کاندھلویؒ
(۳۰) حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ
(۳۱) حضرت مولانا محمد طلحہ کاندھلوی مدظلہ
(۳۲) حضرت مولانا احمد علی آسامیؒ

مجاہدینِ وقائدینِ ملت

(۱) امام العصر حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ
(۲) امام انقلاب حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ
(۳) حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ
(۴) حضرت مولانا محمد میاں منصور انصاریؒ
(۵) حضرت مولانا خلیفہ غلام محمد دین پوریؒ
(۶) حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ شاہجہانپوریؒ
(۷) مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ
(۸) رئیس الاحرار حضرت مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانویؒ
(۹) حضرت مولانا محمد صادقؒ کراچی سندھ
(۱۰) حضرت مولانا سجاد حسین بہاریؒ
(۱۱) حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ
(۱۳) حضرت مولانا سید محمد میاں دیوبندیؒ
(۱۲) حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ
(۱۴) حضرت مولانا مفتی محمود سابق وزیر سرحدؒ
(۱۵) حضرت مولانا احتشام حسین تھانویؒ
(۱۶) حضرت مولانا سید اسعد مدنی مدظلہ

مناظرینِ اسلام

(۱) حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ
(۲) حضرت مولانا احمد حسن لاہوریؒ
(۳) حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ
(۴) حضرت مولانا سید مرتضیٰ حسن چاندپوریؒ
(۵) حضرت مولانا ابوالوفا شاہجہانپوریؒ
(۶) حضرت مولانا اسعد اللہ رامپوریؒ
(۷) حضرت مولانا سید ارشاد احمد فیض آبادیؒ
(۸) حضرت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہیؒ
(۹) حضرت مولانا منظور احمد نعمانیؒ
(۱۰) حضرت مولانا نور محمد ٹانڈویؒ
(۱۱) حضرت مولانا عبداللطیف اعظمیؒ
(۱۲) حضرت مولانا عبدالسلام فاروقی لکھنویؒ
(۱۳) حضرت مولانا عبدالحلیم فاروقیؒ
(۱۴) حضرت مولانا قاضی محمد مظہر حسین مدظلہ
(۱۵) حضرت مولانا عبدالستار تونسویؒ
(۱۶) حضرت مولانا لال حسین اخترؒ
(۱۷) حضرت مولانا احمد حیات فاتح قادیانؒ
(۱۸) حضرت مولانا علامہ خالد محمود مدظلہ
(۱۹) حضرت مولانا محمد اسمٰعیل کٹکی مدظلہ
(۲۰) حضرت مولانا امام علی دانش لکھیم پوریؒ
(۲۱) حضرت مولانا محمد امین صفدر اوکاڑویؒ

صحافی واہل قلم

۱- مولانا سید مناظر احسن گیلانی	ایڈیٹر ماہنامہ القاسم دارالعلوم دیوبند
۲- مولانا منظور احمد نعمانی	ایڈیٹر الفرقان بریلی ولکھنؤ

۳- مولانا سعید احمد اکبرآبادی	ایڈیٹر برہان دہلی
۴- مولانا احسان اللہ خاں تاجور نجیب آبادی	آپکی ادارت میں دسیوں رسائل جاری ہوئے
۵- مولانا مظہر الدین بجنوری	روزنامہ الامان دہلی
۶- مولانا شائق عثمانی	عصر جدید کلکتہ
۷- مولانا عامر عثمانی	ماہنامہ تجلی، دیوبند
۸- مولانا قاضی زید العابدین میرٹھی	الحرم میرٹھ
۹- مولانا حبیب الرحمٰن بجنوری	منصور اور الخلیل ہفتہ وار
۱۰- مولانا عبد الوحید صدیقی	نئی دنیا
۱۱- مولانا ازہر شاہ قیصر	ماہنامہ دار العلوم دیوبند (سابق ایڈیٹر)
۱۲- مولانا حامد الانصاری غازی	مدینہ بجنور، اور جمہوریت دہلی
۱۳- مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہ	البلاغ کراچی
۱۴- مولانا سمیع الحق مدظلہ	الحق اکوڑہ خٹک
۱۵- مولانا مفتی محمد یوسف لدھیانوی	بینات، بنوری ٹاؤن کراچی
۱۶- مولانا عبد العلی	البدر کاکوری
۱۷- مولانا محمد صادق علی بستوی	نقوش حیات، بستی
۱۸- مولانا اسیر ادروی	ترجمان اسلام بنارس، سہ ماہی
۱۹- مولانا اعجاز احمد اعظمی	المآثر، مئو، سہ ماہی
۲۰- مولانا مفتی محمد سلمان منصور پوری	ندائے شاہی مرادآباد
۲۱- مولانا نور الحسن راشد	احوال و آثار سہ ماہی مفتی الٰہی بخش اکاڈمی کاندھلہ
۲۲- مولانا محمد ہاشم القاسمی	الفیصل حیدرآباد
۲۳- مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی	بحث و نظر پٹنہ، سہ ماہی
۲۴- مولانا رضوان القاسمی	صفا، جامعہ سبیل السلام حیدرآباد
۲۵- حبیب الرحمٰن قاسمی اعظمی	ماہنامہ دار العلوم دیوبند
۲۶- مولانا کفیل احمد کیرانوی	آئینہ دار العلوم دیوبند (پندرہ روزہ)
۲۷- مولانا نور عالم امینی	الداعی (عربی)
۲۸- مولانا محمد سالم جامعی فاضل دیوبند	ہفت روزہ الجمعیۃ دہلی

علماءِ دیوبند اور علم القرآن

ایک سرسری جائزہ

شمار	زبان	اسمائے کتب	اسمائے مصنّفین	کیفیت
۱	اردو	موضح فرقان مع تفسیری فوائد سورۂ بقرہ ونساء	حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ	یہ ترجمہ طبع زاد نہیں بلکہ حضرت شاہ عبد القادر دہلوی کے ترجمہ قرآن کا جدید اردو ایڈیشن ہے، حضرت شاہ عبد القادرؒ کے الہامی ترجمہ کی تسہیل وتیسیر بجائے خود ایک کارنامہ ہے۔
۲	اردو	تفسیری فوائد	حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ	سورۂ بقرہ ونساء کے علاوہ پورے قرآن کے یہ تفسیری فوائد مستند ومعتبر تفسیروں کا سلیس و صاف اردو میں خلاصہ ہے جو کوزہ میں دریا سمودینے کا مصداق ہے۔
۳	اردو	ترجمۂ قرآن مع حواشی	حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ	ترجمہ نہایت سلیس ہے حواشی میں ربط آیات اور ضروری وضاحتیں بڑی وقیع ہیں، اب تک اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہوچکے ہیں۔
۴	اردو	ترجمۂ قرآن مع حواشی	حضرت مولانا عاشق الٰہی میرٹھی	یہ ترجمہ نہایت سلیس اور صاف اردو میں ہے اور اہل علم میں مقبول ہے اس ترجمہ کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ اس کا ایک ایک حرف حضرت شیخ الہندؒ کی نظر سے گذرا ہے۔
۵	اردو	ترجمہ قرآن	حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ	یہ ترجمہ سلاست ووضاحت میں اپنی مثال آپ ہے۔
٦	اردو	کشف الرحمٰن ترجمۂ قرآن	حضرت مولانا احمد سعید دہلویؒ	نہایت مقبول ومعتبر ترجمہ ہے ادبی ذوق رکھنے والے بطور خاص اس سے لطف اندوز ہوتے ہیں

۷	بنگلہ	ترجمۂ قرآن	مولانا محمد طاہر خلیفہ حضرت مدنیؒ	بنگال میں یہ ترجمہ بہت مقبول ہے۔
۸	آسامی	ترجمۂ قرآن	مولانا عبدالحق آسامی خلیفہ حضرت مدنی	
۹	اردو	بیان القرآن	حضرت حکیم الامت مولانا تھانویؒ	یہ تفسیر بے پناہ ظاہری ومعنوی خوبیوں کی حامل ہے اور اہلِ نظر علماء اسے اہم عربی تفسیروں کے درجہ میں شمار کرتے ہیں
۱۰	اردو	معارف القرآن ۸ جلدوں میں	حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی	قرآنی مسائل ومعارف کا بیش بہا خزانہ اور عام فہم فصیح اردو میں ہے اب تک اس کے دسیوں ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں
۱۱	اردو	معارف القرآن	حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی	اس تفسیر میں مؤلف نے حقائق ومعارف کے بیش بہا جواہرات جمع کر دیئے ہیں، سورۂ حجر تک مولانا موصوف کے قلم سے ہے اور بقیہ حصہ کی تفسیر انکے خلف رشید مولانا محمد مالک کاندھلوی نے تحریر کی ہے۔
۱۲	اردو	جواہر القرآن دو جلد	شیخ القرآن مولانا غلام اللہ خاں	نہایت عمدہ اور بیش بہا علمی فوائد پر مشتمل ہے، خاص طور پر اپنے استاذ غلام حسین علی تلمیذ حضرت گنگوہی کے افادات کو موصوف نے اس تفسیر میں بڑی خوبی سے جمع کر دیا ہے۔
۱۳	اردو	بلغة الحیران فی تفسیر قرآن	شیخ القرآن مولانا غلام اللہ خاں	یہ تفسیر بھی مولانا علامہ حسین علی کے فرمودات و افادات کی روشنی میں مرتب کی گئی ہے۔
۱۴	اردو	تفسیر القرآن	مولانا قاضی شمس الدین صاحب سابق استاذ دار العلوم دیوبند	اس تفسیر کے بعض اجزاء تسلیم کمپنی پاکستان نے شائع کئے تھے پتہ نہیں مکمل شائع ہوئی یا نہیں
۱۵	عربی	مشکلات القرآن	محدث عصر علامہ انور شاہ کشمیریؒ	نام سے اس کا موضوع ظاہر ہے یعنی اس میں قرآنی مشکلات ومبہمات کا حل موجود ہے اہلِ علم کیلئے اس کا مطالعہ ضروری ہے
۱۶	عربی	احکام القرآن	مولانا مفتی محمد شفیع مولانا محمد ادریس کاندھلوی مولانا ظفر احمد تھانوی اور مولانا محمد جمیل تھانوی	آیات احکام کی فقہی تفسیر ہے، اور اپنے موضوع پر اہم ترین خدمت ہے متعدد ضخیم جلدوں میں ادارۃ القرآن کراچی سے شائع ہو چکی ہیں۔

۱۷	پشتو	انوار القرآن	مولانا سید انوار الحق کاکاخیل فاضل دیوبند	
۱۸	پشتو	انکشاف القرآن	مولانا محمد ادریس طوروی فاضل جامعہ اسلامیہ ڈابھیل	
۱۹	افغانی	تیسیر القرآن	مولانا محمد طاہر مروانی عبدالرحمٰن امروہوی	ترجمہ وتفسیر غیر مطبوعہ
۲۰	عربی	حاشیہ تفسیر بیضاوی	مفسر قرآن مولانا عبدالرحمٰن امروہوی	
۲۱	اردو	حاشیہ تفسیر جلالین مع ترجمہ	حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی	جلالین کا یہ ترجمہ دیوبند سے قرآن کے حاشیہ پر چھپا تھا
۲۲	اردو	ترجمہ تفسیر خازن	// // //	
۲۳	عربی	منحۃ الجلیل خلاصہ معالم التنزیل	// // //	یہ خلاصہ لامع النور پریس آگرہ سے چھپا تھا اب بالکل نایاب ہے۔
۲۴	اردو	ترجمہ تفسیر ابن کثیر	مولانا انظر شاہ کشمیری صاحب	
۲۵	اردو	ترجمہ تفسیر مدارک التنزیل	// // //	
۲۶	اردو	ترجمہ تفسیر جلالین	مولانا محمد نعیم دیوبندی صاحب	
۲۷	ہندی	ترجمہ حضرت شیخ الہند مع فوائد عثمانی	مولانا سید ارشد مدنی صاحب بشرکت ماسٹر محمد سلیمان	ہندی زبان میں ترجمہ کے ساتھ تفسیری تشریحات کی یہ اولین خدمت ہے جو بحمداللہ علمائے دیوبند کے حصہ میں آئی، جمعیۃ علماء نے عمدہ کاغذ و طباعت سے مزین کر کے شائع کیا ہے۔
۲۸	اردو	ترجمہ وتفسیر	مولانا حبیب احمد کیرانوی	اس تفسیر کو حرفاً حرفاً حضرت تھانوی نے پڑھا ہے اور بعض مقامات کی اصلاح بھی فرمائی ہے۔
۲۹	پشتو	ترجمہ وتفسیر	مولانا فضل ودود، مولانا گل رحیم فاضل دیوبند	نصف نصف قرآن کی تفسیر دونوں حضرات نے کی ہے، خازن، معالم التنزیل، جمل اور روح البیان وغیرہ کو سامنے رکھ کر یہ تفسیر مرتب کی گئی ہے۔
۳۰	اردو	البیان فی علوم القرآن مع ترجمہ قرآن	مولانا سید ممتاز علی دیوبندی بانی دارالاشاعت لاہور	موصوف نے قرآن مجید کا ترجمہ اور علوم قرآن کی مکمل فہرست بڑی محنت وکاوش سے اس میں جمع کردی ہے یہ قرآنی انڈکس ۱۹۴۹ء میں گیانی پریس لاہور سے شائع ہوا تھا۔

۳۱	اردو	تفسیر تعلیم القرآن	مولانا قاضی زاہد الحسینی فاضل دیوبند	
۳۲	اردو	درس قرآن مجید	// // //	
۳۳	اردو	معالم التنزیل	مولانا محمد علی صدیقی کاندھلوی	تیس جلدوں پر مشتمل یہ ضخیم تفسیر درحقیقت تمام مستند و معتبر قدیم و جدید تفسیروں کا خلاصہ ہے۔
۳۴	اردو	الہام الرحمٰن	حضرت مولانا عبید اللہ سندھی	تدوین وتہذیب مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی
۳۵	اردو	تفسیر سورۂ فاتحہ	// // //	یہ جملہ تفاسیر دراصل مولانا سندھی مرحوم کے درسی افادات ہیں جنھیں بعد میں ان کے تلمیذ مولوی بشیر احمد لدھیانوی نے جمع و مرتب کر کے شائع کیا ہے، اس مجموعہ تفاسیر میں بعض باتیں قابل گرفت ہیں جس کی ذمہ داری مرتب پر ہی آتی ہے، مولانا سندھی اپنی تشریحات میں حضرت شیخ الہندؒ اور حضرت شاہ ولی اللہ قدس اسرارہما کی تحقیقات سے باہر نہیں نکلتے، جیسا کہ ان کی خود نوشت تالیفات شاہد ہیں۔
۳۶	//	تفسیر سورۂ قتال	// // //	
۳۷	//	تفسیر سورۂ فتح	// // //	
۳۸	//	تفسیر سورۂ مزمل و مدثر	// // //	
۳۹	//	تفسیر سورۂ والعصر	// // //	
۴۰	//	تفسیر سورۂ اخلاص	// // //	
۴۱	//	تفسیر سورۂ معوذتین	// // //	
۴۲	//	المقام المحمود تفسیر سورۂ عم	// // //	
۴۳	//	المقام المحمود تفسیر سورۂ بقرہ	// // //	
۴۴	اردو	درس قرآن کی سات مجلسیں	حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ	مراد آباد جیل میں حضرت شیخ مدنیؒ کے درس قرآن کا مجموعہ ہے جو اگرچہ سورۂ فاتحہ سے متعلق ہے پھر بھی علمی لطائف، رموز قرآن اور اسرار وحکم کا ایک خزینہ ہے جسے حضرت مولانا سید محمد میاں صاحبؒ نے جمع و مرتب فرمایا ہے۔
۴۵	سندھی	تفسیر القرآن	مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی صاحب	
۴۶	اردو	دروس سورۃ الفاتحہ	حضرت مولانا شمس الحق افغانی	یہ حضرت مولانا افغانی کے درسی افادات کا مجموعہ ہے جنھیں ان کے تلمیذ مولانا علی اصغر عباسی نے مرتب کر کے شائع کیا ہے، دروس کا یہ مجموعہ علمی نکات کا ایک بیش قیمت ذخیرہ ہے۔
۴۷	عربی	یتیمۃ البیان	حضرت مولانا محمد یوسف صاحب محدث بنوری	یہ مشکلات القرآن از محدث کشمیری کا مبسوط بلند پایہ مقدمہ ہے جو بجائے خود ایک مستقل تصنیف کی حیثیت رکھتا ہے، الگ سے کتابی شکل میں اور مشکلات القرآن کے ساتھ متعدد بار شائع ہو چکا ہے۔

۴۸	عربی	سبق الکلیات فی نسق الآیات	حضرت حکیم الامت مولانا تھانویؒ	پہلا رسالہ ربط آیات و سور سے متعلق ہے اور بقیہ سارے تفسیر و ترجمہ سے
۴۹	اردو	احسن الاثاث فی النظر الثانی		
۵۰	//	اصلاح ترجمہ دہلویہ		
۵۱	//	اصلاح ترجمہ حیرت		
۵۲	//	التقصیر فی التفسیر		
۵۳	عربی	سمط الدرر فی ربط الآیات والسور	مولانا طاہر مردانی	موضوع نام سے ظاہر ہے یہ کتاب اہل علم میں مقبول ہے اب تک اس کے چار ایڈیشن سے زائد نکل چکے ہیں۔
۵۴	اردو	علوم القرآن	حضرت مولانا شمس الدین افغانی	علوم قرآن پر بڑی معلومات افزا کتاب ہے اور اہل علم میں معروف و مقبول ہے۔
۵۵	اردو	علوم القرآن	مولانا محمد تقی عثمانی	علوم قرآن میں مشہور عربی کتاب مناہل العرفان کا عطر اس کتاب میں نچوڑ لیا گیا ہے۔
۵۶	اردو	معارف القرآن	مولانا قاضی زاہد الحسینی صاحب	علوم قرآن میں جامع و مفید کتاب ہے، اب تک کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔
۵۷	اردو	منازل العرفان فی علوم القرآن	مولانا محمد مالک کاندھلوی	اپنے موضوع پر نہایت جامع و ضخیم کتاب ہے حضرت شاہ ولی اللہ کی مشہور تالیف الفوز الکبیر کا خلاصہ بھی اس میں درج کر دیا گیا ہے۔
۵۸	عربی	العون الکبیر شرح الفوز الکبیر	مولانا مفتی سعید احمد پالنپوری استاذ دارالعلوم دیوبند	الفوز الکبیر کے حل کیلئے یہ شرح نہایت کارآمد اور علماء و طلبہ میں مقبول ہے۔
۵۹	اردو	تاریخ القرآن	مولانا عبد الصمد صارم فاضل دیوبند	تاریخ قرآن پر نہایت مستند اور معیاری کتاب ہے مصر و شام کے علماء نے بھی اسے وقعت کی نگاہ سے دیکھا ہے یورپ کے مصنّفین اس کا حوالہ دیتے ہیں
۶۰	اردو	البرہان فی اصول القرآن	مولانا محمد طاہر مردانی	مخطوطہ
۶۱	اردو	تفسیر ہدایت القرآن	مولانا مفتی سعید احمد پالن پوری، استاذ دارالعلوم دیوبند	موصوف اپنے دیگر علمی مشاغل کی وجہ سے چند پاروں سے زائد کی تفسیر اب تک نہیں کر سکے ہیں۔
۶۲	اردو	تفسیری اشارات	العبد الضعیف حبیب الرحمٰن قاسمی خادم التدریس دارالعلوم دیوبند	تفسیر سورۂ بقرہ جس میں سورۃ کے عمود اور آیات کے مابین ربط کو ایک خاص انداز سے بیان کیا گیا ہے یہ تفسیر قسط وار ماہنامہ دارالعلوم دیوبند اور ہفت روزہ الجمعیۃ دہلی سے شائع ہو چکی ہے۔

۶۳	اردو	قصص القرآن ۴ جلد	حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی	آیات تاریخیہ کی محققانہ تفسیر وتشریح اپنے موضوع پر یہ کتاب نہایت بلند پایہ اور وقیع ہے اور اہل علم میں مقبول ومتداول ہے۔
۶۴	//	نیل السائرین فی طبقات المفسرین	مولانا محمد طاہر مردانی	اپنے موضوع پر نہایت مفید ہے۔
۶۵	//	تذکرۃ المفسرین ۲ جلد	مولانا قاضی زاہد الحسینی	مفسرین کے تذکرہ میں ایک عمدہ کتاب ہے تقریباً سات سو مفسرین کا تذکرہ کیا گیا ہے۔
۶۶	//	قاموس القرآن	مولانا قاضی زین العابدین میرٹھی	قرآن کے لغت میں ایک بہتر کتاب ہے اور علماء وطلبہ میں متداول ہے۔
۶۷	//	لغات القرآن	مولانا قاضی زاہد الحسینی	نام سے موضوع ظاہر ہے۔
۶۸	//	لغات القرآن ۷ جلدوں میں	مولانا عبد الرشید نعمانی ومولانا سید عبد الدائم جلالی	اپنے موضوع پر نہایت جامع اور تحقیقی کتاب ہے
۶۹	//	جنۃ النعیم فی استخراج لغات القرآن الکریم	مولانا اسد اللہ سندھی فاضل دیوبند	
۷۰	//	اعجاز القرآن	حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی	اس رسالہ میں قرآن کے اعجاز سے متعلق بڑی فاضلانہ بحث کی گئی ہے۔
۷۱	//	مقدمۃ القرآن	حضرت حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب سابق مہتمم دار العلوم دیوبند	یہ رسالہ الگ سے اور بعض تفسیروں کے ساتھ شائع ہو چکا ہے اس میں قرآنی حقائق واسرار پر ایک خاص انداز سے گفتگو کی گئی ہے۔
۷۲ ۷۳	اردو //	محاسن موضح القرآن مستند موضح القرآن	مولانا اخلاق حسین قاسمی دہلوی	
۷۴	اردو	درس تفسیر قرآن	مولانا علامہ حسین علی پنجابی تلمیذ حضرت گنگوہی	مولانا موصوف کے درسی افادات ہیں جنھیں ان کے بعض تلامذہ نے جمع کر دیا ہے۔
۷۵	عربی	حاشیہ تفسیر مدارک	مولانا عبد القادر بھوپالی فاضل دیوبند	صرف سورۂ بقرہ کا حاشیہ ہے اور بہت خوب ہے
۷۶		اسرار قرآنی	حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ	معوذتین کی تفسیر میں یہ رسالہ عجیب وغریب معلومات اور اسرار ورموز پر مشتمل ہے۔

۷۷		تفسیر رشیدی	حضرت قطب الارشاد مولانا رشید احمد گنگوہیؒ	اس مجموعہ تفسیر کو مولانا مفتی عزیز الرحمٰن بجنوری نے حضرت گنگوہی کی تصانیف سے اخذ کر کے جمع کیا ہے۔
۷۸	اردو	الحاوی شرح بیضاوی سورۂ بقرہ	مولانا فخر الحسن مرادآبادی	یہ مولانا موصوف کے درسی افادات پر مشتمل ہے جسے مولانا شکیل احمد سیتاپوری نے بوقت درس تحریر کرلیا تھا۔

نوٹ

علمائے دیوبند نے تفسیر قرآن، شرح حدیث، اصول فقہ، فقہ حنفی، توحید وعقائد، سیرت وآداب، تاریخ وتراجم، اخلاق وتصوف اور دیگر علوم وفنون، نیز فرق باطلہ، آریہ سماجی تحریک، عیسائیت، دہریت، قادیانیت، رافضیت کے رداور دین متین کی حفاظت میں جو کتابیں تصنیف کی ہیں ان کی تعداد ایک محتاط اندازہ کے مطابق ایک لاکھ سے کم نہ ہوگی، صرف ایک مصنف حضرت حکیم الامت مولانا تھانویؒ کی تصنیفات پانچ سو سے زائد ہیں، یہ فہرست تو صرف ایک موضوع پر نمونہ ازخروارے کا مصداق ہے، اور بغیر کسی خاص اہتمام کے سرسری طور پر تیار کی گئی ہے۔

قیاس کن زگلستانِ من بہار مرا

یہ ہے دارالعلوم دیوبند کا اجمالی تعارف، اس کا مسلک، مسائل اجتہادیہ میں اس کی ترجیحات، اور تحفظ دین، واحیاءِ سنت، قرآن وحدیث، فقہ اسلامی، اور دیگر علوم دینیہ کی نشر واشاعت، نیز قوم وملت کی آزادی، ورہنمائی کے سلسلے میں اس کی خدمات کا مختصر جائزہ

ایں سعادت بزور بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

وآخردعوانا ان الحمد للّٰہ رب العالمین، والصلوٰۃ والسلام علی سیدالمرسلین وعلی آلہ وصحبہ اجمعین.

(نوٹ) علم حدیث میں علماے دیوبند کی خدمات کے لئے راقم کی کتاب ”علماے دیوبند اور علم حدیث“ کا مطالعہ کیا جائے۔

☆ ☆ ☆

فرزندان دارالعلوم دیوبند کی فقہی تصنیفی خدمات

دارالعلوم دیوبند کی عظیم خدمات

دارالعلوم دیوبند برصغیر ایشیا کی وہ عظیم تعلیمی تحریک ہے جس نے مغرب سے آئے ہوئے الحاد اور بے دینی کے طوفان کا رخ موڑ دیا اور برصغیر میں اسلام کی نشأۃ ثانیہ کے ساتھ ملک میں انقلابی تحریک میں بھی بنیادی اور مؤثر رول ادا کیا۔

دارالعلوم نے اپنی تعلیمات کے ذریعہ علماء، مجاہدین اور رجال کار کی ایک ایسی جماعت پیدا کردی جس نے سخت سے سخت تر حالات میں بھی نہ صرف یہ کہ قوم وملت کی خدمت وحفاظت کی بلکہ دنیا میں اس کے وقار کو بلند کیا۔

تعلیم وتدریس، اصلاح وتلقین، تصنیف وتالیف غرضیکہ علم وعمل کا کوئی میدان ایسا نہ ملے گا جو فرزندان دارالعلوم سے خالی ہو۔ دارالعلوم کی اس ہمہ گیر خدمات میں سے ہم اس مضمون میں اس کی فقہی، خدمات کا مختصر جائزہ پیش کررہے ہیں چوں کہ دارالعلوم کی تفسیری، اصلاحی، ادبی اور سیاسی خدمات پر ماہنامہ الرشید کے دارالعلوم نمبر میں کافی مواد جمع کردیا گیا ہے نیز دارالعلوم کی حدیثی خدمات پر راقم کی ایک مستقل تصنیف ''علماء دیوبند اور علم حدیث'' کے نام سے دارالعلوم نے اجلاس صدسالہ کے موقع پر شائع کردی ہے۔ لیکن اس کے فقہی کارناموں پر اب تک مستقلاً کسی صاحب قلم نے کچھ نہیں لکھا ہے اس لئے ضرورت تھی کہ اس گوشہ کو بھی نمایاں کیا جائے۔ اگرچہ اس مختصر سے مقالہ میں دارالعلوم کی فقہی خدمات کا مکمل تعارف پیش نہیں کیا جاسکتا، مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر یہ مقالہ پیش کیا جارہا ہے جس سے اس باب میں ان کی خدمات کا کچھ اندازہ ہوجائے گا۔

دارالعلوم نے جہاں باکمال فقہاء اور نکتہ رس مفتیوں کی ایک بڑی جماعت تیار کی وہیں اپنے شعبۂ دارالافتاء سے تقریباً پانچ لاکھ سے زائد فتاویٰ بھی جاری کئے جو بذات خود احکام فقہیہ کا ایک دائرۃ المعارف اور امت کی دینی رہنمائی کے لئے ایک عظیم اور کافی وافی ذخیرہ ہے۔

حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن دیوبندیؒ ۱۲۷۵-۱۳۴۷ھ

حضرت مفتی صاحب بیک وقت ایک صاحب نظر فقیہ، مستند محدث، متبحر عالم دین اور باکمال شیخ تھے۔ دیوبند کے مشہور عثمانی خانوادہ کے روشن چراغ تھے۔ ۱۲/برس کی عمر میں حفظ قرآن سے فراغت حاصل کرلی۔ اس کے بعد فارسی اور عربی کی تعلیم شروع کی اور ۱۲۹۵ھ میں دارالعلوم کے نصاب کی تعلیم کو مکمل کر کے فارغ التحصیل ہوگئے۔ آپ کے اساتذہ میں حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ، حضرت مولانا سید احمد دہلویؒ، حضرت شیخ الہندؒ اور حضرت مولانا عبدالعلی جیسے باکمال اساطین علم وفضل ہیں۔

تکمیل کے بعد کچھ عرصہ تک دارالعلوم میں معین مدرس رہے اور ساتھ ہی حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کی نگرانی میں فتویٰ نویسی کی خدمت بھی انجام دیتے رہے۔ پھر اپنے اساتذہ کے حکم سے مدرسہ اسلامیہ اندرکوٹ میرٹھ میں باقاعدہ تدریسی خدمت سنبھال لی۔ ۱۳۰۹ھ میں اکابر دارالعلوم نے نائب مہتمم کی حیثیت سے آپ کو دارالعلوم بلالیا۔ نیابت اہتمام کی یک سالہ خدمت کے بعد آپ کو مفتی و مدرس مقرر کیا گیا اس وقت سے ۱۳۴۶ھ تک مسلسل تدریس کے ساتھ افتاء کی خدمت انجام دیتے رہے۔ فتویٰ نویسی میں جو کمال ومہارت حضرت مفتی صاحب کو حاصل تھا جماعت دیوبند میں حضرت امام ربانی مولانا گنگوہیؒ اور مفتی اعظم مولانا کفایت اللہ صاحب کے علاوہ کوئی تیسرا اس وصف میں ان کا شریک وسہیم نہیں ہے۔ حضرت مفتی صاحب بڑے بڑے معرکۃ الآرا اور اہم سوالوں کا جواب قلم برداشتہ بلاتکلف تحریر فرمادیا کرتے تھے۔ آپ کے فتاویٰ کی ایک بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کی زبان نہایت سلیس، عام فہم اور جچی تلی ہوئی ہے ۳۶-۳۷

برس تک آپ نے دارالعلوم میں افتاء کی خدمت انجام دی اس مدت میں شروع کے ۲۱ سال کے ریکارڈ محفوظ نہیں ہیں۔ کیونکہ ۱۳۴۶ھ تک دارالعلوم میں فتاویٰ کا کوئی ریکارڈ نہیں رکھا گیا۔ ذیقعدہ سن مذکور سے نقول فتاویٰ کا عمل شروع ہوا۔ اس وقت سے ۱۳۴۶ھ تک یعنی ۱۵ سال کے محفوظ ریکارڈ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دوران انھوں نے ۴۲۵۱۹ فتاویٰ تحریر فرمائے۔ آپ کے لکھے ہوئے ان فتووں کو تخریج مصادر اور فقہی ترتیب پر مرتب کر کے ''فتاویٰ دارالعلوم'' کے نام سے منجانب دارالعلوم شائع کیا جارہا ہے۔ اب تک دس جلدیں شائع ہوچکی ہیں۔ تحشیہ و ترتیب کی خدمت مولانا ظفیر الدین مفتاحی انجام دے رہے ہیں۔ (تاریخ دارالعلوم دیوبند ج۲ ص۴۵ تا ۴۸)

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ ۱۲۸۰-۱۳۶۲ھ

حضرت حکیم الامت علماء دیوبند میں جامع کمالات بزرگ ہیں جن کی نظیر اگلی صدیوں کے علماء اسلام میں بھی خال خال ہی نظر آتی ہے وہ ایک عظیم محدث، عظیم فقیہ، عظیم خطیب، عظیم مصلح اور عظیم مصنف تھے۔

حفظ قرآن اور فارسی و عربی کی ابتدائی کتابیں وطن میں حضرت مولانا فتح محمد تھانوی سے پڑھیں۔ ۱۲۹۵ھ میں دارالعلوم میں داخلہ لیا اور چار سال یہاں رہ کر علوم متداولہ کی تکمیل کی۔

تعلیم و تحصیل سے فراغت کے بعد پہلے کچھ دنوں مدرسہ فیض عام کان پور میں بحیثیت صدر مدرس کے تدریسی خدمات انجام دیں پھر یہاں سے الگ ہوکر کان پور ہی کے دوسرے مدرسہ جامع العلوم کی مسند صدارت کو زینت بخشی اور تقریباً ۱۳-۱۴ سال تک یہاں رہ کر تشنگان علوم کو سیراب کیا۔ ۱۳۱۵ھ میں کان پور چھوڑ کر وطن تھانہ بھون چلے آئے اور خانقاہ امدادیہ کو اپنے علمی و اصلاحی منصوبے کا مرکز بنایا اور یہیں سے دعوت و تبلیغ، تزکیۂ نفوس اور تصنیف و تالیف کا وہ عظیم الشان کارنامہ انجام دیا جس کی مثال صدیوں تک نہیں ملتی۔ حضرت حکیم الامت کی ذات علم و حکمت اور معرفت و طریقت کا ایسا سرچشمہ تھی جس

سے نصف صدی تک برصغیر کے مسلمان سیراب ہوتے رہے۔ دین کا ایسا کوئی شعبہ نہیں جس میں ان کی عظیم خدمات تقریری یا تصنیفی صورت میں موجود نہ ہوں۔ کثرت تصانیف کے لحاظ سے ہندوستانی مصنّفین میں ان کا کوئی جواب نہیں۔ آپ کی جملہ تصانیف کی تعداد ساڑھے نوسو بتائی جاتی ہے۔ اوران کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ ہندوپاک کے پڑھے لکھے گھرانوں میں مشکل سے کوئی ایسا گھر ملے گا جس میں حضرت تھانوی کی کوئی نہ کوئی تصنیف موجود نہ ہو ان میں مندرجہ ذیل کتابیں فقہی مسائل سے متعلق ہیں۔

(۱) بہشتی زیور گیارہ حصہ (۲) فتاویٰ امدادیہ چار حصہ (۳) الحیلۃ الناجزہ (۴) بوادر النوادر (۵) ترجیح الراجح (۶) تعلیم الدین (۷) تلخیص المنار (۸) اصلاح الرسوم (۹) صفائی معاملات (۱۰) القول الصواب فی الحجاب (۱۱) القول البدیع فی تخصیص المصر للتجمیع (۱۲) الحق الصریح فی التراویح (۱۳) تحفۃ الاخوان (سود کے موضوع پر) (۱۴) رسالہ در بحث سماع وغیرہ۔

حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ شاہجہاں پوری ۱۲۹۲-۱۳۷۲ھ

حضرت العلامہ، مفتی اعظم مولانا کفایت اللہ صاحب اپنے علم وفضل، فہم وتدبر، تقویٰ وطہارت، اخلاق وکردار اور مجاہدانہ کمالات کے اعتبار سے چودہویں صدی کے علماء میں ایک مثالی شخصیت کے مالک تھے۔ حضرت مفتی اعظم نے ابتدائی تعلیم وطن میں مکمل کر کے مدرسہ شاہی مرادآباد میں داخلہ لیا اور حضرت مولانا عبدالعلی تلمیذ حضرت نانوتویؒ سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ آخر میں تکمیل کے لئے دارالعلوم دیوبند پہنچے اور حضرت شیخ الہندؒ وغیرہ سے دورہ حدیث پڑھ کر بحسب تصریح صاحبزادہ محترم مولانا حفیظ الرحمٰن صاحب واصف ۱۳۱۵ھ میں فارغ ہوئے۔

فراغت کے بعد اپنے اولین استاذ مولانا عبیدالحق صاحب کے مدرسہ عین العلم شاہجہانپور میں درس وتدریس اور افتاء کی خدمات انجام دینی شروع کردیں۔ مولانا موصوف کی وفات کے بعد ۱۳۲۱ھ میں مولانا امین الدین صاحب کے اصرار پر مدرسہ

امینیہ دہلی کی مسند صدارت تدریس وافتاء کو سنبھال لیا اور تادم واپسیں اس منصب پر فائز رہے یعنی ۵۵ برس کی طویل مدت تک مدرسہ امینیہ میں علم وفنون کی تعلیم وتدریس کے ساتھ افتاء کی خدمات بھی انجام دیتے رہے۔ اس مدت میں آپ کے فتویٰ غیر منقسم ہندوستان کے علاوہ جاوا، سماترا، برما، ملایا، چین، بخارا، سمرقند، بلخ، بدخشاں، ختن، تاشقند، سمرقند، ترکستان، افغانستان، ایران، عرب، افریقہ، امریکہ اور انگلستان غرضیکہ جہاں بھی مسلمانوں کا وجود ہے وہاں پہنچے۔ حیرت تو یہ ہے کہ تعلیم وافتاء کی اس عظیم خدمات کے پہلو بہ پہلو سیاسی وملی خدمات، جنگ آزادی میں شرکت اور قید وبند کے مجاہدات کا سلسلہ بھی جمعیۃ علماء ہند کے پلیٹ فارم سے برابر جاری رہا جس کے ابتدائے قیام سے اپنے آخری ایام تک آپ صدر رہے۔

مفتی صاحب کے فتاویٰ کی ایک اہم خصوصیت جس میں وہ اپنے تمام معاصرین سے منفرد ہیں یہ ہے کہ ان کی عبارت مختصر ہونے کے ساتھ نہایت صاف، واضح اور عام فہم ہوتی ہیں، فقہی تصنیفات (۱) تعلیم الاسلام چار حصہ۔ اس کا ہندی اور انگریزی وغیرہ میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے اور ہندوستان کے اکثر مکاتب کے نصاب میں داخل ہے۔ (۲) کفایت المفتی ۹ حصہ۔ یہ مفتی صاحب کے فتاویٰ کا مجموعہ ہے جسے ان کے صاحبزادہ مولانا حفیظ الرحمٰن واصف نے اکٹھا اور مرتب کر کے شائع کیا ہے۔ (تاریخ دارالعلوم ج ۲ ص ۸۰ ودیباچہ کفایت المفتی)

حضرت مولانا سیّد اصغر حسین دیوبندیؒ ۱۲۹۴ھ-۱۳۶۴ھ

حضرت مولانا میاں اصغر حسین صاحب علوم دینیہ، حدیث، تفسیر، فقہ، فرائض وغیرہ میں کمال لیاقت کے ساتھ علوم باطنی میں بھی بلند مقام پر فائز تھے ان کی ذات علم وفضل، زہد وتقویٰ اور نیکی وپرہیزگاری کی بنا پر اپنے عہد میں مرجع خلائق تھی۔ آپ نے ۱۳۲۰ھ میں دارالعلوم سے فراغت حاصل کی۔

تکمیل کے بعد اپنے استاذ حضرت شیخ الہندؒ کی تجویز پر مدرسہ مسجد اٹالہ جون پور میں

بحیثیت صدر مدرس تدریس کا آغاز کیا اور تقریباً سات سال تک تشنگان علوم دینیہ اور مسلمانان جونپور کو اپنے علوم ظاہری و باطنی سے سیراب کیا۔ ۱۳۲۸ھ میں اکابر دارالعلوم کی طلب پر جونپور سے علیحدہ ہوکر دارالعلوم چلے آئے اور ماہنامہ ''القاسم'' کی ادارت کے ساتھ تفسیر، حدیث اور فقہ کے اسباق بھی آپ سے متعلق ہوئے اور زندگی کے آخری لمحہ تک دارالعلوم سے منسلک رہے۔

میاں صاحب نے تعلیم و تدریس کے علاوہ تصنیف و تالیف اور ارشاد و تلقین کی راہ سے بھی علمی و دینی خدمات انجام دیں۔ آپ کی متعدد تصانیف میں ذیل کی کتابیں علم فقہ کے موضوع پر ہیں۔ (۱) مفید الوارثین (۲) میراث المسلمین (۳) مسافر آخرت (۴) الجواب المتین باحادیث سید المرسلین (۵) فتاویٰ محمدی مع شرح دیوبندی۔ یہ سب کتابیں مطبوع ہیں (تاریخ دارالعلوم ج ۲، سوانح مولانا میاں سید اصغر حسین صاحب)

حضرت مولانا اعزاز علی امروہی ۱۳۰۰-۱۳۷۴ھ

حضرت شیخ الادب والفقہ مولانا اعزاز علی دارالعلوم کے ان ممتاز فضلاء میں ہیں جن کی علمی و عملی سرگرمیوں سے خود دارالعلوم کو نہایت دوررس فوائد حاصل ہوئے۔ ہر فن کی کتابوں پر انھیں کامل عبور تھا اور ان کا درس اس طرح دیتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ یہی آپ کا خصوصی فن ہے بالخصوص فقہ اور ادب میں تو آپ کو تبحر کا درجہ حاصل تھا۔ اسی بنا پر حلقۂ دارالعلوم میں آپ کو شیخ الفقہ والادب کے شان دار اور وقیع لقب سے یاد کیا جاتا تھا اور آج بھی اسی لقب سے مشہور ہیں۔ ۱۳۲۱ھ میں دارالعلوم سے فراغت کے بعد اپنے استاذ کبیر حضرت شیخ الہندؒ کے حکم سے مدرسہ نعمانیہ بھاگل پور سے اپنی تعلیمی و تدریسی خدمات کا آغاز کیا اور تقریباً سات سال تک اپنے علمی فیوض و برکات سے اس دیار کو مستفید کیا۔ بعد ازاں افضل المدارس کے نام سے شاہجہان پور میں خود ایک درس گاہ کی بنیاد رکھی، لیکن یہاں ابھی تین ہی سال گزرے تھے کہ اپنے استاذ و اکابر کی طلب پر ۱۳۳۰ھ میں دارالعلوم چلے آئے اور اس انہماک و خلوص سے دارالعلوم کی ہر خدمت

مفوضہ کو انجام دیا کہ ارباب اہتمام سے لے کر طلبہ تک آپ کے مداح و ثنا خواں تھے اور آج بھی جب حلقۂ دارالعلوم میں علمی شغف، طلبہ و ادارہ کی خیر خواہی اور وقت کی پابندی وغیرہ کا ذکر چھڑتا ہے تو بیساختہ زبانوں پر حضرت شیخ الفقہ والادب کا نام آجاتا ہے۔

آپ کو دارالعلوم میں اپنے کمال اخلاص، ممتاز صلاحیت اور بے پایاں جد و جہد کی بنا پر بڑا فروغ حاصل ہوا اور عمر کے آخری دور میں حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنیؒ کے بعد انھیں کا مقام و درجہ تھا چنانچہ حضرت کی غیر موجودگی میں متعدد بار بخاری شریف کا درس آپ ہی سے متعلق ہوا۔

حضرت شیخ الادبؒ نے تدریسی خدمات کے علاوہ شعبۂ دارالافتاء کی صدارت کے بھی فرائض انجام دیئے۔ آپ کے عہد صدارت میں دارالافتاء سے ۲۴۸۵۵ فتاویٰ جاری کئے گئے۔ نیز جب حضرت مولانا حافظ احمد صاحب مہتمم دارالعلوم ریاست حیدرآباد کے مفتی اعظم مقرر ہوئے تو انھوں نے ان کی نیابت کی خدمت بھی انجام دی۔

تصنیفی خدمات: حضرت شیخ الادب نے مستقل تصانیف اور اہم علمی مقالات کے علاوہ فقہ اور ادب کی متعدد کتابوں پر مفید حواشی بھی تحریر کئے جن میں ہمارے موضوع سے متعلق یہ ہیں۔ حاشیہ نورالایضاح فارسی حاشیہ نورالایضاح عربی، حاشیہ کنزالدقائق عربی، حاشیہ شرح نقایہ للملا علی قاری عربی (مقدمہ شرح نفحۃ العرب)

حضرت مولانا مفتی سید مہدی حسن شاہجہانپوری ۱۳۰۱-۱۳۹۶ھ

حضرت مولانا مفتی سید مہدی حسن صاحب فقہ، حدیث اور فن رجال حدیث میں اپنے دور کے ممتاز علماء میں شمار ہوتے تھے۔ ان کا سلسلہ تلمذ اگرچہ براہ راست دارالعلوم سے نہیں ہے کیوں کہ انھوں نے تمام تر تعلیم حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب سے مدرسہ امینیہ دہلی میں حاصل کی ہے۔ لیکن ۱۳۲۸ھ کے جلسۂ دستار بندی میں دارالعلوم نے انھیں دستار فضیلت عطا کر کے اپنے فرزندوں کے زمرہ میں شامل کر لیا۔

تعلیم سے فراغت کے بعد حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب نے انھیں مدرسہ

اشرفیہ راندیر ضلع سورت بھیج دیا۔ جہاں انھوں نے اپنی زندگی کے اولین چالیس سالہ ایام افتاء اور تدریس وتصنیف میں گزار دیئے۔ اور ۱۳۶۷ھ میں دارالعلوم کی طلب پر اس کے شعبہ دارالافتاء کی مسند صدارت کو سنبھالا اور بیس سال تک اس عظیم ذمہ داری کو بصد حسن و خوبی انجام دیا۔ ۱۳۸۷ھ میں اپنی مسلسل طویل علالت کی بنا پر اس خدمت سے سبکدوش ہوگئے۔ آپ کے زمانہ صدارت میں دارالافتاء سے ۵۳۲۴۷ فتاویٰ جاری ہوئے۔ مفتی صاحب ایک ماہر مفتی، صاحب نظر فقیہہ ہونے کے ساتھ زبردست محدث ومصنف بھی تھے۔ آپ کی مشہور تصنیف ’’قلائد الازہار شرح کتاب الآثار للامام محمد الشیبانی‘‘ اس کی شاہد عدل ہے۔ فقہی تصنیفی خدمات: تقریباً پون لاکھ فتاویٰ کے علاوہ آپ نے علم فقہ میں اہم کتابیں اور حواشی بھی تحریر کیئے جن میں بعض یہ ہیں: (۱) تصحیح وتعلیق کتاب الحجہ امام محمد۔ مفتی صاحب کی فقہی خدمات کا یہ ایسا عظیم شاہکار ہے، جسے قدماء کی کتابوں کے مقابلہ میں بلا جھجک رکھا جاسکتا ہے۔ اس عظیم کتاب کی تحقیق وتعلیق پر آپ نے اپنی زندگی کے بیس سال صرف کیئے۔ (۲) التطہیر فی نجاسۃ البیر (۳) اقامۃ القیامہ (مسئلہ طلاق ثلثہ) (۴) البرہان فی اشتراد السلطان (۵) رفع الارتیاب (۶) التحقیق النام (۷) اظہار الصواب (مسئلہ قرأۃ فاتحہ) (۸) النار اللامعہ فی حدیث لا جمعہ وغیرہ (روزنامہ الجمعیۃ دہلی ماہ)

مولانا عبدالحق نافع پشاوری ۱۳۱۳-۱۳۹۳ھ

حضرت مولانا عبدالحق نافع صاحب زیارت کا کاصاحب نوشہرہ ضلع پشاور میں پیدا ہوئے۔ موقوف علیہ تک کی تحصیل اپنے علاقہ کے علماء سے کی، تکمیل کے لئے دارالعلوم میں داخلہ لیا۔ حضرت محدث عصر مولانا انور شاہ کشمیریؒ کے حلقۂ درس میں شامل ہوکر فارغ التحصیل ہوئے۔

تکمیل کے بعد کچھ دنوں نواکھالی بنگال میں تدریسی خدمات انجام دیں۔ ۱۳۵۲ھ میں دارالعلوم کے درجہ علیا کے استاذ مقرر ہوئے اور پندرہ برس تک نہایت حسن وخوبی کے ساتھ اپنے فرائض منصبی کو انجام دیا۔ تقسیم ہند کے وقت دارالعلوم سے مستعفی ہوکر وطن چلے

آئے یہاں بھی تعلیمی وتدریسی مشغلہ قائم رہا اور مظہر العلوم کھنڈہ کراچی، دارالعلوم چارسدہ پشاور اور جامعہ اسلامیہ نیوٹاؤن کراچی میں بحیثیت شیخ الحدیث حدیث وتفسیر اور فقہ کی خدمات انجام دیں۔ آپ کے فتاویٰ ''ایضاح الفتاویٰ'' کے نام سے شائع ہو چکے ہیں اور علمی حلقہ میں مقبول ہیں۔ (ماہنامہ الرشید ساہیوال، دارالعلوم نمبر ص ۴۱۵)

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندیؒ ۱۳۱۴-۱۳۹۶ھ

صفوۃ العلماء، مفتی اعظم مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندیؒ صحیح معنی میں اکابر دیوبند کے مزاج ومذاق کے امین اور ان کی علمی، روحانی واخلاقی اقدار کے نگہبان تھے۔ مفتی صاحب دور حاضر کی ان بلند شخصیتوں میں سے ایک تھے جن کی زندگی علم دین اور فقہ اسلامی کی نشر واشاعت میں بسر ہوئی۔ مفتی صاحب نے از اول تا آخر مکمل تعلیم دارالعلوم دیوبند میں حاصل کی اور ۱۳۳۶ھ میں فارغ ہوکر ۱۳۳۷ھ سے دارالعلوم میں تدریسی کام شروع کردیا اور اپنی خداداد صلاحیت اور علمی استعداد ولیاقت کی بنا پر بہت جلد طبقۂ علیا کے درجہ میں پہنچ گئے۔ آپ کو فقہ، تفسیر اور ادب سے خصوصی مناسبت تھی۔ ۱۳۵۰ھ میں تدریس کے ساتھ دارالافتاء کی صدارت بھی آپ سے متعلق ہوگئی اور درمیان میں مختصر وقفہ کے ساتھ ۱۳۶۱ھ تک بعافیت حسن وخوبی اس عظیم ذمہ داری کو انجام دیتے رہے۔ آپ کے عہد صدارت میں تقریباً ۳۶۰۸۲ فتاویٰ جاری ہوئے۔ ۱۳۶۷ھ میں ہندوستان سے ترک وطن کرکے پاکستان چلے گئے۔ قیام پاکستان کے زمانہ میں برابر علمی واصلاحی خدمات انجام دیتے رہے، لیکن اس دور کا سب سے اہم ترین کارنامہ جسے علمی دنیا میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا ''دارالعلوم کراچی'' کا قیام ہے جو دارالعلوم دیوبند کے بعد برصغیر ایشیا کا سب سے اہم علمی ودینی ادارہ ہے۔ مفتی صاحب کا پاکستان کو یہ عظیم عطیہ ہے جس کے احسان سے اہل پاکستان کبھی عہدہ برآ نہیں ہوسکتے۔

فتویٰ نویسی کی عظیم ذمہ داری جو آپ کی اب تک کی زندگی کا جزو بنی ہوئی تھی پاکستان کے زمانۂ قیام میں اور ہمہ گیر ہوگئی۔ دنیا بھر کے ممالک سے فقہی سوالات کا تانتا

بندھا رہتا تھا۔ دارالعلوم کراچی میں جن فتاویٰ کی نقول محفوظ ہیں ان کی تعداد ۴۰۹۵۸ ہے۔ اس طرح ہندوپاک کے مجموعی فتاویٰ کی تعداد ڈیڑھ لاکھ تک پہنچ جاتی ہے۔ تحریر فتاویٰ کا یہ وہ حیرت انگیز تعداد ہے جس کی مثال شاید پوری ملت اسلامیہ میں نہ مل سکے گی۔

فتاویٰ کی اس کثیر تعداد کے علاوہ جو بذات خود ایک بے مثال فقہی کارنامہ ہے مفتی صاحب نے حدیث، تفسیر، فقہ، کلام، تاریخ وسیر اور فرق باطلہ وغیرہ موضوعات پر ۱۶۲ کتابیں اور رسالے بھی تالیف کئے جن میں پچانوے صرف فقہی ابواب پر ہیں، مثلاً: فتاویٰ دارالعلوم (امداد المفتیین چار جلد) (۲) اسلام کا نظام آراضی (۳) آلات جدیدہ کے شرعی احکام (۴) بیمۂ زندگی (۵) مسئلہ سود (۶) آداب المساجد (۷) رفیق سفر (سفر سے متعلق احکام) (۸) شب برأت (۹) تصویر کے احکام (۱۰) نکاح وطلاق، اعضاء انسان کی پیوندکاری (۱۱) پراویڈنٹ فنڈ پر زکوٰۃ اور سود (۱۲) ضبط ولادت کی شرعی حیثیت (۱۳) احکام حج (۱۴) قرآن میں زکوٰۃ کا نظام (۱۵) احکام دعاء (۱۶) جواہرالفقہ دو حصہ وغیرہ۔

(ماہنامہ البلاغ کراچی کا مفتی اعظم نمبر)

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب ۱۳۱۵ھ

حضرت حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند اپنے علم وفضل، ذہانت وذکاوت، وعظ وخطابت اور زہد وللّٰہیت کے لحاظ سے اپنے معاصرین میں بلند مقام ومرتبہ کے مالک ہیں۔ آپ نے سات برس کی عمر میں دارالعلوم میں داخلہ لیا اور ۱۳۳۷ھ میں جملہ علوم وفنون کی تحصیل کرکے سند فراغت حاصل کی۔ حضرت محدث کشمیری آپ کے استاذ خاص ہیں۔

تکمیل کے بعد درس وتدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ ۱۳۴۷ھ میں نائب مہتمم ہوئے اور وسط ۱۳۴۸ھ میں حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانیؒ کی رحلت کے بعد مہتمم کے منصب پر فائز ہوئے اور اب تک بحمداللہ اس عظیم ذمہ داری کو انجام دے رہے ہیں۔ دارالعلوم کو آپ کے حسن انتظام اور تنظیمی صلاحیت سے بیش از بیش فائدہ پہنچا۔

دارالعلوم کے انتظامی امور کے علاوہ جن چیزوں سے آپ کو طبعی مناسبت اور دل چسپی ہے وہ تصنیف و تالیف اور دعوت و تبلیغ ہے۔ اس وقت آپ برصغیر کے خطیبوں اور واعظوں میں امتیازی شان رکھتے ہیں آپ کی تقریر اسلامی حلقوں کے علاوہ جدید طبقہ میں بھی نہایت پسند کی جاتی ہیں۔ تصنیف و تالیف کا مشغلہ بھی انتظامی معاملات سے فراغت کے اوقات میں جاری رہتا ہے۔ اب تک کی مطبوعہ و غیر مطبوعہ تصانیف کی تعداد سو (۱۰۰) کے قریب ہے جو مختلف اسلامی موضوعات پر ہیں جن میں یہ کتابیں علم فقہ سے متعلق ہیں۔

(۱) شرعی پردہ (۲) داڑھی کی شرعی حیثیت (۳) المتشبہ فی الاسلام۔

ان گوناگوں مصروفیتوں کے ساتھ بیعت وارشاد کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ آپ کے مریدین کا حلقہ کافی وسیع ہے جو ہند و بیرون ہند میں پھیلے ہوئے ہیں۔ (تاریخ دارالعلوم دیوبند ج ۲ ص ۱۳۳ تا ۱۳۵)

حضرت مولانا سیّد بدر عالم میرٹھی ۱۳۱۶-۱۳۸۵ھ

حضرت مولانا سید بدر عالم میرٹھی اپنے علمی کمالات و محاسن کے لحاظ سے اہم ترین علماء میں شمار ہوتے ہیں۔ مولانا میرٹھی نے اولاً میٹرک تک عصری تعلیم حاصل کی بعد ازاں مظاہر علوم سہارنپور میں درس نظامی کی تحصیل و تکمیل کی اور حضرت مولانا خلیل احمد محدث سہارنپوری سے دورہ حدیث پڑھ کر سند و اجازت حاصل کی۔ تعلیم سے فراغت کے بعد مظاہر علوم میں دو سال تدریسی خدمات انجام دیں پھر مزید حصول علم کی غرض سے دارالعلوم دیوبند پہنچے اور حضرت محدث کشمیری کے حلقہ درس میں شامل ہوکر دوبارہ دورۂ حدیث پڑھا۔ دارالعلوم سے فراغت کے بعد ۱۳۴۰ھ میں وہیں مدرس ہو گئے اور وسط ۱۳۴۶ھ میں حضرت محدث کشمیری کے ہمراہ دارالعلوم سے الگ ہوکر جامعہ اسلامیہ ڈابھیل چلے گئے جہاں سترہ سال تک تدریسی خدمات انجام دیں۔ یہاں کے بعد ایک سال مدرسہ جامع العلوم بھاول نگر میں رہے۔ جامع العلوم سے علیحدگی کے بعد ندوۃ المصنّفین دہلی سے وابستہ ہو گئے، لیکن تقسیم ہند کے آگ و خون کے طوفان میں جب ندوۃ المصنّفین تباہ ہو گیا تو

یہاں سے دل برداشتہ ہوکر پاکستان چلے گئے۔ پاکستان میں ایک درس گاہ قائم کر کے اپنے تعلیمی وتدریسی ذوق کو پورا کرتے رہے آخر میں پاکستان سے بھی ہجرت کر کے مدینہ منورہ میں مقیم ہو گئے تھے۔

مولانا میرٹھی نے علم حدیث میں بڑی گراں قدر تصنیفات اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ ان کے علاوہ فقہ میں بھی یہ دو کتابیں آپ کے آثار علمیہ میں سے ہیں۔ مستناد الحضير حاشيه زادالفقير الشيخ ابن همام حنفیؒ، خلاصة المناسك تلخيص زبدة المناسك للشيخ گنگوهیؒ (علمائے دیوبند اور علم حدیث)

مولانا سید شمس الدین افغانی ۱۳۱۸ھ

حضرت مولانا سید شمس الدین افغانی پاکستان کے چند نامور محققین علماء میں سے ایک ہیں۔ آپ گیارہ برس تک ریاست ہائے متحدہ بلوچستان، قلات، فاران، مکران اور لس بیلہ کے وزیر تعلیم رہ چکے ہیں۔

مولانا افغانی نے اپنے والد ماجد مولانا سید غلام حیدر اور سرحد وافغانستان کے دیگر متعدد علماء سے فنون کی تحصیل کر کے دار العلوم دیوبند کا علمی سفر کیا اور حضرت محدث کشمیری کے حلقۂ درس میں شامل ہو کر ۱۳۳۹ھ میں دورۂ حدیث کی تحصیل وتکمیل کی۔ حدیث کے علاوہ طب کی تعلیم بھی انھوں نے دار العلوم میں حاصل کی بعد ازاں ایک سال تک بطور خود اساتذۂ دار العلوم کی رہنمائی میں مختلف علوم کے مطالعہ میں مصروف رہے۔

مولانا افغانی نے بھی اپنے اساتذہ و بزرگوں کی طرح درس و تدریس کو اپنا مشغلہ بنایا اور نصف صدی سے زائد مدت تک مختلف مدارس میں فقہ، حدیث اور تفسیر کا درس دیا۔ تین سال تک دار العلوم دیوبند میں بھی شیخ التفسیر رہے۔ ۱۳۷۲ھ سے تدریسی سلسلہ کو موقوف کر کے تصنیف و تالیف میں مشغول ہیں اور اب تک دو درجن کے قریب کتابیں تصنیف کر چکے ہیں جن میں (۱) معین القضاۃ والمفتی عربی (۲) اور شرعی ضابطہ دیوانی اردو فقہ سے متعلق ہیں۔ (ماہنامہ الرشید ساہیوال کا دار العلوم نمبر)

حضرت مولانا عبدالرحیم کیمبلپوری ۱۳۸۶ھ

مولانا عبدالرحیم صاحب پنجاب میں کیمبل پور کے رہنے والے تھے۔ ابتدائی تعلیم وطن ہی میں پائی پھر مظاہر علوم سہارنپور میں زیر تعلیم رہے آخر میں دارالعلوم میں داخلہ لیا اور ۱۳۳۳ھ میں دورۂ حدیث پڑھ کر سند و اجازت حاصل کی۔ آپ حضرت شیخ الہندؒ کے آخری تلامذہ میں سے تھے جملہ علوم متداولہ میں کامل دستگاہ رکھتے تھے بالخصوص فقہ اور حدیث میں آپ کی نظر بڑی وسیع تھی، ساتھ ہی زہد و تقوی، تواضع اور سادگی میں بھی منفرد تھے۔ فراغت تعلیم کے بعد مظاہر علوم میں مدرس مقرر ہوئے اور بڑی نیک نامی کے ساتھ فرائض تدریس کو انجام دیا۔ ۱۳۴۴ھ میں جب حضرت اقدس مولانا خلیل احمد صاحب نے مدینہ منورہ کا قصد فرمایا تو مولانا کیمبل پوری ہی کو اپنی جگہ صدارت تدریس کے لئے منتخب فرمایا تھا۔ تقسیم ملک کے وقت وطن گئے تو پھر واپس نہ آسکے۔ پاکستان میں بھی ٹنڈو الہ یار، ملتان اور اکوڑہ خٹک وغیرہ کی بڑی بڑی درس گاہوں میں شیخ الحدیث رہے۔

مولانا مرحوم نے تقریباً نصف صدی تک علوم دینیہ کی تدریسی خدمات انجام دیں۔ ارشاد و سلوک میں بھی خاص مقام رکھتے تھے۔ تصنیف و تالیف سے چنداں شغف نہیں تھا پھر بھی ''اسبال الازار'' کے نام سے ایک کتاب تالیف فرمائی جو اپنے موضوع پر نہایت جامع کتاب ہے یہ کتاب ابھی تک طبع نہیں ہوسکی ہے البتہ اس کا کچھ حصہ ماہنامہ ''نظام کانپور'' میں قسط وار شائع ہو چکا ہے۔ (تاریخ دارالعلوم دیوبند ج۲ ص۱۲۰ تا ۱۲۲)

مولانا مفتی محمد اسماعیل بسم اللہ سورتی ۱۳۱۶-۱۳۷۹ھ

مولانا مفتی محمد اسماعیل بسم اللہ صاحب ڈابھیل ضلع سورت کے رہنے والے تھے۔ ابتدائی تعلیم اپنے دیار میں حاصل کرنے کے بعد دارالعلوم دیوبند پہنچے، لیکن دوران تعلیم ہی میں بعض اسباب ضروریہ کی بنا پر گھر چلے گئے۔ کچھ دنوں کے بعد پھر تعلیمی سلسلہ شروع کیا اور مدرسہ امینیہ دہلی میں حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب کے حلقۂ درس میں شامل

ہوکر درسی کتابوں کی تحصیل کے ساتھ فتویٰ نویسی کی مشق بھی کی۔ ۱۳۳۲ھ میں دوبارہ پھر دارالعلوم میں داخلہ لیا اور حضرت محدث کشمیری وغیرہ سے دورۂ حدیث کی تکمیل کی۔

تعلیم سے فراغت کے بعد کچھ دنوں اپنے وطن ہی میں پڑھایا، پھر جوہانس برگ (افریقہ) چلے گئے۔ مگر وہاں زیادہ عرصہ تک قیام نہ رہ سکا اور جلد ہی واپس لوٹ آئے اور جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں مدرس ہوگئے ۱۳۵۳ھ میں برما میں مفتی مقرر ہوئے۔ وہاں فتویٰ نویسی کے ساتھ مولانا احمد اشرف کی معیت میں جمعیۃ علماء برما کی بنیاد رکھی اور کئی مدرسے مختلف مقامات میں قائم کئے ۱۳۵۹ھ میں برما سے واپس آکر جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں تعلیمی امور کے نگراں منتخب ہوئے پھر جلد ہی مہتمم مقرر ہوگئے۔

گجرات میں مفتی صاحب کی ذات مرجع خلائق تھی۔ وہاں کے نہ صرف عوام بلکہ علماء کی جماعت میں بھی ان کے فتاویٰ اہمیت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ تقریباً ۳۳ سال تک گجرات کے ہفت روزہ اخبار ''مسلم گجرات'' میں آپ کے فتاویٰ شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان فتاویٰ کی تین جلدیں گجراتی زبان میں شائع ہوچکی ہیں۔ کل فتاویٰ کی تعداد ۳۵ ہزار بتائی جاتی ہے۔ (تاریخ دارالعلوم دیوبند ج۲ ص ۱۳۱، ۱۳۲)

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی ۱۳۱۹ھ

محدث جلیل، فقیہ نبیل مولانا ابوالمآثر حبیب الرحمٰن اعظمی صاحب ہندوستان کی ان نادرہ روزگار ہستیوں میں سے ہیں جن پر ہندوستان کو بجا طور پر فخر ہے۔ اس وقت حدیث، رجال حدیث، اور متعلقات حدیث میں آپ کے امتیاز کو ہندو پاک کے علاوہ بلاد اسلامیہ کے علماء محققین بھی تسلیم کرتے ہیں۔ مولانا اعظمی نے مشکوٰۃ تک کی تعلیم اپنے قصبہ ہی کے اساتذہ سے حاصل کی جن میں مولانا ابوالحسن صاحب اور مولانا عبدالغفار صاحب خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ دورہ حدیث کی تحصیل کے لئے ۱۳۳۷ھ میں دارالعلوم دیوبند پہنچے مگر درمیان سال ہی میں بیمار ہوکر گھر چلے آئے۔ ۱۳۳۸ھ میں دوبارہ پھر دارالعلوم میں حاضر ہوئے اور محدث کشمیری کے حلقۂ درس میں شامل ہوکر ترمذی شریف کا معتدبہ

حصہ پڑھا مگر اس بار بھی سال تمام ہونے سے پہلے علالت کی وجہ سے گھر لوٹ آئے اور صحت یابی کے بعد قصبہ کی مشہور درسگاہ ''دارالعلوم مئو'' میں مولانا کریم بخش سنبھلی متوفی ۱۳۶۱ھ سے دورۂ حدیث کی تکمیل کی۔ تکمیل کے بعد دارالعلوم مئو ہی میں مدرس ہو گئے پھر دارالعلوم سے الگ ہو کر ۱۳۴۳ھ میں مظہرالعلوم بنارس میں صدارت تدریس پر فائز ہوئے۔ بعدازاں اپنے قصبہ کے ایک قدیم مدرسہ ''مفتاح العلوم مئو'' کی ۱۳۴۹ھ میں نشأۃ ثانیہ کی اور اس وقت سے ۱۳۶۹ھ تک اس کے شیخ الحدیث وصدر مدرس رہے اس کے بعد اپنے تصنیفی مشاغل اور مسلسل علالت کی بناپر عہدہ تدریس سے سبک دوش ہو گئے ۱۳۷۱ھ میں کانگریس کے ٹکٹ پر اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔ ممبری کے زمانہ میں مولانا ابوالحسن علی ندوی صاحب کے اصرار پر ایک سال ندوہ میں بخاری شریف کا درس دیا۔ ۱۳۷۳ھ سے مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند اور مرکزی جمعیۃ علماء ہند کے رکن رکین ہیں۔

محدث اعظمی نصف صدی سے زائد عرصہ سے حدیث کی خدمت انجام دے رہے ہیں اور تلامذہ کی ایک کثیر جماعت کے ساتھ ایک درجن حدیث کی اہم اور ضخیم کتابوں پر تحقیق وتعلیق کا کام مکمل کر چکے ہیں۔

حدیث کے ساتھ فقہ حنفی میں بھی آپ بلند مقام کے مالک ہیں اور حدیث کی طرح فقہ میں بھی آپ کی تحقیقات علماء کی جماعت میں قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔ دارالحرب کے موضوع پر آپ کا ایک تحقیقی مقالہ عرصہ ہوا ماہنامہ البلاغ بمبئی میں قسط وار شائع ہوا تھا جسے علمی حلقوں میں بے حد پسند کیا گیا۔ آپ فقہ کے موضوع پر برابر لکھتے رہتے ہیں ان مضامین کے علاوہ فقہی ابواب سے متعلق آپ کی یہ کتابیں بھی ہیں۔ رہبر حجاج، رکعات تراویح، ابطال عزاداری، الاعلام المرفوعہ، الازہار المرجوعہ وغیرہ۔ (علماء دیوبند اور علم حدیث)

حضرت مولانا سید محمد میاں دیوبندی دہلوی ۱۳۲۱-۱۳۹۵ھ

حضرت مولانا سید محمد میاں صاحبؒ اس دور کے نامور مصنف، مورخ اور عالم دین

تھے۔ فقہ اور تاریخ پر ان کی نظر بڑی گہری تھی۔ جمعیۃ علماء ہند کی تاریخ میں ان کی سیاسی و تصنیفی خدمات ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔ مولانا نے از اول تا آخر مکمل تعلیم دارالعلوم دیوبند میں پائی اور ۱۳۴۳ھ میں فراغت حاصل کی، دورۂ حدیث کے اساتذہ میں حضرت محدث کشمیری، علامہ عثمانی اور مولانا سید اصغر حسین صاحب بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ فراغت کے بعد مدرسہ عربیہ شاہ آباد پھر مدرسہ شاہی مرادآباد میں مدتوں تدریسی خدمات انجام دیں۔ ۱۳۸۴ھ میں مدرسہ امینیہ دہلی کے شیخ الحدیث اور صدر مفتی مقرر ہوئے اور تاحیات ان دونوں عہدوں پر فائز رہے۔ ۱۳۷۰ھ سے دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے رکن بھی رہے۔ ان خالص علمی و دینی خدمات کے ساتھ سیاسی امور میں بھی عملی طور سے دلچسپی لیتے تھے جس کی وجہ سے متعدد بار قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کرنی پڑیں ایک مدت تک جمعیۃ علماء ہند کے ناظم کے عہدے پر بھی رہے۔

مولانا مرحوم کثیر التصانیف مصنف ہیں ان کی زود نویسی اور تصنیف و تالیف میں انہماک کو دیکھ کر حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنیؒ ازراہ مزاح انھیں حیوان کاتب کہا کرتے تھے۔ مولانا کی کثیر تصانیف میں یہ کتابیں فقہ کے موضوع پر ہیں: (۱) شرح نور الایضاح اردو (۲) رسالہ رویت ہلال (۳) دینی رسالہ (کے بعض حصے) (۴) تحقیق دارالاسلام والحرب ان کتابوں کے علاوہ عصر حاضر کے جدید مسائل پر مولانا مستقل مقالات و مضامین لکھتے رہتے تھے جو ماہنامہ برہان دہلی، روزنامہ الجمعیۃ دہلی وغیرہ میں شائع ہوتے تھے۔ نیز مدرسہ امینیہ میں لکھے گئے کثیر فتاویٰ بھی آپ کی فقہی خدمات کا روشن باب ہیں۔

(علماء دیوبند اور علم حدیث)

مولانا محمد منظور نعمانی ۱۳۲۳ھ

حضرت مولانا محمد منظور نعمانی ایک بلند پایہ مناظر، مشہور (مصنف) کامیاب مقالہ نگار اور صاحب نسبت عالم دین ہیں۔ مولانا نے بیشتر کتابیں اپنے وطن کے مشہور عالم حضرت مولانا کریم بخش سنبھلی سے پڑھیں اور انھیں کے مشورہ سے آخر میں دارالعلوم میں

داخلہ لیا اور دو سال رہ کر ۱۳۴۵ھ میں دورۂ حدیث سے فراغت حاصل کی۔

فراغت کے بعد امروہہ کے مدرسہ چلّہ میں تین سال تدریس و تعلیم میں گزارے۔ چار سال ندوۃ العلماء لکھنؤ کے دارالعلوم میں بحیثیت شیخ الحدیث کے ترمذی و مسلم کا درس دیا۔ محرم ۱۳۵۲ھ میں بریلی سے ''الفرقان'' کے نام سے ایک ماہنامہ جاری کیا جو اب لکھنؤ سے نکلتا ہے اور ملک کے مقتدر علمی رسالوں میں شمار ہوتا ہے۔

مولانا نعمانی صاحب اب تک مختلف دینی و علمی موضوعات پر ایک صد کتابیں تحریر فرما چکے ہیں۔ آپ کا طرز نگارش سادہ، شگفتہ اور عام فہم ہوتا ہے فقہی احکام پر مشتمل آپ کی یہ تصانیف ہیں: (۱) آپ حج کیسے کریں (۲) آسان حج اردو اس کا ترجمہ بھی انگریزی میں ہو چکا ہے (۳) تحقیق مسئلہ ایصال ثواب۔ (علماء دیوبند اور علم حدیث)

حضرت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہی ۱۳۲۵ھ

حضرت مولانا مفتی محمود حسن صاحب مدظلہ العالی جودت طبع، کثرت مطالعہ، وسعت علم، جزئیات فقہیہ کے استحضار، زہد و تقویٰ، تواضع اور سادگی میں اس وقت اپنی مثال آپ ہیں۔ مفتی صاحب کی بیشتر تعلیم مظاہر علوم سہارنپور میں ہوئی۔ آخر کے تین سال دارالعلوم دیوبند میں گزارے پھر مزید ایک سال مظاہر میں رہے اور ۱۳۵۱ھ تعلیم و تحصیل سے فراغت ہوئی۔

فراغت تعلیم کے بعد مظاہر علوم میں تقریباً ۲۰ سال تک افتاء اور تدریس کی خدمات انجام دیں پھر ۱۳۷۱ھ سے ۱۳۸۴ھ تک جامع العلوم کانپور میں مسند صدارت و افتاء پر فائز رہے۔ کان پور میں بحیثیت مفتی آپ کی بڑی شہرت ہوئی، نیز اہل کان پور آپ کے زہد و تقویٰ اور علم و فضل سے بے حد متاثر ہوئے یہی وجہ ہے کہ آج بھی ان کی گرویدگی میں کوئی فرق نہیں آیا ہے اور آپ کے تعلقات کان پور والوں سے ویسے ہی قائم ہیں۔ ۱۳۸۵ھ میں دارالعلوم کی طلب پر شعبہ دارالافتاء کے صدر منتخب ہوئے اور تا ہنوز اس منصب جلیل پر فائز ہیں۔ فتویٰ نویسی کے ساتھ صحیح بخاری جلد ثانی کا درس بھی حضرت خاتم المحدثین مولانا

سید فخر الدین مراد آبادی کے ارشاد پر ان کی حیات ہی سے آپ سے متعلق رہا مگر گزشتہ سال سے آنکھوں میں تکلیف کی وجہ سے یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ مفتی صاحب کی کوئی مستقل تصنیف فقہی موضوع پر نہیں ہے۔ البتہ ان کے لکھے ہوئے فتاویٰ عرصہ سے ماہنامہ ''نظام کان پور'' میں برابر شائع ہوتے رہتے ہیں۔ نیز آپ کے فتاویٰ کو محمود الفتاویٰ کے نام سے مرتب کرنے کا کام بھی شروع ہو چکا ہے اور تین جلدیں مکمل ہو چکی ہیں۔ انشاء اللہ جلد ہی ترتیب مکمل ہو جانے کے بعد شائع ہو جائے گا۔

حضرت مولانا سید محمد یوسف محدث بنوریؒ ۱۳۲۶-۱۳۹۷ھ

نابغۃ العصر، محدث کبیر علامہ سید محمد یوسف بنوریؒ اس دور میں علم و فضل، تقویٰ وطہارت، زہد وقناعت اور توکل علی اللہ کے ایسا پیکر تھے جس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔

محدث بنوری نے متوسطات تک کی تعلیم پشاور اور کابل کے مختلف اساتذہ سے حاصل کی ۱۳۵۴ھ میں اعلیٰ تعلیم کے لیے دیوبند پہنچے اور یہاں دو سال رہ کر مختلف علوم و فنون کی تکمیل کی۔ اور ۱۳۴۷ھ میں جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں حضرت محدث کشمیری اور علامہ عثمانی وغیرہ سے دورہ حدیث پڑھ کر فارغ التحصیل ہوئے۔ فراغت تعلیم کے بعد حضرت محدث کشمیری کی صحبت میں رہ پڑے اور شب و روز کی مصاحبت میں کمالات انوری سے بھرپور استفادہ کیا۔ بعد میں جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں استاذ حدیث اور مجلس علمی کے رکن بنائے گئے اور ایک عرصہ تک دونوں خدمتوں کو انجام دیا۔ تقسیم کے بعد پاکستان ہی میں قیام اختیار کر لیا اور دار العلوم ٹنڈو الہ یار میں شیخ التفسیر مقرر ہوئے، لیکن چند ہی سال کے بعد وہاں سے الگ ہو کر کراچی چلے آئے اور غالباً ۱۳۷۴ھ میں جامعہ اسلامیہ نیوٹاؤن کی بنیاد رکھی ''جامعہ اسلامیہ'' اہل پاکستان کو حضرت علامہ بنوری کا وہ عظیم عطیہ ہے جس پر وہ جتنا فخر کریں کم ہے۔ آج یہ ادارہ اپنی بعض اہم خصوصیات میں برصغیر کے اسلامی اداروں میں منفرد مقام رکھتا ہے۔ اس اہم علمی یادگار کے علاوہ علامہ بنوری نے شرح حدیث وغیرہ کے موضوع پر نہایت عظیم الشان تصنیفی خدمات انجام دی ہیں جن کی تحسین

بلاد اسلامیہ کے علماء و مشائخ نے بھی کی ہیں۔ ہمارے موضوع سے متعلق مولانا کی ایک معرکۃ الآرا کتاب ''بغیۃ الاریب فی احکام القبلۃ والمحاریب'' ہے جو علمی حلقوں میں بے حد پسند کی گئی اور اپنے موضوع پر اہم ترین کتاب سمجھی گئی ہے۔

مولانا مفتی نظام الدین اعظمی ۱۳۲۸ھ

حضرت مولانا مفتی نظام الدین صاحب نے وطن کے مکاتب میں پڑھنے کے بعد چند سال مدرسہ احیاء العلوم مبارک پور اعظم گڑھ میں پڑھا بعد ازاں مدرسہ جامع العلوم جیّن پور اعظم گڑھ، مدرسہ عزیزیہ بہار شریف اور مدرسہ عالیہ فتح پوری دہلی میں درجات ثانوی تک تعلیم حاصل کی آخر میں دارالعلوم دیوبند پہنچے اور ۱۳۵۲ھ میں حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنیؒ وغیرہ سے دورہ حدیث کی تکمیل کی۔

تکمیل کے بعد تدریس کا سلسلہ شروع کیا اولاً مدرسہ جامع العلوم جیّن پور اور گورکھپور کے کسی ادارہ میں پڑھایا پھر مدرسہ دارالعلوم مئو ضلع اعظم گڑھ میں افتاء اور مدرس کے منصب پر مقرر ہوئے۔ ۱۳۸۵ھ میں دارالعلوم دیوبند میں افتاء کا منصب تفویض ہوا جس پر اب تک فائز ہیں فتاویٰ نویسی میں آپ کو کامل مہارت حاصل ہے ''نظام الفتاویٰ'' کے نام سے آپ کے اہم فتاویٰ کا انتخاب ضخیم جلد میں شائع ہو چکا ہے اس کے علاوہ اکثر اہم اور مفصل فتوے ماہنامہ ''دارالعلوم'' میں بھی شائع ہوتے رہتے ہیں۔ (تاریخ دارالعلوم دیوبند جلد ۲ ص ۲۵۹)

مولانا شمس الحق فرید پوری ۱۳۲۸-۱۳۸۸ھ

مولانا شمس الحق فرید پور بنگلہ دیش کے رہنے والے تھے۔ پہلے مظاہر علوم سہارنپور میں تعلیم حاصل کی۔ پھر دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے اور ۱۳۴۶ھ میں فارغ التحصیل ہوئے۔

فراغت کے بعد مولانا نے علمی و اصلاحی خدمات کے لئے ڈھاکہ میں جامعہ قرآنیہ کے نام سے ایک درس گاہ قائم کی جو آج ڈھاکہ کے دینی مدارس میں نمایاں درجہ کی حامل

ہے۔ مولانا بنگلہ زبان کے بڑے اچھے مصنف تھے انھوں نے بنگال کے مسلمانوں کو دینی تعلیم سے روشناس کرنے کے لئے بڑی اہم خدمات انجام دیں اور احکام شرعیہ سے انھیں واقف کرنے کیلئے بہشتی زیور کا بنگلہ زبان میں ترجمہ کیا جو وہاں نہایت مقبول ہوا۔ (تاریخ دار العلوم دیوبند ج ۲ ص ۱۶۰)

مولانا سرفراز خاں صاحب صفدر ۱۹۱۴÷/۱۳۳۳ھ

حضرت مولانا سرفراز احمد صفدر مدظلہ اپنی علمی و تحقیقی تصانیف کے لحاظ سے اس وقت پاکستان کے علماء میں ممتاز مقام و مرتبہ کے مالک ہیں۔ مولانا صفدر صاحب نے ابتدائی تعلیم اپنے علاقہ میں حاصل کی۔ پھر سیالکوٹ اور ملتان کے علماء سے استفادہ کیا۔ آخر میں دار العلوم دیوبند حاضر ہوئے اور حضرت شیخ الاسلامؒ کے حلقۂ درس میں شامل ہوکر ۱۳۶۱ھ میں فارغ ہوئے۔

فراغت کے بعد گوجرانوالہ کی جامع مسجد میں خطیب مقرر ہوئے اور ساتھ ہی تدریس کا سلسلہ بھی شروع کر دیا۔ ۱۳۷۴ھ سے مدرسہ نصرۃ العلوم گوجراں والا میں شیخ الحدیث کی حیثیت سے حدیث و فقہ کا درس دے رہے ہیں۔ تدریس کے ساتھ تصنیف کی اعلیٰ صلاحیتوں کے بھی مالک ہیں۔ اب تک ایک درجن سے زائد کتابیں مختلف دینی موضوعات پر تالیف فرما چکے ہیں۔ آپ کی تمام تصانیف نہایت تحقیقی اور ٹھوس علمی مباحث پر مشتمل ہوتی ہیں۔ انداز تحریر بڑا دل کش اور واضح ہے۔ فقہ و حدیث سے متعلق آپ کی یہ تصانیف ہیں (۱) احسن الکلام فی قراۃ خلف الامام ۲ جلد (۲) عمدۃ الاثاث فی طلاق الثلاث (۳) تسکین الصدور فی احوال الموتی والقبور (۴) مسئلہ قربانی (۵) درود شریف پڑھنے کا شرعی طریقہ (۶) حکم الذکر بالجہر۔ (ماہنامہ الرشید ساہیوال کا دار العلوم نمبر ص ۴۱۶)

مولانا سید بادشاہ گل ۱۳۳۳ھ

مولانا سید بادشاہ گل نے ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد مولانا سید مہربان علی شاہ سے

حاصل کی پھر پشاور کے متعدد علماء سے استفادہ کیا۔ ۱۳۵۶ھ میں دارالعلوم پہنچے اور حضرت شیخ الاسلامؒ، حضرت علامہ اور مولانا سید میاں اصغر حسین وغیرہ سے دورۂ حدیث پڑھ کر فارغ ہوئے تکمیل کے بعد وطن آئے اور جامعہ اسلامیہ اکوڑہ کی بنیاد رکھی اور درس و تدریس کا سلسلہ شروع کردیا۔ مولانا کے خلوص اور مسلسل جدوجہد کی بدولت آج یہ مدرسہ پاکستان کے بڑے مدرسوں میں شمار ہوتا ہے۔ تدریس کے ساتھ ساتھ تصنیف کا مشغلہ بھی جاری رہتا ہے اور اب تک متعدد کتابیں لکھ چکے ہیں جن میں ہمارے موضوع سے متعلق یہ ہیں: (۱) زیارۃ القبور (۲) کتاب الوسیلہ (۳) اعفاء اللحیٰ من سنن المصطفیٰ (ماہنامہ الرشید دارالعلوم نمبر ص ۶۱۷)

مولانا محمد طاہر مردانی ۱۳۳۵ھ

مولانا محمد طاہر صاحب نے ابتدائی تعلیم اپنے دیار کے علماء سے حاصل کی۔ تفسیر کی تحصیل مولانا حسین علی مفسر قرآن سے کی اور انھیں کے حکم سے مولانا نصیر الدین کیمبلپوری سے دورۂ حدیث پڑھا۔ یہاں سے فراغت کے بعد پھر مولانا حسین علی کے حلقہ درس میں شامل ہوگئے۔ کچھ دنوں ان سے استفادہ کرنے کے بعد دارالعلوم دیوبند آئے اور حضرت شیخ الاسلامؒ اور دیگر اساتذہ سے دورۂ حدیث دوبارہ پڑھا۔

فراغت کے بعد حضرت شیخ الادب کی تجویز پر منبع العلوم گلاؤٹھی میں ایک سال تدریسی خدمت انجام دی پھر پاکستان چلے گئے اور ۱۳۵۷ھ سے دارالقرآن پنج پیر مردان میں شیخ الحدیث ہیں اور حدیث تفسیر اور فقہ کا درس دیتے ہیں ساتھ ہی ایک درجن سے زائد کتابیں اور رسالے تحریر کرچکے ہیں جن میں فقہ کے موضوع پر یہ ہیں۔ (۱) البصائر للمتوسلین بالمقابر (۲) الرسالۃ البیضاء فی مسئلۃ الدعاء (۳) المصافحۃ بعد العیدین (۴) انشاط فی حیلۃ الاسقاط (دارالعلوم نمبر ص ۶۱۷)

مولانا مفتی عبدالحکیم سکھروی ۱۳۳۲ھ

مولانا مفتی عبدالحکیم سکھروی سندھ کے ممتاز عالم دین اور فاضل دیوبند ہیں۔ افتاء و

تدریس کے ساتھ ساتھ متعدد اصلاحی و دینی کتب و رسائل کے مصنف ہیں اس وقت مدرسہ اشرفیہ سکھر کے مفتی اور صدر مدرس ہیں۔ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ سے آپ کو اجازت وخلافت کا شرف بھی حاصل ہے۔ فقہ کے موضوع پر آپ کی یہ کتابیں ہیں (۱) دین کی باتیں ۲ حصہ (۲) رمضان المبارک (۳) اعتکاف (۴) مکہ مدینہ (حج و زیارت کے احکام پر) (ماہنامہ البلاغ کراچی کا مفتی اعظم نمبر ۹۴۱)

مولانا مفتی سیاح الدین پشاوری ۱۳۳۴ھ

مولانا مفتی سیاح الدین صاحب نے درس نظامی کی تقریباً نصف تعلیم اپنے وطن پشاور کے اساتذہ سے حاصل کی ۱۳۵۲ھ کو دارالعلوم دیوبند پہنچے اور چار سال یہاں رہ کر ۱۳۵۶ھ میں حضرت شیخ الاسلامؒ اور دیگر اساتذہ حدیث سے دورہ حدیث پڑھ کر فارغ التحصیل ہوئے۔ فراغت کے بعد سکرورہ ضلع کوہاٹ کے ایک مدرسہ میں ۴ سال مدرس رہے پھر یہاں سے دارالعلوم عزیزیہ سرگودھا آ گئے جہاں ۱۹۴۶÷ تک درجہ علیا کے مدرس ومفتی اور رسالہ شمس الاسلام کے مدیر رہے۔ اسی دوران ایک بحران کی وجہ سے جب دارالعلوم دیوبند میں اساتذہ کی سخت ضرورت پیش آ گئی تو حضرت مہتمم صاحب کی طلب پر آپ دارالعلوم آئے اور چھ ماہ یہاں تدریسی خدمت انجام دی اس وقت مدرسہ اشاعت العلوم لائل پور میں صدر المدرس ومفتی ہیں۔ ۱۹۷۷÷ میں عبوری حکومت نے آپ کو اسلامی نظریاتی کونسل کا رکن نامزد کیا جس میں تاحال تدوین قانون اسلامی کی اہم خدمات انجام دے رہے ہیں۔

آپ کے فتویٰ فقہی ابواب پر مرتب ہو کر شائع ہو رہے ہیں۔ (مفتی اعظم نمبر ۹۳۱)

مولانا مفتی رشید احمد لدھیانوی ۱۳۴۱ھ

مولانا مفتی رشید احمد صاحب لدھیانوی پاکستان کے ممتاز عالم دین، مفتی، حضرت مولانا شاہ عبدالغنی پھولپوریؒ کے مجاز بیعت اور اشرف المدارس کراچی کے بانی و مہتمم ہیں۔ آپ کے والد ماجد مولانا محمد سلیم صاحب کا وطن اصلی لدھیانہ تھا، اسی نسبت سے آپ

کو بھی لدھیانوی کہا جاتا ہے۔ پنجاب اور سندھ میں علوم وفنون کی تحصیل کر کے ۱۳۶۰ھ میں دورۂ حدیث پڑھنے کے لئے دارالعلوم حاضر ہوئے اور حضرت شیخ الاسلامؒ، حضرت شیخ الادب اور حضرت علامہ وغیرہ سے کتب حدیث پڑھ کر ۱۳۶۲ھ میں فارغ ہوئے۔ فراغت کے بعد مدرسہ مدینۃ العلوم بھینڈ ھ حیدر آباد سندھ میں علیا کے مدرس ہوئے۔ بعد میں ترقی کر کے شیخ الحدیث، صدر مدرس اور مفتی کے عہدوں پر فائز ہوئے۔ ۱۳۷۰ھ تا ۱۳۷۶ھ مدرسہ ٹھیڑ میں شیخ الحدیث اور مفتی رہے۔ پھر ۱۳۷۶ تا ۱۳۸۳ھ دارالعلوم کراچی میں بخاری شریف سمیت دورۂ حدیث کی دوسری کتب پڑھانے کا شرف حاصل رہا۔ ۱۳۸۳ھ میں اپنے شیخ ومرشد حضرت مولانا شاہ عبدالغنی پھولپوریؒ کے مشورہ سے ناظم آباد کراچی میں اشرف المدارس کی بنیاد رکھی اور آج کل وہیں خدمات انجام دے رہے ہیں۔

اشرف المدارس کراچی میں بطور خاص فارغ التحصیل ذی استعداد طلبہ کو فتویٰ نویسی کی مشق کرائی جاتی ہے اور ملک وبیرون ملک سے آنے والے استفتاء کے جوابات روانہ کئے جاتے ہیں۔

مولانا لدھیانوی تدریس وفتویٰ کے علاوہ متعدد کتب ورسائل کے مؤلف بھی ہیں جن میں ہمارے عنوان سے متعلق یہ کتابیں ہیں۔ احسن الفتاویٰ، یہ آپ کے فتاویٰ کا مجموعہ ہے جو کئی ضخیم جلدوں میں ہے۔ تسہیل المیراث وغیرہ (مفتی اعظم نمبر ص ۹۳۰)

مولانا عبدالشکور ترمذی ۱۳۴۱ھ

آپ حضرت مولانا مفتی عبدالکریم گمتھلوی کے صاحب زادہ، حضرت مولانا شاہ عبدالغنی پھولپوری کے مرید اور حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کے مجاز وخلیفہ ہیں۔ آپ کی ابتدائی تعلیم مدرسہ امداد العلوم تھانہ بھون میں ہوئی۔ عربی کی ابتداء مدرسہ علوم الشرعیہ مدینہ منورہ میں کی پھر درس نظامی کی تقریباً نصف کتابیں پٹیالہ، انبالہ اور کرنال کے مدارس میں پڑھیں بعد ازاں ۱۳۶۲ھ میں مظاہر علوم سہارنپور میں داخلہ لیا۔ لیکن آب وہوا کی ناموافقت کی وجہ سے بیمار پڑ گئے اور مجبوراً عید اضحیٰ کی تعطیل میں مظاہر العلوم کو چھوڑ کر

اپنے والد بزرگوار کے پاس قاسم العلوم بھاول نگر چلے گئے اور یہاں ایک سال زیر تعلیم رہ کر ۱۳۶۳ھ میں دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا اور دو سال یہاں رہ کر تعلیم مکمل کی۔ حدیث کے اساتذہ میں حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنیؒ، حضرت شیخ الادبؒ، حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلویؒ وغیرہ ہیں۔ تین ماہ حضرت خاتم المحدثین مولانا سید فخرالدین مرادآبادی سے بھی پڑھنے کا شرف حاصل ہوا کیوں کہ ان ایام میں حضرت شیخ الاسلام رخصت پر تھے۔

تعلیم سے فراغت کے بعد کچھ عرصہ راج پورہ ریاست پٹیالہ کے مدرسہ میں تدریسی خدمت انجام دی پھر مدرسہ حقانیہ شاہ آباد کرنال میں مدرس رہے اور تقسیم ملک کے بعد سے تاہنوز ساہیوال ضلع سرگودھا میں قیام ہے اور تعلیمی و اصلاحی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

تصنیفات: مولانا ترمذی نے تعلیم و تدریس کے ساتھ تصنیف و تالیف کے ذریعہ بھی نمایاں خدمات انجام دی ہیں اور اب تک تقریباً ۴۲ کتب و رسائل تالیف کر چکے ہیں جن میں علم فقہ سے متعلق یہ رسالے ہیں۔

(۱) فضائل و مسائل رمضان (۲) السعی المشکور فی احکام العاشور (۳) خلاصۃ الارشاد فی مسئلۃ الاستمداد (۴) تحقیق الجمعہ فی القریٰ (۵) تسہیل الارشاد (۶) فتاویٰ امداد السائل (۷) ارشاد العباد فی عید المیلاد (۸) فتویٰ کی حقیقت اور اس کی شرعی حیثیت۔ ان مستقل کتابوں کے علاوہ آپ کے علمی و تحقیقی مقالات پاکستان کے علمی و دینی مجلات میں اکثر شائع ہوتے رہتے ہیں۔ (مفتی اعظم نمبر ص ۱۰۳۵)

☆ ☆ ☆

علمائے دیوبند
اور جماعت اہلِ حدیث کی معاندانہ روش

پوری دنیا کے مسلمان ملت واحدہ اور آپس میں بھائی بھائی ہیں انما المؤمنون إخوۃ، ملکی وجغرافیائی تقسیم اس مرکزی عظیم قومیت میں خلل انداز نہیں ہوسکتی، اسی دینی اخوت ووحدت کے تحت ممالکِ اسلامیہ کی علمی وملی تقریبات میں علمائے دیوبند برصغیر (ہندوپاک، بنگلادیش) کے اسلامی نمائندوں کی حیثیت سے شامل ہوتے رہے ہیں۔ مدینہ یونیورسٹی ہو یا جامع ازہر، موتمر اسلامی ہو یا رابطہ اسلامی غرضے کہ دنیا کے کسی بھی خطہ میں مسلمانوں کا کوئی علمی وملی اجتماع ہو، ملکی وجغرافیائی، مسلکی ومشربی تفریق وتقسیم کے ادنیٰ احساس کے بغیر علمائے دیوبند پورے ذوق وشوق کے ساتھ ان میں شرکت کرتے رہے ہیں، جو ان کی اعتدال پسندی فرقہ وارانہ رجحانات سے دوری اور ساری دنیا کے مسلمانوں کو ملتِ واحدہ سمجھنے کی واضح اور روشن دلیل ہے۔ اور پوری بصیرت اور ذمہ داری کے ساتھ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ برصغیر میں اہل علم کا یہی وہ طبقہ ہے جو ملی وسماجی تمام وسعتوں اور عصری ضرورتوں پر نظر رکھے ہوئے سلف صالحین سے مکمل طور پر وابستہ ہے اور احقاق حق اور ابطالِ باطل کے ساتھ ساتھ قوم وملت کے اجتماعی مقاصد پر بھی اس کی نظر رہتی ہے۔ ذلك فضل اللّٰه يوتيه من يشاء ولو كره الاعداء من كل حاسد.

علمائے دیوبند کا استنادی رشتہ

اسلام کے تسلسل حیات اور حفظ دین کی خصوصیات اس کا اسنادی پہلو ہے اور تاریخ کے ہر موڑ پر اسے تھامے رہنا اسلام کا معجزہ ہے اسباب کی دنیا میں اس کا باعث وہ علمائے

ربانی رہے ہیں جو حضرت آدم سے لے کر نبی آخر الزماں ...... تک زنجیر کی کڑیوں کی طرح باہم پیوست ہیں، دیوبندی مکتبِ فکر بحمد اللہ کوئی نو پید جماعت نہیں بلکہ علمی، دینی اور سیاسی احکام و معاملات میں علمائے دیوبند کا سلسلۂ سند امام الہند شاہ ولی اللہ محدث دہلوی سے گذرتا ہوا نبی کریم ...... سے مربوط ہے۔

علمائے دیوبند کا اعتدال

علمائے دیوبند دین کے سمجھنے سمجھانے میں نہ تو اس طریق کے قائل ہیں جو ماضی سے یکسر کٹا ہو کیوں کہ وہ مسلسل رشتہ نہیں ایک نئی راہ ہے۔ اور نہ وہ اس افراط کے قائل ہیں کہ رسم ورواج اور تقلید آباء کے تحت ہر بدعت کو اسلام میں داخل کر دیا جائے۔ جن اعمال میں تسلسل نہ ہو اور وہ تسلسل خیر القرون سے مسلسل نہ ہو وہ اعمال اسلام نہیں ہو سکتے۔ یہ حضرات اس تقلید کے پوری طرح قائل ہیں جو قرآن وحدیث کے سرچشمہ سے فقہ اسلام کے نام سے چلتی آئی ہے۔ قرآن کریم تقلید آباء کی صرف اس وجہ سے مذمت کرتا ہے کہ وہ آباء عقل و اہتداء کے نور سے عاری تھے۔ "اَوَلَو كَانَ آباءُ هُم لا يَعْقِلُون شيئًا وَلاَ يَهتَدُونَ".

ائمہ سلف اور فقہائے اسلام جو علم وہدایت کے نور سے منور تھے ان کی پیروی نہ صرف یہ کہ مذموم نہیں بلکہ مطلوب ہے ہمیں تعلیم دی گئی ہے کہ صرف حضرات انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام ہی کی نہیں، صدیقین، شہداء اور صالحین کی راہ پر چلنے چلانے کی ہر نماز میں اللہ سے درخواست کریں؛ کیوں کہ یہی صراط مستقیم ہے۔ "اِهدِنا الصِّراطَ المُستَقِيم صِراطَ الَّذِينَ أَنعَمتَ عَلَيهِم"

اس منہج اعتدال کی بنا پر علمائے دیوبند مذہبی بے قیدی اور خود رائی سے محفوظ ہیں اور شرک وبدعت کے اندھیرے انھیں اپنے جال میں نہ کھینچ سکے۔

فقہ میں سلف صالحین کے منہاج کی پیروی

برصغیر میں کم وبیش نوے فی صد مسلمان فقہ حنفی پر عامل ہیں۔ فقہ حنفی امام ابوحنیفہؒ کے

اجتہادات، ان کے تلامذہ کے استخراجات اور اصحابِ ترجیح کے فیصلوں کے مجموعہ کا نام ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قدر بحث وتحقیق اور کانٹ چھانٹ کے بعد فقہ کا کوئی مسئلہ اصولِ شریعت کے خلاف باقی نہیں رہ سکتا۔ مگر اس طریق عمل میں ایک پہلو یہ بھی تھا وہ یہ کہ عمل کرنے والے کی نظر ائمہ وفقہاء کی تخریجات تک محدود رہتی، گو وہ عمل حضور......کی سنت اور صحابہ کے طریق سے متجاوز نہ ہوتا، مگر عمل کرنے والے کا شعور اتباع سنت کی لذت پوری طرح محسوس نہیں کرسکتا تھا۔ علمائے دیوبند کا یہ عظیم تاریخی کارنامہ ہے کہ انھوں نے اعمال و عبادات کو ان کے بنیادی مصادر کی طرف لوٹایا۔ احادیث کے دفاتر کھلے، رجال کی گہری نظر سے پڑتال ہوئی، معانی حدیث میں بحث کی گئی، گو ان حضرات کو اس علمی وتحقیقی کاوش سے فقہ کا کوئی مفتی بہ قول اصول شریعت سے معارض نہ ملا تاہم اس راہ تحقیق نے (جو ظاہریت کی تفریط اور اہل بدعت کی افراط سے پاک سلف صالحین کے مقرر کردہ منہاج پر مبنی ہے) ایسی فضا پیدا کردی کہ پہلے جن مسائل پر فقہ سمجھ کر عمل کیا جاتا تھا اب وہی مسائل سنت کی خنک روشنی دینے لگے اور ان اعمال میں اتباع حدیث کی وہ لذت محسوس ہونے لگی جو اس فکری تبدیلی کے بغیر ممکن نہیں تھی۔

علمائے دیوبند نے نہ صرف برصغیر کے مسلمانوں ہی کو سنت کا شعور بخشا بلکہ دیگر بلاد اسلامیہ مصر وشام وغیرہ بھی ان کے اس فکر سے متاثر ہوئے۔ دیوبندی مکتبہ فکر کا نصوص فہمی میں منہج مختار یہی ہے، جیسے ان کی تالیفات مثلاً فیض الباری شرح بخاری، اللامع الدراری شرح بخاری، فتح الملہم شرح صحیح مسلم، الکوکب الدری شرح جامع ترمذی، معارف السنن شرح جامع ترمذی، بذل المجہود شرح سنن ابی داؤد، اوجز المسالک شرح مؤطا امام مالک، امانی الاحبار شرح معانی الآثار للطحاوی، اعلاء السنن، ترجمان السنة، معارف الحدیث وغیرہ میں ان کے اس منہج مختار کو دیکھا جاسکتا ہے۔

علماء دیوبند کا مسلک

محدثین دہلی اور ان کے چشمۂ علم وعرفان سے سیراب علمائے دیوبند اپنے مسلک اور

دینی رخ کے اعتبار سے کلیتًا اہل سنت والجماعت ہیں پھر وہ خود رَو قسم کے اہل سنت نہیں بلکہ اوپر سے ان کا سندی سلسلہ جڑا ہوا ہے؛ اس لیے مسلک کے اعتبار سے وہ نہ کوئی جدید فرقہ ہیں نہ بعد کی پیداوار ہیں بلکہ وہی قدیم اہل سنت والجماعت کا مسلسل سلسلہ ہے جو اوپر سے سند متصل اور استمرار کے ساتھ کابراً عن کابرٍ چلا آرہا ہے۔

علماء دیوبند کے اس جامع، افراط وتفریط سے پاک مسلک معتدل کو سمجھنے کے لیے خود لفظ اہل سنت والجماعت میں غور کرنا چاہیے جو دو اجزاء سے مرکب ہے ایک ''السنۃ'' جس سے اصول، قانون، اور طریق نمایاں ہیں اور دوسرا ''الجماعۃ'' جس سے شخصیات اور رفقائے طریق نمایاں ہیں۔ اہل سنت والجماعت کے اس ترکیبی کلمہ سے یہ بات پورے طور پر واضح ہوتی ہے کہ اس مسلک میں اصول وقوانین بغیر شخصیات کے اور شخصیات بغیر قوانین کے معتبر نہیں کیوں کہ قوانین ان شخصیات ہی کے راستے سے آتے ہیں اس لیے ماخوذ کو لیا جانا اور ماخذ کو چھوڑ دینا کوئی معقول مسلک نہیں ہوسکتا۔

حدیث '''ما أنا علیه و أصحابي'' میں بہتر فرقوں میں سے فرقۂ ناجیہ کی نشاندہی فرماتے ہوئے رسول خدا...... نے معیار حق ان ہی دو چیزوں کو قرار دیا ''ما انا'' سے اشارہ سنت یعنی طریق نبوی یا قانون دین کی طرف ہے اور ''واصحابی'' سے اشارہ الجماعۃ یعنی برگزیدہ شخصیات کی طرف ہے بلکہ مسند احمد اور سنن ابی داؤد میں اصحابی کے بجائے الجماعۃ کا صریح لفظ موجود ہے۔

اس لیے تمام صحابہ، تابعین، فقہائے مجتہدین، ائمہ محدثین اور علمائے راسخین کی عظمت ومحبت ادب واحترام اور اتباع وپیروی اس مسلک کا جوہر ہے؛ کیوں کہ ساری دینی برگزیدہ شخصیتیں ذات نبوی سے انتساب کے بدولت ہی وجود میں آتی ہیں۔ پھر مختلف علوم دینیہ میں حذاقت ومہارت اور خداداد فراست وبصیرت کے لحاظ سے ہر شعبۂ علم میں ائمہ اور اولوالامر پیدا ہوئے اور امام ومجتہد کے نام سے انھیں یاد کیا گیا۔ مثلاً ائمہ اجتہاد میں امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل وغیرہ۔ ائمہ حدیث میں امام بخاری، امام مسلم، امام ابوداؤد، امام ترمذی، امام نسائی وغیرہ۔ ائمہ احسان واخلاص میں اویس قرنی،

فضیل بن عیاض وغیرہ۔ ائمہ حکمت وحقائق میں امام رازی، امام غزالی وغیرہ۔ ائمہ کلام میں ابوالحسن اشعری، ابومنصور ماتریدی وغیرہ۔ نیز اسی قسم کی دین کی اور برگزیدہ شخصیتیں ہیں جن کی درجہ بدرجہ توقیر وعظمت مسلک دیوبند میں شامل ہے۔

پھر ان تمام دینی شعبوں کے اصول وقوانین کا خلاصہ دو ہی چیزیں ہیں: ’’عقیدہ وعمل‘‘ عقیدے میں تمام عقائد کی اساس وبنیاد عقیدۂ توحید ہے اور عمل میں سارے اعمال کی بنیاد اتباع سنت ہے۔

توحید: مسلک دیوبند میں عقیدۂ توحید پر بطور خاص زور دیا جاتا ہے تاکہ اس کے ساتھ شرک یا موجبات شرک جمع نہ ہوں اور کسی بھی غیر اللہ کی اس میں شرکت نہ ہو۔ ساتھ ہی تعظیم اہل اللہ اور اربابِ فضل وکمال کی توقیر کو عقیدۂ توحید کے منافی سمجھنا مسلک کا کوئی عنصر نہیں۔

رسالت: علمائے دیوبند کا یہ ایمان ہے کہ سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم افضل البشر وافضل الانبیاء ہیں، مگر ساتھ ہی آپ کی بشریت کا بھی عقیدہ رکھتے ہیں۔ وہ آپ کے علودرجات کو ثابت کرنے کے لیے حدود عبدیت کو توڑ کر حدود معبودیت میں پہنچا دینے سے کلی احتراز کرتے ہیں۔ وہ آپ کی اطاعت کو فرض عین سمجھتے ہیں مگر آپ...... کی عبادت کو جائز نہیں سمجھتے۔

علمائے دیوبند برزخ میں آپ ...... کی حیات جسمانی کے قائل ہیں مگر وہاں معاشرت دنیوی کو نہیں مانتے۔ وہ آپ کے علم عظیم کو ساری کائنات کے علم سے بدرجہا زیادہ مانتے ہیں پھر بھی اس کے ذاتی ومحیط ہونے کے قائل ہیں۔

صحابۂ کرام: علمائے دیوبند تمام صحابہ کی عظمت کے قائل ہیں؛ البتہ ان میں باہم فرق مراتب ہے تو عظمت مراتب میں بھی فرق ہے، لیکن نفس صحابیت میں کوئی فرق نہیں اس لیے محبت وعقیدت میں بھی فرق نہیں پڑ سکتا پس ”الصحابة کلهم عدول“ اس مسلک کا سنگ بنیاد ہے۔ صحابہ بحیثیت قرن خیر من حیث الطبقة ہیں اور پوری امت کیلئے معیار حق ہیں۔ علمائے دیوبند انھیں غیر معصوم ماننے کے باوجود ان کی شان میں بدگمانی اور بدزبانی کو جائز نہیں سمجھتے اور صحابہ کے بارے میں اس قسم کا رویہ رکھنے والے کو حق سے منحرف سمجھتے ہیں۔

علمائے دیوبند کے نزدیک ان کے باہمی مشاجرات میں خطا وصواب کا تقابل ہے حق و باطل کا، طاعت ومعصیت کا نہیں؛ اس لیے ان میں سے کسی فریق کو تنقید و تنقیص کا ہدف بنانا جائز نہیں۔

صلحائے امت: علمائے دیوبند تمام صلحائے امت و اولیاء اللہ کی محبت و عظمت کو ضروری سمجھتے ہیں لیکن اس محبت و تعظیم کا یہ معنی قطعاً نہیں لیتے کہ انھیں یا ان کی قبروں کو سجدہ وطواف اور نذر وقربانی کا محل بنالیا جائے۔

وہ اہل قبور سے فیض کے قائل ہیں استمداد کے نہیں۔ وہ ایصال ثواب کو مستحسن اور اموات کا حق سمجھتے ہیں۔

وہ تہذیب اخلاق، تزکیۂ نفس اور عبادت میں قوتِ احسان پیدا کرنے کے لیے اہل اللہ کی بیعت وصحبت کو حق اور طریق احسانی کے اصول وہدایات کو تجربتہً مفید اور عوام کے حق میں ایک حد تک ضروری سمجھتے ہیں اور اسے شریعت سے الگ کوئی مستقل راہ نہیں سمجھتے بلکہ شریعت ہی کا باطنی واخلاقی حصہ مانتے ہیں۔

فقہ اور فقہاء

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ علمائے دیوبند احکام شرعیہ وفروعیہ اجتہادیہ میں فقہ حنفی کے مطابق عمل کرتے ہیں بلکہ برصغیر میں آباد کم وبیش پچاس کروڑ مسلمانوں میں نوے فیصد سے زائد اہل سنت والجماعت کا یہی مسلک ہے؛ لیکن اپنے اس مذہب و مسلک کو آڑ بنا کر دوسرے فقہی مذاہب کو باطل ٹھہرانے یا ائمہ مذاہب پر زبانِ طعن دراز کرنے کو جائز نہیں سمجھتے کیوں کہ یہ حق وباطل کا مقابلہ نہیں ہے بلکہ صواب وخطا کا تقابل ہے۔ مسائل فروعیہ اجتہادیہ میں ائمہ اجتہاد کی تحقیقات میں اختلاف کا ہو جانا ایک ناگزیر حقیقت ہے۔ اور شریعت کی نظر میں یہ اختلاف صحیح معنوں میں اختلاف ہے ہی نہیں۔ قرآن حکیم ناطق ہے۔

شَرَعَ لَكُم مِنَ الدِّيْنِ مَا وصّٰى به نُوحاً وَالَّذِیْ اَوحَيْنَا إِلَيكَ وَمَا وَصَّيْنَا به

إِبۡرَاهِيۡمَ وَمُوۡسٰى وَعِيۡسٰى أَنۡ اَقِيۡمُوا الدِّيۡنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوۡا (الشوریٰ)

ظاہر ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دور تک شریعتوں اور منہاج کا کھلا ہوا اختلاف رہا پھر بھی قرآن حکیم اس کو ایک ہی دین قرار دے رہا ہے اور شریعتوں کے باہمی فروعی اختلاف کو وحدتِ دین کے معارض نہیں سمجھتا۔ اگر یہ فروعی اختلاف بھی افتراق واختلاف کی حد میں آسکتے تو پھر ”وَلَا تَتَفَرَّقُوۡا فِيۡهِ“ کا خطاب کیوں کر درست ہوتا۔

لہٰذا جس طرح شرائع سماویہ فروعی اختلاف کے باوجود ایک ہی دین کہلائیں اور ان کے ماننے والے سب ایک ہی رشتہ اتحاد واخوت میں منسلک رہے۔ تحزب وتعصب کی کوئی شان ان میں پیدا نہیں ہوئی؛ اسی لیے وہ ”وَكَانُوۡا شِيَعًا“ کی حد میں نہیں آئے۔ ٹھیک اسی طرح ایک دین حنیف کے اندر فروعی اختلافات اس کی شان اجتماعیت و وحدت میں خلل انداز نہیں ہو سکتے۔

مواقع اجتہاد میں اہل اجتہاد کا اجتہاد دین ہی کا مقرر کردہ اصول ہے، اسے دین میں اختلاف کیسے کہا جا سکتا ہے۔ رہا جماعتِ مجتہدین میں سے کسی ایک کی پیروی وتقلید کو خاص کر لینا تو دین کے بارے میں آزادیِ نفس سے بچنے اور خودرائی سے دور رہنے کے لیے امت کے سوادِ اعظم کا طریق مختار یہی ہے، جس کی افادیت وضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ بابِ تقلید میں علمائے دیوبند کا یہی طرز عمل ہے۔ وہ کسی بھی امام، مجتہد یا اس کی فقہ کی کسی جزئی کے بارے میں تمسخر، سوئے ادب یا رنگ ابطال وتردید سے پیش آنے کو خسران دنیا وآخرت سمجھتے ہیں، ان کے نزدیک یہ اجتہادات شرائع فرعیہ ہیں شرائع اصلیہ نہیں کہ اپنے فقہ کو موضوع بنا کر دوسروں کی تردید یا تفسیق وتضلیل کریں؛ البتہ اپنے اختیار کردہ فقہ پر ترجیح کی حد تک مطمئن ہیں۔

مذکورہ بالا امور میں علمائے دیوبند کا یہ طرز عمل اور مسلک ان کی مؤلفات (شروح حدیث، تفسیر، فقہ وکلام وغیرہ) میں پوری تفصیل کے ساتھ مندرج ہیں، جنھیں دیکھ کر خود فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ اس مختصر تحریر میں ان ساری تفصیلات کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔

یہ ہے علمائے دیوبند کا اجمالی تعارف، ان کا مذہب ومسلک، اور مسائل اجتہادیہ میں ان کا طریق عمل۔

اب رہا مسئلہ احکام اجتہادیہ میں ان کی ترجیحات اور طریقِ عمل کا تو کتاب وسنت اور امت میں متوارث قواعد نصوص فہمی کی روشنی میں ان پر بحث وگفتگو کی جاسکتی ہے جس کا دروازہ ہمیشہ سے کھلا ہے، عہد صحابہ سے یہ تعامل چلا آرہا ہے کہ اس نوع کے مسائل میں اہل نظر علماء قواعد واصول کے تحت صواب وخطا اور راجح ومرجوح کی حد تک بحث ونظر کرتے رہے ہیں۔

لیکن ان جتہادی ومختلف فیہ مسائل کو آڑ بنا کر ملت واحدہ میں انتشار اور تفرقہ پیدا کرنا اور انھیں حق و باطل کا معیار ٹھہرا کر جماعت مسلمین کو ہدایت وضلالت کے متضاد خانوں میں تقسیم کردینا تو یہ نہایت خطرناک رویہ ہے جس سے اہل سنت والجماعت کے سلف وخلف کا دامن پاک وصاف رہا ہے۔ بلکہ اس غیر معقول ونارواروش کے دروازے کو بند کرنے کیلئے تا کہ امت مسلمہ کی وحدت برقرار رہے سلف صالحین وعلماء راسخین نے نصوص فہمی اور تاویل واجتہاد کے سلسلے میں ایک علمی دستور اور منہاج مقرر کردیا ہے جس کے ذریعہ انھوں نے نصوص وآراء میں جمع وتطبیق کی راہیں ہموار کیں اور امت کو ”مِنَ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا وَکَانُوْ شِیَعاً کُلُّ حِزبٍ بِمَا لَدَیْھِمْ فَرِحُوْنَ“ کا مصداق بننے سے بچالیا۔

جماعت اہل حدیث کا بیجا تشدد وغلو

حیف صد حیف کہ عصر حاضر کے اہل ظواہر (جو موحد، اہل حدیث، سلفی، اثری وغیرہ حسب موقع ومحل مختلف ناموں سے اپنا تعارف کراتے ہیں) نے سواد اعظم کے اس مسلمہ علمی دستور ومنہاج کو پس پشت ڈال کر اور اپنے علم وفہم کو حق کا معیار قرار دے کر ان اجتہادی مختلف فیہ مسائل کو حق و باطل اور ہدایت وضلالت کے درجہ میں پہنچادیا ہے اور ہر وہ فرد اور جماعت جو ان کی فکر ونظریہ سے ہم آہنگ نہیں وہ ہدایت سے عاری ومبتدع، ضال ومضل اور فرقہ ناجیہ سے خارج ہے۔ بطور مثال چند حوالے پیش کیے جارہے ہیں:

اس جماعت کے سرخیل اور سب سے بڑے مصنف و محقق مولانا نواب صدیق حسن خاں قنوجی بھوپالی جو اعتدال پسندی میں مشہور ہیں اپنے ایک رسالہ ''ترجمان وہابیہ'' میں رقم طراز ہیں:

''سرچشمہ سارے جھوٹے حیلوں اور مکروں کا اور کان تمام فریبوں اور دغا بازیوں کی علم رائے ہے جو مسلمانوں میں بعد پیغمبر برحق کے پھیلا ہے اور مہا جال ان سب خرابیوں کا بول چال فقہا اور مقلدوں کی ہے اور ساری خرابی ڈالی ہوئی ان ملاؤں کی ہے جو عام تقلید میں گرفتار ہیں اور بدعت اور شرک کے نشہ میں سرشار ہیں'' (ص: ۲۴، طبع لاہور)

اسی رسالہ میں دوسری جگہ لکھتے ہیں:

''سو محمد بن عبدالوہاب خود مقلد مذہب حنبلی من جملہ انھیں چار مذاہب کے ہے جو بالفعل عامۂ رائج ہیں اور فرقۂ موحدین (یہ اہل ظواہر عامۃ المسلمین مقلدین فقہاء کو مشرک سمجھتے ہیں اس لیے ان کے مقابلے میں اپنے آپ کو موحد کہتے ہیں زمانہ ماضی میں ایک عرصہ تک وہ اپنا تعارف اسی لقب سے کراتے تھے'' (از ناقل) کسی ایک مذہب خاص کے ان مذاہب میں سے پیرو اور مقلد نہیں ہے کیوں کہ یہ سب مذاہب بعد از زمانہ نبوت اسلام کے حادث ہوئے، فرق درمیان مقلد مذاہب اور فرقۂ موحدین کے فقط اتنا ہے کہ موحدین قرآن و حدیث صحیح کو ہی مانتے ہیں اور باقی مذاہب اہل الرائے ہیں جو مخالف سنت اور طریقہ شریعت ہے'' (ص: ۲۶)

اسی جماعت کے ایک اور بڑے عالم مصنف، مولانا محمد جونا گڈھی اپنی کتاب طریق محمدی میں لکھتے ہیں:

''جس طرح باپ دادوں کی تقلید موجب گمراہی ہے اسی طرح سادات بزرگوں کی اور اسی طرح علمائے کرام اور خدا والوں کی بھی وہ بزرگ حق پر ہوں اور راہ یافتہ ہوں لیکن ان کی تقلید پھر بھی موجب ضلالت رہے گی۔'' (ص: ۱۱)

اسی کتاب میں ایک موقع پر جونا گڈھی صاحب نے یوں خامہ فرسائی کی ہے:

''الغرض اتباع رسول ...... کو پرے پھینکنے کا آلہ جو ہر زمانہ میں مخالف رسول لوگ

اپنے کام میں لاتے رہے ہیں یہی تقلید ہے، تقلید ہی وہ چیز ہے جو اصل اسلام سے دنیا کو روکتی ہے۔'' (ص:۱۵، جدید ایڈیشن ص:۲۲)

اسی فرقہ کے ایک اور مقتدر عالم ابوالشکور عبدالقادر حصاروی اپنی مشہور زمانہ کتاب ''سیاحۃ الجنان'' میں لکھتے ہیں:

''جب یہ امر روشن ہو چکا کہ مذہب حق اہل حدیث ہے اور باقی جھوٹے اور جہنمی ہیں تو اہل حدیثوں پر یہ واجب ہے کہ ان تمام گمراہ فرقوں سے بچیں اور ان سے خلاء ملاء، میل جول دینی تعلقات نہ رکھیں یعنی باطل مذہب والوں کے پیچھے نماز نہ پڑھیں اور ان کے جنازہ میں شامل نہ ہوں، ان سے سلام نہ لیں ان سے مناکحت نہ کریں۔'' (ص:۴)

اسی کتاب کے ص:۵ پر یہ صاف لفظوں میں لکھتے ہیں:

''موجودہ حنفیوں میں تقلید شخصی پائی جاتی ہے جو سراسر حرام اور ناجائز ہے اور فرقہ بندیوں کا ذریعہ۔''

نیز لکھتے ہیں: ''مقلدین حنفیہ کے ہر دو فرقہ دیوبندی اور بریلوی گمراہ ہیں۔'' (ص:۵)

باب تقلید سے متعلق اس فرقہ کے اعاظم علماء کی یہ عبارتیں اپنے مفہوم میں بالکل واضح وروشن ہیں اور کسی توضیح وتشریح کی محتاج نہیں جن کی رو سے ائمہ مجتہدین امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ کے مدونہ مذاہب بدعت وطریقۂ شریعت کے خلاف ہیں۔ اور سارے مقلدین فرقہ ناجیہ سے خارج، جہنمی ہیں۔ العیاذ باللہ نہ ان کے پیچھے نماز پڑھنی جائز ہے اور نہ ہی ان کے جنازوں پر شرکت کرنی اور نہ ان سے رشتۂ مناکحت قائم کرنا درست ہے۔ کون نہیں جانتا کہ دنیا میں موجود مسلمانوں کی نوے فیصد سے زائد تعداد ہمیشہ ہی سے ائمہ مجتہدین کی تقلید کرتی چلی آ رہی ہے۔ اور ان موجودہ اہل ظواہر کے نزدیک یہ سب کے سب گمراہ، دین سے خارج ہیں اگر صحیح مؤمن ہیں تو بس یہی شرذمۂ قلیلہ، نبی صادق ومصدوق علیہ الصلاۃ والسلام الف الوف تو فرما رہے ہیں ''علیکم بالسواد الأعظم ید اللّٰہ علی الجماعة'' اور ''من شذ شذ في النار'' جبکہ نبی رحمت ...... کی اداؤں کی جانب اپنے آپ کو منسوب کرنے والوں کا دعویٰ اس کے

بالکل برعکس ہے۔ (یا للعجب)

بغرض اختصار اس موقع پر انھیں مذکورہ بالا حوالوں پر اکتفا کیا جا رہا ہے ورنہ ان کی تکفیر سازی کا دائرہ نہایت وسیع ہے اور تقلید ائمہ کے علاوہ دیگر مسائل اجتہادیہ میں بھی یہ اپنے مخالفین کو مبتدع ومشرک سے کم نہیں سمجھتے ان کی کتابوں میں یہ مواد اس کثرت سے موجود ہے کہ اگر ان سب کو ایک جگہ جمع کر دیا جائے تو ایک اچھی خاصی ضخیم کتاب تیار ہوسکتی ہے۔

کس قدر حیرت کا مقام ہے کہ جو چیز امت کے لیے باعث رحمت اور علماء کے واسطے باعث کرامت تھی آج اسی رحمت وکرامت کو علم وفہم سے مخول کرنے والے کچھ لوگ سبب شقاوت وضلالت باور کرانے پر تلے ہیں۔ برصغیر ہندوپاک اور بنگلہ دیش میں چونکہ مسلمانوں کی غالب اکثریت فروعی مسائل میں فقہ حنفی پر عامل ہے پھر ان میں دیوبندی مکتبۂ فکر سے متعلق علماء وفضلاء چونکہ علمی، دینی، سماجی سرگرمیوں میں نمایاں مقام رکھتے ہیں اس لیے ان لوگوں نے ایک خاص ذہنیت کے تحت قادیانیوں، رافضیوں وغیرہ فرقۂ مکفرہ وضالّہ کے بجائے بطور خاص علمائے دیوبند کو اپنے تضلیلی وتکفیری مشن کا ہدف بنا رکھا ہے۔

چنانچہ ابھی حال میں اس جماعت کے علمائے ہندوپاک کی مشترکہ کوششوں سے ایک کتاب "الدیوبندیة" کے نام سے عربی زبان میں شائع کرائی گئی ہے جسے ایک مہم بنا کر علمائے عرب، شیوخ حجاز ونجد اور ممالک اسلامیہ کے سرکاری دفتروں وسربراہان مملکت تک پہنچانے کی پوری کوشش کی گئی ہے۔ اس کتاب میں علمی امانت ودیانت کی پروا کیے بغیر اس بات کی حتی المقدور کوشش کی گئی ہے کہ کسی نہ کسی طرح علمائے دیوبند کو بدعقیدہ صحیح دین سے منحرف اور کافر ومشرک ثابت کر دیا جائے۔ (فالی اللہ المشتکیٰ)

اس من گھڑت مواد پر مشتمل غیر معقول کتاب کے اثر بد سے امت کو بچانے اور صحیح صورت حال سے ملت اسلامیہ کو روشناس کرانے کی غرض سے عرب وعجم کے جانے پہچانے عالم دین اور صاحب تصنیف محقق ومفکر مولانا ابوالحسن علی ندوی وغیرہ علماء نے عربی واردو میں رسائل اور کتابیں تصنیف کیں جن میں علمائے دیوبند کے صحیح مسلک اور ان کی

گراں قدر علمی و دینی خدمات کو مستند تاریخی حوالوں سے پیش کیا گیا ہے۔

پھر اس کتاب کا ذکر تو بطور مثال کے کیا گیا ہے ورنہ اس قسم کی کتابیں تو آئے دن ان کی جانب سے شائع ہوتی رہتی ہیں جس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان اہل ظواہر کا نصب العین ہی یہ ہے کہ اس طرح کے مختلف فیہ فروعی مسائل کی تشہیر کرکے اور اس کی آڑ میں علمائے مقلدین کو بدعتی و گمراہ بتا کر امت کا رابطہ ان سے ختم کردیا جائے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ امت کی وحدت اور اس کا ملی اتحاد پارہ پارہ ہوکر رہ جائے گا۔

ان کی اس منفی روش کے اثرات بد نہ صرف برصغیر میں بلکہ دیگر ممالک مثلاً برطانیہ، کناڈا، روس، امریکہ، افریقہ وغیرہ جہاں ایشیائی مسلمانوں کی اچھی خاصی تعداد آباد ہے نمایاں طور پر دیکھے جاسکتے ہیں کہ اسلام کے ان نادان ٹھیکیداروں کے غلط رویہ کی بدولت خود اہل اسلام باہم دست وگریباں ہیں اور ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے مقابلے میں کفر واسلام کی جنگ لڑ رہا ہے امت مسلمہ کے اس انتشار واختلال اور باہمی مذہبی جنگ سے اسلام دشمن طاقتیں اسلام کے خلاف کیا کیا اور کس قدر فوائد حاصل کررہی ہیں یہ اہل نظر وبینش سے مخفی نہیں ہے۔

چنانچہ جلالۃ الملک شاہ فیصل رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ نے جو ایک دردمند دل اور بیدار دماغ کے مالک تھے مسلمانوں کی اس باہمی فرقہ بندیوں اور مسلکی منافرت کے دوررس مضر اثرات کو پوری طرح محسوس کرلیا تھا اس لیے انھوں نے اپنے عہد حکومت میں مسلمانوں کے درمیان اس قسم کی تفرقہ اندازی کی کبھی ہمت افزائی نہیں کی بلکہ اتحاد بین المسلمین کو فروغ دینے کے لیے ہر اس دروازے کو بند کرنے کی سعی بلیغ کی جس میں داخل ہوکر ملت اسلامیہ میں انتشار وافتراق پیدا کیا جاسکتا تھا۔ ان کی مساعی جمیلہ کے بہتر نتائج ظاہر ہونے لگے تھے کہ دشمنان اسلام نے سازش کرکے انھیں شہید کرادیا اور انجام کار ملت اسلامیہ اپنے ایک بیدار مغز، دور اندیش، اولوالعزم قائد سے محروم ہوگئی۔

جلالۃ الملک شاہ فیصل کے بعد ان کے جانشین شاہ فہد بھی اتحاد بین المسلمین کی اس پالیسی پر قائم رہے مگر بعد میں ایسے حالات پیش آگئے جس کی بنا پر اس کی جانب پوری توجہ

نہ کر سکے اس موقع کو غنیمت سمجھتے ہوئے انتشار پسند اہل ظواہر نے نہایت ہوشیاری سے اپنا رابطہ حکومت کے اہل کاروں سے قائم کرلیا پھر دھیرے دھیرے اپنی جڑیں اس قدر مضبوط کرلیں کہ حکومت کے اہم ذمہ داروں تک ان کی رسائی ہوگئی اوراب تو نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ مملکت کے تحت قائم تعلیمی اداروں پر ان کا بڑی حد تک تسلط ہے اور پوری آزادی کے ساتھ وہ ان تعلیمی اداروں کو اپنی تحریک کے لیے استعمال کر رہے ہیں جس کی تفصیلات بہت طویل ہیں یہ مختصر تحریر اس کی متحمل نہیں ضرورت پیش آئی تو پیش کیا جاسکتا ہے۔

اس موقع سے بطور مثال ایک واقعہ پیش کیا جارہا ہے جس سے صورت حال اچھی طرح منکشف ہوجائے گی۔ الجامعۃ الاسلامیہ مدینہ منورہ کے ایک فاضل ڈاکٹر شمس الدین السّلفی الافغانی کی ایک کتاب ”جهود الحنفيه فى ابطال عقايد القبوريه“ کے نام سے ابھی قریب زمانے میں تین جلدوں میں شائع ہوئی ہے، یہ کتاب درحقیقت ان کا وہ مقالہ ہے جس پر انھیں مدینہ یونیورسٹی کے کلیۃ الدعوہ سے دکتورہ کی سند تفویض کی گئی ہے۔

ڈاکٹریٹ کے اس مقالہ میں نہ صرف یہ کہ اصول تحقیق اور جرح وتعدیل کے مسلمہ قواعد سے انحراف کرکے بلکہ علمائے دیوبند کی اردو تحریروں کو خود ساختہ عربی جامہ پہنا کر انھیں قبوری اور وثنی بتایا گیا ہے بالخصوص ان کے بڑے بڑے علماء کو جن کی علمی و دینی خدمات کے آگے لوگوں کی گردنیں جھکی ہوئی ہیں نام بنام مبتدع اور دین سے منحرف کہا گیا ہے۔

بطور مثال چند حوالے پیش کیے جارہے ہیں: کتاب کے مقدمہ میں ایک عنوان قائم کیا گیا ہے ”اشهر فرق القبوريه“ اس عنوان کے تحت علماء دیوبند کو بھی قبوری فرقہ میں شمار کیا گیا ہے۔ مصنف کی عبارت ملاحظہ ہو:

۱- ”وكثير من الديوبندية وكثير من التبليغية، وغيرهم من الفرق القبورية“ (ج:۱، ص:۲۹)

۲- اسی مقدمہ میں نہ صرف علمائے دیوبند بلکہ مذہب احناف اور امام ابوحنیفہ پر نہایت ہتک آمیز الفاظ میں تبصرہ کیا گیا ہے۔

أما مقارنة المذهب الحنفي بالثلاثة ـ فحاصلها: أنه أبعدها عن السنة والتحقيق وأنه مبنى على كثير من الأصول الباطلة، والأقيسة العاطلة، والآراء الفاسدة، والأدلة الكاسدة، فأبو حنيفة كان من أئمة اهل الرأى والثلاثة كانوا من أئمة أهل الحديث. (ج:۱، ص:۳۲) تعليقا

۳- مقدمہ ہی میں کتاب کی خصوصیات اور اہم مباحث پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

تحقيق أن الديوبندية، والتبليغية الحنفية قبورية ولكنهم أخف من البريلوية إلا من شاء الله مع كون الديوبندية متعصبة كوثرية، مرجئة، ماتريدية، جهمية الخ" (ج:۱،ص:۵۱،۵۲)

۴- فقہ حنفی پر عمل کرنے والوں کے بارے میں لکھتے ہیں۔

لقد عرفت بالتجربة والاستقراء وبما قرأت وبما سمعت أن أكثر القبورية فى المنتسبين إلى المذاهب الأربعة هم الحنفية لكثرتهم ونفوذ سلطانهم ودولهم فى شرق الأرض وغربها من صينها إلى مغربها. (ج:۱،ص:۴۲۲)

۵- فترى هؤلاء المتعصبة المقلدة لا سيما بعض من ينسب إلى الحنفية منهم كالكوثرية والديوبندية يبغضون السنة أشد البغض؛ فرفع اليدين عندهم أشد من وقع السيوف، والتامين بالجهر أشد من الرصاصة في قلوبهم" (ج:۲، ص:۵۷۶)

۶- مولانا خلیل احمد سہارنپوری مہاجر مدنی کے تذکرہ میں یوں لکھتے ہیں:

وكان مع إمامته وعلومه خرافيا قبوريا يعكف على القبور للمراقبة. (ج:۱،ص:۵۱۸)

۷- محدث العصر مولانا انور شاہ کشمیری رئیس التدریس بالجامعۃ الاسلامیہ دارالعلوم دیوبند سابقاً کے بارے میں یہ الفاظ استعمال کرتے ہیں:

وقال خرافى آخر وهو الشاه محمد أنور الكشميرى (۱۳۵۲) أحد

كبار ائمة الديوبنديه (ج:۱، ص:۵۱۹) **اور حاشیہ میں مزید لکھتے ہیں** وكان يحمل افكارًا خرافية صوفية حتى الميل إلى وحدة الوجود. (ج:۱،ص:۵۲۰)

۸- حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کا ذکر ان الفاظ سے کیا گیا ہے۔

وقد أكبره أشرف على التهانوي القبوري الخرافي الملقب عند الديوبندية بحكيم الأمة (ج:۱، ص:۵۲۱) تعليقا.

۹- شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی رئیس التدریس جامعہ اسلامیہ دارالعلوم دیوبند کو بھی انھیں الفاظ سے ذکر کیا گیا ہے، لکھتے ہیں:

وقال حسين أحمد الملقب عند الديوبندية شيخ الإسلام، أحد كبار ائمة الديوبندية، وأحد مشاهير القبورية الخرافية وأحد الأعداء الالدّاء للدعوة السلفية وائمتها" (ج:۱،ص:۵۲۱)

پھر حاشیہ پر حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی کی تصانیف الشہاب الثاقب اور نقش حیات سے کچھ حوالے نقل کرنے کے بعد اپنا فیصلہ بلکہ فتویٰ صادر کیا ہے۔

هذه نبذة من عقائد إمام الديوبندية والتبليغية الملقب بشيخ الإسلام، الخرافات القبورية والخزعبلات الصوفية، فضلا عن الطامات الماتريدية والتقليد الأعمىٰ والتعصب المقيت للحنفية فما بالك بغيره؟؟؟

وهذه من البراهين الباهرة والسلاطين القاهرة على أن ديوبندية والتبليغية من فرق القبورية، وانهم من أهل البدع وليسوا من أهل السنة" (ج:۱،ص:۵۲۲)

خاتم الانبیاء والمرسلین سیدنا محمد رسول اللہ...... کی قبر مبارک کی زیارت کے مسئلہ پر علمائے دیوبند کے مسلک کو متعدد حوالوں سے ذکر کرنے کے بعد آخر میں لکھتے ہیں:

۱۰- قلت: اترك المجال للذين بغيتهم الإنصاف وضالتهم الحق دون العاطفة والعتصب والاعتساف أن يحكموا على هؤلاء الديوبندية الصوفية النقشبندية الماتريدية هل هؤلاء الديوبندية سنية سلفية ام هم مبتدعة قبورية خرافية؟؟؟ مع العلم بأن كثيرا من علماء الحنفية قد قاموا بإبطال تلك

الأحاديث الواردة في زيارة قبر النبي ﷺ وحكموا عليها بانها باطلة موضوعة فاسدة عاطلة، مصنوعة“ (ج:۲، ص:٦٥٠)

ابوالعالیہ کا ایک اثر جس میں فتح تُستر کے موقع پر ہرمزان کے بیت المال میں رجل میت کی سرپر پانے کا ذکر ہے جس کے بارے میں ابوالعالیہ نے کہا کہ یہ حضرت دانیال نبی علیہ الصلاۃ والسلام ہیں اس طویل واقعہ کو ذکر کرنے کے بعد حاشیہ میں علمائے دیوبند کے خلاف اپنے تعصب وتلعب کو یوں ظاہر کیا ہے۔

۱۱- قلت ... ولو ظفرت القبورية ولاسيما الديوبندية المتبركة المتوسلة به لحجوا إليه وتبركوا به وجعلوه عبدا وشددوا الرحال إليه، والله المستعان“ (ج:۲،ص:٦٦٨)

حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی کے بارے میں لکھتے ہیں:

۱۲- هو قاسم بن أسد على ... الصديقي النانوتوي الحنفي الماتريدي النقشبندي كان من كبار علماء الحنفية الزهاد والمتألهين وكان من الصوفية الخرافية القبورية وهو إمام الديوبندية على الإطلاق“ (ج:۲، ص:۷۱۳) تعليقا.

۱۳- اسی جلد۲ کے صفحہ ۷۷۱ پر علمائے دیوبند کے بارے میں لکھا گیا ہے:

ولقد كنت أحسن الظن بالديوبندية لما عندهم من العلوم الجمة والعقول والرد على القبورية فى كثير من البدع والشركيات.

ولكن رأيت عندهم من الشركيات والقبوريات والوثنيات وتصرف الأرواح والاستفاضة من القبور، والاستمداد من روحانية المشائخ شيئا كثيرا هو كنموذج من خرافاتهم القبورية التى لم أطلع عليها وهى تدل على ما وراءها بما لا يعلمه إلا الله.

ولقد توصلت إلى أنه لا فرق بين البريلوية وبين الديوبندية في هذه القبوريات إلا في امور.

اور حیرت تو یہ ہے کہ علمائے دیوبند جن کا بریلویوں سے عقائد میں اختلاف کالشمس فی النہار کی مانند ظاہر و باہر ہے لیکن چونکہ علمائے دیوبند عصر حاضر کے اہل ظواہر کے بھی بہت سے امور میں مخالف ہیں اس لیے مصنف نے جرح وتعدیل کے مسلم اصول کو نظر انداز کر کے ایک بریلوی عالم کے افترأت کو بنیاد بنا کر علمائے دیوبند کو بریلوی کے ساتھ وابستہ کر دیا ہے۔ محولہ صفحات کے مطالعہ سے یہ بات بالکل ظاہر ہو جاتی ہے۔ یہ ہے ڈاکٹر کی تحقیق جن پر ان کو سند دکتورہ تفویض کی گئی ہے۔ "واللہ المستعان".

۱۴- پھر علمائے دیوبند کے فرقۂ قبوریہ کے ساتھ اتصال وارتباط کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

قلت أصل السر والسبب الوحيد لانخراط الديوبندية في العقائد القبورية هو انهم صوفية نقشبندية أصحاب بيعة (ج:۲،ص:۷۷۳)

مقالہ نویس کے نزدیک (جنھیں اس مقالہ پر کلیۃ الدعوۃ، قسم العقیدۃ الجامعۃ الاسلامیۃ مدینہ منورہ سے دکتورہ کی سند تفویض کی گئی ہے) علمائے دیوبند کا صوفیہ نقشبندیہ واصحاب بیعت ہونا وہ جرم عظیم ہے جس کی پاداش میں انھوں نے علمائے دیوبند کو اہل سنت والجماعت سے خارج کر کے اہل بدعت، قبوری، خرافی، جہمی، مرجی وغیرہ فرقوں کی صف میں کھڑا کر دیا ہے جب کہ خود برصغیر کے سلفیوں کے علی الاطلاق قائد ورئیس نواب صدیق حسن خاں صاحب فرماتے ہیں:

> "میں مشائخ کے تمام طریقوں کو موصل الی اللہ جانتا ہوں اور تمام مشائخ سے خواہ ان کا کوئی طریقہ بھی ہو حسن ارادت رکھتا ہوں البتہ میرا اور میرے آبا اور اساتذہ اور مشائخ کا طریقہ نقشبندیہ ہے اگرچہ اور طریقوں کی بھی اجازت ہے۔" (مآثر صدیقی، ج:۴،ص:۵۲، مطبوعہ مطبع نول کشور لکھنؤ ۱۳۴۳ھ
>
> اشاعت نو ۱۴۱۱ھ جمعیۃ اہل سنۃ لاہور مولفہ سید علی حسن خاں فرزند صاحب سوانح)

صاحب مقالہ سے عرض ہے کہ وہ نواب صدیق حسن خاں صاحب، ان کے آباء، اساتذہ اور مشائخ کے بارے میں کیا فرماتے ہیں؟ کیا یہ سب حضرات بھی صوفیہ نقشبندیہ و

اصحاب بیعت ہونے کی وجہ سے قبوری وخرافی ہیں؟

عصر حاضر کے سلفیوں کے استاذ الکل مولانا ''سید نذیر حسین دہلویؒ کے متعلق ان کے سوانح نگار لکھتے ہیں: ''پنجاب اور بنگال میں ان کے مریدوں کی ایک بڑی تعداد تھی'' تو کیا صاحب بیعت ہونے کی بنا پر یہ بھی منخرط بہ فرقۂ قبوریہ ہیں؟

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، ان کے چاروں صاحبزادے، شاہ اسماعیل شہید نبیرہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب اوران کے پیرومرشد حضرت سید احمد شہید بریلوی خلیفہ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی بن شاہ ولی اللہ محدث دہلوی یہ سب کے سب اکابر سلسلۂ نقشبندیہ سے منسلک اور صاحب بیعت وارشاد ہیں۔ کیا ان بزرگوں کے بارے میں بھی مقالہ نگار کا وہی فتویٰ ہے جو اکابر دیوبند کے متعلق صادر کیا گیا ہے؟

علمائے دیوبند کے علاوہ علمائے اشاعرہ وماتریدیہ کو بار بار جہمی لکھا گیا ہے جب کہ محدثین وفقہاء کی ایک بڑی جماعت ہر دور میں عقیدۂ اشعری وماتریدی کی پابند رہی ہے۔ علاوہ ازیں کرمانی شارح بخاری، امام سیوطی، ابن حجر مکی ہیثمی، زرقانی شارح مؤطا، شیخ عبدالحق محدث دہلوی وغیرہ اعاظم علمائے دین اور خادمین کتاب وسنت کو جابجا قبوری ووثنی کے خطاب سے نوازا گیا ہے۔ گویا دین خالص کا حامل اور سنت رسول پر عامل امت کا وہی شرذمہ قلیلہ ہے جو اپنے آپ کو سلفی کہتا ہے اور بقیہ ملت کا سواد اعظم اور ساری جماعت مسلمین جو عقیدۃً اشعری یا ماتریدی ہیں اور فروعاً حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی ہیں اور مشائخ طریقت سے حسن ارادت رکھتے ہیں اہل سنت والجماعت سے خارج، بدعتی، قبوری، وثنی، جہمی، مرجی، ہیں۔ فإلی اللہ المشتکی وھو المستعان.

جس کتاب میں اس طرح کے مواد ہوں اس پر الجامعۃ الاسلامیہ مدینہ منورہ سے دکتورہ کی سند عطا کیا جانا نہ صرف باعث حیرت ہے بلکہ باعث صد افسوس وحسرت ہے کہ جو تعلیمی ادارہ قرآن وحدیث اور دیگر علوم دینیہ کی اشاعت اور صحیح علوم کی تفہیم وتعلیم کے لیے قائم کیا گیا تھا آج اسی علمی ودینی ادارہ سے مسلمانوں کو صحیح دین سے نکال دینے کا کام لیا جارہا ہے۔

مملکت سعودیہ عربیہ کو چونکہ حرمین شریفین سے ایک خاص انتساب ہے، پھر اس حکومت نے حرمین شریفین کی تعظیم وتکریم کے سلسلے میں جو تاریخی خدمات انجام دی ہیں نیز فریضۂ حج کی ادائیگی سے متعلق جس طرح کی بے مثال سہولتیں فراہم کی ہیں ہمارا اس حکومت، ارباب حکومت سے ایک جذباتی تعلق ہے چنانچہ اس تعلق کا مظاہرہ بار بار ہو چکا ہے۔ ابھی ماضی قریب میں تحفظ حرمین کے سلسلے میں علمائے دیوبند نے مملکت سعودیہ کے حق میں رائے عامہ کو ہموار کرنے کے سلسلے میں جو اہم کردار پیش کیا تھا کارکنان مملکت اس سے بخوبی واقف ہیں۔

اسی دیرینہ تعلق کی بناء پر ہمیں یہ توقع اور امید نہیں بلکہ یقین تھا کہ آج کل کے اہل ظواہر ایک خاص مہم کے تحت علمائے دیوبند پر جو ناروا کیچڑ اچھال رہے ہیں (جس کی وجہ سے جماعت مسلمین میں انتشار واختلال بڑھتا جا رہا ہے) مملکت سعودیہ کی جانب سے ان کے اس انتشار پسند رویہ کی کسی طرح بھی ہمت افزائی نہیں ہوگی؛ اگرچہ بعض واقف کار حلقوں کی طرف سے ہمیں یہ اطلاعات مل رہی تھیں کہ مملکت کے اہل کار کھل کر ان اہل ظواہر کی تائید ونصرت کر رہے ہیں مگر ہم نے ان اطلاعات پر اعتماد نہیں کیا لیکن اس کتاب کے منظر عام پر آجانے کے بعد اب ہمارا بھی یہی احساس ہے کہ دانستہ یا نادانستہ طور پر مملکت سعودیہ علمائے دیوبند کے خلاف پروپیگنڈہ میں ان انتشار پسند عناصر کی شریک کار ہوگئی ہے ورنہ ایک ایسے تعلیمی ادارے سے جو کلیتاً حکومت کے تحت قائم ہے اس طرح کی کتاب تیار نہ کرائی جاتی۔ یہ احساس صرف ہندوستان کے علمائے احناف ہی کا نہیں بلکہ پاکستان، بنگلہ دیش اور دیگر ممالک اسلامیہ اور یورپ وافریقہ میں مقیم پیروان فقہ حنفی کا بھی یہی احساس ہے۔ اس تحریر کے ذریعہ ہم اسی احساس کو آپ تک پہنچانا چاہتے ہیں تاکہ اس احساس کے ردعمل میں اگر ہمارے دیرینہ وقدیم تعلق میں فتور پیدا ہو جائے اور رائے عامہ کا رخ کوئی ایسی صورت اختیار کرلے جو مملکت سعودیہ کے حق میں مناسب نہ ہو تو اس کا الزام علمائے دیوبند پر نہ آئے۔

رہا جن مسائل کی بنیاد پر اس کتاب میں علمائے دیوبند کو اہل سنت سے خارج،

بدعتی، قبوری، وثنی، جہمی، مرجی وغیرہ کا اتہام عائد کیا گیا ہے ہم ان مسائل پر گفتگو کے لیے ہمہ وقت تیار ہیں۔ بلکہ ہماری تو یہ رائے ہے کہ اگر مناسب سمجھا جائے تو بین الاقوامی سطح پر ہر جماعت کے منتخب علماء کا حجاز، یا ہندوستان یا پاکستان میں اجتماع بلالیا جائے اور ان مسائل پر اس منتخب مجلس علماء میں بحث و تحقیق ہو جائے۔

ہم پر مختلف ممالک سے یہ زور دیا جارہا تھا کہ دیوبند یا دہلی میں بین الاقوامی سطح پر علمائے احناف بالخصوص دیوبندی مکتبہ فکر سے وابستہ لوگوں کی ایک کانفرنس بلائی جائے تاکہ متفقہ طور پر اس صورت حال سے نمٹنے کے لیے کوئی لائحہ عمل مرتب کر کے اس کے مطابق عمل کیا جائے۔ لیکن ہم نے مناسب یہی سمجھا کہ پہلے مملکت کے ارباب حل وعقد کے سامنے اپنے احساس کو رکھ دیں اس کے بعد جو صورت حال سامنے آئے اس کے پیش نظر آئندہ کے اقدام کے لیے سوچا جائے۔

وما توفیقی الا باللّٰہ وھو حسبی ونعم الوکیل وصلی اللّٰہ علی رسولہ الکریم وعلی آلہ واصحابہ اجمعین.

☆ ☆ ☆

آئینہ ان کو دکھایا تو برا مان گئے

غالباً مئی کا آخری عشرہ تھا کہ دارالعلوم دیوبند کے ایک موقر استاذ نے خبر دی کہ تمہارے مقالہ ''علمائے دیوبند ایک تعارف'' پر مجلّہ اشاعۃ السنہ دہلی شمارہ مارچ، اپریل نے تنقیدی مضمون شائع کیا ہے، یہ سوچ کر اس اطلاع کو اہمیت نہیں دی گئی کہ معاصر مذکور کا تو یہی مشغلہ ہے کیونکہ اس نے اپنے لیے جو راہِ عمل اختیار کی ہے اس میں یہ شغل ناگزیر ہے، لہٰذا اس کے تعاقب میں اپنا وقت کون ضائع کرے۔

لیکن اوائل جولائی میں ایک غیر متعارف بہی خواہ کا بذریعہ ڈاک مکتوب صادر ہوا جس میں سلام ودعا کے بعد انھوں نے لکھا تھا کہ ایک دوست سے آپ کے مقالہ ''علمائے دیوبند ایک تعارف'' کی تعریف وتحسین سن کر اس کے مطالعہ کا اشتیاق ہوا چنانچہ انھیں سے ماہنامہ دارالعلوم لے کر پڑھا سچی بات یہ ہے کہ علمائے دیوبند کے تعارف میں اختصار کے ساتھ مبالغہ سے بری ایسی جامع تحریر اب تک نظر سے نہیں گزری تھی۔

مقالہ کے آخر میں علمائے دیوبند کے بارے میں اہل حدیث علماء کے رویہ کی جو تفصیل آپ نے پیش کی ہے وہ بھی بجائے خود بڑی خاصہ کی چیز ہے، اس جماعت کے بارے میں جو سنا تھا کہ ایک منفی پسند جماعت ہے جو مثبت طور پر علمی ودینی خدمت کے بجائے علمائے دین کے کاموں میں کیڑے نکالنے سے زیادہ دلچسپی رکھتی ہے۔ جناب نے اہل حدیث علماء کی کتابوں سے جو اقتباسات نقل کیے ہیں ان سے اس کی تصدیق ہوگئی کہ یہ جماعت اپنے علاوہ دیگر طبقات مسلمین کے کاموں کو نہ صرف لائق التفات نہیں سمجھتی بلکہ انھیں سچا پکا مسلمان ماننے کے لیے بھی تیار نہیں ہے۔

اسی دوران ایک ذاتی سفر پر بنارس جانا ہوا وہاں ایک دوست کے پاس ''اشاعۃ

السنہ دہلی“ دیکھنے کو ملا چونکہ یہ رسالہ میرے لیے بالکل نیا تھا اس لیے اس کی ورق گردانی شروع کردی، اس پر میرے دوست نے کہا کہ رسالہ ساتھ لیتے جایئے اور اطمینان سے پڑھ کر اگر جی چاہے تو واپس کردیجیے گا۔ چنانچہ رسالہ اپنی قیام گاہ پر لے آیا اور مطالعہ شروع کیا تو حرف اولیں میں مدیر اعزازی ابو عامر رضا بدایونی کے قلم سے جناب کے اس مذکورہ مقالہ پر تنقید وتبصرہ پڑھ کر دم بخود رہ گیا کہ جس تحریر کو میں اب تک تحقیق کے اعلیٰ معیار پر سمجھے ہوئے تھا وہ تحریف وترمیم کا پلندہ نکلی اس انکشاف سے دل پر جو گزری اسے بیان نہیں کرسکتا پوری رات شکوک وشبہات کے طلاطم میں غوطے کھاتے گزر گئی، سفر سے واپس گھر لوٹا تو سیدھے اپنے دوست کے پاس پہنچا جن کی نشاندہی پر میں نے آپ کا یہ مقالہ پڑھا تھا، اور مجلّہ اشاعۃ السنہ کا یہ ادارتی مضمون کھول کر انھیں دیا کہ اسے پڑھ لیجیے انھوں نے مضمون پڑھ کر دوسرے دن مجھ سے کہا کہ ایک طرفہ بات پر کوئی فیصلہ مناسب نہیں ماہنامہ دارالعلوم کے مدیر کو خط لکھ کر اس بارے میں تفصیلات معلوم کرنے کے بعد ہی کوئی رائے قائم کی جاسکتی ہے۔ یہ خط ان کے اسی مشورہ پر لکھ رہا ہوں۔

دریافت طلب امر یہ ہے کہ مجلّہ اشاعۃ السنہ دہلی کے شمارہ مارچ، اپریل ۲۰۰۱ء میں اس کے مدیر اعزازی جناب ابو عامر رضا بدایونی نے پوری وضاحت کے ساتھ لکھا ہے کہ مولانا نواب صدیق حسن خاں صاحب اور مولانا محمد صاحب جونا گڑھی کی عبارتوں میں آپ نے تحریف کرکے اپنے مقصد کے مطابق بنالیا ہے انھوں نے اس کی مثالیں بھی پیش کی ہیں، جس سے ان کا الزام درست معلوم ہوتا ہے، اور آپ نے بھی پورے وثوق کے ساتھ کتاب وصفحات کے حوالوں سے دونوں بزرگوں کی عبارتیں نقل کی ہیں اس لیے اصل سچائی تک پہنچنا ہمارے لیے دشوار ہے، اور ہمارے جیسے نہ جانے کتنے لوگ جنھوں نے ماہنامہ دارالعلوم میں اس مقالہ اور اشاعۃ السنہ میں شائع اس تنقید کو دیکھا ہوگا اس تذبذب کے شکار ہوں گے۔ اس طرح کی صورت حال علماء سے اعتماد کو اٹھا دیتی ہیں۔ اس لیے اگر واقعی آپ سے دانستہ یا نادانستہ غلطی ہوگئی ہے تو پہلی فرصت میں آپ کو اپنی اس غلطی سے رجوع کرلینا چاہیے اور رجوع نامہ ماہنامہ دارالعلوم میں شائع کردینا چاہیے حق پسندی کا

یہی تقاضا ہے اور اگر واقعی آپ کے حوالے درست ہیں اور مدیر اعزازی اشاعۃ السنہ نے محض الزام تراشی کی ہے تو ماہنامہ دارالعلوم کے صفحات میں اس الزام تراشی کی قلعی کھولنی ضروری ہے یہ تنہا آپ کی ذات کا معاملہ نہیں بلکہ پوری جماعتِ دیوبند کی علمی دیانت و امانت کو چیلنج کیا گیا ہے، حیرت ہے کہ اس نزاکت کو آپ نے کیوں نہیں محسوس کیا اور چپ سادھے رہے، میری اس طول کلامی کو امید ہے کہ انگیز کریں گے اور میری گذارش پر ضرور توجہ دیں گے“

اس خط اور اس میں بیان کیے گئے تاثر کے بعد بھی مذکورہ تنقیدی مضمون پر بحث ونظر سے گریز بظاہر اپنے آپ کو مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا کر دینے کے مرادف تھا اس لیے ناچار طے کرنا پڑا کہ معاصر مذکور کی تنقید کا جائزہ لیا جائے اور علم ودیانت کے معیار پر جو بات پوری اترے اسے بے کم وکاست ارباب دین ودانش کی عدالت میں پیش کر دیا جائے۔ اس فیصلہ کے بعد دلی میں مقیم ایک کرم فرما کے ذریعہ مجلّہ اشاعۃ السنہ کی یہ کاپی حاصل کی گئی، اس کے مطالعہ کے بعد جو حقائق سامنے آئے آیندہ سطور میں انھیں ملاحظہ کیجیے۔

مجلّہ اشاعۃ السنہ کے مدیر اعزازی جناب ابوعامر رضا بدایونی صاحب اپنی ادارتی تحریر حرف اولیں کی ابتداء کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

> ”دارالعلوم دیوبند کے ترجمان ماہنامہ دارالعلوم بابت ماہ دسمبر ۲۰۰۰ء کا شمارہ ایک صاحب نے لاکر دیا اور اس کو بغور پڑھنے کی درخواست کی، رسالہ کا پہلا مضمون ”علمائے دیوبند ایک تعارف“ مدیر رسالہ کے قلم سے پورے بیس صفحات پر مشتمل ہے، مضمون کا ابتدائی حصہ تعریف وتمہید دیوبند ومسلک دیوبند پر مشتمل ہے اور ہمیں اس کا اعتراف کرنے میں کوئی باک نہیں کہ مدیر محترم نے اپنے مسلک کی ترجمانی کا پورا پورا حق ادا کیا ہے نہیں بلکہ کچھ زیادہ بھی۔“ (دوماہی مجلّہ اشاعۃ السنہ دہلی شمارہ مارچ، اپریل ۲۰۰۱ء ص: ۵)

ان سطور سے ظاہر ہو رہا ہے کہ محترم مدیر اعزازی صاحب ایک طرح کی گومگو کی کیفیت میں مبتلا ہیں، ماہنامہ دارالعلوم کے اس مقالہ سے وہ متاثر تو ہیں مگر اس تاثر کے

اظہار میں ان کا قلم ان کی رفاقت کے لیے آمادہ نہیں چنانچہ بجبر اعتراف واقرار کے چند الفاظ کے بعد ان کی گرفت سے آزاد ہو کر بول اٹھتا ہے ”نہیں بلکہ کچھ زیادہ بھی“ اس جملہ کو اس کے سیاق وسباق سے ملا کر دیکھا جائے تو اپنے اشہب قلم کی سرکشی کے آگے آں محترم کی بیچارگی ودرماندگی اچھی طرح محسوس کی جاسکتی ہے جس کی بنا پر ان کی تحریر کا یہ پیرا ”اقرار اک طرف ہے تو انکار اک طرف“ کا نمونہ بن گیا ہے۔

اس کے بعد لکھتے ہیں:

> ”بھلا ہمیں اس میں کیا اعتراض ہوسکتا ہے ہر شخص کو اپنے مسلک، موقف اور نظریہ کو اچھے سے اچھے ڈھنگ سے بیان کرنے کا حق ہے، مگر افسوس ہوا کہ موصوف اپنی جماعت کے تعارف سے نکل کر جماعت اہل حدیث کے خلاف الزام تراشی پر اتر آئے اور وہ سب کچھ لکھ گئے جو ایک متعصب، فتنہ پرور کہہ سکتا ہے۔“ (ایضاً ص:۵)

ان سطور سے بھی پتہ چلتا ہے کہ آں موصوف دل وقلم کی اس کشمکش سے ابھی باہر نہیں نکل سکے ہیں بلکہ دل کی سچائی پر سرکش قلم کی گرفت کچھ سخت ہی ہوگئی ہے کہ ماہنامہ دارالعلوم دیوبند کے مدیر کے اس جرم بے گناہی پر کہ اس نے علمائے دیوبند کے تعارف کے آئینہ میں گروہ اہل حدیث کو ان کا اصلی چہرہ کیوں دکھادیا اس قدر الف ہوگئے کہ علم واخلاق اور شرافت ومروت کی حدوں سے گزر کر دشنام طرازی اور افتراء پردازی پر آگئے اور مدیر ماہنامہ دارالعلوم کو ایک سانس میں الزام تراش، عصبیت پسند، فتنہ پرور جیسی گالیاں دے ڈالیں (غالباً سانس نے آگے ساتھ نہیں دیا ورنہ مزید صلواتیں سناتے) اور اہل حدیث ہونے کا دعویٰ کے باوصف احادیث رسول علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام ”المؤمن لا یکون لعانا“ نیز ”اذا خاصم فجر“ کا مطلق پاس ولحاظ نہیں کیا ان کے اس غیر مؤمنانہ رویہ پر بجز اس کے اور کیا کہا جائے کہ

کتنے شیریں ہیں ترے لب کہ رقیب گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا

اگلی سطروں میں مدیر ماہنامہ دارالعلوم پر علمی خیانت کا الزام چسپاں کرنے کی غرض

سے تحریر کرتے ہیں:

> اور اس کے بعد نواب صدیق حسن خاں بھوپال (۱) کی کتاب ترجمان وہابیہ سے ایک ناقص (۲) عبارت نقل کی ہے اور اس میں ہاتھ کی صفائی سے باز نہیں آئے۔ ملاحظہ فرمائیں۔
>
> ''سرچشمہ سارے جھوٹے حیلوں اور مکروں کا اور ان (۳) تمام فریبوں اور دغابازیوں کی علم رائے ہے جو مسلمانوں میں بعد پیغمبر برحق پھیلا ہے اور مہا جال ان سب خرابیوں کا بول چال فقہا اور مقلدوں کی ہے اور ساری خرابی ڈالی ہوئی ان ملاؤں کی ہے جو دام تقلید میں گرفتار ہیں اور بدعت و شرک کے نشہ میں سرشار'' (ماہنامہ دارالعلوم ص ۱۳-۱۴)

قارئین کرام! مذکورہ بالا عبارت نقل کرنے میں مولوی حبیب الرحمٰن مدیر دارالعلوم نے دیوبندی دیانت کا جو ثبوت فراہم کیا ہے وہ واقعی ان ہی کا حصہ ہے ابھی تک ہم حوالوں میں کتر بونت (۴) اور من چاہے معانی نکالنے میں ایک اور فرقہ ہی کو مشاق مانتے تھے مگر ابوبکر غازی پوری اور حبیب الرحمٰن مدیر دارالعلوم کی کارستانیوں کے بعد ہمارے نظریہ میں تبدیلی پیدا ہو گئی ہے۔ غازیپوری کی کتابیں جس نے پڑھی ہیں اور اصل کتابوں تک اس کی رسائی ہے یا اس کا کچھ موازنہ کیا ہے تو وہ اس شخص کی مشاقی کا قائل ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اب اس مضمون کو پڑھ کر ہم نے اصل مراجع کی طرف رجوع کیا تو پتہ چلا کہ

ایں خانہ ہمہ آفتاب است

---

(۱) نواب صدیق مرحوم بھوپال نہیں بلکہ بھوپالی ہیں پتہ نہیں مدیر اعزازی صاحب کے نزدیک یہ کتابت کی غلطی ہے یا ہاتھ کی صفائی؟

(۲) کاش کہ مدیر موصوف کامل عبارت نقل کر دیتے تاکہ ماہنامہ دارالعلوم کے مدیر کا یہ تنقیصی عمل مبرہن ہو جاتا اور دعویٰ محض دعویٰ ہی نہ رہ جاتا۔

(۳) اور ان تمام نہیں بلکہ کان تمام الخ نواب صاحب کے الفاظ ہیں اور ماہنامہ دارالعلوم میں بھی ''کان'' ہی ہے مگر ہم اسے ہاتھ کی صفائی نہیں سمجھتے۔

(۴) کتر بونت نہیں بلکہ کتر بیونت صحیح ہے اگر یہ کتابت کی غلطی نہیں تو املاء سے ناواقفیت یا دانستہ محاورہ میں تحریف ہے حقیقت واقعہ کا علم مدیر اعزازی صاحب ہی کو ہوگا۔

مندرجہ بالا عبارت میں جہاں جہاں ہم نے نیچے خط کھینچا ہے وہاں وہاں موصوف نے ہاتھ کی صفائی دکھائی ہے۔ چنانچہ حیلوں کو میلوں بنا دیا اور علم رائے محض کو، محض اڑا کر صرف علم رائے کر دیا اور ہر پڑھا لکھا آدمی جانتا ہے کہ علم رائے اور علم رائے محض میں زمین آسمان کا فرق ہے۔(۱) لیکن نواب صاحب کی عبارت میں کیڑے نکالنے کے لیے اس میں یہ تبدیلی لازم و ضروری تھی، اس طرح ''فقہاء اور مقلدوں'' دونوں کے پہلے بعض فقہاء، اور بعض مقلدوں لکھا ہوا ہے اس میں سے لفظ بعض کو دونوں جگہ سے اڑا دیا گویا جو بات نواب صاحب بعض فقہاء اور بعض مقلدوں کے بارے میں کہہ رہے ہیں اس کو لفظ بعض اڑا کر تمام فقہاء اور تمام مقلدوں کے لیے عام کر دیا۔

جب دیانت داری، تقویٰ، پرہیزگاری، علم و معرفت جس کی قصیدہ خوانی موصوف نے اپنے اس مضمون میں کی ہے جو خاص دیوبند کا حصہ ہے یہ ہو تو اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ باقی باتوں میں کس قدر صادق القول ہوں گے۔ (مجلّہ اشاعۃ السنہ دہلی مارچ، اپریل ۲۰۰۱ص: ۵، ۶، ۷)

ناظرینِ کرام! مدیر اعزازی صاحب کی یہ طویل عبارت آپ کے پیش نظر ہے۔ (اس طوالت کو محض اس لیے انگیز کیا گیا ہے تاکہ آں موصوف کو ناقص عبارت نقل کرنے کا شکوہ نہ رہے) اس میں محترم نے پوری قوت بلکہ انتہائی جسارت کے ساتھ اپنے قارئین کو یہ جتانے کی سعی کی ہے کہ ماہنامہ دارالعلوم کے مدیر نے والا جاہی نواب صدیق حسن خاں صاحب بھوپالی کی اصل عبارت میں کاٹ چھانٹ کر کے اسے اپنے من پسند معانی میں ڈھال لیا اور اپنی اس بات کو انھوں نے جس طرح دو، دو چار کے انداز میں پیش کیا ہے اسے دیکھ کر مدیر ماہنامہ کے محرّف ہونے پر کون شبہ کر سکتا ہے۔ مگر آپ کو یہ جان کر انتہائی حیرت ہوگی کہ مدیر اشاعۃ السنہ کی یہ خالص بہتان طرازی ہے، نواب صاحب مرحوم کی اس عبارت میں ''علم رائے'' کے بعد محض کا لفظ قطعی طور پر نہیں ہے ''علم رائے'' کے ساتھ لفظ

---

(۱) غالباً مدیر موصوف کو اپنے مسلک کے علماء کی نصوص سے واقفیت نہیں ورنہ یہ جملہ لکھنے کی جسارت کبھی نہ کرتے کون نہیں جانتا کہ علمائے ظاہر اور انھیں کی اتباع میں زمانۂ حال کے اہل حدیث علی الاطلاق علم رائے کو مذموم سمجھتے ہیں علم رائے اور علم رائے محض میں کوئی فرق نہیں کرتے۔

محض کا یہ لاحقہ آں موصوف کا خودساختہ ہے، غالباً انہیں یہ معلوم نہیں یا اس سخن سازی کی دھن میں ان کے ذہن سے یہ بات نکل گئی کہ رائے محض جو کتاب وسنت یا اجماع سے ماخوذ ومستنبط نہیں ہوتی فقہاء ومحدثین سب کے نزدیک غیر معتبر اور مذموم ہے ورنہ نواب صاحب کی عبارت میں اس بے جوڑ پیوندکاری کی غلطی نہ کرتے۔

نواب صاحب رحمہ اللہ کی اس عبارت میں بدستِ خاص ترمیم واصلاح کر کے مدیر موصوف نے اگرچہ کچھ دیر کے لیے ماہنامہ دارالعلوم دیوبند کے مدیر پر الزام تراشی کی گنجائش پیدا کر لی مگر یہ نہیں خیال کیا کہ اس بیجا ترمیم سے امام السنۃ، خاتم المحدثین مجدد فی الہند عالی جاہ نواب صدیق حسن خاں صاحب کا معروف ومسلم علمی مقام ومرتبہ دائرۂ بحث ونظر میں آجائے گا، کیونکہ اس ترمیم کی صورت میں لازم آتا ہے کہ جس رائے وقیاس کو فقہائے مجتہدین اور ان کے متبعین ناجائز اور مذموم مانتے ہیں اور جس خودرو قیاس ورائے کی بیخ کنی کر کے اس کے پنپنے کی راہیں مسدود کر دی ہیں اسی موہوم رائے کو بنیاد بنا کر نواب صاحب مسلم معاشرہ پر حیلہ جوئی، مکرسازی، فریب آفرینی اور دغابازی کی بھپتی کس رہے ہیں کیا نواب صاحب جیسے متبحر، کثیر التصنیف عالم دین کے بارے میں ایسی فاش غلطی کا تصور کیا جاسکتا ہے؟ مدیر اعزازی صاحب نے نواب صاحب کی اس عبارت میں ترمیم کر کے اپنی علمی دیانت وامانت کا جو معیار قائم کیا ہے وہ تو ظاہر ہے، ساتھ ہی عالی جاہ نواب صاحب مرحوم کے علم ودانش کو بھی داؤ پر لگا دیا ہے۔

ہم تو ڈوبے ہیں صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے

اس موقع پر یہ بھی ملحوظ رہے کہ ماہنامہ دارالعلوم کے مدیر نے اپنے مدعا کے ثبوت میں نواب صاحب مرحوم کی زیر بحث عبارت کے علاوہ درج ذیل عبارت بھی نقل کی ہے۔

> ”سو محمد بن عبدالوہاب خود مقلد مذہب حنبلی من جملہ انھیں چار مذاہب کے ہے جو بالفعل عامۃً رائج ہیں اور فرقۂ موحدین (ماضی میں اہل حدیث اپنے کو موحدین کہتے تھے، ناقل) کسی مذہب خاص کے ان مذاہب میں سے پیرو اور مقلد نہیں ہیں کیونکہ یہ سب مذاہب بعد از زمانۂ نبوت اسلام کے

> حادث ہوئے ہیں، فرق درمیان مقلد مذاہب اور فرقہ موحدین کے فقط اتنا ہے کہ موحدین نرے قرآن و حدیث صحیح ہی کو مانتے ہیں اور باقی مذاہب اہل الرائے ہیں جو مخالف سنت اور طریقۂ شریعت ہے۔'' (ترجمان وہابیہ مع معاہدۂ اتفاقیہ ۱۳۱۲ھ مطبوعہ مطبع محمدی لاہور ص ۶۲)

نواب صاحب مرحوم فرقۂ اہل حدیث اور دیگر مذاہب میں فرق بیان کرتے ہوئے اپنی اس تحریر میں صاف لفظوں میں لکھ رہے ہیں کہ ''فرق درمیان مقلد مذاہب اور فرقۂ موحدین کے فقط اتنا ہے کہ موحدین نرے قرآن و حدیث صحیح کو ہی مانتے ہیں اور باقی مذاہب اہل الرائے ہیں جو مخالف سنت اور طریقۂ شریعت ہے'' اور مدیر اعزازی صاحب نے اس حوالہ کو اپنی تنقید اور عمل جراحی کا تختۂ مشق نہیں بنایا ہے جس سے یہی ظاہر ہے کہ آں موصوف اس نقل کو مطابق اصل مان رہے ہیں اور آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہاں بھی نواب صاحب ''اہل الرائے'' لکھ رہے ہیں اہل الرائے المحض نہیں جو اس بات کی دلیل ہے کہ ان کی زیر بحث سابق عبارت میں بھی علم رائے ہی ہے علم رائے محض نہیں ہے ورنہ نواب صاحب کی دونوں عبارتوں میں ایک طرح کا تضاد ہو جائے گا جو ایک بالغ نظر عالم کی شایان شان نہیں اس لیے ماننا پڑے گا کہ نواب صاحب نے صرف رائے محض کے بارے میں نہیں بلکہ مطلق ''رائے'' کے متعلق یہ اظہار خیال فرمایا ہے۔ جس سے روز روشن کی طرح یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ماہنامہ دارالعلوم دیوبند کے مدیر نے اس عبارت کی نقل میں کوئی خیانت نہیں کی ہے البتہ مدیر اعزازی اشاعۃ السنہ کو یہ اعزاز ضرور حاصل ہے ''حق بحق دار رسید''

''ہم الزام ان کو دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا''

آں محترم نے اسی زیر نظر عبارت میں مدیر ماہنامہ دارالعلوم کی بزعم خویش ایک اور خیانت کی نشاندہی یوں کی ہے:

> ''اس طرح ''فقہاء اور مقلدوں'' دونوں کے پہلے ''بعض فقہاء اور بعض مقلدوں'' لکھا ہوا ہے، اس میں سے لفظ بعض کو دونوں جگہ سے اڑا دیا گویا جو بات نواب صاحب بعض فقہاء اور بعض مقلدوں کے بارے میں کہہ

رہے ہیں اس کو لفظ بعض اڑا کر تمام فقہاء اور تمام مقلدوں کے لیے عام کر دیا۔ ''(۱)(اشاعۃ السنہ ص ٦)

خدا جانے مدیر اعزازی صاحب کے ہاتھ وہ کون سا آلہ آ گیا ہے جس کی مدد سے انھیں نواب صاحب مرحوم کی عبارت میں وہ الفاظ بھی نظر آ جاتے ہیں جنھیں مرحوم نواب صاحب نے سرے سے لکھا ہی نہیں ہے۔

ناظرین کرام! ذیل میں نواب صاحب علیہ الرحمہ کی مکمل عبارت درج کی جا رہی ہے آپ دیکھیں آخر وہ الفاظ کہیں ہیں جنھیں موصوف پوری دیدہ دلیری کے ساتھ لکھ رہے ہیں اور اسی بنیاد پر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند کے مدیر کو بد دیانت اور جھوٹا بتانے کے درپے ہیں۔

نقل عبارت عالی جاہ نواب صاحب مرحوم

> ''سر چشمہ سارے جھوٹے حیلوں اور مکروں کا، اور کان تمام فریبوں اور دغا بازیوں کی علم رائے ہے جو مسلمانوں میں بعد پیغمبر برحق کے پھیلا ہے، اور مہا جال ان سب خرابیوں کا بول چال فقہاء اور مقلدوں کی ہے اور ساری خرابی ڈالی ہوئی ان ملاّؤں کی ہے جو دام تقلید میں گرفتار ہیں اور بدعت اور شرک کے نشہ سے سرشار۔'' (ترجمان وہابیہ مع معاہدہ اہل حدیث وحنفیہ مسمّٰی بہ معاہدہ اتفاقیہ ۱۳۱۲ھ، مطبوعہ محمدی واقع لاہور، ص: ۲۴)

نواب صاحب کی تصنیف ''ترجمان وہابیہ'' کے جس مطبوعہ نسخہ سے یہ حوالہ نقل کیا گیا ہے اس کا مطبع اور صفحہ سب لکھ دیا گیا ہے تاکہ اصل کتاب کی طرف مراجعت میں سہولت ہو نواب صاحب مرحوم کے یہ اور جلی اصلی الفاظ اس بات پر شاہد عدل ہیں کہ اس محولہ عبارت سے ماہنامہ دارالعلوم دیوبند کے مدیر نے ''محض'' اور ''بعض'' کے الفاظ اڑا کر تحریف جیسی خیانت نہیں کی ہے بلکہ نواب صاحب کے کرم فرما مدیر اعزازی اشاعۃ السنہ نے اصل عبارت میں اپنی جانب سے دونوں لفظوں کا اضافہ کر کے سلفی دیانت کا ثبوت

---

(۱) اگر لگے ہاتھوں آں موصوف بعض فقہاء اور بعض مقلدین کی تعیین فرما دیتے تو بات منقح ہو جاتی کہ یہ کن فقہاء اور کن مقلدوں کے بارے میں کہا جا رہا ہے اس ابہام سے تو بات وہیں کی وہیں رہی۔

پیش کیا ہے۔ اور فرمان الٰہی وَمَنْ یَکْسِبْ خَطِیْئَةً اَوْ اِثْمًا ثُمَّ یَرْمِ بِه بَرِیْئًا فَقَدِ احْتَمَلَ بُهْتَانًا و اثمًا مُبِیْنًا. سے یکسر چشم پوشی کرلی، "یاللعجب"

آں موصوف کی اس کارستانی پر اگر کوئی گستاخ، ادب سے عاری انھیں کی زبان و الفاظ میں کہنے لگے کہ رضا بدایونی نے تو جھوٹ، فریب اور بے بنیاد الزامات تراشنے میں رضا خانیوں کے بھی کان کتر لیے ہیں تو اس کے جواب میں یہی کہنا پڑے گا۔

جس کی پیشانی پر لکھا تھا کہ میں قاتل نہیں
کیا کریں دھبے اسی کی آستیں پر مل گئے

مدیر موصوف ماہنامہ دارالعلوم دیوبند کے مدیر کے جرم تحریف کی تعداد بڑھانے کی غرض سے یہ بھی لکھتے ہیں کہ ''مدیر ماہنامہ دارالعلوم نے ہاتھ کی صفائی دکھائی ہے کہ ''حیلوں'' کو ''میلوں'' بنادیا'' جب کہ انھیں خوب معلوم ہے کہ عام بول چال میں حیلوں ومکروں استعمال ہوتا ہے نہ کہ میلوں ومکروں کیونکہ مکر کے ساتھ میلہ کا کوئی معنوی ربط نہیں ہے، آں موصوف تو ماشاء اللہ مدیر اعزازی جیسے معزز مقام پر فائز ہیں، ایک معمولی اُردو خواں بھی سمجھ سکتا ہے کہ یہ دانستہ تحریف نہیں بلکہ کتابت کی غلطی ہے اس طرح کی غلطیوں کا رہ جانا کوئی مستبعد نہیں بالخصوص کمپیوٹر کی کتابت میں تو یہ شکایت عام ہے۔ زیر نظر مجلہ اشاعۃ السنہ صفحہ ۳ کی درج ذیل عبارت ملاحظہ کیجیے:

> ''تشریح: "وَمَا مَسَّنَا مِنْ لُغُوب" سے مراد یہ ہے کہ موسیٰ کی کتاب تکوین میں جو لکھا ہے کہ ساتویں دن خدا نے آرام کیا یہ تعریف انسانی ہے، اللہ تعالیٰ نے اس دنیائے حقیر کو پیدا کر کے بالکل تکان محسوس نہیں کی، کیونکہ وہاں تھک جانے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، وہاں تو صرف اعادہ کی ضرورت ہے اور پھر آپ سے آپ کائنات منصف مشہود پر جلوہ گر ہو جاتی ہے۔''

اس مختصر سی عبارت میں تینوں خط کشیدہ الفاظ غلط طبع ہوئے ہیں، تعریف کے بجائے تحریف، اعادہ کی جگہ ارادہ اور منصف مشہود کے بدلہ منصۂ شہود ہونا چاہیے۔ اب ان کتابتی غلطیوں کو دیکھ کر کوئی سرپھرا یہ کہنے لگے کہ علامہ محمد حنیف ندوی رحمہ اللہ کی عبارت میں مولانا ابو عامر رضا بدایونی مدیر اعزازی اشاعۃ السنہ نے ہاتھ کی صفائی دکھائی ہے اور علامہ

کے اصل الفاظ میں رد و بدل اور تحریف کر کے اسے کچھ سے کچھ بنا دیا تو ظاہر ہے کہ مدیر موصوف اس کو یہی جواب دیں گے۔

ادا سناش نئی دلبرا خطا ایں جاست

مدیر ماہنامہ دار العلوم دیو بند کی مزید تحریفات کو بتانے کے لیے آگے لکھتے ہیں:

> ''دوسری مثال حضرت مولانا محمد صاحب جونا گڑھی کی مشہور زمانہ کتاب ''طریق محمدی'' سے دو عبارتیں پیش کی گئی ہیں جس میں پہلی عبارت اس صفحہ میں کہیں نہیں ہے جس کا حوالہ دیا ہے اور دوسری عبارت میں درمیان سے کافی عبارت اڑا کر اس کو ایک عبارت بنانے کی سعی مذموم کی گئی ہے...
>
> بہر حال یہاں ہم اپنے قارئین کو صرف اتنا بتانا چاہتے ہیں کہ حضرت مولانا محمد صاحب جونا گڑھی جن کی کتاب کی دو محرف عبارتیں پیش کر کے مولوی حبیب الرحمٰن اعظمی نے ان کو مخالف ائمہ کرام و دشنام دہندہ بزرگان اعلام ظاہر کرنا چاہا ہے، الحمد للہ حضرت نواب صدیق حسن خاں صاحب بھوپالی اور حضرت مولانا محمد صاحب جونا گڑھی نہ صرف پکے سچے موحد، مسلمان، خادم اسلام تھے بلکہ ائمہ اسلام خصوصاً ائمہ اربعہ رحمھم اللہ اجمعین کو اپنا پیشوا اور بزرگ مانتے تھے۔'' (مجلّہ اشاعۃ السنہ مارچ، اپریل ۲۰۰۱ء ص ۷)

مدیر موصوف کو غالباً ''تحریف'' سے خاص انسیت ہے اسی لیے انہیں ہر جگہ تحریف ہی تحریف نظر آتی ہے اس کے سوا کچھ دکھائی ہی نہیں دیتا۔ گذشتہ سطور میں ملاحظہ کیا جا چکا ہے کہ والا جاہی نواب صدیق حسن خاں صاحب مرحوم کی اصل عبارت میں بقلم خود اضافہ پھر اس جعلی تحریر کو ان کی جانب منسوب کر کے اپنے ذوق کی تسکین کا سامان فراہم کیا تھا۔

اس موقع پر بھی آں موصوف نے مبہم انداز میں کچھ اسی طرح کی کوشش کی ہے کہ اپنے قارئین کو یہ تاثر دینے کے لیے کہ مدیر ماہنامہ دار العلوم دیو بند نے حضرت مولانا جونا گڑھی صاحب کی جانب ایسی بات منسوب کر دی جو ان کی کتاب میں نہیں ہے لکھتے ہیں ''کتاب ''طریق محمدی'' سے دو عبارتیں پیش کی گئی ہیں جس میں پہلی عبارت اس صفحہ

پر کہیں نہیں ہے جس کا حوالہ دیا گیا ہے۔‘‘

جب کہ حوالہ کی صحت کے سلسلہ میں یہ بات کافی سمجھی جاتی ہے کہ جس کتاب سے عبارت نقل کی گئی محولہ کتاب میں بعینہٖ موجود ہونی چاہیے، رہا صفحات میں مطابقت کا معاملہ تو یہ ثانوی درجہ کی چیز ہے کیونکہ محولہ کتاب کے نسخوں کے مختلف ہونے کی صورت میں بالعموم صفحات میں اختلاف ہو ہی جاتا ہے اس لیے محولہ صفحہ پر عبارت کا نہ ہونا چنداں قابل گرفت نہیں لیکن یہاں تو ساری خامہ فرسائی کا مقصد ہی مدیر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند کی تحریر میں کسی نہ کسی طرح کیڑے نکالنا اور اسے زبردستی علمی دیانت سے عاری ٹھہرانا ہے اس لیے اصول وضوابط سے چشم پوشی ہی نہیں بلکہ صحیح حوالوں میں ترمیم وتحریف کو بھی روا سمجھ لیا گیا ہے۔ بہرحال مدیر موصوف کی سہولت کی غرض سے مولانا جونا گڑھی کی پہلی عبارت مع صفحہ درج کی جارہی ہے ’’طریق محمدی‘‘ کے محولہ نسخہ سے مقابلہ کر کے اطمینان کرلیں اور بتائیں اس میں کیا ہاتھ کی صفائی دکھائی گئی ہے اور کس لفظ وجملہ میں تحریف کی گئی ہے۔

نقل عبارت مولانا محمد صاحب جونا گڑھی

> ’’الغرض جس طرح باپ دادوں کی تقلید موجب گمراہی ہے اسی طرح سادات بزرگوں کی اور اسی طرح علماء کرام اور خداوالوں کی بھی وہ بزرگ گو حق پر ہوں اور راہ یافتہ ہوں لیکن ان کی تقلید پھر بھی موجب ضلالت رہے گی۔‘‘

(طریق محمدی ناشر اہل حدیث اکیڈمی مئوناتھ بھنجن، سن اشاعت مارچ ۲۰۰۰ ÷ ص۲۲)(۱)

رہا دوسرے حوالہ کے بارے میں مدیر اعزازی صاحب کا یہ الزام کہ ’’دوسری عبارت میں درمیان سے کافی عبارت اڑا کر اس کو ایک عبارت بنانے کی سعی مذموم کی گئی ہے‘‘ تو یہ بھی نرا الزام ہی ہے، یہاں دو الگ الگ عبارتوں کو ایک نہیں بنایا گیا ہے بلکہ طوالت سے بچنے کی غرض سے ایک ہی عبارت سے بعض حصے حذف کیے گئے ہیں، کون

---

(۱) یہاں بالقصد ’’طریق محمدی‘‘ کے اس خاص نسخہ کو حوالہ کے لیے منتخب کیا گیا ہے کیونکہ اسے ایک اہل حدیث عالم نے مراجعت وتحقیق کے بعد شائع کیا ہے اور امیر مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند نے اس پر تقریظ ثبت فرمائی ہے اس لیے دیگر نسخوں کے مقابلہ میں یہ نسخہ زیادہ قابل اعتماد ہے۔

نہیں جانتا کہ مضمون نگار اور مصنّفین کے یہاں یہ طریقہ عام طور پر رائج ہے کہ حوالوں میں اختصار کی غرض سے عبارت کے بعض حصے درمیان یا آخر سے حذف کر دیا کرتے ہیں۔ البتہ اس حذف و اختصار میں اس بات کا لحاظ ضروری ہے کہ اس کی وجہ سے اصل عبارت کے معانی و مفہوم میں کسی قسم کا تغیر نہ پیدا ہو ورنہ یہ اختصار تحریف کی حد میں داخل ہو جائے گا۔ ذیل میں ماہنامہ دار العلوم دیوبند میں شائع اختصار و تلخیص اور مولانا جوناگڑھی کی مکمل عبارت نقل کی جا رہی ہیں، دونوں عبارتوں میں موازنہ و مقابلہ کر کے دیکھ لیا جائے کہ مدیر ماہنامہ دار العلوم نے اختصار و تلخیص سے کام لیا ہے یا اصل عبارت میں ترمیم و تحریف کی سعی مذموم کی ہے۔

طریق محمدی کی مکمل عبارت

”الغرض اتباع رسول کو پرے پھینکنے کا آلہ جو ہر زمانے کے مخالفِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) لوگ اپنے کام میں لاتے رہے یہی تقلید ہے اگر تقلید کی مذمت میں صرف یہی آیتیں ہوتیں جب بھی اس کی بدترین حرمت کے ثبوت کے لیے کافی تھیں کہ یہ وہ چیز ہے جو اصل اسلام سے دنیا کو روکتی ہے۔“ (طریق محمدی اہل حدیث اکیڈمی مئوناتھ بھنجن ۲۰۰۰ء ص۲۱)

ماہنامہ دار العلوم دیوبند میں شائع مختصر عبارت

الغرض اتباع رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کو پرے پھینکنے کا آلہ جو ہر زمانے میں مخالف رسول لوگ اپنے کام میں لاتے رہے یہی تقلید ہے... تقلید ہی وہ چیز ہے جو اصل اسلام سے دنیا کو روکتی ہے۔ (ماہنامہ دار العلوم دیوبند دسمبر ۲۰۰۰ء ص۱۴)

مکمل اور مختصر دونوں عبارتیں آپ کے سامنے ہیں بغرض اختصار خط کشیدہ عبارت کو حذف کر دیا گیا ہے جب کہ اس حذف و اختصار سے اصل عبارت کے معانی و مفہوم میں ادنیٰ تغیر بھی نہیں ہوا ہے۔ کیا اسے دو عبارتوں کو ایک بنانے کی سعی مذموم کہنا قرینِ انصاف ہے؟ طریق محمدی کی محولہ پہلی اور دوسری عبارتوں کے بارے میں مدیر اعزازی صاحب کا یہ لکھنا کہ ”حضرت مولانا محمد صاحب جوناگڑھی جن کی کتاب کی دو محرف

عبارتیں پیش کر کے الخ'' کہاں کی علمی دیانت ہے جب کہ پہلی عبارت من وعن نقل کی گئی ہے اور اصل ونقل میں ایک نقطہ کا بھی فرق نہیں ہے تو پھر یہ نرا الزام و بہتان نہیں تو کیا ہے۔

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے

اس موقع پر پس و پیش کو دیکھے بغیر مدیر موصوف جوش تردید میں یہاں تک لکھ گئے ہیں ''الحمد للہ حضرت نواب صدیق حسن خاں صاحب بھوپالی اور حضرت مولانا محمد صاحب جونا گڑھی نہ صرف یہ کہ پکے سچے موحد، مسلمان اور خادم اسلام تھے بلکہ ائمہ اسلام خصوصاً ائمہ اربعہ رحمہم اللہ علیہم اجمعین کو اپنا پیشوا اور بزرگ مانتے تھے۔'' (اشاعۃ السنہ مارچ، اپریل ۲۰۰۱ء ص ۷)

ان ہر دو بزرگوں کا موحد و مسلمان ہونا تو مسلمات میں سے ہے اس لیے ان کے اسلام و ایمان کو معرضِ بحث میں لانے کی ضرورت نہیں، البتہ موصوف کا یہ دعویٰ کہ یہ دونوں بزرگوار بطور خاص ائمہ اربعہ رحمہم اللہ کو اپنا پیشوا اور بزرگ مانتے تھے، محلِ نظر ہے اور خود ان کی جماعت کے لوگ بھی شاید انشراح قلب اور بشاشت طبع کے ساتھ اسے تسلیم نہیں کریں گے کیونکہ مولانا جونا گڑھی مرحوم کا خود اپنا عمل اس دعویٰ کی نفی کرتا ہے، مولانا موصوف کی تصنیفی خدمات سے واقف کون نہیں جانتا کہ جماعت اہل حدیث کے اولین بزرگ یہی ہیں جنھوں نے امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے مثالب ومطاعن پر مشتمل روایتیں (جو اصول محدثین کے اعتبار سے لائق قبول نہیں ہیں (۱)) تاریخ بغداد سے منتخب کر کے ان

---

(۱) اصول محدثین کی روشنی میں ان روایتوں کی اسنادی کمزوری اور بے اعتباری کے لیے دیکھئے، ''الشهم المصيب'' **از ملک معظم عیسیٰ بن ابی بکر ایوبی**، والانتصار لامام ائمة الامصار، **نیز** مرآة الزمان **ترجمہ** امام ابوحنیفه **از** امام سبط ابن الجوزی، **مقدمہ جامع** مسانید **ابی حنیفہ، از علامہ ابو المؤید خوارزمی**، تانيب الخطيب على ما ساقه فی ترجمة ابی حنيفة من الاكاذيب، **از محقق زاہد کوثری، حواشی تاریخ خطیب ج ۱۳ طبع ثانی، از** لجنة من علماء الازهر، الحافظ الخطيب و اثره فی علوم الحديث، **از صفحہ ۳۰۶ تا ۳۴۵، از ڈاکٹر محمود الطحان** استاذ الحديث بكلية الشريعة والدراسات الاسلامية **کویت یونیورسٹی وغیرہ۔ علمی وفنی اعتبار سے یہ بات محقق ہو چکی ہے کہ ان انتہائی کمزور اور بے بنیاد روایتوں کے ذکر کرنے میں حافظ خطیب سامحہ اللہ سے بعض وجوہ واسباب کی بنا پر دانستہ غلطی ہوئی ہے پھر بھی عصر جدید کی اہل حدیث نامی یہ جماعت حافظ موصوف کی اس غلطی کو اپنے گلے کا طوق بنائے ہوئے ہے**، والله هو الموفق ويهدى لمن يشاء الى السواء السبيل.

کا اردو ترجمہ ''امام محمدی'' کے نام سے پہلی مرتبہ ہندوستان میں شائع کیا جب کہ امام اعظم رحمہ اللہ کے خلاف اس قسم کے فاسد، رکیک اور جعلی مواد سے ملک کے عوام اب تک نا آشنا تھے۔ کیا اپنے پیشواؤں اور بزرگوں کے ساتھ جماعت اہل حدیث کے یہاں یہی سلوک کیا جاتا ہے؟ غالباً موقع ومحل کے لحاظ سے آں موصوف نے بطور تقیہّ کے یہ بات لکھی ہے ورنہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے بارے میں ان کی جماعت کا مخالفانہ رویہ کوئی ڈھکی چھپی چیز نہیں ہے، تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے انشاء اللہ کسی مناسب موقع پر اس موضوع پر مفصل گفتگو کی جائے گی۔

رات کو یہ دن ثابت کردیں ثابت کردیں دن کو رات
جدھر کا پلاّ بھاری دیکھیں ادھر جھکیں فرزانے لوگ

اوپر مذکور تفصیلات سے یہ بات نصف النہار کی طرح روشن ہوگئی کہ ماہنامہ دارالعلوم دیوبند میں منقول حوالے بالکل صحیح ہیں ان میں ترمیم وتحریف نہیں کی گئی ہے، البتہ خود اشاعۃ السنہ کے مدیر اعزازی مولانا ابوعامر رضا بدایونی اہل حدیث صاحب نے مرحوم نواب صاحب کی عبارت کو ہدفِ تحریف بنایا ہے اور اپنی مشاقی اور ہاتھ کی صفائی سے اسے مدیر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند کے سر تھوپنے کی سعی مذموم کی ہے۔ اس لیے بجاطور پر ان سے یہ مطالبہ کیا جاسکتا ہے کہ آنجناب اگر نام نہاد نہیں بلکہ واقعی اہل حدیث ہیں اور سنت سیئہ کی نہیں بلکہ سنت حسنہ کی اشاعت کرتے ہیں تو احکم الحاکمین کے فرمان ''یَا أَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُوا کُونُوا قَوَّامِینَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلّٰه وَلَوْ عَلٰی اَنْفُسِکُمْ'' الآیۃ کے مطابق عدل و انصاف کو کام میں لائیے اور اس شہادتِ زور اور جھوٹی گواہی کے بالمقابل جو آپ نے ماہنامہ دارالعلوم دیوبند کے مدیر کے خلاف اپنے مجلّہ میں شائع کی ہے اپنے اولیائے نعمت کے مفاد ومقاصد کی پاسداری سے بلند ہوکر مالکِ کائنات کی رضا جوئی کے جذبہ سے شہادتِ حق اور سچی گواہی کی اشاعت کیجیے اور جس خود ساختہ، من گھڑت جرم کو مدیر ماہنامہ دارالعلوم کی جانب بیجا طور پر منسوب کرکے اسے جن مذموم وناپسندیدہ القاب وخطابات کا مورد بنایا ہے اور جماعت دیوبند پر پھبتیاں کسی ہیں، اگر آنجناب کے اندر کچھ بھی ایمانی

حرارت اور محدثانہ جرأت ہے تو اس جرم کے اصلی مجرم اور ان القاب وخطابات کے صحیح مستحق کو اجاگر کیجیے کیونکہ ”صاحب البيت ادرىٰ بمافيه“

مشکل بہت پڑے گی برابر کی چوٹ ہے
آئینہ دیکھئے گا ذرا دیکھ بھال کے

اس بات کے ثبوت میں کہ عصر جدید کی اس اہل حدیث نامی جماعت کے فکر ونظریہ سے جو بھی ہم آہنگ نہیں وہ اس کے نزدیک ہدایت سے عاری، مبتدع اور فرقۂ ناجیہ سے خارج ہے، ماہنامہ دارالعلوم دیوبند میں اس جماعت کے دو اکابر علماء عالی جاہ نواب صدیق حسن خاص صاحب اور ترجمان القرآن والسنہ مولانا محمد صاحب جوناگڑھی رحمہما اللہ کی تحریروں کے علاوہ (جن پر گذشتہ سطور میں تفصیلی بحث گزر چکی ہے) ایک تیسرے عالم مولانا ابوالشکور عبدالقادر حصاروی کی تصنیف ”سياحة الجنان“ کی یہ عبارت نقل کی گئی تھی۔

> ”جب یہ امر روشن ہو چکا کہ مذہبِ حق اہل حدیث ہے اور باقی جھوٹے اور جہنمی ہیں تو اہل حدیثوں پر یہ واجب ہے کہ ان تمام گمراہ فرقوں سے بچیں اور ان سے خلاء ملا، میل جول، دینی تعلقات نہ رکھیں یعنی باطل مذہب والوں کے پیچھے نماز نہ پڑھیں اور ان کے جنازہ میں شامل نہ ہوں ان سے سلام نہ لیں ان سے مناکحت نہ کریں۔“ (ص۴)

نیز لکھتے ہیں:

> ”مقلدین حنفیہ کے ہر دو فرقے دیوبندی اور بریلوی گمراہ ہیں۔“ (ص۵)

مدیر اعزازی صاحب نے اس موقع پر ماہنامہ دارالعلوم کے مدیر کی بڑی عزت افزائی فرمائی کہ اسے اس حوالہ کے نقل کرنے میں تحریف کے الزام کا نشانہ نہیں بنایا۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کے نشتر قلم نے یہاں خود گھر ہی کے ایک بزرگ کو لہولہان کر دیا۔ ملاحظہ کیجیے آں موصوف رقم طراز ہیں:

> ”اطلاعا عرض ہے کہ وہ حصاری صاحب کی اپنی ذاتی رائے ہے۔ جیسا کہ

بعض دیوبندیوں کی بھی رائے ہے، نیز ان کی کتاب سے اہل حدیث کو الزام دینا زیادتی ہے جیسے کسی بریلوی گروپ کی کتاب سے دیوبندیوں کو الزام دینا بظاہر یہ دونوں حنفی ہیں مگر بڑا فرق ہے ایسا ہی معاملہ یہاں ہے۔" (اشاعۃ السنہ ص ۱۰)

(۱) سوال یہ ہے کہ اگر جماعت اہل حدیث سے کوئی دوسرا مدیر اعزازی اٹھے اور ان کے بالمقابل یہ صدائے حق بلند کرے کہ مولانا حصاروی مرحوم کے مندرجات کو ان کی ذاتی رائے بتانا خود مدیر اعزازی اشاعۃ السنہ کی اپنی ذاتی رائے ہے، جماعت اہل حدیث کا اس سے کوئی تعلق نہیں تو آں موصوف کے پاس اسکا کیا جواب ہوگا؟ جب کہ مولانا حصاروی کی تائید دیگر علمائے حدیث بالخصوص مولانا محمد صاحب جونا گڑھی، مولانا محمد رئیس ندوی، محمد اقبال سلفی وغیرہ کی تحریروں سے بھی ہوتی ہے، کیا مدیر اعزازی صاحب کو جماعت اہل حدیث نے "معیار حق" ہونے کا اعزاز بھی عطا کر دیا ہے کہ ان کے اس فرمان کے بعد کسی کو دم مارنے کی گنجائش نہیں؟ ہر ذی فہم سمجھتا ہے کہ یہ آں موصوف کی دفع الوقتی ہے جس کی علم و تحقیق کی دنیا میں کوئی وقعت نہیں۔

(۲) آں موصوف نے اپنی اس تحقیق میں مولانا حصاروی کو بریلوی گروپ سے تشبیہ دے کر یہ بتانے کی ناروا کوشش کی ہے کہ مولانا حصاروی مرحوم کی حیثیت جماعتِ اہل حدیث میں ایک مبتدع کی ہے۔

جب کہ خود فرقۂ اہل حدیث کی تصنیفات سے پتہ چلتا ہے کہ مولانا عبدالقادر حصاروی جماعتِ اہل حدیث کے اکابر علماء مثلاً مولانا محمد صاحب جونا گڑھی، مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا عبدالحق غزنوی، مولانا داؤد غزنوی، مولانا حافظ عبداللہ روپڑی، مولانا عبدالاحد خانپوری رحمہم اللہ وغیرہ کے طبقہ میں شمار ہوتے ہیں، ان بزرگوں کے فتاویٰ کے ساتھ مولانا حصاروی کے فتوے بھی شائع ہوتے تھے اور جماعت میں معتبر مانے جاتے تھے۔ اس لیے مدیر موصوف کا یہ انکشاف اور اپنی ہی جماعت کے ایک بزرگ کا بذات خویش یہ دینی اعزاز اور وہ بھی اپنی ایک غلط اور بے بنیاد بات کو صحیح اور درست بنانے کے

لیے بجائے خود ایک بڑی عبرت خیز روش ہے۔

ناوک نے ترے صید نہ چھوڑے زمانے میں
تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں

ابھی کچھ باتیں مزید آں موصوف سے کہنے کی تھیں مگر اندیشہ ہے کہ شاید آں موصوف کی طبع نازک تحمل نہ کرسکے، اس لیے سر دست انھیں گذارشات پر بات ختم کی جاتی ہے ''یار زندہ صحبت باقی''۔

اندکے از تو بگفتم و بدل ترسیدم   کہ تو رنجیدہ شوی ورنہ سخن بسیار است

☆ ☆ ☆

نوٹ: آئندہ صفحات میں نواب صاحب اور مولانا جونا گڑھی کی کتابوں کا عکس ملاحظہ کیجئے جس سے پوری طرح واضح ہو جائیگا کہ محرّف کون ہے۔ اور الٹے الزام کسے دیا جا رہا ہے۔

دارالعلوم دیوبند کے خلاف ''ترجمان'' دہلی کی الزام تراشیوں پر ایک نظر

شیشے کے گھر میں بیٹھ کے ...

دارالعلوم دیوبند کیا ہے؟ ظلمت کدۂ ہند میں علم وآ گہی کا ایک مینارۂ نور، دین الٰہی کی حسنات و برکات کا ایک چشمۂ فیاض۔ احسان وسلوک اور اخلاص وللّٰہیت کا ایک عظیم مرکز دعوت وعزیمت اور جہد و جہاد کی ایک روشن تاریخ، مجدد الف ثانیؒ، محدث دہلوی، اور شہدائے بالاکوٹ کی امانتوں کا حامل ومحافظ، اور برصغیر میں بقائے دین وتحفظ اسلام کا اہم ترین ذریعہ، چنانچہ دارالعلوم دیوبند کی ہمہ جہت خدمات اور محیر العقول کارناموں کو دیکھ کر ایک مبصر ورطۂ حیرت میں ڈوب جاتا اور بے ساختہ پکار اٹھتا ہے کہ

دامانِ نگہ تنگ گلِ حسن تو بسیار
گل چینِ بہارِ تو ز داماں گلہ دارد

دارالعلوم دیوبند! رب کریم کے لطف بے پایاں، صلحائے امت کی مستجاب دعاؤں اپنے بانیوں کے حسن اخلاص اور اپنی بے مثال خدمات کی بنا پر عظمت ورفعت اور شہرت و مقبولیت کے جس مقام بلند پر فائز ہے، برصغیر کی سوا سو سال کی طویل علمی ودینی تاریخ اس کی مثال پیش کرنے سے عاجز ہے۔ دارالعلوم کا یہی مجد وشرف اور اس کی یہی نیک نامی، بعض بے ہنر، تحزب پسند افراد اور جماعتوں کی نظر میں کانٹے کی طرح چبھ رہی ہے، یہ لوگ نشۂ بغض وحسد میں اس درجہ سرمست ہیں کہ دارالعلوم سے متعلق گفتگو میں علمی دیانت ہی

نہیں بلکہ انسانی شرافت کا بھی پاس ولحاظ نہیں رکھتے۔

حسدوا الفتٰی اذا لم ینالوا فضله　　فالناس اعداء له و خصوم
کضرائر الحسناء قلن لوجهها　　حسدا و بغیا انه لدمیم

چنانچہ مرکزی جماعت اہل حدیث کے نقیب ''ہفت روزۂ ترجمان دہلی'' نے یکم ربیع الاوّل کے شمارہ میں ''دارالعلوم دیوبند'' اوراس کے اکابر اور فضلاء کی بے لوث خدمات اور روشن تاریخ کو اپنے دل کی کدورتوں سے داغدار بنانے کی ناکام کوشش کی ہے۔

غیر مقلدین خود اپنے اکابر علماء کی نظر میں

آج کی اس مختصر تحریر میں ہم ''ترجمان دہلی'' کی اس مذموم روش کا علم وتاریخ کی روشنی میں جائزہ لیں گے، لیکن اصل گفتگو سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس نوپید جماعت کا جس کا مذکورہ جریدہ نقیب وترجمان ہے خود اس جماعت کے اکابر واعاظم علماء کی تحریروں سے مختصر تعارف پیش کردیا جائے، تاکہ اس جماعت کی اصل حقیقت، سلف صالحین کے ساتھ اس کے رویہ وغیرہ سے یک گونہ واقفیت ہوجائے جس سے صحیح فیصلہ تک پہنچنے میں سہولت اور آسانی ہوگی۔

(۱) جماعت اہل حدیث (غیر مقلدین) کے مجدد جناب نواب صدیق حسن خاں صاحب قنوجی جن کے زرومال کے سہارے غیر مقلدیت سرزمین ہند میں پروان چڑھی، ائمہ مجتہدین رحمہم اللہ کے بارے میں اپنی منظور نظر جماعت کے رویہ کی ان الفاظ میں مذمت کرتے ہیں۔

> ''اس زمانہ کی آفات میں سے ایک آفت یہ بھی ہے کہ تقلید کے ردوقدح میں حضرات ائمہ عظام تک طعن وتشنیع کا دروازہ کھول دیا جاتا ہے، یہ بدبختی اور صریح گمراہی ہے، چند بدنام لوگ سلف صالحین کے رسوا کرنے میں اپنے نامۂ اعمال کی طرح سیاہ کرتے ہیں نعوذ باللہ من الخذلان'' (مآثر صدیقی ص۲۲ ج۴)

(۲) غیر مقلدین کے ایک دوسرے مشہور عالم مولانا داؤد غزنوی امام اعظم ابوحنیفہ

رحمہ اللہ کے ساتھ اپنی جماعت کے طرزِ عمل پر یوں نوحہ کناں ہیں۔

> ''جماعت اہل حدیث کو حضرت امام اعظمؒ کی روحانی بددعا لے کر بیٹھ گئی ہے، ہر شخص ابوحنیفہ ابوحنیفہ کہہ رہا ہے، کوئی بہت ہی عزت کرتا ہے تو امام ابوحنیفہ کہہ دیتا ہے، پھر اُن کے بارے میں اِن کی تحقیق یہ ہے کہ وہ تین حدیثیں جانتے تھے یا زیادہ سے زیادہ گیارہ، اگر کوئی بہت بڑا احسان کرے تو انھیں سترہ حدیثوں کا عالم گردانتا ہے جو لوگ اتنے جلیل القدر امام کے بارے میں یہ نقطۂ نظر رکھتے ہوں ان میں یکجہتی و اتحاد کیوں کر پیدا ہوسکتا ہے۔'' یا غربة الاسلام انما اشکوبثی وحزنی الی اللہ
>
> (سوانح مولانا داؤد غزنوی ص ۱۳۶، مرتبہ مولانا سید ابوبکر غزنوی)

(۳) اس گروہ کے بہت بڑے عالم مولانا محمد حسین بٹالوی ایڈیٹر اشاعۃ السنہ (جو جماعت اہل حدیث کے عظیم محسن ہیں کیونکہ انھیں کی جانفشانیوں اور انتھک کوششوں سے برطانوی حکومت کی طرف سے ''اہل حدیث'' کا نام اس جماعت کے لئے الاٹ ہوا، تفصیل کیلئے سیرت ثنائی ۳۷۲ راز مولوی عبدالمجید سوہدری ملاحظہ ہو) غیر مقلدین کے گمراہ کن نتائج پر یوں اظہار افسوس کرتے ہیں۔

> ''پچیس برس کے تجربہ سے ہم کو یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ جو لوگ بے علمی کے ساتھ مجتہد مطلق اور مطلق تقلید کے تارک بن جاتے ہیں وہ آخر اسلام کو سلام کر بیٹھتے ہیں۔
>
> کفر و ارتداد کے اسباب اور بھی بکثرت موجود ہیں مگر دینداروں کے بے دین ہو جانے کیلئے بے علمی کے ساتھ ترک تقلید بڑا بھاری سبب ہے، اگر وہ اہل حدیث میں جو بے علم یا کم علم (اور ایسے ہی افراد کی کثرت ہے) ہو کر ترک مطلق تقلید کے مدعی ہیں وہ ان نتائج سے ڈریں۔'' (بحوالہ خیر التنقید)

(۴) جماعت اہل حدیث کے متعلق اسی جماعت کے ایک اور مشہور محقق و عالم مولانا قاضی عبدالماجد خان پوری کی رائے بھی ملاحظہ کر لیجئے، موصوف اپنی مشہور تصنیف

''کتاب التوحید والسنۃ فی رد اہل الالحاد والبدعۃ'' کے ص ۲۶۲ پر رقم طراز ہیں۔

> ''اس زمانہ کے جھوٹے اہل حدیث مبتدعین، مخالفین سلف صالحین جو حقیقت ماجاء بہ الرسول سے جاہل ہیں وہ صفت میں وارث اور خلیفہ ہوتے ہیں شیعہ وروافض کے یعنی جس طرح شیعہ پہلے زمانوں میں باب اور دہلیز کفر ونفاق کے تھے اور مدخل ملاحدہ وزنادقہ کا تھے اسلام کی طرف یہ جاہل بدعتی اہل حدیث اس زمانہ میں باب اور دہلیز اور مدخل ہیں ملاحدہ اور زنادقہ، منافقین کے بعینہٖ مثل اہل تشیع کے… مقصود یہ ہے کہ رافضیوں میں ملاحدہ تشیع ظاہر کرکے حضرت علی اور حسنین رضی اللہ عنہم کی غلو کے ساتھ تعریف کرکے سلف کو ظالم کہہ کر گالی دیں، اور پھر جس قدر الحاد وزندقہ پھیلادیں کچھ پرواہ نہیں، اسی طرح ان جہال، بدعتی، کاذب اہل حدیثوں میں کوئی ایک دفعہ رفع یدین کرے اور تقلید کا رد کرے اور سلف کی ہتک کرے مثل امام ابوحنیفہ علیہ الرحمہ جن کی امامت فی الفقہ اجماع کے ساتھ ثابت ہے، اور پھر جس قدر کفر، بداعتقادی اور الحاد اور زندیقیت ان میں پھیلادے بڑی خوشی سے قبول کرتے ہیں اور ایک ذرہ چیں بہ چیں بھی نہیں ہوتے اگرچہ علماء اور فقہاء اہل سنت ہزار دفعہ ان کو متنبہ کریں ہرگز نہیں سنتے، سبحان اللہ ما اشبہ اللیلۃ البارحۃ اور سبب اس کا یہ ہے کہ وہ مذہب وعقائد اہل سنت والجماعت سے نکل کر اتباع سلف سے مستنکف ومستکبر ہوگئے ہیں۔''

جماعت اہل حدیث کے مذکور الصدر علمائے عظام کے ان بیانات سے اس جماعت کی دینی وعملی حیثیت اور حضرات ائمہ مجتہدین بالخصوص امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں اس کا نقطۂ نظر کسی حد تک واضح ہوجاتا ہے، جس سے ایک ذی رائے بجا طور پر یہ نتیجہ اخذ کرسکتا ہے کہ جو طبقہ فکری تشتت کا شکار ہوکر جادۂ اعتدال چھوڑ بیٹھا ہو، جس کے یہاں فقہائے مجتہدین وسلف صالحین کسی اعتنا کے مستحق نہ ہوں وہ دارالعلوم

دیوبند یا اس کے اکابر کے ساتھ کبھی انصاف نہیں کرسکتا۔

جہاد حریت میں غیر مقلدین کا کردار

اسی کے ساتھ تحریک حریت ۱۸۵۷ء میں اس جماعت کا کیا کردار رہا؟ اس موضوع پر ہلکی سی روشنی بے محل نہ ہوگی، کیونکہ دینی وسیاسی دونوں اعتبار سے اس طائفہ کا موقف سامنے رہے گا تو صحیح نتیجہ تک پہنچنے میں کسی قسم کی دشواری پیش نہیں آئے گی۔

جب انگریزوں کے ظلم پیہم، اہانت آمیز رویے اور مذاہب میں بے جا مداخلت سے تنگ آکر ملک کے تمام باشندوں کے دلوں میں تنگ آمد بجنگ آمد کا فطری جذبہ بھڑک اٹھا، اور بلالحاظ مذہب وملت پورا ملک برطانوی سامراج کو ملک بدر کرنے پر آمادہ ہوگیا تو اس وقت کے حالات کے پیش نظر جامع مسجد دہلی میں حضرات علماء کرام کا ایک اجتماع ہوا اور انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ مرتب کیا گیا، جس پر اکابر دارالعلوم دیوبند کے نمائندہ کی حیثیت سے حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی کے بھی دستخط ہیں (علمائے ہند کا شاندار ماضی ج۴ ص۲۷۳) اس فتوی کے شائع ہوتے ہی مسلمانوں کے جذبات میں ایک طوفان برپا ہوگیا، اور ان کے دینی احساسات شعلۂ جوالہ کی طرح بھڑک اٹھے، لیکن اس کے برخلاف غیر مقلدین کے امام الہدیٰ، آیت اللہ شیخ الکل فی الکل شمس العلماء مولانا سید میاں نذیر حسین سورج گڑھی دہلوی المتوفی ۱۳۲۰ھ نے وقت کے شرعی مطالبہ کے مقابلے میں عافیت کوشی کو ترجیح دی، اور حاکم وقت کی رضا جوئی میں اس متفقہ شرعی فتوی پر دستخط سے انکار کردیا، چنانچہ میاں صاحب کے سوانح نگار مولوی افضل حسین بہاری ’’الحیات بعد الممات‘‘ (سوانح حیات میاں صاحب) میں ’’گورنمنٹ انگلشیہ کے ساتھ وفاداری کا عنوان قائم کرکے اس کے تحت لکھتے ہیں:

> ’’یہ بتادینا بھی ضروری ہے کہ میاں صاحب گورنمنٹ انگلشیہ کے کیسے وفادار تھے زمانہ غدر ۱۸۵۷ء میں جب دہلی کے بعض مقتدر اور بیشتر معمولی مولویوں نے انگریز پر جہاد کا فتویٰ دیا تو میاں صاحب نے اس پر دستخط کئے

> نہ مہر لگائی، خود فرماتے تھے کہ میاں وہ ہلڑ تھا شاہی نہ تھی، وہ بیچارہ بوڑھا بہادر شاہ کیا کرتا... بہادر شاہ کو بہت سمجھایا کہ انگریزوں سے لڑنا مناسب نہیں مگر وہ باغیوں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنے ہوئے تھے کرتے تو کیا کرتے (الحیات بعد الممات ص ۱۲۵)

جس وقت غیور مسلمان اپنے قائدین کے زیر کمان حریت کی جنگ میں تن، من، دھن کی قربانیاں دے رہے تھے ایسے سنگین اور جان لیوا حالات میں شیخ الکل حضرت میاں صاحب سے یہ تو نہ ہوسکا کہ کسی زخمی مجاہد کے زخم پر مرہم رکھتے، کسی شہید کے اہل خانہ سے تعزیت کے دو لفظ کہہ دیتے یا مجاہدین کی جانی و مالی نہ سہی اخلاقی اعانت کرتے، بلکہ اس کے برعکس انگریزوں کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے رات کے سناٹے میں ایک زخمی میم کو اٹھوا کر اپنے گھر لے جاتے ہیں، اس کا علاج و معالجہ کرتے ہیں اور ساڑھے چار ماہ تک اسے اپنے گھر میں رکھ کر اس کی ہر طرح سے خاطر مدارات کرتے ہیں اور بعد از اطمینان اسے انگریزی کیمپ میں پہنچا کر مبلغ ایک ہزار تین سو روپے نقد، وفاداری کا سرٹیفکیٹ اور شمس العلماء کا خطاب حاصل کرتے ہیں۔

مشہور غیر مقلد عالم و صحافی مولانا محمد حسین بٹالوی میاں صاحب کے اس کارنامہ کو بایں الفاظ بیان کرتے ہیں۔

> ”غدر ۱۸۵۷ء میں کسی اہل حدیث نے گورنمنٹ کی مخالفت نہیں کی (اس جملہ کو بطور خاص ذہن میں رکھا جائے) بلکہ پیشوایان اہل حدیث (میاں صاحب) نے عین طوفان بے تمیزی میں ایک زخمی یورپین لیڈی کی جان بچائی اور عرصہ کئی مہینہ تک اس کا علاج معالجہ کر کے تندرست ہونے کے بعد سرکاری کیمپ میں پہنچا دی۔“ (اشاعۃ السنہ ص ۲۶ شمارہ ۹ جلد ۸)

مولوی فضل حسین بہاری میاں صاحب کے سوانح نویس اس واقعہ کی تفصیل یوں لکھتے ہیں۔

> ”ڈاکٹر حافظ مولوی نذیر احمد صاحب (میاں صاحب کے قریبی عزیز)

> فرماتے تھے کہ زمانہ غدر میں مسز لیسنس زخمی میم کو جس وقت میاں صاحب نے نیم جان دیکھا تو روئے اور اپنے مکان میں اٹھالائے، اپنی اہلیہ اور عورتوں کو ان کی خدمت کیلئے نہایت تاکید کی... امن قائم ہونے کے بعد میم کو انگریزی کیمپ میں پہنچایا جس کے نتیجے میں آپ کو اور آپ کے متوسلین کو گورنمنٹ انگریزی کی طرف سے امن وامان کی چٹھی ملی (الحیات بعد الممات ص ۲۷۵)

امام الہدیٰ شیخ الکل فی الکل جناب میاں نذیر حسین صاحب بالقابہ کے سامنے مسلمانوں پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑے جاتے ہیں، مسلم عورتوں کی عصمتیں لوٹی جاتی ہیں، مسلمانوں کی لاشیں درختوں پر لٹکائی جاتی ہیں، کئی کئی دن تک ان کی نظروں کے سامنے نیم جان تڑپتی ہوئی مسلمان عورتیں، زخموں سے چور معصوم بچے، ہاتھ پیر کٹے ہوئے بوڑھے دہلی کی سڑکوں پر اور گلی کوچے میں انتہائی بے کسی کے عالم میں دم توڑتے رہے مگر ان کی آنکھوں سے ایک قطرہ آنسو بھی نہ ٹپکا، اس کے برخلاف انگریز میم کے لئے میاں صاحب تڑپ اٹھتے ہیں اور شدّت غم سے بے تحاشا ان کی آنکھوں سے سیل اشک رواں ہوجاتا ہے کیا مسلمانوں سے نفرت اور انگریزوں سے محبت کی یہ نظیر پیش کی جاسکتی ہے، میاں صاحب کی اسی بے مثال وفاداری کے صلہ میں انگریزی سامراج نے انھیں اپنی رضا کی خصوصی سند عطا کی اور اسی کے ساتھ تیرہ سو روپے نقد اور شمس العلماء کے خطاب سے نوازا۔ ذیل میں غیر مقلدین کے ترجمان اشاعۃ السنہ اور میاں صاحب کی سوانح حیات ''حیات بعد الممات'' کے حوالہ سے سند وفاداری کا ترجمہ پیش کیا جارہا ہے۔

> سرٹیفکیٹ وفاداری وخوشنودی از جناب جی ڈبلو جی وائر فیلڈ صاحب بہادر قائم مقام کمشنر سابق دہلی ''سو مولوی نذیر حسین اور ان کے پسر مولوی شریف حسین صاحب نے مع دیگر مرحوم خاندان کے مسز لیسنس میم کی غدر میں جان بچائی تھی اس وقت میں یہ اس کو اپنے گھر لے گئے تھے جس وقت وہ زخمی پڑی تھیں اپنے مکان میں ساڑھے تین مہینے تک رکھا آخر سرکاری کیمپ میں پہنچایا... ان کو دو سو روپیہ ایک مرتبہ اور چار صد روپیہ ایک مرتبہ

انعام ملا اور سات صد روپیہ بوجہ گرنے مکانات کے ملا، پس یہ خاندان قابل لحاظ ومہربانی کے ہے، دستخط ڈبلو جی وائر فیلڈ قائم مقام کمشنر‘‘ (رسالہ اشاعۃ السنۃ، شمارہ ۱۰، جلد ۸ والحیات بعد الممات ص ۱۳۲-۱۳۳)

جنگ آزادی ۱۸۵۷÷ کے ۲۶ سال بعد جب حضرت میاں صاحب سفر حج کا ارادہ کرتے ہیں تو ایک اور سند منجانب سرکار عنایت ہوتی ہے، جس کا ترجمہ یہ ہے۔

> مولوی نذیر حسین دہلی کے ایک بڑے مقتدر عالم ہیں جنھوں نے مشکل اور نازک وقتوں میں اپنی وفاداری ونمک حلالی گورنمنٹ برطانیہ پر ثابت کی ہے اب وہ اپنے فرض زیارت کعبہ کے ادا کرنے کو جاتے ہیں امید کرتا ہوں کہ جس کسی افسر برٹش گورنمنٹ کی وہ مدد چاہیں گے وہ ان کو مدد دے گا کیوں کہ وہ کامل طور سے اس کے مستحق ہیں۔ دستخط، جی، ڈی تریلمٹ بنگال سروس کمشنر دہلی، ۱۰/ اگست ۱۸۸۳÷‘‘۔ (الحیاۃ بعد المماۃ ص ۱۴۰ مطبوعہ کراچی ورسالہ اشاعت السنہ شمارہ ۱۰ ج ۸)

شمس العلماء مولانا سید میاں نذیر حسین صاحب بالقابہ کی یہ عزت افزائی کہ برٹش انگلشیہ حضر وسفر ہر جگہ ان کی امداد واعانت کے لئے مستعد نظر آتی ہے، اسی کے ساتھ تصویر کا دوسرا رخ بھی ملاحظہ کیجئے کہ 1915÷/۱۳۳۳ھ میں جب دار العلوم دیوبند کے صدر المدرسین حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی سفر حج میں جاتے ہیں تو برطانوی حکومت انھیں گرفتار کر لینے کے لئے بے چین نظر آتی ہے، چنانچہ حضرت شیخ الہند کی روانگی کے بعد یوپی حکومت بذریعہ تار بمبئ حکومت کو مکلّف کرتی ہے کہ انھیں گرفتار کر لیا جائے، لیکن حُسنِ اتفاق سے یہ تار بمبئ اس وقت پہنچا جب حضرت شیخ الہند کا جہاز بمبئ سے روانہ ہو چکا تھا، بعد ازاں گورنر یوپی نے مرکزی حکومت کے توسط سے عدن کے گورنر کو یہ تار بھیجا کہ مولانا محمود حسن کو جہاز سے اتار لیا جائے، مگر یہ تار بھی عدن سے جہاز کی روانگی کے بعد گورنر عدن کو ملا اس لئے یہ کوشش بھی بے سود ہوگئی، پھر جہاز کے کپتان کو تار دیا گیا کہ مولانا محمود حسن کو جہاز پر گرفتار کر لو مگر خدا کی قدرت دیکھئے کہ اس تار کے پہنچنے میں بھی

تاخیر ہوگئی اور حضرت شیخ الہند جزیرہ سعد میں جہاز سے اتر گئے (مقام محمود ص ۲۲۰-۲۲۱)

تحریک ریشمی رومال کے خلاف پولیس استغاثہ میں بھی حضرت شیخ الہند کی گرفتاری کی کوشش کا ذکر ہے، چنانچہ استغاثہ کے پیرا ۱۲۷ کے آخر میں ہے ’’درحقیقت ستمبر ۱۹۱۵÷ میں بھی مولانا کو جب وہ عرب کو جانے کے لئے سمندری سفر کر رہے تھے روکنے کی کوشش کی گئی تھی، لیکن یہ ہدایات اس وقت عدن پہنچیں جبکہ جہاز اس بندرگاہ سے گذر چکا تھا۔‘‘

(تحریک شیخ الہند ص ۲۱۹، از مولانا محمد میاں صاحب مطبوعہ الجمعیۃ پریس دہلی)

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

جناب شیخ الکل فی الکل، امام الہدیٰ شمس العلماء میاں سید نذیر حسین دہلوی کے اس افسوسناک طرزِ عمل کے بعد غیر مقلدین کے امام السنۃ، خاتم المحدثین، مجدد فی الہند جناب نواب صدیق حسن خان قنوجی ثم بھوپالی کے کردار وعمل کے بھی چند نمونے دیکھتے چلئے۔

۱۸۵۷÷ میں جب کہ ملک کے جیالے وطن عزیز کو ظالم انگریزوں کے پنجۂ استبداد سے نجات دلانے کے لئے صفحۂ عالم پر اپنے خون جگر سے ایک لازوال تاریخ مرتب کرنے میں مصروف تھے، اور انگریزی سامراج بطور خاص مسلمانوں کو اپنے ظلم وستم اور جارحیت و بربریت کا نشانہ بنائے ہوئے تھا، ایسے وقت میں کم از کم قومی حمیت کا تقاضا یہی تھا کہ وطن عزیز کی آزادی پر اپنی جانوں کو نچھاور کرنے والے مجاہدین کی مدد واعانت میں نواب صاحب والا تبار اپنے تمام اسباب و ذرائع کو لگا دیتے، لیکن حیف صد حیف کہ امام السنۃ ومجدد فی الہند نے وقتی نفع ونمود کی خاطر مجاہدین حریت کی ہمت افزائی کی بجائے انھیں پسپا کرنے اور کچلنے میں اپنی پوری طاقت صرف کردی اور انگریزی لشکر کے دوش بدوش اپنی فوجوں کو مجاہدین کے مقابلہ میں کھڑا کردیا، چنانچہ نواب صاحب خود انگریزوں کے ساتھ اپنی اس بے مثال وفاداری کی داستان ان لفظوں میں سناتے ہیں۔

> ’’جو خیر خواہی ریاست بھوپال وغیرہ نے اس زمانہ میں کی ہے وہ گورنمنٹ برطانیہ پر ظاہر ہے ساگر و جھانسی تک سرکار انگریزی کو مدد غلہ وفوج وغیرہ سے دی، جس کے عوض میں سرکار نے پرگنہ ’’بیرسیہ‘‘ جمع ایک لاکھ روپیہ

عنایت فرمایا'' (ترجمان وہابیہ ص ۱۱۳)

انگریزی سامراج کی اس فوجی و مالی امداد کے علاوہ نواب صاحب علی الاعلان مجاہدین حریت کو جاہل و نادان اور عام علماء کے برخلاف اس جہاد کو فساد کہتے رہے، چنانچہ ترجمان وہابیہ ص ۷ پر رقمطراز ہیں۔

''پس فکر کرنا ان لوگوں کا جو اپنے حکم مذہبی سے جاہل ہیں اس امر میں کہ حکومت برٹش مٹ جائے اور یہ امن وامان جو آج حاصل ہے فساد کے پردہ میں جہاد کا نام لے کر اٹھا دیا جائے سخت نادانی اور بے وقوفی کی بات ہے۔''

ایک دوسرے موقع پر لکھتے ہیں۔

یہ بغاوت جو ہندوستان میں بزمانۂ غدر ہوئی اس کا نام جہاد رکھنا ان لوگوں کا کام ہے جو اصل دین سے آگاہ نہیں اور ملک میں فساد ڈالنا اور امن وامان اٹھانا چاہتے ہیں۔ (ترجمان وہابیہ ص ۱۰۷)

اس جہاد حریت میں جسے میاں صاحب ہلڑ وہنگامہ اور نواب صاحب فساد سے تعبیر کرتے ہیں اہل ہند اس قدر حق بجانب تھے کہ خود ظالم انگریز اس کا اقرار کئے بغیر نہ رہ سکے چنانچہ مسٹر لیکی اس کے بارے میں اپنا یہ خیال ظاہر کرتا ہے۔

اگر دنیا میں کوئی بغاوت حق بجانب کہی جاسکتی ہے تو وہ ہندوستان کے ہندو مسلمان کی بغاوت تھی۔ (بحوالہ حکومت خوداختیاری ص ۴۲)

جہادِ حریت میں شرکت سے اپنی اور اپنی پوری جماعت کی برأت کا اظہار واعتراف ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

''کسی نے نہ سنا ہوگا کہ آج تک کوئی موحد، متبع سنّت، حدیث وقرآن پر چلنے والا بیوفائی اور اقرار توڑنے کا مرتکب ہوا ہو یا فتنہ انگیزی اور بغاوت پر آمادہ ہوا ہو اور جتنے لوگوں نے غدر میں شر وفساد کیا اور حکام انگلشیہ سے برسر عناد ہوئے وہ سب کے سب مقلدان مذہب حنفی تھے نہ متبعان سنت نبوی (یعنی غیر مقلد) (ترجمان وہابیہ ص ۲۵)

گویا نواب صدیق حسن خاں صاحب کے نزدیک شہدائے بالاکوٹ حضرت سید احمد شہید، حضرت مولانا شاہ اسمٰعیل شہید، حضرت مولانا عبدالحئی بڈھانوی اور بہت سے علمائے صادقپور جنھوں نے انگریزوں کے خلاف تلوار اٹھائی اور داد شجاعت دے کر رفیق اعلیٰ سے جاملے، ان میں کوئی بھی موحد، متبع سنت، حدیث وقرآن پر چلنے والا نہیں تھا۔

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ حسنِ کرشمہ ساز کرے

نواب صاحب کی مسطورہ بالاتحریر سے یہ حقیقت بھی آشکارا ہوگئی کہ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں کسی اہل حدیث وغیر مقلد نے قطعاً کوئی حصہ نہیں لیا، الحمدللہ ثم الحمدللہ، یہ احناف ہی تھے جنھوں نے اپنی عظیم سابقہ روایات اور قابلِ فخر کردار کے مطابق انگریز جیسے ظالم وجابر اور مکار وعیار حکمراں کے پنجۂ استبداد سے ملک وقوم کو نجات دلانے کیلئے بے خطر جنگ کی آگ میں کود پڑے اور تاریخ کے اوراق پر جرأت و بہادری کی ایسی حیرت انگیز اور محیر العقول تابناک داستانیں رقم کیں جو تا قیامت جگمگاتی رہیں گی۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است برجریدہ عالم دوام ما

برطانوی آقا کی حمایتیں منسوخیٔ جہاد کی ناکام کوشش

مولانا محمد حسین بٹالوی مدیر رسالہ اشاعت السنہ جو جماعت اہل حدیث میں نامی گرامی، نہایت نمایاں اور عظیم شخصیت کے مالک ہیں، انھوں نے اپنے رسالہ اشاعت السنہ کے ذریعہ غیر مقلدین اور انگریزوں کی خوب خوب خدمت انجام دی، اور نہ صرف یہ کہ انگریز نوازی میں اپنے دونوں پیشواؤں نواب صاحب اور میاں صاحب سے آگے بڑھ گئے بلکہ انگریزوں کی رضاجوئی میں انھوں نے مرزا غلام احمد قادیانی کو بھی پیچھے چھوڑ دیا، جبکہ مرزا قادیانی انگریزوں ہی کا خود کاشت پودہ تھا اس اجمال کی تفصیل مشہور محقق و مؤرخ جناب پروفیسر محمد ایوب قادری کے الفاظ میں ملاحظہ کیجئے، موصوف اپنی محققانہ

تاریخی کتاب ’’جنگ آزادی ۱۸۵۷÷‘‘ کے ص ۶۴ پر لکھتے ہیں۔

> مولوی محمد حسین بٹالوی نے سرکار برطانیہ کی وفاداری میں جہاد کی منسوخی پر ایک مستقل رسالہ ’’الاقتصاد فی مسائل الجہاد‘‘ لکھا، انگریزی اور عربی زبانوں میں اس کے ترجمے ہوئے یہ رسالہ سر چارلس اچی سن اور سر جیمس لائل گورنران پنجاب کے نام معنون کیا گیا مولوی محمد حسین نے اپنی جماعت کے علماء سے رائے لینے کے بعد ۱۲۹۶ھ میں رسالہ اشاعت السنہ کی جلد دوم شمارہ گیارہ میں بطور ضمیمہ شائع کیا، پھر مزید مشورہ و تحقیق کے بعد ۱۳۰۶ھ میں باضابطہ کتابی صورت میں شائع ہوا۔

جہاد اسلام کا ایک اہم ترین فریضہ ہے اور محمد رسول اللہ...... کے حسب ارشاد الجهاد ماض الى يوم القيامة دیگر فرائض اسلام کی طرح تا قیام قیامت جاری وساری رہے گا، لیکن انگریزوں کی رضاجوئی میں اپنے آپ کو اہل حدیث اور دنیا بھر کے مقلدین کو مخالف حدیث کہنے والوں نے متفقہ طور پر اس فریضۂ الٰہی کو بیک جنبش قلم منسوخ قرار دیدیا۔

بسوخست عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی ست

خود بٹالوی صاحب لکھتے ہیں۔

> ’’اگرچہ اس مضمون منسوخیٔ جہاد کے رسائل گورنمنٹ اور ملک کے اور خیرخواہوں (غلام احمد قادیانی) وغیرہ نے بھی لکھے ہیں لیکن جو ایک خصوصیت اس رسالہ میں ہے وہ آج تک کسی تالیف میں نہیں پائی جاتی، وہ یہ ہے کہ یہ رسالہ صرف مؤلف کا خیال نہیں اس گروہ کے عوام وخواص نے اس کو پسند کیا اور اس سے آراء کا توافق ظاہر کیا۔ (اشاعت السنہ ص ۲۶۱ شمارہ ۹ ج ۸)

بٹالوی صاحب کی اس اہم ترین خدمت اور اپنے طرز کی انوکھی وفاداری کو سرکار برطانیہ کے حضور بڑی پذیرائی حاصل ہوئی اور اس کے صلے میں انھیں خاطر خواہ جاگیر اور انعام سے نوازا گیا۔ (دیکھئے ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک ص ۲۹ از مولانا مسعود عالم ندوی)

جماعت اہل حدیث کی انگریز نوازی اور ملک وملت کے ساتھ بے وفائی کی طویل

داستان سے یہ چند نمونے پیش کئے گئے ہیں جو بزبان حال کہہ رہے ہیں۔

قیاس کن زگلستانِ من بہار مرا

اکابر دیو بند کی جہاد حریت میں جرأت و بہادری

تاریخ کا یہ رخ بھی کتنا عجیب اور عبرت خیز ہے کہ ایک طرف تو جماعت اہلحدیث اور اس کے علمائے کبار ہیں جو انگریزی حکومت کی ہمدردی اور خیر خواہی میں مجاہدین حریت کو ظالم، غاصب، فتنہ پرور شریر، عہد شکن، جاہل، ایمان سے دور وغیرہ، تہذیب وشرافت سے گرے ہوئے الفاظ سے نواز رہے ہیں اور اپنے برطانوی آقاؤں کی خوشنودی میں فریضۂ الٰہی جہاد کو منسوخ کرنے کی ناروا کوشش میں صفحۂ قرطاس کو سیاہ کرنے میں مصروف ہیں اور اپنی ان خدمات جلیلہ کے صلے میں ان سے خوشنودی کے سرٹیفکیٹ، جاگیریں اور نقدی انعامات وصول کر رہے ہیں۔

دوسری جانب اکابر دارالعلوم دیوبند ہیں جو ظالم و جابر انگریزوں کے مقابلہ میں شاملی(۱) ضلع مظفرنگر کے میدان میں جرأت و بہادری کے جوہر دکھا رہے تھے جس کی پاداش میں سب کے سب باغی و مجرم قرار پائے اور سب کے نام وارنٹ گرفتاری جاری ہوگیا، جس کی وجہ سے کسی کو مدتوں دربدر کے چکر لگانے پڑے (۲) کوئی قید و بند (۳) کی صعوبتوں سے دوچار ہوا، کسی کے لئے ملک کی زمین تنگ (۴) ہوگئی اور اسے ہمیشہ کیلئے محبوب وطن کو خیر باد کہہ دینا پڑا، لیکن ان ساری مصیبتوں کے باوجود ان کے پائے استقامت میں معمولی سی بھی لغزش نہیں آئی، بلکہ صبر و استقلال اور پوری پامردی کے ساتھ اپنے موقف پر قائم رہے البتہ حالات واقعات کے مطابق طریقۂ کار کو بدل دیا، اور جہاد

---

(۱) جہاد شاملی کیلئے دیکھئے علمائے ہند کا شاندار ماضی ج۴، نقش حیات ج۲۔

(۲) مولانا محمد قاسم نانوتویؒ۔

(۳) حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ۔

(۴) حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی، مولانا رحمۃ اللہ کیرانوی عالی اللہ مراتبہم۔

بالسیف کے بجائے جہاد بالقلم کی تحریک کا آغاز کیا، جس کا اولین مظہر دارالعلوم دیوبند ہے، چنانچہ جنگ شاملی کے سپہ سالار حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ کے تلمیذ رشید و سچے جانشیں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صدرالمدرسین دارالعلوم دیوبند نے ایک موقع پر دارالعلوم دیوبند کے مقصد قیام کو بیان کرتے ہوئے فرمایا تھا۔

> حضرت الاستاذ نے اس مدرسہ کو کیا درس وتدریس، تعلیم وتعلّم کیلئے قائم کیا تھا؟ مدرسہ (دارالعلوم دیوبند) میرے سامنے قائم ہوا، جہاں تک میں جانتا ہوں ۱۸۵۷÷ کے ہنگامے کی ناکامی کے بعد یہ ارادہ کیا گیا کہ کوئی ایسا مرکز قائم کیا جائے جس کے زیر اثر لوگوں کو تیار کیا جائے تاکہ ۱۸۵۷÷ کی تلافی کی جائے۔ (ماہنامہ دارالعلوم ص۴۲ ج۴ شمارہ ۶، اشاعت جولائی ۱۳۷۲ھ)

ہندوستان کے مشہور مورخ ڈاکٹر تاراچند کے درج ذیل بیان سے حضرت شیخ الہند کے مذکورہ بالا قول کی تائید ہوتی ہے۔

> ”دیوبند کے مدرسہ کا ان علماء کے ذریعہ قائم ہونا جنھوں نے ۱۸۵۷÷ کی بغاوت میں حصہ لیا تھا اس سے پہلے باب میں بیان ہو چکا ہے اس مدرسہ کے دو اغراض تھے (۱) مسلمانوں میں قرآن وحدیث کی اصلی تعلیمات کی تبلیغ واشاعت کرنا (۲) ہندوستان کے بیرونی حکمرانوں کے خلاف جذبۂ جہاد کو زندہ رکھنا۔ (تاریخ تحریر آزادی ہند ج۳ ص ۳۵۸۔ ترجمہ اردو قاضی عدیل عباسی مطبوعہ ترقی اردو بیورونئ دہلی)

اسی کتاب میں ایک دوسرے جگہ لکھتے ہیں:

(حضرت شاہ) ولی اللہ (محدث دہلوی) کے مستقل کارناموں میں ایک کارنامہ مدارس کا قیام تھا جس میں دیوبند کا مدرسہ جو مسلسل قومی جدوجہد کا حامی رہا سب سے زیادہ قابل لحاظ ہے۔ (ص۵۵۰)

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

دیوبند کا مکتبہ برطانوی اور ملوکیت پرستی کا مخالف رہا تھا۔ (ص۵۵۰)

تحریک ریشمی رومال

چنانچہ دارالعلوم دیوبند کے مقصد قیام کو بروئے کار لانے کیلئے دارالعلوم کے اولین فرزند حضرت شیخ الہند اپنے اکابر حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ وغیرہ کی پیروی کرتے ہوئے مدرسہ وخانقاہ کے گوشۂ عافیت سے نکل کر انقلاب کے پرشور و پرخطر میدان میں کود پڑے۔ مشہور محقق مولانا غلام رسول مہر لکھتے ہیں۔

> ''میرے مطالعہ اور غور وفکر کا نچوڑ یہ ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ اپنی عملی زندگی کے آغاز ہی میں ایک نقشہ تیار کر چکے تھے اور اسے لباس عمل پہنانے کی کوششیں انھوں نے اس وقت سے شروع کر دی تھیں جب ہندوستان کے اندر سیاسی سرگرمیاں برائے نام تھیں، ملک کے حالات کسی تیز تحریک کیلئے ہرگز سازگار نہ تھے... پھر حضرت شیخ الہند کے سامنے ایک بڑی مصلحت یہ بھی تھی کہ دارالعلوم دیوبند کو حکومت کے عتاب کا ہدف بننے سے حتی الامکان محفوظ رکھیں (سرگذشت مجاہدین، ص۵۵۲)

حضرت شیخ الہندؒ نے اپنی انقلابی سرگرمیوں یا بالفاظ دیگر تحریک حریت کا نقشہ اس طرح مرتب کیا تھا کہ اندرون ملک جذبہ آزادی کو بیدار کر کے مخلص فداکاروں کی ایسی جماعت تیار کی جائے جو تحریک کی راہ میں ہر مصیبت کو خندہ پیشانی کے ساتھ جھیل جائے، پھر قابل اعتماد مؤثر افراد کی زیر نگرانی ملک کے اہم مقامات پر ایسے مراکز قائم کئے جائیں جہاں اسلحوں کی فراہمی کے ساتھ رجال کار کی تربیت کا کام بھی انجام پائے بعد ازاں آزاد قبائل کے مرکز سے مسلح جدوجہد کا آغاز کیا جائے۔ اور اسی کے ساتھ بیرون ملک ترکی، افغانستان وغیرہ کی حکومتوں کو آمادہ کیا جائے کہ وہ ہندوستان کی آزادی کے لئے اس مسلح تحریک کی مالی وفوجی مدد کریں، ان حکومتوں کی مدد حاصل ہوتے ہی اندرون ملک مراکز اپنی اپنی جگہ متحرک ہو جائیں اس طرح بیک وقت بیرونی مداخلت اور اندرونی بغاوت پر

قابو پانا برطانوی حکومت کے لئے مشکل ہو جائے گا جس کے نتیجہ میں وہ ملک بدر ہونے پر مجبور ہو جائے گی، یہ تحریک اپنے منصوبے کے اکثر مراحل طے کر کے کامیابی کی منزل کے قریب پہنچ گئی تھی کہ حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ تحریک کے سارے تانے بانے بکھر گئے اور حضرت شیخ الہند اپنے رفقاء حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی، مولانا عزیز گل، مولانا وحید احمد مدنی کے ساتھ گرفتار کر کے مالٹا میں نظر بند کر دیئے گئے، حضرت شیخ الہندؒ کی یہی وہ تحریک ہے جو بعد میں تحریک ریشمی رومال کے نام سے مشہور ہوئی۔ (۱)

حضرت شیخ الہند کی وفات کے بعد ان کے جانشین، مجاہدِ جلیل، بطل حریت محدث کبیر، عارف باللہ، شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی صدر المدرسین دار العلوم دیوبند نے اپنے پیش رو بزرگوں اور اپنی مادر علمی دار العلوم دیوبند کے موقف کے مطابق تحریک انقلاب کی قیادت سنبھالی اور ۱۹۲۱ء میں کراچی کے مقدمہ میں دار و رسن کو اس طرح دعوت دی۔

> ”اگر لارڈ ریڈنگ اس لئے بھیجے گئے ہیں کہ قرآن کو جلا دیں، حدیث شریف کو مٹا دیں اور کتب فقہ کو برباد کر دیں تو سب سے پہلے اسلام پر جان قربان کرنے والا میں ہوں۔“
>
> مولانا محمد علی جوہر بے اختیار ان کے قدموں پر گر پڑے۔

(کراچی کا تاریخی مقدمہ ج ۱ ص ۱٦۵)

اور بقول پروفیسر خلیق نظامی حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی کے ذوق سرفروشی نے ہندوستان کے مسلمانوں کو قربانی اور عزیمت کا وہ سبق پڑھایا جس سے ملک کی آزادی کی تحریک ایک اور ہی منزل پر پہنچ گئی اور ایسا محسوس ہونے لگا کہ ع

شورش عندلیب نے روح چمن میں پھونک دی

(شیخ الاسلام حیات اور کارنامے)

اپنی اسی سرفروشانہ سرگرمیوں کی پاداش میں قید فرنگ کے صبر آزما اذیتوں سے دوچار

---

(۱) تفصیل کے لئے نقش حیات ج ۲، تحریک شیخ الہند مرتبہ مولانا محمد میاں صاحب کی طرف رجوع کیا جائے۔

ہوئے، اور دو ایک سال کے لئے نہیں بلکہ مجموعی طور پر پونے آٹھ برس تک انھیں اس آزمائش سے گذرنا پڑا۔ مگر عزم وہمت کی چٹان بن کر اپنے مسلک وموقف پر قائم رہے، اور سامراجی طاقتوں سے صاف صاف کہہ دیا کہ مادّی قوت لپٹ مارنے والے شعلے کو دبا سکتی ہے، مگر دلوں میں سلگنے والی آگ کو نہیں بجھا سکتی، اور مردانہ وار برطانوی سامراج کے ہر ظلم وستم کو جھیلتے ہوئے منزل کی جانب آگے بڑھتے رہے، تا آنکہ ملک عزیز فرنگی تسلط سے آزاد ہو گیا۔

اولئك آبائی فجئنی بمثلهم
اذا جمعتك يا جرير المجامع

یہ ہے تحریک حریت اور جہاد انقلاب میں دارالعلوم دیوبند اور اس کے اکابر کا قابل فخر کردار، جنھیں انگریزوں کا وفادار بتا کر ''ترجمان دہلی'' اپنی جماعت اہل حدیث کے داغوں کو چھپانے کی کوشش کر رہا ہے۔

ترجمان دہلی کے دلائل پر بحث ونظر

اس مختصر وضروری تمہید کے بعد آیئے اب ''ترجمان دہلی'' کے مقالہ نگار جناب خالد حسین صدیق کے پیش کردہ ان دلائل پر بھی ایک نظر ڈالیں جن کے سہارے وہ اپنے اس مفروضہ تک پہنچنے کی ناکام سعی میں سرگرداں ہیں کہ ''علماء دیوبند حکومت کے وظیفہ خوار تھے اور دارالعلوم دیوبند کو حکومت کی جانب سے امداد ملتی تھی'' (ترجمان)

اپنے اس خودساختہ مفروضہ کے ثبوت میں پہلی دلیل وہ یہ پیش کرتے ہیں۔

(۱) ۳۱ر جنوری ۱۸۷۴ء بروز یکشنبہ لیفٹنٹ گورنر کے ایک خفیہ معتمد انگریز جس کا نام پامر تھا، اس نے دارالعلوم دیوبند کا معاینہ کیا اور متاثر ہو کر یہ ریمارکس دیا کہ ''جو کام بڑے بڑے کالجوں میں ہزاروں روپیہ کے صرفہ سے ہوتا ہے وہ یہاں کوڑیوں میں ہوتا ہے، جو کام پرنسپل ہزاروں روپیہ ماہانہ تنخواہ لے کر کرتا ہے وہ یہاں ایک مولوی چالیس روپیہ ماہانہ پر کر رہا

ہے، یہ مدرسہ خلاف سرکار نہیں بلکہ سرکار کے موافق اور اس کا معاون ومددگار رہے۔ (احسن نانوتوی ص ۲۱۷)

مندرجہ حوالہ کے بعد لکھتے ہیں، ناظرین کرام! آپ خط کشیدہ جملے کو پڑھیں اور بار بار پڑھیں، مذکورہ خط کشیدہ جملے سے میں نے کون سا غلط مفہوم اخذ کرلیا ہے۔‘‘

(جریدہ ترجمان ص ۵-۱۱/۹/۹۱)

موصوف نے یہاں جس عبارت کو پیش کیا ہے ہم اس پر کسی تبصرہ کے بغیر تاریخ دارالعلوم سے پوری عبارت نقل کررہے ہیں، اور فیصلہ ناظرین پر چھوڑ رہے ہیں کہ موصوف نے اس عبارت کو من چاہے معنی پہنانے کی تکنیک اختیار کی ہے یا نہیں؟ یہ ایک طویل رپورٹ ہے جو تاریخ دارالعلوم کے تقریباً چھ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔

مرتب تاریخ دارالعلوم جناب محبوب رضوی ’’ایک انگریز جاسوس کے دلچسپ مشاہدات‘‘ کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں۔

’’دارالعلوم دیوبند جس زمانے میں قائم ہوا اس وقت ۱۸۵۷÷ کی جنگ آزادی پر صرف ۹؍سال گذرے تھے، چونکہ عام مسلمان اور دارالعلوم دیوبند کے اکابر جنگ آزادی میں انگریزوں کے خلاف صف آرا ہوچکے تھے، اس لئے انگریزی حکومت مسلمانوں کے سخت خلاف اور ان سے بدظن وبرگشتہ تھی، مسلمانوں کی حرکات وسکنات پر کڑی نگرانی رکھی جاتی تھی، اس بنا پر دارالعلوم کی نسبت مدت تک خفیہ وعلانیہ تحقیقات کا سلسلہ جاری رہا چنانچہ ۱۲۹۱ھ/ ۱۸۷۵÷ میں صوبہ متحدہ (اترپردیش) کے گورنر سرجان اسٹریچی نے اپنے ایک معتمد ’’جان پامر‘‘ کو اس غرض سے دارالعلوم میں بھیجا کہ وہ خفیہ طور پر تحقیقات کرکے رپورٹ پیش کرے کہ دارالعلوم کے قیام کا مقصد کیا ہے؟ اور مسلمان علماء دارالعلوم کے پس پردہ کس فکروعمل میں مصروف ہیں ’’جان پامر‘‘ نے دارالعلوم کو دیکھ کر جو رپورٹ تیار کی جو تأثرات اس نے اخذ کئے وہ اس نے اپنے ایک دوسرے کو خط لکھتے ہوئے نہایت تفصیل سے بیان کئے ہیں ’’جان پامر‘‘ نے دارالعلوم کی تعلیمی کیفیت کا انگریزی یونیورسٹیوں سے موازنہ کرتے ہوئے اپنے مشاہدات وتأثرات کا جس دلچسپ اور

عالمانہ انداز میں اظہار کیا ہے وہ دارالعلوم کے علمی موقف کو سمجھنے میں بڑی مدد دیتا ہے.... جان پامر لکھتا ہے گورنر ممالک مغربی وشمالی کے ساتھ دورے میں ۳۰/جنوری ۱۸۷۵ء کو دیوبند قیام ہوا۔ گورنر نے مجھ سے کہا کہ ”یہاں دیوبند میں“ مسلمانوں نے گورنمنٹ کے خلاف ایک مدرسہ جاری کیا ہے، تم اجنبیانہ طور پر اس مدرسہ میں جا کر پتہ لگاؤ کہ کیا تعلیم ہوتی ہے؟ اور مسلمان کس فکر وخیال میں لگے ہوئے ہیں؟ چنانچہ ۳۱/جنوری کو اتوار کے دن میں آبادی میں پہنچا... پوچھتے پوچھتے مدرسہ میں پہنچا، یہاں پہنچ کر میں نے ایک بڑا کمرہ دیکھا جس میں چٹائی کے فرش پر لڑکے کتابیں سامنے رکھے ہوئے بیٹھے ہیں اور ایک بڑا لڑکا ان کے درمیان بیٹھا ہوا تھا، میں نے لڑکوں سے دریافت کیا تمہارا استاذ کون ہے؟ ایک لڑکے نے اشارہ سے بتایا، معلوم ہوا کہ جو شخص درمیان میں بیٹھا ہوا تھا وہی استاذ ہے، مجھے تعجب ہوا کہ یہ کیا استاذ ہوگا؟ یہاں سے آگے بڑھا تو ایک جگہ ایک صاحب میانہ قد نہایت خوبصورت بیٹھے ہوئے تھے، سامنے بڑی عمر کے طلبہ کی ایک قطار تھی قریب پہنچ کر سنا تو علم مثلّث کی بحث ہو رہی تھی، میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ علم مثلّث کے ایسے ایسے عجیب اور مشکل قاعدے بیان ہو رہے تھے جو میں نے کبھی ”ڈاکٹر اسپرنگر“ سے بھی نہیں سنے تھے، یہاں سے اٹھ کر دوسرے دالان میں گیا تو دیکھا ایک مولوی صاحب کے سامنے طالب علم معمولی کپڑے پہنے بیٹھے ہیں یہاں اقلیدس کے چھٹے مقالے کی دوسری شکل کے اختلافات بیان ہو رہے تھے اور مولوی صاحب اس برجستگی سے بیان کر رہے تھے کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اقلیدس کی روح ان میں آگئی ہے، میں منھ تکتا رہ گیا، اسی دوران میں مولوی صاحب نے جبر ومقابلہ ٹاڈ ہنٹر سے مساوات درجہ اول کا ایک ایسا مشکل سوال طلبہ سے پوچھا کہ مجھے بھی اپنی حساب دانی پر پسینہ آگیا، اور میں حیران رہ گیا کہ بعض طلبہ نے جواب صحیح نکالا، یہاں سے اٹھ کر میں تیسرے دالان میں پہنچا، ایک مولوی صاحب حدیث کی موٹی سی کتاب پڑھا رہے تھے... یہاں سے میں ایک زینے پر چڑھ کر دوسری منزل پر پہنچا اس کے تین طرف مکلّف مکان تھے بیچ میں ایک چھوٹی سی صحنچی تھی جس میں دو اندھے بیٹھے بڑبڑا رہے تھے، میں یہ سننے کیلئے کہ یہ کیا کہہ

رہے ہیں دبے پاؤں ان کے پاس گیا تو معلوم ہوا کہ علم ہیئت کی کسی کتاب کا سبق یاد کررہے ہیں، اتنے میں ایک اندھے نے دوسرے سے کہا بھائی کل کے سبق میں شکل عروسی اچھی طرح میری سمجھ میں نہیں آئی اگر تم سمجھے ہو تو بتلاؤ، دوسرے اندھے نے پہلے دعویٰ بیان کیا اور اس کی ہتھیلی پر لکیریں کھینچ کر ثبوت شروع کیا، پھر جو آپس میں ان کی بحث ہوئی تو میں دنگ رہ گیا اور مسٹر بریگر پرنسپل کی تقریر کا سماں میری نظروں میں پھر گیا... (الی ان قال) میری تحقیقات کے نتائج یہ ہیں کہ یہاں کے لوگ تعلیم یافتہ نیک چلن اور نہایت سلیم الطبع ہیں، کوئی ضروری فن ایسا نہیں جو یہاں نہ پڑھایا جاتا ہو، جو کام بڑے بڑے کالجوں میں ہزاروں کے صرفہ سے ہوتا ہے وہ یہاں ایک مولوی چالیس روپے میں کررہا ہے، مسلمانوں کے لئے اس سے بہتر کوئی تعلیم گاہ نہیں ہوسکتی اور میں تو یہاں تک کہہ سکتا ہوں کہ اگر کوئی غیر مسلم بھی یہاں تعلیم پائے تو نفع سے خالی نہیں، انگلستان میں اندھوں کا اسکول سنا تھا مگر یہاں آنکھوں سے دیکھا کہ دو اندھے تحریر اقلیدس کی شکلیں کف دست پر اس طرح ثابت کرتے ہیں کہ باید وشاید مجھے افسوس ہے کہ آج سر ولیم میور موجود نہیں ہیں ورنہ بکمال ذوق وشوق اس مدرسہ کو دیکھتے اور طلبہ کو انعام دیتے۔'' (تاریخ دار العلوم ج ۱ ص از ۱۷۵ تا ۱۸۱ بحوالہ روداد ۱۳۰۴ھ بعنوان بشارت)

ناظرین کرام! آپ پوری عبارت کو پڑھیں اور بار بار پڑھیں اور فیصلہ فرمائیں کہ اس عبارت کے کس جملہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ''علماء دیوبند حکومت کے وظیفہ خوار تھے اور دار العلوم دیوبند کو حکومت کی جانب سے امداد ملتی تھی۔

موصوف نے اس رپورٹ کو مطابق مقصد بنانے کے لئے اس کے اول وآخر کو حذف کردیا اور اپنی جانب سے خط کشیدہ جملے کا اضافہ کرکے ناظرین کو بار بار پڑھنے کی دعوت دے رہے ہیں، پھر موصوف نے اسے ۳۱/جنوری ۱۸۷۴÷ کا واقعہ بتایا ہے جب کہ برطانوی جاسوس خود بیان کررہا ہے کہ اس کی یہ تحقیقات ۱۸۷۵÷ کی ہیں، علاوہ ازیں انھوں نے اپنی پیش کردہ عبارت کا ماخذ احسن نانوتوی ص ۱۳۷ درج کیا ہے، اگر یہ محولہ کتاب مولانا احسن نانوتوی کی سوانح مؤلفہ محمد ایوب قادری ایم اے ہے تو یہ حوالہ غلط اور

فرضی ہے، کیونکہ احسن نانوتوی کے کل صفحات ۲۸۸ ہیں پھر ۳۱۷ صفحے پر اس عبارت کے ہونے کا کوئی مطلب نہیں البتہ صفحہ ۲۱۷ پر یہ عبارت ہے جس میں سے موصوف نے اپنے مفروضہ کے خلاف عبارت حذف کردی ہے، مرحوم ایوب قادری صاحب نے پامر کی رپورٹ کے اس حصہ کو دارالعلوم دیوبند کی یوماً فیوماً ترقی کے ثبوت میں نقل کیا ہے، انھوں نے رپورٹ کے اس حصہ کو کہاں سے نقل کیا ہے اس کا کوئی حوالہ نہیں ہے اس لئے اس رپورٹ کا صحیح مآخذ دارالعلوم دیوبند کی روداد ۱۳۰۴ھ ہی ہے جس کے حوالہ سے تاریخ دارالعلوم میں اسے نقل کیا گیا ہے۔

اپنے مدعا و مقصود کی وضاحت کے لئے خالد حسین صدیقی صاحب نے دوسری دلیل یہ پیش کی ہے۔

> (۲) ''دہلی کالج کے دو حصے بن گئے ایک حصہ مولانا محمد قاسم صاحب دیوبند لے گئے جسے عربی حصہ کہتے ہیں اور دوسرا حصہ سرسید خاں صاحب علی گڈھ لے گئے، اسکے مؤسسین میں سے پہلا نام نامی مولانا محمود الحسن صاحب کے والد بزرگوار کا ہے جن کا نام مولانا ذوالفقار علی ولد فتح علی تھا یہ دہلی کالج میں پڑھتے تھے، بریلی کالج میں پروفیسر رہے پھر پنشن کے بعد دیوبند تشریف لے آئے اور حکومت سے وفاداری کے اعزاز میں آنریری مجسٹریٹ بنادیئے گئے، انھیں مولانا ذوالفقار علی صاحب نے دارالعلوم دیوبند کی بنیاد ۱۵ر محرم الحرام مطابق ۳۰ر مئی ۱۸۶۷ء میں رکھی۔
>
> (احسن نانوتوی ص ۷۴ ملخصاً)

کتاب ''احسن نانوتوی'' ص ۷۴ کے اس حوالہ کے بعد اپنا اخذ کردہ نتیجہ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں ''مدرسہ دارالعلوم دیوبند کے موسس اوّل انگریزوں کے پکے وفادار تھے، ایسے انگریز وفادار سے بھلا کون امید رکھے گا کہ وہ مدرسہ کی بنیاد مرکز تحریک آزادی کے طور پر رکھے گا۔''

موصوف نے اس موقع پر دجل وفریب کی حد ہی کردی کہ اپنی جانب سے ایک

عبارت گڑھ لی اور اسے احسن نانوتوی مؤلفہ، محمد ایوب قادری کی جانب منسوب ومحول کردیا، ھٰذا بُهتَانٌ عَظِیم، شاید حافظ شیرازی نے یہ مصرعہ انھیں کے لئے کہا تھا ع

چہ دلاوراست دزدے کہ بکف چراغ دارد

صفحہ ۴۷ ہی نہیں بلکہ پوری کتاب میں کہیں بھی یہ عبارت موجود نہیں ہے پھر اس عبارت کے اختراع میں انھوں نے تاریخی اعتبار سے دو فاش غلطیاں کی ہیں (الف) ان کا خیال ہے کہ سرسید احمد خاں صاحب نے دہلی کالج میں تعلیم حاصل کی ہے اپنے اسی وہم کو بنیاد بنا کر پروفیسر ایوب قادری مرحوم کی جانب منسوب کر کے یہ جملہ گھڑ لیا ''دوسرے حصہ کو سرسید خاں صاحب علی گڈھ لے گئے'' جب کہ سرسید خاں صاحب نے دہلی کالج میں ایک دن بھی تعلیم حاصل نہیں کی، خود ایوب قادری صاحب لکھتے ہیں۔ ''سرسید احمد خاں تو دہلی کالج کے طالب علم بھی نہیں رہے'' (احسن نانوتوی ۱۸۵، مطبوعہ چادو پریس کراچی ۱۹٦٦÷) (ب) اپنی اس من گھڑت عبارت کو بزعم خود مفید مقصد بنانے کے لئے لکھتے ہیں کہ ''انھیں مولانا ذوالفقار علی صاحب نے دارالعلوم دیوبند کی بنیاد ۱۵ر محرم الحرام ۱۲۸۳ھ مطابق ۳۰ر مئی ۱۸٦۷÷ میں رکھی'' (جریدہ ترجمان دہلی ۱۱/۹/۱۹۹۱÷) یہ بھی کھلی بے خبری یا اپنے ناظرین کو اندھیرے میں رکھنے کے لئے فریب افزا تجاہل ہے، کیونکہ خود مولانا ذوالفقار علی صاحب مرحوم لکھتے ہیں۔

لما اراد اللّٰہ تعالیٰ شانہ عز سلطانہ خیر ھذہٖ البلاد وارشاد العباد باحیاء العلوم الدینیة والفنون الیقینیة... الھم السید النسیب الجلیل ... محمد عابد ادامه اللّٰه وابقاہ ... بتاسیس ھذہ المدرسة التی اسست علی التقوی... فندب السید اھل الخیر الی اعانة ھذہ المثوبة وتائید ھذہ المشورة سنة اثنتین وثمانین بعد الالف والمائتین من ھجرة سید الثقلین صلی اللّٰه علیه وسلم ... فاستمعوا له وانتدبوہ واجابوہ واتبعوہ فصار المدرسة بسعیه المشکور ملجاءً للعلم وزویه. (الھدیة السنیة فی ذکر المدرسة الاسلامیة الدیوبندیة ص۲ مطبوعہ بار اول ۱۳۰۷ھ)

مولانا ذوالفقار علی رحمۃ اللہ علیہ کی اس تحریر سے صاف طور پر ثابت ہے کہ دارالعلوم

دیوبند کے موسس اوّل حضرت حاجی عابد حسین دیوبندی قدس سرہٗ ہیں نہ کہ مولانا ذوالفقار علی صاحب، البتہ مولانا مرحوم ابتداء ہی سے مدرسہ کی تعمیر و ترقی میں کوشاں اور اس کی مجلس شوریٰ کے رکن رکین رہے تفصیل کیلئے تاریخ دارالعلوم دیوبند، تاریخ دیوبند، سوانح قاسمی، علمائے حق وغیرہ دیکھی جائیں، علاوہ ازیں جناب محمد ایوب قادری صاحب نے اپنی اس کتاب میں صفحات ۱۴، ۲۴، ۲۵، ۲۶، ۲۷، ۳۸، ۴۵، ۴۶، ۸۰، ۹۹، ۱۰۱، ۱۰۷، ۱۲۰، ۱۷۷، ۱۸۳، ۲۱۵، ۲۳۹ سترہ مقامات پر مولانا ذوالفقار علیؒ کا تذکرہ کیا ہے، لیکن کہیں بھی یہ نہیں لکھا ہے کہ وہ حکومت سے وفاداری کے اعزاز میں آنریری مجسٹریٹ بنادیئے گئے ”ایوب قادری مرحوم پر اتنا بڑا اتہام اور وہ بھی بادعائے نسبت اہل حدیث بڑی جسارت کی بات ہے، ظاہر ہے جس دعویٰ کی عمارت ایسی بنیاد پر کھڑی کی گئی ہو جو خود علی شفا جرف ہار کی مصداق ہو اس عمارت کا حال معلوم ہے۔

(۳) اس خود تراشیدہ مفروضہ اور اس سے اخذ کردہ من مانے نتیجہ کے بعد اہل حدیث صاحب رقم طراز ہیں ”یہ حال تو بانیٔ دیوبند کا تھا اراکین مدرسہ کے حالات زندگی بھی ملاحظہ فرمائیں۔

> ”مدرسہ دیوبند کے اراکین میں اکثریت ایسے بزرگوں کی تھی جو گورنمنٹ کے قدیم ملازم اور پنشن یافتہ تھے جن کے بارے میں گورنمنٹ کو شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں تھی“۔ سوانح قاسمی ج ۲ ص ۲۴۷ (جریدہ ترجمان ۱۱/۹/۹۱ ÷)

یہ محولہ عبارت سوانح قاسمی میں تحریر حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ سابق مہتمم دارالعلوم کے طویل حاشیہ سے ماخوذ ہے جس کے سیاق وسباق کو حذف کرکے اپنے مدعا و مقصود کو ثابت کرنے کی نا مشکور سعی کی گئی ہے، سوانح قاسمی کے مرتب مولانا مناظر احسن گیلانیؒ ”نام مہتممان“ کے زیر عنوان لکھتے ہیں ”نام مہتممان“ نیچے حسب ذیل ناموں کو ہم پاتے ہیں یعنی حاجی عابد حسین، مولوی محمد قاسم صاحب نانوتوی، مولوی مہتاب علی، مولوی ذوالفقار علی، مولوی فضل الرحمٰن، منشی فضل حق، شیخ نہال احمد۔ بظاہر ارکان شوریٰ کی تعبیر مہتممان کے لفظ سے کی گئی ہے جس کا مطلب یہی ہوا کہ دیوبند میں عربی مدرسہ جو قائم ہوا

تھا اس سے اپنے تعلق کو سیدنا الامام الکبیر قطعاً پوشیدہ رکھنا نہیں چاہتے...تو یہ کہنا کہ ابتداء میں حضرت والا اس مدرسہ سے سیاسی مصالح کے پیش نظر ایسا تعلق رکھنا نہیں چاہتے تھے جس پر حکومت کی نظر پڑ سکتی ہو، بجز ایک خود تراشیدہ مفروضہ کے اور بھی کچھ ہے؟۔''

مولانا گیلانی کے اس بیان پر حضرت مولانا قاری محمد طیّب صاحب قدس سرہٗ نے یہ حاشیہ لکھا ہے۔

> احقر کے خیال ناقص میں بسلسلۂ تاسیس دارالعلوم دیوبند حضرت والا کے کھل کر سامنے نہ آنے کو وقت کے سیاسی مصالح پر محمول کر لیا جانا کوئی ایسی بے سرو پا توجیہ نہیں کہ اسے خود ساختہ مفروضہ کہہ کر کلیتہً نظر انداز کر دیا جائے، اس وقت کے نازک حالات حضرت والا کا وارنٹ، روپوشی، سرکاری دوشوں کا پیچھے لگا رہنا، پھر حضرت والا کے جذبات ونظریات... جن کی رو سے یہ مدرسہ تعلیمی ہونے کے ساتھ ساتھ گویا اہل اللہ کی سیاست کا ایک مرکز بھی تھا، کچھ ایسی باتیں نہ تھیں جو کلیتہً پردۂ خفا میں ہوں...ایسی صورت میں حضرت والا کا بحیثیت بانی یا بحیثیت کسی ذمہ دار عہدیدار کے سامنے آنا بلا شبہ مدرسہ کو خطرات کا شکار بنا سکتا تھا...جس سے وہ حریت پرور مقاصد بروئے کار نہ آسکتے تھے جن کے لئے یہ تاسیس عمل میں آئی تھی، ان حالات میں حضرت والا کا رسمی ذمہ دار کی صورت میں سامنے نہ آنا...ایک اچھی خاصی سیاسی مصلحت کی صورت ہو سکتی ہے، رہا ممبران یا ممتحنین کی فہرست میں حضرت والا کا نام شائع ہو جانا کسی رسمی ذمہ داری کو ظاہر نہیں کرتا اور اگر اس میں ذمہ داری نمایاں ہوتی ہے تو ایک جماعت کی پھر جس میں اکثریت ایسے حضرات کی تھی جو تارک الدنیا اور مسجد نشین بزرگ تھے یا ایسے بزرگوں کی تھی جو گورنمنٹ کے قدیم ملازم اور حال کے پنشنر تھے جن کے بارے میں گورنمنٹ کو شک وشبہ کرنے کی کوئی گنجائش نہیں تھی، ایسے رلے ملے ناموں میں قدرتاً کسی خاص شخصیت پر نگاہ عادۃً نہیں پڑ سکتی، اس

پر بھی مخالفین مدرسہ نے حضرت کے تعلق کو بنیاد قرار دے کر مدرسہ کو حکومتِ وقت کی نگاہوں میں مشتبہ کر دینے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ (سوانح قاسمی حاشیہ ص ۱۴۶، ۱۴۷ مطبوعہ دار العلوم دیوبند)

اس طویل حاشیہ سے موصوف نے انتہائی چابک دستی کے ساتھ ایک جملے کو اس کے سیاق و سباق سے الگ کر کے نقل کر دیا ہے تاکہ اسے من چاہے معنی پہنا سکیں، موصوف کے اس غیر ذمہ دارانہ بلکہ مجرمانہ رویہ پر اگر کسی کو یہ شکوہ ہو کہ یہ وہی تکنیک ہے جو اہل بدعت کا شعار ہے تو یہ الزام نہیں بلکہ برمحل گرفت ہے۔

پھر جس طرح کسی کا انگریزی ملازمت سے الگ رہنا اس کے انگریز مخالف ہونے کے لئے ضروری نہیں ہے چنانچہ مجدد اہل حدیث نواب صدیق حسن خاں، استاذ الکل مولانا سید نذیر حسین ترجمان اہل حدیث مولانا محمد حسین بٹالوی وغیرہ علمائے غیر مقلدین حکومت برطانیہ کے ملازم نہ ہوتے ہوئے مدت العمر برطانوی سامراج کے وفادار و قصیدہ خواں رہے، جس کے چند نمونے گذشتہ سطور میں نظر سے گذر چکے ہیں، ٹھیک اسی طرح کسی کی انگریزی ملازمت سے وابستگی اس کی انگریز نوازی کی دلیل نہیں بن سکتی۔ جہاد حریت کے قائد اعظم جنرل بخت خاں (انگریزی فوج میں سب سے بڑے ہندوستانی افسر) علامہ فضل حق خیر آبادی (محکمہ ریزیڈنٹ کے سررشتہ دار، صدر الصدور، مہتمم کچہری) مفتی عنایت احمد کاکوروی (منصف صدر امین) نیز مولوی کریم اللہ خاں صدر الصدور، خان بہادر مفتی انعام اللہ وکیل صدر، مولوی آل حسن، منصف۔ مولوی شاہ احمد اللہ سب کے سب سرکاری ملازمت سے وابستہ تھے، تو کیا ان محبانِ حریت و کشتگان خنجر آزادی کے بارے میں کوئی ذی ہوش کہہ سکتا ہے کہ ایسے انگریزوں کے ملازم اور وفاداروں سے بھلا کون امید رکھے گا کہ وہ تحریک آزادی میں قائدانہ خدمات انجام دیں گے؟

ان ضروری امور کے ساتھ یہ بات بھی ملحوظ رہنی چاہئے کہ دار العلوم دیوبند کے اولین اراکین میں یہ سات بزرگ ہیں حضرت حاجی عابد حسین دیوبندی، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی، حضرت مولانا مہتاب علی دیوبندی، حضرت مولانا ذوالفقار علی دیوبندی،

حضرت مولانا فضل الرحمٰن عثمانی، جناب منشی فضل حق دیوبندی، جناب شیخ نہال احمد دیوبندی۔ چنانچہ قیام دارالعلوم دیوبند کے چوتھے دن یعنی ۱۹؍محرم ۱۲۸۳ھ کو جو اعلان شائع کیا گیا تھا اس پر انھیں مذکورہ سات بزرگوں کے دستخط ہیں ان میں مولانا ذوالفقار علی، مولانا فضل الرحمٰن عثمانی اور منشی فضل حق صرف تین حضرات کا رسمی تعلق برطانوی سرکار سے رہا، اور ان میں بھی پنشن یافتہ صرف مولانا ذوالفقار صاحبؒ تھے، بقیہ چار اصحاب یعنی حضرت حاجی عابد حسین صاحب، حضرت مولانا نانوتوی، حضرت مولانا مہتاب علی اور شیخ نہال احمد کبھی بھی سرکاری ملازمت سے وابستہ نہیں رہے، اس لئے خالد صدیقی صاحب کا یہ فرمان کہ ''مدرسہ دیوبند کے اراکین میں سے اکثریت ایسے بزرگوں کی تھی جو گورنمنٹ کے قدیم ملازم اور پنشن یافتہ تھے۔'' تاریخی اعتبار سے بالکل غلط اور حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب قدس سرہٗ کی تحریر میں کھلی تحریف ہے کیونکہ حضرت قاری صاحب نے اپنے حاشیہ میں اکثریت کا لفظ مسجد نشین اور تارک الدنیا بزرگوں کے ساتھ استعمال کیا ہے نہ کہ ان حضرات کے ساتھ جو گورنمنٹ کی ملازمت سے وابستہ رہ چکے تھے حضرت قاری صاحب کی عبارت ایک بار پھر ملاحظہ کر لیجئے ''پھر جس میں اکثریت ایسے حضرات کی تھی جو تارک الدنیا اور مسجد نشین بزرگ تھے یا ایسے بزرگوں کی تھی جو گورنمنٹ کے قدیم ملازم اور حال پنشنر تھے۔'' (حاشیہ سوانح قاسمی ص ۲۴۶ و ۲۴۷) اب ناظرین ہی بتائیں کہ موصوف کی اس علمی خیانت کو اہل بدعت کی تکنیک نہ کہا جائے تو پھر کیا نام دیا جائے۔

(۴) صدیقی صاحب کی یہ مثال بھی انھی کے الفاظ میں ملاحظہ کیجئے، لکھتے ہیں۔

> ''گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے یہ مقولہ آپ حضرات نے سنا ہوگا، مولانا محمد میاں صاحب اپنی کتاب ''علماء حق حصہ دوم ص ۳۳۶ پر فرماتے ہیں''
>
> علمائے دیوبند کے بھی وہ چند افراد جو ہمیشہ تحریک حریت کے مخالف رہے اور اس وقت سرکاری مدارس کے ملازم یا پنشنز تھے اس تحریک کے زمانہ میں مہتمم صاحبان نے حکومت کے ذمہ داران سے تعلق رکھا حتی کہ گورنر یوپی کو دارالعلوم میں مدعو کیا اور اس کو ایڈریس بھی پیش کیا اور اس تعلق کا نتیجہ یہ تھا

کہ حافظ احمد صاحب کو شمس العلماء کا خطاب ملا۔ (تحریک شیخ الہند ص ۱۶۰، جریدہ ترجمان ۱۱/۹/۹۱ ÷)

خامہ انگشت بدنداں ہے اسے کیا لکھئے! اوپر تو ''علمائے حق'' جلد دوم ص ۳۳۶ کا حوالہ دے کر لکھتے ہیں کہ مولانا محمد میاں فرماتے ہیں اور پھر اسی عبارت کے نیچے ''تحریک شیخ الہند صفحہ ۱۶۰ کا حوالہ دے رہے ہیں۔ ''دروغ گورا حافظہ نباشد'' آپ حضرات نے یہ مقولہ سنا ہوگا، موصوف کا دماغ عبارت سازی وافترا پردازی میں اس درجہ مصروف رہا کہ انھیں یہ بھی یاد نہ رہا کہ اوپر علمائے حق کا حوالہ دیا جا چکا ہے، حافظہ کی اس کوتاہی کی بنا پر آخر میں ''تحریک شیخ الہند'' کی جانب اس عبارت کو محول کر دیا، پھر اس پر طرہ یہ کہ علمائے حق جلد دوم صفحہ ۳۳۶ کا حوالہ دیا ہے، جب کہ جلد دوم کے کل صفحات ۳۰۴ ہیں اس لئے یہ حوالہ ایک مغالطہ ہے جو علمی دیانت کے یکسر منافی ہے، اسی طرح ''تحریک شیخ الہند'' ص ۱۶۰ کا حوالہ بھی غلط ہے اس کتاب کے صفحہ ۱۶۰ پر تو ''وائسرائے فارن ڈپارٹمنٹ کے ٹیلیگرام کا ترجمہ ہے''، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اصل ماخذ کی جانب رجوع کئے بغیر چلتی ہوئی کتابوں کی جانب منسوب کر کے عبارت نقل کر دی گئی ہے اس لئے نہ تو صفحات میں مطابقت ہے اور نہ اصل عبارت میں خالد صدیقی صاحب کا یہ غیر ذمہ دارانہ رویہ انھیں خالد بن قاسم مداینی و خالد بن الیاس مدنی وغیرہ متروکین کی صف میں کھڑا کر دے گا اس لئے احتیاط لازم ہے، البتہ اس کتاب کے صفحہ ۱۰۹ پر یہ عبارت ضرور ہے ''اس تحریک کے زمانہ میں مہتمم صاحبان نے حکومت کے ذمہ داروں سے تعلق رکھا حتی کہ گورنر یوپی کو دارالعلوم دیوبند میں مدعو کیا اس کو ایڈریس بھی پیش کیا اور اس تعلق کا نتیجہ تھا کہ حافظ صاحب کو شمس العلماء کا خطاب دیا گیا۔'' لیکن موصوف نے اپنی عادت سے مجبور ہو کر اس پر یہ خود ساختہ اضافہ کر دیا ''علماء دیوبند کے وہ چند افراد جو ہمیشہ تحریک حریت کے مخالف رہے اور اس وقت سرکاری مدارس کے ملازم یا پنشنز تھے۔'' چنانچہ اصل اور خانہ ساز اضافے میں بے ربطی واضح ہے، تحریک شیخ الہند کی اس عبارت سے زیادہ سے زیادہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ مہتمم صاحبان نے حکومت کے ذمہ داران سے تعلق رکھا، اس عبارت کے

یہ معنی کہ یہ دونوں حضرات تحریک آزادی کے مخالف اور برطانوی حکومت کے مؤید اور معاون تھے، الفاظ ومعانی میں عدم مطابقت کی بناء پر قابل التفات نہ ہوگا، پھر اگر یہ تعلق ملی مصلحت کے پیش نظر بطور حکمت عملی کے اختیار کیا جائے تو اس کی معقولیت سے کون انکار کرسکتا ہے۔ ان حضرات کے پیش نظر دارالعلوم دیوبند کے تحفظ وبقاء کا مسئلہ تھا اسی بناء پر خواہی نخواہی انگریزوں سے تعلق قائم رکھا، اور حکومت کو مطمئن کرنے کی غرض سے گورنر یوپی کو دعوت دی اور شمس العلماء کا خطاب قبول کیا، لیکن بعد میں جب حالات بدل گئے تو ان حضرات کا رویہ بھی بدل گیا، چنانچہ حضرت مولانا حافظ احمد صاحب نے انگریز کے دیئے ہوئے شمس العلماء کے خطاب کو واپس کردیا اور حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی نے اجلاس گیا ۱۹۲۲ء کے موقع پر اپنے خطبۂ صدارت میں کھل کر انگریزوں کی مخالفت کی، اس خطبہ کا اقتباس ملاحظہ کیجئے۔

> ”صرف قوم نصاریٰ اور ان میں سے بھی یورپ کے نصاریٰ کا مقابلہ اسلام سے دائمی رہا ہے، اس لئے یہ کہنا کہ اسلام کے اصلی اور حقیقی دشمن عیسائی ہیں بالکل صحیح ہے۔“ (خطبہ صدارت اجلاس گیا ص ۱۵)

اس لئے ملی مصالح کے پیش نظر اس وقتی تعلق کو بنیاد بنا کر یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ یہ حضرات انگریزوں کے وفادار اور وظیفہ خوار تھے حقائق سے چشم پوشی ہوگی۔

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم
چشمۂ آفتاب راچہ گناہ

(۵) اسکے بعد ”حافظ محمد احمد صاحب کا دور“ عنوان قائم کرکے اسکے تحت لکھتے ہیں۔

> ”حافظ محمد احمد صاحب پسر مولانا محمد قاسم صاحب بانئ دارالعلوم دیوبند کے محتاط انتظام میں ماضی کے بہت سے برسوں میں سیاست سے بالکل پاک صاف رہا اور اس کے مدرسین ومتعلّمین نے جدید سیاست اور امور خارجہ میں مطلق دلچسپی نہ لی“۔ (تحریک شیخ الہند ص ۲۶۲)

یہ ”تحریک شیخ الہند“ وبالفاظ انگریزی سرکار ”ریشمی خطوط سازش کیس“ کے متعلق

سی، آئی، ڈی کی رپورٹ کا ایک پیرا ہے جو تحریک شیخ الہند مرتبہ مولانا محمد میاں صاحب مطبوعہ الجمعیۃ پریس دہلی کے صفحہ ۱۹۳ پر ہے، موصوف نے حسب مرضی اس میں بھی حذف وترمیم کے ذریعہ مقصد براری کی روش اپنائی ہے اور عنوان بھی بدل دیا ہے، اصل عبارت اور اس کا عنوان یہ ہے۔

> ”دیوبند کا مدرسہ اب تک سیاست سے الگ تھلگ رہا۔“ ۹۔ دیوبند کا مدرسہ شمس العلماء حافظ محمد احمد پسر مولانا محمد قاسم بانیٔ مدرسہ کے محتاط انتظام میں ماضی کے بہت سے برسوں میں سیاست سے بالکل پاک وصاف رہا تھا اور اس کے مدرسوں اور متعلموں نے جدید سیاست یا امور خارجہ میں نہایت خفیف دلچسپی لی تھی یا مطلق دلچسپی نہ لی تھی، عبیداللہ کی آمد سے اور اس کے اثر سے مدرسہ کا رنگ بدلنا شروع ہوگیا۔“

خط کشیدہ جملے چونکہ موصوف کے مدعا ومقصود کے لئے مخل تھے اس لئے اسے ہضم کر گئے اور حوالہ میں صفحہ غلط دیدیا تا کہ اصل ونقل کے درمیان مطابقت میں دشواری ہو اور سہل پسند طبائع اس زحمت سے بچنے کے لئے ان کی نقل پر اعتماد کرلیں۔ پھر یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہئے کہ یہ ایک سی، آئی، ڈی کی رپورٹ ہے مستند تاریخ نہیں، لہٰذا جو چیز جس درجہ کی ہو اس کا استعمال اس کے معیار کے لائق ہونا چاہئے، اس لئے موصوف کا یہ حوالہ حذف وترمیم کے باوجود بھی بے سود ہے۔

(۶) اسی مذکورہ بالا عنوان کے تحت ایک اور مثال ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں۔

> ”مولانا مرحوم کی سب سے بڑی قابل قدر خدمت یہ ہے کہ انھوں نے ریشمی رومال تحریک کو ناکام بنانے کی بھرپور کوشش کی چنانچہ رولٹ کمیٹی رپورٹ پیرا نمبر ۱۷۶ میں درج ہے کہ اگست ۱۹۱۶ء میں ریشمی خطوط کے واقعات کا انکشاف ہوا عبیداللہ سندھی نے اپنے تین ساتھیوں کے ساتھ یہ تحریک چلائی مگر مہتمم اور ارباب شوریٰ نے اس کو (عبیداللہ سندھی) اور اس کے وابستگان کو نکال کر اس تجویز کو درمیان ہی میں ختم کردیا۔ (نذیر حسین ص ۲۶ پروفیسر مبارک)

پروفیسر مبارک کی یہ کتاب باوجود تلاش کے دستیاب نہ ہوسکی اس لئے اس حوالہ کی صحت یا عدم صحت کے بارے میں ہم کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے، البتہ ایک بات ضرور کھٹکتی ہے کہ ریشمی خطوط تحریک کے سلسلے میں مستند ترین بسہولت دستیاب کتاب ”تحریک شیخ الہند“ انگریزی زبان میں ریشمی خطوط سازش کیس اور کون کیا تھا، مرتبہ مولانا سید محمد میاں جس کا حوالہ خود موصوف نے متعدد بار دیا ہے کو نظر انداز کر کے ایک غیر متعلق کتاب کا سہارا کیوں لیا گیا ہے ”کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے“ آیئے تحریک شیخ الہندؒ یعنی ریشمی خطوط سازش کیس“ کی روشنی میں موصوف کے پیش کردہ اس حوالہ کا جائزہ لیں تاکہ اس حوالہ کی حیثیت بھی معلوم ہو جائے اور ناظرین کرام کو یہ فیصلہ کرنے میں آسانی ہو کہ اس حوالہ میں کتنا جز اصل کے مطابق ہے اور کتنا حصہ موصوف کی دماغی کاوش کا نتیجہ ہے، اس سلسلے کی پہلی چیز جو ملتی ہے وہ سینٹرل انٹلی جنس کے ڈائرکٹر کی رپورٹ ۱۶، ۱۹۱۵ء کا یہ پیرا گراف ہے جس میں وہ لکھتا ہے۔

> ”مدرسہ دارالعلوم دیوبند میں سرکشی کا آغاز عبید اللہ سے ہوتا ہے یہ شخص نومسلم سکھ ہے اس نے ۸۹، ۱۸۸۱ء کے درمیان مدرسہ میں تعلیم پائی ۱۹۰۹ء میں استاذ بن کر مدرسہ میں غداری کے جذبات پیدا کرنے کے ارادہ سے شامل ہوا، ۱۹۱۳ء میں غیر ملکی مال کا بائیکاٹ کرنے کی تلقین پر اس کو برطرف کر دیا گیا لیکن اس دوران اس نے صدر مدرس محمود حسن کو اپنا ہم عقیدہ بنالیا تھا۔ (تحریک شیخ الہند ص ۱۴۸)

صفحہ ۱۶۹ پر یہ بیان ہے۔

> ”مولوی عبید اللہ نومسلم سکھ پنجابی ہیں انھوں نے دارالعلوم دیوبند ضلع سہارنپور یوپی میں تعلیم پائی، فارغ التحصیل ہونے کے بعد انھوں نے بارہ برس سندھ میں گذارے جہاں وہ بہت بااثر ہوگئے تھے اور انھوں نے جنونی جذبات رکھنے والوں کے لئے مدرسہ قائم کیا تھا، پھر وہ دیوبند میں استاذ بن کر واپس آئے اور انھوں نے ”جمعیۃ الانصار“ قائم کی یہ دیوبند کے

پرانے طالب علموں کی انجمن تھی بظاہر بالکل بے ضرر تھی لیکن اس کے مقاصد جیسا کہ اب ظاہر ہوا ہے باغیانہ تھے۔ ’’

دارالعلوم دیوبند میں ایک استاذ کی حیثیت سے مولوی عبید اللہ نے بڑی کامیابی کے ساتھ کئی اساتذہ کی وفاداری کو متاثر کیا جن میں خصوصیت سے مولانا محمود الحسن صدر مدرس شامل ہیں وہ بہت با اثر عالم ہیں اس معاملہ میں آگے پھر ان کا ذکر آئے گا، اساتذہ میں اختلاف کے باعث بالآخر مولوی عبید اللہ کو برطرف کر دیا گیا ۱۹۱۳ء میں وہ دلی میں متوطن ہو گئے اور ترکوں کے مشہور حامی رام پور کے مولانا محمد علی مدیر کامریڈ کے گہرے دوست بن گئے، عبید اللہ نے دلی میں نظارۃ المعارف القرآنیہ کے نام سے عربی کا ایک مدرسہ قائم کیا حالیہ تحقیقات سے ظاہر ہوا ہے کہ اس کے قیام کا مقصد اسے اتحاد اسلامی کی سازش کا ہیڈ کوارٹر بنانا تھا۔ ’’

استغاثہ ملک معظم شہنشاہ ہند بنام عبید اللہ وغیرہ کے زیر عنوان یہ تفصیل مذکور ہے۔

’’ مدرسہ میں عبید اللہ کا ضرر رساں اثر تیزی سے پھیلنے لگا اور اس نے مدرسہ کے اساتذہ اور طلباء میں بہت سے لوگوں میں اپنے باغیانہ افکار بھر دیئے، اس نے مولانا محمود الحسن کو اس سے پہلے ہی مکمل طور پر اپنا ہم خیال بنا لیا تھا کہ مدرسہ کے منتظمین مدرسہ کو درپیش خطرات کا اندازہ کر سکیں اور عبید اللہ کو اسے چھوڑنے پر مجبور کریں۔ ’’ (ص ۱۹۱)

اسی استغاثہ کے پیرا ۸ میں جمعیۃ الانصار کے سلسلے میں یہ معلومات فراہم کی گئی ہے۔

’’ عبید اللہ نے جمعیۃ الانصار کے اندر ایک خفیہ جماعت بنائی تھی یہ ایک قسم کا اندرونی حلقہ تھا جس کے اغراض و مقاصد ظاہر نہیں کئے گئے تھے لیکن رسوا کن حد تک قابلِ اعتراض تھے چنانچہ مدرسہ کے سربراہ نے موقع نکال کر مولوی عبید اللہ کو طلب کیا اور اس بارہ میں سخت سرزنش کی۔ ’’ (ص ۱۹۲)

پیراگراف ۱۴ میں یہ لکھا گیا ہے۔

> ’’مدرسہ کی نیک نامی کی بقاء کے لئے مجلس منتظمہ نے فیصلہ کیا کہ عبید اللہ کو اس کے دوسرے ساتھیوں کے ہمراہ مدرسہ سے خارج کر دینا چاہئے۔‘‘
>
> (ص ۱۹۵)

ان سارے بیانات کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

(۱) (مولانا) عبید اللہ سندھی دار العلوم دیوبند میں غداری کے جذبات پیدا کرنے کی غرض سے بحیثیت استاذ کے یہاں مقیم ہو گئے۔

(۲) ۱۹۱۳÷ میں غیر ملکی مال کا بائیکاٹ کرنے کی تلقین کی وجہ سے انھیں مدرسہ سے الگ کر دیا گیا۔

(۳) انھوں نے صدر مدرس مولانا محمود حسن (قدس سرہٗ) کو اپنا ہم نوا بنالیا تھا۔

(۴) ۱۹۰۹÷ میں عبید اللہ نے جمعیۃ الانصار قائم کی جس کے مقاصد باغیانہ تھے۔

(۵) اساتذہ سے اختلاف کے باعث (مولانا) عبید اللہ سندھی کو مدرسہ سے الگ کر دیا گیا۔

(۶) (مولانا) عبید اللہ نے مدرسہ کے اساتذہ وطلبہ میں نہایت تیزی کے ساتھ باغیانہ افکار بھر دیئے۔

(۷) مدرسہ کے سربراہ نے (مولانا) عبید اللہ کی خفیہ سرگرمیوں کی بناء پر سخت سرزنش کی۔

(۸) مدرسہ کی نیک نامی کے لئے منتظمہ نے فیصلہ کیا کہ (مولانا) عبید اللہ اور ان کے ساتھیوں کو مدرسہ سے الگ کر دیا جائے۔

محکمۂ خفیہ کی اس رپورٹ کو پڑھیے اس میں مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم کی دار العلوم دیوبند سے علیحدگی کے تین اسباب بتائے گئے ہیں (الف) غیر ملکی مال کا بائیکاٹ کرنے کی دعوت (ب) اساتذۂ دار العلوم سے اختلاف (ج) دار العلوم کی نیک نامی کی بقا۔ پھر مولانا سندھیؒ کو کس نے الگ کیا اس سلسلے میں سی آئی ڈی نے دو جگہ کسی کی تعیین نہیں کی ہے بلکہ برطرف کر دیا گیا کے الفاظ استعمال کیئے ہیں اور ایک جگہ لکھا ہے کہ مجلس منتظمہ نے ان

کی علیحدگی کا فیصلہ کیا۔

جب کہ آں موصوف کے نقل کردہ حوالہ میں اس کی تمامتر ذمہ داری دارالعلوم کے مہتمم حضرت مولانا محمد احمد صاحب پر ڈال دی گئی ہے، چنانچہ لکھتے ہیں ''مولانا مرحوم کی سب سے بڑی قابل قدر خدمت یہ ہے کہ انھوں نے ریشمی تحریک کو ناکام بنانے کی بھرپور کوشش کی۔'' موصوف اپنے اس نادرالوجود حوالہ کے ذریعہ یہ انوکھا انکشاف بھی فرمارہے ہیں کہ مولانا عبیداللہ سندھی اور ان کے رفقائے کار کو دارالعلوم سے علیحدہ کرکے اس تحریک اور اس کی تجویز کو درمیان ہی سے ختم کردیا۔ موصوف کی یہ دریافت تاریخ میں ایک اضافہ ہے جس پر انھیں جتنی بھی داد دی جائے کم ہے، ورنہ سی آئی ڈی کی تحقیق یہ ہے کہ ''دیوبند سے عبیداللہ کے اخراج کے معنی یہ نہیں تھے کہ اس کا وہاں آنا جانا بند ہوگیا، کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ مولانا کی نشست گاہ (بیٹھک) ستمبر ۱۹۱۵÷ تک جبکہ مولانا ہندوستان سے حجاز روانہ ہوئے سازشوں کی جلسہ گاہ بنی رہی، عبیداللہ اور دوسرے لوگ مشوروں میں شریک ہونے کے لئے دیوبند آتے رہے۔'' (تحریک شیخ الہند ص ۱۹۶-۱۹۵)

اگر یہ تحریک وتجویز درمیان ہی سے ختم ہوگئی تھی تو پھر بقول سی، آئی، ڈی یہ سازش کس لئے ہورہی تھی؟ آں موصوف ہی اس سوال کو حل کریں گے، اور خود مولانا سندھی اپنی آپ بیتی میں لکھتے ہیں ''حضرت شیخ الہندؒ کے ارشاد سے میرا کام دیوبند سے دہلی منتقل ہوا، ۱۳۳۱ھ/۱۹۱۴÷ میں نظارۃ المعارف قائم ہوئی۔'' (آپ بیتی ملحقہ مولانا سندھی کی سرگزشت کابل ص ۱۱۱ از مولانا عبداللہ لغاری، مطبوعہ قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ وثقافت اسلام آباد، پاکستان) اسی نظارۃ المعارف کو سرکاری خفیہ پولس اتحاد اسلامی کی سازش کا ہیڈکوارٹر بتاتی ہے۔

پھر آگے چل کر لکھتے ہیں کہ ۱۳۳۳ھ/ ۱۹۱۵÷ میں شیخ الہند کے حکم سے کابل گیا مجھے کوئی مفصل پروگرام نہیں بتایا گیا تھا اس لئے میری طبیعت اس ہجرت کو پسند نہیں کرتی تھی لیکن تعمیل حکم کے لئے جانا ضروری تھا، خدا نے اپنے فضل سے نکلنے کا راستہ صاف کردیا اور میں افغانستان پہنچ گیا... کابل جاکر مجھے معلوم ہوا کہ حضرت شیخ الہند جس جماعت کے

نمائندہ تھے اس کی پچاس سالہ محنتوں کے حاصل میرے سامنے غیر منظّم شکل میں تعمیل حکم کے لئے تیار ہیں .... میں سات سال تک کابل حکومت کی شرکت میں اپنا ہندوستانی کام کرتا رہا الخ (ایضاص۱۲)

تحریک درمیان ہی سے ختم ہوگئی تھی تو بقول سی آئی ڈی دہلی میں نظارۃ المعارف کے نام سے اتحاد اسلامی کی سازش کا ہیڈ کوارٹر کس لئے قائم کیا گیا اور حضرت شیخ الہندؒ نے کس کام کے لئے مولانا سندھی کو کابل بھیجا اور وہ کون سا ہندوستانی کام تھا جسے مولانا سندھی کابل حکومت کی شرکت میں انجام دیتے رہے۔

اس موقع پر یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ سی آئی ڈی کی یہ رپورٹ رجماً بالغیب سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی کیونکہ وہ آخر تک تحریک کی حقیقت سے بے خبر رہا، اسی بے خبری کا نتیجہ ہے کہ وہ تحریک کا بانی مبانی مولانا سندھی کو قرار دیتا ہے جب کہ یہ بات سرے سے غلط ہے، اسی طرح وہ مولانا سندھی کے دارالعلوم سے علیحدگی کے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ نہیں کرسکا اسی بنا پر وہ اس سلسلے میں متعدد وجوہ بیان کر رہا ہے اور اس کے یہ سارے بیانات خود صاحب معاملہ مولانا سندھی مرحوم کے بیان سے مختلف ہیں، کیونکہ مولانا سندھی تو یہ کہہ رہے ہیں کہ حضرت شیخ الہند کے حکم سے انھوں نے اپنا محاذ بدل دیا، مولانا سندھی کے خود اپنے الفاظ یہ ہیں۔ ''حضرت شیخ الہند کے ارشاد سے میرا کام دیوبند سے دہلی منتقل ہوا۔'' جس کا مطلب یہ ہوا کہ غیر ملکی مال کا مقاطعہ، اساتذہ سے اختلاف، اور دارالعلوم کی نیک نامی کی بقاء، یہ امور اس درجہ کے نہیں تھے کہ ان کی وجہ سے مولانا سندھی کو دارالعلوم چھوڑنا پڑ گیا، بلکہ اس کا سبب اصلی کمانڈر کا حکم تھا اس سلسلے میں مولانا سندھی کے تلمیذ رشید اور کار ہائے سیاسی میں ان کے رفیق خاص مولانا عبداللہ لغاری نے جو تفصیلات دی ہیں ان سے صحیح صورت حال بالکل سامنے آجاتی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ

> ''ایک بار نجات غیر مسلم کے بارے میں مولانا سندھی، مولانا انور شاہ سے گفتگو کر رہے تھے، مولانا سندھی نے فرمایا کہ اگر ایک غیر مسلم آدمی جو با اخلاق ہے، اللہ کو وحدہٗ لاشریک مانتا ہے، اور لوگوں میں اصلاح کرتا ہے

اوراس کے اعمال بھی بھلے ہوں تو وہ قیامت میں نجات کا مستحق ہے، مولانا انور شاہ صاحبؒ نے کہا، کیا آپ کا یہ اعتقاد ہے کہ اگر کوئی شخص رسول اللہ ......کو اپنا نبی نہ مانے تو بھی وہ نجات کا مستحق ہوسکتا ہے؟ مولانا نے غصے سے کہا۔ بیشک میں یہی سمجھتا ہوں کیونکہ تمہاری تبلیغ ان کے کانوں میں پہنچی نہیں، اس پر غصہ ہوکر انھوں نے مولانا پر کفر کا فتویٰ صادر کیا اور اراکین مدرسہ کو اطلاع کردی... انھوں نے مولانا سندھی کو ایک مجلس میں بلایا اور ان سے پوچھا کہ آپ نے یہ کہا ہے کہ جو رسول اللہ......کو نہ مانے اور اس کے اخلاق اچھے ہوں وہ مسلمانوں کی طرح نجات کا مستحق ہے، مولانا سندھی نے فرمایا کہ بے شک میں نے یہ کلمہ کہا ہے، انھوں نے کہا کہ آپ نے کلمۂ کفر زبان سے نکالا ہے... اب آپ اس سے توبہ کریں تو یہاں رہیں ورنہ چلے جائیں، مولانا سندھی نے فرمایا میں توبہ کرنے کے لئے تیار ہوں پھر انھوں نے مولانا کو کلمہ اور آیت (آمنت باللہ) پڑھائی اور استغفار اور توبہ کرانے کے بعد کہا اب آپ مسلمان ہیں۔

اس مخالفت کے زمانے میں مولانا شیخ الہندؒ موجود نہ تھے وہ گنگوہ کی طرف گئے ہوئے تھے اور وہاں ہفتہ بھر کے لئے ٹھہر گئے تھے، مولانا سندھیؒ نے ''جمعیۃ الانصار'' کی نظامت کے عہدے سے استعفاء لکھ کر اراکین مدرسہ کے حوالے کیا اور اسٹیشن آ کر سہارن پور کا ٹکٹ لیا، سہارن پور کے اسٹیشن پر مولانا شیخ الہندؒ سے ملاقات ہوگئی، ان سے سارا واقعہ بیان کیا اور اپنے استعفیٰ کا بھی ذکر کردیا، وہ بہت خوش ہوئے اور فرمایا آپ نے بہت اچھا کیا، وہ نہیں چاہتے تھے کہ آپ دیوبند میں رہیں، آپ سیدھے دہلی چلے جائیں اور وہاں کوئی مدرسہ کھول لیں، مولانا سندھی نے دہلی پہنچ کر فتح پوری مسجد میں ''نظارہ المعارف القرآنیہ'' قائم کی، حضرت شیخ الہندؒ کی غرض یہ تھی کہ مولانا دہلی میں رہ کر ہندو مسلم اتحاد کی تحریک شروع کریں۔'' (مولانا عبیداللہ کی سرگذشت

کابل از مولانا لغاری ص۷۸-۷۷)

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ وہ اختلاف اساتذہ جس کو سی آئی ڈی مولانا سندھی کے دارالعلوم سے اخراج کا سبب بتا رہا ہے رفع دفع ہوگیا تھا، لیکن اس واقعہ کے بعد مولانا سندھی نے وہاں رہنا مناسب نہ سمجھا اور استعفا دے کر مدرسہ سے علیحدگی اختیار کرلی۔ مولانا کے اس فیصلے کو شیخ الہندؒ نے بھی پسند کیا اور انھیں دہلی میں رہ کر کام کرنے کی ہدایت دی، یہ ہے واقعہ کی اصل حقیقت۔

اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کردیا

ان حقائق کے بعد آں موصوف کی اس دلیل کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے اسے ناظرین کرام اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں؟

(۷-۸) اس کے بعد موصوف اپنے مدعا و مقصود کے اثبات میں ''مولانا محمد قاسم نانوتوی صاحب کا دور'' اور ''مولانا محمود الحسن صاحب کا دور'' دو عنوان قائم کر کے جریدہ ترجمان ۱۱/۹/۱۹۹۱ء کے صفحہ ۵ پر لکھتے ہیں۔

> ''مولانا محمد قاسم صاحب کا دور بالکل غیر سیاسی تھا اس کے بعد ان کے خطاب یافتہ وفادار سرکار بیٹے شمس العلماء حافظ محمد احمد صاحب کا دور بھی غیر سیاسی بلکہ انگریزوں سے وابستگی کا دور تھا۔'' (احسن نانوتوی ص ۲۱۷)
>
> مولانا محمود الحسن صاحب کا دور جو تقریباً چالیس سال پر محیط ہے اس میں بھی دیوبند ہمیشہ مسلمانوں کی تحریکات میں غیر جانب دار رہا اور سرکاری سرپرستی میں ترقی کرتا رہا اس مدرسہ نے یوماً فیوماً ترقی کی لیفٹنٹ گورنر کے ایک خفیہ معتمد نے اس مدرسہ کا معائنہ کیا تو بڑے اچھے خیالات کا اظہار کیا، یہ مدرسہ خلاف سرکار نہیں بلکہ ممد و معاون سرکار ہے، یہاں کے تعلیم یافتہ لوگ ایسے آزاد اور نیک چلن ہیں کہ ایک کو دوسرے سے کچھ واسطہ نہیں۔''
>
> (احسن نانوتوی ص ۲۱۷)

یہ ہے مختصر ترین تعارف وجہ تاسیس دیوبند اور اس کے اراکین و منتظمین کا۔

آں موصوف کے پیش کردہ دونوں حوالے ایجاد بندہ کے قبیل سے ہیں ''احسن نانوتوی'' مولفہ جناب محمد ایوب قادری میں ان کی پیش کردہ عبارت قطعاً نہیں ہے، دوسرے کے کندھے پر بندوق رکھ کر چلانے میں موصوف کو کمال حاصل ہے، عبارت کا اختراع تو خود کررہے ہیں اور سر منڈھ رہے مرحوم ایوب قادری کے، اس جسارت بے جا کی بھی کوئی حد ہے! جماعت دیوبند سے اپنے نفسانی بغض وعناد کی وجہ سے انھیں یہ گوارہ نہیں ہے کہ کوئی خوبی اور قابل تعریف بات ان کی جانب منسوب ہوجائے اس لئے استخلاص وطن کے سلسلے میں اکابر دارالعلوم کی مجاہدانہ سرگرمیوں پر پردہ ڈالنے کے لئے وہ تاریخ کو مسخ کرنے کے درپے ہیں، اور اپنی ذہنی اپج اور دماغی اختراع کو لائق اعتناء بنانے کی ناکام ہوس میں اسے کسی معروف ومشہور مؤرخ ومحقق کی جانب غلط طور سے منسوب کردیتے ہیں، ان کے اس غیر ذمہ دارانہ رویے کی اس چھوٹے سے مضمون میں متعدد مثالیں موجود ہیں۔

ہاں دوسرے حوالے میں ''اس مدرسہ نے ''یوماً فیوماً ترقی کی'' سے ''ایک کو دوسرے سے کوئی واسطہ نہیں'' تک کی عبارت احسن نانوتوی کی ہے، یہی عبارت اپنے مضمون کی ابتدا میں بھی نقل کرچکے ہیں، ناظرین کرام دونوں جگہوں کی عبارتوں کا مقابلہ کرکے خود اندازہ لگاسکتے ہیں کہ موصوف حوالوں کے پیش کرنے میں کتنے محتاط ہیں، اس حوالہ سے متعلق گفتگو گذرچکی ہے اعادہ کی ضرورت نہیں۔

موصوف کو دیوبندیت وحنفیت سے اس درجہ کد ہے کہ دیوبندی مکتب فکر کے مدارس کی کثرت بھی ان کے لئے سوہان روح بنی ہوئی ہے، چنانچہ اسی مضمون میں انھوں نے اس پر بھی واویلا مچایا ہے حالانکہ موصوف کو معلوم ہونا چاہئے کہ انھیں مدارس اور اس کے علماء نے ظلمت کدۂ ہند میں اسلامی اقدار اور دینی علوم کی نہ صرف حفاظت وصیانت کی بلکہ جب پوری دنیائے اسلام میں دینی علوم باد زوال کے تیز وتند تھپیڑوں سے مرجھا گئے تھے تو ان مدارس کے علماء وفضلاء کی علمی سرگرمیوں کی بدولت ہندوستان کے چمنستان علم میں بہار انگڑائیاں لے رہی تھی، چنانچہ عالم اسلام کے منتخب عالم، نامور صاحب قلم اور یگانۂ روزگار

مصنف علامہ رشید رضا مصری لکھتے ہیں۔

لو لا عناية اخواننا علماء الهند بعلوم الحديث فی هذا العصر لقضی عليها بالزوال من امصار الشرق فقد ضعفت فی مصر والشام والعراق والحجاز منذ القرن العاشر للهجرة حتی بلغت منتهی الضعف فی اوائل القرن الرابع العشر (مقدمہ مفتاح كنوز السنة "ص ق" مطبوعہ مصر ۱۳۵۳ھ)

> اگر علمائے ہند کی توجہ اس زمانہ میں علم حدیث کی جانب نہ ہوتی تو بلاد مشرق سے یہ علم ختم ہو چکا ہوتا، کیونکہ مصر، شام، عراق اور حجاز میں علم حدیث کا زوال دسویں صدی ہجری سے شروع ہو کر چودہویں صدی کے اوائل میں اپنی انتہا کو پہنچ گیا تھا۔

(۹) اپنے مدعا کے اثبات میں صدیقی صاحب ایک دلیل یہ پیش کرتے ہیں۔

> "مولانا محمد میاں صاحب "علماء ہند کا شاندار ماضی ص ۳۸۷" میں فرماتے ہیں۔ "دارالعلوم دیوبند جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مراد آباد، مظاہر علوم سہارنپور کے حلقے قائم کئے گئے جنھوں نے سیاست سے علیحدگی کا اعلان کردیا۔"

اس جگہ بھی عبارت کے مطابق حوالہ نا تمام اور صفحات غلط دئے ہیں، یہ عبارت علماء ہند کا شاندار ماضی ج ۴ ص ۲۸۷ کی ہے مگر مقصد براری کیلئے اس عبارت کے اوّل جملوں کو حذف کردیا ہے، آپ پوری عبارت ملاحظہ فرمائیں اور آں موصوف بزعم خود اہل حدیث صاحب کی دیانت داری کی داد دیں۔

> "حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی، حضرت مولانا محمد منیر صاحب اور ان کے برادر محترم مولانا محمد مظہر صاحب کو ہندوستان چھوڑا گیا اور ابھی شہیدوں کا خون خشک ہونے نہیں پایا تھا کہ ان بزرگوں نے تحریک کی نشأۃ ثانیہ کے لئے دارالعلوم دیوبند، جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مراد آباد، مظاہر علوم سہارنپور وغیرہ کے حلقے قائم

کردیئے جنھوں نے سیاست سے علیحدگی کا اعلان کیا مگر دین و مذہب جس کی تعلیم کو نصب العین بنایا تھا اس کی ہمہ گیر تفسیر میں ان بزرگوں کے عقیدے کے مطابق وطنی سیاست اور جدوجہد آزادی ایک فرض کی حیثیت تھی اسی احساس فرض کا نتیجہ تھا کہ جیسے ہی ۱۸۵۸÷ میں انڈین نیشنل کانگریس قائم کی گئی اس جماعت کے سربراہ شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب قدس سرہٗ العزیز اور آپ کے ساتھیوں نے مسلمانوں کے لئے شرکت کانگریس کا فتویٰ صادر کیا... پھر بیسویں صدی کے شروع میں مؤتمر الانصار و جمعیۃ الانصار کے نام سے ایک نظام قائم کیا گیا اس نظام کا اندرونی رخ یہ تھا بقول شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی ''۱۹۰۷÷ میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب قدس سرہ العزیز نے ریشمی خط کی تحریک شروع کی اور ۱۹۱۴÷ تک اسے اس حد تک پہنچادیا کہ اگر کچھ ملک کے خائن خیانت نہ کرتے تو اسی وقت ہندوستان آزاد ہوچکا ہوتا۔'' (شاندار ماضی ج۴ ص ۸۸-۲۸۷)

مولانا محمد میاں صاحب کیا لکھ رہے ہیں اور آں موصوف اپنے مسموم ذہن سے اسے کیا سمجھ رہے ہیں، سچ ہے ''ہرچہ گیرد علتی علت شود''

(۱۰) صفحہ ۶ کالم ۱، پر آگے لکھتے ہیں انھیں اسباب کی بنا پر مولانا عبیداللہ سندھی مدرسہ دیوبند سے مایوس ہوگئے کہ یہاں سے تحریک آزادی کا کام نہیں ہوسکتا۔

''دیوبند کا مدرسہ شمس العلماء حافظ محمد احمد کے محتاط انتظام میں سیاست سے پاک صاف رہا، اس کے مدرسوں، معلّموں، متعلموں نے سیاست میں مطلق دلچسپی نہ دکھائی چنانچہ دیوبند کو اپنے مشن کی تربیت گاہ بنانے میں ناکام ہوکر عبیداللہ سندھی نے یہ فیصلہ کیا کہ ایک مدرسہ دہلی میں اس مقصد کیلئے قائم کریں۔ (تحریک شیخ الہند ص ۲۸۵)

یہی عبارت بحوالہ تحریک شیخ الہند ص ۲۶۲ جریدہ ترجمان ۹۱/۹/۱۱÷ کے صفحہ ۵ کالم ۳

میں نقل کر چکے ہیں جسے ہم نے بعینہٖ پانچویں نمبر پر درج کر دیا ہے۔ موصوف کی مغالطہ اندازی دیکھئے اس جگہ تو حوالہ میں ۲۶۲ تحریر کیا (جو غلط تھا) اور اس موقع پر حوالہ ۲۸۵ کا دے رہے ہیں اور یہ بھی بالکل غلط ہے، پھر دونوں تحریروں کا مقابلہ کر کے دیکھ لیں کہ اپنے مقصود کو حاصل کرنے کے لئے کس طرح دجل وفریب کیا جارہا ہے ''تحریک شیخ الہند'' کی اصل عبارت میں اپنے مفتریات کو کس طرح داخل کر دیا گیا ہے، علاوہ ازیں گذشتہ صفحات میں موصوف نے خود حافظ احمد صاحب پر یہ الزام چسپاں کیا تھا کہ ریشمی تحریک کو ناکام کرنے کے لئے انھوں نے مولانا سندھی کو دارالعلوم سے الگ کر دیا، اور یہاں لکھ رہے ہیں کہ مولانا عبیداللہ سندھی مدرسہ دیوبند سے مایوس ہوگئے کہ یہاں سے تحریک آزادی کا کام نہیں ہوسکتا... چنانچہ دیوبند کو اپنے مشن کی تربیت گاہ بنانے میں ناکام ہوکر عبیداللہ سندھی نے یہ فیصلہ کیا کہ ایک مدرسہ دہلی میں اس مقصد کیلئے قائم کریں۔ ''دروغ گورا حافظہ نباشد'' کی اس سے بہتر مثال اور کہاں ملے گی۔

(۱۱) دارالعلوم دیوبند اور اس کے اکابر کے خلاف اپنے بغض وحسد کی ظلمت سے صفحۂ قرطاس کو سیاہ کرنے کے بعد وہابی مدارس کی قصیدہ خوانی ومدح سرائی کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

> ''وہابی تحریک کے مدرسوں سے ایسے ایسے سرفروش پیدا کئے جاتے تھے جو وہاں سے نکل کر تحریک حریت میں شامل ہوں، یہ وہابی مدرسے تحریک حریت کے مرکز تھے اور ان مدارس کے معلّمین ومتعلّمین مجاہدین کو روپیہ اور اسلحہ فراہم کرتے تھے، ۱۸۶۳ء میں امیر المجاہدین مولانا عبداللہ نے جنگ انبیلہ لڑی جس میں انگریزوں کو منہ کی کھانی پڑی، تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ وہابی کے ادارے اور علماء ہی اصل مجاہدین کو روپیہ اور اسلحہ سپلائی کرتے ہیں، پورے ملک میں پٹنہ سے صوبہ سرحد تک زیر زمین کا ایک جال بچھا ہوا ہے، اس وقت صرف بنگال میں اسّی ہزار مدرسہ اس قسم کے موجود تھے۔

(جریدہ ترجمان ۹۱/۹/۱۱ء ص ۶)

اس سلسلے میں عرض ہے کہ وہابی مجاہدین کی جانبازی وجاں سپاری سرآنکھوں پر، ان سرفروشوں کے مجاہدانہ کردار کی ہر ذی فہم ملت کا دردمند مسلمان دل وجان سے قدر کرتا ہے، لیکن ان کے کارناموں سے اہل حدیث پارٹی کو کیا واسطہ، جس پر جناب فخر ومباہات کا گیت گا رہے ہیں، جماعت اہل حدیث کے نزدیک تو یہ محبان حریت بدخواہ، دشمن، فسادی، اور شریر تھے، اپنے امام السنۃ، خاتم المحدثین، مجدد فی الہند عالی جاہ نواب صدیق حسن خاں قنوجی ثم بھوپالی کی درج ذیل تحریر پڑھئے۔

> ”گورنمنٹ ہند کے دیگر فریق اسلام نے یہ دل نشین کردیا ہے کہ فرقۂ موحدین (اہل حدیث) ہند مثل وہابیان ملک ہزارہ ایک بدخواہ فرقہ ہے اور نیز یہ لوگ ویسے ہی دشمن فسادی ملک گورنمنٹ کے ہیں جیسے کہ دیگر شریر اقوام سرحدی بمقابلہ حکومت ہند شرارت سوچا کرتے ہیں۔“ (ترجمان وہابیہ، ص ۶۱)

آپ کی جماعت اہل حدیث تو من حیث الجماعت وہابیوں اور ان کی تحریک سے نفرت اور اظہار بیزاری کرچکی ہے، حتی کہ وہابی نام سے موسوم ہونا بھی اسے گوارا نہیں ہے۔ ملاحظہ کیجئے آپ کی جماعت اہل حدیث کے مربی نواب صاحب ہی لکھتے ہیں۔

> ”چنانچہ لیفٹننٹ گورنر صاحب بہادر موصوف نے اس درخواست کو منظور کیا اور پھر ایک اشتہار اس مضمون کا دیا گیا کہ ”موحدین ہند (اہل حدیث) پر شبہ بدخواہی گورنمنٹ ہند عامۃً نہ ہو خصوصاً جو لوگ کہ وہابیان ملک ہزارہ سے نفرت رکھتے ہوں اور گورنمنٹ ہند کے خیر خواہ ہیں ایسے موحدین مخاطب بہ وہابی نہ ہوں۔“ (ترجمان وہابیہ ص ۶۲)

لہٰذا ان وہابی مجاہدین کی انگریز مخالف سرگرمیوں پر آپ کی یہ شیخی قطعاً بے محل ہے۔

”جو بات کی جناب نے وہ لاجواب کی“ آپ کی جماعت تو اپنے برطانوی آقا کی خوشنودی میں فریضۂ الٰہی جہاد کو منسوخ کرچکی ہے چنانچہ عزت مآب جناب نواب صاحب رسالہ ”الاقتصاد فی مسائل الجہاد“ مؤلفہ ترجمان اہل حدیث مولانا محمد حسین بٹالوی جس کے ذریعہ جہاد کو متفقہ طور پر کالعدم کیا گیا تصویب وتصدیق کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

> ”پھر مولوی محمد حسین نے اپنے اس دعویٰ اور جواب کی تصدیق میں کل علماء ملک پنجاب و اطراف ہند کے پاس اپنے فتویٰ جوابی کو بھیج دیا اور اچھی طرح سے مشتہر کیا اور کل علماء ہند و ملک پنجاب سے اس بات کی تصدیق میں اقرار مہری و دستخطی کرالیا کہ عموماً مسلمانان ہند کو ہتھیار اٹھانا اور جہاد بمقابلہ برٹش گورنمنٹ ہند کرنا خلاف سنت و ایمان موحدین ہے، اور نیز کل علماء پنجاب و ہند نے تائید قول مولوی محمد حسین کو اس فتوی میں بہت سچا اور پکا کہا ہے اور سب نے اپنی اپنی رضائے اسلامی و ایمانی سے اس فتویٰ کو قبول کیا ہے اور جانا اور مانا ہے کہ بمقابلہ گورنمنٹ ہند فرقہ موحدین (اہلحدیث) کو ہتھیار اٹھانا خلافِ ایمان و اسلام ہے۔“ (ترجمان وہابیہ ص ۱۲۱)

جس جماعت کا یہ عقیدہ ہو کہ برطانوی سامراج کے مقابلہ میں جہاد خلاف اسلام و ایمان ہے، کیا آج اس جماعت کے کسی فرد کو یہ زیب دیتا ہے کہ وہ وہابی تحریک اور وہابی مجاہدین کی مجاہدانہ خدمات کو اپنی جانب منسوب کرکے اس پر شیخی بگھارے؟ اس موقع پرستی اور بے غیرتی کی بھی کوئی حد ہے۔

علاوہ ازیں وہابی تحریک کو اہل حدیث کی تحریک سمجھ کر آں جناب کا اس پر فخر کرنا تاریخ سے عدم واقفیت کی کھلی دلیل ہے کیونکہ اس زمانہ میں لفظ وہابی حضرت سید احمد شہیدؒ اور ان کے رفقاء پر بولا جاتا تھا جو حنفی المسلک تھے نہ کہ غیر مقلد، چنانچہ تاریخ ہند کے نامور محقق جناب خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں۔

> ”جس نے ہنٹر کی کتاب ”ہمارے ہندوستانی“ پڑھی ہے اس سے انکار نہ کرے گا کہ وہابی کا لفظ اس زمانہ میں سیّد صاحبؒ اور ان کے ہم خیال علماء کے لئے استعمال کیا جاتا تھا اور بقول ہنٹر وہابی اور غدار ہم معنی الفاظ تھے۔“
>
> (مقدمہ ۱۸۵۷÷ کا تاریخی روزنامچہ ص ۱۵ مرتبہ خلیق نظامی)

(۱۲) اس بیجا لاف زنی پر تقریباً ایک کالم سیاہ کرنے کے بعد دارالعلوم اور اس کے اکابر کے خلاف اپنے دل کی بھڑاس یوں نکالتے ہیں۔

> “کیا ملک کی آزادی کے مقابلے میں ایک مدرسہ کی قربانی بھاری تھی؟ ملک آزاد ہوجانے کے بعد ایسے کتنے دارالعلوم بن کر تیار ہوجاتے، لیکن اگر دارالعلوم کو سیاسی مرکز بناتے تو مدرسہ کو مالی تعاون نہ ملتا، وظیفہ خوروں کے وظیفے بند ہوجاتے، یاران حکومت پنشن سے محروم ہوجاتے، عیش وعشرت کدے سرد پڑجاتے اور جیل میں حسرت موہانی کی طرح چکیاں چلانی پڑتیں۔ (جریدہ ترجمان ۱۱/۹/۹۱÷ص ۶ کالم ۲)

آں موصوف سے گذارش ہے کہ پہلے اپنے گھر کی خبر لیجئے اور اپنے امام السنہ، مجدد فی الہند عالیجاہ نواب صدیق حسن خاں صاحب کے کردار وعمل کو گوشۂ چشم سے ہی دیکھ لیجئے کہ موصوف محض دنیوی نفع ونمود کے لئے مجاہدین حریت کے خلاف انگریزوں کی نہ صرف مالی مدد فرمارہے ہیں بلکہ ان کی فوجیں چار سال تک برطانوی افواج کے دوش بدوش مجاہدین کے مقابلہ میں ڈٹی رہیں جس کے صلہ میں آنجناب کو پرگنہ بیرسیہ کی جاگیر اور ایک لاکھ نقد حاصل ہوا، جس کی تفصیل نظر نواز ہوچکی ہے، کیا وطن عزیز کی آزادی کے مقابلہ میں ایک پرگنہ کی جاگیر اور ایک لاکھ کی قربانی بھاری تھی؟

اپنے شیخ الکل فی الکل، مجدد اعظم اور آیت من آیات اللہ مولانا سید میاں نذیر حسین سورج گڑھی ثم دہلوی کے رویے پر بھی ایک طائرانہ نگاہ ڈال لیجئے جو سرفروشان وطن کی ہمت شکنی اور اپنے آقا انگریزوں کی رضاجوئی میں جہاد حریت کو غدر، ہُلّڑ اور مجاہدین کو باغی کہتے رہے جس کے صلہ میں انھیں انگریزی سرکار سے شمس العلماء کا خطاب، وفاداری کی سند، امن کا پروانہ اور تیرہ سو روپے نقد وصول ہوئے، کیا آزادئ ملک کے مقابلہ میں شمس العلماء کے خطاب، سند وفاکیشی، پروانہ امن اور تیرہ سو روپے کی قربانی بھاری تھی؟

رہا معاملہ دارالعلوم دیوبند کی قربانی کا! تو دارالعلوم کا قیام ہی اس غرض سے ہوا تھا کہ یہاں سے ایسے رجال کار تیار کئے جائیں جن کے ذریعہ ۱۸۵۷÷ کی ناکامی کی تلافی کی جاسکے اگر اسے بھی بھینٹ چڑھادیا جاتا تو پھر یہ اسکیم کس طرح بروئے کار لائی جاتی۔

ادا شناس نئی دل برا خطا ایں جاست

چنانچہ منصوبہ کے مطابق اس تربیت گاہ حریت سے بانی تحریک ریشمی رومال، شیخ الہند مولانا محمود حسن مجاہد جلیل مولانا عبید اللہ سندھی، بطل حریت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی، مفتیٔ اعظم مولانا کفایت اللہ دہلوی، مولانا عزیر گل، مولانا حکیم نصرت حسین، مولانا منصور انصاری، مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی وغیرہ ایسے ایسے جانباز مجاہدین تیار ہو کر نکلے جن کے مجاہدانہ کارناموں نے سرفروشی وجانبازی کی تاریخ میں ایک جدید باب کا اضافہ کر دیا، اپنی وفاداریوں کے مرکز، انگریزی سامراج کے محکمہ خفیہ کی رپورٹ کے یہ جملے ملاحظہ کیجئے اس سے کچھ اندازہ ہو جائے گا کہ دار العلوم دیوبند کی آغوش تربیت میں سنور کر عزیمت واستقامت کے کیسے کیسے پیکر نکلے۔

> ''۱۹۱۵÷ میں مولانا محمود الحسن صدر مدرس تھے جو ریشمی خطوط کے مکتوب الیہ ہیں ستمبر ۱۹۱۵÷ میں وہ ہجرت کر کے حجاز چلے گئے تھے، ریشمی خطوط کی سازش میں جو مولوی شامل ہیں تقریباً وہ سب اس مدرسہ کے فارغ التحصیل ہیں۔'' (تحریک شیخ الہند، کون کیا تھا، ص ۵۳)

علمائے دیوبند کو قید و بند سے فرار کا طعنہ اپنے بغض وعناد کا اظہار یا جہالت کا اقرار ہے کون نہیں جانتا کہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی، حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن، حضرت مولانا خلیل احمد، صاحبِ بذل المجہود، حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی، مولانا حکیم نصرت حسین، مولانا عزیر گل، مولانا مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد علی لاہوری، مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، مولانا سید محمد میاں دیوبندی وغیرہ سیکڑوں علمائے دیوبند نے استخلاص وطن کی جدوجہد میں مردانہ وار اس سنتِ یوسفی کو ادا کیا ہے، رہا مالی تعاون، وظیفہ خوری اور عشرت کدوں کے سر دپڑ جانے کا طنز، تو یہ ایک خالص طنز ہی ہے جس کا بزعم خود اہل حدیث صاحب اپنی حیات کی آخری شام تک ایک ثبوت بھی فراہم نہیں کر سکتے، دراصل وہ ان خود ساختہ الزامات کے چھینٹوں سے اپنی جماعت اور اپنے علمائے نامدار کے دامن سے حریت دشمنی اور انگریز دوستی کے سیاہ حسّت آمیز داغوں کو ہلکا کرنا چاہتے ہیں، لیکن ان کی یہ سینہ کاوی خود ان کے لئے مہلک ہے کیونکہ یہ داغ تو جماعت اہل حدیث کی پیشانی کا جھومر

اور گلے کا ہار ہے جس کے زائل ہو جانے کے بعد اس کے پاس بچے گا ہی کیا۔

آں موصوف علمائے دیوبند کی انگریز نوازی کا ایک ثبوت بزعم خویش یہ پیش کر رہے ہیں۔

(۱۳) اور اسی پر بس نہیں! بلکہ ۱۹۲۷÷ میں جمعیۃ علمائے ہند کا ایک اجلاس پشاور میں ہوا جس کی صدارت شیخ الہند مولانا فخر الحسن (حسد و عناد کی شدت نے موصوف کو اس درجہ حواس باختہ کر دیا ہے کہ وہ حضرت شیخ الہند کا صحیح نام بھی تحریر کرنے سے عاجز ہیں) کے تلمیذ خاص مولانا انور شاہ کشمیری نے فرمائی اور خطبۂ صدارت بزبان فارسی پڑھا در ملک ما اگر دارامان است و ما سکونت اندراں داریم باید کہ احکام ایں دار از کتب مذہب تلاش کنیم.. البتہ جملۂ چند معاہدہ نبی کریمؐ با یہود مدینہ در ابتداء ہجرت از سیرت ابن ہشام نقل می کنم الخ شاہ صاحب ۱۹۲۷÷ میں بھی ہندوستان کو دارالعہد مانتے ہیں اس وجہ سے پشاور کے اجلاس میں حکومت سے محکمۂ قضا کے قیام کا مطالبہ کیا گیا اور جو تجویز منظور ہوئی تھی اس میں محکمۂ قضا سے متعلق یہ الفاظ بھی تھے ”جو بحسب معاہدہ حکومت ہمارا شرعی حق ہے۔“

(جریدہ ترجمان ۱۱/۹/۹۱÷ ص ۶ کالم ۳)

ہمیں اجلاس پشاور ۱۹۲۷÷ کے خطبۂ صدارت کا فارسی ایڈیشن نہیں مل سکا، البتہ اس وقت ہمارے پیش نظر اس خطبہ کا اردو ایڈیشن ہے جس میں مسئلہ زیر گفتگو کے بارے میں یہ تفصیل ہے۔

ہندوستان کی موجودہ حالت کو دیکھنا ہے کہ وہ دارالاسلام یا دارالامان ہے یا دارالحرب، جہاں تک غور و فکر اور اصول شرعیہ کا تعلق ہے زیادہ سے زیادہ اس کو دارالامان کا حکم دیا جا سکتا ہے، دارالاسلام کے احکام جاری ہونے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی، ہمارے شیخ المشائخ حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز قدس سرہٗ محدث دہلوی نے تصریح فرما دی ہے کہ ہندوستان ہرگز ہرگز دارالاسلام نہیں ہے، حضرت شاہ صاحب کا یہ خیال اور یہ فتویٰ اس وقت کا ہے جب کہ موجودہ زمانہ کے لحاظ سے ہندوستان میں اسلامیت کا رنگ بہت زیادہ گہرا تھا اور شعائر اسلامیہ کا اہتمام اور وقعت بہت اچھی حالت میں تھی، تو آج اس کا

دارالاسلام نہ ہونا اس سے زیادہ واضح اور روشن ہونا چاہئے...

ہندوستان کے دارالاسلام نہ ہونے کی حالت میں ہمارا فرض ہے کہ ہم دارالامان کے احکام کتب مذہب میں تلاش کریں اور ان احکام کی روشنی میں ہندوستانی مسلمانوں کی رہنمائی کا فرض انجام دیں الخ (خطبۂ صدارت مولانا انور شاہ کشمیری اجلاس پشاور دسمبر ۱۹۲۷÷ ص ۲۳-۲۲)

ناظرین کرام! خطبۂ صدارت کے اس اقتباس کو بنظر عمیق پڑھ کر فیصلہ فرمائیں کہ اس میں وہ کون سا جملہ ہے جس سے انگریزوں کی وفاداری کا ثبوت فراہم ہوتا ہے، حضرت شاہ صاحب بار بار لکھ رہے ہیں کہ بحالت موجودہ ہندوستان دارالاسلام نہیں ہے، البتہ وہ اپنی علمی تحقیق کی بنیاد پر یہ فرما رہے ہیں کہ ''زیادہ سے زیادہ اس کو دارالامان کا حکم دیا جاسکتا ہے'' ان کی اس علمی تحقیق سے اختلاف کیا جاسکتا ہے، لیکن اس جملے سے انگریزوں کی وفاداری کا معنی کشید کرنا کھلی تحریف و تزویر ہے جو ہمارے اہل حدیث صاحب ہی کو زیب دیتی ہے، ارباب علم و دیانت تو اس طرح کی تحریفات سے اپنی علمی ثقاہت کو مجروح نہیں کرتے، موصوف نے حکومت سے محکمۂ قضا کے قیام کے مطالبہ کو انگریز نوازی کے ثبوت میں پیش کیا ہے، کیا کسی حکومت سے اپنے قومی ملّی و شرعی حقوق کا مطالبہ اس حکومت سے وفاداری کی دلیل ہے؟ نہ جانے یہ استدلال کی کون سی قسم ہے، آنجناب ہی بتا سکتے ہیں۔

(۱۴) اسی ضمن میں آگے لکھتے ہیں ''تحریک شیخ الہند'' کے مصنف مولانا محمد میاں صاحب سی آئی ڈی کی رپورٹ نقل کرتے ہیں۔

> ''سب سے گراں قدر فتویٰ وہ ہے جو ۱۸۹۸÷ میں مرحوم رشید احمد گنگوہی نے جاری کیا تھا، کیونکہ اس پر دوسرے علماء کے علاوہ مولانا محمود الحسن کے بھی دستخط تھے، کہ مسلمان مذہبی طور پر پابند ہیں کہ حکومت برطانیہ کے وفادار رہیں خواہ آخر الذکر سلطان ترکی سے ہی برسر جنگ کیوں نہ ہوں۔
>
> (ص ۳۰۵) (ترجمان ۱۱/۹/۹۱ کالم ۳ ص ۶)

آں موصوف نے اپنی سابقہ عادت کے مطابق اس موقع پر بھی حوالہ میں صفحات

کے نمبر غلط لکھے ہیں، تحریک شیخ الہند کے صفحہ ۱۱۴/ ۲۲۶ پر یہ عبارت ہے۔ جو استغاثہ ملک معظم شہنشاہ ہند بنام عبیداللہ وغیرہ کے پیرا (۸۱) کے تحت درج کی گئی ہے۔ استغاثہ میں مدعا علیہم مولانا عبیداللہ وغیرہ ۵۹ حضرات کو ملکی قانون کے لحاظ سے مجرم و مستحق سزا ثابت کرنے کے بعد مذہبی پہلو سے بھی ان حضرات کو مورد الزام بنانے کے لئے پولیس نے ایک فرضی فتویٰ کو حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کی جانب منسوب کرتے ہوئے لکھا ہے ''شاید اس سلسلہ میں سب سے گراں قدر فیصلہ وہ فتویٰ ہے جو ۱۸۹۸÷ میں مرحوم مولانا رشید احمد گنگوہی نے جاری کیا تھا... ترکی کے موجودہ جنگ میں شامل ہونے سے کچھ دن پہلے ہی یہ فتویٰ البشیر میں شائع ہوا ہے، اس فتویٰ پر یقین کرتے ہوئے... استغاثہ یہ کہہ سکتا ہے کہ جہاد اور جہاد کے لئے اشتعال دلانا فرض ہونا تو کجا جائز بھی نہیں بلکہ فی الحقیقت حرام ہے۔ (تحریک شیخ الہند ص ۱۱۴/ ۲۲۶)

استغاثہ کی اس عبارت پر تحریک شیخ الہند کے مرتب مولانا سید محمد میاں دیوبندیؒ نے یہ حاشیہ تحریر کیا ہے۔

> ''تعجب ہے علماء دیوبند یعنی حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ سے تعلق رکھنے والی جماعت کو اس فتویٰ کا علم نہیں، اور سی آئی ڈی کو یہ فتویٰ یاد رہ گیا، مزید تعجب یہ کہ خود مولانا محمود الحسن صاحب کو (جنھوں نے بقول سی آئی ڈی اس پر دستخط کئے تھے) یہ فتویٰ یاد نہیں رہا، اور البشیر جس میں یہ فتویٰ طبع ہوا تھا اس کے متعلق بھی یہ نہیں بتایا گیا کہ یہ اخبار کہاں سے شائع ہوتا تھا اور تاریخ اشاعت کیا تھی، مفصل تردید ہم مقدمہ میں کر چکے ہیں۔'' محمد میاں۔

حیرت ہے کہ صدیقی صاحب کو سی آئی ڈی کی یہ گری پڑی بات اور اس کا خود ساختہ مفروضہ فتویٰ تو تحریک شیخ الہند میں نظر آ گیا، مگر اسی صفحہ کے حاشیہ پر مرتب کتاب کا یہ نقد و تبصرہ نظر نہیں آیا، یا موصوف اسے ہضم کر گئے کیونکہ اس سے تو مدعا کی عمارت ہی زمیں بوس ہو جاتی ہے۔

مولانا محمد میاں صاحب رحمہ اللہ نے تحریک شیخ الہند کے اپنے طویل مقدمہ میں صفحہ

۱۰۵ پر ”چند مغالطے“ کے عنوان کے تحت بھی سی آئی ڈی کے اس خانہ ساز فتویٰ پر ان الفاظ میں نقد فرمایا ہے۔

اس فتوی کے مستفتی کون تھے؟ سوال کے الفاظ کیا تھے؟ کیا ۱۸۹۸÷ میں انگریزوں کی ترکوں سے جنگ ہو رہی تھی؟ ان سوالات میں سے کسی پر روشنی نہیں ڈالی گئی، حوالہ یہ دیا گیا ہے ”ترکی کے موجودہ جنگ میں شامل ہونے سے پہلے یہ فتویٰ البشیر میں طبع ہوا ہے۔“ البشیر اخبار ہے یا رسالہ، کہاں سے شائع ہوتا ہے، ترکی کے موجودہ جنگ میں شامل ہونے سے کچھ دن پہلے، تاریخ ندارد، مہینہ کا نام بھی نہیں۔

ترکی اس جنگ میں نومبر ۱۹۱۴÷ میں شامل ہوا، خلاصہ یہ کہ ۱۶؍سال تک یہ فتویٰ سربستہ راز رہا، حضرت گنگوہی کے سینکڑوں شاگرد اور ہزاروں مریدوں اور لاکھوں متوسلین میں سے کسی کو بھی اس کا علم نہیں ہوا... حتی کہ اگست ۱۹۰۵÷ میں حضرت گنگوہیؒ کی وفات بھی ہوگئی، سولہ سال بعد جب کہ حضرت گنگوہیؒ کی وفات کو بھی نو سال ہو گئے تھے یکا یک طلسمی قوت سے البشیر کے نامعلوم ایڈیٹر صاحب کے پاس پہنچ گیا... سی آئی ڈی کی اس مسل میں بہت سی تحریروں کے فوٹو شامل ہیں، مگر یہ فتویٰ ایسا ہے کہ اس کا فوٹو تو کیا تاریخ اشاعت بھی درج نہیں، بہرحال یہ محض افترا اور اپنے آپ کو حق بجانب ثابت کرنے کیلئے وہ جعل اور وہ چال ہے جس کے لئے ہندوستانی پولس بدنام ہے۔

جہاں تک حضرت شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن رحمہ اللہ کا تعلق ہے تو اس الزام کی حقیقت یہ ہے ”دروغ گویم بروئے تو“ باقی حضرت گنگوہیؒ کے متعلق اس فتویٰ کا امکان اس وقت ختم ہو گیا تھا جب آپ نے مولانا سعد الدین صاحب کشمیری اور مولانا امان اللہ صاحب کشمیری کے استفتاء کے جواب میں مبسوط اور مدلل فتویٰ صادر فرمایا تھا، جس میں سات صفحات کی مفصل اور مدلل تحریر کے بعد بطور نتیجہ فرماتے ہیں۔

> ”اکنوں حال ہندرا خود غور فرمایند کہ اجراء احکام کفار نصاری دریں جا بچہ قوت وغلبہ است اگر ادنی کلکٹر حکم کرد کہ در مساجد جماعت ادا نکنید ہیچ کس از امیر وغریب قدرت نہ دارد کہ اداءآں کند۔“

اب ہندوستان کی حالت پر آپ خود غور فرمائیے کہ اس جگہ کفار ونصاری کے احکام کا اجراء اس قوت اور غلبہ کے ساتھ ہے کہ اگر ایک ادنیٰ کلکٹر حکم کر دے کہ مسجدوں میں جماعت سے ادا نہ کریں تو کسی بھی امیر وغریب کی مجال نہیں کہ مسجدوں میں جماعت ادا کر سکے۔

چند سطروں کے بعد تحریر فرماتے ہیں۔

''بہر حال تسلّطِ کفار (نصاریٰ) بر ہند بداں درجہ است کہ در ہیچ وقت تسلط کفار بدار الحرب زیادہ ازیں نبود و اداء مراسم اسلام از مسلمانان محض باجازت ایشاں است از مسلماناں عاجز در رعایا کسے نیست ہنود را ہم رسوخ است مسلماناں را نیست۔''

بہر حال کفار نصاریٰ کا تسلط ہندوستان میں اس درجہ ہے کہ کسی وقت کسی کافر کا کسی دار الحرب پر اس سے زیادہ غلبہ نہیں ہوا اور جو اسلامی رسومات اور شعائر مسلمان یہاں ادا کرتے ہیں وہ صرف ان کی اجازت سے، کوئی رعایا مسلمانوں سے زیادہ عاجز نہیں ہنود کو بھی رسوخ حاصل ہے، مسلمانوں کو وہ بھی نہیں۔ (مقدمہ تحریک شیخ الہند از ص ۱۰۵ تا ۱۰۷)

اس تفصیل کے بعد آں موصوف کے ثبوت کی کیا حیثیت باقی رہ جاتی ہے اس کے بیان کی ضرورت نہیں ''عیاں را چہ بیان'' البتہ علمائے دیوبند پر اس غلط الزام کو چسپاں کرنے کے بجائے آں موصوف اپنے مجدد اعظم عالیجاہ نواب صدیق حسن خاں صاحب کی درج ذیل تحریروں کو ملاحظہ فرمالیں تو صحیح صورت حال ان پر منکشف ہو جائے گی۔

نواب صاحب اپنی مشہور تصنیف ترجمان وہابیہ کے صفحہ ۲۹ پر رقم طراز ہیں:

''اور حاکموں کی اطاعت اور رئیسوں کا انقیاد ان کی ملت میں سب واجبوں سے بڑا واجب ہے''

یعنی دین اسلام اور مسلمانوں کی عظیم ترین دشمن برطانوی حکومت کی اطاعت گویا امام السنۃ ومجدد اعظم کے نزدیک توحید ورسالت کے اقرار، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ

فرائض سے بھی بڑا فرض ہے۔

اسی کتاب مستطاب کے صفحہ ۴۸ پر بڑی صراحت کے ساتھ لکھتے ہیں۔

> اور کسی شخص کو حیثیت موجودہ پر ہندوستان کے دارالاسلام ہونے میں شک نہیں کرنا چاہئے“

اسی کے ساتھ اپنی جماعت کے محسن اعظم مولانا ابوسعید محمد حسین بٹالوی لاہوری (جن کی سعی مشکور کی بدولت بارگاہِ افرنگ سے ”اہل حدیث“ کا نام آپ کی جماعت کو عنایت ہوا ہے) کا یہ فتویٰ بھی بغور پڑھ لیجئے، مرحوم اپنی مشہور زمانہ کتاب الاقتصاد فی مسائل الجہاد میں رقم طراز ہیں۔

> جس شہر یا ملک میں مسلمانوں کو مذہبی فرائض ادا کرنے کی آزادی حاصل ہو وہ شہر یا ملک دارالحرب نہیں کہلاتا، پھر اگر وہ دراصل مسلمانوں کا ملک یا شہر ہوا قوام غیر نے اس پر تغلب سے تسلّط پالیا ہو جیسے کہ ملک ہندستان ہے تو جب تک اس میں ادائے شعائر اسلام کی آزادی رہے وہ بحکم حالتِ قدیم دارالاسلام کہلاتا ہے، اور اگر قدیم سے اقوام غیر کے قبضہ وتسلّط میں ہو مسلمانوں کو ان ہی کی طرف سے ادائے شعائر مذہبی کی آزادی ملی ہو تو وہ بھی دارالاسلام اور کم سے کم دارالسلم والامان کے نام سے موسوم ہونے کا مستحق ہے، ان دونوں حالتوں اور ناموں کے وقت اس شہر یا ملک پر مسلمانوں کو چڑھائی کرنا اور اس کو جہاد مذہبی سمجھنا جائز نہیں۔ (ص ۱۹)

اسی کتاب میں آگے چل کر صفحہ ۲۵ پر مسئلہ سوم کے نتائج کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں۔

> ”اس مسئلہ اور اس کے دلائل سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ ملک ہندوستان باوجودیکہ عیسائی سلطنت کے قبضہ میں ہے ”دارالاسلام“ ہے اس پر کسی بادشاہ کو عرب کا ہو خواہ عجم کا مہدی سودان ہو یا حضرت سلطان شاہ ایران ہو خواہ امیر خراسان مذہبی لڑائی و چڑھائی کرنا جائز نہیں ہے۔“

ہم الزام ان کو دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا

(۱۵) اوپر مذکور اپنے مفروضہ دلائل کے بعد بطور نتیجہ کے یوں خامہ فرسائی کی ہے۔

"ان حالات کے پیش نظر دارالعلوم دیوبند، جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مرادآباد، مظاہر علوم سہارنپور اور دیگر چالیس اداروں نے متعلّمین کا ایسا ذہن بنایا اور اردگرد کے علاقوں میں روحانیت نے ایسا اثر دکھایا کہ ان علاقہ جات میں دور دور تک ایک بھی فرد واحد مجاہد کا نام تاریخ میں نہیں ہے۔ مولانا محمد میاں صاحب جن کی تاریخ پر گہری نظر ہے وہ خود حیران و پریشان اور انگشت بدنداں ہیں اور لکھنے پر مجبور ہیں۔

> "اس موقع پر تاریخ کے ایک طالب علم کی حیرانی ناقابل بیان ہو جاتی ہے جب وہ دیکھتا ہے کہ صفحات تاریخ پر مالاگڑھ اور فرخ نگر جیسے گمنام مقامات کے نام موجود ہیں لیکن اس علاقہ (تھانہ بھون، کیرانہ، کاندھلہ، شاملی، پھلت، کھتولی، جانسٹھ، جھنجھانہ، بڈھانہ، دیوبند، نانوتہ، گنگوہ، منگلور، رڑکی، انبیٹھہ، رائے پور، رام پور منہاران، نکڑ، (علمائے ہند کا شاندار ماضی ص ۲۲۷ خالد) اور اس کے مجاہدین کا کوئی تذکرہ نہیں، ذکاء اللہ صاحب نے اپنی مشہور کتاب "تاریخ عروج عہد انگلشیہ" کے تقریباً آٹھ سو صفحات ۱۸۵۷ء کی نذر کر دیئے ہیں، ان آٹھ سو صفحات میں سے کوئی ایک صفحہ تو درکنار ایک سطر بھی اس علاقہ کے مجاہدین کے حصہ میں نہ آسکی (علماء ہند کا شاندار ماضی ص ۲۵۰ ج ۲) مولانا محمد میاں صاحب نے مذکورہ واقعہ کو بیان کر کے نیچے طویل حاشیہ دے کر بہت باتیں بنانے کی کوشش کی ہے جس پر یہ مصرعہ صادق آتا ہے "کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے" اب اگر تاریخ داں مذکورہ حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے یہ کہے کہ برصغیر کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ علمائے دیوبند حکومت کے وظیفہ خوار تھے اور دارالعلوم دیوبند کو حکومت کی جانب سے امداد ملتی تھی، کیا یہ تجزیہ اور تبصرہ دارالعلوم دیوبند اور ارباب دارالعلوم کے سلسلے میں حقائق کی عکاسی نہیں کرتا؟

(جریدہ ترجمان ۱۱/۹ کالم ۴-۳ ص ٦)

آں موصوف اس طول طویل اقتباس کو پیش کر کے اپنے ناظرین کے ذہن میں یہ بات اتارنا چاہتے ہیں کہ دارالعلوم دیوبند اور اس کے منہاج پر قائم دینی تعلیم گاہوں نے برطانوی سامراج کی وفاداری کا درس اس قوت کے ساتھ دیا کہ ان اداروں کے زیر اثر مسلمانوں نے جنگ آزادی ۱۸۵۷÷ میں بالکل حصہ نہیں لیا۔

موصوف کو اپنے اس مفروضہ کو تاریخ کا جامہ پہنانے کیلئے دارالعلوم دیوبند ہی کے ایک سپوت یعنی مولانا سید محمد میاں دیوبندیؒ کی دریوزہ گری کرنی پڑی ہے، مگر بدقسمتی سے مانگے کا یہ لباس بھی ان کے اس خانہ ساز مفروضہ پر فٹ نہیں آرہا ہے۔

برصغیر کی علمی وثقافتی تاریخ کے ادنیٰ طالب علم کو بھی معلوم ہے کہ جنگ آزادی ۱۸۵۷÷ کے نو، دس سال بعد محرم ۱۲۸۳ھ (۱۸۶۷÷) میں دارالعلوم دیوبند کی تاسیس عمل میں آئی، اس کے چھ ماہ بعد مظاہر علوم سہارنپور قائم ہوا اور جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مرادآباد تو ان دونوں درسگاہوں کے گیارہ سال بعد ۱۸۷۵÷ میں منصۂ شہود پر آیا یعنی جنگ حریت ۵۷÷ کے بیس اکیس برس بعد اس کا اجراء ہوا، اب سوال یہ ہے کہ کیا یہ ادارے اپنے وجود میں آنے سے قبل ہی بحالت نیستی انگریز نوازی کے لئے اپنے معدوم وموہوم متعلّمین کی ذہن سازی کرتے رہے، جس کی بنا پر ان مقامات میں جہاں یہ ادارے ہیں ”دور دور تک ایک بھی فرد واحد مجاہد کا نام تاریخ میں نہیں ہے“؟ آں جناب کی اس تحقیق کو آخر کیا عنوان دیا جائے۔

ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیے
خامہ انگشت بدنداں ہے اسے کیا لکھیے

دارالعلوم دیوبند اور اس کے ہم فکر دینی اداروں کے متعلق ہمارے اہل حدیث صاحب کا یہ بے بنیاد وصریح غلط دعویٰ بعینہٖ یہود نصاریٰ کے اس دعوی کی طرح ہے کہ حضرت سیدنا ابراہیم ملت یہود (بزعم یہود) یا دینِ نصرانیت (بزعم نصاریٰ) کے پابند تھے جس کی تردید میں خدائے علیم وخبیر کا ارشاد ہے۔

يَاَهْلَ الْكِتَابَ لِمَ تُحَاجُّوْنَ فِىْٓ اِبْرَاهِيْمَ وَمَآ اُنْزِلَتِ التَّوْرَاةُ وَالْاِنْجِيْلُ اِلَّا

مِنۡ بَعۡدِہٖ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡن (آل عمران) اے اہل کتاب کیوں جھگڑتے ہو ابراہیمؑ کی بابت توریت وانجیل تو اتریں ان کے بعد کیا تم کو عقل نہیں ہے۔

یہودی ونصاریٰ میں سے ہر ایک فرقہ دعویٰ کرتا تھا کہ ابراہیمؑ ہمارے دین پر تھے یعنی معاذ اللہ یہودی تھے یا نصرانی، اس کا جواب دیا کہ تورات وانجیل جن کے پیرو یہود ونصاریٰ کہلائے ابراہیمؑ سے سینکڑوں برس بعد اتریں پھر ابراہیمؑ کو یہودی یا نصرانی کیسے کہہ سکتے ہیں۔

اہل حدیث واہل کتاب کے دعووں کی یہ یکسانیت بڑی معنی خیز ہے، جس پر مقالہ نگار کو بطور خاص غور وفکر کرنا چاہئے۔

آں موصوف نے ایک نا کردہ گناہ کو خواہ مخواہ دارالعلوم دیوبند کے سر منڈھنے کے لئے علماء ہند کا شاندار ماضی جلد چہارم کی ایک طویل عبارت سے چند جملوں کو ان کے سیاق وسباق سے الگ کر کے اور صاحبِ کلام کے مدعا اور کلام کے معنی مقصود کو یکسر نظر انداز کر کے مغالطہ انگیزی اور تلبیس وتزویر کا جو نمونہ پیش کیا ہے واقعہ یہ ہے کہ اہل بدعت کے یہاں بھی اس طرح کے نمونے کمتر ہی ملیں گے۔

مولانا محمد میاں صاحب مرحوم نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف علماء ہند کا شاندار ماضی جلد چہارم کے صفحہ ۲۴۳ پر عنوان قائم کیا ہے۔

مضافاتِ دہلی

"ضلع میرٹھ، مظفر نگر، سہارنپور، بلند شہر، علی گڈھ اور روہیل کھنڈ"

اس عنوان کے تحت مذکورہ اضلاع اور ان کے متعلقہ قصبات وقریات کے ان مجاہدین کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے جنھوں نے جنگ آزادی ۱۸۵۷÷ میں براہ راست حصہ لیا ہے اور سرفروشانہ خدمات انجام دی ہیں اور انھیں عاشقان پاک طینت کے ذکر جمیل اور حکایات لذیذ میں اس حصہ کے دوسو انہتر صفحے وقف کر دیئے ہیں چنانچہ صفحہ ۲۵۶ پر واقعات تھانہ بھون وشاملی کے عنوان کے ذیل میں جنگ شاملی اور اس کے شرکاء حضرت حاجی

صاحب، حضرت نانوتوی، حضرت گنگوہی، حضرت حافظ ضامن شہید، حضرت مولانا مظہر نانوتوی، مولانا محمد منیر صاحب نانوتوی، مولانا رحمت اللہ کیرانوی وغیرہ کی مجاہدانہ سرگرمیوں کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے۔

رڑکی ضلع سہارنپور کے ذیلی عنوان کے تحت رڑکی، منگلور، رانی مجرا گاؤں، فتوا، اور محمود پور اور دیوبند کے درمیان انقلابی مجاہدین اور انگریزی افواج کی مقابلہ آرائی کی تفصیلات بیان کی ہیں۔ (علماء ہند کا شاندار ماضی ص ۳۱۳، ۳۱۵ ج ۴)

صفحہ ۳۱۵ پر علی گڈھ کا ذیلی عنوان ہے جس کے ضمن میں مولانا عبد الجلیل اور ان کے ستّر رفقاء کی جانبازیوں اور شہادت کا ذکر ہے۔

''بلند شہر کالے آم کا میدان جنگ عبد اللطیف خاں کا ایثار'' اس عنوان کے تحت انگریزوں اور آزادی کے متوالوں کی خوں ریز جنگ کی داستان زیب قرطاس ہے (۳۱۷ و ۳۱۸)

صفحہ ۳۲۵ سے ۳۶۶ تک روہیل کھنڈ، بریلی، بدایوں، مراد آباد، بجنور، شاہجہاں پور کے مجاہدین کی سرگذشت بیان کی گئی ہے جس میں حافظ الملک حافظ رحمت خان والیٔ روہیل کھنڈ کے پوتے نواب خان بہادر خاں شہید، جنرل بخت خاں، جنرل نیاز محمد خاں، محسن علی خاں، ڈاکٹر وزیر خاں مولوی فیض احمد بدایونی، پہلوان منگل خاں، رستم خاں، سردار خاں، محمد خاں، مان خان، چھادم خاں، دلاور خاں، واصل خاں، فوجدار خاں ساکنان قصبہ ککرالہ ضلع بدایوں، شیخ فصاحت اللہ، شیخ سلیم اللہ، شیخ آیت اللہ، برادران شیخ فضل احمد، مولوی رضی اللہ، مولوی تفضّل حسین، مولوی اشرف علی، مولوی ماجد علی، بدر الاسلام عباسی، سید محمد شاہ، منشی ذو الفقار الدین، شیخ مسیح الدین وغیرہ اہل بدایوں کی خدمات اور کارناموں کا ذکر ہے۔

صفحہ ۳۶۷ سے ۳۸۵ تک مراد آباد، امروہہ وغیرہ کے کشتگان حریت کی جاں بازیوں کا تذکرہ ہے۔

صفحہ ۳۸۵ سے ۴۰۶ تک بجنور کے حالات کیلئے مخصوص ہیں، جس میں فدائے قوم نواب محمود خاں کے مجاہدانہ کردار پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے، اس کے بعد شاہجہانپور

کے معرکوں کا ذکر ہے جو مولانا سید احمد شاہ کی زیر سرکردگی وہاں کے مجاہدین آزادی نے سرانجام دیئے، غرضیکہ شاندار ماضی کا یہ آخری حصہ صفحہ ۲۴۳ سے صفحہ ۵۱۲ یعنی آخر کتاب تک مضافات دہلی اور روہیل کھنڈ کے ان مجاہدین کے ذکر خیر پر مشتمل ہے جنھوں نے ۱۸۵۷÷ کی جنگ آزادی میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں، تاریخ کا ایک طالب علم جب ان اضلاع کے مجاہدین کی ان مجاہدانہ سرگرمیوں کو پڑھتا ہے تو اسے آں موصوف کے اس بیان پر سخت حیرت ہوتی ہے کہ دیوبند، نانوتہ، گنگوہ، تھانہ بھون وغیرہ کے مجاہدین کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا، اور وہ ان کے اس مغالطہ اور تجاہل پر تبصرہ علامہ اقبال کی زبان میں یوں کرتا ہے۔

جو آنکھ کہ ہے سرمۂ افرنگ سے روشن
پرکار وسخن ساز ہے نمناک نہیں ہے

☆ ☆ ☆

باب ﴿۲﴾

صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم کی منفردانہ عظمت شان

صحابۂ کرام قرآن وسنت کی نظر میں

الصحابۃ فی القرآن

صحابہ جس مقدس جماعت کا نام ہے وہ امت کے عام افراد کی طرح نہیں ہے بلکہ صحابہ رسول اللہ......اور امت کے درمیان ایک مقدس واسطہ ہونے کی حیثیت سے ایک خاص مقام ومرتبہ کے مالک ہیں اور عام امت سے امتیاز رکھتے ہیں انھیں یہ امتیاز اللہ اور اس کے رسول کی جانب سے عطا ہوا ہے، ذیل میں اس امتیاز وخصوصیت کی تھوڑی سی تفصیل پیش کی جارہی ہے۔

(۱) والسَّابقُونَ الاَوَّلُونَ مِن المُهَاجِرِينَ وَالاَنُصَارِ وَالَّذِين اتَّبَعُوهُم بِاِحُسَانٍ رَضِىَ اللّٰهُ عَنُهُم وَرَضُوا عَنهُ وَاَعَدَّ لَهُم جَنّٰتٍ تَجرِى تَحُتَهَا الاَنُهٰر خَالِدِينَ فِيهَا اَبَدًا ذٰلِكَ الفَوزُ العَظِيمُ.

> جو مہاجرین اور انصار (ایمان لانے میں سب سے) سابق اور مقدم ہیں (اور بقیہ امت میں) جتنے لوگ اخلاص کے ساتھ ان کے پیرو ہیں اللہ ان سب سے راضی ہوا اور وہ سب اللہ سے راضی ہوئے، اللہ نے ان سب کیلئے ایسے باغ مہیا کر رکھے ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے، یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔

اس آیت میں صحابہ کرام کے دو طبقے بیان کئے گئے۔ ایک سابقین اوّلین کا اور دوسرا بعد میں آنے والوں کا اور دونوں طبقوں کے متعلق یہ اعلان کر دیا گیا ہے کہ اللہ ان سے راضی اور وہ اللہ سے راضی ہیں اور ان کے لئے جنت کا مقام و دوام ہے، سابقین

اوّلین کون لوگ ہیں اس پر بحث کرتے ہوئے علامہ ابن تیمیہ لکھتے ہیں:

> ”ذهب جمهور العلماء الى ان السابقين فى قوله تعالىٰ والسابقون الاولون من المهاجرين والانصار هم هؤلاء الذين انفقوا من قبل الفتح وقاتلوا واهل بيعة الرضوان كلهم منهم وكانوا اكثر من الف واربعمائة وقد ذهب بعضهم الى ان السابقين الاولين هم من صلى الى القبلتين وهذا ضعيف“
>
> جمہور علماء کے نزدیک سابقین اولین میں وہ صحابہ کرام داخل ہیں جنھوں نے قبل الفتح اپنی جان و مال کے ذریعہ جہاد کیا اور اس صفت سے تمام اہل بیعت رضوان متصف ہیں جن کی تعداد چودہ سو سے اوپر تھی، بعض لوگوں کی رائے یہ ہے کہ سابقین اولین وہ لوگ ہیں جنھوں نے دونوں قبلہ کی جانب نماز ادا کی مگر یہ قول ضعیف ہے۔(۱)

اس تحقیق سے معلوم ہوا کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر بیعت جہاد کرنے والے تمام صحابہ سابقین اولین میں داخل ہیں اور صحیح بخاری میں حضرت جابر بن عبداللہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ...... نے فرمایا: ”لا يدخل النار احد ممن بايع تحت الشجرة“ جن لوگوں نے درخت کے نیچے بیعت کی ان میں سے کوئی بھی جہنم میں نہیں داخل ہوگا، اس آیت پاک سے صراحتاً ثابت ہوتا ہے کہ مہاجرین و انصار میں سے تمام سابقین اولین اور ان کے بعد صحابیت کا شرف حاصل کرنے والے تمام صحابہ کرام دوامی طور پر جنتی ہیں جن میں بلا ریب خلفائے اربعہ بھی داخل ہیں۔

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں ”جو شخص قرآن پر ایمان رکھتا ہے جب اس کے علم میں یہ بات آگئی کہ اللہ تعالیٰ نے بعض بندوں کو دوامی طور پر جنتی فرمایا ہے تو اب ان کے حق میں جتنے بھی اعتراضات ہیں سب ساقط ہوگئے کیونکہ اللہ تعالیٰ عالم الغیب ہے وہ خوب جانتا ہے فلاں بندہ سے فلاں وقت میں نیکی

---

(۱) منہاج السنۃ ج۱ ص:۱۵۴، مطبوعہ مکہ مکرمہ۔

اور فلاں وقت میں گناہ صادر ہوگا، اس کے باوجود جب باری تعالیٰ یہ اطلاع دیتا ہے کہ میں نے اسے جنتی بنادیا تو اسی کے ضمن میں اس بات کا اشارہ ہوگیا کہ اس کی تمام لغزشیں معاف کردی گئیں، لہٰذا اب کسی شخص کا ان مغفور بندوں کے حق میں لعن وطعن کرنا جناب باری تعالیٰ پر اعتراض کرنے کے مرادف ہوگا اس لئے کہ ان پر اعتراض کرنے والا گویا یہ کہہ رہا ہے کہ یہ بندہ گوگنہ گار ہے پھر اللہ تعالیٰ نے اسے کیسے جنتی بنادیا اور ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ پر اعتراض کفر ہے۔ (۱)

(۲) وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ وَكَرَّهَ اِلَيْكُم الكُفْرَ والفُسُوْقَ وَالعِصْيَانَ اُولٰٓئِكَ هُم الرَّاشِدُوْنَ فَضلاً مِنَ اللّٰهِ وَنِعْمَةً وَاللّٰهُ عَلِيمٌ حَكِمٌ.

لیکن اللہ نے ایمان کو تمہارے لئے محبوب بنادیا اور اس کو تمہارے دلوں میں مزین کردیا اور کفر، فسق اور نافرمانی کو تمہارے لئے ناپسند کردیا ایسے ہی لوگ اللہ کے فضل ونعمت سے ہدایت یافتہ ہیں اور اللہ خوب جاننے والا حکمت والا ہے۔

اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ بلا استثناء تمام صحابۂ کرامؓ کے دلوں میں ایمان کی محبت اور کفر وفسق ونافرمانی سے نفرت وکراہیت منجانب اللہ راسخ کردی گئی تھی اور لفظ الی سے مستفاد ہوتا ہے کہ یہ ایمان کی محبت اور کفر وغیرہ سے کراہیت انتہا درجے کو پہنچی ہوئی تھی کیونکہ ''الیٰ'' عربی میں انتہا اور غایت کا معنی بیان کرنے کے لئے وضع کیا گیا ہے، نیز اسی آیت پاک سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ حضرات صحابۂ کرام سے جو لغزشیں صادر ہوئی ہیں وہ ضعف ایمان اور فسق وعصیان کو مستحسن سمجھتے ہوئے صادر نہیں ہوئی ہیں بلکہ ان کا صدور بتقاضائے بشریت ہوا ہے، اس لئے ان زلّات اور لغزشوں کو بنیاد بنا کر ان کی شان میں لعن طعن کرنا اور ان کے بارے میں تنقید وتنقیص کا رویہ اختیار کرنا جہالت وزندقہ ہے۔

(۳) وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ آوَوا وَنَصَرُوا اُولٰٓئِكَ هُمُ المُؤمِنُونَ حَقًا لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيْمٌ.

---

(۱) فضائل صحابہ واہل بیت، ص ۲۰۶۔

اور جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا اور جن لوگوں نے انھیں جگہ دی اور ان کی مدد کی وہی ہیں سچے مسلمان، ان کے لئے مغفرت ہے اور باعزت رزق ہے۔

اسی سورہ کے شروع میں ارشاد خداوندی ہے۔

اَلَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ اولئك هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا لَهُمْ دَرَجَةٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَمَغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيْمٌ.

وہ لوگ جو نماز کو قائم رکھتے ہیں اور ہم نے ان کو جو روزی دے رکھی ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں وہی سچے مسلمان ہیں ان کے واسطے درجے ہیں ان کے رب کے پاس اور مغفرت اور عزت کی روزی۔

ان دونوں آیات سے معلوم ہوا ہے کہ حضرات مہاجرین وانصار کے اعمال ظاہرہ نماز روزہ، حج، زکوٰۃ، جہاد وغیرہ قطعی طور پر نفاق ومکر کی بناء پر نہیں تھے ان کا ایمان اللہ کے نزدیک متحقق وثابت تھا اس لئے حضرات صحابہ بالخصوص خلفائے ثلثہ کی جانب نفاق کی نسبت کرنا خدائے بزرگ وبرتر کے ساتھ معارضہ کرنا ہے۔

(۴) مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ اَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ تَرَاهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْاَهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا.

محمد اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کافروں پر سخت ہیں اور آپس میں مہربان ہیں (اے مخاطب) تو ان کو دیکھے گا کہ کبھی رکوع میں ہیں اور کبھی سجدے میں ڈھونڈتے ہیں اللہ کے فضل اور اس کی خوشی کو ان کی نشانی سجدوں کے اثر سے ان کے چہرے پر نمایاں ہے یہ مثال ہے ان کی تورات میں اور انجیل میں ان کی مثال ہے جیسے کھیتی نے نکالا اپنا پٹھا پھر اس

کی کمر مضبوط کی پھر موٹا ہوا پھر کھڑا ہو گیا اپنی جڑ پر بھلا لگتا ہے کھیتی والوں کو تا کہ جلائے اس سے جی کافروں کا وعدہ کیا ہے اللہ نے ان سے جو یقین لائے ہیں اور کیئے ہیں بھلے کام معافی کا اور بڑے ثواب کا۔

امام قرطبی اور عامۂ مفسّرین کہتے ہیں کہ "والذین معه" عام ہے اس میں تمام صحابۂ کرام داخل ہیں، اس آیت کریمہ میں تمام صحابہ کی عدالت، ان کی پاک باطنی اور مدح وثنا خود مالک کائنات نے فرمائی، ابوعروہ زبیری کہتے ہیں کہ ایک دن امام مالک کی مجلس میں ایک شخص کے متعلق یہ ذکر آیا کہ وہ صحابۂ کرام کو برا کہتا ہے، امام مالک نے یہ آیت "لیغیظ بهم الكفار" تک تلاوت کی اور پھر فرمایا کہ جس شخص کے دل میں اصحاب رسول میں سے کسی کے متعلق غیظ ہو وہ اس آیت کی زد میں ہے یعنی اس کا ایمان خطرہ میں ہے کیونکہ آیت میں کسی صحابی سے غیظ کفار کی علامت قرار دی گئی ہے۔

(۵) لِلۡفُقَرَاءِ الۡمُهَاجِرِيۡنَ الَّذِيۡنَ اُخۡرِجُوۡا مِن دِيَارِهِمۡ وَاَمۡوَالِهِمۡ يَبۡتَغُوۡنَ فَضۡلاً مِنَ اللّٰهِ وَرِضۡوَانًا وَيَنۡصُرُوۡنَ اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗ اُولٰئِكَ هُمُ الصَّادِقُوۡنَo وَالَّذِيۡنَ تَبَوَّءُ الدَّارَ وَالۡاِيۡمَانَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ يُحِبُّوۡنَ مَنۡ هَاجَرَ اِلَيۡهِمۡ وَلَايَجِدُوۡنَ فِىۡ صُدُوۡرِهِمۡ حَاجَةً مِمَّا اُوۡتُوۡا وَيُؤۡثِرُوۡنَ عَلٰى اَنۡفُسِهِمۡ وَلَوۡ كَانَ بِهِمۡ خَصَاصَةٌ وَمَن يُوقَ شُحَّ نَفۡسِهٖ فَاُولٰئِكَ هُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ وَالَّذِيۡنَ جَاؤُا مِنۡ بَعۡدِهِمۡ يَقُوۡلُوۡنَ رَبَّنَا اغۡفِرۡ لَنَا وَلِاِخۡوَانِنَا الَّذِيۡنَ سَبَقُوۡنَا بِالۡاِيۡمَانِ وَلَا تَجۡعَلۡ فِىۡ قُلُوۡبِنَا غِلًّا لِلَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا رَبَّنَا اِنَّكَ رؤُفٌ رَحِيۡمٌ.

(اور مال غنیمت حق) ان مفلس مہاجرین کا ہے جو جدا کر دیئے گئے ہیں اپنے گھروں سے اور اپنے مالوں سے وہ اللہ کے فضل اور رضامندی کے طالب ہیں اور وہ اللہ اور اس کے رسول (کے دین) کی مدد کرتے ہیں یہی لوگ (ایمان کے) سچے ہیں اور ان لوگوں کا (بھی حق ہے) جو دارالاسلام میں اور ایمان میں ان مہاجرین سے پہلے قرار پکڑے ہیں جو ان کے پاس ہجرت کر کے آتا ہے اس سے یہ لوگ محبت کرتے ہیں اور مہاجرین

کو جو کچھ ملتا ہے اس سے یہ انصار لوگ اپنے دلوں میں کوئی رشک نہیں پاتے اور (مہاجرین کو) اپنے سے مقدم رکھتے ہیں اگر چہ ان پر فاقہ ہی ہو اور واقعی جو شخص طبیعت کے بخل سے محفوظ رکھا جائے ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں (اور ان لوگوں کا بھی اس مالِ فئی میں حق ہے) جو دعا کرتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہم کو بخش دے اور ہمارے ان بھائیوں کو (بھی) جو ہم سے پہلے ایمان لا چکے ہیں اور ہمارے دلوں میں ایمان والوں کی طرف سے کینہ نہ آنے دیجئے، اے ہمارے رب آپ بڑے شفیق ورحیم ہیں۔

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے عہد رسالت کے تمام موجود اور آئندہ آنے والے مسلمانوں کو تین طبقوں میں تقسیم کر کے ہر طبقہ کا الگ الگ ذکر کیا ہے، پہلا مہاجرین کا طبقہ ہے جنھوں نے محض اللہ اور اس کے رسول کے لئے ہجرت کی کسی دنیوی غرض کے لئے ان کی ہجرت نہیں تھی، جیسا کہ خود باری تعالیٰ ان کی شان میں فرمارہے ہیں اولٰئك هم الصادقون. یعنی یہ حضرات اپنے قول ایمان اور فعل ہجرت میں سچے ہیں۔ دوسرا طبقہ حضرات انصار کا ہے جن کے صفات بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ یہ مہاجرین سے محبت رکھتے ہیں اور ان پر حسد نہیں کرتے ہیں، ان صفات کے ذکر کے بعد فرمایا ”فاولٰئك هم المفلحون“ یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں، تیسرا طبقہ ان مؤمنین کا ہے جو مہاجرین وانصار کے بعد قیامت تک آنے والا ہے۔ اس طبقے کے بارے میں فرمایا کہ یہ مہاجرین وانصار کے حق میں دعائے مغفرت کرتے ہیں اور اس بات کی بھی دعا کرتے ہیں کہ اے اللہ ہمارے دلوں میں ان کی طرف سے کینہ وعداوت نہ ڈالئے، یقیناً آپ مہربان اور رحمت کرنے والے ہیں، لہٰذا اپنے فضل و رحمت سے ہماری دعا قبول کر لیجئے، ان آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ فلاح پانے والے وہی لوگ ہیں جو حضرات مہاجرین سے محبت رکھتے ہیں اور ان کی شان میں طعن وتشنیع نہیں کرتے کیونکہ طعن وتشنیع تقاضائے محبت کے خلاف ہے، جس سے معلوم ہوا کہ خلفائے اربعہ جو مہاجرین اولین

میں یقینی طور پر شامل ہیں کی محبت فلاح کی ضامن اور ان سے بغض وعناد خسران کا سبب ہے، اسی طرح تیسری آیت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جولوگ حضرات صحابہ کے لئے دعائے خیر کرتے ہیں اور ان سے بغض وعناد کو برا سمجھتے ہوئے اس سے محفوظ رہنے کی بارگاہ خداوندی میں دعا کرتے ہیں، وہی زمرۂ مؤمنین میں داخل ہیں اس کے برعکس جو گروہ اس مقدّس جماعت سے محبت کے بجائے عداوت رکھتا ہے، اور ان کے حق میں دعائے خیر کے بجائے لعن وطعن کی زبان دراز کرتا ہے وہ اہل اسلام کے زمرے سے خارج ہے کیونکہ ان آیات میں مستحقین غنیمت کے جن تین طبقوں کا اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمایا یہ لعن وطعن کرنے والے، ان سے خارج ہیں۔

اس موقع پر بغرض اختصار ان پانچ آیات پر اکتفا کیا جارہا ہے ورنہ قرآن مجید میں حضرات صحابہ کے فضائل ومزایا سے متعلق سینکڑوں آیات ہیں۔

الصحابۃ فی الحدیث

آنحضرت ...... نے صحابۂ کرام بالخصوص حضرات خلفائے ثلثہ ابوبکر، عمر فاروق اور عثمان غنی رضی اللہ عنہم کے فضائل ومناقب اور مزایا وخصوصیات اس کثرت وشدّت اور تواتر وتسلسل کے ساتھ بیان فرمائے ہیں کہ ان سب کو جمع کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے اور نہ اس موقع پر اس کی ضرورت ہے، لہٰذا ان بے شمار احادیث میں سے چند کو یہاں نقل کیا جارہا ہے، اس سلسلہ میں پہلے ان احادیث کو پیش کیا جائے گا جن سے پوری جماعت صحابہ کی منقبت وفضیلت ثابت ہوتی ہے پھر خلفائے ثلثہ کے فضائل میں وارد احادیث ذکر کی جائیں گی۔

(۱) عن جابرؓ قال رسول اللہ ﷺ انّ اللّٰہ اختار اصحابی علی الثقلین سوی النبیین والمرسلین (رواہ البزار بسند رجالہ موثقون)

نبی کریم ...... نے فرمایا کہ حضرات انبیاء ومرسلین کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے میرے اصحاب کو تمام انسانوں وجناتوں پر فضیلت دی ہے۔

اس حدیث پاک سے معلوم ہوا کہ جمیع حضرات صحابہ اللہ تعالیٰ کے منتخب و برگزیدہ ہیں نبیوں اور رسولوں کے بعد انسانوں اور جناتوں میں سے کوئی بھی ان کے مقام و مرتبہ کو نہیں پا سکتا۔

(۲) عن انسؓ قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ و سلم اصحابی فی امتی کالملح فی الطعام لایصلح الطعام الا بالملح. (مشکوٰۃ شریف)

رسول اللہ...... نے فرمایا کہ میری امت میں میرے صحابہ کا مقام ایسا ہے
جیسے کھانے میں نمک، کہ کھانا بغیر نمک کے بہتر نہیں ہوتا۔

اس ارشاد عالیہ کے ذریعہ آنحضرت ...... نے امتِ مسلمہ کے سامنے صحابۂ کرام کی اہمیت ایک مثال کے ذریعہ سے واضح فرمائی ہے، کہ جس طرح لذیذ سے لذیذ تر کھانا بے نمک کے پھیکا اور بے مزہ ہوتا ہے، بعینہٖ یہی حال امت کا ہے کہ اس کی صلاح و فلاح اور اس کا تمام شرف و مجد انھیں صحابہ کی مقدس جماعت کا مرہون منت ہے، اگر اس جماعت کو درمیان سے الگ کر دیا جائے تو امت کے سارے محاسن و فضائل بے حیثیت ہو جائیں گے۔

(۳) قال النبی صلی اللّٰہ علیہ و سلم خیر الناس قرنی ثم الذین یلونھم ثم الذین یلونھم فلا ادری ذکر قرنین او ثلاثۃ. (بخاری و مسلم وغیرہ)

انسانوں میں سب سے بہتر میرا زمانہ ہے پھر ان کا جو اس سے متصل ہیں،
پھر ان کا جو اس سے متصل ہیں، راوی حدیث کہتے ہیں کہ مجھے یاد نہیں رہا
کہ متصل لوگوں کا ذکر دو مرتبہ فرمایا یا تین مرتبہ۔

اگر نبی علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے ”ثم الذین یلونھم“ کو صرف دو مرتبہ ذکر کیا ہے تو دوسرا قرن (زمانہ) صحابہ کا اور تیسرا تابعین کا ہے اور اگر اس جملہ کو تین بار فرمایا ہے تو چوتھا دور تبع تابعین کا بھی اس میں شامل ہوگا، بہرحال اس ارشاد نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے متعین طور پر معلوم ہوتا ہے کہ عہد نبوی ...... کے بعد سب سے بہتر زمانہ صحابۂ کرام کا ہے، اصابہ کے مقدمہ میں حافظ ابن حجر عسقلانیؒ لکھتے ہیں: ”وتواتر عنہ صلی اللّٰہ علیہ

وسلم خير الناس قرني ثم الذين يلونهم ثم الذين يلونهم الخ“ جس سے معلوم ہوگیا کہ محدثین کے نزدیک یہ حدیث متواتر ہے جس سے یقینی علم حاصل ہوتا ہے۔

ان تین حدیثوں کے بعد وہ احادیث نقل کی جا رہی ہیں جو خاص طور پر خلفاء ثلثہ کی فضیلت میں وارد ہوئی ہیں۔

(۱) حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت...... نے فرمایا:

ابوبكر وعمر سيدا كهول اهل الجنة من الاولين والآخرين الا النبيين والمرسلين (رواه احمد والترمذی)

> حضرت صدیق وفاروق نبیوں اور رسولوں کے علاوہ درمیانی عمر کے تمام اگلے وپچھلے جنتیوں کے سردار ہیں۔

اس حدیث پاک سے صاف طور پر ثابت ہوگیا کہ انبیاء کرام علیہم السلام کے بعد صدیق اکبر وفاروق اعظم تمام لوگوں سے افضل ہیں، یہی بات قرآن مجید اور دیگر احادیث نبویہ، آثار صحابہ وتابعین سے بھی ثابت ہے اور اسی پر اہل سنت والجماعت کا اجماع ہے، اسی بنا پر حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے تھے ”من فضلني على ابي بكر وعمر جلدته حدی المفتری“ جو مجھے ابوبکر وعمر پر ترجیح اور فضیلت دے گا میں اس پر افترا پردازی کی حد (سزا) جاری کروں گا۔ اسی معنی کی ایک اور روایت کتاب الآثار لامام ابی یوسف میں بھی ہے۔

(۲) ایک حدیث میں نبی کریم...... نے فرمایا:

اقتدوا من بعدی ابی بكر وعمر فانهما حبل الله ممدود و من تمسك بهما فقد تمسّك بالعروة الوثقٰى لا انفصام لها (رواه الطبرانی)

> میرے بعد ابوبکر وعمر کی اقتدا کرو کیونکہ یہ دونوں اللہ کی دراز شدہ رسی ہیں جس نے ان دونوں کو پکڑ لیا اس نے مضبوط حلقہ تھام لیا۔

حبل اللہ سے مراد دین الٰہی ہے، چنانچہ قرآن مجید میں ”واعتصموا بحبل الله جميعا“ میں اسی جانب اشارہ کیا گیا ہے، یعنی سب لوگ مل کر اللہ کے دین کو قوت اور

مضبوطی کے ساتھ پکڑلو، اور ”عروۃ الوثقیٰ“ سے بھی دین خداوندی ہی مراد ہے چنانچہ قرآن کا ارشاد ربانی ہے ”فقد استمسك بالعروة الوثقى“ اس نے مضبوط حلقہ یعنی دین اسلام کو تھام لیا، اس تفصیل و تحقیق سے معلوم ہوگیا کہ حضرات شیخین رضی اللہ عنہما کا طریقہ معیار دین ہے اور ان کے طریقے پر چلنا درحقیقت دین اسلام پر چلنا ہے۔

(۳) ایک موقع پر آنحضرت...... نے ارشاد فرمایا:

ان اللّٰہ جعل الحق علٰی لسان عمر وقلبه (رواه الترمذی واحمد)

لاریب کہ اللہ تعالیٰ نے حق کو عمر کے زبان اور دل پر رکھ دیا ہے۔

بعض روایتوں میں ”جعل“ کے بجائے ”وضع“ کا لفظ ہے، امام ترمذیؒ نے یہ روایت حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے نقل کی ہے اور امام داؤد اور امام حاکمؒ نے حضرت ابوذر غفاریؓ سے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ”کنا لا نبعد ان السکینة علی لسان عمر“ ہم صحابہ اس بات کو بعید نہیں سمجھتے تھے کہ عمر رضی اللہ عنہ کی زبان لسان الغیب کی ترجمان ہے، چنانچہ ۲۶؍ احکام شریعہ کا آپ کے قول کے مطابق نازل ہونا اس حدیث کی صداقت پر خدائی شہادت ہے۔

(۴) لکلِّ نبی رفیق ورفیقی فیها عثمان (رواه الترمذی)

ہر نبی کیلئے جنت میں ایک ساتھی ہے اور میرے جنت کے رفیق عثمان ہیں۔

اس حدیث سے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا نہ صرف جنتی ہونا ثابت ہوتا ہے بلکہ ان کی بلندی درجات پر بھی یہ حدیث دلالت کررہی ہے۔

(۵) امام احمد اپنی مسند میں روایت کرتے ہیں کہ غزوۂ تبوک کے موقع پر جب آنحضرت...... نے لشکر کی تیاری اور سامان جنگ کی فراہمی کا کام شروع فرمایا تو حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ ایک ہزار اشرفی لے کر خدمت نبوی میں حاضر ہوئے اور آپ کی گود میں ڈال دیا، راویٔ حدیث بیان کرتے ہیں کہ میں نے اس وقت دیکھا کہ آنحضرت...... (فرطِ مسرت سے ان اشرفیوں کو الٹ پلٹ رہے تھے، اور زبان وحی ترجمان پر یہ الفاظ جاری تھے ”مَا ضر عثمان ما عمل بعد الیوم مرتین“ عثمان آج کے بعد جو کام بھی

کریں گے وہ ان کے لئے مضرت رساں نہیں ہوگا، آپ ...... نے اس جملہ کو بطور تاکید دو مرتبہ فرمایا۔

اس حدیث پاک میں حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے صدقہ کی قبولیت کی بشارت کے ساتھ ان مخالفین اور ناقدین کے خیالات کی تردید بھی فرمادی گئی ہے جو مفسدین کی افتراپردازیوں سے متاثر ہوکر یا اپنی کجروی کے زیر اثر حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ عنہ کی شان میں طعن وتشنیع کرتے ہیں، جس کا حاصل یہ ہے کہ حضرت ذی النورین رضی اللہ عنہ ان تمام اتہامات سے پاک اور بری ہیں جو معاندین ان پر ناحق تھوپ رہے ہیں لیکن بالفرض یہ باتیں اگر کسی حدتک ثابت بھی ہوجائیں تو آپ کی عظمت شان اور کثرتِ طاعات کی بنا پر کچھ نقصان نہیں پہنچاسکیں گی۔

اللہ اور رسول کے ان فرمودات میں صحابۂ کرام کے ایمان واخلاص اور فضائل و مناقب کی جو تصویر پیش کی گئی ہے اسے سامنے رکھتے ہوئے ان قدسی صفات جماعت کے مقام ومرتبہ کا اندازہ لگائیے، ذلك فضل اللّٰه يوتيه من يشاء.

صحابہ کی تنقیص علمائے امت کی نظر میں

آیت کریمہ ”محمد رسول اللّٰه والذين معه“ الخ کی تفسیر کے ذیل میں معلوم ہوچکا ہے کہ امام مالکؒ نے ”ليغيظ بهم الكفار“ کے پیش نظر فرمایا کہ حضرات صحابہ سے بغض رکھنے والے اس آیت کی زد میں ہیں، یعنی کافر ہیں۔ اب ذیل میں چند اور علمائے محققین کے اقوال ملاحظہ کیجئے۔

(۱) امام ابوزُرعہ رازی متوفی ۲۶۴ھ کا فیصلہ:

اذا رأيت الرجل ينتقص احدا من اصحاب رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم فاعلم انّه زنديق، لان الرسول صلى اللّٰه عليه وسلم عندنا حق، والقرآن حق، وانّما ادّىٰ الينا هذا القرآن والسنن اصحاب رسول اللّٰه وانما يريدون ان يجرحوا شهودنا ليبطلوا الكتاب والسنة، والجرح بهم اولىٰ وهم زنادقة.

(جب تم کسی کو دیکھو کہ وہ صحابۂ کرام میں سے کسی کی تنقیص کررہا ہے تو سمجھ لو کہ یہ زندیق ہے، اس لئے کہ ہمارے نزدیک رسول اللہ...... برحق ہیں، قرآن برحق ہے اور قرآن وسنت کو ہم تک پہنچانے والے یہی صحابہ ہیں، تو یہ لوگ ہمارے شاہدوں کو مجروح کرنا چاہتے ہیں تاکہ قرآن وسنت کو باطل ٹھہرادیں۔ لہٰذا خود انھیں مجروح قرار دینا اولیٰ ہے۔ (ایسا کرنے والے) زندیق ہیں)۔

(۲) اصطخری بیان کرتے ہیں کہ مجھے مخاطب کرتے ہوئے امام احمد بن حنبلؒ نے فرمایا:

يا ابا الحسن اذا رأيت احدا يذكر اصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم بسوء فاتهمه على الاسلام. (١)

(اے ابوالحسن جب تم کسی کو دیکھو کہ وہ صحابہ کا ذکر برائی سے کرتا ہے تو اس کے اسلام کو مشکوک سمجھو)۔

(۳) عمدۃ المفسرین محقق ابن کثیر لکھتے ہیں:

ياويل من ابغضهم او سبّهم او سبّ بعضهم ... فاين هؤلاء من الايمان بالقرآن اذا سبّوا من رضى الله عنهم. (٢)

(عذاب الیم ہے ان لوگوں کیلئے جو حضرات صحابہ سے یا ان میں بعض سے بغض رکھے یا انھیں برا بھلا کہے ایسے لوگوں کا ایمان بالقرآن سے کیا واسطہ جو ان حضرات کو برا کہتے ہیں جن سے اللہ نے راضی ہونے کا اعلان کردیا)۔

(۴) علامہ ابن تیمیہ اپنی مشہور تصنیف الصارم المسلول میں لکھتے ہیں:

وقال القاضى ابويعلى الذى عليه الفقهاء فى سبّ الصحابة ان كان مستحلا لذٰلك كفر وان لم يكن مستحلا فسق. (٣)

(قاضی ابویعلی نے کہا ہے کہ اس پر تمام فقہاء متفق ہیں کہ جو شخص صحابہ کی برائی کو حلال وجائز سمجھتے ہوئے ان کی برائی کرے وہ کافر ہے اور جو حلال نہ سمجھتے ہوئے انھیں برا بھلا کہے وہ فاسق ہے)۔

---

(۱) مقام صحابہ، ص (۲) مقام صحابہ، ص۴۳۔ (۳) الصارم المسلول، ص۵۷۵۔

(۵) علامہ ابن ہمام حنفی لکھتے ہیں:

ان من فضل علیا علی الثلاثة فمبتدع وان انکر خلافة الصدیق او عمر رضی اللّٰہ عنہما فھو کافر.(۱)

(جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو خلفائے ثلثہ (صدیق اکبرؓ، فاروق اعظمؓ اور عثمان غنیؓ) پر فضیلت دے وہ بدعتی ہے اور جو شخص حضرت ابوبکر یا حضرت عمر کی خلافت کا انکار کرے وہ کافر ہے)۔

(۶) فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

الرافضی اذا کان یسبّ الشیخین ویلعنھما العیاذ باللہ فھو کافر وان کان یفضل علیا کرم اللّٰہ وجھه علی ابی بکر رضی اللّٰہ عنه لایکون کافرا الا انه مبتدع.

(رافضی جب شیخین کو برا بھلا اور لعن طعن کرتا ہو تو کافر ہے اور اگر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو حضرت ابوبکر پر فضیلت دیتا ہے تو کافر نہیں ہوگا ہاں اس صورت میں وہ بدعتی قرار پائے گا)۔

ایک اہم ترین نکتہ

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی قدس سرہ نے تنقیص صحابہ کے متعلق ایک نہایت قیمتی اور قابل قدر نکتہ تحریر فرمایا جو قول فیصل کی حیثیت رکھتا ہے اس لئے اسی نکتہ پر یہ بحث ختم کی جاتی ہے، لکھتے ہیں۔

> دریں جا دقیقہ باید دانست کہ سبّ وطعن انبیا ازیں جہت کفر وحرام ست کہ وجہ سبّ یعنی معاصی وکفر دریں بزرگاں یافتہ نمی شود، وموجبات تعظیم وتوقیر وثناءِ حسن بوفور موجود دارند وچوں جماعہ باشند از مؤمنین کہ اسباب تعظیم داشتہ باشند وگناہان ایشاں را مغفرت وتکفیر بنص قرآن ثابت شدہ باشد

---

(۱) فتح القدیر، ج۱ص۳۰۴۔

بالیقین ایں ہم در حکم انبیاء خواہند بود در حرمت سبّ وتحقیر واہانت و بد گفتن۔ نہایت کار آنکہ انبیاء را اسباب تحقیر موجود نیست وایںہا را بعد از وجود معدوم شد ومعدوم بعد الوجود چوں معدوم (اصلی است دریں باب ولہذا تائب را بگناہ او تعبیر کردن حرام ست وعوام امّت غیر از صحابہ ایں مرتبہ ندارند کہ تکفیر سیأت ومغفرت گناہاں ایشاں مارا بالقطع از وحی وتنزیل معلوم شدہ باشد و قبول طاعات وتعلق رضائے الٰہی باعمال ایشاں بالتخصیص متیقن شدہ باشد پس فرقہ صحابہ برزخ اندرمیان انبیاء وامتیاں ولہذا مذہب منصور ہمیں است کہ غیر از صحابہ ہرچند مطیع ومتقی باشد بدرجہ ایشاں نمی رشد ایں نکتہ را بالمیت آں درخاطر باید داشت کہ بسیار نفیس ست۔ (۱)

(اس موقع پر یہ نکتہ سمجھ لینا چاہئے کہ حضرات انبیاء کی برائی اور ان کی شان میں لعن طعن اس وجہ سے حرام وکفر ہے کہ طعن کا سبب یعنی گناہ اور کفران بزرگوں میں نہیں پایا جاتا اور تعظیم وتوقیر اور تعریف وتوصیف کے اسباب ان حضرات میں پورے طور پر موجود ہوں اور اس کے گناہوں کی مغفرت نص قرآنی سے ثابت ہوگئی ہو تو یقینی طور پر اس جماعت کی برائی، اہانت اور تحقیر انبیاء کی اہانت وتحقیر کے حکم میں ہوگی بس صرف فرق یہ ہوگا کہ حضرات انبیاء میں اسباب تحقیر سرے سے موجود نہیں ہیں اور اس جماعت میں یہ اسباب پائے جانے کے بعد ختم ہوگئے، گناہوں کے وجود کے بعد انکا (مغفرت وغیرہ کے ذریعہ) معدوم اور ختم ہوجانا معدوم اصلی کے حکم میں ہے (یعنی مغفرت کے بعد مغفور ایسا ہوجاتا ہے گویا کہ سرے سے گناہ سرزد ہی نہیں ہوا ہے) اسی بنا پر گناہ سے توبہ کر لینے والے کو اس کے سابقہ گناہ پر عار دلانا حرام ہے۔ اور پوری امت میں صرف صحابہ کو یہ مرتبہ حاصل ہے کہ ان کے گناہوں کی مغفرت اور بخشش کا قطعی اور یقینی علم ہمیں وحی ربانی اور کلام الٰہی سے معلوم ہوگیا ہے اور ان کی طاعات (وعبادات) کی قبولیت اور ان کے اعمال کے ساتھ اللہ کی رضا کا تعلق بھی متیقن ہوچکا ہے (لہٰذا حضرات انبیاء کی طرح صحابۂ کرام کی تنقیص،

---

(۱) تحفۂ اثنا عشریہ، ص ۳۳۹۔

اہانت اوران کی برائی حرام وکفر ہوگی) جماعت صحابہ انبیاء اورامتیوں کے درمیان برزخ (بیچ کی کڑی) ہیں اسی بناء پر مذہب منصوریہی ہے کہ غیر صحابی خواہ کتنا ہی مطیع ومتقی کیوں نہ ہوصحابہ کے مقام ومرتبہ کونہیں پہنچ سکتا، اس نکتہ کواس کی لم وعلت کے ساتھ دل نشیں کرلینا چاہئے کہ بہت ہی خوب ہے)۔

اللّٰهم ارنا الحق حقًا و ارزقنا اتباعه و ارنا الباطل باطلاً و ارزقنا اجتنابه.

☆ ☆ ☆

تقدس صحابہ

بسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیمِ

معیار صلاح

اہل سنت والجماعت کا عقیدہ ہے کہ نبیٔ کریم ...... کے بعد اب کوئی معصوم نہیں ہے اگر کوئی فرد یا جماعت کسی غیر رسول کی عصمت کا مدعی ہے تو وہ اپنے دعوی میں کاذب اور جھوٹا ہے۔ اس لئے جماعتِ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے علاوہ ہر انسان سے صواب وخطا اور خیر وشر کا صدور ہوسکتا ہے، البتہ بعض خدا کے ایسے سعید بندے ہوتے ہیں کہ ان کی زندگی پر خیر وصلاح کا غلبہ ہوتا ہے، اسی غلبۂ خیر کی بنا پر انھیں نیک، صالح، ولی وغیرہ محترم ناموں سے یاد کیا جاتا ہے جس کا یہ مطلب ہر گز نہیں ہوتا کہ یہ زلاّت وسیئات سے بالکلیہ پاک ہیں۔

اس کے بالمقابل کچھ نابکار ایسے بھی ہیں جو مجموعۂ شرور ومعاصی اور خزینۂ فسق وفساد ہوتے ہیں، ان کے فسق وفساد کی یہ کثرت انھیں ظالمین ومفسدین کے زمرے میں پہنچا دیتی ہے، بایں ہمہ ان کا بھی دامنِ حیات خیر وصلاح سے یکسر خالی نہیں ہوتا۔

صحابۂ کرام کی سیرت، رسول خدا...... کی سیرت کا جزء ہے

صلحائے امت کی حیات وسوانح پر بحث وتحقیق کے وقت ان کی بعض لغزشوں اور بشری کمزوریوں کے پیش نظر ان کے جملہ محاسن ومزایا پر خط تنسیخ کھینچ دینا، اور ان کے سارے حسنات وخیرات کا انکار کرکے انھیں ظالمین ومفسدین کی صف میں کھڑا کر دینا علم و

دیانت کے سراسر منافی ہے۔ ٹھیک اسی طرح ظالمین ومفسدین کے چند گنے چنے اچھے کاموں کو سامنے رکھ کر ان کی زندگی کے سارے سیاہ کارناموں سے آنکھیں بند کر کے انھیں صلحاء واولیاء کی جماعت میں شامل کر دینا کسی طرح بھی درست نہیں ہوگا، بلکہ ہر ایک کے ساتھ اس کے اعمال خیر وشر کی قلت و کثرت کے اعتبار سے معاملہ کیا جائے گا۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں امرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان ننزل الناس منازلھم آنحضرت...... کا ہمیں حکم تھا کہ ہم لوگوں کو ان کے درجات ومراتب میں رکھیں۔

گر فرق مراتب نہ کنی
....

بحث ونظر اور تحقیق وتبصرہ کا یہ ایسا لازمی اصول ہے جس سے غفلت اور بے اعتنائی ایک محقق ومبصر کو دائرہ بحث وتحقیق سے نکال کر افراط وتفریط اور تنقیص وتضلیل کی سرحد میں پہنچا دیتی ہے، جس سے خود اس کی ذات مجروح اور علمی کاوشیں بے سود ہو کر رہ جاتی ہیں۔

پھر ایک محقق کی علمی دیانت کا یہ بھی تقاضا ہے کہ کسی شخصیت پر بحث کرنے کے لئے اس سے متعلق جو درست، صالح، معتبر اور مستند مواد ہیں انھی کو کام میں لائے، خود تراشیدہ، بے سند، غیر مقبول، اور گری پڑی باتوں کو بنیاد بنا کر اس کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنا نہ صرف اس شخصیت پر ظلم ہے بلکہ خود علم وتحقیق کے ساتھ مذاق کرنا ہے، محقق کا یہ رویہ بھی اسے پایۂ اعتبار سے ساقط اور علمی خیانت سے متہم کر دیتا ہے، باری تعالیٰ عز اسمہ کا ارشاد ہے یا ایھا الذین اٰمنوا ان جاء کم فاسق بنباء فتبینوا جب غلط کار، دروغ گو کوئی خبر دے تو اس کی تحقیق کر لیا کرو۔ ایک دوسری آیت میں ہے اذا ضربتم فی الارض فتبینوا، اسلئے صحیح، سقیم، قوی، ضعیف کی اچھی طرح چھان بین کے بعد ہی کوئی فیصلہ درست سمجھا جائے گا۔

عام اسلامی شخصیات سے ہٹ کر اصحاب رسول...... کے حالات اور ان کے مقام و مرتبہ پر بحث وکلام کے لئے محض تاریخی روایات پر انحصار واعتماد بھی ایک محقق کو جادہ اعتدال اور راہ صواب سے دور کر دیتا ہے، کیونکہ تاریخ کو ہرگز یہ حیثیت حاصل نہیں ہے کہ اس کی شہادت سے کتاب وسنت کے مسلّمات کے خلاف استدلال فراہم کیا جائے رسولِ

خدا اور عام امت کے درمیان دین خالص کے صحیح تصوّر کے لئے اگر کوئی قابل اعتماد واسطہ ہے تو وہ صحابۂ کرام کی برگزیدہ اور مقدس جماعت ہے۔ پیغمبر خدا ...... کی زندگی کے یہ ساتھی ہی آپ کے پیغام اور آپ کی تعلیمات کو پورے عالم میں پہنچانے والے ہیں، صحابہ کرام کی اس داعیانہ حیثیت کا اعلان خود خدائے علیم وخبیر نے اپنے رسول ...... کی زبانی یوں فرمایا ہے قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِىْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِىْ الآية آپ ...... اعلان کردیں کہ یہ میرا راستہ ہے بلاتا ہوں اللہ کی طرف سمجھ بوجھ کر میں اور میرے ساتھی۔ مطلب یہ ہے کہ کسی اندھی تقلید کی بنیاد پر نہیں بلکہ حجت و برہان اور بصیرت و وجدان کی روشنی میں، میں اور میرے اصحاب دین توحید کی دعوت دے رہے ہیں، اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ...... کو جو نورِ بصیرت عطا فرمایا تھا آپ کے فیضِ صحبت سے ہر صحابی کا دل و دماغ اس نور سے روشن ہو گیا تھا اور دعوت الی اللہ علی وجہ البصیرۃ میں وہ رسول اللہ ...... کے دست و بازو اور رفیق کار بن گئے تھے، حدیث پاک "ما انا علیه واصحابی" میں آنحضرت ...... نے بھی صحابۂ کرام کے اسی رتبۂ بلند کو بیان فرمایا ہے، اس لئے صحابہ کی سیرت درحقیقت رسول پاک ...... کی سیرت کا جز ہے، عام شخصیات ورجال کی طرح انھیں صرف کتب تاریخ کی روشنی میں نہیں بلکہ قرآن وحدیث اور سیرت رسول ...... کے آئینہ میں دیکھا جائیگا۔

قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

ومن توقيره ﷺ توقير اصحابه وبرهم ومعرفة حقهم والاقتداء بهم وحسن الثناء عليهم والاستغفار لهم والامساك عما شجر بينهم ومعاداة من عاداهم والاضراب عن اخبار المؤرخين وجهلة الرواة (الاساليب البديعة ص۸)

> آنحضرت ...... کی تعظیم وتوقیر میں سے ہے صحابہ کی تعظیم کرنا، ان سے حسن سلوک کرنا، ان کے حق کو پہچاننا، انکی پیروی کرنا، ان کی مدح وستائش کرنا، ان کے واسطے استغفار کرنا، ان کے باہمی اختلاف کے ذکر سے (زبان وقلم کو) روکے رکھنا، ان کے دشمنوں سے دشمنی رکھنا مورخین اور جاہل راویوں

کی (ان کی خلاف شان) روایتوں کے نقل وبیان سے باز رہنا۔

حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی قدس سرہ اپنے ایک مکتوب میں رقم طراز ہیں۔

> صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی شان میں جو آیات وارد ہیں وہ قطعی ہیں، جو احادیث صحیحہ ان کے متعلق وارد ہیں وہ اگرچہ ظنی ہیں مگر ان کی اسانید اس قدر قوی ہیں کہ تواریخ کی روایات ان کے سامنے ہیچ ہیں، اس لئے اگر کسی تاریخی روایت میں اور آیات واحادیث صحیحہ میں تعارض واقع ہوگا تو تواریخ کو غلط کہنا ضروری ہوگا۔ (مکتوبات شیخ الاسلام، ج ا ص ۲۴۲ مکتوب ۸۸)

صحابہ قرآن مجید کی نظر میں

حضرات صحابہ کا یہ تقدس وامتیاز کسی انسانی شخصیت وجماعت کا عطا کردہ نہیں ہے بلکہ انھیں یہ رتبہ بلند خود مالک کائنات وخالق دوجہاں کے دربار سے مرحمت ہوا ہے، ذیل میں مذکور چند آیات ملاحظہ فرمائیں آپ پر یہ حقیقت روز روشن کی طرح آشکارا ہوجائے گی۔

(۱) کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تأمرون بالمعروف و تنھون عن المنکر و تؤمنون باللّٰہ (آل عمران آیت ۱۱۰)

> تم لوگ بہترین جماعت ہو جو لوگوں کی نفع رسانی کیلئے پیدا کی گئی ہے، تم نیک کاموں کا حکم کرتے اور بری باتوں سے منع کرتے ہو، اللہ پر ایمان لاتے ہو۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس آیت کی تلاوت کے بعد فرمایا ’’اگر اللہ تعالیٰ چاہتے تو انتم فرماتے اس وقت خطاب کی وسعت میں پوری امت مرحومہ براہ راست داخل ہوجاتی مگر اللہ تعالیٰ نے کنتم فرمایا اور صحابہ کی تخصیص فرمادی، اب رہے امت کے باقی لوگ تو جو صحابہ جیسے اعمال کریں گے وہ بھی ان کے تابع ہوکر اس خیرت وافضلیت کے مصداق ہوجائیں گے (اخرجہ ابن جریر وابوحاتم عن السدّی)

حضرت فاروق اعظمؓ نے آیت پاک کا مصداقِ اولین صحابۂ کرام کو قرار دیا ہے اور

امت کے دیگر وہ افراد جو آیت پاک میں مذکور صفات کے حامل ہوں گے انھیں ثانوی درجہ میں شامل کیا ہے اور عربی زبان کے قواعد کی رو سے یہ بات اس طرح سمجھائی ہے کہ انتم خير امة جملہ اسمیہ ہے جو ثبوت نسبت کو بتاتا ہے، تو انتم سے خطاب عام ہوگا جس کے عموم ووسعت میں موجود وغیر موجود سب داخل ہو جائیں گے، لیکن جب ضمیر ”انتم“ پر ”کان“، فعل ماضی داخل کر دیا جائے تو وقوع وحدوث کا معنی پیدا ہو جائے گا، اس صورت میں کنتم کے مخاطب صرف موجودین ہوں گے۔ یعنی نزول آیت کے وقت جو امت موجود ہے وہی اس کی مصداق اولین ہوگی، یہ آیت صاف طور پر بتا رہی ہے کہ اصحاب رسول ...... بلا تخصیص جماعتِ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے بعد سب سے افضل ہیں، علامہ سفارینی نے شرح عقیدۃ الدرۃ المضیۃ میں جمہور امت کا مسلک قرار دیا ہے کہ انبیاء کے بعد صحابۂ کرام افضل الخلائق ہیں، ابراہیم بن سعید جوہری کہتے ہیں کہ میں نے حضرت ابوامامہؓ سے دریافت کیا کہ حضرت معاویہ اور عمر بن عبدالعزیز میں کون افضل ہے تو انھوں نے فرمایا لانعدل باصحاب محمد صلى الله عليه وسلم احدًا (الروضة الندية شرح العقيدة الواسطية ابن تيميه ص ۴۰۵) ہم اصحاب محمد...... کے برابر کسی کو نہیں سمجھتے۔

امام ابن حزم اپنی مشہور کتاب الفصل میں لکھتے ہیں ولا سبيل الٰى ان يلحق اقله درجة احد من اهل الارض کوئی شکل نہیں ہے کہ صحابۂ کرام میں سے کم رتبہ کے درجہ کو بھی کوئی (غیر صحابی) فرد بشر پہنچ سکے۔

اب اگر کسی تاریخی روایت سے صحابۂ کرام کی تنقیص لازم آتی ہو تو وہ اس نص قطعی کے معارض ہونے کی بنا پر لازمی طور پر مردود ہوگی۔

(۲) لا يستوى منكم من انفق من قبل الفتح وقاتل اولٰئك اعظم درجة من الذين انفقوا من بعد وقاتلوا و كلا وعد الله الحسنٰى. (الحدید آیت ۱۰)

> برابر نہیں تم میں جس نے خرچ کیا فتح مکہ (یا صلح حدیبیہ) سے پہلے اور جنگ کی ان لوگوں کا درجہ بڑا ہے ان لوگوں سے جنھوں نے خرچ کیا اس کے بعد اور جنگ کی اور سب سے وعدہ کیا اللہ نے خوبی کا۔

سورۂ انبیاء میں الحسنٰی کے متعلق ارشاد ہے ان الذین سبقت لھم منا الحسنٰی اولئك عنھا مبعدون جن لوگوں کے واسطے ہماری طرف سے حسنٰی کا وعدہ ہو چکا ہے وہ جہنم سے دور رکھے جائیں گے۔ اس آیت پاک سے معلوم ہوا کہ فرق مراتب کے باوجود سارے صحابہ جنتی ہیں یہی بات سورۂ توبہ میں ان الفاظ میں بیان فرمائی گئی ہے۔

(۳) السابقون الاولون من المھاجرین والانصار والذین اتبعوھم باحسان رضی اللّٰہ عنھم ورضوا عنہ واعد لھم جنّٰت تجری من تحتھا الانھار خالدین فیھا ابدا ذلك الفوز العظیم. (آیت۱۰۰)

> اور جو لوگ قدیم ہیں سب سے پہلے ہجرت کرنے والے اور مدد کرنے والے اور جو لوگ ان کے پیرو ہیں نیکی کے ساتھ اللہ راضی ہوا ان سے اور وہ راضی ہوئے اس سے تیار کر رکھے ہیں واسطے ان کے باغ کہ بہتی ہیں نیچے ان کے نہریں رہا کریں انھیں میں ہمیشہ یہی ہے بڑی کامیابی۔

اس آیت میں صحابۂ کرام کو دو طبقوں میں تقسیم کیا گیا ہے ایک اولین سابقین کا اور دوسرا ان کے بعد والوں کا، اور دونوں طبقوں کے متعلق یہ اعلان کر دیا گیا ہے کہ اللہ ان سب سے راضی اور وہ اللہ سے راضی ہیں اور ان کے لئے جنت کا مقام دوام ہے۔

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی قدس سرہ لکھتے ہیں جو شخص قرآن پر ایمان رکھتا ہے جب اس کے علم میں یہ بات آ گئی کہ اللہ تعالیٰ نے بعض بندوں کو دوامی طور پر جنتی فرمایا ہے تو اب ان کے حق میں جتنے بھی اعتراضات ہیں سب ساقط ہو گئے کیونکہ اللہ تعالیٰ عالم الغیب ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ فلاں بندہ سے فلاں وقت میں نیکی اور فلاں وقت میں گناہ صادر ہوگا اس کے باوجود جب وہ اطلاع دے رہے ہیں کہ میں نے اسے جنتی بنا دیا تو اسی کے ضمن میں اس بات کا اشارہ ہو گیا کہ اس کی تمام لغزشیں معاف کر دی گئی ہیں، لہٰذا اب کسی کا ان مغفور بندوں کے حق میں لعن وطعن اور برا بھلا کہنا حق تعالیٰ پر اعتراض کے مرادف ہوگا، اس لئے کہ ان پر اعتراض اور زبان طعن دراز کرنے والا گویا یہ کہہ رہا ہے کہ پھر اللہ نے اسے جنتی کیسے بنا دیا الخ (فضائل صحابہ واہل بیت مجموعہ رسائل ص ۲۰۶، مطبوعہ

انجمن حمایت الاسلام لاہور ۱۹۶۷ء)

اور علامہ ابن تیمیہ نے الصارم المسلول میں قاضی ابو یعلیٰ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ رضا اللہ تعالیٰ کی ایک صفتِ قدیمہ ہے وہ اپنی رضا کا اعلان صرف انھیں کے لئے فرماتا ہے جن کے متعلق وہ جانتا ہے کہ ان کی وفات موجبات رضا پر ہوگی۔ (معارف القرآن ص ۱۰۶ ج ۸) لہٰذا اگر کوئی تاریخی روایت اس نص قطعی کے خلاف ہوگی تو وہ لائق اعتبار نہ ہوگی۔

(٤) هُوَ الَّذِیْ اَیَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِیْنَ وَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مَّا اَلَّفْتَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَیْنَهُمْ اِنَّهٗ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ (الانفال آیت ۶۳)

> اللہ ہی نے تجھ کو زور دیا اپنی مدد کا اور مسلمانوں کا اور الفت ڈال دی ان کے دلوں کے درمیان اگر تو خرچ کر دیتا جو کچھ زمین میں ہے سارا نہ الفت ڈال سکتا ان کے دلوں میں لیکن اللہ نے الفت پیدا کر دی ان کے درمیان بیشک وہ زور آور حکمت والا ہے۔

اسلام سے پہلے عرب میں جدال وقتال کا جو بازار گرم تھا اس سے کون ناواقف ہے، ادنیٰ ادنیٰ باتوں پر قبائل عرب باہم ٹکراتے رہتے تھے، اور بسا اوقات ان کی قبائلی جنگوں کا سلسلہ صدیوں تک جاری رہتا، باہمی عداوت اور شقاق وعناد کے اس دور میں رحمۃ للعالمین توحید ومعرفت اور اتحاد واخوت کا عالمگیر پیغام لے کر مبعوث ہوئے کیا دنیا کی کوئی طاقت تھی جو ان درندہ صفت، جہالت پسند لوگوں میں معرفت الٰہی اور حب نبوی کی روح پھونک کر سب کو ایک دم باہمی اخوت والفت کی زنجیر میں جکڑ دیتی، بلا شبہ روئے زمین کے سارے خزانے خرچ کر کے بھی یہ مقصد حاصل نہیں کیا جا سکتا تھا، یہ خدائی طاقت و حکمت کا کرشمہ ہے کہ کل تک جو ایک دوسرے کے خون کے پیاسے اور عزت وآبرو کے بھوکے تھے ان کے درمیان اس طرح سے برادرانہ اتحاد واتفاق پیدا کر دیا کہ حقیقی بھائیوں سے زیادہ ایک دوسرے سے محبت والفت کرنے لگے، صحابۂ کرام کی اس باہمی الفت ومحبت کا ذکر سورۂ آل عمران میں اس طرح کیا گیا ہے۔

وَاذْ كُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖ اِخْوَانًا.

یاد کرو اللہ کا احسان اپنے اوپر جب کہ تھے تم آپس میں دشمن پھر اللہ نے الفت پیدا کر دی تمہارے دلوں میں۔

آیت پاک محمد رسول الله والذين معه اشداء على الكفار رحماء بينهم (الفتح) (محمدؐ اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کافروں پر سخت اور آپس میں رحیم و مہربان ہیں) بھی حضرات صحابہ کی باہمی رحمت و الفت کی خبر دے رہی ہے۔

امام قرطبی اور عامۂ مفسرین لکھتے ہیں "والذين معه" میں بلا تخصیص تمام صحابۂ کرام داخل ہیں، اس آیت پاک میں تمام صحابہ کو آپس میں رحیم اور مہربان اور فضل خداوندی کا طالب بتایا گیا ہے۔

ان نصوص قطعیہ کے برخلاف اگر تاریخی روایتیں یہ شہادت دیں کہ صحابہ آپس میں ذاتی پرخاش اور بغض و عناد رکھتے تھے تو یہ شہادتِ زور ہوگی جو کسی عدالت میں بھی قابل قبول نہیں ہے، رہا معاملہ صحابہ کے باہمی مشاجرات اور آپسی لڑائیوں کا تو اس کا منشاء بغض و عداوت اور شقاق و عناد قطعی نہیں تھا بلکہ اس میں ہر فریق اپنے نقطۂ نظر اور اجتہاد کے مطابق مسلمانوں کی مصالح اور راہ حق و رضائے الٰہی کے حصول میں کوشاں تھا، یہ الگ بات ہے کہ ایک فریق اپنے اجتہاد میں چوک گیا جس پر وہ قابلِ گرفت نہیں بلکہ مستحق اجر ہے، چنانچہ علامہ سفارینی لکھتے ہیں۔

التخاصم والنزاع والتقاتل والدفاع الذى جرى بينهم كان عن اجتهاد قد صدر من كل واحد من رؤس الفريقين مقصد سائغ لكل فرقة من الطّآئفتين وان كان المصيب فى ذلك للصواب واحدهما ... غير ان للمخطى فى الاجتهاد اجرًا وثواباً. (مقام صحابہ ص ۱۰۴)

جو نزاع و جدال اور دفاع و قتال صحابہ کے درمیان پیش آیا وہ اس اجتہاد کی بنا پر تھا جو فریقین کے سرداروں نے کیا تھا اور فریقین میں سے ہر ایک کا مقصد

اچھا تھا اگر چہ اس اجتہاد میں ایک ہی فریق صواب پر ہے... مگر اپنے اجتہاد میں خطا کر جانے والے کیلئے بھی اجر و ثواب ہے۔

(۵) لَاتَجِدُ قَوۡمًا یُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰہِ وَالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ یُوَادُّوۡنَ مَنۡ حَادَّ اللّٰہَ وَرَسُوۡلَہٗ وَلَوۡ کَانُوۡا اٰبَائَھُمۡ اَوۡ اَبۡنَائَھُمۡ اَوۡاِخۡوَانَھُمۡ اَوۡعَشِیۡرَتَھُمۡ اُولٰئِكَ کَتَبَ فِیۡ قُلُوۡبِھِمُ الۡاِیۡمَانَ وَاَیَّدَھُمۡ بِرُوۡحٍ مِنۡہُ (المجادلہ، آیت ۲۲)

> تو نہیں پائے گا کسی قوم کو جو اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں کہ وہ دوستی رکھتے ہیں ان سے جو اللہ تعالیٰ کے اور رسول اللہ کے مخالف ہیں خواہ وہ ان کے باپ، بیٹے، بھائی یا اپنے گھرانے ہی کے کیوں نہ ہوں ان لوگوں کے دلوں میں اللہ نے ایمان ثبت کر دیا ہے اور ان کو اپنے فیض غیبی سے مدد کی ہے۔

حضرت شاہ عبدالقادر مفسر دہلویؒ اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں، یعنی جو دوستی نہیں رکھتے اللہ کے مخالف سے اگرچہ باپ بیٹے (وغیرہ) ہوں وہ ہی سچے ایمان والے ہیں، ان کو یہ درجے (جنت ورضوان الٰہی) ملتے ہیں، صحابہ رضی اللہ عنہم کی شان یہی تھی کہ اللہ و رسول کے معاملہ میں کسی چیز اور کسی شخص کی پروا نہیں کی۔ الحاصل حضرات صحابہ اس آیت پاک کے مصداق اولین ہیں چنانچہ امام قرطبی، زمخشری، حافظ ابن کثیر وغیرہ ائمہ تفسیر نے اس آیت کے تحت حضرت ابوعبیدہ، حضرت ابوبکر صدیق، حضرت مصعب بن عمیر، حضرت عمر فاروق وغیرہ رضوان اللہ علیہم کے بے لوث مخلصانہ واقعات بیان کئے ہیں۔

اب اس قرآنی اطلاع کے برعکس تاریخ کی روایتیں یہ خبر دیں کہ صحابہ خدا اور رسولِ خدا کے مقابلے میں اپنے بیٹے عزیز و اقارب اور قبیلے و گھرانے کو اولیت دیتے تھے تو یہ روایتیں ساقط الاعتبار ہوں گی انھیں کسی طرح بھی تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔

(٦) وَلٰکِنَّ اللّٰہ حَبَّبَ اِلَیۡکُمُ الۡاِیۡمَانَ وَزَیَّنَہٗ فِیۡ قُلُوۡبِکُمۡ وَکَرَّہَ اِلَیۡکُمُ الۡکُفۡرَ وَالۡفُسُوۡقَ وَالۡعِصۡیَآنَ اُولٰٓئِكَ ھُمُ الرَّاشِدُوۡنَ فَضۡلاً مِّنَ اللّٰہِ وَنِعۡمَۃً وَاللّٰہُ عَلِیۡمٌ حَکِیۡمٌ (الحجرات، آیت ۷-۸)

لیکن اللہ نے محبوب بنا دیا تمہارے لئے ایمان کو اور اس کو مزین کردیا تمہارے دلوں میں اور نفرت ڈال دی تمہارے دلوں میں کفر، گناہ اور نافرمانی کی ایسے ہی لوگ نیک راہ پر ہیں اللہ کے فضل و احسان سے اور اللہ جاننے والا، حکمت والا ہے۔

یعنی اللہ سب کی استعداد و صلاحیت کو جانتا ہے اور اپنی حکمت سے ہر ایک کو وہ مقام و مرتبہ مرحمت فرماتا ہے جو اس کی استعداد کے مناسب ہو۔

یہ آیت ناطق ہے کہ بلا استثناء تمام صحابہ کے دلوں میں ایمان کی محبت اور کفر، گناہ، اور نافرمانی سے نفرت و کراہیت منجانب اللہ راسخ کردی گئی تھی، اور ''الیکم'' میں حرف ''الیٰ'' سے مستفاد ہوتا ہے کہ یہ ایمان کی محبت اور کفر و فسق سے نفرت انتہا درجے کو پہنچی ہوئی تھی کیونکہ ''الیٰ'' عربی میں انتہا و غایت کے معنی بیان کرنے کے لئے وضع کیا گیا ہے، نیز آیت پاک سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ صحابۂ کرام سے جو لغزشیں صادر ہوتی ہیں اس کی بنیاد ضعفِ ایمان اور فسق و عصیان کا (نعوذ باللہ) استحسان نہیں ہے بلکہ بتقاضائے بشریت ان کا صدور ہو گیا ہے، جس سے ان کے رشد پر کوئی حرف نہیں آسکتا، اس لئے ان کی معدودے چند لغزشوں کی بنا پر انھیں تنقید و تنقیص کا نشانہ بنانا کسی طرح بھی درست نہیں ہے۔ چنانچہ علامہ ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں:

ماذکر عن الصحابة من السيئات كثير منه كذب و كثير منه كانوا مجتهدين فيه لكن لايعرف كثير من الناس وجه اجتهادهم وما قدِّر انه كان فيه ذنب من الذنوب لهم فهو مغفور لهم، اما بتوبة واما بحسنات ماحية، واما بمصائب مكفرة واما بغير ذلك، فانه قد قام الدليل الذى يجب القول بموجبه انهم من اهل الجنة، فامتنع ان يفعلوا ما يوجب النار لا محالة واذا لم يمت احدهم على موجب النار لم يقدح ذالك فى استحقاقهم للجنة (المنتقیٰ ص۲۱۹-۲۲۰)

صحابہ کی طرف جو بعض برائیاں منسوب کی گئی ہیں ان میں بیشتر خود ساختہ ہیں، اور ان میں بہت سی ایسی ہیں جن کو انھوں نے اپنے اجتہاد (سے حکم

شرعی سمجھ کر) کیا مگر لوگوں کو ان کے اجتہاد کی وجہ معلوم نہ ہو سکی، اور جن کو گناہ ہی مان لیا جائے تو ان کا وہ گناہ معاف ہو گیا، یہ عفو ومغفرت یا توبہ کی بناء پر ہے یا ان کی (کثرت) حسنات نے ان گناہوں کو مٹا دیا، یا دنیاوی مصائب اِن کے لئے کفارہ بن گئیں، علاوہ ازیں دیگر اسباب مغفرت بھی ہو سکتے ہیں، کیونکہ قرآن وسنت سے ان کا جنتی ہونا ثبت ہو چکا ہے اس لئے یہ ناممکن ہے کہ کوئی ایسا عمل ان کے نامۂ اعمال میں باقی رہے جو جہنم کی سزا کا سبب بنے، تو جب حضرات صحابہ میں سے کوئی ایسی حالت میں وفات نہیں پائے گا جو دخول جہنم کا ذریعہ ہے تو اب کوئی چیز ان کے استحقاق جنت میں مانع نہیں ہو سکتی۔

صحابہ کے ایمان واخلاص، دیانت وعدالت پر اس قرآنی شہادت کے بعد کسی تاریخی مفروضہ کی بنیاد پر صحابۂ کرام کے اسلام کو استسلام سے تعبیر کرنا ایمان بالقرآن سے کیا میل کھاتا ہے؟ پرستارانِ تاریخ ودلدادگان سید قطب وطٰہٰ حسین کو سوچنا چاہئے کہ وہ کس سے رشتہ توڑ رہے ہیں اور کس سے ناطہ جوڑ رہے ہیں۔

بقول دشمن پیمانِ دوست بشکستی
ببیں ازکہ بریدی وباکہ پیوستی

قرآن مقدس کی مندرجہ بالا آیات بصراحت ناطق ہیں کہ

(۱) بغیر کسی استثناء کے تمام صحابہ جنتی ہیں۔

(۲) سارے صحابہ کو اللہ تعالیٰ کی دائمی رضا وخوشنودی حاصل ہے۔

(۳) جملہ اصحاب رسول آپس میں برادرانہ الفت واخوت رکھتے تھے۔

(۴) سبھی حضرات صحابہ اللہ ورسول کے معاملے میں نسبی وقبائلی عصبیت سے بالکل پاک تھے۔

(۵) ہر ایک صحابی کا دل ایمان واخلاص کی محبت سے مزین اور کفر، فسق اور نافرمانیوں سے متنفر تھا۔

صحابہ کا مقام حدیث کی نظر میں

کتاب الٰہی کی ان واضح تصریحات کے ساتھ رسولِ خدا ...... کے ارشادات بھی پیشِ نظر رکھیں تاکہ بات بالکل منقح ہو جائے اور کسی تاویل باطل سے آپ شکوک وشبہات میں گرفتار نہ ہوں۔

آنحضرت...... کا پاک ارشاد ہے۔

(۱) خیرالناس قرنی ثم الذین یلونھم ثم الذین یلونھم، فلاادری ذکر قرنین او ثلاثة الخ (رواہ اہل السنۃ الامالکا جمع الفوائد ص ۲۰۱ ج ۲ طبع الہند)

> سب سے بہتر میرا زمانہ ہے پھر ان کا جو اس سے متصل ہیں، پھر ان کا جو اس سے متصل ہیں، راویٔ حدیث کہتے ہیں مجھے یاد نہیں رہا کہ ”ثم الذین یلونھم“ آنحضرت...... نے دو مرتبہ فرمایا یا تین مرتبہ۔

اس حدیث پاک سے متعین طور پر معلوم ہو گیا کہ عہد نبوی کے بعد سب سے بہتر زمانہ صحابۂ کرام کا ہے ”اصابہ“ کے مقدمہ میں مشہور شارح حدیث حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں۔ وتواتر عنه صلی اللّٰه علیه وسلم خیرالناس قرنی ثم الذین یلونھم الخ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حدیث محدثین کے نزدیک متواتر ہے جس سے علم یقینی حاصل ہوتا ہے۔

(۲) عن جابر قال قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم ان اللّٰه اختار اصحابی علی الثقلین سوی النبیین والمرسلین، رواہ البزار بسند رجاله موثقون.

> آنحضرت...... فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے میرے اصحاب کو انبیاء ومرسلین کے علاوہ تمام انسانوں پر فضیلت دی ہے۔

یہ حدیث پاک اس بات پر نص ہے کہ تمام حضرات صحابہ اللہ تعالیٰ کے منتخب و برگزیدہ ہیں، جماعت انبیاء کے بعد گروہ جن وانس میں سے کوئی بھی ان کے مقام ومرتبہ کو نہیں پاسکتا، شرف صحابیت ایک ایسا شرف ہے جس کے مقابلے میں ساری فضیلتیں ہیچ

دریہچ ہیں، اسی لئے حضرت سعد بن زید (یکے از عشرۂ مبشرہ) قسم کھا کر فرماتے ہیں۔

واللّٰہ لشھد رجل منھم مع النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم یغبر فیہ وجھہ خیر من عمل احدکم ولو عمّر عمر نوح (جمع الفوائد ص۲۰۲ ج۲)

خدا کی قسم صحابہ میں سے کسی کی رسول اللہ...... کے ہمراہ کسی جہاد میں شرکت جس سے اس کا (صرف) چہرہ غبار آلود ہو جائے غیر صحابی میں سے ہر فرد کی عمر بھر کی عبادت و عمل صالح سے بہتر ہے اگرچہ اس کو عمرِ نوحؑ مل جائے۔

صحابی رسول آنحضرت...... کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا:

(۳) اللّٰہ اللّٰہ فی اصحابی لاتتخذوھم غرضاً من بعدی فمن احبھم فبحبی احبھم ومن ابغضھم فببغضی ابغضھم ومن اذاھم فقد اذانی ومن اذانی فقد اذی اللّٰہ فیوشك ان یاخذہ (للترمذی جمع الفوائد ج۲ص۲۰۱)

اللہ سے ڈرو، اللہ سے ڈرو میرے صحابہ کے معاملہ میں میرے بعد ان کو (طعن و تشنیع کا) نشانہ نہ بنانا کیونکہ جس نے ان سے محبت کی اس نے مجھ سے محبت کی وجہ سے ان سے محبت کی اور جس نے ان سے بغض رکھا تو مجھ سے بغض کی وجہ سے ان سے بغض رکھا، اور جس نے ان کو ایذاء پہنچائی اس نے مجھے ایذاء پہنچائی اور جس نے مجھے ایذا دی اس نے اللہ کو ایذا پہنچائی (اور جو اللہ کو ایذاء پہنچانا چاہے) تو قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو عذاب میں پکڑ لے۔

آیت کریمہ فِیْ بُیُوتٍ اَذِنَ اللّٰہُ اَنْ تُرْفَعَ وَیُذْکَرَ فِیْھَا اسْمُہٗ الخ **کی تفسیر میں امام قرطبی نے آنحضرت...... کی درج ذیل حدیث ذکر کی ہے جس سے حدیث بالا کی تائید ہوتی ہے۔**

(٤) من احب اللّٰہ عز وجل فلیحبنی ومن احبنی فلیحب اصحَابی ومن احب اصحابی فلیحب القرآن ومن احب القرآن فلیحب المساجد الخ (الجامع لاحکام القرآن ج۱۲ص۲۶۶)

> جو اللہ سے محبت رکھتا ہے اسے چاہئے کہ مجھ سے محبت رکھے اور جو مجھ سے محبت رکھے اسے چاہئے کہ میرے اصحاب سے محبت رکھے اور جو صحابہ سے محبت رکھے اسے چاہئے کہ قرآن سے محبت رکھے اور جو قرآن سے محبت رکھے اسے چاہئے کہ مساجد سے محبت رکھے۔

کوئی انتہا ہے حضرات صحابہ کی رفعت مقام کی کہ سیّد المرسلین، محبوب رب العالمین، خلاصۂ کائنات، فخر موجودات محمد رسول اللہ...... صحابۂ کرام کی محبت کو اپنی محبت بتا رہے ہیں اور ان سے بغض وعناد کو اپنے ساتھ بغض وعناد قرار دیتے ہیں، جس کے دل میں نبیٔ کریم ...... کی ادنیٰ درجہ کی محبت بھی ہوگی وہ اصحابِ رسول ...... کی شان میں لب کشائی کی جرأت کرسکتا ہے؟ اور جب کہ آپ ...... نے صاف فرما دیا ہو کہ دیکھو میرے بعد میرے صحابہ کے معاملے میں اللہ سے ڈرتے رہنا اور انھیں اپنے اعتراضات کا ہدف نہ بنانا۔

ایک حدیث میں آپ ...... کا ارشاد ہے لاتسبوا اصحابی فمن سبهم فعليه لعنة الله والملائكة والناس اجمعين لاتقبل الله منه صرفا ولا عدلا (شرح الشفاء للملاعلی قاری ص۵۵۷ ج۲)

ان احادیث پاک پر بطور خاص ان لوگوں کو غور کرنا چاہئے جو مؤرخین کی گری پڑی روایتوں اور متنورین کے طبع زاد مفروضوں کو بنیاد بنا کر صحابۂ کرام کے اخلاق واعمال کی ایسی تصویر پیش کرتے ہیں جیسے وہ خود اپنے یا اپنے بڑے بوڑھوں کے بارے میں قطعاً گوارہ نہیں کرسکتے تو کیا (نعوذ باللہ) صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ان متنورین ومتجددین سے بھی انسانی واسلامی اخلاق وشرافت میں فروتر اور پست تھے؟ (العیاذ باللہ)

(۵) عن انس قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم مثل اصحابی فی امتی کالملح فی الطعام لایصلح الطعام الا بالملح (مشکوٰۃ شریف بحوالہ شرح السنۃ ص۵۵۴)

> حضور ...... نے ارشاد فرمایا: میری امت میں میرے اصحاب کی وہی حیثیت ہے جو نمک کی کھانے میں ہے کہ بغیر نمک کا کھانا پسندیدہ نہیں ہوتا۔

مطلب یہ ہے کہ جسطرح عمدہ سے عمدہ تر کھانا بے نمک کے پھیکا اور بے مزہ ہوتا

ہے بعینہ یہی حال امت کا ہے کہ اس کی ساری صلاح وفلاح اور اس کا تمام تر شرف ومجد صحابہ کی مقدس جماعت کا مرہون احسان ہے اگر اس جماعت کو درمیان سے الگ کردیا جائے تو امت کے سارے محاسن وفضائل بے حیثیت اور غیر معتبر ہوجائیں گے۔

الحاصل اس حدیث میں واضح اشارہ ہے کہ امت مسلمہ کے دین کی صحت ودرستگی کیلئے حضرات صحابہؓ کے اقوال واعمال حجت وسند اور معیار کا درجہ رکھتے ہیں۔

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ

(۱) عہد نبوی کے بعد صحابہ کا دور سارے زمانہ سے بہتر ہے۔

(۲) حضرات صحابہؓ اللہ کے منتخب وبرگزیدہ ہیں، جماعت انبیاء کے علاوہ جن وبشر کا کوئی بھی فرد ان کے مقام ومرتبہ تک نہیں پہنچ سکتا۔

(۳) صحابہؓ کی محبت رسول خدا سے محبت کی علامت اور ان سے بغض وعناد رسول اللہ...... سے بغض وعناد کی نشانی ہے، صحابہؓ کو ایذا پہنچانا خود نبیٔ پاک ......کو اذیت پہنچانے کے مرادف ہے۔

(۴) حضرات صحابہؓ کو تنقید وتنقیص کا ہدف بنانا ناجائز وحرام ہے۔

(۵) امت کا سارا شرف ومجد صحابہؓ کے ساتھ وابستگی پر موقوف ہے اور ان کا قول وعمل امت کے لئے حجت ہے۔

صحابۂ کرام کی عیب جوئی اکبر کبائر میں سے ہے

آیات قرآنی اور احادیث نبوی کے نصوص سے ثابت شدہ صحابہؓ کے اسی امتیازی مقام ومرتبہ کو ایک دو گمراہ فرقوں کے علاوہ ساری امت ہمیشہ سے مانتی چلی آرہی ہے، ان کے حق میں طعن وتشنیع، سب وشتم اور ان کی عیب جوئی اور اہانت کو اکبر کبائر میں شمار کیا جاتا رہا ہے۔

چنانچہ امام نوویؒ لکھتے ہیں۔

(۱) واعلم ان سب الصحابة حرام من فواحش المحرمات سواء لابس

الفتنة منهم او غيره. (شرح مسلم ص۳۱۰ ج۲)

> اچھی طرح سمجھ لو کہ صحابہ کا نازیبا الفاظ سے ذکر کرنا حرام ہے اور بڑے حراموں میں ہے خواہ وہ صحابی باہمی جنگ کے فتنہ میں مبتلا ہوئے ہوں یا اس سے بری ہوں۔

حضرت امام مالکؒ کا قول مشہور شارح حدیث ملا علی قاریؒ ان الفاظ میں نقل کرتے ہیں۔

(۲) من شتم احدا من اصحاب النبی صلی اللّٰه عليه وسلم ابابكر او عمر او عثمان او عليا او معاوية او عمرو بن العاص فان قال شاتمهم كانوا علىٰ ضلال او كفر قتل وان شتم بغير هذا نكل نكالا شديدا (شرح الشفاء ص۵۵۷ ج۲)

> جس نے اصحاب رسول میں سے کسی کو (مثلاً) ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ، معاویہؓ، عمرو بن عاصؓ، کو گالی دی اگر انھیں گالی دینے والا یہ کہتا ہے کہ وہ کفر وضلالت پر تھے تو اسے قتل کیا جائے گا اور اگر اس کے علاوہ کچھ اور کہتا ہے تو اسے سخت عبرتناک سزا دی جائے گی۔

عظیم المرتبت محدث امام ابوزرعة الرازیؒ فرماتے ہیں۔

(۳) اذا رأيت الرجل ينتقص احدا من اصحاب رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم فاعلم انه زنديق وذٰلك ان الرسول حق، والقرآن حق وما جاء به حق وانما روى الينا ذٰلك كله الصحابة وهؤلاء يريدون ان يجرحوا شهودنا ليبطلوا الكتاب والسنة والجروح بهم اولىٰ وهم زنادقة (الاصابة ص۱۱ ج۱)

> جب تم کسی شخص کو دیکھو کہ وہ صحابہ میں سے کسی کی تنقیص کر رہا ہے تو سمجھ لو کہ یہ زندیق ہے اور یہ اس لئے ہے کہ رسول حق ہیں، قرآن حق ہے، قرآن نے جو کچھ بیان کیا ہے حق ہے اور ان سب کو ہم تک پہنچانے والے صحابہؓ ہیں تو یہ عیب جویان صحابہؓ چاہتے ہیں کہ ہمارے گواہوں اور واسطہ کو مجروح کر دیں۔ تاکہ وہ کتاب وسنت کو باطل اور بے اصل ٹھہرا دیں لہٰذا یہی بدگو مجروح ہونے کے زیادہ مستحق ہیں یہ لوگ تو زندیق ہیں۔

(۴) امام ذہبیؒ اپنی مشہور کتاب ''الکبائر'' میں لکھتے ہیں۔

من ذم اصحاب رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم بشیء وتتبع عشراتھم وذکر عیبا واضافہ الیھم کان منافقا الخ (ص۲۳۹)

جس نے آنحضرت...... کے صحابہؓ کی کسی نوع کی مذمت کی اور ان کی عیب جوئی اور لغزشوں کی تلاش کے پیچھے لگا رہا یا کسی عیب کا ذکر کرکے اس کی نسبت صحابہ کی جانب کردی تو وہ منافق ہے۔

امام احمد بن حنبلؒ کا قول ان کے تلمیذ المیمونی ان الفاظ میں نقل کرتے ہیں۔

(۵) سمعت احمد یقول مالھم ولمعاویۃ نسأل اللّٰہ العافیۃ وقال لی یا ابا الحسن اذا رأیت احدا یذکر اصحاب رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم بسوء فاتھمہ علی الاسلام (مقام صحابہ ص۷۷)

میں نے امام احمد سے فرماتے ہوئے سنا لوگوں کو کیا ہوگیا ہے کہ وہ حضرت معاویہؓ کی برائی کرتے ہیں ہم اللہ سے عافیت کے طلبگار ہیں پھر مجھ سے فرمایا کہ جب تم کسی شخص کو دیکھو کہ وہ صحابہؓ کا ذکر برائی سے کررہا ہے تو اس کے اسلام کو مشکوک سمجھو۔

حضرات ائمہ ومحدثین کے ان اقوال کا حاصل یہی ہے کہ حضرات صحابہؓ کی اہانت، برائی اور ان کے اوپر طعن تشنیع عظیم تر گناہ کبیرہ ہے، کسی مخلص سچے مومن کی یہ شان نہیں ہے کہ رسولِ خدا کے مخلص وجاں نثار ساتھیوں کو ہدف ملامت اور نشانۂ مذمت بنائے ایسی شنیع جسارت کوئی زندیق، منافق اور مشکوک الاسلام ہی کرسکتا ہے (نعوذ باللہ منہ)

محقق ابن ہمامؒ اسلامی عقائد پر اپنی جامع کتاب مسامرہ میں لکھتے ہیں۔

واعتقاد اھل السنۃ والجماعۃ تزکیۃ جمیع الصحابۃ وجوبا باثبات العدالۃ لکل منھم والکف عن الطعن منھم والثناء علیھم (ص۱۳۲)

اہل سنت والجماعت کا عقیدہ تمام صحابہ کی لازمی طور پر پاکی بیان کرنا ہے، ان میں سے ہر ایک کی عدالت ثابت کرنے ان پر کسی قسم کا طعن نہ کرنے

اوران کی مدح وتعریف کے ساتھ۔

علامہ ابن تیمیہؒ نے شرح عقیدۂ واسطیہ میں اس عقیدہ کی تصریح ان الفاظ میں کی ہے۔

وعن اصول اهل السنة سلامة قلوبهم والسنتهم لاصحاب رسول الله صلی الله علیه و سلم (ص۴۰۳)

> اہل سنت کے اصول عقائد میں سے ہے کہ وہ اپنے دلوں اورزبانوں کو صحابہؓ کے معاملے میں صاف رکھے۔

عقائد کی معروف کتاب شرح مواقف میں سید شریف جرجانی رقم طراز ہیں۔

المقصد السابع انه یجب تعظیم الصحابة کلهم والکف عن القدح فیهم لان الله عظیم و اثنٰی علیهم فی غیر موضع فی کتابهم (عقیدہ سے متعلق یہ تینوں حوالے ''مقام صحابہ'' از مفتی شفیعؒ سے ماخوذ ہیں)

> ساتواں مقصد اس بیان میں ہے کہ تمام صحابہ کی تعظیم اوران پر طعنہ زنی سے رکنا واجب ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ عظیم ہے اوراس نے اپنی کتاب میں ان حضرات کی بہت سے مقامات میں تعریف بیان کی ہے۔

ایک محقق کا غیر تحقیقی رویہ

کس قدر حیرت انگیز ہے یہ واقعہ کہ ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی جو صرف مشہور صاحب قلم عالم ہی نہیں بلکہ ہماری معروف دینی درسگاہ ندوہ کے معتمد تعلیمات بھی ہیں، ظاہر ہے کہ ان کے پیش نظر اصحاب رسول ...... سے متعلق کتاب وسنت کے نصوص اور علمائے امت کی تصریحات ضرور ہوں گی، بایں ہمہ موصوف نے ایک جدید کتاب ''واقعہ کربلا اوراس کا پس منظر'' پر تبصرہ کرتے ہوئے صحابہؓ کے ایک طبقہ کو اپنے قلم کے تیرونشتر کا اس بیبا کی سے ہدف بنایا ہے کہ اسے پڑھ کر یقین نہیں آتا کہ حضرات صحابہؓ کے بارے میں یہ خیالات جماعت اہل سنت سے وابستہ کسی صاحب علم ودانش کے ہیں۔

آں موصوف کی تحریر کا وہ حصہ جس میں انھوں نے حضرت سفیان اور دیگر اموی

صحابہ رضوان اللہ علیہم کو اپنے طعن و تشنیع کا نشانہ ٹھہرایا خود انھیں کے الفاظ میں ملاحظہ کیجئے لکھتے ہیں۔

> ”کربلا کا واقعہ بنوامیہ اور بنوہاشم کی دیرینہ عداوتوں کا ایک منطقی نتیجہ (Cdsequence) تھا وہ عداوتیں جو ظہور اسلام کے بعد بہت طاقتور شکل میں ابھر کر سامنے آئیں اور رسول اللہ...... کے ۲۳ سالہ عرصہ نبوت میں ۲۱ سال تک بلکہ ساڑھے اکیس سال تک شدومد سے قائم رہیں، غزوۂ بدر میں مسلمان فوج کی کامرانی نے جس طبقہ کو سب سے زیادہ برافروختہ کیا اس کے سربراہ ابوسفیان تھے، اسی طرح غزوۂ احد میں ان کا اور ان کی اہلیہ، جگر خور حمزہ ہند کا کردار یہ سب وہ باتیں ہیں جن میں مؤرخین کا کوئی اختلاف نہیں ہے، فتح مکہ کے بعد یہ گروہ اسلام لایا (یا بقول سید قطب شہید کے استسلام کیا) مگر اس استسلام کے بعد اچانک ایک پل میں ایسی تبدیلی ہوگئی کہ وہ بدر کا غم بھول گئے، اپنی انانیت کو بھول گئے عقلاً محال بات ہے اور صحاح ستہ کی مستند روایات سے ثابت ہے کہ ہند نے بیعت کے الفاظ دہراتے ہوئے بھی اپنے اندرونی کرب وغم اور غیظ وغضب کا اظہار کیا تھا، حضرت سفیان نے احتجاج کیا تھا کہ اب وہ دن آگیا ہے کہ یہ پسماندہ ہم اشراف پر فوقیت دیئے جاتے ہیں، رسول اللہ ...... کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر کے خلاف حضرت علی کو اٹھانے کی کوشش بھی ان سے ثابت ہے۔

اسلام کے پورے طور پر فاتح ہوجانے کے بعد جب مقاومت کی تمام راہیں مسدود ہوگئیں تھیں اس عرصۂ مختصر میں اس گروہ کی طرف سے کسی واضح دشمنی کا ثبوت تاریخ میں نہیں ملتا ہے مگر جس طرح انگریزوں کے دل میں صلیبی جنگوں میں شکست کا غم وغصہ آج تک موجود ہے اسی طرح اس گروہ میں بدر کے انتقام کا جذبہ سینہ کے اندر بھڑکتی ہوئی آگ کی طرح

جوش مارتا رہا، حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی خلافت نے البتہ اسلام کی طرف سے ان کے عناد کو ختم کیا مگر رسول اللہ...... کی ذات سے ان کا دل صاف نہیں ہوا، احمد امین نے فجر الاسلام اور اس کے مقدمہ میں طٰہٰ حسین نے اس کی نشاندہی کی ہے۔'' (تعمیر حیات، اشاعت ۱۰/مارچ ۱۹۹۲ء)

ڈاکٹر صاحب کی اس طویل عبارت کا حاصل یہ ہے کہ

(۱) حضرت ابوسفیانؓ اور خاندان بنی امیہ کے دیگر صحابۂ کرام حقیقتاً مسلمان نہیں تھے بلکہ ظاہری طور پر اطاعت قبول کر لی تھی بالفاظ دگر یہ حضرات آیت پاک ''قَالَتِ الۡاَعۡرَابُ آمَنَّا، قُل لَمۡ تُؤۡمِنُوا وَلٰکِنۡ قُوۡلُوۡا اَسۡلَمۡنَا کے مصداق تھے۔

(۲) اس استسلام (ظاہری تسلیم و اطاعت) کے بعد اچانک زمانۂ کفر و شرک کی عداوتوں کو وہ بھول گئے یہ عقلاً محال ہے۔

(۳) ہند زوجہ حضرت ابوسفیانؓ (جنھیں موصوف نے جگر خور حمزہ کا طعنہ دیا ہے) نے بیعتِ اسلام کے وقت اپنے کرب و غم کا اظہار کیا تھا (غالباً ڈاکٹر صاحب امت کو یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ عین اسلام قبول کرتے وقت بھی اللہ کے دین اور اللہ کے رسول سے ان کا دل صاف نہیں تھا بدرجۂ مجبوری استسلام کر رہی تھیں)

(۴) حضرت ابوسفیانؓ نے رسول اللہ...... کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ کے خلاف (خلافت کے لئے) حضرت علیؓ کو اکسایا تھا۔

(۵) غلبۂ اسلام کے بعد یہ گروہ مقابلہ کی طاقت نہ پا کر ایک محدود عرصہ کیلئے خاموش ہو گیا تھا، مگر جس طرح انگریزوں کے دل میں صلیبی جنگوں کا غم آج تک موجود ہے اسی طرح اس گروہ کے سینہ میں بدر کے انتقام کا جذبہ بھڑکتی ہوئی آگ کی طرح جوش مار رہا تھا۔

(۶) حضرت عثمان غنیؓ کی خلافت نے اسلام سے ان کے عناد کو ختم کر دیا مگر رسول اللہ ...... سے ان کا دل صاف نہیں ہوا۔

یہ ہے ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی کی صحابہؓ کی اس جماعت کے بارہ میں رائے جن

میں حضرت ابوسفیانؓ (عامل نجران) اوران کی زوجہ ہندؓ کے علاوہ خال المومنین کاتب وحی حضرت معاویہؓ، عتابؓ ابن اسیدؓ (گورنر مکہ معظّمہ) یزید بن سفیانؓ (عامل تیما) عبداللہ بن سعید (عامل فدک وکاتب وحی) عمرو بن سعیدؓ (عامل خیبر وکاتب وحی) عثمان بن سعیدؓ (عامل عرینہ) خالد بن سعیدؓ (کاتب وحی وعامل یمن) ابان بن سعیدؓ (عامل بحرین) سعید بن سعیدؓ (بازار مکہ کے نگران اعلیٰ) رضی اللہ عنہم اجمعین جیسی اسلام کی پاکباز شخصیتیں شامل ہیں۔ جن پر خود صاحب وحی، رسالت مآب محمد رسول اللہ...... نے اعتماد کر کے اپنے عہد رسالت میں اسلام اور مسلمانوں کی خدمت پر مامور فرمایا تھا اور اپنے اس انتخاب کے ذریعہ اس جماعت کے ایمان و اخلاص پر ہمیشہ کیلئے مہر تصدیق ثبت فرمادی ہے، پھر حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنے دور خلافت میں اسلامی لشکر کی قیادت اور صوبوں کی سربراہی جیسے اہم و نازک ترین عہدوں سے انھیں سرفراز کر کے ہمیشہ کے واسطے اسلامی تاریخ میں ان کے ناموں اور کارناموں کو روشن وتابناک بنادیا ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ مستسلمین جن کے سینوں میں غزوۂ بدر کے انتقام کا جذبہ بھڑکتی ہوئی آگ کی طرح جوش ماررہا تھا اور قلوب اسلام اور داعیٔ اسلام سے صاف نہیں تھے (جیسا کہ ڈاکٹر صاحب کی تحقیق ہے) کیا اس اعتماد واعزاز کے مستحق تھے کہ کتابت وحی جیسی نازک ترین خدمت اور اسلامی ریاست کے اہم مناصب ان کے سپرد کردیئے جائیں؟ کیا ندوی صاحب کی اس تحقیق کو تسلیم کرلینے کے بعد سید المرسلین...... کی ردائے عصمت کو (نعوذ باللہ) جرح وقدح کے دھبوں سے پاک وصاف رکھا جاسکتا ہے؟

بات پہنچی ہے کہاں تک یہ تجھے کیا معلوم

اس لئے یہ ہمارے ایمان بالرسول کا تقاضا ہے کہ بغیر کسی بحث وتحقیق اور ریب وشک کے کہہ دیں کہ "واللہ ھذا بھتان عظیم"۔

ڈاکٹر صاحب ماشاءاللہ ندوہ جیسی مشہور علمی درسگاہ کے ہونہار فاضل ہیں ان کی نظر قدیم وجدید دونوں ماخذوں پر ہے، وہ اچھی طرح واقف ہیں کہ حضرات صحابہ کے متعلق فیصلہ محض تاریخی روایتوں کی بنیاد پر نہیں بلکہ کتاب وسنت کی روشنی میں کیا جاتا ہے، حتی کہ

امام ابن جریر طبری، حافظ ابن کثیر، ابن اثیر اور ابن عساکر جیسے مستند علماء جو فن تاریخ کے علاوہ حدیث، تفسیر وغیرہ اسلامی علوم میں بھی عبقریت کی شان رکھتے ہیں کی بیان کردہ وہ روایتیں جو کتاب وسنت کی تصریحات سے میل نہ کھائیں قابل قبول نہیں ہیں۔

اس کے باوجود ڈاکٹر صاحب نے سید قطب، احمد امین اور ڈاکٹر طٰہٰ حسین جیسے مستشرقین کے کارندوں اور اسلامی روایات واقدار سے بیزار عصر جدید کے متجددوں کے خودساختہ مفروضوں کو سامنے رکھ کر صحابہ کی ایک بڑی جماعت پر ایسی سخت ترین جرح کر ڈالی جس کے نتیجہ میں آنحضرت ...... کے ساتھ ان کی وفاداری ہی نہیں بلکہ اسلام بھی مشکوک ہو جاتا ہے۔ کیا صحابہ کے اخلاق وکردار کی یہ صحیح منظر کشی ہے؟ کیا صحابہ کی یہ تصویر دیکھ کر امت کا وہ اجماعی اعتقاد جو ان کے بارے میں ہے باقی رہ سکتا ہے؟ ڈاکٹر صاحب کو خالی الذہن ہو کر غور کرنا چاہئے۔

ڈاکٹر صاحب کی تحریر پر ایک نظر

اس اجمالی نظر کے بعد ڈاکٹر صاحب کی تحریر کے اجزاء پر تفصیلی گفتگو ملاحظہ فرمائیں۔

(الف) کیا یہ مستسلمین جو حقیقی اسلام کی دولت سے محروم تھے جن کے سینوں میں اسلام سے انتقام کی آگ بھڑک رہی تھی، جن کے قلوب نبی کریم ...... کی طرف سے صاف نہیں تھے کسی درجہ میں مستحق جنت ہیں؟ حالانکہ خدائے علیم وخبیر کا اعلان ہے لا يستوى منكم من انفق من قبل الفتح و قاتل اولئك اعظم درجة من الله و كلا وعد الله الحسنىٰ (آیت پاک کا ترجمہ وتفسیر آگے گذر چکی ہے) فرق مراتب کے باوجود تمام صحابہ کو بارگاہ الٰہی سے جنتی ہونے کی سند مل چکی ہے، اس لئے ڈاکٹر صاحب کی یہ تحقیق کسی اور حلقہ میں قابل قبول ہو تو ہو گروہ اہل سنت والجماعت کے نزدیک قطعاً مردود و نامقبول ہے۔

ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں ''مگر اس استسلام کے بعد اچانک ایک پل میں ایسی تبدیلی ہو گئی کہ وہ بدر کا غم بھول گئے، اپنی انانیت کو بھول گئے عقلاً محال ہے۔''

(ب) ڈاکٹر صاحب کا یہ خیال صحیح نہیں ہے کیونکہ جس بات کو یہ محالِ عقلی ٹھہرا رہے ہیں اسی کے بارے میں کتاب الٰہی کی شہادت یہ ہے کہ چشم گیتی اس حیات بخش منظر کو عہد رسالت میں دیکھ چکی ہے اذ کروا نعمت اللّٰہ علیکم اذ کنتم اعداء فالف بین قلوبھم فاصبحتم بنعمتہ اخوانا، یعنی اللہ کے فضل وعنایت سے قدیم دشمنی بغیر کسی تاخیر کے دوستی میں بدل گئی اور کل کے دشمن آج کے بھائی بن گئے، اس آیت پاک میں اذ کنتم اعداءً پر الّف بین قلوبکم کا عطف کیا گیا ہے اور اس کے لئے حروف عاطفہ میں سے ''فاء'' کا انتخاب ہوا ہے جو تعقیب بلا تراخی کے معنی کے واسطے استعمال ہوتا ہے، جس کا حاصل یہی ہے کہ دشمنی وعداوت کے بعد اچانک ایک پل میں الفت پیدا ہوگئی اور پرانی ساری رنجشیں یک بیک کافور ہوگئیں۔

(ج) ڈاکٹر صاحب یہ بھی لکھتے ہیں کہ ''ہند (زوجۂ ابوسفیان) نے بیعت کے الفاظ دہراتے ہوئے بھی اپنے اندرونی کرب وغم اور غیظ وغضب کا اظہار کیا تھا۔''

اس بیان میں ڈاکٹر صاحب صحیح علم وتحقیق کے حق کو فراموش کر گئے ہیں کیونکہ اس واقعہ میں جو بات انھیں اپنے مقصد کے مطابق نظر آئی اسے اٹھالیا اور جو خلافِ مقصد تھی اسے قلم انداز کر دیا آج کل کے تاریخی تجزیے اور ریسرچ وتحقیق کی یہی تکنیک ہے، بیعت اسلام کے اس واقعہ میں ہند رضی اللہ عنہا کی آخری گفتگو جو انھوں نے نبی کریم ...... سے کی یہ ہے۔

> ''یا رسول اللہ! اسلام سے پہلے آپ کے چہرہ سے زیادہ کوئی چہرہ مجھ کو مبغوض نہ تھا اور آپ سے زیادہ کسی کو دشمن نہ رکھتی تھی، اور اب آپ سے زیادہ کوئی چہرہ مجھے محبوب نہیں، آپ نے فرمایا ابھی محبت میں اور زیادتی ہوگی۔'' (سیرت المصطفیٰ ج ۳ ص ۳۶)

کیا اس کے بعد بھی کہا جائے گا کہ وہ نبی کریم سے بغض وعدات رکھتی تھیں؟ حقیقت تو یہ ہے کہ ان کے دل کی صفائی اور انتہائی اخلاص کی بات ہے کہ اسلام لانے سے پہلے کی اپنی قلبی کیفیات کو بلاتکلف بیان کردیا۔ چونکہ ہمارے محقق ومبصر طٰہٰ حسین اور احمد

امین جیسے استشراق پسند مصنّفین کی عینک لگا کر اس واقعہ کو دیکھ رہے ہیں اس لئے جو چیز قابل تعریف تھی وہی انھیں لائق مذمت نظر آ رہی ہے۔

اس موقع پر موصوف نے حضرت ہندؓ کو ''جگر خوریٔ حمزہؓ'' کا طعنہ بھی دیا ہے جو کسی طرح بھی ان کی علمی شان کے مناسب نہیں ہے کیونکہ حدیث پاک الاسلام یهدم ما كان قبله (اسلام نے اپنے سے پہلے سارے گناہوں کو ختم کر دیا) اور ''التائب من الذنب كمن لا ذنب له'' (گناہ سے توبہ کرنے والا گناہ نہ کرنے والے کے مثل ہو جاتا ہے) اس لئے اسلام لانے کے بعد زمانۂ شرک کے معاصی پر طعن و تشنیع کسی طرح بھی روا نہیں، اور اگر بالفرض اس دروازے کو کھول دیا جائے تو مہاجرین و انصار میں سے کون بچے گا جو اس قسم کے طعنہ کا مورد نہ ہو سکے، جانتے بوجھتے ڈاکٹر صاحب موصوف کا یہ رویہ خواہ مخواہ اس شبہ کو دعوت دیتا ہے کہ ان کا قلب خاندان بنی امیّہ سے متعلق صحابۂ کرام سے صاف نہیں ہے، اللّٰھم احفظنا منه۔

(د) موصوف حضرت ابوسفیان کے جرموں کو شمار کراتے ہوئے لکھتے ہیں ''رسول اللہ......کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر صدیق کے خلاف حضرت علی کو اکسانے کی کوشش بھی ان سے ثابت ہے۔''

ڈاکٹر صاحب جس بات کو ایک ثابت شدہ حقیقت کے انداز میں پیش کر رہے ہیں اس کی حیثیت بس اتنی ہے کہ ایک روایت میں کہا گیا ہے کہ ابوسفیان، حضرت علی اور حضرت عباس کی خدمت میں آئے اور کہا کہ اے علیؓ و عباسؓ! کیا بات ہے کہ خلافت قریش کے اس قبیلہ میں گئی (مراد حضرت ابوبکر صدیقؓ کا قبیلہ ہے) جو مرتبہ کے اعتبار سے پست اور تعداد کے لحاظ سے قلیل ہے، بخدا اگر تم دونوں آمادہ ہو جاؤ تو ہم مدینہ کو اپنے حامیوں اور طرفداروں کے لشکر سے بھر دیں، حضرت علیؓ نے جواب دیا، بخدا میں ہرگز اس کی اجازت نہیں دے سکتا الخ

اس روایت کو مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہٗ نے اپنی مشہور کتاب ''المرتضٰی''، صفحہ ۱۵۱ پر بحوالہ کنز العمال ج ۳ ص ۱۴۱ نقل کیا ہے، اسی روایت کی بنیاد پر کہا جا رہا ہے کہ اسلام

قبول کر لینے کے بعد بھی ابوسفیانؓ کے دل سے جاہلی عصبیت کا جرثومہ ختم نہیں ہوا تھا اسی لئے تو وہ خلافت صدیقی کے خلاف حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ کو اکسا رہے تھے۔

اس سلسلے میں عرض ہے کہ اوّلاً تو خود اس روایت کی صحت ہی مشکوک ہے اس لئے ایسی روایت کی بنیاد پر کسی صحابیٔ رسول کے بارے میں اتنی بڑی بات کہہ دینا کسی طرح مناسب نہیں کیونکہ — جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

علاوہ ازیں اگر کسی درجہ میں اس روایت کو مان لیا جائے تو حضرت ابوسفیان کی اس رائے کو حضرت ابوبکرؓ کے خلاف اکسانے کا معنی پہنانا کسی طرح صحیح نہیں ہے کیونکہ اگر حضرت ابوسفیانؓ کی اس رائے کا یہی معنی درست مانا جائے تو پھر اس اعتراض سے عم رسول عباس رضی اللہ عنہ بھی بری نہ ہو سکیں گے کیونکہ حضرت ابوسفیانؓ سے پہلے خود حضرت عباسؓ کی رائے بھی یہی تھی کہ رسول اللہ...... کے مرض وفات میں ایک دن حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے حضرت علیؓ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا تھا ”انی اری الموت فی وجوه بنی عبدالمطلب فتعال حتی نسأل رسول الله صلی الله علیه وسلم فان کان هذا الامر فینا علمناه“ جس کے جواب میں حضرت علیؓ نے فرمایا تھا انا والله لئن سألناها رسول الله صلی الله علیه وسلم فمنعناها لایعطیناها الناس بعده وانی والله لا اسألها رسول الله“ (رواہ البخاری فی کتاب المغازی) پھر یہی اعتراض حضرت سعد بن عبادہ اور ان کے حامی حضرات انصار پر بھی عائد ہوگا جو سقیفۂ بنی ساعدہ میں انتخاب خلیفہ کے لئے اکٹھا ہوئے تھے۔

درحقیقت اس موقع پر نہ کسی کے اندر خاندانی عصبیت کارفرما ہے اور نہ کوئی کسی کو کسی کے خلاف اکسا رہا ہے بلکہ بات صرف اتنی ہے کہ حضرات صحابہ کے سامنے نبیٔ کریم...... کی وفات کے بعد ایک ایسا مسئلہ کھڑا ہو گیا جس پر انھوں نے پہلے سے پورے طور پر غور وفکر نہیں کیا تھا اس لئے اول وہلہ میں استحقاق خلافت کے سلسلہ میں ان کی رائیں مختلف ہو گئیں، قریش کی وہ شاخ جو عبد مناف سے تعلق رکھتی تھی اس کے دونوں بزرگ یعنی حضرت عباسؓ اور حضرت ابوسفیانؓ کی رائے یہ تھی کہ چونکہ آنحضرت کا نسبی تعلق بنوہاشم

سے ہے اور اس وقت بنو ہاشم میں اپنے فضائل ومحاسن کے لحاظ سے حضرت علیؓ سب پر فوقیت رکھتے ہیں اس لئے وہی خلافت کے سب سے زیادہ مستحق ہیں جس کا اظہار ان دونوں حضرات نے حسب موقع حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کردیا، اس کے برخلاف حضرات انصار کا ایک طبقہ اپنی نصرت وتائید کے پیش نظر یہ سمجھ رہا تھا کہ مہاجرین کے مقابلہ میں خلافت کے زیادہ حقدار یہی ہیں اپنی اسی رائے کے تحت وہ سقیفۂ بنی ساعدہ میں اکٹھا ہوئے تھے لیکن بعد میں حضرت صدیق اکبر اور فاروق اعظم رضی اللہ عنہما کے بیانات سے دلائل منقح ہوکر سب کے سامنے آگئے تو بغیر کسی تردد کے سب نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو خلیفۂ رسول تسلیم کرلیا اور مکمل بشاشت قلبی کے ساتھ خلیفۂ وقت کی سمع وطاعت قبول کرلی۔

(ھ) موصوف آگے چل کر لکھتے ہیں کہ ’’مگر جس طرح انگریزوں کے دل میں صلیبی جنگوں میں شکست کا غم وغصہ آج تک موجود ہے اسی طرح اس گروہ میں بدر کے انتقام کا جذبہ سینہ کے اندر بھڑکتی ہوئی آگ کی طرح جوش مارتا رہا۔‘‘

ڈاکٹر صاحب نے اپنی بات میں زور پیدا کرنے اور اپنے کمال ادب وبلاغت کے اظہار کے لیے حضرات صحابہ کی مقدس جماعت کے ساتھ جس بے ادبی کا مظاہرہ کیا ہے وہ صاف طور پر غماز ہے کہ ’’فی قلبه شیء‘‘ حضرت ابوسفیان، حضرت معاویہ، حضرت یزید بن ابوسفیان، حضرت عتاب بن اسید، حضرت خالد بن سعید وغیرہ آنحضرت...... کے معتمد صحابہ کرام کو انگریزوں کی صف میں کھڑا کردینا حددرجہ کی جسارت ہے جو اہل سنت والجماعت کے صحابہ سے متعلق اجماعی عقیدہ کے یکسر منافی ہے۔

الحاصل ڈاکٹر عبداللہ عباس صاحب کی مندرجہ بالاتحریر کا ایک ایک جز کتاب وسنت سے معارض، عقیدۂ اہل سنت کے خلاف ہے اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے بیان کے مطابق (شائع تعمیر حیات، ۲۵/ اپریل ۹۲ء) خود ندوہ کے مسلک سے بھی ہم آہنگ نہیں ہے جسکے معتمد تعلیمات کی مسند پر بیٹھ کر اسے لکھا گیا ہے اور ندوہ کے ترجمان ’’تعمیر حیات‘‘ کے ذریعہ جس کی اشاعت ہوئی ہے، مگر حیرت ہے کہ ترجمان ندوہ تعمیر حیات نے آج تک

اس کی واضح طور پر تردید اور اس سے برأت کے سلسلہ میں کچھ نہیں لکھا۔

فالی اللّٰہ المشتکیٰ.

اللّٰھم ارنا الحق حقًا وارزقنا اتباعه، وارنا الباطل باطلًا وارزقنا اجتنابه، وصلی اللّٰہ علی النبی الکریم وعلی آله واصحابه اجمعین.

☆ ☆ ☆

معیار افضلیت

حضرات خلفاء اربعہ میں سب سے افضل کون ہے

حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے اپنی معرکۃ الآراء اور لاجواب تصنیف ''تحفۂ اثنا عشریہ'' کی تالیف کے بعد اپنے بعض اصحاب کی درخواست پر ''السرالجلیل فی مسئلۃ التفضیل'' کے نام سے ایک رسالہ مرتب فرمایا تھا جس میں حضرات خلفاء اربعہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے درمیان فرق مراتب اور ترتیب مراتب کو ایسے عمدہ طریقے پر ثابت کیا ہے کہ متلاشی حق کے لئے اب اس مسئلہ میں کسی قسم کے ریب وشک کی گنجائش باقی نہیں رہی۔ یہ رسالہ اُس وقت کی علمی زبان فارسی میں لکھا گیا تھا اور اب چونکہ فارسی تقریباً متروک ہوچکی ہے اس لئے اس رسالہ سے استفادہ عام طور پر ممکن نہیں رہا بالخصوص اردو خواں طبقہ تو اس سے مستفید ہو ہی نہیں سکتا۔ اسی طبقہ کی رعایت میں اس رسالہ کو اردو کے قالب میں پیش کیا جارہا ہے اس سلسلے میں یہ وضاحت ضروری ہے کہ تحت اللفظ ترجمہ کے بجائے حضرت شاہ صاحب قدس سرہ کے مفہوم کو عصری اسلوب میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے اس لئے بہت سی جگہوں پر توضیحی عبارت کا اضافہ ناگزیر ہوگیا ہے اگرچہ یہ چیز ٹھیٹھ ترجمہ کے لئے عیب شمار ہوتی ہے؛ لیکن مفہوم کی وضاحت کے مقابلہ میں یہ عیب انگیز کیا جانا چاہیے۔ (حبیب الرحمٰن اعظمی)

اس مسئلہ پر گفتگو سے پہلے فضیلت کی قسموں کو جان لینا ضروری ہے کیونکہ اسی پر افضلیت کا مدار ہے کتاب وسنت کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ فضیلت کی دو قسمیں ہیں:

(۱) فضیلت اختصاصی (۲) فضیلت اکتسابی۔ اس دوسری قسم کو حضرت شاہ عبدالعزیز قدس سرہ نے فضیلت جزائی سے تعبیر کیا ہے۔

فضیلت اختصاصی

یہ محض عطیۂ الٰہی اور موہبت ربّانی ہے جس میں اطاعت و عبادت کا کوئی دخل نہیں ہے بس اللہ تعالیٰ اپنے فضلِ بے پایاں سے ایک شئے کو دوسری شئے پر فضیلت و فوقیت عطا کر دیتا ہے۔ کیونکہ وہ مالک مطلق ہے اپنی مملوکات میں سے جسے چاہے اپنی عنایت خاص سے سرفراز کر دے۔

جسے چاہے مالکِ دوجہاں اسے رفعتوں سے نواز دے

یہ فضیلت اپنے اندر بڑی وسعت اور عمومیت رکھتی ہے۔ انسان، حیوانات، جمادات بلکہ جواہر و اعراض تک کو اس سے کچھ نہ کچھ حصہ ملا ہے۔ درج ذیل مثالوں سے اس کی ہمہ گیری کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

فضیلت اختصاصی کی چند مثالیں

مثلاً فرشتوں کو وجود اور پیدائش میں تمام مخلوق پر اوّلیت اور تقدم کی فضیلت حاصل ہے کیونکہ خلعت وجود سب سے پہلے انھیں کو عطا کیا گیا' اسی طرح حضرات انبیاء کو منصب نبوت سے سرفراز فرما کر تمام انسانوں پر انھیں فوقیت وفضیلت دی گئی' دنیا کے تمام کمسن بچوں کے مقابلہ میں آں حضرتؐ کے صاحبزادے حضرت ابراہیم کو شرف فضیلت سے نوازا گیا' عالم کی تمام اونٹنیوں پر حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی کو بزرگی عطا کی گئی حرمین شریفین (مکہ و مدینہ) کو تمام شہروں پر فضیلت اور برتری مرحمت ہوئی' یوم جمعہ اور یوم عاشورۂ (دسویں محرم) کو دیگر ایام کے مقابلہ میں امتیاز و اختصاص بخشا گیا۔ اور عشرۂ ذی الحجہ کو باقی تمام دنوں سے محترم بنایا گیا' فرض کو نفل پر برتری دی گئی' عصر و فجر کو دوسرے فرائض کے مقابلہ میں افضلیت حاصل ہوئی اور سجدہ کو باقی ارکانِ صلوٰۃ کے مقابلہ میں

قرب ومنزلت سے نوازا گیا۔

ان مثالوں سے جہاں فضیلت اختصاصی کی وسعت اور ہمہ گیری کا پتہ چلتا ہے وہیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس فضیلت کا حصول کسی عمل پر موقوف نہیں ہے بلکہ اس کا تمام تر مدار قسمت اور تقدیر الٰہیہ پر ہے (ذالك تقدير العزيز العليم)

فضیلت اختصاصی کی قسمیں:

اس کی کل چار قسمیں ہیں: (۱) فضیلت معلوم الوجہ (۲) فضیلت مجہول الوجہ (۳) فضیلت اصلی (۴) فضیلت تبعی۔ سطور ذیل میں ہر قسم کی کچھ تفصیل ذکر کی جا رہی ہے تا کہ بات واضح ہو کر سامنے آجائے

(۱) معلوم الوجہ۔ جس میں سبب فضیلت تک عقل انسانی کی رسائی ہو جائے اور آدمی سمجھ لے کہ اس فضیلت کی وجہ کیا ہے مثلاً یہ بات سب کو معلوم ہے کہ دوسری جگہوں کے مقابلہ میں مساجد کی بزرگی اور فضیلت اس کے محل عبادت اور مقام ذکر ہونے کی وجہ سے ہے البتہ خود اس جگہ کا عبادت گاہ اور مسجد کے لئے منتخب کیا جانا محض عنایت خداوندی کی بنا پر ہے اس اختصاص کا سمجھنا فہم انسانی کے دائرہ قدرت سے بالاتر ہے۔

(۲) مجہول الوجہ: وہ فضیلتیں کہلاتی ہیں جن کے اسباب ووجوہ کی دریافت سے انسانی عقل قاصر ہے۔ جیسے حجر اسود کی دوسرے پتھروں پر اور مکان کعبہ کی دوسرے مکانات پر فضیلت کے اسباب ووجوہ کیا ہیں؛ عقل انسانی ان کے ادراک سے عاجز ودرماندہ ہے۔

(۳) فضیلت اصلی: صاحب فضیلت کو یہ شرف وفضل بلا کسی واسطہ کے اصالۃً حاصل ہوا ہو جیسے حجر اسود کہ اسکی فضیلت اصلی ہے۔ کیونکہ اس میں کسی واسطہ کا دخل نہیں ہے۔

(۴) فضیلت تبعی: جو صاحب فضیلت کو کسی واسطہ اور وسیلہ سے حاصل ہوئی جیسے

صاحبزادہ رسول حضرت ابراہیم کی بزرگی آنحضرتؐ کے واسطہ اور طفیل سے ہے۔

فضیلت اختصاصی کی اس تفصیل سے واضح طور پر معلوم ہوگیا کہ فضیلت کی اس قسم میں مدار فضیلت حق جلّ مجدہ کی تخصیص پر ہے عمل یا کوشش کا اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔

(۲) فضیلت اکتسابی

یہ فضیلت اطاعت وعبادت کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے۔ اور فضیلت کی پہلی قسم یعنی اختصاصی کے بالمقابل اس کا دائرہ محدود اور تنگ ہے کیونکہ اس کا مدار اعمال پر ہے لہٰذا یہ انھیں لوگوں کے حصہ میں آئے گی جو عمل کی استعداد اور صلاحیت رکھتے ہوں ان کے علاوہ کسی کو حاصل نہیں ہوگی اور اہل عمل کی صرف تین جماعتیں ہیں، ملائکہ، جنات اور انسان۔ یہ فضیلت بظاہر عمل کے معاوضہ کے طور پر عطا کی جاتی ہے لیکن اگر دقت نظر سے دیکھا جائے تو اس کا منتہا بھی وہی فضیلت اختصاصی ہی ہے جیسا کہ آیندہ کی تفصیلات سے معلوم ہوگا۔

اختلاف اور نزع کا محل یہی فضیلت اکتسابی ہے۔ فضیلت اختصاصی میں کسی اختلاف کی گنجائش نہیں کیونکہ اس کے ثبوت کے لئے کتاب وسنت کا بیان کافی ہوتا ہے۔ اس موقع پر یہ بات ذہن نشیں رہنی چاہیے کہ تمام حضرات صحابہ کو پوری امت پر فضیلت اختصاصی حاصل ہے جس کا ثبوت ذیل کی حدیث سے ہورہا ہے "اختا راللّٰہ لی اصحابا واصحارا وانصا را" اللہ تعالیٰ نے میرے لئے اصحاب، رشتہ دار اور مدگار کا انتخاب فرمایا ہے اور یہ اختصاصی بزرگی آنحضرتؐ کی ازواج مطہرات اور صاحبزادیوں کو بھی حاصل ہے۔ لیکن یہاں گفتگو امت کے مقابلے میں حضرات صحابہ کی فضیلت کے اثبات میں نہیں ہے وہ تو حضرت شارع علیہ السلام کے فرمودات سے ثابت ہے بلکہ اس وقت تو خود حضرات صحابہ کے درمیان فرق مراتب کی وضاحت مقصود ہے۔ کیونکہ محل اختلاف یہی امر ہے۔

بعض احادیث سے بظاہر ایسا سمجھ میں آتا ہے کہ ان حضرات میں سے ایک کو دوسرے پر جو فضیلت اور بزرگی دی گئی ہے۔ اس کا تعلق فضیلت اختصاصی سے ہے۔ لیکن

آیات قرآنیہ میں غور کرنے اور احادیث پر گہری نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ فضیلت اکتسابی ہی ہے۔ ہاں ترتیب خلافت میں اگر بعض خلفاء کی بعض پر تقدیم کو فضیلت اختصاصی میں شمار کیا جائے تو مناسب ہے۔ جس پر حدیث عائشہ صدیقہؓ ”فابی علیّ الاّ تقدیم اَبی بَکر“ (آنحضرتؐ نے حضرت ابوبکرؓ کے بجائے کسی کی تقدیم کو پسند نہیں کیا) کے علاوہ دیگر احادیث بھی دلالت کرتی ہیں۔

فضیلت اکتسابی کی قسمیں

فضیلت اکتسابی کی بھی چند قسمیں ہیں۔ اب ان اقسام پر بغور نظر ڈال کر محل اختلاف میں جو قسم قابل اعتبار ہو اس کو جاری کرنا چاہئے تا کہ فضیلت اکتسابی کے مصداق کی تعیین ہو جائے اور اختلاف ختم ہو اس سلسلہ میں یہ جان لینا ضروری ہے کہ ایک عمل کو دوسرے عمل پر سات وجہ سے فضیلت حاصل ہوتی ہے ان سات وجوہ کے علاوہ کوئی اور وجہ اور صورت مدار فضیلت نہیں ہو سکتی۔

وجوہ مدار فضیلت یہ ہیں (۱) ماہیت عمل (۲) لمیّت عمل (۳) کیفیت عمل (۴) کمیت عمل (۵) زمان عمل (۶) مکان عمل (۷) امور خارجہ۔ سطور ذیل میں ان ساتوں وجوہ کی قدرے وضاحت پیش کی جا رہی ہے تا کہ بات منقح ہو کر سامنے آ جائے۔

ماہیت عمل: یعنی خود عمل اپنی ذات وصفت کے اعتبار سے دوسرے عمل پر فوقیت رکھتا ہو جیسے فرائض کی فوقیت نوافل پر۔ لہٰذا دو آدمیوں میں ایک جملہ فرائض کو ادا کرتا ہے اور دوسرا بعض کو بجالاتا ہے اور بعض کو چھوڑ دیتا ہے مگر ساتھ ہی نوافل کا بھی پابند ہے، یا دونوں تمام فرائض کو پابندی سے ادا کرتے ہیں اور ساتھ ہی کثرت سے نوافل بھی پڑھتے ہیں لیکن ایک کی نوافل دوسرے سے بڑھی ہوئی ہیں، یا ان میں سے ایک نماز کے اندر تلاوت، تسبیح اور حمد وثنا کثرت سے کرتا ہے اور دوسرا خارج صلوٰۃ ذکر واذکار کی کثرت رکھتا ہے، یا دو شخصوں میں سے ایک جہاد میں جان کی پرواہ کئے بغیر دشمنوں کی صفوں میں گھس کر داد شجاعت دیتا ہے، اور دوسرا مجاہدین کی مدد رسانی اور ان کے آس پاس سے دشمنوں کو دور

رکھنے میں کوشش کرتا ہے، یا ایک جہاد میں مصروف رہتا ہے اور دوسرا جہاد کے بجائے نماز وروزہ اور دیگر عبادات میں لگا رہتا ہے۔ غرض ان تمام صورتوں میں اول دوسرے کے مقابلے میں افضل مانا جائے گا کیونکہ پہلے کا عمل ذاتی طور پر دوسرے کے عمل سے افضل اوراعلیٰ ہے۔

(۲) لمیّت عمل: عمل کی غایت وغرض جسے عرف شرع میں نیت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مثلاً ایک شخص صرف رضائے الٰہی اور خوشنودی مولیٰ کی نیت سے عمل کرتا ہے اس کے سوا اس کی کوئی اور غرض نہیں ہے۔ اس کے مقابلہ میں دوسرا شخص بھی وہی عمل کرتا ہے مگر اس کے اخلاص نیت میں کمی ہے کہ رضائے الٰہی کے ساتھ اس کی نظر دنیوی منافع ومصالح پر بھی ہے۔ ظاہر ہے کہ پہلا عمل حسن نیت اور کمال اخلاص کی بناء پر دوسرے سے افضل ہوگا۔

(۳) کیفیت عمل: یعنی عمل کو اس کے تمام آداب وحقوق کی رعایت کے ساتھ انجام دینا۔ مثلاً ایک شخص ہر عمل کو اس کے جملہ واجبات وسنن اور آداب وحقوق کو پورا کرتے ہوئے ادا کرتا ہے۔ اور دوسرا ان کی پوری رعایت نہیں کرتا ہے۔ یا ایک شخص کا عمل ہر قسم کے گناہوں کی مصاحبت اور تلویث سے پاک وصاف ہے اور دوسرا عبادت وریاضت کے ساتھ گناہوں میں بھی مبتلا رہتا ہے، یا ایک شخص حضور قلب اور پورے خشوع وخضوع کے ساتھ عبادت کرتا ہے اور دوسرا بے توجہی اور بے التفاتی کے ساتھ، یا ایک شخص وضو کے ساتھ ذکر وتلاوت کرتا ہے اور دوسرا بے وضو ہوکر۔ ان تمام صورتوں میں پہلا عمل اپنی کیفیت کی بناء پر دوسرے عمل سے بڑھ جائے گا۔

(۴) کمیت عمل: عمل کی مقدار وتعداد کے لحاظ سے افضلیت کا ثبوت۔ مثلاً دو شخص فرائض کی ادائے گی میں برابر ہوں لیکن ان میں سے ایک کی نفلیں دوسرے سے زائد ہوں تو اس زیادتی مقدار کی بناء پر اسے افضلیت ہوگی۔ جیسا کہ حدیث پاک میں ہے کہ دو اصحاب بیک وقت مشرف بہ اسلام ہوئے اور ساتھ ہی ہجرت بھی کی پھر ان میں سے ایک صاحب کسی جہاد میں شہید ہوگئے اور دوسرے حیات سے رہے۔ ان دونوں حضرات کے

متعلق ایک سلسلۂ گفتگو میں بعض حضرات صحابہ نے کہا کہ شہید کا مقام ومرتبہ اپنے ساتھی کے اعتبار سے بلند ہے آں حضرتؐ کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو آپ نے فرمایا ’’فاین صلوٰته بعدصلوٰته وصیامه بعد صیامه‘‘ (شہید کے بعد زندہ رہنے والے کی نماز اور روزے کہاں جائیں گے، مطلب یہ تھا کہ اگر ایک کو شہادت کا شرف حاصل ہے تو دوسرے کے لئے زیادتی صلوۃ وصوم کی فضیلت متحقق ہے۔ اس لئے ایک کو دوسرے پر ترجیح دینے کا کسی کو حق نہیں ہے۔

(۵) زمان عمل۔ یعنی کبھی وقت کے لحاظ سے عمل کی اہمیت اور فضیلت بڑھ جاتی ہے۔ مثلاً ابتداء اسلام میں یا مسلمانوں کی زبوں حالی کے وقت جہاد اور صدقہ وخیرات کرنا یقینی طور پر اس جہاد اور صدقہ وخیرات سے افضل ہوگا جو اسلام کی شوکت اور مسلمانوں کے استغناء کے زمانہ میں کیا جائے۔ چنانچہ ایک موقع پر آں حضرت ...... نے صحابہ سابقین رضی اللہ عنہم کی دیگر حضرات پر افضلیت کو بیان کرتے ہوئے فرمایا: ’’لو انفق احدکم مثل اُحد ذهبا ما بلغ مد احدهم ولا نصیفه‘‘ (یعنی بالفرض اگر تم میں سے کوئی احد پہاڑ کے برابر سونا اللہ کی راہ میں خرچ کردے جب بھی وہ ثواب میں ان حضرات کے ایک مد (تقریباً آدھ سیر) بلکہ نصف کے برابر بھی نہیں پہنچ سکتا) اللہ تعالیٰ نے بھی قرآن حکیم میں زمان عمل کی اہمیت کو ان الفاظ میں واضح فرمایا ہے۔ ’’لَا يَسْتَوِیْ مِنْكُمْ مَنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ اُولٰٓئِكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِنَ الَّذِيْنَ اَنْفَقُوْا مِنْ بَعْدُ وَقَاتَلُوْا‘‘ (فتح مکہ سے پہلے اللہ کی راہ میں خرچ کرنے اور جہاد کرنے والے اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان لوگوں کے اعتبار سے اعلیٰ وارفع ہیں جنھوں نے فتح مکہ کے بعد انفاق وجہاد کیا)

اسی طرح تنگ دستی اور احتیاج کی حالت میں یا صحت وتندرستی کے وقت اللہ کے راستہ میں ایک روپیہ خرچ کرنا ثروت وتمول کی حالت میں کثیر رقم صدقہ کرنے اور بیماری اور حیات سے ناامیدی کی حالت میں ہزاروں کی وصیت سے بہتر ہوگا۔ یوں ہی جو فرائض اور عبادات، خوف، مرض، سفر، مشقت، قلت فرصت اور کثرت موانع کے وقت ادا کی جائیں وہ اطمینان وراحت اور صحت وفراغت کے وقت کی عبادتوں سے افضل قرار پائیں

گی چنانچہ ارشاد ہے عمرة فی رمضان یعدل بحجة ومن تقرّب فیه بخصلة من الخیر کان کمن ادّی فریضة مما سواه ومن ادّی فریضة فیه کان کمن ادّی سبعین فریضة فیما سواه۔ (ماہ رمضان میں عمرہ ادا کرنا حج کے برابر ثواب رکھتا ہے۔ اور جو شخص اس مبارک مہینہ میں نفلی عبادت بجالائے تو اس کا ثواب غیر رمضان کے فرض کی طرح ہوگا اور اس ماہ کے ایک فرض کا ثواب دوسرے مہینوں کے ستر فرائض کے برابر ہوتا ہے) اسی طرح فرمایا گیا کہ ”افضل الصیام بعد شهر رمضان شهر اللّٰه المحرم“ رمضان کے روزوں کے بعد افضل ترین ماہ محرم (عاشورۂ محرم) کے روزے ہیں۔ اسی طرح اشہر حرام (ذی قعدہ، ذی الحجہ، محرم اور رجب کے مہینے) میں دیگر مہینوں کے اعتبار سے اعمال کے ثواب میں اضافہ ہوجاتا ہے۔

(۶) مکان عمل۔ یعنی عبادت کے مکان ومحل کے اعتبار سے بھی فضائل میں اضافہ ہوتا ہے۔ چنانچہ احادیث سے ثابت ہے کہ جو نماز مسجد حرام یا مسجد نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں پڑھی جائے وہ دیگر مقامات میں ادا کی ہوئی ہزاروں نمازوں سے افضل ہے۔ اسی طرح دار الحرب میں جہاد کے موقع پر روزہ رکھنا دوسرے مقام کے روزہ سے افضل ہوتا ہے حدیث پاک میں ہے ”من صام یوماً فی سبیل اللّٰه حرم اللّٰه علی النار“ (جس شخص نے جہاد کے موقع پر روزہ رکھا اللہ تعالیٰ اس پر جہنم کی آگ حرام کردیں گے)

(۷) امور خارجی۔ عمل کے ساتھ خارج سے کوئی ایسی چیز آکر مل جائے جس سے عمل کے ثواب میں اضافہ ہوجائے۔ یہ سبب خارجی کبھی تو خود عمل کرنے والے کی اپنی ذات ہوتی ہے۔ اور کبھی عمل کرنے والے کے ساتھ کسی دوسرے کی شرکت ومقارنت اضافہ فضیلت کا سبب ہوجاتی ہے۔ جیسے نبی (......) کی ایک رکعت غیر نبی کی ہزاروں رکعتوں سے افضل ہوتی ہے۔ نبی ورسول کے ساتھ ادا کی ہوئی نماز دیگر نمازوں کے مقابلہ میں بدرجہا اعلیٰ ہوگی۔ اسی بناء پر وہ صدقہ وخیرات اور روزہ وجہاد جو خود نبی کریم...... سے عمل میں آئے یا آپ...... کی معیت وصحبت میں حضرات صحابہؓ سے وقوع پذیر ہوئے۔ دیگر صدقات، صیام اور جہاد سے ہزاروں درجہ بڑھے ہوئے ہیں۔ اسی اصول کے پیش

نظر حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم اپنے ان اعمال و عبادات کو جو آں حضرت ...... کے بعد انجام دیئے تھے وہ درجہ نہیں دیتے تھے جو درجہ اور مقام آپ کی معیت وصحبت میں کئے ہوئے اعمال کو دیتے تھے۔ قرآن پاک میں متعدد جگہوں پر اس کے اشارات موجود ہیں چنانچہ ایک جگہ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:

”لٰكِنِ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ آمَنُوْا مَعَهٗ جَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْخَيْرَاتُ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ“ (لیکن رسول خدا اور جو لوگ ان کے ساتھ ایمان لائے اور اپنی جان و مال کے ساتھ جہاد کیا انھیں کے لئے تمام بھلائیاں ہیں اور وہی کامیاب ہیں)

اسی سے ابو ہاشم جبائی (معتزلی) کا یہ نظریہ کہ ”اگر کسی شخص کو طویل عمر مل جائے تو اس کے اعمال نبی کے اعمال کے برابر ہو سکتے ہیں“ پادر ہوا ہو جاتا ہے علاوہ ازیں اس تفصیل سے یہ بات بھی روز روشن کی طرح آشکارا ہو گئی کہ — جماعت صحابہ میں سے حضرت انس بن مالک، ابو امامہ باہلی، عبداللہ بن بشیر، عبداللہ بن الحارث، سہل بن اسعد ساعدی اور جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہم جنھوں نے طویل عمریں پائیں اور کثرت سے اعمال خیر کئے۔ وہ حضرت ابوبکر صدیق، عمر فاروق، عثمان غنی، علی مرتضیٰ، ابوعبیدہ بن الجراح، زید بن حارثہ، جعفر بن ابوطالب، مصعب بن عمیر، عبداللہ بن جحش، سعد بن معاذ اور عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہم کے مقام و مرتبہ کو نہیں پہنچ سکتے حالانکہ اول الذکر حضرات میں سے بعض ثانی الذکر حضرات کے بعد لگ بھگ اسّی نوّے سال تک حیات رہے اور طاعات و عبادات میں لگے رہے۔ لہٰذا یہ بات پورے یقین و وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ جو شخص آں حضرت ...... کی وفات کے وقت دوسروں سے افضل تھا، آں حضرت ...... کی وفات کے بعد دوسرے لوگ اعمال کے ذریعہ اس کے مقام و مرتبہ کو نہیں پہنچ سکتے۔

ثمرۂ فضیلت

فضیلت خواہ اختصاصی ہو یا اکتسابی اس سے دو فوائد حاصل ہوتے ہیں: اول یہ کہ

اللہ تعالیٰ دنیا میں مفضول یعنی کم درجہ رکھنے والے پر افضل کی تعظیم وتکریم واجب کردیتے ہیں۔ اس عزت افزائی میں تمام افاضل اور بلند درجہ کے حاملین شریک ہیں چاہے وہ جمادات، حیوانات اور اعراض سے تعلق رکھتے ہوں جیسے خانہ کعبہ، حجر اسود، مساجد، یوم جمعہ، ماہ رمضان اور ناقۂ حضرت صالح علیہ السلام وغیرہ۔ یا انسان اور ملائکہ کی جماعت سے متعلق ہوں جیسے حضرات انبیاء، صحابہ کرام، ازواج مطہرات وغیرہ کہ حکم تعظیم ان سب کو عام ہے اور ان میں سے سب ہی کی تعظیم وتکریم واجب ہوگی۔

اور فضیلت کا دوسرا نتیجہ یہ ہے کہ آخرت میں انھیں قرب ومنزلت کے اس اعلیٰ و ارفع مقام سے سرفراز کیا جائے گا کہ ان سے کم مرتبہ کو یہ مقام ومرتبہ حاصل نہ ہوسکے گا فضیلت کے یہ دونوں ثمرات چونکہ جنات اور انسان کے ساتھ مخصوص ہیں ان کے علاوہ کسی اور میں نہیں پائے جاتے اسی وجہ سے ان دونوں (جن وانس) کے سوا فضیلت اکتسابی کا ثبوت کسی چیز میں نہیں پایا جاتا۔ یہیں سے یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ دخول جنت بھی کبھی محض اختصاصی طور پر بغیر کسی عمل کے ہوتا ہے جیسے عام مؤمنین اور حضرات انبیاء علیہم السلام کے کمسن بچے کہ انھیں بغیر کسی عمل کے جنت عطا کی جائے گی۔

اور فضیلت کے اس نتیجہ سے یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ شریعت نے جن چیزوں کی تعظیم وتکریم کا حکم ہمیں دیا ہے وہ سب کی سب صاحب فضیلت ہیں۔ اس موقع پر یہ شبہ نہیں ہونا چاہئے کہ ''کافر والدین کی تعظیم کا شریعت نے ہمیں حکم دیا ہے۔ حالانکہ ان کے اندر قطعاً کوئی فضیلت نہیں ہے'' کیونکہ شریعت کی جانب سے ہمیں کافر والدین کی جس تعظیم کا حکم ہوا ہے وہ حقیقت میں تعظیم نہیں ہے؛ بلکہ حسنِ سلوک اور مروت کا معاملہ ہے اور کسی کے ساتھ مروت اور حسن سلوک سے پیش آنے کے لئے اس کا صاحب فضل ہونا ضروری نہیں ہے۔

مدار فضیلت اور اس کے ثمرات ونتائج کی وضاحت کے بعد اب حضرات صحابہ اور ازواج مطہرات واولاد اطہار کے مابین فرق مراتب اور ان کی ایک دوسرے پر فضیلت و بزرگی محقق طور پر معلوم کرنے کے لئے درج ذیل مقدمات اور اصول کو پیش نظر رکھنا ضروری

ہوگا کیونکہ ان مقدمات کو ذہن نشین کئے بغیر اس مقدس جماعت کے باہمی فرق مراتب اور ان کی ایک دوسرے پر فضیلت و برتری کا صحیح طور پر معلوم کرنا نہایت دشوار ہے۔

مقدمہ ۱ ازواج مطہرات کی عظمت۔ یہ امر قطعی اور یقینی طور پر ثابت ہے کہ خدا کی عظمت و کبریائی کے بعد رسول خدا کی تعظیم و تکریم واجب ہے، اور صرف تعظیم ہی نہیں بلکہ تعظیم کا وہ درجہ مطلوب ہے جس میں حضرات انبیاء کے سوا کوئی اس تعظیم و تکریم میں ان کا شریک و سہیم نہیں ہوسکتا ہے۔ پھر حضرات انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے بعد آں حضرت ...... کی ازواج مطہرات کا استحقاق تعظیم نص قرآن سے اس طور پر ثابت ہے کہ دوسرے لوگوں کے لئے اس طرح کا استحقاق ثابت نہیں۔ ارشاد حق جل مجدہ ہے "اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالمؤمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِہِمْ وَاَزْوَاجُہٗ اُمَّہَاتُہُمْ" نبی (......) مؤمنین کے ان کی جانوں سے زیادہ قریب ہیں اور ان کی بیویاں مومنین کی مائیں ہیں۔ اس آیت پاک سے ثابت ہوتا ہے کہ ازواج مطہرات کے حق میں نبی کریم ...... کی صحبت کی فضیلت اکثر حضرات صحابہ کے اعتبار سے قوی تر ہے کیونکہ ان کی صحبت بلحاظ عام صحابہ کی صحبت کے ایک بلند مقام کی حامل ہے اس کے علاوہ امت کی دینی ماں ہونے کی ... خصوصیت نے ان کے استحقاق تعظیم کو مزید دوبالا کر دیا ہے۔

مقدمہ ۲ جس وقت کسی ایک کی دوسرے پر فضیلت کے بارے میں گفتگو ہو تو اس وقت جہت فضیلت کو پیش نظر رکھنا ضروری ہوگا کیونکہ دو چیزوں کے درمیان ایک کی دوسرے پر فضیلت اسی وقت متحقق ہوسکتی ہے جبکہ دونوں میں جہت فضیلت ایک ہو اور پھر اس جہت میں ان کے اندر کمی و بیشی ہو اور اگر دونوں کے فضائل مختلف جہت سے ہوں تو ان میں باہم تفاضل اور ایک کی دوسرے پر بڑائی متحقق نہیں ہوسکتی۔ لہٰذا اگر مکہ معظّمہ اور مدینہ منورہ کے بارہ میں سوال کیا جائے کہ ان دونوں میں افضل کون ہے تو اس کے جواب میں یہ کہنا کہ رمضان المبارک افضل ہے یا ناقۂ حضرت صالح بہتر ہے درست نہ ہوگا۔ کیونکہ مکہ معظّمہ و مدینہ منورہ کی وجہ فضیلت اور ہے اور رمضان المبارک اور ناقۂ حضرت صالح علیہ السلام کی وجہ فضیلت اور۔ البتہ اگر یہ پوچھا جائے کہ ناقۂ حضرت صالحؑ افضل

ہے یا آں حضرت ...... کی اونٹنی عضباء تو اس کے جواب میں ناقۂ صالح یا ناقۂ عضباء کہنا صحیح ہوگا کیونکہ دونوں میں جہت فضیلت متحد ہے اب جس کے اندر یہ جہت قوی ہوگی اسے اپنے مقابل پر فضیلت ہوگی۔

اس تفصیل سے یہ واضح ہوگیا کہ آں حضرت ...... کے صاحبزادے حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کی فضیلت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے مقابلہ میں ثابت نہ ہوگی کیونکہ دونوں حضرات کے درمیان وجہ فضیلت مختلف ہے۔ کہ حضرت ابراہیمؓ کی فضیلت کسی عمل کی بنیاد پر نہیں ہے بلکہ محض اختصاصی ہے۔

مقدمہ ۳ جنت میں درجات کی بلندی کبھی کسی کی تبعیت اور طفیل میں ہوتی ہے جیسے آنحضرت ...... کی کمسن اولاد کے مدارج کی بلندی آں حضرت ...... کی تبعیت اور طفیل میں ہے اس طرح کی بلندئ درجات فضیلت اکتسابی پر افضلیت کو ثابت نہیں کرتی یعنی جو فضیلت عمل اور طاعت کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے اس سے یہ بلندی درجات کی فضیلت جو کسی کے طفیل میں حاصل ہوتی ہے اعلیٰ اور افضل نہیں ہوگی۔

اور کبھی یہ بلندی درجات اصالتاً اپنے عمل کے مقابلہ میں حاصل ہوتی ہے یہ بلندی درجات فضیلت اکتسابی پر افضلیت کو ثابت کرے گی مثلاً دو آدمیوں کو ان کے عمل کے عوض میں بلند درجہ ملا ہے لیکن ان میں سے ایک کا درجہ دوسرے سے بلند ہے تو یہ بلندئ درجات اس فضیلت اکتسابی کے مقابلہ میں افضلیت پر دلالت کرے گا جس کے عوض میں کم تر درجہ حاصل ہوا ہے۔

اسی طرح جنت میں داخل ہونا، حوض کوثر پر پہلے پہنچنا یا حساب و کتاب میں سابق ہونا بھی انھیں دو قسموں پر ہے یعنی کسی کو یہ امور تبعاً حاصل ہوں گے اور کسی کو اصالتاً اپنے عمل کے بدلہ میں پہلی قسم فضیلت اکتسابی پر افضلیت کو ثابت نہیں کرے گی دوسری قسم اس افضلیت پر دلالت کرے گی۔ چنانچہ انھیں امور مذکورہ (یعنی شفاعت وحساب و کتاب اور حوض کوثر پر پہنچنے وغیرہ) میں امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا حضرات انبیاء پر تقدم آں حضرت ...... کی تبعیت اور طفیلی ہونے کے طور پر ہے چنانچہ ارشاد ربانی ہے "ھُمْ

وَاَزْوَاجُهُمْ فِیْ ظِلَالٍ عَلَی الْاَرَائِكِ مُتَّكِئُوْنَ" وہ لوگ اور ان کی بیویاں جنت کے سایہ میں آراستہ تختوں پر مسند نشیں ہوں گے۔ دوسری جگہ ارشاد ہے "وَ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّیَّتَهُمْ" ہم نے ان کے ساتھ ان کی اولاد کو لاحق کر دیا۔ لہٰذا یہ تقدم وسبقت حضرات انبیاء کے مقابلہ میں امت محمدیہ کی فضیلت پر دلالت نہیں کرے گا۔

مقدمہ ۴ سیادت (سرداری) اور فضیلت دو الگ الگ حقیقتیں ہیں کیونکہ سیادت تو صاحب سیادت کی ذاتی شرافت کو بتاتی ہے۔ لہٰذا آں حضرت...... کی اولاد اطہار اس ذاتی بزرگی کی بناء پر جو انھیں حاصل ہے سادات اور سردار ہیں اور فضیلت کا مدار عمل کی جزا پر ہے یعنی صاحب عمل کو فضیلت بطور عمل کی جزاء کے عطا ہوتی ہے۔

اسی طرح امارت کے لئے فضیلت لازم نہیں ہے بلکہ بسا اوقات اعلیٰ کے مقابلہ میں ادنیٰ کو امارت مل جاتی ہے چنانچہ حضرت عمرو بن عاص کی امارت کے وقت حضرت عمر فاروق کو ان کی اطاعت کے لئے مامور کیا جانا اس کی واضح دلیل ہے۔ اسی طرح حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کی امارت کے موقع پر اکابر صحابہ مثلاً حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت علی وغیرہ رضی اللہ عنہم کو ان کی اطاعت پر مامور کیا گیا۔ اس سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ کسی شخص کی اطاعت کا کسی پر واجب ہونا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ جس کی اطاعت واجب کی گئی ہے وہ اطاعت گذاروں سے افضل اور بزرگ تر ہے۔

مقدمہ ۵ جس وقت فضیلت کی مذکورہ سات وجوہ میں باہم تعارض واقع ہو جائے تو کتاب وسنت کی روشنی میں طے کر لینا چاہئے کہ ان متعارض وجوہ میں سب سے زیادہ قابل اہمیت اور لائق اعتبار کون سی وجہ ہے چنانچہ شریعت سے یہ بات یقینی طور پر ثابت ہے کہ کیفیت عمل کے مقابلہ میں کمیت (مقدار) عمل کا چنداں لحاظ نہیں ہے۔ اسی طرح خود کمیت و کیفیت کا زمان عمل کے مقابلے میں کم درجہ ہے حق تعالیٰ کا ارشاد ہے "لَا یَسْتَوِیْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ" تم میں سے جس نے فتح مکہ سے پہلے اللہ کی راہ میں خرچ کیا اور جہاد کیا وہ دوسروں کے برابر نہیں ہوں گے۔ اور احادیث صحیحہ سے یہ امر واضح ہے کہ حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے جو اعمال آں حضرت......

کی معیت اور صحبت میں کیئے ان کے مقام و مرتبہ کو ان کے بعد کے اعمال نہیں پہنچ سکتے۔ اور یہ بات بھی قطعی طور پر معلوم ہے کہ آں حضرت ...... کے عمل کے برابر کسی کا عمل نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا اصحابہ کرام جس عمل میں آں حضرت...... کے ساتھ شریک رہے ہوں اس کے مقام و مرتبہ تک کسی دوسرے عمل کی رسائی ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ شرکت جماعت کی بناء پر ایک نور وحدانیت پیدا ہوجاتا ہے جس سے صحابہ کا عمل آں حضرت ...... کے ہم رنگ ہوجاتا ہے۔ جیسے مرکب دواؤں میں مزاج کی ایک کیفیت وحدانیت پیدا ہوجاتی ہے کہ مرکب کے ہر ہر جز میں باہمی تشابہ رونما ہوجاتا ہے۔ (نماز جماعت کی مشروعیت کی ایک اہم ترین وجہ یہی ہے) اس اعتبار سے تمام حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کو پوری امت پر عظیم بزرگی اور فضیلت حاصل ہے پھر اس مقدس اور پاکباز جماعت کے درمیان حسب تصریح آیت کریمہ ”لَا يَسْتَوِيْ مِنْكُمْ“ الخ سبقت تقدم کا اعتبار ہوگا کہ جو حضرات پہلے مشرف بہ اسلام ہوئے وہ بعد والوں سے افضل ہوں گے کیونکہ جس قدر زمانی تقدم اور سبقت ہوگی اسی قدر... اسلام کی نصرت، تائید اور تقویت کی احتیاج بھی زیادہ ہوگی چنانچہ ایک موقع پر آں حضرت...... نے دیگر حضرات صحابہ کے مقابلہ میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی افضلیت کو بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ”فقال صدقت وقلتم كذبت“ انھوں نے (ابوبکر صدیق) ابتداء میں میری تصدیق کی اور تم لوگوں نے اس وقت میری تکذیب کی۔ اس اعتبار سے وہ حضرات صحابہ جو ہجرت سے پہلے مکی زندگی ہی میں اعمال اسلامی پر عمل پیرا تھے ان حضرات سے افضل ہوں گے جو اس کے بعد ان اعمال پر کاربند ہوئے مثلاً ابوبکر صدیق، عثمان غنی، علی مرتضیٰ، عثمان بن مظعون، طلحہ، زبیر، مصعب بن عمیر، عبدالرحمٰن بن عوف، عبداللہ بن مسعود، سعید بن زید، زید بن حارثہ، ابوعبیدہ، بلال، سعد، عمار بن یاسر، ابوسلمہ بن الاسد، عبداللہ بن جحش وغیرہم رضی اللہ عنہم اجمعین جو بالکل ابتداء ہی میں حلقہ بگوش اسلام ہوگئے تھے۔ دوسروں سے زیادہ افضل ہوں گے۔ ان کے بعد ان حضرات کا درجہ ہوگا جنھوں نے ہجرت سے پہلے عقبۂ اولیٰ میں شرف بیعت حاصل کیا، پھر عقبہ ثانیہ میں بیعت کرنے والے حضرات ہوں گے، پھر غزوۂ بدر میں

شریک ہونے والے حضرات کا مقام و مرتبہ ہوگا۔ پھر غزوہ بدر کے بعد دیگر غزوات میں شرکت کرنے والے تاریخ وسن کی ترتیب کے موافق ایک دوسرے سے افضل ہوں گے۔ یہ سلسلہ غزوۂ حدیبیہ تک جاری وساری رہے گا۔ کیونکہ ان تمام غزوات میں شریک ہونے والوں پر سکینہ کا نزول اوران کے قلوب کا پاک وصاف ہونا حسب تصریح قرآن مجید ثابت ہے۔ لیکن غزوۂ حدیبیہ کے بعد کوئی غزوہ ایسا نہیں ہے جس میں شرکت کو معیار فضیلت قرار دیا جائے کیونکہ اس کے بعد تمام غزوات میں منافقین بھی شریک ہوئے ہیں۔

افضل کی تعین کا طریقہ

ان مقدمات کی تفصیلات کے بعد ہمارے لئے اب یہ موقع آ گیا ہے کہ ہم یہ فیصلہ کرسکیں کہ حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہ اجمعین میں سب سے افضل کون بزرگ ہیں اور اس ساری خامہ فرسائی کا مقصد بھی یہی ہے کیونکہ اختلاف اور نزاع اسی مسئلہ میں ہے کہ حضرات خلفاء اربعہ میں افضلیت کے مقام پر کون فائز ہے، اولیت سابقیت اور قدیم الایمان ہونے کی صفت میں تو یہ چاروں حضرات باہم مشترک اور مساوی ہیں اور دوسرے اکثر حضرات صحابہ سے اس شرف میں سبقت اور تقدم رکھتے ہیں۔ اس لئے اس کے اعتبار سے کسی ایک کو دوسرے پر افضلیت نہیں دی جاسکتی۔ لہٰذا ان حضرات کے درمیان فرق مراتب کی تعیین میں ہمیں دو چیزوں کی جانب رجوع کرنا ہوگا۔ کیونکہ افضل واعلیٰ کو متعین کرنے کی بس یہی صورت ہے اول نبی کریم ...... کی احادیث پاک دوم ان حضرات کے احوال واعمال کی تلاش وجستجو، یعنی پہلے ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ ان حضرات کے بارے میں آنحضرت ...... کے جو ارشادات ہیں ان میں سے کس کی سب پر فضیلت اور بزرگی بیان کی گئی ہے، بعض حضرات کا خیال ہے کہ احادیث سے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کیوں کہ اس سلسلہ کی احادیث باہم متعارض ہیں، لیکن یہ خیال درست نہیں ہے کیونکہ باہمی تعارض اس وقت پیش آتا جبکہ دو اصحاب کے بارہ میں ایک ہی مفہوم کے الفاظ وارد ہوئے ہوں اور ان سے دونوں کی بزرگی اور بڑائی یکساں طور پر ثابت ہوتی ہو حالانکہ احادیث کے مطالعہ سے

یہ ثابت ہوتا ہے کہ واقعہ ایسا نہیں ہے کیونکہ حضرات شیخین (صدیق اکبر و فاروق اعظم) رضی اللہ عنہما کے لئے احادیث میں لفظ ''افضل و خیر'' آیا ہے اور سیادت احبّیت، اور شرف کے الفاظ حضرت علی مرتضٰی، حضرت فاطمۃ الزہراء، اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہم کے متعلق وارد ہوئے ہیں اور گذشتہ تفصیلات سے معلوم ہو چکا ہے کہ یہ الفاظ فضیلت اختصاصی کو ظاہر کرتے ہیں اور ''افضل'' و ''خیر'' سے فضیلت اکتسابی و جزائی ثابت ہوتی ہے۔ اس لئے ان روایات میں سرے سے تعارض ہی نہیں ہے۔

اعمال کی تحقیق اور حضرت ابو بکر صدیق کی افضلیت کا اثبات

دوسرا طریقہ جس کی روشنی میں کسی کی، افضلیت کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے وہ احوال و اعمال کی تحقیق و تفتیش ہے شریعت نے جن اعمال کی وجہ سے کسی کو مستحق فضیلت اور بزرگی قرار دیا ہے ان میں اہم ترین حسب ذیل ہیں:

(۱) جہاد (۲) علم (۳) تقویٰ (۴) زہد (۵) انفاق فی سبیل اللہ (۶) حسن سیاست۔ اب ہمیں دیکھنا ہے کہ ان اوصاف و اعمال میں حضرات خلفاء اربعہ میں سے کس کا درجہ بلند ہے، پھر اسی کی روشنی میں اس اختلافی مسئلہ میں فیصلہ ہوگا۔

(۱) جہاد، اسلام میں جہاد ایک عظیم فریضہ ہے قرآن و حدیث میں اس کی اہمیت و فضیلت کو بڑے اہتمام سے بیان کیا گیا ہے، اسی لئے ان اعمال میں جو مدار فضیلت ہیں یہ ایک اہم ترین عمل ہے، جہاد کی تین قسمیں ہیں: (۱) جہاد باللسان، زبان سے اسلام کی دعوت و تبلیغ کا فریضہ انجام دینا اور وعظ و نصیحت کے ذریعہ اسلام کی اشاعت کی سعی و کوشش بجالانا (۲) جہاد بالرائے، یعنی عقل و تدبیر اور رائے و مشورہ سے مسلمانوں کے اندر اجتماعیت اور استحکام پیدا کرنا، اور حکمت عملی سے دشمنوں کے دلوں میں رعب بیٹھانا اور ان کی صفوں میں انتشار پیدا کرنا۔ (۳) جہاد بالید۔ تیر و تلوار وغیرہ سے دشمنان اسلام کا مقابلہ کرنا اور حرب و ضرب کے ذریعہ اشاعتِ اسلام کی راہ سے رکاوٹیں دور کرنا اور اسلام کی سربلندی کی کوشش کرنا۔

یہ بات یقینی طور پر معلوم ہے کہ آنحضرت ...... شجاعت اور بہادری میں تمام انسانوں سے بڑھے ہوئے تھے اور یہ بات بھی متحقق ہے کہ آنحضرت ...... کی پوری زندگی جہاد باللسان اور جہاد بالرائے میں گزری ہے۔ جہاد بالید میں آپ مشغول نہیں ہوئے (اِلاّ نادراً)، اس لئے جہاد کی پہلی دوقسمیں تیسری اور آخری قسم سے لازمی طور پر اعلیٰ اور افضل ہیں ورنہ لازم آئے گا کہ،

آپ ...... نے اعلیٰ وافضل کو چھوڑ کر ادنیٰ اور کمتر کو اختیار فرمایا اور یہ ممکن نہیں تاریخ و سیر اور آثار واحادیث سے ثابت ہے کہ جہاد باللسان اور جہاد بالرائے میں حضرت صدیق اکبر اور حضرت فاروق اعظم تمام حضرات صحابہ پر سبقت اور فوقیت رکھتے ہیں۔ کیوں کہ اسلام کے بالکل ابتدائی دور میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی دعوت وتبلیغ سے حضرت عثمان غنی، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف، حضرت زبیر اور حضرت طلحہ وغیرہ (رضی اللہ عنہم) جیسے اجلّہ صحابہ حلقۂ اسلام میں داخل ہوئے جس سے اسلام کی ترقی اور اشاعت کی راہیں کھلیں۔ اور حضرت فاروق اعظم کے اسلام سے اسلام اور مسلمانوں کو جو عزت و شوکت حاصل ہوئی ہے وہ تاریخ اسلام کا ایک روشن باب ہے، آپ کے اسلام سے پہلے مسلمانوں کی کس مپرسی اور بیچارگی کا یہ عالم تھا کہ آزادی کے ساتھ وہ اسلامی شعائر کی بجا آوری نہیں کر سکتے تھے، لیکن جس دن سے حضرت فاروق اعظم زمرۂ اسلام میں شامل ہوئے اسی دن سے مسلمان اعلانیہ طور پر اسلامی عبادات واعمال کو ادا کرنے لگے۔

رائے اور مشورہ میں بھی یہ دونوں حضرات ہمیشہ آنحضرت ...... کے مشیر اور وزیر کی حیثیت سے آپ ...... کے شریک رہے اور کوئی غزوہ اور مہم ان دونوں حضرات کے مشورہ کے بغیر واقع نہیں ہوا۔ علاوہ ازیں آنحضرت کی زندگی میں مسلمانوں کے اندر اجتماعیت و استحکام پیدا کرنے اور مشرکین کی صف میں انتشار واختلال برپا کرنے میں ان دونوں حضرات نے دیگر حضرات صحابہ کے مقابلہ میں بہت زیادہ خدمات انجام دی ہیں یہاں تک کہ مشرکین بطور خاص ان ہر دو بزرگوار کے وجود سے نہایت خائف اور بدل وجان ان کی ہلاکت کے آرزومند وخواہاں تھے چنانچہ غزوہ احد کے آخر میں ابوسفیان نے حضرات

صحابہ میں سے انھیں دونوں حضرات کے بارے میں پوچھا تھا کہ کیا یہ دونوں ہلاک ہو گئے یا زندہ ہیں؟ ان تفصیلات سے محقق طور پر ثابت ہو گیا کہ حضرات شیخین رضی اللہ عنہما کا جہاد دوسرے حضرات صحابہ مثلاً حضرت علی مرتضیٰ، حضرت زبیر، حضرت حمزہ، حضرت مصعب بن عمیر، حضرت ابوطلحہ، حضرت سعد بن معاذ، حضرت سماک بن حرب رضی اللہ عنہم اجمعین کے جہاد سے افضل اور اعلیٰ ہے اس کے باوجود حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو تیسری قسم یعنی جہاد بالید میں بھی مشارکت حاصل ہے کما یدل علی ذلک التواریخ۔

(۲) علم ۔ فضیلت کے اسباب میں سے ایک سبب علم بھی ہے چنانچہ ارشاد خداوندی ہے کہ قل ھل یستوی الذین یعلمون والذین لایعلمون (آپ کہہ دیجیے کہ اہل علم اور بے علم برابر نہیں ہیں؟)

کہا جاتا ہے کہ حضرات صحابہ میں علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کا مرتبہ علمی اعتبار سے سب سے بلند ہے۔ میں کہتا ہوں کہ علم کی زیادتی کا پتہ دو طریقہ سے لگایا جا سکتا ہے: اول کثرتِ روایات حدیث اور دوسرے آنحضرت ...... کا کسی کو ایسا کام سپرد کرنا جو علم سے تعلق رکھتا ہو کیونکہ نبی کریم ...... کسی کام کی ذمہ داری اسی شخص کے سپرد کرتے تھے، جو اس کا سب سے زیادہ اہل اور مستحق ہوتا تھا۔ اور یہ بات قطعی طور پر معلوم ہے کہ آنحضرت ...... نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو نماز، حج اور جہاد میں امام اور امیر بنایا ہے اور حضرت فاروق اعظم کو صدقات وزکوٰۃ کی وصولیابی کے لئے عامل مقرر فرمایا ہے، علاوہ ازیں کتب احادیث سے یہ بھی معلوم ہے کہ صدقات سے متعلق اکثر روایتیں صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ہی کے واسطہ سے امت تک پہنچی ہیں۔ مسائل زکوٰۃ کی تشریح وتفصیل انھیں سے منقول ہے اور زکوٰۃ کے سلسلہ میں جو حدیث حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے واسطہ سے منقول ہے وہ محدثین کے نزدیک درجۂ صحت تک نہیں نہیں پہنچ سکی ہے مزید براں اس میں ایک ایسا وہم موجود ہے جس کی بناء پر علماء اسلام میں سے کسی نے اسے اپنا معمول نہیں بنایا۔ نیز یہ بھی ثابت ہے کہ حضرات شیخین سفر وحضر ہر موقع پر آنحضرت ...... کے رفیق صحبت وشریک مشورہ رہتے تھے اور ظاہر ہے کہ علم کامل کے بغیر حضور انہیں اپنا مشیر و وزیر نہیں بنا سکتے تھے

پھر آنحضرت ...... کی صحبت و رفاقت جس قدر دراز ہوگی اسی اعتبار سے احکام وفتویٰ کی معلومات میں زیادتی ہوگی۔

رہا معاملہ کثرت روایات وفتویٰ کا تو چونکہ آنحضرت ...... کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو زندگی کا بہت ہی کم موقع ملا اس کے علاوہ آپ کا دور صحبت نبوی ...... سے بالکل قریب اور متصل تھا اس لئے لوگوں کو آپ سے روایت حدیث کی چنداں ضرورت بھی نہیں تھی پھر آپ حج وغیرہ کے علاوہ کبھی مدینہ سے باہر سفر میں بھی نہیں نکلے کہ دور دراز مقامات کے لوگ آپ سے روایت حاصل کرتے کثرتِ روایت کے ان موانع کے باوجود ایک سو پینتالیس احادیث صحیحہ، آپ کے واسطہ سے مروی ہیں جنہیں کبار صحابہ نے آپ سے روایت کیا ہے جس میں حضرت علی مرتضیٰ، حضرت عمر فاروق اور حضرت عثمان غنی بھی شامل ہیں، اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ آں حضرت ......کی وفات کے بعد تقریباً تیس (۳۰) سال، تک حیات رہے، طول طویل اسفار بھی کئے اور عہد نبوت سے بعید ہونے کی بناء پر لوگوں کو آپ سے روایت حدیث کی احتیاج بھی زیادہ تھی کثرت روایت کے ان اسباب ومواقع کے باوجود آپ کی کل مرویات صحیحہ کی تعداد پانچ سو چھیاسی (۵۸۶) سے زائد نہیں ہے۔ لہٰذا اگر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی مدت حیات سے دیگر حضرات صحابہ کی مدت حیات کا موازنہ کیا جائے اور آپ کے عہد کے مواقع روایت سے دوسروں کے مواقع روایت کا مقابلہ کیا جائے تو واضح طور پر معلوم ہو جائے گا کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا علمی مقام دیگر حضرات صحابہ کے مقابلہ میں بہت بلند ہے اسی پر ان کے فتویٰ کو بھی قیاس کرنا چاہیے۔

اور کمال علمی میں یہی مقام حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا بھی ہے کیوں کہ ان کی مرویاتِ مسندہ کی تعداد پانچ سو سینتیس (۵۳۷) ہے اور فتاویٰ تو ان کے بے شمار ہیں حتی کہ ہر مسئلہ فقہیہ میں ان کا فتویٰ موجود ہے علاوہ ازیں عقائد، تفسیر اور تصوف کے باب میں بھی آپ نے داد تحقیق دی ہے اور اپنے پیچھے ان موضوعات پر ایک اچھا خاصا ذخیرہ چھوڑا ہے۔ چنانچہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی قدس سرہ نے اپنی معرکۃ الآراء تصنیف

’’ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء‘‘ میں ان تمام روایات کو جمع کر دیا ہے جو ایک مستقل کتاب کی حیثیت رکھتی ہیں اور یہ بات متحقق ہے کہ حضرت ...... کے بعد حضرت فاروق اعظم سے تقریباً سترہ (۱۷) سال زیادہ حضرت علی کو دنیا میں رہنے کا موقع ملا ہے کیونکہ حضرت فاروق اعظم کی وفات یکم محرم ۲۴ھ کو ہوئی ہے اور حضرت علی مرتضیٰ کی وفات کا سانحہ ۴۰ھ میں پیش آیا۔ مگر اس مدت دراز کے حاصل ہونے کے باوجود حضرت فاروق اعظم کی مرویات سے ان کی مرویات صرف انچاس (۴۹) زائد ہیں۔ اور اگر حضرت فاروق اعظم کی متانت تقریر، قوتِ تفہیم اور حسن تعلیم کو سامنے رکھا جائے تو دونوں حضرات کے درمیان نمایاں تفاوت نظر آئے گا، کیونکہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے زمانہ میں کوئی اختلافی مسئلہ منقح اور طے نہ ہوسکا برخلاف اس کے حضرت فاروق کے عہد میں بہت سارے مسائل طے ہوئے اس سے پتہ چلتا ہے کہ دوسروں کے بہ نسبت حضرت فاروق اعظم کا علم کئی گنا زیادہ تھا اور یہ حقیقت اس وقت اور منقح ہو کر سامنے آجائے گی جب دونوں حضرات کے مسانید و فتاویٰ کا باہم موازنہ ومقابلہ کیا جائے۔

علم کا ایک اہم ترین شعبہ علوم قرآن ہے اس باب میں بھی حسب تصریح مؤرخین و محدثین حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضرات شیخین پر فضیلت اور فوقیت حاصل نہیں ہے بلکہ سچی بات یہ ہے کہ اس فن میں تینوں حضرات کا درجہ مساوی اور برابر ہے۔ البتہ قرأت قرآن، کتابت قرآن، قرآن کے الفاظ کی حفاظت اور امت کو ایک قرأت پر جمع کرنے کے سلسلہ میں حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو ان تینوں حضرات پر سبقت حاصل ہے، لیکن حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے یہ تمام مساعی جمیلہ حضرات شیخین ہی کے جمع کردہ مصحف کی روشنی میں انجام دی ہیں اس لئے اس امر میں بھی حضرات شیخین ہی کو اولیت کا شرف حاصل ہے پھر آنحضرت ...... کا امامت نماز کیلئے حضرت صدیق اکبر کو منتخب فرمانا بھی یہی بتاتا ہے کہ حضرت علی مرتضیٰ علم وقرأت اور فقہ میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے بڑھے ہوئے نہیں تھے ورنہ لازم آئے گا کہ آپ ...... نے اعلیٰ کو نظر انداز کر کے غیر اعلیٰ کو ترجیح دی جو صاحب نبوت سے بعید ہے۔

(۳) **تقویٰ۔** اعمال فضیلت میں ایک اہم ترین عمل اتباع شریعت اور تقویٰ ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے "اِنّ اَکرَمَ کُمْ عِندَ اللّٰہِ اَتْقَاکُمْ" یقیناً تم میں سے سب سے باعزت اللہ کے نزدیک تمہارا سب سے بڑا متقی ہے کتاب وسنت اور آثار سے یقینی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ حضرت صدیق اکبر نے ایک کلمہ بھی کبھی آنحضرت ...... کی مرضی کے خلاف زبان سے نہیں نکالا۔ چنانچہ بدر کے قیدیوں سے فدیہ لینے کے معاملہ میں اسی طرح حدیبیہ میں صلح کے سلسلہ میں بعض کبار صحابہ نے رائے اور مشورہ کے درجہ میں اختلاف کیا مگر حضرت صدیق اکبر کی رائے ان دونوں موقعوں پر بھی نبی کریم ...... کے موافق رہی حتیٰ کہ ارادہ کے درجہ میں بھی آپ نے آنحضرت ...... کے فرمان کے خلاف کبھی نہیں سوچا اور نہ کبھی آپ ...... کے ارشادات ومرضیات کی تعمیل میں کسی قسم کی سستی وکمزوری گوارا کی یہی وجہ ہے کہ آنحضرت ...... ان سے آخر دم تک راضی وخوش رہے۔ حضرت فاروق اعظم کی رائے اگرچہ بعض مواقع میں آنحضرت ...... کی رائے سے بظاہر مخالف ہوئی مگر یہ اختلاف رائے تشدد فی الدین اور حمیت اسلامی کی بناء پر پیش آیا۔ جو حقیقتاً عین اتباع وموافقت ہے یہی وجہ ہے کہ آخر میں بذریعہ وحی آپ کی تصویب کی گئی لہٰذا یہ اختلاف بھی آپ کے مناقب میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ ابوجہل کی بیٹی سے نکاح کرنے کے معاملہ اور نماز تہجد کی تقیید کے سلسلہ میں مورد عتاب ہو چکے ہیں۔

(۴) **زھد۔** مدار فضیلت میں سے ایک عمل زہد اور دنیا سے بے نیازی ہے بعض لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ "ازہد الناس علیؓ" حضرت علی رضی اللہ عنہ سب سے بڑے زاہد تھے، ہم کہتے ہیں کہ زہد نام ہے دنیا کی لذت سے بے نیاز اور مال ودولت، بیوی، اولاد اور حشم وخدم سے بے رغبت ہونے کا اور یہ بات محقق طور پر معلوم ہے کہ حضرت صدیق اکبر جس وقت مشرف بہ اسلام ہوئے ہیں وہ شہر مکہ کے چند سرمایہ داروں میں سے ایک تھے، لیکن قبول اسلام کے بعد انھوں نے اپنا سارا سرمایہ اللہ اور اس کے رسول کی رضا جوئی میں صرف کر دیا اور ضعفائے مسلمین کی ایک جماعت کو جو غلامی کی دردناک زندگی گذارنے پر مجبور تھی ان کے ظالم وجابر آقاؤں سے انھیں خرید کر آزاد کیا غرضیکہ اسلام اور مسلمانوں کی

امداد واعانت میں اس طرح بیدریغ مال خرچ کیا کہ ان کے پاس ایک درہم بھی باقی نہ بچا اور اس دنیا سے اس طرح فارغ ہو کر گئے کہ اپنے پیچھے نہ کوئی جائیداد چھوڑی اور نہ زمین۔

زمانۂ خلافت میں بھی زہد کا یہ عالم تھا کہ بیت المال سے بطور گذارہ کے بس اتنی رقم لینا قبول کیا کہ کسی طرح گذر اوقات ہو جاتی تھی اور اس پر بھی یہ حال تھا کہ جب مال غنیمت وغیرہ سے کوئی رقم ان کے حصہ میں آتی تھی تو بیت المال سے لی ہوئی رقم کے عوض اسے کار خیر میں خرچ کر دیتے تھے۔

زہد اور دنیا سے بے رغبتی میں یہی حال حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا بھی تھا جس کی شہادت خود حضرات صحابہ نے دی ہے۔ اس کے برعکس حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ نے جائداد اور زمین خریدی کھیتیاں اور باغات لگائے اور وفات کے وقت اپنے پیچھے چار بیویاں انیس باندیاں۔ بہت سارے غلام وخدام اور تیس کے قریب اولاد چھوڑی اور اس بڑے کنبہ کیلئے اتنا ترکہ چھوڑا کہ اس کی وجہ سے سب کے سب غنی اور مالدار تھے، قصبہ ینبع میں آپ کی اتنی بڑی جائداد تھی کہ اس کی پیداوار میں غلہ کے علاوہ ایک ہزار وسق (آج کے حساب سے تقریباً پانچ ہزار ایک سو ترانوے من تیس سیر) کھجور سالانہ پیدا ہوتی تھیں۔

نیز زہد کا اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ نہ خود دنیا کی لذتوں سے نفع اندوز ہو اور نہ اپنے رشتہ داروں کو اس سے منتفع ہونے کا موقع فراہم کرے اس اعتبار سے بھی حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو فوقیت حاصل ہے کہ انھوں نے اپنے اعزا و اقرباء کو حکومت کے عہدوں سے ہمیشہ الگ رکھا، حالانکہ آپ کے قریبی رشتہ داروں میں حضرت طلحہ بن عبید اللہ (بھتیجہ) حضرت عبد الرحمٰن بن ابی بکر (صاحبزادے) اور حضرت عائشہ صدیقہ (صاحبزادی) جیسے جلیل القدر عالم وفاضل صحابی موجود تھے جو کاروبار حکومت کو چلانے کی پوری صلاحیت و اہلیت رکھتے تھے مگر ان میں سے کسی کو کبھی کوئی، منصب نہیں دیا۔ اسی طرح حضرت عمر فاروق نے بھی اپنے قبیلہ بنو عدی میں سے کسی کو حاکم و عامل نہیں مقرر کیا اگرچہ آپ کے خاندان میں بھی حضرت سعید بن زید، ابو جہم بن حذیفہ، خارجہ بن حذیفہ، معمر بن عبد اللہ اور خود آپ کے صاحبزادے حضرت عبد اللہ بن عمر حکومت کی ذمہ داریوں سے عہدہ

برآ ہونے کی پوری پوری صلاحیت رکھتے تھے، لیکن آپ نے کسی کو بھی کوئی عہدہ اور منصب نہیں دیا۔ البتہ اپنے خاندان میں سے نعمان بن عدی کو کچھ دنوں کیلئے علاقہ منان کا حاکم بنادیا تھا، لیکن جلد ہی انھیں اس منصب سے علیحدہ کردیا۔

اور حضرت علی مرتضٰی کرم اللہ وجہہ نے اپنے زمانۂ خلافت میں اپنے چچازاد بھائیوں میں سے حضرت عبداللہ بن عباس کو بصرہ کا حاکم مقرر کیا، عبیداللہ بن عباس کو یمن کا اور قثم اور معبد ابناء عباس کو علی الترتیب مکہ ومدینہ کا اور اپنے بھانجہ جعد بن ہراء کو کوفہ کا اور اپنے ربیب (سوتیلے بیٹے) محمد بن ابی بکرؓ کو مصر کا حاکم بنایا اور بوقت وفات اپنے بڑے صاحبزادے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو خلافت کے لئے نامزد فرمایا۔

بلاشبہ یہ سب کے سب حضرات ان مناصب اور عہدوں کے بجا طور پر لائق اور مستحق تھے۔ اس لئے یہ کہنا قطعاً درست نہ ہوگا کہ حاشاء کلا حضرت علی مرتضٰی رضی اللہ عنہ نے محض قرابت کی بنیاد پر ان حضرات کو اس اعزاز سے نوازا تھا۔ مگر فرق مراتب کے وقت یہ کہا جاسکتا ہے کہ حضرات شیخین کے عزیزوں میں بھی ان مناصب کی اہلیت وصلاحیت رکھنے والے افراد موجود تھے مگر انھوں نے ان لوگوں کو کوئی عہدہ نہیں دیا جس سے واضح ہوتا ہے کہ ان دونوں بزرگوں کا زہد حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زہد سے اعلیٰ وارفع ہے کیونکہ حضرت علی کرم اللہ کا زہد صرف اپنی ذات پر تھا اور حضرات شیخین کا اپنی ذات کے ساتھ اپنے عزیز واقارب پر بھی۔

(۵) انفاق فی سبیل اللہ۔ اللہ کی راہ میں مال کا خرچ کرنا بھی ترقی درجات کا ذریعہ اور سبب فضیلت ہے۔ اور یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ حضرت علی مرتضٰی کرم اللہ وجہہ کو اس باب میں حضرات شیخین رضی اللہ عنہما کے ساتھ چنداں مشارکت نہیں ہے ہاں حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ اس معاملہ میں سب پر فوقیت رکھتے ہیں۔ لیکن حضرات شیخین رضی اللہ عنہ دیگر اسبابِ فضیلت، علم، جہاد، زہد وغیرہ میں ان سے بھی بڑھے ہوئے ہیں۔ اسی لئے اس ایک وصف میں زیادتی کی بناء پر حضرات شیخین کے مقابلہ میں ان کی فضیلت ثابت نہ ہوگی۔

(٦) حسن سیاست۔ خلافت اور حسن سیاست بھی منجملہ اسباب فضیلت میں سے ایک سبب ہے اس شعبہ میں حضرت صدیق اکبر و فاروق اعظم رضی اللہ عنہما کی پیش قدمی روزِ روشن کی طرح واضح ہے اس لئے کہ آنحضرت...... کے اس دنیا سے پردہ فرماتے ہی بہت سے قبائل عرب میں ارتداد کا سنگین فتنہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اگر بروقت اس فتنہ کی سرکوبی نہ کی جاتی تو اسلام کے حق میں یہ ایک ایسا عظیم خطرہ بن جاتا، جس کا مقابلہ ممکن نہ ہوتا۔ اس قیامت خیز فتنہ کے فرو کرنے میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جس جرأت ایمانی اور ثابت قدمی کا مظاہرہ فرمایا ہے وہ تاریخ اسلامی کا ایک درخشاں باب اور حکمت عملی حسن سیاست کا ایک بے مثال نمونہ ہے اور بالآخر آپ ہی کی مساعی جمیلہ سے یہ فتنہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مر گیا۔

اسلامی فتوحات کے آغاز کا سہرا بھی آپ ہی کے سر ہے، کیونکہ آپ ہی کے دور خلافت میں قیصر وکیسری سے باقاعدہ جنگ کی ابتداء ہوئی اور آپ کے حسن تدبیر سے ہر محاذ پر مجاہدین اسلام کو کامیابی ملی اور اسلامی ریاست کا رقبہ فارس وعراق کی حدود تک وسیع ہو گیا۔ مسلمانوں کو خاصی مقدار میں مال غنیمت حاصل ہوئے جس سے ان کی تنگ دستی دور ہوئی اور ان کی عزت وشوکت میں اضافہ ہوا۔

آپ کے دور میں مسلمانوں کی اجتماعی قوت نہایت مستحکم رہی آپس میں اتحاد و یگانگت پورے طور پر قائم رہی۔ باہمی اختلاف وانتشار کا کوئی نام ونشان تک نہیں تھا عام مسلمان امن واطمینان کے ساتھ اسلامی علوم وعبادت کی تعلیم وتبلیغ میں منہمک رہے غرضیکہ آپ کا عہد خلافت اسلام اور مسلمان دونوں کیلئے سراپا خیر وبرکت تھا اور حضرت فاروق اعظم کے دور میں ان تمام امور حسنہ میں مزید استحکام اور ترقی ہوئی جس کی ابتداء اور آغاز عہد صدیقی میں ہوا تھا۔ اس کے بالمقابل حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے زمانہ میں اسلامی قلم رو میں کوئی اضافہ نہ ہوسکا اور نہ ہی مسلمانوں کی اجتماعی قوت کا استحکام باقی رہا بلکہ مسلمان اختلاف و انتشار کے شکار ہو گئے اور نوبت خانہ جنگی تک پہنچ گئی، جس کی بناء پر اسلامی معاشرہ مضمحل ہو گیا اور اسلام کی ترقیات رک گئیں ان تفصیلات سے یہ بات واضح ہو کر سامنے آ گئی کہ

حضرات شیخین رضی اللہ عنہما جملہ اوصاف کمال مثلاً علم، جہاد، زہد، تقویٰ، عشق واطاعت، انفاق فی سبیل اللہ، حسن سیاست وغیرہ کے اس اعلیٰ وارفع مقام پر فائز ہیں۔ جہاں تک دوسروں کی رسائی نہیں ہوسکی ہے اور یہی وہ اوصاف واعمال ہیں جنہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فضیلت و بزرگی کے موقع پر شمار فرمایا ہے، لہٰذا ثابت ہوگیا کہ حضرات خلفاء اربعہ میں سب سے افضل حضرت ابوبکر صدیق ہی ہیں ان کے بعد حضرت عمر فاروق کا درجہ ہے (رضی اللہ عنہما)

ایک شبہ کا ازالہ

بعض لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تمام اصحاب رسول ...... پر فضیلت کے اثبات میں یہ بات پیش کرتے ہیں کہ انھوں نے کبھی بت پرستی اور شرک نہیں کیا برخلاف دیگر حضرات کے کہ دور جاہلیت میں ان سے اس امر قبیح کا صدور ہوا ہے اس لئے حضرت علی مرتضیٰ سب سے افضل ہیں۔ لیکن صغرسنی اور کم عمری کی بناء پر کفر وشرک سے محفوظ رہنا وجہ فضیلت نہیں بن سکتا اور یہ بات یقینی طور پر ثابت ہے کہ حضرت علی مرتضیٰ دس برس کی عمر ہی میں مشرف بہ اسلام ہوگئے تھے کیونکہ ارباب سیر وتاریخ اس پر متفق ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ۴۰ھ میں بعمر ترسیٹھ سال فوت ہوئے ہیں، اور اس پر بھی سب کا اتفاق ہے کہ آنحضرت ...... نے بعثت کے تیرہویں سال ہجرت فرمائی ہے لہٰذا اس حساب سے بعثت نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے وقت حضرت علی کی عمر دس سال قرار پاتی ہے علاوہ ازیں یہ بات بھی معلوم ہے کہ حضرت علی نے رسول اللہ ...... کے گھر میں پرورش پائی ہے اوران کا پورا زمانہ طفولیت آنحضرت ...... کے گھر میں گزرا ہے اور بچوں کا یہ نفسیاتی قاعدہ ہے کہ وہ اپنے بڑوں کی روش اور طور طریقے کو اختیار کرتے ہیں۔ پھر اگر اس اصول کو تسلیم کرلیا جائے کہ شرک و بت پرستی سے بچ جانا علی الاطلاق موجب فضیلت اور وجہ بزرگی ہے تو لازمی طور پر یہ ماننا ہوگا کہ ہروہ بچہ جو اسلام میں پیدا ہوا ہو وہ اکابر صحابہ مثلاً حضرت سلمان فارسی، حضرت سید الشہداء حمزہ، حضرت جعفر الطیار، حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ

عنہم وغیرہ سے افضل ہو حالانکہ یہ قطعاً غلط ہے اس لئے کلی فضیلت کے لئے اسے پیش کرنا ہی درست نہیں ہے۔

حضرت عثمان غنی و علی مرتضٰی میں باہمی فضیلت

اب صرف یہ بات باقی رہ جاتی ہے کہ حضرات ختنین یعنی عثمان ذی النورین اور علی مرتضٰی رضی اللہ عنہما میں افضل کون ہے اس سلسلہ میں علماء کی رائیں مختلف ہیں، اور اس مسئلہ میں کسی فیصلہ کن نتیجہ تک پہنچنا ہمارے لئے مشکل ہے۔ اس لئے کہ ان دونوں حضرات کے کمالات و فضائل مساوی اور ہم پلہ ہیں۔ کیوں کہ اگر حضرت ذی النورین کو خدمت قرآن میں سبقت کا شرف حاصل ہے، تو حضرت مرتضٰی کی روایت حدیث، اجتہاد اور فتاوىٰ میں فوقیت مسلم ہے۔ اور اگر جہاد بالسیف کے سلسلہ میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں، تو لشکر اسلام اور مجاہدین کی مالی امداد و اعانت میں حضرت عثمان غنی کا بیدریغ مال خرچ کرنا ایک مثالی کارنامہ ہے اسی طرح اگر حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ مسلمانوں کے قتل کرنے میں نہایت ہی محتاط تھے کہ اپنی ذات کیلئے قید و بند اور قتل کی مشقت واذیت برداشت کرلی لیکن کسی مسلمان پر ہاتھ اٹھانا گوارا نہیں کیا تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو اپنے مخالفین کے سلسلہ میں زبان کو قابو میں رکھنے اور ان کے حق میں کلمہ حق کے سوا کچھ نہ کہنے میں ملکۂ تامہ حاصل تھا۔ الحاصل دونوں حضرات کے فضائل عملیہ باہم معارض اور مساوی ہیں۔ رہی فضیلت اختصاصی یعنی اللہ کے نزدیک کسی کا خیر و افضل ہونا تو اس میں بھی دونوں حضرات برابر کے شریک ہیں۔ اس لئے اس مسئلہ میں کوئی دوٹوک فیصلہ نہیں کیا جاسکتا۔

واللّٰہ اعلم الحقیقة الحال.

باب ﴿۳﴾

فرق باطلہ کا تعاقب

نبی افرنگ کی داستانِ حیات

نام اور تاریخ پیدائش

انگریزی نبی کا پہلا نام ”رسوندی“ تھا، (۱) پتہ نہیں رسوندی سے کب ”غلام احمد“ بن گئے۔ انھوں نے خود لکھا ہے کہ میری پیدائش موضع قادیان ضلع گورداسپور میں ۱۸۳۹ء یا ۱۸۴۰ء میں ہوئی۔ اور ایک دوسری تحریر میں جو اپنے والد کی وفات کے سلسلہ میں لکھی ہے کہتے ہیں کہ ”جب میرے والد نے دُنیا کو چھوڑا تو اس وقت میری عمر ۳۴ یا ۳۵ سال کی تھی (۲) ان کے والد مرزا غلام مرتضٰی کا انتقال ۱۸۷۶ء میں ہوا ہے۔ (۳) اس اعتبار سے سن پیدائش ۴۲-۱۸۴۱ء ہوتا ہے۔

مرزا قادیانی کا خاندان

مزا قادیانی کس خاندان سے تعلق رکھتے تھے اس کا پتہ لگانا ان کی تحریروں سے نہایت دشوار ہے۔ کیونکہ وہ ۱۸۹۸ء تک اپنے آپ کو مرزا لکھتے رہے ہیں۔ چنانچہ کتاب البریہ جو ان کی ۱۸۹۸ء کی تصنیف ہے اس کے صفحہ ۱۳۴ پر اپنی قومیت برلاس (مغل) لکھی ہے، لیکن اسی کتاب کے صفحہ ۱۳۵ کے حاشیہ پر لکھتے ہیں ”میرے الہامات کی رُو سے ہمارے آباء اولین فارسی تھے، پھر ۱۹۰۱ء میں اس نسبی تعلق سے دست بردار ہو کر اپنے رسالہ ”ایک غلطی کا ازالہ“ کے صفحہ ۱۶ پر رقمطراز ہیں کہ ”میں اسرائیلی بھی ہوں اور فاطمی

---

(۱) تکذیب براہین احمدیہ ص ۱۳۷۔

(۲) کتاب البریہ ص ۱۵۹۔

(۳) مسیح موعود، مؤلفہ مرزا محمود احمد ص ۲۰

بھی‘‘ اس کے ایک سال بعد ایک پلٹا اور کھایا اور اپنی تصنیف تحفۂ گولڑویہ کے صفحہ ۴۰ پر یہ تحقیق سپرد قلم کی ’’میرے بزرگ چینی حدود سے پنجاب آئے تھے‘‘ ان انکشافات سے ان کی ذات چار قوموں کا معجون مرکب معلوم ہوتی ہے۔ یعنی وہ بیک وقت مغل، یہودی، سید اور چینی سب تھے۔‘‘ خامہ انگشت بدنداں ہے اُسے کیا لکھئے۔

مرزا کے والد غلام مرتضٰی بیگ کی عملی حالت

آنجہانی انگریزی نبی کے منجھلے لڑکے میاں بشیر احمد ایم۔ اے لکھتے ہیں کہ ہمارے دادا مرزا غلام مرتضٰی بے نمازی تھے یہاں تک کہ ۷۵ سال کی عمر میں پہنچ کر بھی نماز نہیں پڑھی۔(۱)

مرزا کے ایّام طفلی

اللہ تعالیٰ کے منتخب اور برگزیدہ بندوں کے بچپن کے برعکس مرزا قادیانی کے ایام طفلی دیگر بازاری بچوں ہی کی طرح نظر آتے ہیں۔ چنانچہ ان کی سوانح حیات سیرت المہدی میں درج ہے کہ ایک مرتبہ مرزا کے ہم عمر لڑکوں نے اُن سے کہا گھر سے شکر لاؤ۔ گھر گئے تو وہاں پسا ہوا نمک رکھا تھا۔ اُسے شکر سمجھ کر چپکے سے جیب میں بھر لیا اور لڑکوں کے سامنے پہنچ کر پھانکنا شروع کر دیا(۲) انگریزی نبی صاحب کو بچپن میں چڑیوں کے پکڑنے کی بھی عادت تھی۔(۳)

تعلیمی لیاقت

حضرات انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے علوم و معارف تمام تر موہبتِ ربّانی پر موقوف ہوتے ہیں اپنے جیسے انسان سے تعلیم و تعلّم اور اخذ فیض سے ان کی زندگی بالکل

---

(۱) سیرت احمدی ج ۱ ص ۳۱۲۔

(۲) سیرت المہدی، ج ۱ ص ۲۲۶۔

(۳) ایضاً ج ۱ ص ۲۳۲۔

پاک ہوتی ہے۔ اس لئے انگریزی نبی کو بھی یہ فکر ہوئی کہ وہ اپنے آپ کو امّی ثابت کریں۔ لیکن ان کا اسکولوں میں پڑھنا ایک ایسی حقیقت ہے جس کو خود مرزا جی بھی اپنے دجل و فریب سے چھپا نہ سکے۔ حضرات انبیاء و رسل کی اس صفت خاص میں ہمسری و برابری کی ناکام کوشش کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''امام الزماں کے لئے لازم ہے کہ وہ دینی امور میں کسی کا شاگرد نہ ہو بلکہ اس کا استاذ خدا ہو'' (۱)

ایک دوسری جگہ تحریر کرتے ہیں '' آنے والے کا نام جو مہدی رکھا گیا ہے اس میں اشارہ ہے کہ وہ آنے والا علم دین خدا ہی سے حاصل کرے گا۔ اور قرآن وحدیث میں کسی کا شاگرد نہیں ہوگا۔ سو میں حلفاً کہہ سکتا ہوں کہ میرا حال یہی ہے کوئی ثابت نہیں کر سکتا کہ میں نے کسی انسان سے قرآن وحدیث یا تفسیر کا ایک سبق بھی پڑھا ہے۔ (۲)

نبی بننے کی خواہش میں ان جھوٹے دعووں کے بعد ''دروغ گو را حافظہ نہ باشد'' کی بہترین مثال ملاحظہ کیجئے کہ بقلم خود آنجہانی مرزا کیا لکھ رہے ہیں۔

> ''بچپن کے زمانہ میں میری تعلیم اس طرح ہوئی کہ جب میں سات سال کا تھا تو ایک فارسی خواں معلم میرے لئے نوکر رکھا گیا۔ جنھوں نے قرآن شریف اور چند فارسی کی کتابیں مجھے پڑھائیں۔ اس بزرگ کا نام فضلِ الٰہی تھا اور جب میری عمر قریباً دس سال کی ہوئی تو ایک عربی خواں مولوی صاحب میری تربیت کے لئے مقرر کئے گئے جن کا نام فضل احمد تھا۔ میں نے صَرف کی بعض کتابیں اور کچھ قواعد نحوان سے پڑھے اس کے بعد جب میں سترہ یا اٹھارہ سال کا ہوا تو ایک اور مولوی صاحب سے چند سال پڑھنے کا اتفاق ہوا ان کا نام گل علی شاہ تھا۔ ان کو میرے والد صاحب نے نوکر رکھ کر قادیان میں پڑھانے کے لئے مقرر کیا تھا۔ (اُن) مولوی صاحب سے میں نے نحو، منطق اور حکمت وغیرہ علوم مروجہ کو حاصل کیا۔ (۳)

---

(۱) اربعین ص ۱۱۔ (۲) ایام الصلح، ص ۱۴۷۔

(۳) کتاب البریہ ص ۱۴۸، ۱۵۰۔

مرزا کے پہلے استاذ فضلِ الٰہی قادیان کے باشندے اور حنفی تھے دوسرے فضل احمد فیروز والہ کے رہنے والے اہل حدیث تھے اور تیسرے استاذ گل علی شاہ متوطن بٹالہ شیعہ تھے۔ (۱) قیاس کن زگلستانِ من بہار مرا۔

مرزا نے اپنے تیسرے استاذ گل علی شاہ کے بارے میں یہ جھوٹ لکھا ہے کہ میرے والد نے ان کو نوکر رکھا تھا۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ مرزا کے والد غلام مرتضیٰ ان کے دستر خوان کے ریزہ چین تھے۔ تفصیل کے لئے مرأۃ القادیانیہ، مؤلفہ مرزا احمد علی امرتسری ص ۲۹ ف ۳ ملاحظہ کیجئے۔

مرزا کے اس بیان سے جہاں ان کا پہلا دعویٰ کہ ”میں نے کسی انسان سے قرآن وغیرہ کا ایک سبق نہیں پڑھا ہے“ غلط ہو جاتا ہے۔ وہیں اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ مرزا کی تعلیم ناقص اور ادھوری تھی اور وہ ”نیم ملا خطرۂ ایمان“ کے سچے مصداق تھے۔“

انگریزی زبان کی معمولی واقفیت

انگریزی نبی کو بقول خود انگلش میں بھی الہام ہوا کرتے تھے اور نہایت فخر سے کہا کرتے تھے کہ ”انگریزی نہیں جانتا، اس کوچہ سے بالکل ناواقف ہوں، ایک فقرہ تک مجھے معلوم نہیں۔ مگر خرق عادت کے طور پر اس زبان میں بھی مجھے الہام ہوتے ہیں۔ (۲)

لیکن آنجہانی کا یہ دعویٰ بھی دروغ مصلحت آمیز پر مبنی تھا۔ کیونکہ انھوں نے سیالکوٹ میں دوران ملازمت انگریزی کی دو ایک کتابیں سبقاً سبقاً پڑھی تھیں اور اسی کے نتیجہ میں انگریزی کے ٹوٹے پھوٹے جملے بول اور لکھ لیا کرتے تھے۔ میاں بشیر احمد لکھتے ہیں۔ مولوی الٰہی بخش ڈسٹرکٹ انسپکٹر نے منشیوں کیلئے ایک انگریزی کا مدرسہ قائم کیا تھا“ ڈاکٹر امیر شاہ پنشنر معلم تھے۔ حضرت مسیح موعود نے بھی انگریزی کی دو ایک کتابیں پڑھیں۔ (۳)

---

(۱) سیرت المہدی ج ۱ ص ۲۲۳، ایضاً ج ۱ ص ۱۳۴۔

(۲) نزولِ مسیح ص ۱۴۔

(۳) سیرت المہدی ج ۱ ص ۱۳۷۔

کچہری کی منشی گیری

کچہری سیالکوٹ کی ملازمت بھی انگریزی نبی کی تاریخ کا ایک اہم باب ہے۔ مرزا کی تحریروں سے ثابت ہوتا ہے کہ انگریزی حکومت نے مرزا غلام مرتضٰی کیلئے تاحین حیات سات سو روپے سالانہ کی پنشن مقرر کردی تھی۔ اسی پر خاندان کے گذر بسر کا مدار تھا۔ ایام شباب میں ایک مرتبہ مرزا جی نے اس رقم کو وصول کر کے عیش کوشیوں اور جوانی کی رنگ رلیوں میں اڑا دی، بعد میں ہوا و ہوس کا نشہ جب کچھ اُترا تو یہ شرمندگی دامن گیر ہوئی کہ کونسا منھ لے کر گھر جائیں اس لئے قادیان واپس آنے کے بجائے سیالکوٹ چلے گئے۔ اور وہیں اپنے مکتب کے ساتھی لالہ بھیم سین کی سعی و کوشش سے پندرہ روپئے ماہانہ پر کچہری میں منشی مقرر ہو گئے۔

عہد ملازمت

مرزا زادے بشیر احمد لکھتے ہیں کہ ''مرزا صاحب نے دورانِ ملازمت اپنا دامن رشوت ستانی سے ملوث ہونے نہیں دیا'' لیکن مرزا کے اکثر واقف کار اطلاع دیتے ہیں کہ انھوں نے بزمانۂ ملازمت دل کھول کر رشوتیں لیں۔ چنانچہ مرزا احمد علی شیعی اپنی کتاب دلیل العرفان میں لکھتے ہیں کہ منشی غلام احمد امرتسری نے اپنے رسالہ ''نکاح آسمانی کے رازہائے پنہانی'' میں لکھا تھا کہ مرزا نے زمانۂ محرری میں خوب رشوتیں لیں۔ یہ رسالہ مرزا کی وفات سے آٹھ سال پہلے ۱۹۰۰؁ء میں شائع ہو گیا تھا مگر مرزا نے اس کی تردید نہیں کی۔

مقدمہ بازی کا مشغلہ

آنجہانی مرزا نے منشی سے مختار بن جانے کی ہوس میں سیالکوٹ کے زمانۂ قیام میں مختاری کا امتحان بھی دیا تھا استعداد کی کمی کی بناء پر اس امتحان میں ناکام رہے اور مختاری کے منصب پر فائز ہونے کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ پھر بھی اتنا فائدہ تو ضرور ہوا کہ

قانونِ مروجہ کی موشگافیوں سے کسی حد تک واقف ہو گئے۔ چنانچہ مختاری کے امتحان میں ناکامی اور منشی گیری کی نوکری سے دل برداشتہ ہو کر جب قادیان واپس لوٹے تو اُن کے والد نے خاندانی مقدمات کی پیروی کی خدمت اُن کے سپرد کر دی۔ مرزا جی خود بتاتے ہیں کہ ”میرے والد صاحب اپنے بعض آباء و اجداد کے دیہات دوبارہ حاصل کرنے کے لئے انگریزی عدالتوں میں مقدمات کر رہے تھے۔ انھوں نے انہی مقدمات میں مجھے لگا دیا اور ایک زمانہ دراز تک میں ان کاموں میں مشغول رہا۔(۱)

مقدمہ بازی میں مرزا جی کو اس قدر شغف تھا کہ خواب بھی دیکھتے تو اسی کا جیسا کہ وہ خود لکھتے ہیں ”ہمارا ایک مقدمہ موروثی اسامیوں پر تھا۔ مجھے خواب میں دکھلایا گیا کہ اس مقدمہ میں ڈگری ہو گئی۔(۲) اسی طرح کے ایک خواب کا تذکرہ ”تریاق القلوب“ کے صفحہ ۳۶ پر بھی کیا ہے۔

اپنے شرکاء کی اراضی پر غاصبانہ قبضہ

آنجہانی مرزا کے تحریری بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے والد غلام مرتضٰی اور ان کے بھتیجوں و دیگر اقرباء کی کچھ زمین سکھوں نے اپنے عہد حکومت میں ضبط کر لی تھی۔ جسے انگریزی عہد سلطنت میں بذریعہ عدالت انھوں نے دوبارہ واگذار کرایا۔ بعد میں اس زمین پر آنجہانی مرزا اور ان کے بھائی غلام قادر بلا شرکتِ غیرے قابض و متصرف ہو گئے۔ اور دیگر حقدار رشتہ داروں کو اس میں سے کچھ نہیں دیا۔ بالآخر ان حقداروں نے مرزا اعظم بیگ لاہوری پنشنر اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کے تعاون سے عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا اور مرزا جی کے علی الرغم بذریعہ عدالت اپنا حصہ حاصل کر لیا۔ غم نصیب حقداروں کی اس اعانت پر مرزا اعظم بیگ کی شکایت کرتے ہوئے آنجہانی لکھتے ہیں ”میرے والد کے انتقال کے بعد مرزا اعظم بیگ لاہوری نے شرکائے ملکیت قادیان کی طرف سے مجھ پر اور

---

(۱) کتاب البریہ ص ۱۵۱۔

(۲) حقیقۃ المہدی ص ۲۶۰، ۲۶۲۔

میرے بھائی مرحوم مرزا غلام قادر پر مقدمہ دخل ملکیت کا عدالتِ ضلع میں دائر کر دیا اور میں بظاہر جانتا تھا کہ ان شرکاء کو ملکیت سے کچھ غرض نہیں کیونکہ وہ ایک گم گشتہ چیز تھی جو سکھوں کے وقت میں نابود ہو چکی تھی۔ اور میرے والد نے تن تنہا مقدمات دائر کر کے اس ملکیت اور دوسرے دیہات کی بازیافت کے لئے آٹھ ہزار روپیہ کے قریب خرچ و خسارہ اٹھایا تھا وہ شرکاء ایک پیسہ کے بھی شریک نہیں تھے۔ (۱)

شہرت کی طلب اور سرگرمیٔ مناظرہ

آنجہانی مرزا جی اپنے خانگی حالات سے بہت دل برداشتہ تھے اور شب و روز اسی خیال میں غلطاں و پیچاں رہتے تھے کہ خاندانی زوال کا مداوا کس طرح کیا جائے مختاری کے ایوان میں باریابی کی توقع اٹھ چکی تھی، فوج یا پولیس کی ملازمت سے قلت تنخواہ کی بناء پر کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ تجارتی کاروبار سے سرمایہ کی کمی اور ناتجربہ کاری کی وجہ سے قاصر تھے۔ اس لئے اب لے دے کر صرف یہی ایک صورت باقی رہ گئی تھی کہ خادمِ اسلام کی حیثیت سے زندگی کے میدان میں نمودار ہوں اور اس راہ سے شہرت و دولت حاصل کریں۔ چنانچہ اپنے مکتب کے ساتھی اور قدیم رفیق مولوی محمد حسین بٹالوی کے مشورہ سے قادیان کے بجائے لاہور کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنایا اور آریوں و پادریوں سے مذہبی چھیڑ چھاڑ کا سلسلہ شروع کر دیا۔ مولانا محمد حسین بٹالوی، منشی الٰہی بخش اکاؤنٹینٹ، بابو عبدالحق اکاؤنٹینٹ، حافظ محمد یوسف ضلعدار وغیرہ اس کام میں ان کے معاون بنے۔ اور ہر مجلس، محفل میں یہ حضرات مرزا جی کی قابلیت اور بزرگی کا چرچا کرتے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند ماہ ہی کے اندر مرزا جی مناظرِ اسلام کی حیثیت سے مشہور ہو گئے چونکہ ابھی تک انھوں نے مہدویت مسیحیت وغیرہ کا دعویٰ نہیں کیا تھا۔ اس لئے ہر مسلمان ان کو عزت و عقیدت کی نگاہ سے دیکھنے لگا۔ اور علمائے دین بھی ان کے ساتھ تعاون و اشتراک کو دینی خدمت سمجھتے رہے۔ شہرت کے اس مقام بلند پر پہنچنے کے بعد لاہور کے قیام کو غیر ضروری سمجھ کر مرزا جی وطن مالوف قادیان واپس آ گئے اور

---

(۱) مکتوباتِ احمدیہ ج ۴ ص ۳۲۔

یہیں سے مناظرانہ اشتہار بازیوں کا سلسلہ جاری رکھا۔

مرزا جی ایک عارفِ کامل کے رُوپ میں

مذہبی مناظروں کی بدولت مرزا جی کو جو شہرت حاصل ہوگئی تھی وہ ہر قسم کے دامِ تزویر کے کامیاب بنانے کی ضامن تھی۔ چنانچہ اس شہرت سے نفع حاصل کرنے اور اس کے ذریعہ مستقبل کو سنوارنے کی غرض سے مرزا جی نے باخدا صوفی کا سوانگ رَچایا اور دنیوی کاروبار سے بظاہر منقطع ہوکر خلوت نشیں ہوگئے وظائف وعملیات کی کتابوں کا مطالعہ کرکے بغیر کسی مرشد وشیخ کی رہنمائی کے عملیات و وظائف شروع کردیئے۔ علاوہ ازیں راتوں کو قادیان سے باہر جاکر خندق میں جا بیٹھتے۔ اور جادو کے عمل پڑھا کرتے۔ ساتھ ہی اس زمانہ میں خوابوں کے ذریعہ بھی مستقبل کے حالات معلوم کرنے کی ناکام کوشش کرتے۔ اور اس سلسلے میں شب و روز مطبوعہ تعبیر ناموں کی ورق گردانی میں مصروف رہتے۔ اس زمانہ میں ان کا معمول یہ بھی تھا کہ اپنے خواب دوسروں کو سنایا کرتے اور دوسروں کے خوابوں کی تعبیر خواب ناموں کی ورق گردانی کی مدد سے بتانے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ مرزا زادے میاں بشیر احمد کا بیان ہے کہ جب کوئی اہم معاملہ پیش ہوتا تو گھر کی عورتوں، بچوں اور خادماؤں تک سے پوچھا کرتے تھے کہ تم نے کوئی خواب دیکھا ہے؟ اگر کسی نے دیکھا ہوتا تو اُسے بڑے غور سے سنتے تھے۔ (۱)

نبیٔ افرنگ مرضِ مراق کے شکار تھے

مراق یعنی مالیخولیا۔ دیوانگی کی ایک قسم ہے مرزا جی کے خلیفۂ اعظم حکیم نورالدین لکھتے ہیں۔ مالیخولیا جنون کا ایک شعبہ ہے اور مراق مالیخولیا کی ایک شاخ ہے۔ (۲) طب کی مشہور کتاب شرح اسباب میں ہے ”نَوعٌ مِنَ المالیخولیا یُسمّٰی المراق“(۳) مالیخولیا

---

(۱) سیرۃُ المہدی ج ۲ ص ۶۲۔

(۲) بیاض نورالدین ج ۱ ص ۱۱۔ (۳) شرح اسباب ج ۱ ص ۷۴۔

کی ایک قسم مراق ہے۔ اس مرض کا مریض اگر کچھ پڑھا لکھا ہوتا ہے تو خدائی نبوت، غیب دانی وغیرہ کا دعویٰ کرنے لگتا ہے۔ ’’اگر مریض دانشمند بودہ باشد دعوائے پیغمبری وکرامت کند وسخن از خدائی گوید وخلق را دعوت کند‘‘۔ (۱) اگر مراق کا مریض ذی علم ہو تو پیغمبری اور کرامت کا دعویٰ کرتا ہے اور خدائی کی باتیں کرتا ہے اور لوگوں کو اپنی رسالت کی دعوت دیتا ہے۔ یہ ایسا مرض ہے جس سے حضرات انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو قطعی طور پر محفوظ رکھا گیا ہے۔ لیکن نبیٔ افرنگ بقول خود دیگر بہت سے امراض کے ساتھ اس دماغی مرض کے بھی شکار تھے۔ چنانچہ لکھتے ہیں ’’دیکھو میری بیماری کی نسبت بھی آنحضرت صلعم نے پیشین گوئی کی تھی جو اس طرح وقوع میں آئی ہے۔ آپؐ نے فرمایا تھا کہ مسیح آسمان سے جب اترے گا تو دو زرد چادریں اس نے پہنی ہوں گی۔ سو اس طرح مجھ کو دو بیماریاں ہیں ایک اُوپر کے دھڑ کی اور ایک نیچے کے دھڑ کی یعنی مراق اور کثرت بول‘‘ (۲) اسی طرح ایک مرزائی لکھتا ہے کہ مراق کا مرض حضرت (مرزا) صاحب میں موروثی نہیں تھا، بلکہ یہ خارجی اثرات کے ماتحت پیدا ہوا۔ (۳)

مرزا جی کی دیگر بیماریاں

مراق کے علاوہ اور مختلف امراض میں بھی آنجہانی مبتلا تھے۔ یہاں بعض امراض کا ذکر خود انھیں کے الفاظ میں کیا جارہا ہے۔ لکھتے ہیں: ’’میں دائم المرض ہوں۔ ہمیشہ دردسر، کمی خواب، تشنج، دل کی بیماری دورہ کے ساتھ آتی ہے‘‘ (۴) اور لکھتے ہیں مرض ذیابیطس مدّت سے دامن گیر ہے اور بسا اوقات سو سو دفعہ رات یا دن کو پیشاب آتا ہے اور اس قدر کثرتِ پیشاب سے جس قدر عوارض ضعف وغیرہ ہوتے ہیں وہ سب میرے شامل حال رہتے ہیں۔ (۵) ایک دوسرے موقعہ پر لکھتے ہیں ’’کوئی وقت دورانِ سر سے خالی نہیں

---

(۱) اکسیر اعظم ج۱ ص۱۸۸۔ (۲) رسالہ تشحیذ الاذہان جون ۱۹۰۶÷ ص۱۶۔

(۳) ریویو آف ریلیجنز بابتہ اگست ۱۹۲۶÷ ص۱۰۔

(۴) ضمیمہ اربعین نمبر۳،۴۔ (۵) ایضاً۔

گذرتا۔ مدت ہوئی نماز تکلیف سے بیٹھ کر پڑھی جاتی ہے۔ بعض وقت درمیان میں توڑنی پڑتی ہے۔(۱) مجھے اسہال کی بیماری ہے اور ہر روز کئی دست آتے ہیں۔ (۲) ایک مرتبہ قولنج سے سخت بیمار ہوا اور سولہ دن تک پاخانہ کی راہ سے خون آتا رہا اور سخت درد تھا جو بیان سے باہر ہے۔ (۳) اپنے مرید خاص وخلیفۂ اعظم حکیم نورالدین کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

”جب میں نے نئی شادی کی تھی تو مدّت تک مجھے یقین رہا کہ میں نامرد ہوں“

ایک اور خط میں لکھا کہ ”ایک مرض مجھے نہایت خوف ناک تھی کہ صحبت کے وقت لیٹنے کی حالت میں نعوظ بکلّی جاتا رہتا تھا۔(۴) (نعوظ بالضمّ برخاستن قضیب یعنی استادگیٔ ذکر) انگریزی نبی آنجہانی مرزا جی کا ان موذی اور رسواکن امراض میں مبتلا ہونا حیرت انگیز نہیں ہے بلکہ اگر معاملہ اس کے برعکس ہوتا تو حیرت کی بات ضرور ہوتی۔

افیون اور شراب کا استعمال

مرزا جی کہا کرتے تھے کہ بعض اطباء کے نزدیک افیون نصف طب ہے چنانچہ انھوں نے ایک دوا ”تریاقِ الٰہی“ کے نام سے تیار کی تھی جس کا بڑا اجزو افیون تھا۔ اس دوا کو افیون کے مزید اضافہ کے ساتھ اپنے خلیفۂ اوّل کو چھ ماہ سے زائد مدت تک کھلاتے رہے اور خود بھی وقتاً فوقتاً استعمال کرتے تھے۔ (۵)

ٹانک ڈائن کا استعمال

مرزا جی اپنے چہیتے مرید حکیم محمد حسین کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

محبی اخویکم محمد حسین سلّمہٗ اللہ تعالیٰ۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ اس وقت میاں یار محمد بھیجا جاتا ہے۔ آپ اشیاء خریدنی خود خریدیں اور ایک بوتل ٹانک وائن کی پلومر کی

---

(۱) مکتوبات احمدیہ ج۵ ص ۸۸۔

(۲) کتاب منظور الٰہی ص ۳۴۹۔ (۳) حقیقۃ الوحی ص ۲۳۴۔

(۴) مکتوباتِ احمدیہ، ج۵، ص ۸۸۔

(۵) اخبار الفضل قادیان ۱۹؍ جولائی ۱۹۲۹ء بحوالہ قادیانی مذہب ص ۵۹ مطبوعہ بار سوم۔

دُکان سے خریدیں۔ مگر ٹانک وائن چاہئے اس کا لحاظ رہے باقی خیریت ہے۔ والسلام (۱)

''سودائے مرزا'' کے حاشیہ پر حکیم محمد علی پرنسپل طبیہ کالج امرتسر لکھتے ہیں ''ٹانک وائن کی حقیقت لاہور میں پلومر کی دوکان سے ڈاکٹر عزیز احمد صاحب کی معرفت معلوم کی گئی ڈاکٹر صاحب جواباً تحریر فرماتے ہیں ''حسب ارشاد پلومر کی دوکان سے دریافت کیا گیا۔ جواب حسب ذیل ملا۔

''ٹانک وائن ایک قسم کی طاقت ور اور نشہ دینے والی شراب ہے جو ولایت سے بند بوتلوں میں آتی ہے۔ اس کی قیمت ساڑھے پانچ روپئے ہے'' (۲۱/دسمبر ۱۹۳۲ء) (۲)

مرزا جی بحیثیت صاحبِ کشف

مرض مراق کے دماغ پر مسلّط ہوجانے کے بعد مرزا جی کے دل ودماغ کے سوتے سے الہامات کا سیل رواں پھوٹ پڑا اور اعلانات واشتہارات کے ذریعہ اس کا خوب ڈھنڈھورا پیٹا گیا۔ جس کا اثر یہ نکلا کہ دُور دُور سے لوگ قادیان آنے لگے۔ مرزا جی تقدس کا رُوپ دھارے اپنے بیت الفکر نامی حجرے میں لیٹے رہتے اور الہامات کی بارش ہوتی رہتی تھی۔ اور جب الہام کی غنودگی دور ہوتی تو فوراً اُسے نوٹ بک میں دَرج کرلیا جاتا۔ (۳)

ایک ہندو لڑکا بحیثیت کاتبِ وحی

چونکہ ساون کی جھڑی کی طرح الہامات کا ایک غیر منقطع سلسلہ جاری تھا اس لئے ضرورت تھی کہ انھیں ضبط تحریر میں لانے کیلئے ایک مستقل کاتب رکھا جائے۔ چنانچہ اس مقدس کام کی انجام دہی کے لئے ایک ہندو لڑکے کا انتخاب عمل میں آیا۔ خود مرزا جی لکھتے ہیں ''ان دنوں ایک پنڈت کا بیٹا شام لال نامی جو ناگری اور فارسی دونوں میں لکھ سکتا تھا۔ بطور روزنامہ نویس نوکر رکھا گیا۔ اور بعض امور غیبیہ جو ظاہر ہوتے تھے اس کے ہاتھ سے

---

(۱) خطوط امام بنام غلام ص ۵ بحوالہ سابق ص ۶۰۔

(۲) سودائے مرزا ص ۳۹ حاشیہ۔ (۳) سیرت المہدی ج ا ص ۱۵۔

ناگری اور فارسی خط میں قبل از وقوع لکھائے جاتے تھے اور پھر شام لال مذکور کے اس پر دستخط کرائے جاتے تھے۔ (۱) یہ ہندو لڑکا جب اوّل اوّل نوکر رکھا گیا تو اس کی عمر کل بارہ سال کی تھی اور مرزا جی کے چچازاد بھائی مرزا امام الدین کے بقول اس درجہ بے سمجھ اور سادہ لوح تھا کہ سو تک بمشکل شمار کرسکتا تھا (۲) ''جیسی وحی ویسا کاتب حق بحق دار رسید''۔

زر اندوزی کی ایک اور تجویز

مرزا جی نے معاشی زبوں حالی کو دور کرنے کی غرض سے مذہبی مناظرہ اور بزرگی کا جو سوانگ رچایا تھا اس میں انھیں بڑی حد تک کامیابی مل گئی تھی۔ اور دجل وفریب کے یہ تیر شہرت وقبولیت کے نشانے پر ٹھیک بیٹھ گئے تھے۔ جس کی وجہ سے عوام وخواص کا ایک اچھا خاصا طبقہ ان کی جانب متوجہ ہوگیا۔ اس لئے انھوں نے روپیہ بٹورنے کی ایک اور تجویز سوچی اور ''براہین احمدیہ'' کے نام سے پچاس جلدوں پر مشتمل ایک ضخیم کتاب کی طباعت کا اعلان کیا اور لوگوں سے پیشگی قیمت اور امداد و اعانت حاصل کرنے کی غرض سے اشتہارات کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع کردیا۔ اس سلسلے کا پہلا اشتہار اپریل ۱۸۷۹ء میں بعنوان ''اشتہار بغرض استعانت از انصار دین محمد مختار صلی اللہ علیہ وآلہ الابرار تھا۔'' اس میں دیگر باتوں کے علاوہ یہ بھی تحریر کیا تھا کہ ''ایسی بڑی کتاب کا چھپ کر شائع ہونا بجز معاونت مسلمان بھائیوں کے بڑا مشکل امر ہے اور ایسے اہم کام میں اعانت کرنے میں جس قدر ثواب ہے وہ ادنیٰ اہل اسلام پر بھی مخفی نہیں لہٰذا اخوان مؤمنین سے درخواست ہے کہ اس کے مصارف طبع میں معاونت کریں۔ اغنیاء لوگ اگر اپنے مطبخ کے ایک دن کا خرچ بھی عنایت فرمائیں گے، تو یہ کتاب بسہولت چھپ جائے گی۔ ورنہ یہ مہر درخشاں چھپا رہے گا، یا یوں کریں کہ ہر ایک اہل وسعت بہ نیت خریداری کتاب پانچ پانچ رُوپے مع اپنی درخواستوں کے راقم کے پاس بھیج دیں جیسی جیسی کتاب چھپتی جائے گی۔ ان کی

---

(۱) البشریٰ ج ا ص ۱۰۔

(۲) تکذیب براہین ص ۳۲۸۔

خدمت میں ارسال ہوتی رہے گی۔ (۱) کچھ دنوں کے بعد ایک اور اشتہار بعنوان ''اشتہار کتاب براہین احمدیہ بجہت اطلاع جمیع عاشقانِ صدق وانتظام سرمایہ طبع کتاب'' شائع کیا اس کا مضمون بھی پہلے اشتہار کے قریب قریب تھا۔

ان اشتہارات کے ملک میں پھیلتے ہی حسب توقع روپیوں کی بارش شروع ہوگئی لیکن اس بارشِ زر نے استسقیٰ کے مریض کی طرح ان کی طلب مال کی تشنگی کو مزید بڑھا دیا اس لئے مرزا جی نے ۳ر دسمبر ۱۸۷۹÷ کو اس کی قیمت میں پانچ روپے کا اور اضافہ کرکے دس روپے کردی اور اسی کے ساتھ اس وعدہ کا بھی اعلان کیا کہ جنوری ۱۸۸۰÷ میں کتاب طبع ہوکر شائع ہوجائے گی (۲) چونکہ مرزا جی کے بے پناہ پروپیگنڈے نے لوگوں کو کتاب مذکور کا مشتاق بنا دیا تھا۔ اس لئے بڑی کثیر تعداد میں کتاب کے آرڈر آئے اس مقبولیت کو دیکھ کر دو حصوں کے طبع ہوجانے کے بعد اس کی قیمت میں مزید اضافہ کردیا اور فارغ البال لوگوں سے دس روپے کے بجائے پچیس روپے سے لے کر سو روپئے تک وصول کرنے لگے۔ (۳)

بدمعاملگی اور سخن تراشی

آنجہانی نے ابتداء میں پچاس حصوں پر مشتمل کتاب شائع کرنے کا اعلان کیا تھا اور پچاسوں جلدوں کی پیشگی قیمت لوگوں سے وصول کرلی تھی لیکن چار حصے شائع کرنے کے بعد اس سلسلہ کو بند کردیا جس کی بناء پر خریداروں کو شکایت ہوئی۔ اب اس بدمعاملگی پر پردہ ڈالنے کی غرض سے سخن تراشی اور الہام بازی شروع کردی چنانچہ براہین احمدیہ جلد چہارم کے آخری صفحہ پر ''ہم اور ہماری کتاب'' کے عنوان سے لکھتے ہیں ''ابتداء میں جب یہ کتاب تالیف کی گئی تھی اس وقت اس کی کوئی اور صورت تھی۔ اب اس کتاب کا متولی اور مہتمم ظاہراً اور باطناً حضرت رب العالمین ہے اور کچھ معلوم نہیں کہ کس اندازہ اور مقدار

---

(۱) تبلیغ رسالہ ج اص ۸/ب۔ (۲) تبلیغ رسالت ج اص ۸/ھ۔

(۳) ایضاً ص ۲۳۔

تک اس کو پہنچانے کا ارادہ ہے اور سچ تو یہ ہے کہ جس قدر جلد چہارم تک انوار حقیقت اسلام کے ظاہر کئے ہیں یہ بھی اتمام حجت کے لئے کافی ہیں الخ۔ ''(۱)

اس تولیت واہتمام خداوندی کے ڈھونگ کا واحد مطلب یہ تھا کہ اب میں باقی ماندہ کتاب کی طبع واشاعت کا ذمہ نہیں لے سکتا اب یہ کام خدا ہی کے سپرد ہے وہ چاہے تو طبع کرائے یا نہ طبع کرائے میری کوئی ذمہ داری نہیں۔

الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے

مرزا صاحب لوگوں کی پیشگی رقمیں شیر مادر کی طرح ہضم کر گئے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ لوگوں کو شکایتیں ہوئیں اور مرزا جی کی بدمعاملگی کا چرچا برسر عام ہونے لگا تو انھیں فکر لاحق ہوئی کہ شکوہ وشکایتوں کا یہ سلسلہ یونہی جاری رہا تو ایک عرصہ کے جتن کے بعد تقدس کا جو سکہ جمایا گیا تھا کہیں عقیدت مندوں کے دلوں سے زائل نہ ہو جائے۔ اس لئے یکم مئی ۱۸۹۳ء کو آٹھ صفحات کا ایک اشتہار شائع کیا جس میں لکھا کہ ''مجھے ان مسلمانوں پر نہایت افسوس ہے کہ جو اپنے پانچ یا دس روپے کے مقابل پر ۳۶ جزوں (۵۶۲ صفحات) کی ایسی کتاب پا کر جو معارفِ اسلام سے بھری ہوئی ہے ایسے شرمناک طور پر بدگوئی اور بدزبانی پر مستعد ہو گئے کہ گویا ان کا روپیہ کسی نے چھین لیا یا اُن پر کوئی قزاق آپڑا اور گویا وہ ایسی بے رحمی سے لوٹے گئے کہ اس کے عوض میں ان کو کچھ نہیں دیا گیا اور اُن لوگوں نے زبان درازی اور بدظنی سے اپنے نامۂ اعمال کو سیاہ کیا کہ کوئی دقیقہ سخت گوئی کا باقی نہ رکھا اس عاجز کو چور قرار دیا گیا، مکار ٹھہرایا، مال مردم خور کر کے بدنام کیا، حرام خور کہہ کر نام لیا، دغاباز نام رکھا، اور اپنے پانچ و دس روپے کے غم میں وہ سیاپا کیا کہ گویا تمام گھر ان کا لوٹا گیا الخ (۲)

وعدہ خلافی

مرزا جی نے براہین احمدیہ کی پیشگی قیمت وصول کرتے وقت یہ بھی وعدہ کیا تھا کہ

---

(۱) تبلیغ رسالت ج ۱ ص ۴۷۔ (۲) تبلیغ رسالت ج ۳ ص ۳۴۔

اس کتاب میں حقانیت اسلام کے تین سو دلائل درج کیے جائیں گے لیکن وعدہ کے مطابق ایک دلیل بھی پوری نہیں کی، چنانچہ مرزا زادے میاں بشیر احمد لکھتے ہیں ”تین سو دلائل جو آپ (مرزا غلام احمد) نے لکھے تھے ان میں سے صرف ایک ہی دلیل بیان ہوئی اور وہ بھی نامکمل طور پر۔ (۱)

یہ ہے آنجہانی مرزا غلام احمد قادیانی نبیٔ افرنگ کی ترپن سالہ داستانِ حیات کا مختصر بیان جو ان کی تصنیفات یا اُن کے بیٹے مرزا بشیر احمد ایم، اے اور دیگر مرزائی ماخذوں کو سامنے رکھ کر پیش کیا گیا ہے۔ قارئین اُسے پڑھ کر خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ آنجہانی جیسے کردار و اخلاق کا شخص شریف انسان کہے جانے کے بھی قابل نہیں ہے۔ چہ جائیکہ وہ ملہم، محدث، مہدی موعود، مسیح زماں یا نبی ہو۔

سَبُحَانَکَ هٰذا بُهتَانٌ عَظِیُمٌ.

☆ ☆ ☆

---

(۱) سیرت المہدی، ج ۱ ص ۹۲۔

مرزا قادیانی
اپنے عقائد اور دعووں کی روشنی میں

تمہید

دین اسلام اپنے ابتدائے قیام سے مختلف النوع فتنوں سے دوچار ہوتا رہا ہے جو اس کی ترویج وترقی کی راہ میں کوہِ گراں بنتے رہے ہیں، لیکن اس تاریخی حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں ہے کہ اللہ رب العزت کی تائید ونصرت سے علمائے اسلام وصلحائے امت نے اسلام کے خلاف ان تمام اٹھنے والے فتنوں کا پامردی کے ساتھ مقابلہ کیا اور اسلام کے حریفوں کو ہر محاذ پر شکست فاش دے کر اسلام کے کارواں کو آگے بڑھایا ہے۔

چنانچہ قرونِ اُولیٰ میں خارجیت، رافضیت، اعتزال، جبر وقدر وغیرہ کے نام سے پے درپے انتہائی خطرناک قسم کے فتنے برپا کیے گئے کہ اگر خدائی وعدہ اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحَافِظُوۡنَ۔ کا ظہور علمائے دین ومحافظین شریعت کی صورت میں نہ ہوا ہوتا تو ملت اسلامیہ کی یہ عظیم الشان عمارت کب کی زمیں بوس ہوگئی ہوتی، لیکن حفاظتِ خداوندی کا یہ ادنیٰ کرشمہ ہے کہ آفتاب اسلام اپنی تمام تر تابانیوں کے ساتھ بسیط ارض پر ضیاء پاش اور نور افشاں ہے ”ھُوَ الَّذِیۡ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَہٗ بِالۡھُدٰی وَدِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡھِرَہٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّہٖ وَلَوۡ کَرِہَ الۡکَافِرُوۡنَ“۔

قرون اولیٰ کی طرح دور جدید میں بھی دشمنانِ دین نے اسلام کے محاسن وبرکات سے انسانیت کو محروم کردینے کی غرض سے متعدد فتنوں کو جنم دیا جن میں سب سے زیادہ خطرناک ”فتنۂ قادیانیت“ ہے، جو انگریزوں کی بدنام زمانہ ڈپلومیسی ”لڑاؤ اور حکومت کرو“

کی بنیاد پر سوچے سمجھے منصوبے کے تحت برپا کیا گیا تھا، طالع آزما انگریز اپنے علم و تجربہ کی بنیاد پر اچھی طرح سمجھتے تھے کہ جب تک مسلمانوں کو وحدت ملّی، کتاب و سنت سے والہانہ شیفتگی، جذبۂ جہاد اور عقیدۂ ختم نبوت سے محروم نہیں کر دیا جاتا اس وقت تک ہمارا سامراجی نظام مستحکم اور پائیدار نہیں ہوسکتا اپنی ان مکروہ اغرض کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کیلئے انھیں ایک ایسے دین فروش کی تلاش تھی جو اپنے آپ کو ملتِ اسلامیہ کا ایک فرد کہلانے کے باوجود حطام دنیا کی ہوس میں اسلام کے خلاف سب کچھ کرسکتا ہو چنانچہ انھیں پنجاب کے ضلع گرداسپور میں ''مرزا غلام احمد قادیانی'' کی شکل میں اپنا گوہر مقصود مل گیا، انجام کار انھیں انگریزوں کی تحریک پر ''مرزا'' نے مسلمانوں کو شاہراہِ اسلام سے دور کرنے اور ان میں انتشار و تفریق پیدا کرنے کی غرض سے جھوٹی نبوت کا سوانگ رچایا، اور اسلام کی جانب منسوب کر کے ملتِ اسلامیہ کے سامنے ایسے ایسے عقائد و نظریات پیش کیے جن کا اسلام سے دور کا بھی واسطہ نہیں خود مرزا کی درج ذیل تحریر اس بات کی شاہد ہے کہ مرزا کی یہ ساری فتنہ پردازیاں انگریزوں ہی کے چشم و ابرو کی رہینِ منت ہیں۔

> ''اے بابرکت قیصر ہند (ملکہ وکٹوریہ) تجھے یہ تیری عظمت اور نیک نامی مبارک ہو خدا کی نگاہیں اس ملک پر ہیں خدا کی رحمت کا ہاتھ اس رعایا پر ہے جس پر تیرا ہاتھ ہے تیری ہی پاک نیتوں کی تحریک سے خدا نے مجھے بھیجا ہے۔''(۱)

اس نبیٔ افرنگ نے مسلمانوں کو اسلامی عقائد و اعمال سے برگشتہ کرنے اور انھیں ہمیشہ کے لئے فرنگیوں کا بندۂ بے دام بنائے رکھنے میں اپنی تمام کوششیں اور ساری توانائیاں صرف کر دیں جس کا اعتراف مرزا نے بایں الفاظ کیا ہے۔

> ''میری ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ مسلمان اس سلطنت (برطانیہ) کے سچے خیر خواہ ہو جائیں اور مہدی خونی اور مسیح خونی کی بے اصل روایتیں اور جہاد کے جوش دلانے والے مسائل جو احمقوں کے دلوں کو خراب کرتے ہیں ان کے دلوں سے معدوم ہو جائیں۔''(۲)

---

(۱) ستارہ قیصر ص ۱۵۔ (۲) تریاق القلوب ص ۲۵۔

پھر مزید صراحت کرتے ہوئے یوں لکھتا ہے۔

''میری عمر کا اکثر حصہ سلطنتِ انگریزی کی تائید اور حمایت میں گذرا ہے۔''(۱)

انگریزوں کے الطاف بے پایاں اور نوازشات بیکراں نے اسے اس درجہ مدہوش کر دیا تھا کہ اسلام کی بیخ کنی اور دینِ خداوندی کے مسخ کرنے کو اپنی زندگی کا اعلیٰ ترین مقصد بنالیا تھا، اپنی اس منحوس کارگذاری میں انگریزوں کے تعاون پر وہ ان الفاظ میں ان کا شکریہ ادا کر رہا ہے۔

> ''اگرچہ اس محسن گورنمنٹ کا ہر ایک پر رعایا میں سے شکر واجب ہے مگر میں خیال کرتا ہوں کہ مجھ پر سب سے زیادہ واجب ہے کیونکہ یہ میرے اعلیٰ مقاصد جو قیصر ہند کی حکومت کے سایہ کے نیچے انجام پذیر ہو رہے ہیں ہرگز ممکن نہ تھا کہ وہ کسی اور گورنمنٹ کے زیر سایہ انجام پذیر ہو سکتے اگرچہ وہ کوئی اسلامی گورنمنٹ ہی ہوتی۔''(۲)

ظاہر ہے کہ اسلام کے ازلی دشمن انگریزوں کے اشارے اور ان کے احسانات کے زیر سایہ جس جھوٹی نبوت کا بہروپ بھرا گیا تھا اس کی جانب سے وحی والہام کے نام سے امت مسلمہ کے سامنے جو کچھ پیش کیا گیا ہے اس کا کتاب وسنت سے کیونکر میل کھا سکتا ہے اس لئے ان خرافات سے اگر اسلام کو کوئی نسبت ہو سکتی ہے تو وہ تضاد ہی کی ہوگی، اس مختصر سی تمہید کے بعد مسیلمۂ ہند مرزا غلام احمد قادیانی کے توحید و رسالت وغیرہ کے سلسلے میں چند عقائد اور دعاوی پیش کئے جا رہے ہیں جس سے روز روشن کی طرح یہ بات آشکارا ہو جائے گی کہ مرزا اور اس کے حمایتیوں نے اپنی تصانیف میں اسلام کا نام لے کر جن عقائد و نظریات کو پیش کیا ہے ان کا اس کے متعارف ومتوارث عقائد و اعمال سے کوئی تعلق نہیں ہے بالفاظ دیگر یہ اسلام کے متوازی ایک جدید اسلام کی تشکیل ہے جس کا قرآن وحدیث سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔

---

(۱) ایضاً ص ۲۵۔

(۲) تحفۂ قیصریہ ص ۲۷۔

توحید اور خدا کی ذات وصفات کے متعلق مرزا کے دعوے وعقائد

مرزا کو اس بات کا زعم ہے کہ ان کے قلب پر الہامات بارش کی طرح برستے ہیں، درحقیقت مرزا کا یہ ایک فریب ہے کہ وہ اپنے عقیدے کو لوگوں کے سامنے الہام ووحی کے نام سے پیش کرتا ہے تاکہ بندگان خدا کو اپنے دام شیطانی کا شکار بنا سکے ذیل میں اس کے چند من گھڑت اور جھوٹے دعوے پیش کئے جا رہے ہیں جسے وہ الہام کا نام دیتا ہے۔

دعویٰ ۱: مرزا اپنے ایک الہام کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔

(قال اللّٰه تعالیٰ) اصلی واصوم واسهر وانام.(۱)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا میں نماز پڑھتا ہوں روزہ رکھتا ہوں، جاگتا ہوں، اور سوتا ہوں۔

گویا خدا بھی بندوں کی طرح عبادت کا مکلّف اور پابند ہے اور انسانوں و دیگر حیوانات کی طرح سونے وجاگنے کا محتاج ہے، ''مرزا'' کا باری تعالیٰ عزاسمہ کے متعلق یہ دعویٰ وعقیدہ کتاب وسنت سے ثابت شدہ عقیدہ کے بالکل متضاد ومنافی ہے۔

دعویٰ ۲: ایک الہام کی ترجمانی ان الفاظ میں کی ہے۔

خاطبنی اللّٰه بقوله اسمع یا ولدی (۲)

اللہ نے مجھے یہ کہہ کر خطاب کیا ''اے میرے بیٹے سن''

اس من گھڑت الہام میں بعینہٖ عیسائیت کے عقیدۂ ابنیت کو پیش کیا ہے جس کی تردید کتاب الٰہی کے مقاصد میں سے ایک اہم ترین مقصد ہے۔

دعویٰ ۳: ایک الہام یہ بھی ہے۔

یا قمر یا شمس انت منی وانا منك. (۳)

اے ماہتاب اے آفتاب تو مجھ سے ہے میں تجھ سے ہوں۔

اس الہام کے ذریعہ اپنے آپ کو (نعوذ باللہ) خدا کا جز ثابت کرنے کی مشرکانہ سعی

---

(۱) البشریٰ ج ۲ ص ۷۹۔ (۲) البشریٰ ج ۱ ص ۴۹۔

(۳) حقیقۃ الوحی ص ۷۴۔

کی گئی ہے۔

دعویٰ ۴: ایک الہام کے تیور اور بھی ملاحظہ کیجئے، خدا کی جانب افتراء کرتے ہوئے انگریزوں کا یہ زرخرید لکھتا ہے۔

انا نبشرك بغلام مظهر الحق كانّ الله نزل من السماء. (۱)

ہم تجھے ایک لڑکے کی بشارت دیتے ہیں جو حق ظاہر کرنے والا ہوگا (وہ ایسا ہوگا) گویا آسمان سے خدا اتر آیا ہے۔“

استغفر اللہ، استغفر اللہ مرزا نے اپنے اس دعویٰ میں اپنے بیٹے کو خدا سے تشبیہ دی ہے۔ استغفر اللہ، استغفر اللہ۔

(۲) صفات الٰہیہ سے متصف ہونے کے دعوے

دعویٰ ۱: اور مجھ کو فانی کرنے اور زندہ کرنے کی صفت دی گئی اور یہ صفت اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھے ملی ہے۔ (۲)

مرزا کا یہ نمرودی دعویٰ کتاب الٰہی قرآن میں بیان کردہ موحد اعظم خلیل اللہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے عقیدہ ”ربی الذی یحی ویمیت“ کے سراسر خلاف ہے۔

دعویٰ ۲: بنام الہام مرزا کا یہ افتراء بھی صفات باری تعالیٰ میں دخل اندازی کی مشرکانہ کوشش ہے۔

انما امرك اذا اردت شيئا ان تقول له كن فيكون. (۳)

تو (یعنی مرزا) جس بات کا ارادہ کرتا ہے وہ تیرے حکم سے اسی وقت ہو جاتی ہے۔

قدرت کن فیکون یعنی تصرف بالارادہ کی قدرت صرف ذات جل مجدہ کو حاصل ہے اس صفت میں بنص قرآنی ان کا کوئی شریک اور ساجھی نہیں ہے۔

دعویٰ ۳: اس دعویٰ کا شرک ہونا اظہر من الشّمس ہے۔

---

(۱) حقیقۃ الوحی، ص ۹۵۔ (۲) خطبۂ الہامیہ مترجم ص ۵۵۔

(۳) حقیقۃ الوحی ص ۱۰۵۔

انت منی وانا منك ظهورك ظهوری.(۱)

تو مجھ سے ہے اور میں تجھ سے، تیرا ظہور میرا ظہور ہے۔

دعویٰ ۴: دعویٰ نمبر۳ کی طرح یہ دعویٰ بھی شرک محض ہے اور اپنے آپ کو نعوذ باللہ خدائے پاک کا ہمسر سمجھنے کی فرعونی کوشش ہے۔

الارض والسماء معك كما هو معی.(۲)

زمین وآسمان تیرے ساتھ ہیں جیسا کہ وہ میرے ساتھ ہیں۔

دعویٰ ۵: اس جھوٹے دعویٰ کو بھی ملاحظہ کیجئے کس طرح خدا کی صفت تخلیق کو اپنے اوپر چسپاں کر رہا ہے اور عین خدا بننے کی فرعونی ونمرودی جسارت میں مبتلا ہے۔

رأيتنی فی المنام عين اللّٰه وتيقنت اننی هو وبينما انا فی هذه الحالة كنت اقول انا اريد نظاما جديدا سماء جديدا وارضا جديدة فخلقت السمٰوات والارض اولاً بصورة اجمالية لاتفريق فيها ولا ترتيب ثم فرقتها ورتبتها بوضع هو مراد الحق وكنت اجد فی نفسی علی خلقهما كالقادرين ثم خلقت السماء الدنيا وقلت انا زينا السماء الدنيا بمصابيح ثم قلت الآن نخلق الانسان من سلالة من طين.(۳)

> **میں نے اپنے آپ دیکھا کہ میں عین خدا ہوں اور میں نے یقین کرلیا کہ واقعی میں خدا ہی ہوں میں اسی حالت میں تھا کہ میں نے کہا — میں ایک جدید نظام اور نیا آسمان نئی زمین بنانے کا ارادہ رکھتا ہوں چنانچہ (اس ارادہ کے مطابق) پہلے میں نے زمین وآسمان کی اجمالی صورت پیدا کی جس میں تفریق وترتیب نہیں تھی پھر میں نے انھیں جدا کیا اور ترتیب دی پھر میں نے آسمانِ دنیا کو پیدا کیا اور کہا کہ ہمیں نے آسمان دنیا کو چراغوں سے آراستہ کیا ہے پھر میں گویا ہوا کہ اب میں انسانوں کو گوندھی ہوئی مٹی سے پیدا کروں گا۔**

مرزا قادیانی کے خرافات کے پٹارے سے یہ چند دعوے بطور نمونہ کے پیش کئے

---

(۱) تذکرہ ص۱۷۱۔ (۲) انجام آتھم ص۴۹۔ (۳) آئینہ کمالاتِ اسلام ص۵۶۴،۵۶۵۔

گئے ہیں کیا ان خالص مشرکانہ دعووں کے بعد بھی اس فرنگی شجرۂ خبیثہ کو گلشن اسلام میں باقی چھوڑ دینے کی کوئی گنجائش ہے؟ فرعون ونمرود کے اس بروز کو اسلام اپنے دامن میں پناہ دے سکتا ہے اور کیا ملت اسلامیہ سے ایسے ناپاک شخص کا کوئی رابطہ باقی رہ سکتا ہے؟ ہرگز نہیں ہرگز نہیں۔

(۳) دعوئ وحی، نبوت و معجزات

(۱) میں اسی خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ اسی نے مجھے بھیجا ہے اور اسی نے میرا نام نبی رکھا ہے اور اسی نے مجھے مسیح موعود کے نام سے پکارا ہے اور اس نے میری تصدیق کے لئے بڑے بڑے نشان ظاہر کئے ہیں جو تین لاکھ تک پہنچتے ہیں۔ (تتمہ حقیقۃ الوحی ص ۶۸)

(۲) خدا تعالیٰ نے اس بات کو ثابت کرنے کیلئے کہ میں اس کی طرف سے ہوں اس قدر نشان دکھلائے ہیں کہ اگر وہ ہزار نبی پر تقسیم کئے جائیں تو ان کی بھی ان سے نبوت ثابت ہوسکتی ہے لیکن پھر بھی جو لوگ انسان میں سے شیطان ہیں وہ نہیں مانتے (چشمۂ معرفت ص ۳۱۷)

(۳) میں خدا تعالیٰ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں ان الہامات پر اسی طرح ایمان لاتا ہوں جیسا کہ قرآن شریف پر اور خدا کی دوسری کتابوں پر اور جس طرح میں قرآن شریف کو یقینی اور قطعی طور پر خدا کا کلام جانتا ہوں اسی طرح اس کلام کو بھی جو میرے اوپر نازل ہوتا ہے خدا کا کلام یقین کرتا ہوں (حقیقۃ الوحی ص ۲۱۱)

(۴) نبی کریم ...... کے ساتھ وحدت و یکسانیت کا دعویٰ

(۱) آنحضرت ...... کے دو بعث ہیں یا بہ تبدیل الفاظ یوں کہہ سکتے ہیں کہ بروزی رنگ میں آنحضرت ...... کا دوبارہ آنا دنیا میں وعدہ دیا گیا تھا جو مسیح موعود اور مہدی معہود (مرزا) کے ظہور سے پورا ہوا (تحفۂ گولڑویہ ص ۹۴)

(۲) اور جان کہ ہمارے نبی کریم ...... جیسا کہ پانچویں ہزار (چھٹی صدی مسیحی)

میں مبعوث ہوئے ایسا ہی مسیح موعود (مرزا قادیانی) نے بروزی صورت اختیار کر کے چھٹے ہزار (تیرھویں صدی ہجری) کے اخیر میں (قادیان میں) مبعوث ہوئے، اور یہ قرآن سے ثابت ہے اس میں انکار کی گنجائش نہیں۔ (خطبۂ الہامیہ ص۱۸۰)

(۳) جس نے مسیح موعود (مرزا جی) اور نبی کریم میں تفریق کی اس نے بھی مسیح موعود کی تعلیم کے خلاف قدم مارا کیونکہ مسیح موعود صاف فرماتا ہے کہ من فرق بینی وبین المصطفى فما عرفنى وما راى (خطبۂ الہامیہ ص۱۷۱)

آنجہانی مرزا جی کے ان دعاوی کے بطلان پر خود ان کی اپنی ذات مکمل دلیل ہے کیونکہ ہر وہ شخص جسے قادیانیت سے ادنیٰ بھی واقفیت ہے وہ جانتا ہے کہ مرزا جی بہت سے پیچیدہ ومزمن امراض کے شکار تھے جن میں سے چند امراض کی فہرست بحوالہ کتب درج ذیل ہے۔

(۱) بدہضمی (ریویو، مئی ۱۹۲۸÷) (۲) تشنج دل (ضمیمہ اربعین ۳،۴) (۳) تشنج اعصاب (سیرۃ المہدی ص۱۳ ج۱) (۴) جسمانی قویٰ کا اضمحلال (آئینہ احمدیت ص۱۸۶) (۵) دق (حیات احمدیہ ج۲ ص۷۹) (۶) سل (سیرۃ المہدی ص۴۴ ج۱) (۷) مراق (سیرۃ المہدی ج۲ ص۵۵) (۸) ہسٹریا (سیرۃ المہدی ج۱ ص۱۲، وج۲ ص۵۵) (۹) دماغی بے ہوشی (الحکم ۲۱ مئی ۳۴÷) (۱۰) غشی (سیرۃ المہدی ج۱ ص۱۳) (۱۱) سوسوبار پیشاب کا آنا (ضمیمہ اربعین ص۳ و۴) (۱۲) کثرت اسہال (نسیم دعوت) (۱۳) دل ودماغ کی سخت کمزوری (تریاق القلوب ص۳۵) (۱۴) مسلوب القویٰ (آئینہ احمدیت ص۱۸۶) (۱۵) شوگر (نزول المسیح ص۲۰۹ حاشیہ) (۱۶) دورانِ سر (نزول المسیح ۲۰۹ حاشیہ) (۱۷) شدید دردسر جس کا آخری اثر مرگی (حقیقۃ الوحی ۳۶۲) (۱۸) حافظہ نہایت ابتر (مکتوبات احمدیہ ج۵ ص۳) (۱۹) حالت مردمی کالعدم (تریاق القلوب ص۳۵) (۲۰) نامردی (مکتوبات احمدیہ ج۵ ص۱۴)

سیّد المرسلین …… سے برتر اور افضل ہونے کا دعویٰ

(۱) ہمارے نبی کریم …… کی روحانیت نے پانچویں ہزار میں اجمالی صفات کے

ساتھ (مکہ میں) ظہور فرمایا اور وہ زمانہ اس روحانیت کی ترقیات کی انتہا کا نہ تھا بلکہ اسکے کمالات کے معراج کیلئے پہلا قدم تھا، پھر اس روحانیت نے چھٹے ہزار کے آخر میں یعنی اس وقت (قادیان میں) پوری تجلی فرمائی۔ (خطبۂ الہامیہ ص ۱۷۷)

(۲) اور ظاہر ہے کہ فتح مبین کا وقت ہمارے نبی کریم ...... کے زمانہ میں گذر گیا اور دوسری فتح باقی رہی جو کہ پہلے غلبہ سے بہت بڑی اور زیادہ ظاہر ہے اور مقدر تھا کہ اس کا وقت مسیح موعود کا وقت ہو اور اسی کی طرف خدا تعالیٰ کے قول میں اشارہ ہے سبحان الذی اسری بعبدہ۔ (خطبۂ الہامیہ ص ۱۹۲)

(۳) قرآن شریف کیلئے تین تجلیات ہیں وہ سیّدنا حضرت محمد ...... کے ذریعہ نازل ہوا اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے ذریعہ اس نے زمین پر اشاعت پائی اور مسیح موعود (مرزا) کے ذریعہ سے بہت سے پوشیدہ اسرار اس کے کھلے۔

(۴) تین ہزار معجزات ہمارے نبی ...... سے ظہور ہوئے (تحفۂ گولڑویہ ص ۶۲) میری تائید میں اس خدا نے وہ نشان ظاہر فرمایا ہے کہ.... اگر میں انکو فرداً فرداً شمار کروں تو میں خدا کی قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ وہ تین لاکھ سے بھی زیادہ ہیں (حقیقۃ الوحی ص ۶۷)

(۵) حضرت مسیح موعود (مرزا) کا ذہنی ارتقا آنحضرت ...... سے زیادہ ہے اور یہ جزوی فضیلت ہے جو حضرت مسیح موعود کو (مرزا) آنحضرت صلعم پر حاصل ہے، نبی کریم صلعم کی ذہنی استعدادوں کا پورا ظہور بوجہ تمدن کے نقص کے نہ ہوا اور نہ قابلیت تھی اب تمدن کی ترقی سے حضرت مسیح موعود کے ذریعہ ان کا ظہور ہوا (ریویو مئی ۱۹۲۹ء)

(۶) محمد پھر اتر آئے ہیں ہم میں　　اور آگے سے ہیں بڑھ کر اپنی شان میں
محمد دیکھنے ہوں جس کو اکمل　　غلام احمد کو دیکھے قادیاں میں

(اخبار بدر جلد ۲ مورخہ ۲۵ اکتبر ۱۹۰۶ء)

قاضی اکمل مرزا کے پر جوش مرید تھے انھوں نے یہ نظم لکھ کر اور قطعہ کی شکل میں فریم کرا کر مرزا جی کی خدمت میں پیش کی مرزا اس پر بیحد خوش ہوئے اور انھیں بہت دعائیں دیں۔

کیا مرزا جی کے اس دعویٰ میں کہ میں محمد رسول (......) کی بعثتِ ثانیہ ہوں مجھ پر وحی الٰہی کا بارش کی طرح نزول ہوتا ہے اور ان کی جسمانی ودماغی صحت میں کوئی مطابقت ہے، کیا آنحضرت ......نعوذ باللہ مراق، ہسٹریا ذیابیطس سلسل البول، کثرت اسہال، ضعفِ قلب، ضعفِ دماغ، ضعف اعصاب، حتیٰ کہ حالت مردمی کالعدم کے شکار ہوسکتے تھے استغفر اللہ استغفر اللہ، کیا ایسا مجموعہ امراض وحی ربانی اور الہامات الٰہیہ کے تحمل وتحفظ کی قوت رکھ سکتا ہے، کیا تاریخ کے اوراق سے ایک بھی ایسی مثال پیش کی جاسکتی ہے کہ کوئی تاریخ ساز شخصیت بیک وقت ان تمام امراض خبیثہ کا شکار رہی ہے، واقعہ ہے کہ رب قدیر نے مرزا کی تکذیب وتردید کے لئے خود ان کی ذات ہی کو دلیل بنا کر دنیا کے سامنے پیش کردیا۔

گر نہ بیند بروز شپرۂ چشم
چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

(۵) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حق میں مرزا کی بدزبانی

(۱) یورپ کے لوگوں کو جس قدر شراب نے نقصان پہنچایا ہے اس کا سبب تو یہ تھا کہ عیسیٰ علیہ السلام شراب پیا کرتے تھے شاید کسی بیماری کی وجہ سے یا پرانی عادت کی وجہ سے (کشتی نوح ص ۶۵ حاشیہ)

(۲) یسوع اس لئے اپنے تئیں نیک نہیں کہہ سکا کہ لوگ جانتے تھے کہ یہ شخص شرابی کبابی ہے... چنانچہ خدائی کا دعویٰ شراب خوری کا ایک بدنتیجہ تھا (ست بچن ص ۱۷۲ حاشیہ)

(۳) یہ بھی یاد رہے کہ آپ (یسوع مسیح) کو کسی قدر جھوٹ بولنے کی بھی عادت تھی۔
(ضمیمہ انجام آتھم ص ۵ حاشیہ)

(۴) ہاں آپ (یسوع مسیح) کو گالیاں دینے اور بدزبانی کی اکثر عادت تھی۔

(۵) وہ (مسیح موعود) ہر طرح سے عاجز ہی عاجز تھا مخرج معلوم کی راہ سے جو پلیدی اور ناپاکی مبرز ہے تولد پاکر مدت تک بھوک اور پیاس اور درد اور بیماری کا دکھ اٹھاتا رہا۔ (براہین احمدیہ ص ۳۶۹ ج ۴)

(۶) مریم کا بیٹا کوشلیہ کے بیٹے (یعنی رام چندر) سے کچھ زیادہ نہیں رکھتا (انجام آتھم ص ۴۱)

ایک اولوالعزم نبی کی مقدس شان میں اس طرح کی ہرزہ سرائی کرنے والا کسی طرح سے بھی مسلمان کہلانے کا مستحق نہیں بلکہ ایسا شخص تو انسان کہے جانے کا بھی حقدار نہیں ہے۔

(۶) جہاد کی حرمت کا اعلان

(۱) آج سے دین کیلئے لڑنا حرام کیا گیا اب اس کے بعد جو دین کیلئے تلوار اٹھاتا ہے اور غازی نام رکھ کر کافروں کو قتل کرتا ہے وہ خدا اور اس کے رسول کا نافرمان ہے۔

(اشتہار چندہ منارۃ المسیح صفحہ سات ضمیمہ خطبۂ الہامیہ)

(۲) آج کی تاریخ تک تیس ہزار کے قریب یا کچھ زیادہ میرے ساتھ جماعت ہے جو برٹش انڈیا کے متفرق مقامات پر آباد ہے اور ہر شخص جو میری بیعت کرتا ہے اور مجھ کو مسیح موعود مانتا ہے اسی روز سے اس کو یہ عقیدہ رکھنا پڑتا ہے کہ اس زمانہ میں جہاد قطعاً حرام ہے (گورنمنٹ انگریزی اور جہاد ضمیمہ ص ۷)

(۷) مرزائی مذہب میں حج مکہ معظّمہ کی بجائے قادیان میں

ہمارا جلسہ بھی حج کی طرح ہے، حج خداوند تعالیٰ نے مومنوں کی ترقی کیلئے مقرر کیا تھا آج احمدیوں کے لئے دینی لحاظ سے تو حج مفید ہے مگر اس سے جو اصل غرض قوم کی ترقی تھی وہ انھیں حاصل نہیں ہوسکتی، کیونکہ حج کا مقام ایسے لوگوں کے قبضہ میں ہے جو احمدیوں کو قتل کردینا بھی جائز سمجھتے ہیں اس لئے خدا تعالیٰ نے قادیان کو اس کام کیلئے مقرر کیا ہے۔

(خطبہ جمعہ از میاں محمود احمد خلیفہ قادیان مندرجہ برکات خلافت)

(۲) لوگ معمولی اور نفلی طور پر حج کرنے کو بھی جاتے ہیں مگر اس جگہ قادیان میں ثواب زیادہ ہے۔ (آئینہ کمالات اسلام ص ۳۵۲)

(۸) آنجہانی مرزا پر ایمان نہ لانے والے کافر ہیں

(۱) کل مسلمان جو حضرت مسیح موعود کی بیعت میں شامل نہیں ہوئے خواہ انھوں نے

حضرت مسیح موعود کا نام بھی نہیں سنا وہ کافر اور دائرۂ اسلام سے خارج ہیں۔ (آئینہ صداقت از مرزا محمود ص ۳۵)

(۲) جو شخص تیری پیروی نہیں کرے گا اور تیری بیعت میں داخل نہیں ہوگا، اور تیرا مخالف رہے گا وہ خدا اور رسول کی نافرمانی کرنے والا جہنمی ہے۔ (تذکرہ ص ۳۴۲)

(۹) غیر قادیانیوں سے نکاح کفر ہے

(۱) جو شخص اپنی لڑکی کا رشتہ غیر احمدی لڑکے کو دیتا ہے میرے نزدیک وہ احمدی نہیں ہے ....ایسی شادی میں شریک ہونا بھی جائز نہیں۔ (ڈائری میاں محمود احمد مندرجہ الفضل قادیان ۲۳؍ مئی ۱۹۲۱ء)

(۲) خارج از احمدیت ہونے سے مراد میری ایسے امورات ہیں جن کی وجہ سے کفر کا فتویٰ لگ سکتا.... چنانچہ غیر احمدی کو لڑکی کا رشتہ دینا بھی اسی قسم میں سے ہے۔ (الفضل ۴؍ مئی ۱۹۲۳ء)

(۱۰) غیر احمدیوں کے پیچھے نماز قطعاً حرام ہے

(۱) میرا وہی مذہب ہے جو میں ہمیشہ سے ظاہر کرتا ہوں کہ کسی غیر مبائع شخص کے پیچھے خواہ وہ کیسا ہی ہو اور لوگ اس کی کیسی ہی تعریف کرتے ہوں نماز نہ پڑھو اللہ تعالیٰ کا حکم ہے اور اللہ تعالیٰ ایسا ہی چاہتا ہے اگر کوئی شخص متردد یا مذبذب ہے تو وہ بھی مکذب ہی ہے۔ (الفضل ۲۸؍ اگست ۱۹۱۷ء)

(۲) خدا تعالیٰ نے مجھے اطلاع دی ہے کہ تمہارے پر حرام ہے اور قطعی حرام ہے کہ کسی مکفر اور مکذب یا متردد کے پیچھے نماز پڑھو بلکہ چاہئے کہ تمہارا وہی امام ہو جو تم میں سے ہو۔ (اربعین ص ۳۴ حاشیہ ۳)

یہ مرزا کے چند معتقدات، اعمال اور دعوے ہیں جو انھیں کے الفاظ میں بحوالہ کتب پیش کئے گئے جن سے واضح ہوا کہ مرزا اپنے آپ کو خدائی صفات سے متصف باور کرتے

ہیں، اپنے کو عین محمد...... سمجھتے ہیں بلکہ آپ سے بھی اعلیٰ وارفع، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نعوذ باللہ وہ ایک شریف انسان ماننے کیلئے بھی تیار نہیں ہیں، اپنے آپ کو وحی الٰہی اور الہامات ربانی کا مورد و مہبط یقین کرتے ہیں اللہ کے عائد کردہ فریضۂ جہاد کو حرام بتاتے ہیں اور اپنے منکر کو کافر و جہنمی کہتے ہیں ان کے خلیفہ کعبۃ اللہ کے بجائے قادیان میں حج کو افضل قرار دیتے ہیں۔

قرآن وسنت کے نصوص اور علمائے اسلام کی تشریحات قطعی طور پر ان باطل مزعومات سے پاک اور بری ہیں اس لئے اپنی جگہ نصف النہار کی طرح یہ بات واضح ہے کہ قادیانی مذہب کا سیدنا محمد رسول اللہ...... کے لائے ہوئے دین سے کوئی تعلق نہیں ہے، بلکہ اسلام کی بیخ کنی کیلئے اور ملت اسلامیہ کو اسلام کی راہِ مستقیم سے ہٹانے کے لئے اسلام کے نام سے ایک جدید مذہب پیش کیا گیا ہے۔

☆ ☆ ☆

مرزا قادیانی کی قرآن حکیم میں تحریف معنوی کی چند مثالیں

حرف آغاز

قرآن کریم انسان کی ہدایت اور رہنمائی کے لئے خالق کائنات کی عطا کردہ آخری کتاب ہے جس میں اصولی طور پر دنیا و آخرت میں خیر و فلاح کے ساتھ زندگی بسر کرنے کی جامع ترین ہدایات بیان کردی گئی ہیں جو ہر زمانہ اور ہر طبیعت کے بالکل مناسب ہیں ان میں کسی ترمیم و تنسیخ اور حذف و اضافہ کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے، ارشاد باری تعالیٰ ”ما فرّطنا فی الکتاب من شیء“ اور ”الحمد للّٰہ الذی انزل علی عبدہ الکتابَ ولم یجعل لہ عِوَجاً قیّما“ الخ الآیۃ میں قرآن عظیم کی اسی جامعیت اور ہمہ گیری کو بیان کیا گیا ہے، چنانچہ علامہ عثمانیؒ آخر الذکر آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں۔

> ”اس کتاب میں کوئی ٹیڑھی ترچھی بات نہیں، عبارت انتہائی سلیس و فصیح اسلوب نہایت مؤثر و شگفتہ، تعلیم نہایت متوسط و معتدل جو ہر زمانہ اور ہر طبیعت کے مناسب اور عقل سلیم کے عین مطابق ہے۔“ (فوائد عثمانی ص ۳۸۰)

یہ تغیر پذیر دنیا ہزار کروٹیں بدلے، تمدن و معاشرت اور انسانی مزاج و عادات میں لاکھ تبدیلیاں آجائیں، اقتصادیات و معاشیات کی قدریں گو یکسر مختلف ہو جائیں، علم و تحقیق کے معیار خواہ کتنی بلندیوں پر پہنچ جائیں، زندگی کے تقاضے اور ضروریات کوئی بھی صورت اختیار کرلیں، قرآن حکیم اور کتاب متین کی جامع اور ہمہ گیر ہدایات حیات انسانی کے ہر مسئلہ اور ہر ضرورت کا حل پیش کرتی رہیں گی۔

اسی بناء پر خداوند عالم نے اہل دانش کو قرآن مبین کی آیات میں غور و فکر اور تدبّر کی بار بار دعوت دی ہے چنانچہ ایک موقع پر ارشاد ہے۔

کِتابٌ اَنزَلْنَاہُ اِلَیکَ مُبارَكٌ لِیَدَّبَّرُوا آیاتِہٖ وَلِیَتَذَکَّرَ اُولُوا الاَلْبَابِ (سورہ ص)

(یہ) ایک کتاب ہے جو اتاری ہم نے تیری طرف برکت کی، تاکہ دھیان کریں لوگ اس کی آیتوں میں اور تاکہ سمجھیں عقل والے۔

لیکن تدبر کی اس عام دعوت کے ساتھ اللہ تعالیٰ اس کی قطعاً اجازت نہیں دیتا کہ اس کے کلام میں کوئی شخص اپنے افکار و نظریات اور خیالات و رجحانات کو شامل کردے، کیونکہ اس آزادی اور چھوٹ کا انجام یہ ہوگا کہ یہ دستور الٰہی اور کتاب ہدایت انسانی افکار و مزعومات کا ایک دفتر ہو کر رہ جائے گی اس لئے حق جل مجدہ نے اپنے کلام کی تفسیر و تشریح کے لئے خود اپنے مرسل رسول......کو متعین فرمادیا۔

وَاَنزَلْنَا اِلَیكَ الذِکْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیھِمْ.

اور اتاری ہم نے تجھ پر یہ یادداشت تاکہ تو کھول دے لوگوں کے سامنے وہ چیز جو اتری ان کے واسطے۔

یعنی اے محمد (......) ہم نے آپ کو ایسی کتاب دے کر بھیجا جو تمام کتب سابقہ کا خلاصہ اور انبیاء سابقین کے علوم کی مکمل یادداشت ہے، آپ کا کام یہ ہے کہ تمام دنیا کے لوگوں کے لئے اس کتاب کے مضامین خوب کھول کر بیان فرمائیں اور اس کی مشکلات کی شرح اور مجملات کی تفصیل کردیں، اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کا مطلب وہی معتبر ہے جو روایت رسول (......) کے موافق ہو۔ (فوائد عثمانی ص ۳۵۱)

اسی بنا پر رسول خدا......نے اپنی رائے سے قرآن حکیم کی تفسیر و تشریح کرنے والے کو جہنم کی وعید سنائی ہے چنانچہ ترجمان قرآن حضرت عبداللہ بن عباسؓ نبی پاک......کا ارشاد نقل فرماتے ہیں کہ:

قال: من قال فی القرآن برایه او بما لا یعلم فلیتبوء مقعده من النار (اخرجه الترمذی والنسائی وابوداؤد وقال الترمذی ہذا حدیث حسن)

جس شخص نے قرآن حکیم میں اپنی رائے سے کوئی بات کہی یا ایسی بات کہی جس کا علم اسے (رسول اللہ...... کی طرف سے) نہیں ہے تو اسے جہنم میں اپنا ٹھکانہ بنالینا چاہئے۔

قرآن وحدیث کی روشنی میں ائمہ مفسرین نے قرآن حکیم کی تفسیر کے لئے کچھ اصول وضوابط اور معیار مقرر کیئے ہیں جو تفسیر اس ضابطے اور معیار کے مطابق ہوگی وہی معتبر اور مقبول ہوگی اور جو اس معیار واصول سے منحرف اور ہٹ کر ہوگی وہ غیر معتبر اور مردود سمجھی جائے گی، ائمہ تفسیر کے اس ضابطہ کا خلاصہ یہ ہے۔

(۱) آنحضرت ...... اور صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی تفسیر کے مطابق یا کسی مرفوع حدیث یا اقوال صحابہ سے ماخوذ مستنبط ہو۔

(۲) سیاق وسباق سے ہم آہنگ ہو یعنی قرآن عظیم کی ان آیات سے مربوط ہو جو اس سے پہلے اور بعد میں ہیں۔

(۳) قواعد عربیہ اور اہل زبان کے استعمال کے موافق ہو۔

(۴) اصول شریعت اور دین کے ثابت شدہ ان بنیادی امور کے مطابق ہو جن پر ایمان واعتقاد لازم ہے۔

(۵) مقاصدِ قرآن کے ماتحت ہو۔

لیکن قرآن وحدیث اور علماء حق کی ان تمام ترپیش بندیوں کے باوجود ہر عہد اور ہر زمانہ کے علماء سو اور اہل بدعت قرآن پاک کے تراجم وتفاسیر میں اپنے باطل عقائد اور فاسد نظریات کو ٹھونس کر کتاب مبین کی روشن تعلیمات وہدایات کو غبار آلود کرنے کی مذموم کوشش اور ناروا جسارت کرتے رہے ہیں، خود ہمارے ملک ہندوستان میں بعض کم فہم مغرب زدوں اور اہل بدعت، دین بیزار افراد کے اردو تراجم اور تفسیریں تحریفات اور باطل تاویلات سے بھری ہوئی ہیں اور یہ ناروا ضلالت خیز رویہ آج بھی جاری ہے بلکہ کوشش کی جارہی ہے کہ اسلاف اور علمائے محققین کے علمی شہ پاروں کے مقابلے میں ان خذف ریزوں کو امت ترجیح دے۔ عصر حاضر کے اس خطرناک فتنہ سے پورے طور پر ہشیار رہنے کی ضرورت ہے، بالخصوص حکومت برطانیہ کے ساختہ وپرداختہ مرزا غلام احمد قادیانی نے تو

قرآن حکیم کی معنوی تحریف میں حد ہی کردی ہے، بطور مثال چودھویں صدی کے اس دجال اکبر کی چند تحریفات یہاں نقل کی جارہی ہیں۔

مثال اوّل

(۱) وَاِذۡ قَتَلۡتُمۡ نَفۡسًا فَالدَّرَأۡتُمۡ فیها وَاللّٰهُ مُخۡرِجٌ مَّا كُنۡتُمۡ تَكۡتُمُوۡنَ الآیة کے ذیل میں لکھتا ہے۔

ایسے قصوں میں قرآن شریف کی کسی عبارت سے نہیں نکلتا کہ فی الحقیقت کوئی مردہ زندہ ہوگیا تھا اور واقعی طور پر کسی قالب میں جان پڑگئی تھی بلکہ اس آیت میں غور کرنے سے صرف اس قدر ثابت ہوتا ہے کہ یہودیوں کی ایک جماعت نے خون کرکے چھپادیا تھا اور بعض بعض پر خون کی تہمت لگاتا تھا سو خدائے تعالیٰ نے اصل مجرم کے پکڑنے کیلئے یہ تدبیر سمجھائی کہ ایک گائے کو ذبح کرکے لاش پر نوبت بہ نوبت اس کی بوٹیاں ماریں اصل خونی کے ہاتھ سے جب لاش پر بوٹی لگے گی تو اس لاش سے ایسی حرکات صادر ہوں گی جس سے خونی پکڑا جائے گا، اصل حقیقت یہ ہے کہ یہ طریق مسمریزم کا ایک شعبہ تھا جس کے بعض خواص میں یہ بھی ہے کہ جمادات یا مردہ حیوانیت میں ایک حرکت مشابہ بحرکت حیوانات پیدا ہوکر اس سے بعض مشتبہ اور مجہول امور کا پتہ لگ سکتا ہے۔ (ازالۃ الاوہام ص۷۴۹/۵۰)

مثال دوم

(۲) اسی طرح اس کاذب نامراد نے اپنے ظہور کی علامتوں کو بیان کرتے ہوئے بعض ان آیات کی جن میں قیامت کی ہولناکیوں کو بیان کیا گیا ہے ان کی معنوی تحریف کرکے کچھ سے کچھ بنادیا ہے چنانچہ لکھتا ہے چھٹا نشان ایک نئی سواری کا نکلنا ہے جو مسیح موعود کی خاص نشانی ہے جیسا کہ قرآن شریف میں لکھا ہے ”وَاِذَا العِشَارُ عُطِّلَتۡ“ یعنی آخری زمانہ وہ ہے جب اونٹنیاں بے کار ہوجائیں گی۔

چھٹا نشان کتابوں اور نوشتوں کا بکثرت شائع ہونا جیسا کہ آیت ”وَاِذَا الصُّحُفُ

نُشِرَتُ“ سے معلوم ہوتا ہے کیونکہ بباعث چھاپے کی کلوں کے جس قدر اس زمانے میں کثرت اشاعت کتابوں کی ہوئی ہے اس کے بیان کی ضرورت نہیں۔

ساتواں نشان کثرت سے نہریں جاری کئے جانا جیسا کہ آیت ”واذا البحار فجرت“ سے معلوم ہوتا ہے، پس اس میں کیا شک ہے کہ اس زمانہ میں اس کثرت سے نہریں جاری ہوئی ہیں کہ جن کی کثرت سے دریا خشک ہوئے جاتے ہیں۔

نواں نشان زلزلوں کا متواتر آنا اور سخت ہونا ہے جیسا کہ آیت ”یوم ترجف الراجفة تتبعها الرادفة“ سے ظاہر ہے غیر معمولی زلزلے دنیا میں آرہے ہیں۔ (حقیقۃ الوحی ص ۱۹۸)

مثال سوم

(۳) ولَا تَقولُوْا لِمَن يّقتل فی سَبِيل اللّٰه امواتا بل احياء کے تحت لکھتا ہے کہ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو سچائی پر مرے ہیں، اور یہ مراد لینا کہ جو کافروں کے مقابلہ میں لڑائی میں مارے گئے غلط اور فاسدانہ خیال ہے، مراد یہ ہے کہ جیسے سچائی زندہ رہتی ہے اسی طرح سے سچے لوگ مرنے کے بعد زندہ رہتے ہیں، یعنی وہ نجات پاتے ہیں، ان کو رنج وغم نہیں ہوگا۔

چونکہ انگریزوں کے اس خودکاشت نبی نے اپنے آقاؤں کی خوشنودی میں اپنی اختراعی شریعت سے جہاد کو منسوخ کردیا تھا اس لئے اس کے لئے ضروری تھا کہ اس آیت میں تحریف کرے۔

بغرض اختصار صرف تین مثالوں پر اکتفا کیا گیا ہے ورنہ مرزا قادیانی کی تصانیف میں آیات قرآنیہ کی تحریف کی سیکڑوں مثالیں موجود ہیں، ضرورت ہے کہ کوئی صاحب نظر عالم انھیں جمع کرکے شائع کرادے اور اس مردود تفسیر کے ساتھ ساتھ مقبول تفسیر بھی نقل کردی جائے تاکہ اس ضلالت انگیز فتنہ کے گرداب میں پھنسنے سے امت محفوظ رہے اور قرآن حکیم کی واضح اور روشن ہدایات پر اس امام تلبیس نے اپنے مفتریات اور تحریفات کا جو پردہ ڈالنا چاہا ہے اس کے تاروبود کا لعهن المنفوش ہوکر بکھر جائیں۔

انقلاب ایران کی حقیقت

قائد انقلاب کے عقائد ونظریات کے آئینہ میں

ضروری تمہید

انقلاب ایران ادھر ایک سال سے ہمارے ملک میں موضوع بحث بنا ہوا ہے۔ جماعت اسلامی، مسلمانوں کا جدّت پسند اور عصری علوم وفنون سے وابستہ طبقہ اسے اسلامی انقلاب سمجھتا ہے۔ اور جو لوگ ان کی رائے سے اتفاق نہیں رکھتے انھیں فرسودہ خیال، قدامت پسند، حالات زمانہ سے بے خبر اور اتحاد دشمن جیسے اہانت آمیز خطابات سے نوازتے ہیں یہ گروہ اپنی رائے میں اس درجہ شدت رکھتا ہے کہ قائد انقلاب ''علامہ خمینی'' اور ان کے برپا کئے ہوئے اس انقلاب کے خلاف ایک حرف بھی سننا اسے گوارہ نہیں۔ اس کے بالمقابل قدیم تعلیم یافتہ، اور مذاہب عالم پر مبصرانہ نگاہ رکھنے والے حضرات ہیں جو اس انقلاب کو اسلامی انقلاب ماننے کے لئے تیار نہیں اور بڑی حد تک یہ حضرات بھی اپنی رائے میں جزم اور پختگی رکھتے ہیں۔

جماعت اسلامی اور اس کے ہم خیال گروہ کی تائید خود علامہ خمینی اور ان کے برق رفتار پریس سے بھی ہورہی ہے۔ جو ابلاغ وترسیل کے تمام تر ذرائع کو کام میں لاکر یہ نعرہ بلند کررہے ہیں کہ ''ثورة اسلامية ولا سنية ولا شيعية'' اور ان کا پریس مسلسل اعلان کئے جارہا ہے کہ پوری دنیا میں یہ واحد اسلامی انقلاب ہے جو اسلام کے اقتدار اور کتاب و سنت کے نفاذ کے لئے برپا کیا گیا ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ ملت اسلامیہ متحد ہوکر قائد انقلاب امام خمینی کی قیادت میں اسلام دشمن طاقتوں کا مقابلہ کرے، اسی کے ساتھ علامہ

خمینی کے نمائندے اور پوری دنیا میں پھیلے ہوئے مملکت ایران کے سفارت خانے بھی پوری قوت سے دنیا میں یہ بات پھیلا رہے ہیں کہ ایران کا یہ انقلاب درحقیقت اسلامی انقلاب ہے، جو اس وقت اتحاد بین المسلمین کی ایک علامت ہے، اس کی تائید اور حمایت، دنیا کے تمام بیکسوں اور مظلوموں کی حمایت ہے، اسلام اور اقتدار اسلام کی حمایت ہے۔ اس لئے تمام مسلمانوں کا دینی اور مذہبی فریضہ ہے کہ وہ اپنے فروعی اور فقہی اختلافات سے بالاتر ہو کر وحدت کلمہ، وحدت قبلہ، وحدت کتاب اور وحدت رسول کی بنیاد پر امام خمینی کے پرچم کے نیچے جمع ہو جائیں۔

علامہ خمینی کی اس عمومی دعوت کے بعد ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہم پر یہ ذمہ داری عائد ہو جاتی ہے کہ ہم اسے کتاب وسنت کی کسوٹی پر رکھ کر پرکھیں اگر ان بلند بانگ دعوؤں کے مطابق واقعی یہ انقلاب اسلام کے معیار پر پورا اتر رہا ہے تو اس کی حمایت ونصرت اور تائید وتقویت ہمارے لئے شرعی اعتبار سے ضروری ہو جائے گی۔ اور اگر وہ اس معیار پر پورا نہیں اترتا تو پھر اس کی تردید ومخالفت بھی اسی طرح لازم ہوگی اس میں کسی قسم کی مساہلت ومداہنت شرعاً درست نہ ہوگی۔ یہ تحقیق وتفتیش اور جانچ وپڑتال اس وقت اور بھی ضروری ہو جاتی ہے جب ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ یہ دعوت ایک ایسی شخصیت کی جانب سے دی جارہی ہے جو صرف ایک مذہبی پیشوا ہی نہیں بلکہ ایک عظیم سیاسی لیڈر بھی ہے۔ کیونکہ اکثر اسلام مخالف سیاسی تحریکیں قرآن وسنت اور اتحاد بین المسلمین ہی کے پرشور نعروں کے ساتھ اٹھی ہیں اس بحث وتحقیق کے بغیر اس انقلاب کے بارے میں رد یا قبول کا کوئی بھی پہلو نہ مناسب ہے اور نہ معقول۔ اس لئے کسی فیصلہ سے پہلے اس کی واقعیت کو معلوم کر لینا ازبس ضروری ہے۔

کسی دعوت وتحریک کے صحیح رخ کو جاننے اور اس کی اصل حقیقت تک پہنچنے کا سیدھا اور معقول راستہ یہ ہے کہ اس کے قائد اور رہنما کے افکار ونظریات کا جائزہ لیا جائے جس کی قیادت اور سربراہی میں یہ تحریک پروان چڑھ رہی ہے۔ کیونکہ ہر تحریک اور ہر انقلاب کا مرکز ومحور اس کے اپنے قائد کے افکار ونظریات ہی ہوتے ہیں جس کے گرد اس کا سارا

نظام گردش کرتا ہے۔

قائد انقلاب علامہ خمینی کا مذہب

''علامہ خمینی'' مذہب شیعہ کے مشہور فرقہ اثنا عشریہ کے نہ صرف متبع اور پابند ہیں بلکہ اس کے زبردست عالم، مجتہد، پیشوا، داعی ونقیب اور نظریۂ ولایت فقہ کی روشنی میں امام غائب کے قائمقام اور نائب بھی ہیں۔ ان کی قیادت میں ایران کے اندر جو سیاسی انقلاب آیا ہے۔ اور اس کے نتیجہ میں وہاں جو حکومت قائم ہوئی ہے اس کی تنظیم وتشکیل مذہب اثناعشریہ ہی کے اصول ومنہاج پر کی گئی ہے۔ چنانچہ ''دستور ایران کی دفعہ ۱۲'' میں صراحت کے ساتھ یہ بات کہی گئی ہے کہ اس حکومت کا مذہب "الجعفری الاثنا عشری" ہوگا۔ یہ دفعہ دستور کی ان اساسی وبنیادی دفعات میں سے ہے جس میں کسی قسم کا تغیر اور حذف وترمیم نہیں ہوسکتی۔

المادة الثانية عشر: "الدين الرسمی لايران هو الاسلام والمذهب الجعفری الاثنیٰ عشری" وهذه المادة غير قابلة للتغيير(۱)

(دفعہ (۱۲): ایران کا دین: اسلام ہے اور مذہب جعفری اثنا عشری۔ اس دفعہ میں کبھی کوئی ترمیم نہیں ہوسکتی۔)

اور حکومت کے نظام عمل کی تعیین وتحدید دستور کی دفعہ ۲ میں اس طرح کی گئی ہے:

الجمهورية الاسلامية نظام علی الامامة والقيادة المستمرة وان هذا النظام يقوم علی اساس الكتاب وسنة المعصومين(۲)

(جمہوریہ اسلامیہ (ایران) کا نظام جاری رہنے والی امامت وقیادت پر ہے جو کتاب اور ائمہ معصومین کی سنت کی بنیاد پر قائم ہے۔)

اس مملکت جمہوری اسلامی کا سربراہ اور امیر کن صفات کا حامل ہوگا اس کی وضاحت

---

(۱) الخمینی بین التطرف والاعتدال ص: ۵۵ تالیف ڈاکٹر عبداللہ محمد غریب۔

(۲) الخمینی بین التطرف والاعتدال ص: ۵۵ تالیف ڈاکٹر عبداللہ محمد غریب۔

دستور کی دفعہ ۵ میں ان الفاظ میں کی گئی ہے:

تکون ولایت الامر والامة فی غیبة الامام المهدی عجل اللّٰه فرجه فی جمهوریة ایران الاسلامیة للفقیه العادل النقی العارف بالعصر الخ(۱)

(امام مہدی کے غیبت کے زمانہ میں جمہوریہ اسلامیہ ایران کا امیر وامام اپنے عہد کا فقیہ، عادل، پاکباز اور عصر حاضر سے واقفیت رکھنے والا ہوگا۔)

دستور کی ان دفعات سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہوگئی کہ علامہ خمینی کا برپا کیا ہوا انقلاب مذہب شیعہ کے فرقۂ اثنا عشریہ کی بنیادوں پر قائم ہے۔ یہی انکشاف خود علامہ خمینی کی تحریروں سے بھی ہوتا ہے جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا۔ لہٰذا ضروری ہے کہ فرقۂ اثنا عشریہ کے عقائد واصول اور اعمال وفروع کا قرآن وسنت کی روشنی میں جائزہ لیا جائے تاکہ ان کے برپا کئے ہوئے انقلاب کے بارے میں صحیح فیصلہ تک پہنچا جاسکے کہ وہ اسلامی انقلاب ہے یا غیر اسلامی۔

(۱) مسئلہ امامت

شیعہ بالخصوص فرقۂ اثنا عشریہ کے مذہب کی عمارت درحقیقت عقیدہ امامت کی بنیاد پر قائم ہے چنانچہ فلسفۂ تاریخ کے امام علامہ ابن خلدون لکھتے ہیں:

ومذاهبهم جمیعا متفقون علیه ان الامامة لیست من المصالح العامة التی تفوض الی نظر الامة و یتعین الاقامة بها بتعینهم بل هو رکن الدین وقاعدة الاسلام ولا یجوز لنبی اغفاله ولا تفویضه الی الامة بل یجب علیه تعیین الامام لهم ویکون معصوما من الکبائر والصغائر وان علیًا رضی اللّٰه عنه هو الذی عینه صلوات اللّٰه وسلامه(۲)

(مذہب شیعہ کے تمام فرقے اس پر متفق ہیں کہ امامت مصالح عامہ میں سے نہیں

---

(۱) الخمینی بین التطرف والاعتدال ص: ۵۵ تالیف ڈاکٹر عبداللہ محمد غریب۔

(۲) مقدمہ ابن خلدون ص: ۱۶۴۔

ہے کہ اسے امت کے فکر و رائے پر چھوڑ دیا جائے اور امام کا تقرر ان کے مقرر کرنے سے ہو۔ بلکہ یہ دین کا رکن اور اسلام کی بنیاد ہے اور پیغمبر کے لئے نہ اس سے غفلت برتنا جائز ہے اور نہ اسے امت کے سپرد کرنا بلکہ اس پر واجب ہے کہ خود امت کے لئے امام نامزد کر جائے اور امام کبیرہ و صغیرہ گناہوں سے پاک و معصوم ہوگا چنانچہ حضرت علی صلوات اللہ وسلامہ کی وہ عظیم شخصیت ہے جسے نبی ...... نے منصب امامت پر متعین فرمایا۔)

علامہ خمینی ولایت و امامت کے سلسلہ میں خود اپنا عقیدہ بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

نحن نعتقد بالولایت و نعتقد ضرورة ان یعین النبی خلیفة من بعده وقد فعل(۱)

(ہم امامت کا عقیدہ رکھتے ہیں اور ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ نبی (......) کے لئے ضروری تھا کہ وہ اپنے بعد کے لئے خلیفہ متعین کریں اور آپ...... نے ایسا کیا۔)

علامہ خمینی تو یہاں تک لکھتے ہیں کہ فریضۂ رسالت کی تکمیل اور ادائیگی امام و خلیفہ کے متعین کرنے پر موقوف تھی اگر بالفرض آپ ...... اپنے بعد کے لئے خلیفہ متعین نہ کر جاتے تو فریضۂ رسالت کی ادائے گی میں کوتاہی کے مرتکب ہوتے (نعوذ باللّٰہ من ہذہ الھفوة) ملاحظہ ہو ان کی اصل عبارت:

و کان تعیین خلیفة من بعده عاملا متمما و مکملا لرسالته(۲)

(اور اپنے بعد کے لئے خلیفہ متعین کر جانا ہی وہ عمل تھا جس سے آپ کے فریضۂ رسالت کی تکمیل ہوئی۔)

ایک دوسرے موقع پر مزید وضاحت کے ساتھ لکھتے ہیں:

بحیث کان یعتبر الرسولؐ لو لا تعیّن الخلیفة من بعده غیر مبلغ رسالته.(۳)

(اگر رسول (......) اپنے بعد کے لئے خلیفہ نامزد نہ کرتے تو سمجھا جاتا کہ آپ نے

---

(۱) الحکومۃ الاسلامیہ ص: ۱۸ بحوالہ انقلاب ایران امام خمینی اور شیعیت مولفہ مولانا منظور نعمانی۔

(۲) الحکومۃ الاسلامیہ للخمینی ص: ۱۹ بحوالہ سابق۔

(۳) الحکومۃ الاسلامیۃ للخمینی ص: ۲۳ بحوالہ سابق۔

رسالت کا فریضہ ادا نہیں کیا۔)

اور بات اسی پر ختم نہیں ہو جاتی کہ یہ ان کا اپنا عقیدہ ہے بلکہ وہ اس عقیدہ کی دوسروں تک دعوت و تبلیغ کو بھی ضروری سمجھتے ہیں چنانچہ وہ اپنے ماننے والوں کو ہدایت کرتے ہیں کہ تمام لوگوں کو ولایت کی حقیقت بتا دو اور یہ اعلان کر دو کہ ہم ولایت و امامت کا اعتقاد رکھتے ہیں اور ہمارا یہ نظریہ ہے کہ رسول (......) نے اللہ کے حکم سے اپنا خلیفہ نامزد فرمایا تھا۔

عرفوا الولاية للناس كما هي قولوا لهم انا نعتقد بالولاية وبان الرسول (صلى الله عليه وسلم) استخلف بامر الله. (۱)

(تمام لوگوں کو امامت کی حقیقت سمجھا دو اور ان سے کہہ دو کہ ہم امامت پر اعتقاد رکھتے ہیں اور ہمارا یہ بھی عقیدہ ہے کہ رسول...... نے اللہ کے حکم سے اپنا خلیفہ نامزد کیا۔)

علامہ خمینی کے عقیدہ کے مطابق نبی کریم ...... نے امر خداوندی کے تحت اپنے بعد کے لئے امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ کو لوگوں پر حاکم اور والی ہونے کی حیثیت سے نامزد فرمایا پھر امامت و ولایت کا یہ منصب ایک امام سے دوسرے امام تک منتقل ہوتا رہا جس کا سلسلہ امام غائب مہدی منتظر پر جا کر ختم ہو گیا۔ علامہ خمینی لکھتے ہیں:

قد عين من بعده واليًا على الناس اميرالمومنين واستمر الولاية من امام الى امام الى ان انتهى الامر الى الحجة القائم(۲)

(رسول اللہ...... نے اپنے بعد کے لئے امیر المومنین علیؓ کو لوگوں پر حاکم نامزد فرمایا اور امامت کا یہ منصب ایک امام سے دوسرے تک پہنچتا رہا یہاں تک کہ یہ سلسلہ امام الحجۃ (امام غائب) پر آ کر ختم ہو گیا۔)

جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے کہ شیعوں کا یہ بنیادی اور اساسی عقیدہ ہے اور اسی اہمیت کے پیش نظر علامہ خمینی نے بھی اپنی مشہور کتاب الحکومۃ الاسلامیہ اور دوسری تصانیف میں اس پر خاصا زور صرف کیا ہے اور مختلف اسلوب سے بار بار اس مسئلہ سے متعلق اپنے عقیدہ و نظریہ کی وضاحت کی ہے۔

---

(۱) الحکومۃ الاسلامیۃ ص: ۲۰ بحوالہ الخمینی بین التطرف والاعتدال۔ (۲) الحکومۃ الاسلامیۃ للخمینی ص: ۹۸۔

عقیدۂ امامت پر ایک نظر

آیئے علامہ خمینی کے اس عقیدہ کا جائزہ لیں اور دیکھیں کہ ان کا یہ عقیدہ کتاب و سنت سے کس حد تک مطابقت رکھتا ہے قرآن مبین اور احادیث رسول ...... کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کے جتنے اہم اور بنیادی عقائد ہیں، مثلاً توحید، رسالت، آخرت وغیرہ انھیں کتاب وسنت میں بغیر کسی پیچیدگی کے صاف صاف، صریح اور واضح الفاظ میں اس قطعیت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ ان میں نہ کوئی اشتباہ ہے اور نہ کسی تاویل کی گنجائش۔ اس کے برخلاف مسئلہ امامت کو دیکھئے! پورے قرآن اور سارے ذخیرہ حدیث میں آپ کو ایک آیت اور ایک صحیح حدیث ایسی نہیں ملے گی جس میں وضاحت وصراحت کے ساتھ اس عقیدہ کو بیان کیا گیا ہو۔ قرآن وحدیث کی اس مسئلہ کی جانب سے یہ بے اعتنائی اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ مسئلہ امامت میں شیعی نقطۂ نظر (جس پر بقول علامہ خمینی فریضۂ رسالت کی ادائے گی کی تکمیل موقوف ہے) خود ان کا ایجاد کردہ اور گھڑا ہوا ہے جس کا دین اسلام سے کوئی تعلق اور واسطہ نہیں ہے۔

یہ نقطۂ نظر اس پہلو سے بھی قطعی غلط اور باطل ہے کہ اس عقیدہ کو تسلیم کر لینے کے بعد حضرات خلفاء ثلثہ (صدیق اکبر، فاروق اعظم، عثمان غنی رضی اللہ عنہم) کی وہ حیثیت جو خدا اور رسول خدا کی جناب سے انھیں عطا کی گئی ہے سرے سے ختم ہو جاتی ہے اور یہ حضرات خلیفہ راشد کے بجائے (نعوذ باللہ) امیر غاصب اور نبی کریم ...... کے اطاعت گذار اور فرماں بردار ہونے کے برعکس انتہائی مخالف اور نافرمان ٹھہرتے ہیں کہ آپ ...... کے دنیا سے پردہ فرماتے ہی آپ کے نامزد خلیفۂ برحق کو پس پشت ڈال کر خود امام وخلیفہ بن بیٹھے۔ اور دیگر تمام صحابہ اور خود حضرت علی کرم اللہ وجہہ پر بھی الزام آئے گا کہ انھوں نے متفقہ طور پر غیر مستحق لوگوں کی امامت و ریاست کو کیسے قبول کر لیا اور مدت العمر ان کی اطاعت واعانت اور تعریف وتوصیف کیسے کرتے رہے۔ پھر بات یہیں پر آ کر ختم نہیں ہوگی بلکہ اس صورت میں لازمی طور پر یہ ماننا ہوگا کہ جس معلم اخلاق اور ہادیٔ اعظم کو

اللہ تعالیٰ نے دنیا میں اپنے بندوں کی ہدایت اور تعلیم و تربیت کے لئے بھیجا تھا وہ اپنی تیئس سال کی تمام تر اور انتھک کوششوں کے باوجود چند افراد بھی ایسے تیار نہ کر سکا جو اس کے وفا شعار ہوتے اور اس کے جاری کئے ہوئے نظام کو برقرار رکھتے۔ کیا تہذیب و تمدن اور ادیان و ملل کی تاریخ میں کسی مصلح اور رہنما کی ناکامی کی ایسی مثال مل سکتی ہے۔

بات پہنچی ہے کہاں تک یہ تجھے کیا معلوم

اس مسئلہ سے متعلق اہل سنت اور جمہور مسلمین کے نظریہ کا حاصل یہ ہے کہ امام اور خلیفہ کا تقرر نہ اللہ تعالیٰ پر لازم ہے اور نہ رسول خدا نے حضرت علی کو اپنے بعد کے لئے خلیفہ نامزد فرمایا اور نہ یہ آپ کی ذمہ داری تھی۔ بلکہ اس کا تعلق مصالح عامہ سے ہے اور خود مسلمانوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی جماعت میں سے شرعی ضابطہ کے مطابق کسی شخص کو اپنا امیر و رئیس منتخب کرلیں اور شریعت کے بتائے ہوئے طریقہ کے مطابق اس کی اتباع، اطاعت اور امداد و اعانت کریں چنانچہ اسی شرعی دستور کے مطابق حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے آں حضرت...... کے بعد حضرت صدیق اکبر کو اپنا امام و امیر منتخب کیا اور مع حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے تمام صحابہ کرام امور شرعیہ میں ان کی اطاعت اور پیروی کو اپنے اوپر لازم سمجھتے رہے۔ ان کی وفات کے بعد اسی دستور کے مطابق حضرت فاروق اعظم، حضرت عثمان غنی اور حضرت علی رضی اللہ عنہم علی الترتیب امیر و خلیفہ منتخب ہوئے یہ چاروں بزرگ خلیفہ راشد ہیں اور ان کی خلافت خلافت راشدہ۔ فرقۂ شیعہ کے علاوہ یہی جمہور امت کا مذہب ہے۔ قرآن و حدیث اور عمل صحابہ سے اسی کی تائید و تصویب ہوتی ہے۔ تفصیل کے لئے ازالۃ الخفاء، تحفۂ اثنا عشریہ، اور امام اہل سنت مولانا عبدالشکور لکھنویؒ کی اس موضوع سے متعلق کتابیں دیکھی جاسکتی ہیں۔

مذہب اثنا عشری میں ائمہ کا مرتبہ

شیعہ مذہب میں ''ائمہ'' ان محیر العقول اور مافوق الفطرۃ ہستیوں کو کہتے ہیں۔ جن کی کائنات کے ذرے ذرے پر حکومت ہوتی ہے اور دنیا و آخرت دونوں ان کے قبضے میں

ہیں ان کا علم تمام چیزوں کو محیط ہوتا ہے، ماضی و مستقبل اور حاضر و غائب کی کوئی شے بھی ان سے مخفی نہیں ہوتی، ان کی موت خود ان کے اختیار اور فیصلہ کے تابع ہوتی ہے۔ وہ نہ صرف گناہوں سے معصوم ہوتے ہیں بلکہ بھول، چوک سے بری اور وہم و شک سے بالاتر ہوتے ہیں۔ حضرات انبیاء علی نبینا و علیہم الصلوۃ والسلام کی طرح فرشتے ان کے پاس وحیٔ ربانی لے کر نازل ہوتے ہیں۔ حضرات انبیاء ہی کی طرح ان کی اطاعت بھی فرض ہوتی ہے۔ اور ان کی معرفت شرائط ایمان سے ہے (وغیرہ ذلک من الھفوۃ نعوذ باللہ) انبیاء و رسل سے بالاتر اور خدائی صفات کی حامل یہ شخصیتیں مذہب اثنا عشری کے اعتبار سے کل بارہ ہیں جن کے اسماء انھیں کی اصطلاح کے مطابق یہ ہیں۔

(۱) حضرت امیر المومنین امام علی مرتضی علیہ السلام (۲) حضرت امام حسن علیہ السلام (۳) حضرت سید الشہداء امام حسین علیہ السلام (۴) حضرت امام زین العابدین علیہ السلام (۵) حضرت امام محمد باقر علیہ السلام (۶) حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام (۷) حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام (۸) حضرت امام علی رضا علیہ السلام (۹) حضرت امام محمد تقی علیہ السلام (۱۰) حضرت امام علی نقی علیہ السلام (۱۱) حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام۔

(۱۲) حضرت امام غائب حجۃ العصر محمد علیہ السلام۔ جن میں گیارہ حضرات تو دنیا میں تشریف لاکر اپنے اپنے عہد میں اللہ کی حجت قائم فرما کر دار آخرت کو سدھار گئے لیکن بارہویں امام اپنی پیدائش کے چوتھے یا پانچویں سال معجزانہ طور پر غائب ہوگئے اور اب تک زندہ ایک غار میں پوشیدہ ہیں شیعہ جن کے ظہور کے انتظار میں گھڑیاں گن رہے ہیں۔ شیعی نقطۂ نظر سے اس وقت وہی حجۃ اللہ فی الارض ہیں اور دنیا انھیں کے وجود باوجود سے قائم و برقرار ہے۔

ذیل میں ائمہ سے متعلق کتب شیعہ کے اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

دنیا و آخرت ان کے زیر تصرف ہیں

محمد بن یعقوب کلینی الجامع الکافی میں امام علی رضا سے نقل کرتے ہیں (معلوم ہونا

چاہیے کہ الجامع الکافی کا شیعہ کے نزدیک وہی درجہ ہے جو اہل سنت والجماعت کے یہاں الجامع البخاری کا ہے)۔

والارض کلها للامام قال اللّٰه تعالیٰ ”اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ یُوْرِثُهَا مَنْ یَّشَاءُ مِنْ عِبَادِهٖ والْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِیْنَ واهل البیت هم الذین اورثهم اللّٰه الارض وهم المتقون(۱)

(تمام زمین امام کی ملک ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے یقیناً زمین اللہ کی ہے اس کا وارث بناتا ہے جسے چاہتا ہے اپنے بندوں میں سے اور انجام کار متقیوں کے لئے ہے اور اہل بیت ہی وہ بندے ہیں جنھیں اللہ نے زمین کا وارث بنایا اور یہی متقی ہیں)۔

ایک دوسرے موقع پر امام جعفر صادق کا فرمان نقل کرتے ہیں:

اما علمت ان الدنیا والآخرة للامام یضعها حیث شاء ویدفعها الی من یشاء(۲)

(کیا تمہیں معلوم نہیں کہ دنیا وآخرت امام کی ملکیت ہے وہ اسے جہاں چاہیں رکھیں اور جسے چاہے عطا کردیں)۔

ائمہ کو ماضی ومستقبل کا علم ہوتا ہے اور انکی موت انکے اختیار میں ہے

والائمة اذا شاءوا ان یعلم شیئاً اعلمهم اللّٰه ایاه وهم یعلمون متیٰ یموتون ولا یموتون الا باختیارهم وهم یعلمومن علم ما کان وعلم مایکون ولا یخفیٰ علیهم شیء(۳)

(ائمہ جب کسی چیز کو جاننا چاہتے ہیں تو اللہ تعالیٰ انھیں بتادیتے ہیں انھیں معلوم ہے کہ انکی وفات کب ہوگی اور ان کی موت ان کے اختیار سے واقع ہوتی ہے جو کچھ ہو چکا ہے اور قیامت تک جو ہونے والا ہے سب کی انھیں خبر ہے ان پر کوئی بھی چیز پوشیدہ نہیں ہے)۔

---

(۱) الکافی ص:۲۸۹۔ (۲) الکافی ص:۲۵۹۔

(۳) ایضاً ص:۱۲۵و۱۲۶۔

ائمہ گناہ اور بھول چوک سے بری ہیں

کلینی ہی امام علی رضا سے ائمہ کی صفات سے متعلق ایک طویل روایت نقل کرتے ہیں جس میں امام رضا فرماتے ہیں کہ

الامام المطهر من الذنوب والمبرأ من العيوب.

(امام تمام گناہوں سے پاک اور جملہ عیوب سے بری ہوتا ہے)

اسی روایت میں آگے چل کر ارشاد فرماتے ہیں۔

فهو معصوم قد امن الخطاء والزلل والعشور يخصه الله بذلك ليكون حجته على عباده وشاهده على خلقه(۱)

(امام معصوم ہوتا ہے غلطی، بھول چوک اور لغزش سے محفوظ ہوتا ہے اللہ تعالیٰ نے معصومیت کی خصوصیت سے اسے اس لئے نوازا ہے تا کہ وہ اللہ کے بندوں پر اس کی طرف سے حجت ہو اور اس کی مخلوق پر اس کا شاہد و گواہ ہو)۔

ائمہ پر فرشتے وحی لے کر نازل ہوتے ہیں

امام علی رضا سے ایک شخص نے رسول، نبی اور امام کے درمیان فرق معلوم کیا تو امام نے اس کے جواب میں فرمایا:

الرسول هو الذى ينزل عليه جبريل فيراه ويسمع كلامه وينزل عليه الوحى، والنبى ربما يسمع الكلام و ربما رأى الشخص ولم يسمع، والامام هو الذى يسمع كلامه ولا يرى الشخص (۲)

(رسول وہ ہے جس پر فرشتہ وحی لے کر نازل ہوتا ہے اور وہ فرشتہ کا کلام بھی سنتا ہے اور اس کی صورت بھی دیکھتا ہے اور نبی وہ ہے جو کبھی فرشتہ کا کلام سنتا ہے اور اس کی صورت

---

(۱) الکافی ص:۹۶و۹۷ بحوالہ الصراع بین الاسلام والوثنیہ۔

(۲) ایضاً ص:۸۲ بحوالہ سابق۔

نہیں دیکھتا اور کبھی صورت دیکھتا ہے اور کلام نہیں سنتا، اور امام وہ ہے جو صرف فرشتہ کا کلام سنتا ہے صورت نہیں دیکھتا۔)

اللہ کی طرح امام کی معرفت بھی شرائط ایمان سے ہے

امام محمد باقر یا امام جعفر صادق سے یہی کلینی نقل کرتے ہیں کہ

عن احدهما انه قال لا يكون العبد مومنا حتى يعرف الله ورسوله والائمة كلهم وامام زمانه (۱)

(امام باقر یا امام جعفر صادق سے روایت ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ کوئی بندہ مومن نہیں ہوسکتا تاوقتیکہ وہ اللہ اس کے رسول، تمام ائمہ اور خود اپنے زمانہ کے امام کی معرفت حاصل نہ کرلے)۔

ائمہ رسول کے ہم مرتبہ ہیں اور رسولوں کی طرح انکی اطاعت بھی فرض ہے

امام علی رضا فرماتے ہیں

والله امر بطاعتهم ونهى عن معصيتهم وهم بمنزلة رسول الله الا انهم ليسوا بانبياء ولا يحل لهم من النساء ما يحل للانبياء فاما ماغير ذلك فهم بمنزلة رسول الله(۲)

(اللہ تعالیٰ نے ائمہ کی اطاعت کا حکم دیا ہے اور ان کی نافرمانی سے منع فرمایا ہے وہ رسول ہی کے درجہ میں ہیں البتہ رسول نہیں ہیں اور ان کے لئے عورتوں کی وہ تعداد جائز نہیں ہے جو انبیاء کے لئے جائز ہے اس کے علاوہ بقیہ تمام امور میں ائمہ رسول اللہ ہی کے درجہ میں ہیں۔)

الکافی ہی میں امام جعفر صادق سے روایت ہے۔

عن ابى الصباح قال اشهد انى سمعت ابا عبد الله يقول اشهد ان عليا

---

(۱) ایضاً ص: ۱۰۵، ایران انقلاب امام خمینی وشیعیت۔ (۲) الکافی ص: ۱۱۳۔

امام فرض اللّٰہ طاعته والحسن امام فرض اللّٰہ طاعته وان الحسین امام فرض اللّٰہ طاعته وان علی بن الحسین امام فرض اللّٰہ طاعته و ان محمد بن علی امام فرض اللّٰہ طاعته. (۱)

(ابو الصباح سے روایت ہے انھوں نے کہا میں شہادت دیتا ہوں کہ میں نے امام جعفر صادق سے سنا وہ فرماتے تھے کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ علی امام تھے اللہ نے ان کی اطاعت فرض کی ہے، حسن امام ہیں اللہ نے ان کی اطاعت فرض کی ہے۔ حسین امام ہیں اللہ نے ان کی اطاعت فرض کی ہے، علی بن حسین امام ہیں اللہ نے ان کی اطاعت فرض کی ہے اور محمد بن علی امام ہیں اللہ نے ان کی اطاعت فرض کی ہے۔)

ائمہ کے متعلق شیعی نقطۂ نظر معلوم کر لینے کے بعد آیئے اب امام خمینی قائد انقلاب کی تحریرات کا مطالعہ کریں اور دیکھیں کہ ائمہ کے بارے میں ان کا عقیدہ و نظریہ کیا ہے۔

کائنات کا ذرہ ذرہ امام کے اقتدار کے آگے سرنگوں ہے

علامہ خمینی اپنی مشہور کتاب الحکومۃ الاسلامیہ میں ائمہ کا مرتبہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

فان للامام مقاما محمودا ودرجة سامية وخلافة تكوينية تخضع لولايتها و سيطرتها جميع ذرات هذا الكون(۲)

(امام کو وہ اعلیٰ مقام اور بلند درجہ اور تکوینی حکومت حاصل ہوتی ہے کہ کائنات کا ذرہ ذرہ ان کے اقتدار و سلطنت کے آگے سرنگوں ہوتا ہے۔)

ائمہ کا مرتبہ ملائکہ مقربین اور انبیاء و مرسلین سے بلند تر ہے

علامہ خمینی لکھتے ہیں کہ یہ ہمارے مذہب کا اساسی اور بنیادی عقیدہ ہے کہ ائمہ کا

---

(۱) ایضاً ص: ۱۰۹ بحوالہ ایرانی انقلاب۔

(۲) الحکومۃ الاسلامیہ ص: ۵۲ بحوالہ الخمینی بین التطرف والاعتدال۔

مقام ومرتبہ ملائکہ مقربین اور انبیاء ومرسلین سے بھی بلند اور بالاتر ہے۔ ملاحظہ ہو ذیل کی عبارت:

ومن ضروریات مذهبنا ان لائمتنا مقاما لا يبلغه ملك مقرب ولانبى مرسل (۱)

(ہمارے مذہب کے بنیادی عقائد میں سے ہے کہ ہمارے ائمہ کو وہ مقام ومرتبہ حاصل ہے جہاں تک مقرب فرشتہ اور نبی مرسل کی بھی رسائی نہیں)۔

ائمہ سہو اور غفلت سے محفوظ ہیں

امام خمینی کے نزدیک ان کے ائمہ معصومین سہو وغفلت اور بھول چوک سے بھی محفوظ ہیں لکھتے ہیں

والائمة الذين لا نتصور فيهم السهو والغفلة (۲)

(ائمہ وہ عظیم ہستیاں ہیں جن کے بارہ میں ہم بھول چوک اور غفلت کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔)

ائمہ کی تعلیمات احکام قرآنی کی طرح واجب الاتباع ہیں

امام خمینی بھی شیعی معتقدات کی طرح ائمہ کو مفروض الاطاعت سمجھتے ہیں چنانچہ اپنی اسی کتاب الحکومۃ الاسلامیہ میں تحریر کرتے ہیں۔

ان تعاليم الائمة كتعاليم القرآن لاتختص جيلا خاصا وانما هى تعاليم للجميع فى كل عصر ومصر والى يوم القيٰمة يجب تنفيذها واتباعها. (۳)

(ائمہ کی تعلیمات قرآنی تعلیمات ہی کی طرح ہیں وہ کسی طبقہ کے ساتھ خاص نہیں

---

(۱) الحکومۃ الاسلامیہ ص: ۵۲ بحوالہ سابق۔

(۲) ایضاً ص: ۹۱ بحوالہ سابق۔

(۳) ایضاً ص: ۱۱۳ بحوالہ ایرانی انقلاب خمینی اور شیعیت۔

ہیں بلکہ وہ ہر زمانہ اور ہر علاقہ کے لوگوں کے لئے ہیں اور تا قیامت ان کی تنفیذ اور ان کی اتباع واجب ہے۔)

اگر چہ کتب شیعہ مثلاً اصول کافی، الوشعیہ، جلاء العیون، حیات القلوب، اساس الاصول وغیرہ ''ائمہ'' سے متعلق محیر العقول روایات سے بھری پڑی ہیں لیکن بخوف طوالت ہم اس فسانہ عجائب کو علامہ خمینی کی ایک تقریر کے اقتباس پر ختم کرتے ہیں۔ خمینی صاحب نے یہ سنسنی خیز تقریر نیشنل ٹیلی ویژن کے دوسرے حصہ کے افتتاح کے موقع پر کی تھی جسے ایران کے قومی اخبار ''تہران ٹائمز'' نے اپنی ۲۹ رجون ۱۹۸۰÷ کی اشاعت میں نقل کیا تھا اور اسی کے حوالہ سے سعودی عرب اور کویت کے روزنامہ الرای العام وغیرہ نے شائع کیا تھا۔ امام خمینی اپنی اس تقریر میں نوا سنج ہیں:

> ''اب تک کے سارے رسول دنیا میں عدل وانصاف کے اصولوں کے قیام ونفاذ کے لئے آئے تھے لیکن وہ اپنی کوششوں میں کامیاب نہ ہو سکے۔ حتی کہ نبی آخر الزماں محمد...... جو انسانیت کی اصلاح اور مساوات قائم کرنے کے لئے آئے تھے وہ بھی کامیاب نہ ہو سکے وہ واحد ہستی جو دنیا میں عدل و مساوات قائم کر سکتی ہے اور دنیا سے بد دیانتی کا خاتمہ کر سکتی ہے امام مہدی کی ہستی ہے اور وہ مہدی موعود ضرور ظاہر ہوں گے۔''

اس تقریر کو تہران ریڈیو نے بھی ۳۰ رجون ۱۹۸۰÷ کو نشر کیا تھا حالانکہ یہ مہدی موعود جن کے مقابلہ میں (نعوذ باللہ) سید الانبیاء والمرسلین رحمۃ للعالمین محمد رسول اللہ......کو امام خمینی ناکام قرار دے رہے ہیں ایک افسانوی شخصیت سے زیادہ کی حیثیت نہیں رکھتے اور ان کا وجود تاریخی دلائل سے اب تک ثابت نہیں کیا جا سکا ہے بلکہ جو بات ان کے بارے میں ثابت ہے وہ یہ ہے کہ یہ ایک ایسی مفروضہ ہستی ہے جو نیست سے ہست ہوئی ہی نہیں چنانچہ امام حسن عسکری (جنھیں مہدیٔ موعود اور امام منتظر کا والد قرار دیا جاتا ہے) کے متعلق تاریخ کی یہی شہادت ہے کہ وہ لاولد فوت ہوئے جیسا کہ خود ان کے بھائی جعفر نے بادشاہ وقت کے سامنے یہ شہادت دی تھی کہ میرے بھائی حسن عسکری لاولد فوت ہوئے

ہیں اور ان کی جائداد دوسروں میں تقسیم کر دی گئی ہے یہ ہے حقیقت امام منتظر اور حجۃ العصر کی جن کے متعلق یہ بلند بانگ دعوے کئے جا رہے ہیں فیا للعجب.

شاید آپ کے ذہن میں یہ بات کھٹکتی ہو کہ جب سرے سے امام حسن عسکری کے کوئی اولاد ہی نہیں تھی تو اثنا عشریہ کو آخر ایسی کون سی مجبوری پیش آ گئی کہ انھیں خواہ مخواہ کے لئے امام حسن عسکری کا ایک فرضی بیٹا گھڑنا پڑا؟ تو معلوم ہونا چاہئے کہ اتنے بڑے تاریخی جھوٹ بولنے پر خود ان کا عقیدہ انھیں مجبور کر رہا ہے۔ چونکہ ان کا یہ عقیدہ ہے کہ امام حسین کے بعد سلسلۂ امامت اماموں ہی کے اولاد سے وابستہ رہے گا۔ اس لئے جب ان کے گیارہویں امام حضرت امام حسن عسکری لاولد فوت ہو گئے تو انھیں اس عقیدہ کی بناء پر یہ مشکل پیش آ گئی کہ اب بارہواں اور آخری امام کس کو قرار دیا جائے بالآخر اس مشکل کے حل کی یہ تدبیر نکالی گئی کہ مشہور کر دیا گیا کہ امام حسن عسکری کی وفات سے چار پانچ سال قبل ان کے ایک لڑکا پیدا ہوا تھا جسے مصلحتاً لوگوں کی نگاہوں سے چھپا کر رکھا جاتا تھا اس لئے کوئی انھیں دیکھ نہ سکا پھر اپنے والد کی وفات سے دس دن پہلے ہی یہ غائب ہو گئے اور تقریباً ساڑھے گیارہ سو سال سے غیبوبیت ہی کی زندگی گذار رہے ہیں۔ یہ ہے امام غائب موعود منتظر کی طلسماتی داستان اب آپ خود فیصلہ فرمائیں کہ حقیقت واقعہ کیا ہے؟

ائمہ سے متعلق علامہ خمینی اور انکے مذہب اثنا عشریہ کے عقائد کا خلاصہ

ائمہ سے متعلق علامہ خمینی اور ان کے مذہب اثنا عشریہ کے عقائد کی بحث کے اختتام پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حاصل کلام کے طور پر ان عقائد کا خلاصہ پیش کر دیا جائے تا کہ پوری بات پیش نظر رہے اور مقصد تحقیق تک پہنچنے میں آسانی ہو۔

خلاصۂ بحث

(۱) اماموں کا اقتدار کائنات کے ذرہ ذرہ پر ہے دنیا و آخرت دونوں ان کے قبضۂ تصرف میں ہیں۔

(۲) اماموں کا علم تمام ما کان و ما یکون کو محیط ہے اور کوئی ظاہر و پوشیدہ شے ان کے علم سے باہر نہیں۔

(۳) اماموں کو نہ صرف اپنی موت کا علم ہوتا ہے بلکہ ان کی اپنی موت خود ان کے اختیار میں ہوتی ہے۔

(۴) اماموں کی معرفت شرائط ایمان سے ہے۔

(۵) اماموں کی اطاعت خدا و رسول کی طرح فرض اور ان کی تعلیمات قرآنی تعلیم کی طرح ہمہ گیر اور واجب الاطاعت ہیں۔

(٦) امام تمام گناہوں سے معصوم ہوتے ہیں۔

(۷) امام بھول چوک اور خطا و نسیان سے بھی بری ہوتے ہیں۔

(۸) اماموں کے پاس فرشتہ وحی ربانی لے کر نازل ہوتا ہے۔

ان مذکورہ عقائد پر ایک اجمالی نظر

اب ترتیب وار ہر عقیدے پر اجمالی نظر ڈالتے چلئے تاکہ معلوم ہو جائے کہ یہ عقائد قرآن و حدیث سے کس حد تک مطابقت رکھتے ہیں۔

۱- اس عقیدہ کے ذریعہ درحقیقت علامہ خمینی اور ان کے اہل مذہب نے اپنے اماموں کو خدائی کے درجہ میں پہنچا دیا ہے کیونکہ کائنات کے ذرہ ذرہ کا اقتدار اور دنیا و آخرت میں تصرفِ مطلق یہ خاص اللہ تعالیٰ کی صفت ہے کوئی بھی مخلوق خواہ وہ ولی، امام، فرشتہ، نبی اور رسول ہی کیوں نہ ہو کسی کو بھی یہ اختیار و اقتدار حاصل نہیں ہے۔ ارشاد ربانی ہے "لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" الایۃ زمین اور آسمان کی حکومت اسی کی ہے۔ ایک دوسری جگہ ارشاد ربانی ہے "اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ" غور سے سن لو ساری مخلوقات اور تمام معاملات اسی کے قبضۂ قدرت میں ہیں۔ ایک جگہ یوں ارشاد ہے۔ "اَللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِی الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ ط اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْر. اے اللہ اے ملک کے مالک آپ جسے

چاہتے ہیں ملک عطا کرتے ہیں اور جس سے چاہتے ہیں چھین لیتے ہیں اور جس کو چاہتے ہیں عزت سے نوازتے ہیں اور جسے چاہتے ہیں ذلیل کردیتے ہیں آپ ہی کے قبضۂ تصرف میں تمام بھلائیاں (اور برائیاں) ہیں یقیناً آپ ہر چیز پر قدرت رکھتے ہیں۔

غرضیکہ قرآن مجید میں اس قسم کی بے شمار آیتیں ہیں جن سے صاف طور پر ظاہر ہے کہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کو تصرف مطلق حاصل ہے اور اسی کے اقتدار اور سلطنت میں پوری کائنات ہے خدائے وحدہ لاشریک لہ کی قدرت کاملہ اور تصرفِ عامہ میں نہ کوئی شریک وساجھی ہے اور نہ ہی سہیم ومساوی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیعوں نے اپنے اماموں کے بارے میں یہ عقیدہ عیسائیوں کے عقیدۂ تثلیث سے سرقہ کیا ہے۔

۲- یہ بھی خالص شرکیہ عقیدہ ہے کیونکہ ما کان وما یکون کا علم سوائے ذات وحدہ لاشریک لہ کے کسی کو بھی نہیں ہے لایخفیٰ علیہ شئ صرف اللہ تعالیٰ ہی کی صفت ہے ملاحظہ ہوں درج ذیل آیات قرآنیہ۔

(۱) وِلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاِلَيْهِ يُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ.

آسمان وزمین کے کل مخفیات کا علم صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ہے اور اسی کی طرف تمام امور لوٹتے ہیں۔

بس یہ اللہ ہی کی شان ہے کہ زمین وآسمان کی کوئی مخفی سے مخفی چیز بھی اس کے علم محیط سے باہر نہیں قاضی بیضاوی "لِلّٰهِ غَيْبُ السمٰوٰت والارض" کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں "خاصةً لا يخفى عليه خافيةً فيهما" الفاظ کے فرق کے ساتھ یہی تفسیر خازن مدارک، السراج المنیر اور جامع البیان میں بھی دیکھی جاسکتی ہے۔(۱)

(۲) ولِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا اَمْرُ السَّاعَةِ اِلَّا كَلَمْحِ الْبَصَرِ.

صرف اللہ ہی کے علم میں آسمان وزمین کے مخفیات ہیں اور نہیں قیامت کا وقوع مگر پلک جھپکنے کی طرح ہے۔

---

(۱) بیضاوی، ج:۱،ص:۳۳۹، خازن، ج:۳،ص:۲۱۲۔ مدارک، ج:۲، ص:۱۶۱۔ السراج المنیر، ج:۲، ص:۸۵۔ جامعہ البیان، ج:۱،ص:۱۸۷۔

امام ابومسعود اس آیت کریمہ کی تفسیر میں لکھتے ہیں ای وللّٰہ خاصة لا لاحد غیرہ استقلالا ولا اشتراکاً غیب السمٰوٰت والارض ای الامور الغائبة عن علوم المخلوقین قاطبة(۱) یعنی خاص اللہ ہی کو ہے اس کے علاوہ کسی دوسرے کو نہیں نہ مستقل طور پر اور نہ مشترک طور پر آسمان وزمین کے غیب کا علم یعنی ان امور کا علم صرف اللہ ہی کو ہے جو تمام مخلوق کے علم سے غائب ہیں۔

(۳) قُلْ لَا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰه.

تو کہہ دے نہیں جانتے ہیں غیب کو جو آسمان وزمین میں ہیں سوائے اللہ کے۔

علامہ ابن القیم نے اس آیت کریمہ کی نہایت عمدہ تفسیر فرمائی ہے وہ لکھتے ہیں ان من فی السَّمٰوٰت والارض ھھنا ابلغ صیغ العموم ولیس المراد بھا معینا فھی فی قوة احد المنفی بقولك لا یعلم احد الغیب الا اللّٰہ واتی فی ھذا بذکر السموات والارض تحقیقا لارادہ العموم والاحاطة فالکلام مود معنی لا یعلم احد الغیب الا اللّٰہ الخ(۲) یعنی من السمٰوات والارض اس جگہ عموم کا بلیغ ترین صیغہ ہے ان کا معنی متعینہ مراد نہیں ہے اس لئے یہ جملہ لایعلم احد الغیب الا اللہ کا معنی ادا کر رہا ہے اور السمٰوات والارض کا ذکر عموم میں وسعت اور گیرائی پیدا کرنے کے لئے کیا گیا ہے اس لئے آیت شریف کا معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی بھی غیب کو نہیں جانتا۔

ملا علی قاری شرح فقہ اکبر میں لکھتے ہیں ان الانبیاء لم یعلموا المغیبات من الاشیاء الاما اعلمھم اللّٰہ احیانا وذکر الحنفیة تصریحا بالتکفیر باعتقاد النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم بعلم الغیب لمعارضة قولہ تعالیٰ لا یعلم من فی السموات والارض الغیب الا اللّٰہ. ”یقیناً حضرات انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام مخفی اشیاء کو نہیں جانتے مگر جن کا علم کبھی کبھی اللہ تعالیٰ انھیں عطا فرما دیتا ہے اور علماء احناف نے اس شخص کی تکفیر کی صراحت کی ہے جو یہ اعتقاد رکھے کہ نبی کریم ...... غیب کو جانتے تھے۔“ جب حضرات انبیاء اور خود سید المرسلین کا معاملہ اس بارے میں یہ ہے تو پھر ائمہ را چہ رسد۔

---

(۱) ابوسعود، ص: ۳۵۷۔ (۲) البدائع الفوائد، ج: ۳، ص: ۶۳۔

(۴) شیعوں کا یہ عقیدہ بھی قرآن حکیم اور حدیث نبوی کے صریح خلاف ہے ملاحظہ ہو آیت کریمہ

اِنَّ اللّٰہَ عِنۡدَہٗ عِلۡمُ السَّاعَۃِ وَیُنَزِّلُ الۡغَیۡثَ وَیَعۡلَمُ مَا فِی الۡاَرۡحَامِ وَمَا تَدۡرِیۡ نَفۡسٌ مَّاذَا تَکۡسِبُ غَدًا وَمَا تَدۡرِیۡ نَفۡسٌۢ بِاَیِّ اَرۡضٍ تَمُوۡتُ اِنَّ اللّٰہَ عَلِیۡمٌ خَبِیۡرٌ.

(یقیناً اللہ کے پاس قیامت کا علم ہے اور اللہ تعالیٰ بارش برساتا ہے اور جانتا ہے کہ ماؤں کے رحم میں کیا ہے اور نہیں جانتا کوئی کہ کل کیا کرے گا اور کسی کو معلوم نہیں کہ کہاں اس کی موت واقع ہوگی بلاشبہ اللہ جاننے والا خبر رکھنے والا ہے۔)

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ نبی کریم...... کا ارشاد نقل کرتے ہیں:

قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم مفاتیح الغیب خمس لا یعلمھن الا اللّٰہ ان اللّٰہ عندہ علم الساعۃ الخ(۱)

رسول اللہ...... نے فرمایا مفاتیح غیب پانچ ہے جن کو سوائے اللہ تعالیٰ کے کوئی نہیں جانتا۔ پھر آپ نے اوپر درج کی ہوئی آخر تک آیت کریمہ تلاوت فرمائی جس سے صاف ظاہر ہے کہ ان پانچ امور کا علم کسی کو نہیں ہے اور ان میں ایک موت بھی ہے۔

عقائد ۴، ۵، ۶ اور ۸ کے ذریعہ شیعوں نے اپنے ائمہ کو انبیاء و رسول کے درجہ میں لاکر بٹھا دیا ہے کیونکہ حضرات انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام ہی وہ مخصوص ہستیاں ہیں جن کی معرفت ضروری ہے اور صرف وہی مفروض الطاعت ہیں گناہوں سے عصمت انھیں کے لوازم میں سے ہے وحی کا نزول انھیں کے ساتھ مختص ہے۔ یہ وہ خصوصیات ہیں جن میں تمام بنی نوع بشر سے حضرات انبیاء امتیاز رکھتے ہیں۔ یہی تمام امت کا عقیدہ ہے اور قرآن و حدیث سے یہی ثابت ہے۔ تفصیل اور دلائل کے لئے کتب عقائد کا مطالعہ کیا جائے درحقیقت فرقۂ شیعہ نے ان عقائد کے درپردہ ختم نبوت کے قطعی عقیدہ کا انکار کیا ہے اور یہ کھلا ہوا زندقہ ہے چنانچہ امام ولی اللہ محدث دہلوی کافر، منافق اور زندیق میں باہم فرق کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

---

(۱) الجامع الصحیح للبخاری.

ان المخالف الدين الحق ان لم يعترف به ولم يزعن له لا ظاهرا ولا باطناً فهو كافر وان اعترف بلسانه وقلبه على الكفر فهو المنافق وان اعترف به ظاهرا لكن يفسر بعض ما ثبت من الدين ضرورة بخلاف ما فسره الصحابة والتابعون واجتمعت عليه الامة فهو الزنديق كما اذا اعترف بان القرآن حق وما فيه من ذكر الجنة والنار حق والمراد بالجنة الابتهاج الذى يحصل بسبب الملكات المحمودة والمراد بالنار هى الندامة التى تحصل بسبب الملكات المذمومة وليس فى الخارج جنة ولا نار فهو الزنديق وكذٰلك من قال الشيخين ابى بكر وعمر مثلاً ليسا من اهل الجنة مع تواتر الحديث فى بشارتهما او قال ان النبى صلى اللّٰه عليه وسلم خاتم النبوة ولكن معنى هذا الكلام انه لا يجوز ان يسمٰى بعده احد نبیٌ واما معنى النبوة وهو كون الانسان مبعوثا من اللّٰه تعالیٰ الى الخلق مفترض الطاعة معصوما من الذنوب فهو موجود فى الائمة بعد فذٰلك هو الزنديق وقد اتفق جماهير المتاخرين من الحنفية والشافعية على قتل من يجرى هذه المجرىٰ. (المسوی ج ۲، ص: ۱۳۰ مطبوعہ کتب خانہ رحیمیہ سنہری مسجد دہلی)

(دین حق کا مخالف اگر دین کا معترف نہیں اور نہ ظاہراو باطناً اس پر یقین رکھتا ہے تو وہ کافر ہے۔ اور اگر زبان سے تو اقرار کرے لیکن اس کا دل منکر ہو تو وہ منافق ہے اور اگر ظاہری طور پر دین کا اقرار و اعتراف کرتا ہے لیکن ضروریات دین کی ایسی تفسیر کرتا ہے جو صحابۂ کرام تابعین اور اجماع امت کی تفسیر کے خلاف ہے تو وہ زندیق ہے مثلاً معترف ہے کہ قرآن برحق ہے اور اس میں مذکور جنت وجہنم برحق ہیں لیکن جنت اس مسرت اور خوشی کا نام ہے جو اخلاق حسنہ کے سبب حاصل ہوتی ہے اور جہنم وہ ندامت اور شرمندگی ہے جو بری عادتوں کی بنا پر حاصل ہوتی ہے خارج میں جنت وجہنم کا وجود نہیں ہے تو اس تفسیر کا کرنے والا زندیق ہوگا اسی طرح اگر کوئی کہے کہ حضرت ابوبکرؓ وعمرؓ جنتی نہیں ہیں۔ باوجودیکہ ان دونوں حضرات کے جنتی ہونے کی بشارت میں احادیث حد تواتر تک پہنچی ہوئی ہیں یا اقرار کرے کہ نبی کریم ...... خاتم النّبیین ہیں لیکن اس کا مطلب یہ ہے کہ ان

کے بعد کسی کو نبی کہنا جائز نہیں ہے البتہ حقیقت نبوت یعنی کسی انسان کا اللہ کی جانب سے مخلوق کی طرف بھیجا جانا، مفترض الطاعۃ ہونا، گناہوں سے معصوم ہونا تو یہ صفات و خصوصیات نبی ...... کے بعد اماموں کے اندر موجود ہیں تو یہ کہنے والا زندیق ہوگا اور متاخرین علماء احناف وشوافع نے باتفاق اس طرح کے عقائد رکھنے والے کے قتل کا فتویٰ دیا ہے۔)

(۷) سہو اور نسیان سے تو حضرات انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام بھی محفوظ نہیں ہیں چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ”وَنَسِیَ آدَمَ وَلَمْ نَجِدْ لَہٗ عَزْمًا الایۃ“ اور آدم بھول گئے اور ہم نے ان کے اندر عزم نہیں پایا۔ اسی طرح اور بھی حضرات انبیاء کے سہو و نسیان کا تذکرہ قرآن میں موجود ہے۔ حضرت خاتم النّبیین نبی آخر الزماں ...... ایک مرتبہ نماز پڑھا رہے تھے چار رکعت کی نماز تھی لیکن آپ نے بھول کر دو ہی رکعت پر سلام پھیر دیا اس پر ایک صحابی ذوالیدین نے کھڑے ہو کر عرض کیا ”اقصرت الصلوۃ ام نسیت“ کیا نماز میں کمی کر دی گئی یا آپ بھول گئے؟ آپ ...... نے فرمایا نہ کم کی گئی اور نہ میں بھولا اس پر دیگر حضرات نے ذوالیدین کی تصدیق کی پوری حدیث کتب صحاح میں دیکھی جا سکتی ہے ان آیات واحادیث سے صاف طور پر عیاں ہے کہ سہو و نسیان سے حضرات انبیاء بری نہیں ہیں پھر اماموں کو اس سے بری بتانا یہ خالص افتراء ہے جس کا کوئی ثبوت نہیں پیش کیا جا سکتا۔ درحقیقت سہو و نسیان سے بری ہونا اللہ تعالیٰ کی صفت ہے جس میں کوئی مخلوق اللہ کی شریک نہیں اس لئے ان کا یہ عقیدہ بھی دیگر بہت سے عقیدوں کی طرح شرکیہ ہے۔ نعوذ باللہ منہ۔

(۲) قرآن حکیم اور شیعہ

جس طرح فرقہ شیعہ مسئلہ امامت اور ائمہ کی تعیین وتحدید نیز ان کے مقام ومرتبہ اور صفات ولوازمات کے بارے میں جادۂ مستقیم سے منحرف اور جمہور امت سے بالکل مختلف ہے اسی طرح وہ قرآن عزیز کے متعلق بھی اجماع امت اور قرآن وحدیث کی روشن اور

سیدھی شاہراہ کو چھوڑ کر ایسی راہ پر لگ گیا ہے جس نے اسے ظلمت وضلالت کی آخری منزل پر پہنچا دیا ہے۔ چنانچہ علامہ ابن حزم اپنی مشہور کتاب "الملل و النحل" میں لکھتے ہیں:

ومن قول الامامية كلها قديما وحديثا ان القرآن مبدل زيد فيه ما ليس منه و نقص منه كثير و بدل منه كثير.(۱)

(امامیہ قدیم وجدید سب اس بات کے قائل ہیں کہ قرآن میں تبدیلی کردی گئی ہے جو باتیں قرآن میں نہیں تھیں اس میں بڑھا دی گئی ہیں اور کمی اور تبدیلی تو بہت کی گئی ہے۔)

اس کے بعد علامہ موصوف لکھتے ہیں "والقول بان بين اللوحين تبديلا كفر صريح و تكذيب لرسول الله" موجودہ قرآن کو محرف اور مبدل کہنا کھلا ہوا کفر اور نبی کریم ......کی تکذیب ہے۔

اگرچہ آج کل کے شیعہ از راہ تقیہ تحریف قرآن کا انکار کرتے ہیں لیکن علامہ ابن حزم نے جو بات لکھی ہے صحیح وہی ہے جیسا کہ خود شیعی علماء کی تصریحات اس کی شاہد ہیں جن کا بیان بطور نمونہ آئندہ سطور میں آرہا ہے۔ علاوہ ازیں فرقۂ شیعہ کے لئے اس عقیدہ تحریف کے بغیر کوئی چارہ بھی نہیں ہے، کیونکہ ان کے مذہب میں مسئلہ امامت دین اسلام کا اہم ترین رکن ہے۔ امام کلینی امام باقر سے روایت کرتے ہیں:

عن ابى جعفر عليه السلام قال بنى الاسلام على خمس الصلوٰة والزكوٰة والصوم، والحج والولاية ولم يناد بشيء ما نودئ بالولاية(۲)

(امام باقر سے روایت ہے انھوں نے فرمایا اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر قائم ہے، نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج اور امامت اور ان ارکان میں سے کسی کا اتنی اہمیت کے ساتھ اعلان نہیں کیا گیا جس اہمیت کے ساتھ مسئلہ امامت کا اعلان کیا گیا ہے۔)

اسی الکافی میں یہ بھی ہے:

عن ابى الحسن عليه السلام قال ولاية على مكتوبة فى جميع صحف

---

(۱) الملل والنحل۔

(۲) اصول کافی، ص: ۳۶۸ بحوالہ ایرانی انقلاب۔

الانبیاء ولن یبعث اللّٰہ رسولا الاّ بنبوۃ محمد صلی اللّٰہ علیہ و آلہ ووصیۃ علی علیہ السلام (۱)

(امام ابوالحسن موسیٰ کاظم سے روایت ہے انھوں نے فرمایا علی کی امامت تمام انبیاء کے صحیفوں میں لکھی ہوئی ہے اور اللہ نے جو بھی رسول دنیا میں بھیجا اسے محمد...... کی نبوت اور علی کی وصیت وامامت کی تعلیم کے ساتھ بھیجا)۔

ان روایتوں کے پیش نظر یہ سوال پیدا ہونا لازمی ہے کہ جب مسئلہ امامت اسلام کا اہم ترین رکن ہے اور تمام انبیاء کے صحیفوں میں اس کا ذکر ہے اور ہر نبی کو اس کی تعلیم دی گئی ہے تو پھر قرآن میں صراحت کے ساتھ اس کا ذکر کیوں نہیں ہے جب کہ اسلام کے بقیہ چاروں ارکان کا ذکر پوری وضاحت کے ساتھ بار بار کیا گیا ہے۔ اس سوال کا حل ان کے پاس اس کے علاوہ کوئی نہیں ہے کہ وہ یہ دعویٰ کریں کہ قرآن میں حضرت علی اور دیگر ائمہ کا ذکر تھا مگر مخالفین نے اسے حذف کردیا۔ یہی وجہ ہے کہ فرقۂ شیعہ کے جمہور علماء خواہ وہ متقدمین کی جماعت سے تعلق رکھتے ہوں یا متاخرین کے گروہ سے ہوں سب ہی تحریف قرآن کے عقیدہ پر متفق ہیں۔ فرقۂ اثناعشریہ کے العالم الکبیر المحدث، المجتہد العلامۃ حسین بن محمد تقی النوری الطبرسی المتوفی ۱۳۲۰ھ نے اپنی مایۂ ناز تصنیف "فصل الخطاب فی اثبات تحریف کتاب رب الارباب" میں اپنے متقدمین اکابر علماء ومحدثین کی ایک ایسی فہرست درج کی ہے جو سب کے سب تحریف قرآن کے قائل ہیں آپ بھی ملاحظہ فرمالیں: (۱) الثقۃ الجلیل محمد بن الحسن الصفاء (مصنف کتاب البصائر) (۲) الثقۃ محمد بن ابراہیم النعمانی تلمیذ کلینی (مصنف کتاب الغیبۃ) (۳) الثقۃ الجلیل سعد بن عبداللہ القمی (جنھوں نے اپنی کتاب ناسخ ومنسوخ میں تحریف قرآن کا ایک مستقل باب قائم کیا ہے) (۴) السید علی بن احمد الکوفی (مصنف کتاب بدع المحدثۃ) (۵) اجلۃ المفسرین الشیخ الجلیل محمد بن مسعود العیاشی (مصنف تفسیر عیاشی) (۶) الشیخ فرات بن ابراہیم الکوفی (۷) الثقۃ محمد بن العباس الماہیار (۸) شیخ المتکلمین متقدم النوبختین ابوسہل

---

(۱) ایضاً، ص: ۲۷۶۔

اسماعیل بن علی بن اسحاق بن سہل بن نوبخت... (مصنف کتب کثیرہ) (۹) اسحاق الکاتب (جنھوں نے امام مہدی کی زیارت کی ہے) (۱۰) انیس الطائفہ ابوالقاسم حسین بن روح نوبختی (جو شیعوں اور امام غائب کے درمیان غیبت صغریٰ کے زمانہ میں تیسرے سفیر تھے) (۱۱) العالم الفاضل المتکلم حاجب بن لیث بن سراج (۱۲) الشیخ الجلیل الثقۃ الاقدم فضل بن شاذان (۱۳) الشیخ الجلیل محمد بن حسن الشیبانی (مصنف تفسیر نہج البیان) (۱۴) الشیخ الثقہ احمد بن محمد بن خالد (مصنف کتاب المحاسن، محقق طوسی نے الفہرست میں اور نجاشی نے اپنی کتاب اسماء الرجال میں ان کی ایک تصنیف کتاب التحریف کا تذکرہ کیا ہے (۱۵) الشیخ محمد بن خالد (۱۶) الشیخ الثقہ علی بن الحسن بن فضال (۱۷) محمد بن الحسن الصیرفی (۱۸) احمد بن محمد السیار (۱۹) الشیخ حسن بن سلیمان الحلی تلمیذ الشہید (۲۰) الثقۃ الجلیل محمد بن عباس بن علی بن مروان ماہیار (۲۱) ابوالطاہر عبدالواحد بن عمر القمی (۲۲) محمد بن علی بن شہر آشوب (۲۳) الشیخ احمد بن ابی طالب طبرسی (جنھوں نے تحریف قرآن سے متعلق دس حدیثوں سے زیادہ روایت کی (۲۴) مولیٰ محمد بن صالح (۲۵) الفاضل السید علی خان (۲۶) مولی محمد مہدی ترانی الاستاذ الاکبر البہبہانی (۲۷) محقق کاظمی الشیخ ابوالحسن الشریف (۲۸) شیخ علی بن محمد القابی (۲۹) السید الجلیل علی طاؤس (۳۰) الشیخ الاعظم محمد بن لقمان المفید۔ یہ ہیں فرقۂ شیعہ کے وہ اکابر علماء اور محدثین ومفسرین جو علامہ نوری طبرسی کی تحقیق کے مطابق تحریف کے قائل ہیں۔

اس طویل فہرست کے پیش کرنے کے بعد علامہ نوری لکھتے ہیں یہ صرف اِنہیں مذکورہ علماء کا مذہب نہیں ہے بلکہ:

وهو مذهب جمهور المحدثين الذين عشرنا على كلماتهم.

(یہی ان تمام جمہور محدثین کا مذہب ہے جن کے اقوال پر ہمیں واقفیت ہوسکی ہے)

پھر مزید لکھتے ہیں:

ومن جميع ما ذكرنا ونقلنا بتتبعي القاصر يمكن دعوى الشهرة العظيمة بين المتقدمين وانحصار المخالفين فيهم باشخاص معينين ياتي ذكرهم —

قال السید المحدث الجزائری فی الانوار ما معناه ان الاصحاب قد اطبقوا علی صحة اللاخبار المستفیضة بل المتواتر الدالة بصریحها علی وقوع التحریف فی القرآن کلاما ومادة واعراباً والتصدیق بها نعم خالف فیها المرتضیٰ والصدوق والشیخ الطبرسی. (۱)

(ہم نے اپنی محدود تلاش وجستجو کی بنیاد پر (تحریف قرآن کے بارہ میں شیعہ اکابر علماء کے) جو اقوال نقل کئے ہیں۔ ان کی بنیاد پر دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ ہمارے علمائے متقدمین کا عام طور پر یہی مذہب رہا ہے اور اس کے خلاف رائے رکھنے والے بس چند متعین اشخاص تھے جن کا ذکر آرہا ہے۔

— پھر سید نعمت اللہ الجزائری کی کتاب الانوار النعمانیہ کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ محدث الجزائری نے لکھا ہے کہ

ہمارے اصحاب کا اس پر اتفاق ہے کہ وہ مشہور بلکہ متواتر روایتیں جو صراحت کے ساتھ بتاتی ہیں کہ قرآن میں تحریف ہوئی ہے اس کی عبارت میں بھی اور اس کے الفاظ واعراب میں بھی وہ روایات سب صحیح ہیں اور ان روایات کی تصدیق (یعنی ان کے مطابق عقیدہ رکھنے) میں بھی ہمارے اصحاب کے درمیان اتفاق ہے ہاں اس بارہ میں صرف شریف مرتضیٰ اور شیخ صدوق اور شیخ طبرسی نے اختلاف کیا ہے۔

پھر علامہ طبرسی تحریف قرآن کے اثبات پر بارہویں دلیل پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

الدلیل الثانی عشر الاخبار الواردة فی الموارد المخصوصة من القرآن الدالة علی تغییر لبعض الکلمات والآیات والسور باحدی الصور المتقدمة وھی کثیرة جدّا حتیٰ قال السید نعمة اللّٰہ الجزائری فی بعض مؤلفاته کما حکی عنه ان الاخبار الدالة علی ذلك تزید علی الفی حدیث واوعیٰ استفاضتها جماعة کالمفید والمحقق الداماد والعلامة باقر المجلسی بل الشیخ ایضا صرح فی التبیان بکثرتها بل اوعیٰ تواترها جماعة یاتی ذکرهم(۲)

---

(۱) فصل الخطاب، ص: ۳۰۔ (۲) فصل الخطاب، ص: ۲۲۷۔

(بارہویں دلیل وہ روایتیں ہیں جو قرآن کے خاص خاص مقامات کے بارے میں آئی ہیں جو بتاتی ہیں کہ قرآن کے بعض کلمات بعض آیات اور بعض سورتوں میں مذکورہ بالا صورتوں میں سے کسی ایک صورت کی تبدیلی کی گئی ہے اور یہ روایتیں بہت زیادہ ہیں حتیٰ کہ سید نعمت اللہ جزائری نے اپنی بعض تصانیف میں لکھا ہے جیسا کہ ان سے نقل کیا گیا ہے کہ قرآن میں تحریف پر دلالت کرنے والی ائمہ کی روایتیں دو ہزار سے زائد ہیں اور علماء کی ایک جماعت مثلاً شیخ مفید، محقق داماد اور علامہ باقر مجلسی نے ان حدیثوں کے مشہور ہونے کا دعویٰ کیا ہے اور شیخ طوسی نے بھی اپنی کتاب التبیان میں بصراحت لکھا ہے کہ یہ روایتیں بہت زیادہ ہیں بلکہ ہمارے علماء کی ایک جماعت نے جن کا ذکر آئندہ آرہا ہے ان روایات کے متواتر ہونے کا دعویٰ کیا ہے)۔

بعد میں حسب وعدہ ان علماء کو نام بنام شمار کر کے بتایا ہے کہ جو حضرات تحریف قرآن سے متعلق وارد روایتوں کو متواتر کہتے ہیں۔ یہ کل چار علماء ہیں: (۱) المولیٰ محمد صالح (انھوں نے شرح کافی میں اس کی تصریح کی ہے) (۲) الفاضل قاضی القضاۃ علی بن عبدالعالی (ان کے بارے میں سید نے شرح وافیہ میں لکھا ہے کہ یہ بھی ان روایات کو متواتر کہتے ہیں) (۳) الشیخ المحدث الجلیل ابوالحسن الشریف (انھوں نے اپنی تفسیر کے مقدمہ میں یہ دعویٰ کیا ہے) (۴) العلامہ مجلسی، یہ اپنی مشہور تصنیف مرآۃ العقول میں یوں رقم طراز ہیں:

عندی ان الاخبار فی هذا الباب متواترة معنیً وطرح جمیعها یوجب رفع الاعتماد من الاخبار رأسا بل ظنی ان الاخبار فی هذا الباب لا یقصر عن اخبار الامامة فکیف یثبتونها بالخبر(۱)

(میرے نزدیک تحریف قرآن کی روایتیں متواتر ہیں اور ان سب روایات کو ترک کردینے سے پورے فن حدیث کا اعتبار ختم ہوجائے گا بلکہ میری رائے تو یہ ہے کہ تحریف قرآن کی روایتیں مسئلہ امامت کی روایات سے کم نہیں ہیں لہٰذا اگر تحریف قرآن کی

---

(۱) ایضاً ص: ۲۲۸۔

روایتوں کا اعتبار نہ ہو تو پھر مسئلہ امامت بھی روایتوں سے ثابت نہ ہو سکے گا۔)

علامہ نوری طبرسی کے علاوہ علامہ محسن کاشی مصنف تفسیر صافی، دور آخر کے مجتہد اعظم آیۃ اللہ فی العالم دلدار علی مصنف عماد الاسلام، امام الشیعہ الشیخ حامد حسین مصنف استقصاء الافحام وغیرہ علماء شیعہ نے بھی بڑی شد و مد کے ساتھ تحریف قرآن پر دلائل قائم کئے ہیں۔

اس سلسلہ کی چند روایتیں آپ بھی ملاحظہ کرتے چلیں۔ اصول کافی کے باب النوادر میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

(١) ان القرآن الذی جاء به جبریل علیه السلام الی محمد صلی الله علیه و آله سبعة عشر الف آیة (١)

(یہ یقینی بات ہے کہ جو قرآن جبریل علیہ السلام محمد...... پر لے کر آئے تھے اس میں سترہ ہزار آیتیں تھیں۔)

موجودہ قرآن میں باختلاف روایات کل چھ ہزار چھ سو سولہ (٦٦١٦) آیتیں ہیں لہٰذا اس روایت کے اعتبار سے قرآن کا تقریباً دو تہائی حصہ نکال دیا گیا ہے۔ استغفر اللہ۔

(۲) اصول کافی میں امام باقر سے یہ روایت نقل کی گئی ہے۔

ما ادعی احد من الناس انه جمع القرآن کله کما انزل الا کذاب وما جمعه و حفظه کما انزل الله الا علی بن ابی طالب و الائمة من بعده(۲)

(صرف جھوٹا شخص ہی یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ اس کے پاس بعینہٖ مکمل قرآن ہے اللہ تعالیٰ کی تنزیل کے مطابق صرف علی بن ابی طالب نے اور ان کے بعد ائمہ نے قرآن کو جمع اور محفوظ کیا ہے اور بس)۔

(۳) اصول کافی کی یہ روایت ملاحظہ فرمائیں۔

قراء رجل عند ابی عبدالله علیه السلام ”قُلِ اعۡمَلُوۡا فَسَیَرَی اللّٰهُ عَمَلَکُمۡ وَرَسُوۡلُهٗ وَالۡمُؤۡمِنُوۡنَ“ فقال لیس هکذا هی انما هی والمامونون فنحن المامونون. (۳)

---

(۱) اصول کافی، ص: ۶۷۱۔ (۲) ایضاً، ص: ۱۳۹۔ (۳) اصول کافی، ص: ۲۶۸۔

(ایک شخص نے امام جعفر صادق کے سامنے یہ آیت پڑھی قل اعملوا الخ اے نبی کہہ دو کہ تم لوگ عمل کرو تمہارا عمل اللہ دیکھے گا، اور اس کا رسول اور ایمان والے تو امام نے فرمایا یہ آیت اس طرح نہیں ہے بلکہ یوں ہے والمامونون یعنی مامون لوگ دیکھیں گے اور ہم (بارہ ائمہ) مامون ہیں)۔

کتاب احتجاج مصنفہ شیخ احمد بن ابی طالب طبرسی میں حضرت علیؓ سے یہ روایت نقل کی گئی ہے۔

(۴) انهم اثبتوا فی الکتاب مالم یقله اللّٰه لیلبسوا علی الخلیقة(۱)

(ان منافقین نے قرآن میں وہ باتیں بڑھا دیں جو اللہ تعالیٰ نے فرمائی نہیں تھیں تاکہ مخلوق کو فریب دیں)۔

بطور نمونہ کے یہ چار روایتیں مذہب شیعہ کی معتبر ترین کتابوں سے نقل کی گئی ہیں جن سے صاف طور پر معلوم ہو رہا ہے کہ شیعوں کے نزدیک قرآن میں تینوں طرح کی تبدیلیاں کی گئی ہیں یعنی کمی، زیادتی اور تبدیلی تینوں طرح کی تحریف ہوئی ہے۔

اس ساری کاوش کا مقصد یہ ہے کہ یہ بات مدلل طور پر واضح ہو جائے کہ فرقہ اثنا عشریہ تحریف قرآن کا قائل ہے اور ان کے جمہور علماء کا یہی مذہب ہے جیسا کہ خود ان کی کتابوں سے ظاہر ہو رہا ہے۔ اس لئے آج کل کے سیاسی شیعوں کا اپنے اس باطل اور کفریہ عقیدے کو تقیہ کے غلاف کے اندر چھپانا ایک ایسی کوشش ہے جس کا کوئی فائدہ نہیں۔

عقیدۂ تحریف قرآن کے سلسلہ میں علامہ خمینی کا رویہ

علامہ خمینی جیسا کہ معلوم ہے مذہب اثنا عشری کے بلند پایہ عالم، مجتہد اور امام ہیں اس لئے قرآن مجید کے بارے میں جو نظریہ فرقۂ اثنا عشریہ کا ہے لازمی طور پر اسی کے پابند

---

(۱) کتاب الاحتجاج یہ شیعوں کی نہایت معتبر کتاب ہے، اس کے مصنف نے مقدمہ میں لکھا ہے کہ حسن عسکری کے علاوہ دیگر ائمہ کے جس قدر اقوال اس کتاب میں نقل کئے گئے ہیں۔ وہ سب کے سب اجماعی ہیں، اسی کتاب میں ایک طویل روایت ہے جو صفحہ ۱۱۹ سے شروع ہو کر صفحہ ۱۳۳ پر ختم ہوتی ہے اسی روایت کا یہ ایک ٹکڑا ہے۔

علامہ خمینی بھی ہوں گے، لیکن وہ ایک مذہبی پیشوا ہونے کے ساتھ زبردست سیاسی لیڈر اور رہنما بھی ہیں اس لئے وہ تحریف قرآن کے مسئلہ پر کھل کر اظہار خیال کرنے سے گریز کرتے ہیں بلکہ کبھی کبھی تقیہ کی زبان میں اپنے مذہبی عقیدہ کے برخلاف قرآن مجید کی حقانیت کا بھی اعلان کر دیتے ہیں کیونکہ یہ مسئلہ ایسا نازک ہے کہ اس کے اظہار کے بعد وہ مسلمانوں کی ہمدردیاں اپنے ساتھ باقی نہیں رکھ سکتے جبکہ اس کی انھیں بروقت شدید ضرورت ہے۔ اسلئے اس مسئلہ پر ان کے کسی صریح قول کو اس وقت پیش نہیں کیا جاسکتا۔ "لعل اللہ یحدث بعد ذلك امرا" البتہ ان کی بعض عبارتوں سے تحریف قرآن کی جانب واضح اشارہ ملتا ہے، لیکن اس اشارہ کو وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جن کی قرآن سے متعلق روایات شیعہ پر پوری نظر ہو۔ علاوہ ازیں بعض دوسرے قرائن سے بھی پتہ چلتا ہے کہ علامہ خمینی اس مسئلہ میں اپنے ہم مذہب جماعت کے ساتھ ہیں۔ ذیل میں ان چند قرائن اور عبارت کا تذکرہ کیا جارہا ہے جن سے مسئلہ تحریف قرآن سے متعلق علامہ خمینی کے نظریہ پر روشنی پڑتی ہے۔

(۱) علامہ خمینی نے اپنی تصانیف مثلاً تحریر الوسیلہ، الحکومۃ الاسلامیہ، جہاد اکبر وغیرہ میں بطور خاص ان کتابوں کو ماخذ بنایا ہے جن کے مصنّفین نہ صرف تحریف قرآن کے قائل ہیں بلکہ اس نظریہ کیلئے دلائل کی قوت فراہم کرنے کی خدمت بھی انجام دی ہے مثلاً ''مستدرک الوسائل مصنفہ علامہ نوری طبرسی، یہ شیعوں کے وہی مجتہد اعظم اور محدث کبیر ہیں جنھوں نے ''فصل الخطاب فی اثبات تحریف کتاب رب الارباب'' کے نام سے وہ معرکۃ الآراء کتاب تصنیف کی ہے جس نے انہیں شیعی دنیا میں بقائے دوام کے درجہ عالی پر پہنچادیا ہے۔ اس کتاب کا حوالہ متعدد بار آچکا ہے (۲) الجامع الکافی۔ تالیف علامہ کلینی، انھوں نے اپنی اس کتاب میں ایک مستقل باب "باب فيه نكت و نتف من التنزيل فی الولاية" قائم کیا ہے یعنی یہ باب اس بیان میں ہے کہ قرآن میں امامت سے متعلق آیات میں کانٹ چھانٹ کی گئی ہے۔ (۳) الوسائل مؤلفہ امام العاملی یہ بھی تحریف قرآن کے قائل ہیں جیسا کہ تفسیر القمی کے مقدمہ ص: ۲۴ پر سید طیب مولوی نے اس کی تصریح کی

ہے (۴) کتاب الاحتجاج از علامہ احمد طبرسی یہ تو اس مسئلہ میں انتہائی غلو رکھتے ہیں یہ سب وہ کتابیں ہیں جن سے علامہ خمینی اپنی تصانیف میں استفادہ کرتے ہیں اور ان کے مصنّفین کا نام انتہائی تعظیم سے لیتے اور ان کی بارگاہ میں صلاۃ و رحمت کے نذرانے پیش کرتے ہیں۔ کیا یہ جذبۂ عقیدت و عظمت اور ان کے حق میں یہ دعائیہ کلمات اتحاد مذہب و مسلک کے بغیر زبان و قلم سے نکل سکتے ہیں اپنے ان علماء کے ساتھ علامہ خمینی کا یہ عقیدت مندانہ طرز عمل زبان خاموش سے پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ یہ ان مذکورہ علماء کے ہر قول و عمل سے نہ صرف متفق ہیں بلکہ ان کے نزدیک یہ حضرات استناد کا درجہ رکھتے ہیں اس بنیاد پر بلا خوف و تردید یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ ان علماء کی طرح علامہ خمینی بھی تحریف قرآن کا عقیدہ رکھتے ہیں۔

(۲) ہندوستان کے ایک شیعہ عالم نے ''تحفۃ العوام'' کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے، یہ کتاب بھی شیعوں کی دیگر تالیفات کی طرح الف لیلوی داستانوں سے پر ہے اس کتاب کی توثیق و تصدیق عصر حاضر کے فرقہ شیعہ کے پانچ آیات اللہ نے کی ہے جن کے اسماء یہ ہیں: (۱) آیت اللہ العظمٰی محسن حکیم طباطبائی مجتہد اعظم نجف اشرف (۲) آیت اللہ العظمٰی ابو القاسم مغربی نجف اشرف (۳) آیت اللہ العظمٰی روح اللہ خمینی (۴) آیت اللہ العظمٰی محمود الحسینی الشابرودی (۵) آیت اللہ العظمٰی محمد کاظم شریعت مداری۔ ان پانچ آیت اللہ کے علاوہ چھٹے مصدق سید العلماء علامہ سید علی نقی النقوی مجتہد لکھنو ہیں۔ اس کتاب کے صفحہ ۴۲۲ پر ایک دعا لکھی ہوئی ہے جسے لکھتے ہوئے قلم کانپ رہا ہے۔ بر بنائے ضرورتِ تحقیق ''نقل کفر کفر نہ باشد'' کو پیش نظر رکھتے ہوئے دل پر جبر کر کے لکھ رہا ہوں۔ دعاء کے الفاظ ملاحظہ فرمائیں۔

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم اللھم العن صنمی قریش وجبتیھما و طاغوتیھما وافکیھما وابنتیھما الذین خالفا امرك وانکرا وحیك وعصیا رسولك وقلّبا دینك وحرّفا کتابك.

بسم اللہ الخ اے اللہ لعنت بھیج قریش کے دونوں بتوں، شیطانوں، سرکشوں اور افترا پردازوں اور ان دونوں کی دونوں بیٹیوں پر جنھوں نے آپ کے

حکم کی مخالفت کی، آپ کی وحی کا انکار کیا۔ آپ کے رسول کی نافرمانی کی، آپ کے دین کو بدل دیا اور آپ کی کتاب قرآن میں تحریف کر دی۔

(نعوذ باللہ واستغفراللہ)

آپ جانتے ہیں کہ قریش کے یہ دونوں، صنم، جبت، طاغوت، افّاک، اور ان دونوں کی دو بیٹیاں کون ہیں، ان میں اوّل یارِ غار رسول ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں، جنھیں قرآن اتقی (سب سے بڑے متقی) اور نبیٔ صادق و مصدوق افضل الناس بعد الانبیاء (حضرات انبیاء کے علاوہ تمام بنی آدم سے بزرگ) فرماتے ہیں اور دوسرے حضرت فاروق اعظم عمر رضی اللہ عنہ ہیں، جن کے متعلق خاتم النّبیین ...... کا ارشاد گرامی ہے ”لو کان بعدی نبیٌ لکان عمر“ اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو عمر ہوتے۔ اور ان دونوں حضرات کی دونوں بیٹیوں میں ایک ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا جنتی عورتوں کی سردار اور دوسری ام المومنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہما ہیں، یہ ہیں شیعوں کے نزدیک نعوذ باللہ، بت، شیطان، سرکش اللہ اور اس کے رسول کے نافرمان، دین اسلام کو بدل دینے اور قرآن کریم میں تحریف کر دینے والے، جس کتاب میں یہ کفریہ دعا لکھی ہوئی ہے علامہ خمینی اس کی تصدیق و توثیق کر کے اپنے معتقدین کو ترغیب دیتے ہیں کہ اس سے استفادہ کیا جائے کیا یہ تائید و توثیق اس بات کا کھلا ثبوت نہیں ہے کہ خمینی صاحب بھی اسی عقیدہ کے پابند ہیں۔ ورنہ اس کی توثیق کے بجائے تکذیب و تضلیل کرتے۔ ممکن ہے کہ آپ کے ذہن میں یہ اشکال پیدا ہو کہ اس عبارت میں تو حضرت صدیق اکبر اور فاروق اعظم کا نام ذکر نہیں کیا گیا ہے پھر صنما قریش سے ان دونوں بزرگوں کو کیسے سمجھ لیا گیا؟ تو اس سلسلے میں عرض ہے کہ اگر آپ کے پیش نظر ان ہر دو خلفاء راشد کے بارے میں شیعوں کی روایتیں ہوں تو یہ اشکال کبھی پیدا نہ ہوگا۔

ان دو واضح قرائن کے بعد خمینی صاحب کی ایک عبارت بھی ملاحظہ کرتے چلئے۔ اپنی کتاب تحریر الوسیلہ کے صفحہ ۱۵۲، ج: ۱ پر مسجد سے متعلق احکامات کے ضمن میں لکھتے ہیں ”ویکرہ تعطیل المسجد وقد ورد انہ مِن الثلاثۃ الذین یشکون الی اللہ عزوجل“

مسجد کا معطل کرنا مکروہ ہے اور روایت میں آیا ہے کہ مسجد بھی ان تین میں سے ایک ہے جو اللہ تعالیٰ کے حضور شکایت کریں گے۔ علامہ خمینی نے ”وقد ورد انه من الثلاثة“ سے مسئلہ تحریف قرآن کی جانب اشارہ کیا ہے مگر اس انداز سے کہ جو لوگ مذہب شیعہ اور ان کی مرویات سے واقفیت رکھتے ہیں۔ وہی اسے سمجھ سکیں گے۔ انھوں نے ”قد ورد“ سے جس روایت کی جانب اشارہ کیا ہے وہ مذہب شیعہ کی مشہور کتاب الخصال مصنفہ الشیخ الصدوق ابن بابویہ کی جلد ۱، صفحہ ۱۷۴ و ۱۷۵ میں ان الفاظ کے ساتھ موجود ہے۔

یجئ یوم القیامة ثلاثة یشکون الی اللّٰہ عزوجل المصحف والمسجد والعترة یقول المصحف یا رب حرّقونی ومزقونی الخ

> قیامت کے دن قرآن، مسجد، اور اہل بیت رسول اللہ کے دربار میں حاضر ہوکر اپنی شکایت پیش کریں گے قرآن کریم عرض کریگا اے میرے رب مجھے لوگوں (یعنی ابوبکر، عمر، عثمان رضی اللہ عنہم) نے جلایا اور ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔

اس روایت میں اجمال واختصار کے ساتھ شیعوں کے اس اعتقاد کی ترجمانی کی گئی جو وہ صحابۂ کرام کے بارے میں رکھتے ہیں کہ انھوں نے قرآن کی تحریف کر کے ان آیات کو اس میں سے نکال دیا جو فضائل امیر المومنین یا اہل بیت میں نازل ہوئی تھیں یا جن میں لوگوں کو اہل بیت کی اعانت واتباع کی ترغیب دلائی گئی تھی اور سب پر ان کی اطاعت کو واجب قرار دیا گیا تھا۔ اور کہتے ہیں کہ تمام صحابہ نے رسول اللہ...... کی نصیحت کے خلاف اتفاق کر کے اہل بیت کا حق غصب کیا اور ان پر ظلم وتشدد ڈھایا: (العیاذ باللہ) (۱)

قرآن ہر قسم کی ترمیم وتحریف سے پاک ہے

شیعوں کا یہ عقیدہ تحریف قرآن عقیدۂ امامت سے بھی بدتر ہے لیکن حقیقت میں اسی عقیدہ کا لازمی نتیجہ ہے جیسا کہ اس کی جانب پہلے بھی اشارہ کیا جا چکا ہے ان کے اس عقیدے کا بطلان اس درجہ واضح ہے کہ مسلمان تو مسلمان آج تک کسی بد سے بدتر مخالف

---

(۱) تحفہ اثنا عشریہ اُردو ترجمہ، ص: ۷۵، ۷۶۔

اسلام کو بھی یہ کہنے کی جرأت نہیں ہوئی کہ یہ قرآن مقدس جو مسلمانوں کے پاس ہے وہ اصلی نہیں ہے بلکہ اس میں حذف واضافہ، اور تغیر وتبدل کر دیا گیا ہے، لیکن شیعہ اسلام کا نام لے کر اسلام دشمنی میں یہ قبیح حرکت کر رہے ہیں "قاتلهم الله انى يؤفكون"

ذیل میں اختصار کے ساتھ ان کے اس خرافی عقیدے کے باطل اور غلط ہونے کے دلائل پیش کئے جا رہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

(۱) اِنَّا نَحنُ نَزّلنَا الذِّکرَ وَاِنَّا لَہٗ لحافِظُونَ.

ہم نے ہی نازل کیا ہے قرآن کو اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔

مفسر قرآن علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اس آیت کریمہ کے فوائد میں لکھتے ہیں: "یاد رکھو اس قرآن کے اتارنے والے ہم ہیں اور ہم ہی نے اس کی ہر قسم کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے جس شان اور ہیئت سے وہ اترا ہے بدون ایک شوشہ یا زبر زیر کی تبدیلی کے چار دانگ عالم میں پہنچ کر رہے گا اور قیامت تک ہر طرح کی تحریف لفظی ومعنوی سے محفوظ ومصئون رکھا جائے گا۔

پھر آگے چل کر لکھتے ہیں حفاظت قرآن کے متعلق یہ عظیم الشان وعدۂ الٰہی ایسی صفائی اور حیرت انگیز طریقہ سے پورا ہو کر رہا جسے دیکھ کر بڑے بڑے متکبر ومغرور مخالفوں کے سر نیچے ہو گئے۔ "میور" بارہویں صدی ہجری کا (مشہور عیسائی مصنف) کہتا ہے جہاں تک ہماری معلومات ہے دنیا بھر میں ایک بھی ایسی کتاب نہیں جو قرآن کی طرح بارہ صدیوں تک ہر قسم کی تحریف سے پاک رہی ہو"

ایک اور یورپین محقق لکھتا ہے کہ ہم ایسے ہی یقین سے قرآن کو بعینہٖ محمد (......) کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ سمجھتے ہیں۔ جیسے مسلمان اسے خدا کا کلام سمجھتے ہیں الخ (۱)

علامہ سید محمود آلوسی بغدادی اس آیت پاک کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

اى من كل ما يقدح فيه كالتحريف والزيادة والنقصان وغير ذلك حتىٰ

---

(۱) فوائد عثمانی، ص: ۳۳۹، ۳۴۰۔

ان الشیخ لو غیر نقطة یرد علیه الصبیان... وجوز غیر واحد ان یراد حفظه بالاعجاز فی کل وقت کما یدل علیه الجملة الاسمیة من کل زیادة ونقصان وتحریف وتبدیل ولم یحفظ سبحانه تعالیٰ کتابا من الکتاب بل استحفظها جلّ وعلا الربانیین والاحبار فوقع فیها ما وقع وتولی حفظ القرآن بنفسه سبحانه فلم یزل محفوظا اولا وآخرا.(۱)

(یعنی اللہ تعالیٰ قرآن کی حفاظت فرماتے ہیں ہر اس چیز سے جو اسے عیب دار بنادے جیسے تحریف، زیادتی، کمی وغیرہ حتی کہ اگر کوئی شیخ محترم قرآن کے ایک نقطہ میں تغیر کردے تو طفل مکتب بھی اسے ٹوک دے گا (چند سطروں کے بعد لکھتے ہیں) بہت سے مفسرین کی رائے ہے کہ یہ حفاظت معجزانہ طور پر ہمیشہ کیلئے ہے جیسا کہ جملہ اسمیہ اس استمرار پر دلالت کررہا ہے، اور یہ حفاظت ہر قسم کی زیادتی، کمی، تحریف اور تبدیل سے ہے اللہ تعالیٰ نے کسی بھی کتاب کی خود حفاظت نہیں فرمائی بلکہ اس کی حفاظت کا حکم علما اور احبار کو دیا تو اس میں وہ سب کچھ پیش آیا جو معلوم ہے لیکن قرآن مجید کی حفاظت کی ذمہ داری خود باری تعالیٰ نے اپنے ذمہ لے لی اسی لئے وہ ابتدائے نزول سے آخر تک ہمیشہ سے محفوظ مصئون ہے۔)

قدرے الفاظ کے فرق کے ساتھ یہی تفسیر قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ صاحب مظہری نے بھی کی ہے۔(۲)

(۲) وَلَا یاتِیهِ البَاطِلُ مِنۡ بَیۡنَ یَدَیۡهِ وَلَا مِنۡ خَلۡفِهٖ تَنۡزِیۡلٌ مِنۡ حَکِیۡمٍ حَمِیۡدٍ.
اسکے پاس باطل کسی سمت سے بھی نہیں آسکتا اتارا ہوا ہے حکیم حمید کی طرف سے۔
امام زجاج اس آیت پاک کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

معناه انه محفوظ من ان ینقص منه فیاتیه الباطل من بین یدیه اویزاد فیه فیاتیه الباطل من خلفه.(۳)

---

(۱) روح المعانی، ج:۱۴، ص:۶۔ (۲) تفسیر مظہری، ج:۵، ص:۲۹۳۔

(۳) المظہری، ج:۸، ص:۳۰۱۔

(اس آیت کریمہ کا معنی یہ ہے کہ قرآن محفوظ ہے اس بات سے کہ اس میں کمی کی جائے کہ باطل سامنے سے آئے یا زیادتی کی جائے کہ باطل پیچھے سے آئے۔)

علامہ آلوسی لکھتے ہیں:

صفة اخرى لكتاب ومن بين يديه ولا من خلفه كنايه عن جميع جهاته كالصباح والمسا. كناية عن الزمان كله اى لا يتطرق الباطل من جميع جهاته

(۳) لا يانيه الباطل الخ یہ کتاب کی صفت ثانی ہے اور من یدیہ ولا من خلفہ یعنی اس کے آگے سے نہ اس کے پیچھے سے بطور کنایہ کے تمام جہتیں مراد ہیں۔ جیسے الصباح والمساء بول کر پورا وقت مراد لیا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قرآن میں باطل کسی سمت سے بھی داخل نہیں ہوسکتا یہی تفسیر مدارک التنزیل اور تفسیر کبیر میں بھی ہے۔(۱)

ان دونوں آیات قرآنیہ اوران کی تفسیروں سے کھل کر یہ بات سامنے آگئی کہ قرآن کریم اپنے ابتداء نزول سے آج تک اپنی تنزیلی حالت میں چلا آرہا ہے اور ہر قسم کی تحریف وتبدیل سے پاک اور بری ہے کیوں کہ اللہ تعالیٰ خود اس کتاب مقدس کی حفاظت وصیانت کر رہا ہے اور جس چیز کی حفاظت اللہ سبحانہ تعالیٰ خود فرمائیں، کسے طاقت وقدرت ہے کہ اس میں تحریف وترمیم کردے۔ چنانچہ ایک مرتبہ مشہور ظالم حکمراں حجاج نے حضرت عبداللہ بن زبیر پر یہ الزام تراشی کرتے ہوئے کہا۔

انّ ابن الزبير بدّل كلام الله فقام ابن عمر فقال كذب لم يكن ابن الزبير يستطيع ان يبدل كلام الله ولا انت.(۲)

ابن زبیر نے قرآن میں تبدیلی کردی یہ سنتے ہوئے حضرت عبداللہ بن عمر کھڑے ہوگئے اور فرمایا کہ قرآن میں تبدیلی کرنے کی نہ ابن زبیر میں طاقت تھی اور نہ تجھ میں ہے۔

(۳) ان دلائل سے قطع نظر اگر اس بات پر غور کیا جائے کہ اسلامی دنیا میں جس قدر حفاظ وقاری ہیں وہ سب کے سب اسی قرآنِ محکم اور کتاب مقدس کی سماعت کو مختلف

---

(۱) مدارک، ج:۴، ص:۳۰۷ وتفسیر کبیر، ج:۵، ص:۲۵۷۔

(۲) تذکرۃ الحفاظ امام ذہبی، ج:۳۴

واسطوں سے آنحضرت ...... تک پہنچاتے ہیں اور ہر حافظ کی سند کا آخری شخص اسی قرآن کو بلا کسی تغیر و تبدل اور کمی و بیشی کے اپنی سماعت آنحضرت ...... سے بیان کرتا ہے تو جب دنیا کے تمام حفاظ اسی موجودہ قرآن کی سند کو بعینہٖ اسی ترتیب والفاظ سے آنحضرت ...... تک پہنچاتے ہیں اور پھر یہ سلسلے اور سندیں اس کثرت سے ہیں کہ تواتر کی حدود سے بھی بہت زیادہ آگے بڑھ گئے ہیں تو بدیہی طور پر یہ تواتر اس امر پر قطعی حجت اور یقینی شہادت ہے کہ یہ قرآن بعینہٖ وہی ہے جو آنحضرت ...... پر نازل ہوا تھا اور آپ نے صحابہ کو اسی کی تعلیم دی تھی اور اپنے بعد اسی کو چھوڑا تھا۔ لہٰذا علم ویقین کی یہ عمارت جو تواتر کے بلند پہاڑ کی مضبوط چٹان پر قائم ہے اس سے وہ آبگینہ جس کا خمیر خود ساختہ اور فرضی اماموں کے جعلی اقوال سے تیار کیا گیا ہے ٹکرائے تو بجز اس کے کہ خود پاش پاش ہو جائے اس مستحکم عمارت کو کسی قسم کا صدمہ نہیں پہنچا سکتا۔ یہ تواتر کی روشنی ایسی صاف، لطیف اور تیز ہے کہ اس کے مقابلے میں شیعی روایتوں کے بے نور چراغ تقیہ کی چادر اوڑھ کر نظروں سے اس طرح روپوش ہو گئے ہیں کہ عصر حاضر کے شیعوں اور ان کے مجتہدوں کو اس چادر کذب وفریب کو ان کے تاریک چہرے سے اٹھانے کی ہمت وجرأت نہیں ہو رہی ہے بالکل سچ ہے دروغ را فروغ نیست۔

انقلاب ایران کے داعیٔ اکبر اور عظیم رہنما و لیڈر علامہ خمینی کے ان مذکورہ معتقدات کے پیش نظر اس انقلاب کو ''اسلامی انقلاب'' کسی طرح بھی نہیں کہا جا سکتا ہے، بلکہ یہ خالص شیعی انقلاب ہے جس کا دین اسلام سے صحیح معنوں میں کوئی واسطہ نہیں ہے۔

☆ ☆ ☆

عقائد اہل سنت والجماعت وعقائد شیعہ

ایک تقابلی مطالعہ

عقائد اہلسنّت والجماعت در باب الٰہیات

اس باب میں اہل سنت والجماعت سے ۲۲ عقائد میں شیعہ مختلف ہیں۔ جن میں سے بعض یہ ہیں۔ (عقائد اہل سنت والجماعت)

(۱) اللہ تعالیٰ کی معرفت میں غور وفکر کرنا شرعاً واجب ہے، نہ کہ عقلاً یعنی قطع نظر حکم خداوندی کے از روئے عقل معرفتِ خداوندی میں غور وفکر واجب نہیں ہے۔

(۲) اللہ تعالیٰ حیات کے ساتھ زندہ ہے۔ علم کے ساتھ عالم ہے، قدرت کے ساتھ قدیر ہے یعنی جس طرح ان اسماء کے مشتقات کا اطلاق اللہ تعالیٰ پر درست ہے اس طرح خود ان اسماء کا بھی اطلاق صحیح ہے۔

(۳) اللہ تعالیٰ ہر چیز کو اس کے وجوب سے پہلے جانتا ہے یہی تقدیر کا مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں ہر شے کا اندازہ ہے کہ یہ ایسی اور ویسی ہوگی اور اسی کے مطابق وہ چیز اپنے وقت معین پر وجود میں آتی ہے۔

(۴) قرآن پاک اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اس میں تحریف یا کمی وزیادتی نہ اب تک ہوئی ہے اور نہ آئندہ ہو سکے گی!۔

(۵) حق تعالیٰ کے لئے بدا جائز نہیں ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ ایک چیز کا ارادہ فرمائے پھر اس کو اس کے خلاف مصلحت نظر آئے جو پہلے معلوم نہ تھی لہٰذا پہلے ارادہ کو ترک کر کے دوسرے ارادہ کو اختیار کرے۔ کیونکہ اگر اسے اللہ تعالیٰ کے لئے جائز قرار دیا جائے تو لازم

آئے گا کہ امور کے نتائج سے وہ واقف نہیں ہے اور نعوذ باللہ ناعاقبت اندیش ہے۔

رسالہ اعلام الہدیٰ فی تحقیق البداء میں ''بدا'' کی تحقیق یوں کی گئی ہے۔

"یقال بدا له اذا ظهر له رَایٌ مخالف للرای الاول وهو الذی حققه الشیخ فی العمدة وابوالفتح الکراجکی فی کنزل الفوائد والذی حققه المرتضی فی الذریعة ویشعر به کلام الطبرسی وهو ان معنیٰ قولنا بداله تعالیٰ انه ظهر له من الامر مالم تکن ظاهرا" الی آخرہٖ .

ان تحقیقات کے نقل کرنے کے بعد صاحب اعلام الہدیٰ نظام الدین جیلانی یکے از محققین شیعہ ان ... کا خلاصہ یوں نقل کرتے ہیں۔ الحاصل ان علمه سُبحَانَه بالحوادث حادث علی ما دلّ علیه الاحادیث والآیة المذکورة ونظائرها وصرح به المرتضیٰ والطبرسی والمقداد قدس اللّٰه ارواحهم یعنی حوادث کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا علم قدیم نہیں ہے۔

(۶) اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے کسی کے کفر و گمراہی پر راضی نہیں ہوتا جیسا کہ ارشاد ہے لا یرضیٰ لعباده الکُفرَ.

(۷) اللہ تعالیٰ پر کوئی چیز واجب نہیں ہے۔

(۸) آخرت میں اللہ تعالیٰ کی رویت ہوگی۔

عقائد اثنا عشریہ

(۱) اللہ تعالیٰ کی معرفت میں غور و فکر کرنا عقلاً واجب ہے، یعنی قطع نظر شرع کے از روئے عقل ہر مکلّف پر واجب ہے کہ خدا کو پہچانے۔ یہ عقیدہ اَلا لهُ الحُکم، لا مَعقبَ لحکمهٖ وَمَا کنت معذبین حتّٰی نبعث رسُولا کے خلاف ہے کیونکہ اگر بتقاضائے عقل کوئی چیز واجب ہوتی تو رسول اللہ کی بعثت سے پہلے عذاب دیا جاسکتا تھا۔

(۲) امامیہ کے نزدیک اللہ تعالیٰ صفات سے عاری ہے۔ البتہ ان صفات کے مشتقات اس کی ذات پر بولے جاسکتے ہیں۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کو حیٌّ، سمیع، بصیر، علیم وغیرہ کہنا

جائز ہے لیکن اس کے لئے علم، قدرت، سمع اور بصر کا اطلاق درست نہیں۔ ان کا یہ عقیدہ عقل کے خلاف ہونے کے ساتھ قرآن کے بھی مخالف ہے۔ کیونکہ بہت سی آیات سے باری تعالیٰ کے لئے ان صفات کا ثبوت ہوتا ہے مثلاً "وَلَا یُحِیۡطُوۡنَ بشیءٍ مِنۡ عِلۡمِہٖ" "اَنزله بِعلمٍ" وغیرہ۔

(۳) اثنا عشریہ کے مقدمین ومتأخرین کی ایک جماعت (جن میں مقداد کنز العرفان کا مصنف بھی شامل ہے) کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جزئیات کو ان کے وجود سے پہلے نہیں جانتا یہ عقیدہ قرآن کے سراسر خلاف ہے کیونکہ ارشاد خداوندی ہے۔ اِنَّ اللّٰہ بکلِّ شیءٍ عَلِیۡم، قد احاط بکل شیءٍ علماً، ما اصاب من مُصیبة فی الارض وَلا فی انفسکم الاّ فی کتاب من قبل ان نبرأھا، انا کل شییءٍ خلقناہ بقدر، ولارطب ولا یأبس الا فی کتاب مبین، الم غلبت الروم فی ادنی الارض وھم من بعد غلبھم سیغلبون. اور یہ آیت فارس پر رُوم کے غلبہ سے پہلے کی ہے۔

(۴) اثنا عشریہ کلام مجید میں تحریف اور کمی وزیادتی کے قائل ہیں۔ یہ عقیدہ انا انزلنَاہ الذکر وانا لہٗ لحافظون۝ اور آیت شریفہ لا یأتیه الباطل من بین یدیه ولا من خلفه تنزیل من حکیم حمید کے بالکل خلاف ہے۔

(۵) فرقہ امامیہ جو اثنا عشریہ کی ایک شاخ ہے اور خود اثنا عشریہ بھی بدا کے قائل ہیں۔ چنانچہ کلینی میں زراہ بن امین سے مروی ہے کہ اللہ کے پاس بدا سے بہتر کوئی چیز نہیں ہے۔ ایک دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں ما عظّم اللّٰہ بمثل البدا۔ اور ابن صلت رضا علیہ السلام سے ناقل ہے کہ ما بعث اللّٰہ نبیًّا قط الاّ یتحرم الخمر وان یقرء له البدا.

شیعوں کے نزدیک بدا اپنی ہر سہ اقسام بدا فی الاخبار، بدا فی التکوین، بدا فی التکلیف اللہ تعالیٰ کے لئے جائز بالفاظ دیگر بدا فی العلم، بدا فی الارادہ، بدا فی الحکم اللہ کیلئے ثابت ہے۔

(۶) اثنا عشریہ کہتے ہیں کہ وہ شیعہ کے علاوہ دوسروں کے کفر پر راضی ہے چنانچہ صاحب محاسن نے امام موسیٰ کاظم سے یہ روایت نقل کی ہے کہ لا تعلّموا ھذا الخلق

اصول دینھم وارضوا لھم بما رضی اللّٰہ لھم من الضلال.

(۷) شیعہ سب کے سب متفق ہیں کہ بتقاضائے عقل بہت سی چیزیں اللہ تعالیٰ پر واجب ہیں۔ گویا عقل کارخانہ قدرت میں شریک ٹھہری، اور خدا عقل کا محکوم، یہ خیال مرتبۂ الوہیت وربوبیت کے سراسر منافی ہے۔

(۸) شیعہ میں مجسمہ فرقہ کے علاوہ سب متفق الخیال ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو دیکھا نہیں جا سکتا ہے ان کا یہ عقیدہ آیت پاک وجوہ یومئذ ناضرة الی ربّھا ناظرة وغیرہ آیات کے بالکل خلاف ہے۔ شیعہ کے پاس اس مسئلہ میں عقل کے علاوہ کوئی دلیل نہیں ہے وہ غائب کو ظاہر پر قیاس کرتے ہیں جو انتہائی گستاخی اور بے ادبی کی بات ہے کہ اپنی ناقص عقل کو انھوں نے آیت قرآنیہ کے مقابلہ میں ترجیح دی۔

عقائد اہل سنت والجماعت درباب رسالت

پندرہ عقیدوں میں اختلاف ہے۔

(۱) صرف اہل سنت والجماعت ہی نہیں بلکہ تمام اسلامی فرقوں کا یہ متفقہ عقیدہ ہے کہ جملہ حضرات انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام مخلوقات میں سب سے افضل اور بزرگ ہیں ثواب اور قرب رتبہ میں ان کی ہمسری کوئی بھی نہیں کرسکتا۔ چہ جائیکہ ان سے افضل ہو۔

عقائد شیعہ اثنا عشریہ

جب کہ امامیہ کے نزدیک حضرت علیؓ اولوالعزم انبیاء کے علاوہ تمام نبیوں سے افضل ہیں اس عقیدہ کا کتاب وسنت کے خلاف ہونا بالکل ظاہر ہے۔ جس پر دلیل قائم کرنے کی ضرورت نہیں چنانچہ شیعوں کا فرقہ زیدیہ خود اس مسئلہ میں امامیہ اثنا عشریہ کا مخالف ہے اور علمائے زیدیہ نے ان کی پُرزور تردید کی ہے۔ امامیہ کا اپنے ائمہ کے بارے میں غلو کی چند مثالیں۔

(۱) یہ کہتے ہیں کہ انبیاء کی پیدائش ائمہ کے ضمن میں ہے اور عارضی ہے اصل مقصد

ائمہ کو پیدا کرنا ہے۔

(۲) حق تعالیٰ نے ائمہ کی اطاعت پر فرشتوں اور نبیوں سے عہد لیا ہے اور اس سلسلے میں وہ متعدد روایتیں بیان کرتے ہیں۔ جن میں سے ایک یہ ہے۔ جسے شیخ ابن بابویہ نے ذکر کیا ہے۔ انه لمّا اسری به و کلّمه ربّه قال بعد کلام انك رسولی الی خلقی وان علیا ولی امر المُومنین اخذت میثاق النبیین وملائکتی وجمیع خلقی بولایته. ابن صفار نے بھی اس باب میں ایک روایت ان الفاظ میں نقل کی ہے۔ ان الله اخذ میثاق النبیین بولایة علی بن ابی طالب. ان روایتوں کی تضعیف وتکذیب کی ہمیں ضرورت نہیں۔ کیونکہ خود ان کے ایک مشہور عالم شریف مرتضیٰ نے جو علم الہدیٰ کے لقب سے یاد کئے جاتے ہیں اپنی کتاب الدرر والغرر میں ان میثاق کی روایتوں کی بڑی شدومد سے تکذیب کی ہے۔ و کفی اللّٰه المؤمنین القتال.

(۳) کہتے ہیں کہ انبیاء نے ائمہ کے انوار سے اقتباس نور کیا ہے۔ حالانکہ یہ بات عقل کے قطعاً خلاف ہے کہ اگلا پچھلے کی اقتدا کرے اور ان سے فیض حاصل کرے۔ اور اس باب میں بھی انھوں نے ابن بابویہ کی زنبیل سے ایک روایت ابومحمد حسن عسکری کی جانب منسوب کر کے نکال لی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں۔ اعوذ باللّٰه من قومٍ حذفوا محکمات الکتاب و نسوا رب الارباب والنبیٔ وساقیٔ الکوثر یوم حسَاب ونطی الطامة الکبریٰ ونعیم دارالمتقین فنحن السام الاعظم وفینا النبوة والولایة والکرم فنحن منار الهدیٰ والعروة الوثقٰی والانبیاء کانوا یقتبسون من انوارنا ویقتفون آثارنا وسیظهر حجة اللّٰه علی الخلق وَالسیفُ المسلول لاظهار الحق۔ اس عبارت کا جعلی اور من گھڑت ہونا بالکل ظاہر ہے۔

(۴) کہتے ہیں کہ بروز قیامت حضرات امیر اور ائمہ کا درجہ بلند و بالاتر ہوگا۔ چنانچہ ابن بابویہ معانی الاخبار میں یہ روایت ذکر کرتا ہے کہ حضرت امیر نے فرمایا۔ انا یوم القیامة علی الدرجة الرفیعة دون درجة النبی واما الانبیاء والرسل فدوننا علی المراقی .

عقائد اہل سنت والجماعت

رسالت: (۲) حضرات انبیاء دروغ گوئی اور بہتان طرازی سے عمداً، سہواً بعد از نبوت وقبل از نبوت ہر حیثیت سے پاک اور مبرا ہیں۔

(۳) حضرات انبیاء کا قبل از بعثت اور بعد از بعثت واجبات ایمان سے واقف ہونا ضروری ہے کیونکہ عقائد میں جہالتِ کفر وزندیقیت کا سبب ہے اور یہ ممکن نہیں کہ حضرات انبیاء (نعوذ باللہ) اس قسم کی جہالت میں رہیں۔ ہاں نزول وحی سے پہلے احکام شرعیہ سے انہیں لاعلمی ہوتی ہے چنانچہ اسی کی طرف اشارہ ہے وعلّمك مالم تكن تعلم، و كُلاّ آتينٰه حكماً وعلما. وآتينٰه الحكم صبييًا، وآتيناهُ الحكمة وفصل الخطاب، اور بعض مقامات پر اس مضمون کے بعد بعثت، رسالت، وحی، نزول کتاب کا ذکر آیا ہے۔ بلکہ حضرت لقمان کے حق میں حکمت کا لفظ آیا ہے۔ جن کے پاس نہ وحی آئی اور نہ انھیں نبوت ملی۔

(۴) کسی نبی نے ادائیگی فرائض رسالت سے معافی نہیں چاہی اور نہ احکام خداوندی کی بجا آوری سے معذرت چاہی۔

(۵) حضرت محمد رسول اللہ خاتم النّبیین ...... کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرشتہ کو کسی کے پاس پیغام رساں بنا کر نہیں بھیجا۔ اور سلسلۂ وحی ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔

(٦) کوئی امام اس بات کا مجاز نہیں ہے کہ احکام شرعیہ میں سے کسی حکم کو منسوخ یا تبدیل کر دے۔

عقائد اثنا عشریہ

رسالت: امامیہ کہتے ہیں کہ انبیاء کیلئے کذب جائز ہے اور بلحاظ تقیّہ واجب ہے۔

(۳) امامیہ کا عقیدہ ہے کہ بعثت کے وقت بلکہ بوقت مناجات (جو جناب باری تعالیٰ سے بشری قرب کا اعلیٰ ترین مقام ہے) حضرات انبیاء کو اصول عقائد کی معرفت حاصل نہیں ہوتی دلیل میں محمد بن یعقوب کلینی کی کافی میں بیان کردہ روایت پیش کرتے

ہیں جسے کلینی نے ابوجعفر کے حوالہ سے نقل کیا ہے۔ الفاظ یہ ہیں: ان موسی ابن عمران صلوٰت اللّٰہ و سلامه علیه سأل اللّٰہ تعالیٰ یا رب بعید انت منی فانادیك ام قریب فاناجیك، اس سے پتہ چلتا ہے کہ مناجات کے وقت باری تعالیٰ کے قرب و بعد مکانی سے پاک ہونے کا انھیں علم نہیں تھا۔

(۴) امامیہ کہتے ہیں کہ بعض اولوالعزم رسولوں نے ذمہ داریٔ رسالت سے سبکدوشی حاصل کرنی چاہی ہے اور ٹال مٹول، حیلے حوالے اور عذر کئے ہیں۔

حالانکہ رسالت سے معافی وحی کو رد کرنا اور حکم خداوندی کو تسلیم نہ کرنا ہے۔ جبکہ انبیاء اس سے معصوم ہیں۔

(۵) امامیہ کا عقیدہ ہے کہ حضرت امیر کے پاس وحی آتی تھی آپ کی اور رسول اللہ ......کی وحی میں صرف اتنا فرق ہے کہ آنحضرت ......کو فرشتہ دکھائی دیتا تھا اور حضرت امیر اس کی صرف آواز سنتے تھے دیکھتے نہ تھے۔ چنانچہ کافی میں سجاد علیہ السلام سے کلینی نے نقل کیا ہے کہ۔ ان علی بن ابی طالب کان محدثا وھو الذی یرسل اللّٰہ الیه الملك فیکلّمه ویسمع الصوت ولا یری الصورة.

اثنا عشریہ کا عقیدہ یہ ہے کہ امام کو احکام میں تبدیلی کا حق حاصل ہے۔ یہ عقیدہ عقل و نقل دونوں کے خلاف ہے۔ کیونکہ امام تو دراصل پیغمبر کا نائب اور اس کی شریعت کی اشاعت کرنے والا ہوتا ہے۔ اگر اس کو احکام میں ردّ و بدل کرنے کا اختیار دے دیا جائے تو یہ اس کا مخالف ہو جائے گا نہ کہ نائب۔

اور ظاہر ہے کہ شارع صرف اللہ تعالیٰ ہے چنانچہ ارشاد ہے۔ شرع لکم من الدین ما وصّی بہٖ نوحًا، ولکل جعلنا منکم شرعة ومنھاجاً.

عقائد اہل سنت والجماعت درباب امامت

اہل سنت کہتے ہیں کہ مکلفین پر واجب ہے کہ وہ اپنے میں سے کسی کو امیر منتخب کرلیں اور شریعت کی روشنی میں اس کی اتباع اپنے اوپر لازم جانیں اور امور شرعیہ میں اس

کی معاونت کریں۔ البتہ شارع نے امیر کے اوصاف، شرائط اور لوازم کو بیان کر دیئے ہیں تا کہ ان کی رعایت سے ریاست بدنظمی اور فتنہ وفساد کا شکار نہ ہو۔ شریعت کا قانون یہی ہے کہ وہ ان عمومی شرائط اور لوازم کی وضاحت کر دیتی ہے جو صلاح وفلاح کا باعث ہیں اور تعین وتخصیص عقل کے حوالہ کر دیتی ہے۔ چنانچہ نکاح کے باب میں منکوحہ کے اوصاف اور شرائط نکاح (کفائت، شہادت، مہر و ولایت) اور اس کے لوازم نان ونفقہ اور مکان وغیرہ کی تصریح کر دی گئی۔ اور منکوحات کے تعین کے بارے میں کوئی تعرض نہیں کیا گیا کہ فلاں کا نکاح فلاں سے اور فلاں کا فلاں سے کیا جائے۔ یہی حال تمام معاملات بلکہ امور دینیہ کا ہے چنانچہ فرمایا گیا۔ فاسئلوا اھل الذکر ان کنتم لاتعلمون اور علماء مجتہدین کی کوئی تخصیص نہیں فرمائی۔

(۲) امام کی امامت کیلئے اس کا ظاہر ہونا شرط ہے۔

(۳) امام کا علم واجتہاد میں خطا سے پاک ہونا ضروری نہیں ہے اور نہ گناہ سے معصوم ہونا شرط ہے۔ البتہ بوقت تقرر اس کا گناہ کبیرہ سے پاک ہونا اور صغیرہ پر اصرار سے بری ہونا چاہئے۔

(۴) امام کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اہل زمانہ میں سب سے افضل ہو۔ چنانچہ طالوت کو حق تعالیٰ نے خود اپنے حکم سے امام بنایا تھا حالانکہ حضرت شمویل اور خود حضرت داؤدموجود تھے۔ اور بلا شبہ یہ دونوں حضرات طالوت سے افضل تھے۔

(۵) جمیع اہل سنت کا عقیدہ ہے کہ آنحضرت ...... کے بعد بلا فاصلہ حضرت ابوبکر صدیق خلیفہ وامیر ہیں۔

عقائد اثنا عشریہ

(۱) امامیہ کہتے ہیں کہ امیر وامام کا مقرر کرنا خدا کے ذمہ واجب ہے۔

(۲) شیعہ امام کے ظاہر ہونے کی اس شرط کو نہیں مانتے۔

(۳) شیعہ کے نزدیک امام کا خطا سے پاک اور معصوم ہونا شرط ہے۔ یہ عقیدہ قرآن کے خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ اِنّ اللّٰہ قد بعث لکم طالوت ملکا. لہٰذا طالوت واجب الاطاعت امام ہوئے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو مقرر کیا حالاں کہ بالاجماع یہ معصوم نہیں ہیں۔

(۴) ان کے نزدیک امام کا اپنے زمانہ میں سب سے افضل ہونا ضروری ہے۔

(۵) شیعہ اس عقیدہ سے انکار کرتے ہیں۔ ان کے تمام فرقے اس انکار میں متفق ہیں وہ کہتے ہیں کہ امام بلا فاصلہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں۔ ابوبکر غاصب تھے۔

عقیدۂ اہل سنت والجماعت درباب معاد

(۱) قیامت کے دن بندوں کا زندہ کرنا اللہ تعالیٰ پر واجب نہیں ہے۔ البتہ اللہ تعالیٰ کے وعدہ کے مطابق بعث ونشر وقوع میں آنے والا امر ہے تاکہ وعدہ خلافی لازم نہ آئے۔

(۲) عذاب قبر حق ہے۔

(۳) مُردوں کی قیامت سے پہلے دنیا میں واپسی نہیں۔

(۴) اللہ تعالیٰ اپنے گنہگار بندوں میں سے جسے چاہے گا عذاب دے گا اس کو کسی فرقہ کا پاس ولحاظ اس سے روک نہ سکے گا۔ جیسا کہ فرمایا۔ یُعذّبُ مَن یّشآء وَیَرحَمُ مَنُ یّشآءُ.

عقائد اثنا عشریہ

(۱) امامیہ کے نزدیک بعث ونشر اللہ پر واجب ہے الٰہیات کے باب میں گذر چکا کہ اللہ تعالیٰ پر کوئی چیز واجب نہیں ہے۔

(۲) شیعہ کے اکثر فرقے حتیٰ کہ زیدیہ بھی عذاب قبر کے منکر ہیں۔ حالانکہ قرآن و حدیث سے یہ ثابت ہے۔ اور اس باب میں احادیث تواتر معنوی تک پہنچی ہوئی ہیں۔

(۳) امامیہ سب کے سب اور رافضیوں کے اکثر اس کے قائل ہیں۔ چنانچہ یہ کہتے ہیں کہ پیغمبر، وصی سبطین اور ان کے دشمن یعنی ہر سہ خلفاء، معاویہ، یزید، مروان اور دوسرے ائمہ اور ان کے متبعین حضرت مہدی کے ظہور کے بعد زندہ ہوں گے اور حادثہ دجّال سے پہلے ان سب قصورواروں کو عذاب دیا جائے گا۔ اور ان سے قصاص لیا جائے گا۔ پھر وہ مرجائیں گے اور قیامت میں پھر زندہ کئے جائیں گے۔ یہ عقیدہ بھی باطل ہے۔ خود فرقہ زیدیہ نے اس عقیدہ کی پُر زور تردید کی ہے۔

(۴) امامیہ کا متفقہ اور اجماعی عقیدہ ہے کہ کسی امامیہ کو گناہ صغیرہ اور گناہ کبیرہ کسی پر بھی عذاب نہ دیا جائے گا۔ اسی لئے وہ ترک واجبات اور ارتکاب معاصی پر جری ہوتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ نجات اور خلاصی کے لئے حضرت علی کی محبت کافی ہے۔ دراصل یہ عقیدہ یہود سے لیا گیا ہے۔

اثنا عشریہ کا عقیدہ یہ بھی ہے کہ ان کے علاوہ تمام فرقے شیعہ وغیر شیعہ کے دوزخ میں رہیں گے ناجی صرف اثنا عشریہ ہیں۔ ان کا مشہور مذہب یہی ہے۔ ابن مطہر حلی شرح تجرید میں لکھتا ہے کہ ان فرقوں کے بارے میں ہمارے علماء میں اختلاف ہے بعض کہتے ہیں کہ وہ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے اور بعض کہتے ہیں کہ انھیں دوزخ سے نکال کر بہشت میں لایا جائے گا۔

☆ ☆ ☆

شیعیت کا یہود نواز کردار

فرقہ شیعہ دَراصل یہودیت کی پیداوار ہے۔ جس طرح سینٹ پال و پولوس رسول، یہودی نے ازارہ تعصب مسیحیت کا لبادہ اوڑھ کر دین مسیحؑ کی صداقت اور عقیدۂ توحید کو وثنیت اور شرک سے آلودہ کر دیا۔ ٹھیک اسی طرح صنعاء کے ایک یہودی عبداللہ بن سبا نے منافقانہ طور پر اسلام میں داخل ہو کر اسلام کے صاف و شفاف چشمے کو اپنے مشرکانہ عقائد سے مکدر کرنے کی ناپاک کوشش کی۔ یہ یہودی منافق اگرچہ "انا نحن نزلنا الذکر وانا لہٗ لحافظون" کے خدائی وعدہ حفاظت کی بنا کر اپنے ناپاک مقصد میں کامیاب تو نہ ہوسکا لیکن ملّتِ اسلامیہ کے اندر اختلاف و انتشار کا ایسا بیج بو گیا کہ امّت اس وقت سے لے کر آج تک اتفاق و اتحاد سے محروم ہے۔

یہی ابن سباء یہودی شیعیت کا مؤسس و بانی ہے اسی لئے مشہور تابعی امام شعبیؒ فرماتے تھے کہ ''شیعہ اس امّت کے یہود ہیں'' (الفصل ج ۴ ص ۱۸۰) یہی امام شعبیؒ ایک دوسرے موقع پر اپنے تلامذہ کو خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"احذرکم اهل هذهِ الاهواء المضلة وشرها الرافضة لم یدخلوا فی الاسلام رغبة ولا رهبة ولیکن مقتًا لاهل الاسلام وبغیا علیهم وقد نفاهم علی رضی اللّٰہ عنه الی البلدان منهم عبداللّٰہ بن سباء یهودی من یهود صنعاء نفاه الی سَاباط وعبداللّٰہ بن یسار الی خازر" (الصراع بین الاسلام والوثنیة)

یہودیت اور شیعیت کے تقابلی مطالعہ سے امام شعبی کے قول کی حرف بہ حرف تائید ہوتی ہے کیونکہ فرقۂ شیعہ کے بیشتر عقائد، اخلاق اور اعمال یہودیت ہی کی صدائے بازگشت معلوم ہوتے ہیں بطور مثال و نمونے کے چند امور یہاں ذکر کئے جاتے ہیں۔

۱- یہود حضرت عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہہ کر انھیں الوہیت کا درجہ دیتے ہیں۔ اسی طرح عبد اللہ بن سبا اور اس کے پیرو شیعہ حضرت علی کی الوہیت کے قائل ہیں۔

۲- یہودیوں کے نزدیک خلافت وحکومت آل داؤد کے ساتھ مخصوص ہے اسی طرح شیعوں کے نزدیک خلافت وامامت آل رسول وآل بیت ہی کا حصہ ہے۔

۳- یہود حضرت جبرئیلؑ کے بارے میں کہتے ہیں۔ وھو عدونا من الملائکة شیعہ بھی یہی کہتے ہیں۔

۴- یہود نے اپنی کتاب تورات میں تحریف کی، شیعہ فرقے نے بھی قرآن کریم میں تحریف کی ناپاک کوشش کی۔

۵- یہود مسح علی الخفین کو جائز نہیں سمجھتے۔ یہی مسلک شیعوں کا بھی ہے۔

۶- یہود اپنے علاوہ کسی کو جنتی نہیں سمجھتے لن یدخل الجنة الا من کان یهودًا۔ شیعہ فرقہ کا بھی یہی زعم باطل ہے۔

۷- یہود اشتباک نجوم تک نماز کو مؤخر کرتے ہیں۔ اسی طرح شیعہ نماز مغرب کو اشتباک نجوم کے بعد ادا کرتے ہیں۔

۸- یہود الجرّی والمرماہی مچھلی کو حرام سمجھتے ہیں۔ یہی مذہب شیعوں کا بھی ہے۔

۹- یہودیوں کے یہاں عورتوں پر عدّت نہیں ہے۔ یہی بات شیعہ بھی کہتے ہیں۔

۱۰- یہود تمام غیر یہودیوں کے اموال کو اپنے لئے حلال سمجھتے ہیں۔ اسی نظریہ کے قائل شیعہ بھی ہیں، وتلك عشرة كامله، ان کے علاوہ اور بھی ایسے بہت سے امور ہیں۔ جن میں شیعہ اہل اسلام کے بجائے یہودیوں کے مذہب کی پیروی کرتے ہیں۔ چونکہ اس فرقہ کا مؤسس اصلاً یہودی ہے اس لئے شیعت اور یہودیت میں یہ مناسبت ومطابقت فطری ہے۔

فرقہ شیعہ اپنے ابتدائے وجود سے عالم اسلام کے لئے ایک خطرہ بنا ہوا ہے اور ہمیشہ سے اس کی یہی کوشش رہی ہے کہ ملت اسلامیہ میں اختلاف وانتشار پیدا کر کے اس کے شیرازہ کو منتشر کر دے۔ چنانچہ اس کے بانی ابن سباء نے اپنی خفیہ سازشوں کے ذریعہ

خلیفۂ ثالث داماد رسولؐ حضرت عثمان غنیؓ کے خلاف بغاوت برپا کی جس کے نتیجہ میں ۳۵ھ میں حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی شہادت کا واقعہ پیش آیا، بانیٔ شیعیت کی منافقانہ سازشوں کی بناء پر ۳۶ھ میں واقعۂ جمل اور ۳۷ھ میں صفین کا حادثہ پیش آیا۔ جس کے نتیجہ میں اسلامی متحدہ قوت دو حصوں میں تقسیم ہوگئی اور اس کے نقصان دہ اثرات سے آج تک امت مسلمہ چھٹکارا حاصل نہ کر سکی، شیخ الشیعہ نصیر طوسی اور وزیر علقمی شیعی کی دوہرہ کوششوں سے ہلاکو خاں کے ہاتھوں ۶۵۶ھ میں خلافتِ عباسیہ کا سقوط اور مسلمانوں کا قتل عام ہوا۔ تاریخ اسلام کے یہ ایسے دردناک اور ہلاکت خیز حادثات ہیں جن سے اسلام اور مسلمانوں کو محض شیعوں کی فتنہ پردازیوں اور در پردہ سازشوں کی بناء پر دوچار ہونا پڑا ہے۔ (تفصیل کیلئے تاریخ طبری، تاریخ کامل، تاریخ ابن کثیر وغیرہ کا مطالعہ کیا جائے)

چونکہ شیعوں کے نزدیک مکہ میں رہنے والے مسلمان خدا کے کھلے ہوئے منکر اور اہل مدینہ مکہ والوں کی بہ نسبت ستر گنا پلید ہیں (اصول کافی ج۲ ص ۴۰۹) نیز ان کے نزدیک حرمین شریفین کے مقابلہ میں نجف اور کربلا زیادہ محترم ومقدس ہیں (اصول کافی، والشیعہ والمنار ص ۲۵) اس لئے حرمین شریفین کے مسلمانوں کو قتل کرنا اور حرمین کی مرکزیت کو ختم کرنا اُن کے نزدیک کار ثواب ہے۔ اسی بناء پر شیعوں کو جب بھی اقتدار نصیب ہوا ہے انھوں نے حرمین شریفین بالخصوص مکہ معظّمہ کی مرکزیت کو پامال کرنے کی پوری کوشش کی ہے چنانچہ فرقۂ امامیہ کی مشہور شاخ اسماعیلیہ نے اپنے دور اقتدار میں ملت اسلامیہ کو جس طرح اپنے ظلم وستم کا نشانہ بنایا اور اہل سنت والجماعت کے عمائدین کو جس طرح چُن چُن کر قتل کیا تاریخ اسلام کے اوراق اس خونچکاں داستان سے لالہ زار ہیں۔ علاوہ ازیں اس فرقہ نے اپنے دور اقتدار میں مکہ معظّمہ کی مرکزیت کو ختم کرنے کی غرض سے ایسی ایسی انسانیت سوز حرکتیں کی ہیں، جنھیں یاد کر کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ ۲۹۰ھ میں انھوں نے مکہ معظّمہ سے حج کر کے واپس لوٹنے والے حجاج کے قافلوں پر زبردست حملے کئے اور تقریباً بیس ہزار حاجیوں کو شہید کر ڈالا۔ پھر اسی گروہ نے ۳۱۷ھ میں اپنے سردار ابوطاہر سلیمان کی زیر قیادت ایام حج میں مکہ معظّمہ پر حملہ کیا اور خاص یوم

ترویہ میں حاجیوں پر شب خوں مار کر ان کے مال واسباب لوٹ لئے اور بہت سارے حاجیوں کو بیت الحرام میں قتل کیا۔ حجر اسود کو نکال کر اپنے دار الخلافہ لے گئے تاکہ مسلمان مکہ معظّمہ میں حج کرنے کے بجائے ہمارے دار السلطنت میں حج کرنے آیا کریں، حسب بیان احمد امین اس قتل وغارت گری کا سلسلہ بارہ دن تک جاری رہا (ظہر الاسلام)

فرقۂ امامیہ کی دوسری مشہور ومعروف شاخ اثنا عشریہ بھی اس وقت اسی منفی کردار کو دہرا رہی ہے۔ چنانچہ اپنے قائد، امام، پیشوا اور نائب امام غائب علامہ خمینی کی ہدایت کے مطابق یہ لوگ ہر سال حج کے موقع پر انتشار واختلال پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں شیعوں کے اس شورش پسند رویہ کی وجہ سے سعودی حکومت کو دوہرا انتظام کرنا پڑتا ہے۔ حتی کہ ۱۹۸۶÷ میں حج کے نام پر آنے والے پاسداران خمینی کی اٹیچیوں میں اچھی خاصی مقدار میں پلاسٹک بم اور دیگر آتش گیر مادے پکڑے گئے تھے کہ ان کی تھوڑی سی مقدار ہزاروں کو ختم کرنے کے لئے کافی تھی۔ حج کے موقع پر پاسداران خمینی کی ان دہشت انگیزیوں کا مقصد یہ ہے کہ حجاج اس طرح کے اتھل پتھل سے گھبرا کر یہاں آنا بند کردیں اس طرح سے مکہ کی مرکزیت از خود ختم ہوجائے گی اس کے بعد اس پر قبضہ کرنا آسان ہوجائے گا۔ جس کا خواب خمینی ایک عرصہ سے دیکھ رہے ہیں۔

حرم پاک کے اس حادثہ کو جو لوگ ایک وقتی حادثہ سمجھ رہے ہیں وہ غالبًا شیعت کے اس تاریخی منفی کردار سے یا تو واقف نہیں ہیں یا جان بوجھ کر سہل انگاری سے کام لے رہے ہیں۔ ورنہ درحقیقت شیعیت کی طرف سے ملت اسلامیہ کو ایک چیلنج ہے جس کا جواب نہ صرف سعودیہ حکومت ہی کے ذمہ نہیں ہے بلکہ پوری ملت اسلامیہ پر اس کی جوابدہی شرعاً لازم ہے۔

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
ہند کے ساحل سے لے کر تا بخاک کاشغر

☆ ☆ ☆

کیا اثنا عشری مسلمان ہیں؟

ایمان وکفر میں فرق وامتیاز ضروری ہے

ایمان وکفر دو جدا جدا مستقل حقیقتیں ہیں، جو اپنے معنی ومفہوم، اثرات وعوامل اور نتائج وثمرات کے اعتبار سے ایک دوسرے کی ضد اور متبائن ہیں، انبیائے کرام اور کتب سماویہ کے نزول کی ایک اہم ترین غرض ایمان وکفر کے حدود کی تعیین وتشخیص اور ان کے درمیان امتیاز کرنا بھی ہے تاکہ ایمان کو کفر، اور کفر کو ایمان سمجھنے کی خطرناک اور تباہ کن غلطی سے نوع انسانی کو بچایا جائے اس لئے جو شخص اسلامی تعلیمات کے مطابق عقیدۃً مومن ہے اسے کافر سمجھنا یا جو اسلامی عقائد کی رو سے کافر ہے اسے مؤمن باور کرنا شریعت اسلامیہ میں عظیم جرم ہے "ادخال الکافر فی الملۃ واخراج مسلم عنها عظیم فی الدین" (اکفار الملحدین ص۲۰ وشرح شفاج ۲ص ۵۰۰) کیونکہ یہ غیر محتاط رویہ بعثت رسول اور انزال کتب کے مقصد وغرض کی نفی کرتا ہے۔

مسلمانوں کو کافر کہنے کے متعلق باری تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

یَاَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا اِذَا ضَرَبْتُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰه فَتَبَیَّنُوْا وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰی اِلَیْکُمُ السَّلَامَ لَسْتَ مُؤْمِنًا (نساء)

اے ایمان والو جب تم اللہ کی راہ میں سفر میں نکلو تو ہر کام تحقیق کر کے کیا کرو اور ایسے شخص کو جو تمہارے سامنے اسلام پیش کرے یہ مت کہو کہ تو کافر ہے۔

اس آیت پاک سے ثابت ہوتا ہے کہ جو شخص اپنا اسلام ظاہر کرے تو جب تک اس کے کفر پر مکمل اور یقینی ثبوت فراہم نہ ہو جائے اسے کافر سمجھنا ناجائز ہے۔

اسی کے بالمقابل کافر کو مسلمان قرار دینے پر بایں الفاظ نکیر فرمائی گئی ہے۔

اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَهْدُوا مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا. (نساء)

> کیا تم لوگ اس کا ارادہ رکھتے ہو کہ ایسے لوگوں کو راہ پر لاؤ جن کو اللہ تعالیٰ نے گمراہی میں ڈال رکھا ہے اور جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ گمراہی میں ڈال دے اس کے (مومن ہونے کے) لئے کوئی راہ نہیں پاؤ گے۔

مطلب یہ ہے کہ گمراہ غیر مومن کو راہ یاب مومن قرار دینا درست نہیں ہے لہٰذا اس غلطی سے مسلمانوں کو دور رہنا چاہئے۔

مگر آج کی بے قید آزادی کا یہ کرشمہ ہے کہ اس انتہائی نازک مسئلہ میں بھی بیباکانہ افراط وتفریط کی جارہی ہے ایک طرف وہ لوگ ہیں جنھوں نے تکفیر بازی کو اپنا مشغلہ بنالیا ہے اور معمولی معمولی خلاف شرع بلکہ خلاف طبع باتوں پر فتویٰ تکفیر جاری کر دیتے ہیں، ان کے بالکل برعکس کچھ دوسرے لوگ ہیں جن کے نزدیک اسلام وایمان کی کوئی حقیقت و اہمیت ہی نہیں ہے محض دنیاوی مفاد اور مردم شماری کی فہرست میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ دکھانے کی غرض سے یہ لوگ ہر مدعی اسلام کو (خواہ اس کے سارے کے سارے عقائد اسلام کے خلاف کیوں نہ ہوں) نہ صرف مسلمان کہنے پر مصر ہیں بلکہ جو اہل علم ایسے بدعقیدوں کو شرعی دلائل کی بنیاد پر خارج از اسلام سمجھتے ہیں انھیں یہ لوگ لعن وطعن اور سبّ وشتم بھی کرتے ہیں حالانکہ جس طرح صحیح العقیدہ مسلمان کو مسلمان سمجھنا ضروری ہے اسی طرح ضروریات دین وقطعیات اسلام کے منکرین بدعقیدوں کو خارج از اسلام سمجھنا بھی شرعاً لازم ہے، اور جاننے والوں کی یہ شرعی ذمہ داری ہے کہ ملت اسلامیہ کو ان کے فساد عقیدہ سے باخبر کردیں تاکہ یہ بدباطن مار آستین بن کر اپنے مسموم عقائد کا زہر مسلمانوں میں نہ پھیلا سکیں۔

عقل وانصاف کا تقاضا تو یہ ہے کہ امت کو ان علمائے دین کا احسان مند اور شکر گذار ہونا چاہئے جو اس طرح کے نقاب پوش بدعقیدہ دشمنانِ اسلام کا پردہ چاک کر کے ان کا اصل چہرہ نمایاں کردیتے ہیں تاکہ مسلمان بغیر کسی اشتباہ کے ان کی حقیقتِ اصلیہ سے واقف ہوجائیں اور ان کے ضرر سے محفوظ رہیں نہ کہ الٹے انھیں تنگ نظر، مفاد پرست

اور تفریق بین المسلمین کا مجرم گردانا جائے ''بریں عقل و دانش بباید گریست''

اپنے ذاتی اور وہ بھی موہوم مفاد کے تحت جو لوگ دشمنان اسلام کو مسلمانوں کی صف میں کھڑا کرنے کے لئے اس طرح کی غیر معقول اور ناروا حرکتیں کر رہے ہیں ان کا حال اس ناسمجھ بچے جیسا ہے جو کسی چور کے ہاتھ پڑ گیا تھا اور چور اسے چند چاکلیٹ دیکر گھر کے سیف کی تالیوں کو معلوم کر رہا تھا کہ ایسا شخص وہاں آ گیا جو چور کو اور اس کی اس تکنک کو اچھی طرح جانتا تھا اس نے چور کو بچے کے پاس اکیلا بیٹھا دیکھ کر چور، چور چلانا شروع کر دیا جس کی وجہ سے چور وہاں سے بھاگ گیا، جس پر یہ ناسمجھ بچہ منھ بسور کر اس شور مچانے والے کو برا بھلا کہنے لگا کہ اس نے ناحق ایک مخلص پر چوری کا الزام لگا کر میرے پاس سے اسے بھاگ جانے پر مجبور کر دیا وہ تو از راہ محبت مجھے چاکلیٹ کھلا رہا تھا، ظاہر ہے کہ بچے کے اس واویلا پر کون ذی ہوش کا دن دھرے گا، بعینہٖ یہی حال اس ناروا توسیع پسند گروہ کا ہے جو اپنے چند روزہ مفاد کے پیش نظر فرقۂ اثنا عشریہ کو زبردستی مسلمانوں کے زمرہ میں گھسیٹ لانے پر مصر ہیں بالخصوص دہلی کے ایک معاصر ہفت روزہ نے تو اسے ایک مہم بنالیا ہے اور دلائل و شواہد کے بجائے دشنام بازی، الزام تراشی، افترا پردازی اور صحافتی بھپتیوں کے سہارے وہ ان تقیہ باز منکرین اسلام کو مخلص اور سچا پکا مسلمان ٹھہرا دینے کی نامشکور کوشش میں لگا ہے، چنانچہ اس نے اپنی جنوری کی ایک اشاعت میں ''علامہ خمینی اور ان کے ماننے والے کافر؟'' کا سوالیہ عنوان قائم کر کے خمینی اور ان کے ہم مذہب شیعوں کو کافر کہنے والوں کو دل کھول کر گالیاں دی ہیں اور انھیں کے ساتھ مملکت سعودیہ کے سربراہوں پر بھی بغیر کسی معقول شہادت کے شراب نوشی، قمار بازی اور شہوت پرستی کا الزام لگایا ہے لیکن سعودی حکمرانوں کے بالفرض شراب نوش قمار باز ہونے سے خمینی اور ان کے متبعین کا اسلام کس طرح ثابت ہو گیا؟ کیا ایک فریق کی بد عملی دوسرے فریق کے اسلام کو مستلزم ہے؟ آخر استدلال و استنباط کی یہ کون سی قسم ہے جسے یہ پیش کر کے خمینی کے اسلام پر ثبوت فراہم کر رہا ہے؟ کم از کم مجھ جیسے طالب علم کیلئے تو یہ عقدہ لاینحل ہے۔

ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہئے　　　خامہ انگشت بدنداں ہے اسے کیا لکھئے

اسی تحریر میں جسے بقلم خود فکر انگیز بتایا گیا ہے قارئین کو متاثر کرنے کی غرض سے ایک جگہ بڑے پر اعتماد لہجے میں یوں خامہ فرسائی کی گئی ہے۔

> ''میں عالم دین تو نہیں البتہ یہ بات بڑے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اب تک شیعہ مسلمانوں کو کبھی کافر قرار نہیں دیا گیا۔''

سوال یہ ہے کہ اس وثوق کی بنیاد کیا ہے؟ پردۂ زنگاری میں چھپے معشوق کے چشم و ابرو کا اشارہ ہے؟ یا علم واستدلال کی وہ روشنی ہے جس کے ذریعہ کسی اختلافی ونزاعی مسئلہ میں دوٹوک فیصلہ کی قوت حاصل ہوتی ہے۔ بقول خود اس فکر انگیز تحریر کے لکھنے والے مفکر گرامی دینی علوم کی دولت سے محروم ہیں تو اس انتہائی نازک اور خالص علمی و دینی مسئلہ میں ان کا ایک پہلو پر اظہار وثوق معشوق زنگاری کا مرہون منت ہی ہوگا۔

صحیح بات تو یہ ہے کہ کفر وایمان کا مدار خالص اعتقادیات ونظریات پر ہے اگر کوئی شخص صدق دل سے اللہ کی وحدانیت، رسول کی رسالت اور تمام ضروریاتِ دین وقطعیات اسلام کو مانتا ہے تو وہ مسلمان ہے اور قطعی مسلمان ہے چاہے ساری دنیا ایک زبان ہوکر اسے شرابی جواری اور شہوت پرست کیوں نہ کہے دنیا کا یہ مخالف پروپیگنڈا اسے دائرہ اسلام سے باہر نہیں کرسکتا اس کے برعکس اگر کوئی شخص ضروریات دین میں سے کسی ایک چیز کا بھی منکر ہے تو وہ خارج از اسلام ہے، فقیہ عادل، رہبر اعظم، امام زماں کے دعوے اور نعرے اسے اسلام میں داخل نہیں کرسکتے۔

محدث عصر علامہ انور شاہ کشمیری اپنی معرکۃ الآرا تصنیف ''اکفار الملحدین'' میں بحوالہ ایثار الحق علی الخلق از حافظ محمد بن ابراہیم یمانی لکھتے ہیں۔

اجماع الامة علی تکفیر من خالف الدین المعلوم بالضرورة (ص۶۲)

ضروریاتِ دین کے مخالف کی تکفیر پر امت کا اجماع ہے۔

اثنا عشری میں اسباب کفر پائے جاتے ہیں یا نہیں؟

اس لئے بلند بانگ دعووں اور اخبارات کی شاہ سرخیوں سے کسی منکر ضروریات

دین کے اسلام کو ثابت نہیں کیا جا سکتا اس کیلئے تو ضروریات دین پر یقین واذعان کے ٹھوس اور مستحکم دلائل درکار ہیں اور بد قسمتی سے خمینی اور ان کے ہم نواؤں کی زنبیل اسی گنج گراں مایہ سے خالی ہے جیسا کہ آئندہ سطور سے معلوم ہو جائے گا، اس لئے خمینی اور دیگر اثنا عشری شیعوں کی تکفیر کے سلسلے میں دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ اسباب کفر میں سے کوئی سبب ان کے اندر پایا جاتا ہے یا نہیں اگر ان اسباب میں سے کوئی سبب ان میں محقق ہو جاتا ہے تو وہ یقیناً کافر ہوں گے، اس تلاش وجستجو کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں کہ اب تک کے علماء نے اس فرقہ کی تکفیر کی ہے یا نہیں، کیونکہ اوپر کی تفصیلات سے معلوم ہو چکا ہے کہ کفر کا مدار کسی کے کہنے یا فتویٰ پر نہیں ہے بلکہ وہ اسباب کفر ہیں جن کو اختیار کرنے سے آدمی کافر بن جاتا ہے، لہٰذا معاصر کا یہ دعویٰ کہ ''البتہ میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اب تک شیعہ مسلمانوں کو کافر قرار نہیں دیا گیا'' بالفرض اگر درست بھی مان لیا جائے پھر بھی اس نرے دعویٰ سے کفر کے طوق لعنت سے اثنا عشری شیعوں کی گلوخلاصی نہ ہو سکے گی، کیوں کہ ان کے اندر ایک نہیں بلکہ متعدد اسباب کفر جمع ہو گئے ہیں مثلاً (۱) عصمت ائمہ کا (۲) حضرات انبیاء پر ائمہ کی برتری (۳) تحریف قرآن کا (۴) ارتداد صحابہ کا (۵) انکار خلافت شیخین (ابوبکر وعمرؓ) (۶) بداء (۷) قذف عائشہ صدیقہ (۸) رجعت، وغیرہ یہ سارے عقائد ضروریات دین کے بالکل مخالف ہیں اور اثنا عشری فرقہ سے تعلق رکھنے والے تمام شیعہ ان مذکورہ عقائد کے پابند ہیں جیسا کہ ان کی کتابوں سے ظاہر ہے، اس موقع پر چند کتابوں کا نام درج کیا جا رہا ہے تاکہ انھیں دیکھ کر اطمینان کر لیا جائے (۱) الکافی از محمد بن یعقوب الکلینی متوفی ۳۲۹ھ (۲) من لا یحضرہ الفقیہ از ابن بابویہ محمد بن علی الصدوق القمی متوفی ۳۸۱ھ (۳) تہذیب الاحکام (۴) الاستبصار (اثنا عشریوں میں یہ چاروں کتابیں امہات کتب میں شمار ہوتی ہیں اور ان میں اول الذکر کا مرتبہ تمام کتابوں سے بلند ہے) ان کے علاوہ شیعوں کے رئیس المحدثین علامہ باقر مجلسی کی کتابیں مثلاً (۵) حیات القلوب، (۶) حق الیقین، (۷) جلاء العیون جو شیعوں کے نزدیک نہایت معتبر ومستند مانی جاتی ہیں، ان متقدمین علمائے شیعہ کے علاوہ اس دور کے علمائے شیعہ میں سے مولانا حسین بخش جارا کی

(۸) تفسیر انوار النجف محمد حسین ڈھکو مجتہد کی (۹) احسن الفوائد و (۱۰) تجلیات صداقت اور مترجم الکافی مولانا ظفر حسن امروہوی کی (۱۱) عقائد الشیعہ اور (۱۲) تحفۃ العوام وغیرہ ہندو پاک کے شیعوں میں متداول ہیں اور ہر شیعہ ان کے مندرجات کو صحیح و درست سمجھتا ہے اور موقع استدلال میں ان کی عبارتوں کو پیش کرتا ہے، ان مذکورہ تمام کتابوں میں اوپر ذکر کیئے ہوئے شیعوں کے عقائد کی تفصیلات موجود ہیں اگر طوالت کا خوف نہ ہوتا تو ہر ایک کتاب سے کم از کم ایک حوالہ ضرور پیش کر دیا جاتا۔

مذکورہ بالا سارے کے سارے عقائد ضروریات دین کی نفی کرتے ہیں کیونکہ علمائے متکلمین کی اصطلاح میں ضروریات دین میں ہر ایسے امور داخل ہیں جن کا رسول خدا...... کے دین سے ہونا قطعی دلائل سے ثابت ہو اور مسلمانوں کے ہر طبقہ میں وہ اس طرح سے مشہور ہوں کہ ان کی تحصیل کسی خاص اہتمام پر موقوف نہ ہو بلکہ عام طور پر مسلمانوں کو وراثۃً وہ امور معلوم ہوتے رہتے ہیں جیسے نماز روزہ وغیرہ کی فرضیت، نبی علیہ السلام کا خاتم الانبیاء ہونا وغیرہ ایسے امور ہیں جو بغیر تعلیم و تعلم کے مسلمانوں کو معلوم ہو جاتے ہیں۔ اور علمائے کلام کی حسب تصریح (۱) حضرات انبیاء کا عصمت کے ساتھ مخصوص ہونا (۲) غیر نبی کا نبی سے کم تر درجہ کا ہونا (۳) قرآن کریم کا تحریف و تبدیلی سے محفوظ ہونا (۴) تمام صحابۂ کرام کا مؤمن ہونا (۵) نبی کریم ...... کے بعد حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کا یکے بعد دیگرے خلیفہ ہونا (۶) علم خداوندی کا ہر موجود و غیر موجود پر محیط ہونا (۷) منافقین کے عائد کردہ الزام سے حضرت عائشہ صدیقہؓ کا بری ہونا (۸) مرنے کے بعد اس دنیا میں جزا و سزا کیلئے دوبارہ پیدا نہ ہونا یہ سب امور ضروریات دین اور قطعیات اسلام میں داخل ہیں ان میں سے کسی ایک کا انکار بھی موجب کفر ہے، اور اوپر کی تفصیل سے معلوم ہو چکا ہے کہ اثنا عشری شیعوں کا عقیدہ ان سب کے خلاف ہے اسلئے علمائے امت نے ہر دور میں اس طرح کے عقائد رکھنے والے شیعوں کی تکفیر کی ہے، چنانچہ علامہ ابن کثیر آیت پاک اِنَّ الَّذِیۡنَ یَرۡمُوۡنَ الۡمُحۡصَنَاتِ الخ کے ذیل میں لکھتے ہیں قد اجمع العلماء رحمهم الله قاطبة علی ان من سبّها (عائشةؓ) بعد هذا فانه کافر معاند للقرآن (تفسیر ابن کثیر)

تمام کے تمام علماء نے اس بات پر اتفاق کیا ہے کہ جو لوگ سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو آیت مذکورہ کے بعد قذف کرتے ہیں وہ کافر اور قرآن مجید کے مخالف ہیں اور اصول فقہ کی مشہور کتاب نورالانوار میں ملاجیونؒ اجماع کی بحث میں لکھتے ہیں "ثم هو علی مراتب فالاقوٰی اجماع الصحابة نصا مثل ان یقولوا جمیعا اجمعنا علی کذا فانه مثل الآیة والخبر المتواتر حتی یکفر جاحده ومنه الاجماع علی خلافة ابی بکر پھر اس کے چند مراتب ہیں جن میں سب سے قوی حضرات صحابہ کا صراحتاً کسی بات پر اجماع ہے مثلاً تمام صحابہ کسی مسئلے کے متعلق صراحتاً یہ کہیں کہ ہم نے اس پر اتفاق کرلیا ہے تو یہ آیت اور خبر متواتر کے مثل ہوگا حتیٰ کہ اس اجماع کے منکر کی تکفیر کی جائیگی اور اسی قبیل سے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خلافت پر اجماع ہے، اور فرقہ اثنا عشری اتفاقی طور پر نہ صرف خلافتِ شیخین کے منکر ہیں بلکہ سرے سے انھیں مؤمنِ مخلص ہی نہیں مانتے شیعوں کے مجتہد مولوی حسین بخش جاڑا لکھتے ہیں ''بیشک شیعوں کا یہ عقیدہ ہے کہ یہ لوگ (خلفاء ثلثہ) دل و جان سے مومن نہیں تھے البتہ ظاہر از بانی طور پر وہ اسلام کا اظہار کرتے تھے (مناظرہ بغداد ص ۵۷) شیعوں کے ایک دوسرے مجتہد مولوی محمد حسین ڈھکو لکھتے ہیں۔ ''ہمارے اور ہمارے برادر اسلامی میں اس سلسلہ میں جو کچھ نزاع ہے وہ صرف اصحاب ثلثہ کے بارے میں ہے اہل سنت ان کو بعد از نبی تمام اصحاب امت سے افضل جانتے ہیں اور ہم ان کو دولتِ ایمان و ایقان اور اخلاص سے تہی دامن سمجھتے ہیں (تجلیات صداقت ص ۲۰۱) دور حاضر کے شیعوں کے رہبر اعظم و نائب امام غائب خمینی بھی خلفائے ثلثہ کے ایمان کے منکر ہیں ان کی مشہور کتاب کشف الاسرار کے صفحات ۱۰۷، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۹، ۱۵۳، وغیرہ کو دیکھ کر فیصلہ کرلیا جائے۔

کیا ان تصریحات کے بعد بھی کسی کیلئے اس کی گنجائش ہے کہ وہ دعویٰ کرے کہ ''اب تک شیعہ مسلمانوں کو کافر قرار نہیں دیا گیا۔'' واقعہ یہ ہے کہ اوپر مذکور ضروریات دین وقطعیات شریعیہ کی مخالفت اور انکار کی بناء پر ہر دور کے علماء وفقہاء نے شیعوں کی تکفیر کی ہے اور انھیں گمراہ اور گمراہ کنندہ قرار دیا ہے اس موقع پر بغرض اختصار چندان کتابوں کے

نام مصنف کی تصریح کے ساتھ درج کئے جاتے ہیں جن میں شیعوں کی تکفیر کی گئی ہے۔

چندوہ کتابیں جن میں اثناعشری کے کفر کی تصریح ہے

(۱) الفصل فی الملل والاہواء والنحل ج ۲ ص ۷۸ مؤلفہ امام ابن حزم اندلسی متوفیٰ ۴۵۶ھ

(۲) خلاصۃ الفتاویٰ قلمی مرتبہ شیخ طاہر بن احمد البخاری المتوفی ۵۴۲ھ

(۳) الشفا ج ۲، ص ۲۸۶ و ۲۸۹ مصنفہ قاضی عیاض مالکی متوفی ۵۴۴ھ

(۴) بدائع الصنائع از شیخ ابوبکر ابن مسعود کاسانی متوفی ۵۸۷ھ

(۵) فتح القدیر ج ۱ ص ۱۳۰۴ از علامہ کمال الدین المعروف بہ ابن ہمام حنفی۔

(۶) الصارم المسلول ص ۵۷۵ پر علامہ ابن تیمیہ متوفی ۷۳۷ھ نے قاضی ابویعلی، محمد بن یوسف فریابی، امام ابوبکر ہانی سے فتوئ تکفیر شیعہ درج کیا ہے۔

(۷) خزانۃ المفتیین قلمی میں بھی تکفیر شیعہ کا فتویٰ موجود ہے، امام حسین بن محمد سمعانی مؤلف کتاب اس کی تالیف سے ۷۰۴ھ میں فارغ ہوئے ہیں۔

(۸) تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق ج ۱ ص ۱۳۴ مطبوعہ مصر از امام فخر الدین ابو محمد عثمان بن علی زیلعی متوفی ۷۴۳ھ

(۹) بحر الرائق مؤلفہ شیخ زین العابدین ابن نجیم مصری متوفی ۹۶۹ھ

(۱۰) مجمع الانہر از شیخ زادہ، یہ کتاب ۱۰۷۷ھ میں لکھی گئی ہے۔

(۱۱) فتاویٰ عالمگیریہ جسے اورنگ زیب عالمگیرؒ کے حکم سے پچاس علماء پر مشتمل ایک مجلس نے مرتب کیا ہے۔

(۱۲) تنقیح حامدیہ از علامہ ابن عابدین شامی۔

(۱۳) شرح فقہ اکبر ص ۱۵۳ از ملا علی قاری حنفی متوفی ۱۰۱۴ھ

(۱۴) اور ہندوستان کے مشاہیر علماء میں مجدد الف ثانیؒ نے اپنی مشہور تصنیف ردالروافض میں اثناعشریوں کو کافر لکھا ہے۔

(۱۵) حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے مسوی شرح موطا امام مالک ج ۲ ص

۱۱۰پر انھیں زندیق کہا ہے۔

(۱۶) حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ نے اپنے فتاویٰ میں ان کی تکفیر کی ہے۔

(۱۷) اور مولانا عبدالحیٔ فرنگی لکھتے ہیں منقح اور قولِ مفتی بہ اور مرجح یہ ہے کہ جو شیعہ منکر ضروریات دین ہوں وہ کافر ہیں، ان کا ذبیحہ حلال نہیں، مناکحہ ان کے ساتھ درست نہیں، شرکت ان کے ساتھ مثل شرکت اہل اسلام کے جائز نہیں'' (فتاویٰ مولانا عبدالحیٔ ج۲ص ۷۷ طبع قدیم)

(۱۸) مولانا احمد رضا خاں بریلوی نے اپنے رسالہ ''ردالرفضہ'' میں پچاس سے زائد کتب فقہ کلام وتفسیر کے حوالوں سے اثنا عشریوں کے کفر کو ثابت کیا ہے۔

اثنا عشری کے کفر پر ایک متفقہ فتویٰ

آج سے تقریباً ساٹھ سال پہلے امام اہل سنت حضرت مولانا عبدالشکور فاروقی لکھنوی نے ایک استفتاء کے جواب میں تحریر فرمایا تھا۔ ''شیعہ اثنا عشریہ رافضیہ قطعاً خارج از اسلام ہیں ہمارے علماء سابقین کو چونکہ ان کے مذہب کی حقیقت کماینبغی معلوم نہ تھی بوجہ اس کے کہ یہ لوگ اپنے مذہب کو چھپاتے ہیں اور کتابیں بھی ان کی نایاب تھیں لہٰذا بعض محققین نے بر بنائے احتیاط ان کی تکفیر نہیں کی تھی مگر آج ان کی کتابیں نایاب نہیں رہیں اور ان کے مذہب کی حقیقت منکشف ہوگئی اس لئے تمام محققین ان کی تکفیر پر متفق ہوگئے ہیں، ضروریات دین کا انکار قطعاً کفر ہے اور قرآن شریف ضروریات دین میں سب سے اعلیٰ وارفع چیز ہے اور شیعہ بلا اختلاف ان کے متقدمین ومتاخرین سب کے سب تحریف قرآن کے قائل ہیں'' الخ۔ امام اہل سنت کے اس فتویٰ پر اس وقت کے ۳۰ علمائے ہند کے تصدیقی وتائیدی دستخط ثبت ہیں جن میں شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی، مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ شاہجہاں پوری ثم دہلوی، مولانا مفتی ریاض الدین مفتی دارالعلوم دیوبند، مولانا اعزاز علی شیخ الادب والفقہ دارالعلوم دیوبند، مولانا مرتضی حسن چاند پوری ناظم تعلیمات دارالعلوم دیوبند، مولانا مفتی محمد شفیع مفتی اعظم

پاکستان، محدث کبیر حضرت مولانا خلیل احمد صاحب شیخ الحدیث وصدر مدرس مظاہر علوم سہارنپور، حضرت مولانا سید انور شاہ کشمیری شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا مفتی مہدی حسن شاہجہاں پوری صدر مفتی دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا محمد عبدالعزیز گوجرانوالہ مصنف نبراس الساری، حضرت مولانا عبدالرحمٰن مفسر امروہوی وغیرہ جیسے اساطین علم بھی ہیں۔ ''شیعہ اثنا عشریہ کے کفر وارتداد کے متعلق علمائے کرام کا متفقہ فتویٰ'' کے نام سے یہ فتویٰ متعدد بار طبع ہو چکا ہے اور دستیاب ہے ابھی حال ہی میں ماہنامہ الفرقان لکھنؤ میں بھی یہ پورا فتویٰ شائع کیا گیا ہے۔

ایک اور فتویٰ

اس کے علاوہ ۱۳۴۶ھ میں ''فیصلہ شرعی'' کے نام سے حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم اور ان کے برادر خورد مولانا محمد طاہر صاحب کے اہتمام میں مطبع قاسمی سے ۲۷ صفحات پر مشتمل ایک فتویٰ شائع ہوا تھا، اس رسالہ میں بھی ایک استفتاء کے جواب میں مولانا حکیم محمد قطب الدین پیرکوٹی نے لکھا ہے۔ ''اکثر فقہاء اور متکلمین مطلق رافضیوں کو کافر لکھتے ہیں خواہ وہ رافضی محض سبّی (گالی بکنے والے) ہوں یا سبّ صحابہ کے ساتھ دیگر بکواس بھی بکتے ہوں اور خواہ وہ رافضی صحابۂ کرام کو ایمان دار سمجھ کر گالیاں دیتے ہوں یا (عیاذ باللہ) غیر مومن جان کر سبّ بکتے اور گالیاں دیتے ہوں اور خواہ وہ رافضی سبّ صحابہ کو حرام اعتقاد کرتے ہوں یا حلال چنانچہ صاحب فتاویٰ ظہیریہ اور خلاصہ اور قنیہ اور عالمگیریہ اور جامع الرموز اور درمختار اور ردالمحتار شامی اور فتح القدیر وغیرہ وغیرہ سب کے سب شیعہ رافضیوں کو علی الاطلاق کفر کا فتویٰ دیتے ہیں الخ (ص ٦) اس فتوی پر بھی صوبہ سرحد، ملتان، سندھ وغیرہ کے ۲۶ علماء ومفتیوں کے تائیدی دستخط ہیں، اور ابھی چند ماہ پہلے ماہنامہ الفرقان لکھنؤ نے ''خمینی اور اثنا عشریہ کے بارے میں علماء کرام کا متفقہ فیصلہ'' کے نام سے ۱۸۴ صفحات کا ایک نمبر شائع کیا ہے جس میں ہندوستان و پاکستان کے علمائے دیوبند علمائے اہل حدیث اور علمائے بریلی کے تقریباً ۲۰۰ سے زائد فتاوے اور تصدیقات

ہیں جن میں متفقہ طور پر تینوں مکتبہ فکر کے علماء نے خمینی اور اثنا عشری کو کافر لکھا ہے۔

حیرت ہے کہ ایک ایسا مسئلہ جس پر علمائے متقدمین و متأخرین اور پھر ہندوستان کے تینوں مکتبہ فکر کے علماء متفق ہوں اس کے بارے میں آنکھ بند کر کے یہ لکھ دیا جائے کہ بڑے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اب تک شیعہ مسلمانوں کو کافر قرار نہیں دیا گیا۔

چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد

یہ تو سوچا بھی نہیں جا سکتا کہ کوئی شخص ایسے نازک، حساس اور جذباتی موضوع پر فکر انگیز تحریر سپرد قلم کرنے بیٹھے اور وہ اس موضوع سے متعلق لکھے گئے لٹریچر سے اس درجہ غافل ہو کہ اسے اپنے ہی ملک اور اپنے گرد و پیش کے علماء کی رائے معلوم نہ ہو، اس لئے یہی کہا جا سکتا ہے کہ سب کچھ جاننے کے باوجود کسی خاص مقصد کے تحت تجاہل عارفانہ سے کام لیا گیا ہے اور جان بوجھ کر محض اپنے نقاب پوش محسنوں کی خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے ایک ایسا دعویٰ کیا گیا ہے جس کا غلط ہونا نصف النہار کی طرح روشن ہے۔

اللھم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعه وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابه.

☆ ☆ ☆

I\MONO.
not found.

مقالات حبیب

(حصہ دوم)

مسائل و دلائل

تالیف

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی

استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند، سہارنپور، یوپی

ناشـــــر

شیخ الہند اکیڈمی، دارالعلوم دیوبند

جملہ حقوق بحق شیخ الہند اکیڈمی دار العلوم دیوبند محفوظ ہیں

زیر سرپرستی

حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب دامت برکاتہم
مہتمم دار العلوم دیوبند

زیر نگرانی

حضرت مولانا بدر الدین اجمل علی القاسمی صاحب
رکن مجلس شوریٰ دار العلوم دیوبند

سلسلہ اشاعت ع۱۴

نام کتاب : مقالات حبیب (حصہ دوم)
مولف : حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی
استاذ حدیث دار العلوم دیوبند
سن اشاعت : ۱۴۳۰ھ — ۲۰۰۹ء
تعداد صفحات : ۳۵۱
ناشر : شیخ الہند اکیڈمی دار العلوم دیوبند

فہرست ابواب وموضوعات

(حصہ دوم)

باب (۴) مسائل ودلائل

- عظمت ماہ شعبان ۱۳
- اسلام میں روزہ کی افادیت ۱۹
  - روزہ کی حقیقت ۱۹
  - روزہ کی مصلحتیں ۲۰
  - روزہ اور ہمارا طرز عمل ۲۵
- تفسیر آیات صیام ۲۶
  - تفسیر آیت (۱) ۲۶
  - تفسیر آیت (۲) ۲۷
  - تفسیر آیت (۳) ۲۹
  - تفسیر آیت (۴) ۳۰
  - تفسیر آیت (۵) ۳۲
- عشرۂ ذی الحجہ کے اعمال وفضائل ۳۴
  - عشرۂ ذی الحجہ میں اعمال کے فضائل ۳۴
  - ان ایام کی دو خاص عبادتیں ۳۵
  - ان دنوں میں کرنے کے بعض اہم کام ۳۶
  - صرف گناہ صغیرہ معاف ہوتے ہیں ۳۶
  - توبہ واستغفار کی کثرت ۳۷
  - تکبیر تشریق ۳۸
  - گنگا الٹی بہنے لگی ہے ۳۸
  - تکبیر تشریق خواتین پر بھی واجب ہے ۳۹
  - قربانی دوسرے ایام میں نہیں ہوسکتی ۳۹
  - قربانی کیا سبق دیتی ہے ۳۹

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا مقام تسلیم و رضا ۴۰

نماز دوگانہ کی ادائیگی ۴۰

عید کی اہمیت ۴۰

اسلام میں عید صرف دو ہیں ۴۱

● اسلام کا تصور جہاد ۴۲

● اسلام میں شہید کی حقیقت اور مقام و مرتبہ ۴۷

قرآن میں لفظ شہید کا استعمال ۴۷

شہید کے لغوی معنی ۴۷

اصطلاح شرعی میں شہید کا معنی ۴۸

منقول شرعی کے وجوہ ۴۹

شریعت کی نگاہ میں شہید کون ہے؟ ۵۱

اللہ کی راہ میں مقتول ہونے کی صورتیں ۵۳

شہید کے احکام ۵۳

شہادت کے لئے کسی مخصوص اسلحہ سے مقتول ہونا ضروری نہیں ۵۶

شہید حکمی ۵۶

شہید کے فضائل ۵۷

فضائل شہید سے متعلق تین احادیث ۵۹

شوق شہادت ۶۰

عہد نبوی کے شہداء کرام ۶۲

● جمعیۃ اہل حدیث کان پور کی ایک تحریر پر بحث ونظر ۶۴

تمہید ۶۴

جمعیۃ الاحناف کے سوالوں کے معقول جوابات از اہل حدیث کانپور ۶۸

مسئلہ (۱) ابراد بالظہر یعنی گرمی میں نماز ظہر تاخیر سے پڑھنا ۶۹

پہلے سوال کا جواب از جمعیۃ اہل حدیث ۶۹

بحث ونظر ۷۰

مسئلہ (۲) نماز فجر کے معاً بعد سنت فجر پڑھنے کا حکم ۷۸

دوسرے سوال کا جواب ۷۸

بحث ونظر ۷۹

مسئلہ (۳) دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کا حکم ۸۲

ساتویں سوال کا جواب ۸۲

بحث ونظر ۸۳

مسئلہ (۴) بیس رکعت تراویح کا حکم ۸۵

آٹھویں سوال کا جواب ۸۵

بحث ونظر ۸۹

مسئلہ (۵) ایک مجلس یا ایک لفظ میں تین طلاقوں کا حکم ۱۱۲

نویں سوال کا جواب ۱۱۲

بحث ونظر ۱۱۴

مسئلہ (۶) رفع یدین کا حکم ۱۲۲

دسویں سوال کا جواب ۱۲۲

بحث ونظر ۱۲۵

- کیا خواتین کا مساجد میں آکر باجماعت نماز پڑھنا درست ہے؟ ۱۳۹

پردہ جنسی بے راہ روی روکنے کا ایک مؤثر ذریعہ ۱۳۹

وہ احادیث جن سے خواتین کا مساجد میں آنے کا ثبوت فراہم ہوتا ہے ۱۴۳

مساجد کی بجائے اپنے گھروں میں نماز ادا کرنے سے متعلق احادیث ۱۴۷

جمہور صحابہ خواتین کو مساجد جانے سے روکتے تھے ۱۵۱

- نکاح وطلاق کا اسلامی ضابطہ ۱۵۳

رشتہ زوجیت کی افادیت ۱۵۳

نکاح کی ترغیب ۱۵۴

نکاح میں عبادت کا پہلو ۱۵۵

نکاح کا لغوی معنی ۱۵۵

نکاح ایک دائمی رشتہ ہے ۱۵۶

مرد کی حکیمانہ برتری ۱۵۷

عورتوں کے ساتھ حسن سلوک ۱۵۸

زوجین کی نزاع کا نظام اصلاح ۱۶۰

طلاق ایک ناگزیر ضرورت ۱۶۲

اختیار طلاق مرد ہی کو کیوں ۱۶۲

- نکاح کے شرعی قوانین ۱۶۴

نکاح کی تعریف ۱۶۴

معاہدۂ نکاح کی نوعیت اور عدالتیں ۱۶۴

صحیح نقطۂ نظر ۱۶۵

نکاح ایک شرعی حکم ۱۶۵
نکاح ایک عبادت ہے ۱۶۶
مختلف اسلامی فرقوں اور مذاہب کے افراد کے درمیان نکاح ۱۶۶
مختلف فرقوں سے متعلق ہونے کی صورت میں زوجین کے حقوق وفرائض کا تعین ۱۶۶
کتابیہ سے نکاح ۱۶۷
نکاح کتابیہ اور قرآن ۱۶۷
نکاح کتابیہ اور شیعہ مکتبۂ فکر ۱۶۸
جواز نکاح ۱۶۹
اہلیت نکاح ۱۶۹
صحیح شرعی حکم ۱۶۹
قاضی کی ضرورت ۱۷۰
ایجاب وقبول زبانی یا تحریری ۱۷۰
ایجاب وقبول اصالتاً یا وکالتاً ۱۷۱
وکیل نکاح کی اہلیت ۱۷۱
ایجاب وقبول کے الفاظ ۱۷۲
گونگے بہرے کا ایجاب وقبول ۱۷۲
ایجاب وقبول کے صیغے ۱۷۳
انعقاد نکاح ۱۷۴
انعقاد نکاح کی پہلی شرط - عقل ۱۷۴
دوسری شرط - بلوغ ۱۷۴
بلوغ اور حنفیہ وشافعیہ مکاتیب فکر ۱۷۵
شیعہ مکتبۂ فکر ۱۷۵
انعقاد نکاح کی تیسری شرط - رضامندی ۱۷۵
معنوی رضامندی ۱۷۶
رضا بالجبر ۱۷۷
رضامندی بذریعہ غلط بیانی ۱۷۷
انعقاد نکاح کی چوتھی شرط - اتحاد مجلس ۱۷۷
گواہوں کی موجودگی اور سماعت ۱۷۸
گواہوں کی تعداد ۱۷۸
گواہوں کی اہلیت ۱۷۹

نکاح کے شرعی موانع ۱۷۹
تعدد ازدواج ۱۸۰
قرآنی حکم مشروط ہے ۱۸۱
صحیح، فاسد، اور باطل نکاح ۱۸۱
نکاح صحیح ۱۸۱
نکاح صحیح کے اثرات ۱۸۲
نکاح فاسد ۱۸۲
نکاح فاسد کے اثرات ۱۸۲
مہر ۱۸۳
نسب اولاد ۱۸۳
حرمت مصاہرت ۱۸۴
نفقہ ۱۸۴
وراثت اولاد ۱۸۴
عدت ۱۸۴
توارث بین الزوجین ۱۸۵
نکاح باطل ۱۸۵
نکاح باطل کے اثرات ۱۸۵
ماؤں، بیٹیوں، بہنوں، پھوپھیوں، خالاؤں، بھتیجیوں، اور بھانجیوں سے نکاح ۱۸۶
رضاعی ماؤں، اور بہنوں سے نکاح ۱۸۶
شرائط رضاعت ۱۸۷
رضاعت کا اثر ۱۸۸
ساس سے نکاح ۱۸۸
سوتیلی بیٹیوں سے نکاح ۱۸۹
● ایک مجلس کی تین طلاقیں ۱۹۰
تمہید ۱۹۰
اسلام کا ضابطۂ اخلاق ۱۹۱
ایک مجلس کی تین طلاقیں تین واقع ہوں گی ۱۹۴
عہد فاروقی میں صحابہ کا اجماع ۱۹۹
اجماع کو غیر ثابت قرار دینے کی بیجا کوشش ۲۰۰
فاروق اعظم کا اپنے فیصلہ سے رجوع کر لینے کا بے بنیاد دعویٰ ۲۰۳

آیت طلاق ۲۰۶

آیت کا شان نزول ۲۰۶

لفظ مرتان کی لغوی تحقیق ۲۱۱

دوسری آیت ۲۱۵

تیسری آیت ۲۱۹

سنت رسول خدا ۲۲۱

حدیث (۱) ۲۲۱

حدیث (۲) ۲۲۵

حدیث (۳) ۲۲۶

حدیث (۴) ۲۲۶

حدیث (۵) ۲۲۹

آثار صحابہ اور ان کی شرعی حیثیت ۲۳۲

خلیفہ راشد حضرت فاروق اعظم کا اثر ۲۳۶

خلیفہ راشد حضرت عثمان غنی کا اثر ۲۳۶

خلیفہ راشد حضرت علی مرتضیٰ کا اثر ۲۳۷

حضرت عبداللہ بن مسعود کا اثر ۲۳۷

اثر حضرت عبداللہ بن عباس ۲۳۸

اثر حضرت عبداللہ بن عمر ۲۳۹

اثر ام المومنین عائشہ صدیقہ ۲۳۹

فتویٰ حضرت عبداللہ بن عمرو ۲۴۰

فتویٰ حضرت ابوہریرہ ۲۴۰

اثر حضرت زید بن ثابت ۲۴۱

اثر حضرت انس بن مالک ۲۴۲

اثر ام المومنین ام سلمہ ۲۴۲

اثر عمران بن حصین و ابوموسیٰ اشعری ۲۴۲

اثر مغیرہ بن شعبہ ۲۴۳

ناروا جسارت ۲۴۴

● ایک مجلس کی تین طلاقیں تین ہی واقع ہوں گی ۲۴۶

جمہور ائمہ سلف وخلف کا فیصلہ ۲۴۶

غیر مقلد مفتی کے دلائل کی حقیقت ۲۵۰

- ایک مجلس کی تین طلاقیں اور روشن خیال دانشوروں کا رویہ ۲۵۵
- طلاق سکران صحابۂ کرام وتابعین عظام کے آثار واقوال کی روشنی میں ۲۶۹

آثار صحابہ ۲۷۰
اثر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ ۲۷۰
اثر علی مرتضٰی رضی اللہ عنہ ۲۷۱
اثر امیر معاویہ رضی اللہ عنہ ۲۷۲
اقوال تابعین رحمہم اللہ تعالیٰ ۲۷۵
۱-قاضی شریح ۲۷۵
۲-افضل التابعین سعید بن المسیّب ۲۷۶
۳-امام ابراہیم نخعی ۲۷۸
۴-امام التفسیر مجاہد بن جبر ۲۷۹
۵-امام عامر بن شراحیل شعبی ۲۷۹
۶-فقیہ سلیمان بن یسار ۲۷۹
۷-۸امام حسن بصری وامام محمد بن سیرین ۲۸۰
۹-فقیہ حُمید بن عبدالرحمٰن حمیری بصری ۲۸۱
۱۰-امام عطاء بن ابی رباح ۲۸۲
۱۱-حکم بن عتیبہ کندی ۲۸۳
۱۲-میمون بن مہران جزری ۲۸۳
۱۳-قتادہ بن دِعامہ ۲۸۴
۱۴-امام محمد بن مسلم ابن شہاب زہری ۲۸۴
جمہور ائمہ مجتہدین کا مسلک ۲۸۵
شراب نوشی کی کثرت سے سزا میں زیادتی ۲۸۹

- حرمت مصاہرت ۲۹۱

فطرت انسانی کی رعایت ۲۹۱
محرمات نسبیہ ۲۹۲
محرمات رضاعیہ ۲۹۳
محرمات بالمصاہرت ۲۹۳
حرمت بالمصاہرت میں دو نقطۂ نظر ۲۹۴
اختلاف کی بنیاد ۲۹۴
نکاح کی لغوی تحقیق ۲۹۵

مسئلہ زیر بحث کا اصل مستدل ۳۰۳

احادیث وآثار ۳۰۷

حدیث ۳۰۷

دو حدیثوں سے تائید ۳۰۹

اثر عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ۳۱۴

اثر عمران بن حصین رضی اللہ عنہ ۳۱۹

اثر ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ۳۱۹

اثر عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ ۳۲۰

اقوال تابعین واتباع تابعین ۳۲۲

امام عطاء بن ابی رباح کا فتویٰ ۳۲۲

عکرمہ کا فتویٰ ۳۲۳

مجاہد وعطاء کا فتویٰ ۳۲۳

امام طاؤس کا فتویٰ ۳۲۴

فقہائے سبعہ میں سے عروہ بن زبیر، سعید بن المسیب
ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن اور سالم بن عبداللہ کا فتویٰ ۳۲۴

ابراہیم نخعی اور عامر شعبی کا فتویٰ ۳۲۵

عبدالملک بن جریج اور حسن بصری کا فتویٰ ۳۲۶

قاضی یحییٰ بن یعمر کے قول واللہ ما حرّم حرامٌ حلالاً پر امام شعبی کا معارضہ ۳۲۷

ابراہیم نخعی کا ایک اور فتویٰ ۳۲۷

امام شعبی کا ایک اور فتویٰ ۳۲۸

تابعی کبیر عبداللہ بن معقل کا فتویٰ ۳۲۸

الحرام لایحرّم الحلال پر ایک نظر ۳۳۰

یہ روایت اپنے عموم پر نہیں ہے ۳۳۶

بعض اشکالات ومطالبات پر نظر ۳۴۰

● حقیقت رجم پر ایک نظر ۳۴۴

اسلامی احکام کے بارے میں معتبر بحث وتحقیق ۳۴۴

زانی محصن کے رجم پر اجماع ہے ۳۴۵

اس اجماع کی تائید تورات سے ۳۴۶

وہ صحابہ جنھوں نے زانی محصن کو رجم کرنے کا حکم دیا یا اس پر عمل کیا ۳۵۰

باب ﴿۴﴾

مسائل ودلائل

عظمت ماہ شعبان

خدائے رحیم وکریم نے اپنے الطاف بے پایاں اور فضل بے نہایت سے سال کے مختلف مہینوں اور اس کے مختلف دنوں اور راتوں میں ایسی برکات وخصوصیات رکھ دی ہیں کہ ان میں معمولی کوشش اور تھوڑی محنت سے وہ ثواب اور دینی و دنیوی فوائد حاصل ہو جاتے ہیں جن کا دوسرے اوقات میں طویل مشقت اور بڑی محنت سے بھی حاصل ہونا دشوار ہے۔

مگر آج کل عموماً مسلمانوں کو شریعت وسنت سے غفلت و لاپرواہی کی بناء پر ان اوقات اور ان خاص اعمال وآداب کا علم نہیں جو نبی رحمت ...... نے امت کی صلاح وفلاح کے لیے تعلیم فرمائے ہیں۔ اسلئے ان ایام کی برکات سے محروم رہ جاتے ہیں اور صرف اتنا ہی ہوتا تو زیادہ جرم نہیں تھا بلکہ ہونے یہ لگا کہ لوگوں نے اپنی طرف سے بہت سی رسمیں گھڑ لیں جن میں بہت سی چیزیں خلاف شرع بھی ہیں اور آنحضرت ...... صحابہ کرام وسلف صالحین سے ثابت اعمال وآداب کی بجائے اپنی ان خانہ ساز رسموں کے پیچھے لگ گئے اس کے نتیجہ میں وہ ان مبارک ایام میں ثواب آخرت اور دینی و دنیوی برکات وفوائد حاصل کرنے کے بجائے گناہ مزید میں مبتلا ہو جاتے ہیں کیونکہ مبارک ایام میں جس طرح اچھے اعمال کا ثواب بڑھ جاتا ہے۔ اسی طرح ان میں گناہ کے ارتکاب سے گناہ بھی زیادہ ہوتا ہے۔

ان مبارک ایام میں ماہ شعبان بالخصوص اس کی پندرہویں تاریخ کی احادیث میں بڑی فضیلت آئی ہے۔ آنحضرت ...... ماہ شعبان میں خاص طور پر نفلی روزے کا اہتمام فرماتے تھے۔ سنن نسائی میں ہے۔

(۱) عن اسامة بن زيد رضى الله عنهما قال: قلت: يا رسول الله لم ارك تصوم من شهر ما تصوم من شعبان؟ قال: ذاك شهر يغفل الناس عنه بين

رجب ورمضان وهو شهر ترفع الاعمال الى رب العٰلمين واحبُ ان ترفع عملى وانا صائم. (الترغیب والترہیب، ج:۲، ص:۱۱۶)

حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انھوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ...... سے عرض کیا کہ آپ کو کسی اور مہینے میں اس قدر روزہ رکھتے ہوئے نہیں دیکھا جس قدر آپ ماہ شعبان میں روزہ رکھتے ہیں؟ آپ نے ارشاد فرمایا یہ رجب اور رمضان کے درمیان میں ایک ایسا مہینہ ہے جس سے بالعموم لوگ غفلت برتتے ہیں حالانکہ یہ ایسا مہینہ ہے جس میں رب العالمین کی بارگاہ میں بندوں کے اعمال پیش کئے جاتے ہیں اور مجھے یہ بات پسند ہے کہ بارگاہ الٰہی میں میرے اعمال بحالتِ روزہ پیش ہوں۔

بخاری ومسلم میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت میں یہ الفاظ آتے ہیں:

(۲) وما رأيته فى شهر اكثر منه صياما فى شعبان (مشکوٰۃ، ص:۱۷۸)

مطلب یہ ہے کہ رمضان المبارک کے علاوہ دیگر مہینوں میں بھی آپ نفلی روزے رکھتے تھے مگر شعبان میں جس قدر روزے رکھتے تھے اتنا کسی اور مہینہ میں نہیں۔

(۳) وعن عائشة رضى الله عنها ان النبى صلى الله عليه وسلم كان يصوم شعبان كله. قالت قلت: يا رسول الله احب الشهور اليك ان تصومهٗ شعبان؟ قال: ان الله يكتبُ فيه على كل نفس ميتةٍ تلك السنة واحبُّ ان ياتينى اجلى، وانا صائم: رواه ابويعلى وهو غريب واسناده حسن. (الترغیب والترہیب، ج:۲، ص:۱۱۷)

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آنحضرت ...... ماہ شعبان کے پورے (یعنی اکثر) روزے رکھتے تھے میں نے عرض کیا یا رسول اللہ آپ کو سب مہینوں سے زیادہ ماہ شعبان کے روزے محبوب ہیں؟ آپ نے فرمایا ایک سال میں مرنے والوں کے نام اللہ تعالیٰ ماہ شعبان میں تحریر فرمادیتے ہیں اور میری خواہش یہ ہوتی ہے کہ میری مدتِ حیات بحالت صیام لکھی جائے۔

ان احادیث سے واضح ہوتا ہے کہ اور مہینوں کے اعتبار سے ماہ شعبان میں نفلی روزوں کی کثرت کرنی چاہئے آنحضرت ......کی سنت مبارکہ یہی ہے جس کی کرامت و

شرافت میں کسی مرد مومن کو کیا شبہ ہوسکتا ہے۔

علاوہ ازیں خاص طور سے شعبان کی پندرہویں تاریخ کی فضیلت بھی احادیث سے ثابت ہے۔ ملاحظہ ہوں، احادیث۔

(۴) عن معاذ بن جبل رضى الله عنه عن النبى صلى الله عليه وسلم قال يطلع لله الى جميع خلقه ليلة للنصف من شعبان فيغفر لجميع خلقه الالمشرك او مشاحن. رواه ابن حبان فى صحيحه. (الترغیب والترہیب، ج:۲، ص:۱۱۸۔ وفی مجمع الفوائد، ج:۸، ص:۶۵ رواه الطبرانى فى الكبير والاوسط ورجالهما ثقات)

حضرت معاذ بن جبلؓ آنحضرت ...... سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ...... نے ارشاد فرمایا شعبان کی پندرہویں کو اللہ تعالیٰ اپنے تمام بندوں کی جانب خصوصی رحمت و مغفرت کے ساتھ تجلی فرماتے ہیں اور تمام لوگوں کی مغفرت فرمادیتے ہیں سوائے مشرک اور کینہ پرور کے۔

مسند بزار میں حضرت صدیق اکبرؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ سے بھی مرفوعاً اسی مضمون کی روایت نقل کی گئی ہے (مجمع الزوائد، ج:۸، ص:۶۷)

اللہ تعالیٰ کی اس تجلی کا نزول اور خصوصی رحمت وغفران کا ظہور ہر رات کے آخری تیسرے حصہ میں ہوتا ہے لیکن پندرہویں شعبان کی شب میں یہ نزول سرشام مغرب کے وقت ہی سے شروع ہوجاتا ہے اور اس رحمت بخش کا سلسلہ طلوع فجر تک جاری رہتا ہے اسی وجہ سے شعبان کی پندرہویں شب خصوصیت کے ساتھ جامع خیرات و برکات اور حامل فضیلت و برتری ہوگئی ہے۔

(۵) عن عائشة رضى الله عنها قالت: قام رسول الله صلى الله عليه وسلم من الليل فصلى فاطال السجود حتى ظننت انه قبض فلما رأيت ذالك قمت حتى حركت ابهامه فتحرك فرجعت فسمعته يقول فى سجوده: اعوذ بعفوك من عقابك، واعوذ برضاك من شخطك، واعوذبك منك اليك لا احصى ثناء عليك انت كما اثنيت على نفسك فلما رفع رأسه من السجود،

وفرغ من صلاته قال يا عائشة او يا حميراء اظننت ان النبى صلى اللّٰه عليه وسلم قد خاس بك؟ قلت: لا واللّٰه يا رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم ولكنى ظننت انك قبضت لطول سجدك، فقال اتدرين اى ليلة هذه؟ قلت: اللّٰه ورسوله اعلم، قال: هذه ليلة النصف من شعبان ان اللّٰه عزوجل يطلع على عباده فى ليلة النصف من شعبان فيغفر للمستغفرين، ويرحم للمسترحمين يؤخر اهل الحقد كما هم رواه البيهقى من طريق العلاء بن الحارث عنها، وقال هذا مرسل جيد يعنى ان العلاء لم يسمع من عائشة واللّٰه سبحانهٗ اعلم.

(الترغیب والترہیب، ج:۲، ص:۱۱۹)

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ ایک رات آنحضرت ...... نماز کے لئے کھڑے ہوئے تو آپ نے بڑا طویل سجدہ کیا جس کی وجہ سے مجھے یہ گمان ہوگیا کہ (خدانخواستہ) آپ کی روح مبارک قبض کرلی گئی (اس اندیشہ پر) میں نے آپ کے انگوٹھے کو حرکت دی تو اس میں حرکت معلوم ہوئی تو میں (مطمئن ہوکر اپنی جگہ) لوٹ آئی اور میں نے سنا کہ سجدہ میں آپ یہ دعاء پڑھ رہے تھے اعوذ بعفوك الخ پھر جب آپ نے سجدہ سے سر اٹھایا اور اپنی نماز سے فارغ ہوگئے تو فرمایا اے عائشہ یا اے حمیراء کیا تو نے یہ خیال کیا کہ نبی ...... نے تیرے حق میں کمی کی، میں نے عرض کیا بخدا یہ بات نہیں تھی! یا رسول اللہ مجھے تو آپ کے طویل سجدہ کی بناء پر یہ اندیشہ ہونے لگا تھا کہ آپ وفات پاگئے، پھر آپ نے فرمایا جانتی ہو یہ کونسی رات ہے؟ میں نے عرض کیا اللہ اور اس کے رسول کو ہی اس کے بارے میں زیادہ علم ہے۔ فرمایا یہ شعبان کی پندرہویں شب ہے اس رات میں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر خصوصی فضل وکرم کے لئے سمائے دنیا پر نزول اجلال فرماتا ہے اور طالبان مغفرت کی بخشش اور خواستگاران رحمت پر رحمتیں نچھاور کرتا ہے اور کینہ ور کو اس کے حال پر چھوڑ دیتا ہے۔

(٦) عن علیؓ عن النبى صلى اللّٰه عليه وسلم قال اذا كانت ليلة النصف من شعبان فقوموا ليلها وصوموا يومها فان اللّٰه تبارك و تعالى منزل فيها

لغروب الشمس الی السماء الدنیا فیقول الا من مستغفر فاغفر له الا من مسترزق فارزقه الا من مبتلی فاعافیه الا کذا الا کذا حتی یطلع الفجر. رواه ابن ماجه (مشکوٰۃ، ص:۱۱۵)

حضرت علی رضی اللہ عنہ آنحضرت...... سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ پندرہویں شب میں نوافل پڑھو اور اس کے دن میں روزہ رکھو اس لئے کہ اللہ تعالیٰ سورج ڈوبتے ہی ساری دنیا پر اپنی رحمت و مغفرت کے ساتھ نزول اجلال فرماتا ہے اور کہتا ہے کہ کوئی ہے مجھ سے طالب رحمت کہ اس کی بخشش کردوں۔ ہے کوئی روزی مانگنے والا کہ اسے خوب روزی دوں، ہے کوئی مصیبت کا مارا عافیت خواہ کہ اسے عافیت دوں اسی طرح کا کرم آفریں اعلان طلوع صبح تک ہوتا رہتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ پندرہویں شعبان کی رات اور اس کا دن باری تعالیٰ سے مناجات اور طلب حاجات کا وقت ہے اس دن اللہ تعالیٰ کی رحمت عامہ خصوصیت کے ساتھ بندوں کی جانب متوجہ ہوتی ہے اس لئے اس بابرکت وقت کو غنیمت سمجھنا چاہیے۔ اس لئے کہ آقائے کریم کی رحمت بے پایاں اس وقت بندوں کی جانب متوجہ ہے تو ہماری بندگی اور سراپا احتیاج کا یہی تقاضا ہے کہ اس کی عبادت و اطاعت کے ذریعہ اپنے دامن مراد کو خوب خوب بھرلیں۔

یہ حدیث اگرچہ سند کے اعتبار سے بہت کمزور اور ضعیف ہے لیکن اس کے مضامین کی تائید دوسری صحیح حدیثوں سے ہوتی ہے اس لئے محدثین فضائل شعبان کے ذیل میں اسے ذکر کرتے ہیں۔

ان مذکورہ بالا احادیث سے حسب ذیل امور کا ثبوت ہوتا ہے۔

(۱) ماہ شعبان میں کثرت روزہ کی فضیلت

(۲) اسی ماہ میں سال بھر میں جو نیک اعمال کئے جاتے ہیں وہ الگ لکھ دیئے جاتے ہیں

(۳) سال میں مرنے والوں کا دفتر بھی اسی ماہ میں مرتب کیا جاتا ہے۔

(۴) شعبان کی پندرہویں تاریخ کی شب میں اللہ تعالیٰ کی خصوصی رحمت و مغفرت کا

نزول ہوتا ہے۔

(۵) اس تاریخ کو بے شمار گناہوں کی مغفرت کردی جاتی ہے مگر مشرک اور کینہ ور اس عمومی مغفرت سے محروم رہتے ہیں۔

(۶) پندرہویں شعبان کی رات میں کثرت عبادات اور دن میں روزہ رکھنا بہتر ہے۔

بدعات وخرافات

ہمارے ملک کے اکثر علاقوں میں لوگوں میں یہ رواج ہے کہ پندرہویں شب میں کثرت سے چراغاں کرتے ہیں۔ بعض، بلکہ اکثر علاقوں میں اجتماعی و انفرادی طور پر آتش بازی کا مذموم طریقہ بھی رائج ہے یہ جاہلانہ رسوم اور خلاف شرع امور عقل وشرع دونوں کے خلاف ہیں اسلام میں ایسے امور کی قطعاً گنجائش نہیں درحقیقت مسلمانوں نے یہ رسم ہندوؤں کی دیوالی سے اخذ کرلی ہے۔

ایک طریقہ یہ بھی جاری ہوگیا ہے کہ اس رات کو دینی اجتماع کے نام پر لوگوں کو اکٹھا ہونے کی دعوت دی جاتی ہے اور پھر اس میں وہ ساری قباحتیں پیش آتی ہیں جو اس قسم کے عمومی اجتماعات میں لوگوں کی غفلت اور دین سے بے پرواہی کی بناء پر ظہور پذیر ہوتی ہیں۔ اس خاص تاریخ میں اس قسم کے اجتماعات کا سلف صالحین سے کوئی ثبوت نہیں۔ اس لئے اس دن انفرادی طور پر لوگوں کو ذکر تلاوت قرآن اور نوافل وغیرہ عبادتوں میں مشغول رہنا ہی مستحب اور بہتر ہے۔

حضرات اکابر وسلف صالحین جو مواقع خیر کے متلاشی رہا کرتے تھے اگر اس موقع پر اجتماع کو باعثِ خیر وثواب سمجھتے تو وہ اس سے غافل نہ رہتے اس لئے متعین طور پر پندرہویں شعبان کو کسی خاص اجتماع کے لئے مخصوص کرلینا اور اسے باعث خیر وبرکت باور کرنا بلاشبہ بدعت ہے جس سے اجتناب کرنا چاہیے بالخصوص طبقہ دیوبند کو جو حضرت نانوتویؒ حضرت گنگوہی، حضرت تھانویؒ وغیرہ اکابر کو فہم دین میں پیشوا مانتے ہیں انہیں بطور خاص اس طرح کے امور سے اجتناب کرنا چاہیے۔ وما توفیقی الا باللہ۔

اسلام میں روزہ کی افادیت

اسلام ایک جامع اور مکمل شریعت ہے جس کے اندر مختلف نوع کی عبادتیں ہیں جن میں سے بعض کا تعلق قول سے ہے جیسے ذکر، دُعا، دعوت الی الخیر، وعظ وتذکیر اور تعلیم و تعلّم وغیرہ اور بعض عبادتیں ایسی ہیں جن کا تعلق فعل سے ہے، خواہ وہ بدنی ہوں جیسے نماز یا مالی ہوں جیسے زکوٰۃ وصدقات یا بدنی و مالی دونوں ہوں جیسے حج اور جہاد فی سبیل اللہ اور بعض عبادتیں وہ ہیں جو نہ قولی ہیں اور نہ فعلی بلکہ ان میں صرف رکنا پایا جاتا ہے جیسے روزہ (اکثر علماء نے روزہ کو عبادتِ بدنی میں شمار کیا ہے۔ اور یہی اقرب الی الصواب ہے۔ کیونکہ کسی چیز سے رُکنا بھی تو ایک فعل اور عمل ہی ہے۔

روزہ کی حقیقت

عبادت کی نیت سے صبح صادق سے غروب آفتاب تک کھانے پینے اور جماع سے رُکے رہنے کا نام روزہ ہے یہ عبادت اسلام سے پہلے دیگر مذاہب میں بھی کیفیت وکمیت کے فرق کے ساتھ مشروع تھی جیسا کہ قرآن خود شہادت دے رہا ہے۔

یا ایھا الذین آمنوا کتب علیکم الصیام کما کتب علی الذین من قبلکم لعلّکم تتّقون.

(اے ایمان والو فرض کیا گیا تم پر روزہ جیسے فرض کیا گیا تھا ان لوگوں پر جو تم سے پہلے تھے تاکہ تم پرہیزگار ہو جاؤ)

لیکن جس طرح اسلام نے نماز، زکوٰۃ میں جامعیت ومرکزیت پیدا کر کے انھیں دیگر ادیان و مذاہب کے نماز وزکوٰۃ سے ممتاز بنا دیا۔ اسی طرح سے روزہ کو بھی دیگر مذاہب کے

روزوں کے مقابلہ میں اختصاص و امتیاز عطا کیا گیا۔ چنانچہ اسی غرض سے صوم مفروض کو ایک مہینہ کے لئے خاص کیا گیا اور پھر اس کے لئے وہ مہینہ منتخب کیا گیا جس میں اللہ کی جانب سے مسلمانوں کو دستور ہدایت یعنی قرآن مرحمت فرمایا گیا ارشاد خداوندی ہے۔

شهر رمضان الذی انزل فيه القرآن هدی للناس وبينات من الهدیٰ والفرقان فمن شهد منكم الشهر فليصمه (البقره)

(رمضان وہ مہینہ ہے جس میں نازل کیا گیا قرآن جو انسانوں کے لئے ہدایت ہے اور ہدایت کی واضح دلیل اور حق و باطل کے درمیان فرق کرنے والا ہے لہٰذا جو شخص اس مہینہ کو پائے تو اُس کے روزے ضرور رکھے)۔

روزہ کی مصلحتیں

(۱) ہمیں اس بات پر یقین کامل ہے کہ روزہ کی فرضیت میں بہت سی حکمتیں و مصلحتیں پوشیدہ ہیں اگرچہ ہمارا نارسا ذہن ان تمام اسرار و حکم اور مصالح تک نہ پہنچ سکے البتہ بعض حکمتیں جو سمجھ میں آرہی ہیں انھیں یہاں بیان کیا جارہا ہے۔

اس سلسلے میں ہمیں سب سے پہلے خود اپنے وجود پر...غور کرنا چاہئے کہ انسان کی اصل حقیقت کیا ہے۔ کیا انسان گوشت و پوست اور ہڈی چمڑے کے اس ظاہری مجموعہ کا نام ہے یا اس کی حقیقت اس ظاہری ڈھانچہ کے علاوہ کچھ اور ہے۔ ظاہر ہے کہ صرف اس ظاہری ڈھانچہ کو انسان کبھی نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ اس صورت میں انسان سے زیادہ حقیر اور کم درجہ کی کوئی اور مخلوق نہ ہوگی حالانکہ انسان اشرف مخلوقات اور خلاصۂ کائنات ہے اس لئے لازمی طور پر یہ ماننا ہوگا کہ انسان اس ظاہری شکل وصورت کا نام ہرگز نہیں ہے بلکہ یہ کسی اور ہی چیز کا نام ہے جس کی بنا پر وہ تمام مخلوقات میں ایک امتیازی مقام رکھتا ہے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر وہ کونسی چیز ہے جس کے ذریعہ انسانیت کا وجود متحقق ہوتا ہے تو نفسِ انسانی میں غور وفکر کرنے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ درحقیقت انسان ایک جوہر روحانی کا نام ہے جس کے اندر اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت بالغہ سے غور وفکر کی استعداد

وصلاحیت پیدا کر رکھی ہے جس کے ذریعہ وہ نہ صرف سمجھتا بوجھتا ہے بلکہ پوری کائنات پر حکومت کرتا ہے اور اسی امتیازی وصف کی بناء پر مسجود ملائکہ بنایا گیا۔ چنانچہ قرآن حکیم اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔

اذ قال ربّك للملائكة انى خالق بشرًا من طين فاذا سوّيتهٗ و نفخت فيه من روحى فقعوا له سَاجدين. (سورۂ ص)

(جب کہا تمہارے رب نے فرشتوں سے میں بناتا ہوں ایک انسان مٹی کا۔ پھر جب ٹھیک بنا چکوں اور پھونکوں اس میں اپنی رُوح سے تو تم جھک پڑو سجدہ میں۔)

چونکہ خواہشاتِ نفسانیہ کو دبانے سے قوتِ روحانیہ کو تقویت حاصل ہوتی ہے روزہ میں خواہشِ بطن وفرج کی شکست وریخت ہوتی ہے۔ اس لئے لازمی طور پر روحانیت کو قوت وطاقت ملے گی اور اسی جوہر روحانی سے آدمی انسان کہلاتا ہے تو گویا روزہ کے ذریعہ انسانیت کی تشکیل وتکمیل ہوتی ہے۔

(۲) روزہ سے جہاں روح کو طاقت ملتی ہے وہیں اس سے بدن کی بھی اصلاح ہوتی ہے اس لئے کہ اکثر امراض معدہ کی خرابی کی بناء پر پیدا ہوتے ہیں (چنانچہ کہا جاتا ہے "المعدة ام الامراض" معدہ بیماریوں کی جڑ ہے۔ نبی کریم ...... نے بھی ایک حدیث میں فرمایا ہے کہ "ما ملاء ابن آدم وعاء شرا من بطنه" انسان کے لئے سب سے خراب بات اپنے شکم کو پر کرنا ہے۔ لہٰذا جب پیٹ کا بھرنا۔ امراض اور بیماریوں کا پیش خیمہ ہے، تو اس کا علاج یہ ہے کہ پیٹ کو خالی رکھا جائے اور روزہ کے اندر یہی بات ہے کہ پیٹ کو خالی رکھا جاتا ہے۔ جس سے بدن کی اصلاح ہو جاتی ہے اور آدمی بہت سے امراض سے محفوظ ہو جاتا ہے۔

(۳) روزہ کا ایک اہم فائدہ یہ بھی ہے کہ اس کے ذریعہ سے آدمی کے اندر صبر و استقامت کی قوت پیدا ہوتی ہے (جو انسان کے لئے بڑی خوبی کی چیز ہے) روزہ دار کے سامنے عمدہ اور مرغوب غذائیں ٹھنڈا اور شیریں پانی رکھا رہتا ہے مگر ان کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا حالانکہ بظاہر اس کو ان چیزوں کے استعمال کرنے سے کوئی چیز مانع نہیں

ہے۔ لیکن اس کا ضمیر اس کے لئے تیار نہیں ہوتا کہ وہ اپنے روزہ کو برباد کر کے خدا کے غضب کا مستحق بنے ایک مہینہ کی یہ مشق وتمرین لامحالہ انسان کے اندر استقلال و استقامت کی طاقت پیدا کرے گی۔ چنانچہ ماہرین نفسیات نے اپنے علم وتجربہ کی بنیاد پر یہ بات کہی ہے کہ روزہ سے زیادہ ارادوں میں پختگی اور عزائم میں پائیداری پیدا کرنے والی کوئی دوسری چیز نہیں ہے۔ اسی لئے نبی کریم ...... نے بطور خاص جوانوں کو مخاطب کر کے فرمایا ہے۔

یا معشر الشباب من استطاع منکم باءۃ فلیتزوج فانه اغض للبصر واحصن للفرج ومن لم یستطع فعلیه بالصوم فانه له وجاء. (بخاری شریف)

(اے جوانو! تم میں سے جس کے اندر استطاعت ہو وہ ضرور نکاح کرے اس لئے کہ نکاح نگاہوں کو پست رکھنے والا اور فرج کی حفاظت کرنے والا ہے اور جو نکاح کی طاقت نہیں رکھتا وہ اپنے اوپر روزہ کو لازم کر لے اس لئے کہ روزہ اس کے لئے بندش کا کام دے گا)۔

ایک موقع پر اسی مضمون کو یوں بیان فرمایا:

لکُلّ شیءٍ زکوٰۃ وزکوٰۃ الجسد الصوم، والصوم نصف الصبر.

(ہر چیز کی زکوٰۃ ہے اور جسم کی زکوٰۃ روزہ ہے اور روزہ نصف صبر ہے)

اس حدیث پاک میں روزہ کو نصف صبر اس لئے فرمایا گیا ہے کہ انسان کے اندر تین قوتیں ہیں ایک قوت شہوانی، دوسری قوت غضبی اور تیسری قوت روحانی اور روزہ سے انسان قوت شہوانی پر غالب آجاتا ہے تو گویا اُسے نصف صبر حاصل ہوگیا۔

(۴) اسلام صرف نام ونمود کا مذہب نہیں ہے بلکہ یہ دین جہاد ہے۔

یہ شہادت گہ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

اور جہاد کیلئے صبر واستقامت ایک لازمی چیز ہے۔ لہٰذا جو شخص اپنی ذات کے مقابلہ میں جہاد نہیں کرسکتا وہ اپنے دشمن سے کیا مقابلہ کرے گا۔ اور جس کا اپنے نفس پر قابو نہیں چلتا وہ اپنے دشمن کو کیونکر زیر کرے گا۔ اور جسے ایک دن کی بھوک وپیاس پر صبر نہیں ہوتا وہ

گھر بار چھوڑنے پر کیسے صبر کرے گا۔ اس لئے سال میں ایک ماہ کے روزے کا حکم دے کر صبر واستقامت کی تمرین کرائی جاتی ہے تا کہ آدمی جہاد کیلئے تیار ہو جائے۔

(۵) روزہ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں کی قدر ومنزلت کا عرفان پیدا ہوتا ہے کیونکہ ''تعرف الاشیاء باضدادہا'' جب تک آدمی کو بھوک و پیاس کی شدّت کا احساس نہ ہو اُسے کھانے پینے کی سچی قدر کیا ہوگی اور جب ان نعمتوں کی قدر ومنزلت کی معرفت حاصل ہوگی تو اس کا زیادہ سے زیادہ حق ادا کرنے کی کوشش کرے گا تو اس طرح روزہ اللہ تعالیٰ کے شکر اور اس کی عبادت پر آمادہ کرنے میں ایک قوی اثر رکھتا ہے۔ اسی لئے ہمارے آقا ومولیٰ...... نے فقر کو غنا پر ترجیح دی۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

عرض عليّ ربي ليجعل لي بطحاء مكة ذهبا قلت لا يارب ولكن اشبع يوما واجوع يوما فاذا جعت تضرعت اليك وذكرتك واذا شبعت شكرتك وحمدتك. (ترمذی)

(مجھ پر میرے رب نے یہ بات پیش کی کہ میرے لئے بطحاء مکہ سونا بنا دیا جائے تو میں نے عرض کیا اے میرے رب مجھے اس کی ضرورت نہیں میں تو ایک دن آسودہ شکم رہوں گا اور ایک دن بھوکا رہوں گا۔ جس دن بھوکا رہوں گا آپ سے تضرع کروں گا اور آپ کو یاد رکھوں گا۔ اور جس دن آسودہ رہوں گا آپ کا شکر اور حمد کروں گا۔)

(۶) پھر روزہ کی وجہ سے جب آدمی بھوک و پیاس کی شدت کو محسوس کرتا ہے تو اس کے اندر غرباء ومساکین کی تکلیف کا احساس بیدار ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ناز ونعمت میں پلا ہوا جس نے بھوک و پیاس کی تکلیف کبھی برداشت نہ کی ہو۔ اُسے بھوکوں، پیاسوں کی حالت زار اور اذیت کا کیا علم ہوگا۔ لیکن روزہ کی وجہ سے جب اُسے بھوک کی اذیت کا ذاتی تجربہ ہوتا ہے تو پھر اس کے اندر یہ جذبہ پیدا ہوگا، کہ غریبوں اور ناداروں کی امداد واعانت کر کے انھیں اس تکلیف واذیت سے بچائے۔ چنانچہ آنحضرت...... کے متعلق اربابِ سیر لکھتے ہیں کہ حیاتِ طیبہ کے آخری دور میں جب اموال فئی کی وجہ سے آپ کی تنگدستی دور ہو گئی تھی اس زمانہ میں آپ نے روزوں کی تعداد میں زیادتی فرما دی تھی۔ اور جب آپ سے

اس کا سبب پوچھا گیا تو فرمایا کہ ’’روزہ اس لئے رکھتا ہوں تا کہ غریبوں کو بھول نہ جاؤں‘‘۔

(۷) اوران سب مصالح کے علاوہ سب سے اہم بات جو روزہ سے حاصل ہوتی ہے وہ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے حوالہ کر دینا ہے اور یہ تسلیم اور خود سپردگی ہر عبادت کا حاصل اور خلاصہ ہے جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے۔

سمعنا و اطعنا غفرانك ربّنا و اليك المصير. (البقرہ)

(ہم نے سنا اور قبول کیا تیری بخشش چاہتے ہیں اے ہمارے رب اور تیری طرف لوٹ کر جانا ہے۔)

ان صلاتی و نسکی و محیای و مماتی لِلّٰهِ ربّ العٰلمين.

(یقیناً میری نماز اور میری دیگر عبادتیں اور میری حیات اور موت سب اللہ ہی کے لئے ہے)

اور یہ تسلیم ورضا روزہ کے ذریعہ یوں حاصل ہوتی ہے کہ روزہ دار کے سامنے اس کی مرغوبات موجود ہیں جن کے استعمال پر وہ قدرت بھی رکھتا ہے اور ان کے استعمال کی اُسے شدید خواہش بھی ہوتی ہے۔ لیکن وہ محض اللہ کی رضا کیلئے انھیں ہاتھ نہیں لگاتا اور ان کے استعمال سے رُکا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے روزہ کو بطور خاص اپنی جانب منسوب فرمایا ہے۔

کل عمل ابن آدم له الا الصيام فانه لی وانا اجزیٰ به یدع طعامه من اجلی ويدع شرابه من اجلی ويدع لذته من اجلی ويدع زوجته من اجلی. (ابن خزیمہ)

(انسان کا ہر عمل اس کے لئے ہے البتہ روزہ یہ خاص میرے لئے اور میں ہی اس کا بدلہ دوں گا وہ میرے لئے اپنا کھانا چھوڑ دیتا ہے میرے لئے اپنا پینا چھوڑ دیتا ہے، میرے لئے اپنی لذّت چھوڑ دیتا ہے اور میرے لئے اپنی بیوی کو چھوڑ دیتا ہے۔)

روزہ کی مشروعیت سے مقصود انسان کو تنگی اور دشواری میں مبتلا کرنا نہیں ہے جیسا کہ خود اللہ تعالیٰ روزہ کی فرضیت کے بعد اس حکمت کو بیان کرتے ہیں۔

یرید اللّٰہ بکم الیسر و لا یرید بکم العُسر. (البقرہ)

(اللہ چاہتا ہے تم پر آسانی اور نہیں چاہتا ہے تم پر دشواری)۔

بلکہ روزہ سے مقصود روحانیت کو قوی کرنا ارادہ میں استحکام پیدا کرنا اور صبر و رضا کا خوگر بنانا جسم کو امراض سے بچانا اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی انسان کے دل میں قدر و منزلت پیدا کرنا ہے۔

روزہ اور ہمارا طرز عمل

رمضان المبارک کا روزہ جن مقاصد حسنہ کی تحصیل کے لئے فرض کیا گیا تھا۔ ہمارے سلف صالحین نے روزہ کے آداب و واجبات کی رعایت کرکے ان مقاصد کو پورے طور پر حاصل کیا۔ وہ حضرات دن کو روزہ رکھتے تھے اور رات بھر ذکر و فکر اور نماز و تلاوت میں مشغول رہتے تھے اور رمضان المبارک کے ایک ایک لمحہ کو اللہ کی عبادت میں گذارتے تھے وہ اپنی زبانوں کو بیہودہ گوئی سے بند رکھتے تھے اور کانوں کو لغو اور فحش باتوں کے سننے سے محفوظ رکھتے تھے، ان کی آنکھیں حرام چیزوں کی طرف قطعاً نہیں اٹھتی تھیں۔ اس طرح اُن کے تمام اعضاء روزہ سے رہتے تھے۔ لیکن آج ہمارا یہ حال ہے کہ ہم اس مبارک مہینہ کو بھی دیگر مہینوں کی طرح ضائع کر دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے روزہ کو اس لئے فرض کیا تھا کہ اس کے ذریعہ روح و قلب کو فائدہ پہنچے مگر ہم نے روزہ کو پیٹ اور معدہ کو پُر کرنے کا مہینہ بنالیا۔ اللہ نے اُسے حلم و صبر کے حاصل کرنے کا ذریعہ بنایا تھا مگر ہم نے اُسے غیض و غضب اور غم و غصّہ کا مہینہ بنالیا۔ اللہ تعالیٰ نے اُسے سکینت و وقار کا مہینہ بنایا تھا۔ مگر ہم نے اُسے گالی گلوج اور لڑائی جھگڑے کا مہینہ بنالیا اللہ تعالیٰ نے روزہ کو اس لئے فرض کیا تھا کہ ہماری عادتوں میں تبدیلی آئے مگر ہم نے سوائے کھانوں کے اوقات میں تبدیلی پیدا کرنے کے کچھ نہیں کیا۔

ع ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا

تفسیر آیات صیام

بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

الحمد للّٰہ رب العالمین و الصلوٰۃ و السلام علی خاتم الانبیاء و المرسلین اما بعد:

(۱) یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ ٥

ترجمہ: اے ایمان والو فرض کیا گیا تم پر روزہ جیسے فرض کیا گیا تھا تم سے اگلوں پر تاکہ تم پرہیزگار ہو جاؤ۔

تفسیر: -صیام کے لفظی معنی رکنے کے ہیں اور شریعت اسلامی کی اصطلاح میں عبادت کی نیت کے ساتھ صبح صادق سے غروب شمس تک کھانے، پینے اور عورت سے مباشرت کرنے سے رکنے کو صوم کہتے ہیں۔ صوم یعنی روزہ ان عبادات میں سے ہے جن کو اسلام کے عمود و شعائر قرار دیا گیا ہے۔ رسولِ خدا......کا ارشاد ہے: بنی الاسلام علی خمس شھادۃ ان لا الہ الا اللّٰہ وان محمدا رسول اللّٰہ واقام الصلوٰۃ وایتاء الزکاۃ والحج وصوم رمضان (رواہ ابن عمرؓ متفق علیہ)(۱)

اسلام کی عمارت پانچ ستونوں پر قائم کی گئی ہے اوّل خدائے تعالیٰ کی وحدانیت اور حضرت محمد......کی رسالت کی گواہی دینا، دوم: نماز قائم کرنا، سوم: زکوٰۃ دینا، چہارم: حج کرنا، پنجم: رمضان کے مہینہ کے روزے رکھنا۔

انسان کے اندر شہوت وغضب دو قوتیں ایسی ہیں جو گناہوں کا منبع و سرچشمہ ہیں۔ ظلم وفساد، قتل وغارت گری، چوری ورہزنی، بے حیائی و بدکاری جیسے انسانیت سوز جرائم انہیں دونوں قوتوں کے بیجا غلبہ واستعمال سے ظہور میں آتے ہیں چوں کہ دعوتِ قرآن کا اہم

---

(۱) مشکوٰۃ ج:۱۔

وبنیادی مقصد نفسِ انسانی کی تہذیب واصلاح ہے۔ کیوں کہ اس کے بغیر نہ تو انسانی نفوس کا تعلق ملاء اعلیٰ سے قائم ہوسکتا ہے۔ اور نہ ہی زمین میں عدل وانصاف، طہارت وپاکیزگی اور امن وامان کا ماحول پیدا ہوسکتا ہے۔ روزہ قوت شہوت وغضب کو اعتدال میں رکھنے اور نفس کی تہذیب وتطہیر میں اکسیر اعظم کی حیثیت رکھتا ہے اسی لئے مصلح انسانیت نبی رحمت ……کی ہدایت ہے "یا معشر الشباب من استطاع منکم البائة فلیتزوج فانه اغض للبصر واحصن للفرج ومن لم یستطع فعلیه بالصوم" (رواہ عبداللہؓ بن مسعود متفق علیہ)(۱)

اے جوانو تم میں سے جو مصارف نکاح کی استطاعت وقدرت رکھتا ہے وہ نکاح کرلے کیونکہ نکاح نگاہوں کو خوب پست رکھنے والا اور شرم گاہ کی اچھی طرح سے حفاظت کرنے والا ہے۔ اور جسے نکاح کرنے کی قدرت نہ ہو تو اس پر روزہ رکھنا ہے۔ کیونکہ روزہ قوتِ شہوت کو توڑ دیتا ہے۔

اس حکمت کے پیش نظر پیروانِ دعوت قرآن کو خدائے علیم ورحیم کی جانب سے حکم صادر فرمایا گیا کہ اے مسلمانو جس طرح ان لوگوں پر جو تم سے پہلے گذر گئے روزہ فرض کیا گیا تھا اسی طرح تم پر بھی فرض کیا گیا ہے تاکہ تم روزہ کی بدولت رفتہ رفتہ متقی وپرہیزگار بن جاؤ۔

(۲) اَیَّامًا مَعۡدُوۡدَاتٍ فَمَنۡ کَانَ مِنۡکُمۡ مَرِیۡضًا اَوۡ عَلٰی سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنۡ اَیَّامٍ اُخَرَ، وَعَلَى الَّذِیۡنَ یُطِیۡقُوۡنَهٗ فِدۡیَةٌ طَعَامُ مِسۡکِیۡنٍ، فَمَنۡ تَطَوَّعَ خَیۡرًا فَهُوَ خَیۡرٌ لَّهٗ وَاَنۡ تَصُوۡمُوۡا خَیۡرٌ لَّکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ٥

ترجمہ: (یہ فرض روزے) چند روز ہیں گنتی کے۔ پھر جو کوئی تم سے بیمار ہو یا مسافر تو اس پر ان کی گنتی ہے اور دنوں سے اور جن کو طاقت ہے روزہ کی (اور اس طاقت کے باوجود روزہ نہ رکھیں) ان کے ذمہ بدلہ ہے ایک فقیر کا کھانا کھلانا۔ پھر جو کوئی خوشی سے کرے نیکی تو اچھا ہے اس کے واسطے۔ اور روزہ رکھو تو بہتر ہے تمہارے لئے اگر تم سمجھ رکھتے ہو۔

تفسیر: ایاماً معدوداتٍ۔ یعنی گنتی کے چند سے مراد بقول ترجمان قرآن حضرت عبداللہ بن عباس اور ابومسلم وحسن اور امام شافعیؒ واکثر محققین کے ماہ رمضان ہے۔ پھر اس

---

(۱) مشکوٰۃ ج ۲، وتفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۲۱۳۔

گنتی کے روزوں میں یہ آسانی دی گئی کہ تم میں جو شخص بیمار ہو کہ روزہ رکھنا اس کے لئے مشکل یا مضر ہو۔ یا شرعی سفر میں ہو تو اسے ایام رمضان میں روزہ نہ رکھنے کی اجازت ہے البتہ دوسرے دنوں میں روزے رکھ کر چھوٹے روزوں کی تعداد پوری کرلے۔ مریض و مسافر پر فوت شدہ روزوں کی یہ قضا واجب ہے "فَعِدَّةٌ مِنْ اَيَّامٍ اُخَرَ" کے جملہ سے اسی قضائے واجب کا بیان ہے۔

پھر ایک دوسری سہولت یہ دی گئی ہے کہ جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہیں مگر ابتداء میں عادت نہ ہونے کی وجہ سے مسلسل ایک ماہ کا روزہ رکھنا ان پر دشوار اور نہایت شاق تھا تو ان کو اختیار تھا کہ چاہے تو روزہ رکھیں اور چاہے تو روزہ نہ رکھیں اور ہر ایک روزہ کے بدلے ایک مسکین کو دو وقت پیٹ بھر کر کھانا کھلائیں (۱) کیونکہ جب ایک دن کا کھانا دوسرے کو دے دیا گیا تو گویا اپنے آپ کو ایک دن کے کھانے سے روک لیا تو اس طرح فی الجملہ روزہ کی مشابہت ہوگئی پھر جب لوگ روزہ کے عادی ہوگئے تو یہ سہولت ختم کردی گئی۔

تنبیہ:- اس آیت کی ایک تفسیر اور ہے جس کی رو سے آیت منسوخ نہ ہوگی۔

مسئلہ: ایک روزہ کا فدیہ نصف صاع گیہوں یا اس کی قیمت ہے نصف صاع مروجہ سیر اسی (۸۰) تولہ کے حساب سے تقریباً پونے دو سیر ہوتے ہیں۔ یہ فدیہ کسی معاوضہ کے طور پر دینا درست نہیں ہے بلکہ خالص اللہ کی رضا جوئی کے لئے مسکین کو دیا جائے۔ پھر ایک روزہ کے فدیہ کو دو مسکینوں میں تقسیم کرنا اگرچہ قول مفتی بہ کے اعتبار سے درست ہے مگر خلاف اولیٰ ہے اس لئے ایک فدیہ ایک ہی مسکین کو دیا جائے۔

مسئلہ: اگر کسی شخص کو اپنی تنگدستی کی بناء پر فدیہ ادا کرنے کی وسعت نہ ہو وہ فقط استغفار کرے اور دل میں نیت رکھے کہ جب وسعت ہوگی تو ادا کردوں گا۔

آگے کار ثواب کی ترغیب دلاتے ہوئے ارشاد ہے "فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا الخ" یعنی جو شخص اپنی خوشی سے ایک دن کے کھانے سے زیادہ ایک مسکین کو دیدے یا کئی مسکینوں کا پیٹ بھر دے تو سبحان اللہ بہت بہتر ہے۔ پھر رمضان کے روزوں کی فضیلت

---

(۱) تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۲۱۴۔

واہمیت کی جانب وان تصوموا الخ سے متوجہ فرمایا گیا ہے کہ اگر تم کو رمضان کے روزوں کی فضیلت ومنافع معلوم ہوں تو جان لو کہ روزہ رکھنا فدیہ مذکورہ دینے سے بہتر ہے اور روزہ رکھنے میں کوتاہی نہ کرو۔

(۳) شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرآنُ هُدىً لِلنَّاسِ وَبَیِّنٰتٍ مِنَ الْهُدٰی وَالْفُرْقَان، فَمَنْ شَهِدَ مِنْکُمُ الشَّهْرَ فَلْیَصُمْهُ، وَمَنْ کَانَ مَرِیْضًا اَوْ عَلٰی سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ اَیَّامٍ اُخَرَ، یُرِیْدُ اللّٰهُ بِکُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیْدُ بِکُمُ الْعُسْرَ وَلِتُکْمِلُوْا الْعِدَّةَ وَلِتُکَبِّرُوْ اللّٰهَ عَلٰی مَاهَدٰکُمْ وَلَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ ٥

ترجمہ:- (وہ ایام معدودات یعنی گنتی کے دن جن میں روزہ فرض کیا گیا ہے) مہینہ رمضان کا ہے۔ جس میں قرآن نازل ہوا (جو ذریعہ) ہدایت ہے لوگوں کے واسطے اور روشن دلیلیں ہدایت پانے کی اور حق کو باطل سے جدا کرنے کی۔ سو جو کوئی پائے تم میں سے اس مہینہ کو تو روزہ رکھے اس کے اور جو کوئی بیمار یا مسافر ہو تو (اس حالت میں اس کو روزہ نہ رکھنے کی سابقہ مذکورہ اجازت ہے) اور اس پر ان فوت شدہ روزوں کی تعداد اور دنوں میں (بطور قضا کے) پوری کرنی واجب ہے۔ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے تم پر آسانی اور نہیں چاہتا تم پر دشواری۔ اور اس واسطے کہ تم پوری کرو گنتی اور تاکہ بڑائی بیان کرو اللہ کی اس بات پر کہ تم کو ہدایت کی اور تاکہ تم احسان مانو۔

تفسیر:- گذشتہ حکم میں روزوں کی تعیین نہیں تھی کہ وہ کتنے دنوں کے ہوں گے اس آیت کے ذریعہ ایام معدودہ کی تعداد متعین طور پر بیان کردی گئی ہے کہ ان سے پورے ماہ رمضان کے ایام مراد ہیں۔ اسی کے ساتھ روزہ کی ماہِ رمضان کے ساتھ تخصیص کی علت وحکمت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے کہ اسی بابرکت مہینہ میں قرآن اتارا گیا ہے جو بنی نوع انسان کے لئے ذریعہ ہدایت ہے۔ جس کی ہدایت اور حق وباطل کے درمیان امتیاز دینے کی صفت آفتاب نیم روز کی طرح روشن وآشکارا ہے۔ اس عظیم نعمت کی شکر گذاری کے طور پر روزوں کی یہ خاص عبادت جو کلام الٰہی کے ساتھ خصوصی ربط وتعلق رکھتی ہے مقرر کی گئی ہے۔ لہٰذا جو کوئی اس ماہِ مبارک میں حاضر یعنی مقیم ہو وہ ضرور روزہ رکھے اور جو مریض ہو کہ روزہ کی

طاقت نہیں رکھتا یا روزہ اس کے لئے مضر ہو یا شرعی طور پر مسافر ہو اس کے لئے سہولت سابقہ بدستور باقی ہے اس حالت میں افطار کر سکتا ہے۔ البتہ دوسرے دنوں میں چھوٹے روزوں کی تعداد بذریعہ قضا پوری کر لے۔ پھر مرض وسفر میں افطار اور بعد میں قضا کے حکم کی علت بیان کی گئی ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ سہولت و آسانی کرنا چاہتا ہے دشواری نہیں اس لئے مرض وسفر میں روزہ نہ رکھنے کی اجازت دی اور دوسرے دنوں میں قضا کا حکم اس مصلحت سے دیا کہ تم روزہ کی تعداد پوری کر کے پورے اجر وثواب کے قابل بن جاؤ اور اس تکمیل فریضہ کے بعد تمہارا دل اللہ کی کبریائی وعظمت سے معمور ہو کر پکار اٹھے ''اللہ اکبر'' اس نے ہمیں قضا کا حکم دے کر ایک ایسا راستہ دکھایا کہ جس سے رمضان المبارک کی فوت شدہ خیر وبرکت کی یک گونہ تلافی ہوگئی۔ پھر تو پوری جمعیتِ خاطر اور بشاشت قلب کے ساتھ اس خدائے حکیم ورحیم کا شکر بجالاؤ کہ اس نے ایسی جامع وبابرکت عبادت کی توفیق بخشی جو ثواب آخرت قرب وحضور کے ساتھ تہذیب نفس کے لئے بھی ایک نسخہ کیمیا اثر ہے۔

(۴) وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِىْ عَنِّى فَاِنِّىْ قَرِيْبٌ، اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَان فَلْيَسْتَجِيْبُوْالِى وَلْيُؤْمِنُوْا بِىْ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْن.

ترجمہ:- جب تجھ سے پوچھیں میرے بندے میرے متعلق (کہ میں ان سے قریب ہوں یا دور ہوں انہیں بتا دیجئے کہ) میں تو قریب ہوں قبول کرتا ہوں دعا مانگنے والے کی دعا کو تو چاہیئے کہ وہ حکم مانیں میرا اور مجھ پر یقین رکھیں تا کہ نیک راہ پر آئیں۔

تفسیر:- رمضان المبارک قبولیت دعا کا مہینہ ہے بالخصوص افطار کے وقت کی دعا رد نہیں کی جاتی۔ چنانچہ رسول اللہ...... کا ارشاد ہے ثلاثه لا ترد دعوتهم، الامام العادل، والصائم حين يفطر، ودعوة المظلوم (رواه الامام احمد والترمذى وغيرهما) تین لوگوں کی دعائیں رد نہیں کی جاتیں، ایک عادل بادشاہ کی دوسرے بوقت افطار روزہ دار کی، تیسرے مظلوم کی اسی لئے رمضان المبارک کے احکام کے درمیان اس آیت کو لا کر اس بات کی جانب متوجہ کیا گیا ہے کہ اس مہینہ میں دعاؤں کا خاص اہتمام کرنا چاہیئے۔ علاوہ ازیں روزہ قربِ خداوندی اور نفس میں فروتنی وعاجزی کا اہم ذریعہ ہے اور

دعا کی بھی یہی خاصیت وصفت ہے، اس لئے فائدۂ مزید کی غرض سے احکام رمضان کے درمیان اس آیت پاک کو لاکر دعاء کا گراں قدر انعام عطا کیا گیا ہے۔ پھر دعاء سے پہلے تکبیر و ثنا کے ذکر سے آداب دعا کی جانب بھی لطیف اشارہ ہوگیا۔ ”وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ“ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قرب و وصول طلب پر موقوف ہے بغیر طلب کے عادۃً یہ دولتِ بے بہا نصیب نہیں ہوتی۔

عطار ہو، رومی ہو، رازی ہو، غزالی ہو
کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہ سحرگاہی

پھر قبولیت دعا کے انعام کا ذکر فرما کر اطاعتِ احکام کی ترغیب دی گئی ہے کیونکہ روزہ کی عبادت میں رخصتوں اور سہولتوں کے باوجود کسی قدر مشقت ہے اس کو سہل کرنے کے لئے اپنی خصوصی عنایت وتوجہ کا ذکر فرمایا کہ میں اپنے بندوں سے قریب ہوں اور ان کی حاجتوں کو پورا کرتا ہوں، لہٰذا بندوں کو بھی چاہئے کہ میرے احکام کی تعمیل میں کچھ مشقت بھی ہو تو برداشت کریں۔

(۵) اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَائِكُمْ هُنَّ لِبَاسٌ لَكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَهُنَّ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَختَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ، فَالْئٰنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الخَيطُ الاَبْيَضُ مِنَ الخَيطِ الاَسْوَدِ مِنَ الفَجرِ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى اللَّيْلِ وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ فِی المَسْجِدِ تِلكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا كَذالِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ آيَاتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ o

ترجمہ:- حلال ہوا تم کو روزہ کی رات میں بے حجاب ہونا اپنی عورتوں سے۔ وہ پوشاک ہیں تمہاری اور تم پوشاک ہو ان کی۔ اللہ کو معلوم ہے کہ تم خیانت کرتے تھے اپنی جانوں سے۔ سو معاف کیا تم کو اور درگذر کی تم سے۔ تو اب ملو اپنی عورتوں سے اور طلب کرو اس چیز کو جو لکھ دیا ہے اللہ نے تمہارے لئے۔ اور کھاؤ، پیو اس وقت تک کہ صاف نظر آئے تم کو دھاری سفید صبح کی جدا دھاری سیاہ سے پھر پورا کرو روزہ کو رات تک۔ اور نہ ملو عورتوں

سے جس وقت کہ تم اعتکاف کرو مسجدوں میں یہ خداوندی ضابطے ہیں سو ان کے نزدیک نہ جاؤ۔ اسی طرح بیان فرماتا ہے اللہ اپنے احکام لوگوں کے واسطے تاکہ وہ بچتے رہیں۔

تفسیر: - صحیح بخاری وغیرہ میں بروایت براء ابن عازب مذکور ہے کہ فرضیت صوم کے آغاز میں افطار کھانے پینے اور بیوی سے ہمبستری کی اسی وقت تک اجازت تھی جب تک کہ آدمی سو نہ جائے۔ سو جانے کے بعد یہ سب چیزیں ممنوع ہو جاتی تھیں۔ قیس بن صرمہ انصاری رضی اللہ عنہ دن بھر کام میں مشغول رہ کر افطار کے وقت گھر پہنچے تو گھر میں کھانے کے لئے کچھ نہ تھا بیوی نے کہا میں کہیں سے کچھ کھانے کی چیز لاتی ہوں۔ جب وہ واپس آئیں تو دن بھر کی تکان کی وجہ سے ان کی آنکھ لگ گئی تھی اب بیدار ہوئے تو کھانا ممنوع و حرام ہو چکا تھا۔ اگلے دن اسی طرح بھوکے پیاسے روزہ رکھا تو دوپہر کے وقت بھوک وضعف کی شدت سے بے ہوش ہو گئے (۱) اسی طرح بعض اور صحابہؓ سونے کے بعد اپنی بیویوں کے ساتھ اختلاط میں مبتلا ہو کر پریشان و نادم ہوئے ان واقعات کے بعد یہ آیت نازل ہوئی جس کی رو سے پوری رات کھانے پینے وغیرہ کی اجازت ہو گئی اور روزہ کے وقت کو پورے طور پر منضبط کر دیا گیا کہ طلوع صبح صادق سے غروب آفتاب تک کا وقت روزہ کا ہے اس کے سوا تمام رات افطار کا؛ بلکہ بذریعہ حدیث آخری شب میں سحری کھانے کو سنت قرار دیدیا گیا۔

"هُنَّ لِبَاسُ لكم الخ" کے جملہ سے انتہائی نفاستِ اعجاز کے ساتھ اس حکم کی علت کی جانب اشارہ کر دیا گیا کہ زوجین کا باہمی ارتباط و احتیاج نیز ہر ایک کا دوسرے کے ذریعہ تحفظ جیسی مجبوریاں اور مصلحتیں اس رعایت و سہولت کی داعی ہیں لہٰذا رمضان کی راتوں میں اپنی بیویوں کے ساتھ ہمبستری کر سکتے ہو۔ ساتھ ہی اس لذت نفسانی کو عبادت ربانی بنا دینے کے لئے یہ ہدایت فرمائی کہ اس اختلاط مباشرت کا مقصد لذت طلبی نہیں بلکہ طلب اولاد ہونا چاہئے کیونکہ قوم میں تعداد کی کثرت خاندان، معاشرے اور ملت کی سر بلندی کا باعث ہے علاوہ ازیں صالح اولاد آخرت میں والدین کی بخشش اور ترقیٔ درجات کا ذریعہ

---

(۱) قرطبی ص ۳۱۴، ۳۱۵ ج ۲ و ابن کثیر ص ۲۲۰ ج ۱۔

بنیں گی۔ یہ اسلام ہی کے نظام تربیت کا اعجاز ہے کہ ایک خالص جنسی عمل کو اجر وثواب کا وسیلہ بنادیا۔

”حتّی یتبیَّنَ لَکُمُ الخیط الاَبْیَضُ“ اس آیت میں رات کی تاریکی کو سیاہ خط اور صبح کی روشنی کو سفید خط کی مثال سے بتلا کر کھانے پینے کے حرام ہوجانے کا صحیح وقت متعین فرمادیا اور اس میں افراط وتفریط کے احتمالات کو ختم کرنے کے لئے حتی یتبینَ کا لفظ بڑھادیا کہ نہ تو وہمی مزاج لوگوں کی طرح صبح صادق سے کچھ پہلے ہی کھانے پینے وغیرہ کو حرام سمجھو اور نہ ایسی بے فکری اختیار کرو کہ صبح کی روشنی کا یقین ہوجانے کے باوجود کھاتے پیتے رہو۔ بلکہ کھانے پینے اور روزہ کے درمیان حد فاصل صبح صادق کا تیقن ہے اس تیقن سے پہلے کھانے پینے کو حرام سمجھنا درست نہیں اور تیقن کے بعد کھانے پینے میں مشغول رہنا بھی حرام اور روزے کے لئے مفسد ہے اگرچہ ایک ہی منٹ کے لئے ہو سحری کھانے میں وسعت اور گنجائش صرف اسی وقت تک ہے جب تک صبح صادق کا یقین نہ ہوجائے وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُم عَاكِفُوْنَ فِیْ الْمَسَاجِدِ ہاں بحالتِ اعتکاف رات میں بھی یہ مباشرت جائز نہیں البتہ کھانے پینے کی اجازت ہے اعتکاف کے لغوی معنی کسی جگہ ٹھہرنے کے ہیں اور اصطلاح شریعت میں خاص شرائط کے ساتھ مسجد میں ٹھہرنے اور قیام کرنے کا نام اعتکاف ہے۔ ”وفی الْمَسَاجِدِ“ کے عموم سے ثابت ہوا کہ اعتکاف ہر مسجد میں ہوسکتا ہے۔ حضرات فقہاء نے جو یہ شرط بیان کی ہے کہ اعتکاف صرف مسجد جماعت میں ہوسکتا ہے۔ غیر آباد مسجد جس میں جماعت نہ ہوتی ہو اس میں اعتکاف درست نہیں یہ شرط درحقیقت مسجد کے مفہوم ہی سے اخذ کی گئی ہے کیونکہ تعمیر مسجد کا اصل مقصد جماعت کی نماز ہے ورنہ تنہا نماز تو ہر جگہ پڑھی جاسکتی ہے۔

”تِلْکَ حُدُوْدُ اللّٰہِ الخ“ اس آخری جملہ میں احکام شریعت کی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ روزہ کا مقصد حصول تقویٰ اور پرہیزگاری ہے یہ فائدہ اسی وقت حاصل ہوسکتا ہے جب کہ بیان کردہ احکام پر مکمل طریقہ سے عمل کیا جائے۔ اس لئے ان احکام میں بے پروائی وسہل انگاری سے پورے طور پر احتیاط کی جائے۔

عشرہ ذی الحجہ کے احکام وفضائل

الحَمدُ لِلّٰہِ وَالصَّلوٰۃ وَالسَّلام عَلٰی رَسُوُل اللّٰہِ وَعَلٰی آلِہٖ وَصَحُبِہٖ وَ منُ وَّالاہُ وَبعد!

عشرۂ ذی الحجہ میں اعمال کی فضیلت

اللہ پاک نے اپنی بے پایاں رحمتوں سے اپنے بندوں کے لیے سال بھر کے جن دنوں کو خاص شرف وفضیلت سے نوازا ہے تاکہ وہ ان میں زیادہ سے زیادہ نیکیاں کماسکیں اور آخرت کی اپنی دائمی اور حقیقی زندگی کے لیے زیادہ سے زیادہ توشہ جمع کرسکیں عشرہ ذی الحجہ یعنی ذوالحجہ کے شروع کے دس دن بھی انہی میں سے ہیں۔

صحیح بخاریؒ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ آنحضرت ...... نے ارشادفرمایا کہ ''کوئی دن ایسانہیں جن میں کیا جانے والا نیک عمل اللہ تعالیٰ کے یہاں ان دس دنوں سے زیادہ محبوب ہو'' صحابہؓ نے عرض کیا کہ ''اللہ کے رسولؐ! کیا اللہ کی راہ میں جہاد کرنے کا عمل بھی ان دس دنوں میں کیے جانے والے عمل سے بڑھ کرنہیں؟'' تو فرمایا کہ ''جہاد فی سبیل اللہ بھی اس سے بڑھ کرنہیں، اِلّا یہ کہ کسی آدمی نے اپنی جان اور اپنے مال کوراہ خدا میں اس طرح کھپایا ہوکہ اس سے کچھ بھی واپس نہ لوٹا ہو'' اور مسند امام احمدؒ میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ آنحضرت ...... نے ارشادفرمایا کہ ''کوئی بھی دن ایسانہیں جن میں کیا جانے والاعمل اللہ تعالیٰ کے یہاں ان دس دنوں میں کیے جانے والے عمل سے زیادہ بڑااورزیادہ محبوب ہو، بس تم ان دنوں میں تہلیل (یعنی لَا اِلٰہَ اِلاّ اللّٰہ کہنا) تکبیر (یعنی اللہ اکبر کہنا) اورتحمید (یعنی الحمدللہ کہنے) کی کثرت کیا کرو'' یعنی یہ اذکار ووظائف زیادہ سے زیادہ پڑھا کرو۔ اور صحیح ابن حبان میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے

مروی ہے کہ آنحضرت...... نے ارشاد فرمایا:

اَفْضَلُ الاَیَّامِ یَوْمُ عَرْفَۃ یعنی سب سے افضل دن عرفہ (نویں ذی الحجہ) کا دن ہے۔

ان ایام کی دو خاص عبادتیں

ان دنوں کی اس سے بڑی اور کیا فضیلت ہوگی کہ وہ عبادتیں جو سال بھر کے دوسرے دنوں میں انجام نہیں دی جاسکتیں۔ ان کی انجام دہی کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس زمانے کو منتخب فرمایا ہے۔ مثلاً حج ایک ایسی عبادت ہے جو ان دنوں کے علاوہ دوسرے دنوں میں انجام نہیں دی جاسکتی، اور دوسری عبادتوں کا یہ حال ہے کہ فرائض کے علاوہ جب چاہے نفلی عبادت کرسکتا ہے۔ مثلاً نماز پانچ وقت کی فرض ہے لیکن ان کے علاوہ جب چاہے نفلی نماز پڑھنے کی اجازت ہے، رمضان میں روزہ فرض ہے لیکن نفلی روزہ جب چاہے رکھیں، زکوٰۃ سال میں ایک مرتبہ فرض ہے، لیکن نفلی صدقہ جب چاہے ادا کردے، لیکن دو عبادتیں ایسی ہیں کہ ان کے لیے اللہ تعالیٰ نے وقت مقرر فرمادیا ہے، ان اوقات کے علاوہ دوسرے اوقات میں اگر ان عبادتوں کو ادا کیا جائے گا تو وہ عبادت ہی نہیں شمار ہوگی۔ ان میں سے ایک عبادت حج ہے، حج کے ارکان مثلاً عرفات میں جا کر ٹھہرنا، مزدلفہ میں رات گذارنا، جمرات کی رمی کرنا وغیرہ۔ یہ ارکان و اعمال ایسے ہیں کہ اگر انہی دنوں میں ان کو انجام دیا جائے تو عبادت ہے اور ان دنوں میں اگر کوئی شخص عرفات میں دس دن ٹھہرے تو یہ کوئی عبادت نہیں، دوسرے دنوں میں کوئی شخص مزدلفہ میں جا کر دس راتیں گذارلے تو یہ کوئی عبادت نہیں، جمرات سال بھر کے بارہ مہینے منیٰ میں کھڑے ہیں، لیکن عام دنوں میں کوئی شخص جان کر ان کو کنکریاں مار دے تو یہ کوئی عبادت نہیں تو حج جیسی اہم عبادت کے لیے اللہ تعالیٰ نے ان ہی دنوں کو مقرر فرمادیا کہ اگر بیت اللہ کا حج ان دنوں میں انجام دوگے تو عبادت ہوگی اور اس پر ثواب ملے گا۔

دوسری عبادت قربانی ہے۔ قربانی کے لیے اللہ تعالیٰ نے ذی الحجہ کے تین دن یعنی دس، گیارہ اور بارہ تاریخ مقرر فرمادیئے ہیں، اگر ان دنوں کے علاوہ کوئی شخص قربانی کی

عبادت کرنا چاہے تو نہیں کر سکتا، البتہ اگر کوئی شخص صدقہ کرنا چاہے تو بکرا ذبح کر کے اس کا گوشت صدقہ کر سکتا ہے، لیکن یہ قربانی کی عبادت ان تین دنوں کے علاوہ کسی اور دن میں انجام نہیں پا سکتی۔ تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس زمانے کو یہ امتیاز بخشا ہے، اسی وجہ سے علماء کرام نے ان احادیث کی روشنی میں یہ لکھا ہے کہ رمضانُ المبارک کے بعد سب سے زیادہ فضیلت والے دن عشرہ ذی الحجہ کے دن ہیں، ان میں عبادتوں کا ثواب بڑھ جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ ان دنوں میں اپنی خصوصی رحمتیں نازل فرماتے ہیں، لیکن کچھ چیزیں خاص طور پر شارع کی طرف سے ان دنوں میں مقرر کر دی گئی ہیں۔

ان دنوں میں کرنے کے بعض اہم کام

ان مبارک دنوں میں یوں تو ہر نیک عمل کی بڑی عظمت وفضیلت ہے۔ لیکن خاص کر چند اہم کام ایسے ہیں جو ان میں بطور خاص کرنے کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق نصیب فرمائے۔ ''آمین''

(۱) نفلی روزے رکھنا، ان دنوں کا اہم عمل، اور خاص عبادت ہے جس کا اہتمام ان دس دنوں میں خاص طور پر کرنا چاہئے، کیوں کہ اللہ کے لیے روزہ رکھنا یہ ویسے بھی بہت بڑا عمل اور عظیم عبادت ہے جس کے بارہ میں حدیث قدسی میں فرمایا کہ اللہ پاک فرماتا ہے اَلصَّوْمُ لِیْ وَاَنَا اَجْزِیْ بِہٖ (کہ روزہ خاص میرے لیے ہے اور اس کا بدلہ میں خود ہی دوں گا) لیکن نویں ذی الحجہ یعنی عرفہ کے دن کے روزے کی اہمیت اور عظمت وفضیلت تو اور بھی زیادہ ہے۔ چنانچہ صحیح مسلم وغیرہ میں حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت ...... نے ارشاد فرمایا کہ ''عرفہ (نویں ذی الحجہ) کے روزے سے ایک سال پہلے کے اور ایک سال بعد کے گناہ معاف فرما دیئے جاتے ہیں۔''

صرف گناہ صغیرہ معاف ہوتے ہیں

یہاں یہ بات بھی عرض کر دوں کہ بعض لوگ جو دین کا کما حقہ علم نہیں رکھتے تو اس قسم

کی جو حدیثیں آتی ہیں کہ ایک سال پہلے کے گناہ معاف ہوگئے اور ایک سال آئندہ کے گناہ معاف ہوگئے تو بعض لوگوں کے دل میں یہ خیال آتا ہے کہ جب اللہ نے ایک سال پہلے کے گناہ تو معاف کر ہی دیئے اور ایک سال آئندہ کے بھی گناہ معاف فرما دیئے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سال بھر کے لیے چھٹی ہوگئی جو چاہیں کریں۔ سب گناہ معاف ہیں تو خوب سمجھ لیجئے جن اعمال کے بارے میں نبی کریم ...... نے یہ فرمایا کہ گناہوں کو معاف کرنے والے اعمال ہیں۔ مثلاً وضو کرنے میں ہر عضو کو دھوتے وقت اس عضو کے گناہ معاف ہوجاتے ہیں۔ نماز پڑھنے کے لیے جب انسان مسجد کی طرف چلتا ہے تو ہر ایک قدم پر ایک گناہ معاف ہوتا ہے اور ایک درجہ بلند ہوتا ہے۔ رمضان کے روزوں کے بارے میں فرمایا کہ جس شخص نے رمضان کے روزے رکھے اس کے تمام پچھلے گناہ معاف ہوجاتے ہیں۔ یاد رکھئے اس قسم کی تمام احادیث میں گناہوں سے مراد گناہ صغیرہ ہوتے ہیں اور جہاں تک کبیرہ گناہوں کا تعلق ہے۔ اس کے بارے میں قانون یہ ہے کہ بغیر توبہ کے بخش دیں، وہ الگ بات ہے لیکن قانون یہ ہے کہ جب تک توبہ نہیں کرلے گا معاف نہیں ہوں گے اور پھر توبہ سے بھی وہ گناہ کبیرہ معاف ہوتے ہیں جن کا تعلق حقوق اللہ سے ہو اور اگر اس گناہ کا تعلق حقوق العباد سے ہے مثلاً کسی کا حق دبالیا ہے، کسی کا حق مارلیا ہے، کسی کی حق تلفی کرلی ہے اس کے بارے میں قانون یہ ہے کہ جب تک صاحب حق کو اس کا حق ادا نہ کردے یا اس سے معاف نہ کرالے اس وقت تک معاف نہیں ہوں گے۔ لہٰذا تمام فضیلت والی احادیث جن میں گناہوں کی معافی کا ذکر ہے وہ صغیرہ گناہوں کی معافی سے متعلق ہیں۔

۲: توبہ استغفار کی کثرت

اسی طرح ان پاکیزہ دنوں میں توبہ و استغفار بھی خوب خوب کرنی چاہئے تاکہ رحمتوں بھرے ان دنوں میں اپنے گناہوں کی معافی مل سکے، اور حضرت حق جلّ جلالہٗ کا قرب اور ان کی رضا نصیب ہوسکے۔

توبہ واستغفار کے یہ الفاظ بہت اہم ہیں کیوں کہ مختصر بھی ہیں اور جامع بھی یعنی... اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ الَّذِی لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الحَیُّ الْقَیُّوْمُ وَاَتُوبُ اِلَیْهِ. لہٰذا ان الفاظ کا ہمیشہ اور خاص کر ان دنوں میں جتنا ہو سکے ورد رکھے، اور ان کے معانی کو ذہن میں رکھ کر پڑھے تو اور بھی لذت نصیب ہوگی۔

تکبیر تشریق

ان ایام میں تیسرا عمل تکبیر تشریق ہے جو عرفہ کے دن کی نماز فجر سے شروع ہوکر تیرہ تاریخ کی عصر تک جاری رہتی ہے اور یہ تکبیر ہر فرض نماز کے بعد ایک مرتبہ پڑھنا واجب ہے... تکبیر یہ ہے:

اللّٰہ اکبر، اللّٰہ اکبر، لَا اِلٰه الاّ اللّٰہ، واللّٰہ اکبر، اللّٰہ اکبر، اللّٰہ اکبر، وَلِلّٰهِ الحمد. اور آہستہ آواز سے پڑھنا خلاف سنت ہے۔

گنگا الٹی بہنے لگی ہے

ہمارے یہاں ہر چیز میں الٹی گنگا بہنے لگی ہے کہ جن چیزوں کے بارے میں شریعت نے کہا ہے کہ آہستہ آواز سے کہو، ان چیزوں میں تو لوگ شور مچا کر بلند آواز سے پڑھتے ہیں، مثلاً دعا کرنا ہے۔ قرآن کریم میں دعا کے بارے میں فرمایا ہے:

”آہستہ اور تضرع کے ساتھ اپنے رب کو پکارو، اور آہستہ دعا کرو“ (سورۃ الاعراف ۵۵)

چنانچہ عام اوقات میں بلند آواز سے دعا کرنے کے بجائے آہستہ آواز سے دعا کرنا افضل ہے، البتہ جہاں زور سے دعا مانگنا سنت سے ثابت ہو، وہاں اسی طرح مانگنا افضل ہے۔ دعا میں تو لوگوں نے اپنی طرف سے شور مچانے کا طریقہ اختیار کرلیا اور جن چیزوں کے بارے میں شریعت نے کہا تھا کہ بلند آواز سے کہو، مثلاً یہ تکبیر تشریق۔ جو ہر نماز کے بعد بلند آواز سے کہنا چاہئے، لیکن اس کے پڑھنے کے وقت آواز ہی نہیں نکلتی اور آہستہ سے پڑھنا شروع کر دیتے ہیں۔

تکبیر تشریق خواتین پر بھی واجب ہے

یہ تکبیر تشریق خواتین کے لیے بھی مشروع ہے۔ اس میں عام طور پر بڑی کوتاہی ہوتی ہے اور خواتین کو تکبیر پڑھنا یاد ہی نہیں رہتا۔ مرد حضرات تو چوں کہ مسجد میں جماعت سے نماز ادا کرتے ہیں اور جب سلام کے بعد تکبیر تشریق کہی جاتی ہے تو یاد آجاتا ہے اور وہ کہہ لیتے ہیں، لیکن خواتین میں اس کا رواج بہت کم ہے اور عام طور پر خواتین اس کو نہیں پڑھتیں۔ اگرچہ خواتین پر واجب ہونے کے بارے میں علماء کے دو قول ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ خواتین پر واجب نہیں بلکہ مستحب ہے، لیکن صحیح قول کے مطابق عورتوں پر بھی ایک مرتبہ اس کا پڑھنا واجب ہے۔ (شامی، ج۲ص ۱۷۹)

۴: قربانی دوسرے ایام میں نہیں ہوسکتی

چوتھا اور سب سے افضل عمل جو اللہ تعالیٰ نے ایام ذی الحجہ میں مقرر فرمایا ہے وہ قربانی کا عمل ہے اور جیسا کہ گذشتہ سطور میں عرض کیا گیا کہ یہ عمل سال کے دوسرے ایام میں انجام نہیں دیا جاسکتا۔ صرف ذی الحجہ کی دس گیارہ اور بارہ تاریخ کو انجام دیا جاسکتا ہے، ان کے علاوہ دوسرے اوقات میں چاہے کتنے جانور ذبح کرلے لیکن قربانی نہیں ہوسکتی۔

قربانی کیا سبق دیتی ہے

قربانی کے معنی ہیں ''اللہ کا تقرب حاصل کرنے کی چیز'' اور یہ لفظ قربانی ''قربان'' سے نکلا ہے اور لفظ ''قربان'' ''قرب'' سے نکلا ہے، تو قربان کے معنی یہ ہیں کہ ''وہ چیز جس سے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کیا جائے'' پس اس قربانی کے سارے عمل میں یہ سکھایا گیا ہے کہ ہمارے حکم کی اتباع کا نام دین ہے۔ جب ہمارا حکم آجائے تو اس کے بعد نہ عقلی گھوڑے دوڑانے کا موقع ہے نہ اس میں حکمتیں اور مصلحتیں تلاش کرنے کی گنجائش کا موقع باقی رہتا ہے۔ اور نہ اس میں چوں وچراں کرنے کا موقع ہے۔ ایک مومن کا کام یہ ہے کہ اللہ کی طرف سے حکم آجائے تو اپنا سر جھکا دے اور اس حکم کی اتباع کرے۔

سیدنا ابراہیمؑ کا مقام تسلیم و رضا

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس حکم آگیا کہ بیٹے کو ذبح کر دو، اور وہ حکم بھی خواب کے ذریعہ سے آیا، اگر اللہ تعالیٰ چاہتے تو وحی کے ذریعہ حکم نازل فرما دیتے کہ اپنے بیٹے کو ذبح کرو۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ایسا نہیں کیا، بلکہ خواب میں آپ کو یہ دکھایا کہ اپنے بیٹے کو ذبح کر رہے ہیں۔ اگر ہمارے جیسا تاویل کرنے والا کوئی ہوتا تو یہ کہہ دیتا کہ یہ تو خواب کی بات ہے اس پر عمل کرنے کی کیا ضرورت ہے مگر یہ بھی حقیقت میں ایک امتحان تھا کہ چوں کہ جب انبیاء علیہ السلام کا خواب وحی ہوتا ہے تو کیا وہ اس وحی پر عمل کرتے ہیں یا نہیں؟ اس لیے آپ کو یہ عمل خواب میں دکھایا گیا، اور جب آپ کو یہ معلوم ہو گیا کہ یہ اللہ کی طرف سے ایک حکم ہے کہ اپنے بیٹے کو ذبح کر دو تو حضرت ابراہیم نے پلٹ کر اللہ تعالیٰ سے یہ نہیں پوچھا کہ یا اللہ! یہ حکم آخر کیوں دیا جا رہا ہے؟ اس میں کیا حکمت اور مصلحت ہے؟ دنیا کا کوئی قانون اور کوئی نظام زندگی اس بات کو اچھا نہیں سمجھتا کہ باپ اپنے بیٹے کو ذبح کرے، عقل کی کسی میزان پر اس حکم کو اتار کر دیکھئے تو کسی میزان پر یہ پورا اترتا نظر نہیں آتا۔

۵: نماز عید کی ادائیگی

اس طرح ان برگزیدہ دنوں میں کیا جانے والا پانچواں عظیم الشان اور پاکیزہ عمل نماز عید کی ادائیگی ہے جو اللہ پاک کے حضور جو کہ ہم سب کا اور اس پوری کائنات کا خالق و مالک ہے اس کے حضور اجتماعی طور پر جھکنے اور سجدہ ریز ہونے کا ایک عظیم الشان اور بے مثل اور بے نظیر مظہر ہے اس میں شامل ہونا، اس عبادت سے مشرف ہونا، اور خطبہ عید سننا اور اس سے استفادہ کرنا ایک امر مطلوب و مامور ہے۔ اس لیے اس کا پورا اہتمام کرنا چاہئے اور نہا دھو کر خوشبو لگا کر اہتمام سے اس میں شامل ہونا چاہئے۔

عید کی اہمیت

نماز عید ایک عظیم الشان عبادت اور دین حق کا ایک بے مثل و بے نظیر پاکیزہ مظہر

ہے اور مسلمانوں کی یہ دونوں عیدیں دو عظیم الشان عبادتوں کے ساتھ مرتبط ہیں، عید الفطر رمضان المبارک کے روزوں کے بعد ادا کی جاتی ہے، اور عید الاضحیٰ حج بیت اللہ کے بعد، اور یہ دونوں عبادتیں دین حق کے ارکان خمسہ میں سے دو بنیادی رکن ہیں اور ایسی پاکیزہ اور جامع عبادتیں ہیں جو پوری روئے زمین پر مسلمانوں کے سوا اور کسی قوم کو نصیب نہیں۔ پس عید کی نماز دراصل اللہ پاک کے حضور اس کی اسی عنایت پر سجدۂ شکر بجالانا ہے، جو مسلمان اپنے خالق و مالک کے حضور میں پیش کرتا ہے۔

اسلام میں عیدیں صرف دو ہیں

یہیں سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ اسلامی عید کوئی ایسا تہوار نہیں جس طرح کہ دوسری قوموں کے مختلف تہوار اور قومی دن ہوتے ہیں بلکہ یہ درحقیقت دو عظیم الشان اور پاکیزہ عبادتیں ہیں جن کی تعلیم دین حق نے دی ہے اور عبادت انسان اپنی عقل وفکر سے مقرر نہیں کرسکتا، بلکہ اس کو صرف اسی طریقہ کے مطابق اور اسی طرح سے ادا کرنا اور بجا لانا ہوتا ہے جس طرح کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ برحق نے ارشاد فرمایا ہے اور دین حق کی تعلیماتِ مقدسہ میں سال بھر میں صرف دو ہی عیدیں منانے کا حکم ہے، یعنی عید الفطر اور عید الاضحیٰ۔ تیسری کسی عید کا اسلام میں کوئی وجود نہیں، اسی لیے حدیث اور فقہ کی تمام کتابوں میں ''عیدین'' یعنی صرف دو ہی عیدوں کا ذکر ملتا ہے اور بس اب جو لوگوں نے دوسری کئی عیدیں مختلف ناموں سے بنالی ہیں وہ ان کی اپنی ایجاد و اختراع ہے۔ دین حق میں ان کا کوئی ثبوت و وجود نہیں۔ اس لیے ایسی تمام بدعات سے بچنا ضروری ہے کیونکہ صحیح حدیث میں آنحضرت...... کا یہ صریح ارشاد موجود ہے کہ ''جس شخص نے ہمارے دین میں کسی ایسی نئی چیز کو شامل کرلیا جو اس میں ثابت نہیں، وہ مردود ہے۔'' یعنی وہ اس کے منہ پر ماردی جائے گی۔

والعیاذ باللّٰہ العظیمُ الّذِیُ لَا اِلٰہَ غَیُرَہٗ.

☆ ☆ ☆

اسلام کا تصور جہاد

ملک کی بعض فرقہ پسند تنظیمیں سیاسی اغراض کے تحت اسلام کے خلاف جو افترا پردازیاں کر رہی ہیں ان میں سب سے بڑی افترا پردازی یہ ہے کہ اسلام ایک خونخوار مذہب ہے اور اپنے پیروکاروں کو خونخواری کی تعلیم دیتا ہے اور حیرت تو اس پر ہے کہ اس بہتان وافتراء کے ذریعہ اسلام کے صاف وروشن چہرے کو داغدار بنانے کی مذموم ونامراد سعی ایسے لوگوں کی جانب سے کی جارہی ہے جو خود امن وامان کے دشمن ہیں جن کی تاریخ کے صفحات بے قصور مظلوموں کے خون سے رنگین ہیں۔ جب کہ اسلام پورے عالم انسانیت کے ساتھ نیکی اور بھلائی کا حکم دیتا ہے پیغمبر اسلام ﷺ کا ارشاد ہے ”الخلق کلھم عیال اللہ فاحب الخلق عند اللہ من احسن الی عیالہ“ (بیہقی) ساری مخلوق خدا کا کنبہ ہے اور اللہ کے نزدیک سب سے پسندیدہ مخلوق وہ ہے جو اس کے کنبہ کے ساتھ نیکی کرے۔ ایک حدیث میں ہے: ”من لم یرحم الناس لم یرحمہ اللہ“ (ترمذی) جو شخص لوگوں پر رحم نہیں کرتا اس پر خدا بھی رحم نہیں کرتا۔ بنظر انصاف دیکھا جائے تو ماننا پڑے گا کہ اسلام احترام آدمیت اور حرمت نفس کا سب سے بڑا داعی ہے چنانچہ قرآن میں نیک بندوں کی صفات کے ضمن میں فرمایا گیا ہے:

لَا یَقْتُلُونَ النَّفْسَ الَّتِی حَرَّمَ اللہُ اِلَّا بِالْحَقِّ“ (الایۃ = الفرقان) وہ اس جان کو جسے خدا نے محترم ٹھہرایا ہے بغیر حق کے ہلاک نہیں کرتے ایک اور مقام پر ارشاد ہے: ”وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِی حَرَّمَ اللہُ اِلَّا بِالْحَقِ“ کسی ایسی جان کو جسے اللہ تعالیٰ نے محترم قرار دیا ہے بغیر حق کے ہلاک نہ کرو۔ کون نہیں جانتا کہ اس تعلیم کے اولین مخاطب وہ لوگ تھے جو موہوم ذاتی اغراض کے تحت اپنی اولاد تک کو قتل کر دیا کرتے تھے اس لیے پیغمبر اسلام

صلی اللہ علیہ وسلم ان کے مزاج کی اصلاح کے لیے خود بھی ہمیشہ احترام نفس کی تلقین فرماتے رہتے تھے، احادیث میں کثرت سے اس قسم کے ارشادات پائے جاتے ہیں جن میں بے قصوروں کا خون بہانے کو بدترین گناہ بتایا گیا ہے۔ بطور مثال کے اس موقع پر ایک حدیث پیش کی جا رہی ہے، حضرت انس بن مالکؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ”اکبرُ الکبائر الاشراکُ باللّٰہِ وقتلُ النفسِ وعقوق الوالدینِ وقولُ الزُور“ بڑے گناہوں میں بڑا گناہ اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرانا، اور کسی جان کا قتل کرنا اور والدین کی نافرمانی اور جھوٹ بولنا ہے۔ پھر حرمت نفس کی ہر تعلیم اللہ اور اس کے رسول کی تعلیم تھی جس کا لفظ لفظ ہر مسلمان کا جزو ایمان تھا جس کی تعمیل و تنفیذ ہر اس شخص پر فرض تھی جو کلمہ اسلام کا قائل ہو اس لیے کہ ایک چوتھائی صدی کے قلیل عرصہ میں عرب جیسی خونخوار قوم کے اندر احترام نفس کا ایسا ملکہ پیدا ہو گیا کہ قادسیہ سے صنعاء تک ایک عورت تنہا سفر کرتی تھی اور کوئی اس کے جان و مال پر حملہ نہیں کرتا تھا۔ اقوام عالم کی تاریخ سے واقف جانتے ہیں کہ آج مہذب دنیا کے قوانین میں حرمت نفس کو جو درجہ حاصل ہے وہ درحقیقت اسلام ہی کی دین ہے۔ ورنہ جس تاریک دور میں یہ تعلیم اتری تھی اس میں انسانی جان کی کوئی قیمت نہیں تھی۔

پھر آیت پاک میں ”الا بالحق“ کے استثناء سے یہ بھی واضح کر دیا کہ انسانی خون کی حرمت صرف اسی وقت تک ہے جب تک اس پر حق نہ قائم ہو جائے اسے زندگی کا حق صرف اس کی جائز حدود کے اندر ہی دیا جا سکتا ہے مگر جب وہ ان حدود سے تجاوز کر کے فتنہ و فساد پھیلاتا اور سرکشی اختیار کر کے حق پر دست درازی کرتا ہے تو اپنے خون کی قیمت خود کھو دیتا ہے پھر اس کے خون کی قیمت اتنی بھی نہیں رہتی جتنی پانی کی ہوتی ہے۔

ہندو مذہب کے مشہور عالم و مقنن منو سے دریافت کیا گیا کہ اگر کوئی شخص ہماری عورتوں پر دست درازی کرے یا ہمارا مال چھینے، ہمارے دھرم کی بے آبروئی کرے تو ہم کیا کریں، تو انھوں نے جواب دیا کہ ایسے جفا کار انسان کو ضرور مار ڈالنا چاہیے عام اس سے کہ وہ گورو ہو یا عالم برہمن، بوڑھا ہو یا نوجوان۔

قتل بالحق کا یہ قانون جس طرح افراد کے لیے ہے اسی طرح جماعتوں کے لیے بھی ہے افراد کی طرح جماعتیں بھی سرکش ہوتی ہیں اس لیے جس طرح افراد کو قابو میں رکھنے اور ظلم وتعدی سے باز رکھنے کے لیے خونریزی ناگزیر ہوتی ہے اسی طرح جماعتوں کی بدکاری کو روکنے کے لیے بھی جنگ ناگزیر ہو جاتی ہے۔ نوعیت کے اعتبار سے انفرادی اور اجتماعی فتنہ وفساد میں کوئی فرق نہیں ہے مگر کیفیت کے اعتبار سے عظیم الشان فرق ہے، افراد کا فتنہ ایک تنگ دائرے میں محدود ہوتا ہے اور گز بھر زمین رنگین کر کے اس کا استیصال کیا جا سکتا ہے مگر جماعتوں کا فتنہ غیر محدود ہوتا ہے جس سے بے شمار انسانوں کی زندگی دوبھر ہو جاتی ہے اور اس کا استیصال خون کی ندیاں بہائے بغیر نہیں ہو سکتا، جنگ کی اسی مصلحت و ضرورت کو قرآن پاک میں یوں بیان کیا گیا ہے۔

”وَلَولا دَفعُ اللّٰہِ النَّاسَ بَعُضَھُم بِبَعُض لَھُدِّمَتُ صَوامِعُ وَبیعٌ وَصَلَواتٌ وَمَسَاجدُ یُذُکَرُ فِیھا اسمُ اللّٰہ کثیرا“ (الحج) اگر اللہ تعالیٰ ایک کو دوسرے کے ذریعہ دفع نہ کرتا تو صومعے، گرجے، معبد اور مسجدیں جن میں اللہ کا ذکر کثرت سے کیا جاتا ہے مسمار کر دیئے جاتے۔

اس آیت مبارکہ میں صرف مسلمانوں کی مسجدوں ہی کا ذکر نہیں ہے بلکہ تین اور چیزوں کا بھی ذکر ہے یعنی صوامع، بیع، اور صلوات۔ صوامع سے مراد عیسائی راہبوں کی خانقاہیں ہیں، مجوسیوں اور صابیوں کے عبادت خانے ہیں، بیع کے لفظ میں عیسائیوں کے گرجے اور یہودیوں کے کنیسے دونوں داخل ہیں اس کے بعد صلوات کا ایک وسیع لفظ استعمال کیا گیا ہے جسکا اطلاق عبادت الٰہی کے ہر معبد پر ہوتا ہے اور ان سب کے آخر میں مساجد کا ذکر کیا ہے۔ اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ عادل انسانوں کے ذریعہ ظالم انسانوں کو دفع نہ کرتا رہتا تو اتنا فساد ہوتا کہ عبادت گاہیں تک بربادی سے نہ بچتیں جن سے ضرر کا کسی کو اندیشہ نہیں ہو سکتا۔

یہ ہے اسلام کا تصور جہاد اور نظریۂ جنگ اگر اسلام پر ایسی ہی خوں ریزی کا الزام ہے تو اسے اس الزام کے قبول کرنے میں ذرہ برابر بھی عار نہیں ہے لیکن سوال یہ ہے کہ

اور کون ہے جس کا دامن اس ناگزیر خوں ریزی سے سرخ نہیں ہے۔ اس موقع پر مذاہب کا مقابلہ کر کے اس ناگزیر خونریزی کی ضرورت ثابت کرنے کی گنجائش نہیں ہے ورنہ تفصیل سے بتایا جاسکتا ہے دنیا میں موجود ادیان و ملل اس ناگزیر اقدام پر متفق ہیں۔

اس ضروری جنگ کو دہشت گردی سے تعبیر کرنا یا اس کی وجہ سے اسلام کو خوں ریزی کا الزام دینا عدل و انصاف کا خون کرنا ہے۔ غرض اسلام اس وقت تلوار اٹھانے کی اجازت دیتا ہے جب اصلاح حال اور دفع ضرر کے لیے اس کے سوا کوئی دوسرا ذریعہ باقی نہ رہے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: " لا تتمنوا لقاء العدو واسئلوا اللّٰہ العافیة" الحدیث، دشمن سے مقابلہ کی تمنا مت کرو بلکہ اللہ سے امن و عافیت مانگو۔

اسلام کی نظر میں جنگ و قتال ایک ناگوار اور غیر پسندیدہ چیز ہے جس سے ہر انسان کو اجتناب کرنا چاہیے؛ لیکن جب اس سے بڑی معصیت یعنی ظلم و طغیان اور فتنہ و فساد پھیل گیا ہو اور سرکش لوگوں نے خلق خدا کے امن و راحت کو خطرہ میں ڈال دیا ہو تو محض دفع مضرت کے لیے جنگ کرنا ضروری بلکہ فرض ہو جاتا ہے۔ اسلام کے اس تصور جنگ کا اصلی مقصد حریف مقابل کو ہلاک کرنا نہیں بلکہ محض اس کے شر کو دفع کرنا ہے اس لیے اسلام کا اصول ہے کہ جنگ میں صرف اتنی قوت استعمال کرنی چاہیے جتنی دفع شر کے لیے ناگزیر ہو اور اس قوت کا استعمال صرف ان طبقوں کے خلاف ہونا چاہیے جو برسر پیکار ہوں باقی تمام طبقات کو جنگ کے اثرات سے محفوظ رکھنا چاہیے۔ چنانچہ تمام فقہاء کا اتفاق ہے کہ جنگ میں نابالغ بچوں اور عورتوں کو قتل کرنا جائز نہیں۔ نیز امام مالکؒ اور امام ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب کا یہ مسئلہ ہے کہ نابینا، مجنون، اپاہج اور راہب (اور اسی حکم میں ہندوؤں کے پجاری وغیرہ بھی آتے ہیں) کا قتل کرنا جائز نہیں ہے۔ نیز اجیر، اور کاشت کار وغیرہ کو بھی قتل کرنا درست نہیں ہے۔

اس لیے کہ یہ لوگ جنگ کرنے والوں میں سے نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ "وقاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم (سوہ بقرہ) تفصیل کے لیے حافظ ابن عبدالبر کی التمہید، جلد ۱۶ اور ۲۴ دیکھی جائے۔

اس آیت شریفہ سے صاف معلوم ہورہا ہے کہ اس جنگ کا دائرہ صرف جنگ و جدال اور ظلم وعدوان کرنے والوں تک ہی محدود ہے۔ پھر یہ جنگ جو لوگ اگر مائل بہ صلح ہوجائیں تو اسلام کو ان کے ساتھ مصالحت سے کوئی تردد نہیں ہے۔ خدا کا فرمان ہے اگر یہ مقاتلین آمادۂ صلح ہوں تو آپ ان سے صلح کرلیجیے۔

اس لیے اسلام کے اس تصور جنگ کو خوں ریزی سے تعبیر کرنا اور اس کی بناء پر اسلام کو دہشت پسند مذہب بتانا بجائے خود دہشت پسندی ہے۔

ہم الزام ان کو دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا

☆ ☆ ☆

اسلام میں شہید کی حقیقت اور مقام ومرتبہ

قرآن میں لفظ شہید کا استعمال

لفظ شہید قرآن مجید کی مختلف سورتوں میں بشکل مفرد تثنیہ اور جمع ۵۵ جگہ آیا ہے اور بجز تین مقامات کے ہر جگہ اپنے لغوی معنی کے بجائے ایک نئے معنی میں وارد ہوا ہے یہ ہیں:

(۱) ومن يطع اللّٰه والرسول فاولٓئِك مع الذين انعم اللّٰه عليهم من النبيين والصديقين والشهداء والصالحين وحسن اولٓئك رفيقا.

جو کوئی حکم مانے اللہ کا اور اسکے رسول کا سو وہ ان کے ساتھ ہیں جن پر اللہ نے انعام کیا کہ وہ نبی اور صدیق اور شہید اور نیک بخت ہیں اور اچھی ہے ان کی رفاقت (ترجمہ شیخ الہند)

(۲) واشرقت الارض بنور ربها ووضع الكتاب وجيىء بالنبيين والشهداء.

اور چمکی زمین اپنے رب کے نور سے اور لا دھریں دفتر اور حاضر آئیں پیغمبر اور شہداء۔

(۳) والذين آمنوا بالله ورسله اولئك هم الصديقون والشهداء عند ربّهم لهم اجرهم ونورهم.

اور جو لوگ یقین لائے اللہ پر اور اس کے سب رسولوں پر وہی ہیں صدیق اور شہداء ان کے واسطے ہے ان کا ثواب۔

شہید کے لغوی معنی

ابن منظور لسان العرب میں اس لفظ کی تحقیق یوں کرتے ہیں:

قیل الشهید الذی لایغیب عن علمه شیء والشهید بمعنٰی حاضر فعیل من ابنیة المبالغة من فاعل اذا اعتبر العلم مطلقاً فهو العلیم واذا اضیف الی الامور الباطنة فهو الخبیر واذا اضیف الی الامور الظاهرة فهو الشهید.

کہا گیا ہے کہ شہید وہ ذات ہے جس سے کوئی چیز چھپی ہوئی نہ ہو اور شہید بمعنی حاضر فعیل کے وزن پر مبالغہ کا صیغہ ہے، جب اس سے علم محض مراد ہوتا ہے تو یہ علیم کے معنی میں ہوتا ہے اور جب اس کی اضافت امور باطنہ کی جانب ہوتی ہے تو خبیر کے معنی میں ہوتا ہے اور امور ظاہرہ کی طرف مضاف ہونے کی صورت میں اپنے اصلی معنی میں ہوتا ہے۔

علامہ سہیلی لکھتے ہیں:

هذا الاسم ماخوذ من الشهادة والمشاهدة فان كان عن الشهادة فهو شهید بمعنی مشهود ای مشهود علیه ومشهود له بالجنة فلان النبی صلی الله علیه وسلم حین وقف علی قتلٰی اُحد قال هولاء الذین اشهد علیهم بالوفاء وان كان من المشاهده فهو فعیل بمعنی فاعل ایضاً لانه یشاهد ملكوت الله ویعاین من ملائكته الایشاهد غیره.

یہ اسم شہادت یا مشاہدہ سے ماخوذ ہے، اگر شہادت سے مشتق مانا جائے تو شہید بمعنی مشہود ہوگا یعنی اس کی ایمانداری کی گواہی دی گئی ہے یا اسے جنت کی خوشخبری دی گئی ہے کیونکہ نبی کریم جب غزوۂ احد کے مقتولین کے پاس کھڑے ہوئے تو آپ نے ارشاد فرمایا یہ وہ لوگ ہیں جن کے وفا کی شہادت دی گئی ہے، اور اگر یہ مشاہدہ سے ماخوذ ہو تو فعیل بمعنی فاعل ہوگا یعنی یہ اللہ کے کمال قدرت کا مشاہدہ کرنے والا ہے اور اپنی نگاہوں سے فرشتوں وغیرہ کو دیکھتا ہے جن میں اس کے علاوہ لوگ نہیں دیکھ سکتے۔

اصطلاح شرعی میں شہید کا معنی

قبل از اسلام عرب کے خطباء وشعراء اپنے اشعار اور تقریروں میں لفظ شہید کو اس کے معنی اصلی ہی میں استعمال کرتے تھے، لیکن اسلام نے جس طرح صلوٰۃ، زکوٰۃ، صوم اور

حج کے الفاظ کو ان کے معانی اصلیہ کے بجائے ایک مخصوص معنی میں استعمال کیا ہے جسے اہل علم اصطلاح شرعی سے تعبیر کرتے ہیں، ٹھیک اسی طرح شہید کو بھی اس کے اصلی اور لغوی مدلول، علم، حضور، مشاہدہ سے بدل کر ایک خاص مفہوم یعنی مقتول فی سبیل اللہ کے معنی میں استعمال کیا ہے۔

منقول شرعی کے وجوہ

علامہ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری میں اس نقل شرعی کی متعدد توجیہیں نقل کی ہیں جن میں سے چند یہ ہیں۔

(۱) لان شهيد حيى فكان روحه شاهدة اى حاضرة.

اس لئے کہ شہید زندہ ہے تو گویا کہ اس کی روح موجود ہے۔

(۲) لان الله يشهده عند خروج روحه ما عدّله من الكرامة.

اس کی عزت افزائی کے لئے آخرت میں جو کچھ تیار کیا گیا ہے اللہ تعالیٰ اسے موت کے وقت اس کا مشاہدہ کرا دیتے ہیں۔

(۳) لان الله وملائكته يشهدون له بالجنة.

اللہ تعالیٰ اور اس کے ملائکہ شہید کو جنت کی بشارت دیں گے۔

(٤) لانه يشهد له بالامان من النار

اسے جہنم سے امان کی خبر دی گئی ہے۔

(٥) لان الملائكة تشهد له بحسن الخاتمة

ملائکہ اس کے حسن خاتمہ کی خبر دیتے ہیں۔

(٦) لانه يشاهد الملائكة عند احتضاره

وہ نزع میں فرشتوں کا مشاہدہ کرتا ہے۔

(٧) لان الانبياء يشهدون له بحسن الاتباع

انبیاء کرام اس کے حسن اتباع کی گواہی دیں گے۔

ان جملہ توجیہات سے زیادہ دلنشیں اور لطیف توجیہہ امام رازی نے اپنی تفسیر میں کی ہے وہ لکھتے ہیں۔

هو الذى يشهد بصحة دين اللّٰه تعالىٰ تارةً بالحجة والبيان واخرى بالسيف والسنان فالشهداء هم القائمون بالقسط هم الذين ذكرهم الله تعالىٰ فى قوله (شهد اللّٰه انه لا اله الا هو والملائكة واولوا العلم قائما بالقسط)

شہید وہ شخص ہے جو دینِ اسلام کی حقانیت کی شہادت کبھی تقریر و مناظرہ کے ذریعہ دیتا ہے اور کبھی نیزہ تلوار کے ذریعہ لہٰذا شہداء عدل کو قائم کرنے والے ہیں جن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب مجید میں شهد الله انّه لَا اله الخ کے نہایت وقیع اور پُرشوکت پیرائے میں کیا ہے۔

الحاصل مقتول فی سبیل اللہ کو شہید اس بناء پر کہتے ہیں کہ اس نے دین کی نصرت اور اسلام کی برتری کی شہادت میں اپنی جاں تک کو قربان کر دیا۔(۱)

متعین طور پر یہ کہنا کہ شہید کے اس معنی خاص کی ابتداء فلاں تاریخ سے ہوئی ہے مشکل ہے کیونکہ کتب سیر و تاریخ میں اس کی تصریح نہیں ملتی۔ البتہ اگر ان آیات قرآنیہ میں غور کیا جائے جو مقتولین فی سبیل اللہ کے ذکر پر مشتمل ہیں تو یہ دشواری کسی حد تک دور ہو سکتی ہے۔ اور کتاب مبین کی روشنی میں یہ مبہم پہلو واضح ہو سکتا ہے۔

قرآن حکیم میں غور کرنے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ شہداء کا تذکرہ سورۂ بقرہ، سورۂ آل عمران اور سورۂ توبہ میں کثرت سے آیا ہے اور اسباب نزول کی آیتوں سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں اکثر آیتیں مقتولین بدر و اُحد کے بارے میں نازل ہوئی ہیں۔ نیز سیر و مغازی کی کتابوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ غزوۂ بدر و احد سے پہلے جتنے غزوات و سرایا پیش آئے ہیں ان میں کوئی مسلمان بھی کام نہیں آیا ہے۔ ان تینوں امور کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ نتیجہ آسانی سے نکالا جا سکتا ہے کہ قتیل مسلم پر لفظ شہید کا اطلاق سب سے پہلے غزوۂ بدر کے موقع پر ہوا ہے۔

---

(۱) مفاتیح الغیب ص ۱۷۴۔

شریعت کی نگاہ میں شہید کون ہے؟

اس سوال کو حل کرنے کے لئے ہمیں احادیث کے ذخیرہ پر نظر ڈالنی چاہئے کیونکہ اس امر کی تحقیق کے لئے سب سے واضح اور مستند مآخذ حدیث پاک ہی ہیں اس سلسلے کی چند حدیثیں ملاحظہ ہوں۔

(۱) حضرت موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک اعرابی نے نبی کریم ...... سے سوال کیا کہ یارسول اللہ بہت سے لوگ حصول غنیمت کے لئے لڑتے ہیں اور بہت سے لوگ شہرت اور ناموری کے لئے ان میں سے کس کی جنگ فی سبیل اللہ کہلائے گی آپ ...... نے ارشاد فرمایا:

من قاتل لتكون كلمة اللّٰه اعلىٰ فهو فى سبيل اللّٰه. (۱)

جو شخص اللہ کے دین کی سربلندی کے لئے قتال کرے وہی فی سبیل اللہ ہے۔

اس حدیث پاک سے ثابت ہوا کہ جس شخص نے اللہ کی رضا اور اس کے دین کے غلبہ کے لئے اپنی جان قربان کی، شریعت کی نگاہ میں اسی کو شہید کہا جائے گا۔

(۲) عن سعيد بن زيد قال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم ما تعدون الشهيد فيكم! فقالوا من قتل فى سبيل اللّٰه فقال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم ان شهداءِ اُمّتى لقليل من قتل دون ما له فهو شهيد ومن قتل دون دمه فهو شهيد ومن قتل دون دينه فهو شهيد ومن قتل دون اهله فهو شهيد. (۲)

حضرت سعید بن زید روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت نے صحابہ سے پوچھا تم لوگ اپنے میں شہید کس کو شمار کرتے ہو، صحابہ نے جواب دیا جو اللہ کی راہ میں قتل کر دیا جائے، حضور ...... نے یہ سن کر فرمایا تو میری امت میں شہداء بہت تھوڑے ہوں گے جو شخص اپنے مال کی حفاظت میں قتل ہو جائے وہ شہید ہے اور جو شخص اپنی جان کی حفاظت میں قتل ہو جائے

---

(۱) رواہ مسلم فی صحیحہ۔

(۲) رواہ الامام احمد فی مسندہ وابن حبان فی صحیحہ۔

وہ شہید ہے اور جو اپنے دین کی حفاظت میں قتل ہو جائے وہ شہید ہے اور جو اپنے گھر والوں کی حفاظت میں قتل ہو جائے وہ شہید ہے۔

اس حدیث میں دین کی حفاظت کے علاوہ اپنی جان اپنے مال اور اپنے اہل وعیال کی حفاظت میں مرنے والے کو بھی شہید قرار دیا گیا ہے۔

(۳) عن ابی ھریرةؓ ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم قال الشھداء خمسة المطعون والمبطون والغریق وصاحب الھدم والشھید فی سبیل اللّٰہ.

(۴) وعن سوید بن مقرن مرفوعا من قتل دون مظلمة فھو شھید.

حضرت ابو ہریرہؓ نقل کرتے ہیں کہ آنحضرت ...... نے فرمایا شہداء پانچ ہیں، مرض طاعون میں مرنے والا، مرض شکم میں مرنے والا، ڈوب جانے والا، اوپر سے گر کر مر جانے والا اور اللہ کی راہ میں شہید ہو جانے والا۔ (۱)

حضرت سوید بن مقرن آنحضرت ...... سے روایت کرتے ہیں کہ جو شخص اپنے حق کی حفاظت میں قتل ہو جائے وہ شہید ہے۔ (۲)

ان روایتوں کے علاوہ حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری میں چند اور روایتیں نقل کی ہیں جن سے شہداء کی مزید قسموں کی نشاندہی ہوتی ہے، مثلاً نفاس میں مرنے والی عورت، حالت حمل میں مرنے والی عورت، ذات الجنب میں مرنے والا شخص، جل کر مرنے والا وغیرہ۔

علامہ ابن التین اس حکم کی علت بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں ان ھذه کلھا میتات فیھا شدّة. یعنی ان موتوں میں شدّت ہوتی ہے، اس لئے مرنے والے کو اس کے بدلے میں اس شرف ومجد سے نوازا گیا۔

پھر ان احادیث کو سامنے رکھ کر علماء نے قیاس واجتہاد سے شہداء کی مزید اور قسمیں بھی بیان کی ہیں جن کا ذکر صراحتاً احادیث میں نہیں آیا ہے، مثال کے طور پر حدیث

---

(۱) رواہ البخاری فی صحیحہ۔

(۲) رواہ النسائی فی سننہ۔

من قتل دون مظلمة فهو شهيد میں لفظ مظلمہ عام ہے جو جملہ حقوق کو شامل ہوگا، اس لحاظ سے مردِ مجاہد اپنے وطن کی حفاظت یا مسلمانوں کی عزّت وصیانت میں فوت ہو جائے وہ بھی شہید ہی کے زمرے میں شمار ہوگا لیکن شہداء کی اس طویل فہرست میں ظاہر ہے کہ مقام ومرتبہ اور فضیلت کے اعتبار سے اس مردِ مجاہد کی ہمسری وبرابری کوئی بھی نہیں کرسکتا، جس نے بصد رغبت واشتیاق اپنے خالق ومالک کی رضا جوئی اور اسلام کی سربلندی کے لئے اپنی عزیز جان تک قربان کردی۔

اللہ کی راہ میں مقتول ہونے کی صورتیں

یہاں اس بات پر تنبیہ ضروری ہے کہ شہادت فی سبیل اللہ معرکۂ قتل وقتال ہی میں منحصر نہیں ہے بلکہ اس کی متعدد صورتیں ہیں جن میں بعض یہ ہیں۔

(۱) دین کی بنا پر کفار کی تعذیب وتنکیل کے صدمہ سے جاں بحق ہو جائے، جیسا کہ حضرت یاسر وسمیّہ (حضرت عمار کے والدین) کے ساتھ معاملہ پیش آیا۔

(۲) کفار نے غدر وفریب سے قتل کر دیا ہو جیسے شہداء بیر معونہ ورجیع کے ساتھ ہوا۔

(۳) امام جائر وظالم کسی مسلمان کو امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی بنا پر قتل کر دے جس کی کثرت سے مثالیں خلفاء متأخرین کے عہد میں ملے گی۔

(۴) خود مسلمان غلط فہمیوں کی بنیاد پر کسی امام عادل سے باغی ہو جائیں اور اسے قتل کر دیں جیسا کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے ساتھ معاملہ ہوا۔

(۵) کسی امام عادل کو دھوکہ سے قتل کر دیا جائے جیسا کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ساتھ پیش آیا، شہداء کی یہ جملہ قسمیں شہید فی المعرکہ ہی کے حکم میں ہیں۔

شہید کے احکام

اصطلاح شرع میں شہید کی دو قسمیں ہیں: (۱) شہید حقیقی (۲) شہید حکمی۔ شہید حقیقی کی تعریف یہ ہے۔

هو كل مسلم قتله اهل الحرب والبغى وقطّاع الطريق اوما وجد فى المعركة وعليه اثر من جرح او قتله مسلم او ذمّى ظلمًا ولم تجب بقتله دية(۱)

شہید ہر وہ مسلمان ہے جسے کافر، باغی یا ڈاکو قتل کردیں یا میدان جنگ میں مردہ پایا گیا ہو اور اس کے جسم پر زخم کے نشان ہوں یا اسے کسی مسلمان یا ذمی نے بہ نیت قتل ظلماً مار ڈالا ہو۔

اس کا یہ حکم ہے کہ بلا غسل وکفن خون آلود جسم اور کپڑوں میں اسے دفن کردیا جائے گا، نبی کریم...... نے شہداء احد کے متعلق فرمایا تھا زملوهم بدمائهم ولا تغسلوا شہداء بدر، احزاب اور خیبر کے بارے میں بھی کتب حدیث وسیر سے ثابت ہے کہ انھیں غسل و کفن نہیں دیا گیا تھا ہاں اگر شہید کے جسم پر کپڑے کم ہوں تو پھر الگ سے کپڑا زیادہ کردیا جائے گا جیسا کہ حضرت سید الشہداء حمزہؓ اور حضرت صہیب رومی رضی اللہ عنہما کا واقعہ دفن اس کی نظیر ہے، اس طرح اگر شہید کے جسم پر زائد کپڑے یا ہتھیار ہوں تو انھیں نکال دیا جائے گا۔

انه ينزع عنه السلاح والجلد والفرو الحشو والخف والقلنسوة لانه انّما لبس هذه الاشياء لدفع بأس العدو وبالموت استغنى عنه ذٰلك فضلا عن ان هذه عادة اهل الجاهلية فقد كانوا يدفنون ابطالهم بما عليهم من الاسلحة وقد نهينا نحن عن التشبه بهم.

شہید کے جسم سے ہتھیار اور زائد کپڑے مثلاً جلد، فرو، حشو، خف، قلنسوہ وغیرہ نکال دیئے جائیں گے کیونکہ اس نے ان اشیاء کو دشمن سے حفاظت کے لئے پہن رکھا تھا اور موت نے اس سے مستغنی کردیا، اس کے علاوہ یہ اہل جاہلیت کا طریقہ ہے کہ وہ اپنے بہادروں کو ان کے اسلحے سمیت دفن کرتے تھے اور ہمیں ان کی مشابہت اختیار کرنے سے منع کیا گیا ہے۔

لیکن اگر شہید ہونے کی حالت میں اس پر غسل واجب تھا تو ائمہ اربعہ حضرت امام

---

(۱) تبیین الحقائق علی کنز الدقائق ج ۱ ص ۲۴۷

اعظم ابی حنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمدؒ کے نزدیک اس صورت میں اسے غسل دینا ضروری ہوگا ان حضرات کی مستدل حضرت غسیل الملائکہ حنظلہ بن عامر کی حدیث ہے، رہا مسئلہ شہید پر نماز جنازہ پڑھنے کا تو اس میں ائمہ متبوعین کا اختلاف ہے، حضرت امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل کا مسلک اس سلسلے میں یہ ہے کہ غسل وکفن کی طرح اس پر نماز جنازہ بھی نہیں پڑھی جائے گی، ان حضرات کے دلائل یہ ہیں۔

(۱) عن جابر بن عبد اللّٰه انه صلی اللّٰه علیه و سلم امر بدفن شهداء احد بدمائهم ولم یغسلوا ولم یصلّ علیهم.

حضرت جابرؓ نقل کرتے ہیں کہ آنحضرت...... نے شہداء احد کو خون آلود دفن کرنے کا حکم دیا انھیں نہ غسل دیا گیا اور نہ اُن پر نماز پڑھی گئی۔

(۲) نماز جنازہ میت کی شفاعت اور دعاء مغفرت کے لئے مشروع ہوئی ہے، اور شہداء اس سے بے نیاز ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے گناہوں کو معاف کر دیا ہے اور ان کی مغفرت فرما دی ہے۔

(۳) بنص قرآنی شہداء زندہ ہیں انھیں خدا کی جانب سے رزق پہنچتا رہتا ہے اور نماز جنازہ مردوں کے لئے ہے زندوں کے لئے نہیں۔

احناف اس بات کے قائل ہیں کہ عام مردوں کی طرح شہید پر بھی نماز جنازہ پڑھی جائے گی احناف کے دلائل یہ ہیں۔

ان حضرات کے نزدیک یہ امر متحقق اور ثابت شدہ ہے کہ آنحضرت...... نے شہداء احد پر نماز جنازہ پڑھی ہے، حتی کہ حضرت سید الشہداء حمزہ رضی اللہ عنہ پر شہداء احد کی تعداد کے مطابق ستر بار نماز جنازہ پڑھی، حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت کا جواب یہ دیتے ہیں کہ یوم احد میں چونکہ ان کے ماموں، بھائی اور والد شہید ہوگئے اور یہ ان حضرات کی میت کو مدینہ لے جانا چاہتے تھے اس لئے بغرض انتظام مدینہ چلے گئے تھے اس لئے آنحضرت...... نے جس وقت شہداء کی نماز جنازہ پڑھی وہ وہاں موجود نہیں تھے، اس لئے انھیں اس کا علم نہ ہوسکا۔

(۲) نماز جنازہ کا مقصد صرف دعاء واستغفار ہی نہیں ہے بلکہ اس کے ذریعہ بہت سی شرافت وکرامت کا اظہار بھی مقصود ہے، اور اس تکریم کے شہداء دیگر اموات سے زیادہ مستحق ہیں علاوہ ازیں محوذنوب کے بعد بھی بندہ دعاء سے مستغنی نہیں ہوتا، اسی بناء پر حضرات صحابہ نے آنحضرت...... پر نماز جنازہ پڑھی ہے۔

(۳) رہا معاملہ شہداء کی حیات کا تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ حضرات حیات ہیں اور ان کو اللہ کی جانب سے رزق پہنچتا رہتا ہے، لیکن یہ حیات برزخی ہے، ہاں عام مؤمنین کی حیات برزخیہ سے ان کی حیات قوی ہے، احکام دنیوی کے اعتبار سے یہ حضرات بھی میت ہی ہیں، اسی لئے عام مردوں کی طرح انھیں دفن کیا جاتا ہے، ان کی میراث تقسیم ہوتی ہے اور انقضاء عدت کے بعد ان کی ازواج کو نکاح ثانی کا حق مل جاتا ہے، نماز جنازہ بھی احکام دنیوی ہی میں سے ہے، لہٰذا دیگر احکامات کی طرح اس پر بھی عمل کیا جائے گا۔

شہادت کیلئے کسی مخصوص اسلحہ سے مقتول ہونا ضروری نہیں

فقہاء کے نزدیک ثبوت شہادت کے لئے کسی مخصوص اسلحہ سے مقتول ہونا ضروری نہیں بلکہ جس طرح بھی موت واقع ہوئی ہو شہید ہی ہوگا، اس باب میں اصل شہداء احد ہیں اور ان میں بعض حضرات کی موت پتھروں سے اور بعض کی لاٹھیوں کی ضرب سے ہوئی ہے اور آنحضرت...... نے ترک غسل وکفن میں سب کو ایک ہی حکم میں رکھا، اسی طرح مرد و عورت کے درمیان اس سلسلے میں کوئی تفریق نہیں ہے۔

شہید حکمی

شہید حکمی وہ ہے جو باعتبار ثواب اخروی شہید حقیقی کے ساتھ ملحق کیا گیا ہو جیسے مطعون، مبطون، حریق وغریق وغیرہ جن کی تفصیل اوپر گذر چکی ہے اور ان کا یہ حکم ہے کہ عام مومنین کی طرح انھیں بطریق سنت غسل اور کفن دیا جائیگا اور بلا اختلاف ان پر نماز جنازہ پڑھی جائے گی۔

شہید کے فضائل

سخاوت انسان کے اندر ایک ایسا اعلیٰ وصف ہے کہ آدمی اس کی بدولت اپنے معاصرین اور ہم جنسوں میں ایک ممتاز حیثیت اور بلند مقام حاصل کر لیتا ہے اور دوست و دشمن سب اس کی تعریف میں رطب اللسان رہتے ہیں، زر و مال کے بذل و صرف کا انسانی نفوس پر جب یہ اثر ہوتا ہے تو اندازہ لگایئے جس مرد جانباز نے دین، مذہب وطن اور قوم کے لئے مال و متاع سے گذر کر اپنی جان تک کی بازی لگا دی ہو اس کا مقام و مرتبہ کیا ہوگا؟

”والجود بالنفس اقصى غاية الجود“

یہ ایک نا قابل انکار حقیقت ہے کہ اسلام کی ترقی و سربلندی بڑی حد تک انھیں ارباب عزیمت کے جذبۂ ایثار و قربانی کی مرہون ہے، جنھوں نے گلستانِ اسلام کی اپنے گرم و تازہ لہو سے آبیاری کر کے اسے سدا بہار بنا دیا، اس لئے قرآن و حدیث میں ان پاکباز نفوس کی جو فضیلت و مزیت بیان کی گئی ہے، انبیاء و صدیقین کے علاوہ یہ درجہ کسی کو حاصل نہیں، ذیل میں نمونتاً چند آیات و احادیث پیش کی جاتی ہیں۔

۱- ان اللّٰہ اشترى من المؤمنين انفسهم واموالهم بان لهم الجنة يقاتلون فى سبيل اللّٰہ فيقتلون ويقتلون وعدًا عليه حقًا فى التوراة والانجيل والقرآن ومن اوفى بعدهٖ من اللّٰہ فاستبشروا ببيعكم الذى بايعتم به وذٰلك هو الفوز العظيم (سورہ التوبہ)

یقیناً اللہ نے مومنین سے ان کی جانوں اور مالوں کو جنت کے عوض خرید لیا ہے یہ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں، قتل کرتے ہیں اور قتل کئے جاتے ہیں اللہ نے اس کا برحق وعدہ کیا ہے تورات، انجیل اور قرآن میں اور اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر وعدہ پورا کرنے والا کوئی نہیں، لہٰذا اے مسلمانو تم اس بیع پر خوش ہو جاؤ جس کا معاملہ تم نے کیا ہے، یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔

شہادت کی اس سے احسن و بلیغ تعریف و منقبت اور کیا ہو سکتی ہے، خود مالک انفس

واموال بیش بہا اور گرانقدر قیمت دے کر انھیں خرید رہا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی اطلاع دے رہا ہے کہ یہ ایسا وعدہ ہے جو قرآن کے علاوہ دیگر کتب سماویہ (تورات وانجیل) میں بھی مذکور ہے، پھر اس میں قوت اور تاکید پیدا کرنے کے لئے فرمایا جارہا ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ وعدہ خلافی نہیں کرتا۔

اگر قرآن حکیم میں اس آیت کے سوا اور آیتیں شہید کی فضیلت میں وارد نہ ہوتیں جب بھی کافی تھا، چنانچہ امام طبری لکھتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو صحابۂ کرام فرطِ مسرّت سے اللہ اکبر پکار اٹھے۔

۲- فاولئك مع الذين انعم اللّٰه عليهم من النبيين والصديقين والشهداء والصالحين وحسن اولئك رفيقا(۱)

یہ ان لوگوں کے ساتھ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا ہے یعنی انبیاء صدیقین شہداء اور صالحین اور ان کی رفاقت بہتر ہے۔

اس آیت پاک میں شہداء کو ایسی مقدس اور سعادت مند جماعت کے ساتھ شمار کیا گیا ہے جن پر انعام خداوندی ہوا ہے۔

۳- ولا تقولوا لمن يقتل فى سبيل اللّٰه امواتاً بل احياءٌ ولكن لا تشعرون(۲)

اور مت کہو ان لوگوں کو جو اللہ کی راہ میں قتل کئے گئے ہیں مردہ بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تمہیں (ان کی حیات کا) شعور نہیں۔

ولا تحسبن الذين قتلوا في سبيل اللّٰه امواتاً بل احياءٌ عند ربهم يرزقون.

ان لوگوں کو جو اللہ کی راہ میں قتل کئے گئے ہیں اموات میں خیال نہ کرو، وہ اپنے رب کے حضور ہیں اور رزق دیئے جاتے ہیں۔

ان دونوں آیتوں میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شہداء کرام کے اکرام واعزاز

---

(۱) سورۃ النساء آیت ۶۹۔

(۲) سورہ بقرہ، آیت ۱۵۴۔

کے لئے انھیں ایک خاص قسم کی حیات سے سرفراز کیا ہے اوران پر یہ انعام ہوا ہے کہ ان کی ارواح سبز چڑیوں کی شکل میں ان قندیلوں میں رہتی ہیں جو عرش سے لٹک رہی ہیں اور جنت میں جہاں چاہتی ہیں گھومتی پھرتی ہیں۔

فضائل شہید سے متعلق تین احادیث

عن ابی هريرة رضی اللّٰه عنه قال قال رسول اللّٰه ﷺ لولا ان شق علی امتی ما قعدت خلف سرية لوددت انّی اقتل فی سبيل اللّٰه ثم احيی ثم اقتل ثم احيی ثم اقتل ثم احيی ثم اقتل ثم احيی ثم اقتل (رواہ البخاری فی کتاب الایمان والجہاد)

حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت ...... نے فرمایا اگر میری امت پر دشوار نہ ہوتا تو میں تمام سرایا میں شرکت کرتا اور میری خواہش ہے کہ مجھے اللہ کے راستہ میں شہید کیا جائے، بعدازاں مجھے پھر حیات عطا ہو اس کے بعد پھر شہید کیا جاؤں، پھر زندگی ملے پھر شہید ہوں، پھر زندہ کیا جاؤں اور پھر شہادت نصیب ہو، پھر زندگی سے ہم کنار ہوں اور پھر شہید کیا جاؤں۔

امام المرسلین خاتم النّبیین ومحبوب رب العالمین کے مقام ومرتبہ کا اندازہ کون لگا سکتا ہے لیکن بایں ہمہ کمالات خود آنحضرت ...... شہات کی تمنا فرمارہے ہیں، شہید کی فضیلت و شرافت کے لئے اس سے بڑھ کر اور کیا چیز ہوسکتی ہے۔

(۲) قال النبی صلی اللّٰه علیه وسلم ما احد يدخل الجنة يرجع الی الدنيا وما علی الارض من شیء الا الشهيد يتمنّی ان يرجع الی الدنيا فيقتل عشر مرات لما يریٰ من الكرامة (اخرجه البخاری فی باب التمنی المجاهد ومسلم)

نبی کریم ...... نے فرمایا کہ کوئی شخص جنت میں داخل ہونے کے بعد دنیا میں لوٹ کر نہیں آئے گا اور نہ اس کی خواہش کرے گا البتہ شہید جب شہادت کے انعام اکرام کو دیکھے گا تو اسے یہ تمنا ہوگی کہ ایک مرتبہ کے بجائے دس بار شہادت سے ہم کنار ہو۔

(۳) قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم الشهيد عند اللّٰه ست خصال

يغفر له فی اول وقعة ویری مقعده من الجنة ویجار من عذاب القبر ویامن من الفزع الاکبر ویوضع علی راسه تاج الوقار الیاقوتة منها خیر من الدنیا وما فیها یتزوج اثنین وسبعین زوجة من الحور العین ویشفع فی سبعین من اقربائه (رواه الترمذی وابن ماجه)

رسول اللہ...... نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے شہید کو چھ انعام عطا ہوں گے (۱) شہید ہوتے ہی اس کی مغفرت ہو جاتی ہے اور جنت میں اس کا جو مقام ہے وہ دکھا دیا جاتا ہے (۲) عذاب قبر سے محفوظ کر دیا جاتا ہے (۳) فزع اکبر (حساب وکتاب کی پیشی کے دن کے خوف) سے مامون رکھا جائے گا (۴) (قیامت کے دن) اس کے سر پر ایسا قیمتی تاج رکھا جائے گا جس کے ایک ایک یاقوت کی قیمت دنیا و مافیہا سے بڑھی ہوئی ہے (۵) بہتّر حوریں اس کے نکاح میں دی جائیں گی (۶) اس کے عزیزوں میں سے ستّر کے بارے میں اس کی شفاعت قبول کی جائے گی۔

شوق شہادت

قرآن وحدیث میں وارد انھیں فضائل ومناقب کا یہ اثر تھا کہ مجاہدین اسلام میں جذبۂ شہادت اس درجہ بڑھا ہوا تھا کہ بیٹا باپ پر اور باپ بیٹے پر اس کی تحصیل کے لئے سبقت کی کوشش کرتا تھا، اسی طرح بھائی بھائی سے آگے نکل جانے کی فکر میں رہتا تھا چنانچہ غزوۂ بدر کے موقع پر حضرت خیثمہؓ اور ان کے بیٹے حضرت سعدؓ میں اس بات پر اختلاف ہو گیا کہ دونوں میں سے غزوہ میں کون شریک ہو بالآخر رفع نزاع کیلئے قرعہ اندازی ہوئی اور مقدر چاہا ایسا ہوا کہ بیٹے یعنی حضرت سعدؓ کے نام پر قرعہ نکل آیا، لیکن والد گرامی حضرت خیثمہ کی پھر بھی یہی خواہش رہی کہ سعد مجھے ترجیح دیں، جانباز بیٹے نے پدر بزرگوار کو اس موقع پر جو جواب دیا ہے اس کے حرف حرف سے شوقِ شہادت اور لقائے جنت کی بے پناہ خواہش کا اندازہ ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں

واللّٰہ یا ابت لو کان ما تطلبه منی غیر الجنة. لفعلت.

ابا جان! بخدا اگر آپ مجھ سے جنت کے علاوہ کسی اور شئی کا مطالبہ کرتے تو میں ضرور قبول کر لیتا۔

الحاصل حضرت سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ غزوہ بدر میں شریک ہوئے اور اپنی دیرینہ تمنا یعنی شہادت کے شرف ومجد سے ہمکنار ہوکر منعم علیہم کی جماعت میں شریک ہوگئے، حضرت خیثمہ رضی اللہ عنہ کو جب بیٹے کی شہادت کی اطلاع ملی تو بجائے رنج وصدمہ کے اپنی محرومیٔ شہادت کا ذکر یوں فرماتے ہیں:

لقد اخطاتنی وقعة بدر وکنت واللّٰہ حریصا حتی ساھمنی ابنی فی الخروج فخرج فی القرعة سھمه فرزق الشھادة ولقد رأیت البارحة ابنی فی النوم فی احسن صور یسرح فی ثمار الجنة وانهارها ویقول الحق بنا توافقنا فی الجنة فقد وجدت ما وعدنی ربی حقا.

میں غزوۂ بدر میں شرکت سے رہ گیا حالانکہ میں اس کا نہایت حریص تھا، حتی کہ میرے لخت جگر نے مجھ سے قرعہ اندازی کی اور اس کا نام قرعہ میں آگیا اور وہ اپنے مقصود کو پا بھی گیا، میں نے گذشتہ رات خواب میں اسے بہترین صورت میں جنت کے پھلوں اور نہروں سے آسودہ ہوتے ہوئے دیکھا ہے اور وہ کہہ رہا تھا والد صاحب میرے پاس آپ بھی آجایئے ہم جنت میں ایک ساتھ رہیں گے، اللہ تعالیٰ نے جو کچھ وعدہ کر رکھا تھا وہ بالکل درست نکلا۔

پھر آنحضرت...... سے عرض پرداز ہوئے کہ اے رسول اللہ میں اپنے رب کی لقا کا طلب گار اور اپنے لخت جگر کی مرافقت کا مشتاق ہوں دعا فرما دیجئے کہ اللہ تعالیٰ مجھے شہادت نصیب فرمائے، آنحضرت ...... نے دعا فرمائی جو مقبول ہوئی اور غزوۂ احد میں وہ بھی تمنا بکنار ہوکر رحمتِ خداوندی کے آغوش میں جا پہنچے۔

(۲) غزوۂ احد کی تیاریاں ہو رہی ہیں حضرت عمرو بن جموح رضی اللہ عنہ کے چاروں بیٹے انتظامات مکمل کر کے گھر سے نکلنے والے ہیں کہ حضرت عمرو بھی معذور پیروں سے لنگڑاتے ہوئے ان کے پاس پہنچ جاتے ہیں اور بیٹوں کے ہمراہ جہاد پر چلنے کا اصرار

کرتے ہیں بیٹوں نے ان کی معذوری کے پیش نظر انھیں روکنے کی کوشش کی اور اللہ تعالیٰ کا فرمان لیس علی الاعمی حرج ولا علی الاعرج حرجٌ ولا علی المریض حرج (نابینا لنگڑے اور مریض کے لئے جہاد میں شرکت نہ کرنا جرم نہیں ہے) پڑھ کر اطمینان دلایا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو شرکت جہاد سے معاف کردیا ہم تو آپ کے بدلے جا ہی رہے ہیں، لیکن یہاں تو حضرت عمرو کے قلب وجگر کو شوقِ جہاد کھائے جا رہا تھا، انھیں بیٹوں کے اس دلاسے پر بالکل تشفی نہیں ہوئی اور نبی کریم ...... کی خدمت میں پہنچ گئے کہ درد دل کا مداوا وہیں ہوگا، اور عرض پرداز ہوئے کہ اے اللہ کے رسول ...... میری تمنا ہے کہ میں بھی جہاد میں شریک ہوں اور شہادت سے مشرف ہوکر اپنے انھیں لنگڑے پیروں سے جنت کی سیر کروں مگر میرے بیٹے مجھے اس سے باز رکھنا چاہتے ہیں، آنحضرت ...... نے فرمایا کہ "اما انت فقد وضع اللہ عنك الجهاد" اللہ تعالیٰ نے جہاد کی ذمہ داری سے تمھیں سبکدوش کردیا ہے اور اس کے ساتھ ان کے بیٹوں سے کہا کہ انھیں روکو مت بہت ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ انھیں شہادت کی سعادت سے شادکام فرمادے چنانچہ حضرت عمرو رضی اللہ عنہ اس معذوری کے باوجود شریک جہاد ہوئے اور جامِ شہادت نوش فرماکر اپنے مقصود کو حاصل کرلیا، تاریخ اسلامی حضرات صحابۂ کرامؓ ومجاہدینِ اسلام کے شوق جہاد و شہادت کے واقعات سے بھری پڑی ہے، مگر خوف طوالت سے صرف دو واقعات پر اکتفا کیا جارہا ہے۔

عہد نبوی کے شہداء کرام

آنحضرت ...... کے عہد مبارک میں شہید ہونے والوں کی کوئی جامع فہرست اب تک نظر سے نہیں گذری ہے کیونکہ عام طور پر محدثین وارباب سیر وتاریخ بدر، احد، خندق اور خیبر کے شہداء کرام کی نشاندہی کے بعد خاموش ہوجاتے ہیں، پھر بھی حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے تذکروں میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں "مثلاً الاستیعاب فی اسماء الاصحاب، اسد الغابه فی معرفة الصحابه الاصابه فی تمییز الصحابه"

وغیرہ کے مطالعہ سے ان حضرات کی جامع و مکمل فہرست مرتب کی جا سکتی ہے مگر یہ کام دقّت طلب ہونے کی ساتھ وقت اور اطمینان کا بھی متقاضی ہے اور فی الحال یہ میسر نہیں اس لئے سردست ایک سرسری جائزہ پر اکتفاء کیا جا رہا ہے۔

عہد نبوت میں حق و باطل کے ساتھ جو اہم معرکے ہوئے ہیں وہ یہ ہیں، غزوۂ بدر، غزوۂ احد، غزوۂ احزاب، غزوۂ خیبر، فتح مکہ، غزوۂ حنین اور غزوۂ تبوک۔ ان کے علاوہ کچھ معمولی عزوات و سرایا ہیں ان سب میں جو حضرات شہید ہوئے ان کی تعداد بقول مولانا عبدالماجد دریابادی ۲۵۹ ہے، واللہ اعلم بالصواب۔

نسأل اللّٰه سبحانه ان يغفر خطايانا وان يربط قلوبنا ويثبت اقدامنا وينصرنا على القوم الكفرين وصلّى اللّٰه على نبى الرحمة ونبى الملحمة سيدنا محمد وآله وصحبه اجمعين.

☆ ☆ ☆

جمعیۃ اہل حدیث کانپور کی ایک تحریر پر بحث ونظر

تمہید

تقریباً چار پانچ سال کا عرصہ گذرا ہوگا کہ کان پور سے بعض احباب نے بذریعہ ڈاک ایک کتابچہ بندہ کے پتہ پر بھیجا تھا، اسی کے ساتھ اپنے مکتوب میں اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ اولین فرصت میں اس کتابچہ پر اپنا تبصرہ لکھ کر بھیج دیا جائے، یہ کتابچہ ”جمعیۃ اہل حدیث کانپور“ کی جانب سے شائع کیا گیا تھا جسے دیکھ کر اندازہ ہوا کہ یہ کسی مقلد کے جواب میں لکھا گیا ہے، چونکہ سوالنامہ نہیں بھیجا گیا تھا اس لئے اس کے تفصیلی مندرجات کیا تھے معلوم نہیں ہوسکا، بہرحال مرسل کتابچہ کی خواہش پر بعجلت تمام اس پر نقد وتبصرہ لکھ کر بھیج دیا گیا۔ آگے پھر کیا ہوا کچھ پتہ نہیں کیونکہ اس سلسلے میں کسی طرف سے کوئی گفتگو نہیں ہوئی۔

اس چار پانچ سالہ عرصہ کے بعد سالِ رواں میں عیدالاضحیٰ کی تعطیل گذار کر دیوبند واپس لوٹا تو دارالعلوم دیوبند میں زیر تعلیم ایک طالب علم نے ایک لفافہ دیا اور زبانی بتایا کہ ہمارے یہاں کے امام جامع مسجد نے یہ لفافہ دیا ہے، بندہ اس وقت بخار میں مبتلا تھا اس لئے اس وقت اس کے دیکھنے کی ہمت نہیں ہوئی، ہفتہ عشرہ کے بعد جب طبیعت بحال ہوگئی تو اس لفافہ کو کھولا اس میں سے وہی پانچ سالہ کتابچہ برآمد ہوا جسے دیکھ کر کچھ دیر کے لئے حیرت زدہ ہوگیا کہ بعینہٖ یہی رسالہ آج سے لگ بھگ پانچ سال پہلے کان پور سے آیا تھا اور اب وہی تامل ناڈو سے آرہا ہے آخر ماجرا کیا ہے؟ لفافے میں مذکورہ کتابچہ کے ساتھ ایک مطبوعہ ہینڈبل بھی تھا جس میں احناف کو دعوت دی گئی تھی کہ اب جبکہ حق ظاہر ہو چکا ہے تو

غیر معصوم کی تقلید چھوڑ کر جماعت اہل حدیث کی طرح نبیؐ معصوم کی اتباع و پیروی اختیار کرلو کیونکہ تمہارے اشکالات واعتراضات کے جوابات حدیث کی روشنی میں دیدئے گئے ہیں اور علمائے احناف کی جانب سے ان پر کوئی نقد وتبصرہ اب تک سامنے نہیں آیا ہے جس کا صاف مطلب ہے کہ انھوں نے ہمارے جوابات تسلیم کر لئے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔

اس ہینڈ بل کو دیکھ کر اندازہ ہوا کہ یہ لوگ غافل عوام کو کس کس طرح ذہنی و علمی انتشار میں مبتلا کرنے کے درپے ہیں، جبکہ وہ مسائل جنھیں ان لوگوں نے آج حق و باطل کا معیار ٹھہرا رکھا ہے ان میں بیشتر کا تعلق اسلام کے فروعی احکام سے ہے اور اس طرح کے مسائل میں حضرات صحابہ، اکابر تابعین، ائمہ مجتہدین اور فقہائے محدثین مختلف العمل رہے ہیں، اور ان کے اس اختلاف کو حق و باطل کے اختلاف کی صورت میں پیش کرنا اہل سنت والجماعت کے معروف طریقہ کے یکسر خلاف ہے۔ کیونکہ سلف صالحین اور اکابر امت اس طرح کے اختلاف کو اختلاف تنوع اور وسعت ورحمت سے تعبیر کیا کرتے تھے۔

پھر اس حقیقت کو بھی پیش نظر رکھنا چاہئے کہ برصغیر کے مسلمانوں میں اس اختلاف کے پیدا کرنے والے یہی لوگ ہیں، ان لوگوں کے وجود سے پہلے عام مسلمان ان مسائل میں اختلاف سے یکسر خالی الذہن تھے، کیونکہ برصغیر کی مذہبی تاریخ سے معمولی واقفیت رکھنے والے بھی جانتے ہیں کہ اس خطۂ ارض میں اسلام کے داخلہ کے وقت ہی سے یہاں کے اہل سنت والجماعت سے وابستہ مسلمان اللہ ورسول کی اطاعت اور اسلامی احکام پر عمل فقہ حنفی کی رہنمائی میں کرتے رہے ہیں، انیسویں صدی عیسوی میں بعض سیاسی محرکات کے تحت اس نام نہاد جماعت حقہ کا ظہور ہوا اور اسی وقت سے ان مسائل میں اختلاف کا آغاز ہوا جسے دینی فہم اور اسلامی روح سے عاری لوگوں نے اپنی جارحانہ تبلیغ وتشہیر کے ذریعہ کفر و اسلام کے اختلاف کی حد تک پہنچا دیا، جس کی بناء پر اسلامی اخوت اور دینی وحدت کا وہ تصور جس کا اسلام متقاضی ہے دل ودماغ سے اوجھل ہوتا جا رہا ہے۔ شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ ایک موقع پر ایسے ہی لوگوں کو تنبیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

فان الاعتصام بالجماعة و الائلاف من اصول الدين والفرع المتنازع فيه

من الفروع الخفية فكيف يقدح فى الاصل بحفظ الفرع، وجمهور المتعصبين لا يعرفون من الكتاب والسنة الا ماشاء الله . (مجموع فتاوی شیخ الاسلام ابن تیمیہ، ج:۲۲،ص:۲۵۴)

جماعت مسلمین کا باہمی مستحکم رابطہ اور وابستگی دین اسلام کے اصول میں سے ہے اور جس فروعی مسئلہ میں جھگڑا کیا جا رہا ہے وہ ایک غیر واضح فرعی مسئلہ ہے لہٰذا فرع اور شاخ کی حفاظت کے لیے اصل اور جڑ کو کیونکر مجروح کیا جا سکتا ہے، لیکن اکثر متعصب لوگ کتاب وسنت کی معرفت سے ناآشنا ہیں الا ماشاء اللہ۔

پھر یہ ان مسائل میں سے بھی نہیں ہیں جن کی عوام کو تبلیغ کی جائے اور انہیں مختلف تدبیروں سے مجبور کیا جائے کہ وہ اپنے مالوف ومتعارف اسلامی طریقہ کو جو صحیح دلائل سے ثابت شدہ ہیں چھوڑ کر دوسرے طریقہ کو اختیار کریں چنانچہ خلیفہ وقت ابوجعفر منصور عباسی نے جب امام مالک رحمہ اللہ سے اپنے اس ارادہ کا اظہار کیا کہ آپ نے اپنی کتاب ’’مؤطا‘‘ میں جو احادیث جمع کی ہیں میرا ارادہ ہے کہ اسلامی ممالک کے امراء اور قاضیوں کے نام یہ فرمان جاری کردوں کہ اسی کتاب کے مطابق فیصلے کئے جائیں جو لوگ اس کی مخالفت کریں گے ان کی گردن اڑا دی جائے گی، امام مالک نے یہ سن کر فرمایا کہ امیر المومنین ایسا نہ کیجئے کیونکہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جب کثرت سے فتوحات ہوئیں تو حضرت فاروق اعظم نے ہر خطہ میں اسلامی علوم کی تعلیم کے لئے بحیثیت معلم کے حضرات صحابہ کو بھیجا اب ہر خطہ کے مسلمان نسلاً بعد نسلٍ اپنے معلّمین کے بتائے ہوئے طریقہ پر عمل کرتے آرہے ہیں۔ لہٰذا اگر انھیں دوسرے ایسے طریقہ پر پھیرنے کی کوشش کی جائے گی جسے وہ جانتے نہیں تو وہ اپنے معروف طریقہ کے مقابلے میں اس نئے طریقہ کو کفر سمجھیں گے اس لیے ہر خطہ کے مسلمانوں کو جو اسلامی احکام بذریعہ صحابہ نسلاً بعد نسل پہنچے ہیں انھیں اسی کے مطابق چھوڑ دیجئے۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے مقدمہ کتاب الجرح والتعدیل للحافظ عبد الرحمٰن بن ابی حاتم، ص:۲۹)

اسی لئے امام تیمیہ ایک موقع پر لکھتے ہیں:

انه لاینبغی لاهل العلم ان یجعلوا هذه المسألة محنة و شعارا یفضّلون بین اخوانهم و اضدادهم فان مثل هذا ممایکرهه الله و رسوله صلی الله علیه وسلم و کذلك لا یفاتحوا فیها عوامّ المسلمین الذین هم فی عافیة و سلام عن الفتن و لکن اذا سئل عنها او رأی من هو اهل لتعریفه ذلك القی الیه مما عنده من العلم ما یرجو النفع به . (مجموع الفتاوی، ج:۲۴، ص:۱۷۲، و مابعد)

اہل علم کے لئے مناسب نہیں ہے کہ اس مسئلہ کو آزمائش اور علامت بنالیں کہ اسے اپنے حمایتیوں اور مخالفین کے درمیان فضیلت و بڑائی کا ذریعہ ٹھہرائیں اس طرح کا رویہ اللہ اور اس کے رسول کے نزدیک ناپسندیدہ ہے۔ اسی طرح اس نوع کے مسائل سے عوام مسلمانوں کو مخاطب نہ بنائیں تاکہ وہ فتنوں سے امن وسلامتی میں رہیں۔ البتہ جب ان سے اس کے بارے میں سوال کیا جائے یا کسی کے بارے میں یہ سمجھیں کہ وہ اس کا اہل ہے تو اپنے علم کے مطابق اسے نفع کی امید رکھتے ہوئے بیان کردیں۔

لیکن عصر حاضر کے نام نہاد اہل حدیث چونکہ صرف اور صرف اپنے علم وفہم ہی کو معیار سمجھتے ہیں اس لئے علمائے اسلام کی اس طرح کی تصریحات کو پس انداز کرکے اپنے مختارات اور پسندیدہ مسائل کی نہ صرف جارحانہ تبلیغ وتشہیر کرتے ہیں بلکہ اپنے مخالف مقلدین کو سچا پکا مسلمان ماننے کے لیے بھی تیار نہیں ہیں۔ ”فالی الله المشتکیٰ“

بہرحال اس دوسرے خط کی بناء پر یہ مناسب معلوم ہوا کہ اس کتابچہ کا علمی جائزہ لیا جائے اور اتمام حجت کے لئے رسالہ میں اسے شائع کردیا جائے۔ کتابچہ میں کچھ سوالات اور ان کے جوابات محض لفظی گرفت اور بیجا مباحث سے متعلق ہیں اس لئے انہیں نظر انداز کردیا گیا ہے۔ پھر آخر میں احناف کے بعض فقہی جزئیات پر اعتراضات نقل کئے گئے ہیں جن کے متعدد جوابات علمائے احناف کی جانب سے شائع ہوچکے ہیں نیز چونکہ یہ لوگ معانی حدیث میں غور وفکر کے بجائے ظاہر الفاظ پر ہی اپنی توجہ مرکوز رکھتے ہیں اس لیے ان فقہی مسائل میں ان کے بیشتر اعتراضات اسی ظاہر پرستی سے تعلق رکھتے ہیں جنھیں ادنی تامل سے سمجھا جاسکتا ہے اس لئے ان کے جوابات سے بھی تعرض نہیں کیا گیا ہے۔

جمعیۃ الاحناف کے سوالوں کے معقول جوابات

از: جمعیۃ اہل حدیث کانپور

فلا وربك لايؤمنون حتّٰى يحكموك فيما شجر بينهم ثم لا يجدوا فى انفسهم حرجًا مما قضيت ويسلّمو تسليما .

ترجمہ: اے (محمد) تمہارے رب کی قسم یہ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ اپنے باہمی اختلافات میں تم کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں پھر جو کچھ آپ فیصلہ کریں اس پر اپنے دلوں میں کوئی تنگی نہ محسوس کریں۔ بلکہ سر بہ سر تسلیم کر لیں۔

اللہ رب العالمین کا شکر و احسان ہے کہ ہم اہل حدیث ہیں ہمارا دعویٰ ہے کہ امت کی نجات رسول اللہ...... کے فرمان کے مطابق زندگی گذارنے میں ہے اور ہر شخص کو جہاں تک ممکن ہو سکے معصوم کی پیروی کرے اور غیر معصوم کی پیروی نہ کرے اپنے آپ کو مصیبت میں ڈالنے کا سامان نہ کرے صرف نبی اکرم...... ہی معصوم ہیں باقی امت میں کوئی دوسرا معصوم نہیں قرآن میں اللہ تعالیٰ نے ہم کو اپنی اور اپنے رسول کی فرمانبرداری کا حکم دیا ہے۔ اور ہمیں خبردار کیا ہے کہ اگر اس راہ سے ہٹ گئے تو سارے اعمال غارت ہو جائیں گے۔

اطيعو اللّٰه واطيعو الرسول ولا تبطلوا اعمالكم .

ہمارے بعض بھائیوں نے دس سوالات کر کے ہم کو کسوٹی پر پرکھنے کی کوشش کی ہے آج کی محفل میں ہم ان کی غلط فہمی دور کرنے کیلئے ان سوالات کے جوابات دے رہے ہیں۔ شاید اللہ تعالیٰ انکو سیدھے راستے پر لگا دے۔ اور وہ امتیوں کی جو معصوم نہیں ہیں کی شخصی اور اندھی تقلید چھوڑ کر اپنے معصوم نبی کی اتباع کرنے لگ جائیں۔ ہمارے بھائیوں کو کسی نے یہ دھوکہ دیا ہے کہ اہل حدیث احادیث کا انکار کرتے ہیں اس دھوکہ کو آج وہ سمجھ لیں اور یقین کر لیں کہ اہل حدیث ہرگز حدیث کا انکار نہیں کرتے اور کسی کو ایسا نظر آتا ہے تو اس کے علم کی کمی ہے اور علم حدیث سے نادانی کا نتیجہ ہے۔

مسئلہ (۱) ابراد بالظہر یعنی گرمی میں ظہر کو تاخیر سے پڑھنا

پہلے سوال کا جواب از جمعیة اهل حدیث :

ابردوا بالظهر فان شدّت الحر مِنُ فيح جهنّم .

آپ نے پہلے تو ترجمہ غلط کیا ہے دوسرے حدیث کو سمجھنے میں غلطی کی ہے۔

رسول اکرم...... کو حضرت جبریل علیہ السلام نے دو وقت نماز پڑھائی ایک دن اول وقت اور دوسرے دن اس سے تھوڑا بعد، اسی طرح آپ سے ایک سائل نے نماز کے اوقات کے متعلق پوچھا اس کو آپ نے اپنے ساتھ دو دن نماز پڑھنے کا حکم دیا جس میں پہلے دن ظہر زوال کے بعد ادا فرمائی جبکہ دوسرے دن ظہر کچھ تاخیر سے ادا فرمائی پہلی حدیث ابوداؤد کی اور دوسری مسلم کی ہے۔

نیز یاد رہے افضل عمل کے بارے میں سوال کے جواب میں آپ نے نماز کو اول وقت پر ادا کرنا افضل عمل قرار دیا پھر مندرجہ بالا حدیث نہ تو ضعیف ہے اور نہ اہل حدیث کے نزدیک ناقابل عمل ہے بلکہ بات صرف اتنی ہے کہ ابراد کا حکم بطور دفع مشقت اور بوجہ شفقت ہے اور یہ امر مندوب ہے کیونکہ اس کے لئے قرائن صادقہ موجود ہیں۔

حضرت ابن عبداللہ بن عمر کی حدیث جس کو مسلم، ابوداؤد، احمد اور نسائی نے نقل کیا ہے اس میں ہے ”وقت الظهر اذا زالت الشمس“ ظہر کا وقت زوالِ شمس کے بعد ہے۔

حضرت ابن عباس کی روایت میں ہے ”فصلى بى الظهر حين زالت الشمس“ یعنی زوالِ شمس کے بعد ہی ظہر پڑھائی۔ اس کو ابوداؤد، ترمذی، نسائی، حاکم ابن حبّان و ابن خزیمہ نے روایت کیا۔ امام بخاری ہی نے حضرت جابر سے یہ نقل فرمایا ہے کہ رسول اللہ...... سخت گرمی میں نماز ظہر زوال شمس کے بعد پڑھتے تھے۔ اور امام بخاریؒ ہی حضرت انس بن مالک سے نقل کرتے ہیں کہ رسول اکرم ...... نے ظہر زوال شمس کے فوراً بعد پڑھی۔ یہ دونوں حدیثیں بخاری میں موجود ہیں۔

سیار بن سلامہ کی حدیث میں جو متفق علیہ حدیث ہے موجود ہے ”كان يصلى

الھجیر التی تدعو نھا الا ولی حین تدحض الشمس“

بخاری ہی میں حضرت انسؓ کی یہ حدیث بھی ہے کہ ہم آپ...... کے پیچھے گرمی کے موسم میں ظہر پڑھتے تو گرمی کی شدت کے سبب کپڑوں پر سجدہ کرتے۔

یہ ساری احادیث ہمیں یہ بتاتی ہیں کہ گرمی کی شدت کے سبب ٹھنڈا کر کے نماز پڑھنے کا حکم بطور شفقت اور دفع مشقت کے ہے۔ بطور لزوم و وجوب نہیں اور چونکہ اول وقت کی فضیلت موجود ہے۔ اس لئے ٹھنڈا کر کے پڑھنا جائز ہے اور اول وقت میں پڑھنا علی کل حال افضل ہے۔ اس سلسلہ میں مسلم شریف کی مندرجہ ذیل حدیث ملاحظہ فرمائیں جس میں زوال شمس سے کافی تاخیر کر کے پڑھنے والوں کے لئے درس عبرت ہے وَعَن ابی ذرّ قال قال رسول اللّٰہ علیه و سلم کیف انت اذ کانت علیك امراء یمیتون الصلوة او یؤخرون عن وَقتها قلتُ فما تأمرنی قال صلِّ الصّلوٰة لِوقتها فان ادر کتَهَا معهم فصلِّ فَانَّهَا لك نافلة (صحیح مسلم)

ترجمہ: ”حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے کہتے ہیں کہ آپ...... نے مجھے فرمایا تیرا کیا حال ہوگا جس وقت ہوں گے تجھ پر (مسلط) امام جو دیر کریں گے نماز کو یا دیر کریں گے اس وقت سے میں نے کہا آپ مجھے ایسے حال میں کیا حکم کرتے ہیں۔ فرمایا پڑھ تو اس کے اول وقت پر پھر اگر پائے تو اس نماز کو ان کے ساتھ پس پڑھ تو نماز پس تحقیق یہ تیرے لئے نفل ہوگی۔“

بھائی صاحب کیا آپ نے غور کیا کہ ان ممالک اور مقامات میں جو ٹھنڈے ہیں وہاں بھی احناف نماز کو تاخیر سے پڑھتے ہیں۔ شملہ، مسوری، نینی تال، اوٹی وغیرہ مقامات پر کیوں تاخیر کی جاتی ہے؟ ہم سمجھتے ہیں کہ ظہر کی نماز پڑھ کر جہنم کی تپش و گرمی کو کم کیا جائے اور اول وقت ہی نماز پڑھی جائے۔ جیسا کہ رسول اکرم...... کا عام حکم ہے۔ اور صحابہ کرام کا عمل رہا ہے۔ اور اگر کوئی تھوڑا دیر کر کے پڑھتا ہے تو جائز ہے۔

بحث ونظر

حدیث ”ابردوا بالظهر فان شدت الحر من فیح جهنم“

(الف) آپ نے ترجمہ غلط کیا ہے۔

سوال میں حدیث کا ترجمہ یوں ہے اللہ کے رسول نے فرمایا کہ ظہر کی نماز ٹھنڈی کر کے پڑھو اس لئے کہ گرمی کی شدت جہنم کی بھاپ کا اثر ہے۔ مجیب لبیب اس ترجمہ کو غلط بتا رہے ہیں جو بجائے خود ایک غلطی ہے کیونکہ مشہور غیر مقلد عالم مولانا وحید الزماں حیدر آبادی نے بھی یہی ترجمہ کیا ہے۔ ان کا ترجمہ ملاحظہ کیجئے:

عن ابی هريرة ان رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم قال : اذا اشتد الحر فابردوا عن الصلاة فان شدة الحر من فيح جهنم.

موطاء امام مالک کی اس روایت کا ترجمہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ابوہریرہ سے روایت ہے کہ فرمایا رسول اللہ...... نے جب تیز گرمی ہو تو تاخیر کرو نماز کی ٹھنڈک تک اس لئے کہ تیزی گرمی کی جہنم کے جوش سے ہے۔ (مترجم موطاء امام مالک ص ۲۹ مطبوعہ ۱۹۷۵÷ ملک پبلیشرز پراویٹ لمیٹڈ دیوبند)

ترجمہ کے بعد ’’فائدہ‘‘ کے تحت لکھتے ہیں:

بعض لوگوں نے ’’فابردوا عن الصلاۃ‘‘ کے یہ معنی کئے ہیں کہ اول وقت پڑھو نماز کو، مگر یہ معنی سیاق حدیث کے خلاف ہے، اور بخاری ومسلم نے ابوذرؓ سے روایت کیا ہے کہ ہم نبی ...... کے ساتھ سفر میں تھے تو مؤذن نے ارادہ کیا اذان کا، فرمایا آپ...... نے ٹھنڈا کر یہاں تک کہ دیکھا ہم نے سایہ ٹیلوں کا، اس حدیث سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ’’ابردوا عن الصلاۃ‘‘ کے معنی وہی ہیں جو ہم نے بیان کئے یعنی تاخیر کرو نماز کی ٹھنڈک تک۔‘‘ (مترجم مؤطاء امام مالک ص ۳۰)

مولانا وحید الزماں کے ترجمہ مع فائدہ کو اور سائل کے ترجمہ کو بغور پڑھئے دونوں کا مفہوم یکساں ہے بس الفاظ کا فرق ہے۔

نیز علمائے غیر مقلدین کے پیشوا قاضی شوکانی اور شیخ محمد بن اسماعیل صنعانی نے بھی اس حدیث کا یہی مفہوم بیان کیا ہے۔ (دیکھئے نیل الاوطار، ج:۱، ص: ۳۵۵، اور سبل السلام شرح بلوغ المرام، ج:۱، ص: ۱۷۴) تو کیا جماعتِ غیر مقلدین کے یہ مؤقر ومحترم

پیش رو علماء نے بھی اس حدیث کا معنی غلط بیان کیا ہے؟ ’’قصور ہم ان کو دیتے تھے خطا اپنی نکل آئی‘‘

(ب) آگے جماعت حقہ رقم طراز ہے۔

رسول اکرم ......کو حضرت جبریل نے دو وقت نماز پڑھائی ایک روز اول وقت اور دوسرے دن اس سے تھوڑا بعد اسی طرح آپ سے ایک سائل نے نماز کے متعلق پوچھا اس کو آپ نے اپنے ساتھ دو دن نماز پڑھنے کا حکم دیا جس میں پہلے دن ظہر زوال کے بعد ادا فرمائی جبکہ دوسرے دن کچھ تاخیر سے ادا فرمائی۔

اس سلسلے میں عرض ہے کہ یہ دونوں حدیثیں ’’ابردوا بالظهر‘‘ کے معارض و مخالف نہیں ہیں ان میں تو نماز کے ابتدائی و انتہائی اوقات کو بتایا گیا ہے۔ مسئلہ زیر بحث سے غیر متعلق حدیثوں کو نقل کر کے خوامخواہ کے لئے تحریر کو طول دیا گیا ہے۔ نیز دوسری حدیث جو آنجناب کی تحریر کے مطابق مسلم کی ہے۔ اس میں آپ لکھتے ہیں ’’جبکہ دوسرے دن ظہر کچھ تاخیر سے ادا فرمائی‘‘ یہ ترجمہ حدیث کے کس جملہ کا کیا گیا ہے براہ کرم حدیث کے اس جملہ کو نقل فرما دیں! غالبا حدیث کے الفاظ ’’ثم اخر الظهر حتى كان قريبا من وقت العصر بالامس‘‘ کا آپ نے یہ ترجمہ کیا ہے۔ جو حدیث کے الفاظ کو اپنے خود ساختہ معنی پہنانے کی ناروا جسارت ہے۔ جبکہ حدیث کے الفاظ کا صحیح ترجمہ یہ ہے۔ پھر مؤخر کیا ظہر کو یہاں تک کہ ہوگئی وہ گذشتہ کل کے عصر کے قریب۔

(ج) پھر سوال کے اصل جواب کی جانب رجوع کرتے ہوئے لکھا گیا ہے۔ یاد رہے افضل عمل کے بارے میں سوال کے جواب میں آپ نے نماز کو اول وقت پر ادا کرنا افضل عمل قرار دیا پھر مندرجہ بالا حدیث نہ تو ضعیف ہے اور نہ اہل حدیث کے نزدیک ناقابل عمل ہے الخ۔

عرض ہے کہ صحیح بخاری و مسلم میں اس حدیث کے الفاظ یہ ہیں ’’سألت النبی صلی اللہ علیه وسلم ای العمل احب الی اللہ؟ قال الصلاة علی وقتها‘‘ اور بعض روایتوں میں ’’الصلاة لوقتها‘‘ کا لفظ ہے۔ البتہ سنن ابی داؤد اور سنن ترمذی کی روایت میں

”الصلاۃ فی اول وقتها“ کے الفاظ ہیں اور امام ترمذی نے اس کی سند پر یہ نقد کیا ہے هذا حديث لا يروى الا من حديث عبدالله بن عمر العمرى وليس بالقوى عند اهل الحديث، وقد اضطربوا في الحديث“ اور یہ عبداللہ بن عمر العمری ابوداؤد کی سند میں بھی ہیں۔ علاوہ ازیں امام دارقطنی نے کتاب العلل میں اس حدیث میں کثیر اختلاف و اضطراب ذکر کیا ہے۔ نیز علامہ ماردینی نے الجوهر النقي على سنن البيهقي ۱۱۲/۱ میں اس حدیث میں لفظ ”اول“ کی زیادتی کو شاذ کہا ہے مزید تفصیل کے لئے فتح الباری شرح صحیح البخاری میں باب فضل الصلوۃ کی مراجعت کی جائے جس سے واضح ہو جائے گا کہ اس حدیث سے اول وقت کی فضیلت پر استدلال مخدوش ہے۔

نہ ہر جائے مرکب تواں تاختن — کہ جا ہا سپر باید انداختن

نیز ”الصلاۃ فی اول وقتها“ کے الفاظ سے مروی روایت میں ابن حبان نے فی اول وقتها کے الفاظ کو عثمان بن عمر کا تفرد بتایا ہے۔ تفصیل کیلئے دیکھئے نصب الرایہ، ج:۱، ص:۲۴۱۔ پھر بعض حضرات محدثین کے مذہب پر جو ثقہ کے تفرد کو بغیر کسی قید و شرط کے صحیح مانتے ہیں اس حدیث کو صحیح مان لیا جائے جب بھی ابراد ظہر کی افضلیت کے یہ حدیث خلاف نہیں ہوگی کیونکہ ”الصلاۃ فی اول وقتها“ عام ہے اور ”ابردوا بالظهر“ خاص اور اہل علم جانتے ہیں کہ عام و خاص یا مطلق و مقید میں باہم تعارض و تخالف نہیں ہوا کرتا۔

اور اگر دونوں حدیثوں میں باہم تعارض تسلیم بھی کر لیا جائے تب بھی ترجیح ابراد بالظہر ہی کو ہوگی کیونکہ یہ حدیث متفق علیہ ہے اور اول وقت کی روایت غیر صحیحین کی نیز متکلم فیہ ہے۔ اور جمہور محدثین کے نزدیک (جس کے قائل غیر مقلدین بھی ہیں) متفق علیہ حدیث غیر متفق علیہ کے مقابلہ میں زیادہ صحیح ہوتی ہے اور اصح و صحیح میں تعارض کے وقت اصح کا راجح ہونا مسلمات میں سے ہے۔

اسی طرح جواب میں پیش کی گئی حضرت عبداللہ بن عمر کی حدیث وقت الظهر اذا زالت الشمس نیز حضرت ابن عباس کی روایت فصلی بی الظهر حين زالت الشمس بھی ”ابردوا بالظهر“ کے مخالف و معارض نہیں ہیں کیونکہ ان دونوں حدیثوں

میں ظہر کے ابتدائی وقت کا بیان ہے کہ ظہر کا وقت زوال شمس سے شروع ہوتا ہے چنانچہ مسند احمد میں ہے: قال رسول الله صلی اللّٰه علیه وسلم ان للصلوٰة اولا وآخرا وان اول وقت صلاة الظهر حین تزول الشمس الخ . (ج:۲،ص:۲۳۲)

نیز حدیث پاک کان یصلی الهجیرة التی تدعونها الاولیٰ حین تدحض الشمس کے متفق علیہ ہونے سے کسے انکار ہے۔ اسی طرح ابراد بالظہر کی حدیث بھی متفق علیہ بلکہ متفق علی الجماعۃ ہے یعنی صحیحین کے علاوہ بروایت ابی ہریرہ اس کی تخریج امام ابوداؤد، امام ترمذی، امام نسائی، امام ابن ماجہ نے اپنی اپنی سنن میں اور امام احمد بن حنبل نے اپنی مسند میں کی ہے۔ پھر ابردوا بالظہر کے یہ معارض بھی نہیں ہے کیونکہ خادم رسول انس بن مالک رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ کان رسول الله صلی الله علیه وسلم اذا کان الحر ابرد بالصلاة واذا کان البرد عجل یعنی جب گرمی ہوتی تو حضور...... نماز ٹھنڈی کرکے پڑھتے اور جب ٹھنڈ ہوتی تو جلدی پڑھ لیتے۔ (نسائی، ج:۲، ص:۵۸) یہ حدیث بھی صحیح ہے اور اس صحیح حدیث سے اوپر مذکور دونوں حدیثوں میں تطبیق ہوجاتی ہے۔ چنانچہ امام بغوی سیار بن سلامہ سے منقول ابوہریرہ کی روایت (جو بقلم خود جماعت حقہ کے زیر نظر رسالہ میں بھی مذکور ہے) اور حضرت جابر سے مروی حدیث "کان یصلی الظهر بالهاجرة" کو ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں۔

قلت اکثر اهل العلم من الصحابة والتابعین فمن بعدهم علی ان تعجیل الصلوات فی اول الوقت افضل الا العشاء والظهر فی شدة الحر فانه یبرد بها.

(شرح السنة، ج:۲،ص:۱۹۰)

یعنی حضرات صحابہ وتابعین اور ان بزرگوں کے بعد کے اکثر اہل علم اسی مذہب پر ہیں کہ نمازوں کی تعجیل اول وقت میں افضل ہے البتہ نماز عشاء اور گرمی کی شدت میں ظہر کی نماز حکم تعجیل سے مستثنیٰ ہے لہٰذا ظہر کی نماز ٹھنڈی کرکے پڑھی جائے گی۔

امام بغوی کی اس تحقیق سے معلوم ہوا کہ وہ روایتیں جن میں ظہر کو اول وقت میں پڑھنے کا ذکر ہے اسی طرح "الصلاة فی اول وقتها" کی حدیث اپنے ظاہر معنی اور عموم

پر باقی نہیں ہے۔

اور بعض علمائے فقہ وحدیث "عند الظهيرة" والی حدیث کو حضرت مغیرہ بن شعبہ کی اس روایت سے منسوخ مانتے ہیں "عن مغيرة بن شعبة قال كنا نصلي مع رسول الله صلى الله عليه وسلم بالهاجرة فقال ابردوا بالصلوٰة فان شدة الحر من فيح جهنم" موارد الظمآن الی زوائد ابن حبان، ص: ۹۰ واخرجه احمد و ابن ماجه ايضا و قال الشوكاني وصحح ابوحاتم و احمد حديث مغيرة وعّده البخاری محفوظا. (نیل الاوطار، ج: ۱، ص: ۳۵۶)

مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ...... کے ساتھ تیز گرمی میں نماز ظہر پڑھتے تھے تو حضور...... نے فرمایا نماز (یعنی ظہر) کو ٹھنڈی کر کے پڑھو کیونکہ گرمی کی شدت جہنم کے جوش کی بنا پر ہے۔ امام ابوبکر الخلال حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ کی اس حدیث کو ان الفاظ میں روایت کرتے ہیں "كان آخر الامرين من رسول الله صلى الله عليه وسلم الابراد" یعنی آنحضرت...... کا دونوں امروں (یعنی ہاجرہ اور ابراد) میں سے آخری عمل ابراد کا تھا۔ جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے عندظہیرہ اور تیز گرمی کی حالت میں ظہر پڑھنے کا عمل آخر میں متروک ومنسوخ ہوگیا تھا۔ چنانچہ حنابلہ میں امام ابوبکر خلال اور احناف میں امام طحاوی اسی کے قائل ہیں۔ جبکہ جمہور یہ کہتے ہیں کہ گرمی میں ظہر تاخیر کر کے اور بقیہ ایام میں اول وقت میں پڑھی جائے اس طرح دونوں پر عمل ہوجاتا ہے۔ صحابہ کرام اور تابعین کے آثار سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے۔ اور یہی مذہب منصور ہے اس کے برخلاف جو لوگ گرمی سردی ہر موسم میں ظہر کو بھی اول وقت میں پڑھنے پر اصرار کرتے ہیں وہ بغیر کسی وجہ وجیہہ کے "ابردوا بالظهر" جیسی صحیح، صریح غیر معارض حدیث کے تارک ہیں اور اپنے اس دعوی میں کہ "بحمد اللہ ہم صحیح حدیثوں کو نہیں چھوڑتے" سچے نہیں ہیں۔

(د) جماعت حقہ کا یہ کہنا کہ گرمی کی شدت کے سبب ٹھنڈا کر کے نماز پڑھنے کا حکم بطور شفقت اور دفع مشقت کے ہے بطور لزوم و وجوب نہیں اور چونکہ اول وقت کی فضیلت

موجود ہے اس لئے ٹھنڈا کر کے پڑھنا جائز ہے اور اول وقت میں پڑھنا علی کل حال افضل ہے۔ انتہائی بے تکی اور بھونڈی بات ہے اور نبی رحمۃ للعالمین کی شان رحمت ورأفت سے بیخبری کی واضح دلیل ہے۔ رحمت دو عالم ...... کی شان رأفت وشفقت کے بارے میں خود خدائے رب العالمین کا ارشاد ہے "لَقد جاءَ کُم رَسولٌ مِن اَنفُسِکم عزیزٌ عَلَیہِ مَا عَنِتُّم حَریصٌ علیکم بالمؤ منینَ رؤفٌ رحیمٌ" (سورۃ التوبہ)

ترجمہ: آیا ہے تمہارے پاس رسول تم میں کا گراں ہے اس پر جو تکلیف تم کو پہنچے حریص ہے تمہاری بھلائی پر۔ یعنی بندگان خدا کو جس چیز سے بھی تکلیف اور سختی پہنچے وہ آپ ...... پر گراں گذرتی ہے اور ہر ممکن طریقہ سے آپ یہی چاہتے ہیں کہ امت پر آسانی ہو اور دنیوی واخروی تکلیف وعذاب سے محفوظ رہے، اسی لئے جو دین آپ لائے وہ بھی سہل اور آسان ہے۔ چنانچہ آپ کا ارشاد ہے "بعثت بالحنفیة السمحة" اور آپ ...... اپنے عمّال وکارپردازوں کو ہمیشہ ہدایت فرماتے رہتے تھے کہ "یسروا ولا تعسروا" اس لئے آپ کے جملہ اوامر واحکام خواہ ان کا تعلق فرائض وسنن سے ہو یا مستحبات وفضائل اعمال سے ان سب میں رحمت ورأفت اور رفع مشقت ومضرت کی روح کارفرما ہے۔ "تو قلب ونظر تو پیدا کر پھر دیکھ کہ کیا انعام نہیں"

جماعتِ حقہ کی اس بے تکی توجیہہ کی بنیاد پر رحمت دو عالم ...... کے ہر امر اور ہر حکم کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ بوجہ شفقت اور برائے دفع مشقت ہے لہٰذا لازمی یا افضل نہیں بلکہ صرف جائز ہے! کیا یہ جماعت کتاب وسنت سے کوئی صریح نص پیش کرسکتی ہے جس سے صاف طور پر معلوم ہو کہ رسولِ خدا ...... جو حکم بوجہ شفقت اور بطور دفع مشقت کے دیں وہ واجب ولازم نہیں بلکہ جائز ومباح ہوگا۔

پھر ظہر کو ٹھنڈا کر کے پڑھنے کو جمہور کب واجب کہتے ہیں بلکہ وہ تو ارشاد نبوی " ان للصلوٰۃ اولا وآخرا وان اول وقت الظھر حین تزول الشمس" وغیرہ کے بموجب اول وقت میں ظہر پڑھنے کو صحیح ودرست مانتے ہیں اور فرمان مبارک "ابردوا بالظھر" کی تعمیل میں سخت گرمی میں ٹھنڈا کر کے پڑھنے کو افضل وبہتر کہتے ہیں۔ "فتدبر"۔

(ھ) جناب مجیب نے آخر میں بحوالہ صحیح مسلم ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کی درج ذیل حدیث نقل کی ہے:

عن ابی ذر قال قال لی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم کیف انت اذا کانت علیك امراء یؤخرون الصلاة عن وقتها او یمیتون الصلاة عن وقتها قال قلت فما تأمرنی، قال صل الصلاة لوقتها، الحدیث.

صحیح مسلم میں حدیث کے الفاظ اسی ترتیب سے ہیں جس طرح ہم نے نقل کیا ہے یعنی یؤخرون الصلاة مقدم اور "یمیتون الصلاة" مؤخر (دیکھئے صحیح مسلم، ج:۱، ص:۲۳۰، مطبوعہ دارالاشاعت اسلامیہ کلکتہ) جبکہ مشکوٰۃ المصابیح میں یمیتون الصلاة مقدم اور "او یؤخرون الصلاة" کو مؤخر ذکر کیا گیا ہے۔ جماعت حقہ نے یہ مشکوٰۃ کے مطابق درج کی جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حدیث مشکوٰۃ سے نقل کی گئی ہے اور حوالہ صحیح مسلم کا دیدیا گیا ہے۔ یہ ہے جماعت حقہ کی علمی دیانت کا معیار۔

پھر اس حدیث پاک کا ذکر اس موقع پر بے سود ہے، کیونکہ "یؤخرون الصلاة عن وقتها" کا معنی جمہور شراح حدیث نے "عن وقتها المختار" بیان کیا ہے اور جمہور کے نزدیک گرمی کی شدت میں ظہر کا وقت مختار و پسندیدہ تاخیر کر کے ٹھنڈ میں پڑھنا ہے۔ لہٰذا یہ حدیث جمہور کے خلاف ہے اور نہ ہی جماعت حقہ کے مذہب شاذ کے موافق۔ پھر مجیب کا حدیث پاک کے جملہ "صل الصلاة لوقتها" کا ترجمہ "پڑھو تم اس کے اول وقت پر" سے کرنا حدیث کو اپنے مذہب کے مطابق ڈھالنے کی غیر مقبول کوشش ہے۔

اور امام نسائی نے تو "یؤخرون الصلاة عن وقتها" کا معنی یہ کیا ہے کہ مؤخر کر دیں گے نماز کو اس کے وقت سے یعنی وقت گزرنے کے بعد پڑھیں گے جیسا کہ ان کے ترجمۃ الباب سے ظاہر ہے کیونکہ انھوں نے باب قائم کیا ہے "اعادة الصلاة بعد ذهاب وقتها مع الجماعة اور اس کے تحت حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث ذکر کی ہے (دیکھئے سنن نسائی، ج:۱، ص:۱۳۸-۱۳۷) اور شارح سندھی نے بھی اسی معنی کو ظاہر حدیث کے مطابق کہا ہے چنانچہ لکھتے ہیں قوله (یؤخرون الصلاة عن وقتها)

ظاهره الاخراج عن الوقت وعليه حمله المصنف“ آنحضرت ...... کے قول یؤخرون الصلاة عن وقتها کا ظاہر وقت سے (نماز کو) نکال دینا ہے اور اسی ظاہر پر مصنف یعنی امام نسائی نے اس قول کو محمول کیا ہے۔ (دیکھئے حاشیہ سندھی) اور اس معنی کے اعتبار سے مسئلہ زیر بحث سے اس حدیث کا غیر متعلق ہونا بالکل ظاہر ہے۔

مسئلہ (۲) نماز فجر کے معاً بعد سنت فجر پڑھنے کا حکم

من جانب جمعیة اهل حدیث دوسرے سوال کا جواب:

چونکہ اس حدیث کا ترجمہ بھی آپ نے من مانے طریقہ پر کیا ہے اس لئے پریشانی ہو رہی ہے۔ ورنہ اعتراض کی کوئی بات نہیں ”صبح کی نماز کے بعد ہر قسم کی نماز“ یہ الفاظ حدیث میں کہاں ہیں۔ حدیث میں تو صرف اتنا ہی ہے کہ صبح کی نماز کے بعد طلوع شمس سے پہلے کوئی دوسری نماز پڑھنے سے منع فرمایا۔

چونکہ صبح کی سنتیں صبح کی نماز ہی کا حصہ ہیں اسلئے وہ صبح کے وقت ہی ادا کی جائیں گی اگر اتفاق سے چھوٹ گئی ہوں جیسا کہ مسلم شریف کی حدیث میں یہ الفاظ موجود ہیں لا صلوة بعد صلوة الفجر ”اور چونکہ فجر کی سنتیں نماز فجر ہی کا حصہ ہیں لہٰذا ان کے منع کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔ پھر رسول اکرم ...... کے سامنے صحابہ کرام نے نماز فجر کے بعد سورج نکلنے سے قبل سنتیں ادا فرمائیں اور آپ نے سکوت فرمایا اور منع نہیں کیا جس سے مسئلہ صاف ہو گیا کہ مراد نماز فجر کے علاوہ دوسرے نوافل ہیں نہ کہ سنت فجر۔ چنانچہ صحیح ابن حبان میں موجود ہے کہ حضرت قیس بن فہدؓ نے نبی اکرم ...... کے ساتھ نماز فجر ادا فرمائی سنتیں پڑھی نہ تھیں معاً بعد سنتیں ادا کیں۔ رسول اکرم ...... نے ملاحظہ فرمایا مگر منع نہیں فرمایا“ یحییٰ بن سعید اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں ایک بار وہ فجر میں اس وقت پہنچے جب نماز ہو رہی تھی سنتیں پڑھی نہ تھیں نماز کے معاً بعد کھڑے ہو کر سنتیں پڑھنے لگے آپ نے پوچھا یہ دو رکعتیں کیسی پڑھی ہیں؟ عرض کیا نماز فجر سے قبل پڑھ نہیں سکا تھا، رسول اللہ ...... نے سکوت فرمایا، اس حدیث کو دارقطنی نے اپنی سنن میں نقل فرمایا ہے۔ امام جزری

فرماتے ہیں کہ اس کے رواۃ ثقات ہیں۔ اس کے علاوہ بھی احادیث موجود ہیں امید کہ بات سمجھ میں آ گئی ہوگی۔ یہ عمل ہمارا بخاری کی روایت کے خلاف نہیں ہے نیز یہ کہ یہ عمل مطابق سنت رسول ہے۔

بحث ونظر

سوال ۲ کے جواب میں لکھتے ہیں، چونکہ اس حدیث کا ترجمہ بھی آپ نے من مانے طریقہ پر کیا ہے اس لئے پریشانی ہورہی ہے ورنہ اعتراض کی کوئی بات نہیں۔ ''صبح کی نماز کے بعد ہر قسم کی نماز'' یہ الفاظ حدیث میں کہاں ہیں حدیث میں تو صرف اتنا ہی ہے کہ صبح کی نماز کے بعد طلوع شمس سے پہلے کوئی دوسری نماز پڑھنے سے منع فرمایا ہے۔

اگر کوئی پلٹ کر جناب سے یہ پوچھ بیٹھے کہ حدیث زیر بحث میں ''کوئی دوسری نماز'' کے الفاظ کہاں ہیں؟ تو آپ کے پاس اس کا کیا جواب ہوگا۔ جبکہ آپ کے بیان کردہ مفہوم میں ''دوسری نماز'' کا اضافہ بلا شبہ خود تراشیدہ ہے حدیث پاک کے الفاظ میں اس اضافہ کی قطعاً گنجائش نہیں ہے۔ جناب من علمی مباحث میں اصول وضوابط سے بے نیاز ہوکر محض ظاہر پرستی اور لا حاصل لفظی گرفت سے کام نہیں چلتا دیوبندی مقلد نے اپنے سوال میں یہ حدیث ذکر کی ہے۔

ان النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم ''نہی عن الصلاۃ بعد الصبح حتی تشرق الشمس'' الحدیث .

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے نماز پڑھنے سے منع فرمایا صبح یعنی نمازِ فجر کے بعد یہاں تک کہ سورج روشن ہوجائے۔ ''نہی عن الصلوٰۃ'' مطلق ہے اور مطلق کو اس کے اطلاق پر رکھتے ہوئے ہر ''قسم کی نماز'' ترجمہ کرنا درست ہے اسے من مانے طریقہ کا ترجمہ کہنا اصول عربیت سے غفلت کا نتیجہ ہے۔

اصحاب ستہ کے علاوہ ابن ابی شیبہ نے مصنف میں اور مسدد نے اپنی مسند میں بھی اس حدیث کی تخریج کی ہے۔ امام ترمذی نے اسے روایت کرنے کے بعد وفی الباب کے

تحت گیارہ صحابی کا نام شمار کرایا ہے جنھوں نے آنحضرت ...... سے اس حکم سے متعلق مرفوعاً حدیث روایت کی ہے۔ اور ایک راوی صنابحی کے بارے میں لکھا ہے ولم یسمع من النبی صلی اللہ علیہ و سلم یعنی انھوں نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے براہ راست نہیں سنی ہے بلکہ مرسلاً روایت کیا ہے۔ اور حافظ عینی نے اس فہرست میں پانچ صحابی کا مزید اضافہ کیا ہے۔ دیگر محدثین نے اس تعداد میں اور اضافہ کیا ہے جس کا مجموعہ بتا رہا ہے کہ اس باب سے متعلق تئیس حضرات صحابہ آنحضرت ...... سے یہ حدیث روایت کرتے ہیں۔ چنانچہ ابن بطال لکھتے ہیں ”تواترت الاحادیث عن النبی صلی اللہ علیہ و سلم انہ نہی عن الصلوٰۃ بعد الصبح و بعد العصر“ (تفصیل کے لئے دیکھئے عمدۃ القاری، ج:۵، ص:۷۶-۷۷) یعنی نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے تواتر سے حدیثیں مروی ہیں کہ آپ ...... نے نماز فجر اور نماز عصر کے بعد نماز پڑھنے سے منع فرمایا ہے۔ علامہ مناوی شارح جامع صغیر للسیوطی بھی ان دونوں اوقات میں نماز پڑھنے کی ممانعت سے متعلق احادیث کو متواتر کہتے ہیں۔

ایک حدیث جو کثرت طرق سے حد تواتر کو پہنچی ہوئی ہے، جس کی تخریج اصحاب ستہ کے علاوہ دیگر مشاہیر ائمہ حدیث نے اپنی تصانیف میں کی ہے ایسی متفق علیہ صحیح حدیث کو ترک کر کے قیس بن فہد سے منسوب روایت سے استدلال تعجب خیز ہے، کیونکہ اس حدیث کی صحت محدثین کے نزدیک ثابت نہیں ہے چنانچہ امام نووی قیس بن فہد کے ترجمہ میں لکھتے ہیں واتفقوا علی ضعف حدیثہ المذکور فی الرکعتین بعد الصبح رواہ ابوداؤد والترمذی وغیرھما وضعفوہ (تہذیب الاسماء واللغات، ج:۲، ص:۶۴) ان کی اس حدیث کے ضعف پر محدثین کا اتفاق ہے جس میں نماز فجر کے بعد سنت فجر پڑھنے کا ذکر ہے۔ اس حدیث کو امام ابوداؤد، امام ترمذی وغیرہ نے روایت کیا ہے اور سب نے اس کی تضعیف کی ہے۔ (چنانچہ سنن ابوداؤد اور سنن ترمذی میں اس حدیث پر دونوں حضرات کے کلام کو دیکھا جاسکتا ہے)

قاضی شوکانی نے نیل الاوطار، ج:۳، ص:۲۹ میں ابن حبان اور ابن خزیمہ میں مذکور روایت کو متصل السند اور قوی بتایا ہے غالباً جماعت حقہ نے ابوداؤد و ترمذی کے بجائے

صحیح ابن حبان کی روایت کا ذکر کیا ہے۔ لیکن قاضی شوکانی کا یہ سہارا بھی بے سود ہے۔ ابن حبان وغیرہ محدثین کی ذکر کردہ اس روایت کو ملاحظہ کیجئے جسے مندرج سند سے ان دونوں بزرگوں نے روایت کیا ہے۔

”اسد بن موسى، عن الليث بن سعد عن يحيى بن سعيد عن ابيه عن جده قيس بن فهد انه جاء والنبى صلى الله عليه وسلم يصلي صلاة الفجر فصلى معه فلما سلم قام فصلى ركعتى الفجر فسكت ولم يقل شيئا“

اسد بن موسیٰ لیث بن سعد سے روایت کرتے ہیں اور لیث بن سعد یحییٰ بن سعید سے اور یحییٰ اپنے والد سعید سے اور سعید نے اپنے والد قیس بن فہد سے جو صاحب واقعہ ہیں۔ سند کے جملہ راوی قوی وثقہ ہیں اور بظاہر سند بھی متصل ہے اسی بنا پر قاضی شوکانی اور انکے متبعین اس روایت کو صحیح بتاتے ہیں۔

لیکن حافظ ابن عبدالبر اپنی مشہور کتاب ”الاستیعاب“ میں قیس بن فہد کے ترجمہ میں لکھتے ہیں: ”يقولون ان سعيدا والد يحيى لم يسمع من ابيه“ یعنی علمائے تراجم بیان کرتے ہیں کہ یحییٰ بن سعید کے والد سعید نے اپنے والد قیس سے یہ حدیث نہیں سنی ہے۔ لہٰذا امام ترمذی نے جو انقطاع سند کی جرح کی ہے وہ اپنی جگہ درست ہے اور قاضی شوکانی کا اسے متصل السند کہنا صحیح نہیں، امام ترمذی کی جرح کو نظرانداز کر کے قاضی شوکانی کے قول کو اختیار کرنا محض خودفریبی ہے، امام ترمذی کے مقام بلند کے مقابلہ میں قاضی شوکانی کی حیثیت آفتاب نصف النہار کے مقابلہ میں ذرہ بمقدار کی بھی نہیں ہے۔

علاوہ ازیں یہ حدیث محفوظ بھی نہیں ہے چنانچہ حافظ ابن حجر اصابہ میں لکھتے ہیں

واخرجه ابن منده من طريق اسد بن موسى عن الليث عن يحيى عن ابيه عن جده وقال غريب تفرد به اسد موصولا وقال غيره عن الليث عن يحيى ان حديثه مرسل. یعنی حافظ ابن مندہ نے اسد بن موسیٰ عن اللیث الخ کی سند سے اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد اس پر یہ جرح کی ہے کہ یحییٰ سے اس حدیث کو مرفوعاً روایت کرنے میں اسد بن موسیٰ اکیلے ہیں جبکہ دیگر رواۃ یحییٰ سے اس حدیث کو مرسلاً ذکر کرتے ہیں۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ اس کی سند منقطع ہے نیز اسی کے ساتھ شاذ بھی ہے۔ یہ ہے اس حدیث کا حال جس کی محبت میں ایک اعلیٰ درجہ کی صحیح حدیث کو پس پشت ڈال دیا گیا ہے اور اس پر دعویٰ ہے کہ ہم صحیح حدیثوں کو نہیں چھوڑتے۔

اس حدیث کے علاوہ اس باب میں کچھ حدیثیں اور بھی ذکر کی جاتی ہیں۔ جسکی طرف ”جماعۃ حقہ“ نے اس رسالہ میں اشارہ بھی کیا ہے، لیکن یہ حدیثیں بھی لائق استدلال نہیں ہیں، اگر ان سب حدیثوں پر الگ الگ کلام کیا جائے تو بات بہت طویل ہو جائے گی اور موقع اس کا مقتضی نہیں ہے۔

نوٹ: رسالہ میں کل دس سوالوں کے جوابات ہیں، بحث ونظر میں تیسرے، چوتھے، پانچویں اور چھٹے جواب پر بحث نہیں کی گئی ہے ان میں کوئی علمی بحث نہیں ہے، صرف لفظی گرفت ہے۔

مسئلہ (۳) دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کا حکم

من جانب اہل حدیث ساتویں سوال کا جواب:

ہمارے کرم فرما مقلد بھائی نے یہاں پر مکر وفریب اور کذب بیانی سے کام لیا ہے اور صحیح بخاری کا غلط حوالہ دے کر ”باب المصافحة باليدين“ کے تحت دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کرنے کا مسئلہ سمجھانے کی کوشش کی ہے جب کہ صحیح بخاری میں حضرت امام بخاری نے اس عنوان سے کوئی باب ہی نہیں قائم کیا ہے۔ براہ کرم صحیح بخاری میں یہ باب کس کتاب جلد اور صفحہ پر ہے تحریر فرماویں؟ لیکن وہ نہیں دکھلائیں گے۔ کبھی نہیں دکھلا پائیں گے؟ انشاء اللہ۔

اب ملاحظہ فرمائیں مصافحہ کا مسئلہ

صحیح بخاری میں باب المصافحہ کے ذیل میں امام بخاریؒ حضرت عبداللہ بن ہشامؓ سے روایت کرتے ہیں کہ ”عن هشام قالَ كنا مع النبي ﷺ وهو آخذٌ بيدِ عمر بن الخطاب“ ترجمہ: ہم نبی ...... کے ساتھ تھے اس حال میں کہ آپ عمر بن خطابؓ کا

ہاتھ تھامے ہوئے تھے۔

ہمارے کرم فرما ملاحظہ فرمائیں کہ مذکورہ حدیث میں بِیَدِ عمر بن خطابؓ وارد ہے یعنی رسول اکرم...... نے حضرت عمر بن خطابؓ کے یَد (ایک ہاتھ) کو پکڑے ہوئے تھے اور عربی میں یَد کے معنی ایک ہاتھ کے ہوتے ہیں اور "یَدیَن" کے معنی دونوں ہاتھ۔ جبکہ روایت میں ید (ایک ہاتھ) کا لفظ آیا ہے یدین (دونوں ہاتھ) نہیں مسئلہ صاف ہوگیا کہ اہل حدیث ایک ہاتھ سے مصافحہ کرنے میں بخاری کی حدیث پر عامل ہیں ایک ہاتھ سے مصافحہ کی دوسری حدیث: حافظ ابن عبدالبر تمہید شرح مؤطا میں لکھتے ہیں "ترون یَدِی هذه صافحت بها رسول الله ﷺ" کہ تم لوگ میرے اس ہاتھ کو دیکھتے ہو میں نے اسی ایک ہاتھ سے رسول اللہ ...... سے مصافحہ کیا ہے۔ یہ حدیث صحیح ہے اور اس میں بصراحت موجود ہے کہ ایک ہاتھ سے مصافحہ کرنا مسنون ہے۔

تیسری حدیث: عن ابی امامة تمام التحية الأخذ باليد والمصافحة با اليمنی (رواہ الحاکم) ابوامامہ سے روایت ہے کہ سلام کی تمامی ہاتھ کا پکڑنا ہے اور مصافحہ داہنے ہاتھ سے ہے۔ اس کو حاکم نے روایت کیا ہے کتاب الکنیٰ میں۔

علامہ ضیاء الدین نقشبندی حنفی اپنی کتاب لوامع العقول شرح رموز الحديث میں لکھتے ہیں کہ آداب شریعت سے ظاہر یہی ہے کہ مصافحہ مسنون ہونے کے لئے دونوں جانب سے داہنا ہاتھ متعین ہے۔

بحث ونظر

صحیح بخاری میں کتاب الاستيذان کا ستائیسواں (۲۷) باب امام بخاریؒ نے ان الفاظ میں قائم کیا ہے "باب المصافحة" یعنی مطلق مصافحہ ایک ہاتھ یا دونوں ہاتھ کی قید کے بغیر۔ اس کے تحت سب سے پہلے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث تعلیقاً ذکر کی ہے۔ جس کے الفاظ یہ ہیں "علّمنی النبی صلی الله عليه وسلم التشهد و کفی بين کفيه الخ" (بخاری، ج:۲، ص:۹۲۶) آپ ...... نے مجھے تشہد سکھایا اس حال

میں کہ میرا ہاتھ آپ کے دونوں ہاتھوں کے درمیان تھا۔ بخاری نے ترجمۃ الباب سے متصل اس حدیث کو لاکر گویا اس بات کی جانب اشارہ کیا ہے کہ ترجمۃ الباب میں واقع مطلق مصافحہ سے مراد مصافحہ بالیدین ہے۔

اس کے بعد تعلیقا ہی کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کی حدیث درج کی ہے جس میں "فصافحنی" کا لفظ ہے جو مطلق مصافحہ پر دلالت کرتا ہے بعد ازاں حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی حدیث روایت کی ہے جسے ''جماعت حقہ'' کے رسالہ میں کم فہمی وظاہر پسندی کی بناء پر ایک ہاتھ سے مصافحہ کی دلیل سمجھ لیا گیا ہے جبکہ حدیث کے الفاظ مصافحہ بید واحدۃ کے معنی پر ظاہر نہیں ہیں۔ اس حدیث پاک کے الفاظ دیکھئے "وھو آخذ بید عمر بن الخطاب" یعنی آپ...... عمر فاروق کے ہاتھ پکڑے ہوئے تھے۔ لفظ ید جسم انسانی کے ایک عضو کا علم یعنی نام ہے جو منکب مونڈھوں سے لیکر انگلیوں تک پر بولا جاتا ہے اور صرف کف یعنی ہتھیلی پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ ''بید عمر'' کا ترجمہ ''عمر کے ایک ہاتھ کو پکڑے ہوئے تھے'' کرنا یا تو اصول عربیت سے بیخبری کی بنا پر یا جان بوجھ کر محض اپنے مذہب کی پاسداری میں اس غلطی کا ارتکاب کیا گیا ہے۔ صحیح ترجمہ یوں ہوگا وہ عمر کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھے۔

اسی طرح حافظ ابن عبدالبر کی التمہید سے جو حدیث پیش کی گئی ہے اس میں بھی حدیث کو اپنے مقصد کے تابع بنانے کیلئے "بیدی ھذہ" کا وہی غلط ترجمہ کیا گیا جو حدیث عمر میں کیا تھا۔ اس حدیث پاک کے الفاظ یہ ہیں حدثنا عبدالوارث بن سفیان قال حدثنا قاسم بن اصبغ قال حدثنا ابن وضاح قال حدثنا یعقوب بن کعب قال حدثنا مبشر بن اسماعیل عن حسّان بن نوح عن عبدالله بن بُسر قال: ترون یدی ھذہ صافحت بھا - رسول الله صلی الله علیه و سلم - و ذکر الحدیث ، التمهید ج ١٢ ص ٢٤٦ جس کا صحیح ترجمہ یوں ہوگا، ''تم میرے ہاتھ کو دیکھتے ہو میں نے اپنے اسی ہاتھ سے رسول اللہ...... سے مصافحہ کیا۔''

حدیث کے لفظ بیدی میں ایک یا دونوں ہاتھوں کی کوئی قید نہیں ہے لہٰذا ید کے لفظ میں دونوں معنی یعنی ایک ہاتھ اور دونوں ہاتھ کا یکساں احتمال ہے ہاں جب کوئی دلیل خارجی

دو معنوں میں سے کسی معنی کی مؤید و موافق ہو جائے تو پھر وہی معنی متعین ہو جائے گا۔

اسلئے محض لفظ ید سے (جو صحیح بخاری میں بروایت حضرت عمرؓ آیا ہے یا بیدی سے جو تمہید کی روایت میں ہے) ایک ہاتھ سے مصافحہ پر استدلال فریب محض یا اصول سے بیخبری کی دلیل ہے۔

باب المصافحہ کے بعد امام بخاریؒ نے ایک باب الاخذ بالیدین کے عنوان سے قائم کیا ہے اور اس کے ساتھ حماد بن زید بیکندی کا مصافحہ میں یہ عمل ذکر کیا ہے ”وصافح حمادُ بن زید ابن المبارك بيديه“ حماد بن زید نے عبداللہ بن مبارک سے دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کیا۔

امام بخاریؒ نے صحیح میں حماد کی یہ روایت تعلیقاً ذکر کی ہے لیکن اپنی ”تاریخ کبیر“ میں اسے پوری سند کے ساتھ روایت کیا ہے اس کے بعد عبداللہ بن مسعود کی مذکورہ بالا حدیث کو سند کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ امام بخاری کے طریق استدلال سے واقفیت رکھنے والے اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ وہ اس باب سے مصافحہ بالیدین کو ثابت کر رہے ہیں کیونکہ ایک دوسرے کے باہم ہاتھ ملانے کو مصافحہ کہا جاتا ہے اور اخذ يدين التقاء صفحة اليد بصفحة اليدين کو مستلزم ہے یعنی جب کوئی شخص کسی کے دونوں ہاتھوں کو پکڑے گا تو لازمی طور پر ان دونوں شخصوں کے دونوں ہاتھ باہم مل جائیں گے اور ہاتھوں کے اس طرح ملنے ہی کا نام مصافحہ ہے۔ لہٰذا اخذ بالیدین سے مصافحہ بالیدین لازماً ثابت ہوگا۔ سوال میں اسی معنی کا لحاظ کر کے توسعاً باب المصافحہ بالیدین سے تعبیر کر دیا گیا تھا۔ جسے ہمارے مجیب مکر و فریب اور کذب بیانی پر محمول کر رہے ہیں مگر ہمیں ان سے کوئی شکایت نہیں وہ بیچارے تو اس کے علاوہ سوچ ہی نہیں سکتے کیونکہ ”اذا ساء فعل المرء ساء ظنونه“

مسئلہ (۴) بیس رکعت تراویح کا حکم

جمعية اهل حديث کی طرف سے آٹھویں سوال کا جواب

مقلد معترض نے تراویح کے سلسلہ میں جو صحیح بخاری کی زید بن ثابتؓ کی روایت نقل

کی ہے اس کے متن نقل کرنے میں ہی غلطی کردی جب کہ یہ متن اس طرح ہے عن زید بن ثابت ان رسول الله ﷺ اتخذ حجرة قال حسبتُ انه قال من حصیری فی رمضان فصلےٰ فیها بصلوٰته یة ناسٌ من اصحابه فلمّا علم بهم جعل یقعد فخرج الیهم فقال قد عرفت الذی رأیت من بیوتکم فصلّوا ایها الناسُ فی فانّ افضل الصلوٰة صلوٰة المرأ فی بیةاله المکتوبة (باب صلوٰۃ اللیل پ۳ جلد اول)

نیز یہ اعتراض کیا ہے کہ اس میں کسی تعداد کا ذکر نہیں ہے عرض یہ ہے کہ تعداد کا تذکرہ نہ ہونا کسی تعداد کی نفی پر دلیل نہیں ہے جب تک واضح طور پر نفی نہ ہو نیز اس روایت سے بیس رکعت تراویح بھی ثابت نہیں ہورہی ہے معترض کسی خوش فہمی میں مبتلا ہے۔ احادیث صحیحہ سے تہجد اور قیام اللیل مع وتر گیارہ رکعت ثابت ہے اور یہی اعلیٰ وافضل ہے۔ خود امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں ”باب الفضل من قیام رمضان“ کے تحت حضرت عائشہؓ کی یہ روایت نقل کی ہے، عن ابی سلمة بن عبدالرحمن انه سأل عائشة کیف کانت صلوٰة رسول اللّٰه ﷺ فی رمضان فقالت ما کان یزید فی رمضان ولا غیره علی احدی عشرة رکعة یصلّی اربعًا فلا تسأل عن حسنهنّ وطولهنّ ثم یصلّی اربعاً فلا تسأل عن حسنهنّ وطولهنّ ثم یصلّی ثلثا الخ. یعنی ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن نے حضرت عائشہؓ سے رمضان کی نماز کے بارے میں سوال کیا کہ رسول اللہ ...... رمضان کی نماز کیسے پڑھتے تھے تو حضرت عائشہؓ نے جواب دیا کہ رمضان اور رمضان کے علاوہ اور دنوں میں گیارہ رکعت سے زیادہ نہیں ادا کرتے تھے۔ آپ چار رکعت پڑھتے اس کا حسن اور طوالت کا کیا پوچھنا پھر چار رکعت ادا فرماتے تھے اس کا حسن وطوالت کا کیا پوچھنا پھر تین رکعت (وتر) پڑھتے تھے (صحیح بخاری جلد اول پ ۸)

اس حدیث میں رمضان کی نماز کے بارے میں سوال ہوا ہے جس کو عرف عام میں تراویح کہا جاتا ہے اور غیر رمضان میں تہجد جس کی تعداد آٹھ رکعت ہے اور تین وتر ملانے سے گیارہ ہوجاتی ہے اس حدیث میں بھی فی رمضان کا لفظ آیا ہے لیکن عائشہؓ نے رمضان کے علاوہ غیر رمضان کا تذکرہ کرکے یہ ثابت کیا ہے کہ رمضان کے علاوہ اور دنوں

میں جو تہجد پڑھی جاتی ہے اس کی رکعت کی تعداد بھی مع وتر گیارہ ہے۔ لہٰذا دونوں کی تعداد گیارہ ہے رمضان میں تراویح اور غیر رمضان میں تہجد۔ فافہم

حدیث مسروق میں معترض صرف الجھانا چاہتا ہے اور بغیر سوچے سمجھے تیر چلا دیا اوراس خوش فہمی میں مبتلا ہو گیا کہ قلعہ فتح ہو گیا۔ جب کہ اس حدیث میں سات، نو، گیارہ، رکعتوں کا تذکرہ تو ہے لیکن بیس رکعت کا سرے سے ذکر ہی نہیں ہے ہم تو سرور کائنات ...... کی سنت کے مطابق سات، نو، گیارہ، رکعتوں کے قائل ہیں۔ آپ اپنی خبر لیجئے جو کھلم کھلا آقائے نامدار احمد مجتبیٰ محمد مصطفےٰ ...... کی سنت کی مخالفت پر تلے ہوئے ہیں۔ آمدم برسر مطلب حدیث مسروق میں سات، نو، گیارہ رکعتوں کا تذکرہ ہے اس میں ہم گیارہ رکعتوں کو اس لئے فوقیت دیتے ہیں کہ جب گیارہ رکعت ادا کی جاتی ہے تو اس میں سات، نو کی تعداد بذات خود شامل ہو جاتی ہے کیونکہ سات اور نو کی تعداد پوری کرنے کے بعد ہی گیارہ کی تعداد پوری ہوتی ہے اس طرح سات، نو، گیارہ کی تعداد پر بیک وقت عمل ہو جاتا ہے اور اس سنت رسول ؐ کی موافقت بھی ہو جاتی ہے اس طرح نہ تو حدیث عائشہؓ اور حدیث مسروقؒ میں کوئی تعارض ہے اور نہ ہی ضعیف ہے صرف معترض کی غلط فہمی ہے۔

نیز نبی اکرم ...... ان نمازوں کو عموماً رات کے آخری حصہ میں پڑھا کرتے تھے اور نہایت سکون واطمینان سے پڑھتے تھے جس کی وجہ سے کبھی کبھی فجر کا وقت قریب آجاتا تھا جس کی وجہ سے آپ ...... ان رکعتوں کی تعداد میں کمی کرلیا کرتے تھے تاکہ فجر کی نماز میں تاخیر نہ ہو۔ دیکھئے **صحیح بخاری** باب کیف صلوٰۃ اللیل و کیف کان النبی ﷺ یصلی باللیل. کی **حدیث** ان عبداللہ بن عمر قال ان رجلاً قال یا رسول اللہ کیف صلوٰۃ اللیل قال مثنی مثنیٰ فاذا خفت الصبح فاوتر واحدۃ **یعنی عبداللہ بن عمرؓ** نے بیان کیا کہ ایک شخص نے محمد ...... سے پوچھا کہ رات کی نماز کیسے ادا کی جائے تو رسول اللہ ...... نے فرمایا۔ دو دو رکعت کرکے پڑھو اور جب صبح طلوع ہونے کا خوف ہو تو ایک رکعت وتر پڑھ لیا کرو۔

واضح ہو کہ یہاں تنگی وقت کی وجہ سے ایک رکعت وتر پڑھنے کا حکم ہوا جس کی وجہ

سے دو رکعت کم ہوگئی اس لئے یہ نو رکعت ہوئی۔ اس سے گیارہ کی نفی نہیں ہوتی ہے کیونکہ عارضی علت کی وجہ سے یہ کمی ہوئی ہے نہ کہ مطلق لہٰذا جب یہ علت نہ ہوگی تو گیارہ کی تعداد بھی پوری کی جائے گی اور جب یہ علت پائی جائے گی رکعتوں کی تعداد میں کمی ہوتی جائے گی یہی وجہ ہے کہ حدیث مسروق میں سات، نو، گیارہ کی تعداد آئی ہے نیز اس حدیث کے اخیر میں سوی رکعتی الفجر آیا ہے یعنی دو رکعت فجر کے علاوہ (جس کو معترض نے تحریر ہی نہیں کیا ہے) کیونکہ جب فجر کی دو رکعت (سنت) کو گیارہ میں شامل کیا جائے گا تو تیرہ رکعت شمار میں آجائے گی اسی مفہوم میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت ہے کان صلوٰۃ النبی ﷺ ثلاث عشرۃ رکعۃ باللیل یعنی رسول اللہ...... کی رات کی نماز کی رکعت تیرہ ہوتی تھی اسکی تائید حضرت عائشہؓ کی اس روایت سے ہو رہی ہے عن عائشه قالت کان النبی ﷺ صلی من اللیل ثلث عشرۃ رکعۃ منها الوتر ورکعتا الفجر یعنی عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم...... رات میں تیرہ رکعت پڑھتے تھے اس میں وتر اور فجر کی دو رکعت (سنت) شامل ہے۔ لہٰذا یہ حدیث بھی مذکورہ بالا حدیثوں سے متعارض نہیں ہے اور نہ ہی ضعیف ہے فجر کی دو رکعت قیام اللیل کا حصہ نہیں ہے بلکہ صلوٰۃ اللیل کی ادائیگی کے بعد ہی دو رکعت فجر کی سنت ادا کرتے تھے وقفہ کم ہونے کی وجہ سے اس کو بھی صلوٰۃ اللیل میں جوڑ دیا گیا ہے جس کی وجہ سے روایت میں تیرہ کا تذکرہ آگیا ہے۔

تہجد اور قیام اللیل یا صلوٰۃ اللیل ایک ہی چیز ہے جس کا وقت عشاء اور فجر کے درمیان ہے۔ رمضان میں جب عشاء کے بعد پڑھی جاتی ہے تو اس کو عرف عام میں تراویح کہتے ہیں اور اگر اخیر رات میں پڑھی جاتی ہے تو تہجد کا نام دیا جاتا ہے لیکن رسول اللہ...... عموماً رات کے آخری حصہ میں ہی پڑھتے تھے جسکی متعدد حدیثیں شاہد ہیں ترمذی کی ایک حدیث بطور تائید عرض ہے عن ابی ذر قال فلم یصلی بنا حتی بقی سبع من الشهر فقام بنا حتی ذهب ثلث اللیل ثم لم یقم بنا فی السادسة وقام بنا فی الخامسة حتے ذهب شطر اللیل فقلنا یا رسول الله لو نفلّتنا بقیة لیلتنا هذه فقال انه من قام مع الامام حتی ینصرف کتب له قیام لیلة ثم لم یصل بنا حتی

تخوّفنا الفلاح قلت له و ما الفلاح قال السحور (ترمذی جلداول باب ما جاء فی قیام شهر رمضان) اس حدیث کونسائی اور ابوداؤد نے بھی نقل کیا ہے اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ ان راتوں میں آپ نے الگ سے تہجد کی نماز نہیں پڑھی بلکہ اسی کو تہجد شمار کیا اگر تہجد اور قیام اللیل یا صلوٰۃ اللیل الگ الگ ہوتیں تو تہجد پڑھتے آپ ...... نے ان تینوں میں سے کسی رات میں تہجد نہیں پڑھی جس کی زیادہ وضاحت آخری رات میں ہوتی ہے اس رات آپ ...... نے سحری فوت ہونے کے وقت تک لوگوں کو نماز پڑھائی ظاہر ہے کہ اس کے بعد تہجد الگ سے پڑھنے کا سوال ہی نہیں۔

لہٰذا ثابت ہوا کہ تہجد اور قیام اللیل ایک ہی چیز ہے رسول اللہ ...... کے زمانے میں تراویح کا لفظ رائج نہیں تھا اس وقت اس کو قیام اللیل یا صلوٰۃ اللیل کہتے تھے۔

دودو رکعت والی حدیث آگے آچکی ہے اسلئے اسکی مزید وضاحت کی ضرورت نہیں۔

بحث ونظر

(۱) آٹھویں جواب میں آپ لکھتے ہیں: ''مقلد معترض نے تراویح کے سلسلے میں جو صحیح بخاری کی زید بن ثابت (رضی اللہ عنہ) کی روایت نقل کی ہے اسکے متن نقل کرنے میں غلطی کردی جبکہ متن اس طرح ہے''

اس وضاحت کے بعد آپ نے مقلد معترض کی غلطی کی تصحیح کے لئے حدیث کا متن نقل کیا ہے جبکہ اس نقل میں ایک کے بجائے چھ غلطیاں موجود ہیں: ''ایں گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند'' آپ کے اس مطبوعہ رسالہ میں جہاں جہاں غلطیاں ہیں وہاں خط کھینچ دی گئی تاکہ نشاندھی میں دقّت نہ ہو، ذیل میں حدیث کے الفاظ درج کئے جاتے ہیں مقابلہ کرکے آپ خود دیکھ لیں کہ یہ غلطیاں آپ کے رسالہ میں ہیں یا نہیں۔

عن زید بن ثابت : انّ رسول الله صلى الله عليه وسلم اتّخذ حجرةً ـ قال : حسبت انه قال: من حصير ـ فی رمضانَ فصلّٰى فيها ليالى، فصلّى بصلاته ناس من اصحابه، فلما علم بهم جعل يقعد، فخرج اليهم فقال: قد

عرفت الذی رأیت من صنیعکم، فصلّوا ایها الناس فی بیوتکم، فان افضل الصلاۃ صلاۃ المرء فی بیته الا المکتوبة. (باب صلاۃ اللیل فتح الباری شرح صحیح البخاری، ج:۲، ص: ۲۷۳)

اس سہو وخطا یا مطبعی غلطی کی بناء پر آپ کے پیش رو علماء کی طرح ہم آپ پر کلام رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں تحریف کا الزام نہیں دیں گے لیکن یہ ضرور عرض کریں گے کہ حدیث پاک کی نقل وتصحیح میں یہ سہل انگاری اور غفلت پسندی کہ دو ڈھائی سطروں پر مشتمل حدیث کی نقل میں چھ چھ غلطیاں در آئیں اور وہ بھی ایسے شخص سے جسے حدیث کا اہل ہونے پر اصرار ہو باعث حیرت ہی نہیں قابل گرفت ہے۔

(۲) مقلد معترض کے اس اعتراض پر کہ ''اس حدیث میں کسی تعداد کا ذکر نہیں'' آنجناب لکھتے ہیں کہ ''تعداد کا تذکرہ نہ ہونا کسی تعداد کی نفی پر دلیل نہیں جب تک واضح طور پر نفی نہ ہو'' اس جواب کے بعد آپ نے پلٹ کر مقلد معترض پر یہ اعتراض کیا ہے کہ ''اس روایت سے بیس رکعت تراویح بھی ثابت نہیں ہو رہی ہے'' آپ کے اس اقدامی اعتراض پر اگر کوئی آپ ہی کے الفاظ میں یہ کہے کہ ''اس حدیث میں تعداد کا ذکر نہ ہونا بیس رکعت تراویح کی نفی پر دلیل نہیں ہے'' تو کیا آپ جواب سے مطمئن ہو جائیں گے؟ محترما! اس طرح کے جواب سے مخاطب کو خاموش تو کیا جاسکتا ہے لیکن مطمئن نہیں کیا جاسکتا، غالباً اسی بناء پر حدیث سے آٹھ رکعت تراویح کو بزعم خویش ثابت کرنے کے لئے لکھتے ہیں۔

(۳) احادیث صحیحہ سے تہجد اور قیام اللیل مع وتر گیارہ رکعت ثابت ہے خود امام بخاری نے اپنے صحیح میں باب الفضل من قیام رمضان'' کے تحت حضرت عائشہ کی یہ روایت نقل کی ہے عن ابی سلمة بن عبد الرحمن انه سأل عائشة کیف کانت صلاۃ رسول اللّٰه صلی الله علیه وسلم فی رمضان ؟ فقالت : ما کان یزید فی رمضان ولا غیره علی احدی عشرۃ رکعة، یصلی اربعًا فلا تسأل عن حسنهن وطولهن، ثم یصلی اربعًا فلا تسأل عن حسنهن وطولهن الخ

آپ کی عبارت کے پہلے خط کشیدہ الفاظ کے بارے میں ظن غالب یہ ہے کہ ''قیام

رمضان'' کی جگہ غلطی سے ''قیام اللیل'' چھپ گیا ہے کیونکہ قیام اللیل سے تہجد مراد ہونے میں کوئی اختلاف نہیں کہ اسے ثابت کیا جائے علاوہ ازیں آپ نے صحیح بخاری کی جو حدیث پیش کی ہے اس سے آپ یہی ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ تہجد اور قیام رمضان ایک ہے، اس غلطی کی وجہ سے آپ کے استدلال کی عمارت ہی منہدم ہوئی جاتی ہے اس لئے یہ تصحیح ضروری ہے، اور دوسرے خط کشیدہ الفاظ جو آپ کے مطبوعہ رسالہ سے بعینہٖ نقل کئے ہیں ان الفاظ سے صحیح بخاری میں کوئی باب نہیں ہے اور نہ ہی قواعد عربیہ کے لحاظ سے یہ عبارت درست ہے۔ باب کے صحیح الفاظ جو صحیح بخاری میں ہیں یوں ہیں ''باب من قام رمضان''

حدیث پاک کا متن اور ترجمہ لکھنے کے بعد آٹھ رکعت تراویح ثابت کرنے کی غرض سے لکھتے ہیں ''اس حدیث میں رمضان کی نماز کے بارے میں سوال ہے جسے عرف عام میں تراویح کہا جاتا ہے اور غیر رمضان میں تہجد جس کی تعداد آٹھ رکعت ہے اور تین وتر ملانے سے گیارہ ہو جاتی ہے۔ اس حدیث میں بھی ''فی رمضان'' کا لفظ آیا ہے لیکن (حضرت) عائشہ (رضی اللہ عنہا) نے رمضان کے علاوہ غیر رمضان کا تذکرہ کر کے ثابت کیا کہ رمضان کے علاوہ اور دنوں میں جو تہجد پڑھی جاتی ہے اس کی رکعت کی تعداد بھی مع وتر گیارہ ہے۔ لہٰذا دونوں کی تعداد گیارہ رمضان میں تراویح اور غیر تراویح اور غیر رمضان میں تہجد۔ فافہم

چونکہ آپ نے اپنے اس استدلال کو سمجھنے کی دعوت دی ہے اس لئے ہم نے آپ کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے اسے سمجھنے کی کوشش کی اور ہماری فہم نارسا کی جہاں تک رسائی ہے اس کا خلاصہ پیش کیا جا رہا ہے۔

تراویح کی آٹھ رکعت ہونے پر اس روایت سے موصوف کے استدلال کی بنیاد دو باتوں پر ہے اول یہ کہ تہجد اور تراویح دونوں نمازیں ایک ہیں جسے سال کے عام مہینوں میں تہجد اور رمضان میں تراویح کہا جاتا ہے اور دوسری بات یہ کہ زیر نظر روایت میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا واضح الفاظ میں فرما رہی ہیں کہ رمضان اور غیر رمضان سب میں آنحضرت...... مع وتر کے گیارہ رکعتوں سے زیادہ نہیں پڑھا کرتے تھے۔ لہٰذا اس حدیث

سے ثابت ہو گیا کہ تراویح کی آٹھ رکعتیں ہیں۔

بلا ریب ان کے اس استدلال کا دوسرا جزء اس حدیث پاک سے بصراحت ثابت ہے لیکن پہلا جزء کہ تہجد اور تراویح دونوں ایک ہیں، اس حدیث میں اس کا کوئی ادنیٰ اشارہ تک نہیں، استدلال کا یہ پہلا جزء جب تک اس حدیث سے ثابت نہ ہو جائے اسے آٹھ رکعت تراویح کے ثبوت میں پیش کرنا محض مغالطہ ہے جس سے ممکن ہے ان کے حواری خوش ہو جائیں لیکن علمی دنیا میں اس کی پرکاہ کی بھی حیثیت نہیں۔

(الف) میرے محترم! تہجد اور تراویح دونوں الگ الگ نمازیں ہیں اسی لئے احادیث میں دونوں کی تعبیر میں فرق ملحوظ رکھا گیا ہے کہ تہجد کو قیام لیل اور تراویح کو قیام رمضان کے الفاظ سے بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ شارح بخاری علامہ کرمانیؒ لکھتے ہیں "اتفقوا علی ان المراد بقیام رمضان التراویح" علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ قیام رمضان سے مراد نماز تراویح ہے، امام نوویؒ نے بھی شرح مسلم میں قیام رمضان کی یہی مراد بتائی ہے اور شارح کرمانی کے قول کی تائید کی ہے۔ امام باجی مالکی قیام رمضان کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں "یجب ان یکون صلاة تختص به ولو کان شائعا فی جمیع السنة لما اختص به ولا انتسب الیه" ''قیام رمضان'' میں نماز کی اضافت رمضان کی جانب ضروری قرار دیتی ہے کہ یہ نماز رمضان کے ساتھ خاص ہو ورنہ اگر یہ نماز پورے سال میں عام اور پھیلی ہوتی تو اسے رمضان کے ساتھ نہ خاص کیا جاتا اور نہ ہی رمضان کی جانب اسے منسوب کیا جاتا۔ فقہ حنبلی کی معروف و معتمد کتاب ''الاقناع'' میں ہے "اتفقوا علی ان التراویح ھی المراد من قوله صلی الله علیه وسلم، قام رمضان" الحدیث. اس پر علماء متفق ہیں کہ آنحضرت ...... کے فرمان ''قام رمضان'' سے مراد تراویح ہے، (ان سارے اقوال کے لئے دیکھئے اوجز المسالک شرح مؤطا امام مالک، ج:۱، ص:۳۸۸ مطبوعہ مکتبہ یحیوی سہارن پور یوپی) حافظ الدنیا امام ابن حجر عسقلانی تراویح کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں سُمِّیت الصلاة فی الجماعة فی لیالی رمضان التراویح" وہ نماز (مسنون) جو رمضان کی راتوں میں جماعت کے ساتھ

پڑھی جاتی ہے اسے تراویح کہا جاتا ہے، علماء حدیث وفقہ کے ان اقوال سے روز روشن کی طرح یہ بات عیاں ہوگئی کہ نماز تراویح خاص رمضان کی نماز ہے اسے تہجد پر محمول کرنا مفہوم حدیث سے بیخبری ہے یا مغالطہ انگیزی ہے۔

(ب) حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی مذکورہ بالا روایت سے نماز تہجد وتراویح کے ایک ہونے کا جو آپ نے خود ساختہ معنی کشید کیا ہے خود انہیں کی ایک دوسری روایت اس کی تردید کرتی ہے، چنانچہ امام ابوداؤد نے اپنی سنن میں ''باب فی صلاۃ اللیل'' کے تحت ایک طویل حدیث روایت کی ہے جس میں راوی حدیث سعد بن ہشام کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے درخواست کی کہ آپ مجھ سے آنحضرت ...... کے قیام لیل یعنی تہجد کے بارے میں حدیث بیان فرمائیں تو حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کیا تو سورۃ مزمل نہیں پڑھتا؟ میں نے عرض کیا کیوں نہیں، پڑھتا ہوں تو انھوں نے فرمایا: ''فان اول ھذہ السورۃ نزلت فقام اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حتّٰی انتفخت اقدامھم وحبس خاتمتھا فی السماء اثنی عشر شھرا ثم انزل آخرھا فصار قیام اللیل تطوعا بعد فریضۃ'' الحدیث

(عون المعبود شرح سنن ابی داؤد، ج:٤، ص: ٢٢٠ رقم ١٣٢٨)

''اس سورۃ کا ابتدائی حصہ نازل ہوا تو آنحضرت ...... کے اصحاب نے قیام لیل یعنی نماز تہجد میں (اس قدر درازی کی کہ) ان کے پیر سوج گئے اور اللہ نے اس سورۃ کے خاتمہ اور آخری حصہ کو آسمان میں بارہ مہینے روکے رکھا بعد ازاں اس کا آخری حصہ نازل ہوا تو نماز تہجد فرض سے نفل ہوگئی''

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی یہ صحیح حدیث ناطق ہے کہ (۱) نماز تہجد کی مشروعیت قرآن مجید کے ذریعہ ہوئی، سورۃ مزمل کی ابتدائی سورۃ یعنی ''یا ایھا المزّمل قم اللیل الا قلیلا'' سے حضرت عائشہ نے اسی بات کو بیان کیا ہے۔ (۲) تہجد کی یہ مشروعیت ہجرت سے پہلے ابتدائے اسلام میں ہوئی جیسا کہ روایت کے الفاظ ''حبس خاتمتھا اثنی عشر شھرا'' سے ظاہر ہے۔ (۳) حضرات صحابہ اسی وقت سے پوری تندہی کے

ساتھ اس پر عمل پیرا تھے۔ جبکہ صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ نماز تراویح کی مشروعیت بنص حدیث ہوئی ہے اور وہ بھی ہجرت کے بعد جب رمضان کا روزہ فرض ہوا۔ چنانچہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ (جب رمضان کا روزہ فرض ہوا تو) آنحضرت ...... نے فرمایا ان الله تبارك و تعالیٰ فرض صیام رمضان علیکم، وسننت لکم قیامه فمن صامه و قامه ایماناً و احتسابًا خرج من ذنوبه کیوم ولدته امه (رواه النسائی و ابن ماجه و احمد فی مسنده کما فی نیل الاوطار ج۳ ص۵۷ واللفظ للنسائی)

خدائے بزرگ و برتر نے تم پر رمضان کے روزے فرض کئے ہیں اور میں نے (بحکم ربانی) بذریعہ سنت اس کے قیام کو مشروع کیا ہے، لہٰذا جو شخص یقین اور بنیت ثواب رمضان کے روزے اور تراویح کو ادا کرے گا وہ گناہوں سے یوں پاک و صاف ہو جائے گا گویا وہ آج ہی پیدا ہوا ہے۔

نماز تہجد اور تراویح میں زمانے کا یہ تقدم و تأخر نیز ان کی مشروعیت میں نصوص کا یہ فرق صاف طور پر بتا رہا ہے کہ دونوں نمازوں میں مغایرت ہے اور انھیں ایک بتانا کسی طرح درست نہیں ہے۔

(ج) حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا ہی کی روایت سے ثابت ہے کہ آنحضرت ...... کی تہجد کی رکعتیں مع وتر کے سات سے کم اور تیرہ سے زیادہ نہیں ہوتی تھیں۔ سنن ابی داؤد میں اس حدیث کے الفاظ یہ ہیں "عن عبد اللّٰه بن ابی قیس قلت لعائشة بکم کان رسول الله صلی الله علیه وسلم یوتر؟ قالت کان یوتر باربع و ثلاث، وست و ثلاث، و ثمان و ثلاث وعشر و ثلاث و لم یوتر باکثر من ثلاث عشرة ولا انقص من سبع" (عون المعبود شرح سنن ابی داؤد ج٤ ص ٢٣٦-٢٣٧) عبداللہ بن ابی قیس کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے دریافت کیا کہ آنحضرت ...... تہجد کی کتنی رکعتوں کے ساتھ وتر پڑھتے تھے، تو حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا (کبھی) چار رکعت تہجد اور تین رکعت وتر پڑھتے تھے (اور کبھی

چھ رکعت تہجد اور تین رکعت وتر پڑھتے ، (کبھی) آٹھ رکعت تہجد اور تین رکعت وتر ادا فرماتے (اور کبھی) دس رکعت تہجد کی اور تین رکعت وتر کی پڑھتے تھے مع وتر تیرہ سے زائد اور سات سے کم تہجد نہیں پڑھتے تھے۔ رکعت تہجد اور وتر سے متعلق اس حدیث کے بارے میں حافظ الدنیا ابن حجر عسقلانی کا بیان ہے ”هذا اصح ما وقفت عليه من ذلك“ (فتح الباری، ج۴، ص:۳۱۴) یعنی تہجد اور وتر سے متعلق یہ حدیث میرے علم کے مطابق سب سے صحیح ہے، اس صحیح ترین حدیث سے بغیر کسی غبار کے معلوم ہوگیا کہ آنحضرت ...... کی نماز تہجد کی رکعتیں متعین تھیں جن کی تعداد کم سے کم چار اور زیادہ سے زیادہ دس ہے، جبکہ آنحضرت ...... کے قیام رمضان یعنی تراویح کی رکعتوں میں علماء کا اختلاف ہے بلکہ محدثین کی ایک جماعت تو اس کی قائل ہے کہ آنحضرت ...... کے قول و فعل سے تراویح کی کوئی متعین تعداد ثابت نہیں جس میں شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ، علامہ سبکی، امام سیوطی اور قاضی شوکانی جیسے اکابر علمائے حدیث شامل ہیں، ذیل میں مذکور علماء کے اقوال ملاحظہ کیجئے:

(۱) حافظ ابن تیمیہ لکھتے ہیں: ”ومن ظنّ ان قيام رمضان فيه عدد معين مؤقّت عن النبى صلى الله عليه وسلم لا يزيد ولا انقص فقد اخطاء (مرقاة شرح مشكوٰة ج۳ ص ۱۹۳) جو یہ سمجھتا ہے کہ آنحضرت ...... سے تراویح کی متعین عدد ثابت ہے جس میں کمی زیادتی نہیں ہوسکتی وہ غلطی پر ہے۔

(۲) علامہ سبکی شرح منہاج میں تحریر کرتے ہیں ”اعلم انه لم ينقل كم صلّى رسول الله صلى الله عليه وسلم فى تلك الليالى هل هو عشرون او اقلّ“ (تحفة الاخيار ص ١١٦ بحواله ركعت تراويح) یہ منقول نہیں کہ ان راتوں میں آنحضرت ...... نے کتنی رکعتیں پڑھیں بیس یا اس سے کم۔

(۳) حافظ سیوطی لکھتے ہیں ”ان العلماء اختلفوا فى عدد ولو ثبت ذلك من فعل النبى صلى الله عليه وسلم لم يختلف فيها“ (مصابيح ص ٤٢)

(۴) قاضی شوکانی نے اپنی تحقیق کا اظہار ان لفظوں میں کیا ”والحاصل ان الذى دلت عليه حديث الباب وما يشابها هو مشروعية القيام فى رمضان جماعة و

فرادیٰ، وقصر الصلاۃ المسماۃ بالتراویح علی عدد معین و تخصیصھا بقرأۃ مخصوصۃ لم یرد بہ سنۃ" (نیل الاوطار ج ۳ ص ۶۱) اس باب اور اس کے مشابہ حدیثوں کا حاصل یہ ہے کہ رمضان میں جماعت کے ساتھ یا اکیلے نماز پڑھنا مشروع ہے لہٰذا تراویح کا کسی متعین عدد میں انحصار اور اس میں قرأت کی خاص مقدار مقرر کرنا تو یہ سنت میں وارد نہیں ہے۔

ان اکابر علماء کی یہ تحقیق بتا رہی ہے کہ یہ حضرات تہجد اور تراویح کو الگ الگ نمازیں مانتے ہیں ورنہ یہ کیسے کہتے کہ آنحضرت ...... سے اس باب میں کوئی روایت ثابت نہیں جب کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی یہ مذکورہ روایت ناطق ہے کہ آنحضرت ...... نماز تہجد مع وتر کے سات سے کم اور دس سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے۔ نیز اس سے یہ بات بھی ثابت ہوگئی کہ آپ نے بطریق ابوسلمہ حضرت عائشہ صدیقہؓ جو روایت تراویح کی آٹھ رکعت کے اثبات میں پیش کی ہے اس کا نماز تراویح سے کوئی تعلق نہیں ورنہ یہ اکابر محدثین یہ انکار کیسے کرتے۔ (فافہم وتشکر)

(د) پھر امام بخاریؒ جنھوں نے ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن بن عوف کے طریق سے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی اس روایت کو باب فضل من قام رمضان کے تحت درج کیا ہے اور اسی بناء پر آپ امام بخاری کے منہ سے یہ کہلوانے کے درپئے ہیں کہ تہجد اور تراویح دونوں ایک نمازیں ہیں خود ان کا عمل آنجناب کے اس بیجا رویہ کی تردید کر رہا ہے اور زبان حال سے گویا ہے کہ نماز تہجد اور تراویح اسم اور مسمّٰی دونوں لحاظ سے ایک نہیں بلکہ دو نمازیں ہیں، کیونکہ امام بخاری کا معمول تھا کہ رات کے ابتدائی حصہ میں اپنے تلامذہ کے ساتھ باجماعت تراویح پڑھا کرتے تھے جس میں پورے رمضان میں ایک ختم کرتے تھے، اور رات کے پچھلے پہر اکیلے تہجد پڑھا کرتے تھے اور اس میں ہر تین دن میں ایک ختم کرتے تھے۔

بقول آنجناب کے اگر امام بخاری کی رائے یہی تھی کہ تہجد اور تراویح دونوں ایک ہی نماز کے دو نام ہیں اور اسی بات کو بتانے کے لئے انھوں نے "فضل من قام رمضان" کے

باب میں یہ حدیث درج کی ہے تو پھران کا عمل اپنی اس رائے کے خلاف کیوں تھا کہ دونوں کو دو وقتوں میں مختلف کیفیت کے ساتھ یعنی تراویح کو جماعت سے رات کے ابتدائی حصہ میں اور تہجد کو تنہا آخر شب میں کیوں پڑھتے تھے؟ کچھ تو کہئے کہ لوگ...

محترما! صحیح بخاری میں تراجم ابواب اور سیاق احادیث میں امام بخاری رحمہ اللہ کی دقت نظر اور فقیہانہ انداز فکر کو سمجھنے کے لئے بڑی بالغ نظری اور ژرف نگاہی کی ضرورت ہے جس سے ظاہر الفاظ کے دلدادگان بالعموم محروم ہوتے ہیں۔ مذکورہ باب میں امام بخاری نے تراویح کی فضیلت سے متعلق حضرت ابوہریرہ کی روایت نیز خلیفہ راشد عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے حکم سے حضرت ابی بن کعب کی امامت میں تراویح کی جماعت کبریٰ کے قیام سے متعلق عبدالرحمٰن بن عبدالقاری کی روایت درج کرنے کے بعد حضرت عائشہ صدیقہ سے مروی تین روایتیں بیان کی ہیں اس باب کے تحت ام المومنین کی یہ روایتیں کس غرض سے لائی گئی ہیں حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری میں اس کی جانب اشارہ کیا ہے جس سے صحیح بخاری میں امام بخاری کی نکتہ طرازیوں کا کچھ اندازہ ہوسکتا ہے۔

نماز تہجد اور تراویح کے درمیان مغایرت کے ان مذکورہ چار وجوہ کے علاوہ صاحب نظر علماء نے مزید اور اسباب مغایرت ذکر کئے ہیں لیکن بغرض اختصار انہیں چار کے بیان پر اکتفا کیا جارہا ہے کیونکہ انصاف پسند طالب حق کے لئے یہ کافی وافی ہے۔

ان گذارشات کے بعد عرض ہے کہ حضرت ابوسلمہ ابن عبدالرحمٰن کے طریق سے مروی حضرت عائشہ کی یہ حدیث جس کو آپ تراویح سے متعلق ٹھہرانے کے درپے ہیں اس کا تراویح سے کوئی ربط نہیں یہ بات خود حضرت عائشہ صدیقہ کے جواب سے ظاہر ہے کیونکہ اس حدیث میں انھوں نے اس نماز کی رکعتوں کا ذکر کیا ہے جو رمضان اور غیر رمضان سب میں پڑھی جاتی ہے جبکہ تراویح خاص رمضان کی نماز ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی جو صحیح بخاری کے سب سے بڑے شارح مانے جاتے ہیں اور شرح بخاری میں ان کی شرح فتح الباری کی اہمیت اور امتیازی شان کے آپ بھی معترف ہونگے، حافظ نے اپنی اسی شرح میں اس زیر بحث حدیث کو تہجد ہی سے متعلق مانا ہے کہ نبی پاک...... رمضان المبارک میں عبادت و

ریاضت کا اور مہینوں کے لحاظ سے زیادہ اہتمام کرتے تھے بالخصوص عشرہ اخیرہ کی راتوں میں اس اہتمام میں مزید شدت آجاتی تھی چنانچہ صحیح بخاری میں ہے ”اذا دخل العشر شدّ مئزره واحییٰ لیله وایقظ اهله“ الحدیث یعنی جب رمضان المبارک کا عشرہ اخیرہ آجاتا تو آپ کمر کس لیتے اور اپنی راتوں کو زندہ کرتے اور اپنے اہل خانہ کو (بھی عبادت کے لئے) جگاتے، اور بیہقی کی روایت میں ہے ”اذا دخل رمضان لم یأت فراشه حتی ینسلخ“ الحدیث جب رمضان المبارک آجاتا تو جب تک وہ ختم نہیں ہوتے تھے بستر پر نہیں آتے تھے“ اس لئے ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن کے ذہن میں یہ بات آئی کہ رمضان المبارک میں اس شدت عبادت کا تقاضا ہے کہ آپ کے تہجد کی نماز میں بھی زیادتی ہوجاتی رہی ہوگی، اسی بات کی تحقیق کے لئے انھوں نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے دریافت کیا ”کیف کانت صلاة رسول الله صلی الله علیه وسلم فی رمضان“ رمضان المبارک میں آنحضرت ...... کے تہجد کی کیا کیفیت ہوتی تھی، حضرت عائشہ صدیقہؓ سائل کے منشاء سوال کو سمجھ گئیں اس لئے جواب میں فرمایا ”ما کان یزید فی رمضان ولا غیره علی احدی عشرة رکعة“ رمضان اور غیر رمضان (کسی میں بھی) گیارہ رکعتوں پر زیادتی نہیں کرتے تھے۔ سوال تہجد کے بارے میں ہے اور جواب بھی تہجد ہی سے متعلق ہے اسی لئے ”ولاغیره“ کا اضافہ کیا۔ تراویح سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

پھر اس موقع پر یہ بات بھی ملحوظ رہنی چاہئے کہ حضرت عائشہ صدیقہ کی اس روایت میں گیارہ رکعتوں پر زیادتی کی نفی اکثر اوقات واحوال کے اعتبار سے ہے کلی وعمومی نفی نہیں ہے کہ کہا جائے کہ آنحضرت ...... نے صلاۃ لیل کو گیارہ سے زیادہ کبھی پڑھا ہی نہیں۔

کیونکہ کلی نفی کی صورت میں یہ خود حضرت عائشہ سے منقول درج ذیل حدیثوں کے معارض ہوجائے گی۔

(۱) عن عروة عن عائشة کان رسول الله صلی اللّٰه علیه وسلم یصلی باللیل ثلث عشرة رکعة ثم یصلی اذا سمع النداء بالصبح رکعتین خفیفتین. رواه البخاری فی صحیحه ومالك فی المؤطاء (دیکھئے فتح الباری شرح البخاری ج ۳، ص:

۵۸، الرقم ۱۷۰، اوجز المسالک شرح مؤطا امام مالک، ج:۱، ص: ۴۱۸) یعنی آنحضرت ...... مع وتر کے تہجد تیرہ رکعت پڑھتے اور جب فجر کی اذان سنتے تو دو رکعت سنت پڑھتے۔

(۲) عن عبدالله ابن ابی قیس قال: قلت لعائشة بکم کان رسول الله صلی الله علیه وسلم یوتر؟ قالت: یوتر باربع و ثلاث، وست وثلاث و ثمان وثلاث وعشر وثلاث ولم یکن یوتر باکثر من ثلاث عشرة ولا انقص من سبع (سنن ابی داؤد مع شرحه عون المعبود، ج:٤، ص: ٢٣٦-٢٣٧ رواه ایضا احمد فی مسنده وذکره فی فتح الباری ج:٤، ص: ٣١٤ وقال هذا اصح ما وقفت علیه من ذلك)

عبداللہ بن ابی قیس کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے دریافت کیا کہ آنحضرت ...... تہجد کی کتنی رکعتوں کے ساتھ وتر پڑھتے تھے تو انھوں نے فرمایا کبھی چار رکعت تہجد اور تین رکعت وتر پڑھتے (کبھی) چھ رکعت تہجد اور تین رکعت وتر پڑھتے (کبھی) آٹھ رکعت تہجد اور تین رکعت وتر پڑھتے اور (کبھی) دس رکعت تہجد اور تین رکعت وتر پڑھتے۔

نیز عمومی اور کلی نفی مراد لینے کی صورت میں یہ حدیث حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت زید بن خالد جُہنی کی روایت کے بھی خلاف ہوجائے گی کیونکہ ان دونوں حضرات نے صراحت کی ہے کہ آنحضرت ...... نے مع وتر کے تہجد کی تیرہ رکعتیں پڑھیں، حدیث کے الفاظ ملاحظہ کیجئے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ ایک طویل حدیث میں فرماتے ہیں:

(۳) فصلی رکعتین، ثم رکعتین، ثم رکعتین، ثم رکعتین، ثم رکعتین، ثم رکعتین ثم اوتر، ثم اضطجع حتی جاء ه المؤذن فقام فصلی رکعتین خفیفتین ثم خرج فصلی الصبح (صحیح البخاری مع شرحه فتح الباری، ج:٢، ص: ٦٠٦ وصحیح مسلم، ج:١، ص: ٢٦٠)

تو آپ ...... نے دو رکعتیں پڑھیں، اس کے بعد دو رکعتیں پڑھیں پھر دو رکعتیں

پڑھیں، پھر دو رکعتیں پڑھیں، پھر دو رکعتیں پڑھیں، بعدازاں دو رکعتیں پڑھیں (اور اسے ایک رکعت پڑھ کر) وتر بنایا۔ بعدازاں لیٹ گئے یہاں تک کہ مؤذن آیا تو آپ کھڑے ہوئے اور دو خفیف رکعتیں پڑھیں پھر حجرہ مبارکہ سے نکل کر مسجد گئے اور نماز فجر ادا کی۔

(۴) عن زيد بن خالد الجهني انه قال: لا رمقن صلاة رسول الله صلى الله عليه وسلم الليلة، فصلىٰ ركعتين خفيفتين، ثم صلى ركعتين طويلتين طويلتين طويلتين، ثم صلى ركعتين وهما دون اللتين قبلهما، ثم صلى ركعتين وهما دون اللتين قبلهما ثم صلى ركعتين وهما دون اللتين قبلهما ثم صلى ركعتين وهما دون اللتين قبلهما، ثم اوتر فذلك ثلاث عشرة ركعة (صحيح مسلم، ج: ۱، ص: ۲۶۲)

حضرت زید بن خالد جُہنی رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ انھوں نے کہا آج کی رات میں آنحضرت ...... کی نماز کو اچھی طرح دیکھوں گا (چنانچہ میں نے دیکھا کہ) آپ نے (پہلے) دو رکعتیں ہلکی پڑھیں پھر دو رکعتیں پڑھیں جو طویل، طویل در طویل تھیں، پھر دو رکعتیں جو ان دونوں کی پہلی سے کم تھیں، پھر دو رکعتیں پڑھیں جو ان دونوں کی پہلی سے کم تھیں، پھر دو رکعتیں پڑھیں جو ان دونوں کی پہلی سے کم تھیں، پھر دو رکعتیں پڑھیں جو ان دونوں کی پہلی سے کم تھیں، پھر دو رکعتیں پڑھیں جو ان دونوں کی پہلی سے کم تھیں پھر (ان آخری دونوں کو ایک رکعت کے ذریعہ) وتر بنایا یہ کل تیرہ رکعتیں ہوئیں۔

یہ چار حدیثیں ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ نے مع وتر کے نماز تہجد تیرہ رکعتیں پڑھیں ان کے برخلاف ایک اور روایت ہے جو تابعی کبیر مسروق سے مروی ہے وہ کہتے ہیں کہ سألت عائشة رضي الله عنها عن صلاة رسول الله صلى الله عليه وسلم بالليل؛ فقالت: سبع و تسع، واحدى عشرة سوى ركعتي الفجر (صحیح البخاری مع شرح فتح الباری، ج: ۳، ص: ۲۵) یعنی میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے آنحضرت ...... کی نماز تہجد کے بارے میں دریافت کیا تو انھوں نے فرمایا کہ (کبھی) مع وتر سات رکعتیں پڑھتے اور (کبھی) مع وتر نو رکعتیں اور کبھی مع وتر گیارہ رکعتیں پڑھتے تھے۔

ان مذکورہ روایتوں کے علاوہ بھی حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے آنحضرت ...... کی نماز تہجد اور وتر کے بارے میں روایتیں ہیں اور ان میں تعداد رکعت وغیرہ میں باہم اختلاف ہے۔ اس اختلاف روایت کی بناء پر امام قرطبی لکھتے ہیں کہ اشکلت روایات عائشة علی کثیر من اهل العلم حتیٰ نسب بعضهم الی الاضطراب، وهذا انما یتم لو کان الراوی عنها واحدا او اخبرت عن وقت واحد، والصواب ان کل شيء ذكرته من ذلك محمول على اوقات متعددة واحوال مختلفة بحسب النشاط و بیان الجواز . والله اعلم (فتح الباری ج ۳ ص ۲۶) حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی روایتوں میں وارد یہ اختلاف بہت سارے اہل علم کے لئے باعث اشکال ہوگیا یہاں تک کہ بعض حضرات نے انھیں مضطرب لکھ دیا، لیکن اضطراب کا یہ دعویٰ اس وقت درست ہوتا جبکہ ان ساری حدیثوں کو حضرت عائشہ سے ایک ہی راوی روایت کرتا یا حضرت عائشہ ان ساری روایتوں میں ایک ہی وقت کی نماز کے بارے میں خبر دیتیں، بلکہ حضرت عائشہ کی یہ ساری روایتیں متعدد اوقات اور مختلف حالات سے متعلق ہیں جنھیں آنحضرت ...... نے طبعی نشاط کے مطابق اور بیان جواز کی غرض سے الگ الگ وقتوں میں مختلف تعداد کے ساتھ ادا فرمایا ہے۔ اور حضرت عائشہ نے کسی راوی سے ایک وقت کی نماز کا ذکر اور کسی راوی سے دوسرے وقت یا حالت کی نماز کا ذکر کیا ہے۔ لہٰذا ان کا بیان مضطرب نہیں بلکہ واقعہ کے مطابق ہے جس طرح انھوں نے آنحضرت ...... کو تہجد پڑھتے دیکھا اسی طرح بیان کر دیا ہے۔

بہر حال ہمارے مجیب لبیب بطریق ابو سلمہ حضرت عائشہ صدیقہ سے مروی روایت ما کان یزید فی رمضان ولا غیره علی احدی رکعة الخ آنحضرت ...... رمضان اور غیر رمضان میں مع وتر تہجد کی گیارہ رکعتوں پر زیادتی نہیں فرماتے تھے اور بطریق مسروق حضرت عائشہ کی روایت میں مطابقت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں ”جب کہ اس حدیث میں سات، نو، گیارہ کا تذکرہ تو ہے لیکن بیس رکعت کا سرے سے ذکر ہی نہیں ہے ہم تو سرور کائنات ...... کی سنت کے مطابق سات، نو، گیارہ رکعتوں کے قائل ہیں آپ اپنی

خبر لیجئے جو کھلم کھلا آقائے نامدار احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ ...... کی سنت کی مخالفت پر تلے ہوئے ہیں، آمدم برسر مطلب حدیث مسروق میں سات، نو، گیارہ رکعتوں کا تذکرہ ہے اس میں گیارہ رکعتوں کو اس لئے فوقیت دیتے ہیں کہ جب گیارہ رکعت ادا کی جاتی ہے تو اس میں سات، اور نو بذات خود شامل ہو جاتی ہے کیونکہ سات اور نو کی تعداد پوری کرنے کے بعد ہی گیارہ کی تعداد پوری ہوتی ہے اس طرح نہ تو حدیث عائشہ اور حدیث مسروق میں کوئی تعارض ہے نہ ہی ضعیف صرف معترض کی غلط فہمی ہے” بلفظہ

امام قرطبی نے حضرت عائشہ صدیقہؓ کی روایتوں کے اختلاف کو اختلاف احوال و اوقات پر محمول کیا تھا اور اسی توجیہہ کو حافظ الدنیا امام ابن حجر عسقلانی نے پسند کیا ہے، امام قرطبی سے پہلے ان کے پیش رو امام باجی نے بھی حضرت عائشہ صدیقہ کی ان باہم متعارض روایتوں کے تعارض کو اسی طرح ختم کیا تھا۔ حافظ ابن عبدالبر نے بھی التمہید اور الاستذکار میں اسی کی جانب اشارہ کیا ہے، مگر ان اکابر محدثین کے طریق کے برخلاف ہمارے اہل حدیث مجیب نے اس اختلاف روایت کو دور کرنے کی ایک الگ راہ پسند کی ہے ان کی یہ بیان کردہ تطبیق کی صورت کو غلط نہیں کہا جا سکتا کیونکہ جب مع وتر گیارہ رکعتیں تہجد کی پڑھی جائیں گی تو قطعی طور پر سات اور نو کی عدد پر بھی عمل ہو جائے گا اس طرح ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن کے طریق سے مروی اور مسروق کے طریق سے مروی حضرت عائشہ کی دونوں روایتوں پر بیک وقت عمل ہو جائے گا اور کسی کا ترک لازم نہیں آئے گا، لیکن تطبیق کی اس صورت سے حضرت عائشہ، حضرت ابن عباس اور حضرت زید بن خالد جہنی کی ان روایتوں کا ترک جس میں صراحت سے مذکور ہے کہ آنحضرت ...... نے مع وتر تیرہ رکعتیں پڑھیں (جن کا متن اوپر نقل کیا جا چکا ہے) بہرحال لازم آئے گا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ایک ایسی حدیث (یعنی “ما کان یزید فی رمضان وغیرہ علی احدی رکعة”) جس کا محدثین وفقہاء کے نزدیک تراویح سے کوئی تعلق نہیں اسے دیوبندی مقلد تہجد پر محمول کر کے باب تراویح میں اس پر عمل کی بجائے معتمد دلائل شرعیہ کی بنیاد پر بیس رکعت تراویح پڑھتا ہے تو آپ کے بقول وہ کھلم کھلا سنت سرور کائنات ...... کی مخالفت پر تلا ہوا ہے، تو کیا

آپ تین صحابہ کی روایت سے ثابت (جن میں خود ایک عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بھی شامل ہیں) سنت رسول علی صاحبہا الصلاۃ والسلام کو ترک کر کے مع وتر گیارہ رکعت تراویح کو معمول بنالینے سے کھلم کھلا سنت سرور کائنات ...... کی مخالفت کرنے پر تلے ہیں یا نہیں انصاف سے بتائیں۔ (شاعر سے معذرت کے ساتھ)

اے چشم فتنہ ساز ذرا دیکھ تو سہی   یہ گھر جو جل رہا ہے کہیں تیرا گھر نہ ہو

پھر آپ کو یہ بات یقیناً معلوم ہوگی کہ بیس رکعت تراویح پر عمل میں دیوبندی مقلد منفرد اور اکیلا نہیں ہے بلکہ محدثین وفقہاء کی تصریح کے مطابق بیس کی تعداد قابل اعتماد سند سے حضرت فاروق اعظم، عثمان غنی، علی مرتضیٰ، عبداللہ بن مسعود، ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے ثابت ہے اور لطف یہ کہ جماعت صحابہ میں سے کسی کا ان مذکورہ حضرات سے اختلاف منقول نہیں ہے۔ پھر عہد فاروقی سے جملہ سلف صالحین، جمہور فقہاء مجتہدین، اکابر ائمہ محدثین، اور اہل سنت والجماعت کے جملہ طبقات کا اسی عدد پر تعامل چلا آرہا ہے۔ اس لئے کھلم کھلا سنت آقائے نامدار احمد مجتبیٰ ...... کی مخالفت کے اس الزام کی زد تنہا دیوبندی مقلد ہی پر نہیں پڑے گی بلکہ جماعت مسلمین کے سارے طبقات اس کی زد میں آجائیں گے۔

ناوک نے ترے صید نہ چھوڑے زمانے میں

نبی صادق ومصدوق ...... کی سچی خبر "لا تجتمع امتی علی ضلالة" کے مطابق جماعت مسلمین دینی احکام سے متعلق اپنے فیصلوں میں معصوم ہے اسلئے بلاشبہ یہ بیس رکعت تراویح کے معمول میں حق وصواب پر ہے اور سنت رسول کی مخالفت کا یہ الزام قطعاً اس پر عائد نہیں ہوسکتا۔ البتہ آنحضرت ...... کے فرمان کے مطابق مجیب لبیب کا یہ بیجا الزام لوٹ کر خود انھیں سے چسپاں ہوجائیگا۔

(ایک ضروری تنبیہ) مجیب موصوف اپنی مختار اور پسندیدہ وجہ تطبیق ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں "اس طرح نہ تو حضرت عائشہؓ اور حدیث مسروق میں کوئی تعارض ہے اور نہ ہی ضعیف ہے" (بلفظہ)

ان کی اس عبارت سے ظاہر ہو رہا ہے کہ وہ حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا اور حدیث مسروق کو الگ الگ دو راویوں کی حدیث سمجھ رہے ہیں جبکہ دونوں حدیثیں حضرت عائشہ ہی کی ہیں جن میں سے ایک حدیث کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ان کے ایک شاگرد ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن بن عوف نے روایت کیا ہے اور دوسری حدیث کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ان کے دوسرے شاگرد مسروق نے روایت کیا ہے۔ (فتنبہ وتشکر)

آں محترم! اپنی بات کو مزید مؤکد کرنے کے لئے آخر میں لکھتے ہیں ”تہجد اور قیام اللیل یا صلاۃ اللیل“ ایک ہی چیز ہے جس کا وقت عشاء اور فجر کے درمیان ہے۔ رمضان میں جب عشاء کے بعد پڑھی جاتی ہے تو اس کو عرف عام میں تراویح کہتے ہیں اور اگر اخیر رات میں پڑھی جاتی ہے تو تہجد کا نام دیا جاتا ہے۔ لیکن رسول اللہ...... عموماً آخری حصہ میں ہی پڑھتے تھے جس کی متعدد حدیثیں شاہد ہیں، ترمذی کی ایک حدیث بطور تائید عرض ہے۔

اس تمہیدی عبارت کے بعد بزعم خویش اپنی بات کی تائید کے لئے کہ آنحضرت...... آخر شب میں نوافل پڑھتے تھے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے منقول باب التراویح سے متعلق حدیث نقل کی ہے اور اپنی عادت کے مطابق متن کے نقل کرنے میں اس قدر غلطیاں کی ہیں کہ ان کے منقولہ متن سے اس حدیث کا معنی سمجھنا کارے دارد۔ ہم ذیل میں سنن ترمذی مع تحفۃ الاحوذی سے حدیث کا متن درج کر رہے ہیں تاکہ اس کے سمجھنے میں سہولت ہو۔

عن ابی ذر قال: صمنا مع رسول الله صلی الله علیه وسلم فلم یصل بنا حتی بقی سبع من الشهر، فقام بنا حتی ذهب ثلث اللیل ثم لم یقم بنا فی السادسة وقام بنا فی الخامسة حتی ذهب شطر اللیل، فقلنا: یا رسول الله لو نفّلتنا بقیة لیلتنا هذه؟ فقال: انه من قام مع الامام حتی ینصرف هو کتب له قیام لیلة، ثم لم یصل بنا حتی بقی ثلاث من الشهر، وصلی بنا فی الثالثة ودعا اهله ونساءه، فقام بنا حتی تخوفنا الفلاح، قلت وما الفلاح قال السحور (سنن الترمذی مع شرحہ تحفۃ الاحوذی، ج:۳،ص:۴۵۳)

ترجمہ: حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم نے آنحضرت ...... کے ساتھ رمضان المبارک کا روزہ رکھا، آنحضرت ...... نے ہمیں جماعت سے نماز نہیں پڑھائی یہاں تک کہ ماہِ رمضان کے سات دن باقی رہ گئے تو ہمیں تیئیسویں (۲۳) کو نماز پڑھائی یہاں تک کہ رات کا تہائی حصہ گذر گیا، پھر چوبیسویں کو ہمیں نماز نہیں پڑھائی، اور پچیسویں کو ہمیں نماز پڑھائی یہاں تک کہ نصف رات گذر گئی، تو ہم نے (زیادتی ثواب کے اشتیاق میں عرض کیا) کاش کہ ہماری اس رات میں رات کے بقیہ حصہ تک نماز کو دراز فرماتے؟ تو آپ نے فرمایا جو شخص امام کے ساتھ (یعنی عشاء کی فرض پڑھے) تو اس کے واسطے پوری رات کے قیام کا ثواب لکھا جاتا ہے، پھر چھبیسویں کو ہمیں نماز نہیں پڑھائی اور ستائیسویں کو ہمیں نماز پڑھائی (اور اس رات کو) اپنے اہل خانہ اور دیگر لوگوں کو (نماز میں شریک ہونے کے لئے) بلایا، اس رات کو ہمیں اس قدر لمبی نماز پڑھائی کہ ہمیں سحری چھوٹ جانے کا خوف ہونے لگا۔

مندرجہ بالا حدیث کو نقل کرنے کے بعد موصوف لکھتے ہیں:

اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ ان راتوں میں آپ نے الگ سے تہجد کی نماز نہیں پڑھی بلکہ اسی کو تہجد شمار کیا، اگر تہجد اور قیام اللیل بظاہر صحیح (رمضان ہے) الگ الگ ہوتیں تو تہجد پڑھتے آپ...... نے ان تینوں میں سے کسی رات میں تہجد نہیں پڑھی جس کی وضاحت آخری رات سے ہوتی ہے اس رات آپ...... نے (''سحری'' یہ لفظ ہونا چاہئے جو موصوف کے جواب میں نہیں ہے) فوت ہونے تک پڑھائی اس کے بعد تہجد الگ سے پڑھنے کا سوال ہی نہیں الخ''

اس حدیث سے تہجد اور تراویح کے ایک ہونے پر استدلال کی بنیاد دو باتوں پر ہے:

(۱) حدیث میں مذکور نہیں ہے کہ آپ نے باجماعت تراویح ادا کرنے کے بعد الگ سے تہجد کی نماز پڑھی۔

(۲) تیسری رات میں آپ نے سحری کا وقت ہونے کے قریب تک تراویح کی نماز پڑھی جس سے ظاہر ہے کہ آپ نے اس رات الگ سے تہجد کی نماز نہیں پڑھی۔

اس استدلال کے پہلے جزء کے سلسلے میں عرض ہے کہ موصوف کو اس موقع پر خود اپنا وہ جواب یاد نہیں رہا یا اسے یاد رکھتے ہوئے خلاف مقصد ہونے کی بناء پر نظر انداز کر دیا ہے۔ جسے انھوں نے مقلد معترض کے اس اعتراض پر کہ حدیث زید بن ثابت رضی اللہ عنہ میں کسی تعداد کا ذکر نہیں اپنے مطبوعہ رسالہ کے ،ص: ۱۰ سطر ۱۸ میں ذکر کیا ہے۔ موصوف لکھتے ہیں:

نیز یہ اعتراض کیا ہے کہ اس میں کسی تعداد کا ذکر نہیں ہے، ”عرض ہے کہ تعداد کا ذکر نہ ہونا کسی تعداد کی نفی پر دلیل نہیں ہے جب تک واضح طور پر نفی نہ ہو“

لہٰذا حدیث پیش نظر میں باجماعت تراویح کے بعد تہجد پڑھنے کا ذکر نہ ہونے سے ان راتوں میں تہجد نہ پڑھنے پر ان کا یہ استدلال بقلم خود ساقط ہو جاتا ہے، کیونکہ کسی روایت سے صراحتاً اور واضح طور پر یہ ثابت نہیں کہ جب آپ...... نے اول رات میں ان تین تاریخوں میں باجماعت تراویح پڑھی تو آخر شب میں تہجد نہیں پڑھی، اگر موصوف کے پاس اس باب میں کوئی صریح حدیث ہو تو اسے پیش کریں اس کے بغیر ان کا یہ دعویٰ بقول خود ثابت نہیں ہوسکتا۔ موصوف اپنے اس بیجا استدلال کے ذریعہ گویا یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ سید المتعبدین اللہ کے پیارے رسول ...... رمضان المبارک کے اخیر عشرہ کی تیئیسویں اور پچیسویں انتہائی مبارک راتوں میں علی الترتیب دو تہائی اور نصف حصے میں نوافل وغیرہ میں مشغول رہنے کی بجائے آرام فرماتے تھے جبکہ رسول پاک...... کے اعمال شب کی سب سے بڑی اور سچی شاہد حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی شہادت ہے۔

(۱) قالت عائشة رضی الله عنها کان رسول الله صلی الله علیه وسلم یجتهد فی العشر الاواخر من رمضان ما لا یجتهد فی غیرها“ (رواه مسلم فی الصحیح عن قتیبة وابی کامل السنن الکبریٰ للبیهقی ج ٤ ص ٣١٣ـ٣١٤)

آنحضرت...... رمضان کے آخری عشرہ میں نوافل وعبادت میں جس قدر طاقت صرف فرماتے تھے دیگر ایام میں اتنی جد وجہد اور کوشش نہیں فرماتے تھے۔

حضرت صدیقہ ہی کی یہ بھی شہادت ہے:

(۲) عن عائشة رضی الله عنها اذا دخلت العشر الاواخر من رمضان احیا اللیل وایقظ اهله وشد المیئزر (رواه البخاری فی الصحیح عن علی بن عبدالله ، ورواه مسلم عن اسحاق بن ابراهیم و ابن ابی عمر کلهم عن سفیان، السنن الکبریٰ للبیهقی، ج ٤، ص:٣١٣)

جب رمضان کا عشرہ آخر شروع ہوجاتا تو رات کو زندہ رکھتے (یعنی پوری رات جاگ کر نوافل وغیرہ میں مشغول رہتے) اور اہل خانہ کو بھی عبادت کے لئے بیدار کرتے، اور ازواج سے الگ رہ کر عبادتِ خداوندی کے واسطے مستعد رہتے۔

(۳) وعنها ایضاً قالت : کان اذا دخل رمضان تغیّر لونه و کثرت صلاته وابتهل فی الدعاء وشفق لونه (رواه البیهقی فی شعب الایمان کما فی الجامع الصغیر ج٥ چ ۱۳۲)

جب رمضان آتا تو آپ ...... کی رنگت بدل جاتی، آپ کی نماز میں زیادتی ہوجاتی اور دعا میں خوب عاجزی کرتے اور آپ کا رنگ زرد ہوجاتا۔

حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا کے ان بیانات سے درج ذیل باتیں ثابت ہوتی ہیں:

(الف) سال کے دیگر مہینوں کے بالمقابل رمضان المبارک میں آپ کی عبادتوں میں کثرت اور زیادتی ہوجاتی تھی۔

(ب) رمضان کے آخری عشرہ کی راتوں میں آپ سوتے نہیں تھے، کیونکہ حدیث پاک میں وارد لفظ ''احیاء اللیل'' عربی محاورے میں ساری رات بیدار رہنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، لہٰذا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی جس روایت میں یہ آیا ہے کہ آپ پوری رات جاگتے نہیں تھے بلکہ نوافل وغیرہ بھی پڑھتے تھے اور سوتے بھی تھے، تو یہ اکثر احوال واوقات کا بیان ہے یعنی آپ کا معمول تو یہی تھا، البتہ اخیر عشرہ وغیرہ کی راتیں اس سے مستثنیٰ ہیں ورنہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بیان میں تعارض وتخالف لازم آئے گا جبکہ عقلاء کی باتوں میں باہم تعارض نہیں ہوا کرتا۔

(ج) جن دو راتوں میں آپ ...... نے تہائی اور نصف رات تک تراویح پڑھی اس کے بعد رات کے بقیہ حصہ میں سوئے نہیں کیونکہ، دونوں راتیں عشرۂ اخیرہ میں داخل ہیں، پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ رمضان کی ان دس آخری راتوں کو آپ سوتے نہیں تھے۔

رمضان المبارک بالخصوص اس کے آخری عشرہ کی راتوں میں نبی پاک ...... کے معمول سے متعلق حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ان حدیثوں کے پیش نظر ظن غالب یہی ہے کہ جن دو راتوں میں آپ ...... نے تہائی اور نصف شب تک تراویح پڑھی ان راتوں کے بقیہ دو تہائی اور نصف میں آپ ...... تنہا نوافل میں مشغول رہے ہونگے کیونکہ کتب احادیث وغیرہ سے پتہ چلتا ہے کہ عادت شریفہ رات میں نماز ہی پڑھنے کی تھی، بیٹھ کر ذکر واذکار اور تلاوت قرآن کی عادت نہیں تھی بلکہ نماز ہی میں قرآن کی تلاوت فرماتے تھے۔

رہی تیسری رات جس میں ابتدائے شب سے اس کے آخری حصہ تک تراویح میں مصروف رہے جس کی بناء پر الگ سے تہجد پڑھنے کا موقع نہیں ملا، لیکن آپ کی یہ رات بھی حکماً تہجد سے خالی نہیں، کیونکہ علماء وفقہاء کی تصریح کے مطابق ایک نفلی نماز دوسری نفلی نماز کی قائمقام ہو جاتی ہے۔ مثلاً چاشت کے وقت اگر سورج گرہن ہو جائے اور نماز کسوف کے دوران چاشت کا وقت ختم ہو جائے تو یہی نماز کسوف چاشت کے قائمقام ہو جائے گی اور دونوں نمازوں کا ثواب مل جائے گا اسی طرح اس آخری شب میں چونکہ تہجد کا سارا وقت تراویح میں مصروف ہو گیا تو یہی تراویح تہجد کی بھی قائمقام ہو جائے گی۔ لہٰذا یہ حکم نہیں عائد کیا جائے گا کہ آپ نے اس رات تہجد نہیں پڑھی بلکہ یہ کہا جائے گا کہ اس رات کی تراویح میں تہجد کا تداخل ہو گیا اور بیک وقت دونوں نمازیں ادا ہو گئیں، کتب حدیث و فقہ میں تداخل عبادتین کے نظایر اور مثالیں دیکھی جا سکتی ہیں۔

مشکل یہ ہے کہ ہمارے مجیب محترم کسی مسئلہ سے متعلق بس ایک حدیث کو سامنے رکھ کر کلی وعمومی حکم لگا دیتے ہیں اور اس مسئلہ سے متعلق دیگر احادیث کو بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں، جبکہ فقہائے محدثین کا یہ اصول ہے کہ احادیث وغیرہ، نصوص شرعیہ سے کسی مسئلہ پر استدلال کے لئے ضروری ہے کہ اس باب سے متعلق جملہ نصوص کو پیش نظر رکھا

جائے، چنانچہ زیر بحث مسئلہ میں بھی ان سے یہی بے اصولی ہوئی کہ انھوں نے زیر نظر حدیث میں دیکھا کہ رمضان المبارک کی تیئیسویں، پچیسویں، اور ستائیسویں کی راتوں میں علی الترتیب تہائی، نصف اور پوری رات آنحضرت ...... کے باجماعت تراویح پڑھنے کا ذکر ہے، تراویح کے بعد ان راتوں کے بقیہ حصوں میں آپ کی مشغولیت کیا رہی اس کا حدیث میں کوئی ذکر نہیں بس اسی عدم ذکر کی بنیاد پر حکم لگا دیا کہ ”ان راتوں میں آپ نے الگ سے تہجد نہیں پڑھی“ اگر رمضان المبارک بالخصوص اس کے آخر عشرہ میں آپ کی کثرت عبادت اور احیاء لیل سے متعلق حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی اوپر مذکور حدیثیں مدنظر رکھتے تو ان سے اس غلط استدلال کی غلطی نہ ہوتی۔

ان گذارشات سے پوری طرح منقح ہوکر یہ بات سامنے آگئی کہ حدیث زیر بحث سے موصوف کا یہ استدلال مغالطہ آمیز اور غلط ہے لہٰذا اس استدال کی بنیاد پر ان کا یہ کہنا ہی یکسر غلط ہے کہ ”لہٰذا ثابت ہوا کہ تہجد اور قیام لیل (قیام رمضان) ایک ہی چیز ہے“ کیونکہ جس بنیاد پر یہ عمارت کھڑی کی گئی تھی جب وہ بنیاد ہی منہدم ہوگئی تو اس پر قائم عمارت کا حال محتاج بیان نہیں۔

علاوہ ازیں خود اس حدیث پاک کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ رمضان کے عشرۂ اخیرہ کی ان تینوں راتوں میں آنحضرت ...... کی نماز کا تہجد سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ حدیث میں بصراحت یہ الفاظ موجود ہیں ”وصلی بنا الثالثة و دعا اهله و نساء ه“ ونساء ہ کے بعد ”والناس“ کا بھی ذکر ہے یعنی اپنے گھر والوں، اور اپنی عورتوں کے علاوہ دیگر حضرات صحابہ کو بھی نماز پڑھنے کے لئے جمع کیا۔

حدیث پاک سے معمولی شغف رکھنے والے بھی جانتے ہیں کہ آنحضرت ...... نہ صرف یہ کہ خود نماز تہجد کا ہمیشہ اہتمام فرماتے تھے بلکہ اپنے گھر والوں کو تہجد ادا کرنے کی ترغیب دلاتے رہتے تھے، اور آپ کی عین خواہش یہی تھی کہ گھر کے سارے افراد تہجد گذار رہیں بلکہ ایسا بھی ہوا کہ اپنی لخت جگر حضرت فاطمہ زہراء اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہما کو تہجد کے لئے اخیر شب میں جگایا بھی، حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کو بھی اسکی

رغبت دلاتے رہتے تھے اور عام طور پر اس کی خبر بھی رکھتے تھے کہ کون اس پر مداومت کرتا ہے اور کسی نے کچھ دن پڑھنے کے بعد محض سستی کی بناء پر چھوڑ دیا چنانچہ ایک موقع پر حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کو مخاطب کر کے فرمایا تم فلاں کی طرح مت ہو جانا کہ پہلے تہجد کا اہتمام کرتا تھا مگر اب نہیں پڑھتا۔ ان تمام ترخواہش اور ترغیبات کے باوجود یہ ثابت نہیں کہ آپ نے تہجد ادا کرنے کے لئے لوگوں کو بلا کر جمع کیا ہو، البتہ اگر کوئی از خود آپ کی نماز تہجد کے دوران آکر آپ کی بغل میں کھڑا ہو گیا ہو تو یہ الگ بات ہے، جبکہ اس حدیث میں واضح الفاظ میں حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ آپ ...... نے اس نماز کے لئے صرف اپنے گھر والوں، اور ازواج ہی کو نہیں بلکہ دیگر صحابہ کو بھی اکٹھا کیا جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ تہجد کی نماز نہیں تھی اور اسے تہجد بتانا اس حدیث کے سراسر خلاف ہے۔

ہمارے کرم فرما مجیب نے اپنی اس تحریر میں متعدد بار طنزیہ انداز میں یہ لکھا ہے کہ اس حدیث میں بیس رکعت تراویح کا ذکر نہیں اور اس میں بھی بیس کا ذکر نہیں'' تو کسی خاص حدیث میں بیس رکعت تراویح کا ذکر نہ ہونا اس کے ثبوت پر نفی کی دلیل نہیں ہے جسے آں محترم بھی خوب جانتے ہیں مگر بیس رکعت تراویح سے انھیں اس قدر ذہنی بعد اور طبعی دوری ہے کہ انھیں ہر جگہ اس کے ثبوت کی نفی ہی نظر آتی ہے۔ جبکہ اس کا ثبوت تواتر عمل کی ایسی مستحکم اور ٹھوس دلیل سے ہے کہ اس سے ٹکرانے والا اسے تو کچھ نقصان نہیں پہنچا سکے گا البتہ خود اپنے علم وفکر اور عقل وہوش کو مورد طعن بنالیگا۔

احادیث وآثار سے معمولی شغف رکھنے والے بھی جانتے ہیں کہ اللہ کے رسول ...... نے رمضان المبارک کی بعض راتوں میں جماعت کے ساتھ تراویح پڑھی ہے، اور آنحضرت ...... کے زمانۂ حیات سے صحابۂ کرام الگ الگ اور چھوٹی چھوٹی جماعتوں کے ساتھ، رمضان میں تراویح پڑھا کرتے تھے، پھر حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت ۱۸ھ میں جماعت کبریٰ اور بیس رکعت پر تراویح کا امر مقرر و متعین ہو گیا، جس طرح انہیں کے عہد خلافت میں اسّی کوڑے شرابی کی حد، مرد و عورت کے عضوے تناسل

کے باہم مل جانے سے غسل کی فرضیت اور ایسی لونڈی جس سے مالک کی اولاد ہوگئی ہو کی خرید وفروخت کی ممانعت وغیرہ مسائل میں اقوال وآراء کے اختلاف وانتشار کو ختم کر کے ایک خاص صورت پر سب کا اتفاق ہوگیا تھا، چنانچہ ان مذکورہ مسائل کی طرح تراویح کے مسئلہ میں بھی اسی عہد فاروقی کے فیصلہ کے مطابق صحابہ عمل کرتے رہے چنانچہ حافظ ابن عبدالبر بیس رکعت تراویح سے متعلق آثار واقوال پیش کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

وبه قال الكوفيون، والشافعي، واكثر الفقهاء وهو الصحيح عن اُبیّ بن كعب من غير خلاف من الصحابة... وهو الاختيار عندنا (الاستذكار ج ٥ ص ١٥٧ رقم الفقره ٦٢٨٩) یعنی اسی بیس رکعت تراویح کے قائل فقہائے کوفہ، شافعی اور اکثر فقہاء ہیں اور یہی صحیح طور پر حضرت ابی بن کعب سے ثابت ہے، حضرات صحابہ کے کسی اختلاف کے بغیر اور یہی ہمارے نزدیک بھی مختار ہے۔

الاستذکار کے محقق ومحشی ڈاکٹر عبدالمعطی امین قلعجی حاشیہ میں لکھتے ہیں:

وقد بين فعل الفاروق عمر رضى الله عنه ان عددها عشرون حيث انه جمع الناس اخيرا على هذا العدد فى المسجد ووافقه الصحابة على ذلك ولم يوجد لهم مخالف ممن بعدهم من الخلفاء الراشدين. (حاشیہ الاستذکار ج۵ ص۱۳۳)

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اپنے عمل سے واضح کردیا کہ تراویح کی رکعتیں بیس ہیں کیونکہ انھوں نے آخر میں اسی عدد پر لوگوں کو مسجد میں جمع کیا اور سارے صحابہ نے اس معاملہ میں ان کی موافقت کی، اور حضرات صحابہ کے اس اتفاق کی مخالفت ان کے بعد کے خلفائے راشدین سے نہیں پائی گئی، یعنی وہ حضرات بھی اسی پر متفق رہے۔

صحابۂ کرام کے اس اتفاق کی پیروی ائمہ تابعین وسلف صالحین نے کی پھر ائمہ مجتہدین اور اکابر محدثین بھی اسی پر قولاً وعملاً قائم رہے، پھر ان کے متبعین مغرب سے مشرق تک بلا امتیاز عرب وعجم نسلاً بعد نسلٍ سب کا اسی بیس رکعت یا بعض مقامات میں (بغرض زیادتی ثواب) بیس سے زائد پر عمل جاری رہا اور بحمد اللہ جماعت مسلمین اور سواد اعظم کا آج تک اسی پر عمل قائم ودائم ہے۔ تیرہویں صدی ہجری سے پہلے تک یہ ثابت نہیں کیا

جاسکتا ہے کہ اہل سنت والجماعت سے وابستہ دنیا کے کسی خطہ کے مسلمانوں نے بیس رکعت سے کم تراویح پر اکتفا کیا ہے، اگر کوئی اس کے ثبوت کا قائل ہے تو مستند دلائل سے اسے پیش کرے (دیدہ باید)

تواتر عمل اپنے اثر اور حکم میں تواتر اسنادی کے ہم پلہ ہے اور محدثین وفقہاء بلکہ دنیا کے سارے عقلاء اس پر متفق ہیں کہ کسی امر کے تواتر سے ثابت ہو جانے کے بعد اخبار احاد کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی، پھر بھی حضرات محدثین دوسروں کے اطمینان اور مزید افادہ کی غرض سے اس باب کے متعلق احادیث وآثار جو بسند احاد منقول ہیں انھیں بھی نقل کردیئے ہیں جنھیں السنن الکبریٰ، الاستذکار، التمہید، عمدۃ القاری، المصابیح التراویح، آثار السنن اور رکعات تراویح وغیرہ میں دیکھا جاسکتا ہے اس موقع پر ان کا ذکر باعث مزید طوالت ہوگا۔

مسئلہ (۵) ایک مجلس یا ایک لفظ میں تین طلاقوں کا حکم

من جانب جمعیۃ اہل حدیث نویں سوال کا جواب :

ہمارے دیوبندی مقلد کرم فرما کو پہلے تو یہ بات جان لینی چاہیے کہ ہم ان لوگوں کی طرح مقلد نہیں ہیں ہم اللہ اور اس کے رسول ...... کی اطاعت اور اتباع کو لازم سمجھتے ہیں۔ لہذا کسی امام کا اجتہاد ہمارے لئے حجت نہیں بن سکتا الا یہ کہ رسول اللہ...... سے ثابت ہو۔ کیونکہ ہم مقلدین جامدین کی طرح کسی کے مقلد نہیں ہیں۔

ہمارے معترض نے یہاں پر بھی دجل وفریب اور مکاری سے کام لیا ہے اور لکھا ہے کہ امام بخاری کا مذہب ہے کہ ایک وقت میں تین طلاق کہنے سے تینوں واقع ہو جاتی ہیں آپ بخاری میں کہیں بھی نہیں دکھلا سکتے کہ ایک وقت میں تین طلاق دینے کا لفظ موجود ہو۔ اب رہ گیا معاملہ امام بخاریؒ کا جو باب باندھا ہے کہ "من اجاز طلاق الثلاث" اس میں کہیں بھی ایک وقت میں (فی وقت واحد) کا ذکر نہیں ہے بلکہ صحابہ کرامؓ میں الگ الگ طہر میں طلاق دینے کا شرعی طریقہ سے جو معمول تھا اس شرعی طریقہ سے الگ الگ

دیئے گئے تینوں طلاق مراد ہیں کیوں کہ خود امام بخاریؒ نے یہ باب باندھ کر اللہ تعالیٰ کا یہ قول نقل کیا ہے ”الطلاق مرتان فامساك بمعروف او تسريح باحسان“ اس آیت کو لکھ کر امام بخاریؒ نے گویا خود یہ واضح کر دیا ہے کہ تینوں طلاق سے مراد ایک وقت کی تینوں طلاق مراد نہیں ہو سکتی کیوں کہ اللہ کے ارشاد الطلاق مرتان سے متضاد ہے۔ کیوں کہ الطلاق مرتان کا مفہوم بھی یہی ہے کہ دو بار میں طلاق دی جائے جو الگ الگ وقت کو مستلزم ہے جسے مرۃ کا لفظ بتلا رہا ہے۔ اور اگر اس سے آپ کی تسلی نہ ہوئی ہو تو مسلم شریف جلد اول صفحہ ۴۷۷ کتاب الطلاق کی حدیث ذکر کر دی جائے عن ابن عباسؓ قال کان الطلاق علی عهد رسول الله ﷺ وابی بکر و سنتین من خلافة عمر طلاق الثلاث واحدةً فقال عمر ابن الخطاب ان الناس قد استعجلوا فی امر کانت لهم فیه اناة فعلوا حصیناه علیهم فأمضاه علیهم ابن عباس کہتے ہیں کہ رسول اللہ...... کے زمانے میں اور ابوبکر صدیقؓ کے زمانے میں اور حضرت عمرؓ کے دور خلافت کے شروع دو سال تک تین طلاقیں ایک ہی مانی جاتی تھیں۔ پھر حضرت عمرؓ نے کہا کہ لوگ اس کام میں جلدی کرنے لگے جس میں اللہ تعالیٰ نے مہلت رکھی تھی پس اگر ہم جاری کر دیں تین کی تینوں تو انھوں نے تین طلاق پڑ جانے کا حکم جاری کر دیا۔ اب اس حدیث سے اندازہ لگائیے کہ طلاق کا شرعی مسئلہ کیا ہے یقیناً وہی ہے جو رسول اللہ...... کے زمانے میں تھا اور ابوبکرؓ کے زمانے میں تھا اور حضرت عمرؓ کی خلافت کے ابتدائی دو سال میں تھا۔

اور یہ بات قطعی ہے کہ دین رسول اللہ...... کے زمانہ میں مکمل ہو چکا تھا۔ پھر امام ابن القیمؒ لکھتے ہیں کہ حافظ ابوبکر اسماعیلی نے مسندِ عمر میں کہا قال عمر بن الخطابؓ ما ندمت علی شیءٍ ندامتی ثلاث ان لا اکون حرمت الطلاق (اغاثة لاصفهاتی(۱) جلد اول) یعنی عمر بن خطاب نے کہا کہ میں اتنا نادم کبھی نہ ہوا جتنی ندامت مجھے تین باتوں پر ہوئی پہلی یہ کہ طلاق حرام نہ کرتا تو اچھا تھا (اس کے بعد دو چیزیں اور بیان کریں) معلوم ہوا کہ حضرت عمرؓ آخر عمر میں اپنے حکم پر نادم ہو گئے تھے اور رجوع کر لیا تھا۔

---

(۱) نقل مطابق اصل ہے ورنہ کتاب کا صحیح نام ”اغاثة اللهفان“ ہے۔

بحث ونظر

اس جواب میں مقلدین پر تقلید کی پھبتی کسنے اور اپنی غیر مقلدیت کا اظہار اور اعلان کے بعد لکھتے ہیں ”بخاری میں کہیں نہیں دکھلا سکتے کہ ایک وقت میں تین طلاقیں دینے کا لفظ موجود ہے“

تو کیا آپ دکھا سکتے ہیں کہ بخاری میں یہ لفظ ہے کہ ”ایک وقت میں دی گئی تین طلاقیں ایک شمار ہوں گی؟ محترما! علمی مباحث میں اس قسم کی کٹھ حجتیوں سے اپنے ناواقف معتقدین کو کچھ دیر کے لیے بظاہر خوش کیا جاسکتا ہے، ورنہ اس کا کچھ حاصل نہیں اگر واقعی آپ صرف اللہ اور اس کے رسول ...... کی اطاعت واتباع کو لازم سمجھتے ہیں جیسا کہ آپ کا دعویٰ ہے تو اپنے پیش رو علمائے غیر مقلدین کی تقلید سے کچھ دیر کے لیے سہی آزاد ہو کر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ...... کے فرمودات کا عربی زبان کے قواعد اور محاوروں کی روشنی میں مطالعہ کریں اصل حقیقت آپ پر منکشف ہو جائے گی۔ ”الدین النصیحة“ کے پیش نظر آپ کی خیر خواہی کے جذبہ سے اس موقع پر چند اشارات کر دیئے جارہے ہیں تاکہ غور وفکر میں آپ کو سہولت ہو۔

(۱) آیت کریمہ ”الطلاق مرتان فامساك بمعروف او تسريح باحسان“ کے شان نزول کے سلسلے میں تفسیر ابن جریر طبری، ج:۳، ص:۲۵۸، تفسیر ابن کثیر، ج:۱، ص:۲۷۷ اور کتب حدیث میں سنن الکبری، ج:۷، ص:۳۳۳، سنن ابی داؤد مع بذل المجهود، ج:۲، ص:۶۱ باب فی فسخ المراجعة بعد تطليقات الثلاث، نیز موطاء امام مالک، جامع ترمذی، مستدرک للحاکم وغیرہ میں بالفاظ مختلف جو روایتیں مذکور ہیں ان سب کا حاصل یہ ہے کہ اس آیت پاک کے ذریعہ قدیم طریقہ کو منسوخ کر کے طلاق اور رجعت کی حدیں متعین کر دی گئیں کہ طلاق کی تعداد تین اور رجعت صرف دو طلاقوں تک کی جاسکتی ہے۔

امام طبری اس آیت سے متعلق شان نزول کی روایت ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

”فتاويل الآية على الخبر الذى ذكرنا، عدد الطلاق الذى لكم ايها الناس فيه على ازواجكم الرجعة اذا كن مدخولا بهن تطليقتان“

آیت پاک کی تفسیر اس روایت کے تحت جو ہم نے اوپر ذکر کی ہے یہ ہے کہ طلاق کی وہ تعداد جس میں تمہیں اے مردو اپنی مطلقہ بیویوں سے رجعت کا اختیار ہے جبکہ ان سے ہم بستری ہوچکی ہو دو طلاقیں ہیں۔

امام طبری نے آگے چل کر اسی تفسیر کو ظاہر قرآن کے موافق اور راجح قرار دیا ہے۔ (دیکھئے جامع البیان فی تفسیر القرآن معروف بہ تفسیر طبری، ج:۳، ص:۲۵۹) حافظ ابن کثیر، امام رازی، علامہ سید آلوسی وغیرہ نے بھی اپنی تفسیروں میں اسی تفسیر کو اولیٰ و راجح کہا ہے۔ ائمہ تفسیر کی ان تصریحات سے واضح ہوگیا کہ آیت پاک ”الطلاق مرتان“ کا مقصد نزول طلاق رجعی اور طلاقوں کی انتہائی حد بیان کرنا ہے قطع نظر اس کے کہ یہ طلاق بلفظ واحد دی گئی ہے یا الفاظ مکررہ، ایک مجلس میں دی گئی یا کئی مجلسوں میں۔ اسی لئے امام ابن جریر طبری نے ”مرتان“ کی تفسیر ”تطليقتان“ سے کی ہے یعنی طلاق رجعی دو طلاقیں ہیں۔ لفظ مرتان کے پیش نظر زیادہ سے زیادہ بس یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ دو طلاقیں بیک لفظ نہ دی جائیں بلکہ الگ الگ الفاظ کے ساتھ دی جائیں۔ تعدد مجلس کا اس میں ادنیٰ اشارہ تک نہیں ہے۔ پھر یہاں یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ لفظ ”مرتان“ کلام عرب میں ”مرة بعد اخریٰ“ یعنی ”ایک کے بعد دوسرا“ کے معنی میں قطعی نہیں ہے کیونکہ یہ لفظ جس طرح ”مرة بعد اخرى“ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اسی طرح عدداِن یعنی دو چند، دوگنا اور ڈبل کے معنی میں بولا جاتا ہے۔ اس کی چند مثالیں ملاحظہ کیجئے:

۱- اؤلئك يُوتون اجرهم مرتين : یعنی (مؤمنین اہل کتاب) دیئے جائیں گے اپنا اجر دوگنا۔ یہاں یہ معنی نہیں ہے کہ انھیں ایک کے بعد دوسری مرتبہ اجر دیا جائے گا۔

۲- و من يقنت منكن لله و رسوله و تعمل صالحا نؤتها اجرها مرتين : (ازواج مطہرات کو مخاطب کر کے فرمایا گیا) اور جو کوئی تم میں اطاعت کرے اللہ کی اور اس کے رسول کی اور عمل کرے اچھے تو ہم دیں گے اس کو اس کا اجر و ثواب دوگنا۔ یہاں یہ معنی

نہیں ہے کہ انہیں مختلف اوقات میں دو اجر دیا جائے گا۔

۳- بخاری شریف میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ آنحضرت...... نے فرمایا: "العبد اذا نصح لسيده واحسن عبادة ربه كان له اجره مرتين": غلام جب اپنے آقا کا خیر خواہ اور اپنے رب کی عبادت میں مخلص ہو تو اس کو دوگنا اور دوہرا اجر ملے گا۔

۴- مسلم شریف میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، ان اهل مكة سئالوا رسول الله صلى الله عليه وسلم ان يريهم آية فأراهم انشقاق القمر مرتين" (صحیح مسلم، ج:۲،ص:۳۷۳) مکہ والوں نے رسول خدا...... سے معجزہ طلب کیا تو آپ نے چاند کے دو ٹکڑے ہونے کا معجزہ دکھایا۔ یہاں مرتین کے معنی فلقتین یعنی دو ٹکڑے کے ہیں۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ...... نے انھیں ایک کے بعد دوسرا شق القمر کا معجزہ دکھایا۔

چنانچہ خود علامہ ابن القیم نے "اغاثة اللهفان" میں حدیث مذکور کو نقل کر کے مرتین کا معنی شقتین ہی بیان کیا ہے اور اس کے بعد لکھا ہے "ولما خفى على من لم يحط به علما زعم ان الانشقاق وقع مرة بعد مرة فى زمانين وهذا مما يعلم اهل الحديث ومن له خبرة باحوال الرسول وسيرته انه غلط وانه لم يقع الانشقاق الامرة واحدة" بحوالہ اعلاء السنن ج۱۱،ص:۱۷۹۔

مرتین کا یہ معنی جن لوگوں پر ان کی کم علمی کی بناء پر مخفی رہا انھوں نے سمجھ لیا کہ شق القمر کا معجزہ مختلف اوقات میں متعدد بار ہوا ہے علمائے حدیث اور اللہ کے رسول ...... کے احوال وسیرت سے واقف اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ سمجھنا غلط ہے اور شق القمر کا معجزہ صرف ایک بار ظہور میں آیا ہے۔

۵- عن عبد الله بن زيد ان النبى صلى الله عليه وسلم توضأ مرتين مرتين" رواه البخارى. (مشکوۃ، ج:۱،ص:۴۶)

یعنی اللہ کے نبی علیہ الصلوۃ والسلام نے وضو فرمایا اور اعضاء وضو کو دو دو بار دھلا۔ اس حدیث میں بھی قطعی طور پر یہ معنی نہیں ہے کہ آپ...... نے اعضائے وضو کو ایک مجلس

میں ایک بار اور دوسری مجلس میں دوسری مرتبہ دھلا بلکہ یہی معنی متعین ہے کہ آپ نے ایک ہی مجلس میں اعضاے وضو کو دو دو بار دھلا۔ فتدبر

(۲) دوسروں کی تقلید میں آپ نے جو یہ تحریر فرمایا ہے کہ ”خود امام بخاری نے یہ باب باندھ کر اللہ تعالیٰ کا یہ قول نقل کیا ہے ”الطلاق مرتان فامساك بمعروف او تسریح باحسان“ اس آیت کو لکھ کر امام بخاری نے گویا خود واضح کر دیا ہے کہ تینوں طلاق سے مراد ایک وقت کی تینوں طلاق مراد نہیں ہو سکتی کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد ”الطلاق مرتان“ سے متضاد ہے کیونکہ ”اطلاق مرتان“ کا مفہوم بھی یہی ہے کہ دو بار میں طلاق دی جائے جو الگ الگ وقت کو مستلزم ہے جیسے مرة کا لفظ بتلا رہا ہے۔

قرآن وحدیث سے ماخوذ ہمارے ان اشاروں کی روشنی میں آپ بے سند تقلید جامد پر مشتمل خیالی باتوں کو کون سنے گا۔

اس اندھی تقلید سے اپنے دل و دماغ کو آزاد کر کے غور کیجئے کہ جب بقول آپ کے امام بخاری رحمہ اللہ نے ”باب من اجاز طلاق الثلاث“ قائم کر کے یہ واضح کر دیا ہے کہ اس باب کے تحت مذکور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہما کی حدیث ”ان رجلا طلق امرأته ثلاثا“ میں ”تینوں طلاق سے ایک وقت کی تینوں طلاقیں مراد نہیں ہو سکتیں بلکہ الگ الگ دی گئی تین طلاقیں مراد ہیں“ تو سوال پیدا ہوگا کہ تین الگ الگ وقتوں میں دی گئی تینوں طلاقوں کے جواز و وقوع میں جب کوئی اختلاف ہی نہیں تو پھر اس غیر اختلافی مسئلہ کے لئے امام بخاری رحمہ اللہ نے یہ باب کیوں قائم کیا اور یک بارگی تین طلاقوں کے اختلافی مسئلہ کے لئے انھوں نے کونسا باب قائم کیا ہے؟

پھر آپ کی سہولتِ غور و فکر کے لئے عرض ہے کہ امام بیہقیؒ نے اپنی مشہور جامع ترین کتاب ”السنن الکبریٰ“ میں ایک باب قائم کیا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں ”باب ما جاء فی امضاء الطلاق الثلاث و ان کن مجموعات“ اور اس باب کے تحت سب سے پہلے آیت کریمہ ”الطلاق مرتان فامساك بمعروف او تسریح باحسان“ کو ذکر کیا ہے اور اسی حدیث عائشہ کو جسے امام بخاری رحمہ اللہ نے باب من اجاز طلاق الثلاث

کے تحت ذکر کی ہے، دیگر حدیثوں کے ساتھ اسے بھی ذکر کیا ہے۔ (دیکھئے السنن الکبری، ج:۷، ص:۳۳۳-۳۳۴)

امام بیہقیؒ نے اس باب کے ذریعہ واضح کردیا کہ حضرت عائشہ صدیقہ کی حدیث ”ان رجلاً طلق امرأته ثلاثا“ میں تینوں طلاقوں سے مراد اکٹھا دی گئی تین طلاقیں مراد ہیں اور آیت پاک ”الطلاق مرتان“ اور حدیث کے مفہوم میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ جو آپ کو نظر آرہا ہے۔

گر نہ بیند بروز سپرہ چشم چشمۂ آفتاب راچہ گناہ

جناب من! آپ نے اپنے اس شاذ اور بے بنیاد موقف کی تائید میں صحیح مسلم کی یہ حدیث نقل کی ہے۔

عن ابن عباس قال: کانت الطلاق علی عهد رسول الله صلی الله علیه وسلم وابی بکر و سنتین من خلافة عمر طلاق الثلاث واحدة، فقال عمر بن الخطاب ان الناس قد استعجلوا فی امر کانت لهم اناة فلوامضیناه علیهم فامضاه علیهم.

اور اس کا ترجمہ ان الفاظ میں کیا ہے۔

ابن عباس کہتے ہیں کہ رسول اللہ...... کے زمانے میں اور ابوبکر صدیق کے زمانے میں اور حضرت عمر کے دور خلافت کے شروع دو سال تک تین طلاقیں ایک ہی مانی جاتی تھی۔ پھر حضرت عمر نے کہا لوگ اس کام میں جلدی کرنے لگے جس میں اللہ تعالیٰ نے مہلت دے رکھی تھی پس اگر ہم جاری کردیں تین کی تینوں تو انھوں نے تین طلاق پڑ جانے کا حکم جاری کردیا۔ (دیوبندی مقلدین کے سوالات اور جماعت حقہ کے جوابات، ص:۱۵)

اس سلسلے میں درج ذیل امور ملاحظہ کیجئے اور ان کا معقول جواب دیجئے۔

(الف) جواب میں حدیث مسلم کو غلط لکھا گیا ہے یعنی حدیث کی عبارت ”فلو امضیناه“ کو فعلو امصینا“ بنادیا گیا ہے جو کھلی تحریف ہے۔ یا نقل حدیث میں ناروا تساھل جو اپنے آپ کو اہل حدیث کہنے والوں کی شان سے بعید تر ہے۔

(ب) روایت کے جملہ "طلاق الثلاث واحدة" کا ترجمہ ''تین طلاقیں ایک ہی مانی جاتی تھیں'' کیا گیا ہے جو درست نہیں ہے۔ ''طلاق الثلاث واحدة'' ترکیب اضافی ہے جس کا لفظی ترجمہ ''تین طلاق دینا ایک تھا'' ہوگا جیسے کان غلام زید قائما کا ترجمہ زید کا غلام کھڑا تھا ہے نہ کہ زید کا غلام کھڑا مانا جاتا تھا۔

(ج) "فامضاه عليهم" کا ترجمہ ''تو انھوں نے تین طلاق پڑ جانے کا حکم جاری کر دیا'' بھی بالکل غلط ہے اور محض اپنے مذہب کی پاسداری میں جان بوجھ کر اس غلطی کا ارتکاب کیا گیا ہے۔ صحیح ترجمہ یوں ہے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے طلاقِ ثلاث کو نافذ کر دیا۔

(د) امام مسلم نے طاوس کی اس روایت کو تین سندوں سے ذکر کیا ہے آپ نے بالقصد صرف ایک روایت نقل کی تا کہ عام قارئین سے اصل حقیقت اوجھل رہے جو صریح علمی خیانت ہے اور جماعت حقہ کی شان سے بہت بعید ہے۔ امام مسلم کی ذکر کردہ یہ دونوں روایتیں ملاحظہ کیجئے۔

۱- عن ابن جريج اخبرنى ابن طاؤس عن ابيه ان ابا الصهباء قال لابن عباس اتعلم انما كانت الثلاث تجعل واحدة على عهد النبى صلى اللّٰه عليه وسلم وابى بكر و ثلاثا من امارة عمر فقال نعم. (صحیح مسلم، ج:۱، ص:۴۷۸)

طاؤس روایت کرتے ہیں کہ ابو الصہباء نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کہا کیا آپ جانتے ہیں کہ عہد نبوی اور عہد صدیقی میں اور حضرت عمر کی خلافت میں تین سال تک تین طلاق ایک بنائی جاتی تھی (یعنی طلاق دینے والے عام طور پر تین کے بجائے ایک دیتے تھے) تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہاں۔

۲- عن ابراهيم بن مسيرة عن طاؤس ان ابا الصهباء قال لابن عباس هات هناتك، الم يكن الطلاق الثلاث على عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم وابى بكر واحدة فقال قد كان ذلك فلما كان فى عهد عمر تتابع الناس فى الطلاق فاجازه عليهم" (ايضا)

طاؤس سے مروی ہے ابوالصہباء نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کہا اپنی عجیب و غریب باتوں میں سے کچھ سنایئے، کیا آنحضرت ......اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور میں تین طلاقیں ایک نہیں تھیں؟ تو ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا بیشک ایسا ہوتا تھا، پھر جب عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں لوگ پے در پے لگا تار طلاقیں دینے لگے تو عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے یہ طلاق ان پر نافذ کر دی۔

امام مسلم کی یہ روایتیں بتا رہی ہیں کہ "طلاق الثلاث واحدة" کی خبر دینے والے ابوالصہباء نامی کوئی صاحب ہیں۔ اور طاؤس ان کے اس قول کے ناقل ہیں اور طاؤس کے بیان کے مطابق ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کی تصدیق وتصویب فرمائی۔

(الف) اس لئے سب سے پہلے "ابو الصہباء" کی شخصیت متعین ہونی چاہئے کہ یہ کون اور کس درجہ کے ہیں۔ اور یہ بات انھیں کس ذریعہ سے معلوم ہوئی ہے۔ کیونکہ مجہول راوی کی خبر اصول محدثین کے لحاظ سے لائق التفات نہیں اور جب تک خود خبر ثابت نہ ہو جائے اس کی تصدیق وتصویب کیونکر معتبر ہوگی۔

(ب) پھر یہ بات بھی انتہائی توجہ کی طالب ہے کہ طاؤس تو ابن عباس سے یہ نقل کرتے ہیں اور خود ابن عباس رضی اللہ عنہ کا فتویٰ اس کے خلاف ہے۔ چنانچہ ابن عباس کے تلامذہ کی ایک بڑی جماعت جن میں سعید بن جبیر، عطا بن ابی رباح، مجاہد، عکرمہ، عمرو بن دینار، مالک بن الحویرث، محمد بن ایاس بن بکیر، معاویہ بن ابی عیاش الانصاری وغیرہ تمام مشہور وثقہ راوی حضرت عبداللہ بن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے تین طلاقوں کو تین ہی قرار دیا ہے (دیکھئے سنن الکبری، ج:۷، ص:۲۳۸) اور ابن رشد لکھتے ہیں کہ صرف طاؤس اس پوری جماعت کے خلاف روایت کرتے ہیں (بدایۃ المجتہد، ج:۲، ص:۶۱)

(ج) پھر خود طاؤس کی روایت بھی اس روایت کے برخلاف غیر مدخول بہا کی قید کے ساتھ ہے چنانچہ حافظ ماردینی نے لکھا ہے کہ "ذکر ابن ابی شیبة بسند رجاله ثقات من طاؤس وعطاء وجابر بن زید انهم قالوا اذا طلقها ثلاثاً قبل ان یدخل

بھا فھی واحدۃ" (الجوھر النقی علی البیھقی، ج:۷، ص:۲۳۱) جس سے اس بات کی تقویت ہوتی ہے کہ یہ زیر بحث روایت مطلق نہیں اور اس کو اطلاق پر محمول رکھنا وہم ہے۔ اسی بنا پر حافظ ابن عبد البر مالکی کہتے ہیں "ھذہ الروایۃ وھم وغلط" کہ مسلم کی یہ روایت وہم وغلط ہے۔ (الجوہر النقی، ج:۷، ص:۳۳۷) اور قاضی شوکانی بھی امام احمدؒ سے نقل کرتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا: کل اصحاب ابن عباس رووا عنہ خلاف ما قالہ طاؤس" (نیل الاوطار، ج:۶، ص:۲۴۷) لہٰذا یہ روایت شاذ ہے۔

(د) اور اگر یہ روایت بالفرض صحیح مان لی جائے جیسا کہ علامہ ابن القیم کا اصرار ہے اور انھیں کی اتباع میں قاضی شوکانی نے بھی نیل الاوطار میں اسے صحیح ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا ہے۔ تو کہا جائے گا کہ یہ روایت منسوخ ہے۔ چنانچہ امام بیہقی بسندہ امام شافعی سے نقل کرتے ہیں کہ بعید نہیں کہ یہ روایت جو حضرت ابن عباس سے روایت کی جاتی ہے منسوخ ہو ورنہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ آنحضرت ...... کا ایک حکم ان کو معلوم ہو اس کے باوجود اس کے خلاف فتویٰ دیں۔ (سنن الکبریٰ، ج:۷، ص:۳۳۸)

(ھ) اور حافظ حدیث امام الجرح والتعدیل ابوزرعہ رازی ابن عباس رضی اللہ عنہ کی مذکورہ روایت کا معنی یہ بیان کرتے ہیں معنی ھذا الحدیث عندی ان ما تطلقون انتم ثلاثا کانوا یطلقون واحدۃ فی زمن النبی صلی اللہ علیہ وسلم وابی بکر و عمر رضی اللہ عنھما (سنن الکبریٰ، ج:۷، ص: ۳۳۸) اس حدیث کا میرے نزدیک یہ مطلب ہے کہ جیسے تم اکٹھی تین طلاقیں دیتے ہو حضرات صحابہ وغیرہم آنحضرت ...... کے زمانہ اور حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کے زمانے میں صرف ایک ہی طلاق دیا کرتے تھے۔

حدیث کا یہ معنی امام نووی، امام خطابی، امیر یمانی اور علامہ زرقانی بھی ذکر کرتے ہیں (دیکھئے نووی شرح مسلم، ج:۱، ص:۴۷۸، معالم السنن، ج:۳، ص:۱۲۷، سبل السلام شرح بلوغ المرام، ج:۳، ص:۲۱۱، زرقانی شرح مؤطا، ج:۳، ص:۱۶۷)

روایت کے الفاظ بھی اسی معنی پر دلالت کرتے ہیں جیسا کہ ترجمہ میں اس کی جانب اشارہ موجود ہے۔

اس لئے جماعت حقہ کے مجیب کا اس موقع پر اس حدیث کا پیش کرنا بے سود ہے۔

آخر میں عرض ہے کہ اگر بار خاطر نہ ہو تو اس طالب علمانہ خلش کو بھی دور فرما دیجئے کہ قرأت خلف الامام کے مسئلہ میں صحیح مسلم کی حدیث بروایت ابوموسیٰ اشعری میں ”و اذا قرأ فانصتوا“ کی زیادتی کو سلیمان تیمی (جو بلا اختلاف ثقہ، ثبت، متقن اور حافظ ہیں) کا تفرد بتا کر پوری جماعت غیر مقلدین اسے رد کرنے پر مصر ہے جبکہ سلیمان تیمی اس زیادتی کے بیان کرنے میں متفرد بھی نہیں بلکہ ان کے چار متابع عمر بن عامر، ابن ابی عروبہ، معتمر اور ابوعبید موجود ہیں۔

اور حدیث زیر بحث کی روایت میں طاؤس بالکل اکیلے ہیں پھر بھی آپ حضرات کو اس روایت کے صحیح ہونے پر صرف اصرار ہی نہیں بلکہ اپنے دعویٰ پر اسے قاطع اور ناطق دلیل تصور کرتے ہیں، حدیث کے رد و قبول میں آخر یہ دوہرا معیار کیوں، اور کیا آج کے نام نہاد اہل حدیث کا وطیرہ یہی ہے؟ ”بینوا و توجروا“

مسئلہ (٦) رفع یدین کا حکم

جمعیة اہل حدیث کی طرف سے دسویں سوال کا جواب:

معترض نے عبداللہ بن عمرؓ کی حدیثوں کا تذکرہ کر کے جو تاثر دینے کی کوشش کی ہے وہ بالکل لغو ہے یا تو اس نے ان حدیثوں کو ٹھیک سے پڑھا نہیں ہے یا تجاہل عارفانہ کیا یا اعتراض برائے اعتراض کیا ہے اور اس طرح سے مکڑ جال پھیلانے کی کوشش کی ہے کہ نادانستگی میں اس جال میں پھنس جائیں اور یہ تسلیم کرلیں کہ صحیح بخاری کی روایت ضعیف ہیں اور ناقابل عمل ہیں۔ لیکن ہم اس قسم کے جالوں کو توڑنا بھی جانتے ہیں اور سنت رسول اللہ...... کے خلاف آواز بلند کرنے والوں کو دندان شکن جواب دینے کی ہمت بھی رکھتے ہیں۔ حدیث نقل کرنے سے پہلے یہ وضاحت کر دوں کہ نبی اکرم...... وصحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین و تابعین رحمہم اللہ کی کثیر تعداد تکبیر تحریمہ کے ساتھ رکوع میں جاتے وقت اور پھر رکوع سے اٹھتے وقت رفع یدین کے قائل ہیں نیز اگر چار رکعت والی نماز ہے تو

تشہد اولیٰ کے بعد تیسری رکعت کے لئے کھڑے ہوتے وقت تکبیر کے ساتھ رفع یدین سنت ہے یعنی اگر دو رکعت والی نماز ہے تو پہلی رکعت میں تکبیر اولیٰ کے علاوہ رکوع میں جاتے وقت پھر رکوع سے اٹھتے وقت رفع یدین ہے سجدہ میں جاتے وقت یا دونوں سجدہ کے درمیان رفع یدین نہیں ہے اور نہ ہی دوسری رکعت کے لئے کھڑے ہوتے وقت رفع یدین ہے دوسری رکعت میں پھر رکوع اور رکوع سے اٹھتے وقت رفع یدین ہے۔ اگر دو رکعت والی نماز ہے تو تشہد کے بعد سلام پھیر دیا جائے گا لیکن اگر چار رکعت والی نماز ہے تو تشہد اولیٰ کے بعد تیسری رکعت کے لئے کھڑے ہوتے وقت تکبیر کے ساتھ رفع یدین بھی کیا جائے گا بقیہ رکعتیں بھی ویسے ہی ادا کی جائیگی۔ عبداللہ بن عمرؓ کی روایت کا مطلب بھی یہی ہے لیکن معترض نے بلا وجہ پیچیدگی پیدا کر کے عوام کو گمراہ کرنے کی کوشش کی ہے چنانچہ امام بخاریؒ نے الگ الگ باب باندھ کر یہی ثابت کیا ہے "باب رفع یدین اذا کبّر و اذا رکع و اذا رفع" یعنی تکبیر تحریمہ رکوع اور رکوع سے اٹھتے وقت رفع یدین کرنے کا باب۔

حدیث: عن عبد الله بن عمر قال رأیتُ رسول الله ﷺ اذا قام فی الصلوٰۃ رفع یدیه حتی تکونا حذ و منکبیه و کان یفعل ذالك حین یُکبِّر للرکوعِ ویفعلُ ذالك اذا رفع رأسهٗ من الرکوع ویقول سمع الله لمن حمده ولم یفعل ذالك فی السجود (صحیح بخاری پ۳ صفحہ۱۰۲)

عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول خدا...... کو دیکھا کہ اپنے دونوں ہاتھ کندھوں کے مونڈھوں تک اٹھاتے تھے پھر آپ...... رکوع میں جاتے وقت بھی ایسا ہی کرتے تھے اور جب سر اٹھاتے تھے تب بھی ایسا ہی کرتے تھے اور سمع اللہ لمن حمدہ کہتے تھے لیکن سجدہ میں ایسا نہیں کرتے تھے۔ یہاں پر سجدہ میں رفع یدین کی نفی ہے لیکن دو رکعت کے بعد تیسری رکعت کے لئے کھڑے ہوتے وقت رفع یدین کا ثبوت آگے ملاحظہ فرمائیں اور پھر دو رکعت والی نماز تو ایسے ہی پڑھی جائے گی لیکن اگر چار رکعت والی نماز ہے تو اس باب کے تحت ادا کی جائے گی "بابُ رفع الیدین اذا قام من رکعتین" دو

رکعت کے بعد کھڑے ہوتے وقت رفع یدین کرنے کا باب۔

حدیث: عن نافع ان ابن عمر کان اذا دخل فی الصلوٰۃ کبر ورفع یدیه واذا رکع رفع یدیه واذا قال سمع الله لمن حمده رفع یدیه واذا قام من الرکعتین رفع یدیه، ورفع ذالك ابن عمر الی النبی ﷺ و رواه حماد بن سلمة عن ایوب عن نافع عن ابن عمر عن النبی ﷺ (صحیح بخاری جلداول جز ثالث صفحہ۱۰۲)

ترجمہ: نافع روایت کرتے ہیں عبداللہ بن عمرؓ جب نماز میں داخل ہوتے تو تکبیر کہتے اور دونوں ہاتھ اٹھاتے اور جب رکوع کرتے تو دونوں ہاتھ اٹھاتے اور سمع اللہ لمن حمدہ کہتے تو دونوں ہاتھ اٹھاتے اور جب دو رکعت سے (تیسری کیلئے) کھڑے ہوتے تو رفع یدین کرتے۔

ظاہر ہے کہ جب دو رکعت کے بعد تیسری کے لئے قیام کیا جائے گا تو یا تو تین رکعت والی نماز ہوگی جیسے مغرب کی نماز یا چار رکعت والی نماز ہوگی۔ لہٰذا ان حدیثوں میں نہ تو تعارض ہے اور نہ ضعیف ہے۔ دونوں حدیثیں اپنی اپنی حالت میں قابل قبول ہیں اور اسی کے اہلحدیث قائل ہیں۔

نبی اکرم ...... تاحیات اسی طرح رفع یدین کے ساتھ نماز ادا کرتے رہے۔ عاشق سنت عبداللہ بن عمر فاروقؓ نے "کان یرفع یدیه" فرما کر اور بموجب روایت بیہقی آخر میں "حتیٰ لقی اللّٰه" لا کر یہ ثابت کر دیا کہ رسول اللہ...... اپنی عمر کی آخری نماز تک رفع یدین کرتے رہے۔

اس مسئلہ میں عبداللہ ابن عمرؓ تنہا نہیں ہیں بلکہ جم غفیر اس مسئلہ کی قائل ہے مختصراً صرف ترمذی کی یہ حدیث نقل ہے: "باب رفع یدین عند الرکوع" حدثنا فتبة و ابن ابی عمر قالا ثنا سفیان بن عیینة عن الزهری عن سالم عن ابیه قال رأیتُ رسول الله ﷺ اذا افتتح الصلوٰۃ یرفع یدیه حتیٰ یحاذی منکبیه واذا رکع واذا رفع رأسه من الرکوع وزاد ابن عمر فی حدیثه و کان لا یرفع بین السجدتین قال ابو عیسیٰ ثنا الفضل بن الصّبّاح البغدادی ثنا سفیان ابن عیینة ثنا الزهری

بهذا الاسناد نحو حديث ابن ابى عمر قال وفى الباب عن عمر و على و وائل بن حجر و مالك بن حويرث وانس وابى هريرة وابى حميد و ابى اُسيد و سهل بن سعد و محمد بن مسلمة وابى قتادة وابى موسى الاشعرى وجابر و عمر الليثى. قال ابوعيسىٰ حديث ابن عمر حديث حسن صحيح وبهذا يقول بعض اهل العلم من اصحاب النبى ﷺ منهم ابن عمر وجابر بن عبدالله وابوهريرة وانس وابن عباس وعبدالله بن الزبير وغيرهم" **یہ اسماء گرامی ان لوگوں کے ہیں جو رفع یدین کے قائل ہیں اور وہ تابعین جو اس مسئلہ کے قائل ہیں ان کے اسماء گرامی یہ ہیں۔** "ومن التابعين الحسن البصرى وعطاء و طاؤس و مجاهد ونافع وسالم بن عبدالله و سعيد بن جبير وغيرهم وبه بقول عبدالله بن المبارك والشافعى واحمد واسحٰق" **(ترمذی ابواب الصلوٰۃ باب رفع یدین عندالرکوع صفحہ نمبر ۳۵ جلد اول مطبوعہ کتب خانہ رشیدیہ دہلی) رفع یدین کے قائل سلف صالحین کی فہرست اس سے بھی زیادہ ہے لیکن بخوف طوالت یہاں ان کا تذکرہ ممکن نہیں ہے۔**

معترض نے "جز رفع یدین" کے حوالہ سے جو لکھا ہے نہ تو اس میں عربی متن ہے اور نہ ہی صفحہ نمبر ہے جس غیر مقلد کا ترجمہ نقل کیا ہے اس کا نام اور اس کتاب کا نام جس میں اس نے ترجمہ کیا ہوگا اس کا بھی معترض نے حوالہ نہیں دیا ہے۔ یہاں پر بھی معترض نے فریب سے کام لیا ہے۔

بحمداللہ ہم صحیح حدیثوں کو نہیں چھوڑتے اور صحیح حدیث کے مطابق ہی دو رکعت کے بعد تیسری رکعت کے لئے کھڑے ہوتے وقت رفع یدین کرتے ہیں، یہ صرف مقلدوں کا شیوہ ہے جن کو دن کا سورج بھی نظر نہیں آتا۔

بحث ونظر

اس جواب میں جن باتوں کا انکشاف کیا گیا ہے اس کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

(الف) تکبیر تحریمہ، رکوع میں جاتے وقت، رکوع سے اٹھتے وقت، تشہد اولیٰ کے

بعد تیسری رکعت کے لئے کھڑے ہوتے وقت تکبیر کے ساتھ رفع یدین سنت ہے۔

(ب) سجدہ میں جاتے وقت، دونوں سجدہ کے درمیان، دوسری رکعت کے لئے کھڑے ہوتے وقت رفع یدین نہیں ہے۔

(ج) نبی اکرم ...... تا حیات اسی طرح رفع یدین کرتے رہے، عاشق سنت عبداللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما نے "كان يرفع يديه" فرما کر اور بموجب روایت بیہقی آخر میں "حتى لقى الله" لا کر یہ ثابت کر دیا کہ رسول اللہ...... اپنی عمر کی آخری نماز تک رفع یدین کرتے رہے۔

(د) امام بخاری کی کتاب جز رفع یدین کی اصل عبارت بحوالہ صفحہ اور غیر مقلد مترجم کے نام اور اس کی کتاب کا نام ذکر نہ کر کے معترض نے اس موقع پر بھی فریب سے کام لیا ہے۔

(ھ) اور آخر میں خودستائی کرتے ہوئے یہ اعلان کیا گیا ہے کہ ہم بحمد اللہ صحیح حدیثوں کو نہیں چھوڑتے۔ علاوہ ازیں بحوالہ سنن ترمذی مردم شماری کے ذریعہ اپنے مسلک کی فوقیت جتاتے ہوئے رفع یدین نہ کرنے والوں پر رعب جمانے کی بھی ناکام کوشش کی گئی ہے۔

علی الترتیب جماعت حقہ کے ان انکشافات بلکہ صحیح لفظوں میں مغالطوں کی حقیقت ملاحظہ فرمائیے:

(الف) دعویٰ ہے کہ تحریمہ کے علاوہ رکوع میں جانے، رکوع سے اٹھنے اور قعدہ اولیٰ کے بعد تیسری رکعت کے لئے کھڑے ہونے کے وقت بھی رفع یدین سنت ہے۔ اور اس دعویٰ کی دلیل میں صحیح بخاری کے باب رفع اليدين اذا كبر واذا ركع واذا رفع کے تحت مذکور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت قال رأيت رسول الله صلى الله عليه وسلم رفع يديه حتى تكون حذو منكبيه" الحديث اور باب رفع اليدين اذا قام من ركعتين کے ذیل میں مروی حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت عن نافع عن ابن عمر كان اذا دخل فى الصلاة كبر و رفع يديه

الحدیث کو پیش کیا گیا ہے۔

اس سلسلے میں عرض ہے کہ مذکورہ ان دونوں حدیثوں سے رفع یدین کے مسنون ہونے کا ثبوت اسی وقت ہوسکتا ہے جب ان حدیثوں سے یہ بھی ثابت ہو کہ ان جگہوں میں رفع یدین آنحضرت ...... ہمیشہ یا اکثر کرتے تھے اور آخر عمر تک آپ کا یہ عمل برقرار رہا ہے، کیونکہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا کسی کام کو محض کر لینا اس کے مسنون ہونے کی دلیل نہیں ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری میں ہے توضاء رسول الله صلی الله علیه وسلم مرة لم یزد علی هذا“ رسول خدا ...... نے وضو فرمایا اور اعضاء وضو کو صرف ایک ایک بار دھلا۔ اسی طرح صحیح بخاری کی ایک روایت میں ہے ”ان النبی صلی الله علیه وسلم توضاء مرتین مرتین“ یعنی آنحضرت ...... نے وضو فرمایا اور اعضاء وضو کو دو دو بار دھلا، صحیح مسلم میں حضرت انس سے روایت ہے ”کان النبی صلی الله علیه وسلم یطوف علی نسائه بغسل واحد“ یعنی اللہ کے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنی سب بیویوں کے پاس گئے اور غسل آخر میں صرف ایک بار کیا۔ اسی طرح رسول اللہ ...... کا ایک موقع پر کھڑے ہو کر پیشاب کرنا، روزے کی حالت میں ازواج مطہرات کو بوسہ لینا، نماز پڑھنے کی حالت میں حجرہ کے دروازہ کا کھولنا، بچی کو کندھوں پر اٹھا کر نماز پڑھنا وغیرہ بہت سے افعال صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن اربعہ، مسند امام احمد وغیرہ کتب حدیث میں صحیح سندوں سے ثابت ہیں۔ مگر یہ اعمال کسی کے نزدیک بھی مسنون تو خیر مستحب اور اولیٰ بھی نہیں ہیں۔

اس لئے جب تک اللہ کے رسول ...... سے ان مقامات میں رفع یدین کا دوام اور آخر عمر تک اس پر برقرار رہنا ثابت نہ کر دیا جائے اس کا مسنون ہونا ثابت نہیں ہوسکتا۔ اور آپ دیکھ رہے ہیں کہ جماعت حقہ کی جانب سے پیش کی گئی یہ دونوں حدیثیں دوام و استمرار کے بیان سے خاموش ہیں۔ لہٰذا مذکورہ دعویٰ پر یہ دلیل تام نہیں، اور مجیب لبیب سے ہمارا مطالبہ ہے کہ وہ مغالطہ آفرینی کے بجائے اپنے دعویٰ کی دلیل تام پیش کریں۔ ”ھاتو برھانکم ان کنتم صادقین“

(ب) جواب کے اس جزء میں لکھتے ہیں سجدہ میں جاتے وقت، دونوں سجدہ کے

درمیان رفع یدین نہیں ہے اور نہ ہی دوسری رکعت کیلئے کھڑے ہوتے وقت رفع یدین ہے۔

ان جگہوں میں رفع یدین کیوں نہیں ہے۔ اس کی کوئی دلیل ذکر نہیں کی گئی ہے۔ اگر جماعت حقہ کے نزدیک رکوع میں جانے رکوع سے اٹھنے اور تیسری رکعت کے لئے اٹھنے کے وقت رفع یدین محض اس لئے سنت ہے کہ ان مقامات میں آنحضرت ...... سے رفع یدین کرنا ثابت ہے۔ تو عرض ہے کہ اسی طرح سجدہ میں جانے، دونوں سجدوں کے درمیان وغیرہ مقامات میں بھی نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم سے رفع یدین ثابت ہے۔ لہٰذا ان جگہوں میں رفع یدین سے انکار حدیث نبوی سے کھلا معارضہ و مقابلہ ہے جو بالخصوص عمل بالحدیث کا ڈھنڈورا پیٹنے والوں کیلئے لمحۂ فکریہ ہے۔ ذیل میں ان احادیث کو ملاحظہ کیجئے جن سے ان مذکورہ جگہوں میں اللہ کے رسول ...... کا رفع یدین کرنا ثابت ہوتا ہے۔

(۱) اخبرنا محمد بن المثنیٰ حدثنا ابن ابی عدی عن شعبة عن قتادة عن نصر بن عاصم عن مالك بن الحويرث (رضی الله عنه) انه رأى النبی صلى الله عليه وسلم رفع يديه فی صلاته واذا ركع واذا رفع راسه من الركوع واذا سجد واذا رفع راسه من السجود حتیٰ يحاذی بهما فروع اذنيه" (سنن نسائی، ج:۱، ص: ۱۶۵)

ترجمہ: مالک بن الحویرث رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے رسول اللہ...... کو دیکھا کہ آپؐ نے رفع یدین کیا اپنی نماز (کی ابتداء) میں اور جب رکوع کیا اور جب رکوع سے سر کو اٹھایا اور جب سجدہ کیا اور جب سجدوں سے سر اٹھایا یہاں تک کہ ہاتھوں کو کانوں کے اوپری حصہ کے برابر کر دیا۔

(۲) اخبرنا محمد بن المثنى حدثنا عبدالاعلى قال حدثنا سعيد (هو ابن ابی عروبة) عن قتادة عن نصر بن عاصم عن مالك بن الحويرث انه رأى النبی صلى الله عليه وسلم رفع يديه فذكر مثله. (نسائی، ج:۱، ص:۱۶۵)

یعنی اس حدیث کے الفاظ اور معانی پہلی حدیث کی طرح ہیں۔

(نوٹ) حضرات محدثین کے نزدیک سند کے تعدد سے حدیث میں تعدد ہو جاتا

ہے اسی اعتبار سے اس پر ''۲'' کا ہندسہ لکھا گیا ہے۔ ''فافہم''

حافظ ابن حجر عسقلانی اس دوسری حدیث کے بارے میں لکھتے ہیں: ''اصح ما وقفت علیه من الاحادیث فی الرفع فی السجود ماروا ہ النسائی من روایة سعید بن ابی عروبة عن قتادة عن نصر بن عاصم عن مالك بن الحویرث ... ولم ینفرد به سعید فقد تابعه همّام عن قتادة عند ابی عوانة فی صحیحه'' (فتح الباری، ج:۲،ص:۲۸۴)

(۳) حدثنا عبید الله بن عمر بن میسرة ثنا عبدالوارث بن سعید حدثنا محمد بن جُحادة حدثنی عبد الجبار بن وائل بن حجر قال: کنت غلاما لا اعقل صلاة ربی فحدثنی وائل بن علقمة عن ابی وائل بن حجر قال: صلیت مع رسول الله صلی الله علیه وسلم فکان اذ اکبر رفع یدیه ثم التحف ثم اخذ شماله بیمینه وادخل یدیه فی ثوبه قال فاذا اراد ان یرکع اخرج یدیه ثم رفعهما واذا اراد ان یرفع راسه من الرکوع رفع یدیه ثم سجد ووضع جبهته بین کفیه واذا رفع راسه من السجود ایضا رفع یدیه حتی فرغ من صلاته، قال محمد فذکرت ذلك للحسن بن ابی الحسن فقال هی صلاة رسول الله صلی الله علیه وسلم فعله من فعله وترکه من ترکه، قال ابوداؤد روی هذا الحدیث هشام عن ابن جحادة لم یذکر الرفع مع الرفع من السجود'' (سنن ابی داؤد، ج:۱،ص:۱۰۵)

ترجمہ: وائل بن حجر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول خدا...... کی معیت میں نماز پڑھی تو نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جب تکبیر (یعنی تحریمہ کی) کہی تو ہاتھوں کو اٹھایا پھر چادر لپیٹ لی بعد ازاں اپنے بائیں ہاتھ کو داہنے ہاتھ سے پکڑا اور ہاتھوں کو اپنے کپڑے میں داخل کرلیا۔ وائلؓ نے کہا پھر جب آپ ؐ نے رکوع کرنے کا ارادہ فرمایا تو ہاتھوں کو نکالا اور رفع یدین کیا اور جب رکوع سے سر اٹھانے کا ارادہ فرمایا تو رفع یدین کیا پھر سجدہ کیا اور اپنی پیشانی کو دونوں ہتھیلیوں کے درمیان میں رکھا اور جب سجدوں سے سر اٹھایا تب بھی رفع یدین کیا۔ حتی کہ آپ اپنی نماز سے فارغ ہوگئے۔

محمد بن جحادہ راوئ حدیث نے بیان کیا کہ یہ حدیث میں نے حسن بصریؒ سے بیان کی تو انھوں نے (اس حدیث کی تصویب کرتے ہوئے کہا) یہ رسول اللہ...... کی نماز ہے اس طریقہ کے مطابق بعض لوگوں نے نماز پڑھی اور بعض لوگوں نے اس طریقہ پر عمل نہیں کیا۔

امام ابوداؤد کہتے ہیں کہ اس حدیث کو ہشام بن یحییٰ نے محمد بن جحادہ سے روایت کیا اور سجدوں سے اٹھنے کے وقت رفع یدین کا ذکر نہیں کیا۔

تنبیہ: امام ابوداؤد کے اس کلام سے عبدالوارث بن سعید کی روایت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا کیونکہ عبدالوارث ثقہ وثبت ہیں بلکہ حفظ واتقان میں ہشام بن یحییٰ سے فائق ہیں اور ثقہ کی زیادتی محدثین کے نزدیک مقبول ہے چنانچہ امام بخاری اپنے رسالہ جزء رفع الیدین میں لکھتے ہیں ”وانما زاد بعضهم على بعض والزيادة مقبولة من اهل العلم“ (عمدۃ القاری، ج:۵، ص:۲۷۷)

(۴) ”حدثنا ابو محمد بن صاعد، ثنا بندار فيما سألناه عنه ثنا عبدالوهاب الثقفى ثنا حميد (هو الطويل) عن انس قال: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يرفع يديه اذا دخل فى الصلاة واذا ركع، واذا رفع راسه من الركوع واذا سجد“ (قال الدار قطنى) لم يروه عن حميد مرفوعا غير عبدالوهاب والصواب من فعل انس. (سنن الدارقطنی، ج:۱، ص:۲۹۰)

(قلت اخرجه ابن ماجه من طريق محمد بن بشار حدثنا عبدالوهاب ثنا حميد عن انس وقال الشيخ ابن دقيق العيد فى الامام ورجاله رجال الصحيحين)

(۵) وعن انس ان النبى صلى الله عليه وسلم كان يرفع فى الركوع والسجود“ رواه ابويعلى ورجاله رجال الصحيحين“ (مجمع الزوائد، ج:۲، ص:۱۰۱)

(۶) اور خود حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے بھی سجدہ سے سر اٹھانے کے وقت رفع یدین کرنا ثابت ہے۔ چنانچہ امام بخاریؒ نے رسالہ ”جزء رفع الیدین“ میں روایت کیا ہے:

”حدثنا ابوبكر بن ابى اويس عن سليمان بن بلال عن العلاء انه سمع

سالما بن عبدالله ان اباه كان اذا رفع راسه من السجود واذا اراد ان يقوم رفع يديه" (جزءرفع الیدین،ص:۱۰)

العلاء سے روایت ہے کہ انھوں نے سالم بن عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم سے سنا کہ ان کے والد جب سجدوں سے سر اٹھاتے اور جب کھڑے ہونے کا ارادہ کرتے تو رفع یدین کرتے۔

اسی طرح حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما سے بھی ثابت ہے کہ انھوں نے سجدہ کرنے اور سجدہ سے اٹھنے کے وقت رفع یدین کیا۔ چنانچہ امام ابوداؤد روایت کرتے ہیں:

(۷) حدثنا قتيبة بن سعيد نا ابن لَهِيعَة عن ابی هبيرة عن ميمون المكی انه رأى عبدالله بن الزبير وصلى بهم يشير بكفيه حين يقوم وحين يركع وحين يسجد وحين ينهض للقيام فيقوم فيشير بيديه فانطلقت الى ابن عباس فقلت انی رأيت ابن الزبير صلى صلاة لم ار احدا يصلها فوصفت له هذه الاشياء فقال: ان احببت ان تنظر الى صلاة الرسول صلى الله عليه وسلم فاقتد بصلاة عبدالله بن الزبير" (سنن ابی داؤد،ج:۱،ص:۱۰۸)

میمون مکی بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کو دیکھا لوگوں کو نماز پڑھاتے ہوئے ہاتھوں سے اشارہ کرتے یعنی رفع یدین کیا جب کھڑے ہوے اور جب رکوع کیا اور جب سجدہ کیا اور جب اٹھے قیام کے لئے تو کھڑے ہوئے اور رفع یدین کیا، تو میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی خدمت میں آیا اور عرض کیا کہ میں نے عبداللہ بن زبیر کو جس طرح نماز پڑھتے ہوئے دیکھا کسی اور کو اس طرح نماز پڑھتے نہیں دیکھا اور ان کے رفع یدین کرنے کی تفصیل بیان کی تو حضرت عبداللہ بن عباس نے کہا کہ اگر تمہیں پسند ہے کہ آنحضرت...... کی نماز کو دیکھو تو عبداللہ بن زبیر کی اقتدا کرو۔

ایک ضروری تنبیہ: ابن لہیعہ کا حافظہ ان کی کتابوں کے جل جانے کے بعد خراب ہوگیا تھا اس لئے ان کی روایتیں محدثین کے یہاں ضعیف مانی جاتی ہیں، لیکن جن لوگوں نے حافظہ کی کمزوری سے پہلے ان سے حدیث سنی ہے وہ روایتیں صحیح مانی جاتی ہیں۔ چنانچہ

صاحب عون المعبود علامہ خزرجی کی خلاصۃ التذہیب کے حوالہ سے لکھا ہے کہ "قال احمد و من كتب عنه قديما فسماعه صحيح" (عون المعبود شرح ابی داؤد، ج:۲، ص:۴۳۶)

اور محقق شعیب ارناؤط لکھتے ہیں "رواية العبادلة عبدالله بن وهب و عبدالله بن المبارك و عبدالله بن يزيد المقرى عنه (اى ابن لهيعه) صححه احمد، و ابوحفص الفلاس، وعبدالغنى بن سعيد الازدى وغيرهم لان روايتهم قبل احتراق كتب ابن لهيعة وزاد ابن حبان فى العبادلة عبدالله بن مسلمة القعنبى ... ورواية قتيبة بن سعيد بمنزلة هؤلاء فقد روى الآجُرّى عن ابى داؤد قوله سمعت قتيبة يقول كنا لا نكتب حديث ابن لهيعة الا من كتب اخيه او كتب ابن وهب الا ما كان من حديث الاعرج" (العواصم من القواصم، ج:۶، ص:۱۸۰ تعلیقا)

لہٰذا قتیبہ بن سعید بروایت ابن لہیعہ کی اس حدیث کو ابن لہیعۃ کی عام روایتوں کی طرح ضعیف نہ سمجھا جائے۔

ان مذکورہ احادیث سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ آنحضرت ...... نے سجدہ میں جانے اور سجدہ سے سر اٹھانے کے وقت رفع یدین کیا۔ اور جماعت حقہ ان احادیث کے خلاف یہ باور کرا رہی ہے کہ ان مقامات میں رفع یدین نہیں ہے۔ جب کہ اس کا یہ دعوی ہے کہ "ہم صحیح حدیثوں کو نہیں چھوڑتے" تو آخر ان قابل حجت احادیث کے ترک پر یہ اصرار کیوں ہے؟ دوسروں کو ترک حدیث کا خواہ مخواہ طعنہ دینے والوں کو اپنے گھر کی خبر لینی چاہئے۔

اپنے گیسو تو ذرا دیکھ کہاں تک پہنچے

(ج) جواب کا یہ تیسرا جزء تو بیخبری اور خودفریبی کا شاہکار ہے۔ تفصیل ملاحظہ کیجئے اور عمل بالحدیث کے ان دعویداروں کی کج فہمی کا اندازہ لگائیے۔

گذشتہ سطور میں مدلل طور پر واضح کیا جا چکا ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی یہ حدیث جو عام طور پر رفع یدین کے ثبوت میں پیش کی جاتی ہے رفع یدین کے سنت ہونے پر اسی وقت دلیل بن سکتی ہے جب یہ بھی ثابت ہو جائے کہ مذکورہ مقامات میں نبی کریم ...... آخری حیات تک رفع یدین کرتے رہے چنانچہ دوام و استمرار کو بزعم خویش ثابت بتانے کے

لئے مجیب لبیب لکھتے ہیں:

عاشق سنت عبداللہ بن عمر نے "کان یرفع یدیه" فرما کر اور بموجب روایت بیہقی آخر میں "حتی لقی اللّٰه" لا کر یہ ثابت کر دیا کہ رسول اللہ...... اپنی عمر کی آخری نماز تک رفع یدین کرتے رہے۔ موصوف نے اس مزعومہ دوام واستمرار پر دو دلیلیں قائم کی ہیں: (۱) حدیث ابن عمر رضی اللہ عنہما میں "کان یرفع یدیه" کا جملہ استمرار اور ہمیشگی پر دلالت کر رہا ہے۔ (۲) امام بیہقی کی روایت کے مطابق حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے حدیث کے آخر میں "حتی لقی اللّٰه" کی صراحت فرما دی ہے جس سے ثابت ہو گیا کہ آنحضور...... حیات کے آخر لمحے تک رفع یدین کرتے رہے۔

جماعت حقہ نے اپنی ظاہر پسندی کی بناء پر حدیث ابن عمر رضی اللہ عنہ میں "کان" کے لفظ کو دیکھ کر اسے اپنی تشنہ دلیل کے لئے آب حیات سمجھ لیا۔ اور بغیر سوچے سمجھے اس سے دوام واستمرار پر استدلال کر بیٹھے۔ اس بیجا استدلال پر ممکن ہے کہ وہ اپنے ناواقف حاشیہ نشینوں سے داد تحسین بھی حاصل کر لیں ورنہ علم وتحقیق کی دنیا میں اس استدلال کی حیثیت پر کاہ کے برابر بھی نہیں ہے۔ کیونکہ لفظ کان اپنی وضع کے لحاظ سے فعل ماضی ہے جو فعل کے یکبارگی واقع ہونے کو بتاتا ہے دوام واستمرار اس کے اقتضاء سے خارج ہے۔

چنانچہ صحیح مسلم کی حدیث عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا "کان یصلی ثلث عشرة رکعة، یصلی ثمان رکعة ثم یؤتر ثم یصلی رکعتین وهو جالس" الحدیث کے تحت مشہور محدث وشارح حدیث امام نووی لکھتے ہیں:

ولا تغتر بقولها "کان یصلی" فان المختار الذی علیه الاکثرون والمحققون من الاصولیین ان لفظة "کان" لا یلزم منهما الدوام ولا التکرار وانما هی فعل ماضی یدل علی وقوعه مرة، فان دل دلیل علی التکرار عمل به والا لا تقتضیه بوضعها" (صحیح مسلم مع شرح النووی، ج:۱، ص:۲۵۴)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے الفاظ "کان یصلی" سے دھوکہ نہ کھایا جائے کیونکہ مذہب مختار جس پر اکثر علماء بالخصوص محققین اہل اصول ہیں یہی ہے کہ لفظ کان سے

دوام وتکرار لازم نہیں ہوتا یہ تو بس فعل ماضی ہے جو فعل کے یکبارگی واقع ہونے پر دلالت کرتا ہے، ہاں اگر کوئی خارجی دلیل تکرار کی پائی جائے تو اس وقت اس خارجی دلیل کے مطابق عمل کیا جائے گا ورنہ یہ لفظ اپنی وضع سے تکرار و دوام کو نہیں چاہتا۔

امام نوویؒ کے اس انتباہ کے باوجود نام نہاد جماعت حقہ ''کان'' کے ظاہر سے مبتلائے فریب ہوگئی جس پر بجز اس کے ہم کیا کہہ سکتے ہیں کہ

''حضرتِ ناصح نہیں سمجھے تو سمجھانے لگے''

بعد ازاں جماعت حقہ نے دوام واستمرار کی دوسری دلیل انتہائی مبہم الفاظ میں یوں بیان کی ہے ''اور بموجب روایت بیہقی آخر میں ''حتی لقی اللہ'' لاکرالخ''، جس میں نہ تو یہ بتایا گیا کہ امام بیہقی نے یہ روایت اپنی کس کتاب میں ذکر کی ہے۔ اور نہ ہی روایت کی سند اور اس کا مکمل متن نقل کیا گیا۔ اگر جماعت حقہ کو اس حدیث سے متعلق یہ امور معلوم نہیں اور اس نے اپنے کسی پیش رو کی عبارت بے جانے بوجھے نقل کر دی ہے تو یہ جسارت بیجا ہے اس کے لئے مناسب یہ تھا کہ امر الٰہی ''فاسئلوا اهل الذكر ان كنتم لا تعلمون'' کی تعمیل میں کسی دیو بندی مقلد عالم ہی سے معلوم کر لیتے تا کہ موقع بیان میں ابہام کی غلطی سے محفوظ رہتے۔ اور اگر اس نے حدیث سے متعلق تفصیلات سے پوری واقفیت رکھتے ہوئے مبہم الفاظ میں یہ استدلال پیش کیا ہے تو یہ ایک ایسا جرم عظیم ہے جس کی پاداش کے تصور سے روحِ مومن کانپ جاتی ہے۔

ان كنت لا تدرى فتلك مصيبة
وان كنت تدرى فالمصيبة اعظم

لہٰذا اس انداز مبہم کی بناء پر سوچنے والا سوچ سکتا ہے ''کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے'' اس لئے ذیل میں پوری حدیث مع سند درج کی جارہی ہے تا کہ طالب حقیقت جان لیں کہ اس اجمال وابہام کے پردے میں کس چیز کو چھپانے کی کوشش کی گئی ہے۔

''رواه (البيهقى) عن ابى عبدالله الحافظ عن جعفر بن محمد بن نصر عن عبدالرحمن بن قريش بن خزيمة الهروى عن عبد الله بن احمد الدمجى

عن الحسن ابن عبدالله بن حمدان الرقی ثنا عصمة بن محمد الانصاری ثنا موسیٰ بن عقبة عن نافع عن ابن عمر ان رسول اللّٰه صلی الله علیه وسلم کان اذا افتتح الصلاة رفع یدیه واذا رکع واذا رفع راسه من الرکوع وکان لا یفعل ذلك فی السجود، فما زالت تلك صلاته حتی لقی اللّٰه تعالیٰ" (نصب الرایة، ج:۱، ص: ۲۱۰-۲۰۹)

یعنی حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ آنحضرت...... نے جب نماز شروع فرمائی تو رفع یدین کیا اور جب رکوع کیا اور جب رکوع سے سر اٹھایا (تب بھی رفع یدین کیا) اور سجدوں میں رفع یدین نہیں کرتے تھے آنحضور...... کی نماز اسی طریقہ پر ہمیشہ رہی یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کے حضور پہنچ گئے۔

ضروری وضاحت: اس حدیث کی سند کے ایک راوی عبدالرحمٰن بن قریش ہروی کے بارے میں امام ذہبی لکھتے ہیں: "اتّهمه السلیمان بوضع الحدیث" (میزان الاعتدال، ج:۲، ص:۵۸۲) اور امام خطیب بغدادی کا بیان ہے "فی حدیثه غرائب و افراد ولم اسمع فیه الا خیرا" (تاریخ الخطیب، ج:۱۰، ص:۲۸۳)

ایک دوسرے راوی عصمہ بن محمد انصاری کے متعلق حافظ ذہبی نے ائمۂ حدیث و رجال کے یہ الفاظ نقل کئے ہیں، "قال ابوحاتم: لیس بقوی، وقال یحییٰ (ابن معین) : کذّاب، یضع الحدیث، وقال العقیلی: حدّث بالبواطیل عن الثقات، وقال الدار قطنی: متروك" (میزان الاعتدال، ج:۲، ص:۶۸)

حافظ خطیب لکھتے ہیں "قال یحییٰ بن معین: عصمة بن محمد الانصاری امام مسجد الانصار ببغداد کان کذّابا یروی الحدیث کذبا قد رأیته وکان شیخا له هیبة و منظر من اکذب الناس" (تاریخ الخطیب، ج:۱۲، ص:۲۸۶)

ان دونوں راویوں پر ائمہ جرح وتعدیل کی اس انتہائی شدید جرح کی بناء پر مشہور ناقد حدیث علامہ نیموی لکھتے ہیں هو حدیث ضعیف بل موضوع، (آثار السنن ج ۱ ص ۱۰۱) اور جن مصنّفین نے اپنی کتابوں میں اس حدیث کو نقل کرکے سکوت اختیار کیا ہے

ان کے اس رویہ پر اظہار تعجب کیا ہے۔ (التعلیق الحسن، ج:۱، ص:۱۰۰)

یہ ہے بقلم خود جماعت حقہ کی حق پرستی اور علمی دیانت کا معیار کہ ایک ایسی حدیث جس کی نقل و روایت اس کی حیثیت بیان کئے بغیر ناجائز و حرام ہے۔ اس سے نماز کے مسئلہ پر استدلال ہے، خود جماعت حقہ ہی حق و انصاف کی رو سے بتائے کہ احادیث رسول علی صاحبہا الصلاۃ والسلام کے حوالہ سے اس عظیم علمی خیانت اور افترا پردازی کرنے والوں کو کیا کہا جائے۔'

'ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی''

(د) جواب کے اس حصہ میں حدیث کے اصل الفاظ نہ لکھ کر صرف اس کے لفظی ترجمہ نقل کرنے کو فریب کا نام دیا گیا ہے اگر اسی کا نام فریب ہے تو محدثین کی غالب اکثریت جو روایت بالمعنی کے جواز کی قائل ہے اور ہم تک احادیث عام طور پر روایت بالمعنی ہی کے ذریعہ پہنچی ہیں۔ ہمارے مجیب لبیب اسے کیا کہیں گے؟ خیر ہم اصل عبارت کو صفحہ کے حوالہ کے ساتھ نقل کئے دیتے ہیں تاکہ بیجا ہی سہی ان کی یہ شکایت بھی دور ہو جائے۔ ملاحظہ کیجئے:

حدثنا محمود انا عبدالرزاق انا ابن جریج اخبرنا نافع ان ابن عمر رضی اللّٰہ تعالیٰ عنھما کان یکبر بیدیه حین یستفتح و حین یرکع و حین یقول سمع اللّٰہ لمن حمده و حین یرفع راسه من الرکوع و حین یستوی قائمًا قلت لنافع کان ابن عمر یجعل الاول ارفعھن قال لا” (جزء رفع الیدین للامام البخاری، ص:۱۶ مطبوعہ ۱۳۰۳، در مطبع محمدی لاہور)

غیر مقلد عالم کے حوالہ سے جو سوال نامہ میں ترجمہ نقل کیا گیا ہے اس کا مقابلہ حدیث کے اصل الفاظ سے کر لیجئے انشاء اللہ درست پائیں گے۔ لہٰذا از روئے انصاف سائل کے سوال کا جواب جماعت حقہ کے ذمہ باقی ہے۔

(ھ) جہاں تک صحیح حدیثوں کے نہ چھوڑنے کا دعویٰ ہے تو گذشتہ سطور سے اس دعویٰ کی حقیقت ظاہر ہو چکی ہے، عیاں راچہ بیاں جناب من حقائق کا ثبوت دعووں سے نہیں بلکہ

دلائل وشواہد سے ہوا کرتا ہے۔ کامیابی تو کام سے ہوگی۔ نہ کہ حسین کلام سے ہوگی۔

رہا معاملہ سنن ترمذی کے حوالہ سے مردم شماری کے ذریعہ اپنے مسلک کی فوقیت جتانے کا تو اس سلسلے میں بھی جماعت حقہ نے غور وفکر کی بجائے اپنی عادت کے مطابق جلد بازی اور ظاہر پرستی کا مظاہرہ کیا ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اس میدان میں بھی وہ بہت پیچھے ہے۔ چند شواہد ملاحظہ کیجئے:

حافظ ابن عبد البر لکھتے ہیں:

قال ابو عبدالله محمد بن نصرالمروزی .... لا نعلم مصرا من الامصار ینسب الی اهله العلم قدیما ترکوا باجماعهم رفع الیدین عند الخفض والرفع فی الصلاة الا اهل الکوفة. (التمهید، ج:۹، ص: ۲۱۳)

امام ابوعبداللہ محمد بن نصر مروزی کا بیان ہے کہ ہمیں کسی ایسے شہر کا علم نہیں جس کے باشندے عہد قدیم سے علم کی جانب منسوب ہیں کہ انھوں نے رکوع میں جھکنے اور اٹھنے کے وقت اجماعی طور پر رفع یدین ترک کر دیا ہو سوائے اہل کوفہ کے۔

”ترکوا باجماعهم“ کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ بغیر کسی استثناء کے سارے اہل کوفہ رفع یدین کے ترک پر عامل تھے۔ اور آپ جانتے ہونگے کہ کوفہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے عہد سے چوتھی صدی کے آغاز تک علوم اسلامی کا مرکز ومرجع رہا ہے۔ ڈیڑھ ہزار صحابہ یہاں آباد تھے جن میں چوبیس اصحاب بدر اور تین عشرہ مبشرہ تھے۔ خود صحیح بخاری میں سب سے زیادہ روایتیں کوفہ کے محدثین ہی کی ہیں۔ اور امام بخاری رحمہ اللہ کا خود اپنا بیان ہے کہ کوفہ اور بغداد میں محدثین کے ساتھ میرا جانا اتنی بار ہوا ہے کہ میں اسے شمار بھی نہیں کرسکتا۔

اسلامی علوم کے اس مرکز میں رفع یدین کی صورت حال امام محمد بن نصر کے بیان میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ ہزاروں صحابہ اور ان کے بیشمار تلامذہ ومنتسبین کے اس عظیم شہر میں سب ہی اجماعی طور پر ترک رفع یدین پر عمل پیرا رہے ہیں۔ اسی طرح دیگر اسلامی شہروں میں تارکین رفع کی ایک خاصی تعداد موجود رہی ہے بلکہ اسلام کے عہد زریں تک عام طور پر ترک رفع ہی کا ان میں رواج تھا چنانچہ مدینہ منورہ جو عہد رسالت سے حضرت علی

رضی اللہ عنہ کی خلافت کے ابتدائی زمانہ تک عالم اسلام کا سب سے بڑا علمی و دینی مرکز رہا ہے اور امام مالکؒ کے دور تک جس کی مرکزیت بڑی حد تک برقرار رہی۔ یہاں بھی امام مالک کے زمانہ تک ترک رفع یدین ہی کا غلبہ تھا چنانچہ ابن رشد لکھتے ہیں "ان مالكاً رجح ترك الرفع لموافقة عمل به" (بدایۃ المجتہد، ج:۱، ص:۱۹۳) یعنی امام مالک نے (جو خود رفع یدین کی حدیث کے راوی ہیں) اہل مدینہ کے عمل کی موافقت میں ترک رفع یدین کو ترجیح دیا ہے۔

اس عہد کے دیگر اسلامی مراکز مکہ معظّمہ وغیرہ کا بھی تقریباً یہی حال ہے کہ حضرات صحابہ و کبار تابعین کے عہد تک ان شہروں میں بھی ترک رفع یدین ہی کا غلبہ تھا۔

علاوہ ازیں حضرت صدیق اکبر، فاروق اعظم، علی مرتضٰی، عبداللہ بن مسعود، ابو ہریرہ، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عباس وغیرہ اکابر صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے ترک رفع یدین کا ثبوت جید الاسناد روایتوں سے ثابت ہے۔

اسی طرح تابعین میں حضرت علی اور حضرت عبداللہ بن مسعود کے تلامذہ جن کی تعداد یقیناً ہزاروں سے متجاوز ہوگی(۱) ترک رفع ہی پر عامل تھے۔ ابراہیم نخعی، عامر شعبی، قیس بن ابی حازم، عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ وغیرہ فقہائے محدثین رفع یدین نہیں کرتے تھے۔

مصنف ابن ابی شیبہ، مصنف عبدالرزاق وغیرہ کتب حدیث میں ان بزرگوں کی روایتیں دیکھی جا سکتی ہیں۔

وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمين اللهم ارنا الحق حقا و ارزقنا اتباعه وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابه وصلى الله تعالىٰ على سيدنا محمد خاتم الانبياء والمرسلين وعلى آله و اصحابه و اتباعه اجمعين.

☆ ☆ ☆

---

(۱) مقالات کوثری میں چار ہزار سے زائد کی تصریح موجود ہے۔

کیا خواتین کا مساجد میں آ کر با جماعت نماز پڑھنا درست ہے؟

پردہ جنسی بے رواہ روی کو روکنے کا ایک مؤثر ذریعہ

یہ انسانی دنیا جب سے وجود میں آئی ہے اس میں کوئی خطہ، کوئی قوم اور کوئی مذہب ایسا نہیں ملتا جس میں فواحش و بدکاری، زنا اور حرام کاری کو مستحسن، اچھا یا مباح و جائز سمجھا گیا ہو بلکہ ساری دنیا اور اس کے مذاہب زنا کی مذمت اور برائی میں متفق و ہم رائے رہے ہیں کیونکہ یہ مذموم جرم نہ صرف یہ کہ فطرتِ انسانی کے خلاف ہے بلکہ اس درجہ فساد افزا اور ہلاکت خیز ہے جس کے تباہ کن اثرات صرف اشخاص و افراد ہی کو نہیں بلکہ بسا اوقات سارے خاندان اور پورے شہر و قصبہ کو برباد کر دیتے ہیں۔ اس وقت فتنہ و فساد اور قتل و غارت گری کے جتنے واقعات سامنے آ رہے ہیں ان کی صحیح تحقیق کی جائے تو اکثر واقعات کے پس منظر میں شہوانی جذبات اور ناجائز جنسی تعلقات کا عمل دخل ملے گا۔

البتہ بہت سی قوموں اور اکثر مذاہب میں زنا اور فواحش کی ممانعت کے باوجود اس کے مقدمات اور اسباب و ذرائع کو معیوب و ممنوع نہیں سمجھا جاتا اور نہ ان پر خاص قدغن اور بندش لگائی جاتی ہے۔

مذہب اسلام چونکہ ایک کامل و مکمل نظامِ حیات اور فطرت کے مطابق قانون الٰہی ہے اس لئے اسلام میں جرائم و معاصی کی حرمت کے ساتھ جرائم و معاصی کے ان اسباب و ذرائع کو بھی حرام و ممنوع قرار دے دیا گیا جو بالعموم بطور عادت جاریہ ان جرائم تک پہنچانے والے ہیں۔ مثلاً شراب پینے کو حرام کہا گیا تو شراب کے بنانے، بیچنے، خریدنے

اور کسی کو دینے کو بھی حرام کر دیا گیا۔ سود کو حرام کیا گیا تو سود سے ملتے جلتے سارے معاملات کو بھی ناجائز اور ممنوع کر دیا گیا۔ شرک و بت پرستی کو گناہ عظیم اور ناقابلِ معافی جرم ٹھہرایا گیا تو اس کے اسباب و ذرائع، مجسمہ سازی و بت تراشی اور صورت گری کو بھی حرام اور ان کے استعمال کو ناجائز کر دیا گیا۔

اسی طرح جب شریعت اسلامی میں زنا کو حرام کر دیا گیا تو اس کے تمام قریبی اسباب و ذرائع اور مقدمات پر بھی سخت پابندی لگادی گئی، چنانچہ اجنبی عورت پر شہوت سے نظر ڈالنے کو آنکھوں کا زنا، اس کی باتوں کے سننے کو کانوں کا زنا، اس کے چھونے کو ہاتھوں کا زنا، اس کے پاس جانے کو پیروں کا زنا ٹھہرایا گیا۔ جیسا کہ صحیح مسلم کی حدیث میں وارد ہے:

"العینان زنا هما النظر، والاذنان زنا هما الاستماع، واللسان زنا الکلام، والید زناها البطش، والرجل زناها الخطی" (مشکوٰۃ ص ۲۰ باب الایمان بالقدر)

آنکھوں کا زنا (اجنبی عورت کی جانب شہوت سے) دیکھنا ہے، کانوں کا زنا (شہوت سے اجنبی عورت کی) باتوں کی طرف کان لگانا ہے، زبان کا زنا اس سے گفتگو کرنا ہے، ہاتھ کا زنا اس کو چھونا و پکڑنا ہے، پیروں کا زنا اس کی طرف (غلط ارادہ سے) جانا ہے۔

برے ارادے سے کسی اجنبی عورت کی جانب دیکھنا اس کی باتوں کی جانب متوجہ ہونا، اس سے بات چیت کرنا، اس کو چھونا و پکڑنا اس کے پاس جانا یہ سارے کام حقیقتاً زنا نہیں بلکہ زنا کے اسباب و مقدمات میں سے ہیں مگر انھیں بھی حدیث میں زنا سے تعبیر کیا گیا ہے تاکہ امت سمجھ جائے کہ زنا کی طرح اس کے مقدمات و اسباب بھی شریعت میں حرام و ممنوع ہیں۔ انھیں شہوانی جرائم سے بچانے کے لئے عورتوں کے واسطے پردہ کے احکام نازل و نافذ کئے گئے۔

اس موقع پر یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہئے کہ شریعتِ اسلامی کا مزاج تنگی و دشواری کے بجائے سہولت و آسانی کی جانب مائل ہے اس سلسلے میں کتاب الٰہی کا واضح اعلان ہے "مَا جَعَلَ عَلَیْکُم فِی الدِّیْنِ مِنْ حَرَج" دین میں تمہارے اوپر کوئی تنگی نہیں ڈالی گئی ہے اس لئے اسباب و ذرائع کے بارے میں فطرت سے ہم آہنگ یہ حکمت آمیز فیصلہ کیا گیا

کہ جو امور کسی معصیت کا ایسا سبب قریب ہوں کہ عام عادت کے اعتبار سے ان کا کرنے والا اس معصیت میں ضرور مبتلا ہو جاتا ہے، ایسے قریبی اسباب کو شریعتِ اسلام نے اصل معصیت کے حکم میں رکھ کر انھیں بھی ممنوع و حرام کر دیا۔ اور جن اسباب کا تعلق معصیت اور گناہ سے دور کا ہے کہ ان کے اختیار کرنے اور عمل میں لانے سے گناہ میں مبتلا ہونا عادۃً لازم و ضروری تو نہیں مگر ان کا کچھ نہ کچھ دخل گناہ میں ضرور ہے ایسے اسباب و ذرائع کو مکروہ قرار دیا اور جو اسباب ایسے ہیں کہ معصیت میں ان کا دخل شاذ و نادر کے درجہ میں ہے ان کو مباحات میں داخل کر دیا۔

اس سلسلے کی یہ بات بھی ذہن میں رکھنی ضروری ہے کہ شریعتِ اسلام نے جن کاموں کو گناہ کا سبب قریب قرار دے کر حرام کر دیا ہے وہ تمام مسلمانوں کے لئے حرام ہیں خواہ وہ کام کسی کے لئے گناہ میں مبتلا ہونے کا سبب بنے یا نہ بنے اب وہ خود ایک حکم شرعی ہے جس پر عمل سب کے لئے لازم اور اس کی مخالفت حرام ہے۔

اس کے بعد سمجھئے کہ عورتوں کا پردہ بھی شرعاً اسی سد ذرائع کے اصول پر مبنی ہے کہ ترکِ پردہ گناہ میں مبتلا ہونے کا سبب ہے۔ اس میں بھی اسباب کی مذکورہ قسموں یعنی سببِ قریب، سبب بعید اور سبب بعید تر کے احکام جاری ہوں گے، مثلاً جوان مرد کے سامنے جوان عورت کا بدن کھولنا گناہ میں مبتلا ہونے کا قریبی سبب ہے کہ عادتاً آدمی ایسی صورت حال میں بالعموم گناہ میں لازمی طور پر مبتلا ہو جاتا ہے اس لئے یہ صورت شریعت کی نظر میں زنا کی طرح حرام ہے، کیونکہ شریعت میں اس عمل کو فاحشہ کا حکم دیا گیا ہے لہٰذا یہ سب کے حق میں حرام ہوگا۔ البتہ مواقعِ ضرورت علاج وغیرہ کا مستثنٰی ہونا ایک الگ حکم شرعی ہے اس استثنائی حکم سے اصل حرمت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ پھر یہ مسئلہ اور حکم اوقات و حالات سے بھی متاثر نہیں ہوتا اسلام کے عہد زریں اور خیر و صلاح میں بھی اس کا حکم وہی تھا جو آج کے دورِ ظلمت اور شر و فساد کے زمانہ میں ہے۔

دوسرا درجہ ترک پردہ کا یہ ہے کہ گھر کی چہار دیواری سے باہر برقع یا دراز چادر سے پورا بدن چھپا کر نکلے۔ یہ فتنہ کا سبب بعید ہے۔ اس صورت کا حکم یہ ہے کہ اگر ایسا کرنا فتنہ کا

سبب ہو تو ناجائز ہے اور جہاں فتنہ کا اندیشہ نہ ہو وہاں جائز ہوگا۔ اسی لئے اس صورت کا حکم زمانے اور حالات کے بدلنے سے بدل سکتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد خیر مہد میں اس طرح سے عورتوں کا گھر سے باہر نکلنا فتنہ کا سبب نہیں تھا اس لئے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے عورتوں کو برقع وغیرہ میں سارا بدن چھپا کر چند شرائط کے ساتھ مسجدوں میں آنے کی اجازت دی تھی اور ان کو مسجدوں میں آنے سے روکنے کو منع فرمایا تھا اگرچہ اس وقت بھی عورتوں کو ترغیب اسی کی دی جاتی تھی کہ وہ گھروں میں ہی نماز ادا کریں کیونکہ ان کے لئے مسجد کے مقابلہ میں گھر کے اندر نماز پڑھنا زیادہ باعثِ ثواب اور افضل ہے۔

چنانچہ حافظ ابن عبدالبر لکھتے ہیں: "ولم یختلفوا ان صلاۃ المرأۃ فی بیتها افضل من صلاتها فی المسجد" (التمہید ج ۱۱ ص ۱۹۶) اس بارے میں کسی کا اختلاف نہیں ہے کہ عورت کی گھر میں نماز مسجد میں نماز سے افضل و بہتر ہے۔

آپ کی وفات کے بعد وہ حالات باقی نہیں رہے۔ بلکہ طبیعتوں میں تغیر اور قلبی اطمینان میں فتور پیدا ہو گیا چنانچہ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کا بیان ہے "ما نفضنا ایدینا عن قبر رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم حتی انکرنا قلوبنا" (التمہید للحافظ ابن عبدالبر ج ۳ ص ۳۹۴ مطبوعہ ۱۴۱۰، ورواہ الترمذی فی الشمائل ص ۲۷ عن انس رضی اللہ عنہ) ہم نے ابھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دفن کر کے ہاتھوں سے مٹی بھی نہیں جھاڑی تھی کہ اپنے دلوں کی بدلتی ہوئی کیفیت کو محسوس کیا علاوہ ازیں جن شرائط کے ساتھ مسجد میں حاضری کی اجازت دی گئی تھی ان کی پابندی میں دن بدن کوتاہی بڑھتی رہی اسی تغیر حالات کی جانب مزاج شناسِ نبوت ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے یہ فرماتے ہوئے امت کو متنبہ فرمایا ہے کہ آج کے حالات اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دیکھتے تو عورتوں کو مسجدوں میں آنے سے روک دیتے اس لئے عام صحابۂ کرام نے یہی فیصلہ کیا کہ حالات کی اس تبدیلی کی بناء پر اب عورتوں کا مسجد میں آنا فتنہ سے خالی نہیں رہا اس لئے ان حضرات (رضوان اللہ علیہم اجمعین) نے عورتوں کو مسجدوں میں آنے سے روک دیا۔

اس دور فتنہ و فساد میں جب کہ جنسی انارکی اور شہوانی بے راہ روی کی قدم قدم پر نہ

صرف افزائش بلکہ ہمت افزائی ہورہی ہے، دین و مذہب اور حیا و مروت کے سارے بندھن ٹوٹ گئے ہیں کوچہ و بازار کا کیا ذکر شرور وفتن کی خودسر موجیں گھروں کی چہار دیواری سے ٹکرانے لگی ہیں، کیا ایسے فساد انگیز حالات میں بھی خواتین اسلام اور عفت مآب ماؤں بہنوں اور بہو بیٹیوں کو گھروں کی چہار دیواری سے باہر نکل کر جمعہ و جماعت میں مردوں کے دوش بدوش شریک ہونے کی اجازت مقاصدِ شریعت سے ہم آہنگ اور اصول سدّ ذرائع کے مطابق ہے؟

حالاتِ زمانہ اور گردوپیش کے واقعات سے آنکھیں بند کر کے جو لوگ عورتوں کو مسجد میں جمعہ کی نماز ادا کرنے کی دعوت دے رہے ہیں ان کا یہ رویہ مزاج دین سے کتنا ہم آہنگ اور خود یہ لوگ اسلامی معاشرت کے بارے میں کتنے مخلص ہیں؟ جبکہ

فقہائے اسلام بیک زبان یہ کہتے ہیں کہ ایسے فساد آمیز حالات میں عورتوں کے لئے گھر سے باہر آکر مسجدوں میں حاضر ہونا مقاصد شریعت اور اصول سد ذرائع کے خلاف ہے اس لئے ان حالات میں شرعاً اس کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔

وہ احادیث جن سے مساجد میں خواتین کی حاضری کا ثبوت فراہم ہوتا ہے

ادھر چند مہینوں سے اخبارات و رسائل میں یہ مسئلہ بڑی شدومد کے ساتھ بحث و نظر کا موضوع بنا ہوا ہے کہ مسلم مستورات کے لئے مساجد میں جا کر جمعہ و جماعت میں شرکت کرنا درست ہے یا نہیں؟ یہ ایک خالص مذہبی و دینی مسئلہ ہے جس پر گفتگو اصول وضوابط کے تحت صاحب نظر علماء و فقہا ہی کے دائرے میں ہونی چاہئے۔ لیکن یہ کتنی بڑی ستم ظریفی ہے کہ سیاسی و تفریحی مسائل کی طرح اس خالص دینی و شرعی مسئلہ کو آج کی دین بیزار میڈیا تک پہنچا دیا گیا ہے اور ایسے افراد و اشخاص جو فکر و عمل میں دین و مذہب سے برائے نام کا ہی واسطہ رکھتے ہیں اور شرعی مسائل و احکام کے صحیح و مستند علم سے جن کا دفتر معلومات بڑی حد تک خالی ہے وہ بھی اس بارے میں پوری بیباکی کے ساتھ مجتہدانہ فتوے صادر کر رہے

ہیں اور مذہب بیزار میڈیا عام طور پر ایسے خودرو مجتہدین کے مضامین ومقالات کی نشر واشاعت میں مصروف ہے اس صورت حال نے مسئلہ زیر بحث کو اس قدر پیچیدہ کردیا ہے کہ خالی الذہن ناواقف لوگ عجیب گومگو کی کیفیت میں مبتلاء ہوگئے ہیں اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ موجودہ علماء دین ومفتیان شرع ہی نہیں بلکہ ائمہ مجتہدین وسلف صالحین پر بھی بعض حلقوں سے نکتہ چینیاں شروع ہوگئی ہیں۔ جماعت اہل حدیث (غیر مقلدین) کے بعض ناعاقبت اندیش لوگوں کی جانب سے اس ناروا جسارت کی ہمت افزائی نے صورت حال کی سنگینی میں مزید اضافہ کردیا ہے ہوا کا رخ بتارہا ہے کہ امت مسلمہ کا سلف صالحین کے ساتھ جو مخلصانہ ربط ہے اسے ختم کردینے کے لئے ایک منظّم سازش کے تحت مسلم عورتوں کی حقوق طلبی اور ہمدردی کے نام پر اس قسم کے مسائل قدرے وقفہ کے ساتھ اٹھائے جاتے ہیں جن کی آخری تان ائمہ مجتہدین وسلف صالحین کی تنقید وتنقیص پر ٹوٹتی ہے تاکہ امت کا اعتماد ان سے اٹھ جائے۔ خدانخواستہ امت کا رابطہ اگر سلف صالحین سے قائم نہ رہا تو پھر اس کے حیات دینی کی خیر نہیں کیونکہ اس استنادی حصار کے ٹوٹ جانے کے بعد اسے کوئی بھی اچک سکتا ہے اور ضلالت وگمراہی کی کسی بھی وادی میں پہنچا سکتا ہے۔ صورت حال کی اسی نزاکت نے مجبور کیا کہ مذکورہ بالا مسئلہ پر اختصار کے ساتھ احادیث رسول، آثار صحابہ اور اقوال سلف صالحین کی روشنی میں گفتگو کی جائے ورنہ اس مسئلہ کے ہر پہلو کو فقہاء ومحدثین پورے طور پر واضح کرچکے ہیں جن پر اب کچھ اضافہ نہیں کیا جاسکتا شکر اللہ سعیھم و جزاھم اللہ عنا وعن العلم و الدین.

اصل مسئلہ پر گفتگو سے پہلے چند متفقہ ومسلمہ اصول وقواعد کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے تاکہ مسئلے کی صحیح حقیقت تک پہنچنا آسان ہوجائے۔

(۱) فہم کتاب وسنت کے لئے صحابہ، تابعین اور دوسرے سلف صالحین کی تشریحات وتحقیقات کو مدنظر رکھنا ضروری ہے۔

(۲) مباح بلکہ مستحسن کام بھی اگر شرعی مفاسد کا ذریعہ بن جائیں تو قانونِ سدِّ ذریعہ کے تحت وہ ممنوع ہوجاتے ہیں۔ اور ان پر پابندی لگانی ضروری ہوجاتی ہے۔

(۳) مصلحت وقت اور احوال ناس کی رعایت کے تحت دی گئی رخصتوں کو مستقل شرعی حکم بنانا اور تبدیلیٔ حالات کے باوجود ان کی مشروعیت پر اصرار اصول وضوابط کے خلاف ہے۔

(۴) کتاب وسنت اور سلف صالحین کی تشریحات سے ثابت ہے کہ مردوں کے مقابلہ میں عورتوں کا دائرۂ کار محدود اور طریق کار مخصوص ہے اس وقت اس نوع کے جملہ قواعد کو نہ پیش کرنا مقصود ہے اور نہ ہی ان کے دلائل بیان کرنے اور ان کی تحقیق وتفصیل پیش کرنے کا موقع ہے نہ ضرورت صرف اجمالی اشارات کافی ہیں جو بیان کردیئے گئے۔

اس مختصر اور ضروری تمہید کے بعد عرض ہے کہ بلاشبہ عہد نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں مستورات مسجد نبویؐ میں حاضر ہوکر جمعہ وجماعت میں شرکت کرتی تھیں۔ سلف صالحین وائمہ مجتہدین میں سے کوئی بھی اس کا منکر نہیں ہے۔ یہ امر تو اتفاقی ہے اس لئے اس کے دلائل بیان کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے پھر بھی چند وہ احادیث جن سے اس حاضری کا ثبوت فراہم ہوتا ہے بغرض فائدہ مزید نقل کی جارہی ہیں۔

(۱) عن ابن عمرؓ عن النبی صلی اللّٰہ علیہ و سلم قال اذا استاذنت امرأۃ احد کم فلا یمنعھا (بخاری ج:۱، ص:۱۲۰ و ج:۲، ص:۷۸۸ و مسلم ج:۱، ص:۱۸۲)

آنحضرت...... نے فرمایا جب تم میں سے کسی کی بیوی مسجد جانے کی اجازت مانگے تو اسے منع نہ کرے۔

(۲) عن ابن عمرؓ ان رسول اللّٰہ قال لاتمنعوا اماء اللّٰہ مساجد اللّٰہ (رواہ مسلم ج:۱، ص:۱۸۳ و ابوداؤد ج:۱، ص:۸۴) اللہ کی بندیوں کو اللہ کی مسجدوں سے نہ روکو۔

(۳) عن ابن عمرؓ کانت امرأۃ لعمر تشھد صلوۃ الصبح والعشاء فی الجماعۃ فی المسجد فقیل لھا لم تخرجین وقد تعلمین ان عمر یکرہ ذالک ویغار قالت فما یمنعہ ان ینھانی قال یمنعہ قول رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم لاتمنعوا اماء اللّٰہ مساجد اللّٰہ (بخاری ج:۱، ص:۱۲۳)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ کی ایک بیوی فجر اور عشاء

کی نماز جماعت کے لئے مسجد جاتی تھیں تو ان سے کہا گیا کہ تم مسجد کیوں جاتی ہو جبکہ تمہیں معلوم ہے کہ حضرت عمرؓ تمہارے اس عمل کو پسند نہیں کرتے اور انہیں غیرت آتی ہے تو انھوں نے جواب دیا کہ وہ مجھے منع کیوں نہیں کر دیتے لوگوں نے ان سے کہا کہ (صراحتاً) منع کرنے سے انہیں آنحضرت...... کا یہ ارشاد مانع ہے کہ اللہ کی بندیوں کو اللہ کی مسجدوں سے نہ روکو۔

ان احادیث مبارکہ سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ...... کے عہد کرامت میں عورتوں کو مسجدوں میں حاضری کی صرف اجازت تھی نہ کہ سنت و واجب اور نہ ان کو اس حاضری کی کبھی ترغیب دلائی گئی اور نہ ہی عدم حاضری کی صورت میں ان سے باز پرس اور اظہار ناراضگی کیا گیا چنانچہ مشہور شارح حدیث امام نووی ان احادیث کی شرح میں لکھتے ہیں۔

ظاهرها انها لاتمنع المسجد لكن بشروط ذكرها العلماء ماخوذة من الاحاديث وهو ان لاتكون متطيبة ولا متزينة ولا ذات خلاخل يسمع صوتها ولا ثياب فاخرة ولا مختلطة بالرجال ولا شابة ولا نحوها ممن يفتتن بها وان لا يكون فى الطريق مايخاف به مفسدة ونحوها وهذه النهى عن معنهن من الخروج على كراهية التنزيهة الخ (مسلم مع شرح نوووی ج:۱،ص:۱۸۳)

ان احادیث کا ظاہر یہی ہے کہ عورتوں کو مسجدوں میں جانے سے روکا نہ جائے لیکن اس اجازت کے لئے کچھ شرطیں ہیں جنہیں علماء نے بیان کیا ہے اور یہ شرطیں احادیث سے ماخوذ ہیں وہ شرطیں یہ ہیں (۱) خوشبو لگائے ہوئے نہ ہو، (۲) بنی سنوری نہ ہو (۳) بجتے ہوئے زیور نہ پہنے ہو، (۴) عمدہ بھڑک دار کپڑا زیب تن نہ ہو، (۵) مردوں کے ساتھ اختلاط نہ ہو (۶) نوجوان نہ ہو اور نہ مثل نوجوان کے ہو جس سے فتنہ کا اندیشہ ہو، (۷) راستہ بھی مفاسد سے ماموں ومحفوظ ہو۔ پھر عورتوں کو مساجد سے روکنے کی یہ ممانعت نہی تنزیہی ہے (جس سے معلوم ہوا کہ عورتوں کی مساجد میں حاضری صرف جائز ومباح ہے سنت و واجب نہیں ورنہ انہیں مساجد سے روکنا تنزیہی کے بجائے نہی تحریمی یا حرام ہوتا

اور نہ اس حاضری کے لئے انہیں شوہروں سے اجازت لینی پڑتی)

امام نووی نے اپنی عبارت میں جن شرائط کا ذکر کیا ہے ان میں سے اکثر احادیث میں صراحت کے ساتھ بیان کی گئی ہیں اور بعض دوسرے شرعی دلائل سے ثابت ہیں۔ اس مختصر تحریر میں ان ساری حدیثوں کے ذکر کی گنجائش نہیں۔

تفصیل کے طالب صحیح مسلم ج:۱، ص۱۸۲ و ۱۸۳ و سنن ابوداؤد ج:۱، ص:۸۴، و مجمع الزوائد ج:۲، ص:۳۲، ۳۳، و سنن نسائی ص:۲۸۲، و ترغیب و ترہیب ج:۳، ص:۸۵، و ابوداؤد ج:۲، ص:۱۴۷-۱۵۷ وغیرہ کتب حدیث کا مطالعہ کریں۔

مساجد کی بجائے اپنے گھروں میں نماز ادا کرنے سے متعلق احادیث

آنحضرت ...... کا عہد مبارک اپنے اندر جس قدر خیر و برکات کو سمیٹے ہوئے تھا آج کے اس پرفتن دور میں اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا آنحضرت ...... کی تعلیم و تربیت سے ایک ایسا صالح معاشرہ وجود میں آ گیا تھا جس کے افراد کے قلوب ایمان و یقین سے مزین تھے اور کفر و عصیان سے انہیں طبعی طور پر نفرت ہو گئی تھی ان تمام تر توجہات کا مرکز بس فضل ربانی کی طلب اور رضاء الٰہی کی جستجو تھی۔ اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر ان کا طرہ امتیاز تھا۔ ایسے صالح اور مثالی معاشرے میں عورتوں کو اجازت دی گئی تھی کہ اگر وہ مساجد میں آ کر باجماعت نماز ادا کرنا چاہتی ہیں تو مذکورہ بالا شرائط کی پابندی کرتے ہوئے اپنی خواہش کی تکمیل کر سکتی ہیں اور انہیں اس رخصت و اباحت سے فائدہ اٹھانے کے لئے ان کے شوہروں کو ہدایت دی گئی کہ اگر ان کی بیویاں مسجد میں آنا چاہیں تو انہیں روکا نہ جائے لہٰذا فتنہ و فساد سے مامون اور خیر و صلاح سے معمور اس ماحول میں مردوں کا مساجد سے عورتوں کو روکنا خوف فتنہ کی بناء پر نہ ہوتا بلکہ اپنی شیخی اور بیجا احساس بزرگی کی بناء پر ہوتا اس لئے مردوں کو حکم دیا گیا کہ وہ عورتوں کو مساجد میں آنے سے منع نہ کریں پھر ان کی اس حاضری میں یہ عظیم فائدہ بھی مضمر تھا کہ انہیں براہ راست آنحضرت ...... کی تعلیم و تربیت سے استفادہ کی سعادت غیر متناہی حاصل ہو جاتی تھی۔

لیکن ان سب مصالح اور پابندیوں کے باوجود انہیں ترغیب اسی بات کی دی گئی کہ وہ مساجد میں حاضر ہونے کے بجائے اپنے گھروں کے اندر ہی نماز ادا کریں یہی ان کے حق میں اولی وافضل ہے ملاحظہ ہو اس سلسلہ کی احادیث۔

(۱) ”عن ابن عمر رضی الله عنهما قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم لاتمنعوا نساءكم المساجد وبيوتهن خيرلهن“ (رواہ ابوداؤد ج:۱، ص:۸۴ والحاكم فی مستدرکه وقال صحيح على شرائط الشيخين وصححه ابن خزيمة)

آنحضرت ...... نے فرمایا اپنی عورتوں کو مساجد میں آنے سے منع نہ کرو اور ان کے گھر ان کے لئے مساجد کے مقابلہ میں زیادہ بہتر ہیں۔

(۲) عن عبد اللّٰہ بن مسعود عن النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم قال المرأة عورة وانها اذا خرجت استشرفها الشيطان وانها اقرب ماتكون الى اللّٰہ وهی فی قعر بيتها. (رواہ الطبرانی فی الكبير ورجاله موثقوُن مجمع الزوائد ج:۲، ص:۳۵)

آنحضرت ...... نے فرمایا کہ عورت سراپا پردہ ہے اور یہ جیسے ہی گھر سے باہر نکلتی ہے شیطان اس کی تاک میں لگ جاتا ہے اور بلاشبہ وہ خدا سے زیادہ قریب اسی وقت ہوتی ہے جبکہ وہ اپنی کوٹھری میں ہوتی ہے۔

(۳) عن ام حميد امرأة ابی حميد الساعدی انها جاءت النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم فقالت يا رسول اللّٰہ انی احب الصلوٰة معك قال قد علمت انك تحبين الصلوة معی وصلوٰتك فی بيتك خير من صلوتك فی حجرتك وصلوتك فی حجرتك خير من صلاتك فی دارك وصلاتك فی دارك خير من صلاتك فی مسجد قومك وصلاتك فی مسجد قومك خير من صلا فی مسجدی قال فامرت فبنی لها مسجد فی اقصى بيت فی بيتها واظلمه فكانت تصلی فيه حتى لقيت اللّٰہ عزوجل (رواہ احمد ورجاله رجال الصحيح سوى عبد اللّٰہ بن سويد الانصاری ووثقه ابن حبان مجمع الزوائد ج:۲، ص:۳۳-۳۴) ورواه ابن خزيمه وابن حبان فی صحيحهما. وحسنه الحافظ ابن حجر.

حضرت ابوحمید ساعدی رضی اللہ عنہ کی زوجہ ام حمید سے مروی ہے کہ وہ آنحضرت ...... کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا کہ یارسول اللہ میں آپ کے ساتھ نماز پڑھنا پسند کرتی ہوں تو آپ نے ان سے ارشاد فرمایا کہ مجھے معلوم ہے کہ تم میرے ساتھ نماز پڑھنا پسند کرتی ہو مگر تمہاری وہ نماز جو کمرہ میں ہو وہ تمہاری دالان کی نماز سے بہتر ہے اور تمہاری دالان کی نماز تمہاری صحن کی نماز سے بہتر ہے اور تمہاری گھر کے صحن کی نماز محلّہ کی مسجد کی نماز سے بہتر ہے اور تمہاری مسجد محلّہ کی نماز میری مسجد کی نماز سے بہتر ہے۔

راوی کہتے ہیں کہ (آنحضرت ...... کے اس ارشاد کے بعد) انھوں نے اپنے گھر والوں کو حکم دیا تو ان کے واسطے گھر کی انتہائی اندرونی و تاریک کوٹھری میں مسجد بنادی گئی اور یہ اسی میں نماز پڑھتی رہیں یہاں تک کہ اللہ کو پیاری ہوگئیں۔

امام ابن خزیمہ نے اپنی صحیح میں اس حدیث کا بایں الفاظ باب قائم کیا ہے۔

”باب اختيار صلاة المرأة فی حجرتها على صلاتها فی دارها وصلاتها فی مسجد قومها على صلاتها فی مسجد النبی صلی اللّٰه عليه وسلم وان كانت صلاة فی مسجد النبی صلی اللّٰه عليه وسلم تعدل الف صلاة فی غيره من المساجد والدليل على ان قول النبی صلی اللّٰه عليه وسلم صلاة فی مسجدی هذا افضل من الف صلاة فيما سواه من المساجد انما اراد به صلاة الرجل دون صلاة النساء“ (ترغیب وترہیب ج:۱، ص:۲۵۵)

یعنی یہ باب اس بیان میں ہے کہ عورت کے حجرہ کے اندر کی نماز دالان کی نماز سے بہتر ہے اور اس کی مسجد محلّہ کی نماز مسجد نبوی علی صاجہا الصلوٰۃ والتسلیم کی نماز سے بہتر ہے اگرچہ آنحضرت ...... کی مسجد کی نماز دیگر مساجد کی ہزار نماز کے برابر ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ آنحضرت ...... کا یہ ارشاد کہ میری مسجد کی نماز دیگر مساجد کی ہزار نماز سے بہتر ہے اس سے آپ کی مراد مردوں کی نماز ہے عورتوں کی نماز نہیں۔

اس حدیث پاک سے معلوم ہوتا ہے کہ عورت جس قدر بھی پوشیدہ ہوکر نماز ادا کرے گی اسی قدر اس کا ثواب زیادہ ہوگا اور اللہ کی رضا و خوشنودی میں اسی پوشیدگی وخفا

کے اعتبار سے زیادتی ہوگی۔

اس مضمون کی مرفوع روایت حضرت ام سلمہ، حضرت عبداللہ بن مسعود سے موقوفا ومرفوعاً، حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم اجمعین سے ابوداؤد، مسند احمد، مجمع الزوائد، الترغیب والترہیب اور مصنف ابن عبدالرزاق میں لائق احتجاج سندوں سے موجود ہیں بغرض اختصار اس موقع پر انہیں نقل نہیں کیا جارہا ہے۔

آنحضرت...... کے اس دنیا سے پردہ فرمالینے کے بعد جب خیر وصلاح کی وہ فضاء باقی نہیں رہی اور رفتہ رفتہ اس میں اضمحلال اور کمزوری پیدا ہوگئی اور آنحضرت ...... نے جن شرائط کی پابندی کے ساتھ حصول تعلیم وتربیت کی غرض سے عورتوں کو مسجد میں حاضر ہونے کی اجازت مرحمت فرمائی تھی آہستہ آہستہ عورتیں ان شرائط کی بجاآوری میں کوتاہی کرنے لگیں چنانچہ حضرت ابوہریرہ کے قریب سے ایک عورت گزری جس کے جسم اور کپڑے سے خوشبو پھوٹ رہی تھی تو انھوں نے اس کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا یا امة الجبار اے خدائے قہار کی بندی! مسجد سے آرہی ہے اس نے ہاں میں جواب دیا پھر پوچھا کیا تم نے مسجد میں جانے کے لئے یہ خوشبو لگائی تھی اس نے کہا ہاں تو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں نے اپنے محبوب ابوالقاسم ...... سے فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اس عورت کی نماز قبول نہیں کی جاتی جو خوشبو لگا کر مسجد میں حاضر ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ مسجد سے گھر جائے اور غسل جنابت کی طرح اسے دھوکر صاف کردے یہ حدیث ابوداؤد ج:۲،ص:۵۵۷، نسائی ص:۲۸۲ میں دیکھی جاسکتی ہے امام منذری اس کے بارے میں لکھتے ہیں "اسنادہ متصل ورواتہ ثقات" الترغیب والترہیب ج:۳،ص:۸۵۔

یہ صحیح حدیث اس بات کی واضح دلیل ہے کہ آنحضرت...... کے بعد عورتوں کے اندر وہ حزم واحتیاط باقی نہیں رہی اور مسجد میں حاضری کیلئے مقررہ شرائط کی بجاآوری میں وہ غفلت برتنے لگی تھیں ان کے حالات کے اسی تغیر کو دیکھ کر مقاصد شریعت کی ماہر اور مزاج شناس نبوت حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا لو ادرك رسول الله صلى الله عليه وسلم ما احدث النساء لمنعهن المسجد الحديث (بخاری ج:۱،

ص: ۱۲۰) مسلم ج: ۱، ص: ۱۸۳ میں یہی روایت ان الفاظ میں ہے۔

لو ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم رای ما احدث النساء لمنعھن المسجد یعنی عورتوں نے مسجد میں آنے کے لئے زیب وزینت اور آرائش وجمال کا جو اہتمام شروع کردیا ہے اگر ان کے حال کی یہ تبدیلی آنحضرت ...... کے زمانے میں رونما ہوجاتی اور آنحضرت...... انہیں دیکھ لیتے تو یقیناً انہیں مسجدوں میں آنے سے روک دیتے اس لئے کہ یہ حاضری جن شرائط پر موقوف تھی وہ شرطیں مفقود ہوگئیں تو پھر اصول کے مطابق یہ اجازت بھی باقی نہیں رکھی جاسکتی تھی، اخلاق وعادات میں اسی انقلاب کی بناء پر حضرت عمر فاروق، حضرت زبیر بن العوام عورتوں کی مسجد میں حاضری کو پسند نہیں کرتے تھے اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ تو جمعہ کے دن جو عورتیں نماز جمعہ میں شرکت کیلئے مسجد آجاتیں انہیں یہ کہہ کر لوٹا دیا کرتے تھے کہ جاؤ اپنے گھروں میں نماز پڑھو یہی تمہارے لئے بہتر ہے۔

جمہور صحابہ خواتین کو مساجد میں جانے سے روکتے تھے

اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحب تو حجۃ اللہ البالغہ میں لکھتے ہیں کہ جمہور صحابہ عورتوں کو مسجدوں میں جانے سے روکتے تھے۔ اسی طرح تابعین میں حضرت عروہ بن زبیر، ابراہیم نخعی، قاسم بن محمد بن ابوبکر وغیرہ سلف صالحین میں حضرت حسن بصری حضرت عبداللہ بن مبارک یحیٰی انصاری وغیرہ عورتوں کے لئے مسجد میں حاضری کو درست نہیں سمجھتے تھے۔

یہ حضرات صحابہ جنھوں نے اپنی آنکھوں سے عورتوں کو آنحضرت کے پیچھے جماعت میں نماز پڑھتے دیکھا اور اپنے کانوں سے آنحضرت ...... کی زبان مبارک سے یہ فرماتے ہوئے سنا کہ عورتوں کو مسجدوں میں آنے سے منع نہ کرو۔ اس کے باوجود آنحضرت ...... کے بعد عورتوں کو مساجد میں آنے سے روکنے لگے تو کیا حاشا وکلا یہ سب حضرات آنحضرت...... کے حکم وفرمان کی خلاف ورزی کرنے لگے نہیں نہیں وہ مقاصد شریعت سے اچھی طرح واقف تھے کہ آنحضرت ...... کے زمانہ میں مصالح کا تقاضا یہی تھا کہ عورتیں

مقررہ شرائط کے ساتھ مسجدوں میں آسکتی ہیں لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ عادات واخلاق میں پہلے جیسی پختگی نہیں رہی مزید برآں شر وفتن کے بند دروازے کھل گئے ہیں تو دفع فتنہ کے لیے اس اجازت کے دروازے کا بند ہوجانا ہی قرین مصلحت اور تقاضائے شریعت ہے کیونکہ تحصیل مصالح کے مقابلہ میں دفع فتنہ کو شریعت میں زیادہ اہمیت دی گئی ہےاور موجودہ صورت میں تو تحصیل منفعت کا موقع بھی نہیں ہے۔

سردست اسی پر اکتفا کیا جاتا ہےاور طالب حق کے لئے انشاء اللہ یہ اشارات کافی و وافی ہوں گے ویسے جو حضرات اس موضوع پر مکمل تفصیلات جاننے کے خواہش مند ہوں وہ راقم کی زیر طبع کتاب کا انتظار کریں جس میں اس مسئلہ پر تفصیل کے ساتھ بحث کی گئی ہے اور موضوع سے متعلق اکثر حدیثوں کو اس میں جمع کردیا گیا ہے۔ وما ارید الا الاصلاح وما توفیقی الا باللّٰہ وعلیہ توکلت والیہ انیب وصلی اللّٰہ علی نبیہ الکریم واصحابہ واتباعہ اجمعین.

نوٹ: یہ کتاب ’’خواتین اسلام کی بہترین مسجد‘‘ کے نام سے شائع ہوگئی ہے۔

☆ ☆ ☆

نکاح وطلاق کا اسلامی ضابطہ

رشتۂ زوجیت کی روایت

اسلامی شریعت میں جو درحقیقت ایک پاکیزہ نظام حیات اور مکمل دستور زندگی کا دوسرا نام ہے، رشتۂ نکاح کو ایک امتیازی مقام و مرتبہ حاصل ہے، قرآن وحدیث کے بیانات سے مرد وعورت کے اس حیات آفریں تعلق کی بڑی اہمیت معلوم ہوتی ہے، چنانچہ مولائے کائنات نے اپنی نعمت ربوبیت کا ذکر کرتے ہوئے خاص طور پر رشتۂ زوجیت کی افادیت واہمیت کی جانب اشارہ فرمایا:

وَمِنْ آيَاتِهِ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَّرَحْمَةً(۱)

اور اس کی (ربوبیت ووحدانیت کی) نشانیوں سے ہے یہ کہ بنادیئے تمہارے واسطے تمہاری جنس سے جوڑے، تاکہ چین حاصل کرو ان کے پاس اور پیدا کردیا تمہارے اندر پیار ومحبت۔

یعنی فطری و پیدائشی طور پر مرد وعورت کے درمیان جو خاص قسم کی محبت وحمیت پیدا کردی گئی ہے اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ ازدواجی رشتہ کا مقصد پورے طور پر حاصل ہو، یہ قدرت کا عجیب کرشمہ اور عظیم نشانی ہے کہ ایجاب وقبول کے دو بول کے بعد زوجین کے اندر ایک انقلابِ عظیم پیدا ہوجاتا ہے کہ ابھی اجنبیت تھی، ابھی یگانگت پیدا ہوگئی، ابھی بے تعلقی تھی منٹ بھی نہیں گذرا کہ تعلق پیدا ہوگیا، دلوں کے اسی انقلاب کو آیت اللہ سے

---

(۱) سورۃ الروم۔

تعبیر کیا گیا ہے۔

نکاح کی ترغیب

رسول اللہ...... کے ارشادات میں صراحت کے ساتھ نکاح کی ترغیب اور اس کی ضرورت وافادیت کو واضح کیا گیا ہے، ایک طویل حدیث کے آخر میں آپؐ نے نکاح کو اپنی سنت بتاتے ہوئے اس کی اہمیت کو ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے "فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِیْ فَلَیْسَ مِنِّیْ" جو شخص میری سنتِ نکاح سے منھ پھیرے وہ میرے طریقہ پر نہیں ہے۔(۱)

ایک حدیث میں آپ کا ارشاد یہ ہے "ان سنتنا النکاح" نکاح ہماری سنت ہی ہے۔(۲)

ایک حدیث میں اسے حضرات انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی سنت بتایا گیا ہے۔ ارشاد ہے۔

"اربع من سنن المرسلین الحناء والتعطر والسواك والنکاح" چار چیزیں اللہ کے رسولوں کی سنت ہیں مہندی کا خضاب (بعض نسخوں میں الحنّا کے بجائے الحیاء ہے) عطر کا استعمال مسواک کرنا اور نکاح کرنا۔(۳)

ایک حدیث میں نکاح کی ترغیب ان الفاظ میں دی گئی ہے "اذا تزوج العبد فقد استکمل نصف الایمان فلیتق اللّٰہ نصف الثانی"(۴) مرد مومن نے جب نکاح کرلیا تو اس نے اپنے نصف دین کو مکمل کرلیا لہٰذا دوسرے نصف کے سلسلہ میں اسے اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہنا چاہئے (چونکہ عموماً آدمی فرج اور بطن کی خواہش واشتہاء کی وجہ سے گناہ میں مبتلا ہوتا ہے تو جب اس نے نکاح کرلیا اپنے فرج کی عفت وحفاظت کا انتظام کرلیا تو گویا اس نے اپنے نصف دین کو پورا کرلیا، اب رہ گیا معاملہ پیٹ کی خواہش کا تو اس کا علاج تقویٰ بتایا گیا اس طرح پورے ایمان کی حفاظت ہوجائے گی۔

---

(۱) صحیح بخاری ج ۲، ص: ۷۵۷۔

(۲) مسند امام احمد ج ۵، ص ۱۶۳۔

(۳) انتقاء الترغیب والترھیب، ص ۱۸۲۔

(۴) رواہ البیھقی فی شعب الایمان کما فی المشکوٰۃ ج ۲، ص ۲۶۸۔

ایک حدیث میں اللہ کے رسول ...... نے بطور خاص جوانوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: یا معشر الشباب من استطاع منکم الباءة فلیتزوج فانه اغض للبصر واحسن للفرج.(۱) اے جوانو! تم میں سے جو نکاح کی قدرت رکھے (یعنی اسے بیوی کی مہر اور خرچہ دینے کی قدرت ہوتو) چاہیئے کہ وہ نکاح کرلے کیونکہ یہ نگاہوں کو خوب جھکانے والا اور فرج کی اچھی طرح حفاظت کرنے والا ہے، مطلب یہ ہے کہ نکاح آدمی کی عفت و پاک دامنی کا بہترین ذریعہ ہے، لہٰذا نکاح پر قدرت رکھتے ہوئے اس سے پہلوتہی کرنے سے آنکھ اور فرج کے گناہ میں مبتلا ہوجانے کا اندیشہ ہے۔

نکاح میں عبادت کا پہلو

انھیں جیسی احادیث کے پیش نظر امام اعظم ابوحنیفہ اور دیگر ائمہ رحمہم اللہ نے عبادت نافلہ میں اشتغال کے مقابلہ میں نکاح کو افضل قرار دیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ نکاح کی حیثیت صرف ایک معاملہ ومعاہدہ ہی کی نہیں ہے بلکہ عام معاملات ومعاہدات سے بالاتر یہ ایک گونہ عبادت وسنت کی حیثیت بھی رکھتا ہے جس میں خالق کائنات کی طرف سے انسانی فطرت میں پیدا کردہ شہوانی جذبات کی تسکین کا ایک بہترین اور پاکیزہ سامان بھی ہے، اور ازدواجی تعلقات سے بقاء نسل انسانی اور تربیت اولاد کا حکیمانہ نظام موجود ہے۔

نکاح کا تعمیری معنی

نکاح ایک عربی لفظ ہے جس کا اصلی مادہ ''ن، ک، ح'' ہے۔ کہا جاتا ہے ''نکح المرأة'' فلاں نے عورت سے شادی کی، ''نکح المطر الارض'' بارش زمین میں جذب ہوگئی، ''نکح الدواء'' دوا نے اثر کیا، ''نکح النعاس عینه'' اس کی آنکھوں میں نیند سرایت کرگئی۔ ان سب محاوروں میں جذب وضم کا معنی مشترک ہے، چنانچہ اسلام نے اس من تن شدم تو جاں شدی کے مفہوم کو نہایت بلیغ و دل نشیں اسلوب میں بیان کیا ہے جس

---

(۱) رواہ الامام البخاری فی صحیحهما کما فی المشکوٰة، ج۲ص۲۶۷۔

میں نکاح کے مفہوم کی بھی رعایت ہے اور نکاح سے شرعی مطلوب واقعی کا بیان بھی ہے، قرآن کا ارشاد ہے "ھن لباس لکم وانتم لباس لھن" گویا چولی دامن یا بالفاظ دگر جسم وسایہ کے رشتہ کی تعبیر ہے، کہ عورتیں تمہارے لئے بطور لباس کے ہیں اور تم ان کے لئے لباس کے مانند ہو، دونوں کے منافع باہم مشترک ہوگئے، زوجین کا یہی مشترکہ منافع وسعت پذیر ہوکر کے خاندانی اشتراک کی حیثیت اختیار کرلیتا ہے جس کے زیر سایہ صالح اسلامی معاشرہ وجود میں آتا ہے، رشتۂ نکاح کی اس خصوصی اہمیت وافادیت کی بنا پر شریعت نے اس کے انعقاد اور وجود پذیر ہونے کے لئے کچھ ایسے آداب اور ضروری شرائط مقرر کی ہیں جو دیگر معاملات خرید وفروخت اجارہ معاہدہ وغیرہ میں نہیں ہیں، مثلاً ہر عورت اور مرد سے نکاح درست نہیں، اس بارے میں اسلامی شریعت کا ایک مستقل قانون وضابطہ ہے جس کی رو سے بہت سی عورتوں اور مردوں کا باہم نکاح نہیں ہوسکتا، دیگر معاملات کے منعقد ومکمل ہونے کے لئے گواہی شرط نہیں ہے، جب کہ نکاح کے صحیح ہونے کے واسطے گواہوں کا موجود ہونا شرطِ ضروری ہے، اگر مرد وعورت بغیر گواہوں کے نکاح کرلیں تو یہ نکاح قانونِ شریعت کے لحاظ سے باطل اور کالعدم ہوگا۔

نکاح ایک دائمی رشتہ

اسلام کا مطمح نظر یہ ہے کہ پاکیزہ رشتہ اور قابل احترام معاہدہ زندگی میں قائم ودائم رہے، اس کے توڑنے اور ختم کرنے کی نوبت ہی نہ آئے کیونکہ اس رشتہ کو منقطع اور ختم کرنے کا اثر صرف زوجین پر ہی نہیں پڑتا بلکہ نسل واولاد کی تباہی اور بسا اوقات خاندانوں میں فساد ونزاع تک کی نوبت پہنچ جاتی ہے جس سے پورا معاشرہ بری طرح متاثر ہوجاتا ہے، اس لئے قرآن حکیم میں ازدواجی وعائلی مسائل کو دیگر تمام معاملات سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ قرآن کے مطالعہ سے یہ امر واضح ہے کہ دنیا کے عام معاشی مسائل میں تجارت، شرکت، اجارہ وغیرہ کے سلسلے میں قرآن نے صرف اصول وکلیات کے بیان پر اکتفاء کیا ہے ان کے فروعی مسائل شاذ ونادر ہی قرآن کے زیر بحث آتے ہیں، برخلاف

نکاح وطلاق کے، ان کے صرف اصول بتانے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان کے اکثر و بیشتر فروع وجزئیات بھی براہ راست حق تعالیٰ نے قرآن مجید میں بیان کر دیئے ہیں۔

زوجین کی ازدواجی زندگی سے متعلق جو ہدایتیں قرآن وسنت میں مذکور ہیں ان سب کا حاصل یہی ہے کہ یہ رشتہ زیادہ سے زیادہ مستحکم ہوتا چلا جائے، اسلام نے میاں بیوی کو اپنے اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کا احساس دلاتے ہوئے مردوں سے کہا کہ عورت تیری باندی یا نوکرانی نہیں ہے بلکہ وہ تیری رفیقۂ حیات اور برابر کی شریک زندگی ہے، چنانچہ فرمایا گیا "ولهن مثل الذی علیهن بالمعروف" کہ جس طرح عورتوں کے حقوق مردوں پر ہیں جن کی ادائیگی لازمی ہے اسی طرح مردوں کے حقوق عورتوں کے ذمہ ہیں جنھیں پورا کرنا ضروری ہے۔

یہ آیت پاک مرد وعورت کے حقوق باہمی کے سلسلے میں ایک قانونی ضابطہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

مرد کی حکیمانہ برتری

البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ دنیوی معاملات میں مرد کا درجہ عورتوں سے بڑھا ہوا ہے، لیکن مردوں کی یہ برتری آمریت واستبداد کی نہیں ہے بلکہ مردوں کو بھی قانون شرع اور بعض معاملات میں عورتوں سے مشورہ کا پابند بنایا گیا ہے، درحقیقت یہ تفوق و برتری خاص مصلحت وحکمت کے تحت ہے اور عطیہ الٰہی ہے جس میں مردوں کی سعی وعمل یا عورتوں کی کوتاہ دستی و بے عملی کا کوئی دخل نہیں ہے، پھر مردوں کی افضلیت کو بیان کرنے کے لئے قرآن حکیم نے عجیب حکیمانہ اسلوب اختیار کیا ہے، ارشاد ہوتا ہے "الرِّجَال قوّامون علی النساء بما فضل اللّٰہ بعضھم علٰی بعض"(۱)

مرد حاکم ونگراں ہیں عورتوں پر اس سبب سے کہ اللہ تعالیٰ نے بعضوں کو بعض پر فضیلت عطا کی ہے اس اسلوب میں یہ حکمت معلوم ہوتی ہے کہ عورتوں اور مردوں کو ایک

---

(۱) سورۃ النساء۔

دوسرے کا بعض اور جزو قرار دے کر اس طرف اشارہ ہے کہ اگر کسی چیز میں مردوں کو فوقیت اور برتری ثابت ہے تو بھی اس کی مثال ایسی سمجھنی چاہیے جیسے کہ انسان کا سر ہاتھ سے افضل و برتر ہے، تو جس طرح سر کی افضلیت ہاتھ کے مقام و مرتبہ اور اہمیت کو کم نہیں کرتی اسی طرح مرد کا حاکم ہونا عورت کے درجہ کو کم نہیں کرتا، یہ دونوں ایک دوسرے کیلئے مثل اعضاء و اجزاء کے ہیں گو مرد سر ہے تو عورت بدن ہے، انسانی جسم اسی وقت حقیقی سکون و راحت حاصل کر سکتا ہے جب کہ جسم کے سارے اعضاء صالح اور تندرست ہوں چنانچہ نیک بیویاں مرد کی سعادت کی علامت ہیں، رسول خدا...... کا ارشاد ہے۔

ما استفاد المؤمن بعد تقوى اللّٰه خيرا له من زوجة صالحة ان امرها اطاعته وان نظر اليها سرته وان اقسم عليها ابرته وان غاب عنها نصحته فى نفسها و ماله رواه ابن ماجه. (۱)

تقویٰ کے بعد کسی مرد مومن نے صالحہ بیوی سے بہتر کوئی چیز حاصل نہیں کی ایسی نیک سیرت و خوبصورت بیوی کو اگر شوہر کوئی حکم دیتا ہے تو وہ اسے بجالاتی ہے اور اگر اس کی جانب دیکھتا ہے تو وہ اسے شاداں و فرحاں کر دیتی ہے اور اگر شوہر اس عورت پر قسم کھالیتا ہے (مثلاً یہ کہ وہ یہ کام کرے گی) تو وہ کام کر کے اس قسم میں اسے صادق کر دیتی ہے، اور اگر شوہر کہیں چلا جاتا ہے تو اس کی غیبوبت اور غیر موجودگی میں اپنی ذات کی اور شوہر کے مال کے سلسلے میں خیر خواہی کا معاملہ کرتی ہے، یعنی اپنی ذات کو فسق وزنا سے اور شوہر کے مال کو خیانت اور ضائع ہونے سے بچائے رکھتی ہے۔

عورتوں کے ساتھ حسنِ سلوک

شوہر و بیوی کے تعلقات انتہائی ذاتی ہوتے ہیں اور بر بنائے بشریت بسا اوقات دونوں میں رنجش بھی ہو جاتی ہے، بعض دفعہ شوہر غصہ میں ڈانٹ ڈپٹ کر دیتا ہے اور کبھی بیوی بھی ناز دکھاتی ہے اس سلسلے میں اللہ کے رسول...... کی ہدایت ہے۔

---

(۱) انتقاء الترغیب والترھیب ص ۱۸۲۔

استوصوا بالنساء خيرا فانهن خلقن من ضلع وان اعوج شیء فی الضلع اعلاه فان ذهبت تقیمه کسرته وان ترکته لم یزل اعوج فاستوصوا بالنساء خیرا (متفق علیه)(۱)

عورتوں کے ساتھ خوش معاملگی اور بھلائی کی وصیت اور تاکیدی حکم کو قبول کرو، کیونکہ عورتیں پسلی سے پیدا کی گئی ہیں (جو ٹیڑھی ہے) پسلی کی ہڈیوں میں سب سے زیادہ کج اور ٹیڑھی اوپر کی پسلی ہے اگر تو اسے سیدھی کرنے کی کوشش کرے گا تو (اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ) اسے توڑ ڈالے گا، اور اگر تو نے اسے یونہی چھوڑ دیا تو وہ بحالہ ہمیشہ کج ہی رہے گی، یہی حال عورتوں کا ہے کہ وہ اپنے انفعالی مزاج اور زود رنج طبیعت کی بناء پر اعمال واخلاق کے لحاظ سے استقامت ودرستگی پر نہیں رہتیں اگر مرد انھیں درست ومستقیم طریقہ پر رکھنے کی سعی کریں گے تو اس کا لازمی نتیجہ طلاق کی صورت میں ظاہر ہوگا، اس لئے عورتوں سے انتفاع واستفادہ کی بس یہی شکل ہے کہ ان کی بدخلقی اور درشت مزاجی کو برداشت کیا جائے اور ان کے ساتھ نرمی وملاطفت کا برتاؤ کیا جائے۔

ایک دوسری حدیث میں رسول خدا...... نے نہایت مؤثر نفسیاتی ہدایت فرمائی ہے ارشاد ہے لا يفرك مومن مومنة ان كره منها خلقا رضى منها آخر، رواه مسلم (۲) کوئی مرد مومن اپنی بیوی سے نفرت ودشمنی نہ رکھے اگر اسے عورت کی کوئی خصلت ناپسند ہے تو دوسری عادت پسند ہوگی (کیونکہ آدمی کے سارے اعمال واخلاق برے ہی نہیں ہوتے بلکہ بعض عمدہ اور بھلے بھی ہوتے ہیں لہٰذا نباہ کا طریقہ یہی ہے کہ اس کے اچھے اخلاق واعمال کو پیش نظر رکھا جائے اور بری عادتوں سے چشم پوشی کی جائے اور صبر وتحمل کے ساتھ ان سے حسن معاشرت کا معاملہ کیا جائے، خود قرآن میں باری تعالیٰ کا ارشاد ہے وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰۤى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّ يَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا (۳) اور زندگی گذارو عورتوں کے ساتھ پسندیدہ طور پر اور اگر وہ تمہیں پسند

---

(۱) مشکوۃ، ج۲، ص۲۸۰۔

(۲) مشکوہ، ج۲، ص۲۸۰۔ (۳) سورۃ النساء۔

نہیں ہیں تو ممکن ہے کہ تمہیں ایک چیز ناپسند ہو اور اسی ناپسند چیز میں اللہ تعالیٰ تمہارے لئے خیر کثیر مقدر فرمادے۔

زوجین کی نزاع کا نظام اصلاح

بہر حال زوجین کے بارے میں اسلام کا تصور یہی ہے کہ یہ ایک جان دو قالب کی تصویر و تعبیر ہوں، پھر بھی اگر بتقاضائے بشریت ان میں ناچاقی پیدا ہو جائے تو صبر و تحمل سے معاملہ کو رفع دفع کرنے کی کوشش کرنی چاہئے، چنانچہ مرد جسے عورت پر قوام و نگراں بنایا گیا ہے کو خطاب ربانی ہے۔

وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَھُنَّ فَعِظُوْھُنَّ وَاھْجُرُوْا ھُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْھُنَّ الخ الآیة(۱) اور جن عورتوں کے متعلق تمہیں بدخوئی و نافرمانی کا یقین ہو جائے تو انھیں سمجھاؤ اور انھیں خوابگاہ میں اکیلے چھوڑ دو، اور (بطور تادیب کے) انھیں مارو۔ آیت کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ اگر عورت سے نافرمانی اور اطاعت میں کمی محسوس کرو تو سب سے پہلے سمجھا بجھا کر ان کی ذہنی اصلاح کرو اس سے کام چل گیا تو معاملہ یہیں ختم ہو گیا اور دونوں ذہنی اذیت و گناہ سے بچ گئے، اگر فہمائش و وعظ و نصیحت سے کام نہ چلے تو دوسرا درجہ یہ ہے کہ اپنی ناراضگی کا عملی اظہار کرو اور اپنا بستر الگ کرلو، اگر یہ نفسیاتی تنبیہ بھی غیر مؤثر ثابت ہو اور اس شریفانہ سزا کے باوجود عورت اپنی بد دماغی اور کجروی سے باز نہ آئیں تو بغرض اصلاح و تادیب انھیں مارو مگر اسی قدر کہ ہڈی نہ ٹوٹے نہ بدن پر اس کا نشان باقی رہے، غرض ہر تقصیر کا ایک درجہ ہے اسی کے موافق تادیب و تنبیہ کی اجازت ہے جس کے تین درجے ترتیب وار آیت میں مذکور ہیں، مارنا پیٹنا آخر کا درجہ ہے سرسری اور معمولی قصور پر مارنا پیٹنا مناسب نہیں ہے۔ چنانچہ بلا وجہ یا ضرورت سے زائد بیویوں کو مارنے والوں کے بارے میں آنحضرت ...... کا فرمان ہے "لیس اولئك بخیار کم" (۲) "یہ لوگ تمہارے اچھے افراد نہیں ہیں" اگر اس آخری سرزنش کے بعد وہ راہ راست پر آجائیں تو

---

(۱) سورہ (۲) سورہ

مقصد پورا ہوگیا، درستگیٔ معاملات کے بعد بھی خواہ مخواہ کے لئے ان کے پیچھے پڑے رہنا کسی طرح بھی درست نہیں ہے۔

یہ ہے زوجین کے مابین نزاع کا اسلامی نظام اصلاح جس کے تحت گھر کا جھگڑا گھر ہی میں ختم ہوجاتا ہے، لیکن بعض اوقات زوجین کی باہمی کشمکش اور نزاع اس حد تک پہنچ جاتی ہے کہ اصلاح حال کی مذکورہ صورتیں کارگر نہیں ہوتیں، اس شدید اختلاف کی صورت میں بھی رشتۂ نکاح کو توڑنے کے بجائے اسلام کی ہدایت ہے کہ اصلاح حال کی ایک کوشش اور کرلی جائے، قرآن حکیم کہتا ہے۔

وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَیْنِھِمَا فَابْعَثُوْا حَکَمًا مِّنْ اَھْلِهٖ وَحَکَمًا مِّنْ اَھْلِھَا اِنْ یُّرِیْدَا اِصْلَاحًا یُّوَفِّقِ اللّٰہُ بَیْنَھُمَا. (۱)

اور اگر تم کو معلوم ہو کہ زوجین میں اختلاف وضد ہے (اور وہ اپنے باہمی نزاع کو خود نہ سلجھا سکیں گے) تو ایک منصف مرد کے اقارب میں سے اور ایک منصف عورت کے عزیزوں میں سے (بغرض فیصلہ زوجین کے پاس بھیجو) اگر یہ دونوں منصف زوجین کے مابین اصلاح حال کا قصد کریں گے تو اللہ تعالیٰ (ان کے حسن نیت وسعی) سے زوجین میں اتفاق پیدا کردے گا۔

رفع نزاع واصلاح حال کا یہ ایسا آسان، پاکیزہ اور شریفانہ طریقہ ہے جس سے کوچہ وبازار کی رسوائی اور جگ ہنسائی کے بجائے خاندان کی بات خاندان تک محدود رہ جاتی ہے اور عزیز واقارب کے جذبۂ خیر خواہی سے مصالحت وموافقت کی صورت بھی پیدا ہوسکتی ہے۔

ان تفصیلات سے یہ بات اچھی طرح واضح ہوجاتی ہے کہ شریعت کی نگاہ میں نکاح ایک بہت ہی سنجیدہ وقابل احترام معاملہ ہے جو اس لئے کیا جاتا ہے کہ باقی رہے، یہاں تک کہ موت ہی زوجین کو ایک دوسرے سے جدا کردے، یہ ایک ایسا قابل قدر رشتہ ہے جو اتباعِ سنت، رضائے الٰہی اور تکمیل انسانیت کا ذریعہ ہے، اس کے استحکام پر گھر، خاندان

---

(۱) سورۃ النساء۔

اور معاشرے کا استحکام موقوف ہے اور اس کی خوبی و خوشگواری پر معاشرے کی خوبی و بہتری کا مدار رہے، یہ ایک ایسا عقد ہے جس کے انقطاع اور ٹوٹنے سے صرف میاں بیوی ہی متاثر نہیں ہوتے بلکہ اس سے پورا نظام خانگی بکھر جاتا ہے اور بسا اوقات فساد و نزاع اور مقدمہ بازی تک نوبت آجاتی ہے جس سے معاشرہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا، اس لئے اسلام نے ان اسباب و وجوہ کو جو اس محترم و بابرکت رشتہ کی بقاء کے لئے خطرہ بن سکتے ہیں انھیں راہ سے ہٹانے کا مکمل انتظام کر دیا ہے۔

طلاق ایک ناگزیر ضرورت

لیکن بسا اوقات حالات اس قدر بگڑ جاتے ہیں اور زوجین کا اختلاف ایسی شدت اختیار کر لیتا ہے کہ اصلاح موافقت کی ساری کوششیں بے سود ونا کارہ رہ جاتی ہیں اور رشتۂ ازدواج سے مطلوب ثمرات وفوائد حاصل ہونے کے بجائے زوجین کا باہم ایک ساتھ رہنا عذاب بن جاتا ہے، ایسی ناگزیر حالت میں ازدواجی تعلق کا ختم کر دینا ہی دونوں کے لئے بلکہ پورے خاندان کے لئے راحت وسلامتی کی راہ ہوتی ہے، اس ازدواجی تعلق کو ختم کرنے کو ''طلاق'' کہا جاتا ہے، جن مذاہب میں طلاق کا اصول نہیں ہے ان میں ایسے حالات میں سخت مشکلات کا سامنا ہوتا ہے، اور بعض اوقات انتہائی برے اور خطرناک نتائج سامنے آجاتے ہیں اس لئے شریعت اسلامی نے ایسے ناگزیر حالات میں طلاق کی اجازت دی، اور بعض دیگر مذاہب کی طرح یہ نہیں کہا کہ یہ رشتہ ہر حال میں ناقابل فسخ ہی رہے بلکہ قوانین نکاح کی طرح طلاق و فسخ کے لئے بھی عادلانہ وحکیمانہ قانون اور ضابطے مقرر کئے۔

اختیار طلاق مرد کو کیوں؟

طلاق کا اختیار تو صرف مرد کو دیا جس میں عادتاً فکر و تدبر اور تحمل و برداشت کا مادہ عورت سے زیادہ ہوتا ہے، اور خود عورت کی مصلحت کے تحت عورت کے ہاتھ میں یہ

آزادانہ اختیار نہیں دیا، کیونکہ اپنے انفعالی مزاج کی بناء پر وہ وقتی تأثرات سے مغلوب ہوجاتی ہیں علاوہ ازیں مرد کی قوامیت وافضلیت بھی یہی چاہتی ہے کہ یہ اختیار اسی کو حاصل رہے، لیکن عورت کو بھی اس حق سے یکسر محروم نہیں کیا کہ وہ ”کالمیت فی ید الغسّال“ شوہر کے ظلم اور زیادتیوں کا نشانہ بنی رہے اور اپنی رہائی کے لئے کچھ نہ کرسکے بلکہ اسے بھی یہ حکم دیا کہ حاکم شرعی کی عدالت میں اپنا معاملہ پیش کرکے قانون کے مطابق نکاح فسخ کراسکتی یا طلاق حاصل کرسکتی ہے۔

پھر مرد کو طلاق کا اختیار دے کر اسے بالکل آزاد نہیں چھوڑ دیا گیا بلکہ اسی کے ساتھ اسے یہ تنبیہ بھی کی گئی ہے ابغض الحلال الی اللہ عزوجل الطلاق،(۱) اللہ کی حلال کردہ چیزوں میں (بغیر ضرورت کے) طلاق سے زیادہ اور کوئی چیز نہیں ہے۔

نیز مرد کو تاکیدی ہدایت دی گئی کہ کسی وقتی وہنگامی تأثر وناگواری میں طلاق کے حق کو استعمال نہ کیا جائے۔

ان تمام تر ہدایات اور پیش بندیوں کے باوجود کوئی شخص نادانی وحماقت یا شدّت تأثر میں بیک تلفظ تین طلاقیں دے کر اپنا پورا اختیار استعمال کرے تو شرعی ضابطہ کے مطابق تینوں طلاقیں واقع ہوجائیں گی ایسا شخص بیوی سے محروم ہوجانے کے ساتھ شریعت اسلامی کی نظر میں مجرم ومعصیت کار ہوگا، ظاہر قرآن احادیث صحیحہ اور آثار صحابہ سے یہی ثابت ہے کہ مجلس واحد یا کلمۂ واحدہ کی تین طلاقیں تین ہی شمار ہونگی شریعت اسلامی کا یہ ایسا مسئلہ ہے جس پر عہد فاروقی میں اجماع ہوچکا ہے اور جمہور تابعین، ائمہ محدثین فقہاء مجتہدین، اکابر علم ودین کا اسی پر اتفاق ہے، ابتدائے اسلام سے آٹھویں صدی ہجری کے اوائل تک امت کے اس اتفاقی واجماعی مسئلہ کے خلاف کوئی قابل اعتبار آواز سنائی نہیں دیتی۔

دلائل کی تفصیل کیلئے ہماری کتاب ”تین طلاق صحیح ماخذ کی روشنی میں“ دیکھی جائے۔

☆ ☆ ☆

---

(۱) سنن ابی داؤد، ج۱، ص۳۰۲ والمستدرك للحاکم، ج۲، ص۹۶۹ وقال الذهبیؒ صحیح علی شرط مسلم

نکاح کے شرعی قوانین

تعریف نکاح

۱- نکاح ایک شرعی معاہدہ ہے جس کے ذریعہ مرد وعورت کے درمیان جنسی تعلق جائز اور اولاد کا نسب صحیح ہو جاتا ہے اور زوجین کے درمیان دیوانی حقوق پیدا ہو جاتے ہیں۔

تشریح

نکاح کے لغوی معنی ''ملانا'' اور حقیقی معنی ''جماع'' کے ہیں، اور اس کا مقصد جائز اولاد پیدا کرنا ہے۔(۱)

معاہدہ نکاح کی نوعیت اور عدالتیں

جہاں تک معاہدۂ نکاح کی نوعیت کا تعلق ہے اس بارے میں عدالت ہائے عالیہ ہندو پاک اور پوری کونسل کا زمانہ دراز سے یہ نقطۂ نظر رہا ہے کہ دیگر عام معاہدات کی طرح نکاح ایک دیوانی معاہدہ ہے چنانچہ غیر منقسم ہندوستان کے مشہور جج جسٹس محمود نے تقریباً اسّی سال قبل بمقدمہ عبدالقادر بنام سلیمہ بی اسلامی قانون میں نکاح کی نوعیت پر بحث کرتے ہوئے اس سے اتفاق کیا کہ مسلمانوں میں نکاح ایک مذہبی رسم نہیں بلکہ ایک خالص دیوانی معاہدہ ہے۔ جسٹس محمود کے اس نقطۂ نظر کو اختیار کرنے کے بعد ہندو پاک کی تقریباً تمام ہی

---

(۱) النکاح فی اللغة الضم ثم یستعمل فی الوطء ... والتوالد والتناسل من المقاصد، کفایة علی الهدایة ص ۹۸۔

عدالتوں نے نکاح کو ایک خالص دیوانی معادہ قرار دیا- حالانکہ اسلامی نکاح کو خالص دیوانی معاہدہ کہنا اسلامی تصور نکاح کے ساتھ سراسر زیادتی اور ناانصافی ہے۔

صحیح نقطۂ نظر

حقیقت یہ ہے کہ نکاح ایک مقدس شرعی معاہدہ ہے، البتہ جو حقوق وفرائض اس کے ذریعہ زوجین کے درمیان پیدا ہوتے ہیں وہ دیوانی نوعیت کے حامل ہیں، اور عدالتوں کے ذریعہ نافذ کرائے جاسکتے ہیں— لیکن محض حقوق کے دیوانی ہونے کی بناء پر نکاح کو خالص دیوانی معاہدہ نہیں کہا جاسکتا، وہ حقوق کسی ملک کے قانون ساز ادارے نے عطا نہیں کئے ہیں بلکہ ایجاب وقبول سے جو معاہدۂ نکاح مشہود ہوتا ہے اس کے ساتھ ہی وجملہ حقوق و ذمہ داریاں ایک دوسرے سے وابستہ ہوجاتی ہیں جو اللہ تعالیٰ کے فرمان اور شارع علیہ السلام کی ہدایات پر مبنی ہیں اسی لئے فقہائے اسلام نے نکاح کو عبادات اور معاملات دونوں میں داخل کیا ہے۔

نکاح— ایک شرعی حکم

نکاح کو نبی کریم ...... نے اپنی اور انبیاء کی سنت کہا ہے(۱)، چنانچہ حالتِ اعتدال میں نکاح سنت مؤکدہ ہے(۲) اور جب زنا میں پڑ جانے کا خوف ہو اور مرد عورت کے مہر و نفقہ پر قادر ہو تو نکاح واجب ہے، جس کا نہ کرنا باعثِ گناہ ہے(۳)

---

(۱) قال اللہ علیہ وسلم اربع من سنن المرسلین الحناء والتعطر والسواك والنکاح رواہ الترمذی، قالؐ اتزوج النساء فمن رغب عن سنتی فلیس منی، فتح القدیر، ص۱۰۱۔

(۲) قیل مستحب وقیل انه سنة مؤکدة وهو الاصل وهو محمل قول من اطلق الاستحباب وکثرا ما یتساهل فی اطلاق المستحب علی السنة، فتح القدیر، ص۱۰۱۔

(۳) وفی النهایة ان کان له خوف الوقوع فی الزنا بحیث لاتمکن من التحرز الابه کان فرضا۔ فتح القدیر، ص۱۰۰۔ فهو فی حالة الاعتدال سنة مؤکدة وحالة التوقان واجب وحالة خوف الجور مکروه کذا فی الاختیار شرح مختار، عالمگیری، ج۱ ص۲٦۷۔

نکاح — ایک عبادت

صحابۂ کرام و حنفی فقہاء کے اقوال کے بموجب نکاح کی مشغولیت نفل عبادت سے افضل ہے۔(۱)

مختلف اسلامی فرقوں اور مذاہب کے افراد کے درمیان نکاح

۲- مسلمانوں کے ہر فرقے کے مرد و عورت کے درمیان باہم نکاح جائز ہے۔

تشریح: ایک مسلمان مرد یا عورت خواہ اس کا تعلق کسی مسلمان فرقے یا مکتب فکر سے ہو باہم آزادی کے ساتھ نکاح کر سکتے ہیں، چنانچہ مسلمان مرد یا عورت کا ایسے فرقوں سے جن کو باجماع امت مسلم تصور کیا گیا ہے، متعلق ہونا عورت کی قابلیت نکاح کو متاثر نہیں کرتا اور باہم نکاح جائز ہوگا۔

مختلف فرقوں سے متعلق ہونے کی صورت میں زوجین کے حقوق و فرائض کا تعین

۳- زوجین کا تعلق اگر مختلف مسلم فرقوں سے ہو تو ان کے ازدواجی حقوق و فرائض اس فرقے کے مطابق ہوں گے جس کے وہ بوقت نکاح پابند ہوں — الّا یہ کہ انھوں نے یا ان میں سے کسی ایک نے اپنی مرضی سے اپنے فرقے کے مذہب کو چھوڑ کر دوسرے فرقے کے مذہب کو اختیار کر لیا ہو، اس صورت میں ان کے حقوق و فرائض اس کے اختیار کردہ مذہب کے مطابق ہوں گے۔

تشریح: زوجین کے مختلف مسلم فرقوں سے متعلق ہونے کی صورت میں ہر فریق کے ازدواجی حقوق و فرائض کا تعین اس فرقے کے احکام کے مطابق ہوگا۔ جس سے وہ بوقت نکاح متعلق تھا، چنانچہ نکاح کے بعد عورت اپنی جداگانہ حیثیت برقرار رکھ سکتی ہے اور

---

(۱) وھو افضل من التخلی لنفل العبادة۔ الکفایہ علی شرح الھدایہ ص ۹۸۔

اسے مجبور نہیں کیا جاسکتا کہ وہ شوہر کے فرقے کے احکام کی پیروی کرے، البتہ کوئی فریق اپنی مرضی سے اپنے فرقے کو چھوڑ کر دوسرے فرقے کے مذہب کو اختیار کرسکتا ہے، ایسی صورت میں اس کے حقوق وفرائض اس تبدیل شدہ فرقے کے مطابق ہوں گے۔

کتابیہ سے نکاح

۴-مسلمان مرد کا کتابیہ عورت سے نکاح جائز ہے مگر کتابیہ حربیہ سے نکاح مکروہ ہے۔

تشریح: مسلمان مردوں کا نکاح ان غیر مسلم عورتوں سے جائز ہے جو اہل کتاب ہوں یعنی کسی آسمانی کتاب کی معتقد ہوں (۱)

اہل کتاب سے عیسائی و یہودی مذاہب کے پیرو مراد ہیں۔

اگر کسی عورت کے باپ یا ماں میں سے ایک کتابی ہو اور دوسرا مشرک مجوسی وغیرہ تب بھی وہ عورت کتابیہ کہلائے گی۔ مگر امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ کے نزدیک ایسی عورت کتابیہ نہ ہوگی اور اس سے نکاح حلال نہیں ہے (۲)

نکاحِ کتابیہ اور قرآن

کتابیہ عورتوں سے نکاح کی اجازت خود قرآن پاک میں دی گئی ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں "والمحصنٰت من المؤمنات والمحصنٰت من الذین

---

(۱) ذهب جمهور الفقهاء الى انه يحل الزوجة بالذمية من اليهود والنصارىٰ واستعملوا بهذه الآية الكريمة "والمحصنٰت من الذين اوتو الكتاب من قبلكم"۔ تفسير آيات الاحكام محمد على الصابونى ج۱ ص۵۳۶۔

(۲) اذا كان احدهما كتابيا والآخر مجوسيًا اُمّا وابّا، فحكمنا بان الولد كتابى يجامع الانظر للولد فى الدنيا بالاقتراب من المسلمين بالاحكام من حل الذبيحة والمناكحة ... والشافعى يخالفنا اى فيما اذا كان احدهما كتابيا والآخر مجوسيا فيقول فيما اذا كان الاب كتابيا والام مجوسية انه مجوسى فى اصح قوليه وبه قال احمدؒ فتح القدير ج۳ ص ۲۸۷۔

اوتوالکتاب من قبلکم" (پ٦ رکوع ٥) **یعنی** (حلال ہیں پاک دامن عورتیں جو مسلمان ہیں اور پاک دامن عورتیں ان میں سے جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی)۔

کتابیہ حربیہ سے نکاح مکروہ قرار دینے کی وجہ یہ ہے کہ اس نکاح سے یہ اہم ترین خطرہ پیدا ہوجاتا ہے کہ غیر مسلم ماں کی آغوش میں تربیت پائی ہوئی اولاد اسلامی معاشرے کے لئے کارآمد ثابت نہ ہوسکے گی، اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک مسلمان گھرانے میں غیر اسلامی طریقے اختیار کرے، چنانچہ حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ نے جب ایک یہودیہ سے نکاح کیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس کی اطلاع پہنچی تو آپ نے حذیفہ رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ اس عورت کو چھوڑ دو، حذیفہؓ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا کہ یہ حکم کس بنا پر ہے؟ کیا کتابیہ عورت سے نکاح حرام ہے؟ آپ نے جواب دیا کہ حرام نہیں ہے مگر مجھے خوف ہے کہ کہیں تم لوگ اہل کتاب کی آبرو باختہ عورتوں میں نہ پھنس جاؤ۔(۱)

نکاح کتابیہ اور شیعہ مکتبۂ فکر

کتابیہ عورتوں سے نکاح جائز (مگر مکروہ) ہونے کے بارے میں سنیوں کا اتفاق ہے لیکن شیعہ مکتبۂ فکر میں اس سلسلے میں اختلاف پایا جاتا ہے، چنانچہ اصولی شیعہ اور معتزلہ، احناف سے متفق ہیں اور کتابیہ عورتوں سے نکاح کو جائز سمجھتے ہیں جبکہ اخباری شیعوں کے نزدیک مسلم کا غیر مسلمہ کے ساتھ نکاح دائمی طور پر جائز نہیں، ان کے نزدیک کتابیہ عورتوں سے صرف متعہ جائز ہے۔(۲)

---

(۱) معارف القرآن، از مولانامفتی محمّد شفیعؒ، ج۳ ص ٦٢، ٦٣۔ بحواله احکام القرآن جصاص رازی، کتاب الآثار امام محمد ص ١٥٦۔

(۲) اما الکتابیة من الیهودیة والنصرانیة ففیه اقوال اشهرها المنع فی النکاح الدائم والجواز فی المنقطع، قیل بالمتع مطلقا قیل بالجواز کذلك والاقویٰ الجواز فی المنقطع واما فی الدائم فالاحوط المنع۔ تحریر الوسیلة للخمینی ج٢ ص ٤٢٢۔

جواز نکاح

اہلیت نکاح

۵- ہر عاقل، بالغ مسلمان مرد اور عورت بلا وساطت ولی نکاح کی اہل ہے، البتہ عورت کے مہر مثل سے کم پر یا غیر کفو سے نکاح کر لینے کی صورت میں اس کے ولی کو بذریعہ عدالت (شرعی پنچایت) نکاح فسخ کرانے کا حق حاصل ہوگا۔

تشریح: یہ مسئلہ متفق علیہ ہے کہ ایک عاقل بالغ مرد اپنا نکاح خود کرنے کا اہل و مجاز ہے اسی طرح ایک بالغہ ثیبہ (شوہر دیدہ عورت جو مطلقہ یا بیوہ ہو) بھی اپنا نکاح خود کرنے کی مجاز ہے، لیکن باکرہ، عاقلہ، بالغہ عورت کے اپنا نکاح خود کرنے کے بارے میں ائمہ کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے، امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک اور صاحبین کے آخری قول کے مطابق ایک باکرہ بالغہ عاقلہ عورت کو اپنا نکاح بلا وساطت ولی خود کرنے کا اختیار حاصل ہے۔

اس بارے میں شیعہ مکتب فکر بھی حنفیہ سے متفق ہے لیکن مالکیہ اور شافعیہ مکتب فکر کے نزدیک ایک باکرہ بالغہ و عاقلہ عورت اپنا نکاح ولی کی وساطت کے بغیر نہیں کر سکتی۔(۱)

راجح شرعی حکم

دونوں نقطۂ نظر کی تفصیلات دیکھنے سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ شافعیہ کا یہ نظریہ کہ عورت نکاح کی حقیقت سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتی اور اس کے نکاح کیلئے ولی کی وساطت ناگزیر ہے، دراصل عورت کی آزاد مرضی کو مشروط بنانے اور اس کے ذاتی حق و اختیار پر ایک قدغن کے مرادف ہے، البتہ مسلم معاشرے کو انتشار سے محفوظ رکھنے کیلئے شرع نے

---

(۱) وینعقد نکاح الحرة العاقلة البالغة برضاها وان لم یعقد علیها ولی بکرا کانت او ثیبا عند ابی حنیفة وابی یوسف رحمهما الله فی ظاهر الروایة... وقال مالك والشافعی رحمهما الله لاینعقد النکاح بعبارة النساء اصلا الخ، هدایه مع فتح القدیر ج۳ ص ۱۵۷۔

اولیاء کو یہ حق دیا ہے کہ اگر لڑکی نے ولی کی اجازت کے بغیر غیر کفو میں نکاح کرلیا ہو یا مہر مثل سے کم پر کیا ہو تو ولی عدالت (شرعی پنچایت) میں تنسیخ نکاح کا دعویٰ کرسکتا ہے اور عدالت معقول شرعی وجوہ کی بناء پر نکاح کو فسخ کرسکتی ہے۔

انعقادِ نکاح

۶- نکاح مرد و عورت کے ایجاب و قبول سے منعقد ہوتا ہے۔

تشریح: نکاح کا انعقاد ایجاب و قبول پر منحصر ہے، ایجاب نکاح کی پیش کش کرنے والے کلام اوّل کو کہتے ہیں، اور اس کو منظور کرنے والے کلام کو قبول کہتے ہیں۔ الکافی میں لکھا ہے کہ ایجاب و قبول نکاح کے ستون ہیں پہلا قول خواہ کسی فریق کی جانب سے ہو ایجاب کہلائے گا اور اس کا جواب دوسرے فریق کی جانب سے قبول (۱)

قاضی کی ضرورت

۷- انعقاد نکاح کے لئے کسی رجسٹرار قاضی یا نکاح خوانندہ کی ضرورت نہیں ہے۔

تشریح: فریقین ایک دوسرے سے خود اپنا نکاح کرسکتے ہیں، یہ ضروری نہ ہوگا کہ کوئی دوسرا شخص ان کا نکاح پڑھائے اسلام میں نکاح کے لئے قاضی یا پادری کی ضرورت نہیں ہے۔

ایجاب وقبول زبانی یا تحریری

۸- ایجاب و قبول زبانی یا تحریری دونوں طرح جائز ہے۔

تشریح: اگر فریقین اصالتاً یا وکالۃً مجلس نکاح میں موجود ہوں تو زبانی ایجاب و قبول لازم ہوگا الّا یہ کہ کسی معذوری کے سبب ایسا کرنا ممکن نہ ہو- اور اگر کوئی فریق اصالتاً یا

---

(۱) واما رکنه فالایجاب والقبول کما فی الکافی والایجاب ما یتلفظ به اولا من ای جانب کان والقبول جوابه، هکذا فی العنایه، عالمگیری ج۱ ص ۲۶۷۔

وکالتاً مجلس نکاح میں موجود نہ ہو بلکہ اس کی طرف سے ایجاب مستند تحریر کی شکل میں موجود ہو اور وہ ایجاب بموجودگی گواہان مجلس نکاح میں پڑھا جائے اور فریق ثانی اس کے جواب میں اپنی منظوری ظاہر کردے تو نکاح منعقد ہو جائے گا۔(۱)

ایجاب وقبول اصالتاً یا وکالتاً

۹- (۱) ایجاب وقبول اصالتاً یا وکالتاً دونوں طرح جائز ہے بشرطیکہ وکیل عقل وتمیز رکھتا ہو۔ (۲) اگر شخص غیرمجاز (فضولی) کسی کا نکاح کردے یا اپنے اختیار سے تجاوز کرتے ہوئے مؤکل کی جانب سے نکاح کا ایجاب یا قبول کرلے تو ایسا نکاح موکل کی اجازت پر موقوف رہے گا، اگر اس نے اجازت دے دی تو نافذ ہو جائے گا ورنہ کالعدم قرار پائے گا۔

تشریح: یہ مسئلہ متفقہ ہے کہ نکاح میں ایجاب وقبول وکلاء کے ذریعہ ہوسکتا ہے۔

وکیل نکاح کی اہلیت

حنفیہ کے نزدیک ایسے عاقل لڑکے کو جو اچھے و برے، نفع ونقصان کی تمیز وسمجھ رکھتا ہو اگرچہ بالغ نہ ہو وکیل بنانا جائز ہے، احناف کے نزدیک وکالت میں بلوغ وحریت کی شرط نہیں

---

(۱) فلفظ النکاح فی قوله النکاح ینعقد بمعنی العقد ای ذلك العقد خاص ینعقد حتی تتم حقیقته فی الوجود بالایجاب والقبول والانعقاد هو ارتباط احد الکلامین بالآخر علی وجه یسمی باعتباره عقد اشرعیا ویستعقب الاحکام وذٰلك بوقوع الثانی جوابًا معتبرا محققا لغرض الکلام السابق یسمع کل من العاقدین کلام صاحبه ... فلو کتبا الایجاب والقبول لاینعقد. فتح القدیر ج۳ ص ۱۰۲۔ وفی عالمگیریة ولا ینعقد بالکتابة من الحاضرین فلو کتب تزوجتك فکتبت قبلت لم ینعقد هکذا فی النهر الفائق۔ فتاوی عالمگیریه ج۱ ص ۲۷۰۔ و فی الفتاوی الخانیة رجل قال بحضرة الشاهدین تزوجت فلانة فبلغها بحضرة الشاهدین فقبلت لم یجز فی قول ابی حنیفة ومحمد رحمهما الله ولو ارسل الرجل رسولا الیها او کتب الیها کتابا انی تزوجتك علی هذا فقبلت بحضرة الشاهدین ان سمعا کلام الرسول او قراء الکتاب علیهما فقبلت جاز وان لم یسمعا کلام الرسول اولم یقرء الکتاب علیهما فقبلت لایجوز فتاویٰ قاضی خان حاشیه بر عالمگیری ج۱ ص ۳۲۶۔

ہے، صرف عاقل ہونا شرط ہے، امام شافعیؒ کے نزدیک صبی (نابالغ لڑکے) کی وکالت درست نہیں کیونکہ وہ غیر مکلّف ہے۔

کلکتہ ہائی کورٹ نے ایک مقدمہ عرفان الدین بنام بدّن شیخ میں یہ قرار دیا کہ یہ امر کہ وہ وکیل جس نے لڑکی کی جانب سے بحیثیت وکیل عمل کیا نابالغ تھا نکاح کے جواز کو متاثر نہیں کرتا کیونکہ زیر دفعہ ۱۸۴ معاہدہ ۱۸۷۲÷ ایک نابالغ اصل شخص اور شخص ثالث کے درمیان بحیثیت کارندہ عمل کرسکتا ہے۔ (۱۵۱ انڈین کیسیز ص ۵۸۳)

ایجاب وقبول کے الفاظ

۱۰- نکاح ایجاب وقبول کے ایسے الفاظ سے منعقد ہوسکتا ہے جو اپنی تاثیر کے اعتبار سے عاقدین نکاح کو شرع کے مطابق فوری طور پر رشتہ ازدواج میں منسلک کردیں۔ مثلاً

(الف) میں نے اپنی لڑکی تمہارے نکاح میں دے دی
(ب) میں نے اپنی لڑکی تمہارے ملک میں دے دی
(ج) میں نے اپنی لڑکی تمہیں ہبہ کردی۔

تشریح: احناف کے نزدیک نکاح مختلف کلمات مثلاً نکاح، تزویج، تملیک، ہبہ وغیرہ سے منعقد ہوسکتا ہے، لیکن امام شافعی کے نزدیک نکاح صرف نکاح یا تزویج کے الفاظ سے منعقد ہوتا ہے، اسی طرح شیعہ مکتب فکر میں بھی نکاح یا تزویج کے الفاظ کے بغیر نکاح منعقد نہیں ہوتا، بہرحال ایجاب وقبول کے الفاظ ایسے ہونے چاہئیں جو لفظاً ومعناً اور عرفاً نکاح پر دلالت کرتے ہوں(۱)

گونگے بہرے کا ایجاب وقبول

اگر فریقین یا ان میں سے کوئی ایک گونگا یا بہرا ہو تو ایجاب وقبول اشارے کے

---

(۱) وينعقد بلفظ النكاح والتزويج والهبة والتمليك والصدقة وقال الشافعى رحمه الله لا ينعقد الا بلفظ النكاح والتزويج هدايه مع فتح القدير ج۳ ص ۱۰۵۔

ذریعہ ہوسکتا ہے، لیکن وہ اشارہ ایسا ہونا چاہئے جس سے فریقین پر یہ واضح ہوجائے کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ رشتہ زوجیت میں منسلک ہورہے ہیں۔(۱)

ایجاب وقبول کے صیغے

۱۱- ایجاب وقبول کے الفاظ میں دونوں صیغے ماضی کے ہوں گے یا ایک ماضی اور دوسرا مستقبل کا۔

تشریح: ایجاب وقبول کے لئے دونوں صیغے ماضی کے ہوں جیسے کوئی کہے کہ میں نے اپنا یا اپنی بیٹی کا یا اپنی مؤکلہ کا نکاح تجھ سے کیا اور دوسرا کہے میں نے قبول کیا۔ نکاح ان دولفظوں سے بھی منعقد ہوجاتا ہے، جن میں سے ایک لفظ ماضی کے لئے موضوع ہو اور دوسرا مستقبل یا حال کیلئے، مستقبل سے مراد امر کا صیغہ ہے، جیسے کوئی کہے کہ میرا نکاح اپنی ذات سے کردے۔ یا یوں کہے کہ تو میری بیوی ہوجا، اور دوسرا کہے کہ میں نے تیرا نکاح اپنی ذات سے کردیا، یا میں تیری بیوی ہوگئی۔ نکاح ان دولفظوں سے بھی ہوسکتا ہے جن میں ایک صیغہ ماضی کا اور دوسرا مضارع کا ہو لیکن صیغہ مضارع سے اس وقت نکاح منعقد ہوگا جب کہ متکلم اس سے استقبال کے معنی کا ارادہ نہ کرے، بلکہ حال مراد ہو، ورنہ وعدۂ نکاح ہوگا نہ کہ ایقاع نکاح۔ بہرحال ایجاب وقبول میں سے ایک صیغہ ماضی کا ہونا ضروری ہے۔(۲)

ایجاب وقبول میں مطابقت

۱۲- ایجاب وقبول کیلئے ایک کلام کا دوسرے کلام سے مطابق ہونا ضروری ہے۔

تشریح: ایجاب وقبول کیلئے ضروری ہے کہ ایک کلام دوسرے سے مختلف نہ ہو، چنانچہ اگر ایک نے دوسرے سے کہا کہ میں نے اپنی بیٹی کا نکاح تجھ سے ایک ہزار درہم پر

---

(۱) وکما ینعقد بالعبارة ینعقد بالاشارة من الاخرس ان کانت اشارة معلومة، کذا فی البدائع۔ عالمگیری ج۱ ص ۲۷۰۔

(۲) وینعقد بالایجاب والقبول وصغا للمضی او وضع احدھما للمضی والآخر لغیرہ مستقبلا کان کالامر او حالا کالمضارع کذا فی النھر الفائق عالمگیری ج۱ ص ۲۷۰۔

کیا اور مرد نے جواب دیا کہ میں نے قبول کیا لیکن مہر قبول نہیں کرتا تو نکاح بالکل باطل ہوگا، یعنی سرے سے منعقد ہی نہ ہوگا۔(۱)

جواز نکاح

۱۳- نکاح کا جواز دونوں نکاح کرنے والے یا ان کے اولیاء کے عاقل و بالغ ہونے اور دو عاقل و بالغ مردوں یا ایک مرد اور دو عورتوں کی سماعت میں برضامندی فریقین ایک مجلس میں ایجاب وقبول پر منحصر ہے بشرطیکہ دونوں نکاح کرنے والے یا ان میں سے کسی ایک کی ذات میں کوئی ایسا مرض شرعی موجود نہ ہو جو مانع نکاح ہو۔

تشریح: فقہاء نے نکاح کی شرائط کو تین انواع میں تقسیم کیا ہے:

۱۔ شرائط انعقادِ نکاح

۲۔ شرائط جوازِ نکاح

۳۔ شرائط لزومِ نکاح

انعقاد نکاح کی شرائط کو دو انواع میں تقسیم کیا گیا ہے۔

(الف) وہ شرائط جن کا تعلق عاقدین نکاح سے ہے۔

(ب) وہ شرائط جن کا تعلق مجلس عقد سے ہے۔

انعقاد نکاح کی پہلی شرط — عقل

جن شرائط کا تعلق عاقدین نکاح سے ہے ان میں ایک عقل ہے، نکاح کے منعقد ہونے کے لئے عاقل ہونے کی شرط لازمی ہے کیونکہ پاگل یا بے عقل لڑکا نکاح کی اہلیت نہیں رکھتا لیکن صبی عاقل کا کیا ہوا نکاح اس کے ولی کی اجازت پر موقوف ہوگا۔

انعقاد نکاح کی دوسری شرط — بلوغ

انعقاد نکاح کی دوسری شرط بلوغ ہے کیونکہ نکاح کی قابلیت بلوغ ہی سے پیدا ہوتی ہے اگر متناکحین یا ان میں سے کوئی ایک بالغ نہ ہو تو ان کا کیا ہوا نکاح منعقد نہ ہوگا البتہ

---

(۱) اوقال رجل لرجل زوجتك ابنتي على كذا فقال الزوج قبلت النكاح ولا اقبل المهر قالوا لايصح النكاح وهو باطل۔ فتاویٰ قاضی خاں۔

نابالغ کی طرف سے اس کا ولی ایجاب یا قبول کرسکتا ہے۔(۱)

بلوغ اور حنفیہ و شافعیہ مکاتیب فکر

شرعاً لڑکی اس وقت بالغ سمجھی جاتی ہے جب کہ اسے حیض شروع ہو جائے، حیض آنے کی کم از کم مدت ۹؍سال ہے، حیض نہ آنے یا بلوغ کی کوئی دوسری شہادت نہ ہونے کی صورت میں امام ابوحنیفہ کے نزدیک لڑکی کی عمر بلوغ سترہ سال ہے۔

لڑکا اس وقت بالغ سمجھا جاتا ہے جبکہ اسے احتلام ہونے لگے اس کی کم از کم عمر ۱۲؍سال ہے احتلام یا بلوغ کی کوئی دوسری شہادت نہ ہونے کی صورت میں امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک لڑکا اٹھارہ سال کی عمر میں بالغ سمجھا جائے گا، لیکن امام ابویوسف اور امام محمد نے اس مسئلہ میں امام اعظم سے اختلاف کیا ہے ان کے نزدیک اگر لڑکا محتلم یا لڑکی حائض ہو جائے یا دونوں اپنی عمر کے پندرہ سال پورے کرلیں تو بالغ متصور ہوں گے، امام شافعیؒ نے بھی صاحبین کی رائے سے اتفاق کیا ہے۔ احناف اب اسی قول پر فتویٰ دیتے ہیں۔

شیعہ مکتبہ فکر

شیعہ مکتب فکر کے نزدیک بھی لڑکے اور لڑکی دونوں کا بلوغ شرعی پندرہواں سال قمری ختم ہونے پر قیاس کرلیا جائے گا، الاّیہ کہ شہادت سے یہ ثابت کردیا جائے کہ بلوغ اس سے پہلے ہو چکا تھا۔

تیسری شرطِ انعقادِ نکاح — رضامندی

عاقدین نکاح سے متعلق نکاح کی تیسری شرط رضامندی ہے، طرفین کی رضامندی کے بغیر نکاح جائز نہ ہوگا خواہ عورت باکرہ بالغہ ہو یا ثیبہ رضامندی لازمی ہے، احناف کے نزدیک اس کا ولی اس کو نکاح پر مجبور نہیں کرسکتا یہ ولی خواہ اس کا باپ ہی کیوں نہ ہو۔(۱)

---

(۱) واما شروطه فمنها العقل والبلوغ والحرية فى العاقد الا ان الاول شرط الانعقاد، فلا ينعقد نكاح المجنون والصبى الذى لايعقل والاخير ان شرطا النفاذ فان نكاح الصبى العاقل يتوقف نفاذه على اجازة وليه، هكذا فى البدائع ج٢ ص ٢٣٢ و ٢٣٣ فتاویٰ عالمگیری ج١ ص٢٦٧۔

(۱) ولا يجوز على بالغة صحيحة العقل من اب وسلطان بغير اذنها بكرا كانت او ثيبًا فان فعل ذلك فالنكاح موقوف على اجازتها فان اجازته جاز وان ردته بطل كذا فى السراج الوهاج، فتاویٰ عالمگیری ج١ ص ٢٨٧، وفى الهدايه ولا يجوز اجبار البكر البالغة على النكاح، ج٢ ص٢٩٤.

معنوی رضامندی

رضامندی صریح یا معنوی دونوں طرح ہوسکتی ہے، باکرہ لڑکی کا مسکرادینا، ہنس دینا، یا خاموش رہنا یا بلا آواز رونا معنوی رضامندی سمجھی جائیگی لیکن اگر ہنسی سے تضحیک یا تمسخر ظاہر ہوتا ہو یا خاموشی سے غم وغصہ کا اظہار ہوتا ہو تو وہ معنوی رضامندی نہیں کہلائیگی (۱)

معنوی رضامندی اسی وقت صریح اجازت یا رضامندی کی قائم مقام ہوگی جب کہ نکاح کی اجازت کا طالب ولی اقرب ہو اگر ولی ابعد یا اجنبی باکرہ بالغہ سے اجازت حاصل کرے گا تو ثیبہ کی طرح اس کی صریح رضامندی لازمی ہوگی (۲)

فقہاء نے معنوی رضامندی کا اصل صرف باکرہ کے نکاح کے سلسلے میں قبول کیا ہے لیکن ثیبہ (یعنی بسبب طلاق یا وفات شوہر سے جدا) عورتوں کی صریحی رضامندی ضروری ہے۔

اگر کسی عورت کا پردۂ بکارت اچھل کود، حیض، زخم یا عمر کی زیادتی کے سبب زائل ہوجائے تو حنفی ائمہ کے نزدیک وہ عورت باکرہ ہی متصور ہوگی اور نکاح کیلئے اس کی معنوی رضامندی کافی ہوگی، لیکن امام شافعیؒ کے نزدیک وہ عورت رضامندی کے معاملہ میں ثیبہ کے حکم میں داخل ہوگی (۳)

---

(۱) ولو ضحكت البكر عند الاستئمار او بعدها بلغها الخبر فهو رضا ... وقالوا ان ضحكت كالمستهزئة لما سمعت لايكون رضا كذا فى المبسوط للامام السرخسى والكافى وعليه الفتوىٰ كذا فى البحر الرائق، وان تبسمت هورضا هو الصحيح من المذهب ذكره شمس الائمة الحلوائى كذا فى المحيط وان بكت اختلفوا فيه والصحيح ان البكاء اذا كان بخروج الدمع من غير صوت يكون رضا وان كان الصوت والصياح لايكون رضا كذا فى فتاوىٰ قاضيخاں وهو الاوجه وعليه الفتوىٰ كذا فى الذخيرة وان استاذن الولى البكر البالغة فسكتت فذلك اذن منها الخ. **فتاویٰ عالمگیری ج ۱ ص ۲۸۷۔**

(۲) وان فعل هذا غير الولى يعنى استامر غير الولى او ولى غيره اولىٰ منه لم يكن رضا حتى تتكلم به۔ هدايه ج۲ ص ۲۹۴۔

(۳) واذا زالت بكارتها بوثبة او حيضة او جراحة او تعنيس فهى فى حكم الابكار، وقال فى الكفاية وفيه خلاف الشافعى وهو يقول ان البكر اسم لامرأة عذرتها قائمة والثيب من زالت عذرتها وهذه زالت عذرتها فتكون ثيبا الخ الكفاية شرح هدايه مع فتح القدير ج۳ ص ۱۶۹۔

اگر کسی عورت کی بکارت زنا کے سبب سے زائل ہوجائے تو امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک نکاح کیلئے باکرہ کی طرح معنوی رضامندی قابل اعتبار ہوگی، امام ابویوسفؒ وامام محمدؒ کے نزدیک ثیبہ کی طرح صرف صریح رضامندی کا اعتبار کیا جائے گا، یہی مسلک امام شافعیؒ کا بھی ہے(۱) عقلاً امام اعظم کا قول مستحسن ہے کیونکہ کوئی عورت اپنے زنا کا اعلان نہیں کیا کرتی۔

رضا بالجبر

رضامندی اگر جبر یا فریب سے حاصل کی گئی ہو تو نکاح فاسد ہوگا، بجز اس کے کہ بعد میں توثیق ہوجائے۔

رضامندی بذریعہ غلط بیانی

اگر کسی مرد نے خود کو باعتبار نسب ایسا باور کراکر، جو وہ حقیقتاً نہیں ہے، عورت سے نکاح کی مرضی حاصل کرلی ہو اور نسب کے معاملہ میں اس کو دھوکہ دیا ہو تو عورت کو فسخ نکاح کا حق حاصل ہوگا لیکن اگر مرد نسب کے اعتبار سے اس سے بہتر ہو جو اس نے ظاہر کیا ہے تو عورت کو حق فسخ حاصل نہ ہوگا(۲)

اور اگر عورت خود کو مرد کا کفو ظاہر کرے جبکہ حقیقت میں وہ مرد کی کفو نہ ہو تو مرد پر نکاح لازم ہوجائیگا کیونکہ کفأت کے معاملہ میں عورت کا اعتبار نہیں کیا جاتا(۳)

انعقادِ نکاح کی چوتھی شرط — اتحادِ مجلس

وہ شرائط جن کا تعلق مجلس عقد سے ہے دو ہیں ایک مجلس نکاح یعنی مکان عقد اور دوسری شرط مجلس عقد میں گواہوں کی موجودگی ہے۔

مجلس سے مراد وہ نشست ہے جو انعقاد نکاح کیلئے منعقد کی جاتی ہے۔ ایجاب و

---

(۱) واما اذا زالت عذرتها بالزنا فانها تزوج كما تزوج الابكار فى قول ابى حنيفة وعند ابى يوسف ومحمد والشافعى تزوج كما تزوج الثيب، بدائع الصنائع ج۲ ص ۲٤٤۔

(۲) ولو انتسب الزوج لها نسبا غير نسبه فان ظهر دونه وهو ليس بكفوء فحق الفسخ ثابت للكل وان كان كفأ فحق الفسخ لها دون الاولياء وان كان ما ظهر فوق ما اخبر فلا فسخ لاحد كذا فى الظهيرية، فتاویٰ عالمگیری ج۱ ص ۲۹۳۔

(۳) ولو كانت هى التى عزت الزوج وانتسبت الى غير نسبها لا خيار للزوج وهى امرأة ان شاء امسكها وان شاء طلقها، كذا فى شرح الجامع الصغير لقاضى خان فتاویٰ عالمگیری ج۱ ص۲۹۳۔

قبول کیلئے یہ امر لازمی ہے کہ دونوں ایک ہی مجلس میں ہوں، چنانچہ اگر ایک مجلس میں ایجاب اور دوسری مجلس میں قبول ہو تو نکاح منعقد نہ ہوگا۔(۱)

گواہوں کی موجودگی وسماعت

مجلس عقد کی دوسری شرط ایجاب وقبول کے وقت گواہوں کی موجودگی اور ایجاب و قبول کی سماعت ہے، اس کے تین جز ہیں۔

(۱) موجودگی گواہان جواز نکاح کی شرط کے طور پر۔

(۲) تعداد گواہان۔

(۳) اہلیت گواہان۔

گواهوں کی موجودگی

ایجاب وقبول کے وقت مجلس عقد میں گواہوں کی موجودگی جوازِ نکاح کی شرط کی حیثیت سے امام مالکؒ کے علاوہ عام علماء کے نزدیک مسلم ہے۔(۲) جمہور علماء کی رائے میں نکاح میں گواہوں کی موجودگی اور سماعت عام معاہدات کے برعکس بصورت انکار تصدیق کیلئے نہیں بلکہ بجائے خود معاہدۂ نکاح کے جواز کے لئے ہے بالفاظ دیگر ان کے نزدیک ایجاب وقبول کے وقت گواہوں کی موجودگی اور سماعت معاہدۂ نکاح کا ایک جز ہے نہ کہ محض شہادت کا کوئی قاعدہ۔

گواهوں کی تعداد

فقہاء نے **آیت مداینت** "یا ایها الذین آمنوا اذا تداینتم بدین الی اجل مسمّیً فاکتبوه ... واستشهدوا شهیدین من رجالکم فان لم یکونا رجلین

---

(۱) واما الذی یرجع الی مکان العقد فهو اتحاد المجلس اذا کان للعاقدان حاضرین وهو ان یکون الایجاب والقبول فی مجلس واحد حتی لو اختلف المجلس لاینعقد النکاح الخ بدائع الصنائع ج۲ ص ۲۳۲۔

(۲) قال عامة العلماء ان الشهادة شرط جواز النکاح وقال مالكؒ لیست بشرط وانما الشرط هو الاعلان حتی لو عقد النکاح وشرط الاعلان جازو ان لم یحضره شهود الخ بدائع الصنائع ج۲ ص ۲۵۲۔

فرجل و امرأتان ممن ترضو ن من الشهداء الخ کی پیروی میں معاہدۂ نکاح کیلئے بھی دومرد یا ایک مرد اور دو عورتوں کی شہادت کو کافی قرار دیا ہے، البتہ امام شافعیؒ کے نزدیک دونوں گواہوں کا مرد ہونا ضروری ہے۔(۱)

بہرکیف یہ لازم ہے کہ ایجاب وقبول کے وقت دو عاقل بالغ مسلمان مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں مجلس نکاح میں موجود ہوں اور طرفین کے ایجاب وقبول کو دونوں سنیں۔

گواهوں کی اهلیت

گواہوں کے سلسلے کی تیسری کڑی بوقت نکاح ان کی اہلیت ہے، یہ مسئلہ متفقہ ہے کہ گواہوں کا آزاد، عاقل، بالغ اور مسلمان، ہونا ضروری ہے۔(۲)

البتہ اگر مرد مسلمان اور عورت غیر مسلمہ ہو تو شیخین (امام اعظمؒ وامام ابو یوسفؒ) کے نزدیک نکاح غیر مسلم گواہوں کے روبرو ہوسکتا ہے، اور امام محمد وامام زفر وامام شافعی وغیرہ کے نزدیک غیر مسلموں کی گواہی میں نکاح کسی بھی صورت میں جائز نہیں(۳)

اگر گواہ فاسق یا اندھے ہوں تو احناف کے نزدیک ان کی گواہی درست ہوگی، امام شافعیؒ کے نزدیک ایسی گواہی درست نہیں ہے کیونکہ عدالت گواہی کی شرط ہے اسی طرح ان کے نزدیک گواہ کا بینا ہونا بھی ضروری ہے۔

موانع شرعی

نکاح کے شرعی موانع چار قسم کے ہیں:

---

(۱) ولا ینعقد نکاح المسلمین الا بحضور شاهدین، حرّین، عاقلین، بالغین، مسلمین، او رجل وامرأتین... ولا یشترط وصف الذکورة حتی ینعقد بحضور رجل و امرأتین وفیه خلاف الشافعی۔ هدایه ج۲ ص ۲۸۶۔

(۲) اما صفات الشاهد الذی ینعقد به النکاح وهی شرائط تحمل المشاهد للنکاح فمنها العقل ومنها بلوغ ومنها الحریة... ومنها الاسلام فی نکاح المسلم المسلمة۔ بدائع الصنائع ج۲ ص۲۵۳۔

(۳) واما المسلم اذا تزوج ذمیة بشهادة ذمیین فانه یجوز فی قول ابی حنیفة وابی یوسف سواء کانا موافقین لها فی الملة او مخالفین وقال محمد وزفر وشافعی لایجوز نکاح المسلم الذمیة بشهادة الذمیین۔ بدائع الصنائع ج۲ ص ۲۵۳۔

(۱) نسبی (۲) رضاعی (۳) ازدواجی (۴) سببی

۱- نسبی موانع وہ ہیں جو قرابت نسب یعنی خون کے رشتے سے پیدا ہوتے ہیں چنانچہ ماؤں، بیٹیوں، پھوپھیوں، خالاؤں، بھتیجیوں سے خواہ وہ کتنے ہی بالائی یا زیریں درجہ کی ہوں نکاح بوجہ قرابت نسب ممنوع ہے۔

۲- رضاعی موانع وہ ہیں جو بچے کے کسی اجنبی عورت کا دودھ پی لینے کی بنا پر پیدا ہوتے ہیں چنانچہ رضاعی ماؤں، رضاعی بہنوں وغیرہ سے نکاح بوجہ رضاعت ممنوع ہے۔

۳- ازدواجی موانع وہ ہیں جو ازدواج کی بنا پر پیدا ہوتے ہیں چنانچہ مدخولہ بیوی کی بیٹی، بیوی کی ماں، بیٹے، پوتے، نواسے کی بیوی سے نکاح کی ممانعت ہے۔

۴- سببی موانع وہ ہیں جو مختلف اسباب کی بنا پر پیدا ہوتے ہیں مثلاً ایسی عورت سے نکاح جو کسی دوسرے کے نکاح میں ہو یا جس کی عدت نہ گذری ہو یا چار بیویوں کی موجودگی میں پانچواں نکاح یا ایسی حاملہ سے نکاح جس کا حمل ثابت النسب ہو اس وقت تک کیلئے نکاح ممنوع ہے جب تک سبب امتناع دور نہ ہو جائے۔

تعدد ازدواج

۱۴- ایک مرد ایک زوجہ کو نکاح میں رکھتے ہوئے دوسرا نکاح کرنے کا بشرط ذیل شرعاً مجاز ہے۔

الف: وہ شخص حسب ضرورت مالی استطاعت رکھتا ہو۔

ب: بیویوں میں عدل وانصاف قائم رکھ سکتا ہو۔

ج: دوسرے نکاح سے کوئی اہم شرعی مصلحت فوت نہ ہو رہی ہو۔

تشریح: اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

”وان خفتم الا تقسطوا فی الیتٰمی فانکحوا ما طاب لکم من النسآء مثنٰی و ثلٰث، وربٰع فان خفتم الا تعدلوا فواحدۃ او ماملکت ایمانکم ذٰلک ادنٰی الا تعدلوا“ (سورۃ النساء آیت:۳)

یعنی اگر تمہیں اس بات کا احتمال ہو کہ تم یتیم لڑکیوں کے معاملہ میں انصاف نہ کرسکو گے تو (انھیں اپنے نکاح میں نہ لاؤ) اور جو عورتیں تمہیں پسند آئیں ان سے نکاح کرلو، دو، دو، تین تین، اور چار چار، لیکن اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ عدل نہ کرسکو گے تو پھر ایک ہی زوجہ پر اکتفا کرو یا جو کنیز تمہاری ملکیت میں ہو (اسی پر اکتفاء کرو) بے انصافی سے بچنے کے لئے ایسا کرنا زیادہ قرین صواب ہے۔

قرآنی حکم مشروط ہے

مذکورہ بالا آیت مسلمان مردوں کے بیک وقت چار عورتوں کو اپنے نکاح میں رکھنے کی اجازت پر دلالت کرتی ہے لیکن اس اجازت کے ساتھ ہی مرد کو اس کی اخلاقی ذمہ داری کا احساس دلاکر اس اجازت کو ’’اقامت عدل‘‘ پر مشروط کردیا گیا ہے چنانچہ ’’فان خفتم الا تعدلوا فواحدة‘‘ میں صاف الفاظ میں بیان کردیا گیا ہے کہ اگر تم متعدد بیویوں کے درمیان عدل ومساوات قائم نہ کرسکو تو پھر ایک ہی عورت پر اکتفاء کرو۔

صحیح فاسد اور باطل نکاح

نکاح صحیح

۱۵- وہ نکاح جو شرع کے بالکل مطابق ہو اور جملہ ارکان وشرائط کی پابندی کے ساتھ بلاکسی شرعی مانع کے منعقد ہوا ہو نکاح صحیح کہلاتا ہے۔

نکاح صحیح کے اثرات

۱۶- نکاح صحیح سے زوجین کو حسب ذیل حقوق حاصل ہوں گے۔

(۱) دائمی رشتۂ زوجیت وحقوق حبس زوجہ (بیوی کو پابند بنانے کا حق) (الآ یہ کہ طلاق واقع ہوجائے یا کسی امر شرعی کی بنا پر تفریق واقع ہو یا کوئی فریق مرجائے)

(۲) حق مقاربت جنسی

(۳) حرمت مصاہرت

(۴) تولیدِ نسل وثبوت نسب اولاد

(۵) حق مہر زوجہ

(۶) حق نفقہ زوجہ، راحت وآسائش بقدر استطاعت

(۷) حق وراثت اولاد مابین زوجین

(۸) دیگر استمتاع جس کی شرع نے اجازت دی ہو۔[۱]

تشریح: زوجین کے حقوق وفرائض کے سلسلے میں خداوند تعالیٰ اور حضرت محمد مصطفیٰ ...... نے مسلمانوں کو واضح اصول اور ہدایات دی ہیں چنانچہ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

ولهن مثل الذی علیهن بالمعروف (سورۂ نساء) یعنی مردوں پر عورتوں کا بھی ایسا ہی حق ہے جیسا کہ ان پر مردوں کا حق ہے موافق دستور کے۔

بالمعروف کی قید نے حقوق میں بڑی گنجائش اور وسعت پیدا کر دی ہے، نیز ”الرجال قوّامون علی النساء“ کے ذریعہ عورتوں پر مرد کی برتری کے اصول کو بیان کر کے زوجہ پر شوہر کی فرماں برداری (بجز چند استثنائی صورتوں کے) واجب قرار دی گئی ہے جس کی تفصیل قرآن وحدیث اور کتب فقہ میں موجود ہے۔

نکاح فاسد

۱۷- نکاح فاسد وہ نکاح ہے جس میں نکاح صحیح کی کوئی شرط نہ ہو۔

نکاح فاسد کے اثرات

۱۸- (الف) اگر دخول نہ ہوا ہو تو نکاح فاسد نکاح باطل کے حکم میں ہوگا اور اس

---

(۱) فحل استمتاع کل منهما بالآخر علی الوجه الماذون فیه شرعاً کذا فی فتح القدیر وملك الحبس وهو صیرورتها ممنوعة عن الخروج والبروز ووجوب المهر والنفقة والکسرة علیه وحرمة المصاهرة والارث من الجانبین ووجوب العدل بین النساء ووحقوقهن ووجوب اطاعته علیها اذا دعا الی الفراش، وولایة تادیبها اذا لم تطعه بان نشزت واستحباب معاشرتها بالمعروف هکذا فی البحر الرائق، فتاویٰ عالمگیریه ج۱ ص ۲۰۔

نکاح سے طرفین کو ایک دوسرے پر کوئی حق حاصل نہ ہوگا۔

(ب) دخول کی صورت میں نکاح فاسد کے حسب ذیل اثرات مرتب ہوں گے۔

(۱) مہر مسمّٰی یا مہر مثل دونوں میں سے جو کم ہو

(۲) اثباتِ نسبِ اولاد

(۳) حرمتِ مصاہرت

(۴) نفقۂ اولاد (۱)

(۵) وراثت اولاد

(۶) عدت بصورت تفریق یا وفات شوہر

(۷) عدم توارث بین الزوجین

ج: نکاح فاسد کی صورت میں فساد ظاہر ہو جانے پر تفریق واجب ہوگی، اگر زوجین خود تفریق نہ کریں تو حاکم عدالت یا جماعت مسلمین پر واجب ہوگا کہ مجلس شرعی کے ذریعہ تفریق کرادے۔

مہر

تشریح: نکاح فاسد میں اگر دخول سے پہلے تفریق ہو جائے تو مرد پر عورت کا مہر واجب نہ ہوگا اور نہ ہی عورت پر عدت واجب ہوگی، لیکن اگر دخول ہو گیا ہو تو عورت کو مہر مسمّٰی یا مہر مثل میں سے جو کم ہوگا ملے گا بشرطیکہ اس نکاح میں مہر طے ہوا ہو اور اگر مہر طے نہ ہو تو عورت کو مہر مثل دیا جائے گا۔

نسب اولاد

اولاد کا نسب اپنی ماں سے بہر صورت خواہ وطی جائز ہو یا ناجائز ثابت ہوتا ہے لیکن

---

(۱) اذا وقع النکاح الفاسد فرق القاضی بین الزوج والمرأة فان لم یکن دخل بها فلا مهر لها ولا عدة وان کان قد دخل بها فلها الاقل مما سمی لها ومن مهر مثلها ان کان ثمة مسمی... ویثبت نسب الولد المولود فی النکاح الفاسد وتعتبر مدة النسب من وقت الدخول عند محمدؒ وعلیه الفتویٰ قاله ابواللیث کذا فی التبیین: فتاویٰ عالمگیری ج۱ ص ۳۳۰ وفی فتح القدیر ولا بام امرأته دخل بها اول یدخل اذا کان نکاح البنت صحیحًا اما بالفاسد فلا تحوم الام الا اذا وطی بنتها ج ۳ ص ۱۱۸۔

باپ سے صرف چار صورتوں میں ثابت ہوتا ہے۔

(۱) نکاح صحیح کی صورت میں

(۲) نکاح فاسد کی صورت میں

(۳) وطی بالشبہ کی صورت میں

(۴) اقرار بالنسب کی صورت میں

حرمت مصاہرت

نکاح فاسد میں اگر دخول ہو گیا ہو تو حرمت مصاہرت قائم ہو جائے گی خواہ وہ دخول حرام ہی کیوں نہ ہو، اس کی بنیاد آیت کریمہ وربائبکم اللاتی فی حجورکم من نسائکم اللاتی دخلتم بھن فان لم تکونوا دخلتم بھن فلاجناح علیکم ہے اسی آیت پاک سے مستفاد یہ مشہور فقہی قاعدہ ہے "العقد علی البنات یحرم الامھات والدخول بالامھات یحرم البنات"

نفقہ

نکاح صحیح ہو یا فاسد باپ پر اولاد کا نفقہ واجب ہو جاتا ہے، البتہ نکاح فاسد میں شوہر کے ذمہ بیوی کا نفقہ نہیں ہے کیونکہ فساد ظاہر ہو جانے پر جب مرد و عورت کے درمیان تفریق کرانے اور استمتاع کے حرام ہو جانے کا حکم ہے تو نفقہ کا سوال کیونکر پیدا ہو سکتا ہے(۱)

وراثت اولاد

چونکہ نکاح میں شبہ کی بنیاد پر حد زنا ساقط ہو جاتی ہے اور اولاد ثابت النسب قرار پاتی ہے اس لئے وہ اپنے والدین کی جائز وارث ہوگی، اور شرع کے مطابق ترکہ میں حصہ دار ہوگی۔

عدت: نکاح فاسد میں چونکہ صورتاً نکاح پایا جاتا ہے اس لئے عورت پر بصورت تفریق یا وفات شوہر عدت واجب ہوگی بشرطیکہ دخول ہوا ہو، تفریق کی صورت میں عدت

---

(۱) النکاح الفاسد لایوجب النفقة لاقبل الفرقة ولا بعدھا فی العدة فتاویٰ قاضی خاں علی ھامش فتاوی عالمگیری ج۱ ص ۴۲۷۔

وقت تفریق سے شمار ہوگی(۱)

توارث بین الزوجین

تمام ائمہ کے نزدیک یہ مسئلہ متفقہ ہے کہ نکاح فاسد کی صورت میں زوجین ایک دوسرے کے وارث نہیں ہوں گے۔

نکاح باطل

۱۹- نکاح باطل وہ ہے جو فی نفسہٖ کالعدم ہو۔

نکاح باطل کے اثرات

۲۰- نکاح باطل باعتبار نتیجہ بالکل بے اثر ہوتا ہے اس سے مابین فریقین کوئی ازدواجی وجوب پیدا نہیں ہوگا۔

تشریح: نکاح باطل یا حرام ہونے کے اسباب یہ ہیں:

(۱) قرابت

(۲) رضاعت

(۳) مصاہرت

(۴) اجتماع دو محرمات کا

(۵) ملک، دو کنیزوں کی جو آپس میں بہنیں ہوں ان سے جماع

(۶) شکر، مثلاً مشرکہ یا مشرک سے نکاح

(۷) تین طلاق، اپنی زوجہ کو

(۸) حق الغیر مثلاً منکوحہ غیر سے نکاح

---

(۱) ولو كان النكاح فاسدًا وفرق القاضی بينهما ان كانت الفرقة قبل الدخول لاتجب للعدة وكذا لو فرق بعد الخلوة وان فرق بعد الدخول كان عليها الاعتداد من وقت الفرقة لا من وقت الوداع وكذا لوكانت الفرقة بغير قضاء. فتاویٰ قاضی خان علی فتاویٰ عالمگیری ج۱ ص۵٤۹.

ماؤں، بیٹیوں، بہنوں، پھوپھیوں، خالاؤں، بھتیجیوں اور بھانجیوں سے نکاح

۲۱- ماؤں، بیٹیوں، بہنوں، پھوپھیوں، خالاؤں، بھتیجیوں اور بھانجیوں سے نکاح، خواہ وہ کتنے ہی پشت پہلے یا بعد کی ہوں، حرام و باطل ہے۔

تشریح: ایام جاہلیت میں عام دستور تھا کہ باپ کی وفات کے بعد اس کی بیویاں بھی متروکہ شمار ہوتی تھیں اور متوفی کے بیٹے ان عورتوں سے زوجیت کے تعلقات قائم کر لیتے تھے اسلام نے اس قبیح رسم کا سختی سے قلع قمع کیا ہے۔ چنانچہ آیت قرآنی "ولا تنکحوا ما نکح آباء کم من النساء الاما قد سلف" کے ذریعہ ان تمام عورتوں سے جو آباء و اجداد کے نکاح میں رہ چکی ہیں نکاح حرام قرار دیدیا۔

اسی طرح "حرمت علیکم امھٰتکم وبنٰتکم واخواتکم وعمّٰتکم وخالاتکم وبنات الاخ وبنات الاخت" فرما کر اللہ تعالیٰ نے بر بنائے نسب (ماؤں، بیٹیوں، بہنوں، پھوپھیوں، خالاؤں، بھتیجیوں، بھانجیوں) آباء اجداد اور اولاد اور دوسرے سلسلہ کے حقیقی رشتہ داروں مثلاً بھائی، بہن اور ان کی اولاد سے نیز چچا، ماموں، پھوپھی اور خالہ سے خواہ کسی بالائی یا زیریں درجہ کی ہوں نکاح مطلقاً حرام قرار دیدیا ہے۔

رضاعی ماؤں بہنوں سے نکاح

۲۲- رضاعی ماؤں اور بہنوں سے نکاح حرام ہے۔

تشریح: اسلام میں قرابت کے ساتھ قرابت رضاعی کی بناء پر بھی نکاح حرام ہے۔

چنانچہ آیت قرآنی حرمت علیکم .... امھاتکم اللتی ارضعنکم واخواتکم من الرضاعة کے تحت رضاعی ماؤں اور بہنوں سے نکاح قطعی طور پر حرام کر دیا گیا ہے۔ عام اصول یہ ہے کہ جو عورتیں بر بنائے قرابت نسب حرام ہوتی ہیں رضاعت سے بھی حرام ہو جاتی ہیں، لیکن رضاعت کے سبب حسب ذیل عورتوں سے نکاح حرام نہیں ہے۔

(۱) حقیقی بہن کی رضاعی ماں سے

(۲) رضاعی بہن کی حقیقی ماں سے

اس ماں کی تین صورتیں ہیں

الف: لڑکے کی حقیقی بہن کی رضاعی ماں جس کا دودھ لڑکے نے نہ پیا ہو

ب: لڑکے کی رضاعی بہن کی نسبی ماں جس نے لڑکے کو دودھ نہ پلایا ہو

ج: لڑکے کی رضاعی بہن کی دوسری رضاعی ماں

(۳) رضاعی بھائی کی حقیقی بہن سے

(۴) رضاعی بیٹے کی حقیقی بہن سے

شرائط رضاعت

احناف کے نزدیک ایک دفعہ دودھ پینا رضاعت کے رشتہ کو قائم کر دیتا ہے اور اپنے اثر کے لحاظ سے مانع نکاح ہے، البتہ شوافع کے نزدیک کم از کم پانچ مرتبہ دودھ پینا شرط ہے(۱)

رضاعت کی حرمت ثابت ہونے کے لئے ضروری ہے کہ دودھ پینے کے وقت بچہ یا بچی کی عمر صاحبین کے نزدیک ۲ سال اور امام ابوحنیفہ کے نزدیک ڈھائی سال تک ہو (مفتی بہ قول صاحبین کا ہے اسی پر عمل کیا جانا چاہیے) اگر اس سے زائد عمر کے بچے کو دودھ پلایا گیا تو حرمت قائم نہ ہوگی۔

ثبوت حرمت رضاعت کی دوسری شرط یہ ہے کہ دودھ پلانے والی کی عمر نو سال یا اس سے زائد ہو چنانچہ اگر کسی لڑکی کی عمر ۹ سال سے کم ہو اور اسے دودھ اتر آیا تو اس کے پلانے سے حرمت رضاعت ثابت نہ ہوگی(۱)

اگر عورت کا دودھ گائے، بھینس یا بکری کے دودھ میں ملا دیا، اگر عورت کے دودھ کا

---

(۱) قلیل الرضاع وکثیرہ سواء اذا حصل فی مدة الرضاع یتعلق بہ التحریم وقال الشافعیؒ لایثبت التحریم الا بخمس رضعات الخ ھدایہ ج۲ ص ۳۳۰۔

(۱) ولو ان صبیة لم تبلغ تسع سنین نزل لھا اللبن فارضعت صبیا لم یتعلق بہ تحریم وانما یتعلق التحریم بہ اذا حصل من بنت تسع سنین فصاعدًا، کذا فی الجوھرة النیرة فتاویٰ عالمگیریہ ج۱ ص ۳٤٤۔

حصہ غالب ہے تو رضاعت ثابت ہوگی ورنہ نہیں (۱)

لیکن اگر عورت کے دودھ کو کسی چیز میں ملا کر پکایا اور اسے بچہ نے کھایا تو اس سے حرمت رضاعت ثابت نہ ہوگی کیونکہ وہ رضاعت (دودھ پلائی) نہیں ہے (۲)

رضاعت کا اثر

اگر بلا علم ایسے مرد و عورت باہم نکاح کرلیں جن کا نکاح بسبب رضاعت حرام ہو تو جب اس کا علم ہو جائے ان پر تفریق واجب ہوگی اگر وہ بذات خود تفریق اختیار نہ کریں تو قاضی (یا اس کے قائم مقام) پر واجب ہے کہ ان میں تفریق کرائے۔

اگر یہ تفریق قبل دخول ہوتی ہے تو زوجہ کو کچھ نہ ملے گا لیکن اگر دخول کے بعد تفریق ہو تو زوجہ کو مہر مثل ملے گا اگر کوئی مہر مقرر نہ ہوا ہو، اور اگر مہر مقرر رہا ہے تو مقررہ اور مہر مثل میں سے جو کم ہو وہ ملے گا، چونکہ نکاح فاسد تھا اسلئے مرد پر ایام عدت کا نفقہ واجب نہ ہوگا۔

ساس سے نکاح

۲۳- کسی مرد کا اپنی ساس سے نکاح کرنا حرام ہے۔

تشریح: مسئلہ کی بنیاد یہ ہے کہ بیوی یا شوہر کے اصول سے بوجہ ازدواج نکاح حرام ہو جاتا ہے، چنانچہ بیوی کی ماں، نانی، دادی خواہ سگی ہوں یا سوتیلی اور کتنے ہی اونچے درجے کی ہوں اس مرد پر حرام ہیں، اسی طرح بیوی کیلئے شوہر کے آباؤ اجداد سے نکاح حرام ہے، یہ حرمت مصاہرت نفس نکاح سے ثابت ہو جاتی ہے خواہ بیوی سے صحبت کی ہو یا نہ کی ہو (۳)

---

(۱) ولو خلط لبن الآدمی بلبن الشاة ولبن الادمی غالب ثبت الحرمة۔ فتاویٰ قاضیخاں علی فتاویٰ عالمگیریہ ج۱ ص ٤١٨۔

(۲) واذا جعل لبن المرأة فی طعام فاطعم صبيين ان طبخ الطعام بان طبخ لبنها ارز الا تثبت الحرمة بينهما فی قولهم جميعاً، فتاویٰ قاضی خاں ص ٤١٨۔

(۳) ولا (ای لایحل للرجل ان یتزوج) بام امرأته التی دخل بابنتها اولم یدخل لقوله تعالیٰ وامهات نسائكم من غير قيد الدخول. الهداية ج۲ ص ٢٨٧۔

سوتیلی بیٹیوں سے نکاح

۲۴- کسی مرد کا اپنی سوتیلی بیٹی سے جو کہ اسکی بیوی کے بطن سے ہو نکاح حرام ہے۔

تشریح: آیت قرآنی حرمت علیکم ... وربائبکم التی فی حجورکم من النساء التی دخلتم بھن الخ کے تحت ان سوتیلی بیٹیوں سے نکاح حرام ہے جو مدخولہ بیویوں کے بطن سے ہوں، چنانچہ اگر زوجہ سے صحبت نہ ہوئی ہو اور صحبت سے پہلے ہی طلاق ہو جائے تو اس کی بیٹی سے نکاح ممنوع نہ ہوگا، اس مسئلہ میں محض خلوت صحیحہ دخول کے مترادف نہیں ہوگا(۱)

دراصل اصول یہ ہے کہ بیوی یا شوہر کے فروع سے نکاح حرام ہو جاتا ہے، چنانچہ بیوی کی بیٹی یا بیوی کے بیٹے کی بیٹی خواہ کتنے ہی نیچے درجے کی ہو یا بیوی کے نواسے یا پوتے کی بیٹی سے نکاح حرام ہو جاتا ہے اسی طرح شوہر کی اولاد سے خواہ وہ سگی ہو یا سوتیلی اور کتنے ہی نیچے درجہ کی ہو نکاح حرام ہو جاتا ہے بشرطیکہ عورت سے صحبت ہو چکی ہو اگر صحبت نہ ہوئی ہو تو حرمت مصاہرت قائم نہ ہوگی(۲)

(مصروفیات کی بناء پر یہ سلسلۂ مضمون آگے نہیں بڑھ سکا)

☆ ☆ ☆

---

(۱) بنات الزوجة و بنات اولادها وان سفلن بشرط الدخول بالام كذا فى الحاوى القدسى سواء كانت الابنة فى حجره اولم تكن كذا فى شرح الجامع الصغير لقاضى خاں واصحابنا ما اقامو الخلوة مقام الوطء فى حرمة البنات هكذا فى الذخيرة فى نوع ما يستحق به جميع المهر (فتاوىٰ عالمگيريه ج ص ۲۷٤)

(۲) فبنت الزوجة وبناتها وبنات بناتها وبنيها وان سفلن اما بنت الزوجة فتحرم عليه بنص الكتاب العزيز اذا كان دخل بزوجته فان لم يكن دخل بها فلا تحرم لقوله وربائبكم اللاتى فى حجوركم من نسائكم اللاتى دخلتم بهن الخ سواء كانت بنت زوجته فى حجره اولا عند عامة العلماء الخ بدائع الصنائع ج۲ ص ۲۵۹۔

ایک مجلس کی تین طلاقیں

تمہید

اسلامی شریعت میں نکاح کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ قرآن وحدیث میں اس سے متعلق خصوصی احکامات صادر ہوئے ہیں اور اس کی ترغیب صریح ارشادات نبوی میں موجود ہیں۔ ایک طویل حدیث کے آخر میں آپ...... نے فرمایا ”فمن رغبَ عن سنّتی فلیس منی“ جو میری سنتِ نکاح سے اعراض کرے گا وہ میرے طریقہ سے خارج ہے۔(۱)

ایک اور حدیث میں فرمایا ”ان سُنّتَنا النکاح“ نکاح ہماری سنت ہے۔(۲)

ایک حدیث میں نکاح کو تکمیل ایمان کا ذریعہ بتایا گیا ہے جیسا کہ خادم رسولؐ انس بن مالک راوی ہیں کہ نبی کریم ...... نے فرمایا ”من تزوج فقد استکمل نصف الایمان فلیتق اللّٰہ فی النصف الباقی“ جس نے نکاح کرلیا اس نے اپنے نصف ایمان کی تکمیل کرلی۔ لہٰذا اسے چاہئے کہ بقیہ نصف کے بارے میں اللہ سے ڈرتا رہے۔(۳)

انہیں جیسی احادیث کے پیش نظر امام اعظم ابوحنیفہ اور دیگر ائمہ سلف نے عبادات نافلہ میں اشتغال کے مقابلہ میں نکاح کو افضل قرار دیا ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ نکاح کی ایک حیثیت اگر باہمی معاملہ کی ہے تو اسی کے ساتھ عام معاملات ومعاہدات سے بالاتر یہ سنت وعبادت کی حیثیت بھی رکھتا ہے۔ نکاح کی اسی خصوصی اہمیت کی بنا پر اس کے انعقاد اور وجود پذیر ہونے کے لئے باجماع کچھ ایسے آداب اور ضروری شرائط ہیں جو دیگر

---

(۱) بخاری شریف ج۲ص۵۵۷۔

(۲) مسند امام احمد ج۵ص۱۶۳۔

(۳) مشکوٰۃ ص۲۶۷ وجمع الفوائد ج۱ص۲۱۶۔

معاملات خرید وفروخت وغیرہ میں نہیں ہیں۔ مثلاً ہر عورت اور ہر مرد سے نکاح درست نہیں اس بارے میں اسلامی شریعت کا ایک مستقل قانون ہے جس کی رُو سے بہت سی عورتوں اور مردوں کا باہم نکاح نہیں ہوسکتا۔ دیگر معاملات کے منعقد ومکمل ہونے کیلئے گواہی شرط نہیں ہے۔ جبکہ نکاح کے انعقاد کے واسطے گواہوں کا موجود ہونا شرط ہے اگر مرد وعورت بغیر گواہوں کے نکاح کرلیں تو یہ نکاح قانون شرع کے لحاظ سے باطل اور کالعدم ہوگا۔

یہ خصوصی احکام اور ضروری پابندیاں بتا رہی ہیں کہ معاملہ نکاح کی سطح دیگر معاملات ومعاہدات سے بلند ہے۔ شریعت کی نگاہ میں یہ ایک بہت ہی سنجیدہ اور قابل احترام معاملہ ہے جو اس لئے کیا جاتا ہے کہ باقی رہے یہاں تک کہ موت ہی زوجین کو ایک دوسرے سے جدا کردے۔ یہ ایک ایسا قابل قدر رشتہ ہے جو تکمیل انسانیت کا ذریعہ اور رضائے الٰہی واتباع سنت کا وسیلہ ہے۔ جس کے استحکام پر گھر، خاندان اور معاشرے کا استحکام موقوف ہے اور جس کی خوبی وخوشگواری پر معاشرے کی خوبی وبہتری کا دارومدار ہے۔ یہ ایک ایسا معاملہ ہے جس کے انقطاع اور ٹوٹنے سے صرف فریقین (میاں بیوی) ہی متاثر نہیں ہوتے بلکہ اس کے پورے نظام خانگی کی چولیں ہل جاتی ہیں اور بسا اوقات خاندانوں میں فساد ونزاع تک کی نوبت پہنچ جاتی ہے جس سے معاشرہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ اسی بناء پر بغیر ضرورت طلاق جو رشتہ نکاح کو منقطع کرنے کا شرعی ذریعہ ہے خدائے دوجہاں کے نزدیک ایک ناپسندیدہ اور ناگوار عمل ہے۔ رسول خدا...... کا ارشاد ہے۔ "ابغض الحلال إلی اللہ عزّ و جلّ الطلاق" اللہ کی حلال کردہ چیزوں میں طلاق سے زیادہ مبغوض اور کوئی چیز نہیں ہے۔(۱)

اسلام کا ضابطۂ طلاق

اس لئے جو اسباب ووجوہ اس بابرکت اور محترم رشتہ کو توڑنے کا ذریعہ بن سکتے ہیں انہیں راہ سے ہٹانے کا کتاب وسنت کی تعلیمات نے مکمل انتظام کردیا ہے۔ زوجین کے

---

(۱) سنن ابی داؤد ج ۱ ص ۳۰۲، المستدرک للحاکم ج ۲ ص ۱۹۶ وقال الذهبی صحیح علی شرط مسلم.

باہمی حالات ومعاملات سے متعلق قرآن وحدیث میں جو ہدایتیں دی گئی ہیں ان کا مقصد یہی ہے کہ یہ رشتہ کمزور ہونے کی بجائے پائیدار اور مستحکم ہوتا چلا جائے۔ ناموافقت کی صورت میں افہام وتفہیم، پھر زجر وتنبیہ اور اگر اس سے کام نہ چلے اور بات بڑھ جائے تو خاندان ہی کے افراد کو حکم وثالث بنا کر معاملہ طے کرنے کی تعلیم دی گئی ہے۔

لیکن بسا اوقات حالات اس حد تک بگڑ جاتے ہیں کہ اصلاح حال کی یہ ساری کوششیں بے سود ہو جاتی ہیں اور رشتۂ ازدواج سے مطلوب ثمرات وفوائد حاصل ہونے کی بجائے زوجین کا باہم مل کر رہنا ایک عذاب بن جاتا ہے۔ ایسی ناگزیر حالت میں ازدواجی تعلق کا ختم کر دینا ہی دونوں کے لئے بلکہ پورے خاندان کے لئے باعث راحت ہوتا ہے اس لئے شریعت اسلامی نے طلاق اور فسخِ نکاح کا قانون بنایا۔ جس میں طلاق کا اختیار صرف مرد کو دیا گیا جس میں عادتاً وطبعاً عورت کے مقابلہ میں فکر وتدبر اور برداشت وتحمل کی قوت زیادہ ہوتی ہے علاوہ ازیں مرد کی قوّامیت وافضلیت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ یہ اختیار صرف اسی کو حاصل ہو۔ لیکن عورت کو بھی اس حق سے یکسر محروم نہیں کیا کہ وہ کَالمیّت فِی یَد الغسّال شوہر کے ہر ظلم وجور کا ہدف بنی رہے اور اپنی رہائی کے لئے کچھ نہ کر سکے۔ بلکہ اسے بھی یہ حق دیا کہ حاکم شرعی کی عدالت میں اپنا معاملہ پیش کر کے قانون کے مطابق طلاق حاصل کر سکتی یا نکاح فسخ کرا سکتی ہے۔

پھر مرد کو طلاق کا اختیار دے کر اسے بالکل آزاد نہیں چھوڑ دیا بلکہ اسے تاکیدی ہدایت دی کہ کسی وقتی وہنگامی ناگواری میں اس حق کو استعمال نہ کرے۔ اس پر بھی سخت تنبیہ کی گئی کہ حقِ طلاق کو دفعتہً استعمال کرنا غیر مناسب اور نادانی ہے کیونکہ اس صورت میں غور وفکر اور مصالح کے مطابق فیصلہ لینے کی گنجائش ختم ہو جائے گی جس کا نتیجہ حسرت وندامت کے سوا کچھ نہیں۔ اس کی بھی تاکید کی گئی کہ حیض کے زمانہ میں یا ایسے طہر میں جس میں ہمبستری ہو چکی ہے طلاق نہ دی جائے کیونکہ اس صورت میں عورت کو خواہ مخواہ طول عدت کا ضرر پہنچ سکتا ہے۔ بلکہ اس حق کے استعمال کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ جس طہر میں ہمبستری نہیں کی گئی ہے ایک طلاق دے کر رک جائے، عدّت پوری ہو جانے پر رشتۂ

نکاح ختم ہو جائے گا۔ دوسری یا تیسری طلاق کی ضرورت نہیں پڑے گی اور اگر دوسری یا تیسری طلاق دینی ہی ہے تو الگ الگ طہر میں دی جائے۔

پھر معاملۂ نکاح کے توڑنے میں یہ لچک رکھی کہ ایک یا دو بار صریح لفظوں میں طلاق دینے سے فی الفور نکاح ختم نہیں ہوگا بلکہ عدت پوری ہونے تک یہ رشتہ باقی رہے گا دورانِ عدت اگر مرد اپنی طلاق سے رجوع کر لے تو نکاحِ سابق بحال رہے گا جب کہ دیگر معاملات بیع وشراء وغیرہ میں یہ گنجائش نہیں ہے۔ نیز عورت کو ضرر سے بچانے کی غرض سے حقِ رجعت کو بھی دو طلاقوں تک محدود کر دیا گیا تا کہ کوئی شوہر محض عورت کو ستانے کے لئے ایسا نہ کر سکے کہ ہمیشہ طلاق دیتا رہے اور رجعت کر کے قیدِ نکاح میں اسے محبوس رکھے بلکہ شوہر کو پابند کر دیا گیا کہ اختیارِ رجعت صرف دو طلاقوں تک ہی ہے تین طلاقوں کی صورت میں یہ اختیار ختم ہو جائے گا بلکہ فریقین اگر باہمی رضا سے نکاح ثانی کرنا چاہیں تو ایک خاص صورت کے علاوہ یہ نکاح درست اور حلال نہیں ہوگا۔ آیت پاک ”الطَّلاق مرَّتَان“ اور فان طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلّ لَهٗ مِنْ بَعْد حَتّٰی تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْره میں یہی قانون بیان کیا گیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ اگر کسی نے تیسری طلاق دیدی تو معاملہ نکاح ختم ہو گیا اور اب مرد کو نہ صرف یہ کہ رجعت کا اختیار نہیں رہا بلکہ تین طلاقوں کے بعد اگر یہ دونوں باہمی رضا سے پھر رشتۂ نکاح میں منسلک ہونا چاہیں تو وہ ایسا نہیں کر سکتے تاوقتیکہ یہ عورت عدت طلاق گزار کر دوسرے مرد سے نکاح کر لے، نیز حقوقِ زوجیت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے دوسرے شوہر کے ساتھ رہے پھر اگر اتفاق سے یہ دوسرا شوہر بھی طلاق دیدے یا وفات پا جائے تو اس کی عدت پوری کرنے کے بعد پہلے شوہر سے نکاح ہو سکتا ہے۔ آیت کریمہ ”فَاِنْ طلَّقها فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا اَنْ يَّتَرَاجَعَا“ میں اسی نکاحِ جدید کا بیان ہے۔ یعنی پھر اگر یہ دوسرا شوہر اس کو طلاق دیدے تو ان دونوں پر اس میں کوئی گناہ نہیں کہ دوبارہ باہم رشتۂ ازدواج قائم کر لیں۔

شریعتِ اسلامی کے وضع کردہ اس ضابطۂ طلاق پر اگر پورے طور پر عمل کیا جائے تو طلاق دینے کے بعد نہ کسی شوہر کو حسرت وندامت سے دوچار ہونا پڑے گا اور نہ ہی کثرت

طلاق کی یہ وبا باقی رہے گی جس کے نتیجہ میں طرح طرح کے ناگوار مسائل پیدا ہوتے ہیں جو نہ صرف مسلم معاشرہ کیلئے دردِ سر بنے ہوئے ہیں بلکہ اسلام مخالف عناصر کو اسلامی قانونِ طلاق میں کیڑے نکالنے اور طعنہ زنی کا موقع فراہم کر رہے ہیں حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کا ارشاد ہے۔ ”لو ان الناس اصابوا حد الطلاق ماندم رجل طلق امرأته“ اگر لوگ طلاق سے متعلق پابندیوں پر قائم رہیں تو کوئی شخص اپنی بیوی کو طلاق دے کر گرفتارِ ندامت نہیں ہوگا۔(۱)

ایک مجلس کی تین طلاقیں تین واقع ہوں گی

اس موقع پر ایک سوال یہ بھی اٹھتا ہے کہ اگر کسی نے از راہ حماقت و جہالت طلاق کے مستحسن اور بہتر طریقہ کو چھوڑ کر غیر مشروع طور پر طلاق دیدی مثلاً الگ الگ تین طہروں میں طلاق دینے کے بجائے ایک ہی مجلس میں یا ایک ہی تلفظ میں تینوں طلاقیں دے ڈالیں تو اس کا اثر کیا ہوگا؟

آج کل بعض جماعتیں سرکاری ذرائع ابلاغ اور میڈیا کے تعاون سے یہ باور کرانے کی کوشش کر رہی ہیں کہ ایک مجلس یا ایک تلفظ میں دی گئی تین طلاقیں شرعاً ایک ہی ہوں گی اور اس طرح دی گئی تین طلاقوں کے بعد بھی ازدواجی تعلق برقرار اور شوہر کو رجعت کا اختیار باقی ہے۔ جبکہ ظاہر قرآن، احادیث صحیحہ، آثار صحابہ اور اقوال فقہاء و محدثین سے ثابت ہے کہ مجلس واحد یا کلمہ واحدہ کی تین طلاقیں تین ہی شمار ہوں گی۔ شریعت اسلامی کا یہ ایسا مسئلہ ہے جس پر عہد فاروقی میں حضرات صحابہ کا اجماع و اتفاق ہو چکا ہے جس کے بعد اختلاف کی گنجائش نہیں رہ جاتی۔ اسی بناء پر ائمہ اربعہ امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بیک زبان کہتے ہیں کہ ایک مجلس کی تین طلاقیں چاہے بیک لفظ دی جائیں یا الگ الگ لفظوں سے واقع ہوجاتی ہیں اور تین طلاقوں کے بعد چاہے وہ جس طرح بھی دی گئی ہو رجعت کرنا از روئے شرع ممکن نہیں ہے۔ اور یہی جمہور سلف و خلف کا

---

(۱) احکام القرآن جصاص رازی، ج۱، ص ۳۸۷۔

مسلک ہے۔

(۱) چنانچہ محقق حافظ بن عبدالواحد المعروف بابن الہمام الحنفی لکھتے ہیں وذھب جمھور الصحابة والتابعین ومن بعدھم من ائمة المسلمین الی انهٗ یقع ثلاث(۱) ـــــ جمہور صحابۂ کرام وتابعین اور بعد کے ائمہ مسلمین کا یہی مذہب ہے کہ تین طلاقیں تین ہی ہوں گی۔ آگے چل کر لکھتے ہیں کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کا اسی پر اجماع ہے۔ فاجماعھم ظاھر فانه لم ینقل عن احد منھم انه خالف عمر رضی اللہ عنه حین امضی الثلاث اھ۔ حضرات صحابہ کا اجماع ظاہر ہے کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے فیصلہ کہ تین طلاقیں تین ہیں کی کسی صحابی سے مخالفت منقول نہیں(۲)

(۲) علامہ بدرالدین العینی الحنفی لکھتے ہیں۔

ومذھب جماھیر العلماء من التابعین ومن بعدھم منھم الاوزاعی والنخعی والثوری وابوحنیفة واصحابه ومالك واصحابه والشافعی واصحابه واحمد واصحابه واسحاق وابوثور وابوعبید وآخرون کثیرون علی من طلق امرأته ثلاثاً وقعن ولکنه یأثم وقالوا من خالف فیه فھو شاذ مخالف لاھل السنة وانما تعلق به اھل البدع ومن لایلتفت الیه لشذوذه من الجماعة اھ۔ تابعین اور ان کے بعد کے جمہور علماء جن میں امام اوزاعی، امام نخعی، امام ثوری، امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب، امام مالک اور ان کے اصحاب، امام شافعی اور ان کے اصحاب، امام احمد اور ان کے اصحاب، امام اسحاق بن راہویہ، امام ثور، امام ابوعبیدہ رحمہم اللہ وغیرہ اور دیگر بہت سارے ائمہ کا یہی مذہب ہے کہ تین طلاقیں تین ہی ہوں گی۔ البتہ اس طرح طلاق دینے والا گنہگار رہوگا۔ جمہور کہتے ہیں کہ اس مسئلہ میں جس نے مخالفت کی وہ شاذ اور مخالف اہل سنت ہے اس نے اس مسئلہ میں اہل بدعت اور ایسے لوگوں کی پیروی کی ہے جو جماعت مسلمین سے کٹ جانے کی وجہ سے قابل التفات نہیں ہیں(۳)

---

(۱) فتح القدیر ج۳ ص ۳۳۰۔ (۲) فتح القدیر ج۳ ص ۳۳۰۔

(۳) عمدۃ القاری باب من اجاز طلاق الثلاث ج ۲۰ ص ۲۳۳ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ پاکستان۔

(۳) مفسر محمد الامین بن محمد المختار الشنقیطی اپنی تفسیر میں محدث ابن العربی المالکی کا بیان نقل کرتے ہیں۔

وغویٰ قوم من اهل المسائل فتتبعوا الاهواء المبتدعة فيه وقالوا ان قول انت طالق ثلاثا كذب لانه لم يطلق ثلاثا كما لو قال طلقت ثلاثا ولم يطلق الا واحدة... ولقد طوفت فى الآفاق ولقيت من علماء الاسلام و ارباب المذاهب فما سمعت لهٰذه المسئلة بخبر ولا احسست لها باثر الا الشيعة الذين يرون نكاح المتعة جائز اولا يرون الطلاق واقعا... وقد اتفق علماء الاسلام وارباب الحل والعقد فى الاحكام على ان الطلاق الثلاث فى كلمة وان كان حراما فى قول بعضهم، وبدعة فى قول الآخرين. لازم ... وما نسبوه الى الصحابة كذب بحت لا اصل له فى كتاب ولا رواية له عن احد.

اہل مسائل میں سے ایک قوم بھٹک گئی اور اس مسئلہ میں بدعتیوں کی ہوائے نفسانی کی پیروی کرتے ہوئے وہ کہتی ہے کہ انت طالق ثلاثا (تجھ پر تین طلاق ہے) جھوٹ ہے کیونکہ اس نے تین طلاقیں نہیں دی ہیں جس طرح سے اس کا یہ کہنا غلط ہے کہ طلقت ثلاثا (میں نے تین طلاقیں دیں) حالانکہ اس نے ایک ہی طلاق دی ہے ...میں نے اطراف عالم کی خوب سیر کی اور علماء اسلام وارباب مذاہب سے ملاقاتیں کیں اس مسئلہ سے متعلق میں نے نہ کوئی خبر سنی اور نہ کسی اثر کا مجھے علم ہوا۔ البتہ صرف شیعہ متعہ کو جائز اور تین طلاقوں کو غیر واقع کہتے ہیں...جبکہ علماء اسلام اور معتمد فقہائے امّت متفق ہیں کہ ایک کلمہ کی تین طلاقیں (اگرچہ بعض کے نزدیک حرام اور بعض کے نزدیک بدعت ہے) لازم ہیں اور جن لوگوں نے اس قسم کی تین طلاقوں کے ایک واقع ہونے کے قول کو صحابہ کی جانب سے منسوب کیا ہے یہ نرا جھوٹ ہے اس کی کوئی اصل کسی کتاب میں نہیں ہے اور نہ ہی کسی صحابی سے کوئی روایت ہے۔(۱)

(۴) امام ابوعبداللہ محمد بن احمد القرطبی المالکی لکھتے ہیں۔

---

(۱) اضواء البیان بحذف یسیر، ج۱، ص: ۵۶۶۔

قال عُلماءنا واتفق ائمة الفتویٰ علی لزوم ایقاع الثلاث فی کلمة واحدة وهو قول جمهور السلف وشذ طاؤس وبعض اهل الظاهر الی ان طلاق الثلاث فی کلمة واحدة یقع واحدة ویرویٰ هذا عن محمد بن اسحاق والحجاج بن ارطاة وقیل عنهما لایلزم منه شیء وهو قول مقاتل ویحکی عن داؤد انه قال لا یقع والمشهور عن الحجاج بن ارطاة وجمهور السلف والائمة انه لازم واقع ثلاثا ولافرق بین ان یوقع ثلاثا مجتمعة فی کلمة او متفرقة فی کلمات.

ہمارے علماء کا قول ہے کہ ائمہ فتاویٰ متفق ہیں کہ ایک کلمہ کی تین طلاقیں تین ہی واقع ہوں گی اور اسی کے جمہور سلف قائل ہیں۔ طاؤس اور بعض اہل ظاہر اس قول شاذ کے قائل ہیں کہ ایک کلمہ کی تین طلاقیں ایک ہوں گی۔ محمد ابن اسحاق امام مغازی، اور حجاج بن ارطاۃ کی جانب بھی اس قول کو منسوب کیا گیا ہے اور ان دونوں کی جانب یہ بھی منسوب ہے کہ ایک طلاق بھی واقع نہیں ہوگی یہی مقاتل کا قول ہے اور امام داؤد ظاہری کی جانب بھی اس قول کی نسبت کی گئی ہے اور مشہور روایت حجاج بن ارطاۃ سے اور جمہور سے یہی ہے کہ تین ہی لازم ہوں گی۔ (۱)

(۵) امام محی الدین ابوزکریا یحییٰ بن شرف النووی الشافعی لکھتے ہیں:

وقد اختلف العلماء فیمن قال لامرأته انت طالق ثلاثا فقال الشافعی ومالك وابو حنیفة واحمد وجماهیر العلماء من السلف والخلف یقع الثلاث.

جس شخص نے اپنی بیوی کو کہا تجھ پر تین طلاق ہے، اس بارے میں علماء کے اقوال مختلف ہیں۔ امام شافعی، امام مالک، امام ابوحنیفہ امام احمد اور جمہور سلف وخلف کا مذہب ہے کہ اس صورت میں تین طلاقیں واقع ہوں گی۔ (۲)

(۶) امام حافظ ابن حجر عسقلانی جمہور کے مذہب کی تائید کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

---

(۱) الجامع لاحکام القرآن ج ۳ ص ۱۲۹۔

(۲) شرح مسلم ج ۱ ص ۴۷۸۔

فالراجح فی الموضعین تحریم المتعة وایقاع الثلاث للاجماع الذی انعقد فی عهد عمر رضی اللّٰه عنه علی ذلك ولا یحفظ ان احدا فی عهد عمر خالفه فی واحدة منهما وقد دل اجماعهم علی وجود الناسخ وان کان خفی عن بعضهم قبل ذلك حتی ظهر لجمیعهم فی عهد عمر فالمخالف بعد هذا الاجماع منا بذله والجمهور علی عدم اعتبار من احدث الاختلاف بعد الاتفاق. پس راجح ان دونوں قضیوں میں متعہ کا حرام ہونا اور اکٹھی تین طلاقوں کا تین ہونا ہی ہے کیونکہ حضرت عمرؓ کے عہد میں اس پر اجماع ہو چکا ہے۔ اور حضرت عمرؓ کے زمانہ میں کسی نے ان دونوں مسئلوں میں اختلاف کیا ہو صحیح روایت سے ثابت نہیں اور حضرات صحابہ کا اجماع بذات خود ناسخ کے وجود کو بتا رہا ہے اگرچہ یہ ناسخ اجماع سے پہلے بعض حضرات پر مخفی رہا لیکن حضرت عمرؓ کے زمانہ میں سب پر روشن ہو گیا لہٰذا اس اجماع کے بعد اس کی مخالفت کرنے والا اجماع کو پس پشت ڈالنے والا ہے اور جمہور کا اتفاق ہے کہ کسی مسئلہ پر اتفاق واجماع ہو جانے کے بعد اس میں اختلاف پیدا کرنے والے کا قول غیر معتبر اور مردود ہے۔ (۱)

(۷) حافظ ابن القیم الحنبلی لکھتے ہیں امام ابوالحسن علی بن عبداللہ بن ابراہیم اللخمی المشطی نے الوثائق الکبیرہ کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے جو اپنے موضوع پر بے مثل ہے۔ امام موصوف نے اس میں لکھا ہے۔

"الجمهور من العلماء علی انه یلزمه الثلاث وبه القضاء وعلیه الفتویٰ وهو الحق الذی لاشك فیه" جمہور علماء اس پر متفق ہیں کہ اس پر تین طلاقیں لازم ہیں۔ یہی فیصلہ ہے۔ اسی پر فتویٰ ہے اور بلا ریب یہی حق ہے۔ (۲)

علامہ ابن رجب الحنبلی تلمیذ رشید حافظ ابن القیم اپنی کتاب مشکل الاحادیث الواردة فی ان الطلاق الثلاث واحدة میں لکھتے ہیں۔ اعلم انه لم یثبت عن احد من

---

(۱) فتح الباری ج۹ ص۳۱۹ بحوالہ اعلاء السنن ج۱۱ ص۱۵۰۔

(۲) اغاثة اللهفان ج۱ ص۳۲۶۔

الصحابة ولا من التابعين ولا من ائمة السلف المعتد بقولهم فی الفتاویٰ فی الحلال والحرام شیء صریح فی ان الطلاق الثلاثه بعد الدخول یحتسب واحدة اذا سبق بلفظ واحد.

یہ بات جان لو! کہ صحابہ، تابعین اور ائمہ سلف جن کا قول دربارۂ حلال وحرام معتبر مانا جاتا ہے کسی سے بھی بصراحت یہ ثابت نہیں ہے کہ صحبت کے بعد کی تین طلاقیں جو ایک لفظ سے دی گئی ہوں ایک شمار ہوں گی۔ (۱)

(۸) علامہ ابن تیمیہ کے جد امجد ابوالبرکات مجد الدین عبدالسّلام المقلب با بن تیمیہ الحنبلی اپنی مشہور کتاب منتقی الاخبار میں "باب ما جاء فی طلاق البتة وجمع الثلاث و تفریقها" **میں احادیث وآثار نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں۔**

"وهذا كله يدل على اجماعهم على صحة وقوع الثلاث بالكلمة الواحدة" **یعنی یہ احادیث وآثار دلالت کرتے ہیں کہ ایک کلمہ سے تین طلاقوں کے واقع ہونے پر صحابہ کرام کا اجماع ہو چکا ہے۔ (۲)**

عہد فاروقی میں صحابہ کا اجماع

حافظ ابن الہمام، حافظ ابن حجر عسقلانی محدث ابوبکر ابن العربی، شیخ ابوالبرکات ابن تیمیہ کے علاوہ ابوبکر جصاص رازی احکام القرآن میں امام ابوالولید الباجی المنتقی میں ابن رجب مشکل الاحادیث الوارده میں ابن الہادی سیر الحاث فی علم الطلاق میں امام زرقانی شرح مؤطا میں، علامہ ابن التین شرح بخاری میں، علامہ ابن حزم ظاہری المحلی میں، امام خطابی شرح سنن ابی داؤد میں اور حافظ ابن عبدالبر تمہید واستذکار میں بصراحت لکھتے ہیں کہ عہد فاروقی میں صحابہ کا اس مسئلہ پر اجماع ہو چکا ہے بغرض اختصار ان حضرات کی

---

(۱) الاشفاق علی احکام الطلاق ص ۳۵ **مطبوعہ مصر** وسیر الحاث فی علم الطلاق ص ۷۷ للیوسف بن عبدالرحمن ابن الهادی الحنبلی، **بحوالہ** مجلة البحوث الاسلامية ج ۱ عدد ۳، ۱۳۹۷ھ الرياض المملكة العربية السعودية.

(۲) منتقی الاخبار ص ۲۳۷۔

عبارتیں اس موقع پر حذف کردی گئی ہیں۔ اور حافظ ابن حجر لکھتے ہیں "ان اهل السنة والجماعة متفقون علی ان اجماع الصحابة حجة" اہل سنت والجماعۃ متفق ہیں کہ صحابۂ کرام کا اجماع حجت ہے۔(۱)

خود علامہ ابن تیمیہ لکھتے ہیں کہ مشائخ علم اور ائمہ دین کسی مسئلہ پر اجماع کرلیں تو ان کا اجماع واتفاق حجۃ قاطعہ ہوگا۔(۲) اور حافظ ابن القیم زاد المعاد میں بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت...... کی سنت اور خلفائے راشدین کے عمل کے بعد کسی اور کی بات قابلِ تسلیم ہی نہیں (۳)——— اور یہ بات ثابت اور محقق ہے کہ حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی رضی اللہ عنہم ایک مجلس کی تین طلاقوں کو تین ہی مانتے ہیں۔ اس لئے ان کے مقابلے میں کسی کی بات قابلِ تسلیم نہیں ہونی چاہیئے۔

اوپر کی نقول سے مدلل طور پر یہ بات معلوم ہوچکی ہے کہ عہد فاروقی میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کا اس پر اجماع بھی ہو چکا ہے۔ اپنے آپ کو اہل سنّت والجماعت کے زمرہ میں شمار کرنے والوں کے لئے کسی اعتبار سے بھی درست نہیں ہے کہ وہ اس اجماعی مسئلہ کو چھوڑ کر زید وبکر کے شاذ قول پر عمل کریں جس سے نہ صرف اک حجۃ شرعیہ کا ترک لازم آرہا ہے بلکہ بعض اہل بدع کے ساتھ مشابہت بھی ہورہی ہے۔

اجماعِ مذکور کو غیر ثابت قرار دینے کی غیر اصولی کوشش

جو لوگ اس اجماع کو غیر ثابت باور کرانے کے لئے ابو جعفر احمد بن محمد بن مغیث الطلیطلی المتوفی ۴۵۹ کی "کتاب الوثائق" سے یہ روایت پیش کرتے ہیں کہ حضرت علی، عبدالرحمٰن بن عوف، زبیر بن العوام، عبداللہ بن مسعود اور عبداللہ بن عباس مجلس واحد کی تین طلاقوں کو ایک شمار کرتے تھے۔ انھیں سوچنا چاہیئے کہ سطور بالا میں مذکورہ اکابر حدیث

---

(۱) فتح الباری ج ۱۳، ص ۲۶۶۔

(۲) الواسطہ ص ۴۷، بحوالہ عمدۃ الاثاث ص ۴۲۔

(۳) ایضاً ص ۴۴.

ماہرین فقہ اور ائمہ مسلمین کی ثبوتِ اجماع پر ان تصریحات کے مقابلہ میں بیچارے ابن مغیث الطلیطلی کی اس روایت کی کیا حیثیت ہے؟ جب کہ خود ابن مغیث کا علم وفہم اور نقل روایت میں ان کی امانت اور کردار کی پختگی علمائے رجال کے نزدیک غیر معروف ہے۔ (۱)

علاوہ ازیں ابن مغیث نے یہ روایت محمد بن وضاح کے حوالہ سے نقل کی ہے۔ چنانچہ وہ خود اس کی صراحت بایں الفاظ کرتے ہیں رو ینا ذلك كله من ابن وضاح یہ ساری باتیں ہم نے ابن وضاح سے لی ہیں۔ (۲)

حالانکہ ان کے اور ابن وضاح کے درمیان صدیوں کا طویل فاصلہ ہے اس لمبے فاصلے کو کن وسائط وذرائع سے طے کر کے وہ ابن وضاح تک پہنچے اس کی تفصیل ندارد ہے اس لئے یہ بے سند روایت اصول روایت کے مطابق لائق اعتبار نہیں ہو سکتی۔

اگر راوی اور روایت کی ان خامیوں سے صرف نظر کر کے ابن وضاح کی جانب یہ نسبت درست مان لی جائے تو خود مدار روایت یعنی محمد بن وضاح اس لائق نہیں ہیں کہ ان کی باتیں آنکھ بند کر کے تسلیم کر لی جائیں، اس لئے کہ الحافظ ابو الولید الفرضی ان کے بارے میں لکھتے ہیں "انه كان جاهلا بالفقه وبالعربية ينفى كثيرا من الاحاديث الصحيحة فمثله يكون بمنزلة العامى وان كثرت روايته" ابن وضاح فقہ وعربیت سے ناواقف تھے، اکثر صحیح حدیثوں کی بھی نفی کر دیتے تھے، اس طرح کا آدمی عوام الناس میں شمار ہوگا، اگر چہ اس کی روایت زیادہ ہو(۳)

فن روایت کی یہ ایسی خامیاں ہیں جن کی وجہ سے روایت کی صحت مخدوش ہو جاتی ہے اور وہ اس قابل نہیں بچتی کہ ارباب علم وفن اس کی جانب متوجہ ہوں، چنانچہ الحافظ الفرضی لکھتے ہیں۔ "والاشتغال برأے هذا الطليطلى وذاك المجريطى من المهملين شغل من لاشغل عنده" یہ طلیطلی اور مجریطی ایسے بے کار لوگ ہیں کہ ان کی باتوں میں

---

(۱) ابن مغیث کے متعلق القواصم او العواصم میں محدث ابن العربی کا نقد وتبصرہ دیکھا جائے۔

(۲) الجامع لاحکام القرآن القرطبی ص ۱۳۲، ج ۳۔

(۳) اعلاء السنن ج ۱۱، ص ۱۶۷ بحوالہ الاشفاق۔

وہی مشغول ہوگا جس کے پاس کوئی کام نہ ہو۔(۱)

ان باتوں سے قطع نظر حضرات صحابہ کے آثار واقوال کے قابلِ اعتماد مآخذ کتب حدیث مثلاً صحاح ستہ اور دیگر سنن، جوامع، مسانید، معاجم، مصنفات وغیرہ ہیں جن میں صحابۂ کرام کی جانب منسوب ہر بات کو سند کے ساتھ نقل کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے، اور ان مستند مآخذوں سے ایسی ایک روایت بھی صحیح سند کے ساتھ پیش نہیں کی جاسکتی جس سے یہ ثابت ہو کہ یہ مذکورہ حضرات یعنی علی مرتضیٰ، عبدالرحمٰن بن عوف، زبیر بن العوام، عبداللہ بن مسعود اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم میں سے کسی نے مدخول بہا (جس کے ساتھ ہمبستری ہوچکی ہو) کو مجلس واحد میں دی گئی تین طلاقوں کو ایک طلاق قرار دیا ہے، بلکہ اس کے برعکس ان میں سے اکثر سے معتبر سندوں سے ثابت ہے کہ ایک مجلس کی تین طلاقیں تین ہی ہیں اور بقیہ حضرات سے اس کے خلاف کوئی روایت نہیں ہے، چنانچہ تفصیل آئندہ آرہی ہے، یہی وجہ ہے کہ حافظ ابن القیم جو اپنے شیخ علامہ احمد ابن تیمیہ کی نصرت وحمایت میں ہر طرف سے آنکھیں بند کر کے تین طلاقوں کو ایک ثابت کرنے پر مصر ہیں، ابن مغیث کی مذکورہ بالا روایت نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں "فقد صح بلا شك عن ابن مسعود وعلي وابن عباس الالزام بالثلاث لمن اوقعها جملة و صحّ عن ابن عباس انه جعلها واحدة ولم نقف على نقل صحيح عن غيرهم من الصحابة بذلك الخ بغیر کسی شک وشبہ کے صحیح طور پر ثابت ہے کہ عبداللہ ابن مسعود، علی اور عبداللہ ابن عباس نے اکٹھی تین طلاقیں دینے والے پر تین ہی لازم کیا ہے اور عبداللہ بن عباس سے صحیح طور پر یہ بھی ثابت ہے کہ انھوں نے تین کو ایک قرار دیا ہے، اور ان کے علاوہ دوسرے حضرات صحابہ سے ہم کسی نقل صحیح پر واقف نہیں ہوسکے۔(۲) (یہ موصوف کا فریب علم ہے ورنہ حضرت عبداللہ ابن عباس سے بھی مدخول بہا کی تین طلاقیں تین ہی ثابت ہے اس کے برخلاف ان سے کوئی روایت نہیں ہے، تفصیل آئندہ معلوم ہوجائے گی) گویا

---

(۱) ایضاً۔

(۲) الاغاثۃ اللہفان ج۱ص ۳۲۹، ۳۳۰۔

ابن القیم نے ابن مغیث کی بیان کردہ روایت کی تردید کردی کہ صحیح نقل سے یہ ثابت نہیں ہے بلکہ اس کا برعکس ثابت ہے اس تردید کے باوجود علامہ ابن تیمیہ وابن القیم کے مقلدین ابن مغیث کی قائم کردہ بے سروپا اور فرسودہ لکیر پیٹتے جارہے ہیں۔

فاروق اعظم کے بارے میں اپنے فیصلہ سے رجوع کر لینے کا بے بنیاد دعویٰ

اسی طرح اس ثابت شدہ اجماع کو کالعدم بتانے کے لئے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ حضرت فاروق اعظم نے جو اس اجماع کے محرک اور نافذ کرنے والے تھے بعد میں اپنے اس فیصلہ سے رجوع کرلیا تھا، علماء غیر مقلدین کے علاوہ شیعہ مجتہد اور بعض دوسرے لوگوں نے اس موضوع سے متعلق اپنی تحریروں میں یہ بات دہرائی ہے، لیکن ان میں سے کسی نے بھی یہ زحمت گوارہ نہیں کی کہ جس روایت کی بنیاد پر یہ دعویٰ کیا جارہا ہے اسے سند کے ساتھ پیش کردیتے، تاکہ اس روایت سے استدلال کی حقیقت آشکارا ہوجاتی، شاید عصر جدید کے ان جدید محققین کے نزدیک کسی دعویٰ کے ثبوت پر ''روایت ہے یا مروی ہے'' کا لفظ لکھ دینا کافی ہے، دوسروں پر تقلید اور روایت پرستی کی پھبتی کسنے والوں کا یہ رویہ خود انھیں منھ چڑھا رہا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جس روایت کے سہارے رجوع کی یہ بات اڑائی جارہی ہے وہ اس حیثیت کی ہے ہی نہیں کہ اس سے دعوئ رجوع پر استدلال کیا جاسکے، شاید روایت کی اسی کمزوری کی بناء پر دانستہ اسے نقل کرنے سے احتراز کیا گیا ہے، اور صرف ''روایت ہے'' کہہ کر بات چلتی کردی گئی ہے، ذیل میں ہم اس روایت کو اور اس کی سند پر علمائے جرح و تعدیل کے نقد کو نقل کررہے ہیں۔

حافظ ابوبکر اسماعیلی مسند عمر میں روایت کرتے ہیں اخبرنا ابو یعلیٰ حدثنا صالح بن مالك حدثنا خالد بن يزيد(۱) بن ابی مالك عن ابيه قال قال عمر ماندمت

---

(۱) یہ بات ملحوظ رہے کہ یزید اپنے والد کے بجائے دادا کی جانب منسوب ہیں انکے والد عبدالرحمٰن بن ابی مالک ہیں۔

علی شیء ندامتی علی ثلاث ان لا اکون حرمت الطلاق، وعلی ان اکون انکحت الموالی وعلی ان لا اکون قتلت النوائح. حافظ ابوبکر کہتے ہیں مجھے ابویعلی نے خبر دی وہ کہتے ہیں مجھ سے صالح بن مالک نے بیان کیا صالح کہتے ہیں کہ مجھ سے خالد بن یزید نے اپنے والد کے حوالے سے کہا کہ حضرت عمر نے فرمایا کہ میں کسی چیز پر نادم نہیں ہوا، اپنی تین باتوں پر ندامت کی طرح ان میں سے ایک یہ ہے کہ میں نے طلاق کو حرام کیوں نہیں کر دیا الخ۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس مقولہ کے راوی خالد کے والد یزید کے بارے میں علمائے رجال نے تصریح کی ہے کہ ان کی ملاقات حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں ہے، اس لئے لامحالہ انھوں نے حضرت عمر کا یہ قول کسی واسطہ سے سنا ہوگا جس کا یہاں ذکر نہیں، اس لئے اس روایت میں انقطاع ہے، علاوہ ازیں امام ذہبیؒ نے میزان الاعتدال میں لکھا ہے کہ یزید بن ابی مالک مدلّس تھے، یعنی اپنی روایت کی اہمیت بڑھانے کی غرض سے اپنے استاذ کا نام لینے کی بجائے استاذ کے استاذ کا نام لیتے تھے۔ حافظ ابن حجر نے بھی ”تعریف اہل التقدیس بالموصوفین بالتدلیس“ میں امام ابومسہر کے حوالہ سے لکھا ہے کہ یزید بن مالک مدلّس تھے، اور یزید بن مالک کے درجہ کے مدلّس کی مرسل و منقطع روایت کسی کے نزدیک قابل حجت نہیں۔

دوسری کمزوری یہ ہے کہ خالد بن یزید اکثر علمائے جرح کے نزدیک ضعیف ہیں، چنانچہ امام اہل جرح وتعدیل ابن معین نے انھیں ضعیف قرار دیا ہے، امام احمد بن حنبل کہتے ہیں ”لیس بشیء“ یہ محض ہیچ ہے، امام نسائی نے فرمایا کہ یہ ثقہ نہیں ہے، امام ابوداؤد نے ایک مرتبہ انھیں ضعیف بتایا اور ایک مرتبہ فرمایا کہ یہ منکر الحدیث ہے، علامہ ابن جارود، امام ساجی اور حافظ عقیلی نے خالد کا ذکر ضعفاء کے تحت کیا ہے، ابن حبان کہتے ہیں کہ خالد اگرچہ روایت کرنے میں سچے تھے، لیکن بیان روایت میں اکثر غلطی کر جاتے تھے اس لئے مجھے ان کی روایت سے استدلال پسند نہیں ہے، بالخصوص جب یہ اپنے والد یزید بن ابی مالک سے تنہا کوئی روایت نقل کریں۔ امام جرح یحییٰ بن معین نے غالباً اسی مذکورہ بالا

روایت کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ”لم یرض ان یکذب علی ابیه حتی کذب علی اصحاب رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم“ یعنی خالد نے تنہا اپنے والد پر جھوٹ بولنے پر بس نہیں کیا بلکہ اصحاب رسول...... پر بھی کذب بیانی کی ہے۔(۱)

جس راوی کی ارباب جرح وتعدیل کے نزدیک یہ حیثیت ہو اس کی روایت کس درجہ کی ہوگی اہل علم ودانش اسے خوب جانتے ہیں ”عیاں راچہ بیاں“ پھر اس روایت میں ندامت کا ذکر ہے رجوع کرنے کا نہیں اس لئے ندامت کا معنی رجوع کے لینا ایجاد بندہ سے زیادہ کی حیثیت نہیں رکھتا۔

یہ ہے اس روایت کی حقیقت جس کی بنیاد پر حضرت فاروق اعظم کے اپنے فیصلے سے رجوع کر لینے کا دعویٰ کیا جا رہا ہے، اور ظاہر ہے ”جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا“ اس لئے جمہور کا یہ دعویٰ کہ ایک مجلس کی تین طلاقوں کے تین واقع ہونے پر عہد فاروقی میں حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کا اجماع ہو چکا ہے ہر تردد اور شک و شبہ سے بری ہے، اور حضرات صحابہ کے بارے میں علمائے امت کا متفقہ فیصلہ ہے کہ فانھم اعرف الناس بکتاب اللّٰہ وبرسوله واعلمھم بمعانی السنة ومقاصد الشرع، حضرات صحابہ قرآن اور صاحب قرآن...... کی معرفت میں سب سے فائق ہیں، اور احادیث رسول...... کے معانی اور مقاصد شریعت کو سب سے زیادہ جاننے والے ہیں لہٰذا مسئلہ زیر بحث میں ان کے اجماع کے بعد کسی قیل وقال کی قطعاً کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی، مسئلہ کی اسی قطعیت کی بنا پر محقق ابن ہمام لکھتے ہیں ”لوحکم حاکم بان الثلاث بفم واحد واحدة لم ینفذ حکمه لانه لایسوغ الاجتھاد فیه فھو خلاف لا اختلاف“(۲) اگر کوئی قاضی یہ فیصلہ کر دے کہ ایک تلفظ کی تین طلاقیں ایک ہوں گی تو اس کا یہ فیصلہ نافذ نہیں ہوگا، کیونکہ اس مسئلہ میں اجتہاد کی گنجائش نہیں ہے، اس لئے قاضی کا یہ فیصلہ اختلاف نہیں بلکہ مخالفت کے قبیل سے ہوگا، جس کا اعتبار نہیں ہوتا۔

---

(۱) تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۱۰۹ و مجلّہ البحوث الاسلامیہ الریاض، ص ۱۰۸ ج ۱، عدد ۳، ۱۳۹۷ھ۔

(۲) فتح القدیر، ج ۳، ص ۳۳۰۔

(۱) آیت طلاق

مسئلہ زیر بحث میں ضروری ہے کہ سب سے پہلے قرآن حکیم کی ’’آیت طلاق‘‘ پر غور کرلیا جائے، کیونکہ مسئلہ طلاق میں اس کی حیثیت ایک بنیادی ضابطہ اور قانون کی ہے، اس آیت کی تفسیر و تاویل معلوم ہو جانے سے انشاء اللہ مسئلہ کی بہت ساری گتھیاں از خود سلجھ جائیں گی۔

آیت پاک کا شان نزول

عہد جاہلیت میں طلاقیں دینے اور پھر عدت میں رجوع کر لینے کی کوئی حد نہیں تھی، سینکڑوں طلاقیں دی جاسکتی تھیں اور پھر عدت کے اندر رجوع کیا جاسکتا تھا، بعض وہ لوگ جنھیں اپنی بیویوں سے کسی بناء پر کد ہو جاتی اور وہ انھیں ستانا اور پریشان کرنا چاہتے تو طلاقیں دے دے کر عدت میں رجوع کرتے رہتے تھے، نہ خود ان کے ازدواجی حقوق ادا کرتے اور نہ انھیں آزاد کرتے اس طرح وہ مجبور محض اور بے بس ہو کر رہ جاتی تھیں، جب تک طلاق سے متعلق اسلام میں کوئی حکم نازل نہیں ہوا تھا مسلمانوں میں بھی طلاق کا یہی طریقہ جاری رہا، امام قرطبی لکھتے ہیں و کان هذا فی اول اسلام برهة۔(۱) ابتدائے اسلام میں ایک عرصہ تک یہی طریقہ رائج رہا۔

”اخرج البیهقی بسنده من هشام بن عروة عن ابیه عن عائشة رضی اللّٰہ عنهما قالت کان الرجل طلق امرأته ماشاء ان یطلقها و ان طلقها مائة او اکثر اذا ارتجعها قبل ان تنقضی عدتها حتی قال الرجل لامرأته لا اطلقك فتبینی ولا اوٗویك الیّ قالت و کیف ذاك؟ قال اطلقك فکلما همت عدتك ان تنقضی ارتجعتك وافعل هکذا! فشکت المرأة ذالك الی عائشة رضی اللّٰہ عنها فذکر عائشة ذلك رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم فسکت فلم یقل شیئًا

---

(۱) جامع احکام القرآن، ج ۳ ص ۱۲۶۔

حتی نزل القرآن (الطلاق مرتان) فمن شاء طلق ومن شاء لم یطلق“ ورواه ایضا قتیبة بن سعید والحمیدی عن یعلی بن شبیب و کذالك قال محمد بن اسحاق بن یسار بمعناه وروی نزول آیة فیه عن ھشام بن عروة عن ابیه عن عائشة رضی اللّٰه عنھا. (۱)

عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ مرد اپنی بیوی کو جتنی طلاقیں دینا چاہتا دے سکتا تھا اگرچہ وہ طلاقیں سیکڑوں تک پہنچ جائیں بشرطیکہ عدت پوری ہونے سے پہلے رجوع کرلے، یہاں تک کہ ایک شخص نے اپنی بیوی سے کہا کہ میں تجھے اس طرح طلاق نہ دوں گا کہ تو مجھ سے الگ ہوجائے اور نہ میں تجھے اپنی پناہ ہی میں رکھوں گا، اس عورت نے پوچھا کہ یہ معاملہ تم کس طرح کروگے، اس نے جواب دیا میں تجھے طلاق دوں گا اور جب عدت پوری ہونے کے قریب ہوگی تو رجوع کرلوں گا، طلاق اور رجعت کا یہ سلسلہ جاری رکھوں گا، اس عورت نے اپنے شوہر کی اس دھمکی کی شکایت حضرت عائشہؓ سے کی، حضرت عائشہؓ نے اس کا ذکر آنحضرت ...... سے کیا، نبی کریم ...... سن کر خاموش رہے اس پر کچھ فرمایا نہیں، تا آنکہ قرآن حکیم کی آیت (الطلاق مرتان الخ) نازل ہوگئی، تو اس وقت سے لوگوں نے آیت کے مطابق طلاق کی ابتدا کی اور جس نے چاہا اپنی بیوی کو طلاق دیدی اور جس نے چاہا نہ دی، امام بیہقی کہتے ہیں کہ اس روایت کو قتیبہ بن سعید اور حمیدی نے بھی یعلی بن شبیب کے واسطہ سے نقل کیا ہے، اسی طرح محمد ابن اسحٰق امام المغازی نے ہشام کے واسطہ سے حضرت عائشہ سے الفاظ کے کچھ اختلاف کے ساتھ اسے بیان کیا ہے۔

واخرج ابن مردویة والبیھقی عن عائشة قالت لم یکن للطلاق وقت یطلق الرجل امرأته ثم یراجعھا مالم تنقض العدة فوقت لھم الطلاق ثلاثا یراجعھا فی الواحدة والثنتین ولیس فی الثالثة رجعة حتی تنکح زوجا غیره. (۲)

حافظ ابن کثیر نے لکھا ہے ورواہ الحاکم فی مستدرکه وقال صحیح

---

(۱) سنن الکبریٰ للبیھقی مع الجواھر النقی ج ۷ ص ۳۳۳ مطبوعہ حیدرآباد۔

(۲) درمنثور ج ۱ ص ۲۷۷۔

الاسناد. (۱) اس روایت کو امام حاکم نے مستدرک میں نقل کیا ہے اور فرمایا ہے کہ اس کی سند صحیح ہے۔

عائشہ صدیقہؓ بیان کرتی ہیں کہ طلاق کی کوئی حد نہیں تھی آدمی اپنی بیوی کو طلاق دے کر عدت کے اندر رجوع کرلیا کرتا تھا تو ان کے لئے تین طلاق کی حد مقرر کردی گئی ایک اور دو طلاقوں تک رجعت کرسکتا ہے تیسری کے بعد رجعت نہیں تاوقتیکہ مطلقہ کسی اور سے نکاح نہ کرلے۔

واخرج ابوداؤد عن ابن عباس رضی اللہ عنہما "والمطلقٰت یتربصن بانفسھن ثلاثۃ قروء ولا یحل لھن ان یکتمن ما خلق اللّٰہ فی ارحامھن" الآیۃ وذالك ان الرجل کان اذا طلق امراتہٗ فھو احق برجعتھا وان طلقھا ثلاثا فنسخ ذالك فقال "الطلاق مرتان" (۲)

مطلقہ عورتیں انتظار میں رکھیں اپنے آپ کو تین حیض تک اور انھیں حلال نہیں اس چیز کا چھپانا جو اللہ نے ان کے رحم میں پیدا کیا، اور دستور یہ تھا کہ مرد جب اپنی بیوی کو طلاق دیتا تو رجعت کا حق رکھتا تھا اگرچہ تین طلاقیں دی ہوں پھر اس طریقہ کو منسوخ کردیا گیا، اور اللہ جل شانہ نے فرمایا الطلاق مرتان، یعنی طلاق رجعی دو ہیں۔

الفاظ کے فرق کے ساتھ سبب نزول سے متعلق اسی طرح کی روایتیں، مؤطا امام مالک اور جامع ترمذی اور تفسیر طبری وغیرہ میں بھی ہیں، ان تمام روایتوں کا حاصل یہ ہے کہ آیت کریمہ "الطلاق مرتان" کے ذریعہ قدیم طریقہ کو منسوخ کرکے طلاق اور رجعت کی حد دونوں باتیں متعین کردی گئیں کہ طلاق کی تعداد تین ہے اور رجعت دو طلاقوں تک کی جاسکتی ہے اس کے بعد رجعت کا اختیار ختم ہوجائے گا فَاِنْ طَلَّقَھَا فَلَا تَحِلُّ لَہٗ مِن بَعْدُ حَتّٰی تَنْکِحَ زَوْجًا غَیْرَہ دو کے بعد اگر طلاق دیدی تو بیوی حلال نہ ہوگی یہاں تک کہ کسی اور مرد سے نکاح کرلے، حدیث میں 'تنکح زوجا غیرہ' کی تفسیر یہ بیان

---

(۱) تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۲۷۲۔

(۲) بذل المجھود شرح سنن ابوداؤد باب فی نسخ المراجعۃ بعد التطلیقات الثلاث ج ۲ ص ۶۱۔

کی گئی ہے کہ یہ دوسرا شوہر لطف اندوزِ صحبت بھی ہو۔

قدوۃ المفسرین امام جریر طبری متوفی ۳۰۹ھ سبب نزول کی روایت متعدد سندوں سے ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں ”فتاويل الآية على هذا الخبر الذى ذكرنا عدد الطلاق الذى لكم ايها الناس فيه على ازواجكم الرجعة اذا كن مدخولا بهن ”تطليقتان“ ثم الواجب بعد التطليقتين امساك بمعروف او تسريح باحسان لانه لارجعة له بعد التطليقتين ان سرحها فطلقها الثالثة“ آیت کی تفسیر ان روایتوں کے پیش نظر جو ہم نے اوپر ذکر کی ہیں یہ ہے کہ طلاق کی وہ تعداد جس میں تمھیں اے مردو اپنی مطلقہ بیویوں سے رجعت کا حق ہے جبکہ ان سے ہم بستری ہوچکی ہو دو طلاقیں ہیں ان دوطلاقوں کے بعد خوش اسلوبی کے ساتھ نکاح میں روک لینا ہے، یا حسن سلوک کے ساتھ چھوڑ دینا ہے اس لئے کہ دوطلاقوں کے بعد رجعت نہیں ہے، اگر چھوڑنا چاہے تو تیسری طلاق دیدے۔

اس کے بعد آیت سے متعلق دوسرا قول ان الفاظ میں نقل کرتے ہیں وقال الآخرون انما انزلت هذه الآية على نبى اللّٰه (صلى اللّٰه عليه وسلم) تعريفا من اللّٰه تعالىٰ ذكره عباده سنة طلاقهم نساءهم اذا ارادوا طلاقهن لادلالة على القدر الذى تبين به المرأة من زوجها وتاويل الآية على قول هؤلاء سنة الطلاق التى سننتها وابحتها لكم ان اردتم طلاق نسائكم ان تطلقوهن ثنتين فى كل طهر واحدة ثم الواجب بعد ذالك عليكم اما ان تمسكوهن بمعروف! تسرحوهن باحسان“

اور دیگر حضرات فرماتے ہیں کہ یہ آیت منجانب اللہ رسول خدا...... پر نازل ہوئی اللہ کی طرف سے بندوں کو اپنی بیویوں کو طریقۂ طلاق سکھانے کے لئے، اس آیت کا مقصد طلاق بائن کی تعداد بیان کرنا نہیں ہے، ان حضرات کے اس قول کے تحت آیت کی تفسیر یہ ہوگی کہ طلاق کا طریقہ جو میں نے جاری اور تمھارے لئے مباح کیا یہ ہے کہ اگر تم اپنی بیویوں کو طلاق دینا چاہو تو انھیں دوطلاق ایک طہر میں دو، ان دوطلاقوں کے بعد تم پر

واجب ہوگا کہ انھیں دستور شرعی کے مطابق روک لو یا خوبصورتی کے ساتھ چھوڑ دو۔

شان نزول سے متعلق ان دونوں روایتوں اور ان کے تحت آیت کی تفسیر کرنے کے بعد اپنی رائے کا اظہار یوں کرتے ہیں۔

والذی اولی بظاهر التنزیل ما قاله عروة وقتادة ومن قال مثل قولهما من انّ الآیة انما هی دلیل علی عدد الطلاق الذی یکون به التحریم وبطول الرجعة فیه، والذی یکون فیه الرجعة منه وذالك ان اللّٰه تعالیٰ ذکرهٗ قال فی الآیة التی تتلوها ”فَاِنۡ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنۡ بَعۡدُ حَتّٰی تَنۡکِحَ زَوۡجًا غَیۡرَهٗ“ فعرف عباده القدر الذی به تحرم المرأة علی زوجها الا بعد زوج ولم یبین فیها الوقت الذی یجوز الطلاق فیه والوقت الذی لایجوز فیه اهـ(۱)

ظاہر قرآن سے زیادہ قریب وہی بات ہے جو عروہ، قتادہ وغیرہ نے کہی ہے یعنی یہ آیت دلیل ہے اس عدد طلاق کی جس سے عورت حرام اور رجعت کرنی باطل ہوجائے گی، اور جس طلاق کے بعد رجعت ہوسکتی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت کے بعد فان طلقها فلا تحل له اهـ الآیة کا ذکر کرکے بندوں کو طلاق کی اس تعداد کو بتایا ہے جس سے عورت اپنے شوہر پر حرام ہوجائے گی مگر یہ کہ دوسرے شوہر سے رشتۂ نکاح قائم کرلے، اس موقع پر ان اوقات کا ذکر نہیں فرمایا ہے جن میں طلاق جائز اور ناجائز ہوتی ہے۔

امام ابن جریر طبریؒ کے علاوہ حافظ ابن کثیرؒ اور امام رازیؒ نے بھی اسی تفسیر کو راجح قرار دیا ہے نیز علامہ سید آلوسی حنفی نے اسی کو ”الیق بالنظم واوفق بسبب النزول“ (یعنی نظم قرآن سے زیادہ مناسب اور سبب نزول سے خوب چسپاں ہے) بتایا ہے۔(۲)

آیت پاک ”الطلاق مرتان“ کی اس تفسیر کا جسے امام طبری وغیرہ نے اولیٰ اور راجح قرار دیا ہے سبب نزول سے موافق ہونا تو ظاہر ہے، رہی بات نظم قرآن کے ساتھ اس

---

(۱) جامع البیان فی تفسیر القرآن ج ۳ ص ۲۵۹۔

(۲) روح المعانی ج ۲ ص ۱۳۵۔

تفسیر کی مناسبت ومطابقت کی تو اس کو سمجھنے کے لئے آیت کے سیاق وسباق پر نظر ڈالئے، آیت زیر بحث سے پہلے ”وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْءٍ“ طلاق والی عورتیں اپنے آپ کو انتظار میں رکھیں تین حیض تک۔ بعد ازاں اس مدت انتظار میں شوہر کے حق رجعت کا حکم بیان فرمایا گیا وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْا اِصْلَاحًا، اور ان کے شوہر حق رکھتے ہیں ان کے لوٹا لینے کا اس مدت میں اگر چاہیں سلوک سے رہنا۔

اس آیت کے نزول کے وقت قدیم رواج کے مطابق حق رجعت بغیر کسی قید کے بحالہ باقی تھا چاہے سینکڑوں طلاقیں کیوں نہ دی جا چکی ہوں (۱)۔ اور اس بے قید حق رجعت سے عورتیں جس ناقابل برداشت مصیبت میں مبتلا ہو جاتی تھیں اس کا اندازہ سبب نزول سے متعلق اوپر مذکور روایت سے ہو چکا ہے، چنانچہ اس کے بعد آیت ”الطلاق مرتان اھ“ نازل ہوئی، جس کے ذریعہ قدیم طریقہ کو ختم کر کے ایک جدید قانون نافذ کر دیا گیا کہ رجعت کا حق صرف دو طلاقوں تک ہوگا، اس کے بعد طلاق کی آخری حد بیان کرنے کے لئے ارشاد ہوا ”فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ اور اگر تین طلاقیں دیدیں تو اب عورت اس کے لئے حلال نہ ہوگی تاوقتیکہ دوسرے مرد سے نکاح نہ کر لے (اور دوسرا شوہر اس کی صحبت سے لطف اندوز نہ ہو لے، الحدیث) اس کے ساتھ ازدواجی رشتہ قائم کرنا جائز نہ ہوگا۔

لفظ مرتان کی لغوی تحقیق

کلام کا یہ نظم مُظہر ہے کہ آیت ”الطلاق مرتان“ کا مقصد نزول طلاق رجعی کی حد اور طلاقوں کی انتہائی تعداد بیان کرنی ہے، قطع نظر اس کے کہ یہ طلاق بلفظ واحد دی گئی ہو یا بالفاظ مکررہ ایک مجلس میں دی گئی ہو یا الگ الگ مختلف مجلسوں میں، بس یہی دو باتیں بہ نص صریح اس آیت سے ثابت ہوتی ہیں، تفریق مجلس کے لئے اس آیت میں ادنیٰ اشارہ

---

(۱) تفسیر ابن کثیر ج ا ص ۲۷۱۔

بھی نہیں ہے، لفظ ''مرتان'' کے پیش نظر زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ دو طلاقیں بیک کلمہ نہ دی جائیں بلکہ الگ الگ الفاظ سے دی جائیں، پھر ''مرتان'' کا لفظ ''مرة بعد اخریٰ''، یعنی یکے بعد دیگرے، ایک کے بعد دوسرا کے معنی میں قطعی بھی نہیں ہے، کیونکہ یہ لفظ جس طرح یکے بعد دیگرے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اسی طرح عددان یعنی دو چند اور ڈبل کے معنی میں بھی قرآن وحدیث میں استعمال کیا گیا ہے، جس کی چند مثالیں پیش کی جارہی ہیں۔

(الف) ''اُولٰئِكَ يُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَرَّتَيْنِ'' یہ لوگ (یعنی مؤمنین اہل کتاب) دیئے جائیں گے اپنا اجر وثواب دوگنا۔

(ب) اسی طرح ازواج مطہرات رضوان اللہ علیہن اجمعین کے بارے میں ارشاد ربانی ہے۔ وَمَنْ يَّقْنُتْ مِنْكُنَّ لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتَعمَلْ صَالِحًا نُّؤْتِهَا اَجْرَهَا مَرَّتَيْنِ۔ اور جو کوئی تم میں اطاعت کرے اللہ کی اور اس کے رسول کی اور عمل کرے اچھے تو ہم دیں گے اس کو اس کا ثواب دوگنا، ان دونوں قرآنی آیتوں میں ''مرتین'' عددین یعنی دو چند اور دوہرے ہی کے معنی میں ہے، یہ مطلب نہیں ہے کہ ان کو الگ الگ دو مرتبہ ثواب دیا جائے گا۔

اب حدیث سے دو مثالیں بھی ملاحظہ کیجئے۔

(ج) بخاری شریف میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آنحضرت...... نے فرمایا ''العبد اذا نصح لسيده واحسن عبادة ربه كان له اجره مرتين''(۱) غلام جب اپنے آقا کا خیر خواہ ہوگا اور اپنے رب کی عبادت میں مخلص تو اسے دوہرا اجر ملے گا، یہاں مرتین مضاعفین یعنی دوگنے اور دوہرے ہی کے معنی میں ہے۔

(د) صحیح مسلم شریف میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے ''ان اهل مكة سئالوا رسول الله صلى الله عليه وسلم ان يريهم آية فأراهم انشقاق القمر مرتين''(۲) مکہ والوں نے رسول خدا...... سے معجزہ طلب کیا تو آپ...... نے چاند کے

---

(۱) صحیح بخاری۔ (۲) صحیح مسلم جلد۲ ص۳۷۳۔

دوٹکڑے ہونے کا معجزہ دکھایا، اس حدیث میں ’’مرتین‘‘، فلقتین یعنی دوٹکڑے کے معنی میں ہے، یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ نے انھیں ’’مرۃ بعد اخریٰ‘‘ یکے بعد دیگرے شقّ القمر کا معجزہ دکھایا کیونکہ سیرت رسول سے واقفیت رکھنے والے جانتے ہیں کہ شق القمر چاند کے دو ٹکڑے ہونے کا معجزہ صرف ایک بار ظاہر ہوا ہے، چنانچہ خود حافظ ابن القیمؒ نے اپنی مشہور کتاب ’’اغاثۃ اللہفان‘‘ (۱) میں حدیث مذکورہ کو نقل کر کے مرتین کا معنی شقتین و فلقتین ہی بیان کیا ہے، اور اس کے بعد لکھا ہے۔

ولما خفى هذا على من لم يحط به علما زعم ان الانشقاق وقع مرة بعد مرة فى زمانين وهذا مما يعلم اهل الحديث ومن له خبرة باحوال الرسول وسيرته انه غلط وانه لم يقع الانشقاق الامرة واحدة“ مرتین کا یہ معنی جن لوگوں پر ان کی کم علمی کی بناء پر مخفی رہا انھوں نے سمجھ لیا کہ شق القمر کا معجزہ مختلف زمانوں میں متعدد بار ظاہر ہوا ہے، علمائے حدیث رسول خدا...... کے احوال اور سیرت سے واقف اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ مرتین کا یہ معنی اس جگہ غلط ہے، کیونکہ شق القمر کا معجزہ صرف ایک ہی بار ظہور میں آیا ہے۔

حافظ ابن القیمؒ نے ’’مرتین‘‘ کی مراد سے متعلق اس موقع پر جو اصول ذکر کیا ہے کہ اگر مرتان سے افعال کا بیان ہوگا تو اس وقت تعدد زمانی یعنی یکے بعد دیگرے کے معنی میں ہوگا، کیونکہ دو کاموں کا ایک وقت میں اجتماع ممکن نہیں ہے مثلاً جب کوئی یہ کہے کہ ”اکلت مرتین“ تو اس کا لازمی طور پر معنی یہی ہوگا کہ میں نے دو بار کھایا اس لئے کہ دو اکل یعنی کھانے کا دو عمل ایک وقت میں نہیں ہوسکتا، اور جب مرتین سے اعیان یعنی ذات کا بیان ہوگا تو اس وقت یہ ’عددین‘ دوچند اور ڈبل کے معنی میں ہوگا، کیونکہ دو ذاتوں کا ایک وقت میں اکٹھا ہونا ممکن ہے۔

موصوف کے اس اصول کے اعتبار سے بھی آیت پاک ’’الطلاق مرتان‘‘ میں مرتین، عددین کے معنی میں ہوگا کیونکہ اوپر کی تفصیل سے یہ بات منقح ہوچکی ہے کہ اس

---

(۱) اعلاء السنن ج ۱۱ ص ۱۷۹۔

آیت میں طلاق رجعی کی تعداد بیان کی گئی ہے، تطلیق یعنی طلاق دینے کی کیفیت کا بیان نہیں ہے اور طلاق ذات اور اسم ہے فعل نہیں ہے۔

البتہ امام مجاہد وغیرہ کے قول پر (جن کی رائے میں آیت مذکورہ طریقۂ طلاق بیان کرنے کے لئے نازل ہوئی ہے)) ''الطلاق'' تطلیق یعنی طلاق دینے کے معنی میں ہوگا اور طلاق دینا ایک فعل ہے تو اس وقت ''مرتین'' کا معنی مرۃ بعد اخریٰ اور یکے بعد دیگرے ہوگا، اس معنی کی صورت میں بھی ''الطلاق مرتان'' سے صرف اتنی بات ثابت ہوگی کہ دو طلاقیں الگ الگ آگے پیچھے دی جائیں بیک کلمہ نہ دی جائیں، اس سے زیادہ کوئی اور قید مثلاً تفریق مجلس وغیرہ کی تو اس آیت میں اس کا معمولی اشارہ بھی نہیں ہے، اس لئے اگر ایک مجلس یا ایک طہر میں انت طالق انت طالق، تجھ پر طلاق ہے، تجھ پر طلاق ہے، الگ الگ تلفظ کے ذریعہ طلاق دی جائے تو یہ صورت ''الطلاق مرتان'' طلاق یکے بعد دیگرے ہے، کے عین مطابق ہوگی، لہٰذا اس آیت کے مطابق یہ دونوں طلاقیں ایک مجلس یا ایک طہر میں ہونے کے باوجود واقع ہوجائیں گی، اور جب اس آیت کی رو سے ایک مجلس یا ایک طہر کی متعدد تلفظ سے دی گئی طلاقیں واقع ہوجاتی ہیں، تو ایک تلفظ سے دی گئی طلاقیں بھی واقع ہوجائیں گی، کیونکہ ایک مجلس میں دی گئی دونوں طلاقوں (یعنی ایک تلفظ سے اور متعدد تلفظ سے) کا حکم بغیر کسی اختلاف کے سب کے نزدیک یکساں ہے۔(۱)

اسی بناء پر جو حضرات اس بات کے قائل ہیں کہ آیت ''الطلاق مرتان'' میں طلاق دینے کا طریقہ بتایا گیا ہے اور ''مرتین'' مرۃ بعد اخری یکے بعد دیگرے کے معنی میں ہے وہ حضرات بھی اسی کے قائل ہیں کہ ایک مجلس کی تین طلاقیں تین ہی شمار ہوں گی، اگرچہ طلاق دینے کا یہ طریقہ غلط ہے لیکن غلط طریقہ اختیار کرنے سے طلاق کے وقوع پر کوئی اثر نہیں پڑے گا، ہاں اس طرح طلاق دینے والا غلط طریقہ اختیار کرنے کا مجرم ہوگا۔

آیت طلاق سے متعلق اس تفصیلی بحث سے یہ بات کھل کر معلوم ہوگئی کہ آیت پاک میں واقع لفظ ''مرتین'' کا معنی مرۃ بعد اخریٰ یعنی یکے بعد دیگرے بھی صحیح ہے اور ثنتین

---

(۱) دیکھئے احکام القرآن امام جصاص رازی ج ا ص ۳۸۶، المطبعۃ السّلفیہ مصر۔

یعنی دو کا معنی بھی درست ہے، نیز دونوں معنی کے اعتبار سے ایک مجلس یا ایک تلفظ میں دی گئی تین طلاقیں اس آیت کی رو سے واقع ہو جائیں گی، اور اس کے بعد بحکم قرآن فان طلقها فلا تحل له من بعد حتى تنكح زوجا غيره حق رجعت ختم ہو جائے گا، اس لئے جو لوگ کہتے ہیں کہ ایک مجلس میں دی گئی تین طلاقوں کے بعد بھی حق رجعت باقی رہتا ہے وہ قانونِ الٰہی کی مقررہ حد کو توڑ رہے ہیں اور ایک مشہور دانشور کے الفاظ میں ایک چور دروازہ نکال رہے ہیں تا کہ ظالم شوہروں کو مزید ظلم کا موقع ہاتھ آجائے، یا کم از کم قانون کے دائرہ اثر کو محدود اور تنگ کر رہے ہیں، جبکہ اس تحدید کا کوئی ثبوت نہ آیت کریمہ میں ہے اور نہ اس کا کوئی اشارہ ان روایتوں میں ہے جو اس آیت کے سبب نزول سے متعلق ہیں، علاوہ ازیں قانون بحیثیتِ قانون کے اس طرح کی حد بندیوں کو برداشت بھی نہیں کرتا وہ تو اپنے جملہ متعلقات کو حاوی ہوتا ہے، نیز اس تفصیل سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ جو لوگ ایک مجلس کی تین طلاقوں کو ایک بتاتے ہوئے بطور استدلال کے اس آیت کو پیش کرتے ہیں، ان کا یہ طرز عمل خالص مغالطہ پر مبنی ہے، استدلال سے اس کا کوئی واسطہ نہیں ہے۔

دوسری آیت

(۲) حضرت امام شافعیؒ ایک مجلس کی تین طلاقوں کے وقوع پر آیت کریمہ "فان طلقها فلا تحل لهٗ من بعد حتى تنكح زوجا غيره" اسے استدلال کرتے ہوئے رقم طراز ہیں فالقرآن واللہ اعلم يدل على ان من طلق زوجة له دخل بها اولم يدخل بها ثلثة لم تحل له حتى تنكح زوجا غيره۔(۱) اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ قرآن حکیم کا ظاہر اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ جس شخص نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیدیں خواہ اس نے اس سے ہم بستری کی ہو یا نہ کی ہو وہ عورت اس کے لئے حلال نہ ہوگی تاوقتیکہ وہ کسی دوسرے مرد سے نکاح نہ کرلے۔

---

(۱) کتاب الام ج۵ ص۱۶۵ و سنن الکبریٰ ص ۳۳۴۔

امام شافعیؒ کا استدلال فان طلقہا کے عموم سے ہے کیونکہ ''فان طلق'' فعل شرط ہے جو عموم کے صیغوں میں سے ہے جیسا کہ اصول کی کتابوں میں مصرح ہے، لہٰذا اس کے عموم میں ایک مجلس کی تین طلاقیں بھی داخل ہوں گی۔

یہی بات علامہ ابن حزم ظاہری بھی کہتے ہیں، چنانچہ ''فان طلقها فلا تحل له اهـ الآية'' کے تحت لکھتے ہیں ''فهذا يقع على الثلاث مجموعة ومفرقة ولا يجوز ان يخصّ هذه الآية ببعض ذالك دون بعض بغير نص''(۱) یعنی فان طلقہا کا لفظ ان تین طلاقوں پر بھی صادق آتا ہے جو اکٹھی دی گئی ہوں اور ان پر بھی جو الگ الگ دی گئی ہوں اور بغیر کسی نص کے اس آیت کو خاص کسی ایک قسم کی طلاق پر محمول کرنا درست نہیں ہے۔

اس صحیح استدلال کی تردید میں جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ آیت کے عموم سے اکٹھی طلاقیں خارج ہیں کیونکہ شریعت اسلامی میں اس طرح مجموعی طلاقیں دینی ممنوع ہیں، اب اگر ان ممنوع طلاقوں کو آیت کے عموم میں داخل مان کر ان کے نفاذ کو تسلیم کرلیا جائے تو شریعت کی ممانعت کا کوئی معنی ہی نہ ہوگا اور یہ رائیگاں ہوجائے گی۔

بظاہر ان لوگوں کی یہ بات بڑی وقیع اور چست نظر آتی ہے، لیکن اصول وضوابط اور شرعی نظائر میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی حیثیت ایک بے بنیاد مفروضہ سے زیادہ کی نہیں ہے، اس لئے کہ اس جواب میں سبب اور اس کے اثر وحکم کو گڈمڈ کر کے یہ غلط نتیجہ برآمد کرلیا گیا ہے جب کہ اسباب اور ان پر مرتب ہونے والے احکام وآثار الگ الگ دو حقیقتیں ہیں اسباب کے استعمال کا مکلّف بندہ ہے اور ان اسباب پر احکام کا مرتب کرنا اللہ تعالیٰ کا کام ہے، لہٰذا جب شریعت کی جانب سے یہ معلوم ہوجائے کہ فلاں کام کا فلاں حکم ہے تو بندۂ مکلّف سے جب بھی وہ فعل وجود میں آئے گا لامحالہ اس کا اثر اور حکم بھی ظہور پذیر ہوگا، البتہ اگر وہ فعل غیر مشروع طور پر اللہ تعالیٰ کی اذن واجازت کے خلاف صادر ہوگا تو اس کا کرنے والا عند اللہ معصیت کار ہوگا اور اس عصیان پر اس سے مواخذہ ہوسکتا ہے، رہا معاملہ اس فعل پر اس کے حکم واثر کے مرتب ہونے کا تو فعل کے جائز وناجائز

---

(۱) المحلی، ج۱۰ص۲۰۷۔

ہونے کا اس پر کوئی اثر نہیں پڑے گا، اس بات کو ایک مثال سے سمجھئے، اللہ عز شانہ نے فعل مباشرت یعنی عورت کے ساتھ ہمبستری کو وجوب غسل کے لئے سبب بنایا ہے، اب اگر کوئی شخص جائز طور پر اپنی بیوی سے مباشرت کرے جب بھی اس پر شریعت کی رو سے غسل فرض ہو جائے گا، اسی طرح اگر کوئی بدکار کسی اجنبی عورت کے ساتھ یہی کام کرے تو اس فعل کے حرام وممنوع ہونے کے باوجود اس پر بھی شرعاً غسل فرض ہو جائے گا، افعال شرعی میں اس کے نظائر بہت ہیں اس موقع پر ان نظائر کا جمع کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ مسئلہ کی وضاحت پیش نظر ہے اس لئے اسی ایک نظیر پر اکتفاء کیا جا رہا ہے۔

بعینہٖ یہی صورت طلاق کی بھی ہے، اللہ رب العزت نے فعل طلاق کو قید نکاح سے رہائی کا سبب اور ذریعہ قرار دیا ہے لہٰذا جب شخص مکلّف سے اصل فعل کا صدور ہوگا تو لازمی طور پر اس کے اثر وحکم کا بھی ثبوت ہوگا چاہے طلاق کا یہ عمل شریعت کے بتائے ہوئے طریق کے مطابق وقوع میں آیا ہو یا غیر مشروع طور پر، البتہ غیر مشروع اور ممنوع طریقہ اختیار کرنے کی بنا پر وہ شریعت کی نگاہ میں قصوروار ہوگا اور اس کی بندگی واطاعت شعاری کا تقاضا ہوگا کہ ممکن حد تک اس غلطی کو درست کرنے کی کوشش کرے، چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے اپنی زوجہ کو بحالتِ حیض ایک طلاق دیدی تھی، جس کا ناجائز اور ممنوع ہونا شرعاً مسلّم ہے اس کے باوجود اس طلاق کو نافذ مانا گیا، پھر چونکہ یہ ایک طلاق تھی، جس کے بعد رجعت کا حق باقی رہتا ہے اس لئے اس طلاق سے رجعت کرکے اس غلطی کو دور کرنے کا موقع حاصل تھا، اسی لئے ہادی اعظم ...... نے انھیں رجعت کی ہدایت فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ رجعت کر لینے کے بعد اگر طلاق دینے ہی کی مرضی ہو تو طہر یعنی پاکی کے زمانہ میں جو مجامعت اور ہمبستری سے خالی ہو طلاق دینا، حضرت عبداللہ بن عمر کے اس طلاق کا واقعہ صحیح بخاری، صحیح مسلم، نسائی، سنن الکبریٰ، دارقطنی وغیرہ کتب حدیث میں دیکھا جا سکتا ہے، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی یہ حدیث اس بات پر نص ہے کہ ممنوع اور ناجائز طور پر طلاق دینے سے بھی طلاق واقع ہو جاتی ہے، اس صریح وصحیح نص کے مقابلہ میں اس قیاسی مفروضہ کی کیا حیثیت ہے یہ ارباب علم ودانست پر مخفی نہیں ”عیاں راچہ بیاں“۔

پھر یہ بات بھی کس قدر دلچسپ بلکہ مضحکہ خیز ہے کہ جو لوگ ایک مجلس کی تین طلاقوں کو اس کے ممنوع وغیر مشروع ہونے کی بنا پر آیت کے عموم سے خارج اور غیر نافذ کہہ کر اسے ایک طلاق قرار دیتے ہیں وہی لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ تین طلاقوں کی یہ ایک طلاق بھی ممنوع غیر مشروع اور طلاق بدعی ہے پھر بھی یہ ممنوع طلاق نافذ ہو جائے گی جبکہ ان کے مفروضہ کے مطابق وہ نافذ نہیں ہونی چاہئے، ملاحظہ ہو گروہ اہل حدیث (غیر مقلدین) کے رئیس اعظم جناب نواب صدیق حسن خاں قنوجی مرحوم کے فرزند ارجمند جناب نواب میر نور الحسن خاں المتوفی ۱۳۳۶ھ کی حسب ذیل عبارت:

> ''واز ادلہ متقدمہ ظاہر است کہ سہ طلاق بیک لفظ یا در یک مجلس بدون تخلل رجعت یک طلاق باشد اگر چہ بدعی بود ایں صورت منجملہ صور طلاق بدعی واقع است با آنکہ فاعلش آثم باشد نہ سائر صور بدعی کہ در آنہا طلاق واقع نمی شود۔''(۱)
>
> اوپر بیان کردہ دلیلوں سے ظاہر ہے کہ ایک لفظ کی تین طلاقیں یا ایک مجلس کی تین طلاقیں جب کہ درمیان میں رجعت نہ ہو ایک طلاق ہوگی اگر چہ یہ بھی بدعی ہوگی طلاق بدعی کی یہ قسم دیگر بدعی طلاقوں کے برخلاف نافذ ہوگی اور اس کا مرتکب گنہ گار بھی ہوگا اور طلاق بدعی کی بقیہ ساری قسمیں واقع نہیں ہوں گی۔

سوال یہ ہے کہ ممنوع اور غیر مشروع ہونے میں ایک مجلس کی تین طلاقیں، اور تین طلاقوں کی یہ ایک طلاق دونوں برابر اور یکساں ہیں یا دونوں کی ممنوعیت وغیر مشروعیت میں تفاوت ہے اگر دونوں میں تفاوت اور کمی بیشی ہے تو اس تفاوت پر شرعی نص درکار ہے بالخصوص جو لوگ دوسروں سے ہر بات پر کتاب وسنت کی نص کا مطالبہ کرتے رہتے ہیں، ان پر یہ ذمہ داری زیادہ عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنے اس دعویٰ پر قرآن وحدیث سے کوئی واضح دلیل پیش کریں اور اگر دونوں کی ممنوعیت یکساں ہے اور یہی بات جناب میر نور الحسن

---

(۱) عرف الجادی من جنان ہدی الہادی ص ۱۲۱، المطبع الصدیقی بھوپال ۱۳۰۱ھ۔

خاں مرحوم کی عبارت سے ظاہر ہے تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ یہ مفروضہ خود ان لوگوں کے نزدیک بھی مسلّم اور قابل عمل نہیں ہے بلکہ مغالطہ اندازی کے لئے ایک ایسی بات چلتا کر دی گئی ہے جو واقعیت سے یکسر بے بہرہ اور محروم رہے۔

تیسری آیت

(۳) ”تلك حدود اللّٰه ومن يتعد حدود اللّٰه فقد ظلم نفسه لا تدرى لعل اللّٰه يحدث بعد ذالك امرا“ الآية

یہ اللہ کی باندھی ہوئی حدیں ہیں جو کوئی اللہ کی حدوں سے آگے بڑھے تو اس نے اپنے اوپر ظلم کیا اس کو کیا خبر کہ شاید اللہ پیدا کر دے اس طلاق کے بعد کوئی نئی صورت۔

اس آیت پاک کا ظاہر یہی بتا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تین طلاقوں کا جو حق مرد کو دیا ہے اگر وہ اس کو بیک دفعہ استعمال کر لے تو تینوں طلاقیں واقع ہو جائیں گی، البتہ ایسا کرنا خود اس کی اپنی مصلحت کے خلاف ہوگا، کیونکہ اگر تین طلاقوں کو ایک شمار کر کے حق رجعت دید یا جائے تو پھر اس کے کہنے کا کیا معنی ہوگا کہ ”لاتدرى لعلّ اللّٰه يحدث بعد ذلك امرا“ اسے کیا معلوم کہ شاید اللہ تعالیٰ اس کے بعد کوئی نئی صورت پیدا فرما دے، اس لئے کہ تین کو ایک شمار کرنے کی صورت میں تو رجعت کا حق اور موافقت کی صورت باقی ہی ہے۔

چنانچہ شارح صحیح مسلم امام نوویؒ لکھتے ہیں:

”احتج الجمهور بقوله تعالىٰ ”ومن يتعد حدود اللّٰه فقد ظلم نفسه اهـ الآية“ قالوا معناه ان المطلق قد يحدث له ندم فلا يمكنه تداركه لوقوع البينونة فلو كانت الثلاث لاتقع ولم يقع طلاقه هذا الّا رجعيا فلا يندم.(۱)

جمہور نے تین طلاقوں کے تین واقع ہونے پر اللہ تعالیٰ کے ارشاد ”ومن يتعد حدود اللّٰه فقد ظلم نفسه اهـ“ سے استدلال کیا ہے، یہ کہتے ہیں کہ آیت کا مطلب یہ

---

(۱) صحیح مسلم مع الشرح، ج۱، ص۴۷۸۔

ہے کہ طلاق دینے والے کو بسا اوقات اپنی حرکت پر ندامت ہوتی ہے تو بیک دفعہ تینوں طلاقیں دیدینے کی صورت میں زوجین کے درمیان جدائی واقع ہوجانے سے اس ندامت کا تدارک اورازالہ نہ ہوسکے گا، اگر بیک دفعہ کی تین طلاقیں ایک ہی شمار ہوئیں تو ندامت کس بات پر ہوئی۔

اسی بات کو امام جصاص رازی اپنے انداز میں یوں بیان فرماتے ہیں:

ومن يتعد حدود الله فقد ظلم نفسه، يدل على انه اذا طلق لغيرالسنة وقع طلاقه وكان ظالما لنفسه بتعدية حدود الله لانه ذكر عقيب طلاق العدة فابان ان من طلق لغيرالعدة فطلاقه واقع لانه لولم يقع طلاقه لم يكن ظالما لنفسه ويدل على انه اراد وقوع طلاقه مع ظلم نفسه قوله تعالىٰ عقيبه ”لاتدرى لعل الله يحدث بعد ذلك امرا“ يعنى يحدث له ندم فلاينفعه لانه قد طلق ثلاثا“ (۱)

آیت پاک ومن یتعد حدود اللہ اھ۔ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ جب مرد طلاق بدعی دے گا تو وہ واقع ہوجائے گی اور وہ اللہ کی قائم کردہ حدود سے تجاوز کرنے کی بناء پر اپنی ذات پر ظلم کرنے والا ہوگا یہ دلالت اس طور پر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فَطَلِّقُوْا هُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ ”طلاق دو انھیں ان کی عدت پر“ کے بعد اس آیت کو ذکر فرمایا ہے تو اس سے ظاہر ہوا کہ جو غیر عدت یعنی طلاق بدعی دے گا اس کی طلاق واقع ہوجائے گی ورنہ اپنی ذات پر ظلم کرنے والا کیوں ہوگا اور اس بات پر کہ ”من یتعد حدود اللہ“ کی مراد اپنے نفس پر ظلم کرنے کے باوجود اس کی طلاق کا واقع ہوجانا ہے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد دلالت کررہا ہے جو اس کے بعد آرہا ہے یعنی ”لاتدری لعل اللہ یحدث بعد ذلک امرا“ یعنی ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے دل میں طلاق پر ندامت پیدا کردے اور یہ ندامت اس کے واسطے مفید نہ ہوگی کیونکہ وہ تین طلاقیں دے چکا ہے۔

علامہ علاء الدین ماردینی نے اس آیت کی یہی تفسیر قاضی اسمٰعیل کی کتاب احکام

---

(۱) احکام القرآن ج ۳ ص ۴۵۴، مطبوعہ مصر۔

القرآن کے حوالہ سے امام شعبی، ضحاک، عطاء، قتادہ اور متعدد صحابہ سے نقل کی ہے، (۱) نیز امام قرطبی، علامہ جار اللہ زمخشری اور امام فخر الدین رازیؒ نے بھی اپنی اپنی تفسیروں میں یہی لکھا ہے کہ اس آیت سے ایک مجلس کی تین طلاقوں کے وقوع کا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔ (۲)

ان تینوں آیاتِ قرآنیہ سے جن پر ائمہ تفسیر کی تشریحات کی روشنی میں گذشتہ صفحات میں بحث کی گئی ثابت ہوتا ہے کہ ایک مجلس میں یا ایک لفظ سے دی گئی تین طلاقیں تینوں واقع ہو جائیں گی اس کے برعکس کسی آیت سے اشارۃً بھی یہ بات نہیں نکلتی کہ بیک مجلس یا بیک کلمہ دی ہوئی تین طلاقیں ایک شمار ہوں گی۔

اب انشاء اللہ آئندہ سطور میں حدیث رسول...... سے دلائل پیش کئے جائیں گے۔

(۲) سنتِ رسول اللہ......

(۱) حضرت عویمر عجلانی رضی اللہ عنہ نے صحابۂ کرام کے ایک بڑے مجمع میں آنحضرت ...... کے سامنے اپنی بیوی سے لعان کیا تو اس کے بعد عرض کیا كذبت عليها يا رسول الله ان امسكتها فطلقها ثلاثا قبل ان يامره رسول الله صلى الله عليه وسلم (بخاری شریف باب من اجاز طلاق الثلاث ج ۲، ص ۷۹۱، ومسلم شریف ج ۱، ص ۴۸۹)

"یارسول اللہ اگر میں اسے اپنے پاس روک رکھوں تو میں نے اس پر جھوٹ باندھا اس کے بعد اسے تین طلاقیں دیدیں قبل اس کے کہ آنحضرت ...... انھیں حکم دیتے۔"

امام نوویؒ نے بحوالہ امام جریر طبری لکھا ہے کہ لعان کا یہ واقعہ ۹ھ کا ہے جس سے معلوم ہوا کہ آیت پاک "الطلاق مرتان" کے ایک عرصہ بعد یہ واقعہ پیش آیا ہے، حضرت عویمر رضی اللہ عنہ کی غیرت کا تقاضا یہی تھا کہ اس بیوی سے فی الفور مفارقت ہو جائے اور وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ نفس لعان سے تفریق نہیں ہوگی نہ ایک یا دو طلاقوں سے قطعی جدائی

---

(۱) دیکھئے الجامع لاحکام القرآن للقرطبی ج ۱۸ ص ۱۵۶، ۱۵۷، والکشاف للزمخشری ج ۴ ص ۱۰۹، اور مفاتیح الغیب المشتہر بالتفسیر الکبیر للامام الرازی ج ۸ ص ۱۵۹۔

(۲) الجواہر النقی مع سنن الکبریٰ للبیہقی ج ۷ ص ۳۲۸۔

ہوگی، اس لئے انھوں نے یہ کہتے ہوئے کہ اے رسول اللہ...... اگر لعان کے بعد بھی اسے اپنے نکاح میں باقی رکھوں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ میں نے اس پر بہتان تراشی کی اسی مجلس میں تین طلاقیں دیدیں۔

اس حدیث کو امام مسلم نے متعدد طرق سے روایت کیا ہے، دیگر ائمہ حدیث نے بھی اس کی تخریج کی ہے، مگر کسی روایت میں اس کا ذکر نہیں ہے کہ آنحضرت ...... نے بیک مجلس دی گئی اس طلاق کو کالعدم یا ایک قرار دیا ہو بلکہ اس کے برعکس اسی واقعہ سے متعلق ابوداؤد کی روایت میں تصریح ہے کہ آنحضرت ...... نے ان طلاقوں کو نافذ فرمادیا، روایت کے الفاظ یہ ہیں۔

فطلقها ثلاث تطليقات عند رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم فانفذه رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم وكان ما صنع عند رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم سنة (ابوداؤد، ج۱ص۳۰۷)

”عویمر عجلانی رضی اللہ عنہ نے آنحضرت ...... کی موجودگی میں تین طلاقیں دیدیں، اور آنحضرت ...... نے انھیں نافذ فرمادیا، اور انھوں نے آنحضرت ...... کے پاس جو کیا وہی لعان میں طریقہ عمل قرار پایا۔“ اس روایت پر امام ابوداؤد اور محدث منذری نے کسی قسم کا کوئی کلام نہیں کیا ہے، اور سنن ابی داؤد کی کسی روایت پر دونوں کا سکوت محدثین کے نزدیک اس کے قابل احتجاج ہونے کی علامت ہے، مزید برآں قاضی شوکانی نے ”نیل الاوطار“ میں اس حدیث کے بارے میں تصریح کی ہے کہ ”رجاله رجال الصحيح“ اس حدیث کے راوی صحیح کے راوی ہیں، اصول محدثین کے اعتبار سے اس ثابت شدہ روایت میں صحابی رسول حضرت سہیل بن سعد رضی اللہ عنہ کی یہ تصریح کہ آنحضرت ...... نے عویمر عجلانی رضی اللہ عنہ کی ایک مجلس میں دی ہوئی تینوں طلاقوں کو نافذ فرمادیا، اس کی روشن دلیل ہے کہ بیک مجلس دی گئی تین طلاقیں تین ہی شمار ہوں گی، امام المحدثین بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے تراجم ابواب کی نکتہ آفرینیوں سے واقف اچھی طرح جانتے ہیں کہ انھوں نے ”باب من اجاز (جوز) طلاق الثلاث“ کے تحت حضرت سہل بن سعد کی روایت لاکر

ابوداؤد کی روایت میں آئی ہوئی اسی زیادتی کی جانب اشارہ کیا ہے، ابوداؤد کی یہ روایت چونکہ ان کی شرائط کے مطابق نہیں تھی اس لئے متن میں اسے نہ لا کر ترجمۃ الباب سے اس کی طرف اشارہ کر دیا، امام نسائی جیسا جلیل القدر امام حدیث بھی حضرت عویمر رضی اللہ عنہ کے تین طلاقوں کو تین ہی بتا رہا ہے۔

”باب من الرخصة فی ذلك“ (ایک مجلس میں تین طلاقوں کی رخصت کا باب) کے ذیل میں ان کا اس حدیث کا ذکر کرنا اس کا کھلا ثبوت ہے۔

مسئلہ زیر بحث میں یہ ایسی پختہ اور بے غبار دلیل ہے کہ اگر اس کے علاوہ اور دلیل نہ ہوتی تو تنہا یہی کافی تھی، اس حدیث رسول اللہ...... کے جواب میں یہ کہنا کہ خود لعان ہی سے عویمرؓ اور ان کی بیوی کے درمیان فرقت ہو گئی تھی اور ان کی بیوی اجنبیہ ہو جانے کی بنا پر محل طلاق تھیں ہی نہیں، اس لئے آنحضرت ...... نے ان کے اس طرح طلاق دینے پر سکوت فرمایا، اور ابوداؤد کی روایت ”فانفذه رسول الله صلى الله عليه وسلم“ کا یہ مفہوم بتانا کہ لعان سے جو تفریق ہو گئی تھی آنحضرت...... نے تنفیذ کے ذریعہ اس فرقت کو واضح اور لازم کر دیا علم وتحقیق کی نظر میں مجادلہ ومشاغبہ سے زیادہ کی حیثیت نہیں رکھتا کیونکہ اس تاویل کی تمام تر بنیاد اس بات پر ہے کہ نفس لعان ہی سے زوجین کے درمیان مفارقت ہو جاتی ہے اور یہ بات خود محل نظر ہے کیونکہ لعان سے زوجین کی فرقت پر نہ لعان کا لفظ دلالت کرتا ہے اور نہ ہی کسی آیت یا کسی صریح حدیث سے اس کا ثبوت ملتا ہے، عربی زبان وادب سے واقف کون نہیں جانتا کہ ”لعان“ کے لغوی معنی ایک دوسرے پر لعنت بھیجنے کے ہیں اور قرآن حکیم نے فعل لعان کو ”شہادت“ کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، ارشاد خداوندی ہے ”والذين يرمون ازواجهم ولم يكن لهم شهداء الا انفسهم فشهادة احدهم اربع شهادات بالله“ اور جو لوگ زنا کی تہمت لگائیں اپنی بیویوں پر اور ان کے پاس بجز اپنی ذات کے کوئی گواہ نہ ہو تو ایسے شخص کی گواہی کی صورت یہ ہے کہ چار بار گواہی دے اللہ کی قسم کھا کر، اور حدیث میں اسے یمین (قسم) کے لفظ سے بیان کیا گیا ہے اور شہادۃ ویمین میں سے کوئی بھی مفارقت کے معنی کو نہیں چاہتا، خود حافظ

ابن القیم لکھتے ہیں:

ولفظ اللعان لایقتضی فرقة فانه اما ایمان علی زنا و اما شهادة و کلاهما لایقتضی فرقة (زادالمعادج ۲، ص۳۰۶) اور لعان کا لفظ فرقت کو نہیں چاہتا، کیونکہ لعان یا تو زنا پر قسمیں کھانے کے معنی میں ہے اور یا تو گواہی دینے کے معنی میں، اور قسم و گواہی دونوں فرقت کو نہیں چاہتیں۔

قرآن حکیم کی کسی آیت یا رسول اللہ ...... کی کسی صریح حدیث سے بھی ثابت نہیں ہے کہ نفس لعان ہی سے زوجین کے درمیان فرقت ہو جائے گی، بلکہ درحقیقت ایک ضروری مصلحت کے تحت لعان کی بنا پر فرقت پیش آتی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رشتۂ ازدواج کو زوجین کے مابین رحمت ومحبت کا وسیلہ بنایا ہے اور اسی رشتہ کی بنا پر زوجین ایک دوسرے سے سکون وچین حاصل کرتے ہیں، لیکن شوہر کی جانب سے بیوی پر زنا کا الزام عائد کرنے کے بعد باہمی رحمت ومحبت کا یہ تعلق باقی نہیں رہ پاتا اور ایک دوسرے سے باہمی مخلصانہ ربط وضبط نفرت وعار سے بدل جاتا ہے، ایسی صورت میں زوجین کی ظاہری مصلحت کا تقاضا یہی ہے کہ ان میں فرقت اور جدائی ہو جائے، اس تفصیل سے یہ اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ لعان سے فرقت کوئی امر قطعی نہیں بلکہ ایک اجتہادی مسئلہ ہے، اسی لئے فقہاء مجتہدین اس میں مختلف الرائے ہیں، چنانچہ امام ابوعبید کے نزدیک لعان کے بجائے ''قذف'' یعنی بیوی پر زنا کا الزام لگانے ہی سے فرقت ہو جائے گی، امام جابر بن زید (تلمیذ حضرت ابن عباسؓ و یکے از فقہائے تابعین) عثمان البتی، محمد بن صفرا اور فقہائے بصرہ کی ایک جماعت کے نزدیک لعان سے فرقت ہوگی ہی نہیں بلکہ اس کے بعد بھی شوہر کو اختیار ہے کہ بیوی کو بیوی بنائے رکھے، فقہائے احناف کا مسلک یہ ہے کہ لعان سے فرقت نہیں ہوگی بلکہ شوہر کو لعان کے بعد طلاق دینے، ظہار وایلاء کرنے کی شرعاً گنجائش ہے، البتہ لعان کے بعد اسی مذکورہ مصلحت کے پیش نظر شوہر پر ضروری ہے کہ طلاق دے کر عورت کو اپنے سے الگ کر دے، اور لعان کے برقرار رہتے ہوئے اگر شوہر طلاق نہ دیگا تو قاضی شرعی دونوں کے درمیان تفریق کر دیگا، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ زوجین

کے لعان سے فراغت کے بعد اسی لعان سے فرقت واقع ہو جائے گی، ایک روایت میں یہی مذہب امام احمد بن حنبل کا بھی ہے اور ان کا دوسرا قول احناف کے مسلک کے مطابق ہے اور امام شافعی کا مذہب یہ ہے کہ صرف شوہر کے لعان ہی سے (عورت کے لعان سے پہلے) فرقت ہو جائے گی۔ (زاد المعاد ج۲ص ۳۰۶، وفتح الملہم ج ۳، ص ۵۰۷)

فقہائے مجتہدین کے مذاہب کی اس تفصیل سے واضح ہے کہ لعان سے تفریق ایک امر اجتہادی ہے اور حضرت عویمر رضی اللہ عنہ کا لعان کے بعد آنحضرت ...... کے سامنے تین طلاق دینا اور نبی کریم ...... کا اس پر سکوت اور بروایت ابوداؤد آپ کا تینوں طلاقوں کو نافذ کر دینا ایک امر منصوص ہے، اور ظاہر ہے کہ مسئلہ اجتہادی کے مقابلہ میں ترجیح رسول پاک ...... کے قول و عمل ہی کو ہوگی، یہی تمام محدثین وفقہاء کا مسلک ہے اس لئے آنحضرت ...... کی تقریر اور عمل کو نظر انداز کر کے یہ کہنا کہ لعان کی وجہ سے فرقت ہوگئی تھی اور حضرت عویمر رضی اللہ عنہ کی طلاق بے موقع تھی اس لئے آنحضرت ...... خاموش رہے اور ”فانفذه رسول الله صلى الله عليه وسلم“ کے صریح اور حقیقی معنی کو چھوڑ کر اسے زبردستی مجازی معنی پہنانا صحیح نہیں ہے بالخصوص جو لوگ اپنے آپ کو اہل حدیث کہلاتے ہیں اور دوسروں کو اہل الرائے ہونے کا طعنہ دیتے ہیں ان کے لئے تو یہ رویہ قطعی زیب نہیں دیتا کہ رسول خدا ...... کی دلالت تقریر یا عمل کے مقابلے میں ایک مسئلہ اجتہادی کو فوقیت دیں اس لئے اس صریح ومتفق علیہ روایت کے مقابلہ میں جو بات کہی جارہی ہے وہ محض مجادلہ ومشاغبہ ہی ہے جس کی اہل انصاف کے نزدیک کوئی قدر وقیمت نہیں ہے۔

(۲) وعن عائشة رضى الله عنها ان رجلا طلق امرأته ثلاثا فتزوجت فطلق فسئل النبى صلى الله عليه وسلم قال لاحتى يذوق عسيلتها كما ذاق الاول. (بخاری ج۲ص ۷۹۱، ومسلم ج۱، ص ۴۶۳)

”حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو تین طلاق دیدیں، عورت نے دوسرا نکاح کر لیا، اس شوہر نے طلاق دیدی تو آنحضرت ...... سے دریافت کیا گیا، کیا یہ عورت پہلے شوہر کے لئے حلال ہوگئی؟ آپ نے فرمایا نہیں

تاوقتیکہ دوسرا شوہر پہلے کی طرح لطف اندوز صحبت نہ ہو پہلے کے لئے حلال نہیں ہوگی۔ ‘‘

اس حدیث کو امام بخاری نے ’’باب من اجاز (اوجوز) طلاق الثلاث‘‘ کے تحت ذکر کیا ہے اور اس حدیث سے پہلے حضرت رفاعہ قرظی کے طلاق کے واقعہ کو ذکر کیا ہے، لہٰذا حدیث حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو بھی حضرت رفاعہ کے قصہ پر محمول کیا جائے تو یہ تکرار بے فائدہ ہوگی جو امام بخاری کی عادت کے خلاف ہے، علاوہ ازیں جب دو حدیثیں مختلف سند اور مختلف سیاق سے وارد ہوں تو اصل یہی ہے کہ وہ دونوں دو الگ الگ حدیثیں ہیں اس لئے بلا وجہ اصل کو چھوڑ کر غیر اصل پر محمول کرنا یکسر تحکم ہے جو بحث و تحقیق کی دنیا میں لائق التفات نہیں ہے۔

(۳) حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مسئلہ دریافت کیا گیا:

”عن الرجل يتزوج المرأة فيطلقها ثلاثا فقالت قال رسول الله ﷺ لاتحل للاول حتى يذوق الاخر عسيلتها وتذوقى عسيلته (مسلم ج۱ ص۴۶۳، سنن الکبریٰ مع الجوہر النقی ج۷، ص۳۷۴ واللفظ لہ۔ دارقطنی ج۲، ص۴۳۸ پر بھی یہ حدیث ہے البتہ دارقطنی کے الفاظ یہ ہیں قال رسول الله صلى الله عليه وسلم اذا طلق الرجل امرأته ثلاثا لم تحل لهٗ الخ.)

’’کہ کوئی شخص کسی عورت سے نکاح کرتا ہے پھر اسے تین طلاق دیتا ہے تو کیا اب پہلے شوہر کیلئے حلال ہو جائے گی، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے جواب میں فرمایا نبی کریم...... کا ارشاد ہے کہ وہ عورت پہلے شخص کیلئے حلال نہیں ہوگی تاوقتیکہ دوسرا شوہر اس کی صحبت سے لطف اندوز نہ ہو جائے اور یہ عورت اس سے لطف اندوز نہ ہو جائے۔‘‘

(۴) وعن انس رضى الله عنه ان رسول الله صلى الله عليه وسلم سئل عن رجل كانت تحته امرأة فطلقها ثلاثا فتزوجها بعده رجل فطلقها قبل ان يدخل بها اتحل لزوجتها الاول فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم لاحتى يذوق الاخر ما ذاق الاول من عسيلتها وذاقت عسيلته، رواه احمد والبزار وابويعلى الا انه قال ”فمات عنها قبل ان يدخل بها“ والطبرانى فى الاوسط ورجاله رجال الصحيح خلا محمد بن دينار الطاحى وقد وثقه ابوحاتم

وابوزرعة وابن حبان وفيه كلام لايضر (مجمع الزوائد، ج۴، ص۳۴۰)

”رسول اللہ...... کے خادم حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ...... سے ایک شخص کے بارے میں پوچھا گیا جس نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیدی تھیں اوراس نے کسی اور مرد سے نکاح کرلیا تھا اوراس دوسرے شوہر نے خلوت سے پہلے ہی طلاق دیدی تھی، کیا یہ عورت اپنے پہلے شوہر کے لئے حلال ہوگئی تو رسول اللہ...... نے فرمایا جب تک یہ دوسرا شوہراس کی صحبت سے لطف نہ اٹھالے اور عورت اس کی صحبت کا مزہ نہ چکھ لے پہلے شوہر کے لئے حلال نہ ہوگی، اس حدیث کی امام احمد، امام بزار، اور امام ابویعلی نے اپنے اپنے مسانید میں تخریج کی ہے، البتہ ابویعلی کی روایت میں ”فطلقها قبل ان يدخل بها“ کی بجائے ”فمات عنها قبل ان يدخل بها“ ہے اور امام طبرانی نے معجم اوسط میں اس کا ذکر کیا ہے، محمد بن دینار الطاحی کے علاوہ اس کی سند کے تمام راوی صحیح کے راوی ہیں اور محمد بن دینار کی امام ابوحاتم، امام ابوزرعہ اور ابن حبان نے توثیق کی ہے اور بعض ائمہ جرح نے ان کے بارے میں جو کلام کیا ہے وہ ان کی ثقاہت کے لئے مضر نہیں ہے۔“

چنانچہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے تقریب التہذیب میں ان کے بارے میں لکھا ہے:

”صدوق سئ الحفظ ورمى بالقدر وتغير قبل موته“ (مجمع الزوائد ج۴، ص۴۷۷) سئ الحفظ کی روایت حسن کے درجہ سے کم نہیں ہوتی اور حسن سب کے نزدیک قابل احتجاج ہے، علاوہ ازیں اس روایت کی تائید اوپر مذکور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی دونوں روایتوں سے ہوتی ہے اس لئے اس کی تائید سے یہ صحیح لغیرہ کے درجہ میں پہنچ جائے گی اسی بناپر امام ہیثمی نے لکھا ہے ”وفيه كلام لايضر“

ان تینوں حدیثوں میں طلق ثلاثا کا ظاہر یہی ہے کہ تینوں طلاقیں ایک ساتھ دی گئی تھیں چنانچہ حافظ ابن حجر حضرت عائشہ صدیقہؓ کی حدیث بخاری کی شرح میں لکھتے ہیں ”فالتمسك بظاهر قوله طلقها ثلاثا فانه ظاهر فى كونها مجموعة“ یعنی امام بخاری کا استدلال طلقہا ثلاثا کے ظاہر سے ہے، کیونکہ اس کا ظاہر تین مجموعی طلاقوں کو ہی

بتا رہا ہے، اور نص کا مدلول ظاہر بلا اختلاف سب کے نزدیک قابل استدلال اور واجب العمل ہوتا ہے، جیسا کہ اصول فقہ کی کتابوں میں مصرح ہے، علاوہ ازیں آنحضرت...... کا سائل سے بغیر یہ تفصیل معلوم کئے کہ تین طلاقیں ایک مجلس میں دی گئی ہیں یا الگ الگ تین طہروں میں یہ جواب دینا کہ عورت پہلے شوہر کے لئے حلال نہ ہوگی تاوقتیکہ دوسرے شوہر کی صحبت سے لطف اندوز نہ ہولے اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ تین طلاقیں جس طرح سے بھی دی جائیں گی تین ہی ہوں گی۔

پھر ”انت طالق ثلاثا“ کا جملہ یا ”طلق ثلاثا“ تین طلاقیں دیدیں سے بیک تلفظ تین طلاقوں کا مراد لینا زبان وادب کے لحاظ سے بغیر کسی شک وشبہ کے درست ہے، چنانچہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے تلمیذ جلیل امام ابو یوسف نے نحو کے عظیم المرتبت استاذ امام کسائی سے عربی شاعر کے درج ذیل شعر۔

فانت طالق والطلاق عزیمة ثلاثا یخرق اعق واظلم

کے بارے میں سوال کیا کہ اس شعر میں عزیمة ثلاث و ثلاثا کو مرفوع ومنصوب دونوں طرح پڑھا گیا ہے، لہٰذا بتائیے کہ رفع کی صورت میں کتنی اور نصب کی صورت میں کتنی طلاقیں واقع ہوں گی، امام کسائی نے جواب دیا جس نے ”عزیمة ثلاث“ رفع کے ساتھ پڑھا اس نے صرف ایک طلاق دی اور اپنی بیوی کو بتادیا کہ طلاق قطعی تو تین ہیں، اور جس نے ثلاثا نصب کے ساتھ پڑھا تو اس نے اکٹھی تینوں طلاقیں واقع کردیں اور بیوی کو اپنے سے علیحدہ کردیا کیونکہ اس صورت میں یہ ”انت طالق ثلاثا“ کے معنی میں ہے یعنی تجھ پر تین طلاقیں ہیں اور یہ طلاق قطعی ہے۔ (الاشباہ والنظائر از امام سیوطی ج ۳، ص ۴۲، ۴۳)

امام النحو الکسائی کے اس جواب سے بصراحت یہ بات معلوم ہوگئی کہ ”انت طالق ثلاثا“ کا جملہ نحو اور محاورہ کے اعتبار سے صحیح ہے اور اس طرح طلاق دینے سے تینوں طلاقیں بیک وقت پڑجائیں گی۔

علاوہ ازیں سنن الکبریٰ میں صحیح سندوں کے ساتھ روایتیں موجود ہیں جن میں مذکور ہے ”طلق رجل امرأته عدد النجوم“ کسی نے اپنی بیوی کو ستاروں کی تعداد کے بقدر

طلاق دیدی، بعض روایتوں میں ہے "طلق امرأته الفا" فلاں نے اپنی بیوی کو ہزار طلاقیں دیدیں (سنن الکبریٰ مع الجواہر النقی ج ۷، ص ۳۳۷-۳۳۸) مصنف ابن ابی شیبہ، مصنف عبدالرزاق، دارقطنی وغیرہ کتب حدیث میں اس طرح کی مزید مثالیں مل سکتی ہیں، یہ روایتیں اس باب میں گویا صریح ہیں کہ مذکورہ طلاقیں بیک تلفظ دی گئی ہیں، کیونکہ اگر یہ طلاقیں الگ الگ مختلف مجلسوں میں مانی جائیں تو لازم آئے گا کہ عہد تابعین میں جو اسلامی علوم وفنون کا عہد زریں کہلاتا ہے لوگ طلاق کی آخری حد سے بھی واقف نہیں تھے کہ تین طلاقوں کے بعد بھی مزید طلاقیں دے دیا کرتے تھے اور اس دور کے بارے میں یہ خیال بلاشبہ درست نہیں ہے، اس لئے جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ انت طالق ثلاثا یا طلق ثلاثا سے اکٹھی تین طلاقیں مراد لینا صحیح نہیں خود ان کا یہ دعویٰ ہی صحیح نہیں ہے اور اپنے اس دعویٰ کے ثبوت میں وہ کوئی صحیح دلیل پیش نہیں کر سکتے۔

(۵) عن الحسن قال حدثنا عبداللّٰہ بن عمر انه طلق امرأته تطليقة وهی حائض ثم اراد ان يتبعها تطليقتين اخراوين عند القرئين الباقيين فبلغ ذالك رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم فقال يا ابن عمر ما هكذا امرك اللّٰه انك قد اخطات السنة والسنة ان تستقبل الطهر فتطلق لكل قرء قال فامرنی رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم فراجعتها ثم قال اذا طهرت فطلق عند ذالك اوامسك فقلت يارسول اللّٰه افرايت لوانی طلقتها ثلاثا كان يحل لی ان اراجعها قال كانت تبين منك وتكون معصية قلت (الهيثمی) لابن عمر حديث فی الصحاح بغير هذا السياق، رواه الطبرانی وفيه عن ابن سعيد الرازی قال الدارقطنی "ليس بذاك، وعظمه غيره وبقية رجاله ثقاة (مجمع الزوائد، ج ۴، ص ۳۳۶، وسنن الکبریٰ مع الجواہر النقی ج ۷ ص ۳۳۰، ودار قطنی ج ۲، ص ۴۳۸)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی بیوی کو بحالت حیض ایک طلاق دیدی پھر ارادہ کیا کہ بقیہ دو طلاقیں "قرء" کے وقت دیدیں یہ بات حضور اکرم ...... تک پہنچی تو آپ نے فرمایا اے ابن عمرؓ اس طرح اللہ نے تم کو طلاق دینے کا حکم نہیں دیا ہے تو نے طریقۂ شرعی

میں غلطی کی، طریقہ یہ ہے کہ تو طہر کا انتظار کرے پھر طلاق دے ہر طہر میں، حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں پھر حضور...... نے مجھے رجعت کا حکم دیا تو میں نے رجعت کرلی، پھر فرمایا کہ جب پاک ہوجائے تو ہر پاکی میں ایک طلاق دو یا روک لو، تو میں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ...... بتائیں اگر میں اسے تین طلاقیں دیدیتا تو کیا میرے لئے رجعت حلال ہوتی، آپ نے فرمایا نہیں وہ تم سے جدا ہوجاتی، اور تمہاری یہ کارروائی معصیت ہوتی۔

حافظ ہیثمی کہتے ہیں کہ صحاح میں ابن عمرؓ کی حدیث اس سیاق کے بغیر ہے، اس حدیث کو طبرانی نے روایت کیا ہے، اس کے سب راوی ثقہ ہیں، بجز علی بن سعید رازی کے انھیں دارقطنی نے ”لیس بذاک“ کہا ہے اور باقی علمائے جرح وتعدیل ان کی عظمت کے معترف ہیں، انتہی کلامہ۔

چنانچہ حافظ ابن حجر انھیں ”الحافظ رحّال“ کہتے ہیں، امام ابن یونس کہتے ہیں کہ یہ صاحب فہم وحفظ تھے اور مسلمہ بن قاسم ان کو ثقہ وعالم بالحدیث کہتے ہیں (لسان المیزان ج ۳، ص ۲۳۱) سنن دارقطنی میں اس حدیث کی سند کے رجال یہ ہیں ”علی بن محمد بن عبید الحافظ نا محمد بن شاذان الجوهری نا معلی بن مصور نا شعیب بن زریق ان عطاء الخراسانی حدثهم عن الحسن قال نا عبدالله بن عمر رضی الله عنه“ اور سنن الکبریٰ کی سند یوں ہے ”اخبرنا ابوعبد الله الحافظ (المعروف بالحاکم صاحب المستدرك) و ابوبکر احمد بن الحسن القاضی قالا انا ابوالعباس محمد بن یعقوب نا ابوامیه الطرسوسی نا معلی بن منصور الرازی نا شعیب بن زریق ان عطاء الخراسانی حدثه عن الحسن قال حدثنا عبد الله بن عمر رضی الله عنه“.

حافظ ابن القیم نے سند کے ایک راوی شعیب بن زریق کو ضعیف کہا ہے اور انھیں کی وجہ سے اس حدیث کی تضعیف کی ہے لیکن انصاف یہ ہے کہ حافظ ابن القیم کا شعیب کو ضعیف قرار دینا بالکل بیجا ہے کیونکہ ائمہ جرح وتعدیل میں سے کسی نے ان کی تضعیف نہیں کی ہے ہاں ابوالفتح ازدی نے بیشک ان کو لین کہا ہے اور یہ نہایت کمزور جرح ہے علاوہ

ازیں ابوالفتح ازدی کی جرحیں محدثین کے نزدیک نا قابل اعتبار ہیں، اس لئے کہ وہ خود ضعیف وصاحب مناکیر اور غیر مرضی ہیں، پھر وہ بے سند و بے وجہ جرح کیا کرتے ہیں، اسی طرح اس سند کے دوسرے راوی عطا خراسانی کے بارے میں بعض حضرات نے کلام کیا ہے، لیکن یہ کلام بھی اصول محدثین کے اعتبار سے غیر مضر ہے، یہی وجہ ہے کہ اکابر حدیث و ماہرین رجال وائمہ مسلمین نے ان سے روایت کی ہے بلکہ ان کے شاگردوں میں ایسے حضرات بھی ہیں جن کا کسی سے روایت کر لینا اس کی ثقاہت کی سند ہوتی ہے جیسے امام شعبہ، امام مالک اور امام ابوحنیفہ، معمر، سفیان ثوری اور امام اوزاعی وغیرہ، پھر امام بخاری کے علاوہ جملہ اصحاب صحاح نے ان کی روایتیں لی ہیں اور امام مسلم نے تو احتجاج بھی کیا ہے جو ان کی ثقاہت کی بین دلیل ہے (مزید تفصیل کیلئے دیکھئے الاعلام المرفوعہ از محدث اعظمی ص ۴ تا ۸) علاوہ ازیں عطاء خراسانی اس روایت میں منفرد نہیں ہیں، بلکہ ان کے متابع شعیب بن زریق ہیں کیونکہ اس روایت کو شعیب بلا واسطہ امام حسن بصری سے روایت کرتے ہیں اور عطاء کے واسطے سے بھی، چنانچہ امام طبرانی کہتے ہیں ”حدثنا علی بن سعيد الرازی حدثنا يحيىٰ بن عثمان بن سعيد بن كثيرالحمصی، حدثنا شعيب بن زريق قال حدثنا الحسن حدثنا عبداللّٰه بن عمر الحديث“ (براہین الکتاب والسنۃ للشیخ سلامۃ القضاعی، ص ۳۴) اس لئے عطاء الخراسانی کے تفرد کی بنا پر اگر کچھ ضعف تھا تو وہ بھی ختم ہو گیا، محدثین کا یہ بھی اصول ہے کہ مرسل یا ایسی مسند روایت جس میں کچھ ضعف ہو اور جمہور ائمہ کا اس پر تعامل ہو تو اس تعامل سے وہ ضعف ختم ہو جاتا ہے۔

”واذا ورد حديث مرسل او في احد رواته ضعف لو جدنا ذالك الحديث مجمعا على اخذ، والقول به علمنا يقينا انه حديث صحيح لاشك فيه“ (توجیه النظر الی اصول الاثر، ص ۵۰)

جب کوئی حدیث مرسل ہو یا اس کے کسی راوی میں ضعف ہو اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ اس پر عمل کرنے میں ائمہ مجتمع ہیں تو ہمیں یقینی طور پر یہ معلوم ہو جائے گا کہ اس حدیث کی صحت میں کوئی شک نہیں ہے۔

اس لئے بلاشبہ یہ حدیث لائق احتجاج اور قابل استدلال ہے اور اس مسئلہ میں نص صریح ہے کہ اکٹھی تین طلاقوں سے عورت نکاح سے بالکلیہ خارج ہو جائے گی اور رجعت کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہے گی، البتہ اس طرح طلاقیں دینا خلاف شرع ہے اس لئے ایسا کرنا معصیت شمار ہوگا۔

آثار صحابہ اور ان کی شرعی حیثیت

امت میں صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو جو امتیازی شرف و مجد حاصل ہے وہ کسی اور کو نصیب نہیں، انھوں نے براہ راست فیضان نبوت سے استفادہ کیا ہے اور بغیر کسی واسطہ کے پیغمبر اعظم ...... سے تعلیم و تربیت پائی ہے جو کچھ جس طرح آپ سے سنا یا کرتے دیکھا اسے اپنی زندگی میں ڈھال لیا تھا، اگر کسی امر میں انھیں کچھ تردد واشتباہ پیش آ گیا تو رسولِ خدا...... سے پوچھ کر تشفی حاصل کر لی تھی، اس لئے ان سے بڑھ کر مزاج شناس نبوت اور واقف شریعت کون ہوسکتا ہے؟ ان کے مجموعی عمل اور رائے کے مقابلہ میں کسی بڑے سے بڑے محقق و مجتہد کے قول و عمل کو اہمیت نہیں دی جا سکتی حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے حضرات صحابہ کی اس امتیازی شان کو ان الفاظ میں واضح کیا ہے۔

اولئك اصحاب محمد صلى الله عليه وسلم كانوا افضل هذه الامة ابرها قلوبا واعمقها علما واقلها تكلفا اختارهم الله لصحبة نبيه ولاقامة دينه فاعرفوا لهم فضلهم واتبعوهم على اثرهم وتمسكوا بما استطعتم من اخلاقهم وسيرهم فانهم كانوا على الهدى المستقيم. رواه رزين (مشکوٰۃ المصابیح ج۱،ص ۳۲)

یہ رسول اللہ...... کے اصحاب ہیں جو دل کی نیکی، علم کی گہرائی اور تکلف کی کمی میں امت میں افضل ترین ہیں، جنھیں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی صحبت اور اپنے دین کی اقامت کے لئے منتخب فرمایا ہے لہٰذا ان کے فضل کو پہچانو ان کے نقش قدم کی پیروی کرو، اور ان کے اخلاق و سیرت کو جہاں تک بس چلے مضبوطی کے ساتھ پکڑے رہو، بلاشبہ یہ حضرات ہدایت پر مستقیم ہیں۔‘‘

صحابہ کی زندگی پر خود انھی کے فاضل ترین معاصر کے اس وقیع وعمیق تبصرہ کے بعد کسی اور شہادت کی ضرورت نہیں باقی رہتی، زندگی میں سادگی، دل کی پاکیزگی اور نیکی، علم میں گیرائی وگہرائی ایسے اعلیٰ ترین اور تاریخ ساز اوصاف ہیں جن سے قوموں کی حیات سنور جاتی ہے۔

خود اللہ کے رسول ...... نے صحابہ کے طریقہ پر چلنے کو مدار نجات قرار دیا ہے چنانچہ ایک حدیث میں ارشاد ہے۔ وتفترق امتی علی ثلاث وسبعین ملة کلهم فی النار الا ملة واحدة، قالوا من هی یا رسول اللّٰه؟ قال ما انا علیه واصحابی، رواه الترمذی (مشکوٰۃ المصابیح ص ۳۰، ج ۱)

’’اور میری امت ۷۳ فرقوں میں بٹ جائے گی، اور ایک کے علاوہ سب فرقے جہنم رسید ہوں گے، صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ...... نجات پانے والی کون سی جماعت ہے؟ آپ...... نے فرمایا جو میرے اور میرے اصحاب کے طریقہ پر ہے۔

ایک حدیث میں آپ ...... نے خصوصیت کے ساتھ خلفائے راشدین کے طریقہ پر چلنے کی امت کو ہدایت فرمائی ہے۔

فانه من یعش منکم بعدی فسیری اختلافا کثیرا فعلیکم بسنتی وسنة الخلفاء الراشدین المهدیین تمسکوا بها وعضوا علیها بالنواجذ. رواه احمد وابو داؤد والترمذی، وقال "حدیث حسن صحیح" وابن ماجة (مشکوٰۃ المصابیح ج ۱ ص ۳۰)

’’بس تم میں سے جو میرے بعد زندہ رہے گا وہ اختلاف کثیر دیکھے گا، لہٰذا تم لوگ میری سنت اور خلفائے راشدین (ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ) کی سنت کو لازم پکڑو اور مضبوطی کے ساتھ اس پر جمے رہو، اور قوت کے ساتھ اسے تھامے رہو۔

انھیں جیسی نصوص کی بنا پر تعامل صحابہ کے بارے میں فقہائے امت کا مسلک ہے ’’یجب اجماعا فیما شاع فسکتوا مسلمین ولا یجب اجماعا فیما ثبت الخلاف بینهم (توضیح وتلویح فی تقلید الصحابی)

جو بات عام طور پر صحابہؓ میں شائع ہو اور انھوں نے سکوتاً اسے تسلیم کر لیا ہو اس کی

اتباع باتفاق واجب ہے اور جس بات میں ان کا اختلاف ہو اس میں اتباع سب کے نزدیک واجب نہیں ہے۔

شریعت اسلامی میں حضرات صحابہؓ کی اس خصوصی وامتیازی حیثیت پر ثبوت پیش کرتے ہوئے صاحب توضیح وتلویح کہتے ہیں لان اكثر اقوالهم مسموع بحضرةالرسالة وان اجتهدوا فرايهم اصوب لانهم شاهدوا موارد النصوص ولتقدمهم فى الدين وبركة صحبة النبى صلى الله عليه وسلم وكونهم فى خيرالقرون (توضيح وتلويح فى تقليد الصحابى)

اس لئے کہ ان کے اکثر اقوال زبان رسالتؐ سے سنے ہوئے ہیں اور اگر انھوں نے اجتہاد بھی کیا ہے تو ان کی رائے زیادہ صائب اور درست ہے کیونکہ انھوں نے نصوص (قرآن وحدیث) کے موقع ومحل کا براہ راست مشاہدہ کیا ہے، دین میں انھیں تقدم حاصل ہے، رسول اللہ...... کی صحبت کی برکت سے فیضیاب ہیں اور زمانہ خیرالقرون میں تھے بالخصوص حضرات خلفائے راشدین کی حیثیت تو اس معاملہ میں بہت ہی بلند اور اعلیٰ وارفع ہے چنانچہ مسند ہند حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ آیت استخلاف کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں و كلمة ليمكنن لهم دينهم الذى ارتضى لهم دلالت میکند بردو معنی یکے آنکہ ایں خلفاء کہ خلافت ایشاں موعود است چوں وعدہ منجز شود دین علی اکمل الوجوہ بہ ظہور آید، دوم آنکہ از باب عقائد وعبادات ومعاملات ومناکحات واحکام خراج آنچہ در عصر مستخلفین ظاہر شود وایشاں باہتمام سعی در اقامت آں کنند دین مرتضی است پس اگر الحال قضا مستخلفین در مسئلہ یا فتویٰ ایشاں در حادثہ ظاہر شود آں دلیل شرعی باشد کہ مجتہد باں تمسک نماید زیرا کہ آن دین مرتضیٰ است کہ تمکیں آں واقع شد (ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء ص ۱۹)

جس دین کو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے پسند کیا ہے (یعنی دین اسلام "رضيت لكم الاسلام دينا") اس کو ان کے واسطے جما دے گا، آیت استخلاف کا یہ جز دو معنی پر دلالت کرتا ہے ایک یہ کہ یہ خلفاء جن کی خلافت کا وعدہ ہے جس وقت اس وعدہ کا ظہور ہوگا دین الٰہی مکمل ترین صورت میں رائج ہوگا اور دوسرا معنی یہ ہے کہ عقائد، عبادات،

معاملات، مناکحات، اوراحکام خراج جوخلفاء کے زمانے میں ان کی سعی واہتمام سے رائج ہوئے وہ سب پسندیدۂ الٰہی ہیں، لہٰذا اس عہد کا جو فیصلہ یا فتویٰ ان امور سے متعلق آج دستیاب ہو وہ حجت اور دلیل شرعی ہوگا کیونکہ وہی دین پسندیدہ ہے جس کو تمکین وقوت حاصل ہوئی ہے۔"

محدث دہلوی قدس سرہٗ کی اس تحقیق سے ان بیباکوں کی باطل پسندی بھی اظہر من الشّمس ہوگئی جو بیک وقت دی گئی تین طلاقوں کے تین شمار ہونے سے متعلق خلیفہ راشد حضرت فاروق اعظم کے اجماعی فتویٰ کو سرکاری آرڈی نینس کہہ کر اس کی شرعی حیثیت کو مجروح کرنے کے درپے ہیں۔

شریعت اسلامی میں حضرات صحابہؓ بالخصوص خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین کی امتیازی شان اور خصوصی حیثیت سے متعلق اس مختصر سی تمہید کے بعد مسئلہ زیر بحث کے بارے میں ان کے اقوال وآثار ملاحظہ کیجئے، اس موقع پر یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ حسب تحقیق حافظ ابن الہمام جماعت صحابہ میں فقہاء ومجتہدین کی تعداد تقریباً بیس بائیس سے اوپر نہ ہوگی مثلاً خلفائے اربعہ یعنی: (۱) حضرت صدیق اکبرؓ، (۲) فاروق اعظمؓ، (۳) عثمان غنیؓ، (۴) حضرت علی مرتضیٰؓ، (۵) حضرت عبداللہ ابن مسعود، (۶) عبداللہ ابن عمر، (۷) عبداللہ ابن عباس، (۸) عبداللہ ابن زبیر، (۹) زید بن ثابت، (۱۰) معاذ بن جبل، (۱۱) انس بن مالک، (۱۲) ابوہریرہ، (۱۳) حضرت عائشہ صدیقہ، (۱۴) حضرت ابی بن کعب، (۱۵) ابوموسیٰ اشعری، (۱۶) حضرت عبداللہ ابن عمرو بن العاص، (۱۷) مغیرہ بن شعبہ، (۱۸) ام المومنین ام سلمہ، (۱۹) عمران بن حسین، (۲۰) معاذ بن ابی سفیان وغیرہ رضوان اللہ علیہم اجمعین۔ باقی حضرات صحابہ مسائل میں انھیں کی جانب رجوع کرتے تھے (فتح القدیر، ج ۳، ص ۳۳۰)۔ شیخ محمد خضری بک نے تاریخ التشریع الاسلامی میں پندرہ فقہائے صحابہؓ کا ذکر کیا ہے جن میں حضرت فاروق اعظم، علی مرتضیٰ، عبداللہ بن مسعود اور زید بن ثابت رضوان اللہ علیہم اجمعین کو مکثرین (کثرت سے فتویٰ دینے والوں) میں شمار کیا ہے (تاریخ التشریع الاسلامی ص ۱۳۰، ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۶، ۱۶۰ اور ۱۶۳) ذیل میں

انھیں فقہاء صحابہ میں سے اکثر کے فتاویٰ درج کئے جارہے ہیں۔

خلیفہ راشد حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا اثر

عن ابن عمر ان رجلا اتی عمر فقال انی طلقت امرأتی البتة وھی حائض فقال عمر عصیت ربك وفارقت امرأتك فقال الرجل فان رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم امر ابن عمر حین فارق زوجته ان یراجعھا فقال له عمر ان رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم امره ان یراجع بطلاق بقی وانه لم یبق لك ماترجع به امرأتك" رواه الطبرانی الاوسط ورجاله رجال الصحیح خلا اسمٰعیل بن ابراھیم الترجمانی وھو ثقة (مجمع الزوائد، ج۴، ص۳۳۵، سنن الکبریٰ ج۷، ص۳۳۴)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میں نے اپنی بیوی کو بحالت حیض طلاق بتہ یعنی بیک وقت تین طلاقیں دیدیں (مولانا شمس الحق صاحب اہل حدیث (غیر مقلد) عالم نے لکھا ہے کہ اہل مدینہ تین طلاقوں کو "بتہ" کہتے ہیں التعلیق المغنی ج۲، ص۴۵۰) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تم نے اپنے رب کی نافرمانی کی اور تیری بیوی تجھ سے جدا ہوگئی۔ اس نے کہا: حضرت ابن عمرؓ نے اپنی بیوی کو طلاق دی تھی تو آنحضرت ...... نے رجعت کرادی تھی؟ حضرت عمرؓ نے فرمایا ان کو رجعت کا اختیار اس لئے ملا تھا کہ ان کی طلاق باقی رہ گئی تھی اور تمہارے لئے کچھ باقی ہی نہیں بچا کہ اپنی بیوی سے رجعت کرو۔

خلیفہ راشد حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا فتویٰ

عن معاویة بن ابی یحییٰ قال جاء رجل الی عثمان بن عفان فقال طلقت امرأتی الفا فقال بانت منك بثلاث. (فتح القدیر، ج۳، ص۳۳۰، وزاد المعاد، ج۲، ص۲۵۹)

معاویہ بن ابی یحییٰ سے روایت ہے کہ ایک شخص حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی

خدمت میں آیا اور عرض کیا کہ میں نے اپنی بیوی کو ہزار طلاقیں دیدی ہیں؟ آپ نے فرمایا تیری بیوی تجھ سے تین طلاقوں سے جدا ہوگئی۔

خلیفہ راشد حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اثر

عن حبيب بن ابى ثابت قال جاء رجل الى على بن ابى طالب فقال انى طلقت امرأتى الفا فقال له على بانت منك بثلاث واقسم سائرهن على نسائك. (فتح القدیر ج۳، ص۳۳۰، زاد المعاد ج۲ ص۲۰۹، سنن الکبریٰ، ج۷، ص۳۳۵)

حبیب بن ابی ثابت سے مروی ہے کہ ایک شخص حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خدمت میں آیا اور کہا کہ میں نے اپنی بیوی کو ہزار طلاقیں دے ڈالی ہیں؟ تو حضرت علیؓ نے ان کے جواب میں فرمایا کہ تین طلاقوں سے تیری عورت تجھ سے جدا ہوگئی اور بقیہ ساری طلاقوں کو اپنی عورتوں پر تقسیم کردے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا اثر

عن علقمة قال جاء ابن مسعود رجل فقال انى طلقت امرأتى تسعا وتسعين وانى سألت فقيل قد بانت منى فقال ابن مسعود قد احبوا ان يفرقوا بينك وبينها قال فما تقول رحمك الله فظن انه سيرخص له فقال ثلاث تبينها منك وسائرهن عدوان رواه الطبرانى ورجاله رجال الصحيح. (مجمع الزوائد ج۴ ص۳۳۸)

علقمہ سے روایت ہے کہ ایک شخص عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور کہا کہ میں نے اپنی بیوی کو ننانوے طلاقیں دیدی ہیں اور میں نے پوچھا تو مجھ کو بتایا گیا کہ تیری بیوی تجھ سے جدا ہوگئی؟ یہ سن کر حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا لوگ چاہتے ہیں کہ تجھ میں اور تیری بیوی میں جدائی کر دیں، اس نے کہا اللہ آپ پر رحم فرمائے آپ کیا کہتے ہیں اس کو خیال ہوا کہ شاید ابن مسعود رضی اللہ عنہ اس کے لئے رخصت کا حکم فرمائیں، حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ نے فرمایا کہ تین طلاقوں سے وہ تم سے جدا ہوگئی اور

بقیہ طلاقیں عدوان وسرکشی ہیں۔

اثر حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ

عن مجاهد قال كنت عند ابن عباس رضى اللّٰه تعالىٰ عنهما فجاءه رجل فقال انه طلق امرأته ثلاثا قال فسكت حتى ظننا انه رادها اليه ثم قال ينطلق احدكم فيركب الحموقة ثم يقول يا ابن عباس يا ابن عباس وان اللّٰه جل ثناءه قال ”ومن يتق اللّٰه يجعل له مخرجا“ وانك لم تتق اللّٰه فلا اجدلك مخرجا عصيت ربك بانت منك امرأتك وانّ اللّٰه قال ”يـآيها النبى اذا طلقتم النساء فطلقوهن لعدتهن“ (رواه البيهقى واللفظ لهٗ ورواه ايضا ابواؤد وقال روى هذا الحديث حميد الاعرج وغيره عن مجاهد عن ابن عباس ورواه شعبة عن عمروبن مرة عن سعيد بن جبير عن ابن عباس وايوب وابن جريج جميعاً عن عكرمة بن خالد عن سعيد بن جبير عن ابن عباس وابن جريج عن عبدالحميد بن رافع عن عطاء عن ابن عباس ورواه الاعمش عن مالك بن الحارث عن ابن عباس و ابن جريج عن عمرو بن دينار عن ابن عباس كلهم قالوا فى الطلاق الثلث انه اجازها قال وقالوا بانت منك نحو حديث اسماعيل عن ايوب عن عبداللّٰه بن كثير. السنن الکبریٰ ج۷ص۳۳۱، وابوداؤد ج۱ص۲۹۹)

مجاہد بیان کرتے ہیں کہ میں حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کی خدمت میں تھا کہ ایک شخص حاضر ہوا اور کہا کہ اس نے اپنی بیوی کو اکٹھی تین طلاقیں دیدی ہیں، عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما چپ رہے یہاں تک کہ مجھے گمان ہونے لگا کہ حضرت ابن عباسؓ اسے رجعت کا حکم دیں گے پھر فرمایا کہ پہلے تو لوگ حماقت کر بیٹھتے ہیں اور پھر اے ابن عباس اے ابن عباس چلاتے ہیں، اللہ جل شانہ کا فرمان ہے جو اللہ سے ڈرے گا اس کے واسطے اللہ گنجائش کی راہ پیدا کر دیگا، تم نے اللہ کا خوف نہیں کیا، لہٰذا میں تیرے واسطے کوئی گنجائش کی راہ نہیں پاتا، تو نے اپنے رب کی نافرمانی کی اور تیری بیوی تجھ سے جدا ہوگئی، خدا کا ارشاد ہے اے نبی تم

اپنی بیویوں کو طلاق دینے کا ارادہ کرو تو انھیں طلاق دو ان کی عدت کے وقت سے پہلے، امام ابوداؤد کہتے ہیں کہ مجاہد کے علاوہ سعید بن جبیر، عطاء، مالک بن الحارث اور عمرو بن دینار نے بھی اس حدیث کو حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے۔

کتب حدیث میں حضرت عبداللہ بن عباس سے متعدد فتاوے منقول ہیں بغرض اختصار صرف ایک پر اکتفاء کیا گیا ہے۔

اثر حضرت عبداللہ ابن عمرؓ

عن نافع كان ابن عمر اذا سئل عمن طلق ثلاثا قال لو طلقت مرة او مرتين فان النبى ﷺ امرنى بهذا فان طلقتها ثلاثا حرمت عليكم حتى تنكح زوجا غيره. (رواہ البخاری تعلیقا عن اللیث بن سعد، ج۲، ص۷۹۲ و مسلم شریف ج۱، ص۴۷۶)

نافع بیان کرتے ہیں کہ جب کوئی شخص تین طلاقیں دے کر حضرت ابن عمرؓ سے فتویٰ پوچھتا تو وہ فرماتے اگر تم نے ایک یا دو بار طلاق دی ہوتی تو رجعت کر سکتے تھے کیونکہ رسول اللہ...... نے مجھ کو اسی کا حکم دیا تھا، اور اگر تم نے تین طلاقیں دے دی ہیں تو وہ تم پر حرام ہوگئی تاوقتیکہ دوسرے سے نکاح نہ کرلے۔

مسلم میں یہ الفاظ مزید ہیں وعصيت الله فى ما امرك من طلاق امرأتك اور تم نے حکم عدولی کی اپنی عورت کے طلاق دینے میں جس سے ظاہر یہی ہے کہ یہ بیک کلمہ تین طلاقوں کا حکم بیان کر رہے ہیں۔

اثر ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ

عن محمّد بن اياس بن البكير عن ابى هريرةؓ وابن عباسؓ وعائشہؓ وعبدالله بن عمر وابن العاص سئلوا عن البكر يطلقها زوجها ثلاثا فكلهم قال لاتحل له حتى تنكح زوجا غيره (مصنف ابن ابی شیبہ ج۵، ص۲۳)

محمد ابن ایاسؒ سے روایت ہے کہ ابوہریرہؓ عبداللہ بن عباسؓ، عائشہ، اور عبداللہ بن

عمرو بن العاصؓ سے اس عورت کے بارے میں جسے اس کے شوہر نے صحبت سے پہلے طلاق دیدی ہو پوچھا گیا تو ان چاروں حضرات نے فرمایا وہ عورت اس کے لئے حلال نہیں ہوگی، یہاں تک کہ وہ کسی دوسرے مرد سے نکاح کرلے۔

فتویٰ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ

ان عطاء بن یسارؒ قال جاء رجل یستفتی عبد اللّٰہ بن عمرو بن العاص عن رجل طلق امرأته ثلثا قبل ان یمسها فقال عطاء فقلت انما طلاق البکر واحدة فقال لی عبد اللّٰہ بن عمرو انما انت قاص الواحدة تبینها والثلاث تحرمها حتی تنکح زوجا غیره (السنن الکبریٰ ج ۷، ص ۳۳۵)

عطاء بن یسارؒ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے اس مرد کے بارے میں جس نے اپنی بیوی کو صحبت سے پہلے طلاق دیدی، حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے فتویٰ معلوم کیا، عطاء کہتے ہیں کہ میں نے کہا غیر مدخولہ کی تو ایک ہی طلاق ہے، تو حضرت عبداللہ ابن عمرؓ نے فرمایا تم صرف قصہ گو ہو، غیر مدخولہ ایک طلاق سے بائن اور تین طلاق سے حرام ہوجائے گی یہاں تک کہ اس کے علاوہ کسی اور سے نکاح کرلے، یعنی ایک طلاق سے اس کا نکاح ختم ہوجائے گا، البتہ اگر عورت راضی ہوتو عدت کے بعد نکاح دوبارہ ہوسکتا ہے، اور تین طلاقوں کے بعد اس طرح جدا ہوگی کہ جب تک دوسرے سے نکاح نہ کرلے اور یہ دوسرا شوہر اس سے لطف اندوز نہ ہولے پہلے کے لئے حلال نہ ہوگی۔

فتویٰ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ

عن معاویة بن ابی عیاش الانصاری انه کان جالس مع عبداللّٰہ بن الزبیر وعاصم بن عمر رضی اللّٰہ عنهما قال فجاء هما محمد بن ایاس بن البکیر فقال ان رجلا من اهل البادیة طلقا امراته ثلاثا قبل ان یدخل بها فماذاتریان فقال ابن الزبیر هذا الامر مالنا فیه قول اذهب الی ابن عباس وابی هریرة فانی

ترکتهما عند عائشة رضی اللّٰہ عنها ثم ائتنا فاخبرنا فذهب فسالهما قال ابن عباس لابی هريرة افته يا ابا هريرة فقد جاتك معضلة فقال ابوهريرة الواحدة تبينها والثلاث تحرمها حتی تنكح زوجا غيره وقال ابن عباس مثل ذلك. (السنن الکبریٰ ج ۷، ص ۳۳۵)

معاویہ بن ابی عیاش انصاریؒ بیان کرتے ہیں کہ وہ حضرت عبداللہ بن الزبیر اور عاصم ابن عمرؓ کے ساتھ بیٹھے تھے کہ محمد ابن ایاسؒ آ گئے اور کہا کہ ایک دیہاتی نے اپنی بیوی کو خلوت سے پہلے تین طلاقیں دے دی ہیں، آپ دونوں حضرات اس کے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں، عبداللہ ابن زبیرؓ نے فرمایا اس مسئلہ کا ہمیں علم نہیں ہے، تو عبداللہ ابن عباسؓ اور ابو ہریرہؓ کے پاس جاوہ دونوں حضرات حضرت عائشہؓ کے یہاں ہیں اور دونوں حضرات جو مسئلہ بتائیں اسے ہمیں بھی بتا دینا، محمد بن ایاسؒ ان دونوں حضرات کے پاس گئے اور ان سے معلوم کیا تو حضرت عبداللہ ابن عباسؓ نے حضرت ابو ہریرہؓ سے کہا کہ یہ ایک مشکل مسئلہ پیش آ گیا ہے آپ ہی اس کے بارے میں فتویٰ دیں تو حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا کہ ایک طلاق تو عورت کو بائن کر دے گی اور تین طلاقیں اسے حرام کر دیں گی یہاں تک کہ کسی دوسرے مرد سے نکاح کر لے حضرت عبداللہ ابن عباسؓ نے بھی یہی فتویٰ دیا۔

اثر حضرت زید ابن ثابت رضی اللہ عنہ

عن الحكم ان عليا وابن مسعود وزيد بن ثابت رضی اللّٰہ عنهم اجمعين قالوا اذا طلق البكر ثلاثا فجمعها لم تحل له حتی تنكح زوجا غيره. (مصنف عبدالرزاق، ج ۶، ص ۳۳۶)

حکم سے روایت ہے کہ حضرت علی، عبداللہ ابن مسعود اور حضرت زید ابن ثابت رضی اللہ عنہم اجمعین نے فرمایا کہ غیر مدخولہ کو جب اکٹھی تین طلاقیں دی گئیں تو وہ شوہر کے لئے حلال نہیں ہوگی تاوقتیکہ وہ کسی اور مرد سے نکاح نہ کر لے۔

اثر حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ

حدثنا سعید نا ابوعوانة عن شقیق عن انس بن مالكؓ فی من طلق امرأته ثلاثا قبل ان یدخل بها قال لاتحل له حتی تنكح زوجا غیره و كان عمرؓ اذا اتی برجل طلق امرأته ثلاثا اوجع ظهره (سنن سعید ابن منصور القسم الاول من المجلد الثالث ص۳۶۰ رقم الحدیث ۱۰۷۳ او قال المحدث الاعظمی واخرجه الطحاوی، عن صالح بن عبدالرحمن عن المصنف، ج۲، ص۳۴)

شقیق روایت کرتے ہیں کہ حضرت انسؓ اس شخص کے بارے میں جس نے اپنی بیوی کو صحبت سے پہلے طلاق دی فتویٰ دیتے تھے کہ وہ عورت اس کے لئے حلال نہ ہوگی تاوقتیکہ وہ دوسرے مرد سے نکاح نہ کرلے اور فرماتے تھے کہ حضرت عمرؓ کے پاس جب ایسا شخص لایا جاتا جس نے اکٹھی تین طلاقیں دی ہوں تو وہ اس کی پشت پر درّے مارتے تھے۔

اثر امّ المومنین حضرت امّ سلمہ رضی اللہ عنہا

عن جابر قال سمعت ام سلمة سئلت عن رجل طلق امرأته ثلاثا قبل ان یدخل بها فقالت لاتحل له یطاها زوجها (مصنف ابن ابی شیبہ، ج۵، ص۲۲)

حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ اس شخص کے متعلق جس نے صحبت سے پہلے اپنی بیوی کو تین طلاق دے دی تھی میں نے حضرت ام سلمہ کو فرماتے ہوئے سنا کہ اب اس کے شوہر کے لئے حلال نہیں کہ اس کے ساتھ ہم بستر ہو۔

اثر حضرت عمران بن حصینؓ وابوموسیٰ اشعریؓ

اخبرنا حمید بن واقع بن سحبان ان رجلا اتی عمران بن حصین وهو فی المسجد فقال رجل طلق امرأته ثلاثا وهو فی مجلس قال اثم بربه (یعنی اثم بمعصیة ربه) وحرمت علیه امرأته قال فانطلق الرجل فذكر ذالك لابی

موسى اشعرى يريد بذالك عيبه فقال الا ترى ان عمران بن حصين قال كذا و كذا فقال ابو موسىٰ اكثر الله فينا مثل ابى نجيد (السنن الکبریٰ ج ۷، ص ۳۳۲)

حمید ابن واقع نے ہمیں خبر دی کہ ایک شخص حضرت عمران بن حصینؓ کی خدمت میں حاضر ہوا، جبکہ وہ مسجد میں تھے اوراس نے کہا کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو بیک مجلس تین طلاقیں دیدی ہیں حضرت عمران نے فرمایا وہ اپنے رب کی نافرمانی کی بنا پر گنہ گار ہوا اوراس کی عورت اس پر حرام ہوگئی، یہ شخص ان کے پاس سے حضرت ابوموسیٰ اشعری کی خدمت میں آیا اور بطور شکایت کے کہا کہ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ عمران نے یہ کیسا فتویٰ دیا ہے یہ سن کر حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نے (حضرت عمران کی تصویب کرتے ہوئے) فرمایا ہمارے اندر ابونجید عمران ابن حصینؓ جیسے لوگوں کی اللہ تعالیٰ کثرت فرمائیں۔

اثر حضرت مغیرہ بن شعبہؓ

عن طارق بن عبدالرحمن قال سمعت قيس بن ابى حازم قال سأل رجل المغيرة بن شعبة وانا شاهد عن رجل طلق امرأته مائة قال ثلاث تحرم وسبع وتسعون فضل (السنن الکبریٰ ج ۷ ص ۲۳۶)

طارق بن عبدالرحمٰن کہتے ہیں کہ میں نے قیس بن ابی حازمؒ کو بیان کرتے سنا کہ ایک شخص نے حضرت مغیرہ بن شعبہ سے میری موجودگی میں سوال کیا کہ ایک مرد نے اپنی بیوی کو سو طلاقیں دیدی ہیں، حضرت مغیرہؓ نے فرمایا تین طلاقوں نے حرام کردیا اور ستانوے فاضل ورائیگاں ہیں۔

یہ پندرہ حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے آثار وفتاویٰ ہیں جن سے روز روشن کی طرح واضح ہے کہ ان حضرات کے نزدیک ایک مجلس کی تین طلاقیں تین ہی ہوتی ہیں اور کسی ایک صحابی سے بھی ان فتوؤں کے خلاف کوئی روایت ذخیرۂ احادیث میں موجود نہیں ہے، اگر کوئی اس بات کا مدعی ہے کہ ان فتوؤں کے خلاف بھی روایتیں حضرات صحابہؓ سے منقول ہیں تو وہ کتب حدیث سے ایسی چند صحیح روایتیں پیش کردے (هاتو برهانكم

ان کنتم صادقین)

ناروا جسارت

ایک غیر مقلد عالم جو اپنی جماعت میں اہمیت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں، حضرات صحابہ کے ان فتوؤں کی شرعی حیثیت کو مخدوش بنانے کی نازیبا جسارت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ایک مجلس میں اگر کسی نے تین طلاق دیدی تو اسے ایک ہی طلاق تصور کریں گے جہاں تک حضرت عمر فاروقؓ کے اختیار کردہ طریق کار کا تعلق ہے تو انھوں نے بطور تعزیر ایک آرڈی ننس جاری کر کے فرمایا تھا کہ اگر کسی نے تین طلاق اپنی بیوی کو بیک وقت دیدی تو تین طلاق کا اطلاق ہو جائے گا، خلیفہ ثانی نے نص شرعی پر مصلحت شرعی کو ترجیح دی تھی، ویسے حضرت عمر فاروقؓ کے اس طریق کار کو اس وقت کے عام مسلمانوں نے تسلیم نہیں کیا صرف تیرہ افراد نے اس کو تسلیم کیا تھا اور وہ سبھی خلیفہ وقت کے گورنر تھے۔

(روزنامہ اخبار مشرق کلکتہ ۱۶ ر دسمبر ۱۹۹۳ء)

موصوف جس بات کو آج دہرا رہے ہیں، آج سے نصف صدی پہلے انھیں جیسے ایک بے باک صاحب قلم نے حضرت فاروق اعظمؓ کے اس فیصلے کے بارے میں اسی جیسے ناشائستہ کلمات لکھنے کی جسارت کی تھی، جس کی تردید میں جماعت اہل حدیث (غیر مقلدین) کے ایک متبحر و نامور عالم مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی نے ایک مضمون سپرد قلم کیا تھا، جس میں وہ لکھتے ہیں حضرت عمرؓ کی نسبت یہ تصور دلانا کہ انھوں نے (معاذ اللہ) آنحضرت...... کی سنت کو بدل ڈالا بہت بھاری جرأت ہے، واللہ اس عبارت کو نقل کرتے وقت ہمارا دل دہل گیا، اور حیرانی طاری ہوگئی کہ ایک شخص جو خود مسئلے کی حقیقت کو نہیں سمجھا وہ خلیفۂ رسول اللہ...... کی نسبت یہ خیال رکھتا ہے کہ وہ سنت کے بدلنے میں اس قدر جری تھے استغفر اللہ ثم استغفر اللہ۔ چند سطروں کے بعد مولانا سیالکوٹی لکھتے ہیں:

یہ نہ سوچا کہ اگر حضرات شیعہ کسی وقت آپ کا یہ پرچہ پیش کر کے سوال کو پلٹ کر

یوں کہہ دیں کہ آپ کے خلیفہ نے سنت رسول ...... کو بدل ڈالا، سنت صدیقی کے بھی خلاف کیا اور خود بھی دو تین سال تک اسی سنت مستمرہ پر عمل کرتے رہے، پھر اپنے بھی خلاف کیا اور ان زمانوں میں جس قدر صحابہؓ تھے ان سب کے خلاف کیا، گویا خلاف قرآن کیا، خلاف حدیث کیا اور خلاف اجماع صحابہ کیا، ان تین دلیلوں کے بعد آپ کے پاس کون سی دلیل تھی جس سے آپ کو ان کے خلاف کرنا جائز ہوا، یا تو دلیل لائیے یا خلیفہ کی مداخلت فی الدین اور معاذ اللہ تحریف وتبدیل دین مانئے، تو اس کے جواب میں کیا کہہ سکیں گے، اللہ اکبر، اہل سنت واہل حدیث ہوکر اور خلافت فاروقی کو حق مان کر اس قدر جرأت، (اعاذنا اللہ منھا) (اخبار اہل حدیث ۱۵؍نومبر ۱۹۲۹ ÷ بہ حوالہ الازہار المربوعہ، ص ۱۳۲ و ۱۳۳)

موصوف سے عرض ہے کہ اپنی ہی جماعت کے پیشرو متبحر و نامور عالم دین کی اس عبارت کو بار بار پڑھیں اور نصیحت حاصل کریں، کیونکہ یہ خود ان کے گھر کی بات ہے جس کے مان لینے میں کوئی عار نہیں، (و الحق احق ان یتبع)

☆ ☆ ☆

ایک مجلس کی تین طلاقیں تین ہی واقع ہونگی

جمہور ائمہ سلف وخلف کا فیصلہ

آج کل خدا جانے کن اغراض کے تحت علمائے غیر مقلدین ایک مجلس میں یا ایک کلمہ کے ذریعہ دی گئی تین طلاقوں کے مسئلہ کو بڑی شدومد کے ساتھ اُچھال رہے ہیں، اردو، ہندی، انگریزی اخبارات اور دیگر سرکاری وغیر سرکاری ذرائع ابلاغ کے ذریعے عام مسلمانوں کو یہ دھوکہ دینے کی کوشش کررہے ہیں کہ ایک نشست میں تین مرتبہ دی گئی طلاقوں کو تین طلاق قرار دینا باطل اور شریعت کے ساتھ کھلواڑ کرنا ہے۔

جب کہ ایک مجلس میں ایک لفظ سے یا متعدد الفاظ سے دی گئی تین طلاقیں شرعاً تین ہی واقع ہوتی ہیں، شریعت اسلامی کا یہ وہ مسئلہ ہے جس پر اہل سنت والجماعت کے ہر چہار امام ابوحنیفہ، مالک، شافعی اور احمد رحمہم اللہ کا اتفاق ہے، علاوہ ازیں دیگر ائمہ فقہ و حدیث مثلاً امام اوزاعی، امام نخعی، امام ثوری، امام ثور، امام اسحاق، امام ابن حزم ظاہری، امام بخاری وغیرہ کا بھی یہی قول ہے، بلکہ جمہور صحابہ، تابعین اور جمہور ائمہ سلف وخلف اسی کے قائل ہیں۔

امام نووی شرح مسلم شریف میں لکھتے ہیں:

واختلف العلماء فيمن قال لامرأته: ”أنت طالق ثلاثا“ فقال الشافعي ومالك وابو حنيفة واحمد وجماهير العلماء من السلف والخلف ”يقع الثلث“

یعنی اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے کہے کہ ”تجھے تین طلاقیں“ تو اس مسئلہ میں علماء مختلف ہیں: امام شافعیؒ، امام مالکؒ، امام ابوحنیفہؒ، امام احمدؒ اور سلف وخلف میں سے جمہور کا مذہب یہ ہے کہ تین طلاقیں واقع ہوں گی۔

اور حافظ ابن رجب حنبلی اپنی مشہور کتاب ”مشکل الاحادیث الواردة فی ان الطلاق الثلاث واحدة“ میں لکھتے ہیں:

اعلم انه لم یثبت عن احد من الصحابة ولا من التابعین ولا من ائمة السلف المعتمد بقولهم فی الفتاوی فی الحلال والحرام شيء صریح فی انّ الطلاق الثلاث بعد الدخول یحسب واحدة اذا سیق بلفظ واحد. (بحوالہ اعلاء السنن، ج:۱۱، ص:۷۵۶)

> جاننا چاہئے کہ صحابہ، تابعین اور ان ائمہ سلف میں سے جن کے اقوال پر دربارۂ حلال وحرام اعتماد کیا جاتا ہے کسی سے بھی صراحت کے ساتھ منقول نہیں ہے کہ صحبت کے بعد تین طلاقیں جب ایک لفظ سے دی جائیں تو وہ ایک سمجھی جائیں گی۔

امام ابوالولید الباجی ”المنتقیٰ“ میں لکھتے ہیں:

فمن اوقع الثلاث بلفظة واحدة لزمه ما اوقعه من الثلاث وبه قال جماعة الفقهاء والدلیل علی مانقوله اجماع الصحابة لان هذا روی عن ابن عمرو عمران بن حصین وعبداللّٰه بن مسعود و ابن عبّاس و ابی هریرة وعائشة ولا مخالف لهم. (بحوالہ اعلاء السنن، ج:۱۱، ص:۷۵۵)

> جس شخص نے ایک کلمہ سے تین طلاقیں دیں تو اس کی دی ہوئی یہ تینوں طلاقیں واقع ہوجائیں گی جماعت فقہاء اسی کی قائل ہے ہمارے اس قول کی دلیل صحابہ کا اجماع ہے کیونکہ یہی فیصلہ عبداللہ بن عمر، عمران بن حصین، عبداللہ ابن مسعود، ابن عباس، ابو ہریرہ اور عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہے اور اس بارے میں ان کا کوئی مخالف نہیں۔

امام الباجی کی اس تحریر میں مذکور حضراتِ صحابہ کے علاوہ حضرت عمر فاروق، عثمان غنی، علی مرتضیٰ، زید بن ثابت، عبداللہ بن زبیر، عبداللہ بن عمرو بن العاص، ابوسعید خدری، انس بن مالک، حسین بن علی بن ابی طالب، مغیرہ بن شعبہ وغیرہ اجلہ صحابہ رضوان اللہ علیہم

سے بھی یہی فیصلہ کتب حدیث میں نقل کیا گیا ہے، احادیث رسول …… سے بھی یہی ثابت ہے کہ ایک لفظ سے دی ہوئی تین طلاقیں تین ہی شمار ہوں گی، بغرض اختصار اس موقع پر صرف تین حدیثیں نقل کی جارہی ہیں۔

(۱) بخاری ومسلم میں حضرت عائشہ صدیقہؓ سے مروی ہے۔

إنّ رجلا طلّق امرأتهٗ ثلاثاً فتزوجت فطلق فسئل النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم اتحل للاوّل قال: لا، حتّٰی یذوق عسیلتها کما ذاق الاوّل.

(بخاری، ص:۷۹۱، ج:۲، ومسلم ص:۴۶۲، ج:۱)

ایک شخص نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیدیں، عورت نے دوسرے سے نکاح کرلیا، شوہر ثانی نے (قبل دخول) طلاق دے دی، آنحضرت …… سے پوچھا گیا، کیا اب یہ عورت پہلے شوہر کے لئے حلال ہوگئی؟ آپ نے فرمایا نہیں! تاوقتیکہ دوسرا شوہر اس عورت سے لطفِ صحبت نہ پائے جس طرح پہلے شوہر نے لطفِ صحبت پایا ہے۔

حدیث پاک کے الفاظ "طلق امرأته ثلاثاً" بظاہر ایک ساتھ تین طلاقوں پر دال ہیں جیسا کہ حافظ ابن حجرؒ فتح الباری، ج:۹، ص:۲۹۵، اور علامہ عینیؒ عمدۃ القاری، ج:۹، ص:۵۷۳ میں لکھتے ہیں۔

فالتمسك بظاهر قوله "طلقها ثلاثا" فانه ظاهر فی کونها مجموعة.

یعنی امام بخاری نے طلقہا ثلاثاً کے ظاہر سے استدلال کیا ہے کیونکہ یہ الفاظ تینوں طلاقوں کے بیک وقت ہونے میں ظاہر ہیں۔

لہٰذا بغیر کسی قرینہ کے ظاہر کو چھوڑ کر غیر ظاہر مراد نہیں لیا جاسکتا۔

(۲) ابن ابی شیبہ، بیہقی اور دارقطنی نے حضرت عبداللہ بن عمر کے طلاق کے مشہور واقعہ کو روایت کیا ہے جس کے آخر میں ہے۔

فقلت یا رسول اللّٰہ افرأیت لو انی طلقتها ثلاثا کان یحل لی ان ارجعها؟ قال: لا، کانت تبین منك وتکون معصیة.

اس پر میں (عبداللہ بن عمر) نے عرض کیا یارسول اللہ! اگر میں اس کو تین طلاقیں دیدیتا تو کیا میرے لئے اس سے رجعت کرلینا حلال ہوتا؟ آپ نے فرمایا نہیں! وہ تجھ سے جدا ہوجاتی اور یہ کارروائی معصیت ہوتی۔

اس روایت سے بھی معلوم ہوا کہ تین طلاقوں کے بعد رجوع کرلینا حلال نہیں اور اس حدیث کے راویوں پر جو کلام کیا گیا ہے اس کا شافی جواب حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب محدث اعظمی رحمہ اللہ نے ”الاعلام المرفوعة فی حکم الطلقات الجموعة“ میں دے دیا۔

(۳) دارقطنی نے روایت کی ہے کہ حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ نے اپنی بی بی عائشہ خثعمیہ کو اس طرح طلاق دی کہ ”اذھبی فانت طالق ثلاثا“ یعنی تو چلی جا تجھ کو تین طلاق ہے، عائشہ چلی گئیں بعد میں جب حضرت حسنؓ کو معلوم ہوا کہ عائشہ کو جدائی کا بڑا رنج ہے تو رو دیئے اور فرمایا:

لولا انی سمعت جدی اوحدثنی ابی انه سمع جدی یقول: ایما رجل طلق امرأته ثلاثا مبهمة او ثلاثا عند الاقراء لم تحل له حتی تنکح زوجا غیره لراجعتها.

> یعنی اگر میں نے اپنے نانا حضور...... سے نہ سنا ہوتا یا یوں فرمایا کہ اگر میں نے اپنے والد سے اور انھوں نے میرے نانا آنحضرت...... سے نہ سنا ہوتا کہ جو شخص اپنی بیوی کو تین مبہم یعنی بیک لفظ تین طلاق دیدے یا تین طہروں میں تین طلاقیں دے تو جب تک وہ عورت دوسرے سے نکاح نہ کرے پہلے کے لئے حلال نہیں ہوسکتی تو میں عائشہ سے رجعت کرلیتا۔

یہ حدیث حسن لذاتہٖ یا حسن لغیرہ سے کم نہیں ہے، لہٰذا یہ بھی حجت ہے اور اسکے دو راویوں پر جو معمولی کلام کیا گیا ہے اسکا جواب ”الاعلام المرفوعة فی حکم الطلقات المجموعة“ میں ہے، ان کے علاوہ اور متعدد احادیث صریحہ موجود ہیں، جن میں سے دو صحیح حدیثوں کا تذکرہ آگے آرہا ہے، ایک محمود بن لبید والی روایت اور دوسری عمیر عجلانی کا واقعہ۔

غیر مقلد مفتی کے دلائل کی حقیقت

موصوف نے اپنے فتویٰ کی تائید میں حضرت رکانہ کی حدیث کا ایک حصہ نقل کیا ہے:

انه طلق امرأته سهمية البتة فاخبر بذلك النبی صلی اللّٰه علیه وسلم قال: واللّٰه ما اردت الا واحدة فقال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم ما اردت الا واحدة؟ فقال رکانة: واللّٰه ما اردت الّا واحدة فردها الیه رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم فطلقها الثانیة فی زمان عمر والثالثة فی زمان عثمان، رواه ابوداؤد والترمذی وابن ماجة والدارمی الا انهم لم یذکروا الثانیة والثالثة. (مشکوٰۃ،ص:۲۸۴)

> حضرت رکانہ نے اپنی بیوی کو لفظ بتۃ سے طلاق دیدی اس کی اطلاع آنحضرت ...... کو دی اور کہا بخدا میں نے ایک طلاق کی نیت کی تھی، تو آنحضرت ...... نے ان سے دریافت فرمایا کہ واقعی تم نے ایک ہی کا ارادہ کیا تھا؟ انھوں نے قسم کھا کر کہا ہاں! میں نے صرف ایک ہی کی نیت کی تھی تو آنحضرت ...... نے ان کی جانب ان کی بیوی کو لوٹا دیا، پھر رکانہ نے انھیں حضرت عمرؓ کے زمانہ میں دوسری اور حضرت عثمان غنیؓ کے عہد میں تیسری طلاق دے دی۔

لفظ بتۃ کے مصداق کے بارے میں امام سفیان ثوریؒ اور اہل کوفہ ابوحنیفہؒ وغیرہ کہتے ہیں کہ اس سے ایک یا تین طلاقیں مراد لی جاسکتی ہیں، امام شافعیؒ کی رائے یہ ہے کہ دو کا ارادہ بھی درست ہے، پس غیر مقلد مفتی صاحب نے اپنے فتویٰ میں "بتة" کا جو ترجمہ طلاق مغلظہ سے کیا ہے وہ غلط ہے اور تلبیس پر مبنی ہے، مفتی صاحب کا یہ رویہ علمی دیانت کے سراسر منافی ہے۔ بتۃ کا لفظ طلاق مغلظہ کے معنی میں متعین ہوتا تو آنحضرت ...... رکانہ سے سوال ہی کیوں فرماتے کہ تم نے اس لفظ سے کیا نیت کی تھی، یہ سوال اسی وقت ہوسکتا ہے جب ایک کا ارادہ کرنے سے ایک اور تین کا ارادہ کرنے سے تین طلاقیں واقع ہوجاتی ہوں، نیز اگر دونوں صورتوں میں ایک ہی طلاق واقع ہوتی تو ایک اور تین میں سے کسی

ایک کی تعیین بھی بے معنی ہوگی پھر اس حدیث سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ لفظ ''بتتہ'' سے تین طلاقیں یکبارگی پڑ سکتی ہیں، ورنہ آنحضور...... رکانہ کو قسم دے کر ان کی نیت کیوں معلوم کرتے، اس لئے یہ حدیث تو جمہور کے مسلک کی تائید کررہی ہے، نہ کہ مفتی صاحب کے مزعومہ کی، پھر نہ جانے کیا سوچ کر انھوں نے یہ حدیث اپنے فتویٰ میں نقل کی ہے۔(۱)

اسی طرح موصوف نے حضرت محمود بن لبید کی حدیث بھی نقل کی ہے، اور اپنی حاشیہ آرائی کے ذریعہ یہ تاثر دینے کی ناکام کوشش کی ہے کہ یہ حدیث ان کے حق میں جارہی ہے جب کہ یہ بھی ان کا نرا زعم ہے، اسی حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ بیک لفظ تین طلاقوں پر آپ انتہائی ناراض ہوئے، آنحضرت...... کی اسی ناراضگی کی بنا پر علمائے احناف اس قسم کی طلاق کو بدعی اور مکروہ کہتے ہیں۔ لیکن اس سخت ناراضگی کے باوجود حسب تصریح قاضی ابوبکر ابن العربی (ابن العربی کے اس قول کو امام ابن القیم نے بغیر کسی تبصرہ کے ذکر کیا ہے) آپ...... نے ان تین طلاقوں کو نافذ فرمادیا، جس طرح عویمر عجلانیؓ کی تینوں طلاقوں کو نافذ فرمادیا تھا (دیکھئے تہذیب سنن ابی داؤد، ص: ۱۲۹، ج: ۳، طبع مصر)

لہٰذا یہ روایت بھی جمہور کی مؤید ہے۔

احادیث رسول...... کے علاوہ ظاہر قرآن سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ یکبارگی دی ہوئی تین طلاقیں تین ہی شمار ہوں گی، اور اس طرح طلاق دینے والے پر اس کی بیوی حرام ہوجائے گی، امام شافعی علیہ الرحمہ کتاب الام ص: ۱۶۵، ج: ۵ میں لکھتے ہیں:

فان طلقها فلا تحل له من بعد حتی تنکح زوجاً غیره، القرآن، واللّٰه اعلم یدل علی من طلق زوجة له دخل بها اولم یدخل بها ثلاثاً لم تحل له حتی تنکح زوجا غیره.

سو اگر اس نے اس کو اور طلاق دیدی تو اب وہ عورت اس کیلئے حلال نہیں

---

(۱) واضح رہے کہ مذکورہ روایت کے بعض طرق میں لفظ البتة کے بجائے ثلاثاً کا لفظ آیا ہے مگر محدثین کے نزدیک ثلاثاً والی روایت نہایت ضعیف ہے جو کسی درجہ میں قابل استدلال نہیں ہے۔ (نووی شرح مسلم، ص: ۲۷۸، ج: ۱، المحلی لابن حزم، ص: ۱۶۸، ج: ۱۰)

> تا وقتیکہ وہ کسی اور مرد سے نکاح نہ کرے، امام شافعیؒ فرماتے ہیں اللہ خوب جانتا ہے کہ قرآن کریم کا ظاہر اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ جس شخص نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیدیں خواہ اس سے ہم بستری کی ہو یا نہ کی ہو تو وہ عورت اس کیلئے حلال نہیں تا وقتیکہ وہ کسی اور مرد سے نکاح نہ کر لے۔

اس موقع پر یہ بات قابل غور ہے کہ امام شافعیؒ اس عورت کے لئے بھی یہ حکم عام مانتے ہیں جس سے ہم بستری نہ ہوئی ہو تو وہ تین طہر تک غیر مدخولہ رہتے ہوئے دوسری و تیسری طلاق کی اہل کیسے رہے گی، کیونکہ وہ تو پہلی ہی طلاق سے اپنے شوہر سے بائن اور جدا ہو چکی ہے، اس لئے آیت کا ظاہر اسی بات کا مؤید ہے کہ تین طلاقیں جو ایک مجلس میں دی گئی ہیں وہ تین ہی مانی جائیں گی، ہاں، عموم الفاظ اور دیگر دلائل سے ہر طہر میں الگ الگ دی گئی طلاق بھی اس کے عموم میں شامل ہے چنانچہ علامہ ابن حزم ظاہری "فان طلقها فلاتحل له من بعد" کے تحت لکھتے ہیں۔

فهذا يقع على الثلاث مجموعة و مفرقة ولايجوز ان يخصص بهذه الآية بعض ذلك دون بعض بغير نص. (محلّٰی ص:۲۰۷، ج:۱۰)

> یعنی فان طلقها کا لفظ ان تین طلاقوں پر بھی صادق آتا ہے جو اکٹھی ہوں اور ان پر بھی جو متفرق طور پر ہوں، اور بغیر کسی نص کے اس لفظ کو کسی خاص طلاق پر محمول کرنا غلط ہے۔

اور جو لوگ ابو الصہباء کی ایک روایت کی بنیاد پر یہ خیال باندھے بیٹھے ہیں کہ ایک مجلس کی تین طلاقوں کو تین قرار دینا حضرت فاروق اعظمؓ کے زمانہ سے شروع ہوا ہے، اس سے پہلے ان کو ایک طلاق قرار دیا جاتا تھا، یہ محض فریب خوردگی ہے، کیونکہ وہ روایت اولاً تو صحیح نہیں ہے محض وہم اور غلط ہے، علامہ ابن عبد البرؒ نے اس کی تصریح کی ہے نیز وہ شاذ اور منکر ہے اور دیگر متعدد وجوہ سے قابل استدلال نہیں ہے، جس کی تفصیل الاعلام المرفوعہ میں ہے، علاوہ ازیں محدث ابوزرعہ، علامہ ابو الولید باجی، قاضی ابو محمد عبد الوہاب ابن العربی اور علامہ ابن قدامہ نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ عہد نبوی، دور صدیقی اور

ابتدائی دور فاروقی میں لوگ تین طلاقوں کے استعمال کے عادی نہیں تھے بلکہ ایک ہی طلاق دے کر چھوڑ دیتے تھے، عدت کے بعد عورت بائنہ ہوجاتی تھی، بعد میں لوگ تینوں طلاقیں ایک ساتھ دے کر فوراً بائنہ کرنے لگے تو حضرت عمرؓ نے نئی پیش آمدہ صورت کے بارے میں صحابۂ کرام سے مشورہ کیا، تو بالاتفاق یہ طے پایا کہ جس طرح ایک طلاق دینے سے طلاق واقع ہوجاتی ہے اگر کوئی نادانی یا جہالت سے تین طلاقیں ایک ساتھ دیدے گا تو وہ بھی واقع ہوجائیں گی۔ "فالحديث على هذا اخبار عن الواقع لا عن المشروع" یعنی حدیث میں صورت حال کا بیان ہے، مسئلہ طے کرنے کا بیان نہیں ہے، تفصیل کیلئے دیکھئے حکومت سعودیہ کی تحقیقاتی کمیٹی کا فیصلہ (حكم الطلاق الثلث بلفظ واحد مجلّه البحوث الاسلامية المجلد الاول العدد الثالث ۱۳۹۷ھ شائع شدہ از ریاض)

اگر بالفرض مان لیا جائے کہ حضرت عمرؓ کے زمانہ ہی میں یہ فیصلہ ہوا ہے تو یہ فیصلہ قرآن وحدیث سے ماخوذ ہے، ایجاد بندہ نہیں ہے، جیسا کہ مشہور غیر مقلد مولانا ابراہیم سیالکوٹی المتوفی ۱۳۷۵ھ نے اعترافِ حق کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ حضرت عمرؓ کا یہ فیصلہ کہ تین طلاقیں تین ہی ہوتی ہیں قرآن وحدیث سے ماخوذ ہے (اخبار اہل حدیث ۱۵ر نومبر ۱۹۲۹÷) دلائل کی اسی قوت نے شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی (جنھیں غیر مقلدین اپنا پیشوا گردانتے ہیں) کو مجبور کیا کہ وہ اپنے مقتدا حافظ ابن القیم اور علامہ ابن تیمیہ کے تفرد اور شاذ مسلک کو چھوڑ کر اس مسئلہ میں ائمہ اربعہ ہی کی پیروی کریں۔ (الهدية السُّنّية بحواله وعایات مکثفه ازمولانا منظور نعمانی مدظلہٗ)

حرمین شریفین کی مجلس کبار علماء بھی کافی بحث وتحقیق کے بعد بالآخر اسی نتیجہ پر پہنچی کہ اس مسئلہ میں حق وصواب جمہور ہی کے ساتھ ہے، اور اب حرمین شریفین میں ارباب افتاء وقضاء مجلس کے فیصلہ کے مطابق جمہور ہی کے قول پر فتویٰ دینے کے پابند ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ امت کا یہ سواد اعظم شریعت کے ساتھ کھلواڑ کر رہا ہے یا وہ مٹھی بھر لوگ جو ظاہر قرآن، احادیث صحیحہ، اجماع صحابہ اور مذہب سلف وخلف کو پس پشت ڈال کر خوارج اور روافض کی ہم زبانی وترجمانی میں اپنا زور صرف کر رہے ہیں ایک ایسے وقت

میں جب کہ ملت اسلامیہ ہند اپنی جان و مال اورعزت وشریعت کے بارے میں انتہائی تشویشناک صورتِ حال سے دوچار ہے، اس مسئلہ کو چھیڑ کر اسلام اور مسلمانوں کے یہ نادان دوست ملتِ اسلامیہ کی نہ معلوم کون سی خدمت انجام دے رہے ہیں، درحقیقت یہ لوگ اپنے اس غلط رویہ سے اسلام اور مسلمانوں کے دشمنوں کو تقویت پہنچا رہے ہیں۔

فالی اللّٰہ المشتکی

اللّٰھم ارنا الحق حقًا وارزقنا اتباعه وارنا الباطل باطلاً وارزقنا اجتنابه آمین صلی اللّٰه علی النبی الکریم.

☆ ☆ ☆

ایک مجلس کی تین طلاقیں اور روشن خیال دانشوروں کا رویہ

اسلام دین فطرت اور ایک جامع نظام حیات ہے، جو راستی وسچائی کا آخری بیان ہونے کی بناء پر اپنے اندر کسی ترمیم اور تبدیلی کی گنجائش نہیں رکھتا، اس کی تعلیمات میں ایک طرف صلابت وقطعیت ہے تو دوسری طرف وہ اپنے اندر بے پناہ جامعیت اور ہمہ گیری لئے ہوئے ہے جس میں ہر دم رواں، پیہم دواں زندگی کے مسائل کے حل کی پوری صلاحیت ہے، قرآن حکیم جو خدائے لازوال کا ابدی پیغام ہدایت ہے اصول وکلیات بیان کرتا ہے اور رسول خدا...... نے اپنی زبان وحی ترجمان سے ان اصول وکلیات کی تشریح و توضیح اور اپنے معصوم عمل سے ان کی تطبیق وتنفیذ کا مثالی نمونہ پیش فرمایا ہے، صحابہ کرام، تابعین عظام ائمہ مجتہدین اور سلف صالحین قانون اسلامی کے انہیں دونوں ماخذوں یعنی کتاب وسنت کی روشنی میں اجماع واجتہاد کے ذریعہ اپنے اپنے دور میں پیش آمدہ مسائل کا حل امت کے سامنے پیش کرتے رہے ہیں، جس کا سلسلہ علمائے حق کے ذریعہ آج بھی جاری ہے، اسلام کی تاریخ ثقافت اور فقہ اسلامی کی تدوین وارتقاء سے واقفیت رکھنے والے اس حقیقت سے انکار نہیں کرسکتے۔

مغربی تہذیب جس کی بنیاد ہی اباحیت اور مذہبی واخلاقی قدروں کی پامالی پر ہے بدقسمتی سے آج پوری دنیا پر چھاگئی ہے جس سے ہمارا ملک بھی مستثنیٰ نہیں ہے، تہذیب جدید کی اسی اباحیت پسندی کے زیر اثر بے ضرورت مسائل کی تعداد بڑھتی جارہی ہے اور ملک کا روشن خیال طبقہ جو درحقیقت مغربی تہذیب کا دلدادہ ہی نہیں بلکہ نمائندہ ہے ان

بے ضرورت مسائل کو اٹھاتا رہتا ہے بلکہ بعض ان مسائل میں بھی جو عہد صحابہ وغیرہ میں اجماعی ومتفقہ طور پر طے پاچکے ہیں تشکیک والتباس اور شکوک وشبہات ظاہر کرکے (جس کی انھیں بطور خاص تعلیم دی گئی ہے) ان کے لئے من چاہے فیصلہ کا غیر مناسب مطالبہ کیا جاتا ہے، مزید برآں عربی زبان وادب، قرآن وحدیث اور ان سے متعلق ضروری علوم سے واجبی واقفیت کے بغیر دینی مسائل میں اجتہاد کے فرائض انجام دینے کے خبط میں بھی یہ طبقہ مبتلا ہے، اور اس بات کا خواہاں ہے کہ سلفِ صالحین وائمہ مجتہدین کی بے لوث جدوجہد کے ثمرات اور ان کی مخلصانہ کاوش سے حاصل شدہ متاع گرانمایہ جو مختلف مذاہب فقہ کی شکل میں امت کے پاس موجود ہے اسے نذرآتش کرکے ازسرِنو قرآن وحدیث میں غور وفکر کے ذریعہ مسائل کے حل تلاش کئے جائیں، چنانچہ مجلس واحد کی تین طلاقوں کا مسئلہ اس کی زندہ مثال ہے جو آج کل ہمارے ان روشن خیال دانشوروں کی اجتہاد پسند اور اباحیت نواز فکر ونظر کا ہدف بنا ہوا ہے، ان کے اس غیر معقول رویہ سے ایک طرف تو ملت کی تضحیک ہورہی ہے، اور دوسری جانب اسلام مخالف عناصر کے لئے مسلم پرسنل لاء میں ترمیم وتبدیلی کا جواز فراہم ہورہا ہے، جس کا وہ ایک عرصہ سے خواہش مند ہے، مگر ہمارے یہ دانشور رَچپ وراست سے بے خبر شوق اجتہاد اور جوشِ تجدد میں اپنے ناوک قلم سے دینی احکام ومسائل میں رخنہ اندازی میں مصروف ہیں۔

اس وقت ہمارے پیش نظر ملک کے مشہور روشن خیال دانشور جناب سید حامد صاحب سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا ایک مقالہ ہے جو ’’تین طلاقیں ایک عامی کی نظر میں‘‘ کے عنوان سے ۱۴؍جولائی ۱۹۹۳÷ کو روزنامہ قومی آواز دہلی میں شائع ہوا ہے۔ موصوف متوازن فکر اور سنجیدہ قلم کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے ہیں، لیکن نہایت دکھ کے ساتھ کہنا پڑرہا ہے کہ وہ بھی مسئلہ زیر عنوان پر گفتگو کرتے ہوئے بیجا قطعیت اور خشونت وسخت کلامی سے اپنے آپ کو بچا نہ سکے اور ان کا روایتی اسلوب اور معتدل طرز فکر تجدد پسندی کے آگے سپر انداز ہوگیا ہے اور ان کے قلم کے تیر ونشتر سے اسلام کی مایۂ صد افتخار شخصیتیں تک بھی محفوظ نہیں رہ سکی ہیں۔

موصوف مضمون کی تمہید میں لکھتے ہیں۔

> ''راقم کی دسترس فقہ تک نہیں ہے، لہٰذا ان سطروں کو عالموں کی محفل میں ایک عامی کی بات کے بطور سمجھئے، یوں تو ہر دین و مذہب کے ماننے والے کو اس کا قدرتی حق ہے کہ وہ دین کے احکام اور اس کی مصلحتوں کو سمجھنے کی کوشش کرے لیکن اسلام کے کلمہ گویوں کو یہ حق کچھ اور زیادہ ہے۔''

اہل اسلام کے اس ترجیحی حق کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اسلام میں نہ کلیسا ہے نہ کارکنانِ کلیسا... نہ اس میں مٹھ ہے نہ پنڈت ہیں نہ پروہت گویا اسلام اور اس کے ماننے والے کے درمیان کسی کو حائل نہیں ہونے دیا گیا ہے۔''

(۱) موصوف کا یہ بیان درست ہے کہ اسلام میں کلیسائی نظام جیسی کوئی چیز نہیں، یہ بھی درست ہے کہ مذہب کے معاملہ میں پنڈتوں و پروہتوں جیسی مطلق بالا دستی کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں اور موصوف کی یہ بات بھی صحیح ہے کہ دین کے ماننے والے کا یہ حق (بلکہ اس کی ذمہ داری ہے) کہ دین کے احکام اور اس کے مصالح کو معلوم کرنے کی کوشش کرے، لیکن اسلام نے اس قدرتی حق کو اختیار کرنے کے سلسلے میں اپنے ماننے والوں کو بے مہار آزاد نہیں چھوڑ دیا ہے کہ وہ اپنے طور پر جس طرح چاہے گرے پڑے ماخذوں سے یہ معلومات حاصل کرے بلکہ اسے پابند کیا ہے کہ اسلامی احکام اور ان کی مصلحتوں سے واقفیت رکھنے والوں ہی سے یہ معلومات فراہم کرے، کتاب الٰہی کا فرمان ہے: فَاسْئَلُوْا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَاتَعْلَمُوْنَ الآیۃ اگر تمھیں معلومات نہیں تو جاننے والوں سے دریافت کرو، اور عقل کا فیصلہ بھی یہی ہے کہ جو بات معلوم نہ ہو اسے اس کے جاننے والے ہی سے معلوم کی جائے، اس لئے کہ جو خود نہیں جانتا وہ دوسروں کو کیا بتائے گا۔

''او خویشتن گم است کرا رہبری کند''

علاوہ ازیں دینی احکام اور اس کے مصالح کو سمجھنے کی کوشش کرنا ایک الگ چیز ہے، اور دینی احکام و مسائل میں اظہار رائے اور فیصلے صادر کرنا ایک الگ بات ہے، پہلی چیز ہر

اسلام کے ماننے والے سے مطلوب ہے، ہادیٔ اسلام ...... کا ارشاد ہے "طلب العلم فریضة علی کل مسلم" متعلقہ دینی معلومات کا علم طلب کرنا ہر مسلم پر فرض ہے، لیکن احکام ومسائل میں بلکہ کسی بھی معاملہ میں علم وتحقیق اور غور وفکر کے بغیر بحث وگفتگو اظہار رائے اور فیصلہ صادر کرنے کی اجازت نہیں ہے، فرمانِ خداوندی ہے "وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا، الآية. اور نہ پیچھے پڑ جس بات کی خبر نہیں تجھ کو، بیشک کان اور آنکھ اور دل ان سب کی اس سے پوچھ ہوگی۔ مطلب یہ ہے کہ بے علم وتحقیق کوئی بات زبان سے نہ کہی جائے بلکہ کان آنکھ اور دل ودماغ سے کام لے کر معلومات فراہم کرنے کے بعد کوئی بات منھ سے نکالی جائے، سنی سنائی باتوں پر یونہی اٹکل پچو فیصلہ کرنا اور قطعی حکم لگانا آدمی کیلئے مناسب نہیں ہے۔

اسلامی علوم ومسائل کے علاوہ دنیاوی علوم وفنون کا بھی اہل فن کے نزدیک یہی حکم ہے، مثلاً ایک شخص جو سائنس کے ابتدائی اصول وقواعد سے بھی واقف نہیں وہ ماہرین سائنس کے اقوال وآراء میں محاکمہ کرنے بیٹھ جائے تو ظاہر ہے کہ اہل فن اسے ایک مسخرہ سے زیادہ کی حیثیت نہیں دیں گے، سید صاحب کو ان دونوں باتوں کے باہمی فرق کو اپنی تمہید میں واضح کرنا چاہیئے تھا تاکہ ہر ایک کا دائرہ عمل متعین ہوجاتا اور خلطِ مبحث سے ان کی تحریر پاک رہتی۔

آگے چل کر اصل موضوع پر بحث کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

> "ائمہ مذاہب نے مذاہب فقہ کی تشکیل کرتے وقت اپنے ادوار اور ادوار ماقبل کو پیش نظر رکھا ہے، ان سے یہ توقع نہیں رکھی جاسکتی کہ ان کی نظر اپنے بعد میں آنے والے ادوار اور ان ادوار میں تیزی سے بدلنے والے — حالات پر بھی ہوگی... اس سے یہ نتیجہ ضرور نکلتا ہے کہ دین کی تفہیم کا دروازہ کھلا ہوا ہے اور حشر تک کھلا رہے گا۔"

(۲) تشکیل فقہ کے وقت ائمہ مجتہدین کے طریقۂ کار کے متعلق سید صاحب کا ارشاد بجا اور ان کی یہ بات بھی درست کہ تفہیم دین کا دروازہ کھلا ہوا ہے، لیکن سید صاحب اپنی اس

تحریر سے جو تاثر دینا چاہتے ہیں اور اس زینہ سے جس مقام تک پہنچنا چاہتے ہیں وہ صحیح نہیں ہے، کیونکہ سید صاحب اس عبارت کے ذریعہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ حالات و زمانہ کے تغیر سے اسلامی احکام میں تغیر ہوتا رہتا ہے لیکن سید صاحب اس حکم کو جس قدر عام بتانا چاہتے ہیں در حقیقت وہ اس قدر عام نہیں ہے وہ مسائل جن پر صحابہ یا ائمہ مجتہدین کا اجماع ہو چکا ہے، یا وہ مسائل جن کی قطعیت منصوص طور پر ثابت ہے ان میں کسی طرح کی تبدیلی اور کتر بیونت کی کوئی گنجائش نہیں ہے، البتہ کچھ مسائل ایسے ضرور ہیں جن میں اختلاف زمان ومکان کی رعایت ملحوظ ہوتی ہے، اس موقع پر اس تقسیم کا ذکر ضروری تھا ورنہ اس سے اباحیت کا دروازہ کھل جائے گا اور دینی احکام بازیچۂ اطفال بن کر رہ جائیں گے۔

چند سطروں کے بعد مسئلہ زیر بحث کے متعلق اپنا قطعی فیصلہ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

> ''اسلام سہولتیں فراہم کرتا ہے اور عقوبتوں سے جہاں تک ممکن ہو بچاتا ہے، وہ فقہاء جو اس کے برعکس (یعنی بیک مجلس دی گئی تین طلاقوں کو تین کی) رائے کا اظہار کرتے ہیں ان سے نادانستہ قرآن وسنت سے انحراف سرزد ہوتا ہے۔''

(۳) یہ بھی کیا طرفہ تماشا ہے کہ ایک طرف تو اقرار و اعتراف ہے کہ ''راقم کی دسترس فقہ تک نہیں ہے'' اور دوسری طرف ایک خالص فقہی مسئلہ میں محاکمہ اور قطعی فیصلہ کرنے کا منصب عظیم سنبھال لیا گیا ہے ''ایں کار از تو آید مرداں چنیں کنند'' تمہید میں دین کے مسائل واحکام کو سمجھنے کا قدرتی حق غالباً اسی مقصد کے لئے حاصل کیا گیا تھا، اور دین کی تفہیم کا دروازہ شاید اسی غرض کے لئے کھولا گیا تھا۔

اپنے اس فیصلہ پر کہ جن فقہاء نے ایک مجلس کی تین طلاقوں کو تین قرار دیا ہے ان سے نادانستہ طور پر قرآن وسنت کے حکم سے انحراف سرزد ہوتا ہے، اگر سید صاحب کے دفتر معلومات میں قرآن کریم کی کوئی ایسی آیت ہو جس سے بصراحت ثابت ہوتا ہو کہ ایک مجلس کی تین طلاقیں ایک شمار ہوں گی یا کوئی ایسی حدیث ہو جو اصول محدثین کے اعتبار

سے مسئلہ زیرِ بحث میں قابلِ استدلال ہو تو پیش فرمائیں ورنہ ان کا یہ بے دلیل فیصلہ جمہور فقہاء و محدثین کے مقابلہ میں ایک جسارت بیجا سے زیادہ کی حیثیت نہیں رکھے گا۔

موصوف کے اس فیصلہ کے برعکس ظاہر قرآن سے جمہور ہی کی تائید ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مرد کو تین طلاقوں کا جو حق دیا ہے اگر وہ اس کو بیک وقت استعمال کرلے تو یہ عمل خود اس کی اپنی مصلحت کے خلاف ہوگا، کیونکہ اس طرح وہ اپنے حق رجعت کو اپنے ہاتھوں ختم کرلے گا، چنانچہ سورۃ الطلاق میں فرمایا گیا "وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ لَاتَدْرِیْ لَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا" جس نے احکام الٰہی سے تجاوز کیا اس نے اپنے اوپر ظلم کیا، تمھیں کیا خبر کہ اللہ تعالیٰ اس طلاق کے بعد صلح وصفائی کی کوئی صورت پیدا فرمادے۔ اگر بیک مجلس تین طلاقوں کو ایک شمار کیا جائے تو پھر یہ کہنے کے کیا معنی باقی رہتے ہیں کہ شاید اللہ تعالیٰ اس کے بعد کوئی صورت پیدا کردے، کیونکہ تین کو ایک شمار کرنے کی صورت میں رجعت کا حق اور موافقت کی صورت باقی ہی رہے گی، قرآن کی یہ آیت طلاق دینے والے کو متنبہ کررہی ہے کہ اگر تم نے طلاق کا پورا حق ایک بار استعمال کرلیا تو خود اپنے اوپر ظلم کروگے اور بعد میں پچھتاؤگے اور پھر بیوی سے صلح ورجعت کی کوئی صورت باقی نہیں رہے گی۔ (دیکھئے شرح مسلم للنووی، ص: ۴۷۸، ج: ۱)

آیت پاک وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَل لَهٗ مَخْرَجاً سے بھی یہی مفہوم مستفاد ہورہا ہے یعنی جو شخص طلاق دینے میں خدا سے ڈرتے ہوئے حکم شریعت کی پابندی کرے گا اور تین طہروں میں وقفے کے ساتھ طلاق دے گا، اس کے لئے رجعت کی گنجائش باقی رہے گی اور اگر اس کے برعکس ایک ہی مجلس میں تینوں طلاقیں جاری کردے گا تو رجعت کی یہ گنجائش ختم ہوجائے گی اور بیوی سے ہمیشہ کے لئے ہاتھ دھونا پڑ جائے گا، ترجمان القرآن حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے آیت پاک کی یہی تفسیر سنن ابوداؤد، ص: ۳۰۶، ج: ۱ میں منقول ہے، حضرت فاروق اعظم علی مرتضٰی اور عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے بھی یہی تفسیر کتب حدیث وتفسیر میں نقل کی گئی ہے، کیا کوئی اس فیصلہ میں حق بجانب ہوسکتا ہے کہ قرآن پاک کے سمجھنے اور اس پر عمل کرنے میں ان کبار صحابہ کے مقابلے میں بعد کے

لوگ ان سے آگے ہیں؟

احادیث صحیحہ مثلاً حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کی حدیث جس میں انھوں نے آنحضرت ...... سے دریافت کیا ہے کہ لو انی طلقتها ثلاثا کان لی ان اراجعهما قال لا کانت تبین منك و تكون معصية (بیہقی، ص۳۳۴، ج۷ و دارقطنی ص۴۳۸، ج۳، اصول حدیث کے اعتبار سے اس حدیث کے لائق استدلال ہونے میں کوئی معتبر کلام نہیں کیا جاسکتا، یہ حدیث صراحتاً دلالت کررہی ہے کہ اکٹھی تین طلاقوں سے بیوی جدا ہوجائے گی گو اس طرح طلاق دینا گناہ ہے اسی حدیث کی بناء پر حضرت عبداللہ ابن عمر یکبارگی دی گئی تین طلاقوں کے تین ہونے کا فتویٰ دیا کرتے تھے، حضرت ابن عمر کا یہ فتویٰ بخاری ص۷۹۲، ج۲ و ص۸۰۳، ج۲ اور مسلم ص۴۷۶، ج۱، پر دیکھا جاسکتا ہے۔

نواسۂ رسول حضرت حسن بن علی مرتضیٰ نے اپنی بیوی عائشہ بنت الفضل کو ایک ہی مجلس میں تین طلاقیں دیدیں، بعد میں انھیں معلوم ہوا کہ عائشہ کو مفارقت پر بہت قلق ہے تو فرطِ تاثر سے حضرت حسن رودیئے اور فرمایا "لو لا انی سمعت جدی او حدثنی ابی انه سمع جدی یقول ایما رجل طلق امرأته ثلاثا مبهمة او ثلاثا عند الاقراء لم تحل له حتی تنكح زوجا غيره لراجعتها" (دارقطنی ص۴۳۷، ج۲ و بیہقی ص۲۳۶) اگر میں نے اپنے نانا جان سے نہ سنا ہوتا یا یوں فرمایا کہ اگر میں نے اپنے والد سے اور انھوں نے میرے نانا ...... سے نہ سنا ہوتا کہ جو شخص اپنی بیوی کو تین مبہم یعنی بیک لفظ تین طلاق دیدے یا تین طہروں میں تین طلاقیں دے تو وہ عورت جب تک دوسرے سے نکاح نہ کرے پہلے کے لئے حلال نہیں ہوسکتی، تو میں عائشہ سے رجعت کرلیتا۔ حافظ ابن رجب حنبلی نے لکھا ہے کہ اسنادہ صحیح، یعنی اس حدیث کی سند صحیح ہے (الاشفاق ص۲۴)

حضرت عائشہ صدیقہؓ کی روایت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، جس میں ہے کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیدیں، اس نے دوسرے شوہر سے نکاح کرلیا، اور دوسرے شوہر نے قبل از خلوت طلاق دیدی، نبی کریم ...... سے پوچھا گیا کہ کیا یہ پہلے شوہر کے لئے حلال ہوگئی، آپ نے فرمایا نہیں تاوقتیکہ دوسرا شوہر پہلے کی طرح لُطف اندوز

صحبت نہ ہو پہلے کے لئے حلال نہ ہوگی (بخاری ص ۷۹۱، ج ۲ و مسلم ص ۴۶۳) ان تین معتبر و مستند حدیثوں کے علاوہ اور حدیثیں بھی پیش کی جاسکتی ہیں، لیکن ارادۂ اختصار اس کی اجازت نہیں دیتا۔

ظاہر قرآن، احادیث صحیحہ کے علاوہ تقریباً سولہ حضرات صحابہ کا فتویٰ کتب حدیث میں منقول ہے کہ ایک مجلس کی تین طلاقیں تین ہی شمار ہوں گی اور اسی پر عہد فاروقیؓ میں صحابہ کا اجماع بھی ہوچکا ہے، اس کے برعکس ایک صحابی کا بھی فتویٰ سند صحیح کے ساتھ پیش نہیں کیا جاسکتا کہ انھوں نے ایسی عورت کے متعلق جس سے ہمبستری ہوچکی ہو یہ فتویٰ دیا ہو کہ ایک مجلس میں دی گئی تین طلاقیں اس کے حق میں ایک شمار ہوں گی، حضرات تابعین کا بھی یہی مسلک ہے، ائمہ مجتہدین اور اجلۂ محدثین بھی یہی کہتے ہیں، چنانچہ حافظ ابن رجب اپنی کتاب "مشکل الاحادیث الواردة فی ان الطلاق الثلاث واحدة" میں لکھتے ہیں "اعلم انه لم يثبت عن احد من الصحابة ولا من التابعين ولا من ائمة السلف المعتد بقولهم فی الفتاویٰ الحلال والحرام شيء صريح فی ان الطلاق الثلث بعد الدخول يحتسب واحدة اذا سبق بلفظ واحد" صحابہ، تابعین اور ائمہ سلف میں جن کے فتاوی پر مسائل حلال وحرام میں اعتماد کیا جاتا ہے کسی سے یہ بصراحت ثابت نہیں ہے کہ صحبت کے بعد کی تین طلاقیں جو ایک لفظ سے دی گئی ہوں ایک شمار ہوں گی (الاشفاق ص ۳۵ مطبوعہ مصر) اور بھلا کوئی سمجھدار تین کو ایک کس طرح کہہ سکتا ہے گو عیسائیوں نے تین ایک، ایک تین کا فلسفہ ایجاد کیا مگر اس کی صحیح اور قابل قبول توجیہ پیش کرنے سے آج تک عاجز ہیں۔

اس لئے بغیر کسی شک و تردد کے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ سید صاحب سے اس فیصلہ میں قرآن و سنت سے انحراف سرزد ہوا ہے اور ان کا یہ محاکمہ رجماً بالغیب کے قبیل سے ہے، کاش کہ سید صاحب اس پتھر کے پھینکنے سے پہلے یہ سوچ لیتے کہ اس سے اسلام کی کیسی کیسی برگزیدہ اور قابل احترام شخصیتیں لہولہان ہورہی ہیں، لیکن ان کا شوقِ اجتہاد اور جوشِ تجدّد اس کی فرصت ہی کہاں دیتا ہے۔

چند سطروں کے بعد اپنے ایک اور فیصلہ کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> ’’طلاق بدعت جو حضرت عمر فاروق کے دور خلافت میں ایک ہنگامی فتنہ کو دبانے کے لئے شروع کی گئی تھی اپنا مقصد پورا کرنے کے بعد وجہ جواز کھو بیٹھی، روایت ہے کہ خود فاروق اعظم نے اپنے فیصلہ سے رجوع کرلیا تھا... انسانی فطرت کی کجی اور چور دروازہ نکال لینے کی عادت کو کیا کہئے کہ حضرت عمرؓ کے اس ہنگامی فرمان کو رنگ دوام دے دیا گیا۔‘‘

(۴) الف: سید صاحب مانتے ہیں کہ وقفہ کے ساتھ تین طہروں میں دی گئی تین طلاقوں سے بیوی جدا اور شوہر کے لئے مثل ایک اجنبیہ کے حرام ہو جائے گی۔

(ب) موصوف کا یہ پختہ خیال ہے کہ ایک مجلس میں دی گئی تین طلاقیں ایک شمار ہوں گی اور اس کے بعد طلاق دینے والا رجعت کر کے عورت کو نکاح میں باقی رکھ سکتا ہے، یعنی اس طلاق کے بعد بھی عورت اس کے لئے جائز و حلال ہے۔

(ج) آں محترم کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ حضرت عمرؓ نے ظالم شوہروں کے فتنۂ ظلم کا سدّ باب کرنے کی غرض سے ہنگامی طور پر یہ فرمان جاری کیا تھا کہ جو شخص بیک مجلس تین طلاقیں دے گا یہ تین طلاقیں اس پر لازم ہوں گی اور اس کی بیوی ہمیشہ کے لئے اس پر حرام ہو جائے گی۔

(د) شوہروں کا فتنۂ ظلم ختم ہو گیا تو اس سزا کا جواز بھی ختم ہو گیا اسی بناء پر حضرت عمرؓ نے اپنے اس فیصلے سے رجوع کرلیا۔

(ھ) لیکن انسانی فطرت کی کجی اور چور دروازے نکال لینے کی عادت نے اس وقتی اور ہنگامی سزا کو دوامی حکم دے دیا۔

سید صاحب کے فیصلہ کے یہ پانچ اجزاء ہیں جن کے متعلق علی الترتیب گذارشات ملاحظہ کی جائیں، اوّل الذکر دو جزوں کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔

(۳) اسلامی قانون کی رو سے امیر و خلیفہ کو تادیب و تعزیر کا وسیع حق حاصل ہے، لیکن کیا خلیفۂ وقت کو اس کا بھی اختیار ہے کہ خدا کی حلال کی ہوئی کسی چیز کو حرام کردے یا

کسی حرام کو حلال بنادے اگر خلیفہ کو یہ حق حاصل ہے جیسا کہ سید صاحب موصوف کی تحریر بتارہی ہے تو کس دلیل سے موصوف قرآن وحدیث سے کوئی حجت پیش فرمادیں تو ہم جیسے طالب علموں پر ان کا ایک علمی احسان ہوگا، تحلیل وتحریم کا تعلق تو امر تشریع سے ہے اور مسند ہند حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی تحفۂ اثنا عشریہ ص ۱۷۰ میں لکھتے ہیں ”صحیح آنست کہ امر تشریع مفوض بہ پیغمبر نمی باشد زیرا کہ منصب پیغمبری منصب رسالت وایلچی گری ست نہ نیابت خدا ونہ شرکت در کار خدا“ صحیح یہ ہے کہ شریعت سازی کا کام پیغمبر کے سپرد نہیں ہے کیونکہ پیغمبری کا منصب تو پیغام پہنچانے کا ہے نہ کہ خدا کے کاموں میں شرکت کا، سورہ التحریم کی اولین آیت یا ایُّھا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا اَحَلَّ اللّٰہُ لَکَ“ اے نبی تو کیوں حرام کرتا ہے جو حلال کیا اللہ نے تجھ پر“ سے حضرت شاہ صاحبؒ کے قول کی تائید ہوتی ہے، تو جب پیغمبر اعظم ......کو براہ راست تحریم وتحلیل کا حق نہیں دیا گیا تو کسی امیر وخلیفہ کے بارے میں چاہے وہ خلیفۂ راشد ہی کیوں نہ ہو اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا، علاوہ ازیں فرمان الٰہی ہے یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَیِّبَاتِ مَا اَحَلَّ اللّٰہُ لَکُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا“ اے ایمان والو حرام نہ کرو پاکیزہ چیزوں کو جنھیں اللہ نے تمھارے لئے حلال کردی ہیں (ایسا کرکے تم اپنی حد سے) تجاوز نہ کرو، کیا خلیفۂ راشد حضرت فاروق اعظمؓ کے متعلق یہ سوچا بھی جاسکتا ہے کہ انھوں نے حکم الٰہی کے علی الرغم پاکیزہ اور حلال بیویوں کو ان کے شوہروں کے لئے حرام کردیا، حقیقت یہ ہے کہ جن صاحب نے اپنی بات کی پچھ میں قرآن وحدیث سے ماخوذ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس فیصلہ کو تعزیر کا عنوان دیا ہے انھوں نے خود پسند امراء وسلاطین کے لئے ایک ایسا دروازہ کھول دیا ہے جس کے ذریعہ خدا اور رسول کے احکام میں من چاہی تبدیلی تک وہ بآسانی پہنچ سکتے ہیں۔

اور بالفرض حضرت عمر فاروقؓ نے سزا کا یہ فرمان اپنے اختیار سے تجاوز کرکے صادر کیا تھا تو حضرات صحابہ نے اس غلط فیصلہ پر نکیر کیوں نہیں کی جب کہ اس خیر جماعت کی عورتیں تک برسر منبر خلیفۂ وقت فاروق اعظم کو ٹوک دیا کرتی تھیں۔ پھر اگر یہ ایک ہنگامی حکم تھا جسے بعد میں ختم ہوجانا تھا تو حضرت عثمان غنی اور حضرت علی مرتضٰی اپنے اپنے عہد خلافت میں اور

دیگر حضرات صحابہ مدت العمر فاروقی فیصلہ کے مطابق کیوں فتویٰ دیتے رہے۔

اگر عہد فاروقی کے اس اجماعی فیصلہ کو تعزیر اور سزا کا نام دیا جائے تو ایک طالب علمانہ اشکال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ (خاکم بدہن) حضرت عمرؓ کی یہ سزا مبنی برانصاف نہیں ہے کیونکہ جرم کا مرتکب تو صرف شوہر ہے لہٰذا سزا کا مستحق بھی تنہا وہی ہوگا، لیکن اس سزا نے تو مجرم شوہر کے ساتھ بیگناہ بیوی کو بھی اپنی گرفت میں لے لیا ہے کہ اسے شوہر جیسے رفیق حیات سے محروم کر دیا، کیا مظلوم ہونا بھی جرم ہے جس کی سزا میں فرقت وتنہائی کی اذیت ناک قید میں اسے جکڑ دیا گیا، کیا عدالت فاروقی سے اس ناانصافی کا تصور کیا جا سکتا ہے۔

(۴) حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اپنے فیصلہ سے رجوع کر لینے کا دعویٰ بھی نرا دعویٰ ہے جو دلیل وبرہان کی قوت سے یکسر محروم ہے، جس روایت کی بنیاد پر رجوع کی کہانی مشہور کی جا رہی ہے اس کی حیثیت طبع زاد افسانے سے زیادہ نہیں ہے پھر اس افسانوی روایت میں رجوع کا ذکر ہے نہ ایک مجلس کی تین طلاقوں کا، روایت کے الفاظ اور ائمہ جرح وتعدیل کا اس کے راوی پر نقد وتبصرہ اس موقع پر بغرض اختصار ترک کر دیا گیا ہے، لیکن اگر سید صاحب کا مطالبہ ہوگا تو دونوں چیزیں باحوالہ پیش کر دی جائیں گی، علاوہ ازیں جناب کے دعویٰ کے مطابق حضرت فاروق اعظم نے اپنے فیصلہ سے رجوع کر لیا تھا تو رجوع کے بعد لازمی طور پر ایک مجلس کی تین طلاقوں کے بارے میں انھوں نے ایک کا فتویٰ دینا شروع کر دیا ہوگا، لہٰذا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ایسا ایک فتویٰ ہی سہی سند کے ساتھ پیش کر دیا جائے تاکہ رجوع کا انکار کرنے والوں کا منہ بند ہو جائے۔

(۵) اس سلسلے میں عرض ہے کہ اس ہنگامی فیصلہ کو رنگ دوام دینے والے دو ایک نہیں بلکہ امت کا سواد اعظم ہے اور اس سواد اعظم میں حضرت عمر کے علاوہ دو خلیفہ راشد عثمان غنی اور علی مرتضی اور دیگر صحابہ میں زید بن ثابت، عبد اللہ ابن مسعود، عبد اللہ ابن عمر، عبد اللہ بن عباس، عبد اللہ بن عمرو بن العاص، ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ، حضرت ام سلمہ، عمران بن الحصین، مغیرہ بن شعبہ، ابو ہریرہ، ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہم جیسے فقہاء صحابہ شامل ہیں، اور بقول حافظ ابن القیم تابعین کا تو کچھ شمار ہی نہیں (اغاثۃ اللھفان

ص ۳۲۲، ج ۱) اور مشہور غیر مقلد عالم مولانا شمس الحق ڈیانوی لکھتے ہیں، ائمہ اربعہ اور جمہور علمائے اسلام کا یہی مذہب ہے کہ بیک مجلس دی گئی تینوں طلاقیں واقع ہوجاتی ہیں (عون المعبود شرح سنن ابی داؤد) تو کیا سید صاحب کے نزدیک امت کا یہ سواد اعظم جن کی پیروی کا ہادی اعظم ...... نے حکم دیا ہے کج فطرت اور اسلامی احکام میں چور دروازہ نکالنے والا تھا؟ سچ تو یہ ہے کہ جس کے دل میں اسلام اور اسلامی شخصیات کی معمولی سی وقعت ہوگی اس کی زبان وقلم سے ان کے بارے میں ایسا اہانت آمیز جملہ نہیں نکل سکتا، بات یہ ہے کہ موصوف جن باکمال اساتذہ کے سعادت مند شاگرد ہیں ان کا سب سے بڑا کمال ہی یہ ہے کہ وہ اپنے تلامذہ کے دل ودماغ سے اسلام اور اکابر اسلام کی وقعت و عظمت کا تصور حرف غلط کی طرح مٹا دیتے ہیں، اس لئے ان شاگردوں کو اس کی قطعاً پرواہ نہیں ہوتی کہ ان کے خدنگ قلم کا نشانہ کون ہے، اور اسلام وملتِ اسلامیہ پر اس کا کیا اثر مرتب ہوگا۔

پیراگراف (۶) میں اپنی بات میں قوت پیدا کرنے کی غرض سے تحریر کرتے ہیں کہ ”کئی اسلامی ملکوں نے طلاق کی مسخ شدہ شکل کو (یاد رہے کہ مسخ کرنے کے اس عمل میں امت کا سواد اعظم شریک ہے) درست کرنے کی کوشش کی ہے، میری محدود اطلاع کے مطابق ان میں قابل ذکر مصر اور شام اور پاکستان اور بنگلہ دیش ہیں، کیا ہندوستانی مسلمان جو غیر اسلامی ماحول میں پلے بڑھے ہیں یہ سوچنے میں حق بجانب ہوسکتے ہیں کہ اسلام کو سمجھنے اور برتنے میں وہ اسلامی ممالک سے آگے ہیں۔“

(۶) سید صاحب کی یہ بھی خوب منطق ہے کہ ایک طرف تو وہ دین ومذہب کے ماننے والے کا یہ قدرتی حق بتاتے ہیں کہ وہ براہ راست دین کے احکام ومصالح کو سمجھنے کی کوشش کرے، نیز فرماتے ہیں کہ ”اسلام اور اس کے ماننے والے کے درمیان کسی کو حائل نہیں ہونے دیا گیا ہے۔“ لیکن ہندوستانی مسلمانوں کو ان کا یہ قدرتی حق دینے کے لئے آمادہ نہیں ہیں، ان کی خواہش ہے کہ اسلام اور ہندوستانی مسلمانوں کے درمیان مصر وشام جیسی مذہب بیزار حکومتوں کو حائل کردیں، اور اس جرم میں کہ وہ ہندوستان میں کیوں پیدا

ہو گئے انھیں دین کی تفہیم میں مصر و شام وغیرہ مسلم ملکوں کا پابند بنا دیں۔

سید صاحب موصوف کو جن کی بین الاقوامی معلومات کا دائرہ نہایت وسیع ہے یہ اطلاع ضرور ہوگی کہ مصر و شام اور پاکستان و بنگلہ دیش کی لادینی حکومتوں کے برعکس ''مجلس کبار سعودیہ عربیہ نے (جس کا فیصلہ مملکت سعودیہ کی عدالتوں میں واجب العمل جانا جاتا ہے اور خود شاہِ مملکت بھی اس کے پابند ہوتے ہیں) مسئلہ زیر بحث سے متعلق دونوں قسم کے دلائل و شواہد کی پوری چھان بین اور مکمل بحث و نظر کے بعد بصیرت کے ساتھ یہی فیصلہ کیا ہے کہ ایک مجلس کی تین طلاقیں تین ہی شمار ہوں گی کیونکہ دلائل و براہین کی بنیاد پر یہی مذہب درست اور صواب ہے، موصوف نے اپنی اس اطلاع کو کس مقصد سے مخفی رکھا اس کے اظہار کی ضرورت نہیں ''در مجلس رنداں خبرے نیست کہ ہست'' اور اگر مسئلہ سے عدم دلچسپی یا کسی اور وجہ سے انھیں ''مجلس کبار علماء'' کے اس اہم فیصلہ سے واقفیت نہیں ہو سکی تو عرض ہے کہ ''مجلّہ البحوث الاسلامیہ جلد ١، عدد ٣، ١٣٩٧ھ الریاض'' حاصل کر کے ایک نظر دیکھ لیں اس میں مجلس کی پوری کارروائی الف سے یا تک بغیر کسی حذف و اختصار کے موجود ہے۔

شاید موصوف کو بھی اس سے اختلاف نہیں ہوگا کہ مصر و شام وغیرہ ممالک کے بالمقابل مملکت عربیہ سعودیہ دینی و شرعی معاملہ میں آج بھی بسا غنیمت ہے کیونکہ اس کا نظام حکومت اسلامی ہے اور ان ملکوں کا لادینی، اس لئے شرعی مسائل و احکام میں نظیر بنائے جانے کی مستحق مملکت سعودیہ ہوگی نہ کہ مصر و شام، جہاں اسلامی تہذیب و ثقافت کی باتیں کرنا بنیاد پرستی اور رجعت پسندی ہے جو مغربی تہذیب کے نزدیک ایک جرم عظیم ہے۔

رہی بات اسلام کے سمجھنے اور برتنے کی تو بحمد اللہ ہندوستان کے غیر اسلامی ماحول میں پروان چڑھنے کے باوجود یہاں کے مسلمان مذکورہ ممالک سے اس معاملہ میں کسی طرح پیچھے نہیں ہیں جس کا اعتراف خود وہاں کے علماء و فضلاء کو بھی ہے، یہ ایک الگ موضوع ہے جس پر ہندوستان کی علمی و دینی تاریخ کی روشنی میں سیر حاصل گفتگو کی جا سکتی ہے، لیکن نہ اس کا موقع ہے اور نہ اس مختصر تحریر میں اس کی گنجائش ہی ہے۔

(۷) تقریباً دس بارہ صدیوں سے مسلمان ابنائے وطن کے ساتھ ہندوستان میں آباد ہیں اور وطن عزیز پر برطانوی سامراج کے تسلّط سے پہلے یہاں کے تمام مسلمان بغیر کسی اختلاف کے مسئلہ زیر بحث میں فقہ حنفی بلکہ جمہور امت کے مسلک کے مطابق ایک مجلس کی تین طلاقوں کو تین شمار کرتے رہے، تاریخ سے اس کے خلاف ایک مثال بھی پیش نہیں کی جاسکتی، اور آج کی طرح ہر دور میں یہاں ابنائے وطن ہی کی اکثریت رہی ہے، لیکن اس طویل مدت میں کبھی یہ سوال نہیں اٹھا کہ تین طلاقوں کو تین شمار کرنے سے مسلمان غیر مسلم اکثریت کی تضحیک کا نشانہ بنتے ہیں، درحقیقت شوقِ اجتہاد اور ذوقِ اباحیت کی کوکھ سے اس سوال نے جنم لیا ہے، ورنہ تضحیک و تشنیع کا سبب یہ مسئلہ نہیں ہے، بلکہ روشن خیال دانشوروں کا یہ رویہ ہے کہ اپنے سبک دست اساتذہ کی طرح یہ لوگ مذہبی مسائل میں (جس کی انھیں بطور خاص تربیت دی جاتی ہے) تشکیک و التباس پیدا کرکے دنیا کے سامنے اسے ایک اضحوکہ کی صورت میں پیش کرتے ہیں، اور اس کا دوسرا اہم سبب مسلم معاشرہ کی زبوں حالی ہے جس کی بناء پر بہت سارے مسائل بظاہر پیچیدہ ہوگئے ہیں اس لئے ضرورت ہے اپنے آپ کو بدلنے کی، مسلم معاشرہ کی اصلاح کی، نہ کہ دین کے غیر مجتہد مسائل میں ترمیم وتبدیلی کی، شاعر مشرق کو فقہائے حرم سے یہ شکوہ تھا کہ ”خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں“ آج اسی تاریخ کو روشن خیال دانشور دہرانا چاہتے ہیں۔ اگر معاشرہ درست ہوجائے اور اس میں اسلام کے ضابطۂ طلاق پر عمل کرنے کا رواج ہوجائے تو یہ مسئلہ از خود حل ہوجائے گا جو آج بظاہر لاینحل بنا ہوا ہے جس کی وجہ سے مسائل میں تبدیلی کا غلغلہ بلند کیا جارہا ہے، خلیفۂ راشد امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ارشاد ہے۔

لو ان الناس اصابوا حد الطلاق ما ندم رجل طلق امرأته.

اگر لوگ طلاق کے سلسلے میں متعین حدوں پر قائم رہیں تو اپنی بیوی کو طلاق دینے کے بعد کسی کو ندامت نہیں ہوگی۔

☆ ☆ ☆

طلاق سکران

صحابۂ کرام وتابعین عظام کے آثار واقوال کی روشنی میں

مسئلہ ''طلاق سکران'' اگرچہ عہد صحابہ سے علمائے مجتہدین کی بحث ونظر کا موضوع رہا ہے۔ لیکن ملک العلماء علاؤ الدین الکاسانی کی حسب تصریح عام علماء وصحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین طلاق سکران کے وقوع ونفاذ کے قائل ہیں۔ امام کاسانی اپنی مشہور محققانہ کتاب ''بدائع الصنائع'' میں لکھتے ہیں:

"اما السکران: اذا طلق امرأته فان کان سکره بسبب محظور بان شرب الخمر أو النبیذ طوعا حتی سکر وزال عقله فطلاقه واقع عند عامة العلماء والصحابة رضی اللّٰه عنهم" (۱۵۸/۳ مکتبہ زکریا دیوبند)

خود ہمارے ملک ہندوستان بلکہ پورے برصغیر کے ارباب فتویٰ واصحاب نظر علماء کتب احناف میں منقول مفتی بہ قول کے مطابق زمانۂ قدیم سے طلاق سکران کے وقوع کا فتویٰ دیتے چلے آرہے ہیں اور عامۃ المسلمین ان فتووں پر عمل کرتے رہے ہیں۔

مگر حالیہ چند مہینوں سے ہمارے بعض علماء اس معمول بہا قول کے برخلاف ذرائع ابلاغ کی پوری قوت کے ساتھ عام مسلمانوں کو یہ باور کرانے کی سعی کررہے ہیں کہ طلاق سکران سے متعلق ائمہ مجتہدین واکابر محدثین کا مخلصانہ فیصلہ اور فقہائے اسلام کا فتویٰ عصر حاضر کے لحاظ سے فقہ اسلامی کے مزاج سے ہم آہنگ نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس طلاق سکران کا عدم وقوع ہی علم وتحقیق کی رو سے امت مسلمہ کی صلاح وفلاح کا ضامن ہے۔

اس صورت حال نے مسلم معاشرہ کو ایک ذہنی کشمکش میں مبتلا کردیا ہے کہ وہ مسئلہ زیر بحث میں عام فقہائے اسلام کے مذہب ومسلک کو حسب معمول حرز جان بنائے رکھیں

یا اس جدت طراز حلقہ کی سمیناری تحقیقات کو درست مان کر متقدمین فقہاء کے فتویٰ سے گلوخلاصی کر لیں اس لیے ضرورت محسوس ہوئی کہ اس مسئلہ میں ائمہ احناف اور دیگر جمہور فقہاء و محدثین رحمہم اللہ کے مسلک و مذہب کا جائزہ حضرات صحابہ اور ان کی تربیت یافتہ جماعتِ تابعین رضوان اللہ اجمعین کے آثار و اقوال کی روشنی میں لیا جائے کیونکہ دینی احکام و مسائل میں کتاب و سنت کے بعد جس کی جانب نگاہیں اٹھ سکتی ہیں وہ صحابہ کرام اور تابعین عظام ہی کی جماعت ہے۔ اس لیے کہ یہی وہ سعادت بہ کنار بابرکت شخصیتیں ہیں جو خیر القرون کی عطر بیز، ایمان پرور فضاؤں میں پروان چڑھی ہیں اور انھیں کے علم و عرفان کے چشموں سے دنیائے اسلام کو علم و ایقان کی تازگی نصیب ہوئی ہے۔

اس مختصر تمہید کے بعد اب آیئے دیکھیں کہ اس مسئلہ کے بارے میں حضرات صحابہ اور تابعین کے آثار و اقوال سے ہمیں کیا ہدایت مل رہی ہے۔

آثار صحابہ

اثر حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ

۱- ”حدثنا ابو بکر، قال نا و کیع، عن جریر بن حازم، عن الزبیر بن الخرّیت عن ابی لبید ان عمر اجاز طلاق السکران بشهادة نسوة“ (مصنف ابن ابی شیبة: ۳۱/۶)

ترجمہ: ابولبید لُمازہ بن زُبّار جہضمی روایت کرتے ہیں کہ حضرت امیر المؤمنین عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے عورتوں کی گواہی سے طلاق سکران کو نافذ کیا۔ یعنی کچھ عورتوں نے حضرت عمر فاروق کے سامنے اس بات کی شہادت دی کہ فلاں نے بحالت نشہ اپنی بیوی کو طلاق دی تو حضرت عمرؓ نے اس طلاق کو صحیح قرار دیا۔

۲- حدثنا سعید، قال عبداللّٰه بن وهب، قال اخبرنی مخرمة ابن بکیر، عن عبید اللّٰه بن مقسم، قال سمعت سلیمان بن یسار یقول: ان رجلا من آل ابی البختری طلق امرأته وهو سکران فضربه عمر الحد واجاز علیه طلاقه“

(سنن سعید بن منصور القسم الاول من المجلد الثالث، ص: ۲٦٦ الرقم ۱۱۰٦)

ترجمہ: سلیمان بن یسار روایت کرتے ہیں کہ ابوالبختری کے گھرانے میں سے ایک شخص نے بحالت نشہ اپنی بیوی کو طلاق دیدی تو حضرت فاروق اعظم نے اسے شراب پینے کی شرعی سزا میں مارا اور اس کی طلاق کو نافذ فرمادیا۔

تنبیہ: یہ روایت اگرچہ مرسل ہے پھر بھی قابل استدلال ہے کیونکہ سلیمان بن یسار کی مرسل روایتیں ان محدثین کے نزدیک بھی حجت مانی جاتی ہیں جو مراسیل کو ضعیف کہتے ہیں پھر اس کی اوپر مذکور مرفوع روایت سے تائید بھی ہوتی ہے اس لیے اس کے حجت ہونے میں کوئی کلام نہیں۔

علاوہ ازیں امام ابن حزم ظاہری نے "المحلیٰ" میں بطریقِ ابن مہدی عن خراش بن مالك عن يحي بن عبيد عن ابيه **حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ** کا یہ اثر ذکر کیا ہے "انه اثبت الطلاق على السكران" (۱۰/۲۰۹) یعنی حضرت فاروق اعظم نے سکران پر اس کی طلاق کو نافذ فرمایا۔

اثر حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ

۱-حدثنا ابوبكر قال: ناوكيع، عن الاعمش، عن ابراهيم، عن عابس بن ربيعة، عن على قال: كل طلاق جائز الا طلاق المعتوه." (مصنف ابن ابی شیبہ ۷/۲۵)

۲- عبدالرزاق، عن الثورى، عن الاعمش، عن ابراهيم، عن عابس بن ربيعة، عن على قال: كل طلاق جائز الا طلاق المعتوه" (مصنف عبدالرزاق ۷/۸۷)

۳- حدثنا سعيد قال: نا سفيان وابوعوانة وابو معاوية، عن الاعمش، عن ابراهيم، عن عابس بن ربيعة عن على مثله" (سنن سعید بن منصور القسم الاول من المجلد الثالث، ص: ۲۶۸)

٤- حدثنا سعيد قال: نا هشيم قال: انا اشعث بن سوار اخبرنا عبدالرحمن بن عابس عن ابيه انه سمع عليا يقول: كل طلاق جائز الا طلاق المعتوه" (ایضاً ص: ۲۶۸، الرقم ۱۱۱۴)

٥- اخبرنا ابوالحسين بن الفضل القطان، انا عبداللّٰه بن جعفر، يعقوب

بن سفیان، نا ابونعیم، نا سفیان، عن الاعمش، عن ابراهیم، عن عابس بن ربیعة، عن علی رضی اللّٰہ عنه قال: کل طلاق جائز الا طلاق المعتوه، قال یعقوب، وقال قبیصة، عن سفیان عن عبدالرحمن بن عابس بن ربیعة یعنی عن ابیه عن علی بذلك" (السنن الکبریٰ للبیہقی ۷/۳۵۹)

٦- اخبرنا ابومحمد عبداللّٰہ بن یوسف، انا ابوسعید ابن الاعرابی، نا الحسن بن محمد الزعفرانی، انا ابومعاویة، نا الاعمش، عن عابس بن ربیعة، عن علی رضی اللّٰہ عنه کل طلاق جائز الا طلاق المعتوه" (ایضاً ۷/۳۵۹)

۷- وروی البغوي فی الجعدیات، عن علی بن جعد، عن شعبة، عن الاعمش، عن ابراهیم، عن عابس بن ربیعة ان علیا قال: کل طلاق جائز الا طلاق المعتوه". (فتح الباری شرح البخاری ۹/۴۹۲)

ابراہیم نخعی اور عبدالرحمٰن بن عابس کے طریق سے مروی اس صحیح اثر کا معنی یہ ہے کہ معتوہ یعنی ناقص العقل کی طلاق کے علاوہ ساری طلاقیں واقع ہوجاتی ہیں اس عموم میں سکران کی طلاق بھی داخل ہے۔

اثر حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما

۱- عبدالرزاق عن ابن جریج قال: اجاز عمر بن عبدالعزیز اذ کان عاملاً علی المدینة طلاق السکران، فقال عبید اللّٰہ بن ایمن: طلق رجل امرأته رملة بنت طارق فاجازه معاویة" (مصنف عبدالرزاق ۷/۸۳)

ابن جریج بیان کرتے ہیں کہ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے مدینہ منورہ کی ولایت کے زمانہ میں طلاق سکران کو نافذ کیا تو (ان کے اس عمل کی تائید میں) عبیداللہ بن ایمن نے ذکر کیا کہ ایک شخص نے بحالت نشہ اپنی بیوی رملہ بنت طارق کو طلاق دیدی تھی تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اس طلاق کو نافذ فرمایا تھا۔

۲- اخبرنا ابوالحسین محمد بن الحسین بن محمد بن الفضل القطان

بغداد، انا ابو سهل بن زياد القطان، نا عبداللّٰه بن روح المدائنى نا شبابة نا ابن ابى ذئب، عن الزهرى قال: أُتى عمر بن عبدالعزيز برجل سكران فقال: انى طلقت امرأتى وانا سكران، فكان رأى عمر معنا ان يجلده وان يفرق بينهما، فحدثه ابان بن عثمان ان عثمان رضى اللّٰه عنه قال: ليس للمجنون ولا للسكران طلاق، فقال عمر: كيف تأمرونى وهذا يحدث عن عثمان رضى اللّٰه عنه فجلده ورد عليه امرأته، فقال الزهرى: فذكر ذلك لرجاء بن حيوة فقال: قرأ علينا عبدالملك بن مروان كتاب معاوية بن ابى سفيان فيه السنن ان كل احد طلق امرأته جائز الا المجنون" (السنن الكبرىٰ للبیہقی ۳۵۹/۷)

ترجمہ: امام زہری راوی ہیں کہ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے پاس نشہ میں مست ایک شخص لایا گیا اوراس نے بیان کیا کہ میں نے بحالت نشہ اپنی بیوی کوطلاق دیدی ہے، تو ہمارے موافق عمر بن عبدالعزیز کی رائے یہی تھی کہ اسے حد شرب میں کوڑے ماریں اور اس کے اوراس کی بیوی کے درمیان تفریق کردیں۔ اس موقع پر حضرت عثمان غنی کے بیٹے ابان نے ذکر کیا کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ مجنون اور سکران کی طلاق معتبر نہیں، تو عمر بن عبدالعزیز نے فرمایا تم لوگ مجھے کس طرح سکران کی طلاق واقع کرنے کا مشورہ دے رہے جب کہ یہ ابان مجھ سے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا یہ قول نقل کررہے ہیں۔ اس کے بعد عمر بن عبدالعزیز نے اس پر حد شرب جاری کی (اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے اس قول کے مطابق) اس سکران کی طلاق کو کالعدم قرار دے کر اس کی بیوی کواس کے پاس لوٹا دیا۔

ناقل روایت امام زہری کہتے ہیں کہ اس واقعہ کا ذکر رجاء بن حیوہ سے کیا گیا تو انھوں نے بیان کیا کہ عبدالملک بن مروان نے ہمیں حضرت امیر معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما کا مکتوب پڑھ کرسنایا تھا جیسا کہ طریقہ رائج ہے کہ مجنون کی طلاق کے علاوہ ہر مکلّف کی طلاق واقع ہوجائے گی۔

فائدہ: اس روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ طلاق سکران کے سلسلہ میں حضرت

عثمان رضی اللہ عنہ کی رائے حضرت فاروق اعظم اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہما کے قول کے برخلاف یہ ہے کہ اس کی طلاق واقع نہیں ہوگی۔ اور عمر بن عبدالعزیز نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اسی قول کی بناء پر اپنی سابق رائے سے رجوع کرلیا۔

نیز اس روایت کے آخری حصہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت امیر معاویہؓ اس مسئلہ میں حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے بجائے حضرت عمر فاروق اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کے موافق ہیں۔ چنانچہ حافظ ابن حزم ظاہری جو طلاق سکران کے عدم وقوع کے قائل ہیں اس کے باوجود اپنی مشہور کتاب ''المحلی'' میں حضرت عمر فاروق اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہما سے طلاق سکران کے وقوع کا انکار نہیں کرسکے بلکہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے اوپر مذکور اثر کو ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں ”وروی نحوه عن معاوية بن ابی سفیان ایضا وقال ورویناه عن ابن عباس من طرق فی بعضها الحجاج بن ارطاة وفی اخری ابراهیم بن ابی یحي“ (۱۰/۲۰۹)

یعنی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے قول و عمل کے مطابق حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے بھی روایت منقول ہے۔ اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی یہی روایت متعدد سندوں سے ہم سے بیان کی گئی ہے جن کی بعض سندوں میں حجاج بن ارطاۃ اور بعض دیگر میں ابراہیم بن ابی یحییٰ ہیں (اور یہ دونوں راوی ضعیف ہیں)

امام ابن حزم کا حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول اثر پر نقد اور حضرت عمر فاروق اور حضرت امیر معاویہ کی روایت کے بارے میں سکوت بتا رہا ہے کہ ان کے نزدیک ان دونوں حضرات سے منقول روایتیں ثابت ہیں۔

خلیفۂ راشد فاروق اعظم، علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہما اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے ان قوی آثار سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ سکران کی طلاق واقع ہوجاتی ہے۔ وکفی بهم قدوة نیز ان آثار کی تائید ایک حدیث سے بھی ہوتی ہے جس کو امام ترمذی نے ان الفاظ میں ذکر کیا ہے۔

حدثنا محمد بن عبدالاعلیٰ الصنعانی، انبأنا مروان بن معاوية الفزاری،

عن عطا بن عجلان، عن عكرمة بن خالد المخزومی، عن ابی هريرة قال: قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه عليه وسلم: كل طلاق جائز الا طلاق المعتوه المغلوب علی عقله" (سنن ترمذی مع شرح تحفۃ الاحوذی ۴/۲۹۶)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انھوں نے بیان کیا کہ رسول خدا ...... نے فرمایا معتوہ یعنی مغلوب العقل کی طلاق کے علاوہ ساری طلاقیں واقع ہوجاتی ہیں۔

اس حدیث کو ذکر کر کے امام ترمذی نے اس کی اسنادی حیثیت پر یہ کلام کیا ہے:

هذا حديث لا نعرفه مرفوعا الا من حديث عطاء بن عجلان، وعطاء بن عجلان ضعيف، ذاهب الحديث" (ایضاً)

عطاء بن عجلان پر امام ترمذی کی یہ جرح درست ہے۔ جمہور محدثین کے نزدیک یہ ضعیف ہیں۔ اس لیے محدثین کے نزدیک یہ روایت لائق استدلال نہیں، لیکن اوپر مذکور آثار کی تائید میں اسے پیش کیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ ضعیف روایت کو کسی حدیث کی تائید وتوجیہ میں پیش کیا جانا اصول محدثین کے خلاف نہیں ہے۔

ان تین کبار صحابہ کے آثار کے بعد ان کی تائید میں تابعین عظام کے فیصلے ملاحظہ کیجیے۔

اقوال تابعین رحمہم اللہ تعالیٰ

۱- قاضی شریح متوفی ۷۸ھ

۱- حدثنا ابوبكر قال: نا عمرو بن محمد، عن ابی حنيفة، عن الهيثم، عن عامر، عن شريح قال: طلاق السكران جائز" (مصنف ابن ابی شیبہ ۴/۳۱)

ترجمہ: عامر شعبی بیان کرتے ہیں کہ قاضی شریح نے فرمایا کہ سکران کی طلاق واقع ہوجاتی ہے۔

فائدہ: قاضی شریح بن حارث عہد رسالت علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں موجود تھے لیکن شرف زیارت حاصل نہ کرسکے اس لیے مخضرم تابعین میں شمار ہوتے ہیں۔ فاروق

اعظم، عثمان غنی، علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہم کے زمانۂ خلافت میں تینوں خلفائے راشدین کی جانب سے کوفہ کے منصب قضاء پر فائز رہے۔ اور مجموعی طور پر ۷۵ سال کے طویل زمانہ تک قضا کی خدمت انجام دی۔

ظاہر ہے کہ اس دوران یہ اپنے قول کے مطابق سکران کی طلاق کے وقوع ہی کا فیصلہ کرتے رہے ہوں گے۔ اور ان کے اس فیصلہ پر خلفائے راشدین یا دیگر امراء مسلمین کی نکیر ثابت نہیں جس سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد میں جمہور اسی مسلک پر متفق تھے۔

۲- افضل التابعین سعید بن المسیب متوفی ۹۴ھ

۱- حدثنا ابوبکر قال: نا محمد بن بشر، عن سعید، عن قتادة، عن سعید بن المسیب قال: طلاق السکران جائز" (مصنف ابن ابی شیبہ ۴/۳۰)

ترجمہ: قتادہ بن وعامہ روایت کرتے ہیں کہ امام سعید بن المسیب نے فرمایا کہ سکران کی طلاق واقع ہو جاتی ہے۔

۲- حدثنا ابوبکر قال: نا حاتم بن اسماعیل، عن عبدالرحمن بن حرملة قال: طلق جاری سکرانا فأمر ان اسأل سعید بن المسیب فقال: ان اصبت فیه الحق فرق بینه وبین امرأته واضرب ثمانین" (ایضاً)

ترجمہ: عبدالرحمٰن بن حرملہ بیان کرتے ہیں کہ میرے پڑوسی نے بحالت نشہ طلاق دیدی اور مجھ سے کہا کہ میں اس بارے میں حضرت سعید بن میبّب سے مسئلہ معلوم کرلوں۔ چنانچہ میرے پوچھنے پر انھوں نے فرمایا کہ اس مسئلہ میں اگر تم حق پر پہنچنا چاہتے ہو تو اپنے پڑوسی اور اس کی بیوی کے مابین تفریق کر دو اور شراب کی حد میں اسے اسی کوڑے مارو۔

۳- حدثنا سعید قال: نا عبدالعزیز بن محمد، قال اخبرنا عبدالرحمن بن حرملة عن سعید بن المسیب انه کان یریٰ طلاق السکران جائزا" (سنن سعید بن منصور القسم الاول من المجلد الثالث، ص: ۲۶۷)

ترجمہ: عبدالرحمٰن بن حرملہ سعید بن المسیب سے روایت کرتے ہیں کہ ان کے

نزدیک سکران کی طلاق واقع ہوجاتی ہے۔

٤ – مالك انه بلغه ان سعيد بن المسيب وسليمان بن يسار سئلا عن طلاق السكران فقالا: اذا طلق السكران جاز طلاقه وان قتل قُتِل، قال مالك: وعلى ذلك الامر عندنا“ (مؤطاامام مالک،ص:۲۱٦ والاستذکار ۱۸/۱٦۰)

امام مالک نے بیان کیا کہ انھیں یہ بات پہنچی ہے کہ سعید بن المسیب اور سلیمان بن یسار سے طلاقِ سکران کے بارے میں پوچھا گیا تو دونوں حضرات نے جواب دیا کہ سکران جب طلاق دے گا تو اس کی طلاق واقع ہوجائے گی اور اگر کسی کو اس حالت میں قتل کرے گا تو اسے قتل کیا جائے گا۔“ (مطلب یہ ہے کہ یہ مکلّف کے حکم میں ہے لہٰذا اس کی طلاق واقع ہوگی اور اگر کوئی ایسا جرم کرے گا جس پر شرعاً قصاص یا حد کا حکم جاری ہوتا ہے تو یہ بھی اس پر جاری ہوگا)

امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ سعید بن المسیب اور سلیمان بن یسار نے جو مسئلہ بتایا ہے ہمارے نزدیک بھی سکران کا یہی حکم ہے۔ اہل علم جانتے ہیں کہ امام مالک ”الامر عندنا“ کے الفاظ سے خاص اپنا مسلک ہی نہیں بیان کرتے بلکہ ان کی اصطلاح میں یہ جمہور علمائے مدینہ کے مذہب کی ترجمانی ہوتی ہے۔

فائدہ: سعید بن مسیّب اپنے علم وفضل کے لحاظ سے محدثین کے یہاں افضل التابعین شمار ہوتے ہیں۔ امام المحدثین ابن شہاب زہری کہتے ہیں کہ میں سات برس ان کی خدمت میں رہا میرا خیال ہے ان کے علوم ومعارف میں کوئی اور ان کے شریک سہیم نہیں ہے۔ فقیہ شام امام مکحول کہتے ہیں کہ میں نے تمام مراکز علمیہ کا سفر کیا ہے مجھے سعید بن المسیب سے بڑھ کر کوئی عالم نہیں ملا۔ خود امام سعید بن المسیب کا بیان ہے اب کوئی باقی نہیں رہا جو آنحضرت ...... اور خلفائے ثلثہ حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق، اور حضرت عثمان غنی کے سارے فیصلوں کو مجھ سے زیادہ جاننے والا ہو۔ اولین عظیم حافظ حدیث حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی دامادی کا شرف بھی انہیں حاصل ہے اس نسبت کی بناء پر حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ان کی تعلیم وتربیت پر خصوصی توجہ فرماتے تھے۔ ان وجوہ

سے مسئلہ زیر بحث میں ان کا فیصلہ علمی اعتبار سے ایک خاص وزن اور قوت رکھتا ہے۔

۳- امام ابراہیم نخعی متوفی ۹۶ھ

۱- حدثنا سعید قال: نا ھشیم قال: انا مغیرة، عن ابراھیم قال: طلاق السکران جائز ویضرب الحد لانہ فی عدوان" (سنن سعید بن منصور القسم الاول من المجلد الثالث، ص: ۲۶۶)

ترجمہ: مغیرہ ابن مقسم امام ابراہیم نخعی سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا سکران کی طلاق نافذ ہوگی اور اس پر حد شرب جاری ہوگی۔ کیونکہ یہ طلاق عدوان وسرکشی کی حالت میں دی گئی ہے۔ (مطلب یہ ہے کہ سکران کا نشہ کسی بیماری وغیرہ کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اس نے یہ جانتے ہوئے اس حرام شے کو استعمال کیا ہے کہ اس کے پینے کے بعد اپنی عقل کھو بیٹھوں گا اور اس حالت میں ایسا کام کرسکتا ہوں جو میرے مصالح کے خلاف ہوگا اس لیے اسے معذور نہیں سمجھا جائے گا)

۲- عبدالرزاق عن ابن التیمی، عن اسماعیل بن ابی خالد، عن الشعبی وابراھیم قالا: یجوز طلاق السکران وعتقہ" (مصنف عبدالرزاق ۷/۸۳)

ترجمہ: ابن ابی خالد بیان کرتے ہیں کہ امام شعبی اور امام ابراہیم نخعی دونوں بزرگوں نے فرمایا کہ سکران کی طلاق، اور اس کا عتاق (غلام کو آزاد کرنا) صحیح ہے یعنی دونوں نافذ ہوں گے۔

فائدہ: امام ابوحنیفہ کے استاذ الاساتذہ فقیہ کوفہ ابراہیم بن یزید النخعی کے بارے میں خود ان کے معاصر امام شعبی کا فیصلہ ہے کہ وہ اپنے عہد میں بصرہ، کوفہ، حجاز اور شام کے علماء میں سب سے بڑے عالم وفقیہ تھے۔ لہٰذا ایسے عظیم القدر محدث وفقیہ کے فتویٰ کو بغیر کسی واضح اور قوی دلیل کے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ بالخصوص علمائے احناف کا ان کے فتاویٰ سے اعراض کسی طرح مناسب نہیں کیونکہ بقول امام ولی اللہ محدث دہلویؒ ابراہیم نخعی کے فتاوے مذہب احناف میں اصل الاصول کی حیثیت رکھتے ہیں۔

۴-امام التفسیر مجاہد بن جبر متوفی ۴-۱۰۳ھ

۱- عبدالرزاق، عن ابن عیینة، عن ابن ابی نجیح، عن مجاهد قال: طلاق السكران جائز" (مصنف عبدالرزاق ۷/۸۳، ومصنف ابن ابی شیبہ ۴/۳۰، وسنن سعید بن منصور القسم الاول من المجلد الثالث، ص:۲۶۶)

ترجمہ: امام مجاہد نے فرمایا کہ مدہوش کی طلاق نافذ ہوگی۔

۵-امام عامر بن شراحیل شعبی متوفی ۱۰۴ھ

۱۔ حدثنا ابوبكر، قال: حدثنا اسماعيل بن عياش عن عبدالعزيز عن الشعبى قال: يجوز طلاقه، الحد على ظهره" (مصنف ابن ابی شیبہ ۴/۱۳)

ترجمہ: عبدالعزیز بن عبیداللہ حمصی امام شعبی سے ایک روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا سکران کی طلاق واقع ہوگی اور اس پر حد شرب بھی جاری ہوگی۔

تنبیہ: محدث سعید بن منصور نے اپنی سنن میں اسی سند سے روایت ذکر کی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں "قال الشعبى: لا يجوز نكاح السكران ويجوز طلاقه" (القسم الاول من المجلد الثالث، ص:۲۷۱، الرقم ۱۱۲۶)

فائدہ: عبدالعزیز بن عبیداللہ الحمصی اگرچہ ضعیف ہیں لیکن اوپر مذکور مصنف عبدالرزاق کی روایت میں ان کے قوی شاہد اسماعیل بن ابی خالد موجود ہیں۔

امام شعبی اپنے زمانہ میں جامعیت علوم میں انفرادی شان کے مالک تھے۔ خود امام شعبی کا بیان ہے کہ میں نے پانچ سو صحابہ کو پایا ہے اور بقول امام عجلی اڑتالیس صحابہ سے حدیثیں سنی ہے۔ اس لیے ان کے فتوے کی اہمیت سے کون انکار کرسکتا ہے؟

۶-فقیہ سلیمان بن یسار ۱۰۷ھ

۱- حدثنا ابوبكر قال: نا ابن مهدى قال: قلت لمالك حدثت ان سليمان بن يسار و سعيد بن المسيب قالا: طلاقه جائز؟ قال: نعم" (مصنف ابن ابی شیبہ ۴/۳۰)

ترجمہ: حافظ حدیث عبدالرحمٰن بن مہدی کا بیان ہے کہ میں نے امام مالکؒ سے پوچھا کہ کیا آپ بیان کرتے ہیں کہ سلیمان بن یسار اور سعید بن المسیب نے کہا ہے کہ سکران کی طلاق درست ہے (یعنی واقع ہوجائے گی) تو امام مالکؒ نے فرمایا ہاں میں یہ بیان کرتا ہوں۔

تنبیہ: مؤطا امام مالک کے حوالہ سے امام سعید بن المسیب کے عنوان میں یہ روایت گذر چکی ہے کہ "مالك بلغه ان سعيد بن المسيب و سليمان بن يسار سئلا عن طلاق السكران فقالا: اذا طلق السكران جاز طلاقه و ان قتل، قُتل" جس سے امام عبدالرحمٰن بن مہدی کی اس روایت کی تائید وتوثیق ہوتی ہے۔

فائدہ: سلیمان بن یسار، حضرت ام المومنین میمونہ رضی اللہ عنہا کے آزاد کردہ غلام تھے۔ اور مدینہ منورہ کے ان سات فقہاء میں سے ایک ہیں جن پر اس دور میں فتویٰ کا مدار تھا۔ سعید بن المسیب کے بعد سب سے بڑے عالم وفقیہ مانے جاتے تھے بلکہ بعض علماء نے تو فہم وفراست میں انھیں امام سعید بن المسیب پر بھی فوقیت دی ہے۔ ان کے اس علمی کمالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان کے اس فتویٰ پر غور کریں۔

۷-۸-امام حسن بصری متوفی ۱۱۰ھ و امام محمد بن سیرین متوفی ۱۱۰ھ

حدثنا ابوبكر قال: نا اسماعيل بن علية، عن ايوب، عن الحسن و محمد انهما قالا: طلاقه جائز و يوجع ظهره" (مصنف ابن ابی شیبہ ۴/۳۰)

ترجمہ: ایوب راوی ہیں کہ امام حسن اور محمد ابن سیرین دونوں نے کہا سکران کی طلاق واقع ہے اور اس پر حد شرب جاری ہوگی۔

حدثنا ابو بكر قال: نا ابن ادريس، عن هشام، عن الحسن و محمد انهما قالا: طلاقه جائز" (ایضاً)

عبدالرزاق، عن معمر، عن ايوب، عن الحسن و ابن سيرين سمعهما يقولان: يجوز طلاق السكران و يجلد جلدا" (مصنف عبدالرزاق ۷/۸۲)

حدثنا سعید قال: نا ھشیم قال: انا یونس، عن الحسن وابن سیرین انھما کانا یُجیزان طلاق السکران ویریان ان یضرب الحد“ (سنن سعید بن منصور القسم الاول من المجلد الثالث، ص: ۲۶۶، الرقم ۱۱۱۰)

حدثنا سعید قال: نا حزم بن ابی حزم قال: سمعت الحسن وسأله رجل فقال یا ابا سعید رجل طلق امرأته البارحة ثلثا وھو شارب؟ فقال: یجلد ثمانین وبرأت منه“ (ایضا الرقم ۱۱۱۰)

ترجمہ: حزم بن ابی حزم بیان کرتے ہیں کہ میں نے امام حسن بصری سے سنا اس حال میں کہ ان سے ایک شخص نے مسئلہ پوچھا کہ ایک شخص گذشتہ رات پینے کی حالت میں اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیدی، تو انھوں نے فرمایا کہ اسے اَسّی کوڑے مارا جائے گا اور اس کی بیوی اس سے علاحدہ ہوگئی۔

فائدہ: علمی ودینی شخصیتوں کی ادنیٰ معلومات رکھنے والا بھی امام حسن بصری، اور امام محمد ابن سیرین کے فضائل وکمالات سے یک گونہ واقفیت رکھتا ہے یہ دونوں بزرگ حدیث وفقہ میں امامت کے درجہ پر فائز تھے اور دونوں سکران کی طلاق کے وقوع پر متفق ہیں۔

۹- فقیہ حُمید بن عبدالرحمٰن حمیری بصری معاصر امام حسن بصری وابن سیرین

اخبرنا ابوبکر قال: نا ابن مھدی، عن قتادة، عن حمید بن عبدالرحمن قال: یجوز طلاق السکران“ (مصنف ابن ابی شیبہ ۴/۳۰)

قتادہ روایت کرتے ہیں کہ حمید بن عبدالرحمٰن نے کہا کہ سکران کی طلاق واقع ہوجائیگی۔

فائدہ: حمید بن عبدالرحمٰن حمیری بصری کے سن وفات کی صراحت نظر سے نہیں گزری البتہ حافظ ابن حجر نے تقریب التہذیب میں انھیں امام حسن بصری اور محمد ابن سیرین کے معاصرین میں شمار کیا ہے۔ علمائے رجال نے انھیں ثقہ اور تابعی بتایا ہے۔ امام ابن سیرین ان کے بارے میں کہتے ہیں ”ھو افقه من اھل البصرة“ علمائے بصرہ میں یہ سب سے بڑے فقیہ تھے۔ اور افقہ من اہل البصرہ کا بھی یہی مسلک ہے کہ سکران کی طلاق واقع ہوجاتی ہے۔

۱۰- عطاء بن ابی رباح متوفی ۱۱۴ھ

۱- عبدالرزاق، عن ابن جریج، عن عطاء قال یجوز طلاق السکران، انه لیس کالمریض المغلوب علی عقله انما اتی ما اتی هو یعلم انه یقول ما لا یصلح و یعلمه" (مصنف عبدالرزاق ۷/۸۲)

ترجمہ: مشہور حافظ حدیث عبدالملک ابن جریج امام عطاء سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا سکران کی طلاق واقع ہو جائیگی۔ بلاشبہ وہ بربنائے مرض مغلوب العقل کے حکم میں نہیں ہے اس نے تو شراب یہ جانتے بوجھتے پی ہے کہ وہ پینے کے بعد ایسی باتیں کہے گا جو اس کے مصالح و بہتری کے خلاف ہوں گی اور اس حالت میں بھی جو کہتا ہے اس کو جانتا ہے۔

۲- حدثنا سعید قال: نا هشیم، قال: انا حجاج عن عطاء انه یقول بجواز طلاق السکران و ما اتی من حد فی سکره اقیم علیه" (سنن عید بن منصور القسم الاول من المجلد الثالث، ص: ۲۶۶)

ترجمہ: قاضی حجاج بن ارطاۃ امام عطاء سے روایت کرتے ہیں کہ وہ سکران کی طلاق کے وقوع کے قائل تھے اور فرماتے تھے کہ بحالت نشہ موجب حد جو کام بھی کرے گا اس کی حد اس پر جاری کی جائے گی۔

۳- حدثنا ابوبکر قال: قال ابومعاویة، عن حجاج، عن عطاء انه کان یجیز طلاق السکران" (مصنف ابن ابی شیبه ۴/۳۰)

تنبیہ: حجاج بن ارطاۃ بہ ہمہ کمالات محدثین کے نزدیک سئی الحفظ ہیں۔ لیکن ان کے قوی متابع ابن جریج موجود ہیں جیسا کہ مصنف عبدالرزاق کی روایت سے ظاہر ہے۔ اور سئی الحفظ کی روایت متابع وشواہد سے قوی اور لائق استدلال ہو جاتی ہے۔

فائدہ: امام عطاء بن رَباح فقیہ مکہ معظّمہ امام ابوحنیفہؒ کے استاذ حدیث ہیں امام صاحب فرماتے ہیں کہ جن علماء سے میری ملاقات ہوئی ان میں عطاء بن رباح سے افضل میں نے کسی کو نہیں پایا۔ تمام علمائے مکہ پر فتویٰ میں فوقیت رکھتے تھے حتیٰ کہ حضرت عبداللہ

بن عباس اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم کے پاس جو لوگ کوئی مسئلہ معلوم کرنے حاضر ہوتے تو دونوں بزرگ فرماتے کہ تم ہمارے پاس مسئلہ پوچھنے آتے ہو حالانکہ تم میں عطاء موجود ہیں۔ امام عطاء کا اپنا خود بیان ہے کہ میں نے سو صحابہ کو پایا ہے۔ اور آپ نے دیکھا کہ یہ جلیل القدر تابعی اور عظیم محدث وفقیہ بھی سکران کی طلاق کو واقع مانتے ہیں اور صاف لفظوں میں بیان کرتے ہیں کہ کسی مرض کی بناء پر مغلوب العقل کے حکم پر بالقصد شراب پی کر بے خود ہو جانے والے کا قیاس نہیں کیا جاسکتا کیوں کہ یہ جانتا ہے کہ شراب میں دھت ہو جانے کے بعد میں کچھ بھی کرسکتا ہوں پھر بھی وہ اسے استعمال کرتا ہے۔ اس لیے مریض کی طرح یہ شرعاً معذور نہیں سمجھا جاسکتا۔

۱۱- حکم بن عتیبہ کندی متوفی ۱۱۵ھ

حدثنا ابوبکر قال: نا هشيم، عن اسماعيل بن سالم، عن الحكم قال: من طلق فی سكر من الله فليس طلاقه بشیء و من طلق بسكر من الشيطان فطلاقه جائز“ (مصنف ابن ابی شیبہ ۴/۳۱ وسنن سعید بن منصور القسم الاول من المجلد الثالث، ص:۲۶۹)

ترجمہ: اسماعیل بن سالم روایت کرتے ہیں کہ حکم بن عتیبہ نے فرمایا کہ جس نے منجانب اللہ سکر کی بناء پر طلاق دی اس کی طلاق کا اعتبار نہیں اور جس نے شیطان کی جانب سے نشہ کی حالت میں طلاق دی تو وہ واقع ہو جائے گی۔

مطلب یہ ہے کہ کسی مرض کی بنا پر مغلوب العقل ہو جانے کی حالت میں دی گئی طلاق واقع نہیں ہوگی اور شراب حرام پی کر مست ہو جانے کی حالت میں دی گئی طلاق واقع ہو جائے گی۔ امام عطاء اور حکم بن عتیبہ کے اقوال کا حاصل ایک ہی ہے صرف تعبیر کا فرق ہے۔

۱۲- میمون بن مہران جزری متوفی ۱۱۷ھ

حدثنا ابوبکر قال: نا وكيع، عن جعفر، عن ميمون قال: يجوز طلاقه“

(مصنف ابن ابی شیبہ ۴/۳۰)

ترجمہ: جعفر بن برقان جزری قاضی میمون بن مہران سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے کہا سکران کی طلاق واقع ہوجائے گی۔

فائدہ: میمون بن مہران، حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے جزیرہ کے منصب قضاء پر فائز تھے جس سے ان کی علمی و شخصی ثقاہت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

۱۳- قتادۃ بن دِعامہ متوفی ۱۱۸ھ

۱- عبدالرزاق، عن معمر، عن قتادة قال: يجوز طلاقه، ويجلد جلدًا" (مصنف عبدالرزاق ۸۲/۷)

ترجمہ: معمر روایت کرتے ہیں کہ قتادہ نے کہا سکران کی طلاق واقع ہوجائے گی اور شراب نوشی کی حد میں اسے کوڑا مارا جائے گا۔

فائدہ: حافظ حدیث قتادہ فرمایا کرتے تھے کہ اذا اجتمع لی اربعة لم التفت الی غيرهم ولم ابال من خالفهم الحسن، سعيد بن المسيب، ابراهيم، عطاء. یعنی جب مجھے امام حسن بصری، سعید بن المسیب، امام ابراہیم نخعی اور عطاء بن ابی رباح کی متفقہ بات مل جاتی ہے تو پھر میں کسی اور کی جانب التفات نہیں کرتا اور نہ مجھے اس کی پرواہ ہوتی ہے کہ کون ان کا مخالف ہے۔

اوپر بیان کردہ تفصیلات میں آپ ملاحظہ کرچکے ہیں کہ مسئلہ زیر بحث میں یہ چاروں ائمہ حدیث وفقہ متفق الرائے ہیں چنانچہ یہی بات قتادہ بھی کہہ رہے ہیں۔

۱۴- امام محمد بن مسلم ابن شہاب زہری متوفی ۱۲۴ھ

۱- حدثنا ابوبكر قال: نا عيسى بن يونس، عن الاوزاعى، عن الزهرى قال: اذا طلق واعتق جاز عليه، وأقيم عليه الحدّ" (مصنف ابن ابی شیبہ ۳۱/۴)

ترجمہ: امام اوزاعی امام ابن شہاب زہری سے نقل کرتے ہیں کہ انھوں نے کہا سکران جب طلاق دے گا اور غلام آزاد کرے گا تو یہ دونوں نافذ ہوں گے اور اس پر حد

قائم کی جائے گی۔ یعنی شراب نوشی پر اسے اسّی کوڑے مارے جائیں گے۔

۲- عبدالرزاق، عن معمر، عن الزهری قال: یجوز طلاقه وعتاقه و لا یجوز شراءه و لا بیعه و لا نکاحه" (مصنف عبدالرزاق ۸۲/۷)

ترجمہ: سکران کی طلاق نافذ ہوجائیگی اور اس کی خرید و فروخت اور نکاح صحیح نہیں ہوگا۔

۳- عبدالرزاق عن ابن جریج، عن ابن شهاب قال: یجوز الطلاق للسکران لانه یشرب الخمر وقد نهی الله عنها ولا یجوز هبته و لا صدقته" (مصنف عبدالرزاق ۸۳/۷)

ترجمہ: ابن جریج بیان کرتے ہیں کہ امام زہری نے کہا سکران کی طلاق واقع ہوجائے گی کیونکہ اس نے شراب پی ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اس کے پینے سے منع فرمایا ہے اور اس کا ہبہ اور صدقہ درست نہیں ہوگا۔

جمہور ائمہ مجتہدین کا مسلک

حضرات صحابہ اور تابعین رضوان اللہ علیہم اجمعین سے مروی ان آثار کی روشنی میں جمہور ائمہ مجتہدین وفقہائے محدثین کا مسلک یہی ہے کہ سکران کی طلاق واقع اور نافذ ہوتی ہے۔ چنانچہ امام طحاوی احناف کا مسلک ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

قال اصحابنا طلاق السکران وعقوده و احکام افعاله ثابتة کافعال الصاحی الا الردة فانه اذا ارتد لا تبین منه امرأته استحسانا" (مختصر اختلاف الفقہاء ۴۳۰/۲، الرقم ۴۳۱)

ہمارے فقہائے احناف قائل ہیں کہ سکران کی طلاق اس کے عقود اور دیگر کاموں کے احکام، صاحی (جسے نشہ نہ ہو) کے افعال کی طرح ثابت اور درست ہیں البتہ اس کی ردت (اسلام سے پھر جانا) کا اعتبار نہیں لہٰذا بحالت نشہ جب کوئی مرتد ہوجائے تو استحساناً اس کی بیوی اس سے الگ نہ ہوگی۔

امام مالک نے خود مؤطا میں اپنا اور جمہور اہل مدینہ کا مسلک ''وعلی ذالک الامر عندنا'' کے الفاظ سے ذکر کر دیا ہے۔ حافظ ابن عبدالبر اپنی مشہور و جامع کتاب ''الاستذکار'' میں لکھتے ہیں:

قال ابوعمر: اختلف اهل المدينة وغيرهم فى طلاق السكران فاجازه والزمه اياه جماعة من العلماء منهم سعيد بن المسيب وسليمان بن يسار ومجاهد وابراهيم، والحسن، وابن سيرين وميمون بن مهران وحميد بن عبدالرحمن الحميرى وشريح القاضى والشعبى، والزهرى والحكم بن عتيبة... واليه ذهب مالك وابوحنيفة واصحابهما والثورى، والاوزاعى وابوعبيد وعن الشافعیؒ فى ذلك روايتان احدهما مثل قوله مالك فى ان طلاقه لازم فى حال سكره وهو الاشهر" (۱۸/۱۶۰-۱۶۱)

اہل مدینہ وغیرہ کا طلاق سکران کے بارے میں اختلاف ہے۔ علماء کی ایک جماعت نے سکران پر اس کی طلاق کو نافذ و لازم کیا ہے سعید بن المسیب، سلیمان بن یسار، مجاہد، ابراہیم نخعی، حسن بصری، ابن سیرین، میمون بن مہران، حمید بن عبدالرحمٰن حمیری، قاضی شریح شعبی، زہری اور حکم بن عتیبہ کا یہی مذہب ہے۔

اور اسی مذہب کو مالک، ابوحنیفہ اور ان دونوں کے اصحاب وتلامذہ نے اختیار کیا ہے۔ امام شافعیؒ سے اس بارے میں دو قول منقول ہیں جن میں ایک امام مالک کے قول کی طرح ہے کہ بحالت سکر اس کی دی ہوئی طلاق نافذ و لازم ہوگی اور یہی امام شافعی کا زیادہ مشہور قول ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی شافعی اپنے امام کا مذہب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"عن الشافعى قولان المصحح منهما وقوعه" (فتح الباری ۹/۴۸۹)

امام شافعیؒ کے دو قول ہیں ان میں "وقوع طلاق" کے قول کی تصحیح کی گئی ہے۔

علاوہ ازیں امام بغوی نے شرح السنہ میں اسی قول کو امام شافعی کا ظاہر مذہب قرار دیا ہے۔ (۶/۲۲۳)

اور امام احمد بن حنبلؒ کے مذہب کو فقہ حنبلی کی مشہور محققانہ کتاب "المغنی" میں ان الفاظ کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

وعن ابى عبدالله رحمه الله فى السكران روايات... رواية يقع الطلاق

... اختارها ابوبكر الخلال والقاضى وهو مذهب سعيد بن المسيب... قول النبى صلى اللّٰه عليه وسلم: كل الطلاق جائز الا طلاق المعتوه، ومثل هذا عن علي ومعاوية وابن عباس قال ابن عباس طلاق السكران جائز. ان ركب معصية من معاصى اللّٰه نفعه ذلك؟ ولان الصحابة جعلوه كالصاحى بالقذف بدليل ماروى ابووبره (وفى البيهقى ابن وبره، قاسمی) الكلبى قال ارسلنى خالد الى عمر فاتيته فى المسجد ومعه عثمان وعلى وعبدالرحمن وطلحة والزبير فقلت ان خالدا يقول ان الناس انهمكوا في الخمر وتحاقر والعقوبة فقال عمر هٰولاء عندك فسلهم، فقال على: نراه اذا سكر هذى واذا هذى افترىٰ وعلى المفترى ثمانون، فقال عمر: ابلغ صاحبك ماقال، فجعلوه كالصحاحى، ولانه ايقاع للطلاق من مكلف غير مكرَہ صادف ملكه فوجب ان يقع“

والرواية الثانية لايقع طلاقه اختارها ابوبكر عبدالعزيز وهو قول عثمان رضى الله عنه الخ“ (۷/۲۸۹)

ابوعبداللہ یعنی امام احمدؒ سے طلاق سکران کے بارے میں تین قول ہیں: ایک روایت میں وقوع طلاق کا قول منقول ہے۔ اسی کو فقہ حنبلی کے مدون امام ابوبکر خلال اور قاضی اسماعیل بن اسحاق نے اختیار کیا ہے۔ اور یہی سعید بن المسیب وغیرہ...کا مذہب ہے۔ (اس مذہب کے دلائل بیان کررہے ہیں)

۱- کیونکہ نبی کریم...... نے فرمایا ہے کہ مغلوب العقل کے علاوہ ساری طلاقیں واقع ہوجاتی ہیں۔ اس حدیث کے ہم معنی حضرت علی، معاویہ اور ابن عباس رضی اللہ عنہم کے اقوال بھی مروی ہیں۔ ابن عباس فرماتے ہیں کہ سکران کی طلاق واقع ہوجائے گی۔ بیشک اس نے اللہ کی معصیت کا ارتکاب کیا ہے تو یہ معصیت اسے کیوں کر نفع دے گی۔

۲- صحابۂ کرام نے سکران کو حکم قذف میں یعنی اس شخص کے درجہ میں رکھا ہے جو پورے ہوش وہواس کے ساتھ کسی پر زنا کا اتہام لگائے۔ جیسا کہ ابووبرہ کلبی روایت کرتے ہیں کہ مجھے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی خدمت

میں بھیجا تو میں ان کی خدمت میں مسجد میں حاضر ہوا، ان کے پاس حضرت عثمان، علی، عبدالرحمٰن بن عوف، طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہم تھے۔ میں نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے عرض کیا کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ لوگ شراب نوشی میں منہمک ہوتے جارہے ہیں اور (موجودہ) سزا کو حقیر و کمتر سمجھ رہے ہیں؟ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا یہ اکابر صحابہ تمہارے پاس ہیں ان سے معلوم کرلو، تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ شرابی جب شراب پیتا ہے تو بکواس کرنے لگتا ہے اور اس بکواس میں افترا پردازی بھی کرتا ہے اور مفتری کی سزا اسّی کوڑے ہیں (لہٰذا شرابی کو بھی اسّی کوڑے مارے جائیں) تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مجھ سے فرمایا کہ خالد بن ولید کو یہ بات پہنچادو۔ اس روایت سے معلوم ہوا کہ ان اکابر صحابہ نے سکران کو صاحب ہوش وحواس کے درجہ میں رکھا ہے۔

۳- طلاق سکران اس لیے بھی واقع ہوجائے گی کہ یہ طلاق مکلّف غیر مکرہ کی جانب سے محل طلاق میں واقع کی گئی ہے لہٰذا اصولاً یہ نافذ ولازم ہوگی۔

اور امام احمد کی دوسری روایت یہ ہے کہ سکران کی طلاق واقع نہیں ہوگی اسی کو ابوبکر عبدالعزیز حنبلی نے اختیار کیا ہے اور یہی حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔

فقہ حنبلی کی اہم ترین کتاب شرح المقنع میں ہے:

ومن شرب ما یزیل عقله لغیر حاجة ففی صحة طلاقه روایتان احدها یقع وهو المذهب (۱۳۳/۴)

جو شخص بغیر کسی حاجت کے ایسی چیز کو نوش کرے جو عقل کو زائل کردیتی ہے تو ایسے شخص کی طلاق کے وقوع وعدم وقوع کے بارے میں دو روایتیں ہیں ایک روایت یہ ہے کہ طلاق واقع ہوجائے گی اور یہی مذہب ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اگرچہ مذہب حنبلی میں سکران کی طلاق کے بارے میں دو روایتیں ہیں لیکن حنابلہ کا مذہب یہی ہے کہ طلاق واقع ہوجائے گی۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح اور روشن ہوگئی کہ چاروں امام، ابوحنیفہؒ، مالکؒ، شافعیؒ

اور احمدؒ بن حنبل کا متفقہ مذہب یہی ہے کہ سکران کی طلاق واقع ہو جاتی ہے۔

ان چاروں ائمہ متبوعین کے علاوہ امام سفیان ثوریؒ، امام اوزاعیؒ، امام ابن ابی لیلیٰ، امام ابن شبرمہ، امام حسن بن حیی، امام سلیمان بن حرب وغیرہ فقہائے محدثین کا بھی یہی مذہب ہے۔

ایک ایسا مسئلہ جس کی پشت پر حضرات صحابہ اور تابعین کے صریح آثار واقوال اور فقہائے مجتہدین واکابر محدثین کی واضح تصریحات ہیں اور عہد صحابہ سے امت کا سواد اعظم جس پر عمل کرتا آ رہا ہے۔ اسے یک لخت کالعدم قرار دے کر اس کے برعکس مرجوح قول کی تشہیر واشاعت کہاں کا تفقہ ہے۔

شراب نوشی کی کثرت سے سزا میں زیادتی

جب کہ المغنی میں مذکور ابن وبرہ کلبی کی روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ شراب میں ابتلاء کی کثرت پر عہد فاروقی میں حضرات صحابہ نے اجماعا سزا میں سختی کردی اور چالیس کوڑے کے بجائے اس کی حد میں چالیس کا مزید اضافہ کر کے اسّی کر دیا۔ ابن وبرہ کلبی کی اس روایت کو امام طحاوی نے شرح معانی الآثار ۲/ ۸۸، اور امام بیہقی نے سنن الکبریٰ ۸/ ۳۲۰ میں ذکر کی ہے۔ علاوہ ازیں حضرت سائب بن یزید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے ”قال كنا نؤتى بالشراب فى عهد رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم وفى عهد ابى بكر وصدر من امرة عمر يعنى فنضر بهم بايدينا ونعالنا واردیتنا حتى كان صدرا من امرة عمر رضى اللّٰه عنه فجلد اربعين، حتى اذا عتوافيه وفسقوا جلد ثمانين“ رواه البخارى فى الصحيح عن مكى بن ابراهيم، سنن الكبرىٰ ۸/ ۳۱۹.

حضرت سائب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ عہد نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام اور عہد صدیقی نیز عہد فاروقی کے آغاز میں ہمارے پاس شرابی لایا جاتا تو ہم اسے ہاتھوں، جوتوں اور اپنی چادروں کو لپیٹ کر اس سے مارتے (یعنی کوئی متعین حد نہیں تھی كيف ما اتفق اس کی پٹائی کر دی جاتی تھی) پھر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اپنی خلافت کے

ابتدائی زمانہ میں چالیس کوڑے مارے یہاں تک کہ جب لوگ شراب نوشی میں کثرت سے مبتلا ہونے لگے اور اس میں حد سے گزر گئے تو حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اسّی کوڑے مارے۔

صحیح بخاری کی اس روایت میں بصراحت مذکور ہے کہ شراب نوشی میں کثرت ابتلاء کی بناء پر اس کی حد میں تشدید اور زیادتی کر دی گئی۔

مگر آج کے دل دادگان تجدد معاشرے میں شراب نوشی کی پھیلی ہوئی وباء کو بنیاد بنا کر الٹے اس عدوان وسرکشی کے عادی مجرموں کو اپنی خودساختہ ضرورت کے عنوان سے تخفیف و سہولت کا تحفہ پیش کر رہے ہیں۔ ہمارے یہ متجددین علماء آخر اس بات کو کیوں نہیں سوچتے کہ ایک ایسا مسئلہ جس پر صدیوں سے برصغیر میں آباد مسلمان عمل کرتے چلے آرہے ہیں۔ ان کے اس فیصلہ سے کیا ان میں انتشار نہیں پیدا ہوگا اور امت کی رہی سہی اجتماعیت پارہ پارہ نہیں ہو جائے گی۔ غالباً ایسے ہی لوگوں کے بارے میں حافظ ابن تیمیہؒ کو یہ لکھنا پڑا تھا:

فان الاعتصام بالجماعة والائتلاف من اصول الدين، والفرع المتنازع فيه من الفروعية الخفية فكيف يقدح فى الاصل بحفظ الفرع وجمهور المتعصبين لا يعرفون من الكتاب والسنة الا ما شاء الله (مجموع فتاویٰ شیخ الاسلام، ۲۲/۲۵۴)

جماعت مسلمین سے رابطہ اور پیوستگی دین کے اصول میں سے ہے اور جس مسئلہ میں اختلاف ونزاع کیا جارہا ہے وہ خفی فرعی مسئلہ ہے تو فرع کی حفاظت میں اصل کو کیونکر مجروح کیا جاسکتا ہے مگر اکثر متعصبین کتاب وسنت کی معرفت سے عاری ہیں، الا ماشاءاللہ۔

وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمين والصلوٰة والسلام على خاتم الانبياء والمرسلين.

☆ ☆ ☆

حرمت مصاہرت

الحمد للّٰہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ الکریم وعلی آلہ واصحابہ اجمعین . اما بعد :

فطرتِ انسانی کی رعایت

دنیا کے مذاہب میں اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس کی تعلیمات و ہدایات انسانی زندگی کے تمام گوشوں کا احاطہ کئے ہوئے ہیں، مرد اور عورت کا باہمی جنسی تعلق جو ایک فطری و طبعی عمل ہے اسلام، زندگی کے اس مرحلہ میں بھی انسان کو آزاد نہیں چھوڑ دیتا کہ وہ جس طرح چاہے اور جس سے چاہے یہ رشتہ استوار کر لے اور خواہش کے مطابق جب چاہے ناطہ توڑ لے بلکہ اسلام میں اس کا ایک مکمل نظام ہے جس میں پوری وضاحت سے بتایا گیا ہے کہ اس رشتہ کو کس طرح جوڑا جائے اور اگر کسی ناگزیر مجبوری کی بنا پر اس رشتہ کو باقی نہیں رکھا جاسکتا تو اسے کیسے ختم کیا جائے۔ نیز پوری تفصیل کے ساتھ یہ بھی متعین کر دیا گیا ہے کہ زندگی کی رہ گزر میں انسانی فطرت کے مطابق کسے رفیق سفر بنایا جاسکتا ہے اور کسے نہیں، ان ساری تفصیلات کے مجموعہ کو آج کی اصطلاح میں ''اسلام کا ازدواجی نظام'' سے تعبیر کیا جاتا ہے اور اس کے الگ الگ شعبہ اور حصہ کو نظام نکاح، نظام طلاق، اور نظام حرمت کا عنوان بھی دیا جاسکتا ہے۔ آج کی صحبت میں ازدواجی نظام کے آخری شعبہ یعنی نظام حرمت پر ہم اپنے قارئین سے کچھ گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔

اس بات سے کون واقف نہیں کہ ہماری معاشرتی زندگی گوناگوں رشتوں اور قرابتوں کے گرد گھومتی ہے اور ہر فرد بشر ان رشتوں کی زنجیر میں جکڑا ہوا ہے۔ جن کا پاس و

لحاظ انسانی فطرت کا خاصہ ہے، ایک سلیم الفطرت انسان کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ انھیں یکسر نظر انداز کر دے، فطرت انسانی یہ بھی جانتی و مانتی ہے کہ ان رشتوں میں بعض رشتے ایسے ہیں جو اپنے اندر ایسا تقدس اور عزت واحترام کا پہلو رکھتے ہیں کہ طبع سلیم ایسے اہل قرابت اور رشتہ داروں سے ازدواجی اور جنسی تعلق کو گوارا نہیں کرتی اور اسے انسانی شرافت ہی نہیں بلکہ خود انسانیت کے منافی باور کرتی ہے۔

چنانچہ اسلام نے آدمی کی اصل فطرت سے ہم آہنگ اس کے صالح جذبات کی رعایت ملحوظ رکھتے ہوئے اس شعبہ سے متعلق ایسا قانون اور ضابطۂ عمل وضع کیا ہے کہ اگر علم وانصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو اس اعتراف میں ادنیٰ تردد نہیں ہوگا کہ اس باب میں اس سے جامع اور بہتر قانون سے دنیائے انسانیت نا آشنا ہے۔

محرمات کی تفصیل

جن قرابت داروں سے ازدواجی تعلق قائم کرنا اسلام کی نظر میں ممنوع اور حرام ہے انہیں تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

(۱) محرمات نسبیۃ (۲) محرمات رضاعیۃ (۳) محرمات بالمصاہرت

(۱) **محرمات نسبیۃ** : یعنی جن عورتوں سے نسبی رشتہ ہے ان میں حسب تصریح قرآن حکیم سات رشتہ کی عورتیں ایسی ہیں کہ ان کے رشتہ کے احترام میں ان سے ازدواجی تعلق قائم کرنا ممنوع اور حرام ہیں۔ یہ سات عورتیں یہ ہیں:

(۱) مائیں۔ (اس میں سب اصول آ گئے یعنی ماں کی ماں نانی پرنانی وغیرہ)

(۲) بیٹیاں (ان میں سب فروع داخل ہیں، یعنی لڑکی کی لڑکی وغیرہ نیچے تک)

(۳) بہنیں (خواہ سگی ہوں یا باپ شریک یا ماں شریک)

(۴) پھوپیاں (اس میں باپ اور باپ سے اوپر دادا وغیرہ کی تینوں قسموں کی بہنیں داخل ہیں)

(۵) خالائیں (اس میں ماں اور ماں سے اوپر نانی وغیرہ کی تینوں قسموں کی بہنیں آ گئیں)

(٦) بھتیجیاں (تینوں قسموں یعنی سگے، علاتی یا اخیافی بھائیوں کی اولاد در اولاد سب شامل ہیں)

(۷) بھانجیاں (اس میں بھی تینوں قسموں کی بہنوں کی اولاد بواسطہ و بلاواسطہ سب آگئیں)۔

اس بات سے کسے انکار ہوسکتا ہے کہ اوپر مذکور محترم خونی رشتوں سے متصف ایسی عورتیں ہیں جن سے کوئی صحیح الدماغ، سلیم الفطرت ازدواجی تعلق قائم کرنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔ ذرا سوچئے کوئی بیٹا، اپنی ماں کو باپ اپنی بیٹی کو بیوی بنانے پر آمادہ ہوسکتا ہے، اسی پر بقیہ مذکورہ رشتوں کو قیاس کیا جاسکتا ہے۔

(۲) **محرمات رضاعیہ** : یعنی جن عورتوں نے دودھ پلایا ہے یہ عورتیں اگرچہ حقیقی مائیں نہیں ہیں مگر حرمتِ نکاح میں والدہ ہی کے حکم میں ہیں لہٰذا ماں کی طرح اپنی اناّ سے بھی نکاح کرنا حرام ہے۔ یہاں یہ بات ملحوظ رہنی چاہئے کہ یہ نکاح کی حرمت اسی وقت ثابت ہوگی جبکہ بچپن میں جو دودھ پینے کا زمانہ ہوتا ہے اس میں پیا ہو، اور دودھ شریک بہنوں سے بھی نکاح حرام ہے (یعنی جن کی حقیقی یا رضاعی ماں کا تم نے دودھ پیا ہے وہ تمہاری رضاعی بہنیں ہوجائیں گی ان سے بھی سگی بہن کی طرح نکاح ہمیشہ کے لئے حرام ہوگا) قرآن پاک میں تو صرف رضاعی ماں، بہن ہی کا ذکر ہے، لیکن جس طرح نسبی رشتہ کی سات عورتوں سے (جن کا ذکر اوپر آچکا ہے) نکاح ہمیشہ کے لئے حرام ہے اسی طرح رضاعی رشتہ کی بھی سات قسم کی عورتوں سے نکاح ممنوع ہوگا۔ نبیؐ پاک ...... کا ارشاد ہے : ”یحرم من الرضاعة ما یحرم من النسب“ یعنی دودھ پینے کے رشتہ سے وہ سب عورتیں حرام ہوجاتی ہیں جو نسبی رشتہ کی بناء پر حرام ہیں۔

(۳) **محرمات بالمصاھرت** : یعنی سسرالی رشتہ کی بناء پر نکاح کی حرمت، قرآن نے اس سلسلہ کی چار عورتوں کا ذکر کیا ہے:

(۱) باپ کی بیوی یعنی سوتیلی ماں۔

(۲) بیٹے کی بیوی یعنی بہو، بیٹے کے ساتھ ”مِنْ اَصْلاَبِکُمْ“ کی قید سے لے پالک کی بیویاں اس حکم سے نکل گئیں لہٰذا ان سے نکاح جائز ہوگا۔

(۳) بیوی کی ماں یعنی خوشدامن (اس حکم میں بیوی کے سب مؤنث اصول یعنی بیوی کی دادی وغیرہ شامل ہیں)

(۴) اس بیوی کی بیٹی جس سے ہمبستری ہو چکی ہے، یعنی کسی عورت سے صرف نکاح کر لینے سے اسکی لڑکی سے نکاح حرام نہیں ہوگا بلکہ جب اس سے صحبت بھی ہو جائے تب اسکی لڑکی حرام ہوگی۔

نسب، رضاعت (دودھ پینا) اور مصاہرت (سسرالی رشتہ) کی بنیاد پر ثابت حرمت دائمی ہے جو کبھی ختم نہیں ہوگی، ان تینوں قسم کی حرمت میں تمام فقہاء، محدثین اور اہل سنت والجماعت کا اتفاق ہے۔

حرمت بالمصاہرت کی تفصیل میں دو نقطۂ نظر

البتہ فقہائے اسلام کا مصاہرت کی بناء پر حرمت کی تفصیل میں نقطۂ نظر مختلف ہے۔ ایک جماعت کی رائے یہ ہے کہ ناجائز و حرام صحبت یعنی زنا سے بھی یہ حرمت ثابت ہو جائے گی اور جس عورت سے یہ حرام کاری کی گئی ہے اس کے اصول و فروع یعنی مائیں اور بیٹیاں زانی پر ہمیشہ کے لئے حرام ہو جائیں گی ان سے ازدواجی تعلق قائم کرنا صحیح نہ ہوگا، جبکہ دوسری جماعت کی رائے یہ ہے کہ زنا سے یہ حرمت ثابت نہیں ہوگی۔ ائمہ اربعہ میں امام اعظم ابوحنیفہؒ، امام احمد بن حنبلؒ پہلی رائے کے قائل ہیں، اور امام مالکؒ و امام شافعیؒ دوسری رائے کو مانتے ہیں۔ (۱)

اختلاف کی بنیاد

اس اختلاف کی بنیاد دراصل سورۂ نساء آیت ۲۲ ''وَلَا تَنْكِحُوا مَا نَكَحَ آبَاءُ كُمْ مِنَ النِّسَاءِ'' (اور نکاح نہ کروان عورتوں سے جن سے تمہارے باپ دادا نے نکاح کیا ہے) میں وارد لفظ ''نکاح'' کے لغوی معنی کے فہم میں اختلاف پر ہے۔ جن فقہاء و محدثین

---

(۱) امام مالکؒ کا اس مسئلہ میں دو قول ہے۔ ایک میں وہ امام اعظم و امام احمد کے موافق ہیں مفسر قرطبی لکھتے ہیں وروی عن مالك ان الزنى يحرّم الام والابنة وانه بمنزلة الحلال (الجامع لاحكام القرآن، ج:۵، ص: ۱۱۴) یہ قول امام مالک کے تلمیذ خاص ابن القاسم سے مروی ہے اور مالکیہ کی اہم ترین کتاب المدونة میں مذکور ہے۔ مگر مالکیہ کے یہاں یہ معمول بہا نہیں ہے۔

کے نزدیک زنا سے حرمت ثابت ہو جاتی ہے وہ کہتے ہیں کہ ''نکاح'' کا اصلی معنی ازروئے لغت وطی یعنی ہمبستری ہے، عقد معنی مجازی ہے اور جو حضرات فقہاء اس حرمت کے قائل نہیں ان کے نزدیک نکاح کا اصلی وحقیقی معنی ''عقد'' ہے اور وطی اس کا معنی مجازی ہے۔ لہٰذا جن حضرات فقہاء کے نزدیک نکاح کا اصلی معنی وطی ہے وہ کہتے ہیں کہ وطی جس صورت میں بھی پائی جائے چاہے نکاح کے ساتھ یا بغیر نکاح کے حرمت ثابت ہو جائے گی۔ اور جن حضرات کے نزدیک عقد کے معنی میں ہے ان کے نزدیک نکاح کے ساتھ جو وطی ہو گی اسی سے حرمت ثابت ہو گی۔

لفظ نکاح کی لغوی تحقیق

خود اہل لغت کا اس کے اصلی معنی کے متعین کرنے میں اختلاف ہے بقدر ضرورت اس اختلاف کی تفصیل ملاحظہ کی جائے۔

(۱) حافظ بدر الدین عینی حنفی عمدۃ القاری شرح بخاری میں لکھتے ہیں:

قال الازهری اصل النكاح فی كلام العرب الوطء وقيل للتزويج نكاح لانه سبب الوطء.

وقال الزجاجی : "هو فی كلام العرب الوطء والعقد جميعًا ... وحقيقته عند الفقهاء علی ثلاثة اوجه حكاها القاضی حسين اصحها انه حقيقة فی العقد مجاز فی الوطئ وهو الذی صححه ابو الطيب وبه قطع المتولی وغيره، الثانی انه حقيقة فی الوطئ مجاز فی العقد وبه قال ابو حنيفة، والثالث انه حقيقة فيهما بالاشتراك" (ج:۲۰، ص:۶۴)

امام لغت ازہری کہتے ہیں کہ کلام عرب میں نکاح کا اصلی معنی ''وطی'' ہے عقد تزویج کو نکاح اسلئے کہا جاتا ہے کہ یہ عقد، وطی کا سبب اور ذریعہ ہے۔ اور امام لغت زجاجی کہتے ہیں کہ کلام عرب میں لفظ نکاح، وطی اور عقد دونوں معنی میں مشترک ہے، اور فقہاء کے یہاں اس لفظ کی حقیقت کے بارے میں تین اقوال ہیں جسے قاضی حسین نے نقل کیا ہے۔

(۱) صحیح تر یہ ہے کہ نکاح معنی عقد میں حقیقت اور معنی وطی میں مجاز ہے۔(۱) اسی قول کو امام ابوالطیب اور متولی وغیرہ فقہائے شافعیہ نے صحیح قرار دیا ہے۔ (۲) لفظ نکاح معنی وطی میں حقیقت اور معنی عقد میں مجاز ہے اسی کے امام ابوحنیفہؒ قائل ہیں، (۳) وطی اور عقد مشترک طور پر دونوں معنی میں حقیقت ہے۔

(۲) حافظ ابن حجر عسقلانی شافعی فتح الباری میں ان الفاظ میں اپنی تحقیق نقل کرتے ہیں:

”النکاح فی اللغة الضم والتداخل و تجوّز من قال انه الضم، قال الفرّاء النُکح اسم للفرج ویجوز کسره، وکثر استعماله فی الوطء و سمی به العقد لکونه سببه وقال ابوالقاسم الزجاجی هو حقیقة فیهما وفی الشرع حقیقة فی العقد، مجاز فی الوطئ علی الصحیح ... وفی وجه للشافعیة کقول الحنفیة انه حقیقة فی الوطء ومجاز فی العقد“ (ج:۹،ص:۱۲۸)

نکاح لغت میں چپکنے اور ایک دوسرے میں داخل ہونے کے معنی میں ہے۔ جن حضرات نے نکاح کو ضم یعنی ملنے کے معنی میں لیا ہے انھوں نے مجاز کو اختیار کیا ہے، امام نحو و لغت فرّا کا بیان ہے لفظ نُکِحَ کا اصلی معنی شرمگاہ کے ہیں، اور وطی کے معنی میں کثرت سے استعمال ہوتا ہے۔ نکاح کو عقد اس لئے کہا جاتا ہے کہ عقد، وطی کا ذریعہ وسبب ہے۔ اور ابوالقاسم زجاجی نے کہا کہ عقد اور وطی مشترک طور پر اس کے دونوں معنی اصلی و حقیقی ہیں، اور شرعی(۲) اصطلاح میں صحیح قول کے مطابق عقد اس کا معنی حقیقی اور وطی معنی مجازی ہے، اور فقہائے شافعیہ کے یہاں ایک قول امام ابوحنیفہ کی تحقیق کے مطابق ہے۔ یعنی یہ

---

(۱) حضرات فقہائے شوافع کے یہاں نکاح کے اصلی معنی میں تین قول ہیں: (۱) اس کا حقیقی معنی وطی ہے نقله حافظ ابن حجر فی فتح الباری، دوسرا قول یہ ہے کہ دونوں معنی میں مشترک ہے۔ حافظ ابن حجرؒ کے نزدیک یہی قول راجح ہے اور تیسرا یہ قول ہے جو قاضی حسین نقل کر رہے اور بتا رہے ہیں کہ حضرات شوافع کے یہاں یہی اصح قول ہے۔

(۲) یعنی اصطلاح فقہاء میں کیونکہ حضرات فقہاء اہل شرع ہیں، اس لئے اصطلاح فقہاء اور اصطلاح شرع دونوں کا مفہوم ایک ہی ہے صرف تعبیر کا فرق ہے۔ یہ بات ملحوظ رہنی چاہئے کہ حضرات فقہاء کی اصطلاحات قرآن حکیم کے زمانۂ نزول کے بعد وضع کی گئی ہیں اگرچہ یہ اصطلاحات قرآن وحدیث اور کلام عرب ہی سے ماخوذ ہیں۔

لفظ معنی وطی میں حقیقی اور معنی عقد میں مجازی ہے۔

(۳) حافظ ابوالعباس القرطبی مالکی اپنی معروف محققانہ تصنیف "المفھم" شرح تلخیص صحیح مسلم میں لکھتے ہیں:

"حقیقة النکاح الوطئ ... وقد اشتھر اطلاقه علی العقد" (ج:۴، ص:۸۰)

وطی نکاح کا اصلی معنی ہے اور عقد میں بھی اس کا بولا جانا مشہور ہے۔

مشہور لغوی عالم ناصر الدین المطرزی لکھتے ہیں:

اصل النکاح الوطء ... ثم قیل للتزوج نکاح مجازا لانه سبب للوطء المباح (المُغرِب ج:۲، ص:۲۲۶) **نکاح کا اصلی معنی وطی ہے پھر شادی کرنے کے معنی میں مجازا استعمال ہونے لگا کیونکہ یہی شادی وطی مباح یعنی جائز ہمبستری کا سبب اور ذریعہ ہے۔**

علامہ مجدالدین فیروز آبادی اللغوی القاموس میں لکھتے ہیں:

النکاح، الوطء والعقد له، **نکاح کا لفظ وطی اور عقد نکاح کے معنی میں ہے۔** موصوف کی تعبیر سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ دونوں معنی میں اسے مشترک مانتے ہیں۔

فقہ اور اصول کے مشہور امام ابوبکر جصاص رازی حنفی اپنی محققانہ تصنیف احکام القرآن میں لکھتے ہیں:

اخبرنا ابوعمر (الزاھد) غلام ثعلب قال : الذی حصلناه عن ثعلب عن الکوفیین والمبرد عن البصریین ان النکاح فی اصل اللغة ھو اسم للجمع بین الشیئین... والجمع انما یکون بالوطء دون العقد اذالعقد لا یقع به جمع لانه قول منھما جمیعًا لایقتضی جمعًا فی الحقیقة فثبت ان اسم النکاح حقیقة فی الوطء مجاز للعقد، والعقد انما سمی نکاحاً لانه سبب یتوصل به الی الوطء.

(مطبوعہ داراحیاء التراث العربی، بیروت ۱۴۱۲ھ، ص:۴۹-۵۰)

ہم سے الشیخ الزاہد ابوعمر ملقب بہ غلام ثعلب نے بیان کیا کہ ہمیں ثعلب کے واسطہ کوفیوں کی اور مبرّد کے بالواسطہ بصریوں کی جو رائے معلوم ہوئی وہ یہ ہے کہ لفظ نکاح اصل لغت میں دو چیزوں کے باہم ملنے کے معنی میں ہے...اور یہ معنی وطی اور ہم بستری میں

پایا جاتا ہے عقد میں نہیں کیونکہ نفس عقد سے جمع وضم (باہم ملنے) کا وقوع وثبوت نہیں ہوتا اس لئے کہ عقد تو زوجین کا قول ہے (یعنی زوجین کا ایجاب وقبول کے الفاظ کا زبان سے ادا کرنے کو عقد کہا جاتا ہے) جو درحقیقت جمع کو چاہتا ہی نہیں(۱) لہٰذا ثابت ہوا کہ اسم نکاح معنی وطی میں حقیقت اور معنی عقد میں مجاز ہے، عقد کو نکاح محض اس بناء پر کہا جاتا ہے کہ یہ وطی تک پہنچنے کا (ایک جائز) وسیلہ وذریعہ ہے۔

نکاح کے لغوی معنی کی اس تفصیل سے ان فقہاء وعلماء کے قول کی وجاہت وقوت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا جو کہتے ہیں کہ لفظ نکاح کی حقیقت لغویہ وطی ہے اور عقد وتزوتج اس کا معنی مجازی ہے۔ بایں ہمہ اس بات سے بھی انکار مبنی بر انصاف نہیں ہوگا کہ اس لفظ کا معنی مجازی یعنی عقد اس کے معنی اصلی یعنی وطی کے مقابلہ میں کتاب وسنت اور کلام شریعت میں کثیر الاستعمال اور زیادہ مشہور ہے، لیکن اس کثرت وشہرت کی بناء پر یہ دعویٰ کرنا بھی صحیح نہیں ہوگا کہ قرآن وحدیث میں لفظ نکاح صرف عقد اور تزوتج کے معنی ہی میں استعمال کیا گیا ہے کیونکہ محققین علمائے تفسیر کے بیان سے واضح ہوتا ہے کہ قرآن مجید کی متعدد آیات میں یہ لفظ اپنے اصلی معنی وطی ہی میں مستعمل ہوا ہے، چنانچہ امام تفسیر ابوعبداللہ محمد بن احمد القرطبی اپنی نہایت مفید قابل فخر کتاب ''الجامع لاحکام القرآن'' میں سورۂ بقرہ آیت ۲۳۰ کی تفسیر کے تحت لکھتے ہیں کہ نحاس نے اپنی کتاب ''معانی القرآن'' میں لکھا ہے:

قال : اهل العلم على ان النكاح هاهنا الجماع، لانه قال "زَوْجاً غَيْرَهٗ" فقد تقدمت الزوجية فصار النكاح الجماع، الا سعيد بن جبير فانه قال النكاح ههنا التزويج الصحيح اذا لم يرد احلالها. (ج:۳،ص:۱۴۸،مطبوعہ احیاء التراث العربی بیروت)

نحاس کا بیان ہے کہ اہل علم کا اس پر اتفاق ہے کہ لفظ نکاح اس آیت میں جماع یعنی ہمبستری کے معنی میں ہے اس لئے کہ آیت میں ''زَوْ جًا غَيْرَه'' فرمایا گیا ہے جس سے معلوم ہوا کہ عقد وتزوتج تو پہلے ہوچکا ہے لہٰذا نکاح وطی اور صحبت کے معنی میں ہوگا، البتہ

---

(۱) کیونکہ الفاظ واقوال ایسے اعراض ہیں جن کے ابتدائی اجزاء تحلیل ہوجانے کے بعد دوسرے اجزاء صادر ہوتے ہیں اس لئے لازمی طور پر یہ جمع کا متقاضی نہیں ہوگا۔

سعید بن جبیر کہتے ہیں کہ نکاح یہاں تزویج صحیح کے معنی میں ہے، جبکہ یہ تزویج وعقد عورت کو پہلے شوہر کے لئے حلال کی نیت سے نہ ہو۔

امام فخر الدین رازی اسی آیت کے تحت لکھتے ہیں:

اختلف العلماء فی ان شرط الوطئ بالسنة او بالکتاب، قال ابومسلم الاصفهانی الامران معلومان بالکتاب وهذا هو المختار.. فقوله "تنکح" یدل علی الوطء وقوله زوجاً یدل علی العقد، واما من یقول ان الآیة غیر دالة علی الوطء وانما ثبت الوطء بالسنة فضعیف. (تفسیر کبیر، ج:۶، ص:۱۱۲، مطبوعہ الاعلام الاسلامیہ ۱۳۱۳ھ)

علماء کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ (جس عورت کو اس کے شوہر نے تین طلاقیں دیدیں اس طلاق دینے والے کے نکاح میں دوبارہ آنے کے لئے کسی اور شخص سے شادی کے بعد ہمبستری کرنے کی جو شرط ہے یہ) شرط حدیث سے ثابت ہے، یا قرآن سے ،ابو مسلم اصفہانی کا قول ہے کہ شادی اور ہمبستری دونوں قرآن سے ثابت ہیں۔ یہی قول مختار ہے...(اپنے معروف اسلوب برہان ودلیل کے ساتھ ابومسلم کے قول کو مختار و راجح ثابت کرنے کے بعد بطور خلاصہ کلام لکھتے ہیں) لہٰذا اللہ تعالیٰ کا قول "تنکح" وطی و ہمبستری پر دلالت کررہا ہے اور ''زوجاً'' کا فرمان عقد وتزویج کے معنی کو بیان کررہا ہے، اور جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ آیت وطی کے معنی کو بیان نہیں کررہی بلکہ وطی کی شرط کا ثبوت حدیث سے ہے ان کا یہ قول ضعیف ہے۔

عصر حاضر کے معروف مفسر شیخ محمد علی صابونی لکھتے ہیں:

وذهب جمهور العلماء والائمة الاربعة المجتهدون الی ان المراد فی قوله تعالیٰ "حَتّٰی تَنْکِحَ زَوْجاً غَیْرَه" الوطء لا العقد فلا تحل للزوج الاول حتیٰ یطأها الزوج الثانی فقد وضّحت السنة المطهرة ان المراد من لفظ النکاح فی الآیة الکریمة هو الجماع لا العقد" (الروائع البیان فی تفسیر آیات الاحکام، ج:۱، ص:۳۳۹)

جمہور علماء اور چاروں ائمہ مجتہدین اس طرف گئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد "حَتّٰی تَنْکِحَ زَوْجاً غَیْرَه" میں تنکح سے مراد وطی ہے عقد نہیں لہٰذا (مطلقۂ ثلاثہ)

سے جب تک دوسرا شوہر وطی نہ کرے پہلے شوہر کیلئے حلال نہیں ہوگی اور حدیث پاک نے وضاحت کردی کہ آیت کریمہ میں لفظ نکاح سے مراد ہمبستری ہے، عقد نکاح نہیں۔

علاوہ ازیں سورۂ نساء آیت ٦ "حَتّٰی اِذَا بَلَغُوْا النِکَاحَ" میں سارے مفسرین و فقہاء نکاح کو حلم یعنی احتلام کے معنی میں لیتے ہیں اور کون نہیں جانتا کہ سونے والا جب خواب میں صورۃ وطی کو دیکھتا ہے تو اسے احتلام پیش آتا ہے۔ اس آیت میں عقد نکاح کا معنی کسی کے نزدیک بھی صحیح نہیں ہے۔

حدیث پاک میں بھی لفظ نکاح ''وطی'' کے معنی میں استعمال ہوا ہے چنانچہ مشہور حدیث ہے کہ آنحضرت...... نے فرمایا: "ولدت من نکاح لا من سفاح" میں وطی حلال (بذریعہ عقد جائز) سے پیدا ہوا ہو وطی حرام سے نہیں۔ اس حدیث سے ایک بات تو یہ ثابت ہوتی ہے کہ لفظ نکاح عقد کے معنی میں بھی بولا جاتا ہے اور دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ لفظ نکاح ''وطی بغیر عقد'' یعنی عقد نکاح کے بغیر ہمبستری پر بھی بولا جاتا ہے۔ اگر اس لفظ میں یہ مفہوم نہ ہوتا تو آپ صرف فرماتے "ولدت من نکاح" لیکن نکاح کے بعد آپ کا "لا من سفاح" فرمانا بتا رہا ہے کہ یہ لفظ ''وطی حرام'' پر بھی بولا جاتا ہے ورنہ اس لفظ کے زیادہ کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔

اسی طرح حائض عورت (ماہواری والی) سے متعلق ایک شرعی حکم کے بیان میں آپ...... نے فرمایا "یحل للرجل من امرأته الحائض کل شيء الا النکاح" اپنی حائض بیوی سے مرد کو ہر چیز حلال ہے سوائے نکاح یعنی وطی کے۔

حدیث و قرآن کے علاوہ عرب کے جاہلی شعراء کے کلام میں بھی لفظ نکاح ہمبستری کے معنی میں کثرت سے استعمال ہوا ہے اگر طوالت اور ناظرین کی عدم دلچسپی کا اندیشہ نہ ہوتا تو اس کے بھی شواہد پیش کئے جاسکتے تھے۔

صحیح بخاری میں مذکور حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی ایک روایت اس مسئلہ میں قولِ فیصل کی حیثیت رکھتی ہے کہ لفظ نکاح مطلق وطی اور عورت سے جنسی عمل کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، یہ جنسی عمل خواہ جائز و حلال طریقہ پر ہو یا ناجائز و حرام طور پر،

روایت کے الفاظ درج ذیل ہیں:

عن ابن شهاب قال: اخبرنی عروة بن الزبير ان عائشة زوج النبی صلی الله عليه وسلم اخبرته ”ان النكاح فی الجاهلية كان علی اربعة انحاء. نكاح منها نكاح الناس اليوم يخطب الرجل الی الرجل وليّته او ابنته فيُصدِقها ثم ينكحها. ونكاحٌ آخرُ كان الرجل يقول لامرأتِه اذا طَهُرت من طَمْثها، ارسلی فلان فاستبضعی منه ويعتزلها زوجها و لا يمسها ابدا حتی يتبين حملها من ذلك الرجل الذی تستبضع منه، فاذا تبين حملُها اصابها زوجها اذا احب، وانما يفعل ذلك رغبة فی نجابة الولد، فكان هذا النكاح نكاح الاستبضاع، ونكاح آخر يجتمع الرهط ما دون العشرة فيدخلون علی المرأة كلهم يصيبها فاذا حملت ووضعت ومرّ ليال بعد ان تضع حملها ارسلت اليهم، فلم يستطع رجل منهم ان يمتنع حتی يجتمعوا عندها تقول لهم: قد عرفتم الذی كان من امركم، وقد ولدتُ، فهو ابنك يا فلان، تسمّی من احبّت باسمه، فيلحق به ولدها لا يستطيع ان يمتنع به الرجل، ونكاح الرابع يجتمع الناسُ الكثير فيدخلون علی المرأة لا تمنع من جاء ها، وهن البغايا كن ينصبن علی ابوابهن راياتِ تكون عَلَمًا، فمن اراهن دخل عليهن، فاذا حملت احداهن ووضعت حملها جمعوا لها و دَعوا لهم القافة، ثم الحقوا ولدها بالذی يَرَون، القافة به ودُعی ابنه لا يمتنع من ذلك، فلما بُعث محمد صلی الله عليه وسلم بالحق هَدَم نكاح الجاهلية كله الا نكاح الناس اليوم“ (فتح الباری شرح بخاری کتاب النکاح، ج:۹،ص:۲۲۸ رقم الحدیث ۵۱۲۷)

حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے بیان فرمایا کہ زمانۂ جاہلیت میں نکاح کے چار طریقے تھے:

(الف) ان میں ایک تو یہی نکاح ہے جو مسلمانوں میں رائج ہے کہ کوئی شخص اپنی زیر کفالت لڑکی یا اپنی بیٹی کے نکاح کے لئے کسی کے پاس منگنی بھیجتا اور پھر متعین مہر پر اس

کا نکاح کر دیتا۔

(ب) نکاح کا دوسرا طریقہ یہ تھا کہ آدمی اپنی بیوی سے اس کے حیض (ماہواری) سے پاک ہو جانے کے وقت کہتا کہ فلاں کے پاس جاؤ اور اس سے جنسی تعلق قائم کرنے کے لئے کہو (چنانچہ عورت کسی بڑے شخص کے پاس جا کر یہ تعلق قائم کرتی) اور اس کا شوہر حمل ظاہر ہونے تک اس سے بالکل الگ رہتا، حمل ظاہر ہو جانے کے بعد جی چاہتا تو اس سے ہم بستر ہوتا، (شوہر کے مطالبہ پر بیوی یہ عمل اس غرض سے کرتی تھی کہ) بچہ باحیثیت اور اچھی نسل سے پیدا ہو۔

(ج) نکاح کا تیسرا طریقہ یہ تھا کہ مردوں کی ایک جماعت جو دس سے کم ہوتی، کسی عورت سے جنسی عمل کرتی، جب حمل ٹھہر جاتا (اور مدت پوری ہونے پر وہ) بچہ جنتی تو چند ایام گذر جانے کے بعد یہ عورت ان سب مردوں کو بلاتی اور بغیر انکار کے وہ سب اس عورت کے پاس جمع ہو جاتے، تو عورت انھیں مخاطب کر کے کہتی کہ اپنے معاملہ کو تو تم سب جانتے ہی ہو، اب میں نے بچہ جنا ہے (اور ان میں سے جس کا چاہتی نام لے کر کہتی) اے فلاں یہ بچہ تمہارا ہے، تو یہ بچہ اسی سے وابستہ ہو جاتا اور نامزد شخص کو مجال انکار نہ ہوتی۔

(د) نکاح کی چوتھی صورت یہ تھی کہ کچھ پیشہ ور عورتیں ہوتیں جو اپنے دروازوں پر بطور علامت کے جھنڈا نصب کئے رہتی تھیں، لوگ حسب خواہش ان کے پاس بلا روک ٹوک جاتے، اس طرح کی کسی عورت کو جب حمل ٹھہر جاتا اور وہ بچہ جنتی تو سب لوگوں کو جمع کیا جاتا اور قیافہ شناس بلایا جاتا وہ اپنے قیافہ کے مطابق اس بچہ کو کسی سے وابستہ کر دیتا اور اسے ناچار اس فیصلہ کو تسلیم کرنا پڑتا تھا۔

پھر جب محمد...... رسول بنا کر بھیجے گئے تو آپ نے دور جاہلیت کے ان سب نکاحوں کو ختم کر دیا صرف اس کو باقی رکھا جو اس وقت مسلمانوں میں رائج ہے۔

عہد جاہلیت میں عورت سے جنسی تعلق قائم کرنے کے ان چاروں طریقوں میں سے پہلے کے علاوہ ظاہر ہے کہ سب طریقے ناجائز و حرام اور از قبیل زنا ہیں۔ پھر بھی انھیں نکاح ہی سے تعبیر کیا گیا ہے۔

مسئلہ زیر بحث کا اصل مستدل

اس مذکورہ تفصیل سے یہ بات اچھی طرح سامنے آ گئی کہ نکاح کا لفظ کلام عرب بالخصوص قرآن وحدیث میں عورت کے ساتھ ہمبستری اور صحبت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ خواہ یہ ہمبستری عقد نکاح کے ساتھ ہو یا بغیر عقد کے، اور اوپر مذکور علمائے لغت اور شارحین حدیث کی عبارتوں سے یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ از روئے لغت کلام عرب میں اس لفظ کا اصلی وحقیقی معنی ''وطی'' اور ہمبستری ہے، تو سورۂ نساء کی آیت **۲۲** ''وَلَا تَنۡكِحُوۡا مَا نَكَحَ آبَاءُ كُمۡ مِنَ النِسَاءِ'' سے حرمت مصاہرت بالزنا (یعنی زنا سے حرمت مصاہرت کے ثبوت) پر استدلال میں کیا تردد ہو سکتا ہے؟ بلاشبہ یہ استدلال اصول فقہ اور عربیت کے موافق بے غبار ہے (یہ الگ بات ہے کہ حضرت امام مالک اور حضرت امام شافعی رحمہما اللہ نے اپنے ذوق اجتہاد سے یہاں بھی ''نکاح'' کو عقد وتزویج کے معنی پر محمول کیا ہے جس کی گنجائش سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے) چنانچہ مشہور ظاہری امام حافظ ابن حزم اس استدلال کی ترجمانی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

قول اللّٰہ عزّ وجلّ ''وَلَا تَنۡكِحُوا مَا نَكَحَ آبَاءُ كُمۡ مِنَ النِسَاءِ''

قال ابو محمد: النكاح فى اللغة التى نزل بها القرآن يقع على شيئين، احدهما الوطئ كيف كان بحرام او بحلال والآخر العقد، فلا يجوز تخصيص بدعوى بغير نص من اللّٰه تعالىٰ او من رسوله صلى اللّٰه عليه وسلم فاى نكاح نكح الرجل المرأة حرة او امة بحلال او حرام فهى حرام على ولده بنص القرآن ... وهذا قول ابى حنيفة و جماعة من السلف. (المحلّٰى كتاب النكاح، ج ١١، ص: ٧٩ رقم المسئلة ١٨٦٦)

ابو محمد (یہ ابن حزم کی کنیت ہے) کہتا ہے نکاح لغت عرب میں جس کے مطابق قرآن نازل ہوا ہے دو معنوں پر واقع ہوا ہے اول ''وطی'' جیسے بھی ہو حرام طریقے پر یا حلال طریقے پر، اور دوسرا عقد، لہٰذا لفظ نکاح میں تخصیص کا دعوی اللہ اور رسول اللہ کی نص کے بغیر

صحیح نہیں ہوگا۔ لہٰذا مرد کسی عورت کے ساتھ جس نوع کا بھی نکاح کر لے (خواہ نکاح وطی یا نکاح عقد) عورت خواہ آزاد ہو یا باندی حلال طور پر یا حرام طور سے یہ عورت مرد کے لڑکے پر بنص قرآن حرام ہو جائے گی یہی امام ابوحنیفہ اور سلف کی ایک جماعت کا قول ہے۔

پھر اس جماعت سلف میں سے حضرت عبداللہ بن عباسؓ، مجاہد، ابراہیم نخعیؒ، ابن معقل، عکرمہ، شعبی، سعید بن المسیب، ابی سلمہ بن عبدالرحمٰن بن عوف، عروہ بن زبیر، اور سفیان ثوری کے آثار و اقوال نقل کئے ہیں جو آئندہ سطور میں مسئلہ زیر بحث سے متعلق احادیث و آثار کے ضمن میں انشاء اللہ پیش کئے جائیں گے۔

حافظ ابوالفرج ابن الجوزی حنبلی لکھتے ہیں:

الزنا يثبت تحريم المصاهرت، واصحابنا يستدلون بقوله تعالىٰ "وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ آبَاءُ كُمْ" والنكاح حقيقة فى الوطئ" (تنقيح تحقيق احاديث التعليق للحافظ ابن عبدالهادى، ج:۳، ص: ۱۸۰)

زنا حرمت مصاہرت کو ثابت کر دیتا ہے، ہمارے علمائے مذہب اس مسئلہ پر اللہ تعالیٰ کے فرمان "وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ" سے استدلال کرتے ہیں، اور وطی لفظ نکاح کی حقیقت لغویہ ہے۔ (اس جملہ سے موصوف نے طریق استدلال کی جانب اشارہ کیا ہے)

محقق ابن قدامہ اپنی عظیم المرتبت تصنیف المغنی میں لکھتے ہیں:

۵۳۵۵ – مسئلة: و وطء الحرام محرم كما يحرم وطء الحلال والشبهة.

يعنى انه يثبت به تحريم المصاهرت فاذا زنىٰ بامرأة حرمت على ابيه وابنه و حرمت عليه امها و ابنتها كما لو وطها بشبهة و حلالا، ولو وطى ام امرأته او بنتها حرمت عليه امرأته نص احمد على هذا فى رواية جماعة و روى نحو ذلك عن عمران بن حصين رضى الله عنه، و به قال الحسن و عطاء و طاؤس و مجاهد والشعبى، والنخعى، واسحاق واصحاب الراء وروى عن ابن عباس ان وطء الحرام لا يحرم، و به قال سعيد بن المسيب، ويحيىٰ بن يعمر، وعروة، والزهرى، ومالك، والشافعى، وابو ثور، وابن المنذر لما روى عن النبى صلى الله

علیه و سلم انه قال: ”لا یحرم الحرامُ الحلالَ“ ولانه وطء لا تصیر به الموطوة فراشا فلا یحرم کوطء الصغیرة“

ولنا قوله تعالیٰ ”وَلَا تَنْكِحُوا مَا نَكَحَ آبَاءُ كُمْ من النساء“ والوطء یسمّٰی نکاحا ... فحمل فی عموم الآیة وفی الآیة قرینة تصرفه الی الوطء وهو قوله سبحانه تعالیٰ ”اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَمَقْتًا وَ سَاءَ سَبِيلًا“ وهذا التغلیظ انما یکون فی الوطء الخ. (ج:۷،ص:۹۰)

حرام وطی یعنی زنا وغیرہ حرام کردیتی ہے جس طرح وطی حلال اور وطی بالشبہ حرام کردیتی ہیں (یعنی جس طرح منکوحہ یا شبہ سے غیر منکوحہ کے ساتھ ہمبستری سے حرمت مصاہرت ثابت ہوجاتی ہے اسی طرح زنا سے بھی اس کا ثبوت ہوجاتا ہے)

لہٰذا جب کوئی شخص کسی عورت سے حرام کاری کرے گا تو یہ عورت اس مرد کے باپ اور بیٹے پر حرام ہوجائے گی اور خود اس شخص پر مزنیہ عورت کی ماں اور بیٹی حرام ہوجائیں گی، جیسے کہ اشتباہ کی بناء پر غیر بیوی سے یا خود اپنی بیوی سے ہمبستری کرنے سے حرمت مصاہرت کا ثبوت ہوجاتا ہے، نیز اگر کسی نے اپنی بیوی کی ماں یعنی ساس، یا بیوی کی بیٹی سے صحبت کرلی تو اس کی بیوی اس پر حرام ہوجائے گی۔ ایک جماعت کی روایت کے مطابق امام احمد بن حنبل نے اس مسئلہ کو صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ صحابی رسول ﷺ عمران ؓ بن حصین سے بھی یہی قول مروی ہے اور یہی قول امام حسن بصری، عطاء بن ابی رباح، طاؤس، مجاہد، شعبی، ابراہیم نخعی، اسحاق بن راہویہ اور فقہائے احناف کا ہے۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ سے یہ بات روایت کی جاتی ہے کہ وطی حرام سے حرمت ثابت نہیں ہوتی، اور یہی حضرت سعید بن المسیب، یحییٰ بن یعمر، عروۃ بن زبیر، زہری، امام مالک، وامام شافعی، ابوثور اور ابن المنذر رحمہم اللہ کا قول ہے۔ اس حدیث کی بنیاد پر جو آنحضرت ...... سے روایت کی گئی ہے کہ آپ ...... نے فرمایا ”لا یحرم الحرام الحلال“[1] حرام، حلال کو حرام نہیں کرتا۔

---

(۱) یہ حدیث صحیح نہیں ہے۔ بحث آئندہ سطور میں ملاحظہ کیجئے۔

اور ہماری دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ”وَلَا تَنْكِحُوا مَا نَكَحَ اٰبَاءُ كُم مِنَ النِّسَاءِ“ اور نکاح نہ کرو ان عورتوں سے جن سے تمہارے باپ دادا نے نکاح کیا ہے، اور وطی کو (لغۃ میں) نکاح کہا جاتا ہے لہٰذا آیت کے عموم میں وطی بھی شامل ہوگی۔

پھر آیت میں ایسا قرینہ بھی موجود ہے جو نکاح کو معنی وطی کی جانب پھیرتا ہے اور یہ قرینہ اللہ عز وجل کا یہ قول ہے ”اِنّه كان فَاحِشَةً وَمَقْتًا وَسَاءَ سَبِيْلًا“ یہ بدکاری اور ناراضگی کا کام ہے اور بدترین طریق عمل ہے (یعنی باپ دادا کی منکوحہ عورتوں سے نکاح عقل، شرع اور عرف ہر اعتبار سے ناپسندیدہ وممنوع ہے) اس طرح کی شدت و مذمت ان مذکورہ عورتوں کے ساتھ وطی کی بناء پر ہی ہوگی محض عقد نکاح اس تغلیظ وتشدید کا متقاضی نہیں۔

معروف صاحب نظر وفہم فقیہ ومحدث ابوبکر جصاص رازی لکھتے ہیں:

فوجب اذا كان على ما وصفنا ان يحمل قوله تعالىٰ ”وَلَا تَنْكِحُوا مَا نَكَحَ آبَاءُكُم مِنَ النِّسَاءِ“ على الوطء فاقتضىٰ ذلك تحريم من وطيها ابوه من النساء عليه لانه لما ثبت ان النكاح اسم للوطء لم يختص ذلك بالمباح منه دون المحظور كالضرب، والقتل والوطء نفسه لا يختص عند الاطلاق بالمباح منه دون المحظور بل هو على الامرين حتى تقوم الدلالة على تخصيصه الخ (احکام القرآن، ج:۳،ص:۵۱)

(اس بحث وتحقیق کے بعد کہ لفظ نکاح کا از روئے لغت عربی اصلی وحقیقی معنی وطی ہے) تو جب ہماری بحث سے ثابت ہوگیا کہ نکاح کا حقیقی معنی یہی ہے تو ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان ”وَلَا تَنْكِحُوا الآية“ کو وطی پر محمول کیا جائے اور اس معنی کا یہ مقتضی ہے کہ وہ عورتیں بیٹے پر حرام ہوجائیں جن سے اس کے باپ نے وطی کی ہے، کیونکہ جب یہ ثابت ہوگیا کہ نکاح، مطلق وطی کا نام ہے تو یہ معنی وطی ممنوع کو نظر انداز کر کے صرف مباح کے ساتھ خاص نہیں ہوگا جیسے لفظ ضرب اور قتل۔ جائز و ناجائز دونوں طرح کی ضرب وقتل پر بولا جاتا ہے، اور خود لفظ وطی مطلق بولا جاتا ہے تو جب تک کسی معنی کے ساتھ خاص

ہونے کی دلیل نہیں پائی جاتی تو کسی ایک نوع کے ساتھ مختص ہونے کے بجائے دونوں طرح کی وطی پر صادق آتا ہے۔

علامہ ابن حزم، امام ابن الجوزی، محقق ابن قدامہ اور فقیہ النفس جصاص رازی رحمہم اللہ کے یہ واضح بیانات بتا رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان بالا کی رو سے حرام کاری اور صحبت ناجائز سے بھی حرمت مصاہرت کا ثبوت ہو جاتا ہے۔

احادیث وآثار

(۱) عن ابی ھانی قال: قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم: من نظر إلی فرج امرأة لم تحل له امّها ولا ابنتها. (مصنف ابن ابی شیبة کتاب النکاح، الرجل یقع علی ام امرأته، ج:٣، ص: ٣٠٤) ورجاله ثقات مشهورون.

ترجمہ: ابو ہانی (حمید بن ہانی) سے روایت ہے کہ رسول اللہ...... نے فرمایا: جس نے کسی عورت کی شرمگاہ پر نظر ڈالی تو اس کیلئے نہ اس عورت کی ماں حلال ہوگی نہ اسکی بیٹی۔ (یعنی اس دیکھنے کی وجہ سے اس عورت کی ماں اور بیٹی سے اس مرد کے لئے نکاح کرنا حرام ہو جائے گا، چونکہ حدیث میں نظر حلال ونظر حرام کی تفصیل نہیں بیان کی گئی ہے اس لئے یہ حکم دونوں طرح کی نظر کو شامل ہوگا اور جب نظر سے حرمت کا ثبوت ہو جاتا ہے تو ہمبستری سے بدرجہ اولیٰ حرمت ثابت ہو جائے گی۔

اس حدیث کی سند کے رجال یہ ہیں: ۱ے جریر بن عبدالحمید الضبی، جو ثقہ اور حجت ہیں اصحاب ستہ (بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ، امام احمد وغیرہ) ان سے روایت کرتے ہیں۔ ۲ے حجاج بن ارطاۃ الکوفی القاضی، ان پر اگرچہ بہت سے علمائے رجال نے "لیس بالقوی" وغیرہ کی جرح کی ہے، لیکن خطیب بغدادی نے انھیں احد العلماء بالحدیث والحفاظ له کے بلند الفاظ سے یاد کیا ہے اور حافظ مغلطائی نے لکھا ہے کہ امام شعبہ وغیرہ نے ان کی توثیق کی ہے اور امام سفیان ثوری نے ان کے قوت حافظہ کی شہادت ان الفاظ میں دی ہے "ما رأیت احفظ منه" میں نے ان سے بڑا حافظ نہیں

دیکھا، اور حافظ خلیلی اپنی مشہور کتاب الارشاد میں ان کے بارے میں لکھتے ہیں "عالم کبیر، ثقة، ضعفوه لتدلیسه" عالم کبیر اور ثقہ ہیں بربنائے تدلیس لوگوں نے ان کو ضعیف کہا ہے، ان کے بارے میں حافظ خلیلی کا قول لائق اعتماد ہے، اس لئے از روئے انصاف اصول محدثین کے تحت حجاج ابن ارطاۃ ''حسن الحدیث'' سے کم درجہ کے راوی نہیں ہیں۔ ۳؎ ابن ہانی، ان کا پورا نام حمید بن ہانی، ابو ہانی الخولانی ہے، یہ صحیح مسلم، اور سنن اربعہ کے راوی ہیں۔ امام بخاری نے "ادب المفرد" میں ان سے روایت کی ہے۔ بعض راویوں نے غلطی سے ابن ہانی کی جگہ ''ام ہانی'' کہہ دیا ہے اور ام ہانی نام کا اس طبقہ میں کوئی معروف راوی نہیں ہے اسلئے اس غلطی پر متنبہ نہ ہونے کی بناء پر بعض حضرات نے انھیں مجہول کہہ دیا ہے، جو صحیح نہیں ہے۔ امام ابن ابی شیبہ نے مصنف میں، امام ابن حزم ظاہری نے ''المحلّٰی'' میں اور فقیہ ومحدث ابوبکر جصاص نے احکام القرآن میں انھیں ''ابن ہانی'' ہی کی کنیت سے ذکر کیا ہے اور یہی صحیح ہے۔ ''ابن ہانی'' نام کے ایک دوسرے راوی حدیث بھی ہیں جن سے صرف حَرِیز بن عثمان نے روایت کی ہے، اسی بناء پر حافظ ذہبی اور حافظ ابن حجر نے انھیں مجہول کہا ہے۔ زیر نظر حدیث کی روایت سے حَرِیز کے استاذ ابن ہانی کا کوئی تعلق نہیں۔ بہر حال مذکورہ حدیث کے تینوں راوی معروف اور ثقہ ہیں۔ البتہ حدیث مرسل ہے، جو ائمہ احناف بلکہ جمہور متقدمین کے نزدیک لائق حجت ہے اور جن حضرات محدثین وفقہاء کے نزدیک مرسل روایت حجت نہیں، ان کے نزدیک بھی اگر اس کی تائید کسی دوسری مرسل یا مرفوع روایت سے یا کسی صحابی کے قول سے ہوجائے تو وہ مرسل حجت ہوجاتی ہے اور اس حدیث کی تائید متعدد صحابہ کے قول سے ہورہی ہے، جیسا کہ آئندہ سطور سے واضح ہوجائے گا۔ اس لئے اس حدیث سے مسئلہ زیر بحث پر استدلال بے غبار ہے۔ رہا امام بیہقی رحمہ اللہ کا اس حدیث کے بارے میں یہ کہنا "وهذا منقطع و مجهول و ضعیف، حجاج بن ارطاة لا یحتج به فیما یسنده فکیف بما یرسله ممن لا یعرف" اس حدیث کے لائق احتجاج ہونے میں قطعاً مضر نہیں، کیونکہ یہ انقطاعِ ارسال ہے اور یہ ایسی مرسل ہے جو سب کے نزدیک قابل

استدلال ہے، اور سند میں مذکور ابن ہانی جیسا کہ معلوم ہو چکا ہے مجہول نہیں بلکہ معروف ہیں، مجہول ام ہانی اور حَریز کے شیخ ابن ہانی ہیں اور ان دونوں کا اس روایت سے کوئی تعلق نہیں۔ اور حجاج بن ارطاۃ کے بارے میں موصوف نے مبالغہ سے کام لیا ہے کیونکہ یہ حسن الحدیث سے بہر حال کم درجہ کے نہیں ہیں۔ امام مسلم ان سے مقروناً روایت کرتے ہیں اور سنن اربعہ کے مصنّفین بلا تکلف موقع احتجاج میں ان کی روایت لاتے ہیں۔

اس حدیث کی تائید درج ذیل احادیث صحیحہ سے بھی ہوتی ہے۔

دو حدیثوں سے تائید

(**الف**) عن ابی هريرة (رضی الله عنه) قال: قال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم: لم يتكلم فى المهد الا ثلاثة، عيسى بن مريم، قال : وكان فى بنى اسرائيل رجل عابد يقال له جُريج، فابتنى صومعة و تعبد فيها، قال : فذكر بنو اسرائيل عبادة جريج فقالت بغى منهم : لئن شئتم لَافتننه، فقالوا: قد شئنا ذاك، قال: فاتته فتعرضت له، فلم يلتفت اليها، فامكنت نفسها من راع كان يؤوى غنمه الى اصل صومعة جريج فحملت فولدت غلاماً فقالوا ممن ؟ قالت من جريج، فاتوه فاستنزلوه فشتموه وضربوه وهدموا صومعته، فقال: ما شأنكم ؟ قالوا: انك زينت بهذه البغى فولدت غلامًا، فقال اين هو؟ فقالوا هو هذا، قال فقام فصلى و دعا ثم انصرف الى الغلام فطعنه فقال: باللّٰه يا غلام من ابوك؟ فقال ابن فلان الراعى، فوثبوا الى جريج فجعلوا يقبلونه، وقالوا: نبنى صومعتك من ذهب، قال: لا حاجة لى ذلك ابنوها من طين كما كانت . الحديث (فتح البارى، ج:٦، ص: ٥٨٩ والمفهم لما اشكل من تلخيص كتاب مسلم، ج:٦، ص: ٥١١، ومسند احمد واللفظ له)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسولِ خدا...... نے فرمایا گود کی عمر میں (یقینی طور پر) صرف تین بچوں نے گفتگو کی ہے۔ ایک حضرت عیسیٰ بن مریم

علیہا السلام، بعد ازاں آنحضرت ...... نے فرمایا بنی اسرائیل میں ایک عبادت گذار شخص تھا جس کا نام جریج تھا اس نے ایک عبادت خانہ بنایا تھا جس میں مصروف عبادت رہتا، ایک دن بنی اسرائیل نے جریج کی عبادت کا (بطور تعریف کے) ذکر کیا تو ایک بدکار عورت نے کہا اگر تم لوگ چاہو تو میں اسے اپنے دام گناہ میں پھانس لوں، لوگوں نے کہا ایسا کرلو، چنانچہ وہ جریج کے پاس آئی اور اپنے کو ان پر پیش کیا، مگر انھوں نے اس کی جانب کوئی توجہ نہیں کی، (ان کے پاس سے نامراد ہوکر واپس ہوئی تو) ایک چرواہے سے جو جریج کے عبادت خانہ کے پاس اپنی بکریاں رکھتا تھا) بدکاری کرائی جس سے اس کو حمل ہوگیا، (مدت حمل پوری ہوجانے پر اس نے ایک بچہ کو جنم دیا، لوگوں نے اس سے پوچھا یہ کس کا بچہ ہے تو اس نے کہا جریج کا، (یہ سن کر وہ لوگ جریج پر بہت برافروختہ ہوئے) اور ان کے پاس آکر عبادت خانہ سے انھیں نیچے لائے اور انھیں برا بھلا کہا اور زدوکوب بھی کیا، نیز ان کے عبادت خانہ کو بھی ڈھادیا، (جریج نے ان کے اشتعال کو دیکھ کر) پوچھا آخر ماجرا کیا ہے تو لوگوں نے کہا تم نے اس فاحشہ سے بدکاری کی ہے (اور تمہارے نطفہ سے) اس نے ایک بچہ جنم دیا ہے، جریج نے پوچھا وہ بچہ کہاں ہے، لوگوں نے اسے پیش کردیا۔ آنحضرت ...... نے فرمایا (یہ صورت حال دیکھ کر جریج اپنے رب کی جانب متوجہ ہوئے) نماز (نفل) پڑھی اور اللہ تعالیٰ سے دعا کی پھر بچے کے پاس آئے اور اس کے شکم میں انگلی سے چونکتے ہوئے کہا بخدا بتاؤ تم کس کے بیٹے ہو، بچہ نے جواب دیا میں چرواہے کا بیٹا ہوں (جریج کی اس کرامت سے ان کی پاک دامنی کا یقین آجانے پر) وہ سب تیزی سے جریج کی جانب لپکے (اور فرط عقیدت میں) انھیں بوسہ دینا شروع کردیا اور بولے ہم آپ کے عبادت خانہ کو سونے کا بنائیں گے۔ جریج نے کہا مجھے سونے کے معبد کی کوئی ضرورت نہیں اسے مٹی کا جیسے پہلے تھا بنادو الخ۔

اس حدیث پاک کے جملہ ”یا غلام من ابوك ؟ قال فلان الراعی“ کے تحت حافظ ابوالعباس القرطبی لکھتے ہیں کہ (بعض علمائے مالکیہ) نے اس سے زنا کے ذریعہ حرمت مصاہرت کے مسئلہ پر استدلال کیا ہے اور صورت استدلال کی ان لفظوں میں

وضاحت کی ہے۔

يتمسك به من قال ان الزنى يحرّم كما يُحرّم الوطء الحلال، فلا تحلُّ ام المزنى بها ولا بناتها للزانى، ولا تحل المزنى بها لآباء الزانى ولا لاولاده ... ووجه التمسك : ان النبى صلى اللّٰه عليه وسلم قد حكى عن جريج انه نسب ابن الزانى للزانى، وصدّق اللّٰه نسبته بما خرق له العادة فى نطق الصبئ بالشهادة له بذلك، فقد صدّق اللّٰه جريجاً فى تلك النسبة واخبربها النبى صلى اللّٰه عليه وسلم عن جريج فى معرض المدح لجريج واظهار كرامته فكانت تلك النسبة صحيحة بتصديق اللّٰه وباخبار النبى صلى اللّٰه عليه وسلم عن ذلك فثبت البنوَّة والابوة واحكامها الخ. (المفهم شرح تلخيص صحيح مسلم، ج:٦، ص: ٥١٤)

اس جملہ سے ان علماء نے استدلال کیا ہے جو اس کے قائل ہیں کہ زنا سے بھی وطی حلال کی طرح حرمت کا ثبوت ہوجاتا ہے، لہٰذا جس عورت سے یہ حرام کاری کی گئی ہے اس کی ماں اور بیٹی، مرد زانی پر حرام ہوجائے گی، اور خود یہ عورت زانی کے باپ اور اولاد کے لئے حلال نہ ہوگی۔

استدلال (اور دلیل پکڑنے) کی صورت یہ ہے کہ آنحضرت ...... نے جریج عابد کی یہ بات نقل فرمائی کہ انھوں نے ولد الزنا (یعنی زانی کے بیٹے کو) زانی کی جانب منسوب کیا اور اللہ تعالیٰ نے خلاف عادت اس گود کے بچے سے زبانی شہادت دلاکر اس نسبت کی تصدیق کردی، لہٰذا جب اللہ تعالیٰ نے بچے کی زانی کی جانب نسبت میں جریج کی سچائی کو صحیح بتادیا اور اللہ کے نبی ...... نے جریج کی تعریف اور ان کی کرامت کے اظہار کے طور پر اسے بیان فرمایا تو اللہ تعالیٰ کی تصدیق اور نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس بیان سے یہ نسبت صحیح ہوگئی لہٰذا زانی اور ولد الزنا کے درمیان باپ، بیٹا ہونے کا رشتہ اور رشتہ کے احکام ثابت ہوجائیں گے۔ (البتہ وراثت اور وَلاء کے احکام کا اس سے باجماع امت ثبوت نہیں ہوگا، جیسا کہ حافظ قرطبی نے آخر میں اس کی وضاحت کردی ہے)۔

معروف مفسر علامہ ابوعبداللہ القرطبی نے اپنی بینظیر تفسیر الجامع لاحکام القرآن، ج:۵، ص: ۱۱۵، اور حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہما اللہ نے فتح الباری، ج:۶، ص: ۵۹۷ میں بھی اس استدلال کا تفصیل سے ذکر کیا ہے اور اس پر کوئی نقد نہیں کیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ استدلال ان کے نزدیک بھی درست ہے۔

(ب) عن عائشة رضی الله عنها انها قالت : اختصم سعد بن ابی وقاص و عبد بن زمعة فی غلام، فقال سعد : هذا یا رسول الله ﷺ ابن اخی عتبة بن ابی وقاص عهد الیّ انه ابنه انظر الی شبهه، وقال عبد بن زمعة هذا اخی یا رسول الله صلی الله علیه وسلم ولد علی فراش ابی من ولیدته، فنظر رسول الله الی شبهه فرأی شبهاً بیناً بعتبة، فقال: هولك یا عبد الولد للفراش وللعاهر الحجر، واحتجبی منه یا سودة بنت زمعة ! قالت فلم یر سودة قط.(صحیح مسلم، ج:١، ص: ٤٧٠ مع شرح النووی)

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ انھوں نے کہا! سعد بن ابی وقاص اور عبد بن زمعہ نے ایک غلام کے بارے میں مقدمہ پیش کیا، سعد نے اپنا دعویٰ پیش کرتے ہوئے کہا کہ یہ بچہ میرے بھائی عتبہ بن ابی وقاص کا بیٹا ہے اس نے مجھے وصیت کی تھی کہ یہ اسی کا بیٹا ہے، یارسول اللہ اس کے حلیہ کو دیکھئے، اور عبد بن زمعہ نے اپنے حق کے ثبوت میں عرض کیا کہ یارسول اللہ (......) یہ میرا بھائی ہے یہ میرے باپ کی ہمبستر باندی سے پیدا ہوا ہے، آنحضرت ...... نے اس بچہ کے حلیہ کو دیکھا تو وہ واضح طور پر عتبہ کے ہم شکل تھا، پھر آپ ...... نے فرمایا: اے عبد (بن زمعہ) یہ تمہارا ہی بھائی ہے (کیونکہ اسلامی اصول کے مطابق) لڑکا ہمبستر ہی کا ہوگا اور زانی کیلئے تو خسرانِ محض ہے۔ اور ام المؤمنین سودۃ بنت زمعہ سے فرمایا اے سودۃ اس بچہ سے پردہ کرو، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ اسکے بعد سودۃ نے اس بچہ کو کبھی نہیں دیکھا۔

اس حدیث میں آنحضرت ...... کے فرمان ”احتجبی منه یا سودة“ کے تحت امام خطابی لکھتے ہیں: ”(فیه) حجة لمن ذهب الی ان من فجر بامرأة حرمت علی

اولاده واليه ذهب اهل الرأى وسفيان الثورى والاوزاعى واحمد، لانه لما رأى الشبه بعتبة علم انه من مائه فاجراه فى التحريم مجرى النسب وامرها باحتجاب منه (معالم السنن، ج:۳، ص: ۱۸۲ مطبوعة دارالمعرفة بيروت مع مختصر سنن ابى داؤد للمنذرى)

اس میں ان لوگوں کی حجت و دلیل ہے جو اس جانب گئے ہیں کہ جس شخص نے کسی عورت سے بدکاری کی تو یہ عورت اس بدکار کی اولاد پر حرام ہو جائے گی، یہی اہل الرائے، سفیان ثوری، الاوزاعی اور احمد بن حنبل کا مسلک ہے۔ کیونکہ جب آنحضرت ...... نے (اس بچہ میں) عتبہ بن ابی وقاص کی شباہت دیکھی تو آپ کو علم ہو گیا کہ یہ عتبہ کے نطفہ سے ہے تو اس نطفۂ حرام کو ثبوت حرمت میں نسب کا ہم درجہ ٹھہراتے ہوئے حضرت سودۃ رضی اللہ عنہا کو حکم دیا کہ اس سے پردہ کرو۔

حافظ الدنیا ابن حجر عسقلانی اس استدلال کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

واستدل به على ان لوطئ الزنا حكم وطء الحلال فى حرمة المصاهرت وهو قول الجمهور، ووجه الدلالة امر سودة بالاحتجاب بعد الحكم بانه اخوها لاجل الشبه بالزانى. (فتح البارى، ج:۱۲، ص: ٤٣ مطبوعه قديمى كتبخانه آرام باغ كراچى)

اس سے اس بات پر استدلال کیا گیا ہے کہ حرمت مصاہرت کے اثبات میں وطی حرام، حلال وطی کے حکم میں ہے، یہی جمہور کا قول ہے۔

اس فیصلہ کے بعد کہ یہ غلام حضرت سودہ کا بھائی ہے آپ نے انھیں حکم دیا کہ اس غلام سے پردہ کریں کیونکہ وہ زانی کے ہم شکل تھا۔ صاحب المنهل اس استدلال کی وضاحت یوں کرتے ہیں:

دل قوله صلى الله عليه وسلم : "واحتجبى منه يا سودة" على ان من زنى بامرأة حرمت على اصوله و فروعه وحرم عليه اصل مزنيته وفرعها لان كل تحريم تعلق بالوطء الحلال يتعلق بالوطء الحرام، واللمس بشهوة باحدهما ولو

بحائل وجد معه حرارة الملموس سواء اكان عمدا ام سهوا ام خطاء ام كرها يوجب حرمة المصاهرة كالنكاح، لانه من دواعی الوطء، وبهذا قال جمهور الصحابة والتابعين والحنفيون وسفيان الثوری، والاوزاعی واحمد، لان النبی صلی اللّٰه عليه وسلم لما رأی الشبه بعتبة علم انه من مائه فاجراه فی التحريم مجری النسب وامرها بالاحتجاب منه. (فتح الملك المعبود تكملة المنهل العذب المورود شرح سنن الامام ابی داؤد، ج:٤، ص: ٢٨١، مطبوعة موسسة التاريخ العربی بيروت ١٣٩٤ھ/١٩٧٤ء)

آنحضرت...... کا فرمان ”اے سودہؓ اس سے پردہ کرو“ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ جو شخص کسی عورت سے زنا کرے گا تو یہ عورت اس زانی کے اصول وفروع (یعنی باپ دادا اور اولاد در اولاد) پر حرام ہو جائے گی اور اس مزنیہ کے اصول وفروع اس مرد زانی پر حرام ہو جائیں گے، اس لئے کہ وطی حلال سے جو حرمت متعلق ہوتی ہے وہ وطی حرام سے بھی متعلق ہوتی ہے اور شہوت کے ساتھ چھونا اگرچہ ایسے حائل کے ساتھ کہ ملموس (جسے چھویا جائے) کے جسم کی گرمی محسوس ہو یہ شہوت سے چھونا قصداً ہو یا سہواً غلطی سے یا بزورِ زبردستی ان سب سے نکاح کی طرح حرمت مصاہرت کا ثبوت ہو جائے گا، کیونکہ یہ سب باتیں وطی کے اسباب میں داخل ہیں۔ جمہور صحابہ، تابعین، احناف، امام سفیان ثوری(۱) امام اوزاعی اور امام احمد بن حنبل (وغیرہ) اسی کے قائل ہیں۔

(۱) **اثر عبداللہ بن مسعودؓ:** ”عن عبداللّٰه قال : لا ينظر اللّٰه الی رجل نظر الی فرج امرأة وابنتها“ (مصنف ابن ابی شيبه، ج:٣، ص: ٣٠٤ باب الرجل يقع علی ام امرأته)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ ایسے شخص کی جانب نہیں دیکھیں گے جس نے کسی عورت کی فرج کو دیکھا پھر اس عورت کی بیٹی کی فرج کو

---

(۱) امام سفیان ثوری اور امام اوزاعی کبار ائمہ محدثین اور فقہائے مجتہدین میں سے ہیں ایک طویل عرصہ تک ان دونوں حضرات کے فقہ پر عمل جاری رہا ہے۔

بھی دیکھا۔ (یہ اثر بھی مطلق ہے جس میں نگاہِ حلال وحرام دونوں داخل ہیں)

امام بیہقی اس اثر کو ذکر کرنے کے بعد رقمطراز ہیں:

”هذا ايضا ضعيف، قال ابوالحسن الدارقطنی هذا موقوف وليث وحماد ضعيفان“ (السنن الكبری، ج:۷، ص: ۱۷۰)

اس اثر کے راوی درج ذیل ہیں:

۱ء حفص بن غیاث، ۲ء لیث بن ابی سلیم، ۳ء حماد بن ابی سلیمان شیخ امام ابی حنیفہ، ۴ء ابراہیم نخعی، ۵ء علقمہ۔ ان پانچوں میں ۱ء، ۴ء، ۵ء متفق علیہ ثقہ ہیں اور شیخین ہی نہیں بلکہ محدثین کی پوری جماعت ان سے روایت کرتی ہے۔ ۲ء اور ۳ء پر امام دارقطنی نے ضعف کی جرح کی ہے اسی بناء پر امام بیہقی اس اثر کو ضعیف بتارہے ہیں۔

۲ء بلاشبہ علمائے جرح وتعدیل کی ایک جماعت نے سیٔ الحفظ ہونے کی بناء پر لیث بن ابی سُلیم کی تضعیف کی ہے، لیکن اسی کے ساتھ ائمہ رجال میں سے ایک جماعت انھیں جائز الحدیث ولا بأس بھی کہتی ہے۔ ذیل میں ان کے بارے میں بعض اصحاب جرح و تعدیل کے تبصرے ملاحظہ کیجئے۔

امام ذہبی لکھتے ہیں:

”فيه ضعف يسير من سوء حفظه كان ذا صلاة وصيام وعلم كثير وبعضهم احتج به“ (الكاشف، ج:۲، ص: ۱۵۱)

ان میں سوء حفظ کی بناء پر تھوڑا سا ضعف ہے۔ یہ عبادت گذار اور علم کثیر سے متصف تھے، بعض محدثین ان سے احتجاج کرتے ہیں۔ امام موصوف میزان الاعتدال میں لکھتے ہیں:

الليث بن ابی سليم الكوفی احد العلماء، قال احمد مضطرب الحديث ولكن حدث عنه الناس، وقال يحيیٰ والنسائی ضعيف، وقال ابن معين لابأس به... حدث عنه شعبة، ابن عُلَيَّة، وابومعاوية والناس. (ج:۳، ص: ۴۲۰-۴۲۱)

لیث بن ابی سلیم کوفی علمائے حدیث میں سے تھے، امام احمد ان کے بارے میں کہتے

ہیں کہ یہ مضطرب الحدیث تھے پھر بھی محدثین ان سے روایت کرتے ہیں۔ امام شعبہ، ابن علیہ، ابومعاویہ جیسے اکابر ائمہ اور عام محدثین ان سے روایت کرتے ہیں۔ تہذیب الکمال اوراس کے حاشیہ میں ان کے متعلق حسب ذیل نقد وتبصرہ نقل کیا گیا ہے۔

قال ابن عدی: له احادیث صالحة غیر ما ذکرت وقد روی عنه شعبة، والثوری وغیرهما من ثقات الناس ومع الضعف الذی فیه یکتب حدیثه، وقال البرقانی سالت الدار قطنی عن لیث بن ابی سُلیم فقال: صاحب سنة یخرّج حدیثه ثم قال انما انکروا علیه الجمع بین عطاء، وطاؤس، ومجاهد حسب، وقال العجلی: جائز الحدیث وقال مرة لابأس به. استشهد به البخاری فی الصحیح، وروی له فی کتاب "رفع الیدین فی الصلاة، وروی له مسلم مقرونا بابی اسحاق، وروی له الباقون. (ج:٦، ص: ١٩١، رقم الترجمه ٥٦٠٦)

ترجمہ: ابن عدی نے کہا میری ذکر کردہ روایتوں کے علاوہ ان سے صالح و درست احادیث بھی مروی ہیں، امام شعبہ، سفیان الثوری وغیرہ ثقہ لوگوں نے ان سے روایت کی ہے۔ ان میں موجود کمزوری کے باوجود ان کی حدیثیں لکھی جائیں گی۔ برقانی کہتے ہیں میں نے امام دارقطنی سے ان کے بارے میں پوچھا، تو فرمایا: صاحب سنۃ ہیں ان کی احادیث کی تخریج کی جائے گی۔ ان کا سند واحد میں عطاء، طاؤس اور مجاہد کا جمع کر دینا ہی صرف ائمہ حدیث کے نزدیک منکر ہے۔

امام مزّی کہتے ہیں کہ امام بخاری نے صحیح میں ان سے استشہاد کیا ہے، اور اپنی کتاب ''جزء رفع الیدین فی الصلاۃ'' میں ان کی روایت نقل کی ہے، امام مسلم نے اپنی صحیح میں ابواسحاق سبیعی کے ساتھ ان کی حدیث بیان کی ہے، اور بقیہ اصحاب ستہ نے ان سے روایت کی تخریج کی ہے، علاوہ ازیں امام ترمذی، جامع ترمذی میں لکھتے ہیں:

قال محمد بن اسماعیل (یعنی البخاری) : لیث بن ابی سلیم صدوق ربما یهم فی الشئ.

امام بخاری فرماتے ہیں کہ لیث بن ابی سلیم صدوق ہیں البتہ کبھی کبھی بعض حدیثوں

میں غلطی کر جاتے ہیں۔

حضرات ائمہ جرح و تعدیل کے ان اقوال کے پیش نظر ان کی روایت کو ضعیف کہہ کر مطلقاً رد کر دینا تعنت و بیجا تشدد سے خالی نہیں، کیونکہ اس درجہ کا راوی بعض حضرات محدثین کے نزدیک (بدرجہ حسن الحدیث) لائق احتجاج ہوتا ہے۔ جیسا کہ امام ذہبی نے الکاشف میں اس کی صراحت کی ہے۔ اور جمہور محدثین کے نزدیک اگر اس کی روایت کا کوئی شاہد یا متابع مل جائے تو یہ روایت حسن کے مرتبہ میں پہنچ جائے گی اور لائق استدلال ہوگی، اور اوپر مذکور ابن ہانی کی مرسل حدیث بلاشبہ اس کی شاہد ہے۔ اس لئے امام بیہقی کا اسے ضعیف کہہ کر نا قابل استدلال ٹھہرانا ائمہ حدیث کے اصول اور تعامل کے خلاف ہے، جو لائق قبول نہیں۔

اور راوی [۳] یعنی حماد بن ابی سلیمان (جنھیں امام دار قطنی ضعیف بتا رہے ہیں) کے بارے میں حضرات علمائے رجال کے اقوال ملاحظہ کیجئے اور پھر فیصلہ کیجئے کہ امام موصوف کی اس جرح مبہم میں کتنی جان ہے۔

حماد بن ابی سلیمان کے تذکرہ میں حافظ مزّی لکھتے ہیں:

قال اسحاق بن منصور انه (ای یحیٰی بن معین) سئل عن مغیرة و حماد ایهما اثبت؟ قال حماد، وقال: حماد ثقة، وقال احمد بن حنبل حماد اصح حدیثا من ابی معشر، وقال العجلی: حماد بن ابی سلیمان کوفی ثقة، وقال النسائی: ثقة الا انه مرجئی، وقال شعبة: کان صدوق اللسان (تهذیب الکمال، ج:۲، ص: ۲۸۳، رقم الترجمة ۱٤٦۷)

یحیٰی بن معین سے دریافت کیا گیا کہ مغیرہ (بن مقسم الکوفی) و حماد میں اثبت کون ہے؟ تو جواب دیا حماد اور یہ بھی کہا کہ حماد ثقہ ہیں۔ امام احمد بن حنبل نے فرمایا کہ ابو معشر (زیاد بن کلیب کوفی) کے مقابلہ میں حماد روایت حدیث میں زیادہ صحیح ہیں (زیاد بن کلیب ابو معشر کوفی کو حافظ نے تقریب، ص: ۲۲۰ میں ثقہ کہا ہے اور امام ذہبی نے الکاشف، ج:۱، ص: ۴۱۲ میں حافظ متقن بتایا ہے اور مغیرہ (بن مِقسم کوفی کو امام ذہبی الکاشف، ج:۲،

ص:۱۱۳۳ میں ثقہ اور حافظ تقریب، ص: ۵۴۳ میں ثقہ متقن بتاتے ہیں(۱)، لہٰذا امام احمد اور یحییٰ بن معین کے نزدیک حفظ واتقان اور ثقاہت میں حماد بن ابی سلیمان مذکورہ دونوں بزرگوں سے فائق اور مقدم ہیں) اور امام عجلی نے کہا ہے کہ حماد بن ابی سلیمان کوفی، ثقہ ہیں، اور امام نسائی کہتے ہیں حماد ثقہ ہیں مگر مرجئ ہیں۔ (۲)

امام ذہبی نے الکاشف میں ان کے متعلق اپنا یہ فیصلہ درج کیا ہے:

”ثقة، امام، مجتهد، كريم، جواد“ (ج:۱،ص:۳۴۹رقم الترجمہ۱۲۲۱)

حماد بن ابی سلیمان، ثقہ، امام، مجتہد، کریم اور اعلیٰ درجہ کے سخی تھے۔

اوپر مذکور ائمہ رجال کے توثیقی اقوال اور امام ذہبی (جو بقول حافظ الدنیا ابن حجر عسقلانیؒ رجال حدیث کے نقد وتحقیق میں استقراء تام کے مالک ہیں) کے اس دوٹوک فیصلہ کے بعد حماد بن ابی سلیمان کے ثقہ وثبت ہونے میں کیا تردد ہوسکتا ہے؟ ہاں اس سے انکار نہیں کہ بعض ائمہ حدیث نے ان پر سوء حفظ وغیرہ کی جرحیں بھی کی ہیں مگر ان میں اکثر جرحیں بربنائے عقیدہ کی گئی ہیں جن کا محدثین کے یہاں اعتبار نہیں۔ چنانچہ تہذیب الکمال کے محقق ومحشی علامہ بشار عوّاد ان جرحوں کے متعلق اپنے حاشیہ میں لکھتے ہیں۔

”اناأخوف ما اكون ان يكون تضعيف بعض من ضعفه انما هو بسبب العقائد نسأل الله العافية، واحسن ما قيل فيه عندى هو قول النسائى ثقة الا انه مرجئى“ (ج:۲، ص: ٢٨٤ تعليقاً) مجھے اس بات کا بہت زیادہ اندیشہ ہے کہ بعض حضرات محدثین نے ان پر ضعیف ہونے کی جو جرحیں کی ہیں اس کا سبب عقائد ہوں، اللہ

---

(۱) حافظ ابن حجرؒ نے تقریب میں مغیرہ بن مقسم کے متعلق ”ثقة متقن“ کے بلند توثیقی کلمات کے بعد لکھا ہے: ”اِلّا انه يدلّس و لاسيما عن ابراهيم“ مگر حافظ علام کا یہ استثناء محل نظر ہے کیونکہ شیخین نے صحیحین میں متعدد مواقع میں مغیرہ عن ابراہیم سے روایت کی ہے۔

(۲) امام ذہبی لکھتے ہیں: ”ارجاء الفقهاء وهو انهم لايعدّون الصلاة والزكوٰة من الايمان ويقولون اقرار باللسان ويقين بالقلب والنزاع على هذا لفظى انشاء الله“ (سیر اعلام النبلاء، ج:۵، ص:۲۳۳) یعنی فقہاء کا ارجاء یہ ہے کہ وہ نماز، زکوٰۃ (وغیرہ عبادات واعمال کو) ایمان کا جزء نہیں شمار کرتے ان کے نزدیک ایمان نام ہے زبان کے اقرار اور دل کے یقین کا۔ (محدثین) اور فقہاء کے مابین اس بارے میں اختلاف لفظی ہے (یہ محض تعبیر کا اختلاف ہے ورنہ حقیقت ایمان واعمال کے بارے میں ان کا مذہب ایک ہی ہے)

سے ہم عافیت کے طلب گار ہیں اور میرے نزدیک ان کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے ان میں سب سے بہتر قول امام نسائی کا ہے کہ وہ ثقہ ہیں البتہ مرجئی ہیں (اور اس ارجاء کی حقیقت امام ذہبی نے واضح کردی ہے فتنبہ) لہٰذا امام دارقطنی اور امام بیہقی کی جلالتِ شان کے باوجود حماد بن ابی سلیمان کے بارے میں ان کی یہ رائے قبول نہیں کی جاسکتی لہٰذا بلاشبہ حضرت عبداللہ بن مسعود سے منقول یہ اثر حضرات محدثین کے مقررہ اصول کے لحاظ سے لائق احتجاج واستدلال ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

(۲) **اثر عمران بن حصين رضى الله عنه:** عن قتادة عن عمران بن حصين فى الذى يزنى بام امرأته، قد حرمتا عليه جميعاً. (مصنف عبدالرزاق، ج:٧، ص: ٢٠٠، الطبعة الاولىٰ ١٣٩٢هـ / ١٩٧٢ء، المجلس العلمى، ومصنف ابن ابى شيبة، ج:٣، ص: ٣٠٣ و ص: ٣١٦ و"سنده متصل صحيح" فى باب الرجل يزنى باخت امرأته مطبوعه دارالفكر پاكستان، صحيح بخارى تعليقًا، فتح البارى، ج:٩، ص: ١٩١ و سنن الكبرىٰ، ج:٧، ص: ١٦٨)

صحابی رسول حضرت عمران بن حصین سے مروی ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ جو شخص اپنی بیوی کی ماں (یعنی ساس) سے بدکاری کریگا تو اس پر دونوں (یعنی بیوی اور ساس) حرام ہوجائیں گی۔

حضرت عمران رضی اللہ عنہ سے منقول یہ اثر صحیح اور اپنے مفہوم میں بالکل واضح ہے اور جمہور محدثین وفقہاء کے نزدیک صحابی کا وہ قول جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان سے معارض نہ ہو حجت ہوتا ہے۔

(۳) **اثر أبوهريرة رضى الله عنه:** و عن ابى هريرة رضى اللّٰه عنه قال: لا تحرم عليه حتى يلزق بالارض، يعنى حتى يجامع. رواه البخارى فى صحيحه تعليقًا. (فتح البارى، ج:٩، ص: ١٩٥، و عند المحدثين تعليقات البخارى صحيحة)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ (جب تک کوئی شخص اپنی بیوی کی ماں کو) زمین پر نہیں لٹائے گا حرمت ثابت نہیں ہوگی۔

مطلب یہ ہے کہ حضرت ابو ہریرہ بھی صورتِ مذکورہ میں حرمت کے قائل ہیں البتہ ان کے نزدیک یہ حرمت خاص زنا سے ثابت ہوگی۔ اسباب زنا سے نہیں۔ (اسباب زنا سے حرمت کے ثبوت پر ائمہ اربعہ متفق ہیں اور اس بارے میں ان کے پاس قوی دلائل موجود ہیں)

(۴) **اثر عبداللّٰہ بن عباس رضی اللہ عنہما:** عن ابی نصر عن عبداللّٰہ بن عباس رضی اللہ عنہما ان رجلا قال: انه اصاب ام امرأته، فقال له ابن عباس حرمت علیك امرأتك وذلك بعد ان ولدت منه سبعة اولاد کلهم بلغ مبالغ الرجال. (اخرجه الامام سفیان الثوری فی جامعه موصولا الی ابن عباس، کما قال الحافظ فی فتح الباری، ج:۹، ص: ١٩٤، واخرجه ایضا الامام محمد بن الحسن الشیبانی فی کتاب الحجج ص:۳۳۹ مطبوعه انوار محمدی) والامام البخاری فی صحیحه تعلیقا و ابن حزم فی المحلّٰی، ج:١١، ص: ٧٩ رقم االمسئلة ١٨٦٦)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ان سے ایک شخص نے عرض کیا کہ اس نے اپنی بیوی کی ماں سے مباشرت کی ہے تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا تم پر تمہاری بیوی حرام ہوگئی جبکہ اس شخص کے اپنی بیوی سے سات لڑکے تھے اور یہ سب لڑکے جوان ہوگئے تھے۔

اس حدیث کو سفیان ثوری نے درج ذیل سند سے روایت کیا ہے:

(۱)سفیان عن الاغر بن الصباح المنقری، (۲)عن خلیفة بن الحصین، (۳)عن ابی نصر عن ابن عباس رضی اللّٰہ عنه .

(۱) الاغر بن الصباح کو ابوحاتم نے صالح اور یحیٰی بن معین نے ثقة کہا ہے (کتاب الجرح والتعدیل، ج:۲، ص:۳۰۸-۳۰۹) اور امام ذہبی نے بھی ان کی توثیق کی ہے (الکاشف، ج:۱، ص:۲۵۴)

(۲) دوسرے راوی خلیفہ بن الحصین کی امام نسائی نے توثیق کی ہے۔ نیز ابن

القطان الفاسی، وابن خلفون، اور حافظ ذہبی وحافظ ابن حجر وغیرہ بھی ان کی توثیق کرتے ہیں۔ (تہذیب الکمال، ج:۲، ص:۳۹۷ وتعلیقہ من العلامہ بشار عواد، رقم الترجمہ ۱۷۰۲)

(۳) اور تیسرے راوی ابونصر الاسدی کی توثیق ابوزرعہ الرازی نے کی ہے (تہذیب الکمال، ج:۸، ص:۴۴۱ و۴۴۲ وتہذیب التہذیب، ج:۱۲، ص:۲۳۰ وفتح الباری، ج:۹، ص:۱۹۵) لہٰذا اس کی سند بے غبار صحیح ہے۔ البتہ امام بخاری رحمہ اللہ صحیح بخاری میں لکھتے ہیں "وابو نصر هذا لم يعرف بسماعه من ابن عباس" ان ابونصر کا سماع حضرت ابن عباس سے معروف نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ امام بخاریؒ کے علم کے مطابق یہ اثر منقطع السند ہے لہٰذا لائق اعتماد نہیں۔

حافظ عینی، امام بخاری کے اس قول پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "وعدم المعرفة بسماعه عن ابن عباس هو قول البخاری وعرفه ابوزرعة بانه اسدی وانه ثقة وروی عن ابن عباس انه سأل عن قول عز وجلّ "والفجر وليال عشر" انتهىٰ، فان كانت الطريق اليه صحيحة فهو يرد قول البخاری ولا شك ان عدم معرفة البخاری بسماعه من ابن عباس لا تستلزم لنفی معرفة غيره به على ان الاثبات اولىٰ من النفی. (عمدة القاری، ج:۲۰، ص:۱۰۳ مطبوعه کراچی پاکستان) ابونصر کا حضرت ابن عباس سے براہ راست سماع کا معروف نہ ہونا یہ امام بخاریؒ کا قول ہے، حالانکہ ابوزرعہ رازی ان کو پہچانتے ہیں کہ وہ قبیلۂ اسد سے تعلق رکھتے ہیں اور ثقہ ہیں اور ابن عباس سے متعلق مروی ہے کہ ابونصر نے ان سے اللہ تعالیٰ کے ارشاد: "والفجر وليال عشر" کی تفسیر پوچھی تھی، الخ۔ اگر یہ روایت ان تک صحیح سند سے ثابت ہوجائے تو (ابونصر کا ابن عباس سے سماع ثابت ہوجائے گا) اور امام بخاری کے قول کی تردید ہوجائے گی۔ پھر اس میں کیا شک ہوسکتا ہے کہ ابن عباس سے سماع کو امام بخاری کا نہ جاننا دوسرے لوگوں کے اس سماع سے واقفیت کی نفی کو مستلزم نہیں (یعنی اگر امام بخاری اس سماع سے واقف نہیں ہیں تو اس سے یہ لازم نہیں ہوگا کہ دوسرے لوگ بھی اس سماع سے واقف نہ ہوں) علاوہ ازیں از روئے اصول اثبات کو نفی پر ترجیح ہوا کرتی ہے۔

حافظ عینی نے اپنی اس تحریر میں ابونصر کے براہ راست حضرت ابن عباس سے حدیث سننے کی ایک دلیل کی جانب اشارہ کیا ہے کہ تفسیری روایت میں آیا ہے کہ ابونصر نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے "والفجر ولیال عشر" کا معنی پوچھا تھا، اگر صحیح سند سے اس روایت کا ثبوت ہوجائے تو یہ واضح اور روشن دلیل ہوگی کہ ابونصر براہ راست حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے شاگرد ہیں اور بلا واسطہ ان سے حدیث کی سماعت کی ہے۔

اور امام ابن جریر طبری نے سورۃ الفجر کی تفسیر میں بسند صحیح اس روایت کو نقل کیا ہے دیکھئے جامع البیان لابن جریر طبری، ج:۱۵، ص: ۲۱۰۔ اس لئے بلاشبہ حضرت عبداللہ بن عباس کا یہ اثر صحیح و متصل سند کے ساتھ ثابت ہے اور اسے منقطع السند سمجھنا از روئے دلیل صحیح نہیں۔ اگرچہ حضرت ابن عباسؓ سے اس کے خلاف قول بھی سند صحیح کے ساتھ منقول ہے جسے امام بخاری نے صحیح بخاری میں تعلیقا اور امام عبدالرزاق نے مصنّف میں مسنداً ذکر کیا ہے۔

اقوال تابعین واتباع تابعین

حضرت عطاء کا فتویٰ

(۱) عن ابن جریج قال سئل عطاء عن رجل کان یصیب امرأة سفاحًا اینکح ابنتها؟ قال : لا، وقد اطلع علی فرج امها، فقال انسان: الم یقال: "لا یحرّم الحرام حلالًا"؟ قال: ذلك فی الامة کان یبغی بها ثم یبتاعها، او یبغی بالحرة ثم ینکحها، فلا یحرم حینئذ ما کان صنع من ذلك. (مصنف عبدالرزاق، ج:۷، ص: ۱۹۷-۱۹۸) بسند صحیح.

ترجمہ: ابن جریج بیان کرتے ہیں کہ عطاء بن ابی رباح سے پوچھا گیا کہ ایک شخص نے کسی عورت سے حرام کاری کی ہے تو کیا اس کو اس عورت کی لڑکی سے نکاح کرنا جائز ہوگا؟ تو انھوں نے کہا نہیں (کیونکہ) وہ اس کی ماں کی فرج تک پہنچ چکا ہے۔ (ان کے اس جواب پر ایک شخص نے یہ اشکال پیش کیا کہ) کیا یہ بات نہیں کہی جاتی کہ فعل حرام حلال کو حرام نہیں کرتا (حضرت ابن عباس سے بھی یہ منقول ہے) تو انھوں نے کہا اس قول

کا مطلب یہ ہے کہ کسی نے ایک باندی سے حرام کاری کی پھر اسے خرید لیا، یا کسی آزاد عورت سے بدکاری کی پھر اس سے نکاح کرلیا تو باندی اور آزاد عورت کے ساتھ اس حرام کاری سے وہ باندی اور آزاد عورت اس پر حرام نہیں ہوں گی۔ باندی کو خرید سکتا ہے اور آزاد عورت سے نکاح کرسکتا ہے۔

یہ عطاء ابن رباح حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے بڑے شاگردوں میں ہیں اور حضرت ابن عباس وغیرہ سے مروی قول "لا یحرم الحرام حلالاً" کا یہ معنی بتارہے ہیں جس کا صاف مطلب یہی ہے کہ انھوں نے اپنے اساتذہ وغیرہ بزرگوں سے اس قول کا یہی معنی سمجھا تھا۔ اور اس معنی کی صورت میں حضرت عبداللہ بن عباس سے اوپر منقول قول اور اس قول میں تعارض بھی نہیں ہوگا اور ایک عالم اور صاحب عقل وفہم کی باتوں میں تعارض واختلاف کا نہ پایا جانا ہی اصل ہے۔ "فافہم وتشکر"

حضرت عکرمہ کا فتویٰ

(۲) عن عمر و بن دینار انه سأل عکرمة مولی ابن عباس رجل فجر بامرأة اَیصلح له ان یتزوج جاریة ارضعتها هی بعد ذلك قال: لا. المحلیٰ لابن حزم، ج:۱۱، ص: ۸۰، رقم المسئلة ۱۸۶۶ و روی عبدالرزاق فی مصنفه نحوه، ج:۷، ص: ۲۰۰ (و اسناده صحیح)

ترجمہ: مشہور تابعی عمرو بن دینار مکی بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے حضرت عبداللہ بن عباس کے آزاد کردہ غلام (اور ان کے شاگرد رشید) عکرمہ سے پوچھا کہ کسی شخص نے ایک عورت سے حرام کاری کی تو کیا اس کے لئے درست ہے کہ ایسی لڑکی سے نکاح کرے جسے اس عورت نے اس حرام کاری کے بعد دودھ پلایا ہے، تو انھوں نے جواب دیا نہیں۔

حضرت مجاہد وعطاء کا فتویٰ

(۳) عن عثمان بن الاسود عن مجاهد و عطاء قالا : اذا فجر الرجل

بامرأة فانها تحل له ولا يحل له شيء من بناتها. (مصنف ابن ابی شيبة، ج:٣، ص: ٣٠٤، واسناده صحيح)

ترجمہ: عثمان بن الاسود حضرت مجاہد اور عطاء سے روایت کرتے ہیں کہ ان دونوں بزرگوں نے فرمایا کہ جب کوئی شخص کسی عورت سے بدکاری کرے تو یہ عورت اس کے لئے حلال ہوگی (یعنی یہ شخص اس بدکاری کے بعد بھی اس سے نکاح کرسکتا ہے) اور اس عورت کی لڑکیاں اس کے لئے حلال نہیں ہوں گی۔

حضرت طاؤس کا فتویٰ

(٤) وروى ابن طاؤس عن ابيه فی الرجل كان يزنی بامرأة لاينكح امها و ابنتها. (مصنف عبدالرزاق، ج:٧، ص: ١٩٨ "وسنده صحيح")

ترجمہ: عبداللہ بن طاؤس اپنے والد یعنی طاؤس سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے اس شخص کے بارے میں فرمایا جس نے کسی عورت سے زنا کیا ہے کہ یہ شخص اس عورت کی ماں اور بیٹی سے نکاح نہیں کرسکتا۔

عطاء، عکرمہ، مجاہد اور طاؤس یہ چاروں حضرات عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے اجلّ تلامذہ اور خاص شاگردوں میں سے ہیں اور یہ چاروں باتفاق بیان کرتے ہیں کہ زنا سے حرمت مصاہرت ثابت ہوجائیگی جس سے صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے حضرت ابن عباس کے قول "الحرام لا يحرم حلالاً" کے بجائے ان کے اس قول کو ترجیح دیا ہے جسے ابونصر اسدی ابن عباس سے روایت کرتے ہیں، جو اوپر مذکور ہو چکا ہے۔

فقہائے سبعہ میں سے عروۃ بن زبیر، سعید بن مسیّب، ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن اور سالم بن عبداللہ کا متفقہ فتویٰ

(٥) عن يحيىٰ بن ابی كثير قال: سئل عروة بن الزبير، وسعيد بن المسيب، وابوسلمة بن عبدالرحمن وسالم بن عبدالله عن رجل اصاب امرأة

حراماً هل يحل له نكاح امرأة ارضعتها فقالوا كلهم: هی حرام. (رواه الامام محمد بسند قوی فی كتاب الحجج، ص: ۳۲۹ ورواه الامام عبدالرزاق بسنده فی مصنفه، ج:۷، ص: ۱۹۸) عن عبدالله بن يزيد مولیٰ آل الاسود نحوه وفی روايته ابوبكر بن عبدالرحمن بن الحارث بن هشام بدل سالم بن عبدالله وسنده ايضاً صحيح ، وذكره ايضا الحافظ ابن حزم فی المحلّٰی، ج:۱۱، ص: ۷۹ وقال: هو قول سفيان الثوری)

یحییٰ بن ابی کثیر کا بیان ہے کہ عروہ بن زبیر بن العوام، سعید بن المسیب ، ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن بن عوفؓ، اور سالم بن عبداللہ بن عمر بن الخطاب سے پوچھا گیا کہ ایک شخص نے کسی عورت سے زنا کیا تو کیا یہ مرد اس لڑکی سے نکاح کرسکتا ہے جس کو اس مزنیہ نے دودھ پلایا ہے تو ان سب نے کہا کہ یہ نکاح حرام ہوگا۔

اس روایت کو امام عبدالرزاق نے بھی مصنف میں اپنی سند سے بروایت عبداللہ بن یزید مولیٰ آل اسود ذکر کیا ہے جس کا حاصل یہ ہوا کہ اس روایت کو دو ثقہ راوی بیان کرتے ہیں البتہ عبداللہ بن یزید کی روایت میں سالم بن عبداللہ کی بجائے ابوبکر بن عبدالرحمٰن بن الحارث بن ہشام کا نام ہے۔ یہ چاروں حضرات مدینہ منورہ کے ان سات فقہاء میں سے ہیں جن کی علمی جلالت شان کی ایک دنیا معترف ہے، اگرچہ ان مذکور فقہاء میں بعض سے اس کے مخالف قول بھی منقول ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حضرت ابراہیم نخعی اور عامر شعبی کا فتویٰ

(٦) عن مغيرة عن ابراهيم وعامر فی رجل وقع علی ابنة امرأته قالا: حرمتا عليه كلتاهما، وقال ابراهيم: كانوا يقولون اذا اطلع الرجل علی المرأة علی مالا تحل له او لمسها فقد حرمتا عليه جميعًا. (مصنف ابن ابی شيبة، ج:۳، ص: ۳۰٤) وسنده صحيح.

ترجمہ: مغیرہ بن مِقسَم، امام ابراہیم نخعی، اور عامر شعبی سے نقل کرتے ہیں کہ ان دونوں

بزرگوں نے فرمایا کہ جس شخص نے اپنی بیوی کی بیٹی سے حرام کاری کی تو بیٹی اور ماں دونوں اس پر حرام ہوجائیں گی۔ (یعنی ان دونوں میں سے کسی کو بھی اب نکاح میں نہیں رکھ سکتا) اور امام ابراہیم نخعی نے یہ بھی فرمایا کہ لوگ کہتے تھے کہ جس شخص نے کسی عورت کے ایسے حصہ کو دیکھا جسے دیکھنا اسے جائز نہیں یا شہوۃ سے اس پر ہاتھ پھیرا تو یہ عورت اور اس کی منکوحہ ماں دونوں اس مرد پر حرام ہوجائیں گی۔

امام ابراہیم نخعی (جو تابعی ہیں) فرمارہے ہیں کہ "وکانوا یقولون" لوگ کہتے تھے تو یہ کہنے والے ان کے زمانہ میں موجود کبار تابعین وصحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین ہی ہونگے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس عہد کے عام تابعین اور صحابہ کا مذہب یہی تھا، امام محمد بن حسن شیبانی نے بھی کتاب الآثار میں بروایت امام ابوحنیفہ عن حماد (بن ابی سلیمان) حضرت ابراہیم نخعی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اذا قَبّل الرجل ام امرأته او لمسها من شهوة حرمت عليه امرأته" قال محمد و به ناخذ وهو قول ابی حنيفة رحمه الله (کتاب الآثار مع التعليق المختار، ص: ۲۶٤، رقم الاثر ٤۳۸ مطبوعہ الرحیم اکیڈمی کراچی ۱٤۱۰)

ترجمہ: امام ابراہیم نخعی نے فرمایا کہ جس نے اپنی بیوی کی ماں کا بوسہ لیا یا شہوۃ سے اسکو چھوا تو اس پر اسکی بیوی حرام ہوجائیگی اس اثر کو نقل کرنے کے بعد امام محمد رحمہ اللہ صراحت کرتے ہیں کہ اسی پر ہمارا عمل ہے اور یہی امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ بھی فرماتے ہیں۔

حضرت عبدالملک بن جریج اور حسن بصری کا فتویٰ

(۷) و عن ابن جريج وعن الحسن قالا: اذا زنى الرجل بام امرأته او ابنة امرأته حرمتا عليه جميعًا . (مصنف عبدالرزاق، ج:۷، ص: ۱۹۸ بسند صحيح)

ترجمہ: عبدالملک بن جریج (اتباع تابعین میں سے وہ امام حدیث ہیں جنھوں نے حجاز میں سب سے پہلے حدیث میں کتاب تصنیف کی) اور امام حسن بصری دونوں کا قول ہے کہ جب کسی نے اپنی بیوی کی ماں سے یا بیوی کی بیٹی سے زنا کیا تو اس پر دونوں حرام

ہوجائیں گی۔

قاضی یحییٰ بن یعمر کے قول "واللہ ماحرّم حرام حلالاً" پرامام شعبی کا معارضہ:

(۸) "عن قتادة قال یحییٰ بن یعمر: واللّٰہ ما حرّم حرامٌ حلالاً قط، قال له الشعبی: بل لو رضیت (والصواب لوصبت) خمرا علی ماء حرم شرب ذلك الماء، قال: وکان الحسن یقول مثل قول الشعبی" (مصنف عبدالرزاق، ج:۷، ص: ۱۹۹ بسند صحیح و رواه البیهقی بلفظ "فبلغ ذلك الشعبی فقال لو اخذت کوزا من خمر فسکبته فی جب من ماء لکان ذلك الماء حرامًا" سنن الکبری، ج:۷، ص: ۱٦۷)

ترجمہ: قتادہ روایت کرتے ہیں کہ یحییٰ بن یعمر (قاضی) نے کہا کہ بخدا حرام نے کبھی حلال کوحرام نہیں کیا، تو امام شعبی نے ان سے کہا اگر آپ شراب کو پانی میں ڈال دیں تو اس حلال پانی کا پینا حرام ہوجائے گا۔ قتادہ نے بتایا کہ امام حسن بصری بھی امام شعبی کے قول کے موافق تھے۔

حافظ بیہقی نے بھی امام شعبی کے اس اثر کو بایں الفاظ ذکر کیا ہے کہ یحییٰ بن یعمر کی یہ بات جب امام شعبی کو پہنچی تو اس کے جواب میں فرمایا کہ اگر تم ایک پیالی شراب پانی کے کنویں میں ڈال دو تو یہ پانی حرام ہوجائے گا۔ (امام شعبی کے جواب کا حاصل یہ ہے کہ "لایحرم الحرام حلالاً" کو عام معنی پر محمول کرنا درست نہیں ہے بلکہ دلائل کے تحت یہ خاص صورتوں پر محمول ہوگا)

امام ابراہیم نخعی کا ایک اور فتویٰ

(۹) عن الحکم بن عتیبة قال: قال ابراهیم النخعی: اذا کان الحلال یحرّم الحرام فلحرام اشد تحریماً. (المحلّٰی لابن حزم، ج:۱۱، ص: ۷۹)

ترجمہ: امام ابراہیم نخعی نے کہا جب حلال حرام کو حرام بنا دیتا ہے تو حرام تو بدرجۂ اولیٰ حرام کردے گا۔ (مطلب یہ ہے کہ جب نکاح صحیح کے ذریعہ کسی عورت سے مباشرت کی تو اس عورت کی ماں و بیٹی اس مرد پر حرام ہوجائیں گی، تو ناجائز مباشرت سے بدرجہ اولیٰ یہ حرمت ثابت ہوجائیگی)

امام شعبی کا ایک اور فتویٰ

(۱۰) ”عن الشعبی قال ما کان فی الحلال حراماً فھو فی الحرام حرام“ (مصنف عبدالرزاق، ج:۷، ص: ۲۰۰)

جو چیز حلال کے سبب حرام ہوگی وہ حرام کے ذریعہ بھی حرام ہوگی۔

تابعی کبیر عبداللہ بن معقل کا فتویٰ

(۱۱) وعن عبداللّٰہ بن معقل بن مَقِّرن قال: ھی محرّم علیہ فی الحلال فکیف لاتحرم علیہ فی الحرام. (مصنف عبدالرزاق، ج:۷، ص: ۲۰۰)

ترجمہ: عبداللہ بن معقلؒ (۱) نے کہا یہ (یعنی زوجہ کی ماں و بیٹی) جائز مباشرت سے مرد پر حرام ہوجاتی ہیں تو حرام وطی سے کیونکر حرام نہ ہونگی۔

تشریح: ان بزرگوں کے اقوال کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ”زنا“ کے معاملہ میں شدت اور سختی رکھی ہے، چنانچہ زانی کو بعض صورتوں میں پتھر مار مار کر ہلاک کردینے اور بعض دیگر صورتوں میں سو کوڑے مارنے کا حکم دیا۔ پھر اسی کے ساتھ اسے جہنم کی دھمکی بھی دی گئی۔ نیز اس فعل حرام سے پیدا اس کی اولاد کو اس کے نسبی رشتہ سے وابستہ کرنے سے بھی منع کردیا۔ یہ سب احکام دراصل زنا کی حرمت وقباحت میں شدت پیدا کرنے کیلئے ہی نافذ کئے گئے ہیں، لہٰذا اس معاملہ میں مذکورہ شدت کا تقاضا یہی ہے کہ جائز ہم بستری کے مقابلہ

---

(۱) عبداللہ بن معقل کبار تابعین اور کثیر الحدیث ہیں، ایک بڑے محدث ہونے کے ساتھ فقیہ اور عابد وزاہد تھے، ابن فتحون نے ذیل الاستیعاب میں انھیں صحابی بتایا ہے، مگر اس پر کوئی دلیل نہیں پیش کی ہے۔

میں زنا سے بدرجۂ اولیٰ حرمت ثابت ہو جانی چاہئے۔

اس ضابطہ کو مزید ذہن نشیں کرنے کیلئے اس مثال پر غور کیجئے کہ خداوند عالم نے حج بیت اللہ کا فریضہ ادا کرنے والوں پر ارکان حج کی ادائیگی سے پہلے بیوی سے ہمبستری کو حرام ٹھہرادیا ہے پھر اس حکم میں شدت پیدا کرنے کیلئے یہ فرمان صادر فرمایا کہ ۹؍ذی الحجہ کو عرفہ میں جانے سے پہلے جو اپنی بیوی سے جنسی عمل کرے گا اس کا حج فاسد وا کارت ہو جائے گا، تو صورت مذکورہ میں زانی کے حج کے باطل و بیکار ہو جانے میں کسی ذی فہم کو کیا تردد ہو سکتا ہے۔ بعینہٖ اسی طرح جب اللہ تبارک وتعالیٰ نے بعض رشتوں کی قدر و منزلت اجاگر کرنے اور انسانی دلوں میں ان کی طہارت و پاکیزگی کے جذبہ کو بیٹھانے کے لیے یہ حکم دیا کہ بیوی کی ماں اور بیٹی سے نکاح حرام ہے یا بیٹے کی بیوی سے باپ کو اور باپ کی بیوی سے بیٹے کو نکاح کرنا حرام ہے تو اس حکم میں شدت پیدا کرنے کے لئے یہ بھی حکم دیا کہ ان صورتوں میں نکاح کے ساتھ وطی کرنے سے بیوی اور ماں دونوں اس پر حرام ہو جائیں گی، اسی طرح اگر بیٹے کی بیوی سے کوئی اپنے خیال میں جائز مباشرت کرے گا تو یہ عورت بیٹے اور باپ دونوں کے لئے حرام ہو جائے گی۔ تو زنا میں مذکورہ شدت کا تقاضا یہی ہے کہ یہ تحریم زنا سے بھی ثابت ہو جائے ورنہ لازم آئے گا کہ وطی جائز (جو تخفیف وسہولت کو چاہتی ہے) میں سختی اور زنا (جو شدت وسختی کا متقاضی ہے) میں آسانی اور سہولت پیدا ہو جائے، جو شریعت کی وضع اور حکمت و مصلحت کے یکسر منافی ہے۔

(۱۲) وعن ابن مسعود رضی اللہ عنه قال ما اجتمع حلال وحرام الا غلّب الحرام علی الحلال (مصنف عبدالرزاق، ج:۷، ص: ۲۰۰، وفی سنده ضعف وانقطاع)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حرام وحلال جب بھی اکٹھا ہوتے ہیں تو حرام کو حلال پر غلبہ دیا جاتا ہے۔

یہ اثر اگرچہ سند کے لحاظ سے کمزور ہے لیکن اپنے مفہوم کے اعتبار سے صحیح ہے، بالخصوص فروج کے باب میں تو حضرات فقہاء کا یہ اصول ہے "والفروج اذا تعارضا فیھا التحریم والتحلیل غلّب التحریم" فروج میں جب حلال وحرام کے سلسلہ میں

تعارض پیش آجائے تو تحریم کو غلبہ دیا جائے گا۔

اوپر مذکورا احادیث، آثار صحابہ اور حضرات تابعین رضوان اللہ علیہم کے فتووں سے یہ بات روز روشن کی طرح ثابت ہوگئی کہ اس مسئلہ میں اقرب الی الصحیح یہی ہے کہ زنا سے حرمت مصاہرت ثابت ہو جائے گی، جس کے احوط ہونے میں تو کسی صاحب علم وعقل کو، کوئی تردد بھی نہیں ہوگا، نیز زنا کے باب میں شریعت نے جو شدت اختیار کی ہے اس کا تقاضا بھی یہی ہے کہ زنا سے مصاہرت کی حرمت ثابت ہو جائے گی۔

الحرام لا یحرم الحلال پر ایک نظر

زیر بحث مسئلہ میں جمہور کے موقف ”وطی الحرام یحرّم الحلال“ یعنی حرام وطی (بھی) حلال کو حرام بنا دیتی ہے کے معارضہ میں عام طور پر حضرت عائشہ صدیقہ اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم کی سند سے مروی روایت ”الحرام لا یحرّم الحلال“ یعنی حرام حلال کو حرام نہیں بناتا، پیش کی جاتی ہے۔ بلکہ بعض معاصرین نے (جو صحیحین کی احادیث کی بجائے کسی اور صحیح حدیث سے استدلال پر چیں بجبیں ہو جاتے ہیں) اپنی ایک اخباری تحریر میں اسے اسلام کا ایک ایسا اصول بتایا ہے جسے کسی حال میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے مناسب ہے کہ اس بحث وتحقیق کے آخر میں اس روایت پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے۔

امام ابن الجوزی اپنی مشہور محققانہ تصنیف ”تحقیق احادیث التعلیق“ میں لکھتے ہیں:

احتج الخصم بحدیثین:

(الف) الحدیث الاول: قال الدار قطنی: حدثنا عثمان بن احمد الدقاق، ثنا جعفر بن محمد بن الحسن الرازی ثنا الهیثم بن الیمان(۱)، ثنا عثمان بن عبدالرحمن، عن الزهری، عن عروة عن عائشة قالت: قال رسول الله صلی الله

---

(۱) تنقیح تحقیق احادیث التعلیق کے نسخہ مطبوعہ دار الکتب العلمیہ ۱۴۱۹، ج ۳، ص: ۱۸۰ پر سند کے راوی جعفر بن محمد کے شیخ کا نام القاسم بن الیمان درج ہے جو غلط ہے صحیح الهیثم بن الیمان ہے۔ دیکھئے سنن الدار قطنی، ج ۳، ص: ۲۶۷۔

علیہ وسلم "لا یفسد الحلال بالحرام"(۱)

ترجمہ: حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول خدا...... نے فرمایا: حلال فاسد اور خراب نہیں ہوتا حرام سے۔

(ب) طریق آخر: قال الدار قطنی: وثنا ابوبکر یوسف بن یعقوب بن اسحاق ابن بھلول، نا جدی، ثنا عبداللہ بن نافع مولی بنی مخزوم عن المغیرۃ بن اسماعیل (بن ایوب بن سلمۃ) عن عثمان بن عبدالرحمن عن ابن شھاب عن عروۃ عن عائشۃ ان النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم سُئل عن الرجل یتبع المرأۃ حرامًا، ثم ینکح ابنتھا، او یتبع الابنۃ ثم ینکح امھا، قال: "لا یحرم الحرام الحلال" (ج۳،ص:۱۸۰،۱۸۱)

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام سے پوچھا گیا کہ ایک شخص ایک عورت سے حرام کاری کے لیے اس کے پیچھے لگا رہا تو اس کے بعد اس عورت کی بیٹی سے وہ نکاح کرسکتا ہے یا ایک مرد ایک لڑکی کے پیچھے لگا رہا تو کیا اس کے بعد وہ اس لڑکی کی ماں سے نکاح کرسکتا ہے؟ تو آپ...... نے فرمایا یہ حرام کام حلال کو حرام نہیں کرے گا۔ (بظاہر اس حدیث کا زیر بحث مسئلہ سے تعلق نہیں)

(ج) الحدیث الثانی : قال الدارقطنی: وحدثنا الحسین بن اسماعیل، ثنا علی بن احمد الجواربی، ثنا اسحاق بن محمد الفروی، ثنا عبداللہ بن عمر عن نافع عن ابن عمر عن النبی ﷺ قال: "لا یحرم الحرام الحلال"

ترجمہ: ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی...... نے فرمایا "حرام نہیں بناتا ہے حلال کو حرام"۔

حضرت عائشہ صدیقہ و ابن عمر رضی اللہ عنہم سے مروی ان دونوں روایتوں کو نقل کرنے کے بعد امام ابن الجوزی لکھتے ہیں (فریق مخالف کی جانب سے بطور دلیل پیش

---

(۱) **التنقیح** میں حدیث کے الفاظ یہ ہیں: الحلال لا یفسد بالحرام" جبکہ سنن الدارقطنی میں حدیث کے الفاظ یہ ہیں: "لا یفسد الحلال بالحرام"

کردہ ان دونوں روایتوں کا) جواب یہ ہے کہ

پہلی حدیث جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے دو سندوں سے روایت کی گئی ہے اس کی دونوں سندوں میں ایک راوی عثمان بن عبدالرحمٰن وقّاصی ہیں جن کے بارے میں ”قال یحیی بن معین لیس بشیء، کان یکذب“ وضعفه ابن المدینی جدًّا، وقال البخاری و النسائی والرازی وابوداؤد، لیس بشیء، وقال الدار قطنی متروك، وقال ابن حِبّان: کان یروی عن الثقات الموضوعات لا یجوز الاحتجاج به.

ترجمہ: امام جرح وتعدیل یحیٰی بن معین نے کہا وہ بالکل لائق توجہ نہیں وہ کذب بیانی کرتا تھا، امام بخاری کے استاد علی ابن المدینی نے اس کی بہت زیادہ تضعیف کی ہے، اور امام بخاری، امام نسائی، امام ابوحاتم رازی اور امام ابوداؤد ان سب نے کہا وہ قطعاً لائق توجہ نہیں۔ دارقطنی نے کہا وہ متروک ہے، اور ابن حبان نے کہا کہ وہ ثقہ راویوں سے موضوع روایتیں بیان کیا کرتا تھا اس کی روایت سے احتجاج واستدلال جائز نہیں ہے۔ (انتہی)

علاوہ ازیں امام ذہبی میزان الاعتدال، ج:۳، ص:۴۳ اور الکاشف، ج:۲، ص:۱۰ میں لکھتے ہیں ”قال البخاری ترکوہ“ امام بخاری نے فرمایا کہ محدثین نے اس سے روایت لینی ترک کردی تھی۔ امام بخاری نے خود یہ تصریح کی ہے کہ جس کے متعلق میں یہ لفظ استعمال کروں اس سے روایت کرنی جائز نہیں، نیز حافظ ابن حجر تقریب، ص:۳۸۵ رقم الترجمہ ۴۴۹۳ میں لکھتے ہیں: ”متروك و کذّبه ابن معین“ یہ متروک ہے اور ابن معین نے اس کو جھوٹا بتایا ہے۔

پھر اس حدیث کے مرکزی راوی امام ابن شہاب زہری نے صاف لفظوں میں اس بات سے انکار کیا ہے کہ وہ اس حدیث کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں چنانچہ امام عبدالرزاق نے مصنّف میں اپنے شیخ معمر بن راشد کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ قلت لابن شهاب اَتأثره (ای لا یحرم الحرام الحلال) عن النبی صلی اللّٰه علیه وسلم ؟ فانکر ان یکون حدثه عن النبی صلی اللّٰه علیه وسلم ولکن سمعه من اناس من الناس“ (ج:۷، ص:۱۹۹)

ترجمہ: معمر بن راشد کا بیان ہے کہ میں نے ابن شہاب زہریؒ سے دریافت کیا کہ کیا آپ یہ حدیث رسول اللہ...... سے روایت کرتے ہیں تو انھوں نے اس کو نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم سے روایت کرنے سے انکار کیا اور کہا کہ اس بات کو لوگوں سے کہتے ہوئے سنا ہے۔

علاوہ ازیں امام بیہقی نے اپنی سند سے یونس بن یزید کا ایک قول ذکر کیا ہے جس سے معمر بن راشد کے بیان کی تائید و موافقت ہوتی ہے، بیہقی کے الفاظ یہ ہیں:

عن یونس بن یزید عن ابن شھاب انه سئل عن الرجل یفجر بالمرأة ایتزوج ابنتھا؟ قال: قد قال بعض العلماء ”لایفسد اللّٰه حلالا بحرام“ (سنن الکبریٰ، ج:۷، ص:۱۶۹)

ترجمہ: یونس بن یزید کا بیان ہے کہ ابن شہاب زہری سے پوچھا گیا کہ ایک شخص نے کسی عورت سے حرام کاری کی تو کیا وہ اس عورت کی بیٹی سے نکاح کر سکتا ہے؟ تو انھوں نے فرمایا بعض علماء کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ حرام سے حلال کو فاسد و حرام نہیں کرتے۔

اس حدیث کی سند کے ایک راوی عثمان بن عبدالرحمٰن وقّاصی پر ائمہ جرح و تعدیل کی اس شدید جرح اور سند کے مرکزی راوی امام زہری کی اس وضاحت کے بعد کہ وہ اس حدیث کو مرفوعاً روایت نہیں کرتے، مسئلہ زیر بحث میں اس سے استدلال درست نہیں چہ جائیکہ اسے اسلام کے اصول کلی کے طور پر پیش کیا جائے۔

دوسری حدیث (جو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کی جاتی ہے) پر بحث کرتے ہوئے امام ابن الجوزی حنبلی لکھتے ہیں:

وفی الحدیث الثانی: عبد اللّٰه بن عمر (بن حفص بن عاصم بن عمر بن الخطاب العمری) وھو اخو عبید اللّٰه، قال ابن حبان: فحش خطوہ فاستحق الترك، وفیه اسحاق الفروی، قال یحییٰ: لیس بشیء، کذاب، وقال البخاری ترکوہ“ (تنقیح تحقیق احادیث التعلیق)

ترجمہ: دوسری حدیث کی سند میں عبداللہ بن عمر (العمری) ہیں جو عبیداللہ بن عمر العمری کے بھائی ہیں، ابن حبان نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ کثرت سے غلطی

کرتے تھے اس لیے مستحق ترک ہوگئے، نیز اس کی سند میں اسحاق (ابن محمد) الفروی ہیں (جو عبداللہ بن عمر العمری سے روایت کرتے ہیں) ان کے بارے میں (امام جرح و تعدیل) یحییٰ بن معین نے فرمایا یہ لائق توجہ نہیں، کذاب ہے، اور امام بخاری نے فرمایا کہ محدثین نے ان سے روایت ترک کردی ہے۔

(ضروری تنبیہ) حافظ ابوالفرج ابن الجوزی نے اس حدیث کی سند میں واقع راوی ''اسحاق بن محمد الفروی'' پر جو جرحیں نقل کی ہیں اس نقل میں ان سے چوک ہوگئی ہے، امام جرح وتعدیل یحییٰ بن معینؒ اور امام بخاریؒ نے یہ جرحیں ''اسحاق بن عبداللہ بن ابی فروہ'' پر کی ہیں جو زیر نظر راوی اسحاق بن محمد بن اسماعیل بن عبداللہ بن ابی فروہ کے دادا اسماعیل بن عبداللہ کے بھائی ہیں، غالبا دونوں کے ناموں میں یکسانیت کی بناء پر ان سے یہ غلطی ہوگئی، حافظ ابن الجوزی پر اعتماد کرتے ہوئے قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ نے تفسیر مظہری، ج:۲، ص:۵۵ میں یہی جرحیں اسحاق بن محمد الفروی کے متعلق درج کردی ہیں۔ امام بخاریؒ نے خود صحیح بخاری میں اسحاق بن محمد الفروی سے روایت کی ہے تو پھر ان کے بارے میں ''ترکوہ'' لوگوں نے انھیں ترک کردیا ہے کی جرح کیسے کریں گے۔ (دونوں سے متعلق تفصیلات کے لیے دیکھئے تہذیب الکمال، ج:۱، ص:۱۹۲، رقم الترجمہ ۳۶۱ وص:۱۹۷، الرقم ۳۷۴، وتہذیب التہذیب، ج:۱، ص:۲۱۸، الرقم ۴۰۲ وص:۲۲۵، الرقم ۴۱۶)

اسحاق بن محمد الفروی پر ائمہ جرح وتعدیل کی جرحیں ذیل میں ملاحظہ کیجئے:

حافظ ذہبی المغنی فی الضعفاء میں ان کے ترجمہ میں لکھتے ہیں:

قال النسائی: لیس بثقة، وقال ابوداؤد: واہٍ، وقال ابوحاتم وغیرہ صدوق، قلت (القائل وھو الذھبی) روی عنه البخاری فی صحیحه، وقال الدار قطنی: ضعیف تکلموا فیه. (ج:۱،ص:۱۱۱،الرقم۵۷۹)

ترجمہ: امام نسائی نے کہا وہ ثقہ نہیں ہیں، امام ابوداؤد نے کہا بہت کمزور ہیں، ابوحاتم الرازی وغیرہ نے کہا صدوق ہیں، خود امام ذہبی نے کہا امام بخاری نے ان سے صحیح بخاری میں روایت کی ہے، اور امام دارقطنی نے کہا ضعیف ہیں محدثین نے ان پر کلام کیا ہے۔

اور حافظ ابن حجر لکھتے ہیں:

قال ابو حاتم : كان صدوقا ولكن ذهب بصره فربّما لُقن و كتبه صحيحة، وقال مرة: يضطرب، وذكره ابن حِبّان فی كتاب الثقات قلت: (القائل الحافظ) قال الآجرّی سألت ابا داؤد عنه فوهاه جدا، ... وقال النسائی: متروك، وقال الدار قطنی: ضعيف وقد روى عنه البخاری و يُوبّخونه فی هذا، وقال الدار قطنی ايضا: لا يترك، وقال الساجی: فيه لين، ... وقال الحاكم عُيّب علی محمد اخراج حديثه وقد غمزوه. (تهذيب التهذيب، ج:۱، ص: ۲۲۵)

ترجمہ: ابوحاتم رازی نے کہا وہ صدوق تھے، لیکن نابینا ہو گئے تھے تو بسا اوقات ان کی غیر مروی روایت کے بارے میں کہا جاتا کہ یہ آپ کی مروی روایت ہے تو اسے مان لیتے تھے (محدثین کی اصطلاح میں اسی کو تلقین سے تعبیر کیا جاتا ہے اور یہ راوی میں بڑا عیب شمار کیا جاتا ہے جس کی بناء پر وہ لائق احتجاج نہیں رہ جاتا) اور امام ابوحاتم نے ایک بار کہا کہ وہ مضطرب الحدیث ہیں، اور ابن حبان نے ان کا ذکر اپنی کتاب الثقات میں کیا ہے، حافظ ابن حجر کہتے ہیں کہ امام ابوداؤد کے شاگرد ابوعبید آجرّی کا بیان ہے کہ میں نے ان کے متعلق ابوداؤد سے سوال کیا تو انھوں نے ان کو بہت کمزور بتایا، اور امام نسائی نے کہا وہ متروک ہیں، اور دار قطنی نے کہا ضعیف ہیں اور بخاری نے ان کے واسطہ سے روایت کی ہے اور محدثین نے اس پر امام بخاری کی توبیخ کی ہے، اور دار قطنی نے یہ بھی کہا کہ یہ متروک نہیں ہیں، اور ساجی نے کہا ان میں کمزوری ہے اور امام حاکم نے کہا محدثین نے بخاری کے ان سے روایت کرنے پر اعتراض کیا ہے۔ انتہی

ان تفصیلات کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ فی الجملہ صدوق ہیں (اور امام ابوحاتم رازی کی تصریح کے مطابق صدوق کی روایت بغرض بحث ونظر لکھی جائے گی دیکھئے کتاب الجرح والتعدیل، ج:۲، ص: ۳۷) اور ان کی کتاب صحیح تھی، نابینا ہو جانے کے بعد ان کا حافظہ لائق اعتبار نہیں رہ گیا تھا انھیں وجوہ سے ان کی سند سے روایت کی تخریج پر محدثین نے امام بخاری پر اعتراض کیا ہے۔ جس کا جواب حافظ ابن حجر نے ہدیۃ الساری مقدمہ فتح الباری

میں ان الفاظ سے دیا ہے "كأنها مما اخذ عنه من كتابه قبل ذهاب بصره" (ص: ۵۵۰) امام بخاری کی ان سے مروی یہ روایت ممکن ہے ان روایتوں میں سے ہو جو ان کے نابینا ہونے سے پہلے ان کی کتاب سے لی گئی ہو۔ جس کا حاصل یہی ہے کہ حافظ ابن حجرؒ ان کے ضعف کو بالخصوص نابینا ہوجانے کے بعد تسلیم کرتے ہیں۔ البتہ ان کی سند سے امام بخاری کی تخریج کردہ روایت کو صحیح قرار دیتے ہیں۔

حاصل کلام یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی اس حدیث میں دو راوی مسلسل یعنی اسحاق بن محمد الفروی، اور عبداللہ بن عمر العمری ضعیف ہیں۔ اگرچہ دونوں کا ضعف شدید نہیں ہے، ہاں اگر سند میں ان میں سے صرف ایک ہوتا تو ایک حد تک یہ قابل قبول ہوسکتی تھی، لیکن اس اجتماع کی صورت میں یہ لائق احتجاج نہیں ہوسکتی۔ لہٰذا حضرت عائشہ صدیقہ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہم سے مروی ان دونوں روایتوں سے مسئلہ زیر بحث پر استدلال صحیح نہیں ہے چہ جائیکہ انھیں قواعد الاصول کے طور پر پیش کیا جائے۔

یہ روایت اپنے عموم پر نہیں ہے

اس موقع پر یہ بات بھی ملحوظ رہنی چاہئے کہ اس روایت کا عام معنی مراد لینا صحیح نہیں ہے کیونکہ باتفاق فقہاء ومحدثین بہت سے حرام امور ایسے ہیں جو حلال کو حرام کردیتے ہیں، ایسے چند امور بطور مثال ملاحظہ کیجئے:

(الف) ماہ رمضان کے دن میں بیوی یا باندی سے ہم بستری باتفاق اہل اسلام حرام ہے، جبکہ اس وطی حرام سے باتفاق حرمت مصاہرت کا ثبوت ہوجاتا ہے۔

(ب) بحالت حیض (ماہواری کی حالت میں) بیوی یا باندی سے جنسی عمل باتفاقِ مسلمین حرام ہے، اس وطی حرام سے سب کے نزدیک حرمت مصاہرت ثابت ہوجاتی ہے۔

(ج) اپنی بیوی سے ظہار(۱) بلا اختلاف حرام و ناجائز ہے، جبکہ اس فعل حرام سے

---

(۱) بیوی کو اپنی ماں کی پیٹھ کے مشابہ کہنا۔ شریعت اسلامی کی اصطلاح میں ''ظہار'' کہلاتا ہے جو قرآن، حدیث اور اجماع سب کے رو سے حرام ہے۔ اس طرح کہہ دینے سے شوہر پر اس کی بیوی حرام ہوجاتی ہے اور جب تک اس جرم کا کفارہ نہ دیدے بیوی سے ہم بستری حرام ہے۔

بیوی سے باتفاق ہم بستری حرام ہو جاتی ہے۔

(د) ردّت (یعنی اسلام سے پھر جانا نعوذ باللہ منہا) قطعی طور پر حرام ہے، اور اس فعل حرام سے باتفاق زوجۂ مسلمہ حرام ہو جاتی ہے۔

(ھ) وطی بالشبہ (یعنی اندھیرے وغیرہ کی بناء پر غلطی سے بیوی کی ماں یا بیوی کی بیٹی سے ہمبستری) حرام و ناجائز ہے، اس وطی حرام سے بھی سب کے نزدیک حرمت مصاہرت ثابت ہو جاتی ہے۔

(و) وطی بنکاح فاسد (یعنی وہ نکاح جسے شریعت نے صحیح قرار نہیں دیا ہے) بھی حرام و ناجائز ہے جبکہ سب کے نزدیک بلا اختلاف اس سے حرمت مصاہرت کا ثبوت ہو جاتا ہے۔

غرضیکہ باتفاق علماء اسلام حرام سے حلال کے حرام ہو جانے کی بیشمار صورتیں ہیں اس لئے ''الحرام لایحرّم الحلال'' کا یہ معنی کہ ''کوئی حرام، حلال کو حرام نہیں کرتا'' کسی کے نزدیک صحیح نہیں ہے، بلکہ سب کے نزدیک اس کا درست اور واقع کے مطابق یہ معنی ہے کہ بعض حرام، حلال کو حرام نہیں کرتے، اور اس متفقہ معنی کی صورت میں اس روایت سے زنا سے حرمت مصاہرت کے ثابت نہ ہونے پر استدلال کے لیے ضروری ہوگا کہ پہلے کسی دلیل شرعی سے یہ ثابت کیا جائے کہ ''زنا'' بھی بعض ان حرام کاموں میں سے ہے جو حلال کو حرام نہیں بناتے ہیں۔ یہ دلیل پیش کئے بغیر اس روایت سے استدلال از روئے اصول صحیح نہیں ہے۔

اس بحث و نظر سے یہ بات منقح ہو کر سامنے آگئی کہ زنا سے حرمت مصاہرت کے ثابت نہ ہونے پر یہ روایت سند اور معنی دونوں لحاظ سے دلیل بنانے کے لائق نہیں چہ جائیکہ اسے فقہ اسلامی کے قواعد اصول کے طور پر پیش کیا جائے۔

اوپر مذکور تفصیلات سے یہ بات روشن ہوگئی کہ مسئلہ زیر بحث کا تعلق فقہائے اسلام کی عقل ورائے سے نہیں بلکہ براہ راست قرآن وحدیث، آثار صحابہ اور تابعین رضوان اللہ علیہم اجمعین کی تصریحات سے ہے، اور اس میں کس صاحب ایمان کو کلام ہو سکتا ہے کہ سلف صالحین کی یہ جماعت قرآن وحدیث کے علم و فہم، اسلامی احکام کے علل و حکم کے ادراک،

نیز صدق و دیانت اور اسلام و مسلمانوں کی خیر خواہی میں جس بلند و بالا مرتبہ پر فائز تھی، بعد کی نسلیں بغیر کسی استثناء کے اس درجہ تک نہیں پہنچ سکتیں۔ اس لیے فقہ اسلامی کی تاسیس اور تدوین و ترتیب میں ان کے آثار و اقوال سے چشم پوشی نہیں کی جاسکتی۔ پھر فقہاء مجتہدین میں اس مذہب کے اختیار میں امام اعظم ابوحنیفہ اور ان کے تلامذہ ہی نہیں بلکہ امیر المومنین فی الحدیث اور امام مجتہد سفیان ثوری، امام اوزاعی، امام احمد بن حنبل وغیرہ رحمہم اللہ کا بھی یہی مذہب ہے۔ اوپر سطور میں ہم بتا چکے ہیں کہ امام سفیان ثوری اور امام اوزاعی رحمہما اللہ ان فقہائے مجتہدین اور ائمہ حدیث میں سے ہیں جن کے مذہب پر ایک زمانہ تک عمل کیا جاتا رہا ہے۔ علاوہ ازیں امام دار الہجرۃ مالک بن انس رحمہ اللہ کے مذہب کے سب سے بڑے اور معتبر ترجمان ابن القاسم کی روایت کے مطابق امام مالکؒ بھی مذکورہ ائمہ مجتہدین کے ہم نوا ہیں، اگرچہ جمہور مالکیہ امام مالک کے دوسرے قول پر عمل پیرا ہیں جو مؤطاء مالک میں مذکور ہے۔ پھر حافظ ابن حجر فتح الباری، ج:۱۲، ص:۴۳۳ میں لکھتے ہیں "هو قول الجمهور" یہی جمہور کا قول ہے اور شرح ابوداؤد المنہل کے تکملہ "فتح الملک المعبود" ج:۴، ص:۴۸۱ میں علامہ امین محمود استاذ جامع از ہر مصر نے صراحت کی ہے کہ یہی جمہور صحابہ اور تابعین کا مذہب ہے، تو اس جمہور صحابہ، تابعین، ائمہ مجتہدین اور فقہائے محدثین کے اس مذہب منصور پر حالیہ دنوں کا یہ شور و غوغا آخر چہ معنی دارد؟

ہواؤں کا رخ بتا رہا ہے ضرور طوفان آ رہا ہے
نگاہ رکھنا سفینہ والو! اٹھی ہیں موجیں کدھر سے پہلے

بجا شکایت

یورپ کی فکری و تہذیبی غلامی میں گرفتار میڈیا جس نے ایک عرصہ سے اسلامی تہذیب و ثقافت کے خلاف مہم چھیڑ رکھی ہے، اس سے مسئلہ زیر بحث میں کسی سنجیدگی کی توقع کیونکر کی جاسکتی تھی، چنانچہ اپنی قدیم روایت کے مطابق اس نے اپنے آقاؤں کا حق ادا کرنے میں بڑی تندہی کا ثبوت دیا، اسی طرح جماعتِ اہل حدیث (غیر مقلدین) جس

کے ایک طبقہ کو فقہ اسلامی کے متفقہ عظیم مجتہد امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کو ایک صحیح العقیدہ، معمولی درجہ کا مسلمان ماننا بھی گوارا نہیں، اس نے بھی اسلامی فقہ کو غبار آلود بنانے کے لیے اپنی ساری صلاحیتیں صرف کر دیں اور علمی و دینی مسائل میں بحث و نظر کے مسلمہ آداب کو بالائے طاق رکھ کر طعن و تشنیع کے جس قدر تیر ان کے ترکش میں تھے انھیں آزمانے میں پوری چابکدستی کا مظاہرہ کیا، اور اس کی قطعی پرواہ نہیں کی کہ ان کے اس رویہ سے غیروں میں اسلام کی کیا تصویر ابھرے گی۔

دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام
کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے

اس موقع پر ہمارے بعض اصلاح پسند دانشوروں نے بھی خاموشی کو اپنی دانشوری کی توہین سمجھا لہٰذا وہ بھی اس دنگل میں کود پڑے اور آج کے مغرب گزیدہ معاشرہ (جس میں بیٹی باپ سے مأمون نہیں، بہن بھائی سے خائف ہے اور بھتیجی و بھانجی، چچا و ماموں سے ترساں ہے) کی اصلاح و درستگی کی دانشمندانہ فکر کرتے الٹے فقہ اسلامی کی اصلاح و تجدید کے درپئے ہو گئے، اور اپنی دانشوری کو بروئے کار لاتے ہوئے یہ آوازہ بلند کیا کہ فقہ اسلامی کا یہ قدیم مجموعہ آج کے معاشرہ کی رہنمائی نہیں بلکہ ہم رکابی سے قاصر ہے اس لئے وقت کا تقاضا ہے کہ نئے اجتہاد کے ذریعہ اسے تازہ دم اور اس قابل بنا دیا جائے کہ مغربی تہذیب سے ہم آغوش معاشرہ کا ساتھ دے سکے۔ اور حد تو یہ ہے کہ بعض وہ سیاسی دانشور جو انگریزی ترجمہ کی مدد کے بغیر قرآن و حدیث کی ایک سطر کا معنی سمجھ نہیں سکتے، شریعت اسلامی میں اجتہاد کے لیے پر تول رہے ہیں اور اپنے طور پر اس کا ایک مجتہدانہ خاکہ بھی پیش کر دیا ہے ان کے تخیل کی اس بلند پروازی پر اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ

اپنی حدوں میں رہیئے کہ رہ جائے آبرو
اوپر کو دیکھنا ہے تو پگڑی سنبھالئے

لہٰذا پہلے اپنے اندر اجتہاد کی مطلوبہ صلاحیتیں پیدا کیجئے پھر شوق سے اجتہاد کیجئے سنا اور مانا جائے گا۔

بعض اشکالات ومطالبات پر ایک نظر

(الف) زیر گفتگو مسئلہ میں احناف وحنابلہ بلکہ جمہور کے موقف کے معارضہ میں بڑی شدومد کے ساتھ یہ بات کہی جارہی ہے کہ ”یہ ایسا اندھا فتویٰ ہے جو مجرم وغیر مجرم میں فرق کئے بغیر دونوں کو مورد سزا قرار دیتا ہے اس لئے ازروئے عقل وانصاف یہ لائق تسلیم نہیں ہے۔“

بہ نظر ظاہر یہ ایک مضبوط اعتراض معلوم ہورہا ہے اسی لئے فقہ اسلامی کی دشمنی یا سادہ لوحی میں اسے خوب اچھالا جارہا ہے جبکہ یہ ایک نرا مغالطہ ہے، کسے معلوم نہیں کہ آج کی مہذب دنیا میں بعض جرائم کی سزا میں مجرم کو تختۂ دار پر چڑھا دیا یا قتل کردیا جاتا ہے، کیونکہ قانون وانصاف کا فیصلہ یہی تھا لیکن قانون کے اس فیصلہ سے مجرم کی بے گناہ بیوی بیوہ اوراس کے معصوم بچے یتیم ہوگئے آخر اس بیچاری عورت نے کیا قصور کیا تھا جس کی پاداش میں اسے بیوگی کی صبر آزما اور کسمپرسی کی زندگی پر مجبور اوراس کے نادار وناتواں بچوں کو بے سہارا بنادیا گیا؟ ان غرض پسند فرزانوں کو کون سمجھائے کہ یہ قانون کا اندھاپن نہیں بلکہ اس کا دوررس لازمی اثر ہے جس سے سزایافتہ مجرم کے بعض متعلقین متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ یہ ایک ایسی مشاہد حقیقت ہے جس کے شعور کے لئے کسی غور وفکر کی بھی ضرورت نہیں لیکن یہ پرستان عقل ودانش فقہ اور علمائے فقہ کی دشمنی میں اس قدر مدہوش ہیں کہ انھیں یہ بھی پتہ نہیں کہ ان کے سر سے کیا نکل رہا ہے۔

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا   کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

(ب) ”بعض حلقوں کی جانب سے بڑے پرجوش انداز میں یہ اصرار کیا جارہا ہے کہ اس مسئلہ پر صریح آیت قرآنی یا صریح حدیث سے دلیل پیش کی جائے بغیر اس کے یہ فتویٰ نہ شرعی ہوگا اور نہ اس لائق کہ اسے قبول کیا جائے۔“

ہر پڑھا لکھا مسلمان جانتا ہے کہ سارے اہل سنت والجماعت کے نزدیک اصول فقہ بالفاظ دیگر شریعت کے دلائل چار ہیں: (۱) قرآن حکیم، (۲) حدیث رسول (فقہائے

احناف اور بہت سارے دیگر فقہاء و محدثین کے یہاں بعض قیدوں کے ساتھ حضرات صحابہ بالخصوص خلفاء اربعہ رضوان اللہ علیہم کے فتویٰ اور اقوال بھی حدیث ہی کے حکم میں ہیں) (۳) اجماع، (۴) قیاس۔

لہٰذا ان چاروں اصولوں میں سے جس اصل سے بھی کوئی حکم ثابت ہو جائے وہ فرق مراتب کے ساتھ شریعت ہی کا حکم ہوگا، اور اس کی اس شرعی حیثیت کو تسلیم کرنا لازم ہے، اس لیے یہ مطالبہ کہ فلاں اصول و دلیل مسئلہ کے ثبوت میں پیش کی جائے اصولی طور پر غلط ہے۔ بلا شبہ کسی دعویٰ پر مدعی سے دلیل اور گواہ کا مطالبہ شرع، قانون اور عقل ہر اعتبار سے درست ہے اور فریق مخالف کو اس مطالبہ کا مکمل حق ہے نیز مدعی کے پیش کردہ دلیل و گواہ پر معارضہ اور جرح کا بھی اسے حق حاصل ہے، لیکن مدعی سے کسی خاص و متعین دلیل و گواہ کا مطالبہ کسی لحاظ سے بھی درست نہیں۔ دنیا کے کسی بھی مذہب یا قانون میں اس مطالبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔ اس لئے یہ مطالبہ انتہائی بیخبری، یا ضد و عناد پر مبنی ہے، جو اس کا مستحق ہے کہ باہر گلی میں پھینک دیا جائے۔

نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے
اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں

(ج) کچھ پڑھے لکھے لوگوں کی طرف سے یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ اس مسئلہ کو عقلی دلیلوں سے مدلل کیا جانا چاہئے تھا تا کہ سب کے لئے قابل قبول ہو جاتا۔

ان ناصحین سے عرض ہے کہ جن باتوں کا تعلق نقل و سماع (زبانی یا تحریری بیان اور سننے) سے ہوتا ہے اس پر صحیح عقلی دلیل قائم نہیں کی جا سکتی، ان میں نقل و بیان پر اعتماد کیا جاتا ہے، مثلاً ہر شخص کو اپنے والد کے بارے میں بغیر ادنیٰ تردد و شک کے یقین کامل ہوتا ہے کہ یہی میرے والد اور باپ ہیں کیونکہ آدمی جب سے ہوش سنبھالتا ہے ہر قریب بعید، آشنا، غیر آشنا، اپنے اور پرائے سب سے یہی سنتا رہتا ہے کہ ”یہ فلاں کے والد“ ہیں، تو کیا کوئی شخص اپنے والد کے والد ہونے پر کوئی عقلی دلیل قائم کر سکتا ہے؟ ہرگز نہیں کیونکہ نقلی و سماعی باتیں دائرۂ عقل میں آتی ہی نہیں، ہم تاریخ کی کتابوں میں پڑھتے رہتے ہیں کہ

''جہانگیر'' ہندوستان کا ایک عادل و منصف بادشاہ تھا، تاریخ کے اس بیان پر اعتماد کی بناء پر ہمیں جہانگیر کی بادشاہت پر پورا وثوق اور یقین ہے، اب اگر کوئی فریب خوردہ عقل ہم سے مطالبہ کر بیٹھے کہ جہانگیر ہندوستان کا حکمراں تھا اس پر عقلی دلیل پیش کرو ورنہ پھر اپنے اس یقین سے دست بردار ہو جاؤ تو کیا اس تاریخی و نقلی خبر پر دلیل عقلی نہ ہونے کی بناء پر ہم اپنے یقین سابق سے منحرف ہو جائیں گے؟ ہرگز نہیں، لہٰذا شرع سے منقول اس حکم پر دلیل عقلی کا مطالبہ بجائے خود بے عقلی ہے۔

اپنی کمزوری بیان کرتا ہے ہر دانش فروش
حضرت ناصح نہیں سمجھے تو سمجھانے لگے

(د) ایک صاحب قلم عالم نے مسئلہ زیر نظر سے متعلق اپنی تحریروں میں بار بار یہ بات لکھی ہے کہ اسلامی شریعت میں مصلحت کا بطور خاص لحاظ رکھا گیا ہے مگر اس فتویٰ کے جاری کرنے میں مصلحت کو نظر انداز کر دیا گیا۔

اس سلسلے میں آں محترم سے عرض ہے کہ علمائے اسلام نے مصلحت کی دو قسمیں بیان کی ہیں ایک مصلحت دینی اور دوسری مصلحت دنیوی اور ساتھ ہی یہ وضاحت بھی کر دی ہے کہ پہلی یعنی مصلحت دینی کے ثبوت واعتبار کے واسطے ضروری ہے کہ شارع کی جانب سے اس کے مصلحت ہونے پر نص ہو کیونکہ شرعی مصلحت وہی ہو سکتی ہے جسے خود شریعت مصلحت قرار دے۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ مصلحت تو شریعت کی ہو اور اس کی تعیین و تشخیص کوئی اور کرے۔

اور دوسری یعنی مصلحت دنیوی کے معتبر ہونے کے لئے یہ شرط ہے کہ وہ مصلحت کسی حکم شرعی سے متعارض نہ ہو، کیونکہ شارع کے حکم اور مصلحت میں تعارض و ٹکراؤ کی صورت میں لازم آئے گا کہ (حاشا وکلا) شارع کو اس مصلحت کا علم نہیں تھا اسی لئے تو اس کے معارض و مخالف حکم دیدیا۔ اور ظاہر ہے کہ یہ لازم قطعی طور پر غلط ہے لہٰذا اس مصلحت کا مصلحت ہونا بھی کسی حال میں صحیح نہیں ہو سکتا کیونکہ جس چیز کی بنیاد غیر درست ہوتی ہے وہ بجائے خود غیر درست ہی ہوا کرتی ہے۔

خشت اول چوں نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج

جبکہ آں محترم نے اپنی تحریر میں یہ واضح نہیں کیا ہے کہ اس فتویٰ میں جس مصلحت کو نظر انداز کر دیا گیا ہے وہ کونسی مصلحت ہے دینی یا دنیوی نیز اس کی عرفی حیثیت بھی بیان نہیں کی ہے کہ وہ شرائط کے مطابق معتبر ہے یا نہیں، آخر اس مجمل و مبہم مصلحت کے ذکر سے ان کی غرض کیا ہے؟ حالانکہ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ دنیائے علم وفن میں اس طرح کی مجمل و مبہم باتیں نہ صرف یہ کہ پایۂ اعتبار سے محروم ہوتی ہیں بلکہ جن چیزوں میں ان کا عمل دخل ہوتا ہے انھیں بھی بے اعتبار بنا دیتی ہیں۔

یہ تحریر اندازہ سے زیادہ طویل ہوگئی اس لئے سلسلہ گفتگو انھیں گذارشات پر ختم کیا جاتا ہے۔ موضوع سے متعلق اس بحث ونظر میں خدا جانتا ہے کہ کسی کی تردید یا تنقیص قطعی مقصود نہیں بلکہ دلائل کی تحقیق و تنقیح سے متعلق یہ ایک طالب علمانہ کوشش ہے اور بس۔

وما توفیقی الا باللّٰہ وعلیہ توکلت والیہ انیب،
وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العالمین
والصلوٰۃ والسلام علی سیدالانبیاء والمرسلین
وعلی آلہ اصحابہ اتباعہ اجمعین.

☆ ☆ ☆

حقیقت رجم بحث وتحقیق کے آئینہ میں

جناب مولانا محمد عنایت اللہ اسد سبحانی استاذ جامعۃ الفلاح بلریا گنج اعظم گڈھ کی نئی تصنیف ''حقیقت رجم کتاب وسنت کی روشنی میں'' ایک دوست کے ذریعہ دیکھنے کو ملی۔ اس کتاب میں احادیث رسول، تعامل صحابہ، اقوال سلفِ صالحین اور اجماعِ امت کے برخلاف شادی شدہ زانی کی سزائے رجم کے مسئلہ میں خوارج ومعتزلہ، گمراہ فرقوں کی تائید وتصویب کی گئی ہے۔ کتاب کیا ہے، تحریفات وتلبیسات کا ایک مجموعہ ہے جس کے ذریعہ امتِ مسلمہ کے قلوب سے صحابہ کی عظمت اور سلف صالحین کی علمی ودینی وقعت کو ختم کرنے کی بظاہر ایک ناروا کوشش کی گئی ہے۔

زیر نظر تحریر میں اسی کتاب کا اجمالی علمی جائزہ لیا گیا ہے۔

الحمد للّٰہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی سیّد المرسلین وعلی آلہ واصحابہٖ أجمعین .... امابعد

اسلامی احکام کے بارے میں معتبر بحث وتحقیق

اسلامی احکام ومسائل کا ثبوت قرآن مبین سے ہوتا ہے، یا رسول خدا...... کی سنت ثابتہ سے، یا پھر امت وسط وعدل کے اجماع سے۔ کسی مسئلہ سے متعلق ان مذکورہ مصادر میں صراحتاً اگر حکم معلوم نہ ہوسکے تو پھر ائمہ مجتہدین وسلف صالحین کے استنباطات وقیاسات کی جانب رجوع کیا جاتا ہے۔ شرعی مسائل ومعاملات کے بارے میں امت کے سواد اعظم کا یہی رویہ اسلام کی ابتدائی صدیوں سے معلوم ومتعارف چلا آرہا ہے جس سے اعراض و

انحراف بلاشبہ شذوذ کی راہ ہے جس پر کتاب وسنت میں نہایت شدید وعیدیں آئی ہیں۔

اس لیے اسلامی احکام میں وہی بحث وتحقیق معتبر اور قابل اعتماد ہوگی جو ان مصادر اربعہ سے ماخوذ ومؤید ہو، زانی محصن کی سزائے رجم بھی ایک خالص اسلامی مسئلہ ہے جس پر غور وفکر، بحث وتحقیق، قرآن وسنت، اجماع امت اور قیاس مجتہدین ہی کی روشنی میں کی جائے گی اور ان مصادر شرعیہ سے ثبوت فراہم ہو جانے کے بعد اس کے آگے سرِ تسلیم خم کر دینا ہی ایک سچے پکے مسلمان کی شان ہے۔ اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے عہد خیر وصداقت سے لے کر (بجز چند راہ صواب سے بھٹکے ہوئے فرقوں کے) پوری امت مسلمہ شادی شدہ زانی کے رجم پر متفق ومتحد ہے۔ مشہور مفسر علامہ سید محمود آلوسیؒ اپنی محققانہ تفسیر رُوح المعانی میں لکھتے ہیں:

زانیٔ محصن کے رجم پر امت کا اجماع

”وقد اجمع الصحابة رضى اللّٰه تعالىٰ عنهم ومن تقدمنّا من السلف وعلماء الامة وائمة المسلمين على ان المحصن يرجم بالحجارة حتى يموت، وانكار الخوارج ذٰلك باطل لانهم ان انكروا وقوعه من رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم لانكار حجية خبر الواحد فهو بعد بطلانه بالدليل، ليس مما نحن فيه لان ثبوت الرجم عنه عليه الصلوٰة والسلام متواتر المعنىٰ كشجاعة علي كرم اللّٰه الله تعالى وجهه وجود حاتم والآحاد فى تفصيل صورة وخصوصياته وهم كسائر المسلمين يوجبون العمل بالمتواتر معنىً كالمتواتر لفظاً الا ان انحرافهم عن الصحابة والمسلمين وترك التردد الى علماء المسلمين والرواة اوقعهم فى جهالات كثيرة لخفاء السمع عنهم والشهرة“. (۱)

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور ہم سے پیشتر سلفِ صالحین، علماء امت اور ائمہ
اسلام کا اس پر اجماع ہے کہ شادی شدہ زانی کو سنگسار کیا جائے گا یہاں

---

(۱) روح المعانی، ج:۲،ص:۷۸،۷۹۔

> تک کہ وہ مرجائے، خوارج کا اس مسئلہ سے انکار یکسر باطل ہے۔ کیوں کہ اگر وہ اجماع صحابہ کی حجیۃ کے منکر ہیں تو یہ جہل مرکب ہے۔ اور اگر وہ رسول اللہ...... سے رجم کے ثبوت کا بایں وجہ انکار کرتے ہیں کہ یہ ثبوت خبر واحد سے ہے تو ان کا یہ موقف ہی باطل ہے۔ علاوہ ازیں مسئلہ زیر بحث کا تعلق خبر واحد سے نہیں ہے کیونکہ رجم کا ثبوت آنحضرت ...... سے معنیً متواتر ہے جس طرح علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی شجاعت اور حاتم کی سخاوت کا ثبوت تواتر معنوی سے ہے اگرچہ ہر واقعہ کی صورتیں اور تفصیلات متواتر نہیں ہیں پھر عام مسلمانوں کی طرح خارجی بھی متواتر معنی پر عمل اسی طرح ضروری سمجھتے ہیں جس طرح متواتر لفظی واجب العمل ہے، مگر صحابہ اور عام مسلمانوں سے خارجیوں کے الگ تھلگ رہنے اور علماء مسلمین و حدیث کے راویوں کے پاس آمد و رفت نہ رکھنے کی بناء پر وہ بہت سی جہالتوں میں جا گرے تھے۔ کیوں کہ حدیث اور دینی باتوں سے ان کے کان نا آشنا اور مشہور احادیث و مسائل کی شہرت ان پر مخفی رہ گئی تھی۔

علامہ آلوسی کے علاوہ محقق ابن ہمام حنفی، مشہور فقیہ و شارح حدیث شیخ محی الدین نووی شافعی، امام موفق ابن قدامہ مقدسی حنبلی، حافظ ابوالولید ابن رشد مالکی، امام ابن حزم ظاہری وغیرہ محققین علماء کرام نے بھی اپنی اپنی تصانیف میں زانی محصن کے رجم پر اجماعِ امت کا ذکر کیا ہے۔ حوالے کے لیے دیکھئے علی الترتیب۔ (۱)

اس جماع کی تائید تورات سے

اس موقع پر یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہئے کہ زانی محصن کے رجم پر نہ صرف امتِ محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا اتفاق و اجماع ہے بلکہ اس مسئلہ کے بارے میں تورات کا

---

(۱) فتح القدیر شرح ہدایۃ، ج ۵ ص ۱۲، شرح مسلم النووی، ج ۲، ص ۶۵، المغنی، ج ۷، ص ۱۷۵، بدایۃ المجتہد، ج ۲، ص ۱۲۶، المحلّٰی، ج ۱۱ ص: ۲۴۱۔

بھی یہی فیصلہ ہے اور تورات کے وہ فیصلے جنھیں انجیل میں صریح الفاظ سے رد نہ کر دیا گیا ہو وہ نصاریٰ کے یہاں بھی حجت ہوتے ہیں اور انجیل میں اس کی ممانعت ثابت نہیں اس لیے تورات کا یہ فیصلہ یہود و نصاریٰ دونوں فرقوں کے نزدیک اصولی طور پر حجت اور واجب العمل ہے۔

خود قرآن کریم نے توریت کے اس حکم کو ''حکم اللہ'' قرار دے کر اس کی صداقت و حقانیت پر مہر تصدیق ثبت کر دی ہے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے ”وکیف یحکمونك وعندهم التوراة فیها حکم اللّٰه“ (المائدہ) اور وہ آپ کو کیسے منصف بنا سکتے ہیں، حالانکہ ان کے پاس توریت ہے جس میں اللہ کا حکم موجود ہے، اہل علم جانتے ہیں کہ یہ آیت یہود کے مقدمۂ زنا کے متعلق نازل ہوئی تھی۔ موجودہ بائبل میں بھی (اس کی تحریف کے باوجود) رجم کا حکم موجود ہے، کتاب استثناء میں ہے:

”واذا کانت فتاة عذراء مخطوبة لرجل فوجدها رجل بالمدینة فاضطجع معها فاخرجوهما کلیهما من المدینة وارجموهما بالحجارة حتی یموتا، الفتاة من اجل انها لم تصرخ فی المدینة والرجل من اجل انه اذل امرأة صاحبه فینتزع الشر من المدینة“(۱)

> اگر کنواری لڑکی کسی کے رشتہ نکاح میں منسوب ہو اور کوئی دوسرا شخص اسے شہر میں پا کر اس کے ساتھ صحبت کرے، تو ان دونوں کو شہر سے باہر نکالو اور انھیں سنگسار کرو یہاں تک کہ دونوں مر جائیں۔ لڑکی کو اس لئے کہ اس نے شہر میں ہوتے ہوئے شور نہیں مچایا، اور مرد کو اس لیے کہ اس نے اپنے ساتھی کی بیوی کو بے حرمت کیا۔ پس شر و برائی کو اس طرح شہر سے دور کیا جائے۔

چوں کہ یہ مسئلہ خود نبی کریم الصادق والمصدوق ...... کی احادیث سے حسب تصریح

---

(۱) نظرة الی العقوبة فی الاسلام از فضیلة الاستاذ الشیخ ابوزہرہ، ملاحظہ ہو: کتاب المؤتمر الرابع لمجمع البحوث الاسلامیة رجب ۱۳۸۸ھ، ص ۱۸۷۔

فقہاء ومحدثین بطور تواتر معنوی کے ثابت ہے اس لیے اس باب میں اختلاف کی گنجائش ہی کہاں تھی۔ بایں وجہ ہم دیکھتے ہیں کہ عہد صحابہ سے امت اس پر متفق ومتحد چلی آرہی ہے۔ خلیفہ راشد امیر المؤمنین عمر بن الخطابؓ نے (جن کے بارے میں خود رسولِ خدا...... کی شہادت ہے کہ وہ سچی اور درست بات کہنے والے ہیں) اپنے ایک خطبہ میں شریعت اسلامیہ کے قانون میں اس سزا کی اہمیت اور اس کے ناقابلِ تنسیخ ہونے کو ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

”ان اللّٰہ بعث محمدا صلی اللّٰہ علیہ وسلم بالحق وانزل علیہ الکتاب فکان مما انزل اللّٰہ آیۃ الرجم فقرأناھا وعقلناھا ووعناھا رجم رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ورجمنا بعدہ فاخشیٰ ان طال بالناس زمان ان یقول قائل واللّٰہ ما نجد آیۃ الرجم فی کتاب اللّٰہ فیضلوا بترک فریضہ انزلھا اللّٰہ تعالیٰ، والرجم فی کتاب اللّٰہ حق علی من زنیٰ اذا احصن من الرجال والنساء اذا قامت البینۃ او کان الحبل والاعتراف“(۱)

> لاریب اللہ عز اسمہ نے محمد ......کو حق دے کر بھیجا اور آپ ...... پر کتاب نازل کی اور اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ آیات میں آیت رجم بھی تھی ہم نے اسے پڑھا، سمجھا اور یاد رکھا۔ رسول خدا...... نے رجم کیا اور ہم نے بھی آپ کے بعد رجم کیا، مجھے ڈر ہے کہ کچھ عرصہ گزر جانے کے بعد کوئی کہنے والا کہے کہ ہم رجم کی آیت کتاب اللہ میں نہیں پاتے تو یہ لوگ اللہ کے ایک نازل کردہ فریضہ کے چھوڑ دینے سے گمراہ ہو جائیں گے۔ رجم اللہ کی کتاب میں حق ہے زانی پر جب کہ وہ محصن ہو خواہ اس جرم کا مرتکب مرد ہو یا عورت، جب کہ گواہی سے یا حمل واقرار سے اس کا ثبوت موجود ہو۔

حضرت فاروق اعظمؓ کے اس طویل خطبہ کا یہ ایک حصہ ہے جو موصوف نے اپنی خلافت کے آخری ایام میں حج سے واپسی پر حضرات صحابہؓ کے بڑے مجمع میں دیا تھا

---

(۱) الصحیح للبخاری، ج۲، ص۱۱۰۹۔

حضرت فاروق اعظم کے جملہ ”والرجم فی کتاب اللّٰہ حق“ کا مطلب یہ ہے کہ آیت رجم جو قرآن میں نازل ہوئی تھی اس کی تلاوت منسوخ ہوگئی مگر حکم بحالہ باقی ہے اور ان کے الفاظ ”رجم رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم و رجمنا بعدہٗ“ سے تسلسل رجم کی وضاحت ہورہی ہے کہ رسول اللہ...... نے رجم کیا اور خلیفہ اول حضرت صدیق اکبرؓ اور فاروقِ اعظمؓ کے زمانہ میں بھی رجم کا حکم جاری رہا۔ چنانچہ خادم رسول حضرت انسؓ بھی یہی تسلسل بیان کرتے ہیں: ”رجم رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم وابوبکر وعمر رضی اللّٰہ عنہما وامرھما سنۃ“(۱) رسول اللہ...... نے رجم کیا اور ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما نے رجم کیا اور ان کا حکم (وعمل) بھی سنت ہے۔

شیخین رضوان اللہ علیہما کے بعد خلیفہ ثالث حضرت عثمان غنی، خلیفہ رابع حضرت علی مرتضیٰؓ اور دیگر صحابۂ کرام رضوان اللہ عنہم سے بھی رجم کا قول وعمل صحیح روایات سے ثابت ہے۔(۲) جس سے پتہ چلتا ہے کہ رجم پر عمل آنحضرت ...... کے بعد حضرات صحابہ میں بطور توارث کے جاری وساری تھا۔ ”وکفی بھم قدوۃ“۔

حضرات صحابہ وائمہ سلف سے اجماع وتوارث کے ثبوت کے بعد ایک مخلص مؤمن کے لیے مزید کسی دلیل وحجت کی ضرورت نہیں۔ پھر بھی مزید وضاحت اور تکمیل بحث کی غرض سے ان احادیث مرفوعہ کی نشاندہی بھی کی جاتی ہے جو کتب حدیث میں صحابہ کی ایک بڑی جماعت سے مروی ہیں۔ چوں کہ یہ مختصر تحریر ان احادیث کے حرف بہ حرف نقل کی متحمل نہیں ہے اس لیے اس موقعہ پر صرف ان کتابوں کے حوالے ذکر کیے جارہے ہیں جن میں روایات نقل کی گئی ہیں۔

---

(۱) رواہ ابویعلی ورجالہ ثقاۃ، مجمع الزوائد، ج ۶، ص ۲۶۴۔

(۲) حضرت عثمان غنیؓ کی روایت کیلئے دیکھئے ترمذی، ج ۲، ص ۴۱، نسائی، ج ۲، ص ۱۵۶، مستدرک حاکم، ج ۴، ص ۳۵۰ وغیرہ۔ حضرت علیؓ کے رجم کرنے کا واقعہ ملاحظہ ہو، بخاری، ج ۲، ص ۱۰۰۶، مسند امام احمد، ج ۱، ص ۱۲۱ اور حضرت عبداللہ بن مسعود کی روایت صحیح بخاری، ج ۲، ص ۱۰۱۶، صحیح مسلم، ج ۲، ص ۵۹ وغیرہ کتب صحاح میں موجود ہے۔ نیز حضرت ابوہریرہ اور حضرت زید بن خالد جہنی سے رجم کا فتویٰ مؤطا امام مالک، ص ۳۴۹ اور دیگر کتب صحاح میں دیکھا جاسکتا ہے۔

وہ صحابہ جنھوں نے زانی محصن کو رجم کرنے کا حکم دیا، یا اس پر عمل کیا ہے

۱- حضرت عمر بن خطاب، حضرت علی مرتضیٰ، عبداللہ بن ابی اوفی، جابر بن عبداللہ، ابو ہریرہ، عائشہ صدیقہ، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عباس، زید بن خالد رضی اللہ عنہم ان مذکورہ حضرات صحابہ کی احادیث صحیح بخاری میں موجود ہیں۔

۲- عبادہ بن صامت، سلمہ بن محبق، ابو برزہ، ہزال، جابر بن سمرہ، حلاّج، حضرت ابوبکر صدیق، بریدہ، ابوذر غفاری، نصر بن دہر اسلمی، عمران بن الحصین، ابوبکرہ، ابوسعید الخدری، نعمان بن بشیر، براء بن عازب رضوان اللہ علیہم سے روایات مسند امام احمد ابن حنبل میں منقول ہیں۔

۳- ابی بن کعب، زید بن ثابت، عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم سے مروی احادیث کی تخریج امام بیہقی نے السنن الکبریٰ میں کی ہے۔

۴- قبیصہ بن حریث، انس بن مالک، عجماء، سہل بن سعد، عبداللہ بن حارث بن الجزء رضوان اللہ علیہم کی روایات علامہ ہیثمی کی مجمع الزوائد میں مندرج ہیں۔

۵- وائل بن حجر سے روایت جمع الفوائد میں ہے۔

۶- حضرت عثمان غنیؓ اور ابوامامہ بن سہل بن حنیف کی حدیث مشکوٰۃ المصابیح میں دیکھی جاسکتی ہے۔

چھ کتب حدیث سے پینتیس حضرات صحابہ سے مروی روایات کا یہ اجمالی ذکر ہے مزید تلاش وجستجو سے دیگر اور صحابہ کے آثار بھی مل سکتے ہیں، کیا ان احادیث کثیرہ کے باوجود بھی یہ کہنے کی گنجائش ہے کہ رجم سے متعلق احادیث خبر احاد ہیں اس لیے ان کے ذریعہ کتاب اللہ کے حکم ”الزانية والزانی فاجلدوا كل واحد منهما مأة جلدة“ (زانیہ اور زانی ان دونوں میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو) پر زیادتی از روئے اصول وقواعد درست نہیں ہے؟

کیوں کہ یہ احادیث تعدد طرق و کثرت اسناد کی بناء پر از روئے اصول فقہاء و

محدثین تواتر معنوی کی حد میں داخل ہیں اور تواتر معنوی سے کتاب اللہ پر زیادتی فقہائے امصار کے نزدیک متفقہ طور پر صحیح و درست ہے۔ ان احادیث سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت...... کے بعد بھی اس شرعی سزا کا نفاذ اسلامی حکومت میں جاری رہا۔

افسوس کہ اپنی مصروفیات اور خود جس مقصد کے لیے یہ تحریر قلم بند کی جارہی ہے اس بات کی اجازت نہیں دیتیں کہ اس مسئلہ پر تفصیلی بحث کی جائے ورنہ بتایا جاتا کہ مولانا عنایت اللہ سبحانی نے اپنی تازہ تصنیف ''حقیقت رجم'' میں نہ صرف علمی دیانت وامانت کا گلا گھونٹا ہے بلکہ صریح تحریف وتلبیس کا سہارا لے کر ایک ایسے شرعی حکم کا انکار کیا ہے جو تواتر معنوی، اجماع اور توارث سلف وخلف سے ثابت ہے اور اس طرح انھوں نے صحابہ کرام، سلف صالحین، ائمہ مجتہدین، کبار محدثین کے طریقہ، مسلوکہ کو چھوڑ کر خوارج ومعتزلہ کی راہ اختیار کی ہے، جسے گمراہی نہ سمجھنا بجائے خود ایک گمراہی ہے۔

مزید براں سبحانی صاحب نے اپنی اس تلبیس آمیز وضلالت انگیز کتاب میں صحابیٔ رسول...... کے تقدس وعظمت کا جس طرح عامیانہ مذاق اڑایا ہے اور ان کی شان میں جس قسم کے نازیبا بازاری الفاظ استعمال کیے ہیں انھیں دیکھ کر تو دل لرز اٹھتا ہے جس کی مثال یہودی ونصاریٰ کے یہاں بھی اپنے رسولوں کے اصحاب کے بارے میں شاید تلاش وجستجو کے بعد بھی نہ ملے، رہا اپنی تائید میں سبحانی صاحب کا محدث عصر علامہ انور شاہ کشمیریؒ وغیرہ اکابر دیوبند کا نام لینا، تو اس کے بارے میں حافظ شیرازی کا یہ مصرع حقیقت حال سمجھنے کے لیے کافی ہوگا۔

ع چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد

☆ ☆ ☆

JI\MONO.
not found.

مقالات حبیب

(حصہ سوم)

گوشۂ سیرت و تاریخ
تذکرہ ارباب فضل و کمال

تالیف

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی
استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند، سہارنپور، یوپی

ناشر
شیخ الہند اکیڈمی، دارالعلوم دیوبند

جملہ حقوق بحق شیخ الہند اکیڈمی دار العلوم دیوبند محفوظ ہیں

زیر سرپرستی

حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب دامت برکاتہم
مہتمم دار العلوم دیوبند

زیر نگرانی

حضرت مولانا بدر الدین اجمل علی القاسمی صاحب
رکن مجلس شوریٰ دار العلوم دیوبند

سلسلہ اشاعت ع۴۱

نام کتاب : مقالات حبیب (حصہ سوم)
مولف : حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی
استاذ حدیث دار العلوم دیوبند
سن اشاعت : ۱۴۳۰ھ — ۲۰۰۹ء
تعداد صفحات : ۴۴۰
ناشر : شیخ الہند اکیڈمی دار العلوم دیوبند

فہرست ابواب وموضوعات

(حصہ سوم)

باب (۵) گوشۂ سیرت وتاریخ

- سیرت نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام پر ایک نظر ۱۷
- ہادئ عالم کی ازدواجی سیرت کا ایک پہلو ۲۰

مسئلۂ کثرت ازدواج کے دو بنیادی نقطے ۲۰

تراجم امہات المومنین ۲۱

حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا ۲۱

حضرت سودہ رضی اللہ عنہا ۲۲

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا ۲۲

حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا ۲۳

حضرت زینب بنت خزیمہ رضی اللہ عنہا ۲۴

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا ۲۴

حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا ۲۵

حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا ۲۶

حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا ۲۶

حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا ۲۷

حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا ۲۷
تعدد ازدواج کے مصالح ۲۷
تعلیمی مصلحت ۲۸
تشریعی مصلحت ۳۰
اجتماعی مصلحت ۳۲
سیاسی مصلحت ۳۲
- ہماری تاریخ کا ایک باب یہ بھی ہے ۳۴

خدام کے آرام وراحت کا خیال ۳۴
افشائے راز ۳۴
بیوی کو صبر کی تلقین ۳۵
احساس دیانت ۳۵
مکارم اخلاق ۳۶
پاکبازی ۳۶
حق بحق دار رسید ۳۷
خوف آخرت ۳۷
انجام کی فکر ۳۸
حسن خاتمہ ۳۸
- تاریخ اسپین کا عبرت خیز ورق ۴۰

طوائف الملوکی اور اس کے منفی اثرات ۴۱
مختلف مسلم جماعتیں اور ان کا انجام ۴۲
جبری عیسائی بنانے کا روح فرسا اقدام ۴۴
درس عبرت ۴۵
تنظیم ملت کے چند اصول ۴۸
- اجودھیا کی تاریخی حیثیت ۵۰

اجودھیا کی قدامت ۵۰
اجودھیا کی شناخت ۵۳
عہد وسطیٰ کی تاریخی کتابوں میں اجودھیا کا ذکر ۵۴
الگزنڈر کینگھم کی رپورٹ ۵۶
اجودھیا کی مذہبی حیثیت ۵۹

بدھ مت کے مرکز کی حیثیت سے ۶۱

شیومت کا غلبہ، اور وشنومت کا آغاز ۶۳

جین مت کے استھان کی حیثیت سے ۶۴

مسلمانوں کی آمد اور اسلامی آثار کا فروغ ۶۴

● بابری مسجد-حقائق اور افسانے ۶۶

کیا بابر اجودھیا آیا تھا؟ ۶۷

بابر کی ایک وصیت ۷۰

تلاش حق ۷۱

بابری مسجد کے کتبے ۷۲

کتبہ (۱) ۷۲

کتبہ (۲و۳) ۷۳

جنم استھان کے بارے میں ایک ہندو محقق کی تحقیق ۷۶

کیا رام کرشن کوشل کے راجہ تھے؟ ۷۸

اس افسانہ کی ابتداء اور اس کے مقاصد ۷۹

اختلاف کا آغاز ۸۱

بابری مسجد میں مورتی کی تنصیب ۸۲

مقدمات کا سلسلہ ۸۳

دورانِ مقدمہ خلاف قانون مسجد میں تبدیلیاں ۸۵

مسجد، مندر بنادی گئی ۸۶

فیصلہ پر ایک نظر ۸۷

آخری بات ۸۸

● بابری مسجد تاریخ کے مختلف مراحل میں ۸۹

مسجد کی تعمیر اور اس کی تاریخی حیثیت ۸۹

مسجد، مندر قضیہ کا آغاز ۹۱

مسجد کو مندر بنانے کی شرمناک سازش ۹۳

عدالت نے اقتدار کے دباؤ میں مسجد کے اندر مورتی پوجا کی اجازت دیدی ۹۶

مسجد کو مسمار کر کے اس کی جگہ مندر بنانے کا اعلان ۹۷

بابری مسجد کی المناک شہادت ۱۰۰

● نظام امارت فی الہند کی مختصر تاریخ ۱۰۴

امارت شرعیہ کی تاسیس ۱۰۴
استفتاء اور اس کا جواب ۱۰۶
اصلاح عام ۱۰۶
نظام امارت کا اثر ۱۰۷
ایک سوال ۱۰۷
ایک ضروری تنبیہ ۱۰۷
نظام امارت کی دوبارہ تاسیس ۱۰۸
مجلس شوریٰ کی روداد ۱۱۰
حضرت حاجی صاحب کی امارت پر بیعت ۱۱۰
عام مسلمانوں کی اطاعت گزاری ۱۱۱
تنظیم ملت کی تیسری کوشش ۱۱۲
ایک اور صوبہ میں امیر کا انتخاب ۱۱۴

باب (٦) تذکرہ ارباب فضل وکمال

- امام ابوحنیفہ اور علم حدیث ۱۱۷
امام صاحب کی تابعیت ۱۱۷
طلب حدیث کے لئے اسفار ۱۱۹
علم حدیث میں مہارت وامامت ۱۲۱
ضروری تنبیہ ۱۲۴
امام صاحب کی عدالت وثقاہت ۱۳۲
امام صاحب اور فن جرح وتعدیل ۱۳۷
- امام ابوداؤد سجستانی ۱۴۱
نام ونسب ۱۴۱
تاریخ پیدائش اور تعلیم وتحصیل ۱۴۴
تعلیمی اسفار ۱۴۶
اسفار کی ضروری تفصیلات ۱۴۷
برادر کبیر کی رفاقت ۱۴۹
وقفہ وقفہ سے وطن مالوف کی مراجعت ۱۴۹
صاحبزادے ابوبکر کی معیت ۱۵۰

اساتذۂ کرام ۱۵۲
کیا امام ابوداؤد کے تمام شیوخ ثقہ ہیں؟ ۱۵۳
کتاب السنن کی تالیف ۱۵۴
امام خطیب کی روایت پر ایک نظر ۱۵۵
بصرہ کی سکونت ۱۵۷
تاریخ وفات اور مقام تدفین ۱۶۰
تلامذہ ۱۶۱
ایک عظیم شرف ۱۶۳
ضروری تنبیہ ۱۶۴
علمی مقام ومرتبہ ۱۶۵
اخذ حدیث کے تین مرحلے ۱۶۵
تاریخ رجال میں مہارت ۱۶۷
فقہ میں تبحر ۱۷۰
مذہب ومسلک ۱۷۱
زہد وتقویٰ ۱۷۷
حکمت ومعرفت ۱۷۸
علمی نوادرات ۱۸۰
امام ابوداؤد ائمۂ حدیث اور اکابر علماء کی نظر میں ۱۸۲
تصنیفی خدمات ۱۸۶
● اجودھیا کے مشاہیر علماء ومشائخ ۱۸۹
اجودھیا کی روایتی خصوصیت ۱۸۹
قاضی قدوۃ الدین ۱۹۰
شیخ فرید الدین اودھی ۱۹۱
شیخ بدر الدین واعظ ۱۹۲
قاضی محی الدین کاشانی ۱۹۲
شیخ تقی الدین علم بخش ۱۹۴
شیخ شمس الدین اودھی ۱۹۶
شیخ جلال الدین اودھی ۲۰۰
مولانا قوام الدین اودھی ۲۰۱

مولانا جمال الدین اودھی ۲۰۲
علامہ کمال الدین اودھی ۲۰۳
شیخ نصیر الدین معروف بہ چراغ دہلی ۲۰۵
شیخ علاء الدین نیلی (صاحب مامقیمان) ۲۰۹
شیخ شمس الدین اودھی ۲۱۱
شیخ فتح اللہ اودھی ۲۱۴
شیخ سعد اللہ اودھی ۲۱۷
شیخ جمال گوجری ۲۱۸
شیخ سید سلطان موسیٰ عاشقاں ۲۲۰
قاضی شہاب الدین اودھی ۲۲۲
شیخ محمد درویش اودھی ۲۲۳
شیخ علاء الدین حسینی اودھی ۲۲۷
شیخ عاشق شاہ اودھی ۲۲۸
- شیخ محمد بن عیسیٰ تاج جون پوری ۲۳۰
شیخ کے تذکرہ کے ماخذ ومراجع ۲۳۱
تاریخ ولادت اور نام ونسب ۲۳۲
دہلی سے جون پور آمد ۲۳۳
تعلیم وتربیت ۲۳۴
کثرت ریاضت اور اس کے اثرات ۲۳۶
شانِ استغنا ۲۳۷
شیخ اور تعمیر مسجد جامع جون پور ۲۳۸
درس وتدریس ۲۳۹
تصنیف وتالیف ۲۳۹
قبول عام ۲۴۰
وفات اور مدفن ۲۴۱
چند ملفوظات ۲۴۲
- قاضی خان ظفر آبادی ۲۴۳
ظفر آباد کی مختصر تاریخ ۲۴۳
اسم گرامی اور تاریخ ولادت ۲۴۷

شجرہ نسب اور اصلی وطن ۲۴۸

خاندانی وجاہت ۲۴۹

عرفان وسلوک ۲۵۰

قاضی خاں کا مقام علماء کی نظر میں ۲۵۱

شان استغناء ۲۵۳

وفات ۲۵۴

اولاد اور خلفاء ۲۵۵

شیخ عبداللہ ناصحی ۲۵۶

شیخ عبدالعزیز چشتی دہلوی ۲۵۶

شاہ مسعود خلولی ۲۵۷

● سید محمد جون پوری اور تحریک مہدویت ۲۵۸

تاریخ ولادت اور نام ونسب ۲۵۸

تعلیم وتربیت اور ابتدائی حالات ۲۵۸

جون پور سے ہجرت ۲۵۹

سید صاحب کی تعلیمات اور ان کا اثر ۲۶۴

سید صاحب کے متعلق علماء کی رائے ۲۶۵

دعوائے مہدویت پر ایک نظر ۲۶۷

● استاذ الملک ملا محمد افضل جونپوری ۲۷۱

عہد شرقی کے مشاہیر ۲۷۱

عہد لودھی کے مشاہیر ۲۷۱

عہد مغل کے مشاہیر ۲۷۲

نام ونسب اور تاریخ پیدائش ۲۷۳

تعلیم وتربیت ۲۷۴

علمی تبحر ۲۷۴

ردولی سے جون پور آمد ۲۷۵

سلوک وتصوف ۲۷۶

تصانیف ۲۷۸

شاعری ۲۷۸

وفات ۲۷۹

اولاد و تلامیذ ۲۸۰

● شاہ طیب بنارسی اور ان کے اسلاف و خلفا ۲۸۴

ابتدائیہ ۲۸۴

ماخذ و مصادر ۲۸۵

۱- شیخ الاسلام شیخ فرید بنارسی ۲۸۵

بنارس آمد ۲۸۷

تعلیم و تربیت ۲۸۸

خلافت و جانشینی ۲۹۰

تعلیم و ارشاد ۲۹۲

خدمت خلق ۲۹۳

وفات اور مدفن ۲۹۵

ایک غلطی کا ازالہ ۲۹۶

خلفائے عظام ۲۹۷

میر سید بدھ بہاری ۲۹۷

شیخ مبارک محدث بنارسی ۲۹۸

شیخ لاؤ جون پوری ۲۹۸

اولاد امجاد ۲۹۹

شیخ محی الدین بنارسی ۲۹۹

شیخ ابواللیث بنارسی ۳۰۰

شیخ حبیب اللہ بنارسی ۳۰۰

۲- شیخ داؤد بنارسی ۳۰۳

شیخ حسن بن داؤد بنارسی ۳۰۴

علمی مقام و مرتبہ ۳۰۵

تدریس و تصنیف ۳۰۵

احسان و سلوک ۳۰۶

سفر حج اور واقعہ شہادت ۳۰۸

تحقیق تاریخ شہادت ۳۰۹

خلفاء اور اولاد ۳۱۱

اسد العلماء نصیر الدین مصطفیٰ آبادی ۳۱۲

شیخ مسعود بن حسن بنارسی ۳۱۴
شیخ معین الدین بنارسی ۳۱۵
شیخ المشائخ شاہ طیب بنارسی ۳۱۵
تعلیم و تحصیل اور ابتدائی حالات ۳۱۶
عرفان و طریقت ۳۱۸
بناء شریعت آباد ۳۲۲
درس و تدریس، وارشاد و تلقین ۳۲۳
طریق اصلاح و بیعت ۳۲۴
امر بالمعروف و نہی عن المنکر ۳۲۵
امراء و حکام کا شاہ صاحب سے برتاؤ ۳۲۶
مد معاش کے بارے میں شاہ صاحب کا نظریہ ۳۲۷
فتوحات کے سلسلہ میں طرز عمل ۳۲۷
معمولات ۳۲۹
غنا و سماع کے بارے میں رویہ ۳۳۰
اسرار طریقت کے بیان سے احتراز ۳۳۱
لباس ۳۳۱
وفات اور مدفن ۳۳۲
چند مریدین و خلفاء ۳۳۴
۱- دیوان محمد رشید جون پوری ۳۳۴
۲- شیخ ناصر الدین جھوسوی ۳۳۶
۳- شاہ یٰسین بنارسی ۳۳۷
۴- شیخ عالم بنارسی ۳۴۰
۵- شیخ عبد المومن کشمیری ۳۴۰
۶- شیخ فاضل محمد پھلتی ۳۴۱
۷- شیخ حسن ۳۴۱
۸- شیخ طاہر بنارسی ۳۴۲
● قطب الاقطاب دیوان محمد رشید جون پوری ۳۴۳
علمی مقام و مرتبہ ۳۴۴
دیوان صاحب کے تذکرہ کے مآخذ و مراجع ۳۴۵

دیوان صاحب کے بارے میں اہل باطن کی پیشین گوئیاں ۳۴۷
پیدائش ونشونما ۳۴۷
درس وتدریس ۳۵۰
نقل سند اجازت ۳۵۱
دیوان صاحب بحیثیت استاذ ۳۵۲
عرفان وسلوک ۳۵۴
شعروسخن ۳۵۷
غزل کا نمونہ ۳۵۷
تصنیف وتالیف ۳۵۷
وفات ۳۵۹
اخلاق وسیرت ۳۶۰
خلفاء ومجازین ۳۶۳
- مولانا سخاوت علی جون پوری ۳۶۹
نام ونسب وخاندانی حالات ۳۷۰
سن پیدائش اور ابتدائی حالات ۳۷۱
تبحر علمی ۳۷۱
بیعت وخلافت ۳۷۲
تعلیم وتدریس ۳۷۳
جون پور سے باندہ ۳۷۳
استخلاص الجامع الشرق وقیام مدرسہ قرآنیہ ۳۷۴
مختصر تاریخ مسجد ۳۷۵
ہجرت مکہ معظّمہ ۳۷۵
وفات ۳۷۶
مولانا کا مسلک ۳۷۷
تصانیف ۳۷۸
اولاد ۳۸۰
تلامذہ ۳۸۳
- شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے سفر حرمین شریفین کی تفصیلی روداد ۳۸۴
آغاز سفر ۳۸۵

بندر سورت سے روانگی ۳۸۶

مکہ معظّمہ میں حاضری اور وہاں کے علماء سے ملاقات ۳۸۷

مدینہ منورہ کی حاضری ۳۸۸

ایک بزرگ کا خواب ۳۸۸

ایک عالم کی طرف سے دعوت طعام اور علمی سوالات ۳۸۹

ایک اور علمی سوال اور اس کا حل ۳۸۹

تفصیل اشکال ۳۹۰

جواب اشکال ۳۹۰

روایت حدیث کی اجازت ۳۹۲

اظہار تواضع و اعتراف کمال ۳۹۳

مختلف سلاسل تصوف کی اجازت ۳۹۴

ایک رسالہ کی تالیف ۳۹۴

مدینہ منورہ سے مکہ معظّمہ واپسی ۳۹۵

مکہ معظّمہ میں دوبارہ حاضری ۳۹۵

بعض تصانیف کی شہرت و مقبولیت ۳۹۵

شاہ صاحب کی والدہ محترمہ کی وفات ۳۹۶

وطن واپسی ۳۹۶

- قافلۂ فضل و کمال یعنی مولانا محمد یعقوب نانوتوی صدر مدرس اوّل دار العلوم دیوبند کے مشاہیر تلامذہ .. ۳۹۸

مولانا کی مختصر سوانح ۳۹۸

۱- مولانا فخر الحسن گنگوہی ۳۹۹

۲- مولانا فتح محمد تھانوی ۴۰۰

۳- مولانا امیر باز خاں مظفرنگری ۴۰۰

۴- مولانا منفعت علی دیوبندی ۴۰۱

۵- مولانا احمد حسن امروہوی ۴۰۱

۶- مولانا احمد ہزاروی ۴۰۲

۷- مولانا محمد مراد فاروقی مظفرنگری ۴۰۳

۸- مولانا سید محمد عرفان ٹونکی ۴۰۴

۹- مولانا منصور علی خاں مرادآبادی ۴۰۴

۱۰- شیخ الہند مولانا محمد حسن دیوبندی ۴۰۵

۱۱-مولانا ناظر حسن دیوبندی ۴۰۶

۱۲-مولانا عبدالحق پورقاضوی ۴۰۷

۱۳-مولانا عبداللہ انبیٹھوی ۴۰۷

۱۴-مولانا حکیم محمد حسن دیوبندی ۴۰۸

۱۵-مولانا خلیل احمد محدث سہارنپوری ۴۰۸

۱۶-مولانا عبدالقدیر دیوبندی ۴۱۰

۱۷-مولانا عبدالمومن دیوبندی ۴۱۱

۱۸-مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی ۴۱۲

۱۹-مولانا حافظ محمد احمد قاسمی ۴۱۴

۲۰-مولانا محمد صدیق مرادآبادی ۴۱۵

۲۱-مولانا حکیم رحیم اللہ بجنوری ۴۱۶

۲۲-مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی ۴۱۷

- حضرت شیخ الاسلام کے تین امتیازات ۴۱۹

حیات اور کارناموں پر ایک اجمالی نظر ۴۱۹

امتیاز (۱) شیخ الہند سے طویل استفادہ ۴۲۲

امتیاز (۲) مسجد نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں حلقہ درس ۴۲۴

امتیاز (۳) الجزائر کے جہاد آزادی میں حضرت شیخ الاسلام کا حصہ ۴۳۰

ابن بادیس کا مختصر تذکرہ ۴۳۲

حضرت شیخ الاسلام کا مشورہ اور تحریک کی ابتداء ۴۳۲

فکر و عمل میں یکسانیت ۴۳۵

☆ ☆ ☆

باب ﴿۵﴾

گوشۂ سیرت و تاریخ

سیرت نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام

ایک نظر میں

سن عیسوی	
۵۷۰ء	۲۰؍اگست۔ ولادت باسعادت (ڈاکٹر حمید اللہ کی تحقیق کے مطابق آنحضرت...... کی ولادت ۱۷؍جون ۵۶۹ء کو ہوئی)
۵۷۵/۷۶ء	وفات حضرت آمنہ والدہ ماجدہ آنحضرت......۔
۵۷۸ء	آنحضرت...... کے دادا خواجہ عبدالمطلب کی وفات۔
۵۸۲ء	آنحضرت...... کا ملک شام کی طرف پہلا سفر۔
۵۹۵ء	ملک شام کا دوسرا سفر، حضرت خدیجۃ الکبریٰ کی تجارت کی غرض سے۔
۵۹۵ء	حضرت خدیجۃ الکبری سے عقد
۶۰۵ء	تجدید عمارت کعبہ معظّمہ
۶۱۰ء	آغاز وحی۔ (ڈاکٹر حمید اللہ کی تحقیق کی رو سے وحی کی ابتداء ۲۳؍دسمبر ۶۰۹ء کو ہوئی ہے)
۶۱۵ء	حبشہ کی جانب پہلی ہجرت (رجب ۵ھ نبوی)
۶۱۷ء	قبائل عرب کی جانب سے بنی ہاشم و بنی عبدالمطلب کا معاشرتی مقاطعہ (سوشل بائیکاٹ)
۶۲۰ء	حضرت خدیجہ اور خواجہ ابوطالب کی وفات
۶۲۰ء	آنحضرت...... کا سفر طائف
۶۲۱ء	معراج و فرضیت نماز (ہجرت سے ایک سال قبل ۲۷؍رجب)

۶۲۱ء	بیعت عقبۂ اولیٰ (۱۲ھ نبوی)
۲۸/جون	ہجرت مدینہ منورہ (۱۲/ربیع الاوّل بروز دوشنبہ) حسب تحقیق ڈاکٹر حمید اللہ
۶۲۲ء	۳۱/مئی ۶۲۲÷ یوم دوشنبہ
۶۲۳ء	تحویل قبلہ (آنحضرت ...... نے مدینہ منورہ میں ۱۶/مہینے بیت المقدس کی جانب رخ کرکے نماز ادا کی)
//	سریہ حمزہ وعبیدہ بن حارث۔
۶۲۳ء	(جون) غزوہ ابوا۔ (جولائی) غزوہ بواط (اکتوبر) غزوہ عشیرۃ (نومبر) سریہ عبداللہ بن جحش
۶۲۴ء	(جنوری) غزوہ بدر الکبریٰ (رمضان ۲ھ ڈاکٹر حمید اللہ کی تحقیق کے مطابق ۱۸/نومبر ۶۲۳÷ یوم جمعہ (فروری) غزوۂ بنی قینقاع (شوال ۲ھ (اپریل) غزوۂ سویق، (ذی الحجہ ۲ھ (ستمبر) سریہ زید بن حارثہ
۶۲۵÷	(جنوری) غزوہ احد (شوال ۳ھ) وغزوہ حمراء الاسد (مئی) حادثہ رجیع و بیر معونہ ۴ھ (جون) غزوہ بنو نضیر وغزوہ ذات الرقاع ۴ھ) اسی سال شراب حرام ہوئی
۶۲۶÷	(جولائی) غزوہ دومۃ الجندل (ربیع الاوّل ۵ھ) وغزوہ بنی مصطلق (شعبان ۵ھ) اس کو غزوہ مریسیع بھی کہا جاتا ہے
۶۲۷÷	(فروری) غزوہ خندق (۲۹/شوال ۵ھ) (ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کی تحقیق ہے کہ غزوہ خندق ۱۴/جنوری ۶۲۷÷ کو پیش آیا ہے) (اپریل) غزوہ بنی قریظہ (ذیقعدہ ۵ھ) (جون جولائی) غزوہ بنی لحیان (ربیع الاوّل ۶ھ) وغزوہ ذی قرد
۶۲۸÷	(جنوری) صلح حدیبیہ (ذی قعدہ ۶ھ) (مئی) روم وفارس کو دعوت اسلام بذریعہ مکتوب (اگست) غزوہ خیبر (محرم ۷ھ)
۶۲۹÷	(فروری) عمرۃ قضا (ستمبر) سریہ موتہ (جمادی الاولیٰ ۸ھ) (اکتوبر) سریہ ذات سلاسل (جمادی الثانی ۸ھ)

٦٣٠ ÷ (جنوری) فتح مکہ معظّمہ وہدم اصنام (رمضان ۸ھ) (فروری) غزوۂ حنین (۱۰؍شوال ۸ھ)

٦٣٠ ÷ غزوۂ طائف (اپریل) آنحضرت...... کے صاحبزادے حضرت ابراہیم کی ولادت، (اکتوبر) غزوۂ تبوک (رجب ۹ھ)

٦٣١ ÷ (مارچ) حضرت ابوبکر صدیق کی امارت حج (ذی الحجہ ۹ھ) (جون) صاحبزادۂ رسول...... حضرت ابراہیم کی وفات

٦٣٢ ÷ (مارچ) حجۃ الوداع (۱۰ھ) حسب تحقیق ڈاکٹر حمید اللہ ٦؍مارچ ٦٣٢ ÷ یوم جمعہ (مئی) جیش اسامہ کی ملک شام جانے کی تیاری (صفر ۱۱ھ) (جون) وفات النبی ...... (ربیع الاوّل ۱۱ھ یوم دوشنبہ) ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کی تحقیق کے مطابق ۲۵؍مئی ٦٣٢ ÷ کو آنحضرت...... کا وصال ہوا۔

☆ ☆ ☆

ہادئ عالمؐ کی ازدواجی سیرت کا ایک پہلو

نبئ اسلام محمد رسول اللہ...... کی ازدواجی سیرت پر بہت سے مستشرقین، متعصب پادریوں اور ظاہر بیں معترضوں نے نہایت رکیک خیالات اور دور از حقیقت شبہات کا اظہار کیا ہے جس سے متاثر ہوکر نبئ کریم...... کی سیرتِ پاک اور اخلاق کریمانہ سے ناواقف سادہ لوح مسلمان بھی شکوک واوہام میں مبتلا ہوجاتے ہیں، زیرنظر مقالہ میں اسی مسئلہ پر روشنی ڈالی گئی ہے جس سے حضور پاکؐ کی عفت وعصمت، پاکدامنی ونفس کشی کے ساتھ وہ مصالح ومقاصد اور حکمتیں بھی واضح اور منقح ہوکر سامنے آجائیں گی جن کا حصول عرب جیسے جمود پسند ملک میں بغیر کثرتِ تزویج ممکن نہ تھا اور نہ ہی اس مصلح اعظم اور رحمۃ للعالمین کے لئے ان مصلحتوں سے صرف نظر کرنا مناسب تھا، اسی بنا پر رب العٰلمین نے ساری امت سے الگ اختصاصی طور پر آپ کو کثرتِ ازواج کی اجازت مرحمت فرمائی۔

مسئلۂ کثرت ازدواج کے دو بنیادی نقطے

تفصیل میں جانے سے پہلے اس اہم مسئلہ میں دو بنیادی نقطوں کو پیش نظر رکھنا نہایت ضروری ہے: (۱) نبی کریم...... کے حبالۂ عقد میں امہات المومنین کی کثرت زمانۂ شیخوختہ یعنی پچاس سال کی عمر کے بعد ہوئی ہے، تمام کتب سیر وتاریخ اس امر پر متفق ہیں کہ آنحضرت...... نے ابتدائی عمر سے ۲۵ برس تک کسی عورت سے ازدواجی تعلق قائم نہیں کیا۔

حالانکہ عمر کا یہی وہ دور ہے جس میں جوانی دیوانی ہوتی ہے اور شباب کا بھوت سر پر سوار ہوکر انسان کو پاگل بنادیتا ہے بالخصوص پندرہ برس سے پچیس سال تک کا زمانہ تو انتہائی نازک ہوتا ہے جس میں شہوت سے مغلوب اور نفس سے عاجز اشخاص ہر قسم کے

ناکردنی افعال کرگذرتے ہیں۔

لیکن تاریخ اور واقعات شاہد ہیں کہ زندگی کے یہ ایام نبی کریم ...... نے جس حزم واحتیاط اور عفت وعصمت کے ساتھ گذارے ہیں اس کی نظیر نہیں پیش کی جاسکتی۔

(۲) حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے علاوہ آپ کی جملہ ازواج بیوہ تھیں، جب کہ یہ بات تقریباً مسلمات میں سے ہے کہ شہوت پرست، تعیش پسند بیوہ اور عمر رسیدہ عورتوں کی بجائے نئی نویلی کنواری لڑکیوں کو پسند کرتے ہیں چاہے خود کتنے ہی عمر دراز اور سن رسیدہ کیوں نہ ہوں۔

مگر ہم دیکھتے ہیں کہ نبی کریم ......اوّلاً تو پچیس سال کی عمر تک تجرّد وتفرد کی زندگی بسر کرتے ہیں اور پھر جب عقد کرتے ہیں تو ایسی خاتون کے ساتھ جو عمر میں آپ سے پندرہ سال زیادہ اور ایک نہیں بلکہ دو خاوندوں کے نکاح میں رہ چکی ہیں اور ان کی عمر اور جوانی کا اکثر واہم حصہ گذر چکا تھا، پھر اپنی قوت وطاقت کے عمدہ زمانے یعنی پچیس سال سے ۵۰ سال تک کو اسی ایک سن رسیدہ وبیوہ رفیقۂ حیات کے ساتھ گذار دیتے ہیں۔

یہ دو نقطے اس مسئلے میں اس قدر اہم ہیں کہ انھیں پیش نظر رکھنے سے معاندین وجاہلین کے لگائے ہوئے الزامات کے برعکس نبی کریم......کی عفت اور پاکدامنی منقح ہوکر سامنے آجاتی ہے۔

اب ہم اختصار کے ساتھ ازواج مطہرات کے تراجم پیش کرتے ہیں جس سے ہمارا دعویٰ مدلل ومبرہن ہوکر ہر صاحب عدل وانصاف کو یہ رائے قائم کرنے پر مجبور کردے گا کہ وہ ذات گرامی جو رحمۃ للعالمین اور مکارم اخلاق کی تکمیل کے لئے دنیا میں آئی تھی اس کے لئے کثرتِ ازواج ازبس ضروری تھی۔

تراجم امّہاتُ المومنین

(۱) **حضرت خدیجة الکبریٰ رضی اللہ عنہا:** باتفاق ارباب سیر یہ آپ ......کی اوّلین بیوی ہیں، عقد کے وقت آنحضرت ...... کی عمر شریف پچیس سال اور خود ان

کی چالیس سال تھی، یہ پہلے ابوہالہ بن زرارہ کے نکاح میں تھیں ان کے انتقال کے بعد عتیق بن عائذ مخزومی سے بیاہی گئیں، اور عتیق کے فوت ہوجانے کے بعد آنحضرت ...... کے حبالۂ عقد میں آئیں، حضرت خدیجۃ الکبریٰ عفت اور پاکدامنی میں ممتاز شخصیت کی مالکہ تھیں اور اپنے اسی وصف کی بنا پر مکہ میں طاہرہ کے لقب سے مشہور تھیں۔

نبی کریم ...... نے اپنا مکمل عہد شباب انھیں کے ساتھ گذارا اور ان کی حیات میں کسی اور سے عقد نہیں فرمایا۔ حضرت ابراہیم کے علاوہ آپ کی جملہ اولاد انھیں کے بطن سے تھیں، ہجرت سے تین سال پیشتر سنہ ۱۰ نبوی میں ۶۵ سال کی عمر میں وفات پائی ان کے وصال کے وقت حضور ...... عمر شریف کی پانچ دہائیاں پوری کر چکے تھے یعنی شباب کے دور سے گذر کر شیخوخت کی منزل میں داخل ہوگئے تھے۔

تبلیغ رسالت اور اسلام کی حمایت و نصرت میں حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ نے اہم کارنامے انجام دیئے اور نبی کریم کی رفاقت کا کماحقہ حق پورا کیا۔ (۱)

(۲) حضرت سودہ رضی اللہ عنہا: حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کی وفات سے کچھ ہی روز بعد آپ کے نکاح میں آئیں، بوقت نکاح ان کی عمر پچاس یا پچپن سال تھی ان کے پہلے شوہر حضرت سکران بن عمرو انصاری تھے جو ہجرت حبشہ سے واپسی پر راستے میں فوت ہوگئے تھے جس کی وجہ سے یہ بالکل بے یارومددگار ہوگئیں، گھر والوں کے پاس جانے میں چونکہ ایمان کا خطرہ تھا اس لئے بڑی تنگی میں زندگی بسر کررہی تھیں، نبی کریم ...... نے ان کی درازیٔ عمر کے باوجود ان کے دین ودنیا کی حفاظت وکفالت کے لئے نکاح کرلیا اور اپنے دامنِ رحمت میں لے کر انھیں سارے اندیشوں اور مصیبتوں سے محفوظ کردیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں ۲۳ھ میں ان کی وفات ہوئی۔ (۲)

(۳) حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا: ہجرت سے تین سال قبل ماہ شوال سنہ ۱۰ نبوی میں نبی کریم ...... سے نکاح ہوا اور رخصتی ۱ھ میں ہوئی، ۹؍سال

---

(۱) تفصیلی حالات کیلئے ملاحظہ ہو عیون الاثر، اصابہ اور زرقانی وغیرہ۔

(۲) تاریخ کبیر امام بخاری، رحمۃ للعالمین، سیرت مصطفیٰ وغیرہ۔

آنحضرت ...... کی رفاقت میں رہیں اور آپ ...... کے دنیا سے پردہ فرما جانے کے بعد ۴۸ سال بقید حیات رہ کر ۵۷ھ میں رہ گرائے عالم جاودانی ہوئیں۔

ازواج مطہرات میں صرف حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی کنواری اور بن بیاہی تھیں فہم وفراست اور علم وتفقہ میں تمام ازواج مطہرات بلکہ بہت سے صحابہ کرام پر فوقیت رکھتی تھیں۔

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ما اشكل عَلينا حديث قط فسألنا عائشة الا وجدنا عندها منه علما. ہم اصحاب رسول کو جب بھی کسی مسئلہ میں اشکال پیش آتا تو دریافت کرنے پر حضرت عائشہ صدیقہ کے پاس اس کا حل مل جاتا تھا۔

روایت حدیث میں حضرت ابوہریرہ اور عبداللہ بن عمرو کے بعد حضرت عائشہ صدیقہ ہی کی مرویات سب سے زیادہ ہیں، اکابر صحابہ میں حضرت فاروق اعظم، ان کے صاحبزادے حضرت عبداللہ، حضرت ابوہریرہ، حضرت ابوموسی اشعری، حضرت عبداللہ بن عباس وغیرہ نے آپ سے روایت کی ہے۔

علوم دینیہ کے علاوہ ایام عرب، اور اشعار جاہلیت میں بھی انھیں کامل رسوخ حاصل تھا یہی وہ فضائل ہیں جن کی بناء پر آنحضرت ...... حضرت عائشہ سے بہت زیادہ محبت رکھتے تھے چونکہ تعدد نکاح کا ایک اہم اور بنیادی مقصد دین کی تعلیم اور وہ احکام ومسائل جو صنف نسواں سے متعلق ہیں انھیں ازواج مطہرات کے واسطہ سے امت کی عورتوں تک پہنچانا تھا، درحقیقت یہ ازواج مدرسۃ النسواں کی طالبات تھیں، مسجد نبوی اور صفّہ میں مردوں کو تعلیم دی جاتی تھی، اور بیت نبوی ...... میں امہات المومنین کو تاکہ آگے چل کر یہ دیگر عورتوں کی معلّمات بنیں چونکہ اس میدان میں حضرت عائشہ صدیقہ اپنی جودتِ فہم، دقّتِ نظر، اور قوت حافظہ کی بنا پر تمام ازواج سے ممتاز تھیں، اس لئے فطرتاً آنحضور ...... کا میلان طبع ان کی جانب زیادہ تھا۔

(۴) حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا: یہ حضرت فاروق اعظمؓ کی صاحبزادی تھیں شعبان ۳ھ میں آنحضرت ...... کے نکاح میں آئیں، ان کے پہلے شوہر

حضرت خنیس بن حذافہ سہمی کو غزوۂ بدر میں زخم آیا، جس کے صدمے سے کچھ عرصہ بعد فوت ہوگئے، شوہر کے انتقال کے بعد حضرت فاروق اعظم نے حضرت عثمان غنی اور ابوبکر صدیقؓ کو خطبہ دیا مگر یہ حضرات خاموش رہے بالآخر آپ ...... نے خود انھیں اپنے حبالۂ عقد میں لے کر ان کے والد ماجد اور خود ان کی عزت افزائی فرمائی، حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت شعبان ۴۵ھ میں آپ کا وصال ہوا کل آٹھ سال آنحضرت ...... کی رفاقت میں رہیں۔

(۵) حضرت زینب بنت خزیمہ رضی اللہ عنہا: ۳ھ میں آپ کی زوجیت سے مشرف ہوئیں، ان کے پہلے شوہر حضرت عبداللہ بن جحش غزوۂ احد میں شہید ہوئے، حضرت زینب خود اس غزوہ میں شریک تھیں، مجروحین کی مرہم پٹی اور دیکھ ریکھ کی خدمات نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیا اور شوہر کی شہادت پر پورے صبر وتحمل کا مظاہرہ کیا۔ نبی کریم کو جب ان کے صبر وثبات اور مجاہدین کی خدمات کا علم ہوا تو ان کی عزت افزائی اور قدر دانی اور اطمینان خاطر کی غرض سے اپنی زوجیت میں لے لیا، نکاح کے دو تین ماہ ہی گذرے تھے کہ ان کا وصال ہوگیا، آنحضرت ...... نے خود نماز جنازہ پڑھائی اور جنت البقیع میں دفن کیا۔

(۶) حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا: یہ بھی بیوگی کی حالت میں آپ کے نکاح میں آئیں ان کے پہلے شوہر حضرت عبداللہ بن عبدالاسد اولین سابقین میں سے تھے اور دین کی حفاظت کے لئے اپنی زوجہ محترمہ کو ساتھ لے کر حبشہ ہجرت کر گئے تھے، وہیں ان کے صاحبزادے سلمہ پیدا ہوئے، غزوۂ احد کے موقع پر دولتِ شہادت سے ہم کنار ہوئے۔

شوہر کے وصال کے بعد حضرت ام سلمہ اور ان کے چار یتیم بچے بالکل بے سہارا ہوگئے نبی کریم ...... نے انھیں نکاح کا پیغام بھیجا تا کہ بچوں کی پرورش اور تربیت کے ساتھ خود ام سلمہؓ کی کفالت کا سامان بھی ہوجائے اور ان کی رضامندی پر نکاح فرمالیا اور ان کے بچوں کی اس طرح پیار ومحبت اور اپنائیت کے ساتھ پرورش فرمائی کہ وہ اپنے والد کو یکسر بھول گئے۔

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا شرافت نسبی اور تقدم اسلام کے ساتھ فہم وفراست اور عقل وتدبّر کے لحاظ سے امتیازی شان رکھتی تھیں، حتیٰ کہ خود آنحضرت...... اپنے اور مومنین کے اہم امور میں ان سے مشورہ فرمایا کرتے تھے، سات سال آنحضرت ...... کے ساتھ رہیں، اسّی یا چوراسی سال کی عمر میں وفات ہوئی۔ (۱)

(۷) حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا: آنحضرت ...... کی پھوپھی زاد بہن ہیں، آپ کی زوجیت میں آنے سے پہلے آپ کے آزاد کردہ غلام اور متبنّیٰ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کے عقد میں تھیں، حضرت زینب چونکہ زیدؓ کو حسب و نسب کے لحاظ سے اپنے آپ سے کمتر درجہ کا سمجھتی تھیں، اس لئے شوہر کا جیسا احترام ہونا چاہئے اسے پورا نہ کرسکیں، جس سے حضرت زیدؓ کو شکایت ہوئی اور بالآخر نوبت طلاق تک پہنچی، حضرت زید کے ساتھ ان کا نکاح نبی کریم ...... کے حکم سے ہوا تھا، اگرچہ وہ طبعی طور پر اس کے لئے آمادہ نہ تھیں، مزید برآں طلاق کا واقعہ ہوجانا اس سے ان کی بظاہر مزید سبکی و دل شکنی ہوئی، آنحضرت ...... نے اس کے ازالہ کی خاطر خود حضرت زینب سے بحکم خداوندی نکاح فرمالیا۔

بعض مخالفین اسلام اور اعداء رسول ...... نے ایک بے سروپا اسرائیلی روایت کے سہارے حضرت زینب سے متعلق النبی الذکی الطاہر ...... پر ایک رکیک اور بیہودہ الزام عائد کیا ہے جو روایتاً و درایتہً بالکل غلط اور بے بنیاد ہے، تاریخ اسلامی میں اس روایت کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔

اس مخترع، ساقط الاسناد اور یکسر باطل روایت کا حاصل یہ ہے کہ ایک دن آنحضرت ...... حضرت زید کی غیر موجودگی میں ان کے گھر تشریف لے گئے، وہاں حضرت زینب پر آپ کی نظر پڑگئی اور آپ کا دل ان کی جانب مائل ہوگیا دل کی اس بدلتی ہوئی حالت پر تعجب کرتے ہوئے آپ نے سبحان اللہ مقلب القلوب کا جملہ زبان سے ادا کیا، اس جملہ کو زینب نے سن لیا، اور حضور...... کی حالت کا اندازہ کرلیا، جب زید گھر واپس آئے تو انھوں

---

(۱) تفصیل کے لئے صحیح بخاری، اصابہ، زرقانی، رحمۃ للعالمین وغیرہ ملاحظہ ہو۔

نے اس واقعہ کی اطلاع انھیں دی، زید سمجھ گئے کہ نبی کریم ......کو زینب پسند آ گئی ہیں اس لئے خدمت میں آ کر طلاق کا ارادہ ظاہر کیا، نبی علیہ السلام نے انھیں منع کیا لیکن (نعوذ باللہ) دل میں یہی تھا کہ زید انھیں طلاق دیدیں تو بہتر ہوگا، آخر کار زید نے انھیں اسی نیت سے طلاق دیدی کہ حضور......ان سے نکاح کرلیں۔

سند کے اعتبار سے یہ روایت ساقط الاعتبار ہے ہی از روئے عقل بھی نہایت پوچ اور لغو ہے، زینب نبی کریم ......کی پھوپھی زاد بہن ہیں، آپ انھیں لڑکپن سے جانتے پہچانتے تھے، اس تعارف وتوافق کے باوجود آپ ان کی جانب مائل نہیں ہوئے حالانکہ وہ اس وقت کنواری اور نئی نویلی تھیں پھر یہ کیسے باور کیا جاسکتا ہے کہ وہی زینب جب دوسرے کے عقد میں چلی گئیں اور ثیبہ ہوگئیں تو آپ ان کی جانب مائل ہوگئے، سبحانک ہذا بہتان عظیم۔

اسی لئے جمہور مفسرین ومؤرخین نے اس واقعہ کے موضوع اور جھوٹے ہونے کی واضح الفاظ میں تصریح کی ہے۔ آگے حضرت زیدؓ سے ان کے نکاح کی حکمت اور طلاق کے بعد پھر آنحضرت ......کے ان سے عقد فرمانے کی مصلحت بالتفصیل آرہی ہے۔

ابن سیّد الناس کی تفصیل کے مطابق ۴ھ میں حضرت زینب آپ ...... کے نکاح میں آئیں چھ سال حضور ...... کے ساتھ رہیں اور ۲۰ھ میں بعمر ۵۷ سال وفات ہوئی، حضرت فاروق اعظمؓ نے نماز جنازہ پڑھائی۔

(۸) حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا: یہ حارث بن ضرار سردار بنو مصطلق کی بیٹی تھیں ان کا شوہر مسافع بن صفوان مصطلقی غزوہ مریسیع میں مسلمانوں کے ہاتھوں مارا گیا یہ قبیلہ اسلام اور مسلمانوں کا شدید ترین دشمن تھا، ڈاکہ اور راہزنی میں اسے خاص شہرت تھی، دیگر بہت سے قیدیوں کے ساتھ حضرت جویریہ بھی گرفتار ہوکر آنحضرت ......کی خدمت میں پیش ہوئیں، آنحضرت ...... نے انھیں آزاد کرکے اپنی زوجیت میں لے لیا، جس کی برکت سے اس قبیلہ کو دنیا اور آخرت دونوں میں نفع عظیم حاصل ہوا، ربیع الاول ۵۰ھ میں ان کی وفات ہوئی۔

(۹) حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا: یہ ابوسفیان بن حرب مشہور سردار

عرب کی بیٹی تھیں، ان کا پہلا نکاح عبید اللہ بن جحش سے ہوا، دونوں مشرف باسلام ہوکر حبشہ ہجرت کر گئے، وہاں کچھ عرصہ کے بعد عبید اللہ مرتد ہو کر عیسائی بن گیا، اور اسی حالت میں مر گیا مگر حضرت ام حبیبہؓ اسلام پر قائم رہیں، عبید اللہ کے انتقال اور عدّت کے ختم ہو جانے پر آنحضرت...... نے نجاشی شاہ حبشہ کو کہلا بھیجا کہ اگر ام حبیبہ نکاح پر راضی ہوں تو تم بطور وکیل میرا نکاح ان سے کرادو اور انھیں میرے پاس مدینہ بھیج دو، ام حبیبہؓ کی منظوری پر نجاشی نے آنحضرت...... سے ان کا نکاح کر دیا اور خود اپنی جانب سے چار ہزار درہم مہر کے انھیں دے کر حضرت شرحبیل کے ہمراہ آنحضرت...... کی خدمت میں پہنچا دیا، ۴۴ھ میں بعمر ۷۴ سال مدینہ منورہ میں فوت ہوئیں، اس نکاح کے مصالح آئندہ آرہے ہیں۔

(۱۰) حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا: اپنے قبیلے بنو نضیر کے سردار کی بیٹی تھیں، ان کا پہلا نکاح سلام بن مشکم قرظی سے ہوا، سلام کے طلاق دیدینے کے بعد کنانہ بن ابی الحقیق کے نکاح میں آئیں، کنانہ غزوہ خیبر میں قتل ہوا، حضرت صفیہ گرفتار ہوئیں رسول اللہ...... نے انھیں آزاد کر کے اپنی زوجیت میں لے لیا، ۵۰ھ میں آپ کی وفات ہوئی، سوا تین سال نبی کریم...... کی رفاقت میں رہنے کا موقع ملا۔

(۱۱) حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا: ماہ ذی قعدہ ۷ھ میں جب آپ عمرۂ قضا کے لئے تشریف لے گئے اس وقت آپ کی زوجیت میں آئیں، یہ آپ کی آخری زوجہ ہیں ان کے بعد آپ...... نے کسی اور سے نکاح نہیں فرمایا یہ پہلے ابورہم بن عبد العزہ کے نکاح میں تھیں ۵۱ھ میں بعمر اسّی (۸۰) سال مقام سرف میں انتقال ہوا، سرف ہی میں نکاح بھی ہوا تھا۔

تعدّد ازواج کے مصالح

حضرات امہات المومنین کے تذکرہ سے یہ بات واضح ہوگئی کہ حضرت عائشہؓ کے علاوہ جملہ ازواج مطہرات بیوہ ہونے کے بعد آپ کے نکاح میں آئی اور ان میں بعض وہ بھی ہیں جو عمر کی اس منزل میں پہنچ چکی تھیں، جس میں عورتیں نکاح کے قابل نہیں رہ

جاتیں پھران میں اکثر وہ ہیں جنھیں چند سالوں سے زیادہ آپ کے ساتھ زندگی گذارنے کا موقع نہ مل سکا۔

پھران کی خدمت نبوی میں آمد بھی ایسے دور میں ہوئی جب کہ مشرکین مکہ وغیرہ سے غزوات کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا، جس کی بنا پر آپ کو گھر چھوڑ کر باہر رہنا پڑتا تھا اور اطمینان وسکون تقریباً مفقود تھا اس لئے ان نکاحوں سے نعوذ باللہ خواہش نفس کی تکمیل مقصود نہیں تھی بلکہ اس کی مختلف حکمتیں تھیں جن کے پیشِ نظر مَالِی فِی النساء مِنْ حَاجَةٍ (مجھے عورتوں کی کوئی حاجت نہیں) کے باوجود بحکم خداوندی آپ نے یہ سارے نکاح کئے، ذیل میں اختصار کے ساتھ چند مصالح کا ذکر کیا جاتا ہے تاکہ حقیقتِ واقعہ پوری طرح واضح ہو جائے۔

(۱) **تعلیمی مصلحت** : ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ حضرات امہات المومنین درحقیقت درسگاہ رسول کی طالبات تھیں، بعثتِ رسول کے مقاصد میں سے اہم ترین مقصد امّت کو دین کی تعلیم دینا ہے ویعلمهم الكتاب والحكمة سے قرآن حکیم نے نبی کے اس فریضہ کی وضاحت کی ہے، اس تعلیم میں بہت سی باتیں وہ ہیں جن کا تعلق صرف عورتوں سے ہے یا عورتوں اور مردوں کے باہمی رابطہ سے ہے، اس لئے ضرورت تھی کہ جس طرح مردوں کی ایک جماعت سفر وحضر میں نبی کریم ...... کے ساتھ رہ کر تعلیماتِ نبوی سے مستفید ہو اسی طرح عورتوں کی بھی ایک جماعت خلوت وجلوت میں رسول اللہ ...... کے ساتھ رہے تاکہ ان کے واسطہ سے صنف نسواں کے مخصوص مسائل واحکام امت کی تمام بیٹیوں تک پہنچائے جاسکیں، کیونکہ عورتیں بالعموم اپنی فطری حیاء کی بنا پر براہ راست نبی علیہ السلام سے ان مسائل کو پوچھنے میں شرم کرتی تھیں، علاوہ ازیں خود آنحضرت ......بھی اپنی حیاء کامل کی وجہ سے ان کے مخصوص مسائل کے جوابات صراحۃً دینے پر قادر نہ ہوتے تھے بلکہ ایسی صورتوں میں اشارہ وکنایہ کو کام میں لاتے تھے اور عورتیں بسا اوقات انھیں سمجھ نہ پاتی تھیں۔

چنانچہ حضرت عائشہ صدیقہؓ بیان کرتی ہیں کہ ایک انصاریہ خاتون نے غسل حیض

سے متعلق احکام معلوم کیئے، آنحضرت ...... نے انھیں غسل کا طریقہ بتاتے ہوئے فرمایا خذی فرصة ممسكة فتطهری بها (خوشبو آلود کپڑے کا ایک ٹکڑا لے لو اور اس سے طہارت حاصل کرو) انصاریہ اس کا مطلب نہ سمجھ سکیں اور عرض کیا کیف اطهر بها (اس سے کیوں کر طہارت حاصل کروں) آپ نے جواب میں پھر اسی جملہ فتطهری بها کا اعادہ فرمایا، انصاریہ نے اظہار عجز کرتے ہوئے کہا کیف یا رسول الله اطهر بها نبی علیہ السلام نے ان کے اس اشارہ کو نہ سمجھنے پر تعجب آمیز لہجہ میں فرمایا سبحان الله تطهری بها لیکن انصاریہ پھر بھی نہ سمجھ سکیں، حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جب میں نے یہ حالت دیکھی تو انصاریہ کا ہاتھ بھینچتے ہوئے کہا ضعها فی مکان کذا کذا و تبتغی بها اثر الدم (اسے فلاں مقام میں رکھ لے اور پھر دیکھتی رہ کہ اس پر خون کا اثر ظاہر ہوتا ہے یا نہیں) وصرحت لها بالمكان الذی تضعها فيه اور اس جگہ کی صراحت کردی جس میں کپڑے کو رکھنا تھا۔

ظاہر ہے کہ اس طرح کے مخصوص مسائل کو عورتیں صراحتاً نہ تو نبی کریم سے دریافت کرسکتی تھیں (الاّ ماشاء اللہ) اور نہ خود آنحضرت ...... انھیں ہر عورت سے بیان کرسکتے تھے اس لئے ضروری تھا کہ دوچار نہیں بلکہ عورتوں کی ایک معتد بہ تعداد آپ کی زوجیت میں آکر ان مسائل کو سیکھے اور دوسری عورتوں تک انھیں پہنچائے۔

چنانچہ احادیث و سیر کے مطالعہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ عورتیں رات کی تاریکیوں میں آ آکر حضرت عائشہ صدیقہ اور دوسری ازواجات مطہرات سے اس قسم کے مسائل دریافت کیا کرتی تھیں۔

پھر یہ بات بھی طے شدہ ہے کہ سنّت مطہرہ صرف اقوال رسول میں منحصر نہیں بلکہ آنحضرت ...... کے اعمال اور تقریرات کی بھی وہی حیثیت ہے جو اقوال کی ہے اور جس طرح فرمان نبوی امت کے لئے ہدایت اور ذریعہ نجات و سعادت ہیں، بعینہٖ اقوال و تقریرات بھی سرمایہ رشد و ہدایت ہیں، اب ظاہر ہے کہ یہ امہات المومنین نہ ہوتیں تو آنحضرت ...... کے گھریلو اعمال اور تدبیر منزل کے احکامات کے معلوم ہونے کا ذریعہ کیا

ہوتا، الحاصل نبی کریم ...... نے کثرتِ زوجات کے ذریعہ عورتوں میں معلّمات کی ایک جماعت تیار کردی، احادیث نبوی اور سیرت رسول نیز احکام شرعیہ کا ایک قابل ذکر حصہ انھیں ازواجِ مطہرات کے ذریعہ امت تک پہنچا ہے بالخصوص حضرت عائشہ صدیقہ تو اس وصف میں اکثر صحابۂ کرام پر بھی فوقیت رکھتی ہیں۔

یہ ہے کثرت ازواج کی بنیادی حکمت اور اساسی مصلحت، اسی بناء پر ہم دیکھتے ہیں کہ مکہ معظّمہ کی پوری زندگی اور مدینہ منورہ کے ابتدائی سنین میں چونکہ اصلاح عقائد و اخلاق پر زور تھا، ازواجِ مطہرات کی یہ کثرت نہیں تھی ۲ھ کے بعد جب اصلاح اعمال و افعال پر خصوصی توجہ دی جانے لگی، اور احکام عملیہ تیزی کے ساتھ نازل ہونے لگے تو ضرورت محسوس ہوئی کہ عورتوں کی ایک جماعت حریم نبوت میں داخل ہوجائے تاکہ مردوں کی طرح عورتوں میں بھی معلّمات کا ایک طبقہ پیدا ہوجائے۔

واذكرن ما يتلى فى بيوتكن من آيات اللّٰه والحكمة.

اورتم (اے ازواج رسول) خدا کی ان آیتوں اور رسول کی سنتوں کو یاد رکھو جن کا تمہارے گھروں میں چرچا کا تاکیدی حکم حضرات امہات المومنین کو اسی بنا پر تھا تاکہ آگے چل کر یہ صنف نسواں کی تعلیم وتربیت کا حق پورے طور پر ادا کرسکیں۔

(۲) **تشریعی مصلحت** : کثرتِ ازواج کے مصالح میں سے ایک مصلحتِ تشریعی بھی ہے اس کے ذریعہ آپ نے تبنیت کے بت کو ہمیشہ کے لئے پاش پاش کردیا۔

متبنّٰی (لے پالک) بنانے کا طریقہ عرب میں قدیم زمانہ سے چلا آرہا تھا، اور اہل عرب اس سلسلے میں اتنا غلو رکھتے تھے کہ متبنّٰی (منہ بولا بیٹا) کو حقیقی وصلبی بیٹے کے درجہ میں سمجھتے، میراث، نکاح، طلاق، حرمت مصاہرت، حرمت مناکحت وغیرہ تمام احوال میں منہ بولے بیٹے کا معاملہ حقیقی بیٹے کی طرح کرتے تھے، طریقہ یہ تھا کہ جب کوئی کسی کو اپنا متبنّٰی بناتا تو اس سے کہتا انت ابنى ارثك وترثنى (تو میرا بیٹا ہے میں تمہارا وارث ہوں اور تم میرے وارث ہو)

اسلام جو اصلاح معاشرہ کا سب سے بڑا داعی اور مبلغ ہے وہ ان باطل رسوم اور خلافِ عقل وشرع امور کو کیونکر برقرار رکھ سکتا تھا اور پورے معاشرہ کو جہالت کی تاریکیوں میں بھٹکتا ہوا کس طرح چھوڑ سکتا تھا اس لئے اللہ تعالیٰ نے اوّلاً اپنے رسول کو متبنّیٰ بنانے کا الہام کیا اور آپ نے بعثت سے قبل زید بن حارثہ کو متبنّیٰ بنالیا اور لوگ اس دن سے زید بن حارثہ کے بجائے زید بن محمد کہہ کر پکارنے لگے، امام بخاری و مسلم دونوں متفقہ طور پر حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا یہ قول نقل کرتے ہیں۔

ان زید بن حارثة مولی رسول اللّٰه ما کنّا ندعوه الاّ زید بن محمد حتی نزل القرآن ”ادعوهم لابائهم هو اقسط عند اللّٰه“ فقال النبی انت زید بن حارثة.

متبنّیٰ بنانے کے بعد آپ نے ان کا نکاح اپنی پھوپھی زاد بہن حضرت زینب سے کر دیا اگرچہ زینب اس رشتے کیلئے اپنے آپ کو تیار نہیں کر پا رہی تھیں مگر رسول اللہ...... کے حکم کے آگے سر تسلیم خم کر دیا پھر بھی حسب ونسب کے لحاظ سے وہ اپنے کو حضرت زید سے اعلیٰ و برتر سمجھتی رہیں جس کی بناء پر وہ توافق و یکسانیت جو شوہر اور بیوی کے درمیان ہونا چاہئے پیدا نہ ہوسکی اور حالات بگڑتے بگڑتے اس حد کو پہنچ گئے کہ حضرت زید نے انھیں طلاق دیدی، زید کے طلاق دیدینے کے بعد حکم خداوندی پہنچا۔

فلما قضی زید منها وطرا زوجنا کها (جب زید نے زینب سے اپنی حاجت پوری کرلی اور ان کو طلاق دیدی تو اے نبی ہم نے ان کا نکاح آپ سے کر دیا)

چنانچہ آپ نے حضرت زینب سے نکاح فرمالیا تاکہ عرب کی اس قدیم بدعت کا سلسلہ ٹوٹ جائے اور اسلامی طریقہ کی بنیاد قائم ہو۔ اس طرح اس مبارک نکاح کے ذریعہ عرب سے وہ رسم بد ختم ہوئی جس میں وہ صدیوں سے گرفتار چلا آرہا تھا۔

ساتھ ہی اس جدید تشریع الٰہی اور طریقۂ اسلامی کو مؤکد کرنے کے لئے یہ حکم نازل فرمایا گیا۔ ما کان محمد ابا احد من رجالکم ولکن رسول اللّٰه وخاتم النبیین وکان اللّٰه بکل شیء علیماً الآیة **محمد** تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں بلکہ وہ خاتم سلسلۂ نبوت ہیں اور اللہ تعالیٰ ہر شئی کا علم رکھنے والا ہے۔

ان تفصیلات سے معلوم ہوا کہ یہ نکاح حکمِ خداوندی سے ایک باطل رسم کو مٹانے کیلئے عمل میں آیا تھا نہ کہ ہوائے نفس کی تکمیل کے لئے، جیسا کہ معاندین اسلام واعداء رسول...... کا فاسد خیال ہے۔

(۳) **اجتماعی مصلحت** : یہ حکمت حضرت عائشہ صدیقہ اور سیّدہ صفیّہ رضی اللہ عنہما کے نکاحوں سے خوب ظاہر ہوتی ہے، ان نکاحوں کے ذریعہ آپ کے دونوں وزراء حضرت صدیق اکبرؓ و حضرت فاروق اعظمؓ آپ کے سلسلۂ مصاہرت میں آ گئے جس سے ان حضرات کا مزید اعتبار بڑھا اور آگے چل کر اُن کی خلافتوں کو اس کے ذریعہ تقویت ومنفعت حاصل ہوئی۔

علاوہ ازیں اسلام کی سربلندی اور نشر واشاعت میں ان ہر دو بزرگوار نے جو کارہائے نمایاں انجام دیئے تھے اس کا بھی تقاضا تھا کہ انھیں دنیا میں بھی خصوصی مقام اور امتیازی شان حاصل ہو، اسی لئے آنحضرت...... نے ان دونوں حضرات کی صاحبزادیوں سے نکاح فرما کر ان کی عزت افزائی فرمائی، جس طرح حضرت عثمان اور علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہما کے نکاح میں اپنی صاحبزادیوں کو دے کر ان کے مقام ومرتبہ کو بلند کیا۔ الحاصل یہ چاروں حضرات آپ کے اعظم صحابہ اور آپ کے بعد دین وملت اور اس کی دعوت وامامت میں آپ کے خلیفہ تھے، اس لئے ان سے رشتۂ مصاہرت قائم کرنا اجتماعی سیاست وحکمت کے لحاظ سے نہایت ضروری تھا۔

(۴) **سیاسی مصلحت** : بعض نکاحوں سے تالیف قلوب اور قبائل کو اپنی جانب مائل کرنے اور ان کے ظلم وجور اور بغض وعناد میں کمی کرنے کے مصالح پیش نظر تھے، مثلاً ام المومنین حضرت صفیہ کے نکاح پر غور کیا جائے اس نکاح سے پیشتر مشرکین سے جتنی جنگیں ہوئیں ان میں درپردہ یا کھلے طور پر یہود کا تعلق ضرور ہوتا تھا مگر تزویج صفیہ کے بعد یہود مسلمانوں کے خلاف کسی جنگ میں شریک نہیں ہوئے۔

اسی طرح حضرت ام حبیبہ کے نکاح کا معاملہ ہے کہ ان کے والد ابوسفیان اس نکاح سے پہلے اسلام اور مسلمانوں کے بدترین مخالف اور دشمن تھے، اور حمراء الاسد، بدر صغریٰ اور

احزاب وغیرہ غزوات میں مشرکین کے قائد اور امیر لشکر یہی رہے تھے لیکن تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ اس نکاح کے بعد انھوں نے مسلمانوں پر فوج کشی نہیں کی بلکہ نکاح کے تھوڑے ہی عرصہ کے بعد خود بھی مسلمان ہو کر آنحضرت کے حلقہ بگوش ہو گئے علاوہ ازیں سارے بنوامیّہ اس رشتہ کا خیال کرنے لگے تھے جس کی بنا پر ان کی عداوت اور اسلام دشمنی میں بیحد کمی ہو گئی۔

حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا کے نکاح سے سیاسی فائدہ کے ساتھ دینی فائدہ بھی ہوا کہ اس نکاح کی خبر حضراتِ صحابہ کو ہوئی تو وہ بیک زبان پکار اٹھے اصهار رسول الله تحت ایدینا حضور...... کے سسرال کے لوگ ہماری قید غلامی میں رہیں؟ اور یک لخت سارے قیدیوں کو آزاد کر دیا قبیلہ بنو مصطلق پر اس سیر چشمی اور شرافت و مروّت کا یہ اثر ہوا کہ پورا قبیلہ اسی وقت مسلمان ہو گیا اور اس نکاح کی برکت سے دنیا و آخرت دونوں کی ذلّت سے سب کے سب نجات پا گئے، اسی لئے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرمایا کرتی تھیں ما رأينا امرأة كانت اعظم بركةً علىٰ قومها منها میں نے کسی عورت کو نہیں دیکھا جس کی برکت و منفعت اپنی قوم پر حضرت جویریہ سے زیادہ ہو۔

غرضیکہ کثرتِ ازدواج کے ذریعہ مختلف خاندانوں سے آپ کے تعلقات قائم ہوئے جو آگے چل کر اسلام اور مسلمانوں کی ترقیات کے ذریعہ بنے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ آپ کے نکاح میں بنو ہاشم میں سے کوئی عورت نہیں آئی کیونکہ وہ تو اپنا خاندان تھا۔

ان جملہ تفصیلات سے یہ بات واضح ہو گئی کہ نکاح کے سلسلہ میں آپ نے جو طریقہ اختیار فرمایا وہ اپنی خواہش نفس کی تکمیل کے لئے نہیں تھا بلکہ اس سے ملک وقوم، اسلام اور عالم انسانیت کے مصالح و مفاد وابستہ اور مربوط تھے جسے نظر انداز کرنا اس ہادی برحق اور مصلح اعظم کے لئے ممکن نہیں تھا جسے رب العالمین نے دنیا میں رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجا تھا۔

يارب صل وسلم دائما ابدا
على حبيبك خير الخلق كلهم

☆ ☆ ☆

ہماری تاریخ کا ایک باب یہ بھی ہے!

(۱) خدام کے آرام وراحت کا خیال

سلطان التمش جس نے ۶۰۷ھ سے ۶۳۳ھ تک نہایت کرّ وفر کے ساتھ ہندوستان میں حکمرانی کی حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی المتوفی ۶۳۳ھ اپنے ملفوظات ''فوائد السالکین'' میں اس کے اخلاق حمیدہ کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں ''التمش صحیح العقیدہ تھا، وہ راتوں کو جاگتا، اگر کبھی اتفاقاً نیند آجاتی تو فوراً بیدار ہوجاتا اور وضو کرتا، اپنے نوکروں چاکروں میں سے کسی کو نہ جگاتا اور کہتا کہ آرام سے سونے والوں کو کیوں تکلیف دی جائے۔ رات کو فقیروں کے بھیس میں باہر نکل جاتا۔ اس کے ہاتھ میں اشرفیوں کا تھیلا ہوتا، لوگوں کے دروازوں پر جاتا، انھیں دستک دے کر باہر بلاتا ان کے حالات دریافت کرتا اور ان کی حسب ضرورت مدد کرتا اور قسمیں دے کر ان سے کہتا کہ جب ان کے پاس کھانے پینے کی چیزیں نہ ہوں یا ان پر کوئی ظلم وزیادتی کرے تو وہ اس کے دربار کے پاس آکر لٹکی ہوئی زنجیر عدل کو ہلائیں تا کہ وہ حالات سے باخبر ہوکر انصاف کرسکے کیونکہ قیامت کے دن ان کی فریاد کے بار کو اٹھانے کی طاقت اس کے اندر نہیں ہے۔ (فوائد السالکین ص ۲۹)

(۲) افشائے راز

شیخ قطب الدین بختیار کاکی نے اپنے وصال کے وقت وصیت کی تھی کہ میری نماز جنازہ ایسا شخص پڑھائے جس میں یہ تین وصف جمع ہوں: (۱) ہمیشہ عفیف رہا ہو کسی غیر محرم پر اس نے کبھی نظر نہ ڈالی ہو (۲) اس کی عصر کی سنتیں قضا نہ ہوئی ہوں (۳) اور ہمیشہ نماز باجماعت میں تکبیر اولیٰ سے شریک رہا ہو۔ نماز جنازہ کے وقت جب اس

وصیت کا اعلان کیا گیا تو کوئی آگے نہیں بڑھا کچھ دیر انتظار کے بعد سلطان التمش یہ کہتے ہوئے آگے بڑھا کہ میری خواہش تو یہی تھی کہ میرا حال لوگوں سے پوشیدہ رہے لیکن خواجہ نے آج اس راز کو فاش کر دیا۔ (خزینۃ الاصفیاء ج ا ص ۲۷۵)

(۳) بیوی کو صبر کی تلقین

سلطان التمش کا لڑکا سلطان ناصر الدین محمود بھی باپ ہی کی طرح نہایت عابد وزاہد اور درویشانہ صفات کا حامل تھا۔ وہ ۶۴۴ میں تخت نشین ہوا اور بیس سال تک حکمرانی کے فرائض انجام دیئے وہ اپنے ذاتی مصارف کا بار خزانہ پر بالکل نہیں ڈالتا تھا بلکہ کلام پاک کی کتابت سے اپنے اخراجات پورے کرتا تھا اس لئے اس کی زندگی بڑی عسرت اور تنگی میں گزرتی تھی گھر گرہستی کے کاموں کو انجام دینے کے لئے اس کے محل میں کوئی خادمہ تک نہ تھی ایک روز اس کی ملکہ نے شکایت کے طور پر کہا کہ میں آپ کے لئے روٹی پکاتی ہوں تو میرے ہاتھ جل جاتے ہیں اور ان میں آبلے پڑ جاتے ہیں سلطان ملکہ کی یہ تکلیف سن کر رونے لگا۔ پھر بیوی کو مخاطب کر کے کہا کہ یہ دنیا گذر جانے والی ہے یہاں اس تکلیف کو برداشت کر کے صبر کرو قیامت میں اللہ تعالیٰ اس کے اجر میں تم کو تمہاری خدمت کے لئے حور عطا فرمائے گا ابھی تو میں تمہارے لئے بیت المال سے کوئی کنیز وخادمہ نہیں خرید سکتا۔ سلطان کی نیک دل بیوی نے درویش شوہر کی رائے سے اتفاق کیا۔ (البدایونی، ج ا ص ۹۰)

(۴) احساس دیانت

شاہان بلبن کے بعد جلال الدین فیروز شاہ دہلی کے تخت وتاج کا مالک ہوا رسم تاجپوشی کے موقع پر دو رکعت شکرانہ کی ادا کرنے کے بعد تخت شاہی پر بیٹھا اور اپنے امراء سے مخاطب ہو کر کہا کہ میں نے بار سلطنت اٹھا تو لیا ہے لیکن متحیر ہوں کہ میرا انجام کیا ہوگا۔ اس کے بعد وہاں سے اٹھ کر سلطان بلبن کے محل میں گیا جس کا نام ”کوشک لعل“ تھا اس وقت اس کے ساتھ ایک درباری ملک احمد حبیب تھا اس درباری نے سلطان فیروز شاہ سے

کہا کہ اب آپ کو اس دار الامارت میں سکونت اختیار کرنی چاہیے سلطان نے جواب دیا کہ سلطان غیاث الدین بلبن نے بادشاہ ہونے سے پہلے اس کی تعمیر کی تھی اب یہ ان کی اولاد کی ملکیت ہے میرا اس پر حق نہیں ہے۔ ملک احمد حبیب نے کہا کہ امور حکمرانی میں اتنی پابندی کی گنجائش نہیں۔ سلطان نے برجستہ جواب دیا کہ دنیا کے چند روزہ مفاد کی خاطر اسلامی احکام کی خلاف ورزی نہیں کروں گا اور نفس کی پیروی میں کوئی کام انجام نہیں دوں گا۔

(۵) مکارم اخلاق

سلطان بہلول لودی ۸۵۵ھ میں تخت نشین ہوا۔ یہ نیک دل سلطان اپنی بادشاہت کے زمانہ میں پانچوں وقت کی نماز جماعت سے ادا کرتا تھا، شریعت کی پابندی کا بے حد خیال رکھتا، لوگوں کی درخواستوں کو خود دیکھتا اور سب کے ساتھ عدل کرتا، دربار میں تخت پر نہ بیٹھتا اور نہ امراء کو اپنے سامنے کھڑا ہونے دیتا۔ اس کے امیروں یا لشکریوں میں کوئی بیمار ہو جاتا تو اس کی عیادت کے لئے ضرور جاتا۔ اگر کسی کو اس سے رنج پہنچ جاتا تو اس کے پاس جا کر معذرت خواہ ہوتا۔ میدان جنگ میں پہلے دو رکعت نماز پڑھتا۔ اسلام اور مسلمانوں کے لئے فلاح کی دعائیں مانگتا پھر جا کر دشمنوں سے مقابلہ کرتا اپنی تخت نشینی کے بعد جب پہلی مرتبہ جمعہ کی نماز پڑھنے جامع مسجد گیا تو خطیب نے خطبہ پڑھنے کے دوران افغانوں کا یہ کہہ کر مذاق اڑایا کہ سبحان اللہ! یہ بھی عجیب قوم پیدا ہوئی ہے، شاید یہ دجال کے پیش رو ہوں ان کی زبان یہ ہے کہ ماں کو مور، بھائی کو رور، گاؤں کو شور اور لشکر کو تور کہتے ہیں۔ اپنی قوم کی اس قدر تضحیک کے باوجود سلطان نے مسکرا کر صرف اتنا کہا کہ خطیب صاحب بس کیجئے ہم لوگ بھی خدا کے بندے ہیں۔ (حکمرانوں کی تو خیر بڑی بات ہے علماء و صلحاء کی جماعت میں بھی حلم و بردباری کی ایسی مثال کم ملے گی) تاریخ داؤدی ص ۱۱۔

پاکبازی

احمد نظام الدین شاہ والیٔ احمد نگر المتوفی ۹۰۴ھ نہایت ہی پاک خصلت اور نیک طینت

فرماں روا تھا۔ وہ جب باہر نکلتا تو راستے میں دائیں بائیں دیکھنے کے بجائے اپنی نظریں نیچے کیئے رہتا۔ ایک بے تکلف امیر نے اسکی وجہ پوچھی تو اس نے جواب دیا کہ شہر سے گذرتے وقت میری سواری کا تماشا دیکھنے کیلئے مرد عورت آ کر کھڑے ہو جاتے ہیں میں ڈرتا ہوں کہ میری نگاہ کسی نامحرم پر پڑ جائے اور اس کا وبال مجھ پر نازل ہو۔ (تاریخ فرشتہ ج ۲ ص ۱۰۰)

حق بحق دار رسید

سکندر لودھی کے عہد حکومت میں سنبھل کے علاقہ میں ایک شخص کو پندرہ ہزار اشرفیوں کا ایک دفینہ دستیاب ہوگیا، سنبھل کے حاکم میاں قاسم نے اشرفیوں کو اس شخص سے وصول کرلیا اور سلطان سکندر کے پاس ایک درخواست بھیج کر پوچھا کہ اس دفینہ کے بارے میں کیا حکم ہے۔ سلطان نے حکم دیا کہ پانے والے کو واپس لوٹا دیا جائے حاکم سنبھل نے پھر لکھ کر بھیجا کہ اتنی بڑی رقم پانے کا یہ شخص مستحق نہیں ہے۔ سلطان نے اس کو لکھا کہ اے احمق جس نے اس شخص کو یہ دفینہ عطا کیا ہے وہ بہتر جاننے والا ہے اگر یہ مستحق نہ ہوتا تو وہ کیوں دیتا ہم لوگ سب خدا کے بندے ہیں وہی بہتر جانتا ہے کہ ہم میں کون کس چیز کا مستحق ہے۔ (تاریخ داؤدی ص ۴۲)

خوف آخرت

والئ گجرات سلطان محمود بیگڑہ کا جانشین سلطان مظفر ایک دن قرآن مجید کی تلاوت کر رہا تھا۔ قیامت کے ذکر پر مشتمل آیتوں کو پڑھ کر بے اختیار رونے لگا اور بولا معلوم نہیں اس وقت میرا کیا حال ہوگا۔ اس کے ایک ندیم شیخ جیو نے کہا جہاں تک مجھے معلوم ہے آپ سے کوئی گناہ کبیرہ نہیں ہوا ہے۔ کثرت عبادت آپ کا مشغلہ ہے، خلق خدا بھی آپ سے خوش ہے توقع ہے کہ آخرت میں آپ کو بلند ترین درجات ملیں گے۔ سلطان نے یہ سن کر کہا شیخ جیو میری گردن پر بار گراں ہے اسی لئے روتا ہوں کیا تم نے پیغمبر آخر الزماں...... کی یہ حدیث نہیں سنی "نجا المخففون وهلك المثقلون" ہلکے پھلکے لوگ نجات پالیں

گے اور جو گراں بار ہے وہ ہلاک ہوگا۔ (مرأۃ سکندری ص ۱۷۰)

انجام کی فکر

سلطان محمود بیگڑہ جس نے ۸۶۲ سے ۹۱۷ تک صوبۂ گجرات میں حکمرانی کی۔ اپنی آخر عمر میں عبادت میں مشغول رہتا اور اکثر روتا رہتا تھا اس کے ایک درباری امیر ملک سارنگ نے سلطان کو برابر روتے ہوئے دیکھ کر ایک دن عرض کیا کہ دولت بھی ہے شہنشاہی بھی ہے پھر رونے کی کیا وجہ ہے؟ سلطان نے کہا اے بے عقل! تم کو کیا بتاؤں مجھے کیا غم کھائے جا رہا ہے۔ میرے مرشد شاہ عالم نے اگرچہ میرے لئے دعا فرمائی ہے کہ ''محمود کی عاقبت محمود ہو، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ میری عاقبت محمود نہ ہو سکے گی۔ عمر کی نہر برابر جاری ہے اور اس سے جو حصہ بہہ جاتا ہے وہ کبھی واپس نہیں لوٹے گا۔ اسی لئے روتا ہوں، افسوس اور حسرت تو اس پر ہے کہ اپنے ولی نعمت کی قدر جتنی جانی چاہئے تھی اتنی نہ جان سکا اور جتنی جانی اس پر عمل نہ کر سکا۔ (مرأۃ سکندری ص ۷۹)

حسن خاتمہ

علاء الدین حسن گانگو المتوفی ۹۵۷ھ جس نے گلبرگہ، احمد آباد اور بیدر میں گیارہ سال تک بڑی کامیاب حکمرانی کی۔ اپنے مرض موت میں ایک دن اپنے چھوٹے بیٹے شہزادہ محمود کو پاس نہ دیکھ کر پوچھا کہ وہ کہاں ہے۔ بتایا گیا کہ مکتب میں پڑھ رہا ہے۔ حسن گانگو نے صاحبزادہ کو بلوا کر پاس بٹھایا اور پوچھا کہ کیا پڑھ رہے تھے شہزادے نے جواب دیا کہ شیخ سعدی شیرازی کی بوستاں پڑھ رہا تھا۔ گانگو نے پوچھا کون سی حکایت شہزادہ نے کہا وہ حکایت جس میں یہ ہے۔

شنیدم کہ جمشید فرخ سرشت　　بسر چشمۂ بر بسنگے نوشت
بدیں چشمہ ہو ماں بسے دم زدند　　برفتند چوں چشم برہم زدند
گرفتند عالم بمردی وزور　　ولیکن نبردند باخود بگور

جس وقت گانگو نے تیسرا شعر سنا تو اس پر بے اختیار گریہ وزاری ہو گیا۔ اور اسی وقت اپنے خزانچی کو بلایا، اور اپنے ذاتی خزانہ کے تمام اثاثے کو نکلوایا اور اپنے بیٹوں کے حوالے کیا کہ انھیں لے جا کر جامع مسجد میں علماء، فقراء، میں تقسیم کر دو۔ شہزادوں نے باپ کے حکم کی تعمیل کی۔ اور جب تمام تقسیم کر کے باپ کو واپس آ کر اس کی اطلاع دی تو حسن گانگو نے کہا ''الحمدللہ'' اور اسی وقت روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ (تاریخ فرشتہ ج ا ص ۲۸۱)

☆ ☆ ☆

تاریخ اسپین کا عبرت خیز ورق

''اسپین'' جس پر مسلمانوں نے تقریباً آٹھ سو سال تک اس آن بان کے ساتھ حکومت کی کہ ان کی قوت وعظمت سے پورا براعظم یورپ مبہوت ومتحیر تھا، جس کے شہر و قصبات، مدارس و جامعات کی علمی وتحقیقی سرگرمیوں سے گہوارہ علم وفن بنے ہوئے تھے، جس کی مسجد ''جامع قرطبہ'' اپنی وسعت اور شان وشوکت کے لحاظ سے عالم اسلامی میں بے نظیر تھی، جس کا ایک چپہ بھی بنجر اور بن کھیتی کا نہ تھا، حتی کہ پہاڑوں پر بھی زراعت ہوتی تھی، جس کی تہذیب وثقافت نے تمام دنیا سے خراج تحسین حاصل کیا، جس کے ہر شعبۂ زندگی میں آج بھی اسلام کی چھاپ نمایاں طور پر محسوس ہوتی ہے، مگر آج وہی اسپین مسلمانوں کے وجود سے خالی ہے، جامع قرطبہ تسبیح وتہلیل کے ترنم سے محروم ہے، تکبیر و توحید کی آواز وادی البرتات سے ٹکرا کر خاموش ہوگئی ہے، اسپین کی المناک تاریخ آج ملت اسلامیہ کو خون کے آنسو رلا رہی ہے اور اسپینی مسلمانوں کی بے مثال تباہی کی داستان سن کر ان کے دل تڑپ اٹھتے ہیں۔

تاریخ اسلامی کے نامور مورخ اکبر شاہ نجیب آبادی اسپین کی اس تباہی و بربادی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مسلمانوں پر یہ مصائب اس لئے نازل ہوئے کہ انھوں نے کلام الٰہی کو پس پشت ڈال دیا تھا، جس کی وجہ سے ان میں خودغرضی اور نا اتفاقی پیدا ہوئی، پابندیٔ اسلام کے ترک ہونے کا یہ نتیجہ تھا کہ مسلمان سردار اپنے بھائی مسلمان سرداروں کی مخالفت میں عیسائیوں کے پاس جا کر ان سے مدد طلب کرنے میں کوئی باک وتأمل نہ کرتے تھے، مسلمانوں نے خود عیسائیوں کے ہاتھوں خوشی خوشی مسلمانوں کو ذبح کرایا... اندلس کے مسلمانوں نے اپنی

بداعمالیوں سے اپنے آپ کو مغضوب بنالیا تھا، اس لئے ان کو دنیا کے کسی حصہ سے کوئی امداد نہ پہنچی اور کفار کے ہاتھوں سے فجار کو خدائے تعالیٰ نے سزا دلوائی، مسلمان جب کبھی اور جہاں کہیں دینِ اسلام سے غافل اور قرآن سے بے تعلق ہوئے ان پر ایسی ہی مصیبتیں نازل ہوئیں۔'' (تاریخ اسلام ج۳ ص۲۷۴)

طوائف الملوکی اور اس کے منفی اثرات

اس اجمال کی مختصر تفصیل یہ ہے کہ اسپینی امراء رقابت وثروت میں مخمور ہوکر اسلامی تعلیمات کے علی الرغم عیش ونشاط، سرود ورباب کے دلدادہ ہوگئے، اسلامی اخوت ومحبت کے بجائے ان کے اندر خودغرضی اور اقتدار کی ہوس نے جڑ پکڑ لی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۴۲۲ھ سے وہاں طوائف الملوکی شروع ہوگئی اور اسپین چھوٹی چھوٹی مسلم ریاستوں میں تقسیم ہوگیا، قرطبہ اشبیلیہ، غرناطہ، بلنشیہ، مالقا وغیرہ شہروں میں ان ریاستوں کے دارالحکومت قائم ہوگئے، ان ریاستوں میں آئے دن اقتدار کی جنگ ہونے لگی، عیسائی سلاطین نے مسلمانوں کی اس خانہ جنگی سے بھرپور فائدہ اٹھایا کبھی ایک ریاست کو مدد پہنچا کر اور کبھی دوسری ریاست کو کمک دے کر انھیں لڑا لڑا کر بالکل بیدم کردیا تو پھر اپنا دست ستم بڑھایا۔ مسلمان چونکہ اپنی ساری توانائی باہمی جنگوں میں اپنے ہاتھوں برباد کرچکے تھے، اس لئے وہ عیسائی حملہ کا مقابلہ نہ کرسکے، وہ ایک ایک کر کے سارے شہروں پر قابض ومتصرف ہوگئے، مسلمانوں کا آخری سہارا صرف غرناطہ رہ گیا تھا جو اب تک عیسائیوں کے دست ستم سے محفوظ تھا، ۱۲/ جمادی الآخر ۸۹۶ھ کو قسطلہ کے عیسائی حکمراں فردی نند نے ایک مسلم امیر زغل کی ناعاقبت اندیشیوں سے فائدہ اٹھا کر ایک لاکھ فوج سے غرناطہ کا محاصرہ کرلیا، یہ محاصرہ تقریباً آٹھ ماہ تک جاری رہا، سپہ سالار اعظم موسیٰ غسّانی اور دیگر حکام میدان میں نکل کر مقابلہ کرنا چاہتے تھے مگر سلطان ابوعبداللہ ہمت ہار چکا تھا اس لئے سپہ سالار کی رائے کے برعکس خفیہ طور پر اپنے وزیر کو فردی نند کے پاس بھیج کر صلح کی پیش کش کی، فردی نند اور اس کے سپاہی محاصرہ کی طوالت سے اکتا چکے تھے، اس غیر متوقع

پیش کش کو انھوں نے فوراً قبول کرلیا چنانچہ جانبین کی منظوری سے صلح نامہ تیار ہوا جس کی اہم دفعات یہ تھیں۔

(۱) کسی مسلمان کے جان و مال کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا، مسلمانوں کو اختیار ہوگا چاہے غرناطہ میں رہیں یا اور کہیں چلے جائیں۔

(۲) مسلمانوں کے معاملات میں عیسائی مداخلت نہیں کریں گے۔

(۳) عیسائی مسجدوں میں داخل نہیں ہوں گے۔

(۴) مساجد اور اوقاف بدستور قائم رہیں گے۔

(۵) مسلمانوں کے معاملات کا تصفیہ شریعت اسلامی کے موافق مسلم قاضی کریں گے۔

(۶) جو عیسائی مسلمان ہوگئے ہیں انھیں ترک اسلام پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔

(۷) سلطان ابوعبداللہ کے سپرد البشرات کی حکومت کردی جائے گی۔

(۸) آج سے ساٹھ دن کے اندر قلعہ الحمراء توپ خانہ وغیرہ دیگر اسلحے جو اس وقت قلعہ میں موجود ہیں عیسائیوں کے حوالہ کردیا جائے گا۔

(۹) شہر غرناطہ ایک سال تک آزاد رہے گا، سال بھر کے بعد شرائط بالا ملحوظ رکھتے ہوئے عیسائی اس پر قابض ہوں گے۔

(۱۰) طرفین کے قیدی رہا کردیئے جائیں گے۔

اس صلح نامہ پر یکم ربیع الاوّل ۸۹۷ھ مطابق ۳/جنوری ۱۴۹۲ء کو فریقین کے دستخط ہوئے۔

قلعہ الحمراء پر قابض ہوتے ہی ''فردی نند'' نے صلح نامہ کی ساری شرطیں یک لخت فراموش کردیں، شہر غرناطہ پر اپنا مکمل تسلط قائم کرلیا، ابوعبداللہ سلطان کو البشرات سے بیدخل ہونے پر مجبور کردیا۔

مختلف مسلم جماعتیں اور ان کا انجام

اسپین میں آباد مسلمانوں کی مختلف جماعتیں تھیں: (۱) خالص عربی النسل، جو عام

طور پر شام، یمن، حجاز اور حضر موت سے آ کر یہاں آباد ہو گئے تھے۔ (۲) خالص بربری، ان کی تعداد بھی اچھی خاصی تھی، (۳) مولدین یعنی وہ لوگ جن کے باپ عرب یا بربر تھے اور مائیں اسپینی تھیں (۴) نومسلم یعنی وہ عیسائی جنھوں نے اسلام قبول کر لیا تھا ان کی اولاد بھی نومسلم ہی کہلاتی تھی۔

سقوط غرناطہ کے وقت عام طور پر عربی النسل اور بربری مسلمان اسپین چھوڑ کر تیونس، مراکش وغیرہ ملکوں میں چلے گئے، جنھیں بس اتنی اجازت دی گئی کہ صرف اپنی جان لے کر چلے جائیں مال واسباب ساتھ لے جانے کی قطعی اجازت نہیں تھی، ان ہجرت کرنے والوں میں بھی بہت سارے عیسائی لٹیروں کے ہاتھوں راستے ہی میں شہید ہو گئے۔

کچھ بچے کھچے عربی جنھوں نے ترک وطن کو گوارہ نہیں کیا وہ اسپین ہی میں رہ گئے انھیں حملہ آور اور غیر ملکی جیسے نفرت آمیز ناموں سے یاد کیا جاتا تھا، تیسری اور چوتھی جماعت کے مسلمانوں نے عام طور پر اسپین ہی میں رہنے کو ترجیح دی، کیونکہ انھیں ''فردی نند'' کے اس اعلان پر اعتماد تھا کہ مسلمانوں کو مذہبی آزادی حاصل رہے گی۔

غرناطہ پر تسلط مکمل ہو جانے کے بعد اسپین سے مسلمانوں کو تاخت وتاراج اور نیست ونابود کرنے کی غرض سے درج ذیل ظالمانہ ومنافقانہ طریقے اختیار کئے گئے:

(۱) مسلم عدالتیں توڑ کر عیسائی عدالتیں قائم کی گئیں جن میں ہر روز ہزاروں مسلمان پیش کئے جاتے اور ان پر جھوٹے جھوٹے الزامات عائد کر کے آگ میں جلا دیا جاتا۔

(۲) مسلمانوں کے گھروں کی تلاشی کا سلسلہ شروع کیا گیا کہ یہ لوگ ہتھیار جمع کرتے ہیں اور خفیہ طور پر حکومت کے خلاف اسکیمیں بناتے ہیں۔

(۳) عیسائیوں کی جانب سے مسلمانوں پر حملے کئے جاتے جن میں قتل وغارت گری کے علاوہ ان کے گھروں اور دکانوں کو نذر آتش کر دیا جاتا، حملوں کا یہ سلسلہ ختم ہونے کے بجائے بڑھتا ہی رہا اور اسپین کا کوئی شہر یا قصبہ ایسا نہیں تھا جہاں کے مسلمانوں کی جان ومال تباہ نہ کی گئی ہو۔

(۴) عربی زبان کی سرکاری حیثیت ختم کر دی گئی۔

(۵) پورے ملک میں یہ پابندی لگادی گئی کہ مسلمان اپنا کوئی بڑا تعلیمی ادارہ قائم نہیں کر سکتے۔

(۶) غلط تاریخیں مرتب کرائی گئیں جن میں مسلمانوں کو ظالم و غاصب اور ان کے عہد حکومت کو دور غلامی سے تعبیر کیا گیا، مسلم حکمرانوں نے اسپین کی تہذیب وترقی سے متعلق جو گراں قدر کارنامے انجام دیئے تھے انھیں تاریخ کے صفحات سے یا تو خارج کردیا گیا یا اسے بے حیثیت کر کے بیان کیا گیا۔

(۷) خالص اسپینی مسلمانوں کو پھر سے عیسائی بنانے کی مہم شروع کی گئی، ان سے کہا جاتا کہ تمہارے آباؤ اجداد کو عربوں نے بجبر واکراہ مسلمان بنالیا تھا، اب تم آزاد ہو، اس لئے اپنے اصلی مذہب کی طرف واپس آجاؤ۔

(۸) بعض مسلمانوں کو زبردستی بپتسمہ دیا جاتا اور ان کے لڑکوں کو عیسائی بنالیا جاتا۔

(۹) بڑے بڑے اجتماعات کیئے جاتے جن میں فرضی طور پر کچھ لوگوں کو اسٹیج پر پیش کیا جاتا کہ یہ مسلمان تھے مگر انھوں نے برضا ورغبت اسلام چھوڑ کر عیسائیت قبول کرلی ہے، پھر ان کا خوب اعزاز واعلان کیا جاتا۔

(۱۰) مختلف حیلوں وتدبیروں کے ذریعہ مسلم عوام کو علماء وشرفاء سے بدظن کر کے ان میں بعد اور تفریق پیدا کردی گئی۔

(۱۱) شرعی طریقہ کے برخلاف نکاح کے لئے سرکاری عدالتوں میں رجسٹرڈ کرانے کو لازم قرار دیدیا گیا۔

جبری عیسائی بنانے کا روح فرسا اقدام

ان ہمت شکن حالات میں بھی اسپینی مسلمان اپنے دین ومذہب کو سینے سے لگائے رہے اور اپنی نسلوں میں دین کو باقی وزندہ رکھنے کا یہ نظم کیا کہ گھروں اور مسجدوں میں بچوں کی دینی تعلیم کا نظم اپنے طور پر کیا، لیکن یہ سلسلہ تادیر قائم نہ رہ سکا، ۹۰۴ھ میں یہ اعلانِ عام کیا گیا کہ مسلمان اپنا مذہب چھوڑ کر عیسائیت قبول کرلیں، ورنہ انھیں قتل کردیا جائے گا،

اس اعلان پر مسلمانوں کا ایک طبقہ ملک بدر ہونے کے لئے تیار ہو گیا، فردی نند نے انھیں افریقہ چلے جانے کی اجازت دیدی اور ان کے ساتھ بظاہر یہ کرم کا معاملہ کیا کہ جہاز بھی فراہم کر دیئے گئے مگر عیسائیوں نے ان جہازوں کو ساحل افریقہ تک پہنچنے سے پہلے ہی غرق کر دیا، اور سارے مہاجرین مع اہل وعیال اور قیمتی کتب خانوں کے ہمیشہ کے لئے تہہ آب آسودۂ خواب ہو گئے، اور بقیہ سارے مسلمانوں نے شہروں اور آبادیوں کو چھوڑ کر پہاڑوں کو اپنا ملجا اور جائے پناہ بنالی، ہر نوع کی اذیتیں برداشت کیں مگر اسلام کے دامن کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا، ان پہاڑوں میں پناہ گزیں مجبوروں کو بھی عیسائی حکومت نے برداشت نہیں کیا، ان کی گرفتاری وقتل کا سلسلہ برابر جاری رہا، کبھی جب دس بیس پناہ گزیں اکٹھا ہوتے تو مقابلہ کی بھی نوبت آجاتی اور بہادرانہ لڑتے ہوئے شہید ہو جاتے، بعض اندلس کے شمالی پہاڑوں کی طرف بھاگ گئے اور بے سروسامانی کی حالت میں ہلاک ہو گئے، ان میں سے بعض بچ کر یورپ کے ملکوں کو طے کر کے ملک شام پہنچے، ان مرنے والوں کے بچوں کو عیسائیوں نے اپنے قبضہ میں لے کر عیسائی بنالیا، اس طرح ملک فرانس کے جنوبی اور ملک اسپین کے شمالی حصوں میں عربی النسل خاندانوں کے وجود کا امکان مؤرخین نے تسلیم کیا ہے، اسی بناء پر نپولین کو بعض لوگ عربی النسل لکھتے ہیں۔

مسلمانوں کی اپنی کوئی تنظیم یا ادارہ موجود نہیں تھا جو ان حالات میں ان کی صحیح رہنمائی ودستگیری کرتا، باشعور، عزیمت پسند افراد بھی باقی نہ بچے تھے جو حالات کے رخ کو موڑنے کی فکر کرتے نتیجہ یہ ہوا کہ چند سالوں کے عرصہ میں قسم کھانے کو بھی سرزمین اسپین میں خدائے وحدہ لاشریک لہٗ کا نام لینے والا کوئی باقی نہ رہا، سب ہی کو مختلف ہلاکت خیز طریقوں سے موت کی نیند سلا دیا گیا، اگر کچھ ان ہلاکت خیزیوں سے کسی طرح محفوظ رہ گئے تو اپنی جان بچا کر اِدھر اُدھر منتشر ہو گئے۔

درسِ عبرت

واقعات ومشاہدات گواہ ہیں کہ سرزمین ہند میں بھی ہندو احیاء پرست طاقتیں اسپین

کی تاریخ دہرانا چاہتی ہیں۔

(۱) وہی فرقہ وارانہ فساد کی تکنیک ہے جس پر آزادی کے وقت ہی سے عملدرآمد ہو رہا ہے اور کمی کے بجائے اس میں دن بدن ترقی ہوتی جارہی ہے اور چند سالوں سے حکومت کی صوبائی پولیس ان فسادیوں کے ہراول دستے کی خدمت انجام دینے لگی ہیں۔

(۲) مسلمانوں کو ظالم وغاصب ثابت کرنے کی غرض سے تاریخوں میں تحریف اور ردوبدل کا سلسلہ ایک عرصہ سے جاری ہے۔

(۳) مسلمانوں کے دین و مذہب پر برابر حملے کئے جارہے ہیں، کبھی مسلم پرسنل لا کو تبدیل کردینے کی باتیں کی جاتی ہیں، اور کبھی مسلمانوں کی مقدس کتاب پر پابندی عائد کرانے کی سعی کی جاتی ہے۔

(۴) مسلمانوں کے مذہبی وتاریخی آثار کو سرزمین ہند سے مٹا دینے کی تشدّد آمیز تحریک جاری ہے، بابری مسجد اور ملک کی سیکڑوں مساجد ومقابر اس جارحانہ تحریک کا نشانہ بن چکی ہیں۔

(۵) مسلم عوام اور ان کے دینی وملّی رہنماؤں کے درمیان تفریق قائم کردینے کی مؤثر جدوجہد ہورہی ہے، اور اپنی غفلت شعاری سے یا مفاد پرستی سے بعض مسلمان بھی اس خطرناک سازش کا آلۂ کار بنے ہوئے ہیں اور اس خلیج کو وسیع سے وسیع تر کرنے میں اپنا زور قلم صرف کررہے ہیں۔ فالی اللہ المشتکی.

(۶) بعض علاقوں میں دین سے ناواقف مسلمانوں کو مرتد بنانے کی کوششیں بھی جاری ہیں۔

ایک طرف تو اسلام اور مسلمانوں کو صفحۂ ہند سے مٹا دینے کی یہ منظّم سازشیں اور مسلسل کوششیں ہیں کہ تمام ہندو احیاء پرست پارٹیاں متحد ہوکر ہمارے آثار وروایات کو محو کردینے پر تلی ہیں، دوسری طرف ہم ہیں کہ اپنی غفلت شعاریوں اور راحت کوشیوں کو چھوڑنے کے لئے آمادہ نہیں ہیں، دشمن مجتمع ہوکر حملے پر حملے کئے جارہا ہے مگر ہماری صفوں میں انتشار وتفرقہ ہے اور خود اپنوں ہی کے دست و بازو کو ناکارہ بنانے میں ہم مصروف

ہیں، حوادث ومصائب کے طوفان بار بار آکر ہمیں دستک دے رہے ہیں مگر ہم پر ایسی شدید نیند طاری ہے کہ آنکھ کھلتی ہی نہیں، غنیم ہر چہار طرف سے ہمیں نرغے میں لینے کی تیاریاں مکمل کر چکا ہے، لیکن ہم اپنے اپنے مخصوص دائروں میں اس طرح محصور ہیں کہ ملت کے وسیع تر مفاد کے متعلق غور وفکر کی ہمیں فرصت ہی نہیں، رہنمایان ملت اور علمائے دین، ولی اللّٰہی تحریک دعوت واصلاح کو چھوڑ کر اپنے زاویوں میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں حالانکہ طاغوتی طاقتیں منبر ومحراب اور مدرسہ وخانقاہ پر کمندیں ڈال رہی ہیں، امداد وضامن کے فرزندو اور قاسم ورشید کے درس حکمت وعزیمت کے پاسبانو! بابری مسجد کی زمیں بوس دیواریں تمھیں آواز دے رہی ہیں، شیخ الہند کی غیرت وحمیت اور حضرت مدنیؒ کی شجاعت واستقامت کے وارثو! مظلوم شہیدوں کا بہتا ہوا خون اور سلگتا ہوا جسم تمھیں دعوت حرکت وعمل دے رہا ہے حضرت مجدد الف ثانی کے اس ارشاد گرامی پر ذرا غور کرو تمھیں کیا سبق دے رہا ہے۔ ”ہر چند سلامتی درزاویہ است اما دولتِ شہادت درمعرکہ است، کنج زاویہ با اہل ستر و ارباب ضعف مناسب است، کارمرداں اقویا مبارزت ومعرکۂ کبریٰ است“ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ دنیا کی اور قومیں ہمارے لئے وسیلۂ عبرت تھیں مگر آج خود ہمارے ادبار وزوال کی حکایت اوروں کے لئے مثال عبرت ہے۔

انسان کی تمام اندرونی قوتیں اور جذبات خارجی محرکات کے محتاج ہوتے ہیں، ان کی مثال سوئے ہوئے انسان کی سی ہوتی ہے جو اگرچہ زندہ ہے مگر حرکت کے لئے کسی بیدار کن صدا کا محتاج ہے، آج کے واقعات وحادثات ہماری تنبیہ اور غفلت شکنی کے لئے ہیں، وقت نے صدائے رحیل بلند کر دی ہے، اسے محسوس کیجئے اور حرکت وعمل کیلئے تیار ہوجایئے خدانخواستہ اگر ہم آج بھی خوابِ غفلت میں پڑے سوتے رہے، تو باور کیجئے زمانہ پھر اٹھنے کا موقع نہیں دے گا انقلاب وتغیر کی اہمیت ونزاکت کو خدارا نظر انداز نہ کیجئے، سوچنے اور غور وفکر کرنے کا وقت یہی ہے، ضرورت ہے کہ کمال حزم واحتیاط کے ساتھ آئندہ اقدامات کا ایک نقشہ مرتب ہو، اگر یہ وقت محض اخبار کی قلم فرسائیوں اور تقریر کی طلسم طرازیوں میں ضائع کر دیا گیا تو یاد رکھئے قدرت اپنی بخششوں میں جس قدر فیاض

ہے اتنی ہی غافلوں کی تعذیب میں شدید ہے۔

تنظیم ملت کے چند اصول

ابتدائی مراحل میں بغیر کسی تاخیر کے درج ذیل کاموں کو پورے ولولہ اور حوصلہ مندی کے ساتھ انجام دیا جائے۔

(۱) باہمی یگانگت اور اتحاد و بھائی چارگی کو ترقی دی جائے، تمام جھگڑوں اور اختلافوں کو دور کیا جائے، ہر مسلمان دوسرے مسلمان کے درد و غم میں شریک ہو جائے۔ اور یہ حقیقت لوگوں کے دلوں میں نقش کر دی جائے کہ مسلمانوں کی کسی معصیت نے ان کو اس قدر نقصان نہیں پہنچایا ہے جس قدر باہم اختلاف اور تفرقہ نے اور کوئی چیز ان کو اس قدر نفع نہیں پہنچا سکتی جس قدر یہ چیز کہ سب مل کر ایک اور بھائی بھائی ہو جائیں۔

(۲) مسلمانوں کی عملی زندگی بالکل تباہ ہو چکی ہے اس لئے ضروری ہے کہ احکام شرع کے احترام و اتباع کا مردہ جذبہ پھر از سر نو زندہ کر دیا جائے، اور ایسا ماحول پیدا کیا جائے کہ لوگوں کے دل اللہ اور اس کی شریعت کے حکموں کے آگے سر بسجود ہو جائیں۔

(۳) مسلمانوں کو سمجھایا جائے کہ بیکاری ایک شرعی و ملی معصیت ہے اس لئے کسی مسلمان کو اپنی زندگی بیکار نہیں کاٹنی چاہیئے۔

(۴) تعلیم کی طرف خصوصی توجہ دی جائے بالخصوص مذہبی تعلیم سے ایک مسلمان بچہ بھی محروم نہ رہنے پائے۔

(۵) تمام منہیات و منکرات مثلاً شراب، جوا، گانا، باجا، سنیما، ٹی وی، وی سی آر، جھوٹ، غیبت، فحش کاری سے مسلم معاشرہ کو پاک کیا جائے۔

(۶) نماز با جماعت کے قیام پر زور دیا جائے اور اس سرگرمی سے اس کا ولولہ پیدا کر دیا جائے کہ ایک مسلمان بھی بے نمازی نظر نہ آئے، اس کے لئے ہر گاؤں اور محلّہ میں

دو، دو، تین تین افراد پر مشتمل ایک ذمہ دار مجلس بنائی جائے جو پورے محلّہ کے اتفاق واتحاد کے ساتھ لوگوں کو نمازی بنانے کی جدوجہد کرے۔

(۷) مساجد کی حسب ضرورت اصلاح ومرمت، توسیع وتعمیر کی جائے اور انھیں خوب آباد رکھا جائے۔

(۸) حفاظت خود اختیاری کے لئے ہر گاؤں اور محلّہ میں ایک جماعت ہمیشہ موجود رہے۔

(۹) افواہوں اور اشتعال انگیزیوں پر صبر وسکون کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا جائے اور فتنہ وفساد کو صلح وآشتی کے ساتھ دفع کرنے کی ہر امکانی کوشش کی جائے بصورت دیگر اپنے جان ومال کی حفاظت کے لئے فسادیوں کی مدافعت ہمت وجرأت کے ساتھ کی جائے۔

(۱۰) اپنے ہم سایہ دیگر برادریوں کے ساتھ اچھے تعلقات رکھے جائیں، ان کے ساتھ رواداری، حسن اخلاق، اچھے سلوک اور ہمدردی کا برتاؤ کیا جائے۔

اگر ان اصول پر عمل کرتے ہوئے استقلال وپامردی کے ساتھ ہمارے قدم بڑھتے رہے تو انشاء اللہ مصائب کے بادل چھٹ جائیں گے، مشکلات دور ہوجائیں گی، حق وصداقت کا غلبہ اور عدل وانصاف کا بول بالا ہوگا، ظلم پیشہ طاقتیں سرنگوں اور طاغوتی ظلمتیں کافور ہوجائیں گی۔

جاء الحق وزهق الباطل ان الباطل كان زهوقا.

☆ ☆ ☆

اجودھیا کی تاریخی حیثیت

اجودھیا ہندوستان کا ایک قدیم شہر ہے جو فیض آباد شہر سے جنوب مشرق میں تقریباً چھ کلومیٹر کے فاصلے پر دریائے گھاگھرا کے کنارے آباد ہے۔

اجودھیا کی قدامت

اجودھیا کا سب سے قدیم ذکر والمیک کی رزمیہ نظم رامائن میں ملتا ہے، والمیک کے اس تذکرہ کا خلاصہ یہ ہے۔

> ''قدیم زمانہ میں ایک بڑی سلطنت کوسل نامی دریائے سرجو (گھاگھرا) کے کنارے واقع تھی اس کا دار السلطنت اجودھیا تھا، جس کو خود منو نے آباد کیا تھا (منو انسان کے ابوالآباء کو کہتے ہیں) اس کے چاروں طرف اونچی اونچی دیواریں اور ایک ناقابلِ عبور خندق اس کی حفاظت کا سامان تھے، یہاں ایسے ایسے آلاتِ حرب موجود تھے جو ایک دم سو سو آدمیوں کو ہلاک کر سکتے تھے، کئی محل اور بہت سی منزل در منزل عمارتیں اس کی رونق تھیں، یہ تھا اجودھیا کا وہ شہر جو دنیا میں اپنا جواب نہ رکھتا تھا۔ (۱)

لیکن والمیک کے اس بیان کو عصر حاضر کے غیر مسلم دانشور بھی صحیح تسلیم نہیں کرتے چنانچہ سروپلّی گوپال، رومیلا تھاپر، بپن چندر، ایس بھٹا چاریہ، سویرا جیسوال، ہربنس مکھیا، کے این پنیکر، اَرچمیک لکشمی، ستیش اگروال، بی ٹی چٹو اپادھیائے، آرین ورما، کے

---

(۱) رامائن از گرفتھ کتاب اباب ۵ اشلوک ۵ بحوالہ معارف اعظم گڈھ ۳ جلد ۲۹ ص ۱۷۹ مقالہ بعنوان رامائن پر ایک نظر۔

مینا کشی، دلباغ سنگھ، مردولا مکھرجی، مادھون پلات، آدتیہ مکرجی، ایس ایف رتنا گر، نیلادری بھٹا چاریہ، کے کے تریویدی، یوکیس شرما، کنال چکرورتی، بھگوان سنگھ جوش، راجن گروکل، ہیمان شوری۔ پورے دو درجن تاریخ کے اسکالروں نے متفقہ طور پر والمیک کے اس بیان پر درج ذیل تنقید کی ہے۔

> ”والمیکی رامائن کے مطابق ایودھیا کے ”راجہ رام“ کلیگ شروع ہونے سے ہزاروں سال پہلے تر تیا یگ میں پیدا ہوئے تھے، کلیگ ۳۱۰۲ ق م میں شروع ہوتا ہے اس زمانہ میں آثار قدیمہ کی رو سے ایودھیا آباد ہی نہیں تھا، یہاں سب سے پرانی ممکن بستی آٹھویں صدی قبل مسیح میں تھی، والمیکی رامائن میں بیان کئے گئے طرز زندگی کے برخلاف اس زمانے میں رہن سہن خاصا معمولی اور سادہ تھا، والمیکی میں اعلیٰ شہری زندگی، شاہی محلات اور عمارتوں کا ذکر ہے جن کیلئے آٹھویں صدی قبل مسیح کے آثار قدیمہ سے کسی طرح کا ثبوت نہیں ملتا ہے۔“ (۱)

ایک اور ہندو محقق و مورخ ڈاکٹر آر ایل شکلا پروفیسر دہلی یونیورسٹی یہ تبصرہ کرتے ہیں۔

> ”بعض مؤرخین رامائن میں بیان کئے گئے ”رام“ کو حقیقی کردار مانتے ہیں، یہ مؤرخین رام کا زمانہ ڈھائی ہزار سال قبل مسیح مانتے ہیں.... اگر ہم اس تحقیق کو مان لیں تو رامائن میں جن مقامات کا تعلق رام جی سے بیان کیا گیا ہے ان جگہوں میں عیسیٰ (علیہ السلام) سے ڈھائی ہزار سال پہلے انسانی زندگی کے آثار ملنے چاہئیں اسی مقصد کے تحت تین مقامات کی کھدائی ہوئی (۱) ضلع فیض آباد میں اجودھیا کی (۲) الہ آباد سے ۳۵ کلومیٹر شمال میں واقع شرنگویر پور کی (۳) اور الہ آباد میں واقع بھاردواج آشرم کی، اجودھیا میں کھدائی آج سے تقریباً ۲۵ سال پیشتر ہوئی تھی، اس وقت وہاں آبادی کی علامتیں عیسیٰ (علیہ السلام) سے چھ سو سال پہلے کی نہیں ملی تھی، اور اب سے

---

(۱) تاریخ کا بیجا سیاسی استعمال۔ روزنامہ قومی آواز دہلی ۶/ نومبر ۱۹۹۰÷

تقریباً دس سال پہلے دوبارہ بڑے پیمانے پر وہاں (اجودھیا) کی کھدائی ہوئی، اس کھدائی سے بھی آبادی کے متعلق وہی نتیجہ نکلا کہ عیسیٰ (علیہ السلام) سے زیادہ سے زیادہ سات سو سال قبل کی آبادی کے آثار پائے گئے (اس سے پہلے کے نہیں) اب اگر یہ مان لیا جائے کہ موجودہ اجودھیا ہی رام جی کی نگری تھی تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ رام جی کے زمانہ سے اجودھیا کی آبادی کے زمانے کی تطبیق کیوں نہیں ہوتی کیونکہ رام جی کا زمانہ عیسیٰ (علیہ السلام) سے کم از کم ڈھائی ہزار سال پہلے کا بتایا جاتا ہے، اس تحقیق کے اعتبار سے موجودہ اجودھیا رام جی کی بھومی نہیں ہوسکتا۔" (۱)

ڈاکٹر شکلا اسی مقالہ میں آگے چل کر لکھتے ہیں:

"والمیکی رامائن کے مطابق کوسل کا پایہ تخت اجودھیا سرجوندی (دریائے گھاگھرا) کے داہنی سمت ڈیڑھ یوجن (ساڑھے تیرہ میل) کے فاصلے پر سرجو سے پورب میں تھا جب کہ آج کا اجودھیا سرجو کے بالکل کنارے پچھّم طرف واقع ہے، والمیکی کے اس بیان سے بھی موجودہ اجودھیا کا تعلق رام جی کے اجودھیا سے قائم نہیں ہوتا۔"

والمیک کی اس روایت کے بالمقابل بعض مسلم تاریخ نویسوں نے شہر اجودھیا کا تعلق ابوالبشر آدم علیہ السلام کے حقیقی و صلبی بیٹے حضرت شیث علیہ السلام سے جوڑا ہے اور لکھتے ہیں کہ اجودھیا کے اولین بانی حضرت شیث علیہ السلام ہیں، اور بہت سے مؤرخین نے حضرت شیث علیہ السلام کا مدفن اجودھیا ہی کو قرار دیا ہے، چنانچہ آپ کے نام سے منسوب ایک قبر اجودھیا میں آج بھی موجود ہے جس کی تفصیل کتاب کے آخری باب میں ذکر کی گئی ہے، لیکن آثار قدیمہ کی اس جدید تحقیق کی رو سے یہ روایت بھی مخدوش ہو جاتی ہے۔

اجودھیا کے متعلق ایک روایت یہ بھی مشہور ہے کہ ترتیا یگ کے بعد اجودھیا گم ہو گیا تھا جس کو وکرمادتیہ نے دوبارہ دریافت کیا، اس روایت کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

---

(۱) مقالہ رام کی نگری اجودھیا جھوٹ یا سچ، شائع شدہ ایٹک سنواد ماہ نومبر ۱۹۸۴ء ص ۱۲

> ’’وکرما دتیہ کو جب اجودھیا کی جستجو ہوئی تو انھیں کسی ذریعہ سے پتہ چلا کہ تیرتھوں کے حکمراں پریاگ کو اجودھیا کے جائے وقوع کا علم ہے چنانچہ وکرما ان کی خدمت میں پہنچے اور ان سے اجودھیا کے جائے وقوع کے بارے میں معلومات چاہی، پریاگ نے انھیں اس مقام کی نشاندہی کردی جہاں پہلے اجودھیا واقع تھا، لیکن پریاگ سے صحیح پتہ معلوم کرلینے کے باوجود وکرما اجودھیا کو پا نہیں سکے تو انھوں نے ایک یوگی سے رجوع کیا، یوگی نے ان سے کہا کہ وہ ایک گائے اور ایک بچھڑی کو کھلے مہار آزاد چھوڑ دیں جس جگہ پہنچ کر بچھڑی کے تھن سے دودھ ٹپکنے لگے وہی اجودھیا ہوگا، وکرما نے یوگی کے بتائے ہوئے طریقہ پر عمل کیا اور اجودھیا کے پالینے میں کامیاب ہوگیا۔ (۱)

اس روایت کی تمام تر بنیاد مذہبی خوش اعتقادی پر ہے، جس کا تاریخی حقائق سے کوئی تعلق نہیں، یہی وجہ ہے کہ عصر جدید کے ہندو مؤرخین جنھوں نے مذہبی خوش عقیدگی کے بجائے تاریخی دلائل وشواہد پر اپنی تحقیق و بحث کی بنیاد رکھی ہے وہ والمیکی میں مذکور اجودھیا کو ایک شاعرانہ تخیل سے زیادہ کی حیثیت نہیں دیتے۔

اجودھیا کی شناخت

موجودہ اجودھیا کی شناخت تاریخی لحاظ سے پانچویں صدی عیسوی سے ہوئی ہے، اس سلسلے میں تاریخ نے اپنے صفحات میں جو تفصیلات محفوظ کی ہیں اس کا حاصل یہ ہے کہ گپت خاندان کے راجہ سکند گپت جس کی راجدھانی سکیٹہ یا ساکا (موجودہ ساکیت) تھی اپنے بعض سیاسی مصالح کے پیش نظر اس کا نام تبدیل کرکے اسے اجودھیا سے موسوم کردیا تھا، اجودھیا سے ملحق ساکیت نام کی ایک آبادی آج بھی موجود ہے، جس کا مطلب یہ ہوا کہ سکیٹہ اجودھیا بن جانے کے باوجود ایک حد تک باقی رہا، اسی کے ساتھ سکّوں میں اپنا اصلی نام کندہ کرانے کے بجائے جدید نام وکرماجیت کندہ کرایا، بہت سے مؤرخین کا خیال

---

(۱) تاریخ کا بیجا سیاسی استعمال، قومی آواز ۶؍نومبر ۱۹۹۰ء

ہے کہ ان جذبات طرازیوں سے اس کا مقصد سوریہ ونسی راجوں کا وقار حاصل کرنا تھا کیونکہ راجہ رام چندر جی کے بارے میں یہی روایت ہے کہ وہ سوریہ ونسی (سورج بنسی) تھے، یہ سکند گپت (الملقب بہ وکرماجیت) خود سانکیہ دھرم کا پیرو تھا اور بعد میں بدھ مت کا معتقد ہو گیا تھا، رام جی سے اسے کوئی مذہبی عقیدت نہیں تھی۔

سکند گپت (وکرماجیت) کے بارے میں کیننگھم نے لکھا ہے کہ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ بودھ مت کے پیرووں کا دشمن تھا، لیکن کیننگھم کی یہ سنی سنائی بات درست نہیں ہے کیونکہ ونسنٹ اے اسمتھ نے اپنی مختصر تاریخ ہند میں تاریخی حوالہ سے لکھا ہے کہ وہ اولاً سانکیہ دھرم کا پیرو تھا، بعد میں ایک بدھسٹ عالم کی تبلیغ سے بودھ مت کا معتقد ہو گیا، اسمتھ لکھتا ہے۔

> ''۵۵۰÷ کے قریبی زمانہ میں بودھ مذہب کے ایک زبردست عالم ''بسو بندھو'' کی سوانح عمری ''پرمارتھ'' نامی عالم نے لکھی ہے جس میں وہ لکھتا ہے کہ اجودھیا کا راجہ بکرماجیت (سکند گپت) جو سانکیہ کے فلسفہ کا پیرو تھا اس کو ''بسو بندھو'' نے بودھ مت کا معتقد بنالیا تھا، یہ سوانح عمری چینی زبان میں محفوظ رہ گئی ہے''۔(۱)

عہد وسطیٰ کی تاریخی تصنیفات میں اجودھیا کا ذکر

مسلم دور حکومت میں لکھی گئی تاریخوں میں اجودھیا کا قدرے مفصل ذکر شہنشاہ اکبر کے درباری فاضل علامہ ابوالفضل متوفی ۱۰۱۱÷ نے اپنی فاضلانہ تصنیف آئین اکبری میں کیا ہے ابوالفضل نے بھی عوامی روایتوں ہی کے بیان پر اکتفاء کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

> اودھ از بزرگ شہر ہائے ہند طول صد وہژدہ درجہ وشش دقیقہ عرض بست وہفت درجہ وبیست دو دقیقہ پیش زماں دراز صد وچہل دہشت کردہ وپہنا سی وشش آباد بود از گزیں معابد باستان برشمارند بسواد شہر خاک بیزی کنند وطلا

---

(۱) مقدمہ تاریخ ہند، اکبر شاہ نجیب آبادی ج ۱ ص ۱۷۸۔

برگیرند بنگاہ راجہ رام چندر بود در دور تر تیا فرماں روائی معنوی با تخت نشینی صوری فراہم داشت یک کروے شہر دریائے گھگھر بدریائے سرو پیوستہ پایاں قلعہ بگذرد، نزد ایں شہر دو قبر بزرگ ساختہ اند شش وہفت گزی عامہ خوابگاہ شیث وایوب پیغمبر پندارند وبوئے افسانہا برخوانند۔ (۱)

اودھ ہندوستان کے بڑے شہروں میں ہے اس کا طول البلد ایک سو اٹھارہ درجہ چھ دقیقہ اور عرض البلد ۲۷ درجہ بائیس دقیقہ ہے، قدیم زمانہ میں اس کی آبادی ایک سو اڑتالیس کوس لمبائی میں اور چھتیس کوس چوڑائی میں تھی، یہ ہندوستان کی بہت بڑی تیرتھ گاہ ہے، اطراف شہر میں زمین کھودنے سے سونا نکلتا ہے یہ شہر راجہ رام چندر کا مسکن تھا جو ترتیا دور میں ظاہری و باطنی ریاست کے حامل تھے، شہر سے ایک کوس کے فاصلے پر دریائے گھاگھرا دریائے سرجو سے مل گیا ہے، اور قلعہ (سلطان سکندر لودھی کا تعمیر کردہ قلعہ جو اب دریا برد ہو چکا ہے) کے پاس سے گذرتا ہے، شہر کے نزدیک چھ سات گز لمبی دو قبریں ہیں جنھیں عوام شیثؑ اور ایوبؑ پیغمبر کا مدفن بتاتے ہیں، اور ان کے متعلق عجیب وغریب قصے سناتے ہیں۔

اسی کتاب میں ایک دوسری جگہ اجودھیا کے متعلق یہ درج کیا ہے۔

اجودھیا (بفتح ہمزہ وضم مجہول جیم وسکون واؤ وکسر دال وہائے خفی ویائے تحتانی والف) بہ اودھ مشہور از مشرق تا چہل کردہ معبد شمرند واز شمال تا جنوب بیست کردہ در نہم شکل پچھ ماہ چیت ہنگامہ پرستش فراہم آید۔" (۲)

اجودھیا جو اودھ سے مشہور ہے پورب جانب سے چالیس کوس اور دکھن سے اتر بیس کوس کے علاقہ کو متبرک شمار کرتے ہیں، چیت کی نویں تاریخ کو یہاں مذہبی میلہ ہوتا ہے۔

---

(۱) آئین اکبری ج ۲ ص ۸۷۔

(۲) آئین اکبری ج ۲ ص ۸۷۔

الگزنڈر کیننگھم کی رپورٹ

اجودھیا سے متعلق سب سے مفصل وہ رپورٹ ہے جو الگزنڈر کیننگھم نے ۱۸۷۱÷ میں مرتب کی تھی، اس میں مندرج بعض باتیں قطعی طور پر غلط اور فساد انگیزی پر مبنی ہیں، پھر بھی اجودھیا کے بارے میں اب تک اس سے زیادہ معلومات افزا تحریر نہیں لکھی گئی ہے، ۱۸۵۷÷ میں جب ہندوستان پر انگریزی حکومت کا تسلط مستحکم ہوگیا تو اپنے سامراجی مقاصد کے تحت حکومت نے جہاں بہت سے کام انجام دیئے وہاں آثار قدیمہ کا محکمہ قائم کرکے ان پر کتابیں لکھوانی شروع کیں اور ہر ضلع کے گزیٹر بھی مرتب کرائے، بظاہر یہ کام بہت مفید دکھائی دیا مگر ان میں جو زہر بھرا گیا اس سے عام طور پر لوگ بے خبر رہے، الگزنڈر کننگھم ہندوستانی آثار قدیمہ کا سب سے بڑا ماہر سمجھا جاتا ہے، اس کی رپورٹیں آج تک تحقیقی و تاریخی کاموں کے لئے ناگزیر سمجھی جاتی ہیں، کیننگھم نے اپنی رپورٹ کی جلد اوّل میں اجودھیا پر جو باب لکھا ہے اس موقع پر اس کے کچھ ضروری اقتباسات پیش کیئے جارہے ہیں۔

> ''چینی سیاح ہیون سیانگ کا بیان ہے کہ گوتم بدھ وساکا میں چھ سال رہے یہ سرسوتی کے جنوب میں کچھ فاصلہ پر تھا، میرے خیال میں وساکا اور ساکیت دونوں ایک ہی جگہیں ہیں۔''

اس کے بعد وہ اجودھیا کا ذکر اس طرح کرتا ہے۔

> ''اجودھیا کا موجودہ شہر پرانے شہر کے اتر پورب میں واقع ہے، لمبائی میں دو میل ہے اور پون میل چوڑا ہے، لیکن اس شہر کا آدھا حصہ بھی عمارتوں سے آباد نہیں ہے، پورے شہر میں زوال کے آثار ہیں، کھنڈروں کے اونچے اونچے ٹیلے بھی نہیں ہیں، وہاں ٹوٹی پھوٹی مورتیاں بھی نہیں ملتی ہیں، منقش ستون بھی نہیں پائے جاتے ہیں جیسا کہ دوسرے شہروں کے ویرانوں میں پائے جاتے ہیں، کوڑے کرکٹ کے تودے تو ضرور ہیں جن سے اینٹیں

نکال کر پڑوسی شہر فیض آباد کے مکانات بنائے گئے ہیں، یہ مسلمانوں کا شہر ڈھائی میل لمبا اور ایک میل چوڑا ہے یہ شہر ملبوں سے بنا ہوا ہے جو اجودھیا میں کھود کر نکالے گئے ہیں دونوں شہر چھ مربع میل میں واقع ہیں، یہ گویا رام کی قدیم راجدھانی اجودھیا کا نصف ہے۔“

کیننگھم آگے لکھتا ہے:

رامائن کے بیان کے مطابق اجودھیا کو ”منو“ نے آباد کیا، منو انسان کے ابوالآباء سمجھے جاتے ہیں، رام چندر کے پتا دسرتھ کے زمانہ میں اس میں قلعہ بند شہر تھے، پھاٹک بھی تھے اور اس کے چاروں طرف خندقیں تھیں، لیکن ان کا نام ونشان اب دکھای نہیں دیتا، اس کا کوئی حصہ بھی باقی نہیں، کہا جاتا ہے کہ ”رام“ کا اجودھیا دری ہاد بالا کی موت کے بعد ایک بڑی لڑائی میں ۱۴۲۶ق م میں برباد ہو گیا اس وقت سے وکرماجیت کے زمانہ تک یہ ویران رہا، مشہور روایت یہ ہے کہ وکرماجیت اجین کا مشہور شکاری راجہ تھا، موجودہ دور کے ہندو وکرما کے سارے اعمال اسی سے منسوب کرتے ہیں، اس سلسلے میں ان کی رائے مہمل ہے، ہیون سیانگ کا بیان ہے کہ اس نام کا ایک طاقتور راجہ سرسوتی کے پڑوس میں کنشک سے بعد کا تھا اور تقریباً ۷۸ق م کا زمانہ تھا، (۱) اور یہی سالی واہانہ کے شروع سا کاسنگ کا زمانہ تھا اس وکرماجیت کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ بودھ مذہب کے پیرووں کا دشمن تھا وہ بڑا سرگرم برہمن تھا، میری رائے ہے کہ اسی نے اجودھیا کی ازسرنو تعمیر کی اور رام چندر کی تاریخ میں جو مقدس جگہ ان کے نام سے موسوم تھی ان کو تلاش کرایا روایۃً یہ بات کہی جاتی ہے کہ جب وہ اجودھیا آیا تو یہ بالکل

---

(۱) گپت خاندان کے راجاؤں نے اودھ اور شمالی ہند میں ابتدائے ۳۱۹÷ تا ۴۷۰÷ سلطنت کی البتہ شالباہن کا زمانہ ۷۸÷ ہی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ گپت خاندان راجہ شالباہن کے ۲۴۱ سال بعد مسند آرائے سلطنت ہوئے ہیں، کیننگھم کا بیان اس سلسلے میں مجمل ہے تفصیل کیلئے دیکھئے مختصر تاریخ ہند ص ۱۳۸، از ڈاکٹر ڈبلو ڈبلو ہنٹر۔

کچھ آگے چل کر لکھتا ہے۔

کھنڈر تھا اور جنگلوں سے بھرا تھا، اس نے رام چندر کی مشہور جگہ کی کھوج لگائی سرجو کے گھاٹ سے اس نے پیمائش شروع کی بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے تین سو ساٹھ مندر، رام چندر، ان کی بیوی سیتا، لکشمن اور شتروگھن، ہنومان اور دوسرے ناموں پر بنوائے، تین سو ساٹھ کی تعداد کا تعلق سالی واہانہ سے بھی ہے کیونکہ راجہ کے قبیلہ کے دیس راجپوت کہتے ہیں کہ راجہ کی تین سو ساٹھ بیویاں تھیں یعنی ہر بیوی کی خاطر اس نے ایک مندر بنوایا۔

اجودھیا میں بہت سے برہمنوں کے مندر ہیں لیکن وہ جدید زمانہ کے ہیں ان میں اثری خوبیاں نہیں ہیں، اور اس میں شک نہیں کہ یہ مندر زیادہ تر ان مندروں کی پرانی جگہوں پر بنائے گئے ہیں جن کو مسلمانوں نے مسمار کردیا تھا۔ (۱) رام کوٹ کا ہنومان گڑھی شہر کے پورب جانب ہے یہ چھوٹا سا قلعہ ہے جو دیواروں سے گھرا ہے یہ ایک جدید مندر کو گھیرے میں لئے ہوئے ہے جو ایک ٹیلہ کے اوپر ہے، رام کوٹ یقیناً پرانا ہے اس کا تعلق منی پربت سے ہے، ہنومان کا مندر زیادہ پرانا نہیں ہے، اورنگ زیب کے عہد سے پہلے کا نہیں ہے۔ (۲)، شہر کے پوربی کونے پر رام گھاٹ ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہاں رام چندر نے اشنان کیا تھا، سرگ دواری یا سورگ دوار، سورگ کا پھاٹک ہے، اتر پورب میں اس کا تعین کیا جاتا ہے،

---

(۱) کینگھم اسی رپورٹ میں آگے کی سطروں میں لکھتا ہے کہ ساتویں صدی کے آغاز میں وکرماجیت کے بنوائے ہوئے تین سو ساٹھ مندر ختم ہوچکے تھے اور اجودھیا تباہ ہو رہا تھا- اور اجودھیا پر مسلمانوں کا اقتدار گیارہویں صدی عیسوی کے آخر یا بارہویں صدی کے ابتدائی زمانہ میں قائم ہوا ہے اس لئے جو مندر ساتویں صدی یعنی مسلمانوں کے آنے کے چار سو سال پہلے ہی تباہ اور ختم ہوچکے تھے انھیں مسلمانوں نے کس طرح مسمار کردیا؟ دراصل کینگھم نے اس یکسر خلاف عقل افسانہ کو لکھ کر ہندوؤں کو مسلمانوں سے برگشتہ کرنا چاہا جو اس کا اور ہر انگریز کا مقصد اولین تھا جس کے حصول کیلئے یہ لوگ خلافِ عقل بعید از قیاس اور صد فی صد غلط اور جھوٹی باتوں کے کہنے اور لکھنے سے قطعاً نہیں گھبراتے۔

(۲) ہنومان گڑھی کے اس مندر کی ابتدائی تعمیر نواب شجاع الدولہ متوفی ۱۷۷۵÷/ ۱۱۸۸ھ کے عہد میں ہوئی ہے اور ہنومان گڑھی کی تعمیر اس کے بھی بعد میں ہوئی، تفصیل کتاب میں ملاحظہ کریں۔

جہاں رام چندر جلائے گئے، کچھ سال پہلے یہاں برگد کا درخت تھا، جو اشوک بڑ کہلاتا تھا یعنی یہ وہ برگد ہے جس کے پاس غم نہیں پھٹکتا۔ شاید یہ نام سورگ وغیرہ کے تعلق سے رکھا گیا ہو جس کے بارے میں لوگوں کو یقین ہے کہ جو لوگ یہاں آکر مر جاتے ہیں یا جلائے جاتے ہیں وہ دوسرے جنم سے آزاد ہو جاتے ہیں، اسی کے پاس لکشمن گھاٹ ہے، جہاں رام چندر کے بھائی لکشمن نے اشنان کیا تھا، اور یہاں سے ۱/۲ میل کے فاصلے پر شہر کے قلب میں جنم استھان کا مندر کھڑا ہے، یہاں رام چندر پیدا ہوئے تھے، پھر پچھّم کی طرف پانچ میل کے فاصلے پر گپتار گھاٹ ہے، یہاں کئی سفید مندر ہیں، کہا جاتا ہے کہ یہاں سے لکشمن غائب ہو گئے تھے اسی لئے اس کا نام گپتار ہے جس کے معنی چھپا ہوا ڈھکا ہوا ہے، بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہاں سے لکشمن نہیں بلکہ رام غائب ہوئے، سورگ دواری میں ان کے جلائے جانے کے قصہ سے اس کی تطبیق نہیں ہوتی۔

کیننگھم یہ بھی لکھتا ہے۔

پرانے شہر میں بودھ کے بیس مندر تھے (۱) وہاں تین ہزار بھکشو رہتے تھے اسی کے ساتھ برہمنوں کے پچاس مندر تھے اور برہمنوں کی آبادی تھی اس سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ ساتویں صدی کے آغاز میں وکرماجیت کے بنائے ہوئے تین سو ساٹھ مندر ختم ہو چکے تھے اور اجودھیا تباہ ہو رہا تھا۔ (۲)

اجودھیا کی مذہبی حیثیت

تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اجودھیا رام بھگتی کے مرکزی حیثیت سے بہت بعد میں متعارف ہوا ہے اس سے پہلے وہ بودھ مت، جین مت، شیومت اور اسلامی

---

(۱) ہیونگ شیانگ کے بیان کے مطابق اس وقت اجودھیا میں بودھوں کے بیس نہیں بلکہ سو مندر تھے، تفصیل آگے آرہی ہے۔

(۲) بابری مسجد، تاریخی پس منظر اور پیش منظر کی روشنی میں۔ از سید صباح الدین، ص ۴۰ تا ۴۳۔

تہذیب وثقافت کا مرکز رہ چکا ہے، چنانچہ جن بارہ غیر مسلم دانش وروں کا حوالہ گذشتہ سطور میں گذر چکا ہے وہ مشترکہ طور پر لکھتے ہیں۔

> ’’ایودھیا رام بھگتی کے مرکز کی حیثیت سے بہت بعد میں سامنے آتا ہے، پرانے زمانے میں یہ کئی مذاہب کے لئے مقدس مقام رہ چکا ہے، پانچویں صدی سے آٹھویں صدی بلکہ بعد کے کتبوں میں بھی ایودھیا کے باشندوں کے حوالوں میں کہیں بھی اس کا تعلق رام بھگتی سے نہیں ملتا ہے۔‘‘ (۱)
>
> (ایپی گرافیکا انڈیکا ۱۰اص ۲۷، ۱۵اص ۱۴۳-اص ۱۴)

پٹنہ اور دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ کے سابق صدر، قدیم ہندوستانی تاریخ کے ماہر ڈاکٹر رام سرن شرما اپنی کتاب کمیونل ہسٹری اور رام کی اجودھیا میں لکھتے ہیں۔

> ’’جب ہم ہندو عقائد کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اجودھیا کو ازمنۂ وسطیٰ میں تیرتھ استھان کی حیثیت حاصل ہوئی ہے اس سے قبل اجودھیا کو یہ مقام حاصل نہیں تھا، وشنوسمرتی کے باب پچاسی میں باون تیرتھ استھانوں کی ایک فہرست ہے جس میں شہروں تالابوں، دریاؤں اور پہاڑوں کے نام موجود ہیں لیکن اس فہرست میں اجودھیا کا نام موجود نہیں ہے، اس سمرتی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ تیسری صدی عیسوی کے قریب کی ہے اور اس میں درج تیرتھ گاہوں کی فہرست قدیم ترین فہرست ہے۔‘‘ (۲)

چین کا مشہور بدھسٹ عالم اور سیاح ہیون سیانگ راجہ ہرش (مشہور بہ راجہ سلاوت) کے زمانہ ۶۳۰÷ میں ہندوستان آیا اور تقریباً پندرہ سولہ سال اور بقول مولوی ذکاء اللہ صاحب تیس سال یہاں رہ کر ملک کا چپہ چپہ چھان مارا جس کی مکمل تفصیل اس نے اپنے سفرنامہ میں درج کی ہے اس کا یہ سفرنامہ قدیم ہندوستان کی تاریخ کے لئے ایک

---

(۱) تاریخ کا بیجا سیاسی استعمال، قومی آواز دہلی ۶ رنومبر ۱۹۹۰÷

(۲) کمیونل ہسٹری اور رام کی اجودھیا، ص ۲۰ ہندی ایڈیشن، مطبوعہ مئی ۱۹۹۰÷

دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے، جس کا انگریزی اردو وغیرہ بہت سی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے، ہیونگ شیانگ نے اپنی تحریر کے مطابق کشمیر، پنجاب، سندھ، گجرات، مالوہ، متھرا، تھانیسر، قنوج، بنارس، پٹنہ، بہار، بنگال، آسام، اڑیسہ، مدراس، آندھرا، ممالک متوسط، مہاراشٹر، کوکن، ٹرانکور وغیرہ اہم مقامات کی سیاحت کی، وہ ان جگہوں کے باشندوں، حاکموں اور عالموں کے حالات پوری بصیرت و قابلیت کے ساتھ لکھتا ہے وہ جب قنوج پہنچتا ہے تو اسے وہاں بودھ مذہب کی سو عبادت گاہیں اور دس ہزار پجاری ملتے ہیں اس وقت وہاں کا راجہ ویش ذات کا راجپوت ہرشا وردھن (راجہ ہرش یعنی راجہ سلادت) تھا جس کے والد کا نام ہیونگ شیانگ پراکر وردھن بتاتا ہے یہ راجہ بدھ مت کا پیرو تھا اور بدھ کی تعلیمات کے مطابق پانچویں سال مہاموکش (کفارۂ گناہ کیلئے دان کا عظیم میلہ) کرتا تھا، ہیونگ شیانگ نے قنوج میں دریائے گنگا کے کنارے دو سو فٹ بلند اشوک کی لاٹ بھی دیکھی، شہر قنوج کے ایک ویہار (بودھ عبادت گاہ) میں اس نے ڈیرسبن نامی ایک عالم کی مدد سے بودھ مت کی بعض کتابوں کا مطالعہ بھی کیا، قنوج کی سیاحت کی تفصیلات بیان کرنے کے بعد وہ لکھتا ہے کہ یہاں سے میں اجودھیا کے لئے روانہ ہوا اور وہاں پہنچ کر اس نے جو کچھ دیکھا اس کی تفصیل اس طرح بیان کرتا ہے۔

> ”یہاں (اجودھیا میں) ایک سو عبادت گاہیں (ویہار) اور کئی ہزار پجاری ہیں، وہ لکھتا ہے کہ میں نے اجودھیا میں بودھ مذہب کے قدامت پسند و جدت پسند دونوں فرقوں کی کتابوں کا مطالعہ کیا۔“ (۱)

بدھ مت کے مرکز کی حیثیت سے

ہیونگ شیانگ کی اس تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ ساتویں صدی میں اجودھیا بدھوں کا مرکز تھا، بودھ دھرم والوں کا یہ بھی خیال ہے کہ گوتم بدھ نے اجودھیا میں کچھ دن قیام کیا ہے لیکن جب بہار کے ایک عظیم برہمن رہنما کمارل نے شیو کی پوجا کی ترویج و اشاعت اور

---

(۱) مقدمہ تاریخ ہند ج ا ص ۱۸۰۔ از اکبر شاہ نجیب آبادی۔

بودھ مذہب کی مخالفت میں ایک زبردست تشدّد آمیز تحریک شروع کی اور خوش قسمتی سے انھیں دکن کے ایک طاقتور راجہ کی مکمل ہم نوائی بھی حاصل ہوگئی تو بدھسٹ جو پہلے ہی مذہبی تحزّب اور باہمی فرقہ بندیوں کی وجہ سے اپنی طاقت کھو چکے تھے اس پر تشدد تحریک کا مقابلہ نہ کر سکے، برہمن رہنما کمارل کے بعد ان کے مشہور چیلے شنکراچاریہ (جن کا زمانہ آٹھویں صدی کا آخر یا نویں صدی کا ابتدائی متعین کیا جاتا ہے) نے اپنی بے پناہ اور انتھک جدوجہد سے اس تحریک کو ارتقاء کی آخری حدوں تک پہنچادیا، جس کے نتیجے میں بودھوں کے بڑے بڑے ویہار اور قدیم عبادت گاہیں یا تو مسمار کردی گئیں یا انھیں شیو کے مندر میں تبدیل کرلیا گیا۔

مہاراشٹر کے ایک مؤرخ ڈاکٹر جمنا داس نے انگریزی زبان میں شائع شدہ اپنی کتاب ''تروپتی بالاجی مندر بدھوں کی عبادت گاہ تھی'' کی تلخیص پندرہ روزہ اخبار 'دلت وائس' انگریزی مورخہ یکم تا ۱۵ جنوری ۱۹۹۰÷ میں شائع کرائی ہے، جس میں وہ لکھتے ہیں کہ میری کتاب میں بودھ مت کے زوال کے صرف ایک پہلو کو اجاگر کیا گیا ہے جس میں بودھ مت کی عبادت گاہوں کو برہمن دھرم کے لئے استعمال کرنے کا جائزہ لیا گیا ہے، ماہرین ومحققین یہ بات پہلے ثابت کرچکے ہیں کہ پوری کا گناتھ مندر، بندھاپور کا وشوبھا مندر اور بدری ناتھ مندر ابتدا میں بودھ عبادت گاہیں تھیں آندھرا پردیش کا مشہور تروپتی مندر بھی ایک ایسا ہی مندر ہے جو ابتدا میں بودھ ویہار تھا۔

آگے چل کر ڈاکٹر جمنا داس نے کتاب کی جلدوں اور اس کے ابواب کی تفصیل پر روشنی ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ جلد اول کے باب دوم میں بودھ عبادت گاہوں پر برہمنوں کے قبضہ کی مثالیں پیش کی گئی ہیں، جن میں امراوتی، تیر، چنر ولا، ایہول، انداولی، ایلورا، پوری، اور سرنگیری کے مندروں کا ذکر ہے کہ یہ ابتدا میں بودھ ویہار تھے۔ باب سوم میں اس دعویٰ کے ثبوت فراہم کئے گئے ہیں کہ جگناتھ پوری کا مندر بودھ عبادت گاہ تھی، باب چہارم میں ثابت کیا گیا ہے کہ وٹھالہ پندھارپور کا مندر بودھ خانقاہ تھی، باب پنجم میں اس بات کے ثبوت ہیں کہ ورک شرم مندر بودھ عبادت گاہ تھی، اور کس طرح بدھ ''ایاکا''

کولنگ پوجا کے لئے استعمال کیا گیا، باب ہفتم میں اس دعویٰ کو مدلل کیا گیا ہے کہ نیلا ملائی میں سری سیلم مندر ابتداء میں بودھ عبادت گاہ تھی۔ (۱)

یہ ساری تفصیلات تقریباً ایک خاص خطے سے تعلق رکھتی ہیں، جس سے ہندوستان کے دوسرے مقامات کی بودھ خانقاہوں کے متعلق نتیجہ اخذ کرنا کوئی مشکل اور دشوار امر نہیں ہے، غالب گمان یہی ہے کہ شیومت کے احیاء اور بودھ مخالف تحریک کے اسی دور میں اجودھیا کی وہ یک صد خانقاہیں جن کی ہیونگ شیانگ سیاح نے زیارت کی تھی شیو مندروں میں تبدیل کر لی گئیں اور اجودھیا سے بودھ پجاریوں کو دیس نکالا دے کر وہاں سے بودھ مت کی مرکزیت ختم کر دی گئی۔

شیومت کا غلبہ اور وشنومت کا آغاز

اس وقت سے لے کر تقریباً اٹھارہویں صدی تک دیگر ہندو فرقوں کے مقابلے میں شیومت کا ہی اجودھیا میں غلبہ اور بول بالا رہا۔

مذکورہ بالا غیر مسلم دانشوران لکھتے ہیں:

> ”تیرہویں صدی عیسوی سے رام بھگتی عوام میں پھیلنا شروع ہوتا ہے اور آہستہ آہستہ رام نندی فرقہ کی ترقی اور ہندی میں رام کہانی کی ترتیب کے ساتھ اس کا زور پکڑتا ہے لیکن پندرہویں سولہویں صدی تک بھی رام نندی ایودھیا میں کسی بڑی تعداد میں نہیں بسے تھے شیو بھگتی کی یہاں رام بھگتی سے کہیں زیادہ اہمیت تھی۔“ (۲)

نامور مؤرخ ڈاکٹر رام سرن شرما تو یہاں تک دعوی کرتے ہیں کہ صرف اجودھیا ہی نہیں بلکہ پورے اتر پردیش میں کسی ایک جگہ بھی سولہویں صدی سے پہلے کوئی رام مندر نہیں پایا گیا ہے کیونکہ اس وقت تک رام بھگتی کا وجود ہی نہیں تھا۔ (۳)

---

(۱) ہفت روزہ نئی دنیا دہلی، ۱۳ تا ۱۹ ر جنوری ۱۹۹۰ء

(۲) تاریخ کا بیجا سیاسی استعمال، قومی آواز ۶ ر نومبر ۱۹۹۰ء۔

(۳) کمیونل ہسٹری اور رام کی اجودھیا، ہندی ایڈیشن ص ۲۰ مطبوعہ مئی ۱۹۹۰ء۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ رامانج (جو ١١١٦÷ میں مدراس کے ایک گاؤں پر میر میں پیدا ہوئے) نامی ایک ہندو مصلح نے شیومت کی مخالفت پر کمر باندھی اور شیو بھگتی کے مقابلہ میں وشنومت کا پرچار شروع کیا، بعد ازاں رامانج کے پانچویں جانشین رامانند (١٢٩٩÷ میں الہ آباد کے ایک برہمن خاندان میں پیدا ہوئے) نے اپنی غیر معمولی جدوجہد سے پورے شمالی ہند میں اس تحریک کو عام کر دیا، وشنومت کے نامور اور مشہور بھگتوں میں ناوا جی، سورداس، تلسی داس (جنھوں نے ہندی زبان میں رامائن مرتب کی) جے دیو اور کبیر داس وغیرہ کی مشترکہ کوششوں سے سولہویں صدی آتے آتے رامانندی فرقہ (وشنومت) کو شیومت پر غلبہ ہو گیا اور شیو پوجا کے بجائے وشنو کے اوتار کی حیثیت سے رام کی پوجا عام ہو گئی اور اسی زمانہ سے رام کے نام پر مندروں کی تعمیر شروع ہوئی۔ (١)

جین مت کے استھان کی حیثیت سے

بودھ مت، شیومت، وشنومت (رامانندی فرقہ) کے علاوہ اجودھیا جین مت کی بھی اہم ترین زیارت گاہ رہ چکا ہے، جینی اپنے پہلے اور تیسرے تیرتھنکر کی جنم بھومی اجودھیا ہی کو بتاتے ہیں، چوتھی، تیسری صدی ق م کا ایک پکی مٹی کا جینی پتلا اجودھیا میں پایا گیا ہے جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ زمانہ قدیم میں اجودھیا جین مت کا استھان رہ چکا ہے مگر آج وہاں اس مذہب کی کوئی علامت اور نشانی نہیں پائی جاتی۔

مسلمانوں کی آمد اور اسلامی آثار کا فروغ

بارہویں اور تیرہویں صدی عیسوی کے درمیانی عہد سے اجودھیا میں مسلمانوں کی باقاعدہ آبادی قائم ہو گئی تھی اور ہندوستان کے دیگر مقامات کی طرح اجودھیا کا علاقہ بھی مسلمانوں کے زیر اقتدار آ گیا تھا اور حکومت کی جانب سے اس علاقے کے نظم وضبط کو قائم

---

(١) تفصیل کیلئے دیکھئے مذاہب عالم کا تقابلی مطالعہ، چودھری غلام رسول ایم اے ص ١٩٧ اور مختصر تاریخ ہند ڈبلو ڈبلو ہنٹر اردو ایڈیشن نول کشور ١٨٩٤÷ ص ١٥٩، اور ١٦١۔

رکھنے کے لئے امیر و قاضی مقرر رہتے، ہماری تحقیق کے مطابق اجودھیا کے اولین قاضی شیخ معین الدین چشتی اجمیری کے خواجہ تاش اور پیر بھائی قاضی قدوۃ الدین بن میرک شاہ اسرائیلی اودھی ہیں جن کی وفات اجودھیا ہی میں ۶۰۵ھ/ ۱۲۰۸ء میں ہوئی، کتاب کے پہلے باب میں ان کا مختصر سا تذکرہ موجود ہے اس وقت سے لے کر تقریباً اٹھارہویں صدی عیسوی تک اجودھیا پر اسلامی تہذیب وثقافت چھائی رہی اس مدت میں اجودھیا کے افق سے علم وفضل کے ایسے ایسے آفتاب وماہتاب چمکے جن کی تابانیوں کے سامنے خود دارالخلافہ دہلی کے علمائے نامدار کے چراغ مدھم پڑ گئے جن کے تذکرے اس کتاب میں آپ پڑھیں گے اسی سرزمین میں عام روایت کے مطابق حضرت ابوالبشر آدم علیہ السلام کے صلبی صاحبزادے اور جانشیں حضرت شیث علیہ السلام کا مدفن ہے جس کی زیارت کو مسلمان اپنے لے سرمایۂ سعادت سمجھتے ہیں اور آج بھی پچاسوں ایکڑ پر پھیلے ہوئے قبرستان اور خانقاہوں ومزارات کے کھنڈرات زبان حال سے یہ شہادت دے رہے ہیں کہ اس ارض متبرک پر اسلامی قافلہ کبھی آکر ٹھہرا تھا۔

ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے ☆ کہے دیتی ہے شوخی نقشِ پا کی

یہ تفصیلات بتارہی ہیں کہ پچھلی صدیوں میں ایک مقدس مرکز ہونے کی حیثیت سے اجودھیا کے احوال بدلتے رہے ہیں کبھی یہ بودھوں کا مرکز توجہ رہا ہے تو کبھی جینیوں نے اپنی عقیدت کے نذرانے اس پر نچھاور کئے ہیں کبھی علماء اسلام اور مشائخ تصوف نے اپنی علمی وروحانی سرگرمیوں کا اسے محور بنایا تو کبھی شیومت اور وشنومت کے پجاریوں کا یہ مقصود نظر رہا، غرضیکہ اس کا رشتہ مختلف مذہبوں کی تاریخ سے پیوستہ رہا ہے اور مختلف ادوار میں مختلف مذہبی جماعتوں نے اپنے اپنے طور پر اسے عزت وعظمت کا مقام عطا کیا ہے اس لئے اس شہر پر کسی ایک مذہب کا دعویٰ تاریخی اعتبار سے تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔

☆ ☆ ☆

بابری مسجد حقائق اور افسانے

یکم فروری ۱۹۸۶÷ (۲۱ر جمادی الثانی ۱۴۰۶ھ) سنیچر کے دن ''بابری مسجد'' واقع اجودھیا ضلع فیض آباد، ناجائز اور غیر منصفانہ طور پر نہایت ڈرامائی انداز سے ''رام جنم استھان مندر'' میں تبدیل کردی گئی، اس حادثہ فاجعہ پر مسلمانوں کو جس قدر غم ہو کم ہے۔

''آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمین''

یہ ظالمانہ اقدام محض جبر وتشدد اور کثرت وطاقت کے نشہ میں کیا گیا ہے، لیکن دنیا کو فریب دینے کے لئے اس پر عدالت کے فیصلے کی چادر ڈال دی گئی ہے حالانکہ اس غیر قانونی عمل کو عدالت کا فیصلہ کہنا خود عدلیہ کی توہین ہے اور اب اس نام نہاد فیصلہ کو حق بجانب اور درست ثابت کرنے کی غرض سے ''بابر'' اور اس کی جانب منسوب ''بابری مسجد'' کی تاریخ مسخ کرنے کی ملک گیر تحریک چلائی جارہی ہے، اس رسوائے زمانہ تحریک کا سلسلہ اگرچہ عرصۂ دراز سے جاری تھا مگر اسے آج کل تیز تر کردیا گیا ہے اور وشو ہندو پریشد، آریہ پرتی ندھی سبھا، بھارتیہ جنتا پارٹی، وغیرہ فرقہ پرست تنظیمیں چیخ چیخ کر کہہ رہی ہیں کہ ''بابری مسجد کو بابر شاہ نے رام جنم استھان مندر توڑ کر اس کے کھنڈر پر تعمیر کرایا تھا، اس لئے اس مسجد کو ہندو فرقہ کے حوالہ کرنے کا فیصلہ حق وانصاف پر مبنی ہے۔''

اس بے بنیاد اور من گھڑت افسانے کو ایک صحیح اور سچا واقعہ باور کرانے کے لئے علم و تحقیق کی آبرو کو بالائے طاق رکھ کر پوری جسارت کے ساتھ تزک بابری، آئین اکبری اور عالم گیری نامہ جیسی اہم تاریخی کتابوں کا بالکل غلط طور پر حوالہ بھی دیا جارہا ہے۔

اس لئے جمعیۃ علماء ہند کی مجلس عاملہ منعقدہ ۲۱/۲۲ر فروری ۱۹۸۶÷ نے ضرورت محسوس کی کہ بابری مسجد کی صحیح تاریخ عوام کے سامنے پیش کی جائے تاکہ سرکاری

وغیر سرکاری ذرائع ابلاغ کی مدد سے پھیلائی ہوئی غلط فہمی کا یہ بادل چھٹے جس نے ملک کی فضاء کو خطرناک حد تک مسموم بنادیا ہے، اور ملک کا انصاف پسند طبقہ کذب و افتراء کی تاریکیوں میں بھٹکنے کے بجائے اس انتہائی حساس اور نازک معاملہ میں علم وتحقیق کی روشنی میں غور کر سکے۔ چنانچہ جمعیۃ علماء ہند کے صدر محترم حضرت مولانا سید اسعد مدنی دامت برکاتہم نے یہ خدمت احقر کے سپرد کی، مظلوم بابری مسجد کے سلسلہ میں یہ تحریر اسی حکم کی تعمیل میں سپرد قلم کی گئی ہے اور قارئین ماہنامہ دارالعلوم کی خدمت میں پیش کی جارہی ہے۔

کیا بابر اجودھیا آیا تھا؟

چونکہ یہ مظلوم مسجد بابر کی جانب منسوب ہے، اس لئے عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ اسے بابر نے تعمیر کرایا تھا، پھر اس مفروضہ کی بنیاد پر یہ افسانہ گھڑلیا گیا کہ بابر نے اجودھیا آکر ''رام جنم استھان مندر کو گرایا'' اور پھر اس کی جگہ پر یہ مسجد بنوائی چنانچہ حکومت یوپی کے محکمہ اطلاعات کی جانب سے شائع ہونے والے ماہنامہ ''اتر پردیش'' میں بعینہٖ یہی بات کہی گئی ہے۔

''۱۹۲۸÷ میں بابر یہاں (اجودھیا) آیا تھا اس نے ایک ہفتہ قیام کیا اور جنم استھان مندر کو گرا کر ایک مسجد تعمیر کرائی جو اس مندر کے ملبہ پر تعمیر کی تھی''۔ (ماہنامہ اتر پردیش شمارہ اپریل ۱۹۸۴÷ ص: ۲۷)

اس لئے پہلے یہ طے ہونا ضروری ہے کہ ''بابر'' اجودھیا آیا تھا! کیونکہ (جنم استھان مندر) گرانے کی داستان اسی دعویٰ کی بنیاد پر گھڑی گئی ہے۔

مؤرخین ہند خواہ مسلم دور حکومت سے تعلق رکھتے ہوں یا اس عہد کے بعد کے ہوں سب اس پر متفق ہیں کہ ''بابر'' کے حالات میں مستند ترین مآخذ خود اس کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا وہ سوانحی روزنامچہ ہے جو علمی حلقوں میں ''تزک بابری'' کے نام سے جانا پہچانا جاتا ہے، ''بابر'' نے ۸۹۲ سے جبکہ اس کی عمر صرف بارہ سال تھی، اسے لکھنا شروع کردیا تھا اور اپنے مرضِ وفات میں مبتلا ہونے سے چھ ماہ قبل یعنی ۹۳۶ھ تک اس سلسلہ کو جاری رکھا تزک

میں اس کی آخری تحریر ۳؍محرم ۹۳۶ھ کی ہے اور اسی سال رجب کے مہینہ میں بیمار ہوا اور اسی بیماری میں ۵؍جمادی الاولیٰ ۹۳۷ھ کو انتقال کرگیا اس طرح یہ روزنامچہ آخری ایک سال کے علاوہ اس کے پورے سوانح حیات کو حاوی ہے جس میں اس نے اپنی زندگی کے ہر چھوٹے بڑے واقعہ کو تفصیل سے قلم بند کردیا ہے حتیٰ کہ وہ جن مقامات پر گیا ہے وہاں کے عوام کی حالت، جانوروں کی قسمیں، آب و ہوا، باغات اور عمارتوں کا تذکرہ بھی بڑی دلچسپی کے ساتھ کرتا ہے، اصل کتاب ترکی زبان میں ہے، اس کا سب سے پہلا ترجمہ ''اکبر'' کے حکم سے خانخاناں عبدالرحیم نے فارسی میں کیا تھا، جو اب تک غیر مطبوعہ ہے، اس کے بعد انگریز مؤرخ ''اے، ایس بیورج'' نے دی بابرنامہ ان انگلش کے نام سے انگریزی میں ترجمہ کیا جو دو جلدوں میں ۱۹۲۲ء میں شائع ہوا، یونیورسٹیوں اور دیگر علمی حلقوں میں عام طور پر یہی ترجمہ رائج ہے، مسز بیورج نے ترجمہ کے ساتھ تفصیلی فٹ نوٹ بھی لکھا ہے، جس سے اس کی افادیت بہت بڑھ گئی ہے ''بابرنامہ'' کے نام سے اردو میں بھی ترجمہ ہوگیا ہے، اب یہی انگریزی اور اردو کے دونوں ترجمے تذکرہ نویسوں کے لئے مآخذ و مرجع کا کام دیتے ہیں، کوئی بھی شخص ان ترجموں کو اول سے آخر تک پڑھ جائے اسے ان میں کہیں بھی ''بابر'' کے ''اجودھیا'' آنے کا ذکر نہیں ملے گا، البتہ ۹۳۵ھ کے واقعات کے ضمن میں اس کی یہ تحریر ضرور ملتی ہے۔

''ہفتہ ۷؍رجب کو ہم نے ''اودھ'' سے دو تین کوس (چھ میل) پر ''گھاگھرا'' اور ''سردا'' (ساردا) کے سنگم پر قیام کیا (یہ سنگم بہرائچ میں ہے) اس وقت تک ''شیخ بایزید'' سردا (ساردا) کی دوسری جانب تھا اور سلطان (حسین تیمور) سے خط و کتابت کررہا تھا اس کی دھوکہ بازیوں سے واقفیت کی بناء پر ہم نے بوقت ظہر ''سلطان کو حکم دیا کہ وہ دریا پار کرنے کے لئے تیار ہوجائے، قباچہ کے پہنچنے پر انھوں نے فوراً دریا پار کیا وہاں پچاس گھوڑے اور تین چار ہاتھی موجود تھے وہ مقابلے کی تاب نہ لاسکے اور فرار کی راہ اختیار کی چند لوگ جو گھوڑے سے اتر گئے تھے ان کے سر کاٹ کر حاضر کئے گئے'' (بابرنامہ اردو ۳۳۹)

''بابر'' کے اس بیان سے معلوم ہوا کہ وہ ''شیخ بایزید'' کی بغاوت فرو کرنے کے

لئے رجب ۹۳۵ھ میں اس دیار میں آیا تھا مگر بقول خود اس کا قیام اجودھیا سے ٦ میل دور ساردا کے سنگم پر ہوا، شیخ بایزید کی شکست کے بعد اپنے ایک امیر سید ''میر باقی اصفہانی'' کو اس علاقے کا حاکم مقرر کر کے یہیں سے براہ الٰہ آباد و کڑہ بہار چلا گیا جہاں سلطان محمود بن سکندر لودھی نے علم بغاوت بلند کر رکھا تھا۔ تقریباً ایک ماہ بہار کے علاقے میں گذار کر واپس لوٹا اور واپسی کے موقع پر بھی وہ اجودھیا سے کافی فاصلے سے گذرا، جیسا کہ تزک کی درج ذیل تحریر سے ظاہر ہے۔

> ''بروز دوشنبہ ۲۲/ رمضان کو ہم چوپادہ میں پہنچے چتر مکھ کے راستے دریائے سرجو کے کنارے ہوتے ہوئے بہار اور سردا (ساردا) کے قضیوں سے فارغ ہو کر اور دس کوس (۲۰ میل) چلنے کے بعد دریائے سرجو کے کنارے کیلرہ نامی گاؤں میں جو فتح پور کے علاقے میں ہے قیام کیا، ہم نے کئی دن اس مقام پر گذارے، یہاں آب رواں ہے، اچھی عمارتیں ہیں اشجار خاص طور پر آم کے درخت اور رنگ برنگ کی چڑیاں ہیں، پھر ہم نے غازی پور کی طرف کوچ کا حکم دیا'' (بابرنامہ اردو)

ان دونوں تحریروں کے علاوہ ''تزک بابری'' میں کوئی ایسی عبارت نہیں ملتی جس سے ''بابر'' کے اس دیار میں آنے کا سراغ لگایا جاسکے۔

تزک بابری کے علاوہ طبقات اکبری تالیف خواجہ نظام الدین احمد، اکبرنامہ ابوالفضل، منتخب التواریخ ملا عبدالقادر بدایونی خلاصۃ التاریخ منشی سجان رائے، تاریخ فرشتہ محمد قاسم فرشتہ، منتخب اللباب محمد ہاشم خانی خان، غرضیکہ کسی بھی معاصر یا غیر معاصر مستند و معتبر تاریخ میں بابر کے اجودھیا آنے کا ذکر نہیں ملتا، اس لئے جس بنیاد پر مندر توڑ کر مسجد بنانے کی عمارت کھڑی کی گئی ہے، جب اس بنیاد ہی کا وجود نہیں تو عمارت کا جو حال ہوگا اہل نظر سے مخفی نہیں۔

جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

''بابر'' کے حالات میں اس وقت جتنی بھی کتابیں دستیاب ہیں ان میں ''بابر'' کے

نہ صرف اجودھیا بلکہ کسی بھی مقام پر مندر توڑنے کا ذکر نہیں ہے، حتیٰ کہ جدوناتھ سرکار، ایسٹ اور ڈاوسن نے بھی ''بابر'' کی مندر شکنی کا کوئی واقعہ نقل نہیں کیا ہے، جبکہ یہ مؤرخین مسلم حکمرانوں کی مندر شکنی کے واقعات میں خاص دلچسپی رکھتے ہیں۔

بابر کی ایک وصیت

ان تاریخی شواہد کے علاوہ خود ''بابر'' جس ذہن ومزاج کا حکمراں ہے اس کے پیش نظر یہ امر بعید از قیاس ہے کہ وہ کسی بھی مذہبی عبادت گاہ پر غلط نگاہ ڈالے گا، اس کے اس مزاج کو سمجھنے کیلئے وہ وصیت نامہ کافی ہے جو اس نے اپنے بڑے بیٹے ہمایوں کے لئے قلم بند کیا تھا وہ اس میں ہمایوں کو مخاطب کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

> اے فرزند! ہندوستان کی سلطنت مختلف مذاہب سے بھری ہے، خدا کا شکر ہے کہ اس نے تمہیں اس کی بادشاہت عطا کی، تم پر لازم ہے کہ اپنے لوح دل سے تمام مذہبی تعصّبات کو مٹا دو، اور ہر مذہب کے طریقے کے مطابق انصاف کرو، تم خاص کر گائے کی قربانی کو چھوڑ دو، اسی سے تم ہندوستان کے لوگوں کے دلوں کو مسخر کرسکو گے، پھر اس ملک کی رعایا شاہی احسانات سے دبی رہے گی، جو قوم حکومت کے قوانین کی اطاعت کرتی ہے، اس کے مندروں اور عبادت گاہوں کو منہدم نہ کرو، عدل وانصاف اس طرح کرو کہ بادشاہ رعایا سے اور رعایا بادشاہ سے خوش رہے، اسلام کی ترویج ظلم کی تلوار سے زیادہ احسانات کی تلوار سے ہوسکتی ہے، شیعوں اور سنیوں کے اختلاف سے چشم پوشی کرتے رہو، ورنہ اسلام میں ان سے کمزوری پیدا ہوتی رہے گی، مختلف عقائد رکھنے والی رعایا کو اس طرح ان عناصر اربعہ کے مطابق ملاؤ جس طرح کہ انسانی جسم ملاتا ہے، تاکہ سلطنت کا ڈھانچہ اختلافات سے پاک رہے، یکم جمادی الاولیٰ ۹۳۵ھ'' (انڈیا ڈی ڈائڈڈ ص ۳۹ از ڈاکٹر راجندر پرشاد سابق صدر جمہوریہ ہند)

ان دلائل وشواہد کی روشنی میں ایک دیانت دار مؤرخ اور حقیقت پسند مبصر یہ رائے قائم کرنے پر مجبور ہے کہ ''بابر'' مندر شکنی کے الزام سے قطعا بری ہے، چنانچہ پروفیسر ''شری رام شرما'' اپنی مشہور کتاب ''مغل امپائران انڈیا'' میں پوری صفائی سے لکھتے ہیں:

> ''ہم کو کوئی ایسی شہادت نہیں ملتی کہ ''بابر'' نے کسی مندر کو منہدم کیا یا کسی ہندو کی ایذا رسانی محض اس لئے کی کہ وہ ہندو ہے۔'' (ص ۵۵ ایڈیشن ۱۹۴۵ء
>
> بحوالہ معارف فروری ۸۶ء)

تلاش حقیقت

جب یقینی طور پر یہ معلوم ہو گیا کہ ''بابر'' اجودھیا آیا ہی نہیں تو اس کے بابری مسجد تعمیر کرانے کا سوال نہیں پیدا ہوتا، لہٰذا اب ہمیں تاریخ ہی کی روشنی میں یہ پتہ لگانا چاہئے کہ اس مسجد کا بانی حقیقتاً کون اور اس نے اسے کب تعمیر کرایا ہے، اس سلسلے میں یہ بات ذہن نشیں رہنی چاہئے کہ بابری مسجد اجودھیا ہندوستان میں موجود لاکھوں مسجدوں کے مقابلے میں کسی خصوصی امتیاز کی حامل نہیں ہے، اسی لئے مؤرخین جس طرح عام مسجدوں کی تاریخ بیان کرنے کا عام طور پر اہتمام نہیں کرتے بعینہٖ ''بابری مسجد اجودھیا'' کے بارے میں بھی ان کا یہی رویہ ہے، بالفرض اگر یہ مسجد کسی خصوصی اہمیت کی حامل ہوتی یا اس کی تعمیر کے ساتھ کوئی جذباتی واقعہ وابستہ ہوتا یا کم از کم اسے کسی بادشاہ کی تعمیر کا شرف حاصل ہوتا تو مؤرخین اس طرح سے اس کے بارے میں خاموش نہ رہتے بلکہ اس کی تفصیلات ضرور لکھتے لیکن مؤرخین کے اس مکمل سکوت کے باوجود ''بابری مسجد'' کی تاریخ تاریکی میں نہیں ہے بلکہ اس میں نصب کتبوں کی بناء پر آئینہ کی طرح روشن ہے۔

آج کی دنیا میں کتبات کی جو اہمیت ہے، وہ اہل علم سے پوشیدہ نہیں، آج حکومتیں ان کی فراہمی اور حفاظت پر کروڑوں روپئے خرچ کر رہی ہیں، اور ان سے صرف عمارتوں ہی کی تاریخ معلوم نہیں کی جاتی بلکہ قوموں کی مذہبی، تمدنی اور سیاسی تاریخ کی تدوین میں انہیں مستند ترین مواد کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔

بابری مسجد اجودھیا کے کتبے

اسے اتفاق ہی کہئے کہ ''بابری مسجد'' میں ایک کے بجائے تین کتبے نصب کئے گئے تھے جن میں دو تاریخی حیثیت سے خاص اہمیت کے حامل ہیں کیونکہ ان میں مسجد کی تعمیر کا سن اور بانی کے نام کی تصریح موجود ہے۔

(۱) یہ کتبہ پتھر کی دو میٹر لمبی اور ۵۵ سینٹی میٹر چوڑی تختی پر ہے جو مسجد کے مسقّف حصہ کے درمیانی مرکزی در کے اوپر نصب ہے، جس پر بسم اللہ کے علاوہ تین سطروں میں آٹھ اشعار لکھے ہوئے ہیں، جن میں پانچویں شعر کے دوسرے مصرعہ میں بانی کا نام نسبت کی صراحت کے ساتھ نظم کیا گیا ہے اور آٹھویں شعر کا دوسرا مصرعہ تعمیر کی تاریخ پر مشتمل ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم		
بنام آنکہ او داناست اکبر	کہ خالق جملہ عالم لامکانے	درود مصطفٰی بعد از ستائش
کہ سرور انبیاء زبدہ جہانے	فسانہ درجہاں بابر قلندر	کہ شد در دور گیتی کامرانے
چناں کہ مطلع کشور گرفتہ	زمیں راچوں مبارز آسمانے	دراں حضرت یکے سید معظم
کہ نامش میر باقی اصفہانے	مشیر سلطنت تدبیر ملکش	کہ زیں مسجد حصار مہستانے
خدایا درجہاں تابندہ ماند	کہ خیر و بخت و تخت و زندہ گانے	دریں عہد و دریں تاریخ میموں
کہ نہ صد پنج وسی بودہ نشانے	(ان دو سطروں میں عربی میں کچھ لکھا ہوا ہے جو پڑھا نہیں جاسکا) (حبیب الرحمٰن)	

اس کتبے کے اشعار میں پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا پھر نبی کریم ...... پر درود ہے اور آپ ...... کو تمام انبیاء کا سردار اور خلاصۂ کائنات کہا گیا ہے، پھر دو شعروں میں ''بابر'' کی تعریف اور اس کی فتح وکامرانی کو نہایت لطیف اور بلیغ انداز میں بیان کیا گیا ہے، یہ بات خاص طور پر قابل توجہ ہے، کہ اس موقعہ پر بابر کو بادشاہ کے بجائے قلندر کہا گیا ہے، یہ لفظ صوفیوں کی اصطلاح میں مرنجاں مرنج اور ہر قسم کی مذہبی تعصب سے بے نیاز شخصیتوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

پھر بیان کیا گیا ہے کہ ’’بابر‘‘ کے درباریوں میں ایک صاحب عظمت سید ہیں جن کا اسم گرامی ’’میر باقی اصفہانی‘‘ ہے پھر ’’میر باقی‘‘ کے انتظام ملکی کی تعریف ہے اس کے بعد کے شعر میں بتایا گیا ہے کہ ان ہی ’’میر باقی‘‘ کی بدولت یہ مسجد روشن ضمیروں کے لئے حصار بنائی گئی ہے اس کے بعد کے چار شعروں میں ان کے لئے دعاء ہے کہ خدایا دنیا میں ان کے اس خیر یعنی مسجد اور ان کے مقام و مرتبے اور زندگی کو تابندہ رکھ تا کہ ۹۳۵ھ کی یہ یادگار باقی اور پائیدار رہے۔

’’مسز بیورج‘‘ نے اپنے ترجمہ ’’دی بابر نامہ ان انگلش‘‘ کی دوسری جلد کے ضمیمہ میں ’’بابری مسجد اجودھیا‘‘ کے کتبات کے عنوان کے تحت منبر کے بائیں سمت والے کتبہ کے علاوہ، مندرجہ بالا کتبے کو بھی درج کیا ہے، لیکن انھوں نے اس کے آٹھ شعروں میں سے شروع کے صرف تین اشعار نقل کئے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ بقیہ اشعار کو وہ پڑھ نہ سکیں اس لئے انہیں چھوڑ دیا۔

۲،۳ یہ دونوں کتبے مسجد کے اندرونی حصہ میں ’’منبر‘‘ کے داہنی اور بائیں جانب تھے۔

(داہنی سمت کا کتبہ) (۲)

بمنشائے بابر خدیوں جہاں　　بسائیکہ با کاخ گردوں عناں
بنا کرد ایں خانۂ پائیدار　　امیر سعادت نشاں میر خان
بماند ہمیشہ چنیں بانیش　　چناں شہریار زمیں وزماں

(بائیں جانب کا کتبہ) (۳)

بفرمودۂ شاہ بابر کہ عدلش　　بنائیست با کاخ گردوں ملاقی
بنا کردہ ایں مہبط قدسیاں را　　امیر سعادت نشاں میر باقی
بود خیر باقی وسال بنائش　　عیاں شد چوں گفتم بود خیر باقی

۹۳۵ھ

معمولی سے فرق کے علاوہ ان دونوں کتبوں کے مفہوم میں یکسانیت ہے البتہ دوسرے کتبہ کا آخری شعر دعائیہ ہے اور تیسرے کے آخری جملہ سے تاریخ تعمیر نکلتی ہے اس

آخری کتبہ کو مسز بیورج نے بھی نقل کیا ہے لیکن ان سے اس کے پڑھنے میں غلطی ہوئی ہے، جس سے تعمیر کی معنویت متاثر ہوتی ہے وہ آخری شعر کو اس طرح لکھتی ہیں۔

بود خیر باقی چو سال بنائش　　عیاں شد کہ گفتم بود خیر باقی

جبکہ صحیح اس طرح ہے۔

بود خیر باقی وسال بنائش　　عیاں شد چوں گفتم بود خیر باقی

۲۷/ مارچ ۱۹۳۴؁ مطابق ۱۱/ ذی الحجہ ۱۳۵۳ھ کو اجودھیا میں ایک زبردست فرقہ وارانہ فساد ہوا تھا، اس موقع پر فسادیوں نے ’’بابری مسجد‘‘ میں گھس کر توڑ پھوڑ کیا تھا اسی وقت ان دونوں کتبوں کو بھی اکھاڑ لے گئے، لیکن بعد میں منبر کے بائیں جانب والے کتبے کی ایک نقل تیار کرا کے تہور خان ٹھیکیدار نے نصب کرا دیا البتہ دائیں جانب کی نقل وہ بھی نہ کرا سکے۔

سید بدر الحسن فیض آبادی کے پاس اس ضائع شدہ کتبے کی ایک نقل موجود تھی اسی نقل کے حوالہ سے یہ کتبہ یہاں درج کیا گیا ہے۔

ان تینوں کتبوں کی فلم اور اس کا فوٹو (ضمیمہ فارسی وعربی ہندوستانی کتبات ۱۹۶۵؁ ناگپور میں موجود ہے) جسے حاصل کر کے دیکھا جا سکتا ہے۔

مسجد کی مرکزی دروالا اصلی کتبہ اور منبر کی بائیں جانب والا نقل شدہ کتبہ یہ دونوں کتبے ۱۹۴۹؁ سے پہلے تک مسجد میں موجود تھے، اب موجود ہیں یا وہ بھی بیراگیوں کے دست کرم کے شکار ہو گئے خدا ہی بہتر جانتا ہے کیونکہ تقریباً ۳۷ سال کی طویل مدت سے مسلمانوں کا اپنی اس قدیم عبادت گاہ کے پاس سے گذرنا بھی ممنوع ہے اس کے اندر جانا تو بہت دور کی بات ہے اس لئے اس وقت ان کتبوں کے متعلق کوئی حتمی بات نہیں کہی جا سکتی۔

لیکن ان کتبوں کے اب مسجد میں ہونے یا نہ ہونے سے ان کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا کیونکہ ان کی مستند نقلیں حکومت کے محکمہ آثار قدیمہ اور تاریخ کی معتبر کتابوں میں موجود ہیں۔

یہ کتبے آج بھی شہادت دے رہے ہیں کہ ’’بابری مسجد‘‘ اجودھیا کا بانی ’’شاہ بابر‘‘

نہیں بلکہ اس کا ایک امیر ’’میر باقی اصفہانی‘‘ تھا جسے بابر نے ۹۳۵ھ/ ۱۵۲۸ء میں علاقہ اودھ کا حاکم مقرر کیا تھا ’’میر باقی‘‘ نے اسی تقرری کی یادگار کے طور پر اس مسجد کی تعمیر کرائی تھی، جیسا کہ پہلے کتبہ کے آخری مصرعہ ’’کہ نہ صد پنج وسی بودہ نشانی‘‘ سے واضح ہے۔

اور تیسرے کتبہ کے دوسرے شعر ’’بنا کردایں مہبط قدسیاں‘‘ سے اشارہ ملتا ہے کہ اس مسجد کی تعمیر عدل وانصاف کے مطابق ہوئی ہے کیونکہ اسلامی نقطۂ نظر سے فرشتوں کی درودگاہ وہ مقام کبھی بھی نہیں ہوسکتا جس کی بنیاد ظلم وجور پر رکھی گئی ہو، اور اسلامی قوانین کی رو سے کسی مذہب کی عبادت گاہ کو منہدم کرنا ظلم وزیادتی ہے، اور اس غیر منصفانہ حرکت سے آنحضرت...... نے سختی سے منع فرمایا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ مسز بیورج نے ان کے ترجمہ اور تشریح میں کہیں یہ نہیں لکھا ہے کہ یہ ’’مسجد‘‘ جنم استھان کو توڑ کر بنائی گئی ہے، اسی طرح ولیم ارسکن، آزبروک ولیم جنھوں نے بابر کے عہد کی تاریخ لکھی ہے بابر کے کسی مندر توڑنے کا ذکر نہیں کرتے۔

ان مستند تاریخی شواہد کے علاوہ مسجد کا جائے وقوع بھی یہی کہتا ہے کہ یہاں مسجد سے پہلے مندر نہیں ہوسکتا، کیونکہ مسجد کے احاطے کی چہاردیواری سے متصل پورب اور دکھن سمت ’’گنج شہیداں‘‘ ہے یعنی ان شہیدوں کے مزارات ہیں جو سپہ سالار مسعود غازی کے رفقاء میں سے تھے اور دو قدم فاصلے پر ’’قاضی قدوہ‘‘ کی قبر ہے جو خاندان قدوائی کے مورث اعلیٰ تھے۔

مسعود غازی پانچویں صدی ہجری میں اس دیار میں آئے تھے،... اس لئے اس مقام پر ان کے رفقاء کے مزارات کا ہونا یہ بتاتا ہے کہ اس حصۂ زمین پر اس وقت کوئی مندر وغیرہ نہیں تھا کیونکہ کسی مندر کے متصل شہیدوں کے مزارات نہیں بنائے جاتے ان مزارات کے بعد محلّہ قضیانہ اور ایک اور مسلم محلّہ کی آبادی شروع ہوجاتی تھی جس میں شیخ نصیر الدین چراغ دہلیؒ کا آبائی مکان تھا، اور مسجد کے پورب سمت ذرا سے فاصلے پر محلّہ بیگم پورہ تھا، جو نوابان اودھ کے دور تک خالص مسلم آبادی پر مشتمل تھا، اور مسجد کے اتر جانب احاطہ مسجد سے بالکل متصل تقریباً پندرہ میٹر چوڑی قدیم سڑک ہے اسی سڑک کے متصل اتر

پورب سمت میں جنم استھان کا احاطہ ہے۔ الحاصل اس قدیم سڑک سے دکھن جانب خالص مسلمانوں کی آبادی اور ان کے قدیم مزارات ہیں اس جانب نوابان اودھ کے دور سے پہلے نہ ہندو آبادی تھی اور نہ کوئی مندر وغیرہ ان کے سارے مندر سڑک کے اتری سمت میں تھے جس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ مسجد کی جگہ پہلے ہی سے مسلمانوں کی ملکیت میں تھی اس لئے یہاں کسی مندر کے ہونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

چنانچہ آج سے تقریباً آٹھ، نو سال قبل حکومت نے محکمہ آثار قدیمہ کے ذریعہ ''بابری مسجد'' کی مغربی دیوار سے بالکل متصل بڑے پیمانے پر کھدائی کرائی تھی اس کھدائی سے بھی یہی نتیجہ برآمد ہوا کہ یہاں مسجد سے پہلے کسی قسم کی کوئی عمارت نہیں تھی کیونکہ کھدائی کے بعد کسی عمارت کے کوئی آثار اس جگہ نہیں پائے گئے اس کھدائی کی رپورٹ حکومت کے پاس محفوظ ہے ان دلائل وقرائن کے بعد ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ اس سلسلے میں ایک ہندو محقق کی تحقیق بھی پیش کر دیں تاکہ حقیقت حال اچھی طرح روشن ہو کر سامنے آجائے۔

جنم استھان کے بارے میں ایک ہندو محقق کی تحقیق

ڈاکٹر آر، ایل شکلا استاذ دہلی یونیورسٹی دہلی نے ۱۹۸۴ء میں ایک مقالہ بعنوان (jkedhuxjh iz;/;; ;feFkd) (رام کی نگری اجودھیا جھوٹ یا سچ) لکھا تھا، یہ اقتباس اسی مقالہ سے ماخوذ ہے یہ مقالہ اگرچہ اس قابل ہے کہ اسے پورا نقل کر دیا جائے لیکن طوالت کے خوف سے اس کے ضروری اقتباسات اس موقع پر نقل کئے جارہے ہیں، وہ لکھتے ہیں کہ

''بعض مؤرخین ''مہابھارت'' میں بیان کئے گئے ''رام'' کو حقیقی کردار مانتے ہیں یہ مؤرخین رام کا زمانہ ڈھائی ہزار قبل مسیح مانتے ہیں، اور مہابھارت کا زمانہ عیسی علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ایک ہزار پہلے کا بتایا جاتا ہے، اگر ہم اس تحقیق کو صحیح مان لیں تو رامائن میں جن مقامات کا تعلق رام جی سے بیان کیا گیا ہے، ان جگہوں میں عیسیٰ (علیہ السلام) سے ڈھائی ہزار سال پہلے انسانی زندگی کے آثار ملنے چاہئے اسی مقصد کے پیش نظر تین مقامات کی

کھدائی ہوئی ہے: (۱) فیض آباد ضلع میں ''اجودھیا کی (۲) الہ آباد سے ۳۵ کلومیٹر شمال کی سمت واقع موضع ''شرنگویر پور'' کی (۳) اورالہ آباد میں واقع ''بھاردواج'' آشرم کی، اجودھیا میں کھدائی آج سے تقریباً ۲۵ سال پہلے بھی ہوئی تھی اس وقت بھی وہاں آبادی کے نشان عیسیٰ (علیہ السلام) سے ۶۰۰ سال پہلے کے نہیں ملے تھے اوراب سے تقریباً دس سال پہلے دوبارہ بڑے پیمانے پر وہاں (اجودھیا) کھدائی ہوئی، (اس کھدائی سے) بھی آبادی کے متعلق وہی نتیجہ نکلا کہ عیسی (علیہ السلام) سے (زیادہ سے زیادہ) ۷۰۰ سال قبل کی آبادی کے نشان پائے گئے، اب اگر یہ مان لیا جائے کہ یہی (موجودہ) اجودھیا ''رام جی'' کی نگری تھی جوان کی جنم بھومی مانی جاتی ہے تو (سوال پیدا ہوتا ہے) کہ رام جی کے زمانہ سے اجودھیا کے زمانے کا تعلق اور جوڑ کیوں نہیں قائم ہوتا، اجودھیا کی آبادی عیسیٰ (علیہ السلام) کے زمانے سے ۶۰۰ یا ۷۰۰ سال پہلے کی ہے جبکہ رام جی کا زمانہ عیسیٰؑ سے ۲۵۰۰ سال قبل یا بعض مؤرخین کی تحقیق کے اعتبار سے اس سے بھی پہلے کا ہے تو پھر اجودھیا رام کی بھومی کیسے ہوسکتی ہے اوراس کا کیا ثبوت ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ مشرقی یوپی، شمالی بہار اور مگدھ کے علاقوں میں پہلے جنگل ہی جنگل تھے ان علاقوں میں تقریباً ۵۰ سے ۶۰ انچ تک بارش ہوتی ہے جس کی بناء پر میدانوں میں جنگل کا پیدا ہوجانا فطری امر ہے، جب تک ان جنگلوں کو کاٹ کر صاف نہیں کیا گیا وہاں بستیوں کا آباد ہونا ممکن نہ تھا ان جنگلوں کی صفائی کا کام انہیں جلا کر یا لوہے کے کلہاڑوں سے کاٹ کر کیا گیا ہے اور جدید تحقیقات سے یہ طے ہو چکا ہے کہ لوہے کا استعمال ان علاقوں میں ۷۰۰ سال قبل از مسیح نہیں تھا۔

قدیم پالی ادب میں بڑی بڑی حکومتوں کا ذکر ہے جنہیں ''مہاجن پد'' کہا جاتا تھا، نیز پالی ادب میں ''اجودھیا'' کا بھی ذکر ہے اس کے پیش نظر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ''بدھ'' کے عہد میں اس علاقہ میں حکومت کا قیام ہوگیا تھا، لیکن اس سے پہلے کسی حکومت کے قیام کا ثبوت نہ تو قدیم ادب سے ملتا ہے اور نہ آثار قدیمہ ہی سے، اس لئے جو لوگ اجودھیا کو رام کی جنم بھومی کہتے ہیں ان کے پاس اس کی کوئی بھی دلیل نہیں ہے۔

بالمیکی رامائن (کے مطابق) ''کوشل'' کا پایۂ تخت ''اجودھیا'' سرجوندی کے داہنی سمت سرجو سے ڈیڑھ یوجن (۱۳½ میل) کے فاصلے پر تھا اور سرجو اس سے پچھّم سمت تھی، اور آج کا اجودھیا سرجو کے بالکل کنارے پر ہے پھر آج سرجو اجودھیا سے پورب سمت ہے نہ کہ پچھّم میں (بالمیکی کے اس بیان سے بھی موجودہ اجودھیا رام کی جنم بھومی نہیں ہوسکتا ہے) (ایٹک سنواد، ماہ نومبر ۱۹۸۴ء ص: ۱۲، ۱۳)

پھر یہ بات بھی پیش نظر رکھنی چاہئے کہ ہندو مذہب کی اہم ترین کتاب ''اتھروید'' سے پتہ چلتا ہے کہ لفظ ''ایودھیا'' اسم علم (نام) کے طور پر نہیں بلکہ صفت کے طور پر استعمال ہوا ہے ''انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ایڈوانسڈ اسٹڈی شملہ'' کے فیلو پروفیسر ''بی، بی لال'' جو آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا کے ڈائرکٹر جنرل بھی رہ چکے ہیں، انھوں نے انکشاف کیا ہے کہ

> ''کسی ایک جگہ بھی لفظ اجودھیا اسم معرفہ (نام) کے طور پر استعمال نہیں ہوا ہے اس لئے یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ یہ کسی شہر کا نام ہے'' (ہفت روزہ نئی دنیا دہلی شمارہ ۱۸ و ۲۰ مارچ ۱۹۸۶ء ص: ۱۳، ۱۵)

کیا رام کرشن کوشل کے راجہ تھے؟

ان تحقیقات کے علاوہ بعض محققین کی رائے یہ بھی ہے کہ رام کرشن کا ''جن کی راجدھانی (اجودھیا) بتائی جاتی ہے'' وہ کوشل کے راجہ تھے ہی نہیں بلکہ وہ بنارس کے حکمراں تھے۔

چنانچہ اے، ایل ہاشم لکھتے ہیں:

> ''یہ بات بھی یقینی نہیں ہے کہ ''رام'' کوشل کا بادشاہ تھا کیونکہ اس افسانے ''رامائن'' کا قدیم ترین نسخہ جو ہمارے پاس ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بنارس کا بادشاہ تھا جو تھوڑے زمانے کے لئے ایک اہم حکومت تھی''
>
> (ہندوستان کا شاندار ماضی ص: ۶۷، ۶۸ ناشر ترقی اردو بیورو نئی دہلی ۱۹۸۲ء)

الحاصل قدیم ہندو ادب اور جدید تحقیقات دونوں کے اعتبار سے موجودہ ''اجودھیا'' کا تعلق رامائن کے کردار (ہیرو) ''رام'' سے کسی طرح بھی ثابت نہیں ہوتا، کیونکہ اجودھیا کی آبادی رام کے اٹھارہ سو (۱۸۰۰) سال بعد وجود میں آئی ہے، اس لئے علم و تحقیق کی رو سے اجودھیا کو رام جنم بھومی کہنا انتہائی مضحکہ خیز ہے جس کی حیثیت دیو مالائی افسانے سے زیادہ نہیں۔

غالباً اسی بناء پر غیر ملکی سیاح جب ہندوستان کے قدیم آثار کی سیر کے لئے آتے ہیں تو انہیں بنارس، سارناتھ، مگدھ، نالندہ، کھجراہو، اجنتا وغیرہ کی سرکاری وغیر سرکاری طور پر سیر کرائی جاتی ہے اور ''اجودھیا'' کو بالکل نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

اس لئے جب خود ''اجودھیا'' کا رام جنم بھومی ہونا تاریخی و تحقیقی شواہد سے غلط ہے تو اس میں واقع ایک مسجد کو تقریباً ساڑھے چار سو سال کے بعد متعین کر کے یہ کہنا کہ اسی جگہ رام جی پیدا ہوئے تھے، ایک من گھڑت افسانہ نہیں تو پھر کیا ہے۔

اس افسانہ کی ابتدا اور اس کے مقاصد

رام جی کے زمانہ سے تقریباً سوا چار ہزار سال کے بعد بابری مسجد اجودھیا کی تعمیر ہوئی اگر واقعتاً اس جگہ کوئی مندر ہوتا اور اس اہمیت کا جسے آج ظاہر کیا جا رہا ہے کہ اس کے اوپر ملک کی سالمیت اور یگانگت کو قربان کرنے کا قصد کر لیا گیا ہے تو اس کا ذکر مذہبی اور تاریخی کتابوں میں ضرور ہوتا یا کم از کم محکمہ آثار قدیمہ کی جانب سے کھدائی کے موقع پر اس کے کچھ آثار و نشانات ہی ملتے لیکن اوپر کی سطور میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ ''اجودھیا'' کی آبادی کا وجود ''رام جی'' کے زمانے سے تقریباً اٹھارہ سو سال بعد ہوا ہے تو پھر ''رام جی'' کی وہاں پیدائش کیسے ہو سکتی ہے کہ ان کی پیدائش کی یادگار میں اس جگہ مندر بنایا جاتا۔

دراصل ''رام جنم استھان'' کا یہ قضیہ انگریزوں کی منحوس ڈپلومیسی ''لڑاؤ اور حکومت کرو'' کی پیداوار ہے واجد علی شاہ کے ابتدائی دور میں انگریزوں نے اس افسانہ کے پلاٹ کو تیار کیا، وہ اس طرح کہ ایک بدھشٹ نجومی کو پہلے سے تیار کیا چنانچہ اس نے

انگریزوں کی منشاء کے مطابق زائچہ کھینچ کر ’’جنم استھان‘‘ اور سیتا رسوئی گھر کو ’’بابری مسجد‘‘ کے احاطہ کے اندر ہونا متعین کیا، پھر ہندو طبقہ کے بعض مفاد پرست افراد کو آمادہ کیا گیا کہ وہ ان دونوں مقامات کے حاصل کرنے کی کوشش کریں چونکہ ’’نواب واجد علی شاہ کا وزیر‘‘ نقی علی خان رشوت خور ہونے کے ساتھ انگریزوں کا وفادار تھا اس لئے اس نے بھی اس افسانے کے خاکے میں رنگ بھرنے کی خدمت انجام دی اور ’’واجد علی شاہ‘‘ کو اس پر راضی کرلیا کہ حدود مسجد سے باہر لیکن اس کے احاطہ کے اندر ’’رام استھان‘‘ اور سیتا رسوئی گھر کے لئے جگہ دیدی جائے چنانچہ مسجد کے مسقّف حصہ کے بالمقابل داہنی سمت احاطہ کی دیوار سے متصل سیتا رسوئی کیلئے اور صحن مسجد سے باہر بائیں اور پورب کی طرف ’’جنم استھان‘‘ کے طور پر ۲۱ فٹ لمبی اور ۱۷ فٹ چوڑی جگہ دیدی گئی جس پر ایک بالشت بلند چبوترہ بنانے کی اجازت تھی... اسی موقع پر مسجد کے صحن کو لوہے کی سلاخوں سے گھیر دیا گیا، جواب تک بالکل کھلا ہوا تھا، یہ ہے سیتا رسوئی اور جنم استھان کی اصل حقیقت سچ کہا ہے حافظ شیرازی نے:

چوں نہ یابند حقیقت در افسانہ زدند

جنم استھان کو جس دیومالائی حیثیت سے ثابت کیا گیا تھا وہ عوام کو تو کسی حد تک متاثر کرسکتا تھا، لیکن پڑھا لکھا طبقہ اس پر مطمئن نہیں ہوسکتا تھا اس لئے اس دیومالائی کارروائی کے ایک عرصہ بعد جب فیض آباد کا نیا گزیٹیر مرتب کیا گیا تو پہلی بار اس میں یہ افسانہ بھی گھڑ کر لکھا گیا کہ ۱۵۲۸÷ میں ’’بابر‘‘ اجودھیا آیا اور ایک ہفتہ یہاں قیام کیا اس قدیم مندر (رام جنم استھان) کو ڈھا دیا اور اسی مقام پر ایک مسجد تعمیر کرائی جو اب تک ’’بابری مسجد‘‘ کے نام سے جانی جاتی ہے۔

حیرت ہے کہ حکومت اتر پردیش نے ۱۹۶۰÷ میں ضلع فیض آباد کا جو گزیٹیر شائع کیا اسی میں اس انگریزی افسانہ کو بغیر کسی تحقیق و تفتیش کے درج کردیا، حکومت یوپی کا یہ رویہ بتارہا ہے کہ ہماری حکومت ذہنی طور پر آج بھی انگریزوں کی غلام ہے جو آزاد قوم کے لئے انتہائی ننگ و عار کی بات ہے۔

اختلاف کا آغاز

بہرحال انگریزوں کی یہ چال کامیاب ہوگئی اور اجودھیا میں آباد ہندو مسلم دونوں فرقوں میں اس مسئلہ کو لے کر کشیدگی شروع ہوگئی چنانچہ سب سے پہلے ۱۸۸۵÷ میں رکھوبیر داس نامی مہنت نے سب جج کی عدالت میں ایک دعویٰ دائر کیا کہ ”جنم بھومی استھان پر کوئی عمارت نہیں ہے اور پوجاریوں کو جاڑا گرمی اور برسات میں تکلیف ہوتی ہے لہٰذا اس پر عمارت بنانے کی اجازت دی جائے اس نے اپنے دعویٰ میں یہ بھی ظاہر کیا کہ مسلمانوں کے اعتراض پر ڈسٹرکٹ جج نے رام جنم بھومی چبوترہ پر عمارت تعمیر کرنے سے روک دیا ہے۔

سب جج ہری کشن پنڈت نے اس دعویٰ کو مسترد کر دیا وہ اپنے فیصلے میں تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے، اس احاطہ میں جس پھاٹک سے داخلہ ہوتا ہے اس پر لفظ ”اللہ“ کندہ ہے اس کے فوراً بعد بائیں جانب چبوترہ ہے جس پر ہندوؤں کا قبضہ ہے اس چبوترہ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ رام جنم استھان ہے چبوترہ کے چاروں طرف مسجد کی دیوار ہے چبوترہ اور مسجد کے درمیان علیحدہ علیحدہ حد بندی ہے، اگر اس چبوترہ پر مندر تعمیر ہوا اور اس میں گھنٹیاں اور سنکھ بجائے گئے اور مسلمانوں کا گذر ہوتا رہا تو مستقبل میں بہت زیادہ خون خرابہ کا اندیشہ ہے اور ہزاروں جانیں تلف ہوسکتی ہیں اس لئے مندر کی تعمیر کی اجازت دینے کا مطلب بلوا، قتل اور فساد کو دعوت دینا ہے اس لئے انصاف کا تقاضا ہے کہ مندر تعمیر کرنے کی اجازت نہ دی جائے اس مقدمہ کے دعویٰ اور فیصلہ دونوں سے واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ جنم استھان کا چبوترہ مسجد سے باہر تھا۔

اس فیصلہ کے خلاف اپیل بھی ضلع مجسٹریٹ فیض آباد نے ۲۶/مارچ ۱۸۸۵÷ کو خارج کر دی دیکھئے سول اپیل (۲۷) ۱۸۸۶÷ اگرچہ اس مقدمہ کے وقت سے دونوں فرقوں کے درمیان عملی طور پر کشیدگی پیدا ہوگئی جو دن بدن بڑھتی رہی لیکن مسلمان معمول کے مطابق مسجد میں پنج وقتہ نماز پڑھتے رہے چنانچہ تعمیر کے وقت یعنی ۱۵۲۸÷/ ۹۳۵ھ

سے ۲۲؍دسمبر ۱۹۴۹÷ تک بغیر کسی رکاوٹ کے پنج وقتہ باجماعت نماز ہوتی رہی اور مستقل طور پر اس مسجد کے مؤذن اور امام مغلیہ عہد سے برابر متعین ہوتے رہے مسجد کے مصارف کے لئے مغلیہ عہد میں ساٹھ روپے سالانہ سرکاری خزانہ سے مقرر تھا نوابان اودھ کے دور میں یہ رقم بڑھا کر تین سو دو روپئے تین آنہ ۶ پائی کردی گئی برٹش حکومت نے بھی اس رقم کو جاری رکھا پھر بندوبست اول کے وقت رقم کی بجائے دو گاؤں ''بھورن پور'' اور ''شولا پور'' متصل اجودھیا بطور معافی .... دیئے گئے، جن کی آمدنی برابر مسجد کے مصارف پر خرچ ہوتی رہی، چنانچہ رجسٹر زیر دفعہ (۳۰) میں اس وقت کے متولی، جواد حسین ساکن موضع شہنواں ڈاکخانہ درشن نگر ضلع فیض آباد اور جائداد کی تفصیل، عمارت مسجد بابری مع اراضی واقع موضع بھورن پور اور شولا پور تحصیل و ضلع فیض آباد درج ہے، پھر سنی وقف ایکٹ ۱۳/۱۹۲۰ کے تحت چیف کمشنر وقف بورڈ نے معائنہ کر کے اس کا باقاعدہ رجسٹریشن بابری مسجد کی حیثیت سے کیا۔

غرضے کہ ۱۹۴۹÷ تک تاریخی اور قانونی ہر اعتبار سے ''بابری مسجد'' بغیر کسی اختلاف اور نزاع کے مسجد کی حیثیت سے مسلمانوں کے قبضہ میں رہی اور مسلمان بغیر کسی مزاحمت اور روک ٹوک کے اس میں پنج وقتہ باجماعت نماز ادا کرتے تھے۔

بابری مسجد میں مجرمانہ طور پر مورتی کی تنصیب

۱۹۴۸-۴۹÷ میں ملک کے اندر بالخصوص یوپی، دہلی، میوات، پنجاب وغیرہ صوبوں میں اس بڑے پیمانہ پر فرقہ وارانہ فسادات اور قتل و خوں ریزی کے حادثات ہوئے کہ اس نے ملک کے سارے نظام کو کچھ دنوں کے لئے معطل کر کے رکھ دیا، اسی اتھل پتھل اور افراتفری کے زمانہ میں ۲۲، ۲۳؍دسمبر ۱۹۴۹÷ کی درمیانی رات میں ہنومان گڑھی کے مہنت ''ابھے رام داس'' نے ضلع مجسٹریٹ ''کے، کے، نائر'' کی سازش اور اپنے چیلوں کی مدد سے مسجد کی دیوار پھاند کر مسجد میں گھس گئے اور مسجد کے درمیانی گنبد میں عین محراب کے اندر ''رام کی مورتی'' رکھ دی صبح کو جب مسلمان فجر کی نماز پڑھنے گئے تو مورتی کو دیکھ کر حیرت میں پڑ گئے اور اسی وقت مورتی کو نکالنے کا مطالبہ کیا، چنانچہ ۲۳؍کی صبح کو ڈیوٹی پر

متعین پولیس ''ماتوپرشاد'' نے اس وقت کے تھانہ انچارج ''شری رام دیو'' کو جو تحریری رپورٹ درج کرائی اس میں لکھا ہے کہ ''ابھے رام داس، شکل داس، سدرشن داس، اور پچاس، ساٹھ آدمی نامعلوم نے مسجد میں مورتی استھاپت (نصب) کر کے مسجد کو ناپاک کر دیا ہے جس سے نقض امن کا خطرہ پیدا ہو گیا ہے اسی رپورٹ کی بنیاد پر سٹی مجسٹریٹ ضلع فیض آباد نے دفعہ ۱۴۵ کے تحت مسجد اور اس سے ملحق گنج شہیداں کو قرق کر لیا اور پریہ دت رام چیرمین میونسپل بورڈ فیض آباد کو ریسیور مقرر کر کے مسجد پر تالا ڈال دیا اور فریقین کے نام نوٹس جاری کر دی کہ وہ اپنے اپنے دعویٰ کے سلسلے میں ثبوت پیش کریں۔

اس انتہائی مجرمانہ اور غیر مذہبی حرکت پر پورے ملک کے مسلمانوں میں اضطراب اور بے چینی پھیل گئی چنانچہ جمعیۃ علماء کے اکابر حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی وغیرہ نے صورت حال کی نزاکت سے اس وقت کے وزیر اعظم آنجہانی ''جواہر لال نہرو'' کو مطلع کیا پنڈت جواہر لال جی نے اس وقت کے وزیر اعلیٰ اتر پردیش شری پنتھ کو لکھا کہ وہ ضلع مجسٹریٹ کو حکم دیں کہ مسجد سے مورتی فوراً نکال دی جائے چنانچہ پنتھ نے وزیر اعظم کے حکم کے مطابق ضلع مجسٹریٹ کو یہ آرڈ بھیج دیا چونکہ ضلع مجسٹریٹ اس سازش میں خود ملوث تھا اس لئے اس آرڈر پر عمل کرنے کے بجائے اس نے ابھے رام داس وغیرہ کو نئی صورت حال کی اطلاع دیدی اور ان سے کہا کہ میں اس آرڈر کے نفاذ میں کچھ تاخیر کر دوں گا تم لوگ اس درمیان میں عدالت سے اسٹے حاصل کر لو ان لوگوں نے اس کے کہنے کے مطابق اس حکم کے خلاف عدالت سے اسٹے حاصل کر لیا اس طرح مورتی مسجد سے ہٹائی نہ جاسکی، چنانچہ ضلع مجسٹریٹ، کے، کے نائر سے پنتھ جی نے اسی بنیاد پر استعفا لے لیا، لیکن اس کے بعد پنتھ جی نے اس معاملہ میں دلچسپی نہیں لی اور مورتی اسی جگہ باقی رہی۔

مقدمات کا سلسلہ

مسجد میں مورتی کو غیر قانونی طور پر رکھنے کے تقریباً ۲۳-۲۴ دن بعد ۱۶ر جنوری

۱۹۵۰÷ کو ہندو فرقہ کے ایک شخص گوپال سنگھ نامی کی طرف سے ظہور احمد، حاجی محمد فائق، حاجی پھیکو، احمد حسین عرف اچھن، محمد سمیع، ڈی ایم، سٹی مجسٹریٹ اور سرکار اتر پردیش کو پارٹی بنا کر یہ دعویٰ دائر کیا گیا کہ یہ جنم بھومی ہے ہم یہاں پوجا پاٹ کرتے ہیں مسلمانوں اور ضلع انتظامیہ نے اس میں رکاوٹ ڈال دی ہے لہٰذا اس رکاوٹ کو ختم کرکے ہمیں پوجا پاٹ کی اجازت دی جائے۔ یاد رہے کہ ۱۸۸۵÷ کے دعویٰ میں جو رگھوناتھ داس کی طرف سے دائر کیا گیا تھا، اس میں مسجد کے باہر چبوترہ کو جنم استھان بتایا گیا تھا اور اسی پر عمارت بنانے کی اجازت چاہی گئی تھی اور اس دعویٰ میں جو نظری نقشہ پیش کیا گیا تھا اس میں مسجد کو ''بابری مسجد'' ہی کی حیثیت سے دکھایا گیا تھا۔

یکم جولائی ۱۹۵۶÷ کو ڈپٹی کمشنر فیض آباد نے عدالت میں جواب دعویٰ داخل کرتے ہوئے اپنے بیان کے پیراگراف ۱۴، ۱۵، ۱۶، ۱۷، اور ۱۸ میں لکھا ہے:

> یہ جائداد نزاعی ''بابری مسجد'' کے نام سے مشہور ہے اور لمبے عرصے سے مسجد کے طور پر مسلمانوں کے ذریعہ عبادت کیلئے استعمال ہوتی چلی آرہی ہے اس کا استعمال رام چندر جی کے مندر کے روپ میں کبھی نہیں ہوا ۲۲؍ دسمبر ۱۹۴۹÷ کی رات میں رام چندر جی کی مورتی کو چوری اور غلط ڈھنگ سے مسجد کے اندر رکھ دیا گیا، اس غلط اور غیر قانونی واقعہ سے مسلمانوں میں کافی بےچینی پیدا ہوگئی اور علاقے میں نقض امن کا خطرہ پیدا ہوگیا اس لئے سٹی مجسٹریٹ گرودت سنگھ نے ۲۳؍ دسمبر ۱۹۴۹÷ کو دفعہ ۱۴۴ نافذ کردی اور اسی تاریخ کو ایڈیشنل مجسٹریٹ ''شری مارکھنڈے سنگھ نے دفعہ ۱۴۵ کے تحت اس مسجد کو قرق کرکے ریسیور مقرر کردیا۔''

ڈپٹی کمشنر کے جواب دعویٰ سے ایک ماہ پہلے یعنی یکم جون ۱۹۵۰÷ کو ایس، پی ضلع فیض آباد کرپال سنگھ نے بھی جواب دعویٰ داخل کیا تھا جس میں لکھا تھا کہ

> ''یہ زمانۂ قدیم سے ''بابری مسجد'' ہے اور اس میں ہمیشہ سے مسلمان نماز پڑھتے چلے آرہے ہیں ہندوؤں کا اس سے کوئی واسطہ اور سروکار نہیں ہے۔''

اس مقدمہ کے بعد ہندوؤں کی جانب سے دو مقدمات اور دائر کئے گئے ایک پریم ہنس رام چندر داس کی جانب سے اور دوسرا نرموہی اکھاڑا کی طرف سے، اسکے بعد ۱۹۶۸÷ میں یوپی سنٹرل وقف بورڈ اور مسلمانوں کی جانب سے ایک مقدمہ دائر ہوا جس میں جمعیۃ علماء کی طرف سے مولانا نصیر احمد صاحب فیض آبادی بھی مدعی تھے، اس دعویٰ میں کہا گیا تھا کہ یہ ''بابری مسجد'' مسلمانوں کی مسجد ہے جس میں وہ ۱۵۲۸÷ سے برابر عبادت کرتے چلے آرہے ہیں یہ مسجد ان کو واپس دی جائے اور نماز میں کسی قسم کی مداخلت نہ کی جائے۔

اب تک ان تمام مقدموں کی فائل الگ الگ تھیں بغرض سہولت عدالت کے حکم سے انہیں یکجا کر دیا گیا اور سنّی سنٹرل وقف بورڈ کے مقدمہ ۱۲/۶۱ کو رہنما کیس قرار دیدیا گیا۔

اسی اثناء میں ریسیور پریہ دت کا انتقال ہوگیا، تو عدالت نے ان کی جگہ ''شری کے کے رام ورما'' آنریری مجسٹریٹ کو ریسیور مقرر کیا اسی درمیان مسلمانوں کو اطلاع ملی کی مسجد میں تبدیلی کی جارہی ہے، اس لئے انھوں نے رام ورما کو ریسیور کے عہدہ سے الگ کرنے کی درخواست دی مسلمانوں کی شکایت کو صحیح مانتے ہوئے سول جج نے رام ورما کو ریسیور کے عہدہ سے ہٹانے کا حکم دیدیا اس حکم کے خلاف ہندوؤں نے ہائی کورٹ لکھنؤ بینچ میں ''رویژن'' دائر کر کے اسٹے لے لیا اس موقع پر رہنما کیس اور جملہ مقدمات کی فائل، ہائی کورٹ میں طلب کرلی گئی اور فیض آباد میں تمام مقدمات رک گئے اور تقریباً پندرہ سال کی طویل مدت گذر گئی مگر فیض آباد کی عدالت میں اس مقدمہ کے سلسلے میں کوئی کارروائی عمل میں نہیں آئی حالانکہ اس مدت میں مسلمانوں کی جانب سے بار بار درخواست پیش کی گئی کہ اس کا فیصلہ جلد کردیا جائے اور ہائی کورٹ کی طرف سے بھی عدالت فیض آباد کو ہدایت دی گئی کہ اس مقدمہ کا جلد فیصلہ کردیا جائے مگر اس کا کوئی اثر نہیں لیا گیا۔

دوران مقدمہ خلاف قانون مسجد میں تبدیلیاں

گذشتہ سطور میں معلوم ہو چکا ہے کہ ''بابری مسجد'' کے چاروں سمت چہار دیواری ہے، مسجد کا صدر دروازہ اتری سمت ہے اس دروازے پر موٹے خط میں لفظ اللہ کندہ تھا مگر

ریسیور اور پولیس کی نگرانی کے ہوتے ہوئے اسے کھرچ کر مٹا دیا گیا اور دروازے پر ''جنم استھان مندر'' کا ایک بورڈ لگا دیا گیا، احاطہ کی اتری چہار دیواری اور صحن مسجد کے درمیانی خالی جگہ پر سفید و سیاہ سنگ مرمر کا فرش بنا لیا گیا ہے جسے ''پری کرما'' (مطاف) کا نام دیا گیا ہے، صحن مسجد میں اتری جانب ہینڈ پائپ گاڑ لیا گیا ہے، صحن مسجد سے باہر پوربی سمت ایک سفالہ پوس مندر تعمیر کر لیا گیا ہے، اسی کے متصل مہنتوں کی قیام گاہ بھی بنا لی گئی ہے، دکھن سمت اس چبوترہ پر جسے شروع میں رام جنم استھان کا نام دیا گیا ہے، مندر تعمیر کر لیا گیا ہے اور اسی کے متصل دو مندر اور بھی بنا لئے گئے ہیں، مسجد کے درمیانی گنبد پر ایک جھنڈا لگا دیا گیا ہے، یہ ساری تبدیلیاں ۱۹۶۷÷ سے ۱۹۸۶÷ کی درمیانی مدت میں کی گئی ہیں جبکہ ریسیور کا تقرر قانونی طور پر اس لئے ہوتا ہے کہ متنازع عمارت میں فریقین کی جانب سے کوئی ترمیم و اضافہ نہ کیا جا سکے لیکن یہ تمام تبدیلیاں ہوتی رہیں نہ مقرر ریسیور رام ورما نے اس کا کوئی نوٹس لیا اور نہ وہاں متعین نگراں پولیس نے اس لئے کہ جذباتی طور پر یہ سب لوگ ان غیر قانونی تبدیلیوں میں باہم شریک کار تھے۔

مسجد مندر بنا دی گئی

ہائی کورٹ بنچ لکھنؤ میں ریسیور ورما کے سلسلہ میں داخل رٹ زیر سماعت ہے اور قانونی طور پر ابھی اس کے خلاف اپیل نہیں کی جا سکتی لیکن ۲۵/جنوری ۱۹۸۶÷ رمیش چندر پانڈے نامی ایک غیر متعلق شخص نے جو اب تک کے کسی مقدمہ میں فریق نہیں ہے منصف صدر فیض آباد کی عدالت میں مقدمہ (۲) ۱۹۵۰÷ میں ایک نئی درخواست دی کہ جنم استھان میں پوجا پاٹ کرنے کی چھوٹ ہونی چاہئے لہٰذا عدالت ضلع انتظامیہ کو حکم دے کہ جنم بھومی یا بابری مسجد کا تالا کھول دے تا کہ ہم اور ہندو لوگ بغیر کسی روک ٹوک کے پوجا کر سکیں اس پر منصف صدر نے.... یہ کہتے ہوئے درخواست خارج کر دی کہ اس مقدمہ کی رہنما فائل ہائی کورٹ میں زیر سماعت ہے اس لئے اس درخواست پر کوئی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا اس فیصلہ کے خلاف ڈسٹرکٹ جج مسٹر کے، ایم پانڈے کی عدالت میں سول اپیل

نمبر (۶) ۱۹۸۲÷ ۳۰/ جنوری کو داخل کی گئی اور ۳۱/ جنوری کو دیوانی کے سرکاری وکیل نرائن دت کھتری پیش ہوگئے ضلع مجسٹریٹ نے ڈی، ایم اور ایس، پی کا بیان لینا چاہا چنانچہ یکم فروری ۱۹۸۶÷ کو یہ دونوں حکام بھی حاضر ہوگئے جن سے ضلع مجسٹریٹ نے سوال کیا کہ اگر مسجد یا جنم بھومی کا تالا کھول دیا جائے تو کیا آپ لا اینڈ آرڈر بحال کرسکیں گے جس پر انھوں نے کہا کہ یہ ہماری ڈیوٹی ہے اور ہم اسے پورا کرنے کی کوشش کریں گے چنانچہ اس فرضی کارروائی کے بعد اسی دن یعنی سنیچر کو پونے پانچ بجے جج نے یہ فیصلہ سنا دیا کہ ضلع انتظامیہ اس جگہ کا تالا کھول دے اور رمیش چندر پانڈے اور دیگر ہندوؤں کو پوجا پاٹ کرنے کی کھلی چھوٹ دی جائے اس میں کسی قسم کی کوئی رکاوٹ پیدا نہ کی جائے نیز ضلع انتظامیہ لا اینڈ آرڈر بحال رکھنے کیلئے مناسب کارروائی عمل میں لائے۔

مسلمانوں کی طرف سے اس مقدمہ کے سلسلے میں تین درخواستیں دی گئیں لیکن جج نے یہ کہتے ہوئے کہ معاملہ ضلع انتظامیہ سے متعلق ہے اس میں مسلمانوں کو فریق بنانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، تینوں درخواستیں رد کردیں اور فیصلہ کے فوراً بعد ۵/ بج کر ۱۹/ منٹ پر بابری مسجد کا دروازہ کھول دیا گیا اور ہزاروں ہندو پوجا پاٹ کیلئے اس وقت مسجد میں پہنچ گئے اس طرح سے ۴۵۸ سال کی قدیم مسجد بیک جنبش قلم مندر میں تبدیل کردی گئی۔

انا للّٰہ و انا الیہ راجعون ؁

اس مقدمہ کا یہ پہلو کس قدر ڈرامائی ہے کہ اس میں مدعی رمیش پانڈے، ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اندر کمار پانڈے، ڈسٹرکٹ جج کے، ایم پانڈے اور وکیل ویریشور دود یدی سب کے سب پنڈٹ برادری سے تعلق رکھتے ہیں، اس لئے اس میں جو فیصلہ ہونا تھا وہ پہلے ہی سے ظاہر تھا۔

اسی کا شہر وہی مدعی، وہی منصف ہمیں یقین تھا ہمارا قصور نکلے گا

فیصلہ پر ایک نظر

حیرت انگیز بات یہ ہے کہ مقدمہ کا فیصلہ پونے پانچ بجے ہوتا ہے لیکن اجودھیا اور

فیض آباد میں پی، اے، سی اضافی طور پر دن کے دو بجے ہی لگادی گئی اور مسلمانوں کے محلوں میں ان کا زبردست گشت شروع ہوگیا اور فیصلے سے پہلے ہی عدالت کو پولیس اور پی، اے سی نے اپنے حصار میں لے لیا تھا۔

فیصلہ سے قبل یہ تیاریاں صاف بتلا رہی ہیں کہ جو کچھ ہوا وہ پہلے سے طے شدہ اسکیم کے تحت ہوا ہے، یہ بات بھی کم حیرت کی نہیں ہے کہ صرف پانچ دن کے اندر منصف عدالت سے لے کر ضلع جج کی عدالت تک مقدمہ کی ساری کارروائی عمل میں آگئی اور فیصلہ بھی کر دیا گیا ہندوستان کی عدالتوں میں کیا مقدمات اتنی ہی سرعت کے ساتھ نمٹائے جاتے ہیں، کیا ہندوستانی عدلیہ اس کی کوئی مثال پیش کرسکتی ہے؟

پھر جو مقدمہ ہائی کورٹ میں زیر سماعت ہو اس کی اپیل اور وہ بھی ماتحت عدالت میں کس قانونی دفعہ کے تحت کی گئی ہے؟۔

کیا کسی مقدمہ میں فریق ثانی کو نوٹس دیئے بغیر فیصلہ کر دینا قانونی رو سے درست کہا جاسکتا ہے؟

آخری بات

اسلامی تاریخ شاہد ہے کہ اسلام اور مسلمانوں پر اس طرح کے بلکہ اس سے بھی سنگین تر حالات پیش آئے ہیں لیکن مسلمانوں نے اپنے استقلال و استقامت، صبر وتحمل اور حکمت و جرأت سے ہر موقع پر حالات کے رخ کو موڑ دیا ہے اس لئے آج بھی ہمیں تاریخ سے سبق لینا چاہئے غم وغصہ، مایوسی و نامرادی، جھنجھلاہٹ اور چیخ وپکار کے بجائے صبر واستقامت اور جرأت سے خدا کے سہارے آگے بڑھنا چاہئے ظلم و جبر کی کشتی زیادہ دنوں تک نہیں چلتی، کامیابی وکامرانی ہمیشہ حق وانصاف کے قدم چومتی ہے۔

وانتم الاعلون ان کنتم مؤمنین.

☆ ☆ ☆

بابری مسجد تاریخ کے مختلف مراحل میں

۱

مسجد کی تعمیر اور اس کی تاریخی حیثیت

تین گنبدوں والی یہ قدیم مسجد شہنشاہ ’’بابر‘‘ کے دور میں اودھ کے حاکم ’’میر باقی اصفہانی‘‘ نے ۹۳۵ھ/ ۱۵۲۸÷ میں تعمیر کرائی تھی، مسجد کے مسقّف حصہ میں تین صفیں تھیں اور ہر صف میں ایک سو بیس نمازی کھڑے ہو سکتے تھے، صحن میں چار صفوں کی وسعت تھی، اس طرح بیک وقت ساڑھے آٹھ سو مصلی نماز ادا کر سکتے تھے۔

مسجد کے درمیانی مرکزی در کے اوپر دو میٹر لمبی اور پچپن سینٹی میٹر چوڑی پتھر کی تختی کا ایک کتبہ نصب تھا، جس کی پہلی اوپر سطر میں ’’بسم اللہ الرحمٰن الرحیم و بہ ثقتی‘‘ خوشنما بیلوں کے درمیان لکھا ہوا تھا، اور نیچے کی تین سطروں میں یہ اشعار تھے۔

بنام آنکہ او دانائے اکبر　　　که خالق جملہ عالم لامکانی
درود مصطفیٰ بعد از ستائش　　　کہ سرور انبیاء زبدہ جہانی
فسانہ درجہاں بابر قلندر　　　کہ شد در دور گیتی کامرانی
چنانکہ ہفت کشور در گرفتہ　　　زمیں را چوں مثالے آسمانی
درآں حضرت یکے میر معظم　　　کہ نامش میر باقی اصفہانی
مشیرِ سلطنت تدبیر ملکش　　　کہ ایں مسجد حصار ہست بانی
خدایا درجہاں تابندہ ماند　　　کہ چتر وتخت و بخت و زندگانی
دریں عہد و دریں تاریخ میموں　　　کہ نہ صد پنج و سی بودہ نشانی

تمت ہذا التوحید ونعت ومدح وصفت نور اللہ برہانہ بخط عبد الضعیف نحیف فتح اللہ محمد غوری۔

اس بڑے کتبہ کے علاوہ اندرونِ مسجد منبر کی دونوں جانب ایک ایک کتبہ نصب تھا، ۲۷/مارچ ۱۹۳۴÷ کے ہنگامہ کے موقع پر جوگاؤکشی کے عنوان کا بہانہ بنا کر برپا کیا گیا تھا، مسجد میں گھس کر بلوائیوں نے توڑ پھوڑ کی تھی، جس میں یہ دونوں کتبے بھی اٹھالے گئے تھے، بعد میں ''تہور خاں ٹھیکیدار'' نے منبر کی بائیں سمت والے کتبہ کی نقل تیار کرا کے اسی پہلی جگہ پر اسے نصب کرادیا، داہنی جانب کے کتبہ کی ایک نقل سید بدر الحسن فیض آبادی کے پاس محفوظ تھی، اس لئے اس کتبہ کی عبارت بھی دستیاب ہوگئی۔

بائیں سمت کا کتبہ حسب ذیل اشعار پر مشتمل تھا۔

بفرمودۂ شاہ بابر کہ عدلش بنائیست با کاخ گردوں ملاقی
بنا کرد ایں مہبط قدسیاں را امیر سعادت نشاں میر باقی
بود خیر باقی و سال بنائش عیاں شد چوں گفتم بود خیر باقی

داہنی جانب والے کتبہ کے اشعار یہ تھے۔

بمنشائے بابر خدیو جہاں بنائے کہ با کاخ گردو عناں
بنا کرد ایں خانۂ پائیدار امیر سعادت نشاں میر خاں
بماند ہمیشہ چنیں بانیش چناں شہر یارِ زمیں و زماں

ابتدائے تعمیر سے بابری مسجد میں نماز پنج گانہ اور جمعہ ہوتا رہا ہے، عدالتی کاغذات سے معلوم ہوتا ہے کہ ماضی قریب یعنی ۱۸۵۸÷ سے ۱۸۷۰÷ تک اس مسجد کے امام و خطیب ''محمد اصغر'' تھے، ۱۸۷۰÷ تا ۱۹۰۰÷ کی درمیانی مدت میں مولوی ''عبد الرشید'' نے امامت کے فرائض انجام دیئے، ۱۹۰۱÷ سے ۱۹۳۰÷ کے عرصہ میں یہ خدمت مولوی عبد القادر کے سپرد رہی، اور ۱۹۳۰÷ سے ۱۹۴۹÷ مسجد کے قرق ہونے کی تاریخ تک مولوی عبد الغفار کی اقتداء میں مسلمان اس مسجد میں نماز پنج وقتہ اور جمعہ ادا کرتے تھے، یہ آخری امام ابھی حیات ہیں۔

بابری مسجد کے مصارف کے واسطے عہد مغلیہ میں مبلغ ساٹھ روپے سالانہ شاہی خزانے سے ملتے تھے، نوابان اودھ کے دور میں یہ رقم بڑھا کر تین سو دو روپے تین آنہ چھ پائی کردی گئی تھی، برطانوی اقتدار میں بھی یہ رقم بحال رہی، پھر بندوبست اول کے وقت نقد کی بجائے دو گاؤں بھورن پور اور شولا پور متصل اجودھیا اس کے مصارف کے لئے دیئے گئے، غرض کہ اپنی ابتداء تعمیر ۹۳۵ھ/ ۱۵۲۸÷ سے ۱۳۶۹ھ/ ۱۹۴۹÷ تک یہ مسجد بغیر کسی نزاع واختلاف کے مسجد ہی کی حیثیت سے مسلمانوں کی ایک مقدس ومحترم عبادت گاہ رہی اور مسلمان امن وسکون کے ساتھ اس میں اپنی مذہبی عبادت ادا کرتے تھے۔

﴿۲﴾

مسجد، مندر قضیہ کا آغاز

مستند تاریخوں سے پتہ چلتا ہے کہ بابری مسجد کی تعمیر سے صدیوں پہلے مسلمان اجودھیا میں آباد تھے، اور یہاں کے ہندو مسلم پوری یک جہتی اور یگانگت کے ساتھ رہتے سہتے تھے، ۱۸۵۵÷/۱۲۷۲ھ سے پہلے کسی مذہبی معاملہ میں یہاں کے باشندوں کے درمیان کوئی تنازعہ رونما ہوا یا باہمی ٹکراؤ کی نوبت آئی ہو صحیح تاریخوں اور مذہبی نوشتوں سے اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا، لیکن جب اس ملک پر انگریزوں کا منحوس سایہ پڑا اور ان کا یہاں عمل دخل شروع ہوا تو انھوں نے اپنی بدنام زمانہ پالیسی ''لڑاؤ اور حکومت کرو'' کے تحت یہاں کے لوگوں میں باہمی منافرت اور تصادم پیدا کرنے کی غرض سے مسجد، مندر، جنم استھان وغیرہ کا خود ساختہ قضیہ چھیڑ دیا جس کے نتیجہ میں ۱۸۵۵÷/۱۲۷۲ھ میں اجودھیا کے اندر زبردست خونریزی ہوئی، جس کی تفصیل احقر کی تالیف ''اجودھیا کے اسلامی آثار'' میں ملاحظہ کی جائے، اسی وقت سے اختلاف کی خلیج وسیع سے وسیع تر ہوتی گئی، اور نوبت بایں جا رسید۔

شاطر انگریزوں نے سب سے پہلے ''جنم استھان'' اور ''سیتا کی رسوئی'' کا افسانہ ترتیب دیا اور ایک بدھسٹ نجومی کو پہلے سے سکھا پڑھا کر ان دونوں مقامات کی جگہ معلوم

کی، اس نے طے شدہ سازش کے مطابق زائچہ کھینچ کر بتادیا کہ ''جنم استھان'' اور ''سیتا کی رسوئی'' بابری مسجد سے متصل احاطہ کے اندر ہے، پھر اپنے زیر اثر ہندوؤں کو اکسایا کہ ان دونوں ''پوتر استھانوں'' کو حاصل کرنے کی کوشش کریں، ''نقی علی خاں'' جو نواب واجد علی کا خسر اور وزیر تھا، انگریزوں کی اس سازش میں ان کا مؤید اور طرف دار تھا، اس نے اپنے اثر ورسوخ کے ذریعہ ناعاقبت اندیش نواب کو اس بات پر راضی کرلیا کہ بابری مسجد سے باہر مگر اس کے احاطہ کے اندر جنم استھان وسیتا رسوئی کے لئے جگہ دیدی جائے، چنانچہ مسجد کے مسقّف حصہ کے بالمقابل احاطہ مسجد کی دیوار سے متصل داہنی سمت ''سیتا رسوئی'' کے لئے اور صحن مسجد سے باہر بائیں پورب کی جانب جنم استھان کے نام سے ۲۱ / فٹ لمبی اور ۱۷ / فٹ چوڑی جگہ دیدی گئی، جس پر اسی وقت سے پوجاپاٹ کا سلسلہ بھی شروع کردیا گیا، حالانکہ جس وقت یہ افسانہ ایجاد کیا گیا اس سے برسہا برس پہلے سے قلب شہر میں جنم استھان کا مندر موجود تھا اور آج بھی موجود ہے، اس وقت مسجد اور جنم استھان کے درمیان حد فاصل قائم کرنے کی غرض سے صحن مسجد کے اردگرد آہنی سلاخوں کی باڑھ کھڑی کردی گئی، اسی منحوس تاریخ سے اجودھیا میں مذہبی کش مکش شروع ہوگئی اور یہاں کے ہندو مسلم، مندر مسجد کے نام پر آپس میں دست بگریباں ہوگئے۔

خدا سمجھے بت سحر آفریں سے
گریباں کو لڑایا آستیں سے

۱۸۵۷ء میں جب کہ ہندوستان کے مسلمانوں اور ہندوؤں نے متحد ہوکر بہادر شاہ ظفر کی قیادت میں انگریزوں کے خلاف جنگ آزادی کا بگل بجایا، ضلع فیض آباد کے گزیٹر سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت باہمی اتفاق ویگانگت کو مستحکم کرنے کی غرض سے اجودھیا کے مسلم رہنما امیر علی اور ہندو رہنما بابا چرن داس نے رام جنم استھان اور بابری مسجد کے تنازعہ کو ہمیشہ کے واسطے ختم کرنے کی غرض سے ایک معاہدہ کیا کہ رام جنم استھان کی مخصوص متنازعہ اراضی ہندوؤں کے حوالہ کردی جائے اور ہندو بابری مسجد کی عمارت سے دست کش ہوجائیں، چنانچہ اس معاہدہ پر فریقین خوشی خوشی راضی ہوگئے اور دو سال سے اختلاف کی

جو آگ بھڑک رہی تھی وہ ٹھنڈی ہوگئی، مگر انگریزوں کو یہ ہندو مسلم اتحاد گوارہ نہ ہوا، انھوں نے بابا رام چرن داس اور امیر علی دونوں کو ایک ساتھ املی کے پیڑ پر لٹکا کر پھانسی دیدی اور مندر مسجد کے نزاع کو از سر نو زندہ کرنے کی غرض سے متنازعہ رام جنم استھان اور بابری مسجد کے درمیان ایک دیوار کھینچ دی، دونوں کے راستے بھی الگ الگ بنا دیئے اور مسجد کے شمالی دروازہ سے مسجد میں داخلہ پر پابندی عائد کردی، اور —— جذباتی ہندؤں کو اکسایا کہ وہ اس تقسیم کو مسترد کرکے پوری مسجد پر دعویٰ کریں، اسی کے ساتھ مسلمانوں کو بھی برانگیختہ کیا کہ وہ مسجد کی اراضی کے اس بٹوارہ کو تسلیم نہ کریں چنانچہ یہ کشاکش پھر شروع ہوگئی جس کا ایک طویل سلسلہ ہے، تفصیل کے لئے ”اجودھیا کے اسلامی آثار“ کا مطالعہ کیجئے۔

﴿۳﴾

مسجد کو مندر بنانے کی شرمناک سازش

۴۹/ ۱۹۴۸ء میں جب کہ ملک فرقہ وارانہ تشدّد کی آگ میں جل رہا تھا، اور پورے ہندوستان میں افراتفری مچی ہوئی تھی ۲۲، ۲۳ر دسمبر ۱۹۴۹ء کی درمیانی رات میں ہنومان گڑھی کے مہنت ”ابھے رام داس“ نے اپنے کچھ چیلوں کے ساتھ مسجد میں گھس کر عین محراب کے اندر ایک مورتی رکھ دی جس کے خلاف اس وقت ڈیوٹی پر مقرر کانسٹبل ”ماتو پرشاد“ نے صبح کو تھانہ میں حسب ذیل رپورٹ درج کرائی۔

> ”ابھے رام داس، سدرشن داس اور پچاس ساٹھ نامعلوم لوگوں نے مسجد کے اندر مورتی استھاپت (نصب) کر کے مسجد کو ناپاک کردیا ہے۔ جس سے نقص امن کا خطرہ پیدا ہوگیا ہے۔“

اس رپورٹ کو بنیاد بنا کر فیض آباد کے سٹی مجسٹریٹ نے دفعہ ۱۴۵ کے تحت مسجد اور اس سے ملحق گنج شہیداں کو قرق کرکے مقفل کردیا اور پریہ دت رام چیرمین کو اس کی حفاظت کے لئے رسیور مقرر کردیا، نیز فریقین کے نام نوٹس جاری کیا کہ اپنے اپنے دعویٰ پر ثبوت پیش کریں، سٹی مجسٹریٹ کا یہ غیر منصفانہ عمل زبان حال سے بتا رہا ہے کہ مسجد میں

بت رکھنے کی کارروائی گہری سازش کے تحت عمل میں لائی گئی تھی، ورنہ ایک قدیم جمعہ وجماعت سے آباد مسجد کے بارے میں ثبوت طلب کرنا کیا معنی رکھتا ہے۔ سیدھی بات یہ تھی کہ ماتوپرشاد کانسٹبل کی رپورٹ کے مطابق مجرمین کو قرار واقعی سزا دی جاتی اور مسجد سے مورتی نکال کر اس مسئلہ کو ختم کر دیا جاتا، مگر حیرت ہے کہ حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ، مولانا ابوالکلام آزادؒ اور مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ نے آنجہانی پنڈت جواہر لال نہرو کو اس سنگین معاملہ پر توجہ دلائی اور انھوں نے یوپی کے وزیر اعلیٰ گووند بلبھ پنت کو لکھا کہ اس مسئلہ کو فی الفور حل کریں، پھر بھی اس سلسلے میں کوئی مثبت کارروائی نہیں کی گئی، اور مذہبی جانبداری واقتدار سیکولرزم اور قانون وانصاف پر غالب رہا، گویا ملک کی جنگ آزادی میں مسلمانوں کی قربانیوں کا اولین صلہ آزاد ہونے کے بعد یہ دیا گیا کہ ان کی قدیم متبرک عبادت گاہ میں مورتیاں رکھ دی گئیں اور اس کے منبر ومحراب جواب تک رکوع وسجود سے آباد تھے مقفل کر دیئے گئے۔

دیکھیں اس آغاز کا ہوتا ہے کیا انجام کار

اس حادثہ کے وقت مولانا آزاد نے کہا تھا کہ ''میرے ذہن میں یہ سوال گونج رہا ہے کہ مستقبل میں مسلمانوں کو ایک ملت کی حیثیت سے قبول کیا جائے گا یا نہیں، اگر اس کا جواب اثبات میں ملتا ہے تو بابری مسجد سے بت ہٹا دیئے جائیں گے، اور اگر آئندہ چل کر اس کی نفی ہوتی ہے تو انتظار کیجئے دوسری مسجدوں میں بھی اس طرح کے حادثات پیش آسکتے ہیں۔'' آج کے واقعات سے مولانا آزاد کے خدشات صحیح ثابت ہو رہے ہیں۔

اس حادثہ کے بعد ۱۶؍جنوری ۱۹۵۰÷ کو گوپال سنگھ نامی ایک شخص نے ظہور احمد، حاجی محمد فائق، حاجی پھیکو، احمد حسن عرف اچھن، محمد سمیع، ڈی، ایم سٹی مجسٹریٹ اور سرکار اتر پردیش کو پارٹی بنا کر یہ دعویٰ دائر کر دیا کہ مسجد جنم استھان ہے، ہم یہاں پوجا پاٹ کرتے ہیں مگر مسلمان اور ضلع حکام اس میں رکاوٹ ڈالتے ہیں، لہٰذا اس رکاوٹ کو ختم کرکے ہندوؤں کو اس میں پوجا پاٹ کی باضابطہ اجازت دی جائے، اس مقدمہ کے دائر ہونے کے تیسرے دن یعنی ۱۹؍جنوری ۱۹۵۰÷ کو عدالت نے ایک حکم امتناعی کے ذریعہ

ہندو مسلمان دونوں کا داخلہ مسجد میں ممنوع قرار دے دیا پھر ۱۳/ مارچ ۱۹۵۱÷ میں عدالت نے پجاری کو مسجد کے اندر جا کر پوجا اور بھوگ کرنے کی اجازت دیدی، مگر مسلمان اپنی عبادت گاہ میں خدائے وحدہ لاشریک لہٗ کا نام لینے سے محروم رہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ جب ظلم و ناانصافی کو طاقت وحکومت کی پشت پناہی حاصل ہو جاتی ہے تو آئین و قانون اور عدالت سب اس کے آگے سربسجود ہو جاتے ہیں۔

دعویٰ مذکورہ کی جواب دہی کرتے ہوئے فیض آباد کے ایس پی کرنا سنگھ نے یکم جون ۱۹۵۰÷ کو جو جواب دعویٰ عدالت میں داخل کیا اس میں لکھا تھا کہ

> ”زمانہ قدیم سے بابری مسجد ہے اس میں مسلمان ہمیشہ سے نماز پڑھتے چلے آرہے ہیں ہندوؤں کا اس سے کوئی واسطہ اور سروکار نہیں ہے۔“

ڈپٹی کمشنر فیض آباد نے اسی مقدمہ سے متعلق یکم جولائی ۱۹۵۰÷ کو جو حلف نامہ داخل کیا تھا اس میں بھی ”بابری مسجد“ کی مسجدیت کا اعتراف واقرار موجود ہے، مذکورہ بالا مقدمہ کے علاوہ ۱۹۶۱÷ میں دو مزید مقدمات دائر کئے گئے ایک رام چندر داس کی جانب سے اور دوسرا نرموہی اکھاڑہ کی طرف سے، جس کے جواب میں جمعیۃ علماء ہند اور یوپی سنی سنٹرل وقف بورڈ کی طرف سے بھی مقدمات قائم کئے گئے جن میں کہا گیا تھا کہ یہ بابری مسجد مسلمانوں کی مسجد ہے جس میں وہ ۱۵۲۸÷ سے برابر عبادت کرتے رہے ہیں لہٰذا یہ مسجد انھیں واپس دی جائے اور نماز وغیرہ میں کسی قسم کی مداخلت نہ کی جائے۔

تقریباً ۳۵/ سال کے طویل عرصہ تک یہ مقدمات عدالت میں معطل پڑے رہے، ....ان سے متعلق کوئی مؤثر کارروائی نہیں کی گئی، اس دوران پولیس اور رسیور کی نگرانی کے باوجود مسجد کے اندر اور باہر خلاف قانون بہت سی تبدیلیاں کردی گئیں، مثلاً مسجد کے صدر دروازہ پر جلی حرفوں میں ”اللہ“ کندہ تھا جسے کھرچ دیا گیا، دروازہ پر جنم استھان مندر کا بورڈ لگادیا گیا، احاطہ کی شمالی چہاردیواری اور مسجد کی درمیانی جگہ میں سفید وسیاہ سنگ مرمر کا فرش بنایا گیا جسے پری کرما کا نام دیا گیا، صحن مسجد میں اتر جانب ایک ہینڈ پائپ نصب کرلیا گیا، مسجد سے باہر پورب سمت ایک سفالہ پوش مندر اور مندر کے پجاری کے لئے ایک کمرہ تعمیر

کرلیا گیا دکھن جانب نام نہاد جنم استھان کے چبوترہ پر بھی ایک مندر بنالیا گیا اور مسجد کے درمیانی گنبد پر ایک بھگوا جھنڈا لگا دیا گیا یہ ساری تبدیلیاں ۱۹۶۷÷ اور ۱۹۸۶÷ کے درمیانی عرصہ میں کی گئیں مگر رسیور، انتظامیہ اور عدالت کی پیشانی پر شکن تک نہ آئی۔

﴿۴﴾

عدالت نے اقتدار کے دباؤ میں مسجد کے اندر مورتی پوجا کی غیر منصفانہ اجازت دیدی

مسلمانوں کو کسی حد تک اطمینان تھا کہ مسجد مقفل ہے اور ہائی کورٹ میں اس کے مقدمات کی سماعت ہورہی ہے، عدلیہ اس بارے میں جو فیصلہ کرے گی اسے تسلیم کرلیا جائے گا، کیونکہ عدلیہ پر ان کا اعتماد ابھی مجروح نہیں ہوا تھا، اسی پرامن ماحول میں ۲۵ / جنوری ۱۹۸۶÷ کو ''رمیش پانڈے'' ایک غیر متعلق شخص نے جو بابری مسجد سے متعلق کسی بھی مقدمہ میں فریق نہیں تھا صدر منصف فیض آباد کی عدالت میں یہ درخواست گذاری کہ

> ''جنم استھان میں پوجا پاٹ کی اجازت ہونی چاہئے اس لئے عدالت ضلع انتظامیہ کو حکم دے کہ جنم بھومی بابری مسجد کا تالا کھول دے تاکہ میں اور دوسرے ہندو بغیر کسی رکاوٹ کے پوجا کرسکیں۔''

صدر منصف نے یہ کہہ کر درخواست مسترد کردی کہ ''اس مقدمہ کی رہنما فائل ہائی کورٹ میں زیر سماعت ہے اس لئے اس درخواست پر کوئی فیصلہ نہیں کیا جاسکتا'' منصف کے اس فیصلہ کے خلاف مسٹر کے، ایم، پانڈے ڈسٹرکٹ جج کی عدالت میں ۳۰ / جنوری ۱۹۸۶÷ کو اپیل دائر کی گئی ڈسٹرکٹ جج نے یکم فروری ۱۹۸۶÷ کو پونے بارہ بجے یہ یکطرفہ فیصلہ سنادیا کہ ''ضلع انتظامیہ تالا کھول دے اور رمیش پانڈے و دیگر پجاریوں کو پوجا پاٹ کی عام اجازت دی جائے، اس میں کسی قسم کی رکاوٹ نہ ڈالی جائے، نیز ضلع انتظامیہ لا اینڈ آرڈر بحال رکھنے کے لئے مناسب کارروائی عمل میں لائے۔''

اس غیر عادلانہ فیصلے کے بعد بغیر کسی تاخیر کے ۵ر بجکر ۱۹ر منٹ پر بابری مسجد کا تالا کھول دیا گیا جو ۱۹۵۰ء میں حکم امتناعی کے نفاذ میں لگایا گیا تھا اور ہزاروں ہندو جو وہاں جمع کئے گئے تھے پوجا پاٹ کے لئے مسجد میں داخل ہوگئے، تالا کھولنے کی اس شرمناک تقریب کو ہمارے سیکولر ملک کے نشریاتی ادارہ ''دوردرشن'' نے بڑے اہتمام سے نشر کیا تاکہ مسلمانوں کے زخمی دلوں پر اچھی طرح سے نمک پاشی ہوجائے، علاوہ ازیں پورے ملک میں اس کا جشن منایا گیا اور یہ تاثر دینے کی کوشش کی گئی کہ مسلمانوں کو شکست دیدی گئی، اس کھلی ہوئی بے انصافی پر مسلمانوں کی طرف سے احتجاج کیا گیا تو رائفل کی گولیوں سے احتجاج کرنے والوں کو ہمیشہ کے لئے خاموش کردیا گیا، خاص طور پر بارہ بنکی، بنارس، بنگلور وغیرہ شہروں میں سرکاری پولیس نے مسلمانوں کے خلاف دردناک بہیمیت کا برتاؤ کیا، بعد میں یہ بات عام طور پر مشہور ہوگئی کہ سیکولرزم کی علمبردار کانگریس حکومت کے وزیراعلیٰ اترپردیش اور ایک مرکزی وزیر کے اشارے پر تالا کھولا گیا تھا، آئندہ کے واقعات ومشاہدات نے واضح کردیا کہ یہ شہرت بے بنیاد نہیں تھی۔

واقعہ بھی یہی ہے کہ بغیر مضبوط سیاسی پشت پناہی کے عدالت کو اس طرح سے قانون وانصاف کی دھجیاں اڑانے کی جرأت نہیں ہوسکتی تھی۔

﴿۵﴾

مسجد کو مسمار کرکے اسکی جگہ پر رام مندر بنانے کا مجرمانہ اعلان وسرگرمیاں

مسجد میں عام پوجاپاٹ کی اجازت حاصل ہوجانے سے ہندو احیاء پرستوں کے حوصلے بلند ہوگئے اور اب ایک قدم آگے بڑھا کر مسجد کو منہدم کرکے اس کی جگہ نیا مندر بنانے کی تشدد آمیز جدوجہد شروع کردی گئی، حکومتوں کے تجاہل اور دورخی پالیسی کی بنا پر انھیں مزید حوصلہ ملا، چنانچہ وشو ہندو پریشد کے سربراہ سنگھل نے دھمکی کی زبان میں یہ کھلا اعلان کیا کہ ۹ر نومبر ۱۹۸۹ء کو مندر کا شلانیاس (سنگِ بنیاد) ہوگا، اور ملک کی کسی سیاسی پارٹی کی یہ ہمت نہیں ہے کہ ہمارے اس پروگرام کو روک دے عام ہندوؤں کو ہم نوا بنانے

کی غرض سے پروگرام یوں ترتیب دیا گیا کہ ۳۰ رستمبر ۱۹۸۹ء سے ملک گیر شلا پوجن مہم شروع کی جائے جس کے تحت ملک بھر کے پانچ لاکھ پچھتّر ہزار گاؤں میں ایک ایک شلا (اینٹ) بھیج کر اس کا پوجن کرایا جائے اور دیواستھان اکادشی (۹ رنومبر) کے دن یہ ساری اینٹیں اجودھیا پہنچادی جائیں اور اسی دن رام مندر کا شلا نیاس کیا جائے، وشو ہندو پریشد وغیرہ جارحیت پسند تنظیمیں اپنے سربراہ کے اعلان کے مطابق شلا پوجن کے نام پر گاؤں گاؤں گھوم کر نفرت وتشدد کا زہر پھیلاتی رہیں اور ہماری سیکولر حکومتیں اپنی خاموشی سے ان کا تعاون کرتی رہیں تا آنکہ کانگریسی حکومت کے وزیر داخلہ نے متعینہ تاریخ یعنی ۹ رنومبر کو وشو ہندو پریشد کے ہاتھوں متنازعہ اراضی پر شلا نیاس کی اجازت دے کر مسلمانوں کو آگاہ کردیا کہ بابری مسجد کے انہدام اور مندر کی تعمیر کا وقت قریب آ گیا ہے، وزیر داخلہ نے اس سلسلہ میں حیرت ناک حد تک گمراہ کن رویہ اختیار کیا، ایک طرف تو وہ اعلان کرتے رہے کہ متنازعہ جگہ پر شلا نیاس کی اجازت نہیں دی جائے گی اور دوسری طرف اندر اندر وشو ہندو پریشد سے ساز باز بھی کرتے رہے، حکومت کی اس منافقانہ پالیسی نے فرقہ پرست تنظیموں کو اس قدر جری بنادیا کہ ۲۳ رجون ۱۹۹۰ء کو ہری دوار میں ہندو مذہبی لیڈروں نے ایک قدم اور آگے بڑھ کر طے کیا کہ اگست سے اکتوبر تک پورے ملک میں جگہ جگہ جلوس نکالے جائیں، گاؤں گاؤں سے مندر کی تعمیر کے لئے والنٹیر جمع کئے جائیں، اور ۳۰ را کتوبر کو مسجد کی جگہ پر رام مندر کی تعمیر کا کام شروع کردیا جائے، اس فیصلہ کو عملی جامہ پہنانے کے لئے آر، ایس ایس، بی، جے، پی، وشو ہندو پریشد، بجرنگ دل اور ان کی ہم نوا تمام فرقہ پرست پارٹیاں میدان میں نکل پڑیں، بھارتیہ جنتا پارٹی کے صدر لال کرشن اڈوانی نے سومناتھ سے اجودھیا تک کی رتھ یاترا شروع کی، اس رتھ یاترا میں انتہائی اشتعال انگیز اور دل خراش تقریریں کی گئیں، جس کے نتیجہ میں بڑودہ، بنگلور، کرناٹک، مدھیہ پردیش اور یوپی کے بعض اضلاع میں فساد کی آگ بھڑک اٹھی، لیکن حکومت وقت جس کی اولین واہم ترین ذمہ داری اپنے شہریوں کی جان ومال اور آبرو کی حفاظت ہے خود اپنی حفاظت کے بندوبست اور اپنی جان بچانے کی فکر میں مصروف رہی

اور جارحیت کا عفریت ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک گھوم کر آگ وخون کا طوفان برپا کرتا رہا بہرحال اعلان کے مطابق بھاری تعداد میں کارسیوک ۳۰؍اکتوبر ۱۹۹۰ء کو اجودھیا پہنچ گئے، اور بابری مسجد کو مسمار کرنے کی اپنی جیسی کوششیں بھی کیں، حتی کہ مسجد کے گنبدوں اور دیواروں کو مجروح بھی کر دیا، مگر وزیر اعلیٰ یوپی کے سخت رویہ کی وجہ سے انھیں اپنے مقصد میں کامیابی حاصل نہ ہوسکی حقیقت یہ ہے کہ اس موقع پر وزیر اعلیٰ ملائم سنگھ یادو نے قابل تعریف ہمت وجرأت کا ثبوت دیا اور اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر نہ صرف بابری مسجد کو بچالیا بلکہ سیکولر اور جمہوری قدروں کی آبرو رکھ لی رام بھگت اور کارسیوک کے نام سے اجودھیا میں اکٹھا بلوائی جب بابری مسجد کے انہدام میں ناکام ہوگئے تو انھوں نے اپنا غصہ مسلمانوں پر اتارا، اور پی، اے، سی کے تعاون سے ملک گیر فساد برپا کر دیا جس میں سینکڑوں مسلمان شہید کئے گئے اور ان کی کروڑوں کی جائیدادیں لوٹ لیں، یا نذر آتش کر دی گئیں، وی، پی سنگھ جنھوں نے بھاجپا کے اشتراک سے حکومت بنائی تھی اپنے اقتدار کو بچانے کی غرض سے منافقانہ پالیسی پر عمل پیرا رہے، لیکن ان کا یہ بزدلانہ رویہ ان کی کرسئ اقتدار کو نہ بچا سکا، نفرت کی آگ نے ملک کے امن کے ساتھ اسے بھی بھسم کر دیا۔

وی، پی سنگھ سرکار کے خاتمہ کے بعد چندر سیکھر نے زمام اقتدار سنبھالی انھوں نے اپنے عہد حکومت میں یہ کام کیا کہ وشوہندو پریشد اور اس کی حلیف پارٹیوں کو (جنھوں نے روز اول سے تشدد کی راہ اختیار کر کے نہ صرف مصالحانہ گفت وشنید کا دروازہ بند کر رکھا تھا بلکہ عدالت کے فیصلہ کو تسلیم کرنے کے لئے بھی تیار نہیں تھیں) بات چیت پر راضی کر لیا، چنانچہ ان کے اور ایکشن کمیٹی بابری مسجد کے لیڈروں کے درمیان براہ راست گفتگو کا سلسلہ شروع ہوا، فریقین نے اپنے اپنے دعویٰ کے ثبوت میں تحریری دلائل بھی فراہم کئے، گفتگو کا یہ سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا تھا کہ چندر سیکھر حکومت ہی ختم ہوگئی، بالآخر ملک میں الیکشن ہوا جس کے نتیجہ میں کلیان سنگھ کی زیر سرکردگی یوپی میں بھاجپا کی حکومت قائم ہوئی اور مرکز میں کانگریس نے سیکولرزم کی علامت نرسمہاراؤ کی قیادت میں حکومت بنائی۔

﴿۶﴾

بابری مسجد کی المناک شہادت

بھارتیہ جنتا پارٹی اپنی فرقہ پرست ذہنیت کی بنا پر ہمیشہ ہی سے بابری مسجد کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتی تھی اور اسے غلامی کی علامت قرار دیتی تھی، اب ریاست میں اس کی حکومت تھی اس لئے وہ اس مسجد کو کیونکر برداشت کرسکتی تھی، چنانچہ بھاجپائی وزیر اعلیٰ کلیان سنگھ نے وزارت سازی کے بعد جو اولین کام کیا وہ یہ تھا کہ اپنے وزیروں کو ساتھ لے کر اجودھیا آئے اور بابری مسجد میں نصب مورتی کے پاس کھڑے ہوکر یہ عہد کیا کہ ”رام للہ ہم آئیں گے مندر یہیں بنائیں گے“ اس عہد و پیمان کے بعد کلیان سنگھ حکومت نے قانون و انصاف کو نظر انداز کر کے رام مندر کی راہ میں حائل رکاوٹیں دور کرنے کی مہم شروع کردی، بابری مسجد سے ملحق موقوفہ متنازعہ اراضی کو اپنی تحویل میں لے لیا، پھر اسے وشو ہندو پرشید کے حوالہ کر دیا، جس پر مستحکم بنیادوں کے ساتھ پختہ چبوترہ کی تعمیر کا کام نہایت زور وشور کے ساتھ جاری ہوگیا، جبکہ ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے احکامات تھے کہ متنازعہ جگہ پر کسی قسم کی تعمیر نہ کی جائے، توہین عدالت کا ارتکاب کرتے ہوئے تعمیر ہوتی رہی اور مسلم لیڈران اس غیر قانونی اقدام پر مرکزی سرکار سے احتجاج کرتے رہے، لیکن مرکزی حکومت نے اس وقت تک کوئی مؤثر حرکت نہیں کی جب تک کہ وشو ہندو پریشد نے اپنے منصوبہ کی تکمیل نہ کرلی۔

چبوترہ کی تعمیر کے بعد وزیر اعظم نے فریقین کے درمیان ازسرنو مذاکرات کا سلسلہ شروع کرایا جس کے دو دور حکومت کے ترجمان کے بقول اطمینان بخش اور امید افزا رہے، تیسرے دور کا آغاز ہونے والا ہی تھا کہ اچانک حیرتناک انداز میں وشو ہندو پریشد نے یکطرفہ اعلان کر دیا کہ ۶/دسمبر ۱۹۹۱÷ کو کارسیوا ہوگی، ظاہر ہے کہ اس اعلان کے بعد گفت وشنید کی کیا گنجائش تھی، اس لئے یہ سلسلہ ختم ہوگیا، کارسیوا کے اعلان ہوتے ہی ساری فرقہ پرست تنظیمیں حرکت میں آگئیں۔ بھاجپا کے سابق اور موجودہ صدر اڈوانی اور جوشی یاترا

پر نکل پڑے، تخریب کار عناصر کارسیوک کے نام پر اجودھیا میں جمع ہونے لگے اور دیکھتے دیکھتے سارے ملک کا ماحول کشیدہ وسراسیمہ ہوگیا۔

یوپی کے وزیر اعلیٰ کلیان سنگھ نے عدالت اور مرکزی حکومت کو حلفیہ اطمینان دلایا کہ کارسیوا صرف علامتی ہوگی، عدالت اور مرکزی حکومت کے حکم کی سرمو خلاف ورزی نہیں ہوگی، مرکزی وزیر داخلہ قوم کو اطمینان دلاتے رہے کہ بابری مسجد کی حفاظت کا پورا منصوبہ مرتب کرلیا گیا ہے، سیکولر نواز وزیر اعظم ہند بھی اعلان پر اعلان کرتے رہے کہ بابری مسجد کی حفاظت حکومت کی ذمہ داری ہے مرکز سے- اچھی خاصی تعداد میں فوج بھی اجودھیا پہنچ گئی مگر اسے نامعلوم مصالح کی بنیاد پر بابری مسجد سے دو ڈھائی کلومیٹر دور رکھا گیا، صوبہ اور مرکز کے نیم فوجی دستے مسجد کی حفاظت کے لئے اس کے چاروں سمت میں متعین کئے گئی مگر انھیں وزیر اعظم کی سخت ہدایت تھی کہ رام بھگتوں پر کسی حال میں بھی گولی نہ چلائی جائے۔

بہرحال ان سارے اعلانات وانتظامات کے سائے میں ۶/دسمبر کی وحشتناک تاریخ آگئی، ایڈوانی، سنگھل، ونے کٹیار، اوما بھارتی وغیرہ دولاکھ کارسیوکوں کی فوج لئے اجودھیا کے میدان میں پہلے ہی سے موجود تھے، ان لیڈروں کی رہنمائی میں کارسیوا شروع ہوئی اور تشدد پر آمادہ تربیت یافتہ کارسیوکوں نے گیارہ بج کر پچپن منٹ پر بابری مسجد پر دھاوا بول دیا اور بغیر کسی مزاحمت کے پورے اطمینان سے چار بجے تک اسے توڑتے اور ملبہ کو دور پھینکتے رہے یہاں تک کہ صفحۂ زمین سے بابری مسجد کا نام ونشان ختم کردیا گیا۔

وزیر داخلہ اور وزیر اعظم کو ایک ایک منٹ کی خبر پہنچتی رہی مگر نہ مسجد کی حفاظت کا مرتبہ منصوبہ روبہ عمل آیا اور نہ ہی اس کی حفاظت کی ذمہ داری کا فریضہ ادا کیا گیا، اس طرح ۲۲/۲۳/دسمبر ۱۹۴۹÷ کو بابری مسجد کے خلاف جو تحریک شروع کی گئی تھی، ۶/دسمبر ۱۹۹۱÷ کو سیکولرزم وجمہوریت کے زیر سایہ تکمیل کو پہنچ گئی۔

وزیر اعلیٰ کلیان سنگھ کا منصوبہ چونکہ پورا ہوچکا تھا اس لئے وہ حکومت سے دست بردار ہوگئے، نظم ونسق کی ذمہ داری مرکز کے سر آگئی، صدر راج کا نفاذ ہوگیا، اس کے

باوجود تقریباً ۴۸ گھنٹے تک اجودھیا مکمل طور پر کارسیوکوں کے تصرف میں رہا جنھوں نے اجودھیا کی دیگر بہت ساری مسجدوں کو بھی بالکل مسمار کردیا یا توڑ پھوڑ کر اپنے خیال میں ناقابل استعمال بنادیا، اور اجودھیا میں آباد مسلم گھرانوں کو تہس نہس کرڈالا، اسی وقفہ میں بابری مسجد کی جگہ پر ایک گھروندا بناکر مورتی نصب کردی جس کی پوجا پاٹ بھی شروع کردی گئی، رام بھگت جب اپنی رام بھگتی کے سارے کاموں سے باطمینان فارغ ہوگئے تو مرکزی سرکار کے انتظام میں سرکاری سواریوں کے ذریعہ باعزت طور پر انھیں ان کے ٹھکانوں تک پہنچادیا گیا۔

مسلمانوں کے مذہبی ناموس پر یہ ایسا حملہ تھا جس کی کرب ناکی سے بے چین اور مضطرب ہوکر وہ چیخ اٹھے تو مظلوموں کی یہ بیتابانہ آہ بھی ہماری سیکولر حکومتوں کو گوارہ نہیں ہوئی جس کی سزا میں ہزاروں مسلمانوں کو خون کی موجوں اور آگ کی لہروں میں غرق کردیا گیا، آج وہ کون سی ریاست ہے جو مظلوم مسلمانوں کے خون سے لہولہان نہیں ہے، وہ کون سا شہر ہے جس کی فضا یتیموں کی گریہ وزاری، بیواؤں کے نالۂ وشیون اور غمزدہ ماؤں کی آہ سرد سے کربناک نہیں ہے، جمہوریت اور سیکولرزم کے دعویدار ملک اور ایک سیکولر پارٹی کی حکومت میں اس جماعت پر یہ انسانیت سوز مظالم جس نے ملک کی آزادی میں بے لوث قربانیاں دی ہیں کس قدر شرمناک بات ہے، آخر مسلمان اس ملک کی قربان گاہ پر کب تک بھینٹ چڑھتا رہے گا۔

تجھ کو کتنوں کا لہو چاہیئے اے ارض وطن جو ترے عارض بے رنگ کو گلنار کریں
کتنی آہوں سے کلیجہ ترا ٹھنڈا ہوگا کتنے آنسو ترے صحراؤں کو گلزار کریں

سب کچھ لٹ جانے کے بعد وزیر داخلہ ہند صاحب بیان دیتے ہیں کہ مسلمانوں کی پوری حفاظت کی جائے گی اور انھیں مکمل انصاف ملے گا، وزیر اعظم نے بھی اعلان کیا کہ بابری مسجد دوبارہ تعمیر کرائی جائے گی، مگر اس اعلان پر ایک ہفتہ بھی نہیں گذرا تھا کہ بمبئی میں مسلمانوں پر شیوسینا کے خونخوار درندے ٹوٹ پڑے، سیکڑوں مسلمان ان کے ہاتھوں ہلاک ہوگئے، اربوں کھربوں کی ان کی املاک لوٹ لی گئیں یا نذرِ آتش کردی گئیں، شیوسینا

کے یہ درندے عروس البلاد میں درندگی مچاتے گھومتے رہے اور ہماری حکومت دم سادھے بیٹھی رہی، جب مسلمانوں کا خون پیتے پیتے ان درندوں کا جی بھر گیا تب جا کر بہیمیت کا یہ رقص ختم ہوا، رہا بابری مسجد کی تعمیر کا مسئلہ، تو جو حکومت قدیم عمارت کی حفاظت نہ کر سکی اس سے جدید تعمیر کی توقع رکھنی خود اپنے آپ کو دھوکہ دینا ہے۔

اس وقت تو حکومت تذبذب کا شکار ہے ایک طرف قانون وانصاف کے تقاضے ہیں تو دوسری طرف ووٹ اور کرسئ اقتدار کا مسئلہ ہے، اس لئے گھبراہٹ میں کبھی آرڈی ننس کا سہارا لے رہی ہے تو کبھی عدالت کی پناہ تلاش کرتی ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے نینی سنٹرل جیل میں بغاوت کے مقدمہ میں اپنا جو تحریری بیان دیا تھا اس کے درج ذیل اقتباس کو تاریخ کے حوالہ کے بغیر پڑھئے، اس کی ایک ایک سطر میں حالات حاضرہ کی عکاسی نظر آئے گی، مولانا آزاد اپنے بیان کے ایک پیراگراف میں لکھتے ہیں:

> ”یہ پریشانی گورنمنٹ کو خود اسی کی منافقانہ روش کی وجہ سے پیش آرہی ہے ایک طرف وہ چاہتی ہے کہ شخصی حکمرانوں کی طرح بے دریغ جبر وتشدد کرے، دوسری طرف چاہتی ہے کہ نمائش قانون وعدالت کی آڑ بھی قائم رہے، یہ دونوں باتیں متضاد ہیں، ایک جگہ جمع نہیں ہوسکتیں نتیجہ یہ ہے کہ اس کی پریشانی ودرماندگی روز بروز بڑھتی جارہی ہے۔
>
> میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے کہ آدمی اپنے تمام کپڑے اتار ڈالے اس لئے کہ شریف آدمی آنکھیں بند کر لیں گے، شریف آدمیوں نے سچ مچ آنکھیں بند کر لی ہیں لیکن دنیا کی آنکھیں بند نہیں ہیں، فی الحقیقت ”لا“ اور ”آرڈر“ کا ایک ڈرامہ کھیلا جارہا ہے جسے ہم کامیڈی اور ٹریجڈی دونوں کہہ سکتے ہیں وہ تماشا کی طرح مضحک بھی ہے اور مقتل کی طرح دردانگیز بھی، لیکن میں ٹریجڈی کہنا زیادہ پسند کروں گا۔“

بابری مسجد کی تاریخ کے ساتویں مرحلے کا انتظار کیجئے دیکھئے یہ کب معرض وجود میں آتا ہے۔ ”لعَلّ الله يحدث بعد ذٰلك امرًا“

نظامِ امارت فی الہند کی مختصر تاریخ

احیاء دین، اعلاء کلمۃ اللہ اور خدا کی زمین پر خدا ہی کے احکام وفرمان کے نفاذ واجراء کے لئے نظام امارت وتنظیم جماعت کی ضرورت واہمیت کو ہمارے اسلاف نے کبھی بھی فراموش نہیں کیا۔ بلکہ حالات نے جب بھی اجازت دی حسب استطاعت اس اہم ترین ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کی مخلصانہ جدوجہد کی ہے۔ اور احوال وظروف کے مطابق بتوفیق ایزدی مکی ومدنی دونوں عہد کی سنتوں کو زندہ کر دکھایا ہے۔ آئندہ صفحات میں اکابر رحمہم اللہ کی اسی انقلابی جدوجہد کی مختصر تاریخ پیش کی جارہی ہے۔ انشاء اللہ اس کے مطالعہ سے شبہات کے پردے ہٹیں گے۔ خدشات کے زخم مندمل ہوں گے مسافران منزل کو حوصلہ ملے گا۔ اور اس راہ کی صعوبتوں کے تصور نے جن کی ہمتیں پست کردی ہیں۔ ان میں بھی قدم سے قدم ملا کر چلنے کی ہمت پیدا ہوگی۔

(۱) امارتِ شرعیہ کی تاسیس

قیام امارت کی ضرورت علمائے اسلام نے اسی وقت محسوس کرلی تھی جبکہ ہندوستان کی مسلم حکومت کا چراغ مفلس کے دیئے کی طرح ٹمٹمانے لگا تھا۔ چنانچہ اس عہد کے جماعتِ علماء کے سربراہ اور خاندانِ ولی اللّٰہی کے چشم وچراغ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کا فتویٰ دارالحرب وقیامِ امارت اسی احساس کا جرأت مندانہ اظہار تھا۔ اور اس فتویٰ کو غیر منقسم ہندوستان میں پہلی بار جس جماعت نے عملی جامہ پہنانے کا بیڑا اٹھایا وہ بھی حضرت شاہ صاحب ہی کی ساختہ پرداختہ تھی۔ یعنی حضرت سید احمد شہید بریلویؒ اور آپ کے رفقاء کار۔ اس اجمال کی تفصیل جناب غلام رسول مہر کی زبانی سنئے۔ مہر صاحب لکھتے ہیں۔

''سید صاحب سرحد تشریف لائے تھے تو آپ کو یقین ہوگا کہ شرع شریف کے احکام کی پابندی اور اسلامیت پر فدا کاری میں اہل سرحد مسلمانان ہند سے فائق و برتر ہونگے، لیکن یہاں پہنچ کر دو برس تک ایک ایک طبقے کے احوال و مراسم دیکھ چکنے کے بعد معلوم ہوا کہ ان لوگوں کا اسلام بھی رسمی ہے اور واقعہ بھی یہی تھا کہ اس وقت اہل سرحد کی زندگی جاہلیت کے الواث سے آلودہ تھی لہٰذا یہ فیصلہ کیا گیا کہ سروسامان جہاد کے ساتھ ساتھ انھیں اسلامیت کا پابند بنایا جائے۔ چنانچہ یہ طے پایا کہ جہاد کی بیعت کے ساتھ ساتھ سب سے اقامتِ شریعت کی بیعت بھی لی جائے پٹھانوں کی اصلاح و تنظیم کے سلسلے میں یہ دوسرا قدم تھا۔

چنانچہ فیصلہ کے مطابق کام کا آغاز کردیا گیا اور منفرد ہزاروں آدمیوں نے سید صاحب کی اس دعوت کو قبول کرلیا لیکن اصل غرض انفرادی قبول و پزیرائی سے پوری نہیں ہوسکتی تھی ضروری تھا کہ ایک ہمہ گیر نظام پیدا کیا جائے۔ اس مقصد کیلئے علماء و اکابر کا اجتماع ضروری تھا۔ اس اجتماع کیلئے موزوں مقام پنجتار سمجھا گیا۔ چنانچہ سید صاحب اپنی جماعت کے ساتھ رئیس پنجتار فتح خاں کی دعوت پر وہاں پہنچے اور پہنچتے ہی بیعت شریعت کیلئے دعوت عام کا سلسلہ شروع کردیا اس سلسلے میں آپ مختلف بستیوں اور قبیلوں میں دورے فرماتے اور علماء و اکابر کو جمع کرکے پابندیٔ احکام اسلام کی ہدایت کرتے، دوروں اور وعظ و نصیحت کے ذریعہ سے قبول عام کا جذبہ بیدار ہوگیا تو فیصلہ ہوا کہ پنجتار میں اجتماع عظیم منعقد کیا جائے۔ جس میں سرحد کے ہر حصے سے علماء و خوانین شریک ہوں یکم شعبان ۱۲۴۴ھ (۶ر فروری ۱۸۲۹ء) کی تاریخ اور جمعہ کا دن اس اجتماع کیلئے تجویز ہوا۔ خوانین و اکابر کے علاوہ دو ہزار کے قریب علماء اس موقع پر آئے۔ اتنے ہی ان کے تلامذہ تھے (بعض مکاتیب میں ہے قریب ہزار علماء و طلبہ) اس اجتماع میں سید صاحب نے ایک افتتاحی تقریر فرمائی۔ جس کے آخر میں پنجتار کو مخاطب کرکے فرمایا کہ اگر آپ ہماری بات ماننا چاہتے ہیں تو اسی مجمع میں مان لیجئے ورنہ اتحاد کا رشتہ کٹ جائے گا میں خدائے عزوجل کا ایک عاجز بندہ ہوں۔ میری خواہش اس کے سوا کچھ نہیں۔ کہ سب لوگ احکام الٰہی کے فرمانبردار بن جائیں۔

تقریر پوری کر کے سید صاحب خود مجمع میں سے اٹھ گئے۔ علماء آپس میں مشورے کرتے رہے آخراس فیصلے پر پہنچے کہ ’’نظام شرعی کا قیام‘‘ لازم ہے۔ نماز جمعہ کے بعد سب نے سید صاحب کے ہاتھ پر ’’اقامت شریعت‘‘ کے لئے بیعت کی۔

استفتاء اور اس کا جواب

بیعت کے بعد ایک استفتاء علماء کی خدمت میں پیش کیا گیا جس کا مضمون یہ تھا کہ ’’اگر کوئی شخص امام کی بیعت کرنے اور اس کی اطاعت اپنے اوپر لازم کر لینے کے بعد خدمت دین اور اجرائے شرع مبین کے سلسلے میں امام کے کسی حکم کو رد کر دے اور مخالفت پر کمر بستہ ہو جائے؛ بلکہ جدال و قتال میں بھی شامل نہ ہو تو اس کے اور اس کے ساتھیوں کے متعلق شریعت کا فیصلہ کیا ہے؟

علماء نے غور و فکر کے بعد اس کا مفصل جواب مرتب کیا اسکے مطالب کا خلاصہ یہ تھا۔

۱- اثبات امامت کے بعد حکم امام سے سرتابی سخت گناہ اور قبیح جرم ہے۔

۲- مخالفوں کی سرکشی اگر اس پیمانے پر پہنچ جائے کہ قتال کے بغیر اس کا استیصال ممکن نہ رہے تو تمام مسلمانوں پر فرض ہو جاتا ہے کہ ان مخالفوں کی تادیب کے لئے تلواریں نکالیں اور امام کے حکم کو بزور مخالفوں پر نافذ کریں۔

۳- اس معرکے میں لشکر امام سے جو شخص قتل ہوگا وہ شہید سمجھا جائے گا اور لشکر مخالف کے مقتولین مردود و ناری متصور ہوں گے۔

اس فتوے پر علماء سرحد میں سے پچیس افراد کے دستخط تھے۔ (جن کے نام سیرت احمد شہید میں مرقوم ہیں)

اصلاح عام

غالباً ۱۵ ر شعبان ۱۲۴۴ھ کو جمعہ کے دن (۲۰ ر فروری ۱۸۲۹ء) پھر ایک اجتماع ہوا جو فتح خاں رئیس پنجتار کے قبیلے کے افراد پر مشتمل تھا۔ خان نے ان سب کو بیعت کی ترغیب دی

اور انھوں نے بطیب خاطر نظام اسلامی کی پابندی قبول کر لی پھر مختلف علاقوں کیلئے سید صاحب نے قاضی مقرر فرما دیئے۔ مولوی سید محمد حبان کو قاضی القضاۃ بنایا گیا۔ ملا قطب الدین ننگرہاری کو احتساب کا کام سونپا گیا۔ اور تیس تفنگچی ان کے ساتھ مقرر کئے گئے وہ قریہ قریہ اور دیہ دیہ دورہ کرتے رہے۔ جہاں کوئی امر خلاف شرع پاتے اس کا انسداد کرتے۔

نظامِ امارت کا اثر

راویوں کا بیان ہے کہ تھوڑی ہی مدت میں پورے علاقے کی کایا پلٹ گئی۔ تمام لوگوں نے شریعت کی پابندی اختیار کر لی پٹہ داریاں ٹوٹ گئیں۔ مقدمات کے فیصلے شریعت کے مطابق ہونے لگے۔ اگر ملا قطب الدین کے آدمی دوسرے کام کے سلسلے میں بھی کسی گاؤں میں جاتے تو گاؤں والے دوڑے ہوئے آتے اور بتاتے کہ یہاں کوئی بے نمازی نہیں رہا۔

ایک سوال

کیا بیعت اقامتِ شریعت کے بعد سید صاحب کے اختیارات فرمانروائی میں کوئی اضافہ ہوا؟ اس کا جواب نفی میں ہے۔ بیعت اقامت نے سید صاحب کو نظم قوائے جہاد کا مجاز بنایا تھا۔ بیعت اقامت شریعت کی رُو سے وہ اجرائے احکام شرعی کا مرکز بن گئے۔ رؤسا و خوانین پر صرف اس حد تک پابندیاں عائد ہوئیں جو از روئے شریعت حقہ ضروری تھیں لیکن ان کی ریاستیں اور سرداریاں بدستور قائم رہیں (سیرت احمد شہید ج ۲ ص ۸۳ تا ۸۷ و سید احمد شہید ج ۲ ص از ۵۵ تا ۶۵)

ضروری تنبیہ

یہ بات ذہن نشین رہے کہ یہ بیعت شریعت، بیعت جہاد سے الگ ہے۔ چنانچہ غلام رسول مہر صاحب نے بھی اس پر تنبیہ کی ہے۔ وہ بیعت جہاد کی بحث کو ختم کر کے حاشیہ

پر لکھتے ہیں ’’یہاں یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ بعض سوانح نگاروں نے بیعت امامت جہاد اور بیعت اقامت شریعت کو مخلوط کر دیا ہے۔ حالانکہ دونوں بیعتیں الگ الگ موقعوں پر ہوتی تھیں۔ اور ان میں کم و بیش دو سال دو مہینے کا فصل ہے۔ (ایضاً ج ا ص ۳۸۰)

(۲) نظامِ امارت کی دوبارہ تاسیس

حضرت امام سید احمد شہید کے واقعہ شہادت (۲۴/ ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ) کے بعد باقی ماندہ مجاہدین نے شیخ ولی محمد صاحب پھلتی کو (جو امام شہید کے مخصوص احباب میں تھے) اپنا امیر بنالیا پھر ۱۲۵۰ھ میں جب شیخ نصیر الدین دہلوی داماد حضرت شاہ محمد اسحاق دہلوی (حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے مرشد اوّل) ہجرت مجاہدین کے مرکز استھانہ پہنچے تو تمام مجاہدین نے ان کے ہاتھ پر بیعت جہاد کی اور انھیں اپنا امیر منتخب کرلیا۔ لیکن مجاہدین کی جماعت میں حضرت امام شہید کی غیبت و رجعت کے جدید نظریہ کی وجہ سے اجتماعیت قائم نہ رہ سکی اور جماعت دو حصوں میں تقسیم ہوگئی۔ شیخ نصیر الدین دہلویؒ نے اگرچہ ان کے انتشار و اختلاف کو دور کرنے کی بہت کوشش کی مگر انھیں کامیابی حاصل نہ ہوسکی جس کی بناء پر اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے جدوجہد کا وہ سلسلہ جسے امام شہید نے جاری فرمایا تھا اور ان کی شہادت کے بعد منقطع ہوگیا تھا۔ دوبارہ شروع نہ ہوسکا۔ مجاہدین کے اسی انتشار کے زمانہ میں مولانا نصیر الدین دہلوی کا ۱۲۵۶ھ میں انتقال ہوگیا۔ ان کے بعد مجاہدین کی قیادت و سیادت کی ذمہ داری مولانا ولایت علی صادق پوری نے سنبھالی۔ چونکہ نظریۂ غیبت و رجعت کے مولانا زبردست حامی اور موئد تھے اور عقیدہ کی رُو سے امام شہید کے ظہور کے بعد انھیں کی معیت میں جہاد کیا جاسکتا تھا۔ اس لئے ان کے عہد امارت میں بھی حضرت امام شہید کے عظیم مقصد کو بروئے کار لانے کے سلسلے میں کوئی پیش رفت نہ ہوسکی۔

حضرت شاہ محمد اسحاق دہلوی جو ہندوستان سے ہجرت کر کے حجاز چلے گئے تھے انھیں ہندوستان میں دوبارہ اس بابرکت جدوجہد کو دوبارہ شروع کئے جانے کی بڑی تمنا تھی۔ اور اس کی تدبیروں پر اکثر غور و فکر کرتے رہتے تھے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب

سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی بغرض حج وزیارت حرمین شریفین پہنچے اور تقریباً دوسال اس ارض مقدس میں مقیم رہے۔ اس سفر میں حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب کی مجلس میں حاضری اور ان سے استفادہ کا خوب خوب موقع ملا۔ چنانچہ حضرت شاہ صاحب نے انھیں جوہر قابل پاکر ان کی تربیت کی جانب خصوصی توجہ فرمائی اور ہندوستان میں انقلابی جدوجہد کی ہدایات دے کر واپس بھیجا چنانچہ حضرت حاجی صاحب نے انھیں خطوط پر جن کی ہدایات ''شاہ صاحب'' نے فرمائی تھیں ہندوستان آکر استاذ الکل مولانا مملوک علی، مولانا مظفر حسین کاندھلوی، مولانا احمد علی سہارنپوری، مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی وغیرہ کے اشتراک وتعاون کے ساتھ کام شروع کردیا۔

(ماخوذ از التمهيد لتعرف ائمة التجديد۔ تالیف مولانا عبید اللہ سندھی ص۷۳، ۷۴، ۷۵)

بالآخر ۱۲۷۴ھ / ۱۸۵۷ء میں جب کہ برطانوی سامراج کے ظلم وتشدد کے خلاف برسوں کی سلگتی ہوئی آگ لاوابن کر پھوٹ پڑی تو ان قافلۂ ولی اللّٰہی کے مسافروں نے جو سالوں سے سامانِ سفر کی تیاریوں میں لگے ہوئے تھے تھانہ بھون کی ایک مسجد میں بیٹھ کر طے کیا کہ اب وقت آگیا ہے کہ ''زمین اللہ کی، حکومت بادشاہ کی اور حکم انگریز بہادر کا کے بالمقابل یہ اعلان کیا جائے کہ، زمین اللہ کی، حکومت اللہ کی اور حکم اللہ کا، ظاہر ہے یہ اعلان کوئی معمولی اعلان نہیں تھا بلکہ ایک ایسی جابر وقاہر حکومت کے خلاف اعلانِ جنگ تھا جس کی وسیع سلطنت میں سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔ اس لئے ضرورت تھی کہ اس مسئلہ پر خوب غور وفکر کرنے کے بعد ایک تنظیم کے تحت یہ انقلابی قدم اٹھایا جائے۔ مزید غور وفکر کی اس لئے بھی ضرورت تھی کہ اپنی ہی جماعت کے ایک بزرگ حضرت مولانا شیخ محمد تھانوی رحمۃ اللہ علیہ بحالتِ موجودہ اس اقدام کے شدید مخالف تھے۔ تھانہ بھون کی اسی مسجد میں ایک بار پھر مجلس شوریٰ کے ارکان سر جوڑ کر بیٹھے۔ اس مجلس شوریٰ کا انعقاد کس تاریخ کو ہوا۔ ارباب حل وعقد میں سے کتنے حضرات اس میں شریک ہوئے۔ ان تفصیلات سے تاریخ کا دامن خالی ہے۔

حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی قدس سرہ کے بیان سے صرف دَرج ذیل اکابر کے

ناموں کا پتہ چلتا ہے۔

(۱) حضرت حاجی امداد اللہ صاحب، (۲) حضرت حافظ ضامن شہید صاحب (۳) حضرت مولانا شیخ محمد صاحب (۴) حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی صاحب (۵) حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی صاحب۔ اوّل الذکر تین اکابر تو تھانہ بھون ہی میں پہلے ہی سے موجود تھے۔ البتہ آخرالذکر ہر دو بزرگوں کو ان کے گھروں سے بلایا گیا تھا۔ اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آگے کی کارروائی کی تفصیل خود حضرت مدنی قدس سرہ ہی کی زبانی سنی جائے کیونکہ اس سلسلۃ الذہب کی آخری کڑی آپ کی قدآور شخصیت تھی۔ اس لئے ان سے زیادہ صحیح رپورٹ کون دے سکتا ہے۔ حضرت مدنی تحریر فرماتے ہیں۔

مجلس شوریٰ کی رُودَاد

جب ہر دو حضرات (مولانا نانوتوی و مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہما) پہنچ گئے تو ایک اجتماع میں اس مسئلہ پر گفتگو ہوئی۔ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے نہایت ادب سے مولانا شیخ محمد صاحب سے پوچھا (چونکہ وہ چچا پیر تھے اس لئے ہمیشہ ان کا ادب کیا جاتا تھا) حضرت کیا وجہ ہے کہ دشمنانِ دین و وطن پر جہاد کو فرض بلکہ جائز بھی نہیں فرماتے تو انھوں نے جواب دیا کہ ہمارے پاس اسلحہ اور آلات جہاد نہیں ہیں، ہم بالکل بے سروسامان ہیں مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے عرض کیا اتنا بھی سامان نہیں ہے جتنا کہ غزوۂ بدر میں تھا۔ اس پر مولانا شیخ محمد صاحب مرحوم نے سکوت فرمایا۔ اس پر حافظ ضامن (شہید) صاحب نے فرمایا کہ بس مولانا سمجھ میں آ گیا اور پھر جہاد کی تیاری شروع ہوگئی اور اعلان کر دیا گیا۔

حضرت حاجی صاحب کی امارت پر بیعت اور تنظیم کی تشکیل

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو امام مقرر کیا گیا۔ اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کو سپہ سالار افواج قرار دیا گیا۔ اور حضرت مولانا

رشید احمد گنگوہی کو قاضی بنایا گیا اور مولانا محمد منیر صاحب نانوتوی اور حضرت حافظ ضامن صاحب تھانویؒ کو میمنہ و میسرہ (فوج کے دائیں و بائیں بازو) کا افسر قرار دیا گیا۔

عام مسلمانوں کی اطاعت گزاری

چونکہ اطراف و جوانب میں مذکورہ بالا حضرات کے علم و تقویٰ (تصوف اور تشرع) کا بہت زیادہ شہرہ تھا ان حضرات کے اخلاص اور للّٰہیت سے لوگ بہت زیادہ متاثر تھے، ہمیشہ سے ان کی دین داری اور خدا ترسی دیکھتے رہے تھے اس لئے بہت تھوڑی مدت میں جوق جوق لوگوں کا اجتماع ہونے لگا۔ مجاہدین ہزاروں کی تعداد میں جمع ہو گئے تھانہ بھون اور اطراف میں اسلامی حکومت قائم کر لی گئی اور انگریزوں کے ماتحت حکام نکال دیئے گئے۔ (نقش حیات ج۲ ص۴۲،۴۳)

اس نظام امارت کا ذکر مولانا عاشق الٰہی میرٹھیؒ نے تذکرۃ الرشید میں کیا ہے مگر تذکرۃ الرشید ایسے زمانہ میں ترتیب دی گئی ہے جب کہ واقعہ کو اس کے اصلی رنگ میں بیان نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس لئے مولانا میرٹھی نے اجمال و توریہ سے کام لیا ہے۔ ضرورت تھی کہ بعد کے ایڈیشنوں میں بات وضاحت کے ساتھ حاشیہ ہی میں صحیح بیان کر دی جاتی مگر ناشروں کی سہل انگاری سے ایسا نہ ہو سکا۔ ظاہر ہے کہ اس مجمل اور تلمیح و توریہ کے پردے میں کہی گئی بات کو ماخذ نہیں بنایا جا سکتا۔

مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے بھی سوانح قاسمی بروایت حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب اس کا تفصیلی تذکرہ لکھا ہے۔ حضرت شیخ الاسلام اور حضرت قاری صاحب کے بیانات میں جزوی اختلاف پایا جاتا ہے۔ ہم نے حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ کے بیان کو ترجیح دی ہے۔

مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے اپنی مشہور تصنیف التمہید کے صفحہ ۹۷ پر لکھا ہے کہ حضرت شیخ الہند نے اس واقعہ کو تفصیل کے ساتھ مجھ سے بیان کیا تھا مگر حضرت شیخ الہند نے کیا تفصیلات بیان کی تھیں۔ مولانا سندھیؒ اس سے بالکل خاموش۔ کاش کہ مولانا ان تفصیلات

کو بیان کردیتے تو ممکن تھا کہ اس واقعہ سے متعلق کچھ مزید باتیں منصۂ شہود پر آجاتیں۔

بادشاہ دہلی کی گرفتاری اور مجاہدین حریت کی ناکامی کے بعد اس نظام امارت کا شیرازہ بھی منتشر ہوگیا۔ جس کی تفصیلات مذکورہ بالا کتابوں بالخصوص نقشِ حیات میں دیکھی جاسکتی ہیں۔

(۳) تنظیم ملت کی تیسری کوشش

اس ناکامی کے بعد اگرچہ حضرت شیخ الہند اپنے پورے عہد میں ''ثمرۃ الترتیب، جمعیۃ الانصار، نظارۃ المعارف اور ریشمی رومال تحریک کے ذریعہ اسی متاعِ گم شدہ کی بازیافت میں کوشاں رہے۔ لیکن ۱۸۵۷÷ کی تحریک کا ردّ عمل اتنا سنگین تھا کہ اس دور میں دین ومذہب کے نام پر کسی تنظیم کی تشکیل تو دور کی بات ہے۔ زبان پر اس کا نام لانا بھی جُرم عظیم تھا۔ اس لئے باقاعدہ طور پر نظامِ امارت کا قیام تو اس زمانہ میں نہیں ہوسکا۔ پھر بھی حضرت شیخ الہند اپنے مخصوص اور معتمد تلامذہ اور متوسلین سے خفیہ طور پر احیاءِ دین کے لئے جدوجہد پر بیعت لیتے رہتے تھے۔ بانئ تبلیغی جماعت حضرت مولانا محمد الیاس صاحب کاندھلویؒ بھی انھیں معتمد تلامذہ کی فہرست میں شامل تھے جن سے یہ معاہدۂ شرعی ہوا تھا (مولانا محمد الیاس اور ان کی دینی دعوت) لیکن آہستہ آہستہ جب شکوک وشبہات کے بادل کچھ چھٹے یا بالفاظ دیگر جب مجاہدین حریت کے پے درپے حملوں سے برطانوی سامراج کی قوت میں اضمحلال پیدا ہوگیا اور اسیران ظلم وستم کو کسی حد تک امن واطمینان کی فضا میں سانس لینے کا موقع نصیب ہوا تو ۶۳ سال کے طویل عرصے کے بعد ۱۹۲۰÷ میں اسی بوڑھے مجاہد (جسے درازئ عمر، کثرتِ امراض اور مالٹا کی تقریباً تین سالہ قید وبند کی صعوبتوں نے چارپائی پر لٹادیا تھا۔ لیکن اس کے حوصلے جوان اور عزائم بلند تھے) کی یہ آواز ہمارے کانوں میں گونجتی ہے، میری چارپائی کو اٹھا کر جلسہ گاہ لے چلو۔ پہلا شخص میں ہوں گا جو اس امیر کے ہاتھ پر بیعت کرے گا۔ لیکن بُرا ہو ہم عصری کی چشمک اور منافست کا کہ غیروں نے نہیں بلکہ خود اپنوں نے اس صدائے حیات افزا کو سنی ان سنی کردیا۔

حضرت سحبان الہند مولانا احمد سعید دہلویؒ نے اپنی ایک تحریر میں اسی تلخ حقیقت کا اظہار کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

> ’’اگر علماء میں مداہنت و منافست نہ ہوتی اور صوفیاء میں ارباباً من دون اللہ بننے کا شوق نہ ہوتا تو آج تمام ہندوستان ایک شرعی امیر کے تحت زندگی بسر کر رہا ہوتا۔ اور اسلام کی حقیقی برکات سے متمتع ہوتا۔ ان کی روح حکومت کی غلامی سے آزاد ہوتی اگرچہ جسم غلامی میں مقید ہوتا۔‘‘ (حیات سجاد ص ۱۰۷)

قصہ مختصر جب جمعیۃ علماء کے دوسرے اجلاس میں حضرت شیخ الہند جیسی عظیم و ہمہ گیر شخصیت کی موجودگی اور ان کی شدید خواہش کے باوجود علمائے ذی مراتب امیر الہند کے انتخاب پر آمادہ نہیں ہوئے۔ تو مولانا ابوالمحاسن نے اپنی بصیرت سے اسی وقت بھانپ لیا کہ امیر الہند کا مسئلہ جل طے ہونے والا نہیں ہے۔ اس لئے انھوں نے صوبائی پیمانے پر نظامِ امارت قائم کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اور اپنے صوبہ بہار میں اس کی داغ بیل ڈالنے کی مہم شروع کر دی۔ چنانچہ ۲۳، ۲۴؍شعبان ۱۹۳۹÷ (۲، ۳؍مئی ۱۹۲۱÷ کو دربھنگہ میں جمعیۃ علمائے صوبہ کے اجلاسِ عام کے موقع پر یہ تجویز منظور کی گئی۔

> ’’صوبہ بہار و اڑیسہ (اس وقت اڑیسہ مستقل صوبہ نہیں بنا تھا بلکہ صوبہ بہار ہی کا ایک جزء تھا) کے محکمۂ شرعیہ کے لئے ایک عالم مقتدر شخص امیر منتخب کیا جائے جس کے ہاتھ میں تمام محاکم شرعیہ کی باگ ہو اور اس کا ہر حکم مطابقِ شریعت ہر مسلمان کیلئے واجب العمل ہو۔ نیز تمام علماء و مشائخ اس کے ہاتھ پر خدمت و حفاظتِ اسلام کے لئے بیعت کریں۔ جو سمع و طاعت کی بیعت ہوگی۔ جو بیعتِ طریقت سے الگ ایک ضروری اور اہم چیز ہے۔
> جمعیۃ متفقہ طور پر تجویز کرتی ہے کہ انتخاب امیر کیلئے ایک خاص اجلاس علماء بہار کا بمقام پٹنہ وسط شوال میں کیا جائے۔‘‘ (تاریخ امارت ص ۵۸ و ۵۹)

حسب تجویز ۱۸، ۱۹؍شوال ۱۳۳۹ھ (۲۵، ۲۶؍جون ۱۹۲۰÷) کو یہ اجلاس پتھر کی مسجد پٹنہ میں مولانا ابوالکلام آزاد کی زیر صدارت منعقد ہوا۔ جس میں مولانا آزاد سبحانی اور

مولانا سبحان اللہ خاں کے علاوہ سو سے زیادہ صوبہ بہار کے علماء شریک تھے۔ چنانچہ اسی اجلاس کی دوسری نشست میں بالاتفاق شرکائے اجلاس مولانا شاہ بدرالدین پھلواروی کو امیر شریعت صوبہ بہار۔ اور مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب کو نائب امیر شریعت منتخب کیا گیا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان کی تاریخ میں یہ پہلا مبارک دن تھا جس میں باقاعدہ امارتِ شرعیہ کا قیام عمل میں آیا۔ جس کا سلسلہ بحمداللہ آج تک جاری ہے اب تک یکے بعد دیگرے امارت کے منصب پر چار امراء کا انتخاب ہو چکا ہے اور یہ سب جمعیۃ علماء ہی کی نگرانی میں ہوا ہے۔ فالحمدللہ علیٰ ذٰلک۔

(۴) ایک اور صوبہ میں امیر کا انتخاب

صوبہ بہار میں انتخاب امیر اور نظامِ امارت کے قیام کے بعد، حضرت مولانا احمد علی لاہوری قدس سرہ کی انجمن ''خدّام الدین'' کے سالانہ اجلاس ۱۹۲۶ء کے موقع پر جس میں حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا محمد انور شاہ محدث کشمیریؒ، حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، حضرت مولانا حسین علیؒ چھپراواں، حضرت مولانا علامہ محمد یوسف بنوریؒ، مولانا ظفر علی خاں، اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری وغیرہ پانچ سو سے زائد علماء کرام شریک تھے۔ حضرت محدث کشمیری کی تحریک پر سید عطاء اللہ شاہ بخاری کو امیر شریعت منتخب کیا گیا اور پہلی بیعت خود حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ نے کی تھی۔ اس کے بعد بیعتِ عامہ ہوئی۔ (ماہنامہ ''الرشید'' ساہیوال شمارہ جمادی الاخریٰ ۱۴۰۴ھ)

اس امارت کے متعلق اس سے زیادہ معلومات پر سردست دسترس حاصل نہیں ہوئی۔ یہ ہے ہندوستان میں نظام امارت کے قیام کی مختصر تاریخ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے اکابر اور بزرگوں نے اس شرعی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کی ہر دور میں حسب استطاعت جدوجہد فرمائی ہے۔ (خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را)

اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے اسلاف و اکابر کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق اور حوصلہ عطا فرمائے۔

باب ﴿۶﴾

تذکرہ اربابِ فضل و کمال

امام ابوحنیفہ اور علم حدیث

امام ابوحنیفہ کی تابعیت

امام اعظم ابوحنیفہ نعمان بن ثابت متوفی ۱۵۰ھ رحمہ اللہ کی جلالتِ قدر وعظمت شان کے لیے یہ کافی ہے کہ وہ تابعیت کے عظیم دینی اور روحانی شرف کے حامل ہیں۔ امام ابوحنیفہؒ کی یہ ایسی فضیلت ہے جس نے انہیں اپنے معاصر — فقہا ومحدثین میں اسناد عالی کی حیثیت سے ممتاز کردیا ہے۔ چنانچہ علامہ ابن حجر ہیتمی مکی لکھتے ہیں۔

”إنه أدرك جماعة من الصحابة كانوا بالكوفة بعد مولده بها سنة ثمانين فهو من طبقة التابعين ولم يثبت ذٰلك لأحد من أئمة الأمصار المعاصرين له كالأوزاعى بالشام، والحمادين بالبصرة، والثورى بالكوفة ومالك بالمدينة المشرفة، والليث بن سعد بمصر“(۱)

> امام ابوحنیفہ نے اپنی پیدائش سن ۸۰ کے بعد صحابہ کی ایک جماعت کا زمانہ پایا ہے جو کوفہ میں تھے اس لیے وہ تابعین کے طبقہ میں ہیں، اور یہ شرف ان کے معاصر محدثین وفقہاء جیسے شام میں امام اوزاعی، بصرہ میں امام حماد بن سلمہ، امام حماد بن زید، کوفہ میں امام سفیان ثوری، مدینہ میں امام مالک، اور مصر میں امام لیث بن سعد کو حاصل نہیں ہوسکا۔

حافظ الدنیا امام ابن حجر عسقلانی نے بھی ایک استفسار کا جواب دیتے ہوئے امام ابوحنیفہؒ کی تابعیت کو دلائل کے ساتھ بیان کیا ہے ان کے الفاظ ملاحظہ کیجئے!

---

(۱) الخیرات الحسان فصل سادس ص: ۲۱، از علامہ ابن حجر ہیتمی مکی۔

أدرك الإمام أبو حنيفة جماعة من الصحابة لأنه ولد بالكوفة سنة ثمانين من الهجرة وبها يومئذ من الصحابة عبدالله بن أبی أوفی فإنه مات بعد ذلك بالاتفاق، وبالبصرة يومئذ أنس بن مالك ومات سنة تسعين أو بعدها، قد أورد ابن سعد بسند لابأس به أن أبا حنيفة رأی أنساً وكان غير هذين فی الصحابة بعده من البلاد احياء.

وقد جمع بعضهم جزأ فيما ورد من رواية أبی حنيفة عن الصحابة لكن لايخلو اسنادها من ضعف والمعتمد علی ادراكه ما تقدم وعلی رويته لبعض الصحابة ما أورده ابن سعد فی الطبقات، فهو بهذا الاعتبار من طبقه التابعين. (۱)

امام ابوحنیفہ نے صحابہ کی ایک جماعت کو پایا ہے کیونکہ آپ کی ولادت ۸۰ھ میں کوفہ میں ہوئی اوراس وقت وہاں صحابہ میں سے عبداللہ بن ابی اوفی موجود تھے کیونکہ ان کی وفات بالاتفاق ۸۰ھ کے بعد ہوئی ہے، اوران دنوں بصرہ میں انس بن مالک موجود تھے اس لیے کہ ان کی وفات ۹۰ھ یا اس کے بعد ہوئی ہے اور ابن سعد نے اِسی سند سے جس میں کوئی خرابی نہیں ہے بیان کیا کہ امام ابوحنیفہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کو دیکھا ہے، نیز ان دونوں اصحاب کے علاوہ اور بھی بہت سے صحابہ مختلف شہروں میں بقید حیات تھے اور بعض علماء نے امام ابوحنیفہ کی صحابہ سے روایت کردہ احادیث کو ایک خاص جلد میں جمع کیا ہے، لیکن ان کی سندیں ضعف سے خالی نہیں ہیں، امام ابوحنیفہ کا صحابہ کے زمانے کو پانے کے متعلق قابل اعتماد بات وہی ہے جو گزرچکی ہے اور بعض صحابہ کو دیکھنے کے بارے میں قابل اعتماد بات وہ ہے جس کو ابن سعد نے طبقات میں ذکر کیا ہے، لہٰذا اس اعتبار سے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تابعین کے طبقہ میں سے ہیں الخ۔

علامہ ہیتمی مکی اور حافظ ابن حجر عسقلانی کے علاوہ امام دارقطنی، حافظ ابونعیم اصبہانی،

---

(۱) تبييض الصحيفة ص:۲۵، ۲۶، ۱، حافظ سیوطی مطبوعہ کراچی ۱۴۱۸ھ

حافظ ابن عبدالبر، امام خطیب بغدادی، ابن الجوزی، امام سمعانی، حافظ عبدالغنی مقدسی، سبط ابن الجوزی، حافظ زین الدین عراقی، ولی الدین عراقی، ابن الوزیر یمانی، وغیرہ ائمہ حدیث نے بھی امام اعظم ابوحنیفہؒ کی تابعیت کا اقرار واعتراف کیا ہے۔

ذٰلك فضل اللّٰه يؤتيه من يشاء

طلب حدیث کے لیے اسفار

امام اعظم ابوحنیفہؒ نے فقہ وکلام کے علاوہ بطور خاص حدیث پاک کی تعلیم وتحصیل کی تھی اور اس کے لئے حضرات محدثین کی روش کے مطابق اسفار بھی کئے چنانچہ امام ذہبی جو رجال علم وفن کے احوال وکوائف کی معلومات میں ایک امتیازی شان کے مالک ہیں اپنی مشہور اور انتہائی مفید تصنیف ''سیر اعلام النبلا'' میں امام صاحب کے تذکرہ میں لکھتے ہیں وعنی بطلب الآثار وارتحل فی ذلك(۱) امام صاحب نے طلب حدیث کی جانب خصوصی توجہ کی اور اس کے لئے اسفار کئے۔

مزید یہ بھی لکھتے ہیں:

ان الامام ابا حنيفة طلب الحديث واكثر منه سنة مئة وبعدها۔(۲)

امام ابوحنیفہؒ نے حدیث کی تحصیل کی بالخصوص ۱۰۰ھ اور اس کے بعد کے زمانہ میں اس اخذ وطلب میں بہت زیادہ سعی کی۔

امام ذہبی کے بیان ''وارتحل فی ذلك'' کی قدرے تفصیل صدر الائمہ موفق بن احمد مکیؒ نے اپنی مشہور جامع کتاب ''مناقب الامام الاعظم میں ذکر کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ امام اعظم ابوحنیفہ کوفی نے طلب علم میں بیس مرتبہ سے زیادہ بصرہ کا سفر کیا تھا اور اکثر سال، سال بھر کے قریب قیام رہتا تھا۔'' (۳)

---

(۱) سیر اعلام النبلاء ۶/۳۹۲۔

(۲) سیر اعلام النبلاء ۶/۳۹۶۔

(۳) مناقب الامام الاعظم ۱/۵۹۔

اس زمانے میں سفرِ حج بھی افادہ واستفادہ کا ایک بڑا ذریعہ تھا کیونکہ بلادِ اسلامیہ کے گوشہ گوشہ سے اربابِ فضل وکمال حرمین شریفین میں آ کر جمع ہوتے تھے اور درس و تدریس کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ امام ابوالمحاسن مرغینانی نے بالسند نقل کیا ہے کہ امام صاحب نے پچپن حج کئے تھے۔ تاریخ اسلام میں یہ کوئی عجیب بات نہیں کہ اسے مبالغہ آمیز تصور کیا جائے کیونکہ متعدد شخصیتوں کے نام پیش کئے جاسکتے ہیں جن کی حج کی تعداد اس سے کہیں زیادہ ہے چنانچہ امام ابن ماجہؒ کے شیخ علی بن منذر نے اٹھاون حج کئے تھے اوران میں اکثر پاپیادہ ہی تھے۔(۱) محدث سعید بن سلیمان ابوعثمان واسطی نے ساٹھ حج کئے تھے(۲) اور حافظ عبدالقادر قرشی نے جواھر المضیه فی طبقات الحنفیه میں امام سفیان بن عیینہ کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ انھوں نے ستر حج کئے تھے۔

علاوہ ازیں ۱۳۰ھ سے خلیفہ منصور عباسی کے زمانہ تک جس کی مدت چھ سال کی ہوتی ہے آپ کا مستقل قیام مکہ معظّمہ ہی میں رہا۔(۳)

ظاہر ہے کہ اس دور کے طریقۂ رائج کے مطابق دورانِ حج اور اس چھ سالہ مستقل قیام کے زمانہ میں آپ نے شیوخ حرمین شریفین اور واردین وصادرین اصحاب حدیث سے خوب خوب استفادہ کیا ہوگا طلب علم کے اسی والہانہ اشتیاق اور بے پناہ شغف کا ثمرہ ہے کہ آپ کے اساتذہ وشیوخ کی تعداد چار ہزار تک پہنچ گئی۔(۴) پھران چار ہزار اساتذہ سے آپ نے کس قدر احادیث حاصل کیں اس کا کچھ اندازہ مشہور امام حدیث حافظ مِسعَر بن کِدام کے اس بیان سے کیا جاسکتا ہے جسے امام ذہبی نے ''مناقب امام ابی حنیفه وصاحبیه'' میں نقل کیا ہے۔

---

(۱) سنن ابن ماجہ باب صید الکلب۔

(۲) مناقب امام احمد از ابن الجوزی ص ۳۸۷۔

(۳) عقود الجمان از مؤرخ کبیر ومحدث امام محمد بن یوسف الصالحی الشافعی ص ۳۱۲۔

(۴) عقود الجمان میں امام صالحی نے الباب الرابع فی ذکر بعض شیوخه کے تحت ۲۴ صفحات میں شیوخ امام اعظم کے اسماء ذکر کئے ہیں۔

علم حدیث میں مہارت وامامت

امام مُسِعر بن کدام جو اکابر حفاظ حدیث میں ہیں امام صاحب کی جلالت شان کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

طلبت مع ابی حنیفة الحدیث فغلبنا، واخذنا فی الزهد فبرع علینا وطلبنا معه الفقه فجاء ماترون(۱)

> ”میں نے امام ابوحنیفہ کی رفاقت میں حدیث کی تحصیل کی تو وہ ہم پر غالب رہے اور زہد و پرہیزگاری میں مصروف ہوئے تو اس میں بھی وہ فائق رہے اور فقہ ان کے ساتھ شروع کی تو تم دیکھتے ہو کہ اس فن میں کمالات کے کیسے جوہر دکھائے۔“

یہ مسعر بن کدام وہ بزرگ ہیں جن کے حفظ واتقان کی بناء پر امام شعبہ انہیں مصحف کہا کرتے تھے(۲) اور حافظ ابومحمد رامہرمزی نے اصول حدیث کی اولین جامع تصنیف المحدث الفاضل میں لکھا ہے کہ امام شعبہ اور امام سفیان ثوری میں جب کسی حدیث کے بارے میں اختلاف ہوتا تو دونوں کہا کرتے کہ ”اذهبنا الی المیزان مسعر“ ہم دونوں کو مسعر کے پاس لے چلو جو فن حدیث کے میزان علم ہیں، ذرا غور تو فرمائیے کہ امام شعبہ اور امام سفیان ثوری دونوں امیر المومنین فی الحدیث ہیں پھر ان دونوں بزرگ کی میزان جس ذات کے بارے میں یہ شہادت دے کہ وہ علم حدیث میں ہم پر فوقیت رکھتی ہے اس شخصیت کا فن حدیث میں پایہ کیا ہوگا۔

مشہور امام تاریخ وحدیث حافظ ابوسعد سمعانی کتاب الانساب میں امام صاحب کے تذکرہ میں لکھتے ہیں۔

اشتغل بطلب العلم وبالغ فیه حتی حصل له مالم یحصل لغیره.(۳)

---

(۱) مناقب ذہبی ص: ۲۷۔ (۲) تذکرۃ الحفاظ از امام ذہبی ۱/۱۸۸۔

(۳) کتاب الانساب طبع لندن ورق ۱۹۶۔

> ''امام ابوحنیفہ طلب علم مشغول ہوئے تو اس درجہ غایت انہماک کے ساتھ ہوئے کہ جس قدر علم انہیں حاصل ہوا دوسروں کو نہ ہوسکا۔''

غالبًا امام صاحب کے اسی کمالِ علمی کے اعتراف کے طور پر امام احمد بن حنبل اور امام بخاری کے استاذ حدیث شیخ الاسلام حافظ ابوعبدالرحمٰن مقری جب امام صاحب سے کوئی حدیث روایت کرتے تو اس الفاظ کے ساتھ روایت کرتے تھے اخبرنا شاهنشاه ہمیں علم حدیث کے شہنشاہ نے خبر دی۔ یہ حافظ ابوعبدالرحمٰن مقری امام ابوحنیفہ کے خاص شاگرد ہیں اور امام صاحب سے نوسو (۹۰۰) حدیثیں سنی ہیں جیسا کہ علامہ کردی مناقب الامام الاعظم (ج ۲ ص ۲۱۶ مطبوعہ دائرۃ المعارف حیدرآباد) میں لکھتے ہیں عبداللہ بن یزید المقری (ابوعبدالرحمٰن) سمع من الإمام تسع مأة حديث.

اسی بات کا اعتراف محدث عظیم حافظ یزید بن ہارون نے ان الفاظ میں کیا ہے۔

كان ابو حنيفة نقيا، زاهدًا عالماً صدوق اللسان احفظ اهل زمانه.(۱)

امام ابوحنیفہ پاکیزہ سیرت، متقی، پرہیزگار، صداقت شعار اور اپنے زمانہ میں بہت بڑے حافظ حدیث تھے۔

امام ابوحنیفہؒ کے علوم وقرآن وحدیث میں امتیازی تبحر اور وسعت معلومات کا اعتراف امام الجرح والتعدیل یحیٰی بن سعید القطان نے ان وقیع الفاظ میں کیا ہے۔ إنه والله لأعلم هذه الامة بما جاء عن الله ورسوله(۲)

> ''بخدا ابوحنیفہ اس امت میں خدا اور اس کے رسول سے جو کچھ وارد ہوا ہے اس کے سب سے بڑے عالم تھے۔''

امام بخاریؒ کے ایک اور استاذ حدیث امام مکی بن ابراہیم فرماتے ہیں۔

كان أبو حنيفة زاهدا، عالماً، راغباً في الآخرة صدوق اللسان أحفظ اهل زمانه(۳)

---

(۱) اخبار ابی حنیفہ واصحابہ از صیمری ص ۳۶۔

(۲) مقدمہ کتاب التعلیم از مسعود بن شیبہ سندھی بحوالہ ابن ماجہ اور علم حدیث ص ۱۶۷، از محقق کبیر علامہ محمد عبدالرشید نعمانی۔ (۳) مناقب الامام الاعظم از صدر الائمہ موفق بن احمد مکی۔

”امام ابوحنیفہ، پرہیزگار، عالم، آخرت کے راغب، بڑے راست باز اور اپنے معاصرین میں سب سے بڑے حافظ حدیث تھے۔“

امام ابوحنیفہؒ کی حدیث میں کثرت معلومات کا اندازہ اس سے بھی کیا جاسکتا ہے کہ امام صاحب نے حدیث پاک میں اپنی اولین تالیف کتاب الآثار کو چالیس ہزار احادیث کے مجموعہ سے منتخب کر کے مرتب کیا ہے۔ چنانچہ صدر الائمہ موفق بن احمد مکی محدث کبیر امام الائمہ بکر بن محمد زِرَنجری متوفی ۵۱۲ھ کے حوالہ سے لکھتے ہیں۔

وانتخب ابو حنيفة رحمه الله الآثار من اربعين الف حديث.(۱)

”امام ابوحنیفہ نے کتاب الآثار کا انتخاب چالیس ہزار احادیث سے کیا ہے۔“

پھر اسی کے ساتھ امام حافظ ابو یحییٰ زکریا بن یحییٰ نیشاپوری متوفی ۲۹۸ھ کا یہ بیان بھی پیش نظر رکھئے جسے انھوں نے اپنی کتاب مناقب ابی حنیفہ میں خود امام اعظم سے بہ سند نقل کیا ہے کہ:

عندی صناديق الحديث ما أخرجت منهما إلا أليسير الذی ينتفع به(۲)

”میرے پاس حدیث کے صندوق بھرے ہوئے موجود ہیں مگر میں نے ان میں سے تھوڑی حدیثیں نکالی ہیں جن سے لوگ نفع اٹھائیں۔“

اب خدا ہی کو معلوم ہے کہ ان صندوقوں کی تعداد کیا تھی اور ان میں احادیث کا کس قدر ذخیرہ محفوظ تھا۔ لیکن اس سے اتنی بات تو بالکل واضح ہے کہ امام اعظم علیہ الرحمہ والغفر ان کثیر الحدیث ہیں اور یار لوگوں نے جو یہ مشہور کر رکھا ہے کہ حدیث کے باب میں امام صاحب تہی دامن تھے اور انھیں صرف سترہ حدیثیں معلوم تھیں یہ ایک بے بنیاد الزام ہے جو علمی دنیا میں قطعاً غیر معروف ہے۔ اور بازاری افسانوں سے زیادہ کی حیثیت نہیں رکھتا۔

---

(۱) مناقب الامام الاعظم ۱/ ۹۵۔

(۲) مناقب الامام الاعظم ۱/ ۹۵۔

ضروری تنبیہ

اس موقعہ پر یہ علمی نکتہ پیش نظر رہے کہ یہ چالیس ہزار متون حدیث کا ذکر نہیں بلکہ اسانید کا ذکر ہے پھر اس تعداد میں صحابہ و اکابر تابعین کے آثار و اقوال بھی داخل ہیں کیونکہ سلف کی اصطلاح میں ان سب کے لئے حدیث و اثر کا لفظ استعمال ہوتا تھا۔

امام صاحب کے زمانہ میں احادیث کے طرق و اسانید کی تعداد چالیس ہزار سے زیادہ نہیں تھی بعد کو امام بخاری، امام مسلم وغیرہ کے زمانہ میں سندوں کی یہ تعداد لاکھوں تک پہنچ گئی کیونکہ ایک شیخ نے کسی حدیث کو مثلاً دس تلامذہ سے بیان کیا تو اب محدثین کی اصطلاح کے مطابق یہ دس سندیں شمار ہوں گی، اگر آپ کتاب الآثار اور مؤطا امام مالک کی احادیث کی تخریج دیگر کتب حدیث کی احادیث سے کریں تو ایک ایک متن کی دسیوں بیسیوں سندیں مل جائیں گی۔

حافظ ابونعیم اصفہانی نے مسند ابی حنیفہ میں بسند متصل یحییٰ بن نصر کی زبانی نقل کیا ہے کہ:

دخلت على أبى حنيفة فى بيت مملوء كتباً فقلت: ما هذه؟ قال هذه أحاديث كلها وما حدثت به الا اليسير الذى ينتفع به(۱)

> ”میں امام ابوحنیفہ کے یہاں ایسے مکان میں داخل ہوا جو کتابوں سے بھرا ہوا تھا۔ میں نے ان کے بارے میں دریافت کیا تو فرمایا یہ سب کتابیں حدیث کی ہیں اور میں نے ان سے تھوڑی سی حدیثیں بیان کی ہیں جن سے نفع اٹھایا جائے۔“

مشہور محدث ابومقاتل حفص بن سلم امام ابوحنیفہؒ کی فقہ و حدیث میں امامت کا اعتراف ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

وكان أبوحنيفة إمام الدنيا فى زمانه فقها وعلما وورعاً قال: وكان

---

(۱) الانتقاء از حافظ عبدالبر ص ۳۱۹ مطبوعہ دالرالبشائر الاسلامیہ بیروت ۱۴۱۷ھ

أبو حنيفة محنة يعرف به أهل البدع من الجماعة ولقد ضرب بالسياط على الدخول فی الدنیا لهم فابی(۱)

امام ابوحنیفہ اپنے زمانہ میں فقہ وحدیث اور پرہیزگاری میں امام الدنیا تھے۔ ان کی ذات آزمائش تھی جس سے اہل سنت والجماعت اور اہل بدعت میں فرق وامتیاز ہوتا تھا انھیں کوڑوں سے مارا گیا تاکہ وہ دنیاداروں کے ساتھ دنیا میں داخل ہوجائیں (کوڑوں کی ضرب برداشت کرلی) مگر دخولِ دنیا کو قبول نہیں کیا۔

حفص بن مسلم کے قول "وكان أبوحنيفة محنة يعرف به أهل البدع من الجماعة" (امام ابوحنیفہ آزمائش تھے ان کے ذریعہ اہل سنت اور اہل بدعت میں تمیز ہوتی تھی) کی وضاحت امام عبدالعزیز ابن ابی رواد کے اس قول سے ہوتی ہے وہ فرماتے ہیں:

أبو حنيفة المحنة من أحب أبا حنيفة فهو سنّيی و من أبغض فهو مبتدع(۲)

"امام ابوحنیفہ آزمائش ہیں جو امام صاحب سے محبت رکھتا ہے وہ سنی ہے اور جو ان سے بغض رکھتا ہے وہ بدعتی ہے۔"

مؤرخ کبیر شیخ محمد بن یوسف صالحی اپنی معتبر، مقبول اور جامع کتاب "عقود الجمان فی مناقب الامام الاعظم ابی حنیفة النعمان" میں امام صاحب کی عظیم محدثانہ حیثیت کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

اعلم رحمك الله أن الإمام أبا حنيفة رحمه الله تعالى من كبار حفاظ الحديث وقد تقدم انه اخذ عن أربعة آلاف شيخ من التابعين وغيرهم وذكره الحافظ الناقد ابو عبدالله الذهبى فى كتابه الممتع طبقات الحفاظ من المحدثين منهم ولقد اصاب وأجاد، ولولا كثرة اعتنائه بالحديث ماتهيّاله استنباط مسائل الفقه فانه أوّل من استنبطه من الأدلة ۱ھ۔(۳)

---

(۱) اخبار ابی حنیفہ واصحابہ از امام صمیری ص ۷۹۔

(۲) اخبار ابی حنیفہ واصحابہ از امام صمیری ص ۷۹۔ (۳) عقود الجمان ص ۳۱۹۔

> ''معلوم ہونا چاہئے کہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کبار حفاظ حدیث میں سے ہیں اور اگلے صفحات میں یہ بات گزر چکی ہے کہ امام صاحب نے چار ہزار شیوخ تابعین وغیرہ سے تحصیل علم کیا ہے اور حافظ ناقد امام ذہبی نے اپنی مفید ترین کتاب تذکرۃ الحفاظ میں حفاظ محدثین میں امام صاحب کا بھی ذکر کیا ہے (جو امام صاحب کے حافظ حدیث ہونے کی بڑی پختہ دلیل ہے) ان کا یہ انتخاب بہت خوب اور نہایت درست ہے اگر امام صاحب تکثیر حدیث کا مکمل اہتمام نہ کرتے تو مسائل فقہیہ کے استنباط کی استعداد ان میں نہ ہوتی جبکہ دلائل سے مسائل کا استنباط سب سے پہلے انھوں نے ہی کیا ہے۔''

علم حدیث میں امام صاحب کے اسی بلند مقام ومرتبہ کی بناء پر اکابر محدثین اور ائمہ حفاظ کی جماعت میں عام طور پر امام اعظم کا تذکرہ بھی کیا جاتا ہے:۔ چنانچہ امام المحدثین ابوعبداللہ الحاکم اپنی مفید ومشہور کتاب ''معرفۃ علوم الحدیث'' کی انچاسویں (۴۹) نوع کی توضیح کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

هذا النوع من هذه العلوم معرفة الائمة الثقات المشهورين من التابعين وأتباعهم ممن يجمع حديثهم للحفظ والمذاكرة والتبرك بذكرهم من الشرق الى الغرب.

> ''علوم حدیث کی یہ نوع مشرق ومغرب کے تابعین اور اتباع تابعین میں سے مشہور ائمہ ثقات کی معرفت اور ان کے ذکر میں ہے جن کی بیان کردہ احادیث حفظ ومذاکرہ اور تبرک کی غرض سے جمع کی جاتی ہیں۔''

پھر اس نوع کے تحت بلاد اسلامیہ کے گیارہ علمی مراکز مدینہ، مکہ، مصر، شام، یمن، یمامہ، کوفہ، جزیرہ، بصرہ، واسط، خراسان کے مشاہیر ائمہ حدیث کا ذکر کیا ہے۔

۱- محدثین مدینہ میں سے امام محمد بن مسلم زہری، محمد بن المنکدر قرشی، ربیعۃ بن ابی عبدالرحمٰن الرائی، امام مالک بن انس، عبداللہ بن دینار، عبیداللہ بن عمر بن حفص عمری، عمر

بن عبدالعزیز، سلمہ بن دینار، جعفر بن محمد الصادق وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔

۲- محدثین مکہ میں سے ابراہیم بن میسرہ، اسماعیل بن امیہ، مجاہد بن جبر، عمرو بن دینار، عبدالملک بن جریج، فضیل بن عیاض وغیرہ کے اسماء ذکر کئے ہیں۔

۳- محدثین مصر میں سے عمرو بن الحارث، یزید بن ابی حبیب، عیاش بن عباس القتبانی، عبدالرحمٰن بن خالد بن مسافر، حیوۃ بن شریح التجیبی، رزیق بن حکیم الایلی وغیرہ کا تذکرہ کیا ہے۔

۴- محدثین شام میں سے عبدالرحمٰن بن عمرو الاوزاعی، شعیب بن ابی حمزہ الحمصی، رجاء بن حیوۃ الکندی، امام مکحول (الفقیہ) وغیرہ کے اسماء بیان کئے گئے ہیں۔

۵- اہل یمن میں سے ہمام بن منبّہ، طاؤس بن کیسان، ضحاک بن فیروز دیلمی، شرحبیل بن کلیب صنعانی وغیرہ کے نام لئے ہیں۔

۶- محدثین یمامہ میں سے یحیٰی بن ابی کثیر، ابو کثیر یزید بن عبدالرحمٰن الیحیمی، عبداللہ بن بدر یمانی وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔

۷- محدثین کوفہ میں سے عامر بن شراحیل الشعبی، ابراہیم نخعی، ابواسحاق السبیعی، عون بن عبداللہ، موسی بن ابی عائشہ الہمدانی، سعید بن مسروق الثوری، الحکم بن عتیبہ الکندی، حماد بن ابی سلیمان (شیخ امام ابوحنیفہ) منصور بن المعتمر السلمی، زکریا بن ابی زائدہ الہمدانی، مسعر بن کدام الہلالی، امام ابوحنیفہ النعمان بن ثابت التیمی، سفیان بن سعید الثوری، الحسن بن صالح بن حی، حمزہ بن حبیب الزیات، زفر بن الہذیل (تلمیذ امام ابوحنیفہ) وغیرہ کا نام لیا ہے۔

۸- محدثین جزیرہ میں سے میمون بن مہران، کثیر بن مرۃ حضرمی، ثور بن یزید ابوخالد الرجبی، زہیر بن معاویہ، خالد بن معدان العابد وغیرہ کے اسماء ذکر کئے ہیں۔

۹- اہل بصرہ کے محدثین میں سے ایوب بن ابی تمیمۃ السختیانی، معاویہ بن قرۃ مرنی، عبداللہ بن عون، داؤد بن ابی ہند، شعبہ بن الحجاج (امام الجرح والتعدیل) ہشام بن حسان، قتادہ بن دعامۃ سدوسی، راشد بن نجیح حمانی وغیرہ کا تذکرہ کیا ہے۔

۱۰- اہل واسط میں سے یحییٰ بن دینار رمانی، ابوخالد یزید بن عبدالرحمٰن دالانی، عوام بن حوشب وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔

۱۱- محدثین خراسان میں سے عبدالرحمٰن بن مسلم، عتیبہ بن مسلم، ابراہیم بن ادہم الزاہد، محمد بن زیاد وغیرہ کا تذکرہ کیا ہے۔(۱)

اس نوع میں امام حاکم نے پانچ سو سے زائد ان ثقات ائمہ حدیث کا ذکر کیا ہے جن کی مرویات محدثین کے یہاں اہمیت کی حامل ہیں اور انہیں جمع کرنے کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے۔ اور ان ائمہ حدیث میں امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا ذکر ہے، کیا اس کے بعد بھی امام صاحب کے حافظ حدیث بلکہ کبار حفاظ حدیث میں ہونے کے بارے میں کسی تردد کی گنجائش رہ جاتی ہے؟۔

اسی طرح امام ذہبی جو بقول حافظ ابن حجر عسقلانی نقد رجال میں استقراء تام کے مالک تھے۔ اپنی اہم ترین ومفید ترین تصنیف سیر اعلام النبلاء میں امام مالک رحمہ اللہ علیہ کے تذکرہ میں امام شافعی رحمہ اللہ کے قول "العلم يدور على ثلثة مالك، والليث وابن عيينة"

(علم حدیث تین بزرگوں امام مالک، امام للیث بن سعد اور امام سفیان بن عیینہ پر دائر ہے) کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں۔

قلت بل وعلى سبعة معهم، وهم الاوزاعى، الثورى، معمر، وأبوحنيفة، وشعبة، والحمادان(۲)

میں کہتا ہوں کہ ان تینوں مذکورہ ائمہ حدیث کے ساتھ مزید سات بزرگوں یعنی امام اوزاعی، امام ثوری، امام معمر، امام ابوحنیفہ، امام شعبہ، امام حماد بن سلمہ اور امام حماد بن زید پر علم دائر ہے۔

آپ دیکھ رہے ہیں امام ذہبی ان اکابر ائمہ حدیث کے زمرہ میں جن پر علوم حدیث

---

(۱) معرفۃ علوم الحدیث از امام حاکم نیساپوری ص ۲۴۰-۲۴۹۔

(۲) سیر اعلام النبلاء ۹۴/۸۔

دائر ہے امام ابوحنیفہ کو بھی شمار کر رہے ہیں امام صاحب کے کبار محدثین کے صف میں ہونے کی یہ کتنی بڑی اور معتبر شہادت ہے اس کا اندازہ اہل علم کر سکتے ہیں۔

نیز اسی سیر اعلام النبلاء میں مشہور امام حدیث یحییٰ بن آدم کے تذکرہ میں محمود بن غیلان کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ

"سمعت أبا أسامة يقول كان عمرؓ فی زمانه رأس الناس وهو جامع وكان بعده ابن عباس فی زمانه وبعده الشعبی فی زمانه وكان بعده سفيان الثوری وكان بعد الثوری يحيىٰ بن آدم"

محمود بن غیلان کہتے ہیں کہ میں نے ابواسامہ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اپنے عہد میں علم واجتہاد کے اعتبار سے لوگوں کے سردار تھے اور وہ جامع فضائل تھے۔ اور ان کے بعد حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اپنے زمانہ میں، اور ان کے بعد امام شعبی اپنے زمانہ میں اور امام شعبی کے بعد سفیان ثوری اپنے زمانہ میں اور ان کے بعد یحییٰ بن آدم اپنے زمانے میں علم واجتہاد کے امام تھے۔

اس قول کو نقل کرنے کے بعد اس بارے میں امام ذہبی نے اپنی رائے ان الفاظ میں بیان کی ہے۔

قلت: قد كان يحيىٰ بن آدم من كبار ائمة الاجتهاد، وقد كان عمر كما قال فی زمانه ثم كان علی، وابن مسعود، ومعاذ، وابوالدرداء، عم كان بعدهم فی زمانه زيد بن ثابت، وعائشه و ابوموسیٰ، ابوهريرة، ثم كان ابن عباس وابن عمر، ثم علقمة، ومسروق، وابوادريس، وابن المسيب، ثم عروة، والشعبی، والحسن، وابراهيم النخعی، ومجاهد، وطاؤس، وعدَّة، ثم الزهری، وعمر بن عبدالعزيز، وقتادة، وأيوب، ثم الأعمش، وابن عون، وابن حريج، وعبيد اللّٰه بن عمر، ثم الأوزاعی، وسفيان الثوری، ومعمر، وابوحنيفه، وشعبة، ثم مالك والليث، وحماد بن زيد، و ابن عيينة، ثم ابن المبارك، ويحيیٰ القطان، ووكيع، و عبدالرحمن، وابن وهب، ثم يحيیٰ بن آدم وعفان، والشافعی، وطائفة ثم

أحمد، واسحاق، و ابوعبيد، وعلى المدينى وابن معين، ثم ابو محمد الدارمى، ومحمد بن اسماعيل البخارى وآخرون من ائمة العلم والاجتهاد. (۱)

میں کہتا ہوں یقیناً یحییٰ بن آدم کبار ائمہ اجتہاد میں سے تھے، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ بلا شبہ اپنے زمانہ میں علم واجتہاد میں سرتاج مسلمین تھے پھر ان کے بعد حضرت علی، عبداللہ بن مسعود، معاذ بن جبل ابودرداء رضی اللہ عنہم کا مرتبہ ہے، ان حضرات کے بعد زید بن ثابت، عائشہ صدیقہ، ابوموسیٰ اشعری اور ابوہریرہ رضی اللہ عنہم کا علم واجتہاد میں مرتبہ تھا، ان حضرات کے بعد حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم کا مقام تھا پھر ان حضرات صحابہ کے بعد علقمہ، مسروق، ابوادریس خولانی اور سعید بن المسیب کا درجہ تھا پھر عروۃ بن زبیر، امام شعبی، حسن بصری، ابراہیم نخعی، مجاہد، طاؤس وغیرہ تھے پھر ابن شہاب زہری، عمر بن عبدالعزیز، قتادہ، ایوب سختیانی کا مرتبہ تھا پھر امام اعمش، ابن عون، ابن جریج، عبیداللہ بن عمر کا درجہ تھا پھر امام اوزاعی، سفیان ثوری، معمر، امام ابوحنیفہ اور شعبہ بن حجاج کا مقام ومرتبہ تھا پھر امام مالک، لیث بن سعد، حماد بن زید اور سفیان بن عیینہ تھے، پھر عبداللہ بن مبارک، یحییٰ بن سعید قطان، وکیع بن جراح، عبدالرحمٰن بن مہدی، عبداللہ بن وہب تھے پھر یحییٰ بن آدم، عفان بن مسلم، امام شافعی وغیرہ تھے پھر امام احمد بن حنبل اسحاق بن راہویہ، ابوعبید، علی بن المدینی اور یحییٰ بن معین تھے پھر ابومحمد دارمی، امام بخاری اور دیگر ائمہ علم واجتہاد اپنے زمانہ میں تھے۔

اس موقع پر بھی امام ذہبی نے اکابر ائمہ حدیث کے ساتھ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا بھی ذکر کیا ہے جس سے صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ امام ذہبی کے نزدیک امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ علم حدیث میں ان اکابر کے ہم پایہ ہیں۔

یہ اکابر محدثین یعنی امام مسعر بن کدام، امام ابوسعد سمعانی، حافظ حدیث یزید بن ہارون، استاذ امام بخاری مکی بن ابراہیم، ابومقاتل، امام عبدالعزیز بن رواد، مؤرخ کبیر المحدث محمد بن یوسف صالحی، امام المحدثین ابوعبداللہ حاکم نیشاپوری، امام ذہبی وغیرہ

---

(۱) سیر اعلام النبلاء ۹/ ۵۲۵-۵۲۶۔

بیک زبان شہادت دے رہے ہیں کہ امام اعظم ابوحنیفہ اپنے عہد کے حفاظ حدیث میں امتیازی شان کے مالک تھے ان اکابر متقدمین ومتأخرین علمائے حدیث کے علاوہ امام ابن تیمیہ، ان کے مشہور تلمیذ ابن القیم وغیرہ حفاظ حدیث بھی امام صاحب کو کثیر الحدیث ہی نہیں بلکہ اکابر حفاظ حدیث میں شمار کرتے ہیں۔

اس موقع پر بغرض اختصار انہیں مذکورہ ائمہ حدیث وفقہ کی نقول پر اکتفا کیا گیا ہے ورنہ امام اعظمؒ کی مدح وتوصیف کرنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ چنانچہ امام حافظ عبدالبر اندلسی مالکی اپنی انتہائی وقیع کتاب "الانتقاء فی فضائل الائمة الثلاثة الفقهاء" میں سرسٹھ (٦٧) اکابر محدثین وفقہاء کے اسماء نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

وكل هٰولاء أثنوا عليه ومدحوه بألفاظ مختلفة(۱)

ان سارے بزرگوں نے مختلف الفاظ میں امام ابوحنیفہؒ کی مدح وثنا کی ہے امام صاحب کے بارے میں تاریخ اسلام کی ان برگزیدہ شخصیتوں کے اقوال کو حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی اس صحیح حدیث کی روشنی میں دیکھئے، خادم رسول اللہ...... بیان کرتے ہیں کہ:

مرّوا بجنازه فاثنوا عليها خيرًا فقال النبى صلى الله عليه وسلم! وجبت فقال عمر ما وجبت؟ فقال هذا أثنيتم عليه خيرا، فوجبت له الجنة أنتم شهداء الله فى الأرض (متفق علیہ)(۲)

حضرات صحابہ کا ایک جنازہ کے پاس سے گزر ہوا تو ان حضرات نے اس کی خوبیوں کی تعریف کی اس پر آنحضرت...... نے فرمایا واجب ہوگئی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے پوچھا کیا چیز واجب ہوگئی؟ تو رسول خدا...... نے فرمایا تم نے اس کے خیر وبھلائی کو بیان کیا لہٰذا اس کے لئے جنت واجب ہوگئی تم زمین میں اللہ کے گواہ ہو۔

اس حدیث پاک کے مطابق یہ اعیان علماء اسلام یعنی محدثین فقہاء، عباد وزہاد اور

---

(۱) الانتقاء ص ۲۲۹ مطبوعہ دار البشائر بیروت ۱۴۱۷ھ

(۲) مشکوٰۃ المصابیح ص ۱۴۵ باختصار۔

اصحابِ امانت و دیانت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی عظمت شان اور دینی امامت کے بارے میں شہداء اللہ فی الارض ہیں اور اللہ کے ان گواہوں کی شہادت کے بعد مزید کسی شہادت کی حاجت نہیں۔

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا
ہر اک کا نصیب یہ بخت رسا کہاں

امام صاحب کی عدالت وثقاہت

سید الفقہاء، سراج الامت امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ علم وفضل اور امامت و شہرت کے جس بلند وبالا مقام پر ہیں، ان کی عظمت شان بذات خود انہیں ائمۂ جرح و تعدیل کی انفرادی تعدیل وتوثیق سے بے نیاز کر دیتی ہے۔

چنانچہ امام تاج الدین سبکی اصول فقہ پر اپنی مشہور کتاب ”جمع الجوامع“ کے آخر میں لکھتے ہیں۔

”ونعتقد أن أبا حنيفة ومالكا، والشافعی، وأحمد، والسفيانين، والأوزاعی، واسحاق بن راهويه، وداؤد الظاهری، وابن جرير وسائر أئمة المسلمين على هدى من اللّٰه فی العقائد وغيرها ولا التفات الى من تكلم فيهم بماهم بريئون منه فقد كانوا من العلوم اللّدنّية والمواهب الالٰهية والاستنباط الدقيقة والمعارف الغزيرة والدين والورع والعبادة والزهادة والجلالة بالمحل لايسامٰی“(۱)

ہمارا اعتقاد ہے کہ ابوحنیفہ، مالک، شافعی، احمد، سفیان ثوری، وسفیان بن عیینہ، اوزاعی، اسحاق بن راہویہ، داؤد ظاہری، ابن جریر طبری اور سارے ائمہ مسلمین عقائد واعمال میں منجانب اللہ ہدایت پر تھے اور ان ائمۂ دین پر ایسی باتوں کی حرف گیری کرنے والے جن سے یہ بزرگان دین بری تھے مطلقاً لائق التفات نہیں ہیں کیونکہ یہ حضرات علوم لدنی، خدائی عطایا، باریک استنباط، معارف کی کثرت اور دین و پرہیزگاری، عبادت وزہد

---

(۱) جمع الجوامع ۳/۴۴۱۔

نیز بزرگی کے اس مقام پر تھے جہاں پہنچا نہیں جا سکتا ہے۔

نیز شیخ الاسلام ابو اسحاق شیرازی شافعی اپنی کتاب **اللمع فی اصول الفقه** میں رقمطراز ہیں۔

وجملته أن الراوی لایخلوا إما ان یکون معلوم العدالة أو معلوم الفسق أومجھول الحال، فإن کانت عدالته معلومة کالصحابة رضی اللہ عنھم أو أفاضل التابعین کالحسن وعطاء والشعبی والنخعی أو أجلاء الأئمة کمالک، وسفیان، وأبی حنیفة، والشافعی، وأحمد، وإسحاق، ومن یجری مجراھم وجب قبول خبره ولم یجب البحث عن عدالته.(۱)

(جرح وتعدیل کے باب میں خلاصہ کلام یہ ہے کہ راوی کی یا تو عدالت معلوم و مشہور ہوگی یا اس کا فاسق ہونا معلوم ہوگا، یا وہ مجہول الحال ہوگا (یعنی اس کی عدالت یا فسق معلوم نہیں) تو اگر اس کی عدالت معلوم ہے جیسے کہ حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم یا افاضل تابعین جیسے حسن بصری، عطاء بن رباح، امام سفیان ثوری، امام ابوحنیفہ، امام شافعی، امام احمد، امام اسحاق بن راہویہ اور جو ان کے ہم درجہ ہیں تو ان کی خبر ضرور قبول کی جائے گی اور ان کی عدالت وتوثیق کی تحقیق ضروری نہیں ہوگی)۔

یہی بات اپنے الفاظ میں حافظ ابن صلاح نے اصول حدیث پر اپنی مشہور ومعروف کتاب علوم الحدیث میں تحریر کی ہے۔ لکھتے ہیں:

فمن اشتھرت عدالته بین أھل النقل من اھل العلم وشاع کالثناء علیه بالثقة والأمانة استغنی فیه بذلك عن بینة شاھد بعدالته تنصیصاً(۲)

> ”علمائے اہل نقل میں جس کی عدالت مشہور ہو اور ثقاہت وامانت میں جس کی تعریف عام ہو اس شہرت کی بناء پر اس کے بارے میں صراحتاً انفرادی تعدیل کی حاجت نہیں ہے۔“

---

(۱) اللمع فی اصول الفقه ص ۴۱ مطبوعہ مصطفیٰ البابی الحلبی بمصر ۱۳۵۸ھ

(۲) علوم الحدیث المعروف بمقدمۃ ابن صلاح ص ۱۱۵۔

حافظ شمس الدین سخاوی ”الجواھرُ الدرر فی ترجمة شیخ الاسلام ابن حجر“ **میں رقم طراز ہیں:**

وسئل ابن حجر مما ذکره النسائی فی ”الضعفاء والمتروکین عن أبی حنیفة رضی اللّٰه أنه لیس بقوی فی الحدیث وهو کثیر الغلط والخطاء علی قلة روایته، هل هو صحیح؟ وهل وافقه علی هذا احد من ائمة المحدثین ام لا؟

فأجاب: النسائی من أئمة الحدیث والذی قاله إنما هو حسب ما ظهر له وأداه إلیه اجتهاده، ولیس کل أحد یؤخذ بجمیع قوله، وقد وافق النسائی علی مطلق القول فی جماعة من المحدثین، واستوعب الخطیب فی ترجمته من تاریخه أقاویلهم وفیها مایقبل ومایرد وقد اعتذر عن الإمام بانه کان یری أنه لایحدث إلا بما حفظه منذ سمعه إلی أن اداه، فلهذا قلت الروایة عنه وصارت روایته قلیلة بالنسبة لذلک، وإلا فهو فی نفس الأمر کثیر الروایة.

وفی الجملة: ترک الخوض فی مثل هذا أولی فإن لإمام وأمثاله من قفزوا القنطرة فما صار یؤثر فی أحد منهم قول أحد بل هم فی الدرجة اللتی رفعهم اللّٰه تعالیٰ إلیها من کونهم متبوعین یقتدیٰ بهم فلیعتمد هذا واللّٰه ولی التوفیق(۲)

”شیخ الاسلام حافظ ابن حجر عسقلانیؒ سے دریافت کیا گیا کہ امام نسائی نے اپنی کتاب ”الضعفاء والمتروکین“ **میں امام اعظم ابوحنیفہؒ کے متعلق جو یہ لکھا ہے کہ** ”إنه لیس بالقوی فی الحدیث وهو کثیر الغلط والخطاء علی قلة روایته“ **(کیا یہ درست ہے اور ائمہ محدثین میں کسی نے اس قول میں ان کی موافقت کی ہے؟) تو شیخ اسلام حافظ ابن حجر نے جواب دیا۔ نسائی ائمہ حدیث میں ہیں انھوں نے امام اعظمؒ کے بارے میں جو بات کہی ہے وہ اپنے علم واجتہاد کے مطابق کہی ہے۔ اور ہر شخص کی ہر بات لائق قبول نہیں ہوتی، محدثین کی جماعت میں سے کچھ لوگوں نے اس بات میں نسائی کی موافقت کی ہے اور امام خطیب بغدادی نے اپنی تاریخ میں امام اعظم کے تذکرے میں ان لوگوں کے اقوال**

---

(۲) بحوالہ اثر الحدیث الشریف فی اختلاف الائمہ رضی اللہ عنہم ص ۱۱۶-۱۱۷، از محقق علامہ محمد عوامہ۔

کو جمع کر دیا ہے جن میں لائق قبول اور قابل رد دونوں طرح کے اقوال ہیں۔ امام اعظمؒ کی قلت روایت کے بارے میں یہ جواب دیا گیا ہے کہ روایت حدیث کے سلسلے میں چونکہ ان کا مسلک یہ تھا کہ اسی حدیث کا نقل کرنا درست ہے جو سننے کے وقت سے بیان کرنے کے وقت تک یاد ہو، باب روایت میں اسی کڑی شرط کی بناء پر ان سے منقول روایتیں کم ہو گئیں ورنہ وہ فی نفسہٖ کثیر الروایت ہیں‘‘۔

’’بہر حال (امام اعظمؒ کے متعلق) اس طرح کی باتوں میں نہ پڑنا ہی بہتر ہے کیونکہ امام ابوحنیفہ اور ان جیسے ائمہ دین ان لوگوں میں ہی ں جو اس پل کو پار کر چکے ہیں (یعنی باب جرح میں ہماری بحث و تحقیق سے بالاتر ہیں) لہٰذا ان میں کسی کی جرح مؤثر نہیں ہوگی بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان بزرگوں کو امامت و مقتدائیت کی جو رفعت و بلندی عطا کی وہ اپنے اسی مقام بلند پر فائز ہیں۔ ان ائمہ حدیث کے متعلق اسی تحقیق پر اعتماد کرو اللہ تعالیٰ ہی توفیق کے مالک ہیں۔‘‘

ان اکابر علماء حدیث و فقہ کی مذکورہ بالا تصریحات اور حدیث و فقہ کے اس مسلمہ اصول کے پیش نظر اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی توثیق و تعدیل سے متعلق ائمہ جرح و تعدیل کے انفرادی اقوال پیش کئے جائیں پھر بھی بغرض فائدہ مزید امام اعظمؒ کی توثیق و تعدیل سے متعلق ذیل میں کچھ ائمہ جرح و تعدیل کے اقوال درج کئے جا رہے ہیں۔

۱- قال محمد بن سعد العوفی سمعت یحییٰ بن معین یقول کان أبو حنیفة ثقة لا یحدث بالحدیث إلا بما یحفظه و لا یحدث بمالا یحف.(۱)

> ’’محمد بن سعد عوفی کا بیان ہے کہ میں نے یحیٰ بن معین سے کہتے ہوئے سنا کہ امام ابوحنیفہ ثقہ تھے وہ اسی حدیث کو بیان کرتے تھے جو انہیں محفوظ ہوتی تھی اور جو حدیث یاد نہ ہوتی بیان نہیں کرتے تھے۔‘‘

۲- وقال صالح بن محمد الأسدی الحافظ سمعت یحییٰ بن معین

---

(۱) تہذیب الکمال از حافظ مزی ۷/۳۴۰ مطبوعہ موسسۃ الرسالہ ۱۴۱۸ھ۔

يقول كان أبو حنيفة ثقة فى الحديث. (۱)

”حافظ صالح بن محمد اسدی کہتے ہیں کہ میں نے یحییٰ بن معین کو کہتے ہوئے سنا کہ امام ابوحنیفہ حدیث میں ثقہ تھے۔“

۳- وقال على بن المدينى أبو حنيفة روى عنه الثورى، وابن المبارك وحماد بن زيد وهشيم ووكيع بن الجراح وعباد بن العوام وجعفر بن عون وهو ثقة لا بأس به. (۲)

امام بخاری کے استاذ کبیر علی بن المدینی کا قول ہے کہ امام ابوحنیفہ سے سفیان ثوری عبداللہ بن مبارک، حماد بن زید، ہشیم، وکیع بن الجراح، عباد بن عوام اور جعفر بن عون روایت کرتے ہیں اور وہ ثقہ تھے ان میں کوئی خرابی نہیں تھی۔

٤- قال محمد بن اسماعيل سمعت شبابة بن سوار كان شعبة حسن الراى فى أبى حنيفة. (۳)

شبابۃ بن سوار کا بیان ہے کہ امام شعبہ بن الحجاج امام ابوحنیفہ کے بارے میں اچھی رائے رکھتے تھے۔

٥- قال عبدالله بن أحمد بن إبراهيم الدورقى قال سئل يحيٰى بن معين وانا اسمع عن ابى حنيفة فقال: ثقة ماسمعت احد أضعّف هذا شعبة بن الحجاج يكتب إليه ان يحدث ويامره وشعبة شعبه. (۴)

”عبداللہ دورقی کہتے ہیں یحییٰ بن معین سے امام ابوحنیفہ کے متعلق پوچھا گیا اور میں سن رہا تھا کہ یحییٰ بن معین نے فرمایا وہ ثقہ ہیں میں نے کسی سے ان کی تضعیف نہیں سنی، یہ امام شعبہ ہیں جنھوں نے امام ابوحنیفہ کو مکتوب لکھا ہے کہ آپ حدیث روایت کیجئے یعنی

---

(۱) ایضاً۔

(۲) جامع بیان العلم وفضلہ ۲/۱۰۸۳، از حافظ ابن عبدالبر مطبوعہ دار الجوزیہ طبعۃ ثالثۃ ۱۴۱۸ھ۔

(۳) الانتقاء فى فضائل الائمة الثلاثة الفقهاء ص ۱۹۶ از حافظ ابن عبدالبر مطبوعہ دار البشائر الاسلاميه بيروت لطبعة الاولى ۱۴۱۷ھ۔

(۴) جامع بیان العلم وفضلہ ۲/۱۰۸۴۔

امام شعبہ نے انہیں حدیث کی روایت کا حکم دیا اور جرح وتعدیل کے فن میں شعبہ کا جو مقام ہے وہ سب کو معلوم ہے۔''

اس موقع پر بغرض اختصار ائمہ جرح وتعدیل میں سے امام یحییٰ بن معین، امام علی بن المدینی اور امام شعبہ بن الحجاج کے اقوال پر اکتفاء کیا جارہا ہے ورنہ "یقول امام ابن عبدالبر: الذین رووا عن أبی حنیفة ووثقوہ وأثنوا علیه أکثر من الذین تکلموا فیه"

یعنی امام ابوحنیفہ سے حدیث کی روایت کرنے اور ان کی توثیق وتعریف کرنے والوں کی تعداد ان پر کلام کرنے والوں کی تعداد سے بہت زیادہ ہے۔

پھر ان مذکورہ ائمہ کا فن جرح وتعدیل میں جو مقام ومرتبہ ہے وہ اہل علم سے پوشیدہ نہیں کہ ان میں سے صرف ایک کی تعدیل کسی کی عدالت کے ثبوت کیلئے کافی سمجھی جاتی ہے۔

امام ابوحنیفہ اور فن جرح وتعدیل

سراج الامت، سید الفقہاء نہ صرف ایک عادل وضابط حافظ حدیث تھے بلکہ ائمہ محدثین کی اس صف میں شامل تھے جو علوم حدیث اور رجال حدیث میں مہارت، نیز ذکاوت وفراست وعدالت وثقاہت میں اس معیار پر تھے جن کے فیصلوں پر راویانِ حدیث کے مقبول وغیر مقبول ہونے کا مدار ہے۔

چنانچہ الامام الناقد الحافظ ابوعبداللہ شمس الدین محمد الذہبی المتوفی ۷۴۸ھ طبقات المحدثین کے فن میں اپنی جامع ونافع ترین کتاب ''تذکرۃ الحفاظ'' کے سرورق پر رقم طراز ہیں:

ھذہ تذکرۃ اسماء معدلی حملة العلم النبوی ومن یرجع اجتھادھم فی التوثیق والتضعیف والتصحیح والتعریف (۱)

> ''یہ مستقیم السیرت حاملین حدیث اور رجال کی توثیق وتضعیف نیز حدیث کی تصحیح وتضعیف میں جن کے اجتہاد ورائے کی جانب رجوع کیا جاتا ہے کے اسماء کا تذکرہ ہے۔''

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ ۱/۱ مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بلا تاریخ۔

اور تذکرہ میں امام ذہبی پانچویں طبقہ کے حفاظ حدیث میں امام صاحب کا بھی ذکر ہے(۱) جس سے صاف ظاہر ہے کہ امام ذہبی نے (جن کے بارے میں حافظ ابن حجر کا فیصلہ ہے کہ نقد رجال میں استقراء تام کے مالک ہیں) کے نزدیک امام اعظم ابوحنیفہ کا شمار ان ائمہ حدیث میں ہے جن کے قول سے جرح وتعدیل کے باب میں سند پکڑی جاتی ہے۔

پھر یہی امام ذہبی اپنے رسالہ ”ذکر من یعتمد قوله فی الجرح والتعدیل“ میں لکھتے ہیں۔

فاول من زکیّ وجرّح عند انقراض عصر الصحابة

۱- الشعبی، ۲-وابن سیرین ونحوهما حفظ عنهم توثیق أناس وتضعیف آخرین. سبب قلة الضعفاء فی ذلك الزمان: قلة متبوعهم من الضعفاء إذا کثر المتبوعین صحابة عدول واکثرهم من غیرالصحابة بل عامتهم ثقات صادقون یعون ما یرون وهم کبار التابعین ... ثم کان فی المائة الثانیة فی اوائلها جماعة من الضعفاء من اوساط التابعین وصغارهم ... فلما کان عند انقراض امة التابعین فی حدود الخمسین ومائة تکلم طائفة من الجهابذة فی التوثیق والتضعیف، ۳- فقال ابوحنیفة ما رأیت أکذب من جابر الجعفی الخ.(۲)

”عہد صحابہ رضی اللہ عنہم کے خاتمہ کے بعد اولین جرح وتعدیل کرنے والوں میں امام شعبی اور امام ابن سیرین ہیں ان دونوں بزرگوں سے کچھ لوگوں کی توثیق اور کچھ دوسرے لوگوں کی جرح محفوظ ہے۔ اس عہد میں ضعفاء کی کمی کا سبب یہ ہے کہ اس زمانہ کے متبوعین میں حضرات صحابہ ہیں جو سب کے سب عادل ہی ہیں اور غیر صحابہ میں کبار تابعین ہیں جو عام طور پر ثقہ صادق اور اپنی مرویات کو محفوظ رکھنے والے تھے پھر دوسری صدی ہجری کے اوائل میں اوساط وصغار تابعین میں ضعفاء کی ایک جماعت ہے۔ پھر

---

(۱) ایضاً/ ۱۶۸۔

(۲) اربع رسائل فی علوم الحدیث، ص۱۷۲-۱۷۵ مطبوعہ دارالبشائر الاسلامیہ الطبعة السادسة ۱۴۱۶ھ بتحقیق علامہ محدث عبدالفتاح ابوغدہ۔

جب ۱۵۰ھ کے حدود میں اکثر اور عام تابعین ختم ہو گئے تو ناقدین رجال کی ایک جماعت نے توثیق وتضعیف کے باب میں کلام کیا چنانچہ امام ابوحنیفہ نے جابر جعفی پر جرح کرتے ہوئے فرمایا: ”ما رأیت اکذب من جابر الجعفی“ جابر جعفی سے بڑا جھوٹا میں نے نہیں دیکھا۔“

جابر جعفی کے بارے میں امام صاحب کی اس جرح کی بنیاد پر عام طور پر ائمہ رجال نے یہی فیصلہ صادر کیا ہے کہ جابر جعفی کی روایت قابل اعتبار نہیں ہے۔ چنانچہ امام ترمذی کی کتاب العلل میں امام صاحب کے حوالہ سے جابر جعفی پر جرح نقل کی ہے وہ لکھتے ہیں:

حدثنا محمود بن غیلان، حدثنا ابویحییٰ الحمانی قال سمعت أبا حنیفة یقول: ما رأیت احدًا أکذب من جابر الجعفی و لا أفضل من عطاء.(۱)

> ”امام ترمذی ناقل ہیں کہ مجھ سے محمود بن غیلان نے اور انھوں نے اپنے شیخ ابویحییٰ حمّانی سے نقل کیا کہ میں نے ابوحنیفہ سے کہتے ہوئے سنا کہ جابر جعفی سے بڑا جھوٹا اور عطا بن ابی رباح سے افضل میں نے نہیں دیکھا۔“

جرح وتعدیل کے باب میں امام صاحب کے اس قول کو امام ترمذی کے علاوہ امام ابن حبان نے اپنی صحیح میں، حافظ ابن عدی نے ”الکامل فی الضعفاء“ میں اور حافظ ابن عبدالبر نے ”جامع بیان العلم وفضلہ“ میں نقل کیا ہے۔

امام بیہقی کتاب القرأت خلف الامام میں لکھتے ہیں۔

”ولو لم یکن فی جرح الجعفی الاقول ابی حنیفة رحمه الله لکفاه به شرا فانه رأه و جرّبه و سمع منه ما یوجب تکذیبه فاخبر به.“(۲)

”جابر جعفی کی جرح میں اگر امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ہی کا قول ہوتا تو بھی اس کے مجروح ہونے کیلئے یہ کافی تھا کیونکہ امام صاحب نے اسے دیکھا اور اس کا تجربہ کیا تھا اور اس

---

(۱) جامع ترمذی ۲/۳۳۳ طبع مصر ۱۲۹۲ بحوالہ ابن ماجہ اور علم حدیث از محقق علامہ عبدالرشید نعمانی ص ۲۲۹، تہذیب التہذیب ۲/ ۴۸۔

(۲) ص ۱۰۸-۱۰۹ مطبوعہ دہلی ۱۴۱۶ھ

سے ایسی باتیں سنی تھیں جس سے اس کی تکذیب ضروری تھی لہٰذا انھوں نے اس کی خبر دی“

اور امام ابو محمد علی بن احمد المعروف بہ ابن حزم اپنی مشہور کتاب ”المحلی فی شرح المجلی“ میں لکھتے ہیں۔

جابر الجعفی كذاب وأول من شهد عليه بالكذب ابو حنيفة(۱)

جابر جعفی کذاب ہے اور سب سے پہلے جس نے اس کے کاذب ہونے کی شہادت دی وہ امام ابو حنیفہ ہیں۔

ان نقول سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ جرح و تعدیل کے باب میں امام بخاری، امام علی بن المدینی استاذ امام بخاری، امام احمد بن حنبل، یحییٰ بن معین، یحییٰ بن سعید قطان، عبدالرحمٰن بن مہدی، امام شعبہ وغیرہ ائمہ جرح و تعدیل کے اقوال کی طرح امام ابو حنیفہ کے اقوال سے بھی ائمہ حدیث احتجاج و استدلال کرتے ہیں، کتب رجال مثلاً تہذیب الکمال از امام مزی، تہذیب التہذیب از امام ذہبی، تہذیب التہذیب از حافظ ابن حجر عسقلانی وغیرہ میں جرح و تعدیل سے متعلق امام صاحب کے دیگر اقوال بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔

اس مختصر مقالہ میں ان سب اقوال کے نقل کی گنجائش نہیں کسی دوسرے موقع پر ان شاء اللہ اس اختصار کی تفصیل بھی پیش کر دی جائے گی۔ یار زندہ صحبت باقی۔

وآخر دعوانا ان الحمد الله رب العالمين والصلاة والسلام على سيد المرسلين وعلى آله وأصحابه وأتباعه أجمعين.

☆ ☆ ☆

---

(۱) ۳۷۸۱ طبع بیروت۔

امام ابوداؤد اور ان کی سنن

امام ابوداؤد تیسری صدی ہجری کے اوائل میں اس سرائے فانی میں وارد ہوئے اور زندگی کی تہتر بہاریں دیکھ کر رہگرائے عالم جاودانی ہوگئے، تاریخ تمدن وثقافت میں یہ صدی اسلامی علوم وفنون کی جمع وتدوین اور بحث وتحقیق کے لحاظ سے سنہری صدی شمار ہوتی ہے، چنانچہ امام ابوداؤد کی علمی حیات پر سرسری نگاہ ڈالنے ہی سے ان کے شیوخ اور اساتذہ کی فہرست میں امام احمد بن حنبل، یحییٰ بن معین، اسحاق بن راہویہ، ابوبکر بن ابی شیبہ، عبداللہ بن مسلمہ القعنبی، ابوخیثمہ زہیر بن حرب، سعید بن منصور، ہناد بن سری مسدد بن مسرہد وغیرہ جیسے اکابر ائمہ حدیث، ہم عصر علماء کی جماعت میں امام بخاری، مسلم، ابوحاتم الرازی، ابوزرعہ الرازی جیسے اساطین حدیث ورجال، اور ان کے تلامذہ کی صف میں امام ترمذی، نسائی، ابوعوانہ الاسفرائینی، ابوبشر الدولابی، زکریا الساجی محمد بن نصر المروزی، ابوبکر محمد بن یحییٰ الصولی جیسے نابغۂ روزگار محدثین وعلماء نظر آتے ہیں جس سے اس عہد کے علمی نشاط وشباب کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

نام ونسب

سلیمان ابن الاشعث بن اسحاق بن بشیر، بن شداد، بن عمرو، بن عمران، ابوداؤد الازدی السجستانی (۱)

---

(۱) تاریخ بغداد از خطیب بغدادی، ج:۹، ص:۵۵ وتہذیب، تاریخ دمشق از ابن عساکر، ج:۶، ص:۲۴۶ وفیات الاعیان از ابن خلکان، ج:۱، ص:۳۸۲ وتہذیب الکمال از مزیؒ، ج:۳، ص:۳۶۵ وتذکرۃ الحفاظ، ج:۲، ص:۵۹۱ وسیر اعلام النبلاء، ج:۱۳، ص:۲۰۵، از الذہبی، والبدایہ والنہایۃ ابن کثیر، ج:۱۱، ص:۶۴۔ مطبوعہ دار احیاء التراث العربی ۱۴۱۳ھ-۱۹۹۳ء میں عرو بن عمران کی بجائے یحییٰ بن عمران ہے جو بلا شبہ طباعتی غلطی ہے۔

امام ابوداؤد کے والد ''الاشعث'' کے اوپر سلسلۂ نسب میں قدرے اختلاف ہے چنانچہ حافظ عبدالرحمٰن بن ابی حاتم نے کتاب الجرح والتعدیل میں نسب نامہ یوں درج کیا ہے۔

سلیمان بن الاشعث بن شداد بن عمرو بن عامر الازدی ابوداؤد السجستانی (۱) جبکہ امام ابوداؤد کے دو اہم تلامذہ ابن داسہ اور ابوعبید الآجرّی نے اوپر مذکور سلسلۂ نسب کو بیان کیا ہے البتہ انھوں نے صرف ''بشیر'' تک کا ہی ذکر کیا ہے۔ آگے کا اضافہ خطیب بغدادی کا ہے۔ (۲)

ابن داسہ اور آجرّی ہی کے بیان پر خطیب بغدادی، مزّی اور ذہبی نے اعتماد کیا ہے۔ حافظ ابوطاہر السّلفی بھی اسی کو راجح قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں "هذا القول أمثل والقلب اليه أميل" یہی قول حق سے قریب تر ہے اور دل کا رجحان اسی جانب زیادہ ہے۔ (۳) اسی لیے یہی نسب نامہ درست ہے۔ واللہ اعلم

امام ابوداؤد کی پانچویں پشت اور شجرہ میں مذکور آخری دادا کے بارے میں حافظ ابن عساکر نے یہ بھی تصریح کی ہے کہ یہ جنگ صفین میں حضرت علی مرتضٰی رضی اللہ عنہ کے پرچم تلے لڑتے ہوئے شہید ہوئے۔ (۴)

''الازدی'' ازد کی جانب نسبت ہے، جو یمن کا معروف قبیلہ ہے صاحب قاموس لکھتے ہیں "الأزد ابن الغوث أبو حَيٍّ باليمن ومن أولاده الانصار كلهم" ازد ابن الغوث یمن کے ایک قبیلہ کے باپ ہیں اور سارے انصار مدینہ انھیں کی اولاد ہیں۔ (۵) امام ابوداؤد کا بھی نسبی تعلق اسی یمنی قبیلہ سے ہے۔

''السجستانی'' سجستان (سیستان) کی طرف نسبت ہے۔ ابن الاثیر الجزری لکھتے ہیں هذه النسبة إلى سجستان وهی البلاد المعروفة ينسب إلى هذه النسبة جماعة

---

(۱) ج ۴، ص: ۱۰۲ و ۱۰۳ رقم الترجمہ ۴۵۶۔

(۲) سیر اعلام النبلاء، ج: ۱۳، ص: ۲۰۵۔

(۳) تہذیب الاسماء واللغات از نووی، ج: ۲، ص: ۲۲۵۔

(۴) تہذیب تاریخ دمشق از ابن عساکر، ج: ۶، ص: ۲۴۶۔

(۵) القاموس المحیط ص ۳۳۸ مطبوعہ موسسۃ الرسالہ ۱۴۱۶ھ-۱۹۹۶ء۔

من العلماء منهم الامام أبو داؤد سليمان بن الأشعث السجستانى صاحب كتاب السنن (۱) یہ سجستان کی جانب نسبت ہے جو ایک معروف بلاد ہے۔ علماء کی ایک جماعت اس کی طرف منسوب ہے، جن میں امام ابوداؤد سجستانی ''صاحبِ سُنن'' بھی ہیں۔

حافظ ذہبی اس بلاد معروفہ کی تفصیل یوں رقم کرتے ہیں:

واما سِجّستان الإقليم الذى منه الإمام أبو داؤد ، فهو إقليم صغير منفرد، يتاخم بالسند ، غربيّه بلد هراة وجنوبيّه مفازة بينه وبين اقليم فارِس و كرمان، وشرقيّه مفازة بَرِّيَةٌ بينه وبين مكران التى هى قاعدة السند ... وشماليّه أول الهند''(۲)

> سجستان جس سے امام ابوداؤد کا وطنی تعلق ہے ایک چھوٹا سا علیحدہ صوبہ ہے جس کی سرحد سندھ سے ملتی ہے اس کی جانب مغرب شہر ہراۃ ہے اور جنوبی سمت ایک وسیع بیابان ہے جو سجستان اور فارس و کرمان کے درمیان حائل ہے جانب مشرق بھی بیابان اور خشک زمین ہے جو سجستان اور مکران (جو سندھ کا ایک بڑا شہر ہے) کے درمیان واقع ہے اور اس کا شمالی حصہ ہندوستان کی سرحد سے ملحق ہے۔

ان واضح تصریحات کے برخلاف ''ابوموسیٰ صاحب زیادات'' روایت کرتے ہیں کہ میں نے ''محمد بن نصر'' الملقب بہ قل ھو اللہ احد خواں سے کہتے ہوئے سنا کہ ''أبو داود السجستانى الإمام هو من قرية بالبصرة يقال لها سجستان وليس من سجستان خراسان''(۳) امام ابوداؤد سجستانی بصرہ کے سجستان نامی ایک قریہ کے ہیں خراسان سے ملحق سجستان کے نہیں ہیں۔

اس قول کو حافظ منذری نے تہذیب سنن ابی داؤد کے مقدمہ میں اور ابن خلکان

---

(۱) اللباب فی تہذیب الانساب، ج:۱،ص:۴۳۱۔

(۲) سیر اعلام النبلاء، ج:۱۳،ص:۲۲۰۔

(۳) زیادات ابی موسیٰ علی الانساب المتفقة لابن طاہر ص:۱۹۹ بواسطہ حاشیۃ الاکمال، ج:۴،ص:۵۵۰ لابن ماکولا۔

نے وفیات الاعیان میں صیغۂ تمریض کے ساتھ ذکر کیا ہے اور امام منذری نے ساتھ ہی یہ تصریح بھی کردی ہے کہ "والأول أكثر و أشهر"

محقق یاقوت حموی نے بھی ابوموسیٰ کی بیان کردہ روایت ذکر کی ہے مگر غلطی سے اس کی نسبت حافظ ابوالفضل محمد بن طاہر مقدسی کی جانب کردی ہے جبکہ اس کے راوی ابوموسیٰ ہیں ابوالفضل نہیں۔ حموی اس روایت کے نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ محمد بن نصر المذکور کا بیان ہے کہ میں نے اہل بصرہ سے سجستان نامی بستی کے بارے میں تحقیق کی تو کسی کو بھی اس قریہ کا علم نہیں تھا۔ پھر تذکروں میں مذکور ہے کہ امام ابوداؤد کے صاحبزادے ابوبکر عبد اللہ نیساپور کے مکتب میں امام اسحاق بن راہویہ کے لڑکوں کے ساتھ پڑھتے تھے۔ اور تذکرہ نگار یہ بھی لکھتے ہیں کہ ابوبکر نے حدیث پاک کی تحصیل کا آغاز شیخ مشرق محمد بن اسلم الطّوسی سے کیا(۱)۔ اس وقت ان کی عمر دس سال سے بھی کم تھی، علاوہ ازیں حفاظ میں سے کسی نے بھی یہ ذکر نہیں کیا ہے کہ امام ابوداؤد غیر معروف سجستان کے تھے۔ (۲)

معجم البلدان میں مذکور یہ قرائن بتارہے ہیں کہ امام ابوداؤد کا مسقطِ راس اور آبائی وطن موجودہ افغانستان کا صوبہ سجستان ہی ہے اور زیادات علی الانساب المتفقہ میں مذکور روایت بس روایت ہی ہے جس کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔

تاریخ پیدائش اور تعلیم و تحصیل

امام ابوداؤدؒ کے سارے تذکرہ نگار بیک قلم لکھتے ہیں کہ ان کی ولادت ۲۰۲ھ میں ہوئی خود امام ابوداؤد نے بھی اپنی پیدائش کی یہی تاریخ بتائی ہے۔ امام حاکم کہتے ہیں "مولده سِجستان وله ولسلفه إلى الآن عُقَد و أملاك و أوقاف" (۳) امام ابوداؤد کی جائے پیدائش سجستان ہے ان کی اور ان کے بزرگوں کی جائیدادیں، املاک اور اوقاف

---

(۱) امام ذہبی لکھتے ہیں: فأول شيخ سمع منه محمد بن أسلم الطوسی اولین شیخ جن سے ابوبکر ابن ابی داؤد نے حدیث کی سماعت کی محمد ابن اسلم طوسی ہیں۔

(۲) معجم البلدان ج:۳، ص:۲۴۔

(۳) سیر اعلام النبلاء، ج:۱۳، ص:۲۱۷۔

وہاں اب تک موجود ہیں۔

امام ابوداوٗد کی نشو ونما، تربیت و پرورش سے متعلق تفصیلات کے بارے میں ان کے سوانح نویس خاموش ہیں نیز امام صاحب نے طلب وتحصیل کا آغاز کس وقت کیا اس کا ذکر بھی کسی نے نہیں کیا ہے، البتہ خود امام ابوداوٗدؒ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اٹھارہ برس کی عمر میں انھوں نے طلب علم کے لیے گھر سے رخت سفر باندھا۔ ظاہر ہے اس رحلت سے پہلے اپنے شہر کے اساتذہ سے ابتدائی ضروری علوم وفنون کی تحصیل وتکمیل کر لی ہوگی چنانچہ امام الحاکم لکھتے ہیں: ”وقد كتب بخراسان قبل خروجه الى العراق في بلده وهراة“(۱) عراق کی رحلت سے قبل انھوں نے خراسان، اپنے شہر اور ہراۃ میں تحصیل علم کیا۔ بعد ازاں مزید علمی لیاقت کے لیے مراکز علمیہ کا سفر کیا۔ آپ کے تلمیذ رشید ابوعبید الآجری ناقل ہیں:

سمعت سليمان بن الأشعث أبا داؤد يقول ولدت سنة اثنتين ومأتين، وصليت على عفان ببغداد سنة عشرين، وسمعت ابن عمر الضرير مجلسا واحدا، ودخلت البصرة وهم يقولون أمس مات عثمان المؤذن، وتبعت عمربن حفص بن غياث ولم أسمع منه شيئاً. (۲)

> ابوعبید الآجرّی کا بیان ہے کہ میں نے امام ابوداوٗد سے یہ کہتے ہوئے سنا کہ میری ولادت ۲۰۲ھ میں ہوئی اور میں نے ۲۲۰ھ میں عفان بن مسلم کی نماز جنازہ بغداد میں پڑھی اور ابن عمر الضریر سے صرف ایک مجلس میں حدیث کی سماعت کی، اور بصرہ اس وقت پہنچا کہ وہاں لوگ کہہ رہے تھے کہ گذشتہ کل عثمان بن الہیثم المؤذن انتقال کر گئے، اور عمر بن حفص بن غیاث کے پیچھے پیچھے ان کے گھر تک گیا مگر ان سے کچھ سننے کا اتفاق نہ ہوا۔

امام ذہبی لکھتے ہیں کہ ابوعمر الضریر کی وفات ماہ شعبان ۲۲۰ھ میں ہوئی اور ان سے

---

(۱) تہذیب الکمال از مزّی مطبوعہ مؤسسۃ الرسالہ ۱۴۱۸ھ-۱۹۹۸ء، ج:۳، ص: ۶۶۵۔

(۲) سوالات ابوعبید الآجرّی، ج:۲، ص: ۲۹۴ و ۲۹۵۔

ایک ماہ قبل یعنی رجب میں عثمان بن الہیثم فوت ہوئے۔ (۱)

امام ابوداؤدؒ کے اس بیان سے واضح ہے کہ وہ اٹھارہ برس کی عمر میں تحصیل علم کی غرض سے گھر سے نکلے اور اس وقت کے عظیم علمی مرکز بغداد پہنچے، یہی ان کا اولین علمی سفر بتایا جاتا ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ نوعمری ہی سے انھیں تحصیل علم کا شوق تھا اور اسکے لیے وطن اور اقربا سے مفارقت اور اسفار کی صعوبت انکے جذبۂ صادق کی راہ میں حائل نہیں ہوسکی۔

تعلیمی اسفار

امام ابوداؤد ان اکابر ائمہ حدیث میں ہیں جنھوں نے حدیث پاک کی تعلیم و تحصیل کے لیے کثرت سے اسفار کیے اور اپنے عہد کے مراکز علمیہ میں پہنچ کر وہاں کے شیوخ و اساتذہ سے احادیث کی سماعت و کتابت کی۔ چنانچہ حافظ ابن کثیر صراحت کرتے ہیں کہ

أحد أئمة الحديث الرحالين فى الآفاق فى طلبه ... وسمع الكثير عن مشائخ البلدان فى الشام، ومصر، والجزيرة، والعراق، وخراسان وغير ذلك. (۲)

امام ابوداؤد ان ائمہ حدیث میں سے ایک ہیں جنھوں نے حدیث کی طلب میں آفاق کا چکر لگایا ہے، شام، مصر، جزیرہ، عراق، خراسان وغیرہ شہروں کے بہت سارے مشائخ سے احادیث کی سماعت کی۔

حافظ خطیب بغدادی لکھتے ہیں:

”أحد من رحل وطوّف وجمع وصنّف وكتب عن العراقيين والخراسيين والمصريين والجزريين“ (۳)

---

(۱) سیر اعلام النبلاء، ج:۱۳، ص:۲۰۴، امام ذہبی سیر اعلام النبلاء ج:۱۰، ص:۲۱۰، امام ابوداؤد کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ عثمان المؤذن کی وفات ۱۱/رجب ۲۲۰ھ کو ہوئی۔

ے حافظ ذہبی لکھتے ہیں: ”فأبوداؤد أول ما قدم من البلاد دخل بغداد وهو ابن ثمان عشرة سنة وذلك قبل أن يروى البصرة، ثم ارتحل من بغداد البصرة“ سیر اعلام النبلاء، ج:۱۳، ص:۲۲۱۔

(۲) البدایۃ والنهایۃ مطبوعہ دار احیاء التراث العربی ۱۴۱۳ھ-۱۹۳۰ء، ج:۱۱، ص:۶۴۔

(۳) تاریخ بغداد، ج:۹، ص:۵۵۔

امام ابوداؤد ان محدثین میں سے ایک ہیں جنھوں نے طلب حدیث کے لیے اسفار کیے، مراکز علمیہ کا چکر لگایا، احادیث جمع کیں، کتابیں تصنیف کیں، عراق، شام، مصر اور جزیرہ کے شیوخ سے احادیث نقل کیں۔

امام مزّی نے ان پر شیوخ حجاز وغیرہ کا اضافہ کیا ہے۔

حافظ ابن عساکر یوں تحریر کرتے ہیں:

”وسمع الحديث بدمشق، ومصر، والبصرة، والكوفة، وبغداد، وخراسان من خلق.“ (۱)

دمشق، مصر، بصرہ، کوفہ، بغداد اور خراسان میں بہت سارے لوگوں سے احادیث کی سماعت کی۔

امام ابوداؤد کے تذکرہ نویسوں کی تصریحات نیز ان کے اساتذہ کی فہرست سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے بغداد، بصرہ، کوفہ، مکہ معظّمہ، مدینہ منورہ، دمشق، حلب، حمص، ہراۃ، مرو، بلخ، بغلان، نیشاپور، رے، واسط، جزیرہ، بیروت، حرّان، رملہ، مصر، طرسوس وغیرہ بلاد اسلامیہ کے شیوخ سے حدیث کی سماعت کی۔

اسفار کی ضروری تفصیلات

امام ابوداؤد نے اپنی رحلۃ علمیہ اور اسفار کی وقتاً فوقتاً جو مختصر روداد اور اپنے شیوخ کے متعلق جو معلومات دی ہیں ان سے اوپر مذکور اجمال کی بعض تفصیلات یوں سامنے آتی ہیں کہ امام ابوداؤد جو ۲۰۲ھ میں موجودہ افغانستان کے ایک صوبہ یا ضلع سجستان میں پیدا ہوئے، طلب علم کے لیے ۲۲۰ھ میں بغداد میں نظر آتے ہیں جہاں عفان بن مسلم کی نماز جنازہ میں حاضری کا شرف انھیں حاصل ہوا، بغداد سے اسی سال بصرہ آ گئے جہاں لوگوں سے انھیں معلوم ہوا کہ کل گذشتہ عثمان بن الہیثم المؤذن اللہ کو پیارے ہو گئے، گذشتہ سطور میں یہ بات گذر چکی ہے کہ ”عثمان المؤذن کی وفات ۱۱/رجب ۲۲۰ھ کو ہوئی، بصرہ میں

---

(۱) تہذیب تاریخ دمشق، ج:۶، ص:۲۴۶۔

ان کا قیام ۲۲۱ھ تک رہا اور محمد بن بشار المعروف بہ بُندار، ابوموسیٰ الزمن وغیرہ سے وہاں حدیث کی سماعت کی چنانچہ خود امام ابوداؤد کا قول ہے "کتبت عن بُندار وأبی موسیٰ سنة احدی وعشرین" (۱) میں نے بندار اور ابوموسیٰ الزمن سے ۲۲۱ھ میں احادیث نقل کیں، اسی سال یہاں سے کوچ کر کے کوفہ پہنچے خود انھیں کا بیان ہے "دخلت الکوفة سنة ۲۲۱ھ" (۲) میں ۲۲۱ھ میں کوفہ پہنچا، بظاہر یہیں سے عازم مکہ معظّمہ ہوئے اور وہاں پہنچ کر امام عبداللہ بن مسلمہ القعنبی المتوفی ۲۲۱ھ سے احادیث کی تحصیل کی۔ مکہ معظّمہ سے ۲۲۲ھ میں دمشق کے لیے رخت سفر باندھا جہاں ابوالنضر اسحاق بن ابراہیم الدمشقی سے اخذ علم کیا، حافظ الآجری لکھتے ہیں کہ امام ابوداؤدؒ نے ایک دن اسحاق الدمشقی کا ذکر کیا اور فرمایا: "مارأیت بدمشق مثله کان کثیر البکاء کتبت عنه سنة اثنین وعشرین" (۳) میں نے دمشق میں ان جیسا نہیں دیکھا وہ بہت رونے والے تھے میں نے ان سے ۲۲۲ھ میں حدیثیں لکھیں، یہاں سے ۲۲۳ھ میں پھر بصرہ آ گئے اور محمد بن کثیر العبدی البصری المتوفی ۲۲۳ھ کی نماز جنازہ میں شریک ہوئے، اسی موقع پر ان کی ملاقات حفص بن عمر الحوضی سے ہوئی۔ (۴) بصرہ سے جانب حمص متوجہ ہوئے اور یہاں حیوۃ بن الشریح الحمصی المتوفی ۲۲۴ھ اور حافظ یزید بن عبدربہ المتوفی ۲۲۴ھ نیز دیگر شیوخ حدیث سے اخذ واستفادہ کیا۔ (۵) حمص کا سفر کئی بار کیا جس کا ذکر امام ابوداؤد نے محمد بن اسماعیل بن عیاش کے تذکرہ میں کیا ہے۔ (۶)

۲۲۷ھ میں وہ بیروت وارد ہوئے اور ابن ابی سمینہ کی رفاقت میں عباس بن الولید بن مزید البیروتی سے حدیث کی نقل وسماع کیا۔ (۷) بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان اسفار

---

(۱) سوالات ابوعبید الآجرّی، ج:۲، ص:۱۴۲۔

(۲) تہذیب الکمال ج:۱۳، ص:۲۶۵۔

(۳) سوالات ابوعبید الآجرّی، ج:۲، ص:۲۲۵۔

(۴) ایضاً ج:۱، ص:۴۴۲۔

(۵) سیر اعلام النبلاء، ج:۱۳، ص۲۰۴۔

(۶) سوالات آجری، ج:۲، ص:۲۳۱۔ (۷) ایضاً، ج:۲، ص:۲۵۴ و۲۵۵۔

کے دوران وہ بغداد آتے جاتے رہے چنانچہ مسدد بن مسرھد کے سانحۂ ارتحال کے متعلق ان کا یہ بیان ہے کہ مسدد کی وفات ۲۲۸ھ میں ہوئی اور میں نے اس حادثہ کی خبر امام احمد بن حنبل کو دی۔ (۱) بغداد ہی کے بعض اسفار میں ان کی ملاقات امام ابوحاتم الرازی سے ہوئی اور ان کی خدمت میں بغرض سلام حاضر ہوئے۔ (۲) ۲۳۰ھ میں وہ بمقام رملہ محمد بن سماعہ الرملی سے تحصیل علم کرتے نظر آتے ہیں (۳) اسی سال ان کے خلف صدق ابوبکر عبداللہ بن ابوداؤد کی سجستان میں ولادت ہوئی۔ (۴)

۲۳۵ھ میں ھیثم بن خالد الجہنی سے روایت کی (۵) ھیثم ابن خالد الجہنی کوفی ہیں اس لیے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بلاد شام وغیرہ سے لوٹ کر کوفہ آئے اور یہیں ان سے سماعت کی۔ واللہ اعلم

برادر کبیر کی رفاقت

ان اسفار میں امام ابوداؤد کے بڑے بھائی محمد بن الاشعث السجستانی ان کے رفیق تھے۔ امام ذہبی لکھتے ہیں: ”كان أخوه محمد بن الأشعث أسن منه بقليل و كان رفيقا له فى الرحلة ... ومات كهلاً قبل أبى داؤد بمدة“ (۶) امام ابی داؤد کے بھائی محمد بن الاشعث ان سے کچھ بڑے تھے اور رحلت علمیہ میں ان کے رفیق سفر تھے، امام ابوداؤد سے بہت پہلے ادھیڑ عمر میں اُن کی وفات ہوئی۔

وقفہ وقفہ سے وطن مالوف کی مراجعت

اس موقع پر یہ بات ملحوظ رہنی چاہیے کہ اگرچہ اس کی تصریح نہیں ملتی کہ امام ابوداؤد

---

(۱) ایضا، ج:۲، ص:۵۴۔

(۲) کتاب الجرح والتعدیل از عبدالرحمٰن بن ابی حاتم ج:۴، ص:۱۰۱-۱۰۲۔

(۳) سوالات الآجری، ج:۲، ص: ۲۹۵۔

(۴) سیر اعلام النبلاء، ج:۱۳، ص:۲۲۲۔

(۵) سوالات ابوعبید الاجرّی، ج:۱، ص:۱۸۵۔

(۶) سیر الاعلام النبلاء، ج:۱۳، ص:۲۲۱۔

اپنے اس پندرہ سالہ سفر میں کبھی وطن مالوف بجستان بھی گئے، مگر وہاں ان کی جائیداد، املاک اوراوقاف کا ہونا، ان کا شادی شدہ ہونا اور وطن میں بیوی کی موجودگی، نیز ۲۳۰ھ میں صاحبزادے کی پیدائش ایسے قرائن ہیں جن سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اپنے اس طویل علمی اسفار کے دوران وقفہ، وقفہ سے وہ بجستان آتے رہے تاکہ املاک واوقاف کی نگرانی اور خانگی ضروریات کی کفالت فی الجملہ ہوتی رہے۔ البتہ ۲۳۸ھ میں امام ابوداؤد کی بجستان میں موجودگی حافظ ذہبی کی درج ذیل عبارت سے معلوم ہوتی ہے۔

عبدالله بن سليمان بن الأشعث، الإمام العلامة شيخ بغداد أبوبكر السجستانى صاحب التصانيف ولد بسجستان فى سنة ثلاثين ومئتين وسافر به أبوه وهوصبى فكان يقول رأيت جنازة اسحاق بن راهويه ، قلت و كانت فى سنة ثمان و ثلاثين و مئتين، قال وأول شيخ سمع عنه محمد بن أسلم الطوسى و سُر أبوه لجلالة محمد بن أسلم"(۱)

الامام، العلامہ، شیخ بغداد عبداللہ بن سلیمان بن الاشعث، ابوبکر السجستانی ۲۳۰ھ میں بجستان میں پیدا ہوئے اور بچپن ہی میں ان کے والد اپنے ساتھ انھیں سفر میں لے گئے، ابوبکر عبداللہ کہتے تھے کہ میں نے نیسا پور میں اسحاق بن راہویہ کے جنازہ کو دیکھا، امام ذہبی کہتے ہیں کہ امام ابن راہویہ کے جنازہ کی یہ رویت ۲۳۸ھ میں واقع ہوئی اور اولین شیخ جن سے ابوبکر بن ابی داؤد نے سماعت کی شیخ مشرق محمد بن اسلم الطّوسی ہیں۔ شیخ طوسی کی علم وفضل میں جلالت شان کی بناء پر (بیٹے کے اس معنوی شرف سے) امام ابوداؤد کو بڑی مسرت ہوئی۔

صاحبزادے ابوبکر کی معیت

اسی طرح امام الحاکم بیان کرتے ہیں:

---

(۱) سیر اعلام النبلاء، ج:۱۳، ص:۲۲۲

ثم رحل بابنه أبی بكر بقية المشائخ، وجاء إلى نيساپور فسمع ابنه من إسحاق ابن منصور، ثم خرج إلى سجستان وطالع بها اسبابه، وانصرف إلى البصرة واستوطنها“(۱)

> پھر اپنے صاحبزادے ابوبکر کے ساتھ بقیہ مشائخ کی خدمت میں حاضر ہوئے، نیساپور آئے جہاں صاحبزادے ابوبکر نے اسحاق بن منصور الکوشج المتوفی ۲۵۱ھ سے درس حدیث لیا۔ پھر ”وطن“ سجستان کی مراجعت کی اور وہاں گھر کے اسباب کا معاینہ کیا، پھر بصرہ گئے اور (آخر میں) اسی کو وطن بنالیا۔

امام حاکم کے اس بیان میں خاصا اجمال ہے پھر بھی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نیساپور سے (جہاں ۲۳۸ھ میں پہنچے تھے) وطن واپس لوٹے اور گھر کے اسباب وغیرہ کی دیکھ ریکھ کے بعد پھر سماع حدیث کیلئے سفر پر روانہ ہوگئے اس سفر میں ولد رشید ابوبکر عبداللہ السجستانی ساتھ رہے، امام ابوداؤد نے اس دوران جن شیوخ سے حدیث کی سماعت کی ابوبکر بھی ان کے شریک درس رہے، ابن خلکان لکھتے ہیں وشارك اباه فی شیوخه بمصر والشام ابوبکر اپنے والد کے مصر اور شام کے شیوخ میں ان کے شریک درس رہے۔(۲) چنانچہ جب امام ابوداؤد مصر میں محدث احمد بن صالح المتوفی ۲۴۸ھ کی خدمت میں پہنچے تو انھیں معلوم ہوا کہ شیخ احمد مجلس درس میں کسی امرد نوجوان کو حاضر ہونے کی اجازت نہیں دیتے تو امام ابوداؤد نے بیٹے کو شریک درس کرنے کیلئے ان کے چہرے پر مصنوعی داڑھی لگادی۔ اس تدبیر سے وہ اپنے والد کے ساتھ شیخ احمد بن صالح کی مجلس میں حاضر ہوتے رہے۔ کچھ دنوں بعد کسی طرح شیخ کو اس کی خبر ہوگئی تو بہت ناخوش ہوئے اور فرمایا ”أمثلی يعمل معه هذا؟“ کیا مجھ جیسے کے ساتھ یہ حیلہ کیا گیا، اس پر امام ابوداؤد نے معذرت کی اور عرض کیا کہ میرے اس نوعمر بیٹے کا بڑوں سے مقابلہ کر کے دیکھ لیں اگر علم ومعرفت میں ان سے کمتر ٹھہرے تو پھر اسے سماع حدیث سے ضرور محروم فرمادیں، اس

---

(۱) سیر اعلام النبلاء، ج:۱۳، ص:۲۱۸۔

(۲) وفیات الاعیان، ج:۱، ص:۳۸۲۔

پر امام احمد بن صالح مصری نے ان کا امتحان لیا تو وہ سب پر فائق نکلے، پھر بھی اپنے معمول کے مطابق انھیں مجلس درس میں حاضری کی اجازت نہیں دی، اسی بناء پر امام احمد بن صالح مصری کی جملہ مرویات کی بجائے نصف یا نصف سے کچھ زائد کی حافظ ابوبکر عبداللہ السجستانی روایت کرتے ہیں۔ (۱)

اساتذۂ کرام

گذشتہ سطور سے معلوم ہو چکا ہے کہ امام ابوداؤد نے ۲۲۰ھ میں بہ عمر اٹھارہ برس تحصیل حدیث کے لیے اسفار کا آغاز کیا جو تقریباً ۲۴۰۔۲۴۱ھ تک جاری رہا اس مدت میں انھوں نے سیکڑوں شیوخ سے حدیث کا سماع کیا۔ حافظ ابن حجر عسقلانی ان کے تذکرہ میں لکھتے ہیں ”وشیوخه فی السنن وغیرها نحو ثلاثمائة نفس“ (۲) کتاب السنن وغیرہ میں انکے اساتذہ کی تعداد تین سو کے قریب ہے ان تین سو میں سے تقریباً چوہتر (۷۴) کا نام بنام ذکر امام مزّی نے تہذیب الکمال میں کیا ہے جن میں کچھ حضرات یہ ہیں:

امام احمد بن حنبل، یحییٰ بن معین، علی ابن المدینی، اسحاق بن راہویہ، مسلم بن ابراہیم، عبداللہ بن مسلمہ القعنبی، ابوبکر بن ابی شیبہ، ابوعمرو الحوضی، عثمان بن ابی شیبہ، ہناد ابن سری، قتیبہ بن سعید، مسدد بن مسرہد، محمد بن بشار المعروف بہ بندار، ابوالولید الطیالسی، موسیٰ بن اسماعیل المنقری، ابوجعفر النفیلی، ابوسلمہ التبوذکی، محمد بن کثیر العبدی، قطن بن نسیر وغیرہ، اپنے سارے اساتذہ میں سے امام ابوداؤد نے بطور خاص امام احمد بن حنبل سے استفادہ کیا تھا۔ حافظ ذہبی لکھتے ہیں ”وهو من نجباء أصحاب الإمام أحمد لازم مجلسه مدة“ وہ امام احمد کے برگزیدہ اور بڑے تلامذہ میں تھے ایک طویل مدت تک ان کی مجلس درس میں بیٹھے۔ (۳) امام ابوداؤد اپنے اساتذہ میں سب سے زیادہ امام احمد ہی سے متاثر تھے حتی کہ

---

(۱) سیر اعلام النبلاء، ج:۱۳، ص:۲۲۶-۲۲۷ و تذکرۃ الحفاظ، ج:۲، ص:۷۰۰-۷۷۱۔ حافظ ذہبی نے اس واقعہ کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے: ”یروی بإسناد منقطع“

(۲) تہذیب التہذیب، ج:۴، ص:۱۵۵۔

(۳) سیر اعلام النبلاء، ج:۱۳، ص:۲۱۵۔

سیرت وعادت اور چال ڈھال میں انھیں کی وضع کی پابندی کرتے تھے۔

کیا امام ابوداؤد کے تمام شیوخ ثقہ ہیں؟

ائمۂ حدیث میں سے ایک جماعت کی یہ خصوصیت بیان کی جاتی ہے کہ یہ ائمہ اخذ حدیث میں اس درجہ محتاط تھے کہ صرف انھیں راویوں سے حدیث لیتے تھے جو ان کے نزدیک ثقہ اور قابل اعتماد ہوتے تھے اس طبقہ کے محدثین میں سے امام احمد بن حنبل، بقی بن مخلد، حریز بن عثمان، سلیمان بن حرب، امام شعبہ، عبدالرحمٰن بن مہدی، امام مالک، یحییٰ بن سعید القطان کے اسماء کی تصریح حافظ سخاوی نے فتح المغیث میں کی ہے۔(۱) امام ابوداؤد کا شمار بھی محدثین کے اسی طبقہ میں کیا جاتا ہے چنانچہ حافظ ابن القطان الفاسی اپنی مشہور اور مفید ترین کتاب "بیان الوهم والایهام الواقعین فی کتاب الاحکام" میں لکھتے ہیں "و أبو داؤد إنما یروی عن ثقة عنده" (۲) امام ابواؤد صرف اسی سے روایت کرتے ہیں جو ان کے نزدیک ثقہ ہے۔ اسی طرح حافظ ابن حجر عسقلانی نے بھی حسین بن علی بن الاسود کے تذکرہ میں صراحت کی ہے کہ "إنه (یعنی أبا داؤد) لا یروی الا عن ثقة عنده" (۳) امام ابوداؤد صرف اسی سے روایت کرتے ہیں جو ان کی رائے میں ثقہ ہوتا ہے۔ نیز اس کی تائید خود امام ابوداؤد کے اس قول سے بھی ہوتی ہے، حافظ آجریؒ کا بیان ہے "سئل أبو داؤد عن سوار بن سهل فقال: لولم أثق مارویت عنه"(۴) امام ابواؤد سے سوار بن سہل البصری کے بارے میں دریافت کیا گیا تو فرمایا اگر میرے نزدیک قابل اعتماد اور ثقہ نہ ہوتے تو میں ان سے روایت نہ کرتا۔

بایں ہمہ ان کی تصانیف میں متعدد ایسے شیوخ موجود ہیں جو امام ابوداؤد کی رائے میں ثقہ نہیں ہیں اور خود انھوں نے ان کی تضعیف کی ہے مثلاً امام ابوداؤد شعیب بن ایوب

---

(۱) ج:۲، ص:۴۲ طبع وارانسی ہند۔

(۲) ج:۳، ص:۴۶۶، الرقم ۱۲۲۷۔

(۳) تہذیب التہذیب، ج:۲، ص:۳۱۲۔

(۴) سوالات الآجری، ج:۲، ص:۸۰۔

الصریفینی کے بارے میں کہتے ہیں ”انی لأخاف الله عن الروایة عن شعیب بن أیوب“ شعیب بن ایوب سے روایت کرنے میں مجھے اللہ تعالیٰ سے ڈر لگتا ہے۔ (۱) اور امام مزی لکھتے ہیں ”روی عنه أبوداؤد حدیثا واحدا“ (۲) امام ابوداؤد نے ان سے ایک روایت کی ہے۔ اسی طرح ہشام بن عبدالملک الحرانی الحمصی کے متعلق امام ابوداؤد کہتے ہیں ”شیخ ضعیف“ (۳) جب کہ امام مزی کہتے ہیں ”روی عنه أبوداؤد“ امام ابوداؤد نے ان سے روایت کی ہے (۴) نیز ابراہیم بن العلاء بن الضحاک الحمصی، امام ابوداؤد کے نزدیک ”لیس بشيء“ ہیں (۵) حالانکہ امام مزی صراحت کرتے ہیں کہ امام ابوداؤد نے ان سے روایت کی ہے۔ (۶)

ان کے علاوہ اور بھی متعدد راویانِ حدیث ہیں جو امام ابوداؤد کی رائے میں ضعیف ہیں اور امام مزی نے تہذیب الکمال میں انھیں امام صاحب کے شیوخ میں شمار کیا ہے؛ لیکن تین سو کی کثیر تعداد میں ان کے گنے چنے چند شیوخ کے ضعیف ہونے سے امام ابوداؤد کی یہ خصوصیت کہ ”لا یروی الا عن ثقة عنده“ متاثر نہیں ہوگی کیونکہ نادر وشاذ کا اعتبار نہیں ہوتا۔ واللہ اعلم

کتاب ”السنن“ کی تالیف

امام ابوداؤد مصر میں احمد بن صالح وغیرہ شیوخ مصر سے سماع حدیث کے بعد دیگر بلاد اسلامیہ کے محدثین سے اخذ واستفادہ کرتے ہوئے طرسوس وارد ہوئے اور وہیں بیس سال مقیم رہ کر کتاب السنن کی جمع وترتیب کا عظیم الشان کام انجام دیا۔ امام نووی رقمطراز ہیں:

”ذکر محمد بن صالح الهاشمی قال لنا أبوداؤد: وأقمت بطرسوس عشرین سنة أکتب المسند فکتبت أربعة آلاف حدیث، ثم نظرت فإذا مدار

---

(۱) سوالات الآجری، ج:۲، ص:۲۹۹۔ (۲) تہذیب الکمال الرقم ۲۷۲۹۔

(۳) سوالات الآجری، ج:۲، ص:۲۵۱۔ (۴) تہذیب الکمال الرقم ۷۱۷۸۔

(۵) سوالات الآجری، ج:۲، ص:۲۲۹۔ (۶) تہذیب الکمال رقم الترجمہ ۲۱۸۔

أربعة آلاف على أربعة أحاديث لمن وقفه الله تعالىٰ" (۱)

> محمد بن صالح الہاشمی نے ذکر کیا کہ ہم سے امام ابوداؤد نے فرمایا میں طرسوس میں بیس سال مقیم رہا اس مدت میں مسند (یعنی کتاب السنن) کو لکھتا رہا میں نے اس میں چار ہزار حدیثیں درج کیں پھر میں نے غور کیا تو سمجھ میں آیا کہ ان چار ہزار حدیثوں کا مدار چار احادیث پر ہے ایسے شخص کے لیے جسے اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائیں۔

امام ابوداؤد کا طرسوس میں یہ قیام ۲۴۱-۲۴۰ھ کی حدود میں ہوا ہے کیونکہ خود ان کے بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ ۲۴۲ھ میں طرسوس میں موجود تھے، حافظ الآجرّی لکھتے ہیں:

"سمعت أبا داؤد يقول: مات حامد بن يحيىٰ بطرسوس فی يوم مطير ما قدرنا أن نخرج فی الجنازة"(۲)

> میں نے امام ابوداؤد سے کہتے ہوئے سنا کہ حامد بن یحییٰ (بن ہانی البلخی ابوعبداللہ نزیل طرسوس) کی وفات تیز بارش کے دن ہوئی جس کی بناء پر ہم ان کے جنازہ میں نہیں جا سکے۔

علمائے رجال بغیر اختلاف کے لکھتے ہیں کہ حامد بن یحییٰ کا انتقال ۲۴۲ھ میں ہوا ہے۔ محمد بن صالح الہاشمی کے اس بیان سے واضح ہوتا ہے کہ "کتاب السنن" کی تالیف کا کام ۲۶۰ھ کے لگ بھگ انجام کو پہنچا۔

امام خطیب کی روایت پر ایک نظر

لیکن اس کے برخلاف امام خطیب بغدادی لکھتے ہیں: "ويقال إنه صنفه قديما وعرضه على أحمد بن حنبل فاستجاده و استحسنه"(۳) اور کہا گیا ہے کہ امام ابوداؤد نے کتاب السنن ابتدائی زمانہ میں تصنیف کر لی تھی اور اسے امام احمد المتوفی ۲۴۱ھ

---

(۱) تہذیب الاسماء واللغات، ج:۲، ص:۲۲۶، حافظ سِلَفی نے بھی اپنے مقدمہ معالم السنن للخطابی میں اپنی سند سے محمد بن صالح الہاشمی کی یہ روایت درج کی ہے۔

(۲) سوالات الآجرّی، ج:۲، ص:۲۵۵۔ (۳) تاریخ بغداد، ج:۹، ص:۵۶۔

کی خدمت میں پیش کیا تو امام احمد نے کتاب کی خوبی کو سراہا اور اس کی تحسین فرمائی۔

خطیب بغدادی کی اس معلق، بصیغۂ تمریض روایت کو انھیں کے حوالہ سے حافظ ابن عساکر نے تاریخ دمشق میں، امام مزی نے تہذیب الکمال میں، امام ذہبی نے سیر اعلام النبلاء میں اور حافظ ابن حجر نے تہذیب التہذیب میں نقل کیا ہے نیز حافظ سِلَفی نے امام خطابی کی شرح معالم السنن کے مقدمہ میں بایں الفاظ اس روایت کا ذکر کیا ہے "حین عُرض کتاب أبی داؤد علی أحمد بن حنبل ورآه، استحسنه وارتضاه، وحسبه ذلك فخرا"(۱) جس وقت امام ابوداؤد کی کتاب امام احمد بن حنبل کو پیش کی گئی اور امام صاحب نے اس کو ملاحظہ کیا تو اس کی تحسین کی اور پسندیدگی کا اظہار کیا، امام ابوداؤد کے فخر کے لیے یہ بات کافی ہے۔

مگر اس روایت کی صحت پر اعتماد درج ذیل وجوہ سے مشکل ہے:

(الف) یہ روایت بے سند، بصیغۂ تضعیف ذکر کی گئی ہے۔

(ب) امام ابوداؤد کی ولادت ۲۰۲ھ میں ہوئی اور تحصیل علم کے لیے انھوں نے ۲۲۰ھ میں گھر سے قدم باہر نکالا اور علمی اسفار کا آغاز کیا امام احمد بن حنبل کی وفات ۲۴۱ھ کے وقت امام ابوداؤد کی عمر ۳۹ سال کی تھی اور بروایت ابن صالح الہاشمی خود امام صاحب نے یہ صراحت کی ہے کہ کتاب "السنن" کی تدوین و تالیف میں ۲۰ سال صرف ہوئے، لہٰذا امام احمدؒ کی خدمت میں کتاب مذکور پیش کرنے کی یہ روایت اگر صحیح مان لی جائے تو لازمی طور پر یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ امام ابوداؤد نے ۱۹/برس کی عمر میں کتاب کی تصنیف کا آغاز کر دیا تھا جب کہ ان کی رحلتِ علمیہ اور شیوخ سے سماع حدیث کا یہ دوسرا سال ہی ہے، تعلیم و تحصیل کے ابتدائی مرحلہ میں اس طرح کے کام کا تصور بعید از عقل و قیاس ہے۔

(ج) امام ابوداؤد کے نامور تلمیذ، کتاب "السنن" کے راوی ابوبکر ابن داستہ کا بیان ہے کہ میں نے امام صاحب سے فرماتے ہوئے سنا کہ "میں نے (شیوخ حدیث سے

---

(۱) معالم السنن، ج:۴، ص:۳۵۸ طبع مصر ومختصر سنن ابی داؤد للمنذری معہ معالم السنن وتہذیب لابن القیم، ج:۸، ص:۱۴۲۔

آنحضرت ...... کی پانچ لاکھ حدیثیں نقل کیں، کتاب ''السنن'' اسی عظیم ذخیرہ سے منتخب احادیث پر مشتمل ہے جن کی تعداد چار ہزار آٹھ سو ہے نیز اس منتخب مجموعہ میں صحیح، مشابہ صحیح اور صحیح سے قریب حدیثیں ذکر کی ہیں'' (۱)

ظاہر ہے کہ پانچ لاکھ احادیث کا یہ عظیم ذخیرہ تحصیل وتعلیم کے ابتدائی مرحلہ میں محفوظ نہیں کیا جاسکتا بلکہ بلاد اسلامیہ میں پھیلے شیوخ اور مشرق ومغرب کے مراکز علمیہ سے ایک زمانہ تک اخذ واستفادہ کے بعد ہی اس پر دسترس حاصل ہوسکتی ہے۔ پھر احادیث کے اس بحر ذخار سے مقصد کے مطابق موتیوں کا انتخاب واستخراج، ان کے رجال کی تحقیق اور صحیح و لائق استدلال احادیث کی ضعیف وناقابل استدلال روایتوں سے تمیز، پھر ان سے فقہی احکام ومسائل کا استنباط وغیرہ ایسے امور ہیں جو انتہائی تبحر، طویل بحث ونظر اور ژرف نگاہی کو چاہتے ہیں جن کا تصور ایک ایسے طالب علم سے جو ابھی اخذ وطلب کے ابتدائی مرحلہ میں ہو نہایت بعید ہے ے

بصرہ کی سکونت

حدیث پاک کی تحصیل کے لیے ۲۲۰ھ میں امام ابوداؤد گھر سے نکلے، مراکز علمیہ اور شیوخ حدیث کی مجالس درس میں حاضری کی غرض سے تقریباً بیس بائیس سال تک بلاد اسلامیہ میں چکر کاٹتے رہے، ان علمی اسفار میں ان کا مرکز ثقل بغداد تھا جہاں گھوم پھر کر پہنچ جاتے، خطیب بغدادی لکھتے ہیں: ”وقدم بغداد غير مرة“ بغداد بار بار گئے، اس دوران اگرچہ کبھی کبھی وطن مالوف سجستان کی مراجعت کا بھی اتفاق ہوا، ورنہ لیلائے مطلوب کی طلب وجستجو میں ان کی زندگی کے اکثر ایام دیارِ غربت ہی میں بسر ہوئے۔ طرسوس کے بیس

---

(۱) سیر اعلام النبلاء، ج: ۱۳، ص: ۲۰۹-۲۱۰، تہذیب الکمال، ج: ۳، ص: ۲۶۴، الرقم ۲۴۷۶، تاریخ بغداد، ج: ۹، ص: ۵۷۔

ے عصر حاضر کے نامور عالم اور مشہور محقق علامہ شیخ عبد الفتاح ابوغدہ رحمہ اللہ نے بھی ”رسالۃ الإمام ابی داؤد السجستانی إلى أهل مكه في وصف سننه“ کی تحقیق وتعلیق کے مقدمہ میں اس روایت کے داخلی وخارجی وجوہ ضعف پر قریب قریب یہی تنبیہ کی ہے۔ دیکھئے رسالہ مذکور کا مقدمہ، ص: ۱۲-۱۳۔

سالہ قیام اور کتاب ”السنن“ کی تکمیل کے بعد گھوم پھر کر آخری بار وہ پھر بغداد پہنچے، مگر اب امام ابوداؤد اخذ واستفادہ کی منزل سے گزر کر مشیخیت وامامت کے درجہ پر فائز ہو چکے تھے اور ان کی عظمت ومقبولیت کا آفتاب نصف النہار کی بلندیوں کو چھورہا تھا، تشنگان علوم حدیث جوق در جوق ان کی خدمت میں آتے اور ان کے چشمۂ فیاض سے خاطر خواہ سیراب ہوتے تھے، ان کی مرجعیت اور ان کے گرد شائقین علوم حدیث کے ازدحام کا یہ عالم تھا کہ خلیفۂ وقت کے بھائی اور صاحب اقتدار ولی عہد ان سے درخواست کرتا ہے کہ آپ مستقل طور پر بصرہ میں سکونت فرمالیں تاکہ آپ کے وجود باجود کی برکت اور آپ کی مجلس درس میں طلبہ کی کثرت سے بصرہ دوبارہ آباد ہو جائے اور اس کی اجڑی ہوئی رونق پھر لوٹ آئے۔ امام خطابی اپنی سند سے لکھتے ہیں:

فقد روى خادمه أبوبكر بن جابر قال : كنت معه ببغداد فصلينا المغرب اذ قرع الباب ففتحته فاذا خادم يقول : هذا الامير أبو أحمد الموفق يستاذن، فدخلت إلى أبى داؤد فاخبرته بمكانه فأذن له، فدخل وقعد ثم أقبل عليه أبوداؤد وقال: ما جاء بالأمير فى مثل هذا الوقت ؟ قال : خلال ثلاث، فقال ماهى؟

قال : تنتقل البصرة فتتخذها وطناً ليرحل إليك طلبة العلم من أقطار الأرض فتعمربك، فإنها قد خربت وانقطع عنها الناس لما جرىٰ عليها من محنة الزنج[ع]

[ع] علی بن عبدالرحیم المعروف بہ صاحب الزنج کا فتنہ ۲۵۲ھ میں رونما ہوا اور ۲۵۵ھ میں اس نے بصرہ پر اپنا ظالمانہ تسلط قائم کرلیا تقریباً ۱۲/ ہزار بصریوں کو قتل کیا، بیشمار لوگ جان بچانے کے لیے آبادیوں سے بھاگ کر جنگلوں میں روپوش ہوگئے، جان ومال کے علاوہ عزت وآبرو بھی اس کے ہاتھوں محفوظ نہ رہی حتیٰ کہ سادات کی عزت مآب خواتین کو لونڈیاں بنا کر برسر عام نیلام کیا، ان مظالم اور تباہ کاریوں کی وجہ سے بصرہ جو اسلامی علوم وثقافت کا ایک اہم مرکز تھا بالکل ویران ہوگیا بصرہ کی عظیم جامع مسجد جو وہاں کی علمی سرگرمیوں کا مرکز تھی سنسان ہوگئی۔ عراق اور اس کے شہروں کی اس زبوں حالی سے متاثر ہوکر بالآخر خلیفۂ وقت معتمد کا بھائی ابواحمد الموفق اس فتنہ کی سرکوبی کے لیے خود میدان میں اترا اور شجاعت کے ایسے جوہر دکھائے کہ زنگی مقابلہ میں ٹھہر نہ سکے اور ۲۷۰ھ میں خود صاحب الزنج یعنی علی بن عبدالرحیم کو قتل کرکے اللہ کی مخلوق کو اس کے ظلم وتشدد سے ہمیشہ کے لیے نجات دیدی اور بصرہ وغیرہ اسلامی شہروں میں پھر سے امن وامان کی فضا بحال کردی، ”محنۃ الزنج“ کے الفاظ سے اسی فتنہ کی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔

فقال هذه واحدة، هات الثانية .

قال: وتروى لأولادى كتاب السنن ، فقال : نعم ، هات الثالثة .

قال و تفرد لهم مجلسا للرواية، فإن أولاد الخلفاء لا يقعدون مع العامة.

فقال : اما هذه فلا سبيل إليها لأن الناس شريفهم ووضيعهم فى العلم سواء .

قال ابن جابر فكانوا يحضرون بعد ذلك ويقعدون فى كم حيرى و يضرب بينهم وبين الناس ستر فيسمعون مع العامة.(۱)

امام ابوداؤد کے خادم ابوبکر بن جابر کا بیان ہے کہ میں امام صاحب کے ساتھ بغداد میں تھا نماز مغرب سے فراغت کے بعد دروازہ پر دستک ہوئی، میں نے دروازہ کھولا تو ایک خادم نے کہا امیر ابواحمد الموفق حاضری کی اجازت چاہتے ہیں، میں نے امام صاحب کو اسکی اطلاع دی، امام صاحب نے انھیں تشریف لانے کی اجازت دی۔ چنانچہ وہ اندر آ کر بیٹھے تو امام صاحب ان کی جانب متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ اس وقت امیر نے کیوں تشریف لانے کی زحمت کی؟ تو امیر الموفق نے کہا تین باتوں کے تحت حاضری ہوئی ہے۔ امام صاحب نے فرمایا وہ کیا ہیں؟ (۱) امیر نے کہا آپ بصرہ تشریف لے چلیں اور اسے وطن بنالیں تا کہ اطراف عالم سے طلبہ کوچ کر کے آپ کی خدمت میں آئیں اور بصرہ آپ کے وجود سے آباد ہو جائے کیونکہ وہ زنگیوں کے فساد سے ویران ہو گیا ہے، امام صاحب نے فرمایا یہ پہلی بات ہوئی، دوسری پیش کیجیے۔ (۲) امیر نے کہا میری اولاد کو کتاب السنن پڑھا دیجئے، امام صاحب نے فرمایا ٹھیک ہے، تیسری بات بیان فرمائیں، (۳) امیر الموفق بولے ان کی تعلیم کے لیے الگ مجلس درس کا اہتمام کریں کیونکہ خلفاء کی اولاد عام لوگوں کے ساتھ نہیں بیٹھتی، امام صاحب نے اس تیسری بات پر فرمایا کہ اس کے قبول کیے جانے کی کوئی صورت نہیں ہے اس لیے کہ تعلیم کے معاملہ میں شریف و غیر شریف سب برابر ہیں، ابوبکر ابن جابر کا بیان ہے کہ امیر الموفق کے لڑکے پڑھنے کے لیے آتے (اور حریری

---

(۱) معالم السنن، ج:۱ص:۱۲، مختصر تاریخ دمشق، ج:۶ ص:۲۴۷، وسیر اعلام النبلاء، ج:۱۳، ص:۲۱۶

چادر میں بیٹھتے البتہ) ان کے اور عام لوگوں کے درمیان ایک پردہ ڈال دیا جاتا اور سب کے ساتھ ہی حدیث پاک کی سماعت کرتے۔

امیر ابواحمد الموفق کی یہی خواہش بصرہ میں امام ابوداؤد کی مستقل سکونت کا سبب بنی اور وہ ۲۷۱ھ میں بغداد سے منتقل ہوکر بصرہ آ گئے۔ سنن ابوداؤد کے معروف راوی ابن داسہ بصری کے ایک بیان سے (جسے حافظ ابوطاہر السِلَفی نے معالم السنن شرح سنن ابوداؤد کے اپنے مقدمہ میں خود اپنی سند سے روایت کیا ہے) معلوم ہوتا ہے کہ بصرہ میں امام ابوداؤد کا قیام قدیمی شہر ''اُبلّہ'' میں تھا۔(۱)

تاریخ وفات اور مقام تدفین

بصرہ کو وطن اور اپنی علمی سرگرمیوں کا مرکز بنا لینے کے بعد انھوں نے کہیں اور کا قصد نہیں کیا اور زندگی کے باقی ماندہ ایام یہیں گزار کر ۱۶؍شوال ۲۷۵ھ بروز جمعہ اس دنیائے بے ثبات سے دار جاودانی کو رحلت کر گئے، ابن المنادی کا بیان ہے "ودخلها (يعني بغداد) أبوداؤد السجستاني مرارا ثم خرج منها آخرمراته في أول سنة إحدى وسبعين إلى البصرة فنزلها ومات بها في سنة ٢٧٥هـ"(۲) امام ابوداؤد سجستانی بارہا بغداد آئے وہاں سے آخری بار ۲۷۱ھ میں نکلے اور بصرہ جا کر مستقل طور پر آباد ہو گئے اور وہیں ۲۷۵ھ میں وفات پائی۔

وفیات الاعیان میں جمعہ کی اور سیر الاعلام، تذکرۃ الحفاظ، تہذیب الاسماء واللغات وغیرہ میں تاریخ اور مہینہ کی تصریح موجود ہے۔(۳)

---

(۱) تفصیل وتحقیق کے لیے امام سِلَفی کا مقدمہ معالم السنن مطبوعہ مختصر سنن ابی داؤد للمنذری ومعالم السنن للخطابي وتهذيب لابن القيم، ج:۸، ص: ۱۵۲-۱۵۳ ملاحظہ کیجئے اور ''الأُبُلَّة'' سے متعلق تفصیلات کے لیے ''یاقوت حموی'' کی معجم البلدان، ج:۱، ص:۱۷ دیکھئے۔

(۲) تاریخ بغداد، ج:۹، ص:۵۸-۵۹۔

(۳) وفیات الاعیان، ج:۱، ص:۳۸۳ مطبوعہ بیروت ۱۴۱۷ھ، سیر اعلام النبلاء، ج:۱۳، ص: ۲۲۱، تذکرۃ الحفاظ، ج:۲، ص:۵۹۳ تہذیب الاسماء واللغات، ج:۲، ص: ۲۲۷۔

وفات سے پہلے یہ وصیت کی تھی کہ ”أن یغسله الحسن بن المثنی فإن اتفق، وإلا نظروا فی کتاب سلیمان بن حرب عن حماد بن زید فی الغسل، فعملوا به“(۱) اگر ممکن ہو تو میری میت کو غسل ”حسن بن مثنیٰ“ دیں، ورنہ سلیمان بن حرب کی کتاب میں غسل سے متعلق جو احادیث بروایت حماد بن زید ہیں دیکھ لی جائیں چنانچہ اسی پر عمل کیا گیا۔ نماز جنازہ عباس بن الواحد الہاشمی کی امامت میں ادا کی گئی۔(۲) اور امیر المؤمنین فی الحدیث سفیان ثوری کی قبر کے پہلو میں دفن کیے گئے۔(۳)

تلامذہ

امام ابوداؤدؒ مقبولیت و مرجعیت کے جس بلند و بالا مقام پر فائز تھے اور ان کے حلقۂ درس میں طلبۂ علوم کا جس کثرت سے ورود ہوا کرتا تھا اس کا بڑی حد تک اندازہ اوپر مذکور واقعہ سے ہوسکتا ہے کہ زنگیوں کے ہاتھوں تباہ و برباد بصرہ کی تعمیر نو اور اس کی گزشتہ علمی رونق کی بازیابی کے لیے حکومت وقت کے اہم ترین رکن نے انھیں بصرہ میں قیام پذیر ہونے کی دعوت دی، لہٰذا بلا تردد کہا جاسکتا ہے کہ امام ابوداؤد کے شاگردوں اور ان سے مستفیدین کی تعداد سیکڑوں میں نہیں بلکہ ہزاروں میں ہوگی جنھیں شمار میں لانا مشکل ہے، اس کثیر تعداد میں سے تقریباً سینتالیس کے ناموں کا ذکر امام مزّی نے تہذیب الکمال میں کیا ہے۔(۴) جن میں کچھ ائمہ مشاہیر یہ ہیں:

---

(۱) تہذیب التہذیب، ج:۴،ص:۱۵۶۔

ب حسن بن مثنیٰ بن معاذ ابومحمد العنبری المتوفی ۲۹۴ھ اکابر فضلاء محدثین میں شمار ہوتے ہیں۔ ورع وتقویٰ اور عبادت وریاضت میں مشہور زمانہ تھے۔ ابتداء میں حدیث کی روایت سے بچتے تھے بعد میں منامی تنبیہ پر روایت کرنے لگے تھے امام طبرانی کے شیوخ میں تھے۔ سیر اعلام النبلاء ج:۱۳،ص:۵۲۶-۵۲۷= عباس الہاشمی کے حالات معلوم نہیں ہوسکے۔

(۲) تاریخ بغداد، ج:۹،ص:۵۹ مقدمہ معالم السنن از حافظ سلفی، معالم السنن، ج:۸،ص:۱۵۷، تحقیق احمد محمد شاکر و محمد حامد الفقی دار المعرفۃ بیروت۔

(۳) البدایہ والنہایہ، ج:۱۱،ص:۶۵۔

(۴) تہذیب الکمال، ج:۳۔

امام ترمذی، امام نسائی، امام ابوعوانہ اسفرائینی، امام ابن ابی الدنیا، امام ابوبشر محمد بن احمد دولابی، امام محمد بن نصر مروزی، امام زکریا ساجی آپ کے خلف الصدق امام ابوبکر عبداللہ سجستانی، عبدالرحمٰن بن خلاد رام ہرمزی، ابوبکر محمد بن یحییٰ صولی وغیرہ، علوم حدیث کی وہ مقتدر اور عظیم المرتبت شخصیات ہیں جن کے نام وکام سے علم حدیث کا ابتدائی طالب علم بھی ایک حد تک واقفیت رکھتا ہے۔

اور خاص وہ تلامذہ جنھوں نے امام صاحب سے کتاب السنن کی سماعت وروایت کی ان میں معروف یہ ہیں: ابوالحسن علی بن الحسن بن العبد الانصاری، المتوفی ۳۲۸ھ، ابواسامہ محمد بن عبدالملک بن یزید الرواس، ابوسعید احمد بن محمد بن زیاد المعروف بہ ابن الاعرابی المتوفی ۳۴۰ھ، ابوعلی محمد بن احمد اللؤلؤی المتوفی ۳۳۰ھ، ابوبکر محمد بن بکر بن داسہ التمار المتوفی ۳۴۵ھ، ابوسالم محمد بن سعید الجلودی، ابوعمر واحد بن علی بن حسن البصری، تذکرۃ الحفاظ میں امام ذہبی ان ساتوں اصحاب کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں "فھؤلاء السبعة رووا عنه سننه" ان ساتوں نے امام ابوداؤد سے ان کی سنن روایت کی ہے۔ (۱)

اور سیر اعلام النبلاء میں ابوالطیب احمد بن ابراہیم بن عبدالرحمٰن الاشنانی کے بارے میں راوی السنن ہونے کی تصریح کی ہے نیز ابوعیسیٰ اسحاق بن موسیٰ بن سعید الرملی کے متعلق لکھا ہے کہ یہ امام ابوداؤد کے ورّاق تھے یعنی امام صاحب کی خدمت میں یہی سنن کی قرأت کیا کرتے تھے، اس لیے یہ بھی سنن کے راوی ہوئے اور حافظ ابن حجر نے ان نوؤں اصحاب کا نام شمار کرنے کے بعد لکھا ہے "وھؤلاء رواة السنن عنه" (۲) ان کے علاوہ محمد بن احمد بن یعقوب المتوثی البصری کتاب "الرد علی اہل القدر" کے راوی ہیں اور ابوبکر احمد بن سلیمان النجّاد المتوفی ۳۴۸ھ کتاب الناسخ والمنسوخ کی روایت کرتے ہیں، حافظ ابن کثیر ان کے بارے میں لکھتے ہیں "ھو آخر من رویٰ عنه فی الدنیا" یعنی امام ابوداؤد سے براہ راست روایت کرنے والے یہ دنیا میں آخری راوی تھے۔ (۳) نیز ابوعبید

---

(۱) ج:۲، ص:۲۹۱-۲۹۲۔ (۲) تہذیب التہذیب، ج:۴، ص:۱۵۴۔

(۳) البدایہ والنہایہ، ج:۱۱، ص:۶۵۔

محمد بن علی بن عثمان الآجرّی إجاباته عن سوالات أبی عبید الآجری **اور** تسمیة الإخوة الذین روی عنهم الحدیث **کے راوی ہیں۔ اور اسماعیل بن محمد الصفار ''مسند مالک'' کے راوی ہیں۔**

امام ابوداؤد کے یہ تیرہ وہ مخصوص تلامذہ ہیں جنھوں نے ان سے کتاب السنن یا ان کی دیگر تصانیف روایت کی ہیں ان کے علاوہ بھی نامور تلامذہ کی ایک طویل فہرست ہے جن کا اس موقع پر ذکر موجب طوالت ہوگا، تفصیل کے طالب تہذیب التہذیب، سیر اعلام النبلاء، تذکرہ الحفاظ اور بطور خاص تہذیب الکمال کی مراجعت کریں۔

ایک عظیم شرف

امام ابوداؤد کے شرف ومجد کے لیے یہی کیا کم ہے کہ ان کے گلستان علم کی خوشہ چیں حفاظ حدیث اور اکابر محدثین کی ایک بڑی جماعت ہے جس میں اصول ستہ کے دو مصنف یعنی امام ابوعیسیٰ[ے] الترمذی اور امام[@] ابوعبدالرحمٰن النسائی بھی ہیں مگر اسی کے ساتھ انھیں ایک ایسا عظیم شرف اور اعزاز حاصل ہے جس میں اصحاب ستہ میں سے کوئی اور ان کا شریک وسہیم

[ے] امام ترمذی نے اپنی سنن کی کتاب الدعوات کے آخری باب میں ایک حدیث امام ابوداؤد سے بایں سند درج کی ہے: حدثنا ابو داؤد سلیمان بن الاشعث السجزی حدثنا قطن البصری عن انس الخ اسی طرح ''باب ماجاء فی الصائم یذرعہ القیٔ'' میں بواسطہ امام ابوداؤد: امام احمد سے عبداللہ بن زید کی توثیق نقل کی ہے۔

[@] امام نسائی نے اپنی سنن (مجتبیٰ) میں متعدد روایتیں حدثنا ابوداؤد کے الفاظ سے بیان کی ہیں اور ظاہر یہی ہے کہ نسائی کے یہ شیخ امام ابوداؤد السجستانی ہی ہیں چنانچہ حافظ مزی لکھتے ہیں ''وروی النسائی فی السنن عن أبی داؤد، عن سلیمان بن حرب، و عبدالله بن محمد النفیلی، و عبدالعزیز بن یحییٰ الحرّانی، وعلی ابن المدینی، وعمرو بن عون الواسطی، ومسلم بن إبراهیم، وأبی الولید الطیالسی، وروی (ای النسائی) فی کتاب ''یوم ولیلة'' عن أبی داؤد عن محمد بن کثیر العبدی والظاهر أن أبا داؤد فی هذا کله هو السجستانی فانه معروف بالروایة عن هٰؤلاء وقد شارکه ابوداؤد سلیمان بن سیف الحرانی فی بعضهم، وروی (ای النسائی) عنه فی کتاب الکنٰی وسماه ولم یکنِه وذکر الحافظ أبوالقاسم فی ''المشایخ النبَل'' أن النسائی أیضا روی عنه'' (تہذیب الکمال، ج:٣، ص:٢٦٤، رقم الترجمہ ٢٤٧٦)

حافظ ذہبی اور حافظ ابن حجر نے بھی امام مزی کی بیان کردہ اس تفصیل کو سیر اعلام النبلاء، ج:١٣، ص:٢٠٧، اور تہذیب التہذیب، ج:٤، ص:١٥٤ میں نقل کیا ہے۔

نہیں ہے۔ وہ یہ کہ ائمہ اربعہ کے چوتھے امام، آپ کے استاذ کبیر، امام السنہ احمد بن حنبل بھی آپ سے حدیث پاک کی نقل وسماعت کرنے والوں کی صف میں شامل ہیں۔ خود امام ابوداؤد کو اپنے اس شرف پر ناز تھا اور تحدیث نعمت کے طور سے بیان کیا کرتے تھے۔

چنانچہ حافظ مزی بواسطہ ابوبکر الخلال لکھتے ہیں: ”وسمع أحمد بن حنبل منه حديثًا واحدا كان أبوداؤد يذكره(١) امام احمد بن حنبل نے ابوداؤد سے ایک حدیث سنی تھی جس کا ذکر امام ابوداؤد (تحدیث نعمت کے طور پر) کیا کرتے تھے، امام خطیب بغدادی نے اس حدیث واحد کو اپنی سند سے بطریق امام ابوداؤد ان الفاظ میں ذکر کیا ہے:

عن ابی العُشَراء عن أبيه اَن النبی صلى الله عليه وسلم سئل عن العتيرة فحسنها[ے]“(٢) امام ابوداؤد نے کہا میں نے یہ حدیث امام احمد بن حنبل سے بیان کی تو اسے پسند کیا اور فرمایا کہ یہ ایک غریب و نادر حدیث ہے پھر مجھے مخاطب کر کے فرمایا کہ ذرا بیٹھو اور خود گھر کے اندر سے دوات، قلم اور کاغذ لے کر آئے اور کہا کہ یہ حدیث مجھے لکھا دو (ان کے حکم کے مطابق اس حدیث کا میں نے انھیں املا کرادیا) پھر ایک دوسرے دن میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور اتفاق سے ابوجعفر ابن ابی سمینہ بھی آگئے تو امام احمد بن حنبل نے ان سے کہا ابوداؤد کے پاس ایک غریب حدیث ہے تم اسے لکھ لو چنانچہ ابو جعفر نے مجھ سے اس حدیث کو املا کرانے کے لیے کہا تو میں نے انھیں بھی لکھوادی۔

ضروری تنبیہ

یہی اوپر مذکورہ حدیث عتیرہ ہے جس کی روایت امام احمد بن حنبل نے امام ابوداؤد سجستانی سے کی ہے جب کہ علامہ محمود السبکی نے اپنی مشہور و مفید کتاب ”المنہل العذب المورود“ شرح سنن ابی داؤد کے مقدمہ میں اس کا مصداق حضرت ابوہریرہ سے مرفوعاً

---

(١) تہذیب الکمال، ج:٣، ص:٢٦٤۔

[ے] امام ذہبی ابوالعشراء کی اس حدیث کے بارے میں لکھتے ہیں: ”هذا حديث منكر تُكُلِّم فى ابن قيس من اجله“ سیر اعلام النبلاء، ج:١٣، ص:٢١١۔

(٢) تاریخ بغداد، ج:٩، ص:٥٧-٥٨ و تہذیب تاریخ دمشق، ج:٦، ص:٢٤٦۔

مروی حدیث ”لا فرع ولا عتیرة الخ“ کو بتایا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس حدیث سے متعلق خطیب بغدادی کے کلام سے ان کی نظر چوک گئی ورنہ اس حدیث کا صحیح مصداق سمجھنے میں ان سے یہ غلطی نہ ہوتی۔ چنانچہ محدث کبیر علامہ محمد یوسف بنوری ”بذل المجہود“ کے اپنے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

”هذا هو حديث العتيرة الذى رواه عنه أحمد لاما فهمه محمود السبكى فى المنهل العذب المورود، ولعله لم يقف على كلام الخطيب فقال وهو حديث ”لا فرع ولا عتيرة“ مارواه احمد والبخارى ومسلم، فتنبه“۔

علمی مقام ومرتبہ

امام ابوداؤد ان اکابر محدثین کی صف میں شامل ہیں جنھوں نے علوم حدیث کی تحصیل میں پوری جانفشانی اور خصوصی توجہ کی اور اس مبارک فن میں درجۂ کمال پر فائز ہوئے۔

یہ ایک مسلم اور ثابت شدہ حقیقت ہے کہ علوم وفنون کے اخذ وتحصیل نیز فہم وادراک میں کسی بھی فن کے علماء ایک درجہ کے نہیں ہوتے بلکہ ان میں فرق مراتب ہے، اسی طرح علمائے حدیث کے بھی مختلف درجات ہیں، جنھیں عام طور پر تین درجوں میں تقسیم کیا جاتا ہے یا یوں کہہ لیجیے کہ علوم حدیث کے تین مرحلے ہیں:

اخذ حدیث کے تین مرحلے

۱- حفظ وجمع اور روایت کا مرحلہ ہے، بہت سے محدثین اسی درجہ پر پہنچ کر ٹھہر جاتے ہیں اس سے آگے بڑھنے کی ان میں طلب وہمت نہیں ہوتی یا اس کے مواقع حاصل نہیں ہوتے ہیں پھر ان میں بھی روایات کی قلت وکثرت کے لحاظ سے متعدد درجات ہوتے ہیں۔

۲- جمع وحفظ کے ساتھ صحیح وضعیف، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت اور غیر ثابت روایات کی معرفت اور ان میں فرق وامتیاز کی صلاحیت پیدا کرنا اس درجہ پر پہنچنے کے لیے بہت سارے علوم سے واقفیت درکار رہوتی ہے بالخصوص جرح وتعدیل، اتصال و

انقطاع وغیرہ سے متعلق اصول واحکام کی وافر معلومات ضروری ہوتی ہے اس لیے پہلے درجہ کے بالمقابل اس درجہ کے حاملین کی تعداد کم ہے۔ اس درجہ پر فائز محدثین، صحیح و ضعیف قابل حجت اور نا قابل حجت روایات کی شناخت کر لیتے ہیں مگر ان سے صحیح طور پر شرعی احکام ومسائل کا استخراج ان کے بس میں نہیں ہوتا۔

٣- اس مرحلہ میں ایک محدث پہلے اور دوسرے درجے سے گزر کر احادیث رسول علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے احکام ومسائل کے استنباط واستخراج کی قوت وصلاحیت اپنے اندر پیدا کر لیتا ہے تاکہ ان احکام پر خود بھی عمل کرے اور دوسروں کے لیے عمل کی راہ ہموار اور آسان کر دے اس درجہ کی تحصیل میں علم وعمل اور تجربات کے وسیع تر میدان سے گزرنا پڑتا ہے اور اسے عبور کرنے کے لیے قدم قدم پر ژرف نگاہی اور روشن ضمیری کی ضرورت پڑتی ہے اس لیے اس درجہ پر فائز دوسرے درجہ کے حاملین سے بھی کم ہوتے ہیں۔

وہ محدثین عظام جو ان تینوں درجات کے حامل ہیں درحقیقت یہی وہ فقہائے محدثین اور ائمۂ دین ہیں جنھوں نے خدائے حکیم وقدیر کی حکمت بالغہ وتدبیر نافذہ کے تحت اللہ رب العزت کے پسندیدہ دین کی حفاظت وصیانت کا عظیم الشان کارنامہ انجام دیا اور انھیں کی مساعی جمیلہ کا یہ ثمرہ ہے کہ اسلام اپنی اصل اور کامل شکل میں آج بھی انسانیت کی صحیح رہنمائی کر رہا ہے۔

اور بلاخوف تردید یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ امام ابوداؤد سلیمان بن الاشعث السجستانی محدثین عظام کے اسی آخری طبقہ کے ایک فرد کامل ہیں۔ وہ حافظ حدیث بھی ہیں، ناقد حدیث بھی اور فقہ حدیث کے زبردست عالم بھی ہیں جس پر ان کی کتاب ''السنن'' شاہد عدل اور روشن دلیل ہے۔

اگر امام یحییٰ بن معین نے اپنے دست خاص سے دس لاکھ حدیثیں لکھیں، امام احمد ابن حنبل نے سات لاکھ سے زائد احادیث سے انتخاب کر کے اپنی مسند تیار کی، امام ابوزرعہ رازی کو چھ لاکھ احادیث محفوظ تھیں؎، امام بخاری نے اپنی ''الجامع الصحیح'' کی

؎ امام احمد اور حافظ ابوبکر محمد بن عمر الرازی سے منقول ہے کہ امام ابوزرعہ کو سات لاکھ احادیث یاد تھیں۔

احادیث کی تخریج چھ لاکھ حدیثوں سے کی ہے، اور امام مسلم نے اپنی صحیح کی تخریج تین لاکھ حدیثوں سے کی ہے، تو امام ابوداؤد نے بھی پانچ لاکھ حدیثوں سے انتخاب کر کے اپنی سنن کی تالیف کی ہے امام ابوداؤد کے تلمیذ رشید اور کتاب السنن کے راوی ابوبکر ابن داسہ کا بیان ہے: ”سمعت أبا داؤد يقول كتبت عن رسول الله صلى الله عليه وسلم خمس مأةِ ألف حديث انتخبت منها ما ضمنته هذا الكتاب. يعنى السنن جمعت فيه أربعة آلاف وثمان مأة حديث وذكرت الصحيح وما يشبهه ويقاربه“(۱)

میں نے امام ابوداؤد کو فرماتے ہوئے سنا کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پانچ لاکھ حدیثیں لکھیں اور انہی پانچ لاکھوں سے ان احادیث کا انتخاب کیا ہے جو کتاب السنن میں ہیں۔ میں نے اس میں چار ہزار آٹھ سو حدیثیں جمع کی ہیں اور اس میں صحیح، مشابہ صحیح اور قریب صحیح احادیث ذکر کی ہیں۔

تاریخ رجال میں مہارت

دیگر فقہائے محدثین کی طرح امام ابوداؤد کو بھی صحیح وضعیف احادیث کی معرفت اور ان میں فرق و امتیاز کی شدید ضرورت تھی تاکہ وہ لائق احتجاج روایتوں سے مسائل فقہ کا استنباط و استخراج کرسکیں جو ان کی کتاب السنن کا موضوع اور مقصود اصلی ہے چنانچہ وہ اپنے ”رسالہ“ میں جو اہل مکہ کو تحریر کیا تھا سنن میں موجود احادیث کے بارے میں لکھتے ہیں:

”وليس فى كتاب السنن الذى صنفته عن رجل متروك الحديث شيء، وإذا كان فيه حديث منكر بينت انه منكر وليس على نحوه فى الباب غيره“(۲)

میری تصنیف کردہ کتاب السنن میں کوئی روایت متروک الحدیث سے مروی

---

(۱) تاریخ بغداد، ج:۹، ص:۵۷ وتہذیب تاریخ دمشق الکبیر، ج:۶، ص:۲۴۷ وتہذیب الکمال، ج:۳، ص:۲۶۴ رقم الترجمہ ۲۴۷۶۔

(۲) رسالة الامام ابى داؤد السجستانى الى اهل مكة فى وصف سننه، ص:۳۳، مطبوعہ ۱۴۱۶ھ بہ تحقیق الشیخ عبدالفتاح ابوغدہ۔

> نہیں ہے اور جب اس میں کوئی منکر حدیث ہوتی ہے تو میں اس کی نکارت کو واضح کر دیتا ہوں، (اس نوع کی روایت اسی صورت میں لائی گئی ہے کہ) اس باب میں اس کے علاوہ کوئی اور حدیث نہیں تھی۔

چند سطروں کے بعد مزید لکھتے ہیں:

وما کان فی کتابی من حدیث فیه وَهن شدید فقد بیّنته ومنه ما لا یصح سنده، ومالم اذکر فیه شیئاً فهو صالح وبعضها اصح من بعض الخ“(١)

> میری اس کتاب کی کسی حدیث میں اگر ضعف شدید اور زیادہ کمزوری ہے تو میں نے اسے بیان کر دیا ہے اور اس میں بعض وہ روایتیں ہیں جن کی سند صحیح نہیں ہے (بلکہ درجۂ حسن کی ہے یا اس میں لائق برداشت ضعف ہے) اور وہ احادیث جن پر میں نے کوئی کلام نہیں کیا ہے صالح ہیں اور ان میں بعض احادیث بعض کے مقابلے میں راجح ہیں۔

کتاب السنن کی احادیث کا یہ انتخاب وانتقاء، ان کے مراتب کی تحدید وتعیین، منکر، معلول اور ضعیف ترین روایتوں کی نشاندہی وغیرہ ایسے امور ہیں جو بتا رہے ہیں کہ امام ابوداؤد صرف حافظ حدیث اور اس کے راوی ہی نہیں بلکہ بلند پایہ ناقد حدیث بھی تھے اور راویانِ حدیث کے حسب حال ان کے درجات مقرر کرنے پر ماہرانہ دسترس رکھتے تھے، ظاہر ہے کہ یہ سب تاریخ رجال اور فن جرح وتعدیل پر مکمل عبور کے بغیر ممکن نہیں۔

علاوہ ازیں ”سوالات ابوعبید الآجری“ (جو علم جرح وتعدیل کا ضخیم ومعتمد مجموعہ ہے) جس کے جمع وترتیب کی سعادت اگرچہ حافظ ابوعبید محمد بن علی بن عثمان الآجری کے حصہ میں آئی مگر اصالتاً یہ امام ابوداؤد ہی کی کتاب مانی جاتی ہے کیونکہ اس میں مندرج تمام معلومات انھیں کے خزانۂ علمی سے ماخوذ ومستفاد ہیں۔

امام ابوداؤد کے افادات ومعلومات کے اس مجموعہ کی اہمیت اور فن جرح وتعدیل میں ان کے مقبول ومعتمد ہونے کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ ہر دور کے علمائے

---

(١) رسالۃ الامام ابی داؤد، ص: ٣٧۔

رجال واکابر محدثین، مثلاً حافظ عسکری متوفی ۳۸۲ھ، امام خطیب بغدادی متوفی ۴۶۳ھ، حافظ ابن عساکر متوفی ۵۷۱ھ، حافظ جمال الدین المزی متوفی ۷۴۲ھ، حافظ شمس الدین الذہبی متوفی ۷۴۸ھ، حافظ ابن حجر ۸۵۲، حافظ محمد بن عبدالرحمٰن السخاوی متوفی ۹۰۲ھ وغیرہ اپنی تصانیف میں اس کے اقتباسات کثرت سے نقل کرتے ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ فن اسماء الرجال میں امام ابوداؤد کی عبقریت وامامت ہر دور کے محدثین بالخصوص علمائے جرح وتعدیل کے نزدیک مسلم رہی ہے۔ اوراس فن میں ان کا شمار کبار ائمہ حدیث کے طبقہ میں ہوتا ہے۔ چنانچہ امام ابن حبان البستیؒ ائمہ جرح وتعدیل کے طبقات کا تذکرہ کرتے ہوئے امام احمد بن حنبل، یحییٰ بن معین، علی ابن المدینی وغیرہ کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

ثم اخذ عن هؤلاء مسلك الانتقاد فی الاخبار وانتقاد الرجال فی الآثار جماعة منهم محمد بن یحییٰ الذهلی النیسابوری، وعبدالله بن عبدالرحمن الدارمی، وابوزرعة عبید الله بن عبدالکریم بن یزید الرازی، ومحمد بن اسماعیل الجعفی البخاری، ومسلم بن الحجاج النیسابوری، وابوداؤد بن الاشعث السجستانی فی جماعة من اقرانهم الخ(۱)

> پھراُن ائمہ سے حدیث اوررجال حدیث پرنقد کا طریقہ ایک جماعت نے سیکھا ان میں امام ذہلی، امام دارمی، امام ابوزرعہ رازی، امام بخاری، امام مسلم اورامام ابوداؤد سجستانی اوران کے ہم طبقہ محدثین عظام ہیں۔

اسی طرح امام ذہبی نے بھی اپنے رسالہ ”ذکر من یعتمد قوله فی الجرح والتعدیل“ میں انھیں امام بخاری، امام ذہلی، امام ابوزرعہ رازی، امام ابوحاتم رازی، ابن وارہ، الجوزجانی، امام مسلم، امام الحربی، ابن ابی خیثمہ وغیرہ اساطین فن رجال کے ساتھ پانچویں طبقہ میں شمار کیا ہے۔(۲)

---

(۱) المجروحین، ج:۱، ص:۵۷-۵۸۔

(۲) اربع رسائل فی علوم الحدیث تحقیق شیخ عبدالفتاح ابوغدہ، ص:۱۹۲-۱۹۳۔

فقہ میں تبحر

گزشتہ سطور میں یہ بات گزر چکی ہے کہ امام ابوداوٗد کا شمار علماء حدیث کے اس طبقہ میں ہے جنہیں فقہائے محدثین سے موسوم کیا جاتا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ اس طبقہ کے محدثین عظام علم حدیث میں کامل مہارت اور رسوخ تامہ کے ساتھ فقہ حدیث میں بھی تبحر کے درجہ پر فائز تھے۔ چنانچہ محقق جلیل علامہ محمد زاہد الکوثری متوفی ۱۳۷۱ھ حافظ ابوبکر الحازمی متوفی ۵۸۴ھ کے انتہائی وقیع اور کثیر الفوائد رسالہ ”شروط الائمۃ“ کی تعلیق میں لکھتے ہیں:

وأبوداؤد تفقّه على فقهاء العراق وعظم مقداره فی الفقه وهما (اعنی البخاری وأباداؤد) أفقه الجماعة“(۱)

> امام ابوداوٗد نے فقہاءِ عراق سے فقہ حاصل کی تھی اور اس فن میں بڑی قدر و منزلت کے حامل تھے، اور یہ دونوں بزرگوار یعنی امام بخاری اور امام ابوداوٗد تفقہ میں اصحاب ستہ (یعنی امام مسلم، امام ترمذی، امام نسائی اور امام ابن ماجہ) میں سب پر فائق تھے۔
>
> امام ذہبی نے اس سلسلے میں اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

قلت : كان أبوداؤد مع إمامته فی الحدیث وفنونه من كبار الفقهاء فكتابه یدل على ذلك وهو من نجباء اصحاب الإمام احمد لازم مجلسه مدةً وسأله عن دقائق المسائل فی الفروع والاصول“(۲)

> میں کہتا ہوں (یعنی حافظ ذہبی) کہ امام ابوداوٗد حدیث اور فنون حدیث میں امامت کے ساتھ اکابر فقہاء میں تھے جس پر ان کی کتاب السنن شاہد عدل ہے وہ امام احمد ابن حنبل کے برگزیدہ اور منتخب شاگردوں میں تھے ایک

---

(۱) ثلاث رسائل فی علم مصطلح الحدیث، ص:۱۷۱، مطبوعہ دار البشائر الاسلامیہ، بیروت ۱۴۱۷ھ

(۲) سیر اعلام النبلاء، ج:۱۳، ص:۲۱۵۔

زمانہ تک ان کی مجلس درس میں بیٹھے اور ان سے اصول و فروع سے متعلق دقیق مسائل دریافت کیے۔ (ان مسائل کا مجموعہ مسائل امام احمد بروایت امام ابوداؤد کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔)

امام ذہبی کی یہ تصریح کہ امام ابوداؤد فقہائے کبار میں تھے بتا رہی ہے کہ وہ فقہ کا اعلیٰ ترین ذوق رکھتے تھے کیونکہ اس ذوق فراواں کے بغیر فقہاء کبار کے درجہ تک نہیں پہنچا جاسکتا ہے۔ امام ابوداؤد کے اسی فقہی ذوق کی کارفرمائی ہے کہ انھوں نے اپنے پیش رو محدثین (امام بخاری و مسلم وغیرہ) کے طریق عمل کی بجائے اپنی کتاب میں صرف احادیث احکام کی تخریج کی اور اس میں فقہی احادیث کا ایسا عظیم القدر ذخیرہ جمع کردیا کہ کتب سنن میں اسے ''ام الاحکام'' کی نہایت وقیع و بالاتر حیثیت حاصل ہوگئی۔ چنانچہ شیخ الاسلام، حافظ العصر ابن حجر العسقلانی ''تلخیص الحبیر'' میں ایک جگہ لکھتے ہیں: "کیف یقال ذلک فی حدیث فی سنن ابی داؤد التی ھی ام الاحکام" (۱)

امام ابی داؤد کے فقہ میں اسی غیر معمولی تبحر اور مرتبہ بلند کی بنا پر شیخ ابواسحاق شیرازی نے انھیں طبقات الفقہاء میں جگہ دی ہے جب کہ اصحاب ستہ میں سے کسی اور بزرگ کو یہ مقام حاصل نہیں ہوسکا۔

مسلک و مذہب

ائمہ حدیث بالخصوص اصحاب ستہ یعنی امام بخاری، امام مسلم، امام ابوداؤد، امام ترمذی اور امام ابن ماجہ نے خود اپنے فقہی مسلک و مذہب کے بارے میں کوئی تصریح نہیں کی ہے۔ بعد کے علماء نے اپنے تتبع اور بحث و نظر کے تحت انھیں مجتہد یا ائمہ اربعہ امام اعظم ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل وغیرہ میں سے کسی کا متبع اور مقلد کہا ہے۔ پھر بحث و تحقیق اور فکر و نظر میں اختلاف کا ہونا بالکل ظاہر ہے اس لیے اس سے ماخوذ نتائج کا باہم مختلف ہونا ناگزیر ہے چنانچہ یہی اختلاف امام ابوداؤد کے مسلک کی تعیین میں

---

(۱) ج:۲، ص:۵۰۶، رقم الحدیث ۵۳۳ ناشر مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز ۱۴۱۷ھ۔

بھی نمایاں طور پر نظر آ رہا ہے۔

عصر حاضر کے بلند پایہ ناقد و محقق مولانا عبدالرشید نعمانی نے ’’سنن ابن ماجہ‘‘ کے اپنے مقدمہ میں اصول ستہ کے مصنّفین کے مسلک پر بڑی تفصیلی بحث کی ہے، اس مفصل و مبسوط بحث میں امام ابوداؤد کے مسلک سے متعلق جو اقوال ہیں وہ محقق نعمانی ہی کے الفاظ میں درج ذیل ہیں:

(١) فقال الإمام العلامة، الحافظ محمد أنور الكشميرى فى فيض البارى (ج١ ص ٥٨ طبع مصر): ”والنسائى و أبوداؤد حنبليان صرح به الحافظ ابن تيمية“، وقال رحمه اللّٰه في ”عرف الشذى“: ”وأما ابوداؤد والنسائي فالمشهور أنهما شافعيان ولكن الحق أنهما حنبليان. وقد شحنت كتب الحنابلة بروايات ابى داؤد عن احمد والله اعلم“ ١هـ.

(٢) واما السيد صديق حسن خان ذكر فى كتابه ”أبجد العلوم“ (ص ٨١٠ طبع الهند) البخارى، و أباداؤد، والنسائى فى الشوافع اهـ

(٣) وقال الشاه ولى اللّٰه المحدث دهلوى فى ”الانصاف فى بيان سبب الاختلاف“ (ص٧٩-٨٠ طبع دهلى بالهند): ”وإمام أبوداؤد والترمذى فهما مجتهدان منتسبان الى احمد واسحق“ اهـ

(٤) وقال العلامة ابن القيم فى ”إعلام الموقعين“ فى الوجه الرابع والاربعين من وجوه رد التقليد (ج ١ ص ٢٣٦ طبع الهند) : ”البخارى، ومسلم، وأبوداؤد والأثرم وهذه الطبقة من اصحاب احمد أتبع له من المقلدين المحض المنتسبين اليه“ اهـ

(٥) وكذلك ذكر هؤلاء الثلاثة ابن ابى يعلى فى طبقات الحنابلة، واما تاج الدين السبكى فلم يذكر فى طبقات الشافعية الا البخارى وأبا داؤد والنسائى، وأما الحنفية والمالكية فلم يذكروا أحدا منهم فى طبقاتهم.(١)

---

(۱) ماتمس الیہ الحاجہ لمن یطالع سنن ابن ماجہ ص: ۲۵-۲۶ طبع دیوبند مع سنن ابن ماجہ۔

’’امام، علامہ، حافظ محمد انور شاہ کشمیریؒ نے اپنی املائی کتاب فیض الباری میں کہا کہ امام نسائی اور امام ابوداؤد حنبلی المسلک ہیں، حافظ ابن تیمیہ نے اس کی صراحت کی ہے۔

محدث کشمیری اپنی دوسری املائی تصنیف العرف الشذی میں کہتے ہیں: امام ابوداؤد اور امام نسائی کے بارے میں مشہور ہے کہ یہ دونوں بزرگوار شافعی المذہب ہیں لیکن سچی و صحیح بات یہ ہے کہ یہ دونوں حنبلی ہیں۔ حنبلیوں کی کتابیں، امام احمد بن حنبل کے اقوال سے جو امام ابوداؤد کی روایت سے ہیں بھری ہوئی ہیں۔ واللہ اعلم

اور مولانا سید صدیق حسن خاں قنوجی ثم بھوپالی نے ’’ابجد العلوم‘‘ میں امام بخاری، امام ابوداؤد اور امام نسائی کو شوافع میں ذکر کیا ہے۔

مسند ہند شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے ’’الانصاف فی بیان سبب الاختلاف‘‘ میں لکھا ہے کہ امام ابوداؤد اور امام ترمذی دونوں مجتہد ہیں اور علی الترتیب امام احمد بن حنبل اور اسحاق بن راہویہ سے منتسب ہیں۔

علامہ ابن القیم اعلام الموقعین میں لکھتے ہیں امام بخاری، امام مسلم، امام ابوداؤد اور امام الاثرم اور امام احمد بن حنبل کے تلامذہ کا یہ طبقہ ان کی اتباع زیادہ کرتا ہے بہ نسبت ان خالص مقلدین کے جو ان کی جانب منسوب ہیں۔

اسی طرح ان تینوں ائمہ یعنی امام بخاری، امام مسلم اور امام ابوداؤد کو ابن ابی یعلی نے حنابلہ کے طبقات میں ذکر کیا، جبکہ علامہ تاج الدین سبکی نے امام بخاری، امام ابوداؤد اور امام نسائی کو طبقات شافعیہ میں شمار کیا ہے البتہ احناف اور مالکیہ ان میں سے کسی کو اپنے طبقات میں ذکر نہیں کرتے۔

ان اقوال کا خلاصہ یہ ہے کہ محدث کشمیری، حافظ ابن القیم اور ابن ابی یعلی یہ تینوں حضرات امام ابوداؤد کو حنبلی المسلک کہتے ہیں، جب کہ مولانا نواب صدیق حسن خاں قنوجی ثم بھوپالی اور علامہ تاج الدین سبکی نے انھیں شوافع میں شمار کیا ہے، یہی رائے برکۃ العصر شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی رحمہ اللہ کی بھی ہے۔ چنانچہ لامع الدراری کے مقدمہ میں لکھتے ہیں: ”فإن أبا داؤد عندی حنبلی قطعا، متشدد فی مسلك الحنابلة

کالطحاوی فی الحنفیة"(۱)

''امام ابوداؤد میرے نزدیک قطعی طور پر حنبلی ہیں حنابلہ کے مسلک میں متشدد ہیں جیسے امام طحاوی مسلک حنفیہ میں متشدد ہیں'' جب کہ علامہ نواب صدیق حسن خاں قنوجی بھوپالی اور امام تاج الدین سبکی امام ابوداؤد کو شوافع میں شمار کرتے ہیں اور مسند ہند شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی نظر میں امام ابوداؤد مجتہد منتسب ہیں۔

ان مختلف اقوال کو نقل کرنے کے بعد محقق نعمانی نے ان پر درج ذیل الفاظ میں تبصرہ کیا ہے:

"فانظر الی هذا التجاذب الذی وقع بین هؤلاء الأعلام فتارة یعدون أحدهم شافعیا وتارة حنبلیا وأخری مجتهدا وهذا کله عندی تخرص وتکلم من غیر برهان، فلو کان أحد من هؤلاء شافعیا او حنبلیا لأطبق العلماء علی نقله ولما اختلفوا هذا الاختلاف، کما أطبقوا علی کون الطحاوی حنفیاً والبیهقی شافعیاً وعیاض مالکیاً وابن الجوزی حنبلیاً، سوی الإمام أبی داؤد فإنه تفقه علی الإمام أحمد ومسائله عن احمد بن حنبل معروف مطبوع وذکره الشیرازی فی طبقات الفقهاء من اصحابه"

ان علماء کبار کے مابین پیش آمدہ کشمکش کو دیکھو، کبھی تو ان مذکورہ ائمہ حدیث میں سے کسی کو شافعی بتاتے ہیں اور کبھی حنبلی اور کبھی مجتہد کہتے ہیں۔ میرے نزدیک یہ سب اٹکل اور بے دلیل باتیں ہیں۔ اصول ستہ (یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابی داؤد، سنن ترمذی، سنن نسائی اور سنن ابن ماجہ) کے مصنّفین میں اگر کوئی شافعی یا حنبلی ہوتا تو اس اختلاف شدید کی بجائے سارے لوگ اس کے نقل پر متفق ہوتے جس طرح امام طحاوی کے حنفی، امام بیہقی کے شافعی، قاضی عیاض کے مالکی اور امام ابن الجوزی کے حنبلی ہونے کے قول پر سب کا اتفاق واجماع ہے۔ ہاں امام ابوداؤد کے حنبلی ہونے کی

---

(۱) ص: ۱۵، طبع سہارن پور ۱۳۸۹ھ۔

بات اس سے الگ ہے کیونکہ انھوں نے امام احمد سے فقہ کی تحصیل کی ہے اور اس باب میں امام احمد سے ان کے سوالات معروف ہیں اور کتابی شکل میں طبع ہو چکے ہیں، نیز ابو اسحاق شیرازی نے انھیں طبقات الفقہاء میں امام احمد بن حنبل کے اصحاب وتلامذہ میں ذکر کیا ہے۔

اس تبصرہ کے بعد لکھتے ہیں:

ولعل الصواب فی هذا الباب مانقله الشيخ طاهر الجزائری في ”توجيه النظر إلى أصول الاثر“ عن بعض الفضلاء و نصه :

وقد سئل بعض البارعين فی علم الأثر عن مذاهب المحدثين مرادا بذلك المعنى المشهور عند الجمهور، فاجاب عما سئل عنه بجواب يُوَضّح الحال و إن كان فيه نو ع إجمال، وقد أحببنا ايراده مع اختصار.

قال : ”اما البخاری و أبوداؤد فإمامان فی الفقه وكانا من أهل الاجتهاد“@(۱)

@ جواب کا بقیہ حصہ یہ ہے۔ وأما مسلم ، والترمذی، والنسائی وابن ماجه و ابن خزيمة، وابو يعلىٰ ، والبزار و نحوهم فهم على مذهب أهل الحديث ليسوا مقلدين لواحد بعينه من العلماء ولاهم من الأئمة المجتهدين على الإطلاق بل يميلون الى قول أئمة الحديث كالشافعی واحمد، واسحاق وابی عبيد وأمثالهم وهم إلى مذاهب أهل الحجاز اميلُ منهم الى مذاهب اهل العراق، وأما أبوداؤد الطيالسی فأقدمُ من هؤلاء كلهم من طبقة يحيیٰ بن سعيد القطان، ويزيد بن هارون الواسطی، وعبدالرحمن بن مهدی، وأمثال هؤلاء من طبقة شيوخ الإمام أحمد، وهؤلاء كلهم لا يألون جُهدًا فی اتباع السنة، غير أن منهم من يميل إلى مذهب العراقيين كوكيع ويحيیٰ بن سعيد ، ومنهم من يميل إلى مذهب المدنيين كعبد الرحمن بن مهدی.

وأما الدار قطنی فإنه كان يميل إلى مذهب الشافعی إلا أنه له اجتهاد وكان من أئمة السنة والحديث ولم يكن حاله كحال احدٍ من كبار المحدثين ممن جاء على اثره فالتزم التقليد فی عامة الاقوال إلا فی قليل منها مما يُعَدُّ ويُحصر، فإن الدارقطني اقویٰ فی الاجتهاد منه وكان افقه واعلم منه (ج ا ص ۴۳۸ طبع بیروت ۱۴۱۶ھ بہ تحقیق الشیخ عبد الفتاح ابو غدہ)

(۱) ماتمس الیہ الحاجۃ ص: ۲۶-۲۷ طبع دیوبند۔

شاید کہ اس باب میں وہ بات درست ہو جسے الشیخ طاہر الجزائری نے ”توجیہ النظر الی اصول الاثر“ میں بعض فضلاء سے نقل کی ہے شیخ جزائری کے الفاظ یہ ہیں:

اصول حدیث میں بعض[ے] ماہرین سے محدثین کے مذاہب فقہیہ کے بارے میں دریافت کیا گیا تو انھوں نے اس سوال کا جو جواب دیا وہ صورت حال کو خوب واضح کرتا ہے، اگرچہ اس میں قدرے اجمال ہے۔ مجھے یہ بات پسند آئی کہ اس جواب کو کچھ اختصار کے ساتھ پیش کر دوں۔ انھوں نے کہا کہ ”امام بخاری اور امام ابوداؤد فقہ میں امام ہیں اور دونوں بزرگوار اہل اجتہاد میں سے ہیں“

علامہ طاہر الجزائری کا اس جواب کے متعلق "یوضّح الحال" (جس نے واقعی صورت حال سے پردہ اٹھادیا) کا توصیفی جملہ نیز مسئلۂ زیر بحث میں بطور خاص اسے نقل کرنا بتا رہا ہے کہ امام ابن تیمیہ کی یہ تحقیق ان کے نزدیک اہمیت رکھتی ہے، واللہ اعلم۔

لیکن محقق نعمانی اس تحقیق کے اُس جزء سے جو امام بخاری اور امام ابوداؤد کے بارے میں ہے متفق نہیں ہیں چنانچہ توجیہ النظر سے مکمل جواب نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

”وعندی أن البخاری وأبا داؤد ایضاً کبقیة المذکورین لیسا مقلدین لواحد بعینه ولا من أئمة المجتهدین علی الإطلاق بل یمیلان إلی أقوال أئمتهم، ولو کانا مجتهدین لنقل أقوالهما مع سائر الائمة من أهل الإجتهاد والفقه، ولکن نری أن سائر الکتب التی دُوِّن فیها أقوال المجتهدین خالیة عن ذکر مذاهبهما... وإن کان لا ینکر أن أبا داؤد أفقه الستة ولذا ذکره الشیرازی فی طبقات الفقهاء دون غیره“اھ۔(۱)

میرے نزدیک امام بخاری اور امام ابوداؤد بھی بقیہ مذکورین یعنی امام مسلم، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، ابن خزیمہ، ابویعلی، بزار وغیرہ کی طرح کسی متعین

[ے] محقق عبدالفتاح ابوغدہ نے بعض البارعین کی تعیین امام ابن تیمیہ سے کی ہے۔ چنانچہ اپنے حاشیہ میں لکھتے ہیں هو الشیخ الامام ابن تیمیه کما فی مجموع الفتاوی ج:۲۰،ص:۳۹-۴۰

(۱) ماتمس الیہ الحاجۃ ص:۲۶-۲۷ طبع دیوبند۔

> امام کے مقلد نہیں ہیں اور نہ ہی مجتہد مطلق ہیں بلکہ اپنے اپنے ائمہ کے اقوال کی جانب میلان رکھتے ہیں، اگر یہ دونوں حضرات مجتہد ہوتے تو دیگر فقہائے مجتہدین کے ساتھ انکے اقوال بھی نقل کیے جاتے؛ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ وہ ساری کتابیں جن میں ائمہ مجتہدین کے اقوال جمع کیے گئے ہیں ان دونوں بزرگوں کے اقوال سے خالی ہیں۔ اگرچہ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ائمۂ ستہ میں فقاہت میں بڑھے ہوئے ہیں اسی بناء پر شیرازی نے ان کے علاوہ کسی کا ذکر ’’طبقات الفقہاء‘‘ میں نہیں کیا ہے۔

امام ابوداؤد کے مسلک کے سلسلے میں بظاہر اقرب الی الصواب یہی بات معلوم ہوتی ہے کہ یہ بھی دیگر فقہائے محدثین کی طرح عام مسائل واحکام میں حدیث ہی پر عمل کرتے ہیں اور اس عمل بالحدیث میں وہ بسا اوقات اپنے اہم ترین وعزیز ترین استاذ احمد بن حنبل کی (جن سے وہ بیحد متاثر ہیں اور جن کی سیرت وعادت اور وضع زندگی کو اپنے لیے نمونہ سمجھتے تھے) مخالفت کی بھی چنداں پرواہ نہیں کرتے البتہ جن احکام میں ان کے سامنے حدیث نہیں ہوتی ان میں وہ امام احمد کے اقوال کو اختیار کرتے ہیں، اس اعتبار سے انھیں حنبلی المسلک بجا طور پر کہا جاسکتا ہے۔ واللہ اعلم

زہد وتقویٰ

امام ابوداؤد کے تذکرہ نویس ان کے علمی فضل وکمال کے ساتھ ان کی دنیا سے بے نیازی، ورع وپرہیزگاری اور خشیت الٰہی کا ذکر بھی خصوصیت سے کرتے ہیں اوپر یہ بات گزر چکی ہے کہ امام سجستانی اپنے شیخ اجل امام احمد بن حنبل سے غایت درجہ متاثر تھے حتیٰ کہ عادت وسیرت، اطوار وکردار اور طرز حیات میں انہی کی موافقت ومماثلت اختیار کرتے تھے۔ امام احمد کی حیات طیبہ کے ساتھ اس موافقت سے ان کی طہارت نفس اور پاکیزگیٔ باطن کا اندازہ کیا جاسکتا ہے اور یہ سب حدیث پاک کے ساتھ مخلصانہ اشتغال کی اولین برکت ہے جس سے عام طور پر ائمہ حدیث وفقہ ہم کنار ہوتے ہیں، چنانچہ امام سجستانی

کی بے نفسی اور غیر ضروری چیزوں سے احتراز کا عالم یہ تھا کہ ایک آستین وسیع اور دوسری تنگ بنواتے تھے اس کی وجہ پوچھی گئی تو فرمایا: وسیع آستین تو کتاب رکھنے کے لیے ہے اور دوسری کو وسیع بنانے کی کوئی حاجت نہیں۔ (۱)

حکمت ومعرفت

بندۂ مؤمن جب سنت رسول علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے مطابق زہد وورع اور صلاح وتقویٰ کو اپنی زندگی کا شعار بنالیتا ہے تو بارگاہ رب العزت سے بطور انعام واکرام اس کے دل پر علم وحکمت کا فیضان ہوتا ہے۔ امام ابوداوٴد بھی انہیں خوش بخت بندگان خدا میں شامل ہیں جو حکمت ومعرفت کی دولتِ لازوال سے بہرہ ور تھے، حدیث پاک اور اس سے متعلق علوم وفنون کی تعلیم وتحصیل اور پھر ان کی تبلیغ واشاعت میں غیر معمولی انہاک کی بناء پر اگرچہ انہیں اس علم وہبی کے اظہار و بیان کا موقع نہیں مل سکا پھر بھی خزانۂ دل میں محفوظ علم وحکمت کے کچھ جواہر پارے ان کی زبان پر آ کر عالم آشکارا ہو ہی گئے جن میں سے بعض یہ ہیں:

۱- کان یقول: "الشهوة الخفية حب الرياسة" (۲) چھپی شہوت ریاست اور بڑائی کی خواہش ہے۔

۲- قال: "من اقتصر علی لباس دون و مطعم دون فقد اراح جسده" (۳) فرمایا جس نے معمولی اور کم تر لباس اور طعام پر اکتفاء کیا اس نے اپنے بدن کو راحت وآرام پہنچایا۔

۳- ان کے بیٹے ابوبکر عبداللہ السجستانی ناقل ہیں کہ میں نے والد ماجد سے فرماتے ہوئے سنا کہ "خير الكلام ما دخل الأذن بغير إذن" (۴) بہترین بات وہ

---

(۱) تہذیب تاریخ دمشق، ج:۶، ص:۲۴۸۔

(۲،۳) تہذیب تاریخ دمشق، ج:۶ ص:۲۴۸۔

(۴) سیر اعلام النبلاء، ج:۱۳، ص:۲۱۷۔

ہے جو بغیر اجازت کے کان میں داخل ہوجائے۔ (یعنی اسکے سننے کے لیے متکلم کی یا شریعت کی اجازت درکار نہ ہو)

۴- ایک مرتبہ کسی شیخ کی مجلس میں بیٹھے لکھ رہے تھے کہ ایک شخص ان کی دوات کے قریب آکر کہنے لگا کہ میں اس دوات سے روشنائی لینا چاہتا ہوں تو اس کی جانب متوجہ ہوکر فرمایا: "أما علمت أن من شرع فی مال أخیه بالاستیذان فقد أوجب بالحشمة الحرمان"(۱) کیا آپ کو معلوم نہیں کہ جو شخص اپنے بھائی کے مال کو استعمال کرنے کی اجازت لینا شروع کردیتا ہے وہ وقار اور پسندیدہ سیرت وخصلت سے محرومی کو لازم کرلیتا ہے۔

۵- آپ کے مشہور تلمیذ اور طویل مجلس نشیں حافظ ابوعبید الآجری کا بیان ہے کہ میں نے امام ابوداؤد سے دریافت کیا : "سمعت من یوسف الصفّار ؟ قال : لا، قلت سمعت من ابن الاصفهانی ؟ قال : لا، قلت سمعت من عمرو بن حماد بن طلحة ؟ قال : لا، ولا سمعت من مُخَوَّل بن ابراهیم، ثم قال هؤلاء کانوا بعد العشرین والحدیث رزق ولم اسمع منهم" (۲) کیا آپ نے یوسف الصفار سے حدیث کی سماعت کی ہے؟ فرمایا نہیں، میں نے مزید دریافت کیا کہ کیا جناب نے ابن الاصفہانی سے حدیث سنی ہے فرمایا نہیں، میں نے عرض کیا کہ آپ نے عمرو بن حماد بن طلحہ سے سنا ہے؟ فرمایا نہیں، اور میں نے مخوّل بن ابراہیم سے بھی نہیں سنا ہے پھر ارشاد فرمایا: یہ سب شیوخ حدیث ۲۲۰ھ کے بعد کے ہیں (جو میرا عہد طالب علمی ہے) حدیث پاک اللہ کا رزق ہے (ان بزرگوں کا زمانہ پانے کے باوجود) میں ان سے حدیث نہ سن سکا، مطلب یہ ہے کہ جس طرح روزی اسی کو ملتی ہے جسے مالک کائنات عطا فرمائے انسان کے علم و ہنر کا اس میں کوئی دخل نہیں، اسی طرح سماعت حدیث بھی اسی سے سننا نصیب ہوگی جس سے سننے کی توفیق الٰہی میسر آجائے۔

---

(۱) وفیات الاعیان، ج:۱، ص:۳۸۳۔

(۲) سوالات الآجری، ج:۲، ص:۲۹۵۔

علمی نوادرات

(۱) آپ کے نامور شاگرد اور کتاب السنن کے راوی ابوبکر ابن داسہ کا بیان ہے کہ میں نے امام ابوداؤد کو فرماتے ہوئے سنا کہ میں نے رسول اللہ...... کی پانچ لاکھ حدیثوں کو تحریراً ضبط کیا ہے کتاب السنن کی چار ہزار آٹھ سو احادیث انھیں کا انتخاب ہیں جس میں صحیح، مشابہ صحیح اور مقارب صحیح روایتیں ہیں اور ایک انسان کے دین کی استواری کے واسطے ان میں سے چار حدیثیں کافی ہیں: (۱) إنما الأعمال بالنيات۔ اعمال کا اعتبار نیتوں کے مطابق ہوتا ہے۔ (۲) من حسن إسلام المرء تركه مالا يعنيه. مرد مسلم کے اسلام کی خوبی سے ہے اس کا بیکار چیزوں کا ترک کر دینا۔ (۳) لايكون المؤمن مؤمنا حتى يرضى لأخيه مايرضاه لنفسه. ایک مؤمن اس وقت تک کامل مؤمن نہیں جب تک کہ وہ اپنے بھائی کے لیے وہی چیز پسند نہ کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔ (۴) الحلال بیّن، والحرام بیّن، وبين ذلك امور مشتبهات، الحديث؎.(۱) حلال ظاہر ہے، حرام ظاہر ہے اور حلال و حرام کے درمیان کچھ امور مشتبہ ہیں۔

امام ابوداؤد کے اس وقیع علمی قول کی توجیہ کرتے ہوئے زبدۃ المحدثین شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رقمطراز ہیں:

> ”راقم الحروف می گوید معنی کفایت آنست کہ بعد از معرفت قواعد کلیہ شریعت ومشہورات آں، در جزیات و وقائع حاجت بہ مجتہدے و مرشدے باقی نمی ماند زیرا کہ در تصحیح عبادات حدیث اول کفایت می کند، و در محافظات اوقات

؎ حدیث پاک کے باقی الفاظ یہ ہیں لا يعلمهن كثير من الناس فمن اتقىٰ الشبهات فقد استبرأ لدينه وعرضه ومن وقع فى الشبهات وقع فى الحرام كالراعى يرعى حول الحمى يوشك ان يرتع فيه ان شبہات کو اکثر لوگ نہیں جانتے تو جو شخص شبہات سے بچا اس نے اپنے دین اور آبرو کو نقص وعیب سے محفوظ و بری کرلیا اور جو شبہات میں پڑے گا وہ (بالآخر) حرام میں پڑے گا اس چرواہے کی طرح جو ممنوع چراگاہ کے اردگرد مویشیوں کو چراتا ہے تو عنقریب وہ اس ممنوعہ چراگاہ میں چرالے گا۔

(۱) تاریخ بغداد، ج:۹، ص:۵۷، تہذیب تاریخ دمشق، ج:۶، ص:۲۴۷، البدایہ والنہایہ، ج:۱۱، ص:۶۴۔

عمر عزیز حدیث دوم، و در مراعات حقوق ہمسایہ و اقارب و دیگر اہل تعارف و معاملہ حدیث سوم، و در دفع شک و تردد کہ بسبب اختلاف علماء یا اختلاف ادلّہ رومی دہد حدیث چہارم، پس ایں ہر چہار حدیث نزد مرد عاقل حکم پیرو استاد ہر دو دارند واللہ اعلم۔'' (۱)

راقم حروف کہتا ہے کہ ان کے کافی ہونے کے معنی یہ ہے کہ شریعت کے قواعد کلیہ اور مشہور امور کو معلوم کر لینے کے بعد پیش آمدہ جزئی مسائل میں مجتہد و مرشد کی ضرورت نہیں ہوگی کیونکہ عبادات کی درستگی کے لیے پہلی حدیث اور عمر عزیز کے اوقات کی حفاظت کے لیے دوسری حدیث اور ہمسایہ و اقارب اور دیگر اہل تعارف و معاملہ کے حقوق کی رعایت کے لیے تیسری حدیث اور اس شک و تردد کے ازالہ کے لیے جو علماء کے اختلاف یا دلائل کے مختلف ہونے سے پیدا ہوتے ہیں چوتھی حدیث کافی ہے۔ لہٰذا یہ چاروں حدیثیں مرد عاقل کے لیے مرشد اور استاذ دونوں کے حکم میں ہیں۔ واللہ اعلم

(۲) حافظ الآجری کہتے ہیں کہ میں نے امام ابوداؤد کو کہتے ہوئے سنا کہ ''اللیث بن سعد روی عن الزهری، وروی عن خمسة عن الزهری، حدث عن خالد بن یزید، عن سعید بن ابی هلال، عن یزید بن الهاد، عن ابراهیم بن سعد، عن صالح بن کیسان، عن الزهری'' (۲)

لیث بن سعد مصری الامام ابن شہاب زہری سے بلا واسطہ روایت کرتے ہیں اور درج بالا پانچ واسطوں سے بھی روایت کرتے ہیں۔

(۳) امام ابوداؤد کا بیان ہے ''شبّرت قثّاء بمصر ثلاثة عشر شبرا، و رأیت اترجّة علی بعیر قطعت قطعتین وعملت مثل عِدلین''(۳) میں نے مصر میں ایک

---

(۱) بستان المحدثین مترجم، ص:۲۸۶ طبع سعید کمپنی کراچی، پاکستان۔

(۲) سوالات الآجری، ج:۲، ص: ۱۶۷-۱۶۸ و تہذیب التہذیب، ج:۸، ص: ۴۰۴-۴۰۵، رقم الترجمہ ۵۹۱۰، سیر اعلام النبلاء، ج:۱۳، ص: ۲۱۷، چار واسطوں کا ذکر ہے سعید بن ابی ہلال کے بعد یزید بن الہاد کا نام نہیں ہے۔

(۳) تذکرۃ الحفاظ، ج:۲، ص:۵۹۲۔

ککڑی کی پیمائش کی تو وہ تیرہ بالشت کی تھی اور اونٹ پر لدا ایک لیمو دیکھا جس کے دو ٹکڑے کر کے گون کی طرح دونوں جانب لٹکا دیئے گئے تھے۔

(۴) امام ابوداؤد فرماتے ہیں کہ ”حارثة بن النعمان، و عبد اللّٰه بن عباس، وابو سفيان بن حرب، وجابر بن عبد اللّٰه و حسان بن ثابت، و كعب بن مالك، وابن ام مكتوم، و عِتبان بن مالك، وابو قحافة، والعباس بن عبدالمطلب هؤلاء ذهبت ابصارهم“(۱) یعنی مذکورہ بالا حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نابینا ہو گئے تھے۔

امام ابوداؤد ائمہ حدیث اور اکابر علماء کی نظر میں

ارباب علم وفضل کی نظر میں امام ابوداؤد کا مقام و مرتبہ کیا تھا اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے کہ شیخ العارفین سہل بن عبداللہ التستری المتوفی ۲۸۳ھ (معروف بہ الزاہد المحدث) ایک دن امام ابوداؤد کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ میری ایک حاجت آپ سے وابستہ ہے، امام سجستانی نے کہا ارشاد فرمائیں وہ کیا حاجت ہے؟ شیخ تستری بولے اس شرط پر بیان کروں گا کہ آپ وعدہ فرمائیں کہ اگر اسے پورا کرنے کی قدرت ہوگی تو آپ اس سے دریغ نہیں فرمائیں گے، امام ابوداؤد نے وعدہ کر لیا کہ حتی الامکان اسے پورا کروں گا، تو شیخ تستری نے عرض کیا ”اخرج الیّ لسانك الذي حدثت به احاديث رسول اللّٰه صلى الله عليه و سلم حتّٰى اقبّله“ اپنی پاکیزہ زبان جس سے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث بیان کرتے ہیں میری جانب نکالیے تا کہ اس کا بوسہ لوں۔ ”فاخرج اليه لسانه فقبله“ حسب وعدہ امام ابوداؤد نے زبان باہر نکال دی اور شیخ تستری نے اسے چوم لیا۔(۲)

---

(۱) سوالات الآجری، ج:۱، ص: ۱۹۸

(۲) وفیات الاعیان، ج:۱، ص: ۳۸۳ رقم الترجمہ ۲۷۲ وتہذیب الکمال، ج:۳، ص: ۲۶۵ رقم الترجمہ ۲۴۷۶ وسیر اعلام النبلاء، ج:۱۳، ص: ۲۱۳ وص ۲۳۱ مختصراً۔

شیخ تستری جیسے زاہد و عابد (جو دنیا اور اہل دنیا کی سرگرمیوں سے الگ تھلگ زاویۂ خمول میں بیٹھے یاد الٰہی میں مستغرق رہا کرتے تھے) کا امام ابوداؤد کے ساتھ حسن عقیدت اور والہانہ محبت کا یہ معاملہ ارباب فضل و کمال کے دلوں میں ان کی قدر و منزلت کا پتہ دیتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ امام ابوداؤد کے کمالات و فضائل کے اعتراف و اظہار میں ہر دور کے صاحب نظر علماء رطب اللسان رہے ہیں اس موقع پر بنظر اختصار اکابر علماء کے دس فرمودات واقوال نقل کیے جاتے ہیں:

(۱) امام ابراہیم بن اسحاق الحربی المتوفی ۲۸۵ھ فرماتے ہیں:

"أُلِین لأبی داؤد الحدیث کما ألین لداؤد علیه السلام الحدید" (۱)

ابوداؤد سجستانی کے لیے حدیث نرم کردی گئی جس طرح داؤد نبی علیہ السلام کے لیے لوہا نرم کردیا گیا تھا، بعینہٖ یہی بات محمد بن اسحاق الصاغانی المتوفی ۲۷۰ھ نے بھی فرمائی ہے۔

(۲) حافظ موسیٰ بن ہارون المتوفی ۲۹۴ھ کا قول ہے:

"خلق أبو داؤد فی الدنیا للحدیث وفی الآخرة للجنة ما رأیت افضل منه"(۲)

امام ابوداؤد دنیا میں خدمت حدیث کے لیے اور آخرت میں جنت کے واسطے پیدا کیے گئے ہیں میں نے ان سے افضل و برتر کسی کو نہیں دیکھا۔

(۳) ابوبکر الخلال المتوفی ۳۱۱ھ نے ان الفاظ میں مدح سرائی کی ہے:

"أبو داؤد الإمام المقدم فی زمانه رجل لم یسبق الی معرفته بتخریج العلوم وبصره بمواضعه احد فی زمانه رجل ورع مقدم. (۳)

امام ابوداؤد سجستانی اپنے عہد میں پیشوا اور ایک ایسے مرد کامل تھے کہ احادیث احکام کی تخریج کی معرفت اور مواقع احکام کی بصیرت میں ان کے

---

(۱) تہذیب الکمال، ج:۳، ص:۲۶۴ رقم الترجمہ ۲۴۷۶ وتہذیب تاریخ دمشق، ج:۶، ص:۲۴۷

(۲) تہذیب الکمال، ج:۳، ص:۲۶۴ رقم الترجمہ ۲۴۷۶ وتہذیب تاریخ دمشق، ج:۶، ص:۲۴۷

(۳) ایضاً

زمانہ میں کوئی عالم ان پر سبقت نہ لے جا سکا نیز وہ ایک مرد پارسا اور برتر شخصیت کے مالک تھے۔

(۴) مسند بغداد امام محمد بن مخلد المتوفی ۳۳۱ھ ان الفاظ میں امام ابوداؤد کی جلالت شان کا اعتراف کرتے ہیں:

”کان ابوداؤد یفی بمذاکرة مأة الف حدیث ... اقرّ له اهل زمانه بالحفظ“(۱)

وہ دوران مذاکرہ ایک لاکھ حدیثیں پیش کر دیتے تھے ان کے معاصرین نے ان کے حفظ و اتقان کی شہادت دی ہے۔

(۵) محدث احمد بن محمد بن یاسین الہروی المتوفی ۳۳۴ھ امام سجستانی کے مناقب بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

”کان أبوداؤد أحد حفاظ الإسلام لحدیث رسول الله صلی الله علیه سلم وعلمه وعلله فی اعلا درجة النسك والعفاف والصلاح والورع من فرسان الحدیث“(۲)

امام ابوداؤد رسول خدا...... کی احادیث، نیز علم حدیث، علل حدیث کے حفاظ میں سے ایک تھے، عبادت الٰہی، پارسائی و پاکدامنی اور صلاح و پرہیزگاری میں بلند درجہ پر فائز، میدانِ حدیث کے شہ سواروں میں تھے۔

(۶) امام ابوحاتم ابن حبان المتوفی ۳۵۴ھ یوں مدح سرا ہیں:

”کان أبوداؤد أحد ائمة الدنیا فقهاً و علماً و حفظاً ونسكاً و ورعاً واتقاناً جمع و صنّف وذبّ عن السنن“ (۳)

فقہ، حدیث، قوت حافظہ، عبادت گزاری، زہد و پارسائی اور حافظہ کی پختگی

---

(۱) تہذیب تاریخ دمشق، ج:۲، ص:۲۴۷ و تہذیب الکمال، ج:۳، ص:۲۶۴ رقم الترجمہ ۲۴۷۹

(۲) تہذیب تاریخ دمشق، ج:۲، ص:۲۴۷ و تہذیب الکمال، ج:۳، ص:۲۶۴ رقم الترجمہ ۲۴۷۹

(۳) تہذیب الکمال، ج:۳، ص:۲۶۵ و سیر اعلام النبلاء، ج:۱۳، ص:۲۱۲

کے اعتبار سے امام ابوداؤد دنیا کے اماموں میں سے ایک تھے، انھوں نے حدیث رسول اللہ...... کی جمع و تالیف اور حمایت سنت کی گرانقدر خدمات انجام دیں۔

(۷) حافظ ابوعبداللہ بن مندہ المتوفی ۳۹۶ھ نے ان کی عظمت شان کا اظہار اس طرح کیا ہے:

”الذین أخرجوا و میزوا الثابت من المعلول والخطاء من الصواب اربعة: البخاری، ومسلم و بعدھما ابو داؤد والنسائی“ (۱)

بطور خاص جن ائمہ حدیث نے احادیث کی تخریج کی اور ثابت وصحیح کو ضعیف و کمزور سے اور غلط کو درست سے الگ کیا، چار ہیں: امام بخاری، امام مسلم، امام ابوداؤد اور امام ابوعبدالرحمٰن النسائی۔

(۸) امام ابوعبداللہ الحاکم النیسا پوری المتوفی ۴۰۵ھ کہتے ہیں:

”أبو داؤد إمام أهل الحدیث فی عصره بلا مدافعة“ (۲)

امام ابوداؤد بغیر کسی اختلاف کے اپنے عہد میں علمائے حدیث کے امام تھے۔

(۹) امام ابن الجوزی المتوفی ۵۹۷ھ کا بیان ہے:

”کان عالما عارفا بعلل الحدیث ذا عفاف وورع و کان یشبه باحمد بن حنبلؒ“

امام ابوداؤد عالم، حدیث کی علتوں کے پہچاننے والے، پاکبازی و پرہیزگاری سے متصف تھے اور حسن سیرت میں امام احمد بن حنبل سے مشابہ تھے۔

(۱۰) امام النووی المتوفی ۶۷۶ھ رقمطراز ہیں:

---

(۱) ایضاً

(۲) ایضاً

”اتفق العلماء علی الثناء علی أبی داؤد و وصفه بالحفظ التام والعلم الوافر والإتقان والورع والدین والفهم الثاقب فی الحدیث وغیره“ (۱)

امام ابوداؤد کی ستائش اوران کی بھرپور قوت حافظہ، علم کی کثرت، ضبط کی پختگی، پارسائی اور دینداری اور حدیث وغیرہ علوم میں فہم رسا پر علماء کا اتفاق ہے۔

امام ابوداؤد کی تصنیفی خدمات

(۱) رسالة الی اهل مکة فی وصف سننه : **علماء مکہ نے ایک تحریر کے ذریعہ امام ابوداؤد سے ان کی کتاب السنن کی احادیث کے مرتبہ صحت وغیرہ سے متعلق امور کی وضاحت چاہی تھی اسی کے جواب میں انھوں نے یہ رسالہ قلمبند کیا تھا، یہ رسالہ پہلی بار مطبع الانوار قاہرہ سے ۱۳۶۹ھ میں محقق جلیل علامہ محمد زاہد الکوثری کے مقدمہ اور تعلیق و تحقیق کے ساتھ شائع ہوا۔ اس کے بعد ڈاکٹر محمد بن لطفی الصباغ اور معروف محقق علامہ عبدالفتاح ابوغدہ کی تحقیقات وتعلیقات سے اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے۔**

(۲) مسائل الإمام أحمد روایة أبی داؤد : **علامہ رشید رضا کے مقدمہ اور استاذ محمد بہجت البیطار کی تصحیح سے مطبع المنار مصر سے پہلی بار ۱۳۵۳ھ میں یہ رسالہ شائع ہوا تھا بعد میں اسی نسخہ کی فوٹو کاپی سے بیروت سے اس کے متعدد ایڈیشن طبع ہوئے۔**

(۳) سوالات الآجرّی : **یہ کتاب علم حدیث کے اہم ترین فن معرفۃ الرجال (جرح وتعدیل) کے موضوع پر ہے اس کتاب کا ایک ناقص نسخہ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ سے ڈاکٹر محمد علی قاسم العمری کی تحقیق وتعلیق کے ساتھ ۱۴۰۳ھ میں طبع ہوا تھا پھر دوسرا فی الجملہ مکمل نسخہ ۱۴۱۸ھ میں ڈاکٹر عبدالعلیم بستوی کے مقدمہ اور تعلیق کے ساتھ مکتبہ دارالاستقامہ مکہ مکرمہ نے شائع کیا ہے جو اصل کتاب کے جزء ۲، ۳، ۴، ۵ پر مشتمل ہے۔ جزء اول مفقود ہے، اس لیے شامل کتاب نہیں ہوسکا۔**

(۴) تسمیة الإخوة الذین روی عنهم الحدیث : **موضوع نام سے ظاہر**

---

(۱) تہذیب الاسماء واللغات، ج:۲، ص:۲۲۵

ہے حال ہی میں یہ رسالہ ڈاکٹر باسم فیصل الجوابرۃ کی تحقیق سے شائع ہوگیا ہے۔

(۵) أسئلة لأحمد بن حنبل عن الرواة الثقات والضعفاء : چند سال پہلے یہ رسالہ بھی ڈاکٹر زیاد محمد منصور کی تحقیق سے شائع ہوگیا ہے۔

(٦) المراسیل : امام ابوداؤد کی یہ معروف تصنیف ۱۳۱۰ھ میں مصر سے طبع ہوئی تھی بعد میں بیروت سے دوسرا ایڈیشن شائع ہوا۔ اور تیسرا ایڈیشن شیخ شعیب الارناؤط کی تحقیق سے شائع ہوا ہے یہ نسخہ سابقہ نسخوں کے لحاظ سے زیادہ مفید و مکمل ہے۔

(۷) الناسخ والمنسوخ : امام ابوداؤد سے اس کتاب کی روایت ابوبکر احمد النّجاد کرتے ہیں حافظ ابن حجر نے تہذیب التہذیب میں اس کی صراحت کی ہے۔(۱)

(۸) کتاب الزهد : ضیاء الحسن السّلفی کی تحقیق کے ساتھ الدار السّلفیہ بمبئی سے چند سال قبل شائع ہوگئی ہے۔

(۹) کتاب الرد علی اهل القدر : حافظ ابن حجر عسقلانی نے اس کا ذکر کیا ہے اور بیان کیا ہے کہ امام ابوداؤد سے اس کی روایت ابوعبداللہ محمد بن احمد بن یعقوب المتوُّثی کرتے ہیں(۲)

(۱۰) کتاب البعث والنشور : الزرکلی نے الاعلام میں اور بروکلمان نے تاریخ الادب العربی میں اس کا تذکرہ کیا، امام ابوداؤد کے خلف الصدق ابوبکر عبداللہ السجستانی کی بھی ایک تصنیف اسی نام سے ہے۔(۳)

(۱۱) المسائل التی حلف علیها الإمام أحمد بن حنبل : اس کتاب کا سو ورق پر مشتمل مخطوطہ الظاہریۃ میں ہے۔

(۱۲) دلائل النبوة

(۱۳) کتاب الدعاء

---

(۱) ج:۴، ص:۱۵۴ رقم الترجمہ ۲۶۲۸

(۲) الاعلام، ج:۳، ص:۱۲۲ و تاریخ الادب العربی، ج:۳، ص:۱۸۹

(۳) تاریخ التراث العربی، ج:۱، ص:۲۳۸

(۱۴) كتاب ابتداء الوحی

(۱۵) كتاب أخبار الخوارج

(۱٦) التفرد فی السنن

(۱۷) فضائل الأنصار

(۱۸) مسند مالك **نمبر شمار ۱۲ سے ۱۸ تک سات تصانیف کا ذکر حافظ ابن حجر نے تہذیب کے مقدمہ میں کیا ہے۔**

(۱۹) أصحاب الشعبی : **اس کتاب کا ذکر سوالات الآجرّی میں آیا ہے۔**

(۲۰) كتاب السنن : **امام ابوداؤد کے تصنیفی کاموں میں یہ کتاب شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے۔ امام سجستانی کی یہی وہ عظیم تصنیف ہے جس نے ان کے شرف ومجد کو ثریا کی رفعت وبلندی عطا کی اور ان کے نام وکام کو ذکر دوام کی دولت بیکراں سے ہم آغوش کردیا جو اپنے زمانۂ تالیف سے آج تک محدثین وفقہاء کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی ہے۔**

”ذلك فضل الله يوتيه من يشاء“

☆ ☆ ☆

اجودھیا کے مشاہیر علماء و مشائخ

اجودھیا شہر فیض آباد سے جنوب مشرق میں ۶ کلو میٹر کے فاصلے پر ایک قدیم قصبہ ہے جس کی کل آبادی اس وقت ۳۵ ہزار کے قریب ہے جن میں مسلمان صرف ایک ہزار کے لگ بھگ ہیں۔ اس قدیم آبادی میں ½۴ ہزار نئے پرانے مندر ہیں اور تقریباً ایک صد سے زائد قدیم مسجدیں ہیں۔ کسی زمانہ میں یہاں بدھوں اور جینیوں کی عبادت گاہیں بھی تھیں مگر اب ان کا کوئی نام ونشان باقی نہیں ہے۔ سرکاری اندراج کے مطابق ۲۷ قبرستان ہیں جن میں سے صرف ۶ قبرستانوں میں بروقت مُردے دفن کرنے کی اجازت ہے۔

مسجدیں بالعموم خستہ حالت میں ہیں جن کی مرمت وتعمیر کی اجازت نہیں ہے جبکہ مندروں کی مرمت وتعمیر پر کسی قسم کی کوئی قدغن نہیں ہے۔ اسی جانب دارانہ پالیسی کی وجہ سے مسجدوں کی تعداد گھٹ کر سورہ گئی ہے ورنہ زبانی روایات کے مطابق یہاں ہزاروں چھوٹی بڑی مسجدیں تھیں۔

اجودھیا کی روایتی خصوصیت

مشہور روایت کے مطابق یہ شہر ابوالانسان حضرت آدم علیہ السلام کے صلبی صاحبزادے حضرت ''شیث'' علیہ السلام کا مدفن اور ''رام جی'' کا جنم استھان ہے اسی بناء پر مسلمان اور ہندو دونوں اس سرزمین کو عظمت کی نگاہ سے دیکھتے اور اس کے ساتھ جذباتی تعلق رکھتے ہیں۔ حضرت شیثؑ کا مزار آج بھی متعین ومعلوم طور پر اجودھیا میں موجود ہے اور بلا اختلاف ہندو و مسلمان دونوں اسے متبرک ومقدس سمجھتے ہیں۔

اجودھیا اپنی اسی روایتی خصوصیت کی بناء پر ہمیشہ سے مشائخ وصوفیاء اور سادھوؤں و سنتوں کا مرکز رہا ہے۔ چنانچہ آج بھی یہاں سیکڑوں مشائخ و اولیاء کے مزارات اور ان کی

خانقاہوں کے آثار موجود ہیں اور زبان حال سے اپنی عظمت رفتہ کی شہادت دے رہے ہیں۔

نوابان اودھ کی عملداری اور انگریزوں کے جابرانہ تسلط نے اجودھیا کی اس مرکزیت کو باقی نہیں چھوڑا اوّل الذکر نے اپنے مخصوص مذہبی عقائد ونظریات اور انگریزوں نے اپنے سیاسی مقاصد کے حصول کی غرض سے یہاں کی اسلامی روایات کو اپنی شاطرانہ چالوں سے پامال کردیا۔ آزادی کے بعد ابنائے وطن کے ایک مخصوص طبقہ نے حکومت کی غیر منصفانہ خاموشی اور درپردہ تعاون سے رہی سہی کسر بھی پوری کردی اور آج صورت حال یہ ہے کہ اس سرزمین پر مسلمانوں کے وجود کو ننگ وعار سمجھا جارہا ہے اور اسلامی عبادت گاہوں (مساجد) کو مندروں میں تبدیل کیا جارہا ہے۔ حالانکہ جس طرح یہ سرزمین ہندوؤں کے نزدیک رام جنم بھومی ہونے کی وجہ سے پوتر ہے اسی طرح مسلمانوں کے نزدیک بھی حضرت شیث علیہ السلام کے مدفن اور سیکڑوں اولیاء کی خواب گاہ ہونے کی بناء پر مقدس ومتبرک ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ابنائے وطن جن روایات کے سہارے اجودھیا کو رام جی کی جنم بھومی کہتے ہیں ان سے کہیں زیادہ اور مضبوط تاریخی روایات سے اس سرزمین میں حضرت شیث علیہ السلام کا مزار ہونا ثابت ہے دور جدید کی تحقیق کے اعتبار سے اگر یہ روایتیں محل نظر ہیں تو جنم استھان کی روایت اس سے بھی زیادہ کمزور اور عقل وتحقیق سے بعید ہے۔

اس مختصر مقالہ میں ان روایتوں کی تنقیح وتحقیق کی گنجائش نہیں انشاء اللہ کسی اور موقع پر اس اجمال کی تفصیل پیش کی جائے گی اس مختصر تمہید کے بعد چند مشائخ کے حالات ملاحظہ فرمائیں جن سے کچھ نہ کچھ حقیقت حال ضرور منکشف ہوگی۔

(۱) قاضی قدوۃ الدین

قاضی قدوۃ الدین بن میرک شاہ بن ابوالعلی اسرائیلی اودھی متقدمین علمائے ہند میں صاحب کمال بزرگوں میں شمار ہوتے ہیں۔ علوم وفنون میں مکمل دستگاہ رکھنے کے ساتھ شیخ عثمان ہرونی (مرشد شیخ معین الدین سجزی اجمیری متوفی) سے سلوک وطریقت کی

تحصیل کا شرف بھی انھیں حاصل تھا۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت قائم ہو جانے کے بعد یہاں تشریف لائے اور سکونت کے لئے اجودھیا (اودھ) کو منتخب کیا۔

قاضی صاحب نہایت جری اور حق گو تھے امر بالمعروف و نہی عند المنکر میں امراء و حکام کی بھی مطلق پروا نہیں کرتے تھے ۶۰۵ھ میں آپ کی وفات ہوئی۔(۱)

بابری مسجد کے سامنے پورب جانب پختہ چبوترہ پر آپ کی قبر آج بھی موجود ہے۔ اور عوام میں ''قاضی قدوہ کا مزار'' کے نام سے مشہور ہے اس قبر کے اردگرد بالخصوص جنوب کی سمت بہت سی قبریں تھی مگر اب انھیں برابر کر کے کھیت بنا لیا گیا ہے۔

قاضی صاحب کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادے شیخ اعزالدین اس دیار کے قاضی مقرر ہوئے اللہ تعالیٰ نے ان کی اولاد میں بڑی برکت عطا کی اور ان کا سلسلہ اس علاقے میں خوب پھیلا۔ بقول شیخ وجیہہ الدین اشرف لکھنوی مولف بحر ذخار اس خاندان کے لوگوں نے اجودھیا کے اطراف و جوانب میں تقریباً پچاس گاؤں بسائے۔ چنانچہ سورا پور ضلع فیض آباد، لکھنؤ، نواب گنج ضلع بارہ بنکی وغیرہ میں اس سلسلہ کے لوگ اب بھی موجود ہیں جو اپنے آپ کو انھیں قاضی قدوۃ الدین کی جانب منسوب کرتے ہوئے قدوائی کہتے اور لکھتے ہیں۔

ڈاکٹر دبیر مؤلف شہر اولیاء اپنی کتاب کے صفحہ ۲۵۹ کے حاشیہ میں لکھتے ہیں۔

> ''معتبر کتب تاریخ میں کسی قاضی قدوہ نامی شخص کا شہر اودھ (اجودھیا) میں بطور حاکم یا قاضی شہر آنا ثابت نہیں ہے۔''

ڈاکٹر صاحب موصوف اگر تھوڑی سی زحمت گوارا فرما کر بحر ذخار یا نزہۃ الخواطر کو دیکھ لیتے تو اس غلط حاشیہ آرائی سے بچ جاتے۔

(۲) شیخ الاسلام فرید الدین اودھی

شیخ الاسلام فرید الدین اودھی، نحو، لغت، ادب، تفسیر وغیرہ علوم میں امتیازی شان

---

(۱۰) بحر ذخار بحوالہ نزہۃ الخواطر ج ۱ ص ۱۹۶۔

کے مالک تھے۔ مولانا عبدالحئی حسنیؒ ان کے متعلق لکھتے ہیں ”لم یکن مثله فی زمانه“ احکام فرعیہ میں امام شافعیؒ کے پیرو تھے۔ اجودھیا میں شیخ الاسلام کے باوقار منصب پر فائز تھے اور کار منصبی کے ساتھ طلبہ کو درس بھی دیتے تھے۔ علامہ شمس الدین بن یحییٰ اور شیخ علاء الدین نیلی جیسے اساطین فن آپ کے خوان علم کے ریزہ چیں تھے۔ افسوس کی اس یگانہ دہر کے تفصیلی حالات وسن وفات دستیاب نہیں البتہ مولانا شمس الدین اودھی اور مولانا نیلی کا ان سے تلمذ یقینی طور پر بتاتا ہے کہ یہ آٹھویں صدی ہجری کے اوائل کے بزرگ ہیں۔ (۱)

(۳) شیخ بدرالدین واعظ

شیخ بدرالدین حنفی اودھی صلاح وتقویٰ سے متصف عہد علائی کے زبردست واعظ ومذکر تھے، مستقل قیام اجودھیا ہی میں تھا مگر وعظ وتذکیر کی غرض سے گاہے بہ گاہے دارالحکومت دہلی تشریف لے جاتے اور وہاں مہینوں قیام کر کے خلق خدا کو اپنے مواعظ و نصائح سے مستفید کرتے تھے مورخ برنی اپنی تاریخ میں شیخ کا تذکرہ یوں کرتا ہے۔

> ”شیخ بدرالدین زہد وتقویٰ میں بلند مرتبہ کے حامل تھے گفتگو میں تصنع و تکلف سے پرہیز کرتے تھے، راست گوئی عادت ثانیہ تھی۔ ان کی مجلس وعظ میں ہر طبقے کے لوگ حاضر ہوتے تھے وعظ کی اثر انگیزی کا یہ عالم تھا کہ سامعین روتے روتے نڈھال ہو جاتے تھے۔“ (۲)

مزید تفصیلات معلوم نہ ہوسکیں ہاں علاء الدین خلجی کے عہد سلطنت کی تصریح سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ساتویں صدی کے آخر یا آٹھویں صدی کے ابتدائی عہد کے بزرگ ہیں۔ کیونکہ شاہ علاء الدین خلجی ۶۹۲ھ میں تخت نشیں ہوا ہے اور بیس سال حکومت کر کے ۷۱۶ھ میں وفات پا گیا۔

(۴) قاضی محی الدین کاشانی

قاضی محی الدین اجودھیا کے ایک ذی اثر خاندان کے فرد فرید تھے سلسلۂ نسب یوں

---

(۱) نزہۃ الخواطر ج۲ ص۱۰۸۔ (۲) تکملہ تذکرہ علمائے ہند ص۲۶۲ ونزہۃ الخواطر ج۲ ص۱۶۔

بیان کیا جاتا ہے، قاضی محی الدین کاشانی، بن قاضی جلال الدین، بن قاضی قطب الدین، از اولاد زید بن اسود بن سید ابراہیم، بن سید محمد، بن سید قاسم، بن ابراہیم طباطبا، بن اسمٰعیل، بن ابراہیم، بن عمر بن حسن حسنی بن حضرت حسن بن علی بن ابی طالب۔ (۱)

قاضی کاشانی حضرت نظام الدین اولیاء کے خلفاء میں زہد و تقویٰ اور علمی تبحر میں بلند درجہ رکھتے تھے۔ ابتداء میں حکومت سے متعلق رہے لیکن جس وقت شیخ نظام الدین اولیاء کی خدمت میں حاضر ہوئے تو سرکاری وثیقہ کو پارہ پارہ کر کے فضا میں بکھیر دیا۔ اور ریاست و امارت کے بجائے فقر و مسکنت کی زندگی اختیار کر لی۔ بالآخر سلطان المشائخ نے قاضی صاحب کے عمدہ احوال کو دیکھ کر اپنے دست خاص سے خلافت نامہ لکھ کر عنایت فرمایا۔ خلافت نامہ کے الفاظ یہ ہیں۔

> می باید کہ تارک دنیا باشی۔ بسوئے دنیا و ارباب دنیا مائل نہ شوی و دیہ قبول نہ کنی وصلۂ بادشاہان مگیری و اگر مسافران بتو رسند و بر تو چیزے نباشد ایں حال را غنیمتی و نعمتی شمری از نعمتہائے الٰہی فان فعلت وما امرتك وظني بك ان تفعل كذالك فانت خليفتي وان لن تفعل فالله خليفتي على المسلمين. (۲)
>
> تارک دنیا رہنا، دنیا اور دنیا والوں کی طرف مت جھکنا، بادشاہوں کی جاگیر اور انعام قبول نہ کرنا اگر مسافر تمہارے مہمان ہوں اور تمہارے پاس کچھ بھی نہ ہو تو اس حالت کو غنیمت سمجھنا اور اسے اللہ کی نعمت باور کرنا۔ اگر تم میرے حکم کے مطابق عمل پیرا رہے اور میرا خیال ہے کہ ایسا ہی کرو گے تو تم میرے خلیفہ ہو اگر بالفرض تم نے ان باتوں پر عمل نہیں کیا تو پھر مسلمانوں پر میرا قائم مقام اللہ تعالیٰ ہے۔

قاضی صاحب حسب ہدایت شیخ پوری استقامت کے ساتھ دنیا و اہل دنیا سے کنارہ

---

(۱) دہلی کے ۲۲ خواجہ ص ۱۸۰۔

(۲) سیر الاولیا ص ۲۹۵۔

کش ہوکر یادالٰہی اور عبادت و ریاضت میں مشغول رہے۔ کچھ دنوں کے بعد تنگ دستی اور فقر و فاقہ اس انتہا کو پہنچ گئی کہ ان کے گھر والے بلبلا اٹھے۔ اس کیفیت کو دیکھ کر قاضی صاحب کے ایک شناسا نے اس کا تذکرہ سلطان علاء الدین خلجی سے کر دیا۔ سلطان نے اجودھیا کا منصب قضا (جوان کا موروثی منصب تھا اور اپنے علم و فضل کی بناء پر یہ اس کے اہل بھی تھے) کا پروانہ ان کے نام بھیج دیا۔ قاضی صاحب حضرت سلطان المشائخ کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض رسا ہوئے کہ یہ عہدۂ قضا بغیر کسی طلب کے مرے سپرد کیا جارہا ہے۔ اس بارے میں حضرت کا منشا کیا ہے؟ یہ سن کر سلطان المشائخ نے ناخوش ہوکر فرمایا پہلے تمہارے دل میں اس کا داعیہ پیدا ہوا ہوگا جب ہی تو ایسا ہوا ہے۔ اور خلافت نامہ ان سے واپس لے لیا۔ تقریباً ایک سال تک شیخ ان سے کبیدہ خاطر رہے بالآخر امیر خرد کی سفارش پر راضی ہوئے اور تجدید بیعت کر کے خلافت نامہ واپس فرمادیا۔ سلطان المشائخ کی حیات ہی میں قاضی صاحب ۷۱۹ھ میں وفات پاگئے۔ (۱)

(۵) شیخ تقی الدین علم بخش

شیخ تقی الدین علم بخش اودھی اپنے عہد کے علمائے کبار و مشائخ عظام میں سے تھے آپ شیخ داؤد ماہی متوفی ۶۸۰ھ خلیفہ شیخ فریدالدین مسعود گنج شکر کے برادرزادہ اور شیخ نصیرالدین چراغ دہلی کے ماموں تھے۔ (۲)

گم گشتہ حالات اجودھیاء میں مولوی عبدالکریم اودھی متوفی ۱۳۰۷ھ نے شیخ تقی الدین کو بھی شیخ فریدالدین مسعودؒ کا خلیفہ بتایا ہے مگر یہ بات تشنۂ تحقیق ہے اس لئے لائق اعتماد نہیں۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی آپ کے تذکرہ میں لکھتے ہیں۔

---

(۱) قاضی کے حالات کیلئے سیرالاولیاء از میر خسرو، اخبار الاخیار از شیخ عبدالحق دہلوی، خزینۃ الاصفیاء غلام سرور لاہوری، تذکرہ علمائے ہند مولوی رحمان علی، نزہۃ الخواطر ج ۲، اور تاریخ مشائخ چشت پروفیسر خلیق نظامی دیکھی جائیں۔

(۲) منبع الانساب از مولوی معین بن شہاب جھوسوی۔

بغایت متقی بود کار او آں بود کہ کتاب اورادے داشت آنرا می گرفت و در آخر شب از خانہ بیروں می آمد تمام روز در جائے مشغول می بود چوں پارۂ از شب می گذشت بخانہ می آمد۔

بڑے متقی تھے ان کا معمول تھا کہ اپنی وظائف کی کتاب لے کر رات کو پچھلے پہر آبادی سے باہر نکل جاتے اور پورے دن وہیں یاد الٰہی میں مشغول رہتے اور کچھ رات گئے وہاں سے گھر واپس آتے۔(۱)

آپ کے چچا شیخ داؤد پالہی کے بارے میں تذکرہ نگار لکھتے ہیں کہ نماز فجر کے بعد جنگل میں چلے جاتے اور وہیں دن بھر عبادت حق میں مستغرق رہتے۔(۲) ممکن ہے شیخ تقی الدین نے اپنے عم محترم سے یہ طریقہ اخذ کیا ہو۔

جس خوش قسمت کو آپ کے آگے زانوئے ادب تہہ کرنے کی توفیق مل جاتی وہ ان کی انفاس قدسیہ کی برکت سے علم کی دولت سے مالا مال ہو جاتا تھا اس لئے لوگ آپ کو علم بخش کہا کرتے تھے۔ مولوی عبدالکریم اودھی اپنے والد مولوی عبدالرؤف کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ والد ماجد کہا کرتے تھے کہ میرے بچپن کے وقت تک طلبہ اور شائقین علم پنجشنبہ کو آپ کے مزار پر حاضر ہو کر ترقیٔ علم و افزائش حفظ کی دعائیں مانگا کرتے تھے۔(۳)

ماہ رجب ۷۲۶ھ میں آپ نے دار دنیا کو الوداع کہا۔(۴)

مزار اجودھیا میں ایٹوا تالاب (جو اس وقت ستیہ ساگر کے نام سے مشہور ہو گیا ہے) کے اوپر ہے۔(۵)

لطائف اشرفی کی اس نشاندہی کی بنیاد پر آپ اس وقت مزار تک پہنچنا چاہیں تو کبھی بھی نہیں پہنچ سکتے کیونکہ یہ بیان اب سے تقریباً چھ ساڑھے چھ سو سال پہلے کا ہے اگرچہ ایٹوا تالاب نام کی تبدیلی کے ساتھ سہی اب بھی موجود ہے مگر اس کے حدود اربعہ یکسر بدل چکے

---

(۱) اخبار الاخیار ۱۷۱۔

(۲) خزینۃ الاصفیاء ص ۳۱۳۔

(۳) گم گشتہ حالات اجودھیا ص ۱۵۔

(۴) ایضاً۔

(۵) لطائف اشرفی ملفوظات و مکتوبات مخدوم اشرف سمنانی کچھ چھوی۔

ہیں اور ایک ایٹوا تالاب کی کیا تخصیص ہے اب تو پورے اجودھیا کے آسمان و زمین کچھ سے کچھ ہو گئے ہیں اس لئے اس نابغۂ عصر اور مرد کامل کے مزار تک پہنچنے کے لئے درج ذیل تفصیلات پیش نظر رکھنی ہوں گی۔

محلّہ نوگزی (اس محلّہ میں وہ قدیم قبرستان ہے جو نبی نوح سے موسوم ہے اور اس قبرستان میں وہ مشہور و معروف قبر ہے جو نوگزی کہی جاتی ہے مگر پیمائش میں چودہ گز سے زیادہ لمبی ہے اسی قبر کے نام پر یہ محلّہ نوگزی کہلاتا ہے) سے جانب مشرق تقریباً ۳۰، ۳۲ میٹر کے فاصلے پر ''کیوڑا مسجد'' ہے، مسجد کی پشت سے ایک راستہ اتر کو جاتا ہے اس راستہ کو تھوڑی دور طے کرنے کے بعد ایک سڑک ملے گی۔ اس سڑک سے پورب جانب ۲۰، ۲۲ میٹر چلنے پر ''چھوٹی کٹیا'' — نامی ایک مندر ملے گا۔ یہ مندر ایک وسیع احاطہ کے اندر ہے۔ احاطہ میں داخلہ ایک بلند پھاٹک سے ہوتا ہے۔ پھاٹک میں داخل ہوتے ہی پھاٹک سے متصل داہنے ہاتھ ایک چبوترے پر آپ کو ایک قبر نظر آئے گی۔ یہی حضرت شیخ تقی الدین علم بخش اودھی کی آرام گاہ ہے۔ مندر کا یہ احاطہ آج سے ایک صدی قبل مسلمانوں کا قبرستان تھا جس میں بے شمار قبریں تھیں مگر اب شیخ تقی الدین کے علاوہ کسی قبر کا نام و نشان باقی نہیں ہے۔ ''مٹے ناميوں کے نشاں کیسے کیسے''۔

قبر اگرچہ کافی بوسیدہ ہو گئی ہے مگر مندر کے پجاری اس پر سفیدی کراتے رہتے ہیں اور قبر کے ارد گرد حصے کو ستھرا رکھتے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مندر کے بیراگیوں کے دل میں اس کی عزت و حرمت باقی ہے۔ اگر کوئی بھولے بھٹکے برائے فاتحہ درگاہ علم بخش کی تلاش میں ادھر آ جاتا ہے تو پجاری اس کی رہنمائی کرتے ہیں اور اسے مزار تک پہنچا دیتے ہیں۔ (۱)

(۶) شیخ شمس الدین اودھی

شیخ شمس الدین محمد بن یحیٰی اودھی آٹھویں صدی ہجری کے علماء میں علمی تبحر، زہد

---

(۱) گم گشتہ حالات اجودھیا ص ۱۵۔

وتقویٰ اور درس وافادہ میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ سید محمد علوی (میر خرد) لکھتے ہیں۔

> کار علم وتبحر خدمت مولانا رحمۃ اللہ علیہ بجائے کشید کہ اوستادانِ شہر بخدمت ایں بزرگ بزانوے ادب بنشستند وتلمذ کردند... بیشتر علمائے شہر منسوب بہ شاگردئ ایں بزرگ اندو سند علم ہائے ظاہری وتحقیق دینی نسبت بداں بزرگ کنند وفخر ومباہات بمجلس رفیع آں بزرگ دانند، کسے کہ بہ شاگردئ ایں بزرگ منسوب است میاں علماء بغایت معظم ومبجل ومکرم است۔ (۱)

مولانا کا علمی تفوق اس درجہ کو پہنچا ہوا ہے کہ دہلی کے اساتذہ ان کے سامنے زانوئے ادب بچھاتے ہیں دہلی کے اکثر علماء ان کے شاگرد ہیں اور علوم وفنون وتحقیقات دینیہ میں مولانا ہی سے استناد کرتے ہیں۔ اور آپ کی علمی مجلس کو اپنے لئے باعثِ افتخار سمجھتے ہیں۔ جسے بھی آپ کی شاگردی کا شرف حاصل ہو جاتا ہے وہ علماء میں نہایت عزت واحترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔

آپ کے خواجہ تاش اور تلمیذ رشید شیخ نصیر الدین چراغ دہلی متوفی (۷۵۷ھ) نے آپ کی علمی سرگرمیوں کی مدح سرائی ان الفاظ میں کی ہے۔

سألت العلم من احياك حقا   فقال العلم شمس الدين يحيىٰ (۲)

میں نے علم سے پوچھا کہ واقعتاً (اس زمانہ میں) تجھے کسی نے زندگی عطا کی تو علم نے جواب دیا شمس الدین یحیٰ نے۔

مولانا آزاد بلگرامی اپنے محتاط انداز میں یوں رقمطراز ہیں۔

ثم اقام مولانا شمس الدين فى ظل شيخه بدهلى فانارسوادها الاعظم بالتدريس و منّ على العالم الدراسة بالتاسيس وانتهت اليه رياسة التدريس بدار الخلافه. (۳)

---

(۱) سیر الاولیاء ص ۲۲۶۔ (۲) سبحۃ المرجان آزاد بلگرامی ص ۲۹۔

(۳) سبحۃ المرجان آزاد بلگرامی ص ۲۹۔

> بعد ازاں اپنے شیخ (نظام الدین اولیاء) کے زیر سایہ دہلی میں مقیم ہوگئے اور درس وتدریس کے ذریعہ دہلی میں ایک بہت بڑی جماعت کو علم کی روشنی سے منور کردیا اور تدریسی مسئلہ میں استحکام پیدا کرکے اس پر احسان فرمایا دارالخلافہ دہلی میں تدریس کی ریاست آپ پر ختم ہوگئی۔

شیخ شمس الدین اودھی نے علوم وفنون کی تحصیل شیخ الاسلام فرید الدین شافعی اودھی اور شیخ ظہیر الدین بھکری وغیرہ اساتذہ سے اودھ اور دہلی میں کی تھی۔ تکمیل درس کے بعد سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاء کی خدمت میں رہ کر سلوک ومعرفت کی منزلیں طے کیں اور خلافت سے مشرف ہوئے۔ سلطان المشائخ نے جو خلافت نامہ عطا فرمایا تھا اس پر کتابت کی تاریخ ۲۰؍ ذی الحجہ ۷۲۴ھ درج ہے۔ (۱) سلطان المشائخ خلافت نامہ میں لکھتے ہیں۔

ثم ان الولد الاعز التقى والعالم المرضى المتوجه الى رب العالمين شمس الملة والدين محمد بن يحيىٰ افاض اللّٰه الواحد انواره على اهل التقوىٰ واليقين. لما صح مقصده الينا ولبس خرقة الارادة واستوفىٰ حظه من صحبتنا اجزت له اذا استقام على اتباع سيد الكائنات واستغرق الاوقات بالطاعات ودافت القلب عن هواجس النفس والخطرات واعرض عن الدنيا واسبابها ولم يركن الى ابنائها واربابها وانقطع الى اللّٰه بالكلية واشرقت فى قلبه الانوار القدسية واسرار الملكوتية وانفتح باب الفهم لتعريفات الالٰهية ان يلبس الخرقة المريدين ويرشدهم الى مقامات الموقنين الخ(۲)

> صاحب تقویٰ، پسندیدہ عالم، پروردگار عالم کی جانب متوجہ رہنے والا عزیز فرزند شمس الدین محمد بن یحییٰ نے (اللہ تعالیٰ اس کے انوار سے اہل یقین اور اصحابِ تقویٰ کو مستنیر کرے) جب اپنی نیت ہماری جانب درست کرلی

---

(۱) سیر الاولیاء ص ۲۳۱۔

(۲) سیر الاولیاء ص ۲۳۰۔

اور ارادت کا خرقہ پہن لیا اور ہماری صحبت سے پوری طرح مستفید ہو گیا (اور میں نے یہ محسوس کیا کہ) وہ سید کائنات کی پیروی میں ثابت قدم ہے اور اپنے اوقات یاد الٰہی میں مصروف رکھتا ہے۔ اور نفسانی توہمات سے اپنے قلب کو محفوظ رکھتا ہے۔ دنیا اور اسباب دنیا سے رخ موڑ لیا ہے اور ارباب دنیا کی جانب مائل نہیں ہوتا اور پورے طور پر اللہ تعالیٰ کی جانب متوجہ ہے اور اس کے قلب میں عالم قدس کے انوار درخشاں اور عالم ملکوت کے اسرار چمک رہے ہیں اور معرفت الٰہیہ کا باب اس پر کھل گیا ہے تو میں نے اسے اجازت وخلافت دے دی کہ وہ مریدین کو بیعت وارادت کا خرقہ پہنائے اور انہیں اہل یقین کی راہ دکھائے۔

سلطان المشائخ نے آپ کے لئے جن وقیع احوال کا ذکر کیا ہے ان سے طریقت ومعرفت میں آپ کی علوشان کا اندازہ ہوتا ہے۔

آپ کے مزاج میں بڑی سادگی تھی۔ تکلّفات اور رسم ورواج کے بالکل پابند نہیں تھے۔ حتیٰ کہ نکاح بھی نہیں کیا تھا اور پوری زندگی تجرد میں بسر کر دی۔ امراء واغنیاء کے دربار میں حاضری گوارا نہ تھی اور نہ اپنے پاس ان کی آمد ورفت پسند تھی۔ تصوف کے بلند ترین مقام پر فائز ہونے کے باوجود سجادۂ مشیخیت پر بیٹھنے سے گریز کرتے تھے اس لئے جلد کسی کو بیعت نہیں کرتے تھے، فرماتے تھے کہ اگر خلافت نامہ پر حضرت سلطان المشائخ کے دستخط نہ ہوتے تو میں اسے ہرگز اپنے پاس محفوظ نہ رکھتا۔ فتوح نامی ایک خادم تھا وہی آپ کے خانگی معاملات کا منتظم تھا۔ آپ کے کھانے پینے کے انتظام کے علاوہ واردین و صادرین کی تواضع وخاطر داری اسی کے سپرد تھی۔ خود ہر کام سے فارغ البال رہ کر درس و افادہ، تصنیف وتالیف اور ذکر ومراقبہ میں مشغول رہتے تھے۔ (۱)

سلطان محمد بن تغلق جس زمانہ میں علماء ومشائخ کو دہلی سے دعوت وتبلیغ کے نام پر ملک کے دور افتادہ خطوں میں بھیج رہا تھا اس موقع پر اس نے شیخ اودھی کو بھی طلب کیا اور کہا

---

(۱) سیر الاولیاء ص ۲۲۵۔

کہ آپ جیسے عالم وفاضل کا یہاں کیا کام آپ کو تو شہر جا کر اشاعت دین کی سعی کرنی چاہئے۔ اور چند لوگوں کو متعین کر دیا کہ وہ شیخ کو جلد از جلد کشمیر روانہ کر دیں۔ حکم سلطانی کے بموجب سامان سفر درست کرنے کے لئے شیخ گھر واپس آئے۔ اس وقت وہاں جو ارادت مند حاضر تھے انہیں مخاطب کرتے ہوئے فرمایا ”اینہا چہ می گویند من بندگی شیخ را خواب دیدہ ام کی مرا طلبند من بخدمت خواجہ بروم ایشاں مرا کجا می فرستادند“ یہ لوگ کیا بکواس کرتے ہیں میں نے خواب دیکھا ہے کہ حضرت سلطان المشائخ مجھے بلا رہے ہیں میں تو اپنے شیخ کے پاس جا رہا ہوں یہ لوگ مجھے کہاں بھیجنا چاہتے ہیں۔

چنانچہ دوسرے دن شیخ کے سینہ میں ایک پھوڑا نکل آیا اور اسی عارضہ میں جان جان آفریں کے حوالہ کر دی اور اپنے شیخ سلطان المشائخ کے حظیرہ میں اندرونی گنبد کے سامنے مدفون ہوئے۔ (۱) مولوی رحمٰن علی نے سن وفات ۷۴۷ھ لکھی ہے۔

شیخ اودھی کثیر التصانیف عالم تھے چنانچہ ان کے قریب ہم عصر میر خرد لکھتے ہیں ”چندیں تصانیف در علوم دینی از خدمت آں بزرگ در عالم یادگار ماندہ است“ (۲) مولانا بلگرامی لکھتے ہیں ”مولانا تصانیف دارد اما دریں عصر کم یافت می شود“۔ (۳) مولانا صاحب تصانیف ہیں مگر اس وقت ان کی کتابیں کم یافت ہیں۔

گردش لیل ونہار نے اس فاضل اجل کی علمی یادگاروں کو اس طرح گم کر دیا ہے کہ آج ”شمس العوارف“ اور ”شرح مشارق الانوار“ کے علاوہ دیگر کتابوں کے نام کا پتہ لگانا بھی مشکل ہے۔ آپ کا تذکرہ سیر الاولیاء، اخبار الاخیار، سبحۃ المرجان، مآثر الکرام، خزینۃ الاصفیاء، حدائقہ حنفیہ، تذکرہ علمائے ہند، نزہۃ الخواطر ج ۲ وغیرہ میں موجود ہے۔

(۷) شیخ جلال الدین اودھی

شیخ جلال الدین اودھی نحو، فقہ اور اصول فقہ کے زبردست عالم اور زہد وتقویٰ سے

---

(۱) ایضاً ص ۲۲۸۔ (۲) سیر الاولیاء ص ۲۲۶۔

(۳) مآثر الکرام ص ۱۸۳۔

متصف بزرگ تھے۔ سلطان المشائخ نظام الدین اولیاء سے بیعت وارادت کا تعلق رکھتے تھے۔ حسب تصریح میر خرد علمائے اودھ میں سب سے پہلے آپ ہی حضرت سلطان المشائخ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے تھے۔ اسی بناء پر تمام علمائے اودھ آپ کو احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ میر خرد یہ دلچسپ واقعہ بھی لکھتے ہیں کہ ''یارانِ اودھ'' جو سب کے سب عالم وفاضل تھے اور ان میں سے اکثر ایک عرصہ تک علمی اشتغال میں اپنی عمر بسر کر چکے تھے۔ مگر سلطان المشائخ سے بیعت ہوجانے کے بعد آگے علمی مشاغل جاری نہ رہ سکے۔ اس لئے سب نے متفق ہوکر شیخ جلال الدین کو تیار کیا کہ سلطان المشائخ سے ہم سب کی طرف سے یہ درخواست کریں کہ ہمیں تھوڑی دیر کے لئے علمی گفتگو اور بحث وتکرار کی اجازت ہوجائے۔ چنانچہ شیخ جلال الدین کی قیادت میں یہ سب لوگ سلطان المشائخ کی خدمت میں پہنچے۔ شیخ جلال نے حسب قرار داد مدعا پیش خدمت کیا، شیخ نے سن کر فرمایا ''من چہ کنم مرا از ایشاں مطلوبے دیگر است وایشاں ہمچوں پیاز پوست در پوست اند'' میں کیا کروں میرا مقصد تو انہیں مغز بنانا ہے مگر یہ لوگ پیاز کی طرح چھلکے ہی چھلکے ہیں۔ سلطان المشائخ کے اس جواب کا اثر یہ ہوا کہ شیخ جلال الدین نے دنیا کے تمام بکھیڑوں سے یکسو ہوکر ترک وتجرید کی زندگی اختیار کرلی اور بقیہ زندگی عزلت میں گزاردی۔ میر خرد آخر میں لکھتے ہیں کہ چند روز بیمار رہ کر یہ فرشتہ صفت بزرگ اللہ کو پیارا ہوگیا۔ میر صاحب نے تاریخ وفات کی تصریح نہیں کی ہے چونکہ خود میر خرد کی وفات ۷۷۰ھ میں ہوئی ہے اس لئے لازمی طور پر شیخ جلال الدین کی رحلت اس سے پہلے ہوئی ہے۔(۱)

(۸) مولانا قوام الدین اودھی

مولانا قوام الدین معروف بہ یکدانہ شیخ شمس الدین بن یحییٰ کے تلمیذ اور سلطان المشائخ کے مرید تھے سلطان المشائخ انہیں ''مرد صالح'' کہا کرتے تھے۔ خادم ونوکر کے قطعاً محتاج نہیں تھے۔ اپنا سارا کام خود اپنے ہاتھوں کرلیا کرتے تھے۔ اکثر اوقات ذکر

---

(۱) سیر الاولیاء ص ۳۰۵-۳۰۶ ونزہۃ الخواطر ج ۳ ص ۲۳۔

ومراقبہ میں مشغول رہتے، مجاہدہ وریاضت کا عالم یہ تھا کہ کھانے میں آس (پیچھ) پر اکتفا کرتے تھے۔ تفصیلی حالات دستیاب نہیں سیر الاولیاء میں بس یہی چند سطریں ہیں۔

(۹) مولانا جمال الدین اودھی

شیخ جمال الدین اودھی سلطان المشائخ کے مرید اور متبحر عالم تھے۔ میر خسرو اپنے والد اور چچا کے حوالے سے نقل کرتے ہیں کہ مولانا جمال الدین اودھی جس زمانہ میں مرید ہوکر خانقاہ میں مقیم ہوئے اسی زمانہ میں ایک خراسانی عالم (جو کثرت مباحثہ کی وجہ سے مولانا بحاث کے نام سے مشہور تھے) خانقاہ میں آئے اور وہاں موجود علماء مولانا وجیہ الدین پائلی وغیرہ کی موجودگی میں ''بزدوی'' کے کسی مسئلہ پر بحث شروع کردی۔ بعض علماء کو ساکت بھی کردیا جس کی بناء پر دوسرے علماء کو ان سے گفتگو کی ہمت نہ ہوئی۔ محفل کا یہ رنگ دیکھ کر مولانا جمال الدین سامنے آئے اور مولانا بحاث سے بحث شروع کردی اور بالآخر انہیں لاجواب کردیا۔ مولانا جمال الدین کی اس کامیابی پر خانقاہ کے علماء بہت خوش ہوئے انہیں مبارکباد اور دعائیں دیں کہ آج آپ نے مولانا بحاث کے سر سے ہمہ دانی کا غرور دور کردیا۔ اس مجلس میں سلطان المشائخ کے خادم خاص خواجہ اقبال بھی تھے انھوں نے اس واقعہ سے متاثر ہوکر حضرت سلطان المشائخ کے سے عرض کیا کہ جمال الدین عالم وفاضل ہیں، شیخ نے فرمایا تمہیں کیسے معلوم ہوا۔ انھوں نے سارا واقعہ سنادیا۔ سلطان المشائخ نے فرمایا کہ نوجوان کو بلاؤ، چنانچہ شیخ جمال الدین احباب کے ساتھ حاضر خدمت ہوئے۔ شیخ نے انہیں دیکھ کر فرمایا ''رحمت بر آمدن تو کہ علم خود را نہ فروختی'' تمہارے آنے پر خدا کی رحمت ہو کہ تم نے اپنے علم کو دنیا کے بدلے فروخت نہیں کیا۔

سلطان المشائخ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوجانے کے بعد علمی مشغلہ قائم نہیں رہا اور اب سارا وقت یاد الٰہی میں گزرنے لگا تھا، سماع سے بھی خاص شغف رکھتے تھے۔ (۱)

تاریخ وفات معلوم نہ ہوسکی صاحب گم گشتہ نے لکھا ہے کہ آپ کا مزار اجودھیا کے

---

(۱) سیر الاولیاء ص ۳۱۹۔

محلّہ قضیانہ میں قاضی لطف اللہ کی مسجد کے سامنے ہے۔ گری ہوئی عمارتوں اور بنیادوں کے آثار سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس جگہ وسیع خانقاہ رہی ہوگی۔ (۱) اب یہ آثار بھی مٹ گئے اور ان کی جگہ دوسرے مکانات تعمیر ہو گئے ہیں۔ ’’بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے‘‘

(۱۰) علامہ کمال الدین اودھی

علامہ کمال الدین حامد بن عبدالرحمٰن بن محمد حنفی اودھی شیخ نصیر الدین چراغ دہلی کے بھانجے اور اہم خلفاء میں تھے آپ کی ولادت ونشو ونما اجودھیا میں ہوئی یہیں کے علماء سے اکتساب علم کیا بعد ازاں دہلی جا کر اپنے ماموں چراغ دہلی سے بیعت ہوئے اور سلوک کے مراحل طے کر کے درجۂ تکمیل وارشاد پر فائز ہوئے۔

علامہ کمال الدین تمام علوم وفنون میں مہارت کا درجہ رکھتے تھے۔ بالخصوص فقہ، اصول فقہ، حدیث اور تفسیر میں تو یگانۂ عصر تھے اور علمی حلقوں میں علامہ کے لقب سے مشہور تھے۔ شجرۃ الانوار میں ہے۔

> تا ابتدائے جوانی از فنون علمی بہرہ یاب گشتہ وعلم را مرور ایام تمام وکمال ساختہ ہیچ علمے از وباقی نماندہ بود کہ دردے کمالے بہم نرسانیدہ۔ ودر علم تفسیر و فقہ وحدیث حظے وافر داشت۔ درمیان علماء مفسران وفقہاء ومحدثان وغیرہ کہ دراں زماں علم علمی افروشتہ بودند بعلامہ شہرت یافتہ۔ (۲)

نوعمری ہی میں علمی فنون سے بہرہ یاب ہو گئے تھے اور وقت گزرنے کے ساتھ علمی ترقی کرتے رہے اور کوئی فن ایسا باقی نہیں بچا تھا جس میں انھوں نے کمال حاصل نہ کیا ہو بالخصوص تفسیر، فقہ اور حدیث میں کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ اس عہد کے سربرآوردہ مفسرین، فقہا اور محدثین میں علامہ کے لقب سے مشہور تھے۔

---

(۱) گم گشتہ حالات اجودھیا ص ۴۷۔

(۲) شجرۃ الانوار بحوالہ تاریخ مشائخ چشت ص ۲۰۹۔

اپنے شیخ حضرت چراغ دہلی کی تجویز کے مطابق علامہ کمال نے اپنی علمی سرگرمیوں اور دعوت وارشاد کا مرکز گجرات کو بنایا اور طویل عرصہ تک وہاں مقیم رہ کر علم ودین کی روشنی پھیلاتے رہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس دیار میں انہیں بڑی مقبولیت عطا کی ہر خاص و عام انہیں عظمت وتوقیر کی نگاہ سے دیکھتا۔ ۷۲۵ھ کے حدود میں بعہد فیروز شاہ پھر دہلی واپس آگئے تھے۔ تکملہ سیر الاولیاء میں ہے کہ جس وقت علامہ کمال الدین گجرات سے دہلی آئے تو ان کے ساتھ تیس اونٹ مال واسباب سے لدے ہوئے تھے۔ چراغ دہلیؒ نے اس مال واسباب کو دیکھ کر فرمایا۔ اس قدر دنیا اپنے ساتھ کیوں لائے ہو۔ علامہ نے عرض کیا کہ راستے میں اطلاع مل گئی تھی کہ سلطان المشائخ کی رحلت ہوگئی ہے اور ان کی جگہ آپ سجادۂ مشیخت پر رونق افروز ہیں اس لئے خیال ہوا کہ اگر خالی ہاتھ جاؤں گا تو لوگ بدگمانیوں میں مبتلا ہوں گے (ورنہ مجھے اس مال واسباب کی کوئی ضرورت نہیں) اب میں اس سارے مال کو علماء وصوفیاء پر تقسیم کردوں گا۔ چنانچہ سارا اثاثہ اللہ کے نام پر بانٹ دیا۔ (۱) دہلی ہی میں ۷۵۶ھ میں داعی اجل کو لبیک کہا۔

علامہ کمال اگرچہ خود تو دہلی آگئے تھے مگر اپنی اولاد کو گجرات ہی میں مقیم رہنے کی ہدایت کر آئے تھے تاکہ رشد وہدایت کا جو سلسلہ انھوں نے قائم کیا تھا وہ چلتا رہے۔ چنانچہ ان کی اولاد میں برابر ایسے فرد کامل پیدا ہوتے رہے جنھوں نے علامہ کی مسند دعوت و ارشاد کو سونی نہ ہونے دیا۔ علامہ کے بعد ان کے فرزند ارجمند شیخ سراج الدین نے سجادۂ مشیخت کو زینت بخشی یہ بڑے صاحب کمال بزرگ تھے۔ فیروز شاہ بہمنی ان سے خاص عقیدت رکھتا تھا اسی بناء پر اس نے انہیں دکن آنے کی دعوت دی مگر شیخ سراج نے اس پیشکش کو یہ کہہ کر رد کردیا کہ ”حق تعالیٰ مرا در گجرات ہرچہ ضرورت است عطا می فرماید“ اللہ تعالیٰ کی عطا سے یہاں ساری ضرورتیں پوری ہوجاتی ہیں (پھر دکن آنے کی کیا ضرورت ہے)“ ۸۱۷ھ میں آپ کا وصال ہوا۔

اس کے بعد شیخ سراج کے صاحبزادے شیخ علم الحق مسندِ ارشاد پر بیٹھے۔ ان کی

---

(۱) تکملہ سیر الاولیاء ص ۱۵۔

نیک نفسی اور للّٰہیت کا اندازہ صاحب شجرۃ الانوار کے اس بیان سے لگایا جا سکتا ہے کہ آپ کی اثر آفرینی کا یہ عالم تھا کہ جو بھی کافر، فاسق اور منکر خدمت میں حاضر ہوتا اور کچھ دیر بیٹھ کر آپ کی باتوں کو سنتا وہ اسی مجلس میں تائب ہو کر آپ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو جاتا تھا۔ (۱)

شیخ علم الحق کے بعد ان کے بیٹے شیخ راجن شجادہ نشین ہوئے۔ پھر علی الترتیب شیخ جمال الدین عرف جمن، شیخ حسن محمد اور شیخ یحییٰ مدنی نے مسند ارشاد کو رونق بخشی۔ تیرہویں صدی ہجری کے آخر میں علامہ کمال کی خانقاہ کے صاحب سجادہ شیخ محمود تھے جو علامہ ہی کی اولاد میں سے تھے۔ (۲)

علامہ کمال الدین اودھیؒ کے حالات کے لئے شجرۃ الانوار، خزینۃ الاصفیاء، تذکرۂ علمائے ہند، حدائقہ حنفیہ، نزہتہ الخواطر ج ۲، مزارات اولیائے دہلی، تاریخ مشائخ چشت وغیرہ دیکھی جائیں۔

(۱۱) شیخ نصیر الدین اودھی (چراغ دہلی)

شیخ نصیر الدین محمود بن یحییٰ بن عبد اللطیف معروف بہ چراغ دہلی کا مولد ومنشا اور آبائی وطن اجودھیا ہی ہے آپ زبردست عالم وفاضل ہونے کے ساتھ اپنے دور کے سرتاج اولیاء تھے۔ آپ کا سلسلہ نسب یوں بیان کیا جاتا ہے۔

شیخ نصیر الدین محمود، بن یحییٰ، بن عبد اللطیف، بن یوسف، بن عبد الرشید، بن سلیمان، بن احمد، بن یوسف، بن محمد، بن شہاب الدین، بن سلطان، بن اسحٰق، بن مسعود، بن عبد اللہ، بن واعظ اصغر، بن واعظ اکبر، بن اسحٰق، بن شیخ ابراہیم، بن ادہم بلخی، بن سلیمان بن ناصر، بن حضرت عبد اللہ بن عمر فاروق رضی اللہ عنہم۔ (۳)

---

(۱) شجرۃ الانوار ص ۲۶ بحوالہ تاریخ مشائخ چشت ص ۲۱۰۔

(۲) تاریخ مشائخ چشت ص ۲۱۰۔

(۳) دہلی کے ۲۲ خواجہ ص ۴۷۔

مگر شیخ ابراہیم ادھم بلخیؒ کے بارے میں ابن اثیر، امام بخاری، ابن حجر عسقلانی، سید مرتضیٰ بگرامی وغیرہ نے صراحت کی ہے کہ یہ عمری نہیں تھے بلکہ تمیمی اور بقول بعض عجلی تھے (تفصیل کے لئے الکامل لابن اثیر جلد ۶، تہذیب التہذیب، اتحاف السعادة المتقین شرح احیاء العلوم دیکھی جائیں) اس لئے اس شجرہ نسب پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ واللہ اعلم۔

حضرت شیخ نصیر الدین کے دادا شیخ عبداللطیف نے اپنے آبائی وطن یزد سے ہجرت کر کے لاہور میں سکونت اختیار کر لی تھی پھر آپ کے والد شیخ یحییٰ نے لاہور کی وطنیت ترک کر کے اجودھیا کو اپنا مسکن بنا لیا۔ اجودھیا ہی میں شیخ نصیر الدین کی ولادت ہوئی ابھی عمر کی صرف نو بہاریں دیکھ پائے تھے کہ والد ماجد کے سایۂ عاطفت سے محروم ہو گئے۔ اس لئے والدہ ماجدہ کی زیر نگرانی تعلیم و تحصیل کا سلسلہ شروع کیا۔ ابتداء سے لے کر ہدایہ تک کی کتابیں مولانا عبدالکریم شیروانی سے پڑھیں۔ اس کے بعد مولانا افتخار الدین محمد گیلانی کے حلقۂ درس میں شامل ہو گئے۔ ان ہر دو اساتذہ کے علاوہ شیخ فخر الدین ہانسوی، قاضی محی الدین کاشانی اور شیخ شمس الدین یحییٰ اودھی سے بھی آپ کو شرف تلمذ حاصل ہے، ۲۵ برس کی عمر میں علوم متداولہ کی تحصیل سے فارغ ہو گئے۔

تعلیمی مشغلہ سے فراغت کے بعد عبادت و ریاضت کا داعیہ پیدا ہوا۔ اس لئے مکان ہی میں عزلت نشین ہو کر ذکر و اوراد میں مشغول رہنے لگے۔ پھر چالیس سال کی عمر میں اجودھیا سے رخت سفر باندھا اور دہلی جا کر حضرت سلطان المشائخ کے حلقہ بگوش ہو گئے بالآخر حضرت سلطان المشائخ نے اپنی خلافت سے سرفراز فرما کر چراغ دہلی کے لقب سے امتیاز بخشا۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی لکھتے ہیں کہ ایک دن شیخ نصیر الدین نے امیر خردؒ کے ذریعہ حضرت سلطان المشائخ کی خدمت میں درخواست پیش کی کہ بندہ اودھ (اجودھیا) میں رہتا ہے لیکن وہاں لوگوں کے ازدحام اور کثرت آمد و رفت کی وجہ سے ذکر و مراقبہ میں خلل پڑتا ہے اگر اجازت ہو تو کسی جنگل میں تنہا رہ کر یاد حق میں مشغول رہوں، سلطان المشائخ نے امیر خرد سے فرمایا کہ نصیر الدین سے کہہ دو ”ترا درمیان خلق می باید بود و جفائے

خلق می باید کشید و مکافات بہ بذل و عطا می باید کرد۔‘‘ (۱)

تمہیں خلق خدا کے درمیان رہنا اور ان کے جور و ستم سہنا چاہئے اور ان کی زیادتیوں کا بدلہ داد و دہش سے دینا چاہئے۔

پیرومرشد کے اس فرمان پر شیخ نصیر الدین آخر دم تک عمل پیرا رہے اور ہر ظلم و ستم و جور و جفا کا استقبال خندہ پیشانی کے ساتھ کیا۔ سلطان محمد بن تغلق نے انہیں طرح طرح سے پریشان کیا اور اذیتیں دیں جس کی کچھ تفصیل سیر الاولیاء میں دیکھی جاسکتی ہے لیکن دہلی کا یہ روشن چراغ ظلم و جبر کے تیز و تند طوفانوں کی زد میں بیٹھ کر اپنی ضیا پاشیوں سے ظلمت کدۂ ہند کو منور کرتا رہا اور پیرومرشد نے آپ سے جو امیدیں وابستہ کی تھیں اپنا خونِ جگر دے کر انہیں پورا کر دکھایا۔

حقیقت یہ ہے کہ آپ فقر و صبر اور تسلیم و رضا کے پیکر اور مہر و محبت کے مجسمہ تھے سخت سے سخت ناگوار اور اذیت ناک برتاؤ کو نہ صرف مسکراتے ہوئے برداشت کر لیتے تھے بلکہ اس کے عوض ایثار و مروت اور حسن سلوک کا معاملہ فرماتے تھے۔ آپ کی بلندیٔ اخلاق کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے جو آپ کے مجموعہ ملفوظات خیر المجالس کے تکملہ میں ذکر کیا گیا ہے۔ تفصیل یوں بیان کی گئی ہے کہ، ایک دن بعد نماز ظہر حجرہ میں تنہا بیٹھے تھے موقع پا کر ’’تراب‘‘ نامی ایک قلندر اندر گھس گیا اور نہایت بیدردی کے ساتھ چاقو سے آپ پر وار کرنا شروع کر دیا۔ آپ کے جسم میں بارہ زخم لگائے مگر آپ نے بالکل مزاحمت نہیں کی۔ جسم سے خون نکل کر نالی کے راستہ باہر بہنے لگا جسے دیکھ کر مریدین گھبرائے اور اندر جا کر دیکھا تو ان کی نگاہوں کے سامنے یہ منظر تھا کہ یہ بیباک قلندر شیخ کو چاقو سے مار رہا ہے اور شیخ ساکت اور خاموش بیٹھے ہیں۔ مریدین نے اسے پکڑ کر سزا دینی چاہی لیکن شیخ نے انہیں اس کی اجازت نہیں دی قلندر کو اپنے پاس ہی روک لیا۔ اور اپنے مرید خاص مولانا عبد المقتدر تھانیسری، شیخ صدر الدین طبیب اور خادم خاص و بھانجہ شیخ زین الدین علی کو اپنے پاس بلا کر قسم لی کہ قلندر کو کسی قسم کی تکلیف نہیں پہنچائیں گے پھر قلندر کو بیس تنکہ

---

(۱) اخبار الاخیار ص ۸۷۔

(اس عہد کا سکہ) یہ کہہ کر عطا فرمایا کہ شاید چاقو مارنے میں ہاتھ کو تکلیف پہنچی ہو۔ (۱)

تسلیم و رضا اور مہر و وفا کا یہ تاجدار ۱۸/ رمضان المبارک ۷۵۷ھ/ ۱۳۵۹ء کو پیوند خاک ہو گیا (۲)

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لعین　　　تو نے یہ گنج ہائے گرانمایہ کیا کئے

حضرت سلطان المشائخ کے دامن سے وابستگی کے بعد اگرچہ اجودھیا سے بود و باش کا تعلق نہیں رہا تھا پھر بھی اس سرزمین سے کسی نہ کسی حد تک رابطہ قائم رہا اور گاہے بہ گاہے اعزاء و اقربا سے ملاقات کے لئے یہاں آتے رہتے تھے۔ غلام سرور لاہوری لکھتے ہیں۔

> صاحب اخبار الاولیاء می فرمایند کہ شیخ نصیر الدین را در خطہ اودھ خواہرے بود از وے کلاں و عفیفۂ زماں او نیز دو پسر داشت یک مولانا زین الدین علی دوم کمال الدین حامد شیخ نصیر الدین گاہ گاہ از حضرت شیخ اجازت گرفتہ برائے زیارت ہمشیرہ مکرمہ در اودھ تشریف بردے و بعد حصول ملاقات وے باز آمدے۔ (۳)

> اخبار الاولیاء کے مؤلف لکھتے ہیں کہ شیخ نصیر الدین کی عفت مآب بڑی بہن اجودھیا میں رہتی تھیں ان کے دو صاحبزادے مولانا زین الدین علی اور مولانا کمال الدین حامد تھے (مولانا کمال الدین کا تذکرہ گذشتہ صفحات میں آچکا ہے) شیخ نصیر الدین ہمشیرہ کی ملاقات کی غرض سے باجازت حضرت سلطان المشائخ اجودھیا تشریف لاتے اور ملاقات کے بعد پھر دہلی واپس چلے جاتے تھے۔

اجودھیا ریلوے اسٹیشن سے تقریباً ڈیڑھ دو کلومیٹر فاصلے پر جانب مغرب و شمال شیخ نصیر الدین کی ایک ہمشیرہ کا مزار ہے جسے عوام عقیدت و احترام میں ''بڑی بوا'' کا مقبرہ کہتے ہیں۔ (۴)

---

(۱) تکملہ خیر المجالس ص ۳۱۴، ۳۱۵۔ (۲) اخبار الاخیار۔

(۳) خزینۃ الاصفیا ص ۳۵۴۔ (۴) گم گشتہ حالاتِ اجودھیا ص ۴۔

لیکن یہ تحقیق نہیں ہوسکی کہ یہ انہیں خواہر کلاں عفیفۂ زماں کا مزار ہے یا کسی دوسری بہن کا البتہ بڑی بوا کے عرفی نام سے ذہن اسی طرف جاتا ہے کہ یہ انہیں ہمشیرہ کلاں کا مزار ہے جن کی ملاقات کے لئے شیخ دہلی کی طویل مسافت طے کر کے اجودھیا آتے تھے۔ اسی مقبرہ کے قریب اجودھیا اور فیض آباد کے مسلمانوں نے بڑی بوا کے نام سے ایک یتیم خانہ جاری کیا ہے جس میں یتیم بچوں کی تعلیم و تربیت کا مفت انتظام ہے۔

کوشلیا گھاٹ اور محلّہ مدار کے درمیان جو آبادی ہے وہ آج سے پچاس سال پہلے تک محلہ چراغ دہلی سے موسوم تھی مگر آج کل اسے عالم گنج کٹرہ کہتے ہیں، اسی محلّہ میں شیخ نصیرالدین چراغ دہلی کا آبائی مکان تھا جسے بعد میں آپ نے شیخ فتح اللہ اودھی کو دے دیا تھا۔ شیخ فتح اللہ اسی مکان میں رہتے تھے اور اسی کے متصل ان کا مزار بھی ہے (۱) تفصیل آگے آرہی ہے۔ شیخ کے تفصیلی تذکرہ کے لئے سیر الاولیاء، اخبار الاخیار، خزینۃ الاصفیاء وغیرہ کا مطالعہ کیا جائے۔

(۱۲) شیخ علاء الدین نیلی صاحب ''مامقیماں''

شیخ علاء الدین نیلی اودھی اپنے وقت کے زبردست عالم دین اور صاحب نسبت بزرگ تھے، شیخ الاسلام فریدالدین اودھی شافعی کے تلمیذ اور شیخ شمس الدین یحییٰ اودھی کے رفیق درس تھے، تفسیر کشاف کی تعلیم کے وقت قرأت یہی کرتے تھے۔ شیخ شمس الدین اور دیگر رفقاء درس سامع ہوتے تھے۔

کشاف اور مفتاح العلوم سکاکی کے غوامض کی توضیح وتشریح میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ آپ کی تقریر انتہائی دل نشیں اور مؤثر ہوتی تھی بڑے بڑے علماء وفضلاء آپ کی تقریر کے دلدادہ تھے۔ (۲)

تحصیل علوم سے فراغت کے بعد سلطان المشائخ کے حلقۂ ارادت میں شامل

---

(۱) گم گشتہ حالاتِ اجودھیا ص ۱۳۱۔

(۲) سیر الاولیاء ص ۲۷۵۔

ہو گئے تھے۔ اور شیخ کے اہم خلفاء میں شمار ہوتے تھے۔ سلطان المشائخ کی خصوصی مجلسوں میں تصوف کے اسرار ورموز پر بحکم شیخ آپ کی تقریریں ہوا کرتی تھیں۔

مشہور سیاح ابن بطوطہ یہ بھی اطلاع دیتا ہے کہ ہر جمعہ کو آپ کا عمومی وعظ ہوا کرتا تھا جس کی اثر انگیزی کا یہ عالم ہوتا تھا کہ سامعین پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی اور بعض تو بے ہوش تک ہو جاتے تھے۔ ابن بطوطہ اپنا چشم دید واقعہ لکھتا ہے کہ میں ایک مرتبہ ان کی مجلس وعظ میں حاضر تھا۔ قاری نے قرآن مجید کی آیت "یاایھا الناس اتقوا ربکم ان زلزلة الساعة شیء عظیم" کی تلاوت کی۔ بعد میں مولانا نیلی نے اسی آیت کو پڑھا جسے سن کر مسجد کے گوشہ سے ایک شخص کی چیخ بلند ہوئی۔ مولانا نے پھر اسی آیت کی تلاوت کی اس شخص نے دوبارہ چیخ ماری اور اسی کے ساتھ جاں بحق ہو گیا۔ ابن بطوطہ کہتا ہے کہ میں اس مردِ حق آگاہ کی تجہیز و تکفین اور جنازے میں شریک رہا۔ (۱)

مولانا نیلی کے مزاج میں بے پناہ تواضع تھی۔ تصوف کے اعلیٰ مقام پر فائز ہونے اور سلطان المشائخ کے اہم ترین خلفاء میں شمار ہونے کے باوجود نہ صوفیانہ خرقہ زیب تن کیا اور نہ مدت العمر کسی کو مرید بنایا۔ کہتے تھے کہ اگر حضرت شیخ حیات سے ہوتے تو اس خلافت نامہ کو حضرت کی خدمت میں پیش کر کے مؤدبانہ عرض کرتا کہ حضرت نے اگرچہ ازراہ بندہ نوازی اس عاجز کو اپنی خلافت سے سرفراز فرمایا ہے مگر بندہ اپنے اندر اس بار امانت کے اٹھانے کی طاقت نہیں پاتا۔ (۲)

آخر میں سلطان المشائخ کے ملفوظات ''فوائد الفواد مرتبہ حسن سجزی'' کا ایک نسخہ دستِ خاص سے لکھ کر اپنے پاس محفوظ کر لیا تھا اور اکثر اوقات اسی کے مطالعہ میں مشغول رہتے تھے۔ لوگوں نے پوچھا کہ آپ کے پاس ہر علم وفن کی مستند و معتبر کتابیں موجود ہیں پھر کیا وجہ ہے کہ صرف ''فوائد الفواد'' ہی کا مطالعہ کرتے ہیں؟ فرمایا سلوک اور دیگر فنون کی کتابوں سے دنیا بھری ہے لیکن سلطان المشائخ کے ملفوظات روح افزا جن سے مری

---

(۱) نزہۃ الخواطر ج ۲۔

(۲) سیر الاولیاء ص ۲۷۶۔

نجات وابستہ ہے کہاں ملیں گے۔

مرا نسیم تو باید صبا کجا است کہ نیست　　کجا ست زلف تو مشک خطا کجا است کہ نیست (۱)

بالآخر اپنے عہد کا یہ مرد کامل اور عالم بے بدل حیات مستعار کے دن پورے کر کے ۷۶۲ھ میں رہگرائے عالم جاودانی ہوا۔ (۲) اور سلطان المشائخ کے مقبرہ کے احاطہ میں اپنے خواجہ تاش، رفیق درس اور ہم وطن شیخ شمس الدین بن یحییٰ اودھی کے جوار میں ابدی نیند سو رہا ہے (۳)

''گم گشتہ حالات اجودھیا'' اور ''شہر اولیاء'' کا یہ بیان درست نہیں ہے کہ آپ کا مزار اجودھیا کے مشہور قبرستان ''خرد مکہ'' میں ہے۔ بلکہ صحیح یہ ہے کہ اس مقبرہ میں شیخ علاء الدین حسینی، ان کے صاحبزادے شیخ ماہ رو اور ان کی اولاد امجاد کی قبریں ہیں۔ نام کی یکسانیت سے یہ اشتباہ ہوا ہے۔

سرِ دست مولانا نیلی کی صرف ایک تصنیف ''مامقیماں'' کا پتہ چل سکا ہے۔ مامقیماں فارسی زبان کی مشہور ترجیع بند مثنوی ہے اور ایک عرصہ تک مدارس کے نصاب درس میں شامل رہی ہے اور اب بھی بعض مدرسوں میں پڑھائی جاتی ہے۔ آپ کے حالات سیر الاولیاء، اخبار الاخیار، خزینۃ الاصفیاء، بحر ذخار قلمی، نزہۃ الخواطر ج ۲، تاریخ مشائخ چشت وغیرہ میں مذکور ہیں۔

(۱۳) شیخ شمس الدین اودھی

شیخ شمس الدین فریادرس بن نظام الدین اودھی مشہور مشائخ ہند میں ہیں علوم دینیہ کی تحصیل مولانا رفیع الدین اودھی سے کی اور طویل عرصہ تک ان کی خدمت میں رہے۔ تعلیم سے فراغت کے بعد انہیں سے بیعت بھی ہو گئے تھے۔ بعد میں شیخ اشرف سمنانی

---

(۱) سیر الاولیاء ص ۲۷۸۔

(۲) خزینۃ الاصفیاء ص ۳۶۱۔

(۳) سیر الاولیاء ص ۲۷۸۔

کچھوچھوی کی جانب رجوع کیا اور انہیں سے خلافت پائی۔ آپ مخدوم سید اشرف کچھوچھوی کے خلفائے کبار میں شمار ہوتے ہیں۔ لطائف اشرفی میں ہے کہ شیخ سمنانی فرماتے تھے ''اشرف شمس وشمس اشرف است'' یعنی دونوں حقیقتاً ایک جان اور ظاہراً دو قالب ہیں۔ اس سے شیخ شمس الدین کے درجہ کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ لطائف اشرفی میں یہ تفصیل بھی مذکور ہے کہ جب مخدوم سمنانی پہلی مرتبہ کچھوچھہ تشریف لائے تو اپنے احباب واصحاب سے فرمایا کرتے تھے کہ ''اجودھیا سے دوست کی خوشبو آرہی ہے'' کچھ عرصہ کے بعد آپ اجودھیا کے لئے روانہ ہوئے اور وہاں پہنچ کر حسب عادت ایک مسجد میں قیام پذیر ہوئے۔ آپ کی آمد کی خبر پاکر شہر کے علماء واکابر خدمت میں حاضر ہوئے، ان حاضرین میں شمس الدین نامی ایک نوجوان بھی تھا جو علوم دینیہ کی تکمیل کر چکا تھا۔ اور اب کسی شیخ کامل کی اسے ضرورت تھی مخدوم سمنانی نے اس نوجوان کو دیکھتے ہی فرمایا شمس الدین میں تمہاری تلاش میں یہاں آیا ہوں۔ (۱)

الحاصل انہیں بیعت کر کے اوراد ووظائف کی تلقین کی اور خلوت میں بیٹھنے کا حکم دیا شیخ شمس الدین نے مرشد کی ہدایت کے مطابق عمل کیا۔ اور اپنی خداداد صلاحیتوں اور شیخ کی توجہ خاص کی بدولت سلوک کے مراحل بہت جلد طے کر لئے، تکمیل کے بعد شیخ نے اپنی خلافت سے نوازا۔ اس عرصہ میں شیخ سمنانی اجودھیا ہی میں مقیم رہے۔ شیخ شمس الدین کو درجۂ کمال تک پہنچانے کے بعد یہاں سے روانہ ہوئے اور سدھور، لکھنؤ، جائس ہوتے ہوئے کچھوچھہ واپس آگئے۔

شیخ سمنانی کی واپسی کے کچھ عرصہ بعد اجودھیا کے منصب دار ''سیف اللہ خاں'' اپنے ندیموں کے ساتھ کچھوچھہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور آپ کی بزرگی وجلالت شان سے اس قدر متاثر ہوئے کہ اسی سفر میں آپ سے بیعت ہوگئے۔ کچھ دن خانقاہ میں قیام کے بعد جب واپس جانے لگے تو شیخ سے درخواست کی کہ اہلِ اجودھیا کی اصلاح کے لئے آپ کی دعوت وارشاد کا ایک مرکز خود اجودھیا میں بھی ہونا چاہئے۔ چنانچہ

---

(۱) سیرت اشرف ص ۳۰۔

ان کے اصرار پر شیخ سمنانی نے ایک خانقاہ اجودھیا میں بھی قائم کی اور اپنے محبوب و مراد خلیفہ شیخ شمس الدین کو اپنا جانشین بنا کر اہل اجودھیا کی اصلاح و تربیت کی خدمت ان کے سپرد کی۔ شیخ شمس الدین اسی خانقاہ میں بیٹھ کر زندگی بھر تہذیب اخلاق، و تزکیۂ نفوس کی اہم ترین خدمت انجام دیتے رہے۔(۱)

قلب کی طہارت اور روح کی پاکیزگی نے شیخ شمس کی دعاؤں میں ایسی تاثیر پیدا کر دی تھی کہ جس مقصد کے لئے اللہ تعالیٰ کے آگے دستِ دعا دراز کرتے خدائے قاضی الحاجات اسے پورا کر دیا کرتا تھا اپنی اسی خصوصیت کی بناء پر عوام و خواص میں ''فریادرس'' کے لقب سے مشہور ہو گئے تھے۔ صاحب بحرِ ذخار شیخ کے تذکرہ میں لکھتے ہیں:

> ''شیخ شمس الدین فریادرس کے لقب سے مشہور ہوئے ان کا مزار اجودھیا میں مرجع خلائق ہے۔''

حسب تحقیق مولوی عبدالکریم اودھی چمنستان اجودھیا کا یہ گل تازہ اپنے شیخ مرشد کی حیات ہی میں ۷/محرم ۷۹۰ھ یوم جمعہ کو اس جہان خزاں آباد کو الوداع کہہ کر راہئ باغ رضوان ہوا۔(۲)

لیکن مولانا عبدالحی حسنی کے اس جملہ ''تصدّر للارشاد بعدہ'' یعنی مخدوم سمنانی کے بعد مسند ارشاد کے صدر نشیں ہوئے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ شمس الدین مخدوم سمنانی کے بعد نہ صرف حیات رہے بلکہ ان کی اصلاحی سرگرمیاں حضرت مخدوم کی وفات کے بعد ہی بام عروج پر پہنچیں۔ واللہ اعلم۔

آپ کا مزار محلّہ بکسر ٹولہ اجودھیا میں ایٹوا تالاب (موجودہ ستیہ ساگر) کے گوشۂ شمال مغرب بلندی پر واقع ہے۔ اب سے پچاس سال پہلے مزار کے چاروں سمت پختہ چہار دیواری تھی مگر امتدادِ زمانہ اور شکست و ریخت کی مرمت نہ ہونے کی وجہ سے مغربی دیوار زمیں بوس ہو گئی ہے اور بقیہ تین جانب کی دیواریں بھی نہایت خستہ و بوسیدہ ہو گئی ہیں اگر انہیں اسی حال میں چھوڑ دیا گیا تو وہ بھی چند سالوں میں بے نام و نشان ہو جائیں گی۔

---

(۱) سیرت اشرف ص ۳۴۔ (۲) گم گشتہ حالات اجودھیا ص ۲۰۔

گم شدہ حالات اجودھیا کے مصنف کا بیان ہے کہ مقبرہ کی مرمت اور اس کے دیگر مصارف کے واسطے سلاطین دہلی نے ستر بیگھہ آراضی بطور معافی دی تھی مگر جن صاحب کے نام سند معافی تھی ان کی ناخلف اولاد نے نہ صرف مقبرہ کی اس معافی کو اپنی ذاتی جاگیر بنالیا بلکہ مزار کے احاطہ میں مولسری وغیرہ کے جو پُرانے درخت تھے انہیں بھی بیراگیوں کے ہاتھ فروخت کردیا اور قیمت ذاتی مصارف میں خرچ کر ڈالی انہیں لوگوں کے استحصال سے آج مقبرہ بالکل ویران ہے۔ (۱)

یہ تربت ماتمی ہے ان حجازی شہ سواروں کی   مسلمانوں نے مٹی بیچ لی جنکے مزاروں کی

شیخ شمس الدین نے اپنے پیچھے مرید و مسترشدین کی ایک کثیر جماعت کے علاوہ تین صاحبزادے چھوڑے۔ شیخ بدیع الدین جن کی نسل سے موضع کولا ضلع فیض آباد کے شیوخ ہیں۔ دوسرے شیخ جہانگیران کے صاحبزادے شیخ علاء الدین تھے، جن کے نام پر موضع علاء الدین پور ضلع فیض آباد آباد ہوا۔ یہیں شیخ علاء الدین کی اولاد بھی ہے اور مزار بھی۔ تیسرے صاحبزادے شیخ احمد تھے جن کے متعلق کچھ صحیح تفصیل معلوم نہ ہوسکی۔

(۱۴) شیخ فتح اللہ اودھی

شیخ فتح اللہ بن نظام الدین اپنے عہد کے زبردست عالم اور بلند پایہ شیخ تھے۔ نحو، فقہ، اصول فقہ میں خصوصی مہارت رکھتے تھے۔ ان کا آبائی وطن بدایوں تھا۔ تحصیل علم کی غرض سے دہلی گئے اور حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلی کی سرپرستی میں اساتذۂ دہلی سے علوم و فنون کی تحصیل و تکمیل کی۔ تعلیم سے فراغت کے بعد مسند درس وافادہ کو زینت بخشی اور طویل عرصہ تک جامع مسجد دہلی متصل منارہ شمسی (قطب مینار) میں تدریسی خدمت انجام دیتے رہے، بعد ازاں حضرت چراغ دہلی کے خلیفۂ خاص شیخ صدر الدین احمد حکیم دلہا متوفی ۷۵۹ھ سے بیعت ہوکر مجاہدۂ و ریاضت میں لگ گئے ساتھ ہی تدریسی مشغلہ بھی جاری رہا۔ لیکن مجاہدۂ بسیار و ریاضت شاقہ کے باوجود دل کی گرہیں نہ کھلیں اور سوز دروں

---

(۱) گم گشتہ حالات اجودھیا ص ۱۹۔

کی جو کیفیت حاصل ہونی چاہئے تھی وہ میسر نہ ہوئی۔ تو شیخ سے عرض حال کی پیر و مرشد حکیم دلہا نے فرمایا تدریسی سلسلہ بند کردیں اور کتابوں کو اپنے پاس سے علاحدہ کردیں۔ چنانچہ پیر روشن ضمیر کی تجویز کے مطابق درس کو موقوف کردیا اور چند اہم و پسندیدہ کتابوں کے علاوہ پورا اپنا کتب خانہ دوسروں کے حوالہ کردیا پھر بھی قلب معرفت کی چاشنی سے نا آشنا ہی رہا۔ شیخ سے دوبارہ رجوع کیا۔ انھوں نے فرمایا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ علمی اشتغال سے بالکلیہ انقطاع نہیں ہوا ہے۔ "العلم حجاب الاکبر" جب تک یہ پردہ درمیان میں حائل ہے معرفت کی روشنی قلب تک نہیں پہنچ سکتی۔ پھر دیکھنے والوں نے دیکھا کہ شیخ فتح اللہ ان عمدہ کتابوں کو جنھیں حرز جان بنائے ہوئے تھے ان کے ایک ایک جز کو الگ کرکے پانی کے کنارے بیٹھے انہیں دُھل رہے ہیں اور آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی ہے۔ ''اورا دیدند کہ برلب آبے نشست اجزا را می شست و آب از چشم اومی رفت'' بالآخر لوحِ دل ماسوی اللہ کے نقش سے بالکل صاف ہوگئی، نورِ معرفت سے سینہ جگمگا اٹھا اور حضرت حکیم دلہا نے خلعت خلافت سے سرفراز فرمایا۔

مقام ارشاد پر فائز ہونے کے بعد حضرت چراغ دہلی اور اپنے پیر و مرشد کے منشاء سے اجودھیا تشریف لائے اور حضرت چراغ دہلی کے آبائی مکان میں فروکش ہوئے جسے حضرت چراغ دہلی نے انکی تحویل میں دے دیا تھا۔ شیخ فتح اللہ زندگی کے آخری لمحے تک اسی میں رہے جو رہائش کا بھی کام دیتا تھا اور بندگان خدا کی اصلاح و تربیت کیلئے خانقاہ کا بھی۔

شیخ فتح اللہ کا ہندوستان کے مشائخ کبار میں شمار ہوتا ہے۔ ان کے فیض تربیت سے ہزاروں گم کردہ راہ صراط مستقیم سے آشنا ہوئے۔ شیخ محمد عیسیٰ تاج جونپوری، شیخ سعد الدین اودھی، شیخ قاسم اودھی، شیخ درویش اودھی جیسے بلند مرتبہ مشائخ چشت ان کے دامن تربیت سے وابستہ اور مرید و خلیفہ تھے۔ مفتی غلام سرور لاہوری لکھتے ہیں ''از کاملین وقت گشت رو ہزارہا طالبان حق را بحق رسایند چنانچہ شیخ قاسم دہلوی (اودھی) از خلفائے وے است و نیز شیخ محمد عیسیٰ تاج جونپوری مرید و خلیفہ او بود''(۱) مخدوم شیخ احمد عبد الحق ردولوی متوفی

---

(۱) خزینۃ الاصفیاء ص ۳۸۰ ج ۱۔

۸۳۷ھ بھی شیخ اودھی کی خدمت میں بغرض بیعت اجودھیا حاضر ہوئے تھے۔ لیکن شیخ ردولوی مشرب عشق ومحبت کے دلدادہ تھے اور شیخ فتح کی روش زہد وفقر اور تسلیم ورضا کی تھی اس لئے مناسبت پیدا نہ ہوسکی(۱) اسی موقع پر شیخ ردولوی نے اجودھیا میں کئی ماہ کا قیام کر کے چلہ کشی کی تھی۔

شیخ فتح اللہ جب دہلی سے رخصت ہوکر اجودھیا کے لئے عازم سفر ہوئے تو ان کے شیخ حضرت طبیب دلہا نے اپنے دو صاحبزادوں شیخ یحییٰ اور شیخ نور کو بغرض تعلیم وتربیت ان کے حوالہ کر دیا تھا۔ شیخ اودھی نے دونوں مخدوم زادوں کو علوم ظاہر وباطن سے آراستہ کر کے بغرض دعوت وتبلیغ اجودھیا سے جانب مشرق تقریباً ۳۰-۳۵ کلومیٹر کے فاصلے پر بھیج دیا جہاں پہنچ کر ان دونوں حضرات نے مستقل سکونت اختیار کر لی۔ یہ مقام آج کل ''اونچا گاؤں'' کے نام سے مشہور ہے۔ اسی میں دونوں حضرات کے مزارات ہیں اور ان کی اولاد اب بھی یہاں موجود ہے۔ مولانا عزیز احمد قاسمیؒ بی، اے استاذ دار العلوم دیوبند اسی اونچا گاؤں کے رہنے والے اور شیخ یحییٰ کی نسل سے تھے مولانا موصوف کا شجرۂ نسب شیخ صدر الدین حکیم دلہا تک یہ ہے۔

مولانا عزیز احمد، بن محمد فاروق، بن الٰہی بخش، بن محمد اشرف، بن راحت علی، بن عباد اللہ، بن خدا بخش، بن محمد ہادی، بن محمد زاہد، بن اللہ دیا، بن ابوبکر، بن عبد الملک، بن مخدوم یحییٰ، بن شیخ صدر الدین حکیم دلہا۔ (۲)

۲۶/ ربیع الاول ۸۲۱ھ کو شیخ فتح اللہ کا وصال ہوا، مزار اجودھیا میں ہے۔ (۳)

مکاتب شیخ فتح اللہ کے نام سے آپ کے مکاتیب کا ایک مجموعہ کسی مرید نے جمع کیا تھا جو شائع بھی ہوا تھا مگر اس وقت نایاب ہے۔ شیخ عبد الحق محدث دہلوی نے بعض مکاتیب کے اجزا اخبار الاخیار میں نقل کئے ہیں۔

---

(۱) اخبار الاخیار ص ۱۹۴-۱۹۵۔

(۲) از خاندانی شجرہ مولانا عزیز احمد قاسمی۔

(۳) نزہۃ الخواطر ج ۳ ص ۱۲/ ۱۳۔

شیخ اودھی کا مقبرہ محلّہ چراغ دہلی (موجودہ عالم گنج کٹرا) اجودھیا میں خود انہی کی خانقاہ کے احاطہ میں ہے۔ مزار آج بھی موجود ہے اور اچھی حالت میں ہے، مزار اور خانقاہ کی مرمت حسب تصریح صاحب گم گشتہ حالاتِ اجودھیا اب تک تین بار ہو چکی ہے، سب سے پہلے واجد علی ناظم اودھ نے اس کی شکست وریخت کو درست کرایا۔ کچھ دنوں کے بعد خانقاہ کا ایک حصہ گر گیا تو شیخ رمضان علی تاجر فیض آباد نے اس کی مرمت کرائی اور گرے ہوئے حصہ کو از سر نو تعمیر کرادیا پھر تیسری بار ۱۳۳۵ھ/ ۱۹۱۶ء میں خواجہ برکات اللہ اعظم گڈھی نے مرمت کرائی اور خانقاہ ومزار کے اردگرد چہار دیواری قائم کردی۔ اور خانقاہ کی مسجد کی مرمت ڈیڑھ صدی قبل سید محمد بخش کرنالی رسالہ دار نے کرائی تھی اس کے ایک عرصہ کے بعد رسالہ دار موصوف کے برادر زادہ سید جعفر کرنالی نے دوبارہ اس کی اصلاح ومرمت کرائی۔

خانقاہ کے احاطہ کی مشرقی دیوار کے متصل آپ کے خلیفۂ خاص شیخ قاسم اودھی کا مدفن ہے، شیخ قاسم بن برہان الدین دہلوی اودھی عالم وفقیہ اور ولیٔ کامل تھے۔ سلوک کی تحصیل پہلے اپنے والد شیخ برہان الدین سے کی پھر شیخ فتح اللہ اودھی کے حلقہ ارادت میں شامل ہوئے اور انہیں کی رہنمائی میں طریقت کی راہیں طے کر کے درجہ ارشاد وتلقین کو پہنچے۔ (۱)

(۱۵) شیخ سعدُاللہ اودھی

شیخ سعداللہ اودھی کے حالات معلوم نہ ہوسکے۔ ممکن ہے مرأۃ الاسرار یا بحر ذخار میں ان کا تذکرہ اور تفصیلی حالات ہوں۔ مگر اس وقت یہ کتابیں پیش نظر نہیں ہیں۔ مولانا عبدالحیٔ حسنی نے شیخ محمد بن قاسم (المعروف بہ شیخ درویش) کے تذکرہ میں ضمناً گلزارِ ابرار کے حوالہ سے لکھا ہے کہ یہ شیخ فتح اللہ اودھی کے خلیفہ تھے (۲) تذکرۃ العابدین کے مصنف لکھتے ہیں کہ ''آپ خلیفہ شیخ فتح اللہ اودھی کے ہیں۔ آپ بہت بڑے مشائخِ طریقت تھے

---

(۱) نزہۃ الخواطر ج ۳ ص ۱۱۹۔

(۲) نزہۃ ج ۳ ص ۱۴۵/ ۱۴۶۔

مگر اپنا حال ہمیشہ پوشیدہ رکھا۔ کسی پر یہ ظاہر نہ ہوا کہ آپ کا کیا حال اور طریق ہے۔ وفات آپ کی ۱۷/ ذی قعدہ ۸۵۰ھ میں ہوئی اور مزار اودھ میں ہے۔ بلفظہٖ (۱)

(۱۶) شیخ جمال گوجری

شیخ جمال الدین گوجری اودھی عظیم المرتبت، صاحب نسبت اور بڑے مقام و مرتبہ کے بزرگ تھے۔ پانچ واسطوں سے آپ کا سلسلہ نسب شیخ نجم الدین کبریٰ سے مربوط ہو جاتا ہے۔ اپنے زہد و ورع، مجاہدہ و ریاضت اور کریم النفسی و شفقت علی الخلق کی بناء پر شیخ الاولیاء کے لقب سے مشہور تھے (۲) شیخ احمد عبدالحق ردولوی متوفی ۸۳۷ھ فرماتے ہیں ”از بھکر تا پنڈوہ مسافرت کردم باہیچ مسلمانے ملاقات نہ شد اِلاّ در اودھ یک بچہ دیدم واشارت بشیخ جمال گوجر کرد‘‘ (۳) بھکر سے پنڈوہ تک سفر کیا مگر کسی (کامل) مسلمان سے ملاقات نہیں ہوئی البتہ اودھ میں ایک شخص جمال گوجر کو دیکھا۔

شیخ جمال سلسلۂ فردوسیہ کے مشہور و بلند پایہ بزرگ شیخ مظفر بلخی متوفی ۸۰۳ھ کے مرید و خلیفہ تھے اور انھیں کے حسب منشاء اجودھیا میں سکونت پذیر تھے حسن اتفاق سے اسی زمانہ میں شیخ احمد عبدالحق ردولوی بھی اجودھیا میں اقامت گزیں تھے۔ ان بزرگوں کے اجتماع سے اجودھیا دارالاولیاء بن گیا تھا۔ مفتی غلام مسرور لاہوری لکھتے ہیں کہ شیخ جمال گوجر شیخ ردولوی کی مجلس کے حاضر باش اور ان کے دامِ محبت میں گرفتار تھے۔ محدث دہلوی بیان کرتے ہیں کہ جس زمانہ میں شیخ احمد ردولوی اجودھیا میں مقیم تھے۔ ان کے ساتھ ایک کتیا بھی تھی۔ اس نے جب بچہ جنا تو شیخ نے اس کی تقریب میں تمام اعیان و اکابر اور امراء شہر کی دعوت کی لیکن شیخ جمال گوجر کو مدعو نہیں کیا۔ انھیں شیخ کی اس بے اعتنائی پر حیرت ہوئی۔ چنانچہ دوسرے دن ان سے شکوہ کرتے ہوئے کہا کہ کل کی دعوت میں آنجناب بندہ

---

(۱) تذکرۃ العابدین ص ۱۰۲۔

(۲) خزینۃ الاصفیاء ج ۲ ص ۳۲۱۔

(۳) اخبار الاخیار۔

کو بھول گئے۔ شیخ ردولوی نے یہ سن کر فرمایا: جمال الدین میزبانئ سگ بود، سگاں را طلبیدیم کہ ''الدنیا جیفۃ وطالبہا کلاب'' تو از جملۂ آدمیانی تراچوں طلبم'' (۱) جمال الدین یہ تو کتے کی میزبانی تھی اس لئے کتوں کو دعوت دی گئی کیونکہ (حسب ارشاد نبی پاک ﷺ) دنیا مُردار ہے اور اس کے طالب کتے ہیں تم تو ایک آدمی ہو اس میں تمہیں کیسے مدعو کرسکتا تھا۔

شفقت علی الحق کے جذبہ سے شیخ جمال بسا اوقات کھچڑی کی دیگ تیار کرا کے خود اپنے سر پر لئے اجودھیا کے گلی کوچے میں گھومتے پھرتے جہاں کہیں کوئی بھوکا مل جاتا اسے وہ کھچڑی دیدیتے۔ ایک دن حسبِ عادت شیخ جمال کھچڑی کی ایک دیگ سر پر لئے کسی اور طرف جانے کے بجائے اتفاقاً سید سلطان موسیٰ عاشقان کی خانقاہ میں پہنچ گئے۔ اور دیگ شیخ عاشقان کے آگے رکھ دی، اس وقت ان کے یہاں تین دن سے فاقہ چل رہا تھا۔ شیخ جمال کی بروقت اس پیش کش پر سید عاشقان بیحد ممنوع ہوئے اور جزاک اللہ کہتے ہوئے فرمایا'' جمال تو دیگِ طعام (برنگِ گوجراں کہ سبوے شیر برسر گرفتہ می فروشند) گرفتہ می گردی لیکن بہ بہائے عشق می فروشی'' اے جمال تم گوجروں کی طرح (جو دودھ کی ٹھلیا سر پر رکھے بیچتے پھرتے ہیں) کھانے کی دیگ سر پر لئے گھومتے ہو لیکن (سچ تو یہ ہے کہ اسے) عشق ومحبت کی قیمت کے عوض فروخت کرتے ہو۔ کہتے ہیں کہ اسی دن سے شیخ جمال گوجر کے لقب سے پکارے جانے لگے۔ اور پھر اسے اتنی شہرت ہوئی کہ نام کا جزو بن گیا۔ آپ کی فوات ۸۵۸ھ میں ہوئی (۲)

مزار محلّہ بکسریا ٹولہ اجودھیا میں ایک احاطہ کے اندر تھا مگر عرصہ ہوا احاطہ کی دیواریں گر کر بے نشان ہوگئی ہیں۔ البتہ کچھ شکستہ قبریں اب بھی موجود ہیں جن میں سے ایک کے بارے میں اجودھیا کے لوگ کہتے ہیں کہ یہی شیخ جمال اولیاء کا مدفن ہے۔ (۳) واللہ اعلم۔ صاحبِ گم گشتہ حالات اجودھیا و مرتب شہر اولیاء دونوں نے مزار جمال اولیاء

---

(۱) اخبار الاخیار ص ۱۹۶۔

(۲) خزینۃ الاصفیاء ج ۲ ص ۳۲۱۔

(۳) گم گشتہ حالات اجودھیا ص ۲۲ و شہر اولیاء ص ۲۱۵۔

کے عنوان سے اوپر کی تفصیلات تحریر کی ہیں لیکن یہی دونوں حضرات دوبارہ اپنی کتابوں میں مزار جمال گوجری کا عنوان قائم کر کے لکھتے ہیں ''شاہ مظفر کی مسجد سے دکھن جانب حضرت شاہ جمال گوجری کا مزار ہے۔ گم گشتہ ص ۳۹ وشہر اولیاء ص ۲۵۲ جبکہ جمالِ اولیاء اور جمال گوجری دونوں ایک ہی بزرگ ہیں جیسا کہ خود صاحبِ گم گشتہ کی بیان کردہ تفصیلات سے بھی ظاہر ہے۔ ان دونوں حضرات کی یہ تحریریں دیکھ کر بے ساختہ نوکِ قلم پر غالب کا یہ مصرعہ آ گیا ''یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے''

صاحبِ گم گشتہ نے شیخ جمال کے چار خلفاء کا نام ذکر کیا ہے۔ مولانا کمال[۱] الدین جو شیخ جمال کے برادر خرد تھے۔ ان کا مزار شیخ جمال کے مزار کے متصل ہے۔ شاہ[۲] جانی، شاہ درویش[۳]۔ ان دونوں بزرگوں کا مرقد اترولہ ضلع گونڈہ میں ہے۔ اور چوتھے مولانا عبدالکریم اودھی جن کا مقبرہ محلہ قضیانہ اجودھیا میں ہے، مزار کے گرد پختہ چہار دیواری تھی، مگر عرصہ ہوا اسی محلہ کے ایک عاقبت فراموش نے (اس دعویٰ سے کہ میرے دادا نے ان دیواروں کو تعمیر کیا تھا) انھیں توڑ کر ساری اینٹیں فروخت کر دیں۔ (۱)

''پیچ کھاتے ہیں جو اسلاف کا مدفن تم ہو''

(۱۷) شیخ سید سلطان موسیٰ عاشقان

سیّد سلطان موسیٰ عاشقان، شیخ حاجی صدر الدین چراغ ہند متوفی ۷۹۵ھ کے مرید و خلیفہ تھے۔ انھیں کے ہمراہ ملتان سے ظفر آباد (جون پور) آئے، اور پھر وہاں سے شیخ کے حکم سے اجودھیا میں سکونت پذیر ہو گئے تھے، اجودھیا میں جس جگہ آپ کی رہائش تھی وہ محلہ سیّد واڑہ کے نام سے مشہور ہے۔ افسوس کہ سیّد عاشقان کے حالات دستیاب نہیں ہو سکے۔ صاحب تاریخ شیرازِ ہند نے بحوالہ مرأۃ الاسرار جو کچھ لکھا ہے انھیں کے الفاظ میں وہ تفصیلات ذیل میں درج کی جا رہی ہیں۔

''آپ درویش اہلِ دل اور تنہائی پسند تھے حضرت مخدوم چراغِ ہند سے بیعت تھی۔

---

(۱) گم گشتہ ص ۱۲۔

اور آپ ہی کے ہمراہ بسلسلۂ جہاد (دعوت وتبلیغ) ظفر آباد تشریف لائے تھے۔ ریاضت ومجاہدات میں محنت شاقہ برداشت فرمائی تھی۔ جب آپ کو مقام قطبیت حاصل ہوگیا تو بحکم پیرومرشد ولایت ملک اودھ آپ کو عطا کی گئی۔ آپ نے وہیں قیام فرمایا۔ لباس میں محض سترِ عورت کا اہتمام کرتے زیادہ تر ننگے سر رہتے تھے۔ کبھی کبھی جذب اور وجد کی کیفیت طاری رہتی۔ ہجوم کو ناپسند کرتے اور تنہائی سے وحشت ہوتی، صدہا فقراء ومساکین آپ کی خانقاہ میں رہتے تھے لنگر خانہ جاری تھا۔ (۱)

گم گشتہ حالات اجودھیا میں تاریخ وفات ۸/صفر لکھی ہے مگر سن ندارد ہے۔ پہلے عرس بھی ہوتا تھا۔ سیّد عاشقان کے تین صاحبزادے تھے۔ ایک صاحبزادہ کی اولاد قصبہ سیدن پور ردولی میں اب بھی موجود ہے۔ دوسرے صاحبزادہ نے موضع ملہار پور کلاں ضلع جون پور میں سکونت اختیار کرلی تھی۔ ان کی اولاد بھی اب تک اس موضع میں مقیم ہے۔ بڑے صاحبزادے جو والد بزرگوار کی وفات کے بعد سجادہ نشین ہوئے اجودھیا ہی میں مقیم رہے۔ ان کے سلسلۂ نسب سے ایک بزرگ سیّد سلطان علی عرف سیّد سلطان بخش تھے جو نہایت متوکل اور صبر ورضا کے مالک تھے۔ اکثر خانہ نشیں رہتے تھے۔ اگر کبھی گھر سے باہر نکلتے تو اولیائے کرام کے مزارات پر فاتحہ خوانی کے لئے ضرور جاتے۔ ۷۵ سال کی عمر میں ۱۲۶۴ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ اور اپنے آباء واجداد کے مقبرہ میں دفن ہوئے (۲)

شہر اولیاء میں شیخ عاشقاں کے مزار کی نشاندہی اور اس کی موجودہ کیفیت کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:-

”گوکل پھول مندر کے پاس سے ایک کچا راستہ دکھن سمت گیا ہے جو آگے جاکر فیض آباد اجودھیا روڈ کے سامنے ختم ہوجاتا ہے۔ اس کے راستے پر دکھن جانب تقریباً سو سوا سو میٹر چلنے کے بعد داہنے ہاتھ ایک قطعہ اراضی نظر آئے گی جس میں خودرو جھاڑیاں اگی ہوئی ہیں۔ اسی قطعۂ اراضی میں عام راستہ سے ۲۰، ۲۵ قدم ہٹ کر قدرے اونچے

---

(۱) تاریخ شیراز ہند ص ۱۹۹ از سید اقبال جونپوری طبع قدیم۔

(۲) گم گشتہ ص ۵۰۔

ایک چبوترے پر چند دوسری قبروں کے ساتھ سید سلطان موسیٰ عاشقاں صاحب کا مزار ہے۔ مزار کے پاس کافی گندگی ہے اور کوڑا کباڑ کا انبار ہے۔ (۱)

فاعتبروا یااولی الابصار

(۱۸) قاضی شہابُ الدین اودھی

قاضی شہابُ الدین مداری اودھی الملقب بہ پرکالۂ آتش، قاضی قدوۃ الدین اسرائیلی کی اولاد میں تھے۔ علومِ دینیہ بالخصوص فقہ میں پوری دستگاہ رکھتے تھے اور اودھ کے قاضی تھے۔ ہندوستان کے مشہور صوفی شیخ بدیع الدین مدار متوفی ۸۴۰ھ جس وقت کالپی سے جونپور جارہے تھے اسی سفر میں قاضی شہابُ الدین ان کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ اور پہلی ہی ملاقات میں شیخ مدار سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ بیعت ہو کر ان کے حلقۂ خدّام میں شامل ہو گئے۔ (۲)

پھر پیر و مرشد کی محبت کا ایسا غلبہ ہوا کہ علمی مشغلہ ترک ہو گیا، تمام کتابوں کو دریا برد کر دیا اور منصبِ قضا سے بھی دست بردار ہو گئے۔ شیخ مدار کی خدمت یا ذکر و مراقبہ بس یہی زندگی کا مشغلہ رہ گیا۔ (۳) شیخ مدار سے اس درجہ تعلق ہو گیا تھا کہ سفر و حضر کسی وقت بھی ان کی صحبت سے جدائی گوارا نہیں تھی۔ شیخ مدار کو بھی ان سے انس خاص تھا اور زیادہ تر خدمت انھیں سے لیتے تھے۔ چنانچہ شیخ مینا لکھنوی متوفی ۸۷۰ھ کو شاہ مدار نے اپنا مصلیٰ قاضی شہابُ الدین پرکالۂ آتش ہی کے ذریعہ سے بھیجا تھا (۴)

الحاصل پیر و مرشد کی توجہ خاص سے درجۂ تکمیل کو پہنچ کر خلافت سے مشرف ہوئے۔ شیخ مدار کے کل ستر (۷۰) خلفاء تھے جن میں قاضی سیّد اجمل بہرائچی، مولانا حسام الدین ملامتی جون پوری، مولانا محمد جھندہ بدایونی، قاضی محمود کشوری، اور شیخ

---

(۱) شہر اولیاء ص ۲۶۵ ڈاکٹر دبیر فیض آبادی۔

(۲) انتصاح عن ذکر اہل الصلاح ص ۹۶۔

(۳) نزہۃ الخواطر ج ۳ ص ۸۷۔

(۴) انتصاح عن ذکر اہلِ الصلاح ص ۹۶۔

شہابُ الدین پرکالۂ آتش اجلّ خلفاء میں شمار ہوتے ہیں۔ (۱)

پرکالۂ آتش لقب سے متعلق مولانا عبدالحئ حسنی لکھتے ہیں "لقبه الناس لذكاوته پر كالۂ آتش" ان کے ذہن ثاقب کی بناء پر لوگوں نے انھیں پرکالۂ آتش کا لقب دیدیا تھا۔ (۲) بعض لوگوں نے اس کی وجہ یہ لکھی ہے کہ "حرارت شوق الٰہی چناں غالب می بود کہ از آتش انفاس خود مرغ می پخت واز کثرتِ جلال خلق اورا پرکالۂ آتش می گفت" عشقِ الٰہی کی حرارت اس قدر تیز تھی کہ سانس کی گرمی سے چڑیا پک جاتی تھی۔ اور کثرتِ جلال کی وجہ سے لوگ انھیں پرکالۂ آتش کہتے تھے۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔

سنِ وفات معلوم نہ ہوسکا ان کے شیخ و مرشد مخدوم مدار کی وفات ۸۴۰ھ میں ہوئی ہے، اس لئے اندازہ ہے کہ خود ان کی وفات نویں صدی ہجری کے آخر میں ہوئی ہوگی۔ مقبرہ موضع جملائی میں ہے جسے اب بڑا گاؤں کہتے ہیں، جو اجودھیا سے ۲۰، ۲۵ کلومیٹر برجانبِ مغرب واقع ہے اور معمولی درجے کا ریلوے اسٹیشن ہے جس پر صرف پسنجر گاڑیاں رُکتی ہیں۔

شیخ بدیع الدین مدار کے اجودھیا میں ایک خلیفہ اور بھی تھے جو شیخ جودھن مداری اودھی کے نام سے مشہور تھے۔ صاحب انتصاح نے شیخ مدار کے خلفاء کی فہرست میں لکھا ہے "حضرت شاہ جودھن کہ در شہر اودھ مسکن گرفتہ" اور شاہ جودھن جو شہر اجودھیا میں مدفون ہیں۔ لیکن ان کے تفصیلی حالات معلوم نہ ہوسکے اور نہ مقبرہ کی نشاندہی ہوسکی کہ کس محلے میں تھا۔ اجودھیا میں شاہ مدار نام سے ایک محلّہ ہے، ممکن ہے ان کا قیام اسی جگہ رہا ہو جس کی مناسبت سے یہ نام پڑ گیا ہو۔

(۱۹) شیخ محمد درویش اودھی

آپ کا نام نامی محمد اور لقب درویش ہے والد ماجد کا اسم گرامی قاسم بن برہان

---

(۱) تذکرۃ المصنّفین ج۲ ص۴۵ مع زیادہ۔

(۲) نزہۃ ج۳ ص۸۷۔

الدین اودھی ہے۔ صاحبِ نزہۃ نے آپ کے تذکرہ کی ابتداء ان الفاظ سے کی ہے ”الشیخ الصالح الفقیہ محمد بن قاسم بن برھان الدین اودھی احد المشائخ المشھورین“ شیخ، صالح، فقیہ محمد بن قاسم بن برہان الدین اودھی مشہور مشائخ میں سے تھے۔ تذکرۃ الرشید ص ۸۶ میں شیخ درویش بن محمد قاسم درج ہے جو صحیح نہیں ہے۔ احد المشائخ المشہورین میں ہونے کے باوجود آپ کا تفصیلی تذکرہ دستیاب نہیں ہے، خود نزہۃ میں صرف چار پانچ سطریں آپ کے بارے میں ہیں۔ اسی طرح شیخ یٰسین بنارسی متوفی ۱۰۷۶ھ نے مناقب العارفین میں شیخ محمد بن عیسیٰ بن تاج الدین جونپوری متوفی ۸۷۰ھ کے خلفاء کا تذکرہ کرتے ہوئے شیخ درویش کا ذکر کیا ہے مگر درج ذیل چند جملوں کے اور کچھ نہیں لکھا ہے۔ ”واز جملۂ خلفاءِ حضرت مخدوم درویش قاسم اودھی است بسیار بزرگ بود شیخ عبدالقدوس گنگوہی را از ایشاں جامۂ خلافت رسید (۱) اور منجملہ خلفاء کے حضرت مخدوم درویش بن قاسم اودھی ہیں۔ بہت بڑے بزرگ تھے۔ شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کو ان سے جامۂ خلافت ملا ہے۔

تذکرۃ العابدین میں یہ چند سطریں ہیں ”آپ خلیفہ شیخ سعد اللہ کے اور پیر حضرت عبدالقدوس گنگوہی کے ہیں۔ آپ بہت بڑے عالم بہ علوم ظاہری و باطنی ومقبول و عاشقِ خدا تھے۔ آپ نے اپنی تمام عمر ریاضت ومجاہدہ میں صرف کی اور جابجا مشائخ کی خدمت میں گئے اور کئی طریق سے سلسلۂ طریقت حاصل کیا اور مخلوقِ خدا کو فیض یاب کیا (۲)

صاحبِ تذکرۃ العابدین کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ درویش کو اپنے عہد کے بہت سے مشائخ سے اجازت وخلافت حاصل تھی۔ راقم الحروف کو تلاش وجستجو کے بعد چھ ایسے مشائخ کا علم ہوا جن سے آپ نے اخذ فیض کیا اور خلافت پائی۔ تفصیل اس طرح ہے۔ (۱) اپنے والد محترم شیخ قاسم اودھی (۲) شیخ سعد الدین اودھی (۳) شیخ محمد بن عیسیٰ تاج جونپوری، یہ تینوں بزرگ شیخ فتح اللہ اودھی کے مرید وخلیفہ تھے۔ ان تینوں مشائخ سے

---

(۱) مناقب العارفین قلمی ص ۱۵۔

(۲) تذکرۃ العابدین ص ۱۰۳۔

واسطہ کے بغیر براہِ راست (۴) شیخ فتح اللہ سے بھی آپ کو خلافت حاصل تھی چنانچہ مولانا عبدالحیؒ حسنی لکھتے ہیں ”قال المندوی فی گلزار ابرار انه اخذ الطریقة الچشتیة عن والده وعن الشیخ سعد الدین اودھی کلاهما عن الشیخ فتح اللّٰه. واخذ عن الشیخ فتح اللّٰه بلا واسطة(۱)

صاحبِ گلزار ابرار کا بیان ہے کہ شیخ درویش نے طریقۂ چشتیہ اپنے والد اور شیخ سعدالدین اودھی خلیفہ شیخ فتح اللہ سے حاصل کیا۔ اور خود شیخ فتح اللہ سے بغیر واسطہ کے بھی اخذ فیض کیا۔ (۵) شیخ میاں بن حکیم اودھی خلیفہ سید صدرالدین اودھی سلسلۂ چشتیہ کے ان پانچوں مشائخ کے علاوہ سلسلۂ مداریہ سہروردیہ میں (۶) شیخ بدھن بہرائچی خلیفہ شیخ اجمل بہرائچی سے بھی خلافت یافتہ تھے۔ اور شیخ عبدالقدوس گنگوہی متوفی ۹۴۴ھ ان تمام سلسلوں میں شیخ درویش کے مجاز و خلیفہ تھے۔ مناقبُ العارفین میں شیخ عبدالقدوس گنگوہی کی شیخ درویش کی خدمت میں حاضری اور پھر شیخ سے ان کی گرویدگی کا بڑا دلچسپ واقعہ لکھا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے:

پہلے پہل جب مولانا عبدالقدوس شیخ کی خدمت میں باریاب ہوئے تو گدڑی پوش تھے۔ شیخ نے انھیں اس لباس میں دیکھ کر پوچھا کہ آپ کو اس لباس میں دیکھ کر اگر کوئی یہ کہے کہ یہ درویش جا رہا ہے، تو یہ بات آپ کے کانوں تک پہنچے گی یا نہیں؟ مولانا نے جواب دیا ہاں پہنچے گی۔ شیخ نے فرمایا کانوں سے گزر کر دل تک جائے گی؟ مولانا نے اس کا جواب بھی اثبات میں دیا۔ شیخ نے پھر سوال کیا کہ دل اس بات کی طرف متوجہ ہوگا یا نہیں؟ مولانا نے عرض کیا ہاں متوجہ ہوگا۔ شیخ درویش نے یہ سن کر فرمایا ”چرا روشے اختیار باید کرد کہ مشغولی از دست برود“ ایسا طریقہ کیوں اختیار کیا جائے جس کی وجہ سے خدا کی یاد سے دل غافل ہو جائے۔

شیخ کی اس لطیف تنبیہ سے مولانا عبدالقدوس گنگوہی اس درجہ متاثر ہوئے کہ انھیں کی صحبت میں رہ پڑے تا آنکہ شیخ درویش نے انھیں جامۂ خلافت اور فن تصوف میں اپنی

---

(۱) نزہۃ الخواطر ج ۳ ص ۱۴۵/ ۱۴۶۔

تصنیف ’’آدابُ السالکین‘‘ دے کر رخصت کیا۔ (۱)

شیخ درویش کی تصنیف آداب السالکین کا ذکر مولانا عبدالحئی حسنی نے بھی کیا ہے لکھتے ہیں ”له كتاب آداب السالكين كتاب مفيد فى السلوك“ شیخ درویش کی فنِ سلوک میں آداب السالیکن مفید کتاب ہے۔ شیخ فتح اللہ کے تذکرہ میں لکھتے ہیں ”اخذ عنه محمد بن قاسم اودهی صاحب آداب السالکین“. ان سے اخذ سلسلہ کیا محمد بن قاسم آداب السالکین کے مصنف نے (۲)

علاوہ ازیں اپنی مشہور تصنیف ’’الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند‘‘ میں بھی آدابُ السالکین کو شیخ محمد درویش کی تصنیف بتایا ہے۔ (۳)

شیخ عبدالحق محدّث دہلویؒ نے بھی شیخ فتح اللہ اودھی کے تذکرہ میں ضمناً آداب السالکین کا ذکر کیا ہے اور نصف صفحہ سے زائد اس کا اقتباس بھی دیا ہے، لیکن کتاب کی نسبت شیخ درویش کے بجائے ان کے والد شیخ قاسم کی طرف کی ہے لکھتے ہیں ’’شیخ قاسم اودھی از مریدان اوست رسالہ دارد مسمّٰی بہ آداب السالکین‘‘ (۴) شیخ قاسم اودھی دہلوی ان (شیخ فتح اللہ) کے مریدوں میں سے ہیں جن کا آداب السالیکن نامی ایک رسالہ ہے۔

یوم پنجشبہ ۱۶/محرم ۸۹۶ھ کو شیخ درویش کا وصال ہوا۔ محلّہ چراغ دہلی اجودھیا (عالم گنج کٹرا) میں شیخ فتح اللہ کے حظیرہ میں مشرقی دیوار کے متصل اپنے والد بزرگوار کے پائیں آسودہ خواب ہیں۔ (۵)

منشی محبّ اللہ فرید آبادی سپرنٹنڈنٹ نے مولانا محمد علی خلیفہ مولانا سید امیر علی شہید کے حکم سے شیخ قاسم و شیخ محمد درویش کے مزاروں کی مرمّت اب سے تقریباً ۷۰/۸۰ برس پہلے کرادی تھی اس لئے دونوں قبریں ابھی درست حال میں ہیں۔ (۶) مگر یہ آج سے

---

(۱) مناقب العارفین ص ۱۱۵۔

(۲) نزہۃ ج ۳ ص ۱۴۶، ایضاً ج ۳ ص ۱۲۔

(۳) الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند اردو ترجمہ ص ۲۷۳۔

(۴) اخبارالاخیار ص ۱۷۴۔

(۵) نزہۃ ج ۳۔ (۶) گم گشتہ حالات اجودھیا ص ۳۵۔

پچاس سال پہلے کی اطلاع ہے۔ اب خدا ہی کو معلوم ہے کہ نشانات محفوظ ہیں یا نہیں؟

(۲۰) شیخ علاء الدین حسینی اودھی

مولانا سید علاؤ الدین اودھی سید شریف احمد ماہر و بغدادی کی اولاد سے اور حسینی سیّد تھے۔ علم و صلاح سے متصف صاحبِ ذوق و حال بزرگ تھے۔ ہندوستانی سنگیت اور موسیقی کے ماہر تھے۔ شیخ عبد السلام بن سعد الدین بجنوری کے مرید و خلیفہ تھے۔ فارسی زبان کے بڑے اچھے شاعر تھے۔ نمونہ کے طور پر ایک غزل کے چند اشعار درج ہیں۔

ندانم آں گل خنداں چہ رنگ و بو دارد　　کہ مرغ ہر چمنے گفتگوئے او دارد
بجستجوئے نیابد کسے مراد ولے　　کسے مراد بیابد کہ جستجو دارد
نشاط بادہ پرستاں بہ منتہا برسید　　ہنوز ساقئ ما بادہ درسو دارد
حدیثِ عشقِ تو تنہا نہ من ہمی گویم　　کہ ہر کہ ہست ازیں گونہ گفتگو دارد
متاعِ دل بکف دلبرے بدہ تو علا　　کہ ایں متاعِ گرانمایہ او نکو دارد

آپ کے خلفاء میں سیّد علی تلہری اور صاحبزادے سید ماہ رَو بطورِ خاص شہرت کے مالک ہوئے۔ باختلافِ روایت ۹۶۸ھ یا ۹۷۷ھ میں وفات پائی۔(۱)

اجودھیا کے مشہور قبرستان ''خرد مکہ'' میں محوِ خوابِ راحت ہیں۔ اسی میں آپ کے صاحبزادے سیّد ماہ رَو اور دیگر اہلِ خاندان و متعلقین کے مزارات ہیں۔ سید علاؤ الدین کے مزار کے سرہانے ایک سیاہ پتھر نصب تھا، مگر ۶۰/۷۰ سال کا عرصہ ہوا، کچھ نامعلوم افراد رات کو وہ پتھر وہاں سے اُکھاڑ لے گئے اور اسی کے ساتھ بہت سی قبریں بھی کھود ڈالیں۔ بعد میں بذریعہ پولیس تحقیقات کرائی گئی مگر کچھ سُراغ نہ ملا کہ کن لوگوں کی یہ حرکت تھی۔ اور کن اغراض کے تحت ایسی مذموم حرکت کی گئی(۲)

''خرد مکہ'' قبرستان پرمودین کٹیا کے پورب ۳۰/۴۰ میٹر کے فاصلہ پر اس مشہور

---

(۱) نزہۃ الخواطر ج۴ ص۲۳۲۔

(۲) گم گشتہ ص۱۷ (۵)

مقبرہ (جس میں بڑے بڑے علماء، اولیاء، عباد، زہاد مدفون ہیں) کی ناگفتہ بہ حالت کو ڈاکٹر دبیران الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

> ''گندگی اور غلاظت سے بھرا ہوا ایک باغ ہے جس میں خودرو جنگلی پودے اُگے ہوئے ہیں۔ کبھی یہ باغ ایک وسیع احاطہ کے اندر رہا ہوگا۔ کیونکہ قدیم ترین چہار دیواری کے باقیات اب بھی جگہ جگہ موجود ہیں۔ باغ کا یہی احاطہ ''خرد مکہ'' کہلاتا چلا آرہا ہے۔ انیسویں صدی کے آخر تک اس میں ہزاروں پختہ و خام قبریں موجود تھیں۔ جس زمانہ میں ''راجہ درشن سنگھ'' نے نالا کھدوایا بہت سی قبریں اس نالہ میں آکر تلف ہوگئیں۔ اس کے علاوہ بہت سی قبریں فیض آباد، گھورکھپور روڈ بننے کے وقت سڑک اور فٹ پاتھ میں آکر تلف ہوگئیں۔'' (۱)

(۲۱) شیخ عاشقِ شاہ اودھی

شیخ غلام المعروف بہ عاشق شاہ اجودھیا کے علمائے عظام و مشائخِ کبار میں سے تھے۔ ابتداء میں علماء کی روش پر درس و تدریس میں مشغول رہے۔ بعد میں جاذب حقیقی نے اپنی طرف کھینچا تو علمی مشغلہ سے دل اُچاٹ ہوگیا اور مرشد کامل کی تلاش میں گھر سے نکل پڑے۔ گھومتے پھرتے شیخ عبدالباسط الہ آبادی متوفی ۱۱۹۶ھ کی خدمت میں پہنچ گئے۔ شیخ عبدالباسط پر ان کی نظر جیسے ہی پڑی ہوش و حواس کھو بیٹھے۔ اور وارفتگی کے عالم میں بدن کے کپڑے پھاڑ ڈالے۔ بعد میں افاقہ ہوا تو شیخ الہ آبادی نے انھیں اجودھیا واپس لوٹ جانے کا حکم دیا۔ چنانچہ حکم کے مطابق واپس تو آگئے مگر شیخ کی نگاہ کیمیا اثر نے دل کی دنیا ہی بدل دی تھی۔ وطن مالوف میں سکون نہ ملا اور جملہ اسباب و مال و متاع نذر فقراء و مساکین کر کے دیوانہ وار شیخ الہ آبادی کی خدمت میں حاضر ہوگئے۔ اور مسلسل کئی سال تک صحبت میں رہ کر ریاضتِ شاقہ میں مشغول رہے۔ تا آنکہ شیخ نے خلافت اور عاشق شاہ

---

(۱) شہر اولیاء ص ۲۰۷/ ۲۰۸ مع اختصار۔

کے خطاب سے نواز کرا جودھیا رخصت کیا۔ کثرتِ ذکر کی وجہ سے جذب وسکر کی کیفیت پیدا ہوگئی تھی۔ اس لئے مدتوں سرگشتہ اور اِدھر اُدھر گھومتے۔ بالآخر اس کیفیت میں کچھ کمی آئی تو وطن عزیز واپس آئے اور محلّہ کاغذی ٹولہ کی مسجد میں فروکش ہوگئے۔ کسی معتقد نے مسجد کے غسلخانہ کے اوپر ایک حجرہ تعمیر کرادیا تھا۔ اسی حجرہ میں زندگی کے بقیہ دن گذار دیئے۔ مریدین وطالبین کی اصلاح وتربیت کے ساتھ مثنوی مولانا روم اور دیوان حافظ شیرازی کا درس بھی دیتے تھے۔

نواب آصف الدولہ کے عہد نوابی ۱۲۱۲ھ میں وفات پائی۔ محلّہ کاغذی ٹولہ میں معماروں کے امام باڑہ کے متصل آپ کی قبر ہے۔ اسی مناسبت سے مولوی سیّد محمد علی اودھی نے مصرعہ تاریخِ وفات یوں کہا ہے:-

آستانِ امام شد جائش

۱۲ ۱۲

مزار کی عالیشان عمارت اب بھی اچھی حالت میں موجود ہے۔ (۱)

☆ ☆ ☆

---

(۱) فصول مسعودیہ ص ۱۳۴ و گم گشتہ حالات ص ۴۸۔

شیخ محمد بن عیسیٰ تاج جونپوری

شرقی عہد ۸۰۴ھ سے مغل بادشاہ محمد شاہ ۱۱۳۱ھ کے زمانہ تک دارالخیو رشہر جونپور علماء ومشائخ کا مرکز رہا ہے۔ جون پور کی علمی تاریخ میں پچاسوں مدرسوں خانقاہوں کا پتہ چلتا ہے جن میں بیک وقت سیکڑوں علماء وفضلاء اور مشائخ تعلیم و تزکیہ کی خدمت میں مصروف رہتے تھے۔

(۱) ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی متوفی ۸۴۸ھ (۲) قاضی نظام الدین جونپوری مرتب فتاویٰ ابراہیم شاہیہ متوفی ۸۵۸ھ (۳) شیخ ابوالفتح جونپوری متوفی ۸۵۸ھ (۴) شیخ محمد بن عیسیٰ جونپوری ۸۵۸ھ (۵) ملاالہ داد جونپوری محشی ہدایہ ومدارک وغیرہ متوفی ۹۲۳ھ (۶) شیخ قطب بینائے دل جونپوری متوفی ۹۲۵ھ (۷) شیخ معروف جون پوری ۹۴۰ھ (۸) شیخ بہاء الدین چشتی متوفی ۹۴۷ھ (۹) میر سید عبدالاول محدث جون پوری متوفی ۹۶۲ھ (۱۰) شیخ مبارک جونپوری متوفی ۹۸۳ھ (۱۱) شیخ عبدالقدوس قلندر جونپوری متوفی ۱۰۵۲ھ (۱۲) استاذ الملک ملا محمد افضل جونپوری متوفی ۱۰۶۲ھ (۱۳) ملامحمود جونپوری مصنف شمس بازغہ وغیرہ متوفی ۱۰۶۲ھ (۱۴) شیخ دیوان محمد رشید جونپوری متوفی ۱۰۸۰ھ (۱۵) قاضی خوب اللہ محدث متوفی ۱۱۰۰ھ (۱۶) مفتی محمد جمیل جونپوری از مرتبین فتاویٰ عالمگیری متوفی ۱۱۲۳ھ (۱۷) ملاحفیظ جونپوری متوفی ۱۱۲۸ھ وغیرہ اپنے اپنے دور میں یہاں کے مشائخ کبار اور علماء عظام میں گذرے ہیں۔ جن میں الشیخ، الامام، العالم الکبیر، العلامہ محمد بن عیسیٰ حنفی جونپوری اپنے معاصر علماء ومشائخ میں خاص شہرت اور مقام ومرتبہ کے مالک ہیں۔ آج کی بزم شرقی میں سے انھیں کا تذکرہ زیر عنوان ہے۔

شیخ محمد کے تذکرہ کے ماخذ و مراجع

(۱) ہماری تحقیق میں ان کے سب سے قدیم تذکرہ نگار خود انھیں کے پڑپوتے شیخ مصطفیٰ جونپوری ہیں جو عہد اکبری میں جونپور کے علماء و امراء میں خاص اہمیت کے حامل تھے۔ شہنشاہ اکبر نے انھیں دہلی بلا کر بڑی عزت افزائی کی اور قاضی القضاۃ کا منصف جلیل عطا کر کے لاہور بھیجا، لیکن یہ اکبر کی دینی بے اعتدالیوں سے بددل ہو کر جج کی رخصت پر جونپور چلے آئے اور پھر کسی عہدہ کو قبول نہ کیا۔

انھیں شیخ مصطفیٰ نے اپنے اسلاف کے حالات میں ایک رسالہ لکھا تھا جس میں اپنے پردادا شیخ محمد بن عیسیٰ جونپوری کے سوانح تفصیل سے لکھے ہیں جو بعد کے تذکروں کے مقابلہ میں زیادہ مفصل اور مستند ہے لیکن یہ رسالہ اب بالکل نایاب ہے اس لئے براہ راست اس سے استفادہ نہیں کیا جاسکا ہے البہ شیخ یٰسین بنارسی نے مناقب العارفین میں اس رسالہ کے اکثر حصہ کو بعینہٖ نقل کر دیا ہے، زیر نظر مقالہ میں زیادہ تر مواد شیخ یٰسین کی اسی کتاب سے ماخوذ ہے۔

(۲) اخبار الاخیار: شیخ عبدالحق محدث دہلوی متوفی ۱۰۵۲ھ نے شیخ جونپوری کا تذکرہ اخبار الاخیار کے ص ۱۸۶ پر کیا ہے، مگر اس میں ان کی ولدیت بیان کرنے میں محدث دہلوی سے چُوک ہوگئی ہے جس کی تفصیل آئندہ آرہی ہے۔

(۳) مناقب العارفین قلمی: مولفہ شیخ یٰسین بنارسی متوفی ۱۰۷۶ھ خلیفہ شیخ طیب بنارسی، بزرگانِ چشت کے ذیل میں مؤلف نے شیخ جونپوری کے حالات شیخ مصطفیٰ جونپوری کے حوالہ سے بالتفصیل درج کیے ہیں، یہ قلمی کتاب شیخ طیب بنارسی اور ان کے خانوادہ کے حالات میں نہایت مستند اور گرانقدر ذخیرہ ہے۔

(۴) گنج ارشدی: یہ شیخ محمد ارشد بن شیخ دیوان محمد رشید جونپوری المتوفی ۱۱۱۳ھ کے ملفوظات کا مجموعہ ہے جسے ان کے خلیفہ شیخ شکر اللہ نے جمع اور شیخ غلام محمد رشید بن شیخ محبّ الدین بن شیخ ارشد نے مرتب کیا ہے۔

دیوان محمد رشید کے مشائخ کے ضمن میں شیخ جونپوری کا مختصر سا تذکرہ ہے۔

(۵) مرأۃ الاسرار قلمی: مصنف شیخ عبدالرحمٰن چشتی یہ ایک جامع تذکرہ ہے جس میں تصوف کے تمام مشہور سلسلوں کے قابل ذکر بزرگوں کے حالات مذکور ہیں، شیخ چشتی نے مرأۃ الاسرار کے ص ۴۲۵ پر شیخ جونپوری اور ان کے خلفاء کا ذکر کیا ہے۔

(۶) اعلام الانام لوفیات الاعلام قلمی: مولفہ شیخ محمد یحییٰ خوب اللہ الہ آبادی متوفی ۱۱۴۴ھ علماء وصوفیاء کے حالات میں یہ ایک اہم کتاب ہے جسے مؤلف علامّ نے سنین کی بجائے شہور کی ترتیب پر مرتب کیا ہے۔ ابھی تک یہ کتاب طبع نہیں ہوسکی ہے دائرہ اجمل شاہ الہ آباد کے کتب خانہ میں اس کا ایک قلمی نسخہ محفوظ ہے شیخ الہ آبادی نے ماہ ربیع الاول کے تحت ص ۳۵۲ پر شیخ جون پوری کے حالات درج کئے ہیں۔

ان کتابوں کے علاوہ بحر زخار قلمی، اخبار الاصفیاء قلمی، تجلی نور، تذکرۃ العلماء (جونپور نامہ) تذکرہ علماء ہند، نزہۃ الخواطر جلد سوم اور تاریخ شیراز ہند وغیرہ میں بھی شیخ جونپوری کا ذکر ہے مگر ان میں کوئی نئی بات نہیں ہے۔ تقریباً سب نے مذکورہ بالا کتابوں کی باتیں دہرائی ہیں البتہ تذکرۃ العلماء میں ایک نئی بات ہے جو اپنے موقع پر بیان ہوگی۔

اس مقالہ کی ترتیب میں مذکورہ بالا سبھی کتابوں سے مدد لی گئی ہے مگر اصل ماخذ کی حیثیت مناقب العارفین ہی رکھتی ہے۔

تاریخ ولادت اور نام ونسب

شیخ محمد بن قاضی عیسیٰ بن شیخ تاج الدین بن شیخ بہاء الدین کی ولادت ماہ صفر ۸۰۷ھ میں دہلی میں ہوئی سلسلہ نسب اس سے زیادہ معلوم نہیں ہوسکا، البتہ صاحب نزھۃ الخواطر نے منہج الانساب کے حوالہ سے صدیقی النسل ہونے کی صراحت کی ہے۔

اس موقع پر ایک بات خاص طور سے قابل توجہ ہے کہ محدث دہلوی نے اخبار الاخیار میں شیخ جونپوری کے والد کا نام ''احمد'' تحریر فرمایا ہے بعد کے بہت سے تذکرہ نویسوں نے ان کے بیان پر اعتماد کرتے ہوئے اسی کو لے لیا ہے لیکن گنج ارشدی، مناقب

العارفین اور نزھۃ الخواطر وغیرہ میں والد کا نام ''قاضی عیسیٰ'' مرقوم ہے اور یہی صحیح ہے۔ شیخ احمد شیخ جونپوری کے چھوٹے بھائی ہیں نہ کہ والد جیسا کہ آیندہ معلوم ہوگا۔

شیخ جونپوری کے آباء واجداد دہلی کے مشاہیر علماء میں شمار ہوتے تھے، جدامجد شیخ تاج الدین معلم الثقلین کے لقب سے مشہور تھے، کیونکہ ان کے درس میں انسانوں کے ساتھ جنّات بھی حاضر ہوتے تھے۔

والد بزرگوار قاضی عیسیٰ حضرت مخدوم جہانیان جہانگشت میر سید جلال الدین بخاری متوفی ۷۸۵ھ کے مرید وخلیفہ اور عالی مرتب صوفی تھے۔ انھوں نے وصیت کی تھی کہ مرنے کے بعد مجھے حجرہ کے دَروازہ پر جہاں طلبہ اپنی جوتیاں نکالتے ہیں دفن کیا جائے، حسب وصیت انھیں اسی مقام پر دفن کیا گیا۔

اس وصیت سے اندازہ ہوتا ہے کہ قاضی عیسیٰ کے دل میں علم وعلماء کی کتنی عظمت وعزت تھی۔(۱)

دہلی سے جونپور آمد

فتنۂ تیموری کے وقت دہلی جو کبھی رشکِ بغداد اور غیرت مصر تھی۔ جہاں چپہ چپہ پر خانقاہیں اور قدم قدم پر درس گاہیں تھیں ایسی تباہ وبرباد ہوئی کہ دُور دُور تک خاک اڑنے لگی، علمی وروحانی محفلیں اُجڑ گئیں گھر کے گھر بے نور وبے چراغ ہوگئے۔ اسی ہنگامۂ رست وخیز میں قاضی عیسیٰ نے اپنے دونوں بیٹوں شیخ محمد وشیخ احمد کو ہمراہ لے کر دہلی کو بصد حسرت ویاس خیر باد کہا اور جونپور کا رُخ کیا جو اس وقت تاجدار سلطنت شرقیہ ابراہیم شاہ شرقی متوفی ۸۴۴ھ کے حسن انتظام، علم دوستی اور علماء نوازی کی بناء پر مرجع ارباب کمال بنا تھا، صاحب مناقب بحوالہ رسالہ مصطفائیہ لکھتے ہیں۔

> وے در ایام فتور فعل از حضرت دہلی بجانب جونپور آمد واقامت فرمود
> حضرت مخدوم خواجہ محمد وخواجہ احمد ہر دو برادر ہمراہ وے آمدند (۲)

---

(۱) مناسب العارفین ص ۱۰۷۔ (۲) ایضاً۔

(بزمانہ ہنگامہ قاضی عیسیٰ دہلی سے جونپور چلے آئے اور یہیں اقامت پذیر ہو گئے ان کے ساتھ شیخ محمد و شیخ احمد دونوں بھائی بھی جونپور آئے)

محدث دہلوی رقمطراز ہیں:

> در فترتے کہ از آمدن امیر تیمور بصوب دہلی افتاد اکثرے اکابر بجونپور رفتند او نیز دَراں میاں بود۔ (۱)

(امیر تیمور کے حملہ سے دہلی میں جو ہنگامہ ہوا اس کی وجہ سے اکثر اکابر جونپور چلے گئے، ان جانے والوں میں قاضی عیسیٰ بھی تھے)

تعلیم و تربیت

محدث دہلوی کی تصریح کے مطابق اس وقت شیخ محمد جونپوری کی عمر آٹھ برس کی تھی۔ (۲)

شیخ جونپوری نے ایسے گہوارہ میں آنکھیں کھولیں جو علم و فضل کا مرکز تھا۔ آپ کے والد قاضی عیسیٰ صوفی المشرب ہونے کے ساتھ عالم، فقیہ اور قاضی بھی تھے، علاوہ ازیں اس زمانہ میں شاہ شرقی کی قدر شناسی اور علم پروری کی بدولت جونپور مدرسوں اور خانقاہوں کا ایک عظیم مرکز تھا۔ یہاں کی علمی و دینی سرگرمیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے ملا خیر الدین سیر الملوک کے حوالہ سے لکھتے ہیں۔

> از متعلقات الہ آباد شہریست کہ سلطان فیروز دہلوی آنرا در سنہ ہفت صد و ہفتاد و ہجری بنا نہادہ بہ جون پور موسوم ساختہ در عہد سلاطین شرقیہ دار السلطنت گردیدہ صد ہا مدارس و مساجد در شہر و حوالیٔ آں بنا یافتہ و علماء و فقراء از اقالیم دراں بلدہ رسیدہ (۳)

(متعلقات الہ آباد کا ایک شہر ہے جسے فیروز شاہ دہلوی نے ۷۷۲ھ میں جون پور کے نام سے آباد کیا۔ سلاطین شرقیہ کے عہد میں دار الحکومت ہو گیا۔ سیکڑوں مدرسے اور مسجدیں شہر اور اس کے اطراف میں تعمیر ہو گئیں اور علماء و مشائخ مختلف شہروں سے وہاں پہنچ گئے۔)

---

(۱) اخبار الاخیار ص ۱۸۶۔ (۲) ایضاً۔ (۳) تذکرۃ العلماء ص ۴۔

علم اور روحانیت کے اس دور شباب میں شیخ مخدوم محمد جونپوری پروان چڑھے خود ان کا گھر علم وفضل کا نمونہ تھا۔

شیخ جون پوری نے پہلے اپنے والد ماجد سے اکتساب فیض کیا۔ بعد ازاں ملک العلماء قاضی شہاب الدین متوفی ۸۲۹ھ کے حلقۂ درس میں شامل ہو گئے۔ اور خداداد صلاحیت کی بدولت تھوڑے ہی دنوں میں استاذ کے منظور نظر بن گئے یہاں تک کہ قاضی صاحب نے ان کی تعلیم کے لئے بطور خاص اصول بزدوی کی شرح لکھی۔

نزہۃ الخواطر میں ہے:

فکان القاضی یحبه حبا مفرطا صنف له شرحا علی اصول البزدوی الی مبحث الامر عند قرأته ذالك الکتاب۔ (۱)

> ”قاضی دولت آبادی آپ سے انتہائی محبت رکھتے تھے آپ کیلئے اصول بزدوی کی باب الامر تک شرح لکھی۔ جس وقت آپ اس کتاب کو پڑھ رہے تھے۔“

اس زمانہ میں علم ظاہری کے ساتھ تصوف میں کمال حاصل کرنا بھی ضروری سمجھا جاتا تھا۔ عام طور پر علماء مشائخ اور مشائخ علماء ہوتے تھے، خود شیخ کے والد زبردست صاحب تدریس عالم، فقیہ اور قاضی ہونے کے ساتھ مخدوم جہانیان جہاں گشت کے مرید وخلیفہ تھے، اس لئے طلب علم ہی کے زمانہ سے شیخ کا دل سلوک وطریقت کی طرف مائل تھا۔ اور نوعمری ہی میں شیخ ابوالفتح جونپوری متوفی ۸۵۸ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو گئے تھے لیکن تعلیم وتحصیل میں انہماک کی وجہ سے طریقہ صوفیہ کے اخذ وکسب کی جانب پوری توجہ نہ ہو سکی اس لئے تعلیم سے فراغت کے بعد حسب منشاء ادھر متوجہ ہوئے اور شیخ فتح اللہ اودھی متوفی ۸۲۱ھ سے بیعت ہو کر عبادت وریاض میں لگ گئے۔

تجلی نور میں ہے۔

در صغر سنی اولاً حضرت شیخ ابوالفتح دریافت سپس از حضرت شیخ فتح اللہ اودھی

---

(۱) نزہۃ الخواطر ج ۳ ص ۱۵۲۔

ارادت آوردو بیعت نمود۔ (۱)

بچپن میں پہلے شیخ ابوالفتح کی خدمت میں پہنچے بعد ازاں شیخ فتح اللہ اودھی کے حلقۂ ارادت میں شامل ہوئے اور بیعت کی۔

کثرت ریاضت اور اس کے اثرات

شیخ اودھیؒ کی صحبت میں نہ جانے کیا تاثیر تھی کہ بچپن کی دبی ہوئی چنگاری شعلہ جوالہ بن کر بھڑک اٹھی اور شیخ کی پوری زندگی اسی کی نذر ہوگئی، سارے مشاغل وتعلقات سے یکسو ہوکر عبادت وریاضت میں مشغول ہوگئے اور اس میں انہماک اس درجہ بڑھا کہ بارہ برس کی طویل مدّت میں نہ زمین سے پیٹھ لگایا اور نہ نماز پنج وقتہ کے علاوہ حجرہ سے باہر قدم نکالا، کثرت مراقبہ سے گردن کی ہڈیاں اوپر کو نکل آئیں اور ٹھوڑی سینہ سے لگ گئی تھی۔

مولانا عبدالحئیؒ حسنی لکھتے ہیں۔

واخذ الطريقة الشيخ فتح الله اودهي وجاهد في الله حق جهاده حتى قبل ان ظهره لم يمس الارض اثنتي عشر سنة(۲)

سلوک کی تعلیم حضرت شیخ فتح اللہ اودھی سے حاصل کی اور اس راہ میں جدوجہد کا حق ادا کردیا۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ بارہ سال تک لیٹنے کی نوبت نہ آئی۔

مراقبہ اور ذکر وفکر کی کثرت نے عشق ومحبت کی ایسی کیفیت پیدا کردی کہ اسی کی حلاوت اور لذت میں شیخ ہر آن سرمست اپنے گردوپیش سے بالکل بےخبر رہتے تھے بیان کرنے والوں نے تو یہاں تک بیان کیا ہے کہ شیخ کے حجرہ کے متصل ایک درخت اُگ آیا تھا مگر مدّت دراز تک انھیں اس کا علم نہ ہوسکا۔ ایک دن اتفاقاً اس کی چند پتیاں ہوا سے اُڑ کر حجرے میں آگئیں تو حیرت سے دریافت کرنے لگے یہ پتیاں کہاں سے آگئیں۔ بتانے والوں نے بتایا کہ دروازہ کے قریب جو درخت ہے یہ اسی کی پتیاں ہیں تو نہایت

---

(۱) تجلی نور ج۲ ص۱۵۲۔ (۲) نزہۃ الخواطر ج۳ ص۱۵۲۔

متعجب ہو کر فرمایا کیا یہاں کوئی درخت ہے۔‘‘ (۱)

شانِ استغنا

شیخ جونپوری نبی کریم ...... کے اس فرمان پر شدت سے عامل تھے جس میں علماء اور ارباب فضل وکمال کو امراء واغنیاء کے یہاں بلاضرورت آمد ورفت سے منع کیا گیا ہے۔ اوران سے تعلق رکھنے کو علماء کے حق میں فتنۂ عظیم بتایا گیا ہے۔

ان کا معمول تھا کہ نہ خود کسی امیر ورئیس کے یہاں جاتے اور نہ اسے موقع دیتے کہ وہ آپ کی مجلس میں حاضر ہو۔ چنانچہ ایک بار سلطان ابراہیم شاہ شرقی نے ازراہ نیازمندی کچھ نقد اور خلعت خدمت میں پیش کیے تو بکمال استغناء اسے واپس کردیا اور یہ رباعی پڑھی۔

من دلق خود با اطلس شاہاں نمی دہم
من فقہ خود با ملک سلیماں نمی دہم
از رنج فقر در دل گنج کہ یافتم
ایں رنج را براحتِ سلطاں نمی دہم

شیخ کے استغناء کے سلسلے میں شیخ مصطفیٰ جونپوری نے ایک عجیب وغریب واقعہ لکھا ہے۔ لکھتے ہیں کہ ایک دن سلطان حسین شاہ شرقی نے شیخ کے صاحبزادہ شیخ حبیب اللہ سے نہایت اصرار کے ساتھ یہ درخواست کی کہ مخدوم زادہ اگر کچھ زمین قبول فرمالیں تو اہل خانقاہ کے صرف وخرچ میں آسودگی وآسائش ہوجاتی۔ شیخ حبیب اللہ نے کوئی جواب نہ دیا اور خاموش رہے، سلطان حسین ایک دیہات کی جاگیر کا پروانہ خانقاہ کے کسی خادم کو دے کر چلا گیا، کچھ دنوں کے بعد جاگیر کی پیداوار لے کر اس گاؤں کے کاشتکار خانقاہ میں حاضر ہوئے دیہات کے لوگ آداب خانقاہ سے ناواقف اس لئے کچھ شور وشغب ہوگیا، شیخ کے کان میں اس کی آواز پہنچی تو پوچھا کیا ہنگامہ ہورہا ہے کسی نے عرض کیا ’’مخدوم زادہ کی جاگیر سے غلہ آیا ہے اسے وزن کیا جارہا ہے‘‘ یہ سنتے ہی شیخ کا تیور بدل گیا، غضب

---

(۱) تجلی نور ص ۲۳۔

ناک ہوکر فرمایا۔

حبیب اللہ ایں را نہ خورد خلیفہ اور خواہد خورد طعام خود می رسد حبیب اللہ ایں را چرا قبول کرد و ساکت ماند۔

حبیب اللہ اسے نہ کھا سکے گا بلکہ اس کا قائم مقام کھائے گا طعام تو خود سے پہنچتا ہے حبیب اللہ نے اسے کیوں قبول کرلیا اور خاموش رہا۔

انجام کار شیخ نے جو فرمایا تھا وہی ہوا، اس واقعہ کے تیسرے دن شیخ حبیب اللہ کا انتقال ہوگیا اور اس غلہ کو وہ نہ کھا سکے۔ (۱)

شیخ اور تعمیر مسجد جامع جونپور

شاہان شرقیہ کو شیخ سے غایت درجہ عقیدت وارادت تھی وہ ہمہ وقت ان کی خدمت کو سرمایۂ سعادت سمجھتے تھے، اگرچہ شیخ اس کا موقع ہی نہ دیتے تھے... شیخ کی خانقاہ کے قریب کوئی جامع مسجد نہ تھی اس لئے جمعہ وعیدین کی ادائیگی کیلئے خانقاہ سے کافی فاصلہ پر محلّہ خالص پورہ کی مسجد میں جانا پڑتا تھا، آخر عمر میں ضعف ونقاہت کی وجہ سے دشواری پیش آنے لگی تو سلطان محمود شرقی کو شیخ کی رضاء حاصل کرنے کا ایک اچھا موقع ہاتھ آ گیا۔ حاضر خدمت ہوکر عرض کیا کہ اگر حضرت پسند فرمائیں تو خانقاہ سے قریب ہی ایک جامع مسجد تعمیر کرادی جائے۔ شیخ نے فرمایا ''خوب است'' چنانچہ ۸۴۲ھ میں ان کے مکان سے قریب مسجد کی بنیاد رکھ دی گئی اور دس سال میں تعمیر مکمل ہوگئی۔ مسجد جامع الشرق تکمیل کی تاریخ ہے۔ (۲)

مسجد کے مکمل ہوجانے کے بعد شیخ اسی میں جمعہ وعیدین کی نماز ادا کرنے لگے۔ آج کل یہ مسجد ''بڑی مسجد'' کے نام سے مشہور ہے اور سلاطین شرقیہ کی عظمت رفتہ کی ایک عظیم یادگار ہے۔

---

(۱) مناقب العارفین ص ۱۰۸۔

(۲) تذکرۃ العلماء، ص ۳۹۔

درس وتدریس

شیخ کی زندگی کا روحانی پہلو اتنا پرکشش اور نمایاں رہا کہ تذکرہ نگاروں نے عام طور سے ان کی اسی حیثیت کا ذکر کیا ہے، حالانکہ وہ دوسرے مشائخ چشت کی طرح ظاہری علوم کا درس بھی دیتے تھے۔

ملا خیر الدین لکھتے ہیں۔

> درحضور پدر بتدریس طلبۂ علوم پرداخت وغوامض مسائل را دراندک تأمل منکشف ساخت۔ (۱)
>
> اپنے والد کی موجودگی میں طلبہ کو درس دیتے تھے اور دقیق مسائل علمیہ کو ادنیٰ غور وفکر سے حل کردیا کرتے تھے۔

لیکن ان طلبۂ علوم میں سے دو کے علاوہ کسی اور کا نام باوجود تلاش بسیار کے معلوم نہ ہوسکا۔ ان میں ایک شیخ بہاء الدین عمری جونپوری ہیں جنھوں نے جملہ علوم شرعیہ کی تحصیل وتکمیل آپ ہی سے کی، دوسرے شیخ بدہ حقانی ہیں جن کے بارے میں شیخ یٰسین بنارسی لکھتے ہیں، درخدمت مخدوم بعضے کتب تحصیل نمود۔ (۲)

مشائخ کی تذکرہ نگاری کا یہ پہلو ہمیشہ سے بہت افسوسناک رہا ہے کہ ان کے روحانی درجات ومراتب اور کرامات وتصرّفات کے انبار میں ان کی علمی زندگی دب کے رہ گئی ہے کچھ یہی معاملہ شیخ جون پوری کے ساتھ بھی پیش آیا۔ ان کے جملہ تذکرہ نگار اُن کے روحانی فضل وکمال کو تو بڑی تفصیل سے بیان کرتے ہیں، مگر ان کے علمی مقام ومرتبہ کی جانب کسی نے توجہ نہ دی۔

تصنیف وتالیف

شیخ کے کسی تذکرہ نویس نے ان کی کسی تصنیف کا تذکرہ نہیں کیا ہے اور شیخ کے مجموعی

---

(۱) تذکرۃ العلماء، ص۲۱۔ (۲) مناقب العارفین ص۱۰۴۔

حالات بھی یہی بتاتے ہیں کہ انھیں اس جانب توجہ مبذول کرنے کی نوبت نہ آئی ہوگی، مگراس کے علی الرغم ملا خیرالدین الہ آبادی نہ جانے کہاں سے لکھتے ہیں ’’او صاحب تصانیف کثیرہ است‘‘ یعنی بہت سی کتابوں کے مصنف تھے اور صاحب بحر ذخار نے ان تصانیف کثیرہ کی تعداد ’’یک صد‘‘ بتائی ہے مگر یہ تصریح محل نظر ہے کیونکہ اگر شیخ کی کوئی تصنیف ہوتی تو کم ازکم ان کے پر پوتے مصطفیٰ جون پوری اس کا ضرور تذکرہ کرتے جبکہ انھوں نے شیخ کی معمولی سے معمولی خدمت کو بھی ذکر کیا ہے، واللہ اعلم۔

قبول عام

شیخ کو اللہ تعالیٰ نے بڑی مقبولیت عطا کی تھی اور ہر طبقہ کے لوگ ان کے فضل وکمال کے معترف تھے، محدث دہلوی لکھتے ہیں:

> وھو ممن یتفق علی ولایتہ وعظمتہ و کرامتہ.(۱)

شیخ جونپوری ان بزرگوں میں سے ہیں جن کی ولایت، عظمت اور کرامت پر سب کا اتفاق ہے، اورتو اور خود ان کے استاذ اجل ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی بھی آپ کی اس حیثیت کے نہ صرف قائل تھے بلکہ اپنے آڑے وقتوں میں طالبِ توجہ بھی ہوتے تھے، صاحبِ گنج ارشدی لکھتے ہیں کہ ایک بار قاضی صاحب کا ملا خیراتی سے دربارِ شاہی میں مناظرہ طے پا گیا قاضی صاحب نے آخر عمر میں درس و تدریس کا مشغلہ کچھ کم کر دیا تھا اس لئے انھیں تشویش ہوئی تو خانقاہ میں حاضر ہوئے اور کامیابی کی دعا چاہی شیخ نے عرض کیا آج رات کو اپنے کتب خانہ کی جس کتاب پر پہلے نظر پڑے اسی کا مطالعہ فرمائیں انشاء اللہ فتح وکامرانی نصیب ہوگی۔ شیخ کی تجویز کے مطابق قاضی صاحب کتب خانہ پہنچے تو ان کی نظر اپنی ہی تصنیف کردہ کتاب ’’الارشاد فی النحو‘‘ پر پڑی، قاضی صاحب نے اسی کا مطالعہ کیا اور بفضلہٖ تعالیٰ شیخ کی دعا کی برکت سے کامیاب ہوئے۔

---

(۱) اخبار الاخیار ص ۱۸۶۔

وفات ومدفن

شیخ جونپوری کی تاریخ وفات میں تذکرہ نگاروں کا سخت اختلاف ہے۔ شیخ مصطفیٰ نے اپنے رسالہ میں ۱۴؍ربیع الاول ۸۷۰ لکھا ہے۔ صاحب مناقب اور گنج ارشدی نے اسی قول کو ترجیح دیا ہے۔(۱) لیکن اس کے برخلاف صاحب تجلی نور لکھتے ہیں کہ محدث دہلوی نے اخبار الاخیار میں سن وفات ۸۴۵ھ درج کیا ہے، میرے سامنے اخبار الاخیار کا جو نسخہ ہے اس میں سن وفات مرقوم نہیں ہے ممکن ہے زیدی مرحوم کے نسخے میں اس کی تصریح رہی ہو، اخبار الاصفیاء قلمی میں ۸۶۹ درج ہے۔(۲)

شیخ خوب اللہ الہ آبادی نے ۸۹۹ تحریر کیا ہے(۳) ان سبھی حضرات کی تحقیق سے اختلاف کرتے ہوئے مفتی غلام سرور لاہوری خزینۃ الاصفیاء میں ۹۱۱ لکھتے ہیں۔ ان سبھی اقوال میں صحیح شیخ مصطفیٰ اور گنج ارشدی ہی کا قول ہے، چنانچہ تاریخ اسلامیٔ ہند کے محقق مولانا عبدالحئی مرحوم نے نزہۃ الخواطر میں اسی قول کو لیا ہے۔

گذشتہ سطور میں معلوم ہو چکا ہے کہ سلطان محمد شاہ شرقی نے شیخ جونپوری کی رضا جوئی میں ۸۴۲ھ میں جامع الشرق کی بنیاد رکھی اور دس سال (۸۵۲ھ) میں تعمیر مکمل ہوئی اور شیخ نے نماز جمعہ وعیدین اسی نو تعمیر مسجد میں ادا کرنی شروع کردی اس لئے لازمی طور سے ۸۵۲ھ کے بعد تک شیخ کا موجود رہنا ضروری ہے۔ اس طرح ۸۴۵ھ والی روایت غلط ہو جاتی ہے، رہیں مفتی لاہوری اور شیخ الہ آبادی کی بیان کردہ روایتیں تو وہ اس لئے صحیح نہیں کہ شیخ مصطفیٰ نے اپنے رسالہ میں لکھا ہے کہ شیخ کے پرپوتے شیخ فضل اللہ بن شیخ نعم اللہ کی ولادت کے بعد شیخ جونپوری صرف چھ ماہ بقید حیات رہے اور شیخ فضل اللہ کی پیدائش ۸۶۹ھ میں ہوئی ہے۔

---

(۱) مناقب العارفین ص ۱۰۹۔

(۲) اخبار الاصفیاء قلمی، ص ۷۶۔

(۳) اعلام الانام لوفیات الاعلام قلمی، ص ۳۵۲۔

مقبرہ جامع الشرق (بڑی مسجد) کے قریب محلّہ ارزن میں بعمارت پختہ آج بھی موجود ہے اور زیارت گاہِ خلائق ہے، مقبرہ اور خانقاہ کی پختہ سنگین تعمیر ''جنید برلاس'' نے کرائی تھی جو عہد بابری میں جون پور کا حاکم تھا، اس کے بعد محمد شاہ کے دورِ حکومت میں شیخ ہی کے خانوادہ کے ایک بزرگ شیخ محمد ماہ جونپوری نے اس کی شکست و ریخت کی مرمت کرائی، مقبرہ کے صدر دروازہ پر اب تک یہ عبارت موجود ہے ''خاکروب ایں درگاہ محمد ماہ''۔

شیخ کے چند ملفوظات

شیخ کے چند ملفوظات درج کئے جاتے ہیں جو حقیقتاً رُوحِ تصوّف اور خلاصۂ سلوک ہیں۔ ان سے شیخ کے اندازِ تربیت کا بھی کچھ اندازہ ہوگا۔

(۱) اپنے متعلقین سے بتاکید فرماتے رہتے تھے ہمہ وقت اللہ کو حاضر و ناظر جانو اور تدریجاً اس بات کی کوشش کرو کہ "اَلَمْ یَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰہَ یَریٰ" (کیا وہ نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ سب کچھ دیکھ رہے ہیں) کا تصور دل میں اس طرح جاگزیں ہو جائے کہ ایک لمحہ بھی دل اس خیال سے غافل نہ ہو۔

(۲) اوراد و اشغال سے مقصود اصلی یہ ہے کہ ظاہراً و باطناً اللہ تعالیٰ سے تعلق قائم ہو جائے اور دل میں یہ یقین راسخ ہو جائے کہ انه ارحم به من نفسه وانصح له من نفسه ومن الناس اجمعين، یعنی اللہ تعالیٰ میری ذات پر خود مجھ سے زادہ مہربان ہے اور خود مجھ سے اور تمام لوگوں سے زیادہ میرا خیر خواہ ہے۔

(۳) سعی اس بات کی ہونی چاہئے کہ قلب یادِ حق میں اور قالب کارِ حق میں مشغول رہے۔

(۴) جو کام بھی کیا جائے صرف اللہ کی رضا کیلئے کیا جائے اور ہر امر میں فعالِ حقیقی اسی کو سمجھا جائے۔(۱)

☆ ☆ ☆

---

(۱) مناقب العارفین، ص ۱۱۸۔

قاضی خاں ظفر آبادی

ظفر آباد کی مختصر تاریخ

ظفر آباد جون پور سے ٦ میل پورب اور دکھن میں واقع ہے۔ یہ قدیم اور تاریخی مقام ایک زمانہ میں علماء اور مشائخ کا مرکز رہ چکا ہے۔

اس کا اصل اور قدیم نام منہج تھا۔ جب مسلمانوں کی آمد اور فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا اور اس علاقہ پر ان کا قبضہ ہو گیا اس وقت سے منہج کے بجائے ظفر آباد کے نام سے مشہور رہوا۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ۵۸۹ھ میں سلطان شہاب الدین غوری کے نائب السلطنت قطب الدین ایبک نے گوالیار، بدایوں اور کالپی وغیرہ کی تسخیر کے بعد منہج پر حملہ کیا اس وقت یہاں کا راجہ اودے پال نامی ایک راجپوت تھا۔ اودے پال، ایبک کے مقابلہ میں ٹھہر نہ سکا اور اپنے خاندان کو لے کر مارواڑ کی جانب بھاگ گیا۔

ایبک فاتحانہ شہر میں داخل ہوا اور چند دن یہاں قیام کر کے انتظامات درست کیے اور اپنی جانب سے اودے پال کے وزیر جیت سنگھ کو شہر کا حاکم بنا کر خود دلی چلا گیا۔ اس تاریخ سے منہج اسلامی قلمرو میں شامل ہو گیا۔ لیکن عملاً حکومت جیت سنگھ اور اسکی اولاد کے قبضے میں رہی، یہ لوگ برابر سالانہ خراج دہلی بھیجتے رہے اور اپنی نیازمندی اور ماتحتی کا اقرار کرتے رہے۔

لیکن جیت سنگھ کی پانچویں پشت میں سکیٹ سنگھ نامی ایک ایسا راجہ ہوا جو ناعاقبت اندیش ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت متعصب بھی تھا۔ اس نے ایک طرف تو شاہان دہلی کی برتری کا انکار کر کے خود مختاری کا اعلان کر دیا اور دوسری جانب جو مسلمان اس کی حدود سلطنت میں تھے ان کے درپئے آزار ہو گیا۔ اور نت نئے مظالم ان پر توڑنے لگا۔ اس کے

تعصب کی پیاس جب ان مظالم سے نہ بجھ سکی تو اعلان کر دیا گیا کہ کوئی مسلمان اس کی حدود سلطنت میں رہنے نہ پائے جو مسلمان اس اعلان کے بعد اپنی مجبوریوں سے ہجرت نہ کر سکے وہ اس کی جارحیت و بربریت کے ہاتھوں ہلاک و برباد ہوئے۔ (۱)

انھیں ایام میں جبکہ سکیٹ سنگھ مسلمانوں پر جبر وتشدد کے پہاڑ توڑ رہا تھا۔ شیخ سید(۲) اسدالدین آفتاب ہند المتوفی ۷۹۳ھ جو اس عہد کے اولیائے کاملین میں تھے اپنے شیخ مخدوم رکن الدین ملتانی المتوفی ۷۳۵ھ کے حکم سے دیار پورب میں مقیم تھے انھیں جب سکیٹ سنگھ کی زیادتیوں کی اطلاع ملی تو وہ مسلمانوں کی مدد اور انھیں ظلم وستم کے خونیں پنجے سے نجات دلانے کے لیے بے چین ہو گئے۔ اور فوراً ایک خط اپنے پیر ومرشد شیخ ملتانی کی خدمت میں ارسال کیا۔ انھیں راجہ کے ظلم وتعصب سے باخبر کر کے اجازت چاہی تا کہ منیھج جا کر مسلمانوں کی نصرت وحمایت کی جائے اور راجہ کو ظلم وعدوان سے روکا جائے۔

مخدوم آفتاب ہند نے اس سلسلہ میں جو مکتوب شیخ رکن الدین ملتانی کی خدمت میں بھیجا تھا اس مکتوب سے راجہ کی جارحیت اور مسلمانوں کی مظلومیت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ مکتوب ملاحظہ ہو۔

> کمترین بندگان اسد حسین حسینی اُمید وار برکت مخدوم مداللہ ظلال جلالہ برآں جملہ کہ ایں بندہ بعد آئے آداب بجماعت در دعا مشغول می ماند رجاءً کہ مددے درکار بندہ با خدائے تعالیٰ اسباب دینی ودنیوی ساختہ گرداند۔
>
> دیگر عرض می اُفتد چوں بندۂ بندگان بحکم آں مخدوم زمان در جہاد بنادیٰ

---

(۱) تاریخ ظفر آباد، ص ۱۹۔

(۲) شیخ مخدوم سید اسدالدین ۶۶۱ھ میں پیدا ہوئے کڑا مانک پور میں شیخ ضیاء الدین زاہد کڑوی سے علوم وفنون کی تعلیم بیس سال کی عمر میں مکمل کی، پھر ملتان جا کر شیخ رکن الدین ابوالفتح بن محمد ملتانی سے بیعت کی اور خلافت پائی۔ آپ فقہ اصول فقہ اور تفسیر میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ سبعہ کے قاری بھی تھے۔ ملتان سے واپس آ کر حضرت سلطان الاولیا شیخ نظام الدین بدایونی سے بھی کسب فیض کیا۔ ۱۶/ جمادی الاول ۷۹۳ھ میں بعارضۂ فالج وفات پائی۔ محلّہ سیدواڑہ ظفر آباد میں دریائے گومتی کے ساحل پر آپ کا مزار ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھئے.... تجلی نور ص ۱۱-۷، و چراغ نور، ص ۴۳-۳۸، ونزہۃ الخواطر، ص ۱۲، ج ۲۔

> مشغول وسرگرم ست لاکن معرکہ آرائی ختم نشد ہمدریں اثنا اخبار بدعت آثار راجہ منہیچ کہ درسخت قلب ظلم وکشت بے گناہان وبر مسلمانان انواع انواع بدعت وایذاء می رسانند وازخوف ورجاے یوم انتقام غافل است جماعت فقراء کہ درزاویۂ ایں بندۂ بندگان ماموراست بجوش وخروش می خواہد کہ براں ناعاقبت اندیش نعرۂ تکبیر بلند کنندالا انتظارایں معرکہ موقوعہ بدل گزیں اگر نوع مددرکارمابندۂ بندگان شودحق سبحانہ تعالیٰ آں سخت قلباں رابخلعت نور اسلام مزین کنادوجملہ مسلماناں رافیروزمندی رہادبمنہ وکرمہ (۱)

مخدوم آفتاب ہنداس وقت بنادیٰ (۲) میں مصروف تھےاس لیے شیخ ملتانی نے اپنے دوسرے خلیفہ مخدوم صدرالدین چراغ ہند (۳) المتوفی ۷۷۴ھ کوجواس وقت مرزاپور کے علاقہ میں ارشادوتبلیغ کےاہم کام میں مصروف تھے منہیچ کی جانب متوجہ ہونے کاحکم دیا۔

شیخ کے حکم پر مخدوم چراغ ہندمرزاپور سے منہیچ کے لیے روانہ ہوگئے۔ ان کے پہنچتے پہنچتے مخدوم آفتاب ہندی بنادیٰ سے فارغ ہوکرمنہیچ پہنچ گئے۔ دونوں بزرگوں نے معاملہ کی اہمیت ونزاکت کے پیش نظرشاہِ دلی غیاث الدین تغلق سے امداد کی فرمائش کی۔ ان حضرات کی طلب پرسلطان نے شاہزادہ ظفرخاں کی معیت میں چھ ہزار کالشکرمنہیچ روانہ کردیا۔ شہزادہ ظفرخاں نہایت تیز رفتاری سے شب وروزمنزلیں طے کرتے ہوئے بہت جلدمنہیچ کےقریب پہنچ کردریائے گومتی کےساحل پرخیمہ زن ہوگیا۔ (۴)

ظفرخاں کے آجانے کے بعدراجہ کوپیغام بھیجا گیا کہ سرکشی اورظلم وتشدد کے راستہ کو

---

(۱) تاریخ ظفرآباد بحوالہ مناقب درویشیہ قلمی ص ۲۱ وتاریخ شیراز ہندص ۹۲۵۔

(۲) بنادیٰ تحصیل سگڑی ضلع اعظم گڑھ کاایک مشہورموضع ہے۔

(۳) شیخ صدرالدین ظفرآبادی ۷۰۵ھ میں ملتان میں پیداہوئے اوراس دور کےاساتذہ سےحفظ قرآن اوردیگر علوم متعارفہ کی تکمیل کی پھراپنے ماموں زاد بھائی شیخ رکن الدین ملتانی سے بیعت کی اورخلافت پائی اورشیخ کے حکم سےتبلیغ دین کی غرض سے دیارپورب میں تشریف لائے۔ آپ نے سات بارپیدل حج کیا تھا۔ ۸/ذی قعدہ ۹۷۴ھ یا۹۹۰یا۹۹۵ میں وفات پائی۔ آپ کامدفن محلّہ شیخ واڑہ ظفرآبادمیں ہے۔ دیکھئے چراغ نورص ۴۷-۴۳ وتجلی نورص ۱۴-۱۱ونزھۃ الخواطرص ۶۰ ج ۲۔ (۴) تاریخ ظفرآباد، ص ۲۲۔

چھوڑ کر اطاعت قبول کرلو اور اگر یہ منظور نہیں ہے تو پھر جنگ کے لیے آمادہ ہو جائے۔ راجہ کی جانب سے اس پیغام کا کچھ جواب نہیں ملا جسے مسلمانوں نے اس کے کبر و نخوت اور آمادگیٔ جنگ پر محمول کیا اور شہر کا محاصرہ کرلیا۔

راجہ سکیٹ سنگھ اپنے اندر مقابلہ کی طاقت نہ پا کر قلعہ میں محصور ہو گیا۔ اور مسلمانوں کے پاس پیغام بھیجا کہ لڑنے کے بجائے ہمارے درمیان مذہبی مباحثہ ہو جائے اگر مسلمان اس مباحثے میں کامیاب ہو جائیں گے تو مجھے قبول اسلام سے کوئی عذر نہ ہوگا اور اگر بازی ہمارے ہاتھ رہی تو پھر مسلمان کو ہمارا شہر خالی کر دینا پڑے گا۔ مخدوم چراغ ہند نے راجہ کی تجویز تسلیم کر لی اور محاصرہ اٹھالیا۔

دونوں فریق کے لوگ جمع ہوئے اور مجلس مناظرہ منعقد ہوئی۔ فریقین کے نمائندوں نے اپنے اپنے دلائل پیش کیے۔ انجام کار میدان مسلمانوں کے ہاتھ رہا۔ راجہ کے مناظرین، اسلام کی حقانیت کے معترف ہو کر مسلمان ہو گئے۔ راجہ کو جب اس شکست کی خبر ملی تو وہ بدعہدی کرتے ہوئے اپنے خاندان کے افراد کو ہمراہ لے کر چپکے سے جان بچا کر مرزا پور بھاگ گیا۔ اور فوجیوں نے قلعہ کا دروازہ بند کرلیا۔ ناچار مسلمان پھر لڑنے پر مجبور ہوئے چونکہ راجہ فرار ہو چکا تھا اس لیے فوج زیادہ دیر تک مقابلہ میں قائم نہ رہ سکی اور معمولی مزاحمت کے بعد قلعہ کا دروازہ کھول دیا اور مسلمان فاتحانہ شہر میں داخل ہوئے۔(۱)

یہ جنگ ۷۲۱ھ میں پیش آئی ہے اور اس وقت سے یہ قدیم اور تاریخی شہر منہج کے بجائے ظفر آباد کے نام سے موسوم ہوا۔

اس سن کی تصدیق اس کتبہ سے ہوتی ہے جو حضرت چراغ ہند کے مقبرہ کے صدر دروازہ پر نصب ہے جس پر یہ اشعار کندہ ہیں۔

بعہد ملک ذوالقرنین ثانی — بنائے شہر را از عدل بانی
غیاث دین ودنیا بوالمظفر — سلیماں خاتم وجمشید وافسر
شہ آفاق تغلق شاہ اعظم — کہ بروے شد جہانگیری مسلم

---

(۱) تاریخ ظفر آباد، ص۲۲ و تاریخ شیراز ہند، ص ۹۲۷۔ تاریخ ظفر آباد، ص۲۳ و تاریخ شیراز ہند، ص ۱۰۱۳۔

دوشنبہ بست و ہفتم روز بودہ ربیع الاول ماہ ستودہ
ہمایوں سال و ساعت وقت مسعود زہجرت ہفت وصد و بست یک بود
مظفر شد چوں شد معمور ایں شہر ظفرآباد نامش ماندہ در دہر

یہ کتبہ دراصل اس شہر پناہ کا تھا جسے شاہزادہ ظفر خاں نے شہر پر قبضہ ہوجانے کے بعد بنوایا تھا مگر جب شہر پناہ گرگئی تو بعد میں وہ پتھر یہاں لاکر نصب کردیا گیا۔(۱)

شہر کے فتح ہوجانے کے بعد مخدوم آفتاب ہند و چراغ ہند نے اسی جگہ اقامت اختیار کرلی۔ ان دونوں بزرگوں کے ہمراہ اس تبلیغی و جہادی قافلہ میں شیخ نظام الدین علامی، قاضی اعزالدین، ملا بہرام منطقی، شیخ محمد کوفی، قاضی تاج الدین ناصحی، ملا بدرالدین، ملا آدم وغیرہ بھی تھے جو اپنے وقت کے مشاہیر علماء وصوفیاء میں شمار ہوتے تھے جن کی وجہ سے ظفرآباد علماء و مشائخ کا عظیم ترین مرکز بن گیا۔(۲)

قاضی تاج الدین ابراہیم ناصحی ظفرآباد کے اولین قاضی منتخب ہوئے۔ یہ حافظ قرآن اور نہایت خوش الحان قاری تھے اور مخدوم آفتاب ہند کے ممتاز خلفاء میں تھے۔ سلطان الشرق ابراہیم شاہ شرقی کے عہد میں ۸۳۰ھ میں فوت ہوئے۔(۳)

انھیں قاضی تاج الدین ناصحی کی چوتھی پشت میں نویں صدی کی ابتداء میں اس نادر روزگار ہستی کا وجود ہوا جس نے بیک وقت درسگاہ اور خانقاہ دونوں کو اپنی علمی و روحانی سرگرمیوں سے آباد رکھا اور جس کے دست قناعت نے فقر و فاقہ کے باوجود کسی امیر و رئیس کا شرمندۂ احسان ہونا پسند نہیں کیا۔ اسی قدسی صفات بزرگ کی ذات آج زیب عنوان ہے۔

اسم گرامی اور تاریخ ولادت

نام نامی جلال الدین اور لقب قاضی خاں اور ناصحی ہے۔ ناصحی آپ کا خاندانی لقب

---

(۱) سید سلیمان ندوی قدس سرہ نے حیات شبلی کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ غیاث الدین تغلق نے مخدوم چراغ ہند کے لیے ظفرآباد میں ایک محل بنوایا تھا یہ کتبہ اسی محل کا ہے مگر تمام تذکرے اس روایت سے خالی ہیں اس کے برخلاف تاریخ شیراز ہند، ص ۱۰۱۴ پر ہے کہ یہ کتبہ شہر پناہ کا تھا جسے بعد میں شہر پناہ کے منہدم ہوجانے کے بعد روضہ کے دروازے پر نصب کردیا گیا ہے۔ (۲) چراغ نور، ص ۲۳۔ (۳) چراغ نور، ص ۱۲ بحوالہ مناقب درویشیہ۔

ہے جس سے پورا خاندان ملقب ہے۔ اِس لقب کے سلسلے میں صاحب مناقب درویشیہ لکھتے ہیں کہ حضرت ابراہیم ادہم قدس سرہ نے جب تاج وتخت سے کنارہ کش ہوکر درویشانہ اورفقیرانہ روش اختیار کرلی تو ان کے ایک صاحبزادہ محمود نے آپ کو پندونصائح کے ذریعہ پھر سلطنت وحکومت کی جانب مائل کرنا چاہا اسی پندونصیحت کی وجہ سے لوگ محمود کو محمود ناصح کہنے لگے اوراس کی اولاد ناصحی کی نسبت سے مشہور ہوئی۔ (۱)

آپ کی ولادت ۸۰۵ھ میں بمقام ظفرآباد ہوئی۔ مادۂ تاریخ پیدائش خاصان حق ہے۔

شجرہ نسب اوراصلی وطن

آپ نسباً شیخ فاروقی اور حضرت ابراہیم ادہم کی اولاد سے ہیں۔ شجرہ نسب یہ ہے۔

جلال الدین قاضی خاں، بن قاضی یوسف ناصحی بن نظام الدین ناصحی بن شیخ صدر عالم ناصحی بن قاضی تاج الدین ابراہیم ناصحی بن سلطان حسین ناصحی بن سلطان سلیمان ناصحی بن سلطان محمود ناصح بن شیخ ابراہیم ادہم قدس اسرارہم (۲)

حضرت ابراہیم قدس سرہٗ کے تارک الدنیا ہوجانے کے بعد بھی کئی پشتوں تک اُن کے خاندان میں حکومت باقی رہی لیکن سلطان حسین ناصحی کے عہد میں شاہ عباس فرماں روائے ایران نے حملہ کرکے حکومت بخارا کو تاخت وتاراج کردیا اور خاندان ناصحی کا شیرازہ اقصائے عالم میں منتشر ہوگیا۔

اسی حملہ کے بعد ۷۰۸ھ میں شیخ تاج الدین ناصحی نے بخارا کی سکونت ترک کرکے دہلی کو اپنا مسکن ووطن بنایا۔ بعدازاں حضرت آفتاب ہند کی معیت میں ۷۲۱ھ میں ظفرآباد تشریف لائے اور یہاں کے قاضی مقرر ہوئے۔ یہی عہدۂ قضا بعد میں خاندان ناصحی کے

---

(۱) چراغ نور، ص ۴۷، نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۲۶۵۔

(۲) چراغ نور، ص ۱۲۵۔ ناصحی خاندان کے شیوخ اپنا سلسلہ نسب حضرت ابراہیم تک پھر اس کے اوپر حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ تک لے جاتے ہیں لیکن یہ محل نظر ہے کیونکہ علامہ ابن اثیر کامل میں لکھتے ہیں کہ ابراہیم بن ادہم قبیلہ بکر بن وائل سے تھے اور حافظ نے تہذیب التہذیب میں لکھا ہے کہ حضرت ابراہیم عجلی تھے اور بعض نے تمیمی لکھا ہے۔ امام بخاری بھی قتیبہ کے حوالہ سے انھیں تمیمی بیان کرتے ہیں۔ واللہ اعلم۔

ظفر آباد میں قیام کا سبب ہوا۔ (۱)

شیخ تاج الدین نے ظفر آباد میں جس مقام کو اپنی قیام گاہ بنایا تھا وہ جگہ محلّہ ناصحی سے مشہور ہوئی اور آج تک اسی نام سے موسوم ہے۔

خاندانی وجاہت

قاضی خاں نے جس وقت آنکھ کھولی آپ کا گھر علم وفضل کا گہوارہ تھا۔ والد بزرگوار قاضی یوسف ناصحی ظفر آباد کے قاضی تھے۔ گھر میں علوم وفنون کے چرچا کے ساتھ فراغت ورفاہیت بھی تھی۔ ابھی آپ چھ ماہ کے تھے کہ ایک عجیب وغریب واقعہ پیش آیا جس نے آپ کو ایک قاضی کے گھر سے وزیر اعظم کی آغوش میں پہنچا دیا۔

آپ کے والد قاضی یوسف ایک شب اپنے خسر عماد الملک بختیار خاں وزیر اعظم کے بالا خانہ پر تہجد کے بعد ذکر وشغل میں منہمک تھے۔ اتفاقاً شیخ بہاء الدین (۲) جونپوری قدس سرہ کا گزر بالا خانہ کے پاس سے ہوا۔ شیخ نے قاضی یوسف کو دیکھ کر بڑے پر درد لہجے میں بلند آواز سے یہ اشعار پڑھے۔

دارم سخنے اگر نہی گوش   من رسم سوئے تو خاموش
ایوان ترا بسے بلند است   اینجا حرص و ہوا کمند است
باید درعشق خانہ بردوش   مجنوں شدہ کوہ کوہ بجزدش

خدا جانے شیخ کی آواز میں کیا جادو تھا کہ ان اشعار کے سنتے ہی قاضی یوسف از خود رفتہ ہو گئے اور ایک آہ سرد مار کر بیابان کی راہ لی۔ سلطان الشرق اور عماد الملک نے ہر چند تلاش وجستجو میں آدمی دوڑائے مگر کچھ خبر نہ ملی کہ کہاں گئے اور کیا ہوئے۔ (۳)

---

(۱) بیان الانساب سادات زیدیہ، ص ۱۳۹ بحوالہ تاریخ شیراز ہند۔

(۲) شیخ بہاء الدین جون پوری چشتی مشہور مشائخ چشتیہ میں سے ہیں۔ مولانا عبدالحئی رائے بریلوی نزہۃ الخواطر ص ۶۱، ج ۴ میں شیخ بہاء الدین جون پوری کے ترجمہ میں لکھتے ہیں العالم الفقیہ المورث جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ علوم باطن کے ساتھ علوم ظاہر میں بھی یدطولیٰ رکھتے تھے۔ شیخ محمد عیسیٰ تاج جونپوری کے مرید اور راجہ حامد شہ مانکپوری کے خلیفہ تھے بقول صاحب بحرزخار ۹۱۱ھ میں وفات پائی۔ تفصیل کے لئے دیکھئے تجلی نور، ص ۲۷۔

(۳) چراغ نور، ص ۴۸، وگنج ارشدی ص ونزہۃ الخواطر، ص ۶۱، ج ۴۔

قاضی یوسف کے اس طرح لا پتہ ہو جانے کے بعد قاضی خاں کی نگہداشت اور تربیت کی تمامتر ذمہ داری ان کے نانا عماد الملک کے سر آئی۔ عماد الملک جملہ علوم وفنون میں کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ اور وزیر السلطنت بھی تھے اس لیے علمی ماحول کے ساتھ ہر طرح کی آسائش اور آسودگی بھی میسر تھی جس کا اثر مخدوم قاضی خاں کی نشو ونما پر بہت اچھا پڑا اور سترہ سال کی قلیل مدت میں علوم متداولہ کی تعلیم وتحصیل سے فراغت ہو گئی۔

نزھۃ الخواطر میں ہے۔

ونشاء فی مهد جده لامه الوزیر عماد الملك الجونپوری واشتغل بالعلم من صباه وقرء فاتحة الفراغ فی السابع عشر من سنه. (۱)

اپنے نانا عماد الملک وزیر جونپور کی آغوش میں پروان چڑھے اور بچپن ہی میں تحصیل علم میں مشغول ہو گئے اور سترہ سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہو گئے۔

مخدوم قاضی خاں نے کن کن اساتذہ سے تعلیم حاصل کی اس کی تفصیل سے تمام تذکرہ نگار خاموش ہیں لیکن اتنی بات واضح ہے کہ انھوں نے عماد الملک کی زیر نگرانی علمی مراحل طے کئے اور جملہ علوم وفنون کی تحصیل جونپور ہی میں کی۔ عماد الملک خود ایک متبحر عالم اور علم وعلماء کی عظمتوں سے واقف، بیدار دل، روشن ضمیر بزرگ تھے اور جون پور سلطان الشرق کی علم پروری اور علماء نوازی سے چمنستان علم وفضل بنا ہوا تھا۔

اس لیے یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ شفیق نانا نے عزیز نواسے کی علمی تربیت کے لیے وقت کے علماء وفضلا کی خدمات حاصل کی ہوں گی۔

عرفان وسلوک

علوم ظاہری کی تحصیل سے فراغت کے بعد علوم باطنی کی جانب متوجہ ہوئے اور سلسلۂ چشتیہ کے مشہور بزرگ شیخ حسن بن طاہر جون پوری کی خدمت میں دہلی پہنچے اور مسلسل تیس سال اُن کی صحبت میں رہ کر عبادت وریاضت میں مشغول رہے اور ولایت کے اعلیٰ مدارج طے کر کے شیخ سے خلافت حاصل کی۔

---

(۱) نزھۃ الخواطر ص ۲۶۵، ج ۴ و تجلی نور ص ۱۵، وفیات الاعلام ص ۱۸۰۔

مولانا عبدالحئی مرحوم نزھۃ الخواطر میں رقمطراز ہیں۔

ثم لازم الشیخ حسن بن الطاھر العباسی الجونپوری وصحبہ ثلاثین سنۃ واخذ عنہ الطریقۃ(۱)

پھر وہ شیخ حسن بن طاہر عباسی جونپوری کی خدمت میں جا پڑے اور پورے تیس سال ان کی صحبت میں رہ کر راہ سلوک طے کی۔

شیخ حسن طاہر جونپوری اپنے عہد کے مشاہیر علماء و مشائخ میں سے تھے۔ علوم باطنی کے ساتھ علوم ظاہری کے زیور سے بھی آراستہ تھے۔ شیخ کو راجہ حامد شہ مانکپوری المتوفی ۹۰۱ھ سے خلافت حاصل تھی۔ شیخ حامد فرماتے تھے کہ قیامت کے دن حسن مرے لیے حجت و دلیل ہوں گے۔ سلطان سکندر پوری کی خواہش پر جون پور سے آگرہ پھر وہاں سے دلی تشریف لے گئے اور وہیں بجے منڈل میں ۹۰۹ھ میں ہمیشہ کے لیے اقامت گزیں ہوگئے۔ (۲)

قاضی خاں کا مقام علماء کی نظر میں

مخدوم قاضی خاں کے تمام تذکرہ نگاران کی جلالت شان کا تذکرہ نہایت شاندار اور پُر شوکت الفاظ میں کرتے ہیں۔ شیخ محدث دہلوی لکھتے ہیں:

> ”میاں قاضی خاں ظفر آبادی قدس سرہٗ مرید و خلیفہ شیخ حسن طاہر است از جملہ صادقان ایں طریق است، صاحبِ استقامت و کرامت و حرمت و زہد و تجرید، و لے بحسب زماں اگر چہ متاخر است ولیکن بجہت صفائی معاملہ اعداد از متقدمان است۔ (۳)

قریب قریب انھیں خیالات کا اظہار مفتی غلام سرور لاہوری نے بھی کیا ہے لکھتے ہیں:

> ”شیخ قاضی خاں ظفر آبادی قدس سرہ مرید و خلیفہ شیخ حسن طاہر است شیخ بود صاحب استقامت و کرامت و زہد و ورع و تقویٰ و تجرید و تفرید (۴)

---

(۱) نزھۃ، ص ۲۶۵، ج ۴، اخبار الاخیار ص ۲۳۹۔

(۲) اخبار الاخیار، ص ۲۰۱، تذکرہ علمائے ہند، ص ۴۷، نزھۃ الخواطر ص ۸۹، ج ۴۔

(۳) اخبار الاخیار ص ۲۳۹۔ (۴) خزینۃ الاصفیاء ص۔

مولانا عبدالحئی مرحوم ان الفاظ میں ان کی جلالت کا اعتراف کرتے ہیں:

”الشیخ العالم الصالح جلال الحق قاضی خاں بن یوسف الناصحی العمری الظفر آبادی کان من کبار المشائخ الچشتیہ (۱)

صاحب تجلی نور رقم طراز ہیں:

حضرت بندگی جلال الحق در بزرگان متاخرین اہل چشت از بس نام آورد صاحب زہد وتوکل عبادت وریاضت واہل استقامت وکرامت بود حتی کہ پیرش ہنگام فروشدن پسر خود عبدالعزیز راجہت تعلیم باطنی با تفویض نمود (۲)

سلوک کے مراحل طے کر لینے اور درجۂ کمال حاصل ہوجانے کے بعد پیر ومرشد کی اجازت سے وطن مالوف واپس تشریف لائے۔ ہر نوع کے شاہی عہدے اور مناصب کے دروازے آپ پر کھلے تھے مگر سب سے کنارہ کش ہوکر درویشانہ زندگی اختیار کی اور دنیاوی عزت وجاہ سے بے نیاز ہوکر درس وتدریس اور تصفیہ قلوب وتزکیۂ نفوس میں مشغول ہوگئے۔

لیکن جب افلاس اور تنگدستی کی گرفت سخت ہوگئی اور اہل وعیال کی حالت فقر وفاقہ سے بالکل خستہ تو قاضی صاحب کو بھی یک گونہ پریشانی لاحق ہوئی ناچار ایک عریضہ غربت وتنگدستی کی شکایت میں شیخ کی خدمت میں ارسال کیا۔ شیخ حسن قدس سرہ نے جواب میں تحریر فرمایا۔

بخدمت قاضی خاں ظفر آبادی چوں غم فرزند واطفال وعیال ومتعلقۂ آں دردل بگذرو مضمون یک بیت را در خاطر تصور نمائند۔

از خدا خواہم وزغیر نخواہم بخدا
کہ نیم بندہ غیر و نخدائے دگر است

فرزند بندہ است خدارا تو غم مخور تو بندہ ہستی نہ خداوند پروری اگر مفلس است گنج توکل برائے او کافی تو رنج ناحق ونا روا مبر۔ (۳)

---

(۱) نزہۃ الخواطر ص ۲۶۵، ج ۴۔ (۲) تجلی نور ص ۱۶۔

(۳) بیاض درویشیہ قلمی بحوالہ چراغ نور ص ۴۸

شیخ کے مکتوب سے قاضی خاں کی ساری پریشانی کافور ہوگئی اور اطمینان وسکون حاصل ہوگیا اس کے بعد زندگی بھر نہ فقر وفاقہ کی شکایت لب پر آئی نہ کبھی خانقاہ سے باہر قدم نکالا۔

شان استغناء

مخدوم قاضی خاں کے مزاج میں حد درجہ قناعت واستغناء تھی۔ امراء وسلاطین کے دربار میں حاضری تو درکنار ان سے کسی قسم کا ہدیہ اور تحفہ قبول کرنا بھی گوارا نہ تھا۔ ایک بار ہمایوں شاہ نے اپنے ایک امیر مرزا عسکری کو خدمت میں بھیجا کہ مخدوم جتنے مواضعات کی خواہش کریں معاف کردیے جائیں۔ مرزا عسکری کو باریابی نصیب نہ ہوئی اس لیے آپ کے چچا قاضی صدرالدین ناصحی کے ذریعہ بادشاہ کا پیغام پہنچایا۔ آپ نے ہمایوں شاہ کی اس پیش کش کو ٹھکرادیا اور یہ قطعہ پڑھا۔

ما حرص و ہوا دو بندہ داریم　　با ہر دو برام بادشاہیم
تو بندۂ بندگان ما ہستی　　از بندۂ بندگان چہ خواہیم

ہمایوں شاہ کو جب اس بے نیازی اور شان استغناء کا علم ہوا تو اس کی عقیدت اور بڑھی خود آستانہ پر حاضر ہوا مگر قاضی خاں اس وقت خلوت کدہ میں تھے ملاقات نہ ہوسکی دوسرے دن صبح سویرے پھر حاضر ہوا مگر قاضی صاحب حسب معمول اس وقت طلبہ کے درس میں مشغول تھے۔ درس سے فراغت کے بعد ملاقات ہوئی، ہمایوں نے بحسب خواہش خود مواضعات وقریات کی معافی کا فرمان پیش خدمت کیا۔ آپ نے فرمان واپس کردیا اور فرمایا کہ میں نے اپنے شیخ سے عہد کیا ہے

از خدا خواہیم وزغیر نخواہم بخدا　　کہ نیم بندۂ غیر ونخداے دگراست

جاتے جاتے ہمایوں نے سادہ کاغذ پر مہر شاہی ثبت کر کے قاضی صاحب کی خدمت میں بھیج دیا کہ جتنے مواضعات اور نقد کی خواہش ہو مخدوم اس پر تحریر فرمادیں آپ نے اسے بھی لوٹا دیا اور فرمایا کہ

”مارا احتیاجے نیست و بے احتیاج حق مسلماناں گرفتن روا نہ باشد“ (۱)

کہتے ہیں کہ جب مخدوم قاضی خاں نے اس گراں بہا نذرانہ کو قبول کرنے سے انکار کردیا تو ہمایوں نے ان کے بڑے صاحبزادے شیخ عبداللہ کی خدمت میں پیش کیا شیخ عبداللہ نے بھی رد کردیا اور فرمایا:

پسر باید کہ برمتابعت پدر رد و چوں پدر ما قبول نکردنا چار مارا نیز آں باید کرد کہ ایشاں کردند (۲)

وفات

بالآخر علم و فضل اور رشد و ہدایت کے اس امام نے، تعلیم کتاب و حکمت اور تطہیر قلوب والنفس میں پوری زندگی گزار کر ۱۵؍صفر ۹۴۴ھ کو جاں جان آفریں کے حوالہ کردی۔

سید نور الدین زیدی ظفر آبادی نے تاریخ رحلت ان اشعار میں لکھی ہے۔

گل گلزار باغ لامکانی   در دریائے عمان معانی
مئے شوق محبت نوش کردہ   خمار جام وحدت ہوش بردہ
بملک فقر شاہنشاہ مسعود   جلال الدین قاضی خاں محمود
زمہجوری بساط قرب جستند   زدنیا رفتہ خلد آباد کردند
چوں زیدی جست سال فوت قاضی
ندائے فخر دیں کردہ منادی (۳)
۹۴۴

شیخ محدث دہلوی نے اخبار الاخیار (۴) میں اور مفتی غلام سرور لاہوری نے خزینۃ الاصفیاء میں سال وفات ۹۷۰ھ تحریر فرمایا ہے۔ صاحب تذکرہ علمائے ہند (۵) نے بھی اسی سن کو درج کیا ہے۔ ان حضرات کے برخلاف شیخ محمد یحییٰ خوب اللہ الہ آبادی المتوفی

---

(۱) اخبار الاخیار ص ۲۳۹ و تجلی نور ص ۱۷، چراغ نور ص ۴۹، تذکرہ علمائے ہند ص ۱۶۶۔

(۲) اخبار الاخیار ص ۲۴۰ و تذکرہ علماء ہند ص ۱۶۶۔ (۳) چراغ نور، ص ۵۰ و تجلی نور ص ۱۸۔

(۴) دیکھئے اخبار الاخیار ص ۲۴۰۔ (۵) تذکرہ علمائے ہند ص ۱۶۶۔

۱۱۴۴ھ نے وفیات الاعلام میں ۹۵۰ھ لکھا ہے (۱)۔ زیدی ظفر آبادی مخدوم قاضی خاں کی کرامات کے ذیل میں لکھتے ہیں کہ ''میر علی عاشقاں سرائے مری، شیخ اڈہن جونپوری، سید غیاث الدین درویش ظفر آبادی اور مخدوم جلال الحق قاضی خاں ظفر آبادی میں باہم مخلصانہ دوستی اور راہ ورسم تھی۔ ایک مرتبہ چاروں حضرات بیٹھے موت اور مابعد الموت کے موضوع پر گفتگو کر رہے تھے درمیان میں یہ بات آئی کہ ہم میں سے جس کی وفات پہلے ہو وہ اطلاع دے کہ وہاں سب سے زیادہ قدر کس عمل کی ہے۔

خدا کا چاہا ایسا ہوا کہ ان حضرات میں سے پہلے قاضی خاں کی وفات ہوئی۔ وفات کے تیسرے دن تینوں حضرات قاضی خاں کے مزار پر حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ''الکریم اذا وعدوفی'' اسی وقت ہوا کا ایک بگولہ اٹھا اور قبر کے پاس ختم ہو گیا۔ ہوا کے ختم ہونے کے بعد دیکھا گیا تو کاغذ کا ایک ٹکڑا ملا جس پر حافظ شیرازی کا یہ شعر قاضی خاں کے خط میں لکھا ہوا تھا۔

آنجا فنون شیخ نیرزد بنیم خس　　راحت بدل رساں کہ ہمیں راخرندویس

سید میر علی عاشقاں کی وفات حسب تصریح شیخ محمد عارف ۹۵۵ھ ہے۔ (۲) اگر یہ واقعہ صحیح ہے تو قاضی صاحب کا سن وفات ۹۵۰ھ یا ۹۴۴ھ ہی صحیح ہوگا۔ شاید اسی وجہ سے مولانا عبدالحئی مرحوم نے نزھۃ الخواطر ص ۲۶۵ میں انھیں دونوں تاریخوں کو نقل کیا ہے اور ۹۷۰ھ والی روایت کو نظر انداز کر دیا۔ واللہ اعلم

اولاد اور خلفاء

مبدأ فیاض نے حضرت قاضی کو علم وفضل اور زہد وورع کی دولت جاودانی کے ساتھ اولاد کی نعمت سے بھی شادمانی عطا فرمائی تھی۔ مناقب درویشیہ اور اخبار الاخیار سے معلوم

---

(۱) وفیات الاعلام ص ۱۸۰۔

(۲) رسالہ عاشقاں ص ۳۲، رسالہ عاشقیہ کو شیخ محمد عارف نے میر علی عاشقاں سرائے مری کے حالات میں قلمبند کیا ہے۔ شیخ علی عاشقاں کے حالات میں اس سے زیادہ اہم اور مستند کوئی اور ماخذ نہیں ہے اس کا ایک قلمی نسخہ مولانا نجم الدین اصلاحی دامت برکاتہم کے ذاتی کتب خانہ میں موجود ہے۔

ہوتا ہے کہ آپ کثیر الاولاد تھے مگر شیخ عبداللہ ناصحی کے علاوہ بقیہ اولاد کی تفصیل سے تمام تذکرے خالی ہیں۔

شیخ عبداللہ ناصحی

نام نامی آپ کا عبداللہ اور لقب جمال الحق ناصحی ہے۔ آپ مخدوم قاضی خاں کے پہلوٹھے صاحبزادے ہیں۔ شیخ محدث دہلوی لکھتے ہیں ”شیخ عبداللہ اکبر اولاد او بود“ آپ بڑے صاحب حال بزرگ تھے۔ کبھی کبھی صحو و سلوک میں آجاتے ورنہ ہمیشہ جذب و مستی اور سکر کی کیفیت طاری رہتی۔ ریاضت و کرامت میں خاص شہرت کے مالک تھے اور بڑے مستجاب الدعوات، سیف زبان تھے۔ والد بزرگوار کی طرح دنیا اور اہل دنیا سے بے نیاز اور نذر و نیاز قبول کرنے سے محترز تھے۔

حضرت قاضی خاں کے بعد سجادۂ مشیخت پر رونق افروز ہوئے اور والد محترم کی صحیح جانشینی فرمائی۔ ۱۰۰۱ھ میں وفات ہوئی اسم گرامی ”شیخ عبداللہ“ سے سن وفات نکلتا ہے۔(۱)

حضرت قاضی خاں کے متوسلین اور خلفاء کی تعداد بہت زیادہ ہے مگر ان میں دو بزرگوں کو خاص شہرت حاصل ہوئی بغرض اختصار انھیں دو کے حالات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

شیخ عبدالعزیز چشتی دہلوی

آپ شیخ حسن بن طاہر جونپوری کے فرزند ارجمند تھے۔ ۸۹۸ھ میں جونپور میں پیدا ہوئے ڈیڑھ برس کی عمر میں باپ کے ساتھ دہلی آگئے پھر وفات تک یہیں رہے۔ شیخ عبدالعزیز شریعت و طریقت دونوں کے جامع تھے۔ علوم باطنی کی تکمیل حضرت قاضی خاں کے زیر تربیت کی، شیخ حسن بن طاہر نے وفات کے وقت انھیں قاضی خاں کے سپرد کردیا تھا۔ چنانچہ والد کی وفات کے بعد یہ ظفرآباد آئے اور طویل مدت تک یہاں مقیم رہ کر عبادت و ریاضت اور کسب سعادت میں مشغول رہے اور سلوک کی منزلیں طے کر کے

---

(۱) اخبار الاخیار ص ۲۴۰ و تاریخ شیراز ہند ص ۹۹۲۔

قاضی خاں سے خرقہ خلافت حاصل کیا پھر دہلی آ کر مسند ارشاد کو زینت بخشی۔ دہلی اور اس کے قرب وجوار میں آپ سے بڑا فیض ہوا اس عہد میں آپ کا کوئی ہمسر اور مثیل نہ تھا۔

شیخ محدث دہلوی لکھتے ہیں:

> اورادر تواضع وحلم وصبر ورضا وتسلیم وشفقت بر خلق ورعایت فقر نظیر نبود ودرزماں خودیادگار مشائخ چشت بود گرد دہلی بوجوداو سلسلۂ ارشاد مشیخت برپا بود (۱)

ان کے تقدس، حلم اور تواضع نے انھیں ہر دلعزیز بنا دیا تھا۔ سلسلۂ چشتیہ کی دیرینہ روایات اس تاریک دور میں پھر ایک بار ان کے ذریعہ زندہ ہونے لگی تھیں۔ عوام وخواص سب ہی ان سے عقیدت رکھتے تھے۔ بیرم خاں خانان خاص طور سے معتقد تھا۔

۶/ جمادی الاخری ۹۷۵ھ میں آیت ”فسبحان الذی بیدہ ملکوت کل شیء والیہ ترجعون“ کے سماع پر بحالت وجد محبوب حقیقی سے جا ملے۔ ”یادگار چشت“ سے تاریخ وفات نکلتی ہے۔ (۲)

شاہ مسعود خلوتی

یہ بزرگ بھی حضرت قاضی خاں کے ارشد خلفاء میں ہیں۔ بیعت کے بعد ذکر وشغل کی غرض سے بارہ سال تک عوام الناس سے بالکل منقطع ہو کر ذکر وفکر اور مراقبہ میں مشغول رہے اسی وجہ سے ”شاہ خلوتی“ کے لقب سے مشہور ہوئے۔

آپ عزلت گزیں اور تنہائی پسند تھے۔ عوام سے اختلاط بالکل پسند نہ کرتے۔ دنیا ومافیہا سے بے نیاز ہو کر شب وروز ذکر الٰہی اور یاد ربانی میں محو رہتے۔ بلا کسی شدید ضرورت کے بات نہ کرتے ہمیشہ ایک جوڑا کپڑا رکھتے۔ ازدواجی جھمیلوں سے بھی تاحیات الگ رہے۔ ۹۸۴ھ میں بعہد اکبر شاہ انتقال فرمایا۔ مزار محلّہ ناصحی ظفر آباد میں موضع رام داس پور کے متصل اب بھی موجود ہے۔ (۳)

---

(۱) اخبار الاخیار ص ۲۸۸۔ (۲) چراغ نور ص ۱۰۵، تاریخ مشائخ چشت ص ۲۲۶، اخبار الاخیار ص ۲۸۸۔

(۳) تاریخ شیراز ہند ص ۹۹۵ و چراغ نور ص ۱۰۶۔

سیّد محمد جونپوری اور تحریک مہدویت

سیّد محمد جونپوری کی ذات نویں صدی ہجری سے آج تک اہل علم کے حلقہ میں محل بحث و اختلاف چلی آرہی ہے ایک جماعت انھیں صاحب مقامات اور کشف و کرامات کا حامل سمجھتی ہے — کچھ لوگ کہتے ہیں کہ یہ متقی پرہیزگار ضرور تھے لیکن دعوائے مہدویت میں غلطی پر تھے — ایک تیسری جماعت ہے جس کا خیال یہ ہے کہ وہ زاہد و متقی بالکل نہیں تھے بلکہ ایک جدید مذہب کے بانی تھے۔

اس لئے ضرورت ہے کہ ان کے حالات کا جائزہ ان کے معاصرین اور دیگر محقق مورخین کی فراہم کردہ معلومات کی روشنی میں لیا جائے تاکہ صحیح نتیجہ پر پہنچا جا سکے اور اس مشہور روزگار ہستی کے سلسلے میں درست معلومات حاصل ہوں۔

تاریخ ولادت اور نام و نسب

محمد نام، اسد العلماء، خاتم الاولیا اور نور بخش القاب ہیں۔ سلسلۂ نسب یہ ہے: سید محمد بن سید عبداللہ بن عثمان بن موسیٰ بن قاسم بن نجم الدین بن عبداللہ بن یوسف بن یحییٰ بن نعمت اللہ بن اسمٰعیل بن موسیٰ کاظم بن جعفر صادق بن باقر بن زین العابدین بن سیدنا حسین بن امیر المومنین علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ۔

۱۴؍ جمادی الاولیٰ ۸۴۷ھ/۱۴۱۳ء میں بزمانہ سلطنت ابراہیم شاہ شرقی شہر جونپور میں پیدا ہوئے۔(۱)

تعلیم و تربیت اور ابتدائی حالات

عمر جب پانچ سال کی ہوئی تو خاندانی روایت کے مطابق تعلیم و تحصیل کا سلسلہ

---

(۱) مقدمہ ترجمہ رسالہ مناقب۔

شروع کیا اور استاذ کے لئے جونپور کے مشہور عالم اور بزرگ ترین صوفی شیخ دانیال کا انتخاب ہوا سات سال کی قلیل عمر میں قرآن حکیم کے حفظ سے فراغت ہوگئی اور بارہ برس کی عمر میں علوم وفنون رسمیہ سے فارغ التحصیل ہوگئے مطالعہ کی کثرت، معلومات کی وسعت اور بحث ومباحثہ کے وقت انتقال ذہنی کو دیکھ کر بڑے بڑے اہل علم متحیر ہوجاتے تھے انھیں اوصاف کے تحت اس عہد کے علماء نے آپ کو اسد العلماء کے لقب سے یاد کرنا شروع کردیا تھا۔ (۱)

علوم رسمیہ سے فارغ ہونے کے بعد شیخ دانیال کی صحبت میں رہ کر تربیت علوم باطنی کی بھی تکمیل کی اور انھیں سے خرقۂ خلاف حاصل کیا۔ (۲)

۸۶۲ھ میں شاہ حسین شرقی نے اڑیسہ پر فوج کشی کی۔ ترہٹ کا راجہ دلپت راؤ مقابلہ میں آیا جسے شاہ حسین نے پہلے ہی حملہ میں پسپا کردیا بالآخر معاملہ ادائیگی خراج پر ختم ہوا۔ لیکن واپسی کے بعد دلپت راؤ نے معاہدے کی خلاف ورزی کی اور خراج کی رقم روک لی جس کے نتیجے میں شاہ حسین نے ۸۶۴ھ میں اس پر دوبارہ حملہ کیا اس جنگ میں سید محمد نے بھی بہ نیت جہاد شرکت کی اور دلپت راؤ کو اپنے ہاتھوں سے قتل کرکے کامیابی کے ساتھ واپس آئے اس وقت آپ کی عمر صرف سترہ سال تھی۔

شیخ دانیال کی صحبت کے اثر سے تصوف کا چسکا پہلے لگ ہی چکا تھا اور اس راہ کی منزلیں طے کرکے خلافت بھی پاچکے تھے مگر جنگ کی شرکت نے دنیا کی بے ثباتی کا ایسا نقشہ سامنے کردیا کہ ماسویٰ اللہ سے بے نیازی اور تعلق مع اللہ کی حالت جذب کے درجہ تک پہنچ گئی اور سات سال تک بے حد استغراق رہا اور پانچ برس تک صحو وسکر کی ملی جلی کیفیت طاری رہی اور اسی عالم میں وطن عزیز کو خیرباد کہہ کر راہ غربت اختیار کرلی۔

جونپور سے ہجرت

۸۸۷ھ میں جونپور سے روانہ ہوکر عظیم آباد کے جنگلات میں اقامت پذیر ہوگئے

---

(۱) گلشن زار بحوالہ مقدمہ رسالہ مناقب۔ (۲) خزینۃ الاصفیاء ص ۴۶۷۔

-اس سفر میں آپ کی زوجۂ محترمہ اور بڑے صاحبزادے سید محمود کے علاوہ اور دوسرے طالبان بھی ہمراہ تھے- کچھ دنوں یہاں قیام کرنے کے بعد چندیری گئے اور وہاں سے مالوہ کے پایۂ تخت مانڈو میں رونق افروز ہوئے۔ مالوہ کا حکمران علاء الدین خلجی متوفی ۹۰۵ھ نے جب آپ کے پاکیزہ اخلاق اور اتباع سنت نبوی کا چرچا سنا تو آپ کا گرویدہ ہوگیا یہاں آپ کے مواعظ حسنہ سے ہزاروں ہدایت یاب ہوئے مانڈو سے کوچ کر کے ۸۸۸ھ میں گجرات تشریف لائے اور تقریباً ڈیڑھ سال یہاں مقیم رہ کر خلق خدا کی اصلاح وتربیت میں مشغول رہے اسی مقام پر آپ کی زوجہ کا ۸۹۰ھ میں انتقال ہوگیا اس زمانہ میں گجرات فتح نہیں ہوا تھا مگر سلطان محمود بیگڑھ اس کا محاصرہ کئے تھا۔ سلطان محمود کو آپ کے ورع تقویٰ اور پسندیدہ اخلاق کی خبر پہنچی تو آپ سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی لیکن امرائے سلطنت نے اس خیال سے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ سید صاحب کی صحبت سے سلطان متاثر ہوکر ترک حکومت کر بیٹھے تو پھر گجرات کی مہم یونہی ناتمام رہ جائے گی- سلطان کو کسی طرح سے سید صاحب کی مجلس میں آنے سے باز رکھا اسلئے سلطان محمود بیگڑھ اس مبارک صحبت سے محروم رہ گیا مگر اسی جگہ جالور کا تاجدار زبدۃ الملک عثمان خاں شرف ملاقات سے بہرہ اندوز ہوکر عقیدت مندوں میں شامل ہوگیا ۸۹۰ھ میں گجرات سے روانہ ہوکر خاندیش کے دارالسلطنت برہان پور پہنچے پھر وہاں سے دولت آباد ہوتے ہوئے احمدنگر میں اقامت گزیں ہوئے چندے قیام کرنے کے بعد یہاں سے بیدر شریف کا قصد کیا بیدر کا حاکم قاسم برید آپ کے حلقہ بگوشوں میں داخل ہوگیا بیدر سے کوچ کر کے گلبرگہ پہنچے یہاں آپ کے پندونصائح سے بے شمار لوگ ہدایت یاب ہوئے گلبرکہ سے بندر ڈابھیل آئے اور یہاں سے بذریعہ جہاز مکہ معظّمہ کے لئے روانہ ہوگئے۔

۸۹۱ھ میں زیارت حرمین سے فیضیاب ہوکر براہ جدہ کھمبائٹ واپس آئے پھر احمد آباد تشریف لے گئے اور شہر سے باہر تاج خاں سالار کی مسجد میں فروکش ہوئے یہاں آپ کے زہد وتقویٰ اور اخلاق حمیدہ کا بے حد چرچا ہوا اور ایک کثیر تعداد آپ کے فیوض وبرکات سے مستفیض ہوئی۔ احمد آباد کے مشہور بزرگ حضرت سید جلال الدین عرف شیخ

جیو کو جب آپ کے اوصاف و کمالات کی اطلاع پہنچی تو ملاقات کے لئے خود حاضر ہوئے۔ سید صاحب نے دوسری اور تیسری آیات پڑھیں شیخ جیو نے ان کا جواب بھی قرآن ہی سے دیا اور اس کے بعد وہاں سے رخصت ہوئے راہ میں کسی نے ان سے سید صاحب کے بارے میں معلومات چاہی تو فرمایا مرد صاحب حال ہے خواص کی باتیں عوام سے کہتا ہے۔ اور کلموا علی قدر عقولھم کی رعایت نہیں کرتا جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کے بعد اس کے مقلدین غلط فہمی میں مبتلا ہو کر فتنہ کھڑا کر دیں گے۔

احمد آباد کے قیام کے زمانہ میں سید صاحب نے ایک دن یہ فرمایا کہ میں اس دنیا میں انھیں مادی آنکھوں سے خدا دکھا سکتا ہوں اس بات سے اہل علم کے حلقہ میں ایک قسم کا اضطراب پیدا ہو گیا اور علماء جو سید صاحب کے اثر و رسوخ اور روز افزوں ترقی سے پریشان تھے اٹھ کھڑے ہوئے اور قرآن کے خلاف (لا یدرکه الابصار) کا دعویٰ کرنے والے کے قتل کا فتویٰ تیار کر دیا۔

مولانا تاج محمد نے جو اپنے وقت کے بڑے مشہور عالم تھے لوگوں کو اس قسم کی جرأت سے روکا بالخصوص اپنے شاگردوں کو جن کا حلقہ بہت وسیع تھا اور ارشاد فرمایا کہ تم نے مجھ سے علم اسی لئے حاصل کیا تھا کہ اس کے ذریعہ سادات کے قتل کا فتویٰ دیا کرو۔

مولانا تاج محمد کی بروقت ترجمانی سے حکام سلطنت نے کسی قسم کی پیش دستی نہیں کی لیکن علماء سوء کی شورش برابر جاری رہی اس لئے سید صاحب فتنہ کے خیال سے ۹۰۳ھ میں احمد آباد سے سانتیج چلے آئے اور یہاں سے نہروالا (پٹن) منتقل ہو گئے جہاں خان سرور کے تالاب کو قیام کے لئے انتخاب کیا۔

سید صاحب کا یہ عام دستور تھا کہ قیام کے لئے شہری زندگی سے الگ کسی مسجد تالاب یا کھلی جگہ کو منتخب کرتے تھے جہاں آپ کا قیام ہوتا تھا اس کو آپ کے معتقدین دائرہ کہتے تھے۔ اس کی تصریح نہیں ملتی کہ دائرہ کی اصطلاح سید صاحب کی زندگی ہی میں رائج ہو گئی تھی یا ان کی وفات کے بعد اس کا رواج ہوا۔

دائرہ کا اپنا خاص معاشرتی نظام ہوتا تھا۔ جس میں سب ایک گھر کے افراد کی طرح

مل جل کر رہتے تھے۔ محنت و مزدوری سے جو کچھ دستیاب ہوتا اس کا دسواں حصہ خدا کی راہ میں صرف کر دیتے باقی کو آپس میں برابر تقسیم کر کے کھاتے تھے۔ صبر و قناعت کا یہ حال تھا کہ کئی دنوں تک کھانے کو کچھ نہ ملتا مگر دلوں کی فراغت اور چہروں کی بشاشت سے یہ گمان ہوتا کہ ابھی شکم سیر ہو کر آ رہے ہیں۔

طبقات اکبری میں ہے۔

> اگر کشت یا زراعت و تجارت می کردہ دہ یک در راہ خدا صرف می نمود پس ہم چناں شدہ کہ پدر از پسر و زن از شوہر مفارقت گزیدہ راہ فقر و فنا پیش گرفتند و فتوح کہ بادمی آمد خرد و کلاں علی السویہ شریک بودند و اگر چیزے بہم نمی رسد تا در سہ روز بہ فاقہ می گزرانیند و اظہار نمی نمود(۱)
>
> اگر کھیتی باڑی زراعت یا تجارت کرتے تو آمدنی کا دسواں حصہ خدا کے راستے میں صرف کر دیتے یہ لوگ آپس میں ایسے رہتے کہ تمام رشتوں کو چھوڑ کر فقر و فاقہ کو اپنا سب کچھ بنا لیا تھا۔ سید مہدی کو فتوحات سے جو کچھ حاصل ہوتا سب لوگوں پر برابر تقسیم کر دیتے اور اگر دو تین دن تک فاقہ کی نوبت آتی تو اس کا اظہار نہیں کرتے تھے۔

اسی قسم کے حالات ملا عبدالقادر بدایونی اور عبدالباقی نہاوندی نے بھی تحریر کئے ہیں(۲)

ہندوستان کی عام تاریخوں میں مذکور ہے کہ بزمانہ قیام بڑلی ۹۰۵ھ میں آپ نے مہدی موعود ہونے کا دعویٰ کیا۔ لیکن اس کے برخلاف مہدوی تاریخوں میں ہے کہ آپ نے جب جونپور سے ہجرت کر کے عظیم آباد کے جنگل کو اقامت گاہ بنایا تو پہلی دفعہ آپ کو الہام ہوا کہ تم مہدی ہو اس کے بعد جب حج کو تشریف لے گئے تو رکن اور مقام کے درمیان کھڑے ہو کر مہدی ہونے کا دعویٰ کیا پھر ۹۰۳ھ میں احمد آباد میں مکرر دعویٰ مہدویت کیا اور جب بڑلی پہنچے تو چھ ماہ کے بعد ۹۰۵ھ میں مؤکد طور پر علی الاعلان

---

(۱) طبقات اکبری ص ۲۳۷۔

(۲) منتخب التواریخ ج ۱ ص ۳۹۸ و ماثر رحیمی ج ۱ ص ۶۳۰۔

مہدویت کا اظہار کیا۔ (۱) لیکن مہدوی تاریخوں کی اس روایت کی تائید ہندوستان کی عام تاریخوں سے نہیں ہوتی بلکہ جس مورخ نے بھی مہدویت کے ادّعا کا تذکرہ کیا ہے اس نے تصریح کی ہے کہ جب آپ نہروالا سے بڑلی گئے ہیں تو مہدی ہونے کا دعویٰ کیا ہے اور یہی صحیح بھی معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس کا چرچا بڑلی ہی سے شروع ہوا اس سے پہلے کی زندگی میں آپ کے متعلق مسلمانوں کے عام عقائد کے خلاف کوئی بات نہیں ملتی یہی وجہ ہے کہ وہ جہاں جہاں پہنچے لوگ ان کے زہد وتقویٰ، فقر درویشی کو دیکھ کر ان کے گرویدہ ہو گئے کسی جگہ مخالفت نہیں کی گئی۔ اگر مسلمانوں کے عقائد کے خلاف کچھ بیان ہوتا تو اس کا ذکر تاریخوں میں ضرور آتا خاص کر مخالفین تو کبھی بھی معاف نہ کرتے حالانکہ تاریخوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے آپ کی مخالفت احمد آباد میں رویت باری تعالیٰ کے مسئلے میں کی گئی اس کے علاوہ یہ امر بھی نہایت اہم ہے کہ اگر آپ حج کے موقع پر مکہ معظّمہ میں مہدویت کا اعلان کئے ہوتے تو تمام دنیائے اسلام میں ایک شور برپا ہوتا اور علمائے مکہ معظّمہ سے اسی وقت بحث ومناظرہ شروع ہو گیا ہوتا مگر کسی تاریخ سے بھی اس قسم کی کسی بات کا سراغ نہیں ملتا جو سراسر عقل کے خلاف ہے۔ (۲)

بڑلی میں آپ کا قیام کل چھ ماہ رہا اور اعلان مہدویت کے بعد یہاں علماء اور عوام کی مخالفت حد سے بڑھ گئی اس لئے اسکو چھوڑ کر دھراؤ چلے آئے اور یہاں سے جالور پہنچے اور چار ماہ قیام کرنے کے بعد ۹۰۶ھ میں مارواڑ تشریف لے گئے پھر وہاں سے جیسلمیر ہوتے ہوئے نصر پور کاہہ میں رونق افروز ہوئے۔ رمضان کا اکثر مہینہ اسی جگہ گذار کر ۲۷/ ماہ مذکور کو نو سو مخلصین کی جماعت کے ساتھ خراسان کی جانب روانہ ہو گئے اور ۹۱۰ھ میں مقام فرخ میں پہنچ کر اقامت گزین ہوئے۔ اسی جگہ ۱۹/ ذی قعدہ ۹۱۰ھ مطابق ۲۳/ اپریل ۱۵۰۵÷ کو آپ نے دق کے عارضہ میں مبتلا ہو کر وفات پائی۔

آپ کے صاحبزادے سید محمود نے جنازہ کی نماز پڑھائی اور مقام رج وفرخ کے

---

(۱) تاریخ پالن پور ج ۱ ص ۷۰ تا ۷۵۔

(۲) مقدمہ رسالہ مناقب اردو ص ۵۸۔

درمیان مدفون ہوئے عشق تمّ سے تاریخ وفات نکلتی ہے۔ (۱)

سید صاحب کی تعلیمات اور ان کا اثر

نویں صدی کا زمانہ جو اکبر سے پہلے گذرا ہندوستان میں طوائف الملو کی کا زمانہ تھا روز روز حکومتیں بنتی اور بگڑتی تھیں کوئی مرکزی حکومت باقی نہیں تھی جو احکام شرع کے اجراء کی ذمہ دار ہوتی مزید برآں علمائے حقانی بہت تھوڑے تھے اور علمائے دنیا ہر طرف پھیلے ہوئے تھے دنیا طلبی اور مکروفریب کی گرم بازاری تھی اس پر طرہ یہ تھا کہ جاہل صوفیوں کی بدعات ومنکرات نے ایک عالم کو گمراہ کرر کھا تھا ایسے حال میں سید موصوف نے احیائے شریعت اور قیام امر بالمعروف کا غلغلہ بلند کیا۔ (۲)

آپ نے دنیا طلبی، بدعات ومنکرات اور گمراہی سے بچانے کیلئے اپنی تعلیمات اور دعوت وتذکیر کے آٹھ اصول مرتب کئے تھے۔ (۱) ترک دنیا (۲) صحبت صادقین (۳) عزلت از خلق (۴) توکل (۵) طلب دیدار حق (۶) عُشر (۷) ذکر کثیر (۸) ہجرت۔

انھوں نے اپنے مشن کو تقلیل دنیا کی بنیاد پر شروع کیا تھا آپ کا ارشاد تھا کہ دنیا محض کھیتی کی جگہ ہے اسے اپنی منزل نہ بناؤ اس سے زادراہ لو مگر اس سے چمٹ نہ جاؤ اس سے فائدہ حاصل کرو مگر اس کو اپنے اوپر مسلط نہ کرو۔ سرمایہ داری اور ذخیرہ اندوزی آپ کے اصول کے قطعاً خلاف تھی آپ فرماتے تھے کہ مؤمن ذخیرہ نہ کند (۳) آپ کی تعلیمات کا اثر بقول مولانا آزاد یہ ہوا۔

> عشق کی صداقت اور قلب کی پاکی نے ان کی دعوت وتذکیر میں ایسی تاثیر بخشی تھی کہ تھوڑے ہی عرصہ میں ہزاروں آدمی حلقۂ ارادت میں داخل ہو گئے اور متعدد سلاطین وقت نے بیعت کی۔ (۴)

---

(۱) ایضاً ص ۶۰۔ (۲) تذکیر ص ۴۷۔

(۳) مقدمہ سراج الاخبار ص ۲۰۳-۱۹۶۔

(۴) تذکرۃ ص ۴۶۔

آپ کے متوسلین کی زندگی کا نقشہ مولانا آزاد نے اس طرح پیش کیا ہے۔

ان لوگوں کے طور طریق عجیب عاشقانہ و والہانہ تھے اور ایسے کہ صحابۂ کرام کے خصائص ایمانی کی یاد تازہ کرتے تھے۔ عشق الٰہی کی ایک جاں نثار جماعت تھی جس نے اپنے خون کے رشتوں اور وطن و زمین کی فانی الفتوں کو ایمان و محبت کے رشتہ پر قربان کر دیا تھا اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر راہ حق میں ایک دوسرے کے رفیق و غمگسار بن گئے تھے۔ امیر و فقیر اعلیٰ وادنیٰ سب ایک رنگ میں رہتے اور بجز خلق اللہ کی ہدایت و خدمت اور احکام شرع کے اجراء و قیام کے اور کسی سے واسطہ نہ رکھتے تھے۔ (۱)

سیّد صاحب کے متعلق علماء کی رائے

زمانہ حال و ماضی کے سبھی مورخین اور سوانح نویس خواہ موافق ہوں یا مخالف معترف ہیں کہ سید محمد علوم رسمیہ کے ساتھ زہد و تقویٰ اور فقر درویشی میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ شیخ علی متقی متوفی ۹۷۵ھ جو سید صاحب کے معاصر اور شدید مخالف تھے جنھوں نے سید صاحب کی تردید میں چند رسالے بھی تحریر کئے ہیں وہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ ان کا ابتدائی عہد کمال زہد و تقشّف اور استغراق اور استہلاک میں گذرا۔ (۲)

ملا عبد القادر بدایونی متوفی ۱۰۰۴ھ نے سید صاحب کے کمالات کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے۔

> ایں مرد آیت است از آیات خدا و نیز در ولایت و جلالت و بزرگی محتاج سخن نیست (۳)

(یہ شخص اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے اور حالات ولایت و بزرگی

---

(۱) تذکرہ ص ۴۶۔

(۲) دربار اکبری ص ۸۲۴۔

(۳) نجات الرشید ص ۹۳۹۔

میں محتاج تعریف نہیں)۔

شیخ عبدالغنی شطاری بن شیخ عبداللہ شطاری متوفی ۱۰۴۰ھ تحریر فرماتے ہیں:

> میر سید محمد جونپوری رحمۃ اللہ مردی خالی از فضیلت نبودہ واز اکابران جونپور بودند در احمد آباد متوطن شدہ بودند در شاہ پور بیرون قلعہ احمد آباد مسجدی بودہ وعقب آں مسجد منزل داشتہ مردی نوارانی ومرتاض بودہ، ہمیشہ مشغول بود ومتوکل وہرگز از خانہ خود بدر نیامدہ وبخانہ ارباب دولت نرفتہ وبر فقر وفاقہ عمر خود بکمال عشرت وشادمانی گذرایند (۱)

(میر سید محمد جونپوری صاحب فضل وکمال اور اکابرین جونپور میں تھے احمد آباد میں شہر سے باہر ایک مسجد تھی اسکے پشت کی جانب ایک مکان میں اقامت گزیں تھے نہایت مرتاض اور نورانی بزرگ تھے ہمیشہ ذکر وفکر میں مشغول رہتے صفت توکل کے سات متصف تھے کبھی گھر سے باہر نہ نکلتے اور امراء کے یہاں حاضری نہ دیتے تھے فقر وفاقہ کی حالت میں نہایت مسرت وشادمانی کے ساتھ عمر گذاردی)۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی المتوفی ۱۰۵۲ھ اپنے ایک مکتوب میں رقمطراز ہیں۔

> ہر کمالے کہ محمد رسول اللہ داشت در سید محمد مہدی نیز بود فرق ہمیں است کہ آنجا باصالت بود وایںجا بہ تبعیت رسول بجائے اور سیدہ کہ ہمچوں اوشد فقط (۲)

(ہر وہ کمال جو محمد...... رکھتے تھے (بجز وحی اور رسالت کے) سید محمد اسکے حامل تھے فرق یہ ہے کہ وہاں اصل تھا اور سید نے ان کی اتباع کی بدولت اس کے مثل حاصل کیا)۔

ابوالفضل المتوفی ۱۰۱۱ھ آئین اکبری میں لکھتا ہے۔

> سید محمد جونپوری سید بدھ اویسی است از فراداں روحانیہ فیض برگرفتہ و برصوری ومعنوی علم چیرہ دست از شوریدگی دعویٰ مہدویت کرد بسیارے مردم بردگردیدند وبسا خارق از وبرگزارند۔ (۳)

---

(۱) تذکرۃ الاولیا قلمی نسخہ دار المصنّفین اعظم گڈھ ص ۱۴۸۔

(۲) دربار اکبری ص ۸۲۴۔ (۳) بحوالۂ دربار اکبری ص ۸۲۲۔

(سید محمد جونپوری (سید بدھ) مادرزاد ولی ہیں بے انتہا فیوض و برکات کے حامل تھے علوم ظاہری و باطنی میں مہارت تامہ رکھتے تھے شوریدگی حال میں دعوائے مہدویت کیا۔ ان کے بہت سے ماننے والے ہیں اور بہت سی کرامتیں ان کی جانب منسوب ہیں)

تحفۃ الکرام میں ہے۔

> ایشاں سلالۃ الاولیا الکرام واسوۃ النجباء العظام سید نور بخش کہ از سلسلہ کبرویہ علم فاخرت می افراختند - صاحب تصانیف وکشف وکرامات در تصوف تصرفا زاہل مقامات بودہ دراصل منشاء شریفش در بلدۂ جونپور الخ (۱)

مولانا آزاد تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ مولانا جمال الدین دہلوی نے سید محمد کی ولایت کے اثبات میں ایک کتاب لکھی اور دلائل وشواہد قاطعہ سے ثابت کیا کہ حضرت سید محمد کی ولایت حق ہے۔ (۲)

مندرجہ بالا علماء ومورخین کے علاوہ میاں حاتم سنبھلی، شیخ وجیہہ الدین گجراتی ابن حجر مکی وغیرہ علماء سید صاحب کو عالم حق اور واصل باللہ تسلیم کرتے ہیں۔

دعوائے مہدویت پر ایک نظر

اسلامی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ نویں صدی ہجری میں بہ چند وجوہ مہدی موعود کا چرچہ عام تھا سرزمین ہند سے عالم اسلام تک ان کے ظہور کے بارے میں افواہ پھیلی ہوئی تھی۔ اس عہد کے علماء ومشائخ کی محفلیں مہدی موعود کے ذکر سے گرم رہتی تھیں اس زمانے کے لگ بھگ ابن حجر نے ان احادیث کی خوب ترویج وتشریح کی جن میں مہدی موعود سے متعلق پیشین گوئیاں پائی جاتی ہیں اسی طرح حضرت سید اشرف سمنانی جو اپنے دور کے بلند پایا عالم اور صوفی تھے۔ ان کی محفلوں میں بھی مہدی آخر الزماں کی آمد سے متعلق احادیث کا خوب چرچا تھا۔ (۳)

---

(۱) تحفۃ الکرام ج ۱ ص ۴۵۰۔ (۲) تذکرہ ص ۳۲۔

(۳) لطائف اشرفی ص ۴۴۔

اس عہد کے قریب علماء حرمین نے بھی ایک فتویٰ شائع کیا تھا۔ جس میں لکھا تھا کہ ہجرت نبوی کے ہزار سال پورے ہونے تک مہدی موعود کا ظہور ہو جائے گا۔ (۱)

اسی دور میں جب کہ مہدی موعود کے ذکر سے عوام کے ذہن و دماغ بالکل معمور تھے۔ حضرت سید محمد جونپوری نے اپنی تحریک دعوت واصلاح کا آغاز کیا مقصد کی لگن اور اس کی سچائی کے یقین نے اس تحریک میں غیر معمولی قوت پیدا کر دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے ہی عرصے میں آپ کی تحریک کا غلغلہ جونپور سے گزر کر پورے ہندوستان میں پھیل گیا۔ اور بے شمار خلق اللہ آپ کے حلقہ ارادت میں شامل ہوگئی جس میں عالم جاہل، امیر غریب رعایا اور بادشاہ ہر قسم کے لوگ شامل تھے۔ سید صاحب کی حیات تک اس جماعت کے افراد نہایت پاک باطن اور خدا پرست تھے اور کسی قسم کی بدعت یا کوئی نیا عقیدہ ان میں رائج نہیں تھا۔ لیکن سید صاحب کی وفات کے بعد اس جماعت کے عقائد میں تبدیلی آگئی۔ جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ اس عہد میں مہدی کا چرچا عوام وخواص سب کی زبانوں پر تھا۔ اس لیے سید صاحب کے وفات پاتے ہی ان کے جاہل عقیدت مندوں نے اس عقیدے کا کھلے بندوں اعلان شروع کر دیا کہ سید محمد جونپوری ہی مہدی موعود تھے ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ حضرت سید نے خود اس کا دعویٰ نہیں کیا اور اگر عالم سکر میں یہ الفاظ کبھی آپ کی زبان پر آگئے تھے تو حالت صحو میں اس کی تردید کر دی جیسا کہ بہت سی تاریخوں سے ثابت ہے۔

خزینۃ الاصفیاء میں ہے۔

> سید محمد مہدی جونپوری قدس سرہ پدر دی یوسف واصلش از جونپور مرید و خلیفہ شیخ دانیال واز اولیائے مغلوب الحال وصاحب سکر بود در حالت سکر۔ چنانچہ بعضے اکابر انا اللہ وانا الحق وسبحانی وامثال آں گفتہ اند او لفظ مہدی برزبان آورد واما در حالت صحو مثل دیگر بزرگان از دعوئ مہدویت تائب شد بہ مہدی موعود اقرار نمود اما مردم جہلا کہ در زمان سکر حاضر بودند معاودت اور

---

(۱) بدایونی ص ۳۸۔

اعتبار نہ کردہ بر سخن اول او اصرار نمودہ اورا مہدی موعود دانستند و در چاہ ضلالت و بطالت افتادند۔ (۱)

(حضرت سید محمد کے والد یوسف ہیں۔ جونپور کے رہنے والے تھے۔ شیخ دانیال کے خلیفہ تھے۔ جونپور کے اولیائے کبار میں سے تھے وہ اکثر حالت سکر میں رہتے تھے۔ چنانچہ جس طرح بعضے اکابرین نے غلبہ حال میں انا اللہ اور انا الحق وغیرہ کہہ دیا اسی طرح سے انھوں نے انا مہدی کا نعرہ لگایا مگر جب افاقہ ہوا تو اس کی تردید کی اور مہدی موعود کا اقرار کیا مگر ان جہلا نے جو اس وقت مجلس میں تھے ان کے غلبۂ حال کے قول ہی کو اصل قرار دیا اور ان کو مہدی موعود کہنے لگے اور گمراہی میں پھنس گئے۔)

صاحب تحفۃ الکرام لکھتے ہیں۔

> مریدانش محمد مہدی آخر الزمانش خوانند واعتقاد نمودند کہ مہدی موعود گویند در آخر الزماں جلوۂ ظہور نمود ہمیں محمد است چنانچہ ایں عقیدہ در مزاج ایشاں راسخ گشتہ وحالانکہ مرشد بایں معنی امر نکردہ ایں بدعت مخترع مریدانش (۲)

(ان کے مریدین انھیں مہدی آخر الزماں کہتے ہیں اور اعتقاد رکھتے ہیں کہ جو مہدی آخری زمانہ میں آنے والے تھے وہ یہی سید محمد ہیں۔ چنانچہ یہ عقیدہ ان لوگوں میں پختہ ہو گیا ہے حالانکہ ان کے مرشد نے اس امر کا انہیں حکم دیا تھا بلکہ یہ بدعت سراسر مریدوں کی گڑھی ہوئی ہے۔)

اسی کے قریب قریب مراۃ احمدی کے خاتمے میں بھی ہے۔ (۳)

تحریک مہدویت کے بارے میں مولانا آزاد کا خیال ہے:

> یہ فرقہ سید محمد جونپوری کی طرف منسوب ہے جن کی نسبت بیان کیا جاتا ہے کہ مہدی ہونے کے مدعی تھے اگرچہ آگے چل کر اس فرقہ کے عقائد میں

---

(۱) خزینۃ الاصفیاء ص ۴۴۷۔

(۲) تحفۃ الکرام ج ا ص ۴۵۔

(۳) مراۃ احمدی ص ۴۶۷۔

بہت سی نئی باتیں اور حد غلو سے بھی گذرے ہوئے اعتقادات شامل ہو گئے، لیکن میرا خیال ہے کہ اس کی بنیاد صداقت و حق پرستی پر پڑی تھی یعنی دعوت و تبلیغ حق و احیائے شریعت و قیام امر بالمعروف و نہی عن المنکر اس کا مقصد اصلی تھا اور خود سید اور ان کے پیرووں کی پہلی جماعت کے اکثر بزرگ بڑے ہی پاک نفس اور خدا پرست تھے اس قسم کے معاملات ہمیشہ ابتدا میں کچھ ہوتے ہیں اور آگے چل کر کچھ اور بن جاتے ہیں اور فتنۂ غلو و تاویل پچھلی امتوں کی طرح اس امت کی ہر جماعت کے لئے بھی ایک بڑا فتنہ ہے یہی حالت اس جماعت کو بھی پیش آئی اور رفتہ رفتہ اس کی بنیادی صداقت اخلاف کے غلو و محدثات میں گم ہوگئی۔ (۱)

سید محمد جونپوری کے سوانح اور تعلیمات کے مطالعہ سے مجھ پر جو اثر ہوا اس سے میں نے رائے قائم کی کہ وہ اپنے وقت کے بہترین انسان قابل ترین عالم اور کامل ترین صوفی تھے جنکی ساری زندگی تعمیل احکام الٰہی اور اتباع رسول اللہ...... میں صرف ہوئی ایسے شخص نے دعوئ مہدویت کیا ہو مجھے یقین نہیں آتا اور کسی وقت حالت غلبہ میں مہدی ہونے کا اعادہ کیا ہو تو اس کو سہو پر اطلاق کرنا چاہیے جیسا کہ علی متقی نے فرمایا کہ ولی سے بھی ایسی غلطی ہو جاتی ہے اور الہام میں غیر انبیاء سے سہو ممکن ہے بلکہ غالب گمان یہ ہے کہ آپ کی وفات کے بعد ان کے مقلدوں نے ان کی طرف یہ دعویٰ منسوب کر کے تمام عقائد سے زیادہ اس پر زور دیا اور اسی پر زیادہ اصرار کرتے رہے۔ (۲)

☆ ☆ ☆

---

(۱) تذکرہ، ص ۴۷۔

(۲) مقدمہ رسالہ مناقب، ص ۶۴۔

اُستاذُ الملک ملا محمد افضل جونپوری

شرقی عہد ۸۰۴ھ سے مغل بادشاہ محمد شاہ ۱۱۳۱ھ کے زمانہ تک جونپور دیار یورپ میں علوم وفنون کا مرکز رہا ہے۔ مصر وشام اور دوسرے اسلامی ملکوں کے مقابلہ میں یہاں کے علماء نے اسلامی علوم وفنون پر کم کام نہیں کیا ہے۔ (آثر الکرام ج۱ ص۲۲۲)

جونپور کی تاریخ میں پچاسوں مدرسوں اور خانقاہوں کا پتہ چلتا ہے جن میں ہزاروں طلباء وفضلاء علمی وروحانی مشغلہ میں مصروف رہتے تھے۔ ذیل میں یہاں کے مشاہیر علماء ومشائخ کی مختصر فہرست پیش کی جاتی ہے جس سے ناظرین کو اس کی مرکزیت کا کسی حد تک اندازہ ہوگا۔

عہد شرقی کے مشاہیر

ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی جونپوری المتوفی ۸۴۸ھ (۲) قاضی نظام الدین کیکلانی جونپوری مرتب فتاویٰ ابراہیم شاہیہ المتوفی ۸۷۵ھ (۳) شیخ ابوالفتح سون برلیس جونپوری المتوفی ۸۵۸ھ (۴) ملا بیرام منطقی خطیب جامع مسجد ظفرآباد (۵) قاضی نصیرالدین گنبدی قاضی شہر جونپور (۶) شیخ عیسیٰ بن تاج الدین جونپوری المتوفی ۸۴۰ھ (۷) ملا عبدالملک بن عادل جونپوری استاذ ملا الہ داد۔

عہد لودھی کے مشاہیر

ملا علاء الدین الہ داد محشی ہدایہ وغیرہ المتوفی ۹۲۳ھ (۲) شیخ حسن بن طاہر جونپوری (۳) شیخ سید محمد جونپوری المتوفی ۹۱۰ھ (۴) شیخ معروف چشتی جونپوری (۵) قاضی

صلاح الدین بن خلیل جونپوری۔

عہد مغل کے مشاہیر

میر سید عبدالاول محدث جونپوری شارح بخاری شریف المتوفی ۹۶۸ھ (۲) ملا محمد یوسف قاضی خان المتوفی ۹۷۰ھ (۳) خواجہ محمد ارزانی مولف مدارج الاخبار المتوفی ۹۸۰ھ (۴) استاذ الملک ملا محمد افضل المتوفی ۱۰۶۲ (۵) ملا محمود بن محمد مصنف شمس بازغہ وغیرہ المتوفی ۱۰۶۲ (۶) دیوان محمد رشید المتوفی ۱۰۸۳ (۷) ملا ضیاء الدین استاذ شاہزادہ بہادر شاہ بن عالمگیر (۸) شیخ عبدالقدوس قلندر المتوفی ۱۰۵۲ (۹) ملا محمد جلیل، ملا محمد حسین، ملا ابوحامد بن حامد، یکے از مرتبین فتاویٰ عالمگیری (علمائے جونپور کا ماضی) ان حضرات کے علاوہ اور بھی بہت سے نامور علماء ومشائخ اس سرزمین سے اُبھرے جنھوں نے اپنے اپنے دور میں مدرسہ اور خانقاہ دونوں کو اپنی علمی و روحانی سرگرمیوں سے آباد کیا ان میں اعلم العلماء افضل الفضلاء جامع علوم ظاہری وباطنی قطب زماں استاذ الملک ملا محمد افضل عثمانی جونپوری کی ذات اپنے عہد میں خاص شہرت اور مخصوص مقام کی مالک ہے۔ قاضی شہاب الدین دولت آبادی کے بعد آپ جیسی ہمہ گیر اور جملہ علوم وفنون میں ماہر شخصیت سرزمین جونپور سے پیدا نہیں ہوئی۔

سید نورالدین زیدی ظفرآبادی لکھتے ہیں:

> دمیکہ ملک العلماء جادۂ عدم پیمودند اہل جونپور ماتم الوداع علم کردند مگر ندانستند کہ بذات خود ملک العلماء برفت وخلعت فاخرہ علم پس آئندہ استاذ الملک گزاشت (۱)

آپ کا حلقہ درس اس قدر وسیع تھا کہ اس زمانہ میں کوئی شخص ایسا نہیں تھا جس نے ان سے بالواسطہ یا بلاواسطہ کسب فیض نہ کیا ہو۔

تجلی نور میں ہے:

---

(۱) تجلی نور ص ۴۴۔

دراں زماں ہیچ کس نبود کہ پیش آں بلاواسطہ زانوے ارادت تہ نکرد و سبق نہ آموخت صدہا بفیض درس و تعلیم شاں عالم العلوم و فاضل متبحر گشتند (۱)

اس مضمون میں اسی فاضلِ یگانہ کے حالات پیش کیے جائیں گے۔ اس مضمون کی ترتیب میں حسب ذیل ماخذوں سے مدد لی گئی ہے۔

گنج رشیدی قلمی، گنج ارشدی قلمی، تجلی نور، سبحۃ المرجان، تذکرہ علمائے ہند، نزھۃ الخواطر، معارف اعظم گڑھ مئی ۳۰÷ ان کے علاوہ بحر ذخار مصنفہ شیخ وجیہ الدین اشرف لکھنوی، بسط الکلام فی وفیات الاعلام از شیخ یحییٰ عباسی الہ آبادی میں بھی ملا افضل کے حالات ہیں لیکن یہ دونوں کتابیں انتہائی کوشش کے باوجود بھی دستیاب نہ ہوسکیں اس لیے ان سے استفادہ نہیں کیا جاسکا۔

نام ونسب اور تاریخ پیدائش

نام محمد افضل، لقب استاذ الملک اور استاذ العلماء ہے۔ سلسلۂ نسب محمد افضل بن شیخ حمزہ بن شیخ فرید الدین بن شیخ بہاء الدین عثمانی ہے۔ شیخ عثمان ہارونی کی اولاد میں ہیں سلسلۂ نسب اس سے آگے معلوم نہیں ہوسکا۔

صوبہ اودھ کے مشہور تاریخی قصبہ ردولی میں ۱۶/رمضان ۹۷۷ھ کو بعہد جلال الدین اکبر پیدا ہوئے (۲)۔ آپ کے والد شیخ حمزہ گردش زمانہ سے تنگ آکر اپنے آبائی وطن شہر دماوند مضافات مازندران کو خیر باد کہہ کر ہندوستان چلے آئے تھے اور ردولی میں سکونت پذیر ہوگئے تھے۔

شیخ حمزہ زیور علم سے آراستہ تھے اس لیے عزت ووقعت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے، آپ کے تفقہ اور علم وفضل کا عملی اعتراف اس طرح کیا گیا کہ آپ کو عہدۂ قضا پر مامور کردیا گیا (۳)

---

(۱) ایضاً ص ۴۳۔

(۲) نزھۃ الخواطر ج ۵ ص ۳۵۹، وتجلی نور ص ۴۳۔

(۳) نزھۃ الخواطر ج ۵ ص ۳۵۹۔

تعلیم وتربیت

استاذ الملک نے علم وفضل کے گھوارہ میں آنکھ کھولی تھی۔ آپ کے والد عالم فقیہ اور مفتی کی حیثیت سے شہر میں ممتاز تھے۔ گھر میں فراغت ورفاہت بھی تھی جس کا اثر استاذ الملک کی نشو ونما پر بہت اچھا پڑا۔

ابتدائی تعلیم گھر میں اپنے والد کی نگرانی میں حاصل کی اور بہت جلد جملہ علوم وفنون میں دستگاہ پیدا کرلی۔ پھر مزید تکمیل کے لیے دہلی تشریف لے گئے اور شیخ حسین عمری کے حلقہ درس میں داخل ہوگئے۔ یہاں سے فراغت کے بعد ملا ابوحنیفہ تلمیذ حکیم گیلانی کے حلقۂ ارادت میں شامل ہوئے اور ان سے صحاح ستہ اور دیگر کتب حدیث پڑھ کر سند فراغت حاصل کی۔ ''الثقافتہ الاسلامیہ فی الہند'' کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ حدیث کی تکمیل کے سلسلے میں لاہور بھی گئے تھے۔

تبحر علمی

اس طرح بیس سال کی مدت میں سر آمدہ روزگار ہوگئے۔(۱)

نزھۃ الخواطر میں ہے۔

وجدّ فی البحث والاشتغال حتی برع فی العلم وافتیٰ ودرس وله نحو عشرین سنة صارَ من اکابر العُلماء(۲)

تحصیل وتعلیم میں انتہائی محنت وجانفشانی کی تا آنکہ تمام علوم میں فاضل ہوگئے اور بیس سال کی عمر میں اکابر علماء میں شمار کیے جانے لگے۔

نورالدین زیدی رقمطراز ہیں:

درتحصیل علوم چناں ریاضتہا کشید وجانہا کند یدکہ بعمر بست سال فاتحہ فراغ

---

(۱) تجلی نور ص۴۴۔

(۲) نزھۃ الخواطر ص ۳۵۹ ج ۵۔

خواند و طبع دقیقش نشتر زن عروق اشکالات و فکر بلیغش گرہ کشائے معضلات گشت (۱)

تذکرہ علمائے ہند میں ہے:

افضل الفضلاء عصر، اعلم العلماء دہر، جامع علوم عقلیہ و نقلیہ، متشرع و متقی، خوش خلق، سلیم المزاج بود۔ (۲)

ردولی سے جونپور آمد

تعلیم و تحصیل علوم سے فراغت اور جملہ علوم و فنون متعارفہ میں مہارت حاصل ہونے کے بعد اپنے برادر خورد سلطان محمود عثمانی کو ہمراہ لے کر ردولی کا قیام ترک کر کے دار الخیور شہر جونپور کی سکونت اختیار کر لی۔ (۳)

استاذ الملک نے ردولی کی سکونت کیوں ترک کی اور جونپور کب آئے اس سے تمام تذکرہ نویس خاموش ہیں۔ آپ نے ایسے دور میں آنکھیں کھولیں جب جونپور کے علوم و فنون کا غلغلہ پورے ہندوستان میں بلند تھا اس لیے قیاس ہے کہ یہ غلغلہ سن کر استاذ الملک جیسے شائق علوم کے دل میں اس مرکز علمی کی کشش پیدا ہوئی ہوگی اور آپ نے ردولی سے جونپور کا قصد کیا ہوگا پھر یہ سرزمین ایسی دل پسند ہوئی کہ یہیں کے ہو رہے۔ تذکرہ نگاروں کے سیاق کلام سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ فراغت تعلیم کے بعد ہی جونپور چلے آئے تھے اس اعتبار سے جونپور میں آپ کی آمد ۱۰۰۰ کے حدود میں ہوئی ہوگی۔

یہ زمانہ جون پور کے علمی شباب کا تھا اور وہاں متعدد مدارس کو تعلیمی مرکزیت حاصل تھی ان میں چند مشہور مدارس یہ تھے۔

(۱) مدرسہ ملا عبد الباری المتوفی ۱۰۳۶ (۲) مدرسہ ملا شیخ صادق المتوفی ۱۰۶۴ (۳)

---

(۱) تجلی نور ص ۴۴۔

(۲) تذکرہ علمائے ہند ص ۱۸۱۔

(۳) تجلی نور ص ۴۵۔

مدرسہ ملا شمس الدین بن نور الدین برنوی المتوفی ۱۰۴۷ (۴) مدرسہ مداریہ ملا مداری المتوفی ۱۰۷۲ (۵) مدرسہ ملا خلیل المتوفی (۱۰۷۹) (۶) مدرسہ شیخ حامد (۷) مدرسہ ملا سید مبارک بن خیر محمد وغیرہ (۱)

استاذ الملک نے بھی اپنی قیام گاہ کے متصل دائرۂ افضل کے نام سے ایک درسگاہ قائم کر کے تعلیم وتدریس کا سلسلہ شروع کردیا اس مدرسہ نے بہت جلد شہرت ومقبولیت حاصل کرلی اور طلباء کا اتنا مرجوعہ ہوا کہ تمام مدارس کی رونق سرد پڑ گئی۔

وہ آئے بزم میں اتنا تو میرؔ نے دیکھا پھر اسکے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

سلوک وتصوف

استاذ الملک نے پوری زندگی گو علماء کے انداز پر گزاری لیکن قدرت نے انھیں صوفی صافی بھی پیدا کیا تھا اس لیے عمر کے ساتھ ساتھ تصوف کی طرف میلان بڑھتا گیا۔ بالآخر شیخ عبدالقدوس قلندر جونپوری کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوگئے۔

شیخ عبدالقدوس قلندرؒ زہد وتقویٰ اور عشق الٰہی میں خاص امتیاز رکھتے تھے۔ استغناء اور ماسوی اللہ سے بے نیازی کا یہ عالم تھا کہ دنیا سے کوئی واسطہ ہی نہیں رکھتے تھے۔ جنگلات سے گھاس کاٹ کر فروخت کر کے بسر اوقات کرتے تھے۔ کھانے میں مشتبہات سے انتہائی پرہیز اور اکل حلال کا بڑا اہتمام تھا آپ کی ذات مرجع خلائق تھی خواص وعوام سب آپ کی صحبت کو سرمایۂ سعادت سمجھتے تھے اپنے وقت کے مشاہیر علماء نے آپ سے کسب فیض کیا۔

آپ کی پیدائش ۹۴۲ میں شہر جونپور میں ہوئی اپنے والد شیخ قیام الدین (۲) بن قطب الدین المعروف بہ قطب بینائے دل سے خلافت پائی تھی۔

اپنے مسترشدین کے شوق وطلب کا نہایت سخت امتحان لیتے تھے۔ گنج ارشدی میں

---

(۱) علمائے جونپور کا ماضی۔

(۲) شیخ عبدالقدوس کے والد کا اسم گرامی شیخ عبدالسلام (علن) بن شیخ محمد بن قطب بینائے دل ہے۔

ہے کہ جب دیوان محمد رشید جونپوری بیعت کے لیے حاضر ہوئے تو ان سے بات تک نہ کی اور دیوان صاحب بھی رعب کی وجہ سے اظہار مدعا نہ کر سکے مگر مسلسل خدمت میں حاضری دیتے رہتے تقریباً ایک برس کے بعد ایک دن قلندر صاحب نے فرمایا کہ کیوں حاضر ہوتے ہو۔ دیوان صاحب نے عرض کیا، بیعت کے خیال سے، حکم ہوا کہ نصف شب کے بعد آنا۔ خانقاہ دریا کے پار تھی اور آدھی رات کے بعد پُل کا دروازہ بھی بند ہو جاتا تھا۔ دیوان صاحب دریا پار کر کے حکم کے مطابق پہنچ گئے۔ اس وقت قلندر صاحب نے بیعت کی۔

تقریباً ایک سو بیس (۱۲۰) سال کی عمر میں ۱۲؍شوال ۱۰۵۲ کو اپنے محبوب حقیقی سے جا ملے۔ آپ کا مزار جیل خانہ کے جنوب میں سڑک اور جیل خانہ کی چہار دیواری کے درمیان واقع ہے۔(۱)

اس مقام پر یہ وضاحت ضروری ہے کہ بعض اہل علم نے عبدالقدوس قلندر اور عبدالقدوس شلطاری کو ایک ہی ذات سمجھا ہے حالانکہ یہ دونوں بزرگ الگ الگ شخصیت رکھتے ہیں شیخ عبدالقدوس شلطاری قدن شاہ اور قطب صدیق سے مشہور ہیں اور ضلع اعظم گڑھ کے مشہور قصبہ نظام آباد کے رہنے والے تھے اور آج بھی نظام آباد میں ان کا مزار مرجع خلائق ہے۔ شاہ قدن نظام آبادی میر علی عاشقاں سرائے میری کے پیر ہیں اور میر علی عاشقاں کی وفات ۹۰۵ھ میں ہوئی ہے۔(۲)

استاذ الملک نے جونپور آنے کے بعد بیعت کی اور تعلیم و تدریس کے ساتھ مجاہدہ و ریاضت کا بھی سلسلہ جاری رہا اور مختصر مدت میں تصوف کے اعلیٰ مقام پر پہنچ گئے اور قطبیت کے عہدہ سے سرفراز ہوئے۔

گنج ارشدی میں ہے۔

> مرتب احقر از پیر دستگیر خود شنیدہ فرمود کہ روز وفات استاذ العلماء حضرت بندگی شیخ محمد افضل قدس سرہ در لاہور ہماں روز ملا خواجہ قدس سرہ فرمودہ

---

(۱) گنج ارشدی قلمی ص ۱۲۴، و تجلی نور ص ۶۸۔

(۲) گنج ارشدی ورق ۱۲۴، و سیر المتاخرین ج ۱ ص ۲۳۵۔

امروز قطبِ جونپور وفات یافت۔(۱)
شیخ ملاخواجہ سلسلۂ قادریہ کے مشہور مشائخ میں ہیں۔
صاحب تجلی نور لکھتے ہیں:

قطع نظر علوم ظاہری اہل دل صوفی صافی روشن ضمیر آغاز وانجام حقیقت رابمیز ان اعتبار ہم سنجیدہ بود بیعت از شیخ عبدالقدوس قلندر جونپوری داشت درکرامت وخوارق بغایت ستر نمودہ(۲)

آزاد بلگرامی مرحوم لکھتے ہیں:

انه كان حصور اتقيا حسن الخلق سليم المزاج(۳)

استاذ الملک پاک باطن متقی خوش خلق اور سلیم المزاج تھے۔

تصانیف

استاذ الملک تمام علوم میں امامت وعبقریت کا درجہ رکھتے تھے مگر ان کی کسی تصنیف کا تذکرہ نہیں ملتا۔ معلوم ہوتا ہے حلقۂ درس کی وسعت اور مشغولیت نے تصنیف وتالیف کا موقع نہ دیا۔

شاعری

استاذ الملک کبھی کبھی تفنناً فارسی میں شعر بھی کہتے تھے مگر طبعاً شعر گوئی کی جانب میلان کم تھا نمونہ کلام یہ ہے۔

بازلف تو تودۂ عنبر چہ کنم　　باخال تو مشکنای اذخر چہ کنم
تو کافر و زلف کافر و دل کافر　　من نیم مسلماں بسہ کافر چہ کنم (۴)

---

(۱) گنج ارشدی ورق ۲۲۔　(۲) تجلی نور ص ۴۵۔

(۳) سبحۃ المرجان۔

(۴) تجلی نور ص ۴۵۔

وفات

آپ کے شاگرد رشید فخر استاذ ملا محمود کا انہتر سال کی عمر میں استاذ الملک کے سامنے انتقال ہوگیا تھا استاذ الملک اس صدمۂ جانکاہ سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ چالیس دن تک آپ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تک نہیں دیکھی گئی اور اکتالیسویں دن اس غم کو سینے سے لگائے ۱۹؍ربیع الثانی ۱۰۶۲ کو بعمر چوراسی سال سات ماہ تلمیذ عزیز سے جاملے۔ استاذ وشاگرد کے تعلق کی یہ مثال ایسی ہے جس کی نظیر تاریخ میں شاذ ونادر ہی ملے گی۔ بعض لوگوں نے تاریخ وفات ۱۹؍ کے بجائے ۱۳؍ربیع الثانی بیان کی ہے۔

مصرع ''زمحمود وافضل بگوآہ آہ'' سے استاذ وشاگرد دونوں کا سنہ وفات نکلتا ہے۔(۱)

مزار محلّہ سپاہ شہر جونپور میں ریلوے لائن سے مشرق جانب نیم کے درخت کے نیچے واقع ہے راقم الحروف کئی بار بغرض فاتحہ مزار پر حاضر ہوچکا ہے۔

استاذ الملک کے مزاج میں اس درجہ تواضع وانکسار تھا کہ کسی سے خدمت لینا قطعاً پسند نہیں کرتے تھے، اپنا کل کام خود ہی انجام دے لیتے تھے دیوان محمد رشید نقل کرتے ہیں کہ

> حضرت بندگی میاں محمد افضل ہمہ کارہا خودمی کردند حتی کہ چراغ حجرہ خود روشن کردند وکتاب از حجرہ خودمی آوردند (۲)

امراء وحکام کے دربار میں حاضری سے بہت اجتناب کرتے تھے کبھی اپنی غرض لے کر ان کے پاس نہیں گئے اگرچہ حکام آپ کی خدمت باعثِ سعادت سمجھتے تھے البتہ طلباء اور صوفیاء کی ضرورت کے وقت امراء کے پاس جانے میں تأمل نہ تھا۔

تجلی نور میں ہے۔

> باوصف چندیں باستدعا وطلب بہ دربار امراء وملوک نمیرفتی مگر برائے حوائج فقراو طلباء ہمچومردم بخانہ چشم منتظراں درآمدی (۳)

---

(۱) نزھۃ الخواطر ج۵ ص۳۵۹۔

(۲) گنج ارشدی ورق ۱۳۶۔ (۳) تجلی نور ص۱۔

اتنے کمالات کے باوجود کبھی کوئی طلب لے کر امراء کے دربار میں نہیں جاتے تھے البتہ طلباء وفقراء کی ضروریات لے کر نہایت عزت کے ساتھ جاتے تھے۔

اولاد وتلامیذ

استاذ الملک کی کسی اولاد کا ان کے تذکرہ نگاروں نے ذکر نہیں کیا ہے البتہ ان کے شاگردوں کی فہرست بڑی طویل ہے لیکن ان کی تعیین بھی مشکل ہے تاریخوں میں منتشر طور پر کچھ لوگوں کا پتہ لگتا ہے جن میں مشاہیر حسب ذیل ہیں۔

(۱) ملا محمود بن محمد جونپوری: آپ ولید پور(۱) ضلع جونپور کے اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ۹۹۳ھ میں پیدا ہوئے۔ تعلیم وتربیت استاذ الملک کے زیر سایہ تکمیل کو پہنچی۔ بڑے ذہین وفطین اور علم کے بیحد شائق تھے اس لیے تعلیم کے زمانہ میں بڑی محنت وجانفشانی سے تحصیل کی اور بہت جلد اپنے پیشرؤوں سے بھی آگے نکل گئے۔ آپ کے طلب واشتیاق کی قدر استاذ الملک بھی کرتے تھے۔ آپ فخر استاذ تھے استاذ الملک کے تمام تلامذہ میں آپ کا درجہ علمی اعتبار سے سب سے بڑھا ہوا ہے۔ صرف سترہ سال کی عمر میں جملہ علوم وفنون میں مہارت تامہ حاصل کرلی بالخصوص فلسفہ میں ایسا کمال پیدا کرلیا کہ متقدمین میں بھی ان کے ہم پایہ کم نظر آتے ہیں۔ متعدد اہم کتابوں کے مصنف ہیں ان میں شمس بازغہ اور فرائد محمودیہ بہت مشہور اور اپنے فن میں نہایت جامع ہیں۔ ایک عرصہ تک یہ دونوں کتابیں داخل نصاب رہ چکی ہیں۔ شمس بازغہ پر متعدد علماء نے حواشی وشروح لکھا ہے۔

شعر وسخن میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے۔ دو دیوان یادگار چھوڑے، دو شعر نمونۃً پیش ہیں۔

برصوفئ بے وجد وبال است عبادت　　برشیشہ کہ خالیست زمے سجدہ حرام است

اشکے کہ راز عشق بگوید فشاندنی است　　طفلے کہ خوش محاورہ افتد نماندنی است

---

(۱) اب ولید پور ضلع اعظم گڑھ میں ہے۔

ملا محمود نے اپنے استاذ کی طرح پوری عمر درس وتدریس میں گزار دی آپ کے مشہور شاگردوں میں ملا عبدالباقی جونپوری خاص شہرت کے مالک ہیں۔ ۱۰۶۲ میں آپ کا انتقال ہوا مزار چاچک پور شہر جونپور میں ہے۔ (۱)

(۲) دیوان محمد رشید بھی استاذ الملک کے ارشد تلامذہ میں ہیں۔ استاذ الملک سے انھیں خاص لگاؤ تھا۔ فراغت تعلیم کے بعد بھی ہفتہ میں ایک بار ضرور حاضری دیتے تھے جب تک استاذ الملک نے درس وتدریس کا صریحی حکم نہیں دیا اس کا سلسلہ شروع نہیں کیا لوگوں کے اصرار پر فرماتے کہ جس جگہ استاذ الملک جیسی ہمہ گیر شخصیت مصروف تدریس ہو مجھ جیسے شخص کے لیے تدریس کی مسند پر بیٹھنا مناسب نہیں ہے۔

دیوان صاحب جملہ علوم میں مہارت رکھتے۔ تعلیم وتدریس کے ساتھ تصنیف وتالیف کا بھی شغل تھا اور متعدد کتابوں کے مصنف ہیں جن میں مناظرہ رشیدیہ، شرح ہدایۃ الحکمت اور شرح اسرار المخلوقات نہایت جامع اور اہم ہیں رشیدیہ تو اب تک نصاب میں داخل ہے۔

علم ظاہری کے ساتھ علوم باطنی میں بھی آپ کا مقام بہت بلند ہے اس دور میں تصوف کے جتنے سلاسل رائج تھے ان سب سے آپ کو خلافت و اجازت حاصل تھی اس وصف میں دیوان صاحب اپنے تمام معاصرین میں ممتاز اور فائق تھے۔

شاعری میں بھی آپ کا پایہ بہت بلند ہے۔ شمسی تخلص تھا۔ دیوان شمسی کے نام سے آپ کا قلمی دیوان کتب خانہ رشیدیہ جونپور میں اب بھی موجود ہے۔

نمونۂ کلام یہ ہے:

بر بدن صد زخم خنجر گر زنی　　کے بمیرم جاں بجائے دیگر است
من بیکدم سیر عالم می کنم　　روح را دستے و پائے دیگر است

۱۰؍ ذیقعدہ ۱۰۰۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۹؍ رمضان ۱۰۸۳ھ کو وفات پائی۔ مزار محلہ رشید آباد شہر جون پور میں ہے۔ (۲)

---

(۱) تجلی نور ص ۴۹۔

(۲) گنج رشیدی قلمی، تفصیل کے لیے راقم کا مقالہ مطبوعہ ماہنامہ معارف اعظم گڑھ ماہ جون وجولائی ۲۷÷ دیکھیے۔

(۳) ملا ضیاء الدین جونپوری: استاذ الملک کے مشہور شاگرد ہیں جملہ علوم وفنون میں تبحر حاصل تھا۔ حدیث وفقہ اور لغت میں امتیازی شان رکھتے تھے۔ ایک ہزار سے زائد احادیث کے حافظ تھے۔ قاموس مولفہ مجدالدین فیروزآبادی بھی نوک زبان تھی۔ نہایت متقی، صالح اور پرہیزگار تھے۔ شہنشاہ عالمگیرؒ نے شاہ زادہ بہادر شاہ کی تعلیم وتربیت پر آپ کو مامور کیا تھا۔ عین عالم شباب میں وفات پائی۔ اس سے زیادہ معلومات حاصل نہ ہوسکیں۔ (۱)

(۴) سلطان محمود عثمانی: آپ استاذ الملک کے چھوٹے بھائی ہیں۔ ولادت قصبہ ردولی میں ہوئی۔ تعلیم استاذ الملک کی نگرانی میں پائی اور استاذ الملک کے ساتھ جونپور چلے آئے۔ یہیں شیخ مبارک بن خیر محمد جونپوری کی صاحبزادی سے عقد ہوا۔

سلطان محمود اپنے وقت کے مشہور صوفیاء میں تھے۔ اپنے خسر شیخ مبارک سے بیعت کی اور جملہ مقامات طے کر کے اعلیٰ مدارج پر پہنچ گئے۔ اپنے زمانہ میں مرجع خاص وعام تھے اور بے شمار کرامات آپ سے صادر ہوئیں۔

تجلی نور میں ہے۔

> طبیعت فقر آشنا بود واز خسر خود حضرت مبارک خیر محمد بیعت نمود ودر ریاضت باطنی برخود کشیدہ باندک۔ زمانہ طئی منازل کردہ منازل سلوک وفقر جادۂ مستقیم گشت واز میر علی عاشقاں سرائے میری ہم فراواں برگرفت وبسیار مردم بروگردیدند وبسیار خوارق از دپر گزارند (۲)

صاحب تجلی نور کی یہ تصریح کہ از میر علی عاشقاں سرائے میری ہم فراواں برگرفت محل نظر ہے کیونکہ صاحب سیر المتاخرین کے بیان کے مطابق میر علی عاشقاںؒ کی وفات ۹۰۵ میں ہوئی ہے اور تمام تذکرہ نویس اس بات پر متفق ہیں کہ سلطان محمود استاذ الملک سے عمر میں چھوٹے ہیں اور استاذ الملک کی پیدائش باتفاق مورخین ۹۷۷ میں ہوئی ہے اس لیے سلطان محمود کا میر علی عاشقاں سے کسب فیض کرنا کس طرح درست ہوسکتا ہے۔ واللہ اعلم۔

---

(۱) معارف مئی ۱۹۷۳ء۔

(۲) تجلی نور ص ۷۷۔

سن وفات معلوم نہ ہوسکا۔ مزار محلّہ چاچک پور شہر جونپور میں ہے۔

(۵) **محمد ارشد بن دیوان محمد رشید:** انھیں بھی استاذ الملک سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ استاذ الملک ان سے بہت محبت کرتے تھے۔ ان کا پہلا عقد استاذ الملک ہی کی تجویز پر ہوا تھا۔

ولادت ۱۰۴۱ میں ہوئی۔ بیس سال کی عمر میں علوم ظاہری کے ساتھ علوم باطن میں بھی درجۂ کمال کو پہنچ گئے۔ آپ کا مشغلہ بھی تعلیم وتدریس ہی تھا اور اس میں بڑا انہماک تھا۔ صبح درس گاہ میں بیٹھتے تو دوپہر کے وقت اٹھتے اور ظہر کی نماز اول وقت میں جماعت سے ادا کر کے پھر درس شروع کر دیتے تھے۔ طلباء سے بڑی محبت اور شفقت سے پیش آتے جو خود کھاتے انھیں بھی کھلاتے تھے۔ نہایت متقی، پرہیزگار اور پابند سنت تھے اگر کبھی فاقہ کی نوبت آجاتی تو بڑی بشاشت وانبساط کا اظہار فرماتے کہ سنت نبوی پر عمل کی توفیق ہوئی۔

حقیقت تو یہ ہے کہ خاندان رشیدی میں دیوان صاحب کے بعد اس پایہ اور مقام کا کوئی اور شخص پیدا نہیں ہوا۔ ۲۴/ جمادی الاولیٰ ۱۱۱۳ کو کلمہ توحید کا ورد کرتے ہوئے جاں بحق ہوئے۔ آپ کا مزار بھی اپنے والد مکرم کے پاس رشید آباد میں ہے۔(۱)

(۶) **شیخ مولا چندن:** نسلاً شیخ صدیقی تھے۔ جملہ علوم کی تعلیم استاذ الملک سے حاصل کی۔ اپنے دور کے مشاہیر علماء ومحدثین میں شمار کیے جاتے تھے۔ علم حدیث سے خاص شغف تھا۔ حرمین شریفین کے سفر میں مکہ معظّمہ کے محدثین عظام سے بھی حدیث کی تصحیح اور اسکی سند حاصل کی اسی سفر میں ۱۰۶۲ مکہ معظّمہ میں وفات پائی۔ زیادہ تفصیل معلوم نہ ہوسکی۔(۲)

* * *

---

(۱) گنج ارشدی ورق ۱۰ ج ۱۔

(۲) معارف اعظم گڑھ مئی ۱۹۳۰÷۔

حضرت شاہ طیب بنارسی
اور ان کے اسلاف وخلفاء

ابتدائیہ

بنارس ایک صنعتی اور ایک خاص طبقہ کا مذہبی مرکز ہونے کے علاوہ گذشتہ دور میں اسلامی علوم وفنون اور ارباب فضل وکمال کا بھی مرکز رہ چکا ہے، یہ علاقہ چھٹی صدی میں باقاعدہ اسلامی قلم رو میں شامل ہوا۔ سلطان شہاب الدین غوری کے غلام قطب الدین ایبک نے اس دیار کو فتح کر کے دہلی سے وابستہ کیا۔ اسی وقت سے علمی وروحانی خانوادے یہاں آ کر آباد ہونے لگے، خاص طور سے نویں صدی ہجری کے آغاز سے جب پورب کی آزاد خود مختار سلطنت کی بنیاد پڑی اور چند سالوں کے بعد سلطان ابراہیم شاہ شرقی متوفی ۸۴۴ھ تخت نشین ہوا تو اس کے علم پروری علماء نوازی اور عدل گستری کی بدولت پورب کی ساری سرزمین اسلامی علوم اور علمائے اسلام کے حسنات وبرکات سے لہلہا اٹھی۔ سلاطین شرقیہ کے بعد افق سلطنت پر لودھی خاندان کا ستارہ چمکا اور غروب ہوا۔ مگر یہاں علم ودانش اور فضل وکمال کی محفلیں جمی رہیں۔ زمانہ نے ایک کروٹ پھر لی اور ۹۳۳ھ میں شاہان مغلیہ کی سلطنت قائم ہوئی تو تیموری خاندان کا پانچواں حکمراں اس خطہ کی علمی ودینی شان وشوکت اور علماء وفضلاء کی کثرت دیکھ کر بے ساختہ پکار اٹھا ''مملکت پورب شیراز ماست'' اسی شیراز ماست کا ایک قابل قدر حصہ بنارس بھی تھا جہاں بہت سے علمی وروحانی خانوادے آ کر اس طرح اقامت پذیر ہوگئے کہ صدیوں تک ان کے فیوض وبرکات کا سلسلہ جاری رہا، ان باہر سے آنے والوں میں قدوۃ اہل تجرید، غریق بحر توحید فرید ثانی شیخ

الاسلام شیخ فرید بن قطب الدین اور ان کے برادر خرد امام العارفین ہمام العاشقین شیخ داؤد بن قطب الدین کے خاندان کو علمی و دینی لحاظ سے بڑا فروغ حاصل ہوا، گیارہویں صدی ہجری کے مشہور شیخ شاہ طیب بن معین بنارسی اسی خانوادے کے ایک فرد تھے۔ آئندہ صفحات میں شیخ طیب اور ان کے اسلاف اور خلفاء کے علمی و روحانی کارناموں کا تذکرہ کیا جارہا ہے۔

ماخذ و مصادر

ہماری تحقیق میں اس خاندان کے سب سے قدیم ترین تذکرہ نگار شیخ یٰسین بن احمد بنارسی متوفی ۱۰۷۶ھ ہیں جنھوں نے اپنے شیخ و مرشد طیب بنارسی کی وفات کے بارہ سال بعد مناقب العارفین میں اس خانوادے کا مفصل تذکرہ کیا ہے۔ اس کے بعد شیخ ارشد جون پوری متوفی ۱۱۱۲ھ کے ملفوظات گنج ارشدی میں شیخ طیب کے تذکرہ کے ضمن میں اس خاندان کے اکابر کا ذکر تفصیل سے ہے جس میں کچھ باتیں مناقب سے زائد ملتی ہیں۔ گنج ارشدی کا ایک قلمی نسخہ خانقاہ رشیدیہ جون پور میں ہے اور میری نظر سے کئی بار گذر چکا ہے۔

بحر ذخار میں بھی اس خانوادے کے بہت سے بزرگوں کا تذکرہ ہے جس کا ایک قلمی نسخہ پیرزادہ شاہ محمود احمد رمز ایڈووکیٹ خانقاہ ملا سید محمدی الہٰ آبادی کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ جسے پیرزادہ صاحب کی نوازشوں کے طفیل متعدد بار مطالعہ کرنے کا موقع ملا ہے۔ بعد کے جن تذکرہ نویسوں نے بھی اس خاندان کے کسی بزرگ کا تذکرہ کیا ہے ان کا مرجع یہی کتابیں ہیں۔ چنانچہ نزہۃ الخواطر عربی، سمات الاخیار، مرقع بنارس، تذکرہ مشائخ بنارس وغیرہ میں انہیں کتابوں کے حوالے سے اس خانوادے کا ذکر ملتا ہے۔

(۱) شیخ الاسلام شیخ فرید بنارسی

نام فرید اور لقب شیخ الاسلام ہے۔ شیخ کے مورث اعلیٰ جد گرامی شیخ خلیل فاروقی، ملک عرب سے ترک وطن کر کے ہندوستان وارد ہوئے اور ضلع غازی پور کے مشہور تاریخی

مقام قصبہ بھتری کے متصل منجھوارہ نامی بستی کو توطن کیلئے منتخب کیا۔ یہ بستی قصبہ بھتری اور قصبہ چندولی ضلع بنارس کے درمیان واقع ہے اور ذرا سی تبدیلی کے ساتھ اسی قدیم نام سے آج بھی موسوم ومشہور ہے۔ منجھوارہ نام کا ایک قصبہ ضلع اعظم گڈھ میں بھی ہے مگر اس منجھوارہ سے شیخ خلیل کا کوئی تعلق نہیں۔

مناقب العارفین میں ہے:

> گویند کہ شیخ خلیل فاروقی از ولایت بالا چوں بایں دیار رسید در پرگنہ منجھوارہ توطن اختیار نمود۔ (۱)

''لوگوں کا کہنا ہے کہ شیخ خلیل جب ولایت بالا (خراسان) سے اس دیار میں پہنچے تو پرگنہ منجھوارہ کو وطنیت کیلئے منتخب کیا۔''

ایک سطر کے بعد مزید تشریح کرتے ہوئے شاہ یٰسین رقمطراز ہیں:

> واز بعضے فرزنداں ایشاں شنیدہ کہ وے (شیخ خلیل) درقریہ جسڑی کہ متعلقات منجھوارہ است می بود، قبر شریف وے درہماں دیہ بالائے حوض بربلندی واقع است۔ (۲)

''شیخ کے بعض لڑکوں سے معلوم ہوا کہ وہ قریہ جسڑی متعلقہ منجھوارہ میں رہتے تھے، وہیں تالاب کے ٹیلے پر ان کا مزار بھی ہے۔''

محترم جناب ڈاکٹر صلاح الدین صاحب مدیر رسالہ ''معرفت حق'' الہ آباد، متوطن قصبہ بھتری سے معلوم ہوا کہ جسڑی قصبہ بھتری سے متصل ایک چھوٹی سی بستی ہے۔ اسی گاؤں کے قدیم تالاب کے ٹیلہ پر شیخ خلیل فاروقی کا مزار آج بھی مرجع خلائق ہے۔ شیخ خلیل علم وفضل اور زہد وورع کی دولتِ لازوال سے بہرہ یاب تھے اس لئے اس نئے وطن میں بہت جلد اپنا ایک امتیازی مقام پیدا کرلیا۔

صاحب مناقب کا بیان ہے:

---

(۱) مناقب العارفین ص ۸۸۔

(۲) ایضاً ص ۸۹۔

> آں جا بافراغت می بود اکثر امراء وقت کہ معتقد وے بودند خدمت وے را سعادت می دانستند۔

’’اس جگہ شیخ فراغت کے ساتھ رہتے تھے اس عہد کے اکثر امراء ان سے عقیدت رکھتے تھے اور ان کی خدمت کرنا سعادت تصور کرتے تھے۔‘‘

یہیں قریب کے موضع خانقاہ میں شیخ خلیل نے اپنے صاحبزادے قطب الدین کا عقد وہاں کے مشہور بزرگ شیخ نور کی صاحبزادی سے کر دیا، اس تعلق سے شیخ قطب الدین منجھوارہ کے بجائے خانقاہ میں شیخ نور کے پاس رہنے لگے تھے۔ شیخ قطب الدین کے دونوں مایۂ صد افتخار اور نادرۂ روزگار صاحبزادگان شیخ فرید و شیخ داؤد کی ولادت اسی موضع میں ہوئی۔

> والد شریف وے بندگی شیخ قطب بن شیخ خلیل فاروقی در مقام خانقاہ کہ دہے است معروف نزدیک بھتری می بودند تولد بندگی میاں فرید در ہماں مقام شدہ بود۔ (۱)

’’شیخ فرید کے والد شیخ قطب بن خلیل فاروقی موضع خانقاہ میں رہتے تھے جو بھتری کے پاس ایک مشہور قریہ ہے۔ شیخ فرید کی ولادت اسی قریہ میں ہوئی۔‘‘ (۲)

بنارس میں آمد

یہ بتانا مشکل ہے کہ زندگی کے کس مرحلے میں شیخ فرید نے اپنے مادری وطن خانقاہ کو الوداع کہا اور بنارس کو شرف وطنیت سے نوازا۔ تذکروں سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ اپنے والد شیخ قطب الدین کی وفات کے بعد شیخ فرید معہ برادر خرد شیخ داؤد تحصیل علم کی غرض سے بنارس تشریف لائے، اس وقت شیخ موسیٰ فردوسی خلیفہ ارشد مخدوم شرف الدین احمد بن یحییٰ منیری متوفی ۷۸۳ھ کی عظمت و شہرت کا آفتاب نصف النہار میں تھا، یہ دونوں بھائی انہیں کی خدمت میں پہنچے۔ شیخ یٰسین لکھتے ہیں:

---

(۱) مناقب العارفین ص ۸۸ (۲) ایضاً ص ۸۷۔

> گویند کہ بعد وفات بندگی شیخ قطب بندگی شیخ فرید مع برادر عزیز بندگی شیخ داؤد بقصد تحصیل علم در بنارس رسید چوں دراں وقت در شہر مذکور (بحذف القاب) شیخ موسیٰ فردوسی مشہور ترین وقت بودند بالضرورۃ آں ہر دو برادراں رخ بجانب خانقاہ حضرت ایشاں کردند۔ (۱)

''لوگوں کا بیان ہے کہ شیخ قطب کی وفات کے بعد دونوں بھائی شیخ فرید و شیخ داؤد بغرض تحصیل علم بنارس آئے چونکہ اس وقت اس شہر میں مشہور ترین شخصیت شیخ موسیٰ فردوسی کی تھی، اس لئے انہیں کی درسگاہ میں حاضر ہوئے۔''

صاحب مناقب کا بیان ہے کہ جس وقت یہ دونوں حضرات شیخ فردوسی کی خدمت میں باریاب ہوئے۔ شیخ نے دیکھتے ہی محبت آمیز انداز میں فرمایا ''بیائید فرید'' فرید آؤ پھر مجلس سے اٹھ کر گھر کے اندر گئے اور دو روٹیاں لاکر اپنے دست خاص سے ایک ایک دونوں بھائیوں کو مرحمت کی، پھر فرمایا ''نصیب شما از علومِ ظاہری و باطنی از برادر عزیز خواجہ مبارک است (ص ۸۹) یعنی تم دونوں کو علمی و روحانی دولت شیخ مبارک کی خدمت سے حاصل ہوگی اور خود ہی از راہ عنایت ایک خادم کے ذریعہ دونوں حضرات کو خواجہ مبارک بنارسی کی درسگاہ میں پہنچادیا۔

تعلیم و تربیت

خواجہ مبارک(۲) کا کاشانہ بیک وقت مدرسہ اور خانقاہ دونوں تھا۔ یہاں پہنچ کر ہر

---

(۱) مناقب العارفین ص ۸۶۔

(۲) حضرت خواجہ مبارک بنارسی اپنے وقت کے ممتاز علماء وفضلاء میں تھے۔ آپ کا حلقۂ درس بڑا وسیع تھا، ابتداء میں درس و تدریس میں خاص شغف رہا کسی شیخ و مرشد سے بیعت وارادت کا تعلق نہیں تھا لیکن صفائی باطن کی دولت سے آغاز ہی سے بہرہ ور تھے۔ کبھی کبھی خیال بھی ہوتا تھا کہ کسی سے بیعت کا تعلق قائم کرلیں لیکن علمی تبحر عقیدت کی راہ میں سدراہ بن جاتا تھا، ایک دن ان کے دل میں یہ خطرہ گذرا کہ شیخ محمد بن عیسیٰ جونپوری کے متعلق تواتر سے سننے میں آرہا ہے کہ بڑے صاحب تصرف بزرگ ہیں کیا اچھا ہوتا کہ یہ مجھ پر تصرف فرماتے۔ اور اپنی جانب جذب کرلیتے اس خیال کے آنے کے چند یوم کے بعد ایک شب خواب میں دیکھا کہ بنارس کے اکابر حضور...... کے استقبال کے ←

طرف سے بے نیاز ہو کر تحصیل علوم میں منہمک ہو گئے۔ خواجہ مبارک کی توجہ اور اپنی خداداد صلاحیت کی بدولت مختصر سی مدت میں جمیع کتب متداولہ کی تحصیل سے فراغت حاصل کر لی۔ شیخ نے جوہر قابل دیکھ کر، ظاہری علوم سے تکمیل کے بعد ان کی روحانی تربیت بھی شروع کر دی اور کلاہ ارادت ان کے سر پر رکھ کر مشائخ چشت کے اوراد و اذکار کی تلقین فرمائی۔ علوم ظاہری کی طرح اس میدان میں بھی شیخ فرید نے نہایت تیز روی کا مظاہرہ کیا، شب و روز ذکر و فکر، صوم و صلوٰۃ اور اشغال و مراقبہ میں مشغول رہنے کے ساتھ ساتھ شیخ کی خدمت سے بھی یک دم غافل نہ ہوئے تھے۔ شیخ فرید کی اس اطاعت شعاری اور خدمت گذاری نے خواجہ کے دل کو رام کر لیا۔ شیخ فرید کے حلقۂ ارادت میں داخل ہونے سے پہلے شیخ سعد اللہ بنارسی خواجہ کے خاص اور محبوب ترین خادم و مرید تھے، وضو اور غسل کی خدمت انہیں سے متعلق تھی، اکثر مبتدیان سلوک کی تربیت بھی انہیں کے حوالے ہوتی تھی اس اختصاص و امتیاز کی بناء پر خواجہ کے متعلقین میں انہیں خاص اہمیت حاصل تھی۔ اپنے

← لئے جا رہے ہیں یہ بھی ان کے ہمراہ ہو رہے اور حضور...... کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ پھر کیا دیکھتے ہیں کہ حضرت خواجہ بایزید بسطامیؒ کی آمد کا آوازہ بلند ہو رہا ہے اور لوگ کشاں کشاں ان کی خدمت میں چلے جا رہے ہیں، یہ بھی جانے والوں کے ساتھ ہو رہے اور جب قریب پہنچتے ہیں تو کیا دیکھتے ہیں کہ خواجہ بسطامی کی بجائے شیخ محمد بن عیسیٰ صدر مجلس ہیں انھوں نے حاضرین میں سے کسی سے سوال کیا کہ شور تو خواجہ بسطامی کی آمد کا تھا مگر یہ تو شیخ محمد جونپوری ہیں، اس شخص نے جواب دیا کہ بایزید بسطامی زمانہ یہی ہیں۔ یہ سن کر حسن عقیدت سے شیخ محمد کے قریب پہنچے۔ شیخ نے فرمایا مبارک سعادت کا وقت ہے وضو کر کے آؤ چنانچہ یہ وضو کر کے آئے تو تحیۃ الوضو پڑھنے کا حکم دیا پھر بیعت فرما کر اپنی کلاہ سعادت سر سے اتار کر خواجہ مبارک کے سر پر رکھ دی۔ نیند سے بیدار ہوئے تو ہاتھ وضو کے پانی سے تر تھا اور سر پر ٹوپی بھی موجود تھی۔ یہ صورت حال دیکھ کر شیخ محمد جونپوری کی عقیدت کا جذبہ موجزن ہو گیا جس کی رو میں تمام علمی غرور بہہ گیا اور جون پور کی راہ لی۔ خدمت میں پہنچے تو خواب میں جو کچھ پیش آیا تھا بعینہٖ وہی معاملہ شیخ نے عالم بیداری میں فرمایا۔ اب تو خواجہ مبارک کے حیرت و استعجاب کی حد ہی نہ رہی۔ چنانچہ فوراً شیخ محمد کے دست حق پر بیعت ہو گئے اور صرف ایک ہفتہ کی مدت میں اجازت و خلافت کی دولت سے مالا مال ہو کر بنارس واپس آئے اور طلباء و فقراء کی تعلیم و تربیت میں اس طرح مشغول ہوئے کہ پوری زندگی اسی میں گذار دی۔ آپ کی تلقین و تربیت سے بہت سے لوگ درجہ تکمیل تک پہنچے اور اجازت و خلافت سے مشرف ہوئے جن میں شیخ الاسلام حضرت شیخ فرید بنارسی، شیخ سعد اللہ بنارسی، شیخ بدھ حقانی جونپوری خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

اوپر خواجہ کی ان مہربانیوں، اور عنایتوں کو دیکھ کر انھیں بھی یقین تھا کہ خواجہ اپنا جانشین اور خلیفہ مطلق مجھے ہی منتخب فرمائیں گے۔ لیکن شیخ فرید کے خانقاہ میں آجانے اور ان کی صلاحیتوں کے اجاگر ہوجانے کے بعد شیخ سعد اللہ کا وہ اختصاص باقی نہ رہا، بلکہ شیخ فرید بھی اس میں برابر کے شریک ہوگئے۔

خلافت وجانشینی

شیخ سعد اللہ کا دستور تھا کہ خانگی ضروریات کے تحت ہفتہ یا مہینہ میں گھر تشریف لے جاتے، رات مکان پر گذار کر صبح کو خواجہ کی خدمت میں واپس آجاتے۔ حسب دستور ایک مرتبہ گھر گئے ہوئے تھے کہ شب میں خواجہ نے بوقت تہجد انہیں یاد فرمایا، چونکہ شیخ صاحب موجود نہیں تھے، اس لئے شیخ فرید نے عرض کیا ''فرید حاضر است'' خواجہ خاموش ہو رہے، کچھ دیر کے بعد پھر شیخ سعد اللہ کو آواز دی، شیخ فرید نے عرض کیا ''فرید حاضر ہے'' خواجہ پھر خاموش ہوگئے اور تھوڑے سے وقفہ کے بعد تیسری بار بلند آواز سے انہیں پکارا۔ شیخ فرید نے ڈرتے ہوئے باادب عرض کیا کہ شیخ صاحب آج موجود نہیں ہیں، گھر تشریف لے گئے ہیں۔ خواجہ نے فرمایا فرید غسل کیلئے پانی لاؤ شیخ نے فوراً حکم کی تعمیل کی۔ خواجہ مبارک کا معمول تھا کہ وہ نماز پنج گانہ اور تہجد کیلئے تازہ غسل فرمایا کرتے تھے۔ غسل سے فارغ ہوکر تہجد میں مشغول ہوگئے۔

شیخ فرید حجرہ کے متصل مؤدب کھڑے رہے، تہجد کے بعد خواجہ مراقب ہوگئے، مگر شیخ فرید بدستور اسی طرح کھڑے رہے۔ تقریباً سوا گھنٹہ کے مراقبہ کے بعد خواجہ نے شیخ فرید کو آواز دی اور حجرہ کے اندر طلب کیا شیخ فرید لرزاں وترساں حجرہ میں داخل ہوئے اور خواجہ کے حکم سے باادب روبرو بیٹھ گئے۔ خواجہ نے اسی وقت اپنا خرقۂ خاص ان کے زیب تن کیا اور فرمایا:

''ہر طالبے کہ پیش نما آید وآں رااہل دانی خرقہ پوشانی وتلقین نمائی''

''جو طالب بھی تمہاری خدمت میں آئے اور تمہیں اس میں صلاحیت معلوم ہو، تو

اسے بیعت کر کے اوراد و وظائف کی تلقین کرنا"

پھر مزید نوازش وکرم کی بارش کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

"فرزند من و جانشین من توئی نام من روشن خواہد شد ولایت بنارس را بتو دادم وہدایت اہل آں ولایت بتو سپردم"(۱)

"میرا (روحانی) فرزند اور جانشین تو ہی ہے میرا نام تیرے ذریعہ سے روشن ہوگا، اس شہر کی ولایت اور اہل شہر کی ہدایت کا کام میں تمہارے سپرد کر رہا ہوں۔"

اس کے بعد ان الفاظ میں چند نصیحتیں فرمائیں:

"باید کہ طالباں ہمدراں بمدارات وتواضع گذاری وبا فقراء سلوک نیکو کنی وبا طالب علماں مہرباں باشی ودرس علوم ظاہری نہ گذاری، وہر چہ از غیب رسد خرچ کنی"(۲)

"طالبان سلوک کے ساتھ ہمیشہ مدارات وتواضع سے پیش آنا، فقراء کے ساتھ حسن سلوک کا معاملہ کرنا اور طالب علموں کے ساتھ شفقت کا برتاؤ کرنا اور علوم ظاہری کے درس کو برابر جاری رکھنا اور جو کچھ فتوحات ہو اسے خرچ کرتے رہنا۔"

صبح کے وقت شیخ سعد اللہ خواجہ کی خدمت میں پہنچے تو انہیں اپنی محرومی پر نہایت صدمہ ہوا اور فرط حرمان ویاس سے آنکھیں اشک بار ہو گئیں، ان کے اس رنج واضطراب کو دیکھ کر خواجہ نے انہیں تسلی دی اور فرمایا: ماشاء اللہ کانَ، اپنے کو مبتلائے رنج ویاس مت کرو اس سعادت میں تمہارا بھی حصہ ہے۔ "سعد اللہ تا سعد اللہ وفرید تا قیامت" خواجہ کی پیشین گوئی بعد میں درست نکلی۔ شیخ سعد اللہ بھی خلافت واجازت سے شرف یاب ہو گئے، مگر ان کا سلسلہ ان ہی کی ذات پر منقطع ہو گیا۔ بالمقابل ان کے شیخ فرید بنارسی کا سلسلہ ڈھائی صدی تک نہایت شان وشوکت کے ساتھ جاری رہا اور ان کی خاندان میں نسلاً بعد نسلٍ اربابِ علم وفضل اور اصحاب خیر وصلاح پیدا ہوتے رہے۔

---

(۱) مناقب ص ۹۱۔

(۲) مناقب ص ۹۱۔

تعلیم وارشاد

خواجہ مبارک کے ساتھ شیخ فرید کی گرویدگی اور محبت کا یہ عالم تھا کہ علوم شریعت و طریقت میں درجۂ کمال پر فائز ہوجانے کے بعد بھی ایک لمحہ کیلئے ان کی صحبت سے علیحدگی گوارہ نہ تھی۔ چنانچہ خواجہ کی زندگی بھر ان کی صحبت سے جدا نہ ہوئے اور اکتساب فیوض کرتے رہے، خواجہ کی وفات کے بعد حسب ارشاد سجادۂ مشیخت پر بیٹھے اور سالکین کی تربیت وتلقین کے ساتھ درس وتدریس کا سلسلہ بھی ہمیشہ جاری رکھا۔ عام طور سے ظہر کے بعد درس دیتے تھے۔(۱)

مشائخ کی تذکرہ نگاری کا یہ پہلو ہمیشہ سے افسوسناک رہا ہے کہ ان کے درجات ومراتب اور کرامات وتصرفات کے انبار میں ان کی علمی زندگی دب گئی۔ شیخ فرید کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوا۔ تذکرہ نگاران کے روحانی تصرفات و درجات کا تو تفصیل سے ذکر کرتے ہیں لیکن علم ظاہری کے سلسلے میں سرسری طور سے یہ کہہ کر گذر جاتے ہیں کہ بعد ظہر سبق گفتے۔

اس لئے تلامذہ کی مکمل فہرست پیش کرنا ممکن نہیں، تلاش وتحقیق کے بعد صرف چار حضرات کے متعلق صراحت سے معلوم ہوسکا کہ انھوں نے شیخ فرید سے تعلیم حاصل کی، ان میں ایک شیخ کے خلف اکبر شیخ محی الدین بنارسی اور دوسرے ان کے برادرزادہ شیخ حسن بن شیخ داؤد بنارسی ہیں ان دونوں حضرات نے جملہ علوم متداولہ کی تحصیل وتکمیل شیخ فرید ہی سے کی۔ تیسرے اور چوتھے اسد العلماء شیخ نصیر الدین مصطفیٰ آبادی جھوسوی متوفی ۹۸۰ھ اور شیخ محمد حافظ بن حبیب اللہ بنارسی نبیرۂ شیخ فرید ہیں۔ ان دونوں حضرات نے شیخ سے نحو وصرف وغیرہ کی چند کتابیں پڑھیں۔

حالانکہ خود مناقب العارفین سے پتہ چلتا ہے کہ شیخ فرید کی خدمت میں طلبہ کی ایک کثیر تعداد ہروقت رہتی تھی۔ چنانچہ ایک جگہ یہ عبارت ہے۔

---

(۱) مناقب ص۹۳۔

''حضرت بندگی میاں (شیخ فرید) بتقریب عرس عزیزاں جائے تشریف برده بود جمیع طلبہ ہمراہ وے بودند۔''(۱)

''حضرت شیخ فرید کسی عزیز کی دعوت کے سلسلے میں کسی جگہ تشریف لے گئے تھے، تمام طلبہ ہمراہ تھے۔''

مطبخ کے خرچ کے ضمن میں ہے:

''خرچ مطبخ وے بحدے رسید کہ قریب صد کس از فقراء وطلبۂ علم ومہمان بر سفرۂ وے حاضر شدند''(۲)

''شیخ کے مطبخ کا خرچ اس قدر بڑھ گیا تھا کہ تقریباً ایک سو فقراء وطلبہ اور مہمان روزانہ دستر خوان پر موجود رہتے۔''

ان تحریروں سے واضح ہوتا ہے کہ شیخ کی خدمت میں طلبہ کی کثیر جماعت موجود رہتی تھی، لیکن ان کی تعلیمی سرگرمیوں کے سلسلے میں ایک حرف بھی نہیں ملتا کہ طریقہ تعلیم کیا تھا، نصاب میں کیا کیا کتابیں تھیں۔ پھر علوم وفنون میں شیخ کا کیا مقام تھا۔ کتنے طلبہ شیخ کی درسگاہ سے فارغ ہوکر نکلے۔ یہ سوالات عصر حاضر کے تذکرہ نگاروں کے اذہان میں ابھرتے ہیں۔ لیکن قدیم دور کے تذکرہ نویسوں کی جانب سے ان سوالوں کے جوابات سے عام طور پر محرومی ہی ہوتی ہے۔

خدمت خلق

خواجہ کی حیات ہی میں ان کی جانب لوگوں کا رجوع ہونے لگا تھا، لیکن سجادۂ مشیخت پر بیٹھنے کے بعد تو عام شہرت ومقبولیت حاصل ہوگئی اور ارادتمندوں کا حلقہ نہایت وسیع ہوگیا۔ طلبہ اور سالکین کی ایک بڑی تعداد ہر وقت خانقاہ میں موجود رہتی تھی، امراء وحکام بھی حاضری کو سرمایۂ سعادت خیال کرتے تھے۔ متعدد حکام نے عقیدت میں جاگیر

---

(۱) مناقب ص ۶۸۔

(۲) مناقب ص ۹۳۔

کے پروانے بھی پیش خدمت کئے، لیکن تجرید وتفرید اور استغناء کا یہ عالم تھا کہ ان کی جانب نظر التفات بھی نہ کی، عسرت وتنگی اور فقر وفاقہ کے ساتھ طلبہ وفقراء کی تعلیم وتربیت میں مشغول رہے کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ متعدد دن فاقے میں گذر جاتے، خانقاہ کے طلبہ اور سالکین کی حالت بھی شیخ سے مختلف نہ تھی۔ انہیں حالات میں ایک شب شیخ ومرشد خواجہ مبارک کو خواب میں دیکھا کہ فرمارہے ہیں ''اے فرید فردا ہدیہ از غیب رسد البتہ قبول خواہی کرد، ہرگز رد نہ کنی۔ خواجہ کی پیشین گوئی کے مطابق دوسرے دن پرگنہ کسوارہ کے حاکم کا فرستادہ پانچ سو بیگھ کا پروانہ لے کر حاضر ہوگیا۔ مناقب میں ہے:

> ''صباح آں وقت شخصے از نوکران بعضے حکام پرگنہ کسوارہ پروانۂ پانصد بیگھ زمین از برائے خرچ فقراء آورد ہر چند دل وے بدو مائل نہ بود اما از جہت اطاعت حکم حضرت خواجہ قبول کرد۔''(۱)

''اسی صبح کو حاکم پرگنہ کسوارہ کا ایک ملازم پانچ سو بیگھ آراضی کا پروانہ لے کر حاضر خدمت ہوا، ہر چند کہ شیخ کا دل قبول کرنے سے ابا کر رہا تھا لیکن مرشد کے حکم کی تعمیل میں قبول کرلیا۔''

اس کے بعد سے تنگیٔ معیشت اور فقر وفاقہ کی نوبت نہ آئی۔ رفاہیت وفراغت کے اس دور میں مرشد کی وصیت ''ہر چہ از غیب رسد خرچ کنی'' پر شیخ نے بڑے حوصلہ سے عمل کیا، جس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے شیخ یٰسین بنارسی رقمطراز ہیں:

> ''بعد ازاں خرچ مطبخ وے بحدے رسید کہ قریب صد کس از فقراء وطلبہ ومہمان بر سفرۂ وے حاضر شدند واز احوال ہمسائیگاں بہ کمال خبر گرفتی وہمہ را یومیہ طعام فرستادی واز اکثر مردم قبائل کما حقہ خبردار شدی ہیچ یکے را محروم نہ گذاشتی ہمہ را بقدر قسمت حصص معین ساختہ''(۲)

''اس کے بعد شیخ کے مطبخ کا خرچ اس قدر وسیع ہوگیا کہ تقریباً سو افراد از قبیل طلبہ،

---

(۱) مناقب ص ۹۳۔

(۲) مناقب ص ۹۳۔

فقراء اور مہمانوں کے دستر خوان پر موجود رہتے، ہمسایوں کے یہاں روزانہ پکا پکایا کھانا بھیجتے۔ اہل خاندان میں اکثر کے وظیفے بقدر حصہ متعین کر دیا اور کسی کو بھی محروم نہ رکھا۔“

اور خود شیخ کا اپنا معاملہ یہ تھا کہ ”اما خود دریافت شاقہ کشیدے واکثر صائم ماندے“۔ اسی دور میں چند بار حرمین شریفین کے سفر میں بھی گئے اور حج و زیارت کی سعادت سے شرف یاب ہوئے۔

”گویند کہ وے چند مرتبہ بہ سعادت زیارت حرمین شریفین مشرف شدہ۔“(۱)

کہتے ہیں کہ وہ (شیخ فرید) متعدد بار حرمین شریفین کی زیارت سے بھی مشرف ہوئے۔

وفات اور مدفن

شیخ کے خلف اکبر شیخ محی الدین کسی تقریب کے سلسلے میں چنار تشریف لے گئے تھے اس وقت وہاں کا حاکم ایک افغانی پٹھان تھا، خان کو شیخ محی الدین کا گھوڑا بہت پسند آیا اور بزور طاقت شیخ محی الدین سے لے لیا۔ صاحبزادے شیخ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور گھوڑے کی بازیابی کیلئے شیخ سے چنار چلنے کی درخواست کی۔ شیخ نے انہیں ہر چند سمجھایا اور صبر کی تلقین کی۔ لیکن ان کا اصرار واضطراب بڑھتا ہی گیا۔ اس لئے ان کی رعایت خاطر میں اپنے برادر خرد شیخ داؤد اور چند دیگر متعلقین کی معیت میں براہ دریا چنار تشریف لے گئے۔ شیخ کے وہاں پہنچتے ہی ارادتمندوں اور عقیدت کیشوں کا ان کے گرد زبردست مجمع اکٹھا ہو گیا۔ شیخ کی اس مقبولیت اور ہر دلعزیزی کو دیکھ کر ظالم افغانی بھی خدمت میں حاضر ہوا، اور نہایت خاطر مدارات اور نیازمندی کا مظاہرہ کیا اور شیخ کی تشریف آوری کے مقصد پر مطلع ہوتے ہی گھوڑا صاحبزادے کے حوالے کر دیا، اور جب شیخ وہاں سے واپس ہونے لگے تو مشایعت میں دریائے گنگا تک آیا جب شیخ معہ رفقاء کے کشتی پر سوار ہو گئے تو خبث باطنی کی وجہ سے ملاح سے اشارہ کر دیا کہ کشتی ساحل تک پہنچنے نہ پائے، درمیان ہی میں کسی تدبیر سے غرق کر دینا۔ چنانچہ کشتی جب بیچ دھارے میں پہنچی ملاح نے حاکم چنار کی

---

(۱) مناقب ص ۸۸۔

ہدایت کے بموجب کشتی کو درست کرنے کے بہانے سے ایک پٹرے کو اکھاڑ دیا اور کشتی مع سواروں کے غرقاب ہوگئی۔ رفقاء میں چند افراد بدقت تمام جان بچا سکے۔ بقیہ تمام لوگ جن میں غریق بحر توحید، رئیس اہل تجرید حضرت شیخ فرید اور ان کے برادر عزیز شیخ داؤد بھی تھے۔ دریائے گنگ کی تیز موجوں کی آغوش میں اس طرح کھو گئے کہ تلاش بسیار کے باوجود بھی کچھ سراغ نہ مل سکا یہ حادثہ فاجعہ ۱۴/ شوال ۹۰۶ھ کو وقوع میں آیا۔ (۱)

ایک غلطی کا ازالہ

محترم سید اقبال جون پوری اپنی مشہور تصنیف ''تاریخ شیراز ہند جون پور'' میں لکھتے ہیں ''(شیخ فرید) بحکم پیر سیر وسیاحت ختم کر کے جون پور تشریف لائے۔ محمود شرقی کے دور میں کچھ دنوں مشیر سلطنت رہے اس کے بعد جو گوشہ نشیں ہوئے تو مرتے دم تک پھر قدم باہر نہ نکالا۔ آپ کا مزار محلّہ شاہ گنج جون پور میں بعمارت پختہ وبلند موجود ہے۔ (ص ۶۰۹)

صاحب شیراز ہند کی تصریح کے بالمقابل محلّہ سنار پورہ شہر بنارس میں واقع ایک مزار کی نسبت شیخ فرید کی جانب کی جاتی ہے اور سالانہ ۱۴/ شوال کو اس کا عرس بھی ہوتا ہے۔

لیکن یہ دونوں روایتیں تاریخی اعتبار سے پایۂ تحقیق سے گری ہوئی ہیں کیونکہ خاندان فریدی کے پروردہ شیخ یٰسین بنارسی خلیفہ وجانشین شیخ طیب بنارسی اور شیخ محمد رشید جونپوری خلیفہ ارشد شیخ طیب موصوف دونوں اس پر متفق ہیں کہ شیخ فرید معہ برادر عزیز شیخ داؤد دریائے گنگا میں غرق ہو گئے اور تلاش بسیار کے باوجود دونوں کا جسد مبارک دستیاب نہ ہو سکا۔

> حضرت وے با برادر عزیز میاں شیخ داؤد قدس سرہما پیدا نشدند در آب غوطہ خوردہ ناپید شدند ہر چند بعضے معتقدان وے دامہا انداختند وتفحص نمودند، مگر اثرے ازاں بزرگاں یافتہ نشد۔ (۲)

---

(۱) مناقب ص ۹۷۔

(۲) مناقب ص ۹۷۔

’’حضرت شیخ فرید معہ شیخ داؤد، ظاہر نہ ہوئے پانی میں ڈوب کر ناپید ہوگئے۔ بعض معتقدوں نے جال بھی ڈالا مگر کوئی سراغ ان دونوں بزرگوں کا نہ مل سکا۔‘‘

پھر چند سطر کے بعد لکھتے ہیں: ’’قبر او برروئے زمین نیست‘‘ یعنی ان کی قبر روئے زمین پر نہیں ہے۔ چنانچہ تاریخ اسلامی ہند کے مشہور مورخ و محقق مولانا سید عبدالحئی حسنی بریلوی نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف ’’نزہۃ الخواطر‘‘ میں گنج ارشدی کے حوالہ سے اسی تحقیق کو نقل کیا ہے ملاحظہ ہو نزہۃ الخواطر ص ۲۵۸ ج ۴۔

رہا جون پور کا قیام اور مشیر سلطنت کا منصب تو یہ باتیں بھی بے اصل ہیں۔ مناقب اور گنج ارشدی کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ زندگی کے آخر لمحہ تک شیخ کا قیام بنارس ہی میں رہا۔ سفر حج کے علاوہ کبھی بھی زاویۂ عزلت سے قدم باہر نہیں نکالا۔ اور نہ مدت العمر کسی امیر یا حاکم کے دربار میں گئے۔ مناقب میں صاف موجود ہے کہ ’’در مدت عمر پیش حاکے و دنیاداراں نہ رفت‘‘ زندگی میں کبھی کسی حاکم اور دنیادار کے پاس نہیں گئے۔

خلفائے عظام

شیخ فرید بنارسیؒ کے فیض صحبت سے بہت سے لوگوں نے اکتساب فضل و کمال کیا اور منزل تکمیل و ارشاد تک پہنچے۔ شیخ یٰسین لکھتے ہیں: وو ے را خلفا بسیار بودند کہ بمرتبۂ تکمیل رسیدند‘‘ (۱) ان خلفائے بسیار میں مندرجہ ذیل حضرات نے بڑی شہرت و مقبولیت حاصل کی اور ان کا سلسلۂ فیض ایک عرصہ تک جاری رہا۔

(۱) شیخ حبیب اللہ بنارسی صاحبزادہ جانشین شیخ قدس سرہ۔

(۲) شیخ غیاث الدین حسن بن شیخ داؤد بنارسی رحمۃ اللہ علیہ۔

ان دونوں بزرگوں کے حالات آئندہ صفحات میں ملاحظہ فرمائیں۔

(۳) میر سید بدہ بھاری

یہ اپنے وقت کے متبحر عالم، عظیم المرتبت شیخ اور ماہر طبیب تھے۔ شیر شاہ سوری آپ کا

---

(۱) مناقب ص ۹۴۔

نہایت معتقد تھا اور بڑے نیاز مندانہ طور سے آپ سے پیش آتا تھا۔ اس وقت کے اکثر افغانی آپ کے حلقۂ ارادت میں داخل تھے۔ احکام شرعیہ کے اجراء میں کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ عبادت وریاضت کے ساتھ طلبہ کو درس دینے کا بھی معمول تھا۔ قاضی شہاب الدین دولت آبادی کی الارشاد کی ایک عمدہ شرح بھی لکھی۔ تاریخ وفات معلوم نہ ہوسکی۔ آپ کا مزار موضع مسوئیں صوبہ بہار میں ہے۔ (۱)

(۴) شیخ مبارک محدث بنارسیؒ

شیخ مبارک بن شیخ ارزآنی کے جد اعلیٰ رہتک سے ترک سکونت کر کے نواحی شہر بنارس میں بکھرا نامی قریہ میں آباد ہو گئے تھے، اسی جگہ شیخ مبارک کی ولادت ہوئی، بنارس اور جونپور کے علمائے عصر سے علوم وفنون کی تحصیل وتکمیل کی، فقہ، اصول فقہ، اور حدیث میں تبحر کا درجہ حاصل تھا، مشارق الانوار للصنعانی کی احادیث کو مشکوٰۃ کی ترتیب پر از سر نو مرتب کیا، اور اس کا نام مدارج الاخبار رکھا۔ اس علمی خدمت سے ماہ رجب ۹۵۲ھ کو فارغ ہوئے۔ آپ شیر شاہ سوری کے دربار سے منسلک تھے اور آخر میں ترقی کر کے منصب وزارت تک پہنچے۔ وزارت کی اہم ذمہ داریوں کے ساتھ ذکر واذکار اور عبادت وریاضت میں سر مو فرق نہیں آنے دیتے تھے۔ اپنے مرشد شیخ فرید سے والہانہ محبت رکھتے تھے۔ ۹۸۰ھ یا ۹۸۱ھ میں وفات ہوئی۔ آپ کی اولاد بنارس اور جونپور میں آباد ہے۔ (۲)

(۵) شیخ لاؤجون پوریؒ

شیخ لاؤ موضع قاضی پورہ متصل مڑیاہوں ضلع جونپور کے رہنے والے تھے۔ پوربی زبان کے زبردست شاعر تھے۔ اسرار طریقت کو اشعار میں نہایت اچھوتے انداز میں بیان کرتے تھے۔ اپنے شیخ ومرشد شیخ فرید کے مناقب ومحامد پر ایک طویل نظم پوربی زبان میں لکھی تھی جو بہت مقبول ہوئی۔ عرصۂ دراز تک اس دیار کے قوال اپنی محفلوں میں اسے گاتے تھے۔ مڑیاہوں کے اطراف وجوانب میں شیخ لاؤ کے بہت سے مریدین تھے۔

---

(۱) مناقب ص ۹۴، وتذکرہ علمائے ہند ص ۱۳۱۔

(۲) مناقب ص ۹۴۔ وتجلی نور ص ۵۵، ونزہۃ الخواطر ص ۲۷۷ ج ۴۔

قاضی پورہ ہی میں انتقال ہوا۔ اور وہیں دفن کیئے گئے۔ آپ کے خاندان کے لوگ اب بھی قاضی پورہ میں آباد ہیں۔ (۱)

اولاد امجاد

مبدۂ فیاض نے شیخ فرید کو جملہ نعمتوں کے ساتھ اولاد کی نعمت سے بھی نوازا تھا، آپ کے تین صاحبزادے تھے جن میں سب سے بڑے شیخ محی الدین اور چھوٹے شیخ حبیب اللہ تھے۔

(۱) شیخ محی الدین بنارسیؒ

یہ اپنے بھائیوں میں سب سے بڑے تھے۔ جملہ علوم متداولہ کی تحصیل اپنے والد ماجد ہی سے کی تھی، تمام علوم میں کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ شیخ کی زندگی ہی میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔

مناقب میں ہے:

> ''اعلم الزماں بندگی شیخ محی الدین کہ درعلم حالت قوی داشت وجمیع کتب متداولہ بحضور والد شریف تحصیل نمودہ بود و درس می گفت در صلاح وتقویٰ بےنظیر بود۔'' (۲)

''اعلم الزماں بندگی شیخ محی الدین علم میں اچھی صلاحیت رکھتے تھے، مروجہ نصاب کی جملہ کتابوں کی تحصیل اپنے والد ہی سے کی تھی اور درس وتدریس کا مشغلہ تھا۔ صلاح و تقویٰ میں بینظیر تھے۔''

حضرت شیخ فرید کے ہمراہ متعدد بار زیارت حرمین شریفین کی سعادت سے بہرہ ور ہوئے تھے۔ مناقب میں ہے۔

---

(۱) مناقب ص ۹۵۔

(۲) مناقب ص ۹۵۔

> ''گویند کہ وے ہمراہ پدر بزرگوار چند مرتبہ بحرمین شریفین رفتہ واز سعادت طواف مشرف گشتہ'' (۱)

> ''بیان کیا جاتا ہے کہ شیخ محی الدینؒ پدر بزرگوار کے ہمراہ چند بار حرمین شریفین حاضر ہوئے اور طواف وزیارت کی سعادت لوٹی۔''

انہیں کے گھوڑے کی بازیابی کے سلسلے میں شیخ چنار تشریف لے گئے تھے۔ اور واپسی میں غرقابی کا حادثہ پیش آیا۔ والد ماجد کی وفات کے بعد بنارس سے کچھ فاصلہ پر محی الدین پور کے نام سے ایک آبادی قائم کر کے وہیں رہنے لگے تھے۔ محی الدین پور ہی میں کسی تالاب کے ٹیلے پر آپ کا اور آپ کی اولاد کا مزار ہے۔ تاریخ وفات معلوم نہ ہو سکی۔ (۲)

(۲) شیخ ابواللیث بنارسیؒ

یہ شیخ کے منجھلے صاحبزادے ہیں۔ علوم ظاہری سے چنداں تعلق نہیں تھا۔ ابتداء ہی سے ان پر جذب وسکر کی کیفیت طاری ہوگئی تھی۔ سماع سے خاص ذوق تھا۔ بحالت سماع انتقال ہوا۔ آپ کا مزار محلہ بھدوں میں حضرت خواجہ مبارک کے مزار کے احاطہ میں ہے۔

(۳) شیخ حبیب اللہ بنارسیؒ

یہ اپنے بھائیوں میں عمر کے اعتبار سے سب سے چھوٹے تھے۔ لیکن فضل وکمال میں سب پر فوقیت رکھتے تھے۔ حضرت شیخ فریدؒ انہیں بہت چاہتے تھے۔ اور ایک دم کے لئے بھی اپنے پاس سے الگ نہ ہونے دیتے تھے، اور ان کی تعلیم وتربیت پر بطور خاص توجہ فرماتے تھے، چنانچہ انھوں نے بھی اپنی فطری صلاحیتوں اور نیک بختی کی بناء پر اکتساب فیوض میں مطلق کوتاہی نہیں برتی اور شیخ کی حیات میں ہی سلوک کے منازل طے کر کے خلافت واجازت سے مشرف ہوئے۔ ان کے اوصاف ومحامد کا تذکرہ کرتے ہوئے شیخ یٰسین لکھتے ہیں:

---

(۱) ایضاً۔ (۲) ایضاً۔

''بکمالات باطنی آراستہ بود و باخلاق حمیدہ پیراستہ خدمت فقراء و مسافراں بوجہ اتم کردے بدلجوئی غریباں کما حقہ نمودے و عمدہ خوبیہائے وے آں بود کہ جملگی اوقات حاضر خدمت والد بزرگوار بودے و خلاف مرضیٔ وے عمل نہ نمودے''۔ (۱)

''کمالات باطنی سے آراستہ اور اخلاق حمیدہ سے پیراستہ تھے فقراء اور مساکین کی خدمت و خاطر داری میں ذرا بھی تساہلی نہیں کرتے تھے۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ ہمیشہ والد بزرگوار کی خدمت میں حاضر رہتے۔ اور ان کی مرضی کے خلاف کوئی کام نہیں کرتے تھے۔''

شیخ فرید قدس سرہ کے سلسلے کو ان کے ذریعہ بڑا فروغ حاصل ہوا، اس دیار کے بے شمار افراد ان کے حلقۂ ارادت میں داخل تھے اور بہت سے لوگ تکمیل وارشاد تک پہنچے۔

مناقب میں ہے:

''اکثر طالبان از دولت توجہ وے بمقامات عالی رسیدند و روے شاہد مقصود دیدند۔'' (۲)

''اکثر طالبان (سلوک) ان کی توجہ کی برکت سے بلند مرتبہ پر پہنچے اور اپنے مقاصد سے ہمکنار ہوئے۔''

زندگی کے آخر ایام میں حج و زیارت کے ارادہ سے عازم مکہ معظّمہ ہوئے مگر راستہ ہی میں فرنگی رہزنوں نے کشتی پر حملہ کر کے غرق کر دیا اور تمام مسافروں کے ساتھ یہ بھی ڈوب کر جاں بحق ہو گئے۔

شیخ حبیب اللہ کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادے شیخ محمد حافظ بنارسی مسند سجادگی پر بیٹھے۔ شیخ حافظ صاحب نسبت بزرگ ہونے کے ساتھ ساتھ عالم و فاضل بھی تھے۔ تعلیم و تحصیل اپنے جد بزرگوار شیخ فرید اور خاندان کے دوسرے اکابر سے کی تھی۔

---

(۱) مناقب ص ۹۶۔

(۲) ایضاً ص ۹۹۔

عبادت وریاضت میں اپنے وقت میں ممتاز مقام کے مالک تھے۔

شیخ یٰسین کا بیان ہے:

''وے جمیع کتب متداول تحصیل نمودہ بعضے کتب بخدمت جد بزرگوار ہم خواندہ ونظر قبولیت ایشاں ہم می داشت وے در مجاہدہ وریاضت یگانہ بود''(۱)

''انھوں نے تمام متداول کتابوں کو پڑھا تھا، بعض کتابیں اپنے جد بزرگوار (شیخ فرید) سے بھی پڑھا۔ شیخ کے مقبول نظر تھے اور مجاہدہ وریاضت میں بے نظیر۔''

اپنے بزرگوں کی طرح شیخ حافظ بھی مدت العمر امراء وسلاطین کے دربار میں کبھی نہیں گئے۔ ان کی وفات کے بعد شیخ چاندہ صاحب سجادہ ہوئے یہ شیخ حافظ کے صاحبزادے اور خلیفہ تھے۔ عسرت وتنگی کے باوجود فقراء وطلبہ کی خبر گیری بڑے فراخ حوصلگی سے کرتے تھے۔ ان کے دو صاحبزادے ہوئے۔ شیخ طاہر اور دیوان شاہ عبدالحفیظ، ان دونوں حضرات کے متعلق شیخ غلام رشید جونپوری کا بیان ہے کہ مشائخ کبار وقدوۂ صغار وکبار بودند، اپنے والد کے بعد یہی شیخ طاہر جانشین ہوئے۔ یہ شیخ طیب بن معین بنارسی کے خاص ارادتمندوں میں تھے۔ شریعت آباد میں ایک حجرہ بنا کر عرصہ تک ذکر واشغال میں مشغول رہے، وہیں برنا وگنگا کے سنگم پر آپ نے ایک سنگین مسجد بھی تعمیر کرائی جو آج تک ان کی یادگار ہے۔ شیخ طیب کی وفات کے تین ماہ بعد ۱۰۴۲ھ میں انتقال کیا۔(۲)

شیخ طاہر کی شادی دائرۂ اجمل شاہ میں شیخ طاہر بن یحییٰ خوب اللہ کی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔ جن کے بطن سے چار صاحبزادے شیخ عبدالرحمٰن، شیخ عبدالسبحان، شیخ عزیز اللہ، اور شیخ نور اللہ پیدا ہوئے۔ جو سب کے سب علم وفضل اور صلاح وتقویٰ سے آراستہ تھے۔ دوسرے صاحبزادے دیوان شاہ عبدالحفیظ کا عقد امروہہ میں میر سید بڈھن امروہوی کی صبیہ سے ہوا تھا جن سے ایک صاحبزادہ شیخ فیض اللہ ہوئے۔ شیخ فیض اللہ بھی صاحب نسبت اور عظیم المرتبت بزرگ تھے، ان کی نسبت میر سید محمد تقی ظفر آبادی کی دختر سے ہوئی۔ جن سے تین بیٹے شیخ رضی، شیخ محمد رفیع اور شیخ سیف اللہ اور دو صاحبزادیاں

---

(۱) مشائخ بنارس ص ۱۲۔ (۲) مشائخ بنارس ص ۲۵۔

ہوئیں۔ شیخ محمد رضی کے صاحبزادے شیخ غلام حفیظ تھے، جن کی شادی شیخ رزق اللہ الٰہ آبادی کے یہاں ہوئی تھی۔ شیخ غلام حفیظ کے دو صاحبزادے صوفی صلاح الدین اور مولوی خیرالدین محمد پیدا ہوئے۔ مولوی خیرالدین نے اپنے وقت میں بڑا فروغ حاصل کیا۔ جملہ علوم میں کامل مہارت رکھتے تھے۔ ایک عرصہ تک انگریزی حکومت سے منسلک رہے۔ آخر میں پنشن لے کر علیحدگی اختیار کرلی۔ اور راجہ بنارس کے دربار سے وابستہ ہوگئے تھے۔ مولوی خیرالدین نے بہت سی مفید کتابیں بطور علمی یادگار کے چھوڑیں، جن میں جون پورنامہ (تذکرۃ العلماء) اور بلونت نامہ نہایت اہم ہیں، تذکرۃ العلماء کا ایک مطبوعہ نسخہ دارالمصنّفین اعظم گڈھ میں موجود ہے اور میری نظر سے گذر چکا ہے اور بلونت نامہ کا قلمی نسخہ راجہ بنارس رام نگر کے کتب خانہ میں ہے۔ (۱)

اس سلسلۃ الذہب کا ایک سلسلہ یہاں آکر ختم ہوجاتا ہے۔ دوسرے سلسلہ کی ابتداء شیخ فرید بنارسی کے برادر خورد شیخ داؤد بنارسی سے ہوتی ہے۔ جس کی تفصیلات آئندہ صفحات میں ملاحظہ فرمائیں۔

(۲) حضرت شیخ داؤد بنارسیؒ

شیخ داؤد بن قطب بنارسی شیخ فرید کے چھوٹے بھائی تھے۔ انھیں کے ہمراہ بغرض تحصیل علم بنارس آئے۔ پھر شیخ فرید کی طرح یہیں بود و باش اختیار کرلی۔ علوم وفنون کی تکمیل حضرت خواجہ مبارک بنارسی سے کی اور بیعت وارادت کا تعلق اپنے برادرِ کلاں شیخ فرید سے قائم کیا۔ شیخ فرید کی اطاعت و خدمت کا حد درجہ اہتمام کرتے تھے۔ صاحب مناقب لکھتے ہیں:

> ”گویند کہ شیخ داؤد دراز خردی تا آخر وقت غیر از خدمت برادر کلاں کارے دیگر مقصود نبود حتیٰ کہ بہ نوافل ہم کم پرداختے حکم وے را منتظر بودے، ہرچہ می فرمود ہمازاں ساختے۔“ (۲)

---

(۱) مکتوب شاہ بدیع الدین لکھنوی بنام غلام حفیظ بنارسی قلمی بخط مولوی خیرالدین جونپوری۔

(۲) مناقب العارفین ص ۹۰۔

”بیان کیا جاتا ہے کہ شیخ داؤد کو بچپن سے آخر عمر تک بجز شیخ فرید کی خدمت کے کوئی اور کام نہیں تھا۔ حتیٰ کہ ان کی خدمت کی انجام دہی کے پیش نظر نوافل میں بھی کم ہی مشغول ہوتے ہمہ وقت حکم کے منتظر رہے اور جو کچھ وہ فرماتے اسی وقت اس کو پورا کرتے۔“

تعلیم و تحصیل سے فراغت کے بعد علماء و صلحاء کی طرح پوری زندگی درس و تدریس میں بسر کردی۔ ۱۴؍شوال ۹۰۶ھ کو شیخ فرید کے ساتھ دریائے گنگا میں غرق ہو کر درجۂ شہادت سے مشرف ہوئے۔ شیخ داؤد علوم فنون کے ساتھ صلاح و تقویٰ سے بھی آراستہ تھے، لیکن انھوں نے اپنے آپ کو اس طرح گوشۂ گمنامی میں رکھا کہ وہ شہرت و مقبولیت انہیں حاصل نہ ہو سکی جس کے یہ مستحق تھے۔

شیخ داؤد کے کل تین اولادیں ہوئیں۔ شیخ حسن، شیخ اللہ داد، اور ایک صاحبزادی۔ شیخ حسن اپنے فضل و کمال کے لحاظ سے کبار مشائخ چشت میں شمار ہوتے ہیں۔

حضرت شیخ حسن بنارسی

شیخ حسن کی علمی و دینی جلالت پر ان کے سبھی تذکرہ نگار متفق ہیں اور ہر ایک نے نہایت شاندار و پرشوکت الفاظ میں ان کا ذکر کیا ہے۔ تاریخ ولادت اور ابتدائی حالات پر لاعلمی کا دبیز پردہ پڑا ہوا ہے، تلاش و جستجو کے بعد اتنا معلوم ہو سکا کہ علوم و فنون کی تحصیل و تکمیل اپنے تایا شیخ فرید بنارسی سے کی۔

مناقب میں ہے:

> اکثر کتب ہائے متداول را در خدمت عم خرد شیخ الاسلام بندگی شیخ فرید بن قطب تحصیل نمودہ بود۔

”اکثر کتب مروجہ کی تعلیم اپنے تایا شیخ الاسلام بندگی شیخ فرید بن قطب الدین سے حاصل کی تھی۔“

ان کے علاوہ کبھی کسی استاذ کے آگے زانوے ادب تہہ کیا تھا یا نہیں اس بارے میں کوئی تصریح نہیں ملتی، لیکن قیاس یہ کہتا ہے کہ والد ماجد شیخ داؤد سے بھی کچھ ضرور پڑھا ہوگا

کیونکہ یہ بھی اپنے وقت کے ایک جید عالم اور کامیاب مدرس تھے اور شیخ فرید کی طرح درس وتدریس کی خدمت انجام دیتے تھے۔ اس لئے اغلب یہی ہے کہ ابتدائی تعلیم کا مرحلہ والد بزرگوار کے سایۂ عاطفت میں طے ہوا ہوگا۔

علمی مقام

شیخ حسن بنارسی قدس سرہٗ جملہ علوم میں تبحر کا درجہ رکھتے تھے، اس وقت کے علماء و فضلاء ان کی علمی جلالت وعبقریت کے معترف تھے۔

شاہ یٰسین رقمطراز ہیں:

> درعلم ظاہری حالت قوی داشت فضلائے وقت منقاد وے بود وعلماء زمان مطیع او (ص ۷۹)

"علم ظاہری میں قوی صلاحیت رکھتے تھے، اس وقت کے علماء وفضلاء نے ان کے سامنے سر اعتراف خم کر دیا تھا۔"

شاہ یٰسینؒ نے ایک دوسرے موقع پر اجلۂ وقت واعاظم عہد کے وقیع الفاظ سے یاد کیا ہے۔ حضرت شیخ فرید بنارسی کو بھی ان کی علمی استعداد اور صلاحیت پر پورا اعتماد تھا اور اپنے مخصوص تلامذہ کو ان کے حوالے کر دیا کرتے تھے۔

تدریس وتصنیف

تعلیم وتحصیل سے فراغت کے بعد اپنے بزرگوں کی طرح شیخ حسن نے بھی مسند تدریس کو زینت بخشی اور تشنگان علوم کی تسکین خاطر کا سامان فراہم کیا۔ آپ کے حلقۂ درس سے ایک کثیر جماعت نے اکتساب فیض کیا جن میں اسدالعلماء شیخ نصیرالدین مصطفیٰ آبادی جھوسوی کا نام نامی سرفہرست ہے۔

تدریسی خدمات کے ساتھ تصنیف وتالیف کے ذریعہ بھی آپ نے علمی حلقہ کو مستفید کیا اور ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادیؒ متوفی ۸۴۹ھ کے تتبع میں

بطرز ارشاد فن صرف میں ایک کتاب تصنیف کی اور نام مرغوب الطالبین رکھا، علم نحو میں بھی ایک رسالہ سپرد قلم کیا۔

مناقب میں ہے:

> وِوے در علم صرف کتابے در طریق ارشاد ملک العلماء متضمن ز مثال نوشتہ
> وآں را مرغوب الطالبین نام نہاد و رسالہ در علم نحو ہم نوشتہ (ص۷۹)

''اور انھوں نے (شیخ حسن) فن صرف میں ایک کتاب ملک العلماء کی ارشاد کے طرز پر مثالوں کو بیان کرتے ہوئے تحریر کی اور اس کا نام مرغوب الطالبین رکھا اور فن نحو میں بھی ایک رسالہ تصنیف کیا۔''

مرغوب الطالبین اب دنیا سے ناپید ہو چکی ہے، اس لئے اس کے بارے میں کچھ لکھنا دشوار ہے۔ البتہ قاضی شہاب الدین کی ارشاد کے ساتھ مشابہت اس کی اہمیت وافادیت کی جانب مشیر ضرور ہے۔

احسان وسلوک

سلسلۂ تدریس نہایت شان وشوکت اور وقار وتمکنت کے ساتھ جاری تھا۔ تشنگان علوم دور و دیار سے آ آ کر اپنی تشنگی بجھا رہے تھے، عین اسی ہنگامہ قال اقول میں جاذب حقیقی نے اپنی جانب کھینچنا شروع کیا۔ درس وتدریس سے دل یکلخت سرد پڑ گیا۔ مدرسہ کی زندگی سے وحشت ہونے لگی اور خانقاہ کے ماحول سے انس بڑھنے لگا۔ حالت کے اس تغیر سے اپنے استاذ حضرت شیخ الاسلام فرید بنارسی کو مطلع کیا۔ اور سلسلہ درس کو موقوف کر کے راہ طریقت میں قدم رکھنے کی اجازت طلب کی۔ شیخ کی خواہش تھی کہ ابھی کچھ دنوں تک علمی مشاغل کو برقرار رکھیں، لیکن ادھر تو ذہنی وقلبی کیفیات میں انقلاب عظیم پیدا ہو چکا تھا، عشق الٰہی نے دل میں جو آگ لگا دی تھی، اس کے بجھانے کے لئے فنون کے خشک مباحث کے بجائے آخر شب کی آہ سرد کی ضرورت تھی۔ بالآخر مرشد کامل نے حالات کے پیش نظر بیعت فرما کر اذکار و اوراد کی تلقین کی، اور ریاضت ومجاہدہ کا حکم دیا۔

صاحب مناقب لکھتے ہیں:

> چوں طبیعت از درس علوم سرد شد کتاب ہائے را در گوشہ نہاد و از مدرسہ در کنج فقرا می افتاد و احوال خود بخدمت مخدوم و مربی و عم خود عرض کرد ایشاں ہر چند می خواستند کہ چند روز در استفادہ علم مشغول باشند ہر گاہ شوق ایشاں غالب دید بعد ارادت وعنایت بہ تشریف خرقہ بطریق حضرت خواجگان چشت و آخر العمر اوقات تحفظ انفاس و مجاہدۂ نفس فرمود (ص ۷۹)

”جب طبیعت علوم ظاہری کے درس سے سرد پڑ گئی تو کتابوں کو ایک کنارے رکھ کر گوشۂ فقراء میں شامل ہو گئے اور اپنے احوال سے حضرت شیخ فرید کو مطلع کیا شیخ کی خواہش اگر چہ یہی تھی کہ ابھی سلسلہ درس کو جاری رکھیں، لیکن ان کے شوق فراواں کو دیکھ کر بطریق خواجگان چشت بیعت کیا اور تا مد العمر حفاظت اوقات اور ریاضت و مجاہدہ کی تلقین فرمائی۔“

بیعت و تلقین کے بعد آبادی سے باہر راجہ بنارس کے قلعہ کے کھنڈرات کے متصل ایک حجرہ بنا کر عزلت گزیں ہو کر اذکار و اشغال، اوراد اور دیگر مشاغل سلوک میں منہمک ہو گئے، مسلسل روزہ پر روزہ رکھتے اور افطار میں خشک جو کی روٹی پر اکتفا فرماتے۔ ان ایام میں صرف اوقات نماز یا شیخ و مرشد اور والد بزرگوار کی زیارت کی غرض سے شہر میں آتے، ورنہ ہمہ وقت اسی ویرانہ میں تنہا مجاہدات و عبادات میں مشغول رہتے تھے تا آنکہ درجہ کمال کو پہنچے اور خرقۂ خلافت سے مشرف ہوئے۔

مناقب میں ہے:

> تا کہ بکمالات رسید و بمقام عالی و مرتقی گردید و اجازت تلقین طالباں یافت
>
> (ص ۸۰)

”یہاں تک کہ درجہ کمال تک پہنچے اور بلند مقام پر فائز ہو کر خلافت و اجازت سے مشرف ہوئے۔“

خلافت سے شرف یاب ہونے کے بعد شیخ حسن قدس سرہ نے محفل ارشاد و تلقین کو سجایا اور رشد و ہدایت کے آب زلال سے تشنگان معرفت و حقیقت کے تسکین دل کا سامان

کرنے کے ساتھ ان کے ساتھ قلب و روح کے تزکیہ وتصفیہ کی سعی میں ہمہ تن مصروف ہوگئے اوراس ویرانہ سے منتقل ہوکرمخلوق خدا کی سہولت کی خاطر علوی پورہ میں قیام فرمایا، اور زندگی کے آخری سات سال یہیں بسر کئے۔ اس زمانہ میں ہمہ وقت استغراق اور حضور دائمی کے لذت وسرور سے مخمور رہتے تھے۔ اس محویت کے عالم میں گرد وپیش کی کچھ خبر نہ رہتی تھی، نماز پنجگانہ کے وقت خادم کان میں اللہ اکبر کی صدا بلند کرتا تھا تو کچھ دیر کے لئے افاقہ ہوجاتا اور نماز سے فراغت کے بعد پھر وہی کیفیت عود کرآتی۔ (مناقب ۸۰)

سفرِ حج اور واقعۂ شہادت

انہیں حالات میں حرمین شریفین کی زیارت کا اشتیاق ہوا اور اس شدت کے ساتھ کہ تمام جذبات وکیفیات پر غالب ہوگیا۔ اس کیفیت سے بھی اپنے شیخ ومرشد حضرت شیخ الاسلام فرید بنارسی اور والد ماجد شیخ داؤد کو مطلع کیا اور دونوں بزرگوں سے سفر کی اجازت طلب کی۔ چونکہ شیخ داؤد کو ان سے عشق کی حد تک محبت تھی، اس لئے مفارقت پر راضی نہیں ہوئے، ان کی رعایت خاطر میں شیخ فرید نے بھی سفر کی اجازت نہ دی، لیکن شیخ حسنؒ شوق زیارت میں بیخود تھے، حتیٰ کہ اسی عالم وارفتگی میں اپنی جائے اقامت علوی پورہ ہی سے احرام باندھ لیا اور تقریباً چھ ماہ تک اسی حالت میں وہاں مقیم رہے۔ ان کی اس حالت کو دیکھ کر شیخ فرید نے شیخ داؤد کو رخصت کی اجازت پر رضامند کرکے انہیں سفر کی اجازت مرحمت فرمائی۔ شاہ یٰسین بنارسیؒ کا بیان ہے کہ جس وقت شیخ حسن اپنے حجرہ سے بقصد سفر نکلے تو ایک زبردست مجمع ان کی مشایعت میں چلنے کے لئے شہر سے امنڈ آیا جنھیں چند میل کے بعد شیخ نے بصد اصرار واپس کیا، لیکن چند حضرات کسی طرح ساتھ چھوڑنے پر راضی نہ ہوئے۔ چنانچہ انہیں ہمراہ لے کر پاپیادہ منزل حبیب کی جانب روانہ ہوگئے راہ میں مصطفیٰ آباد کے پاس پہنچے تو اپنے تلمیذ رشید اور مرید خاص حضرت اسد العلماء شیخ نصیر الدین کو خدمت میں طلب کیا اور چند روز ان کی خواہش پر وہاں قیام فرمایا اور اپنی توجہ خاص سے نواز کر اجازت وخلافت سے امتیاز بخشا۔ پھر انہیں اپنا نائب وقائم مقام بنا کر رفقاء سفر کے

ساتھ بجانب منزل روانہ ہوگئے۔ اسد العلماء نے بھی رفاقت ومعیت کی خواہش ظاہر کی تو انہیں یہ کہہ کر روک دیا ’’عجب کہ من شما دریں ملک بجائے خود میدارم وشمار ہو سے دیگری شوذ‘‘ (مناقب ص ۴۷) مجبوراً اسد العلماء نے رفاقت کے ارادہ کو فسخ کردیا۔ اور اظہار نیازمندی میں ایک نہایت نفیس گھوڑا سواری کیلئے پیش خدمت کیا، شیخ نے اسے بھی رد کردیا اور فرمایا کہ ’’میاں نصیر بی بی رابعہ بصریہ زنے بود چنیں گویند کہ وقتے بطواف کعبہ می رفت در ہر گامے دوگانہ می گذارد حسن اگرچہ مرد نیست امانام مرد دارد اگر ہر گامے دوگانہ نمی تواں گذارد بارے بقدم خود برود۔‘‘ (ص ۴۷)

الحاصل حضرت اسد العلماء کو رخصت کرکے وہاں سے روانہ ہوئے اور خشکی کی مسافت کو پیادہ پا طے کرکے دریا سے کشتی پر سوار ہوئے۔ چند یوم کشتی امن وسلامتی کے ساتھ چلتی رہی، ایک دن اچانک بحری ڈاکوؤں نے کشتی پر حملہ کردیا۔ شیخ نے نہایت جرأت وہمت سے ان کا مقابلہ کیا اور کئی ڈاکوؤں کو جہنم رسید بھی کیا۔ لیکن اسی ہنگامۂ جنگ وپیکار میں کسی نے آپ کیے سینۂ مبارک پر نیزہ مارا جو پار اتر گیا اور یہ عاشق جانباز بیت اللہ کے بجائے رب البیت سے جاملا۔ رفقاء سفر میں شیخ اسماعیل نامی ایک شخص کے علاوہ سبھی کام آگئے۔ شیخ اسماعیل کو ڈاکوؤں نے زندہ گرفتار کرلیا اور ملک روم میں لے جاکر کسی مسلمان تاجر کے ہاتھ فروخت کردیا۔ شیخ اسماعیل نے اس تاجر سے شیخ اور دیگر رفقاء سفر کے جانگداز حادثہ کو بیان کیا۔ اسے ان کے حال زار پر بہت رحم آیا اور انہیں رہا کرکے حجاز مقدس تک پہنچادیا۔ یہ حج وزیارت سے فارغ ہوکر ایک سال کے بعد بنارس واپس لوٹے اور اس المناک واقعہ کی خبر دی۔

تحقیق تاریخ شہادت

شیخ حسن بنارسیؒ کی تاریخ شہادت ۴؍ربیع الاول پر ان کے تمام تذکرہ نگاروں کا اتفاق ہے لیکن سنہ میں عجیب اختلاف واقع ہوگیا ہے۔ گنج ارشدی اور بحر ذخار میں سن شہادت ۹۶۰ھ تحریر ہے اسی روایت کو صاحب نزہہ نے گنج ارشدی کے حوالے سے اور

چودھری نبی اللہ سندیلوی نے مرقع بنارس میں بحر زخار کے حوالہ سے لیا ہے اور تذکرہ مشائخ بنارس میں بغیر کسی حوالہ کے ۹۰۰ھ درج ہے۔ ان تصریحات کے خلاف شیخ یٰسین بنارسی نے ۹۰٦ھ لکھا ہے۔

مناقب کی عبارت یہ ہے:

> چند روز بہ سلامت وعاقبت بر کشتی رفت تا کہ روزے فرنگیاں بر جماعت مسلماں تاختند و بازار قتل ایشاں پرداختند آنحضرت ہم دست بسلاح برد و بعضے کافراں را قتل نمود بعد ازاں کافرے نیزہ بر سینۂ مبارک وے زود بمرتبہ شہادت رسید وجان درراہ دوست فدا ساخت وکان ذالک فی رابع جمادی الاول سنۃ ست وتسع مائیۃ (ص۸۳،۸۴)

’’چند یوم امن وسلامتی کے ساتھ کشتی پر سفر جاری رکھا کہ اچانک ایک دن فرنگیوں کی جماعت نے غارت گری مچادی اور قتل کا بازار گرم کردیا، شاہ حسن نے بھی ہتھیار سنبھالا اور بعض کافروں کو قتل کیا، بعد ازاں ایک کافر نے ان کے سینۂ مبارک پر نیزہ مارا جس سے ان کی شہادت واقع ہوگئی یہ حادثہ ۴؍جمادی الاول ۹۰٦ھ کو پیش آیا‘‘

اور اس سلسلے میں یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ جس دن یہ حادثہ رونما ہوا، اسی دن بعد نماز ظہر حضرت شیخ فرید نے مصلی اٹھایا تو اس کے نیچے سے شیخ حسن کی تسبیح اور کنگھی برآمد ہوئی۔ اسے دیکھتے ہی شیخ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے اور فرمایا کہ پیشوا ہمیں ساعت ازیں عالم رفت و در دریا شہید گشت۔ (ص۸۴)

اس واقعہ نیز گذشتہ سطور سے معلوم ہو چکا ہے کہ جس وقت شاہ حسن سفر حج کے لئے بنارس سے روانہ ہوئے تھے، اس وقت حضرت شیخ فرید وشیخ داؤد باحیات تھے۔ اور ان دونوں حضرات کی وفات بحسب تصریح مناقب وگنج ارشدی ۹۰٦ھ میں ہوئی ہے۔ اس لئے حضرت شاہ حسن کی وفات اسی سن میں ماننی پڑے گی یا اس سے کچھ پہلے۔ دوسری بات یہ ہے کہ مناقب اور گنج ارشدی دونوں میں بصراحت موجود ہے کہ شہادت کے وقت ان کی عمر پچاس سال کے قریب تھی۔ لیکن شہادت کے سن کو ۹٦۰ھ تسلیم کر لینے کی صورت

میں ان کی عمر کم از کم ۸۵، ۸۶ سال کی ماننی پڑے گی۔ کیونکہ شیخ فرید کی وفات سے سات سال پیشتر انہیں خلافت مل چکی تھی۔ خلافت سے پہلے تعلیم وتحصیل اور درس وتدریس میں طویل عرصہ تک مشغول رہ چکے تھے۔ ان وجوہ سے صاحب مناقب کی بیان کردہ تاریخ ہی درست ہے۔ اغلب گمان یہ ہے کہ گنج ارشدی کے کاتب نے ۹۰۶ھ لکھنے کے بجائے غلطی سے ۹۶۰ھ لکھ دیا ہوگا۔ (کیونکہ ہندسوں میں اس طرح کی غلطی کا ہوجانا بعید نہیں ہے) بعد کے تذکرہ نگاروں نے اسی تاریخ کو اپنی تصنیفات میں درج کردیا۔ اس طرح سے یہ غلطی چل پڑی۔ واللہ اعلم۔

خلفاء واولاد

حضرت شاہ حسن نے وفات کے بعد تین بیٹے شیخ مسعود، شیخ معین الدین، شیخ نصیر الدین اور ایک خلیفہ وجانشین اسد العلماء شیخ نصیر الدین مصطفیٰ آبادی کو بطور یادگار چھوڑا۔ شاہ صاحب کے مریدین ومتعلقین میں اسد العلماء کے علاوہ کسی اور کو یہ دولت ونعمت حاصل نہ ہوسکی۔ (۱)

مناقب میں ہے:

> حضرت شاہ را غیر از حضرت اسد العلماء خلیفہ دیگر نبود وآنچہ گفتہ اند پیر را یک مرید کافیست گویا درحق اوست (مناقب ص ۸۷)

”شاہ صاحب سے خلافت صرف اسد العلماء کو حاصل ہوئی۔ صوفیاء کا مقولہ پیر را ایک مرید کافیست گویا آپ ہی کی شان میں کہا گیا تھا۔“

---

(۱) مولانا عبدالسلام نعمانی نے تذکرہ مشائخ بنارس میں حضرت شیخ حسن بنارسی کے صاحبزادے شیخ نصیر الدین کے تذکرے میں لکھا ہے کہ ”حضرت شاہ یٰسین صاحب مرتب مناقب العارفین تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت بندگی شاہ حسن کا حضرت نصیر الدین کے علاوہ کوئی دوسرا خلیفہ نہیں تھا“ تذکرہ ص ۱۵، یہ حوالہ اپنی جگہ بالکل درست ہے لیکن صاحب مناقب کی اس عبارت کے مصداق حضرت شاہ حسنؒ کے صاحبزادے شیخ نصیر الدین نہیں بلکہ اسد العلماء نصیر الدین جھوسوی ہیں چنانچہ مناقب کی یہ عبارت ملاحظہ ہو: ”حضرت شاہ را غیر از اسد العلماء خلیفہ دیگر نہ برد“ ص ۸۷۔

اسد العلماء نصیر الدین مصطفیٰ آبادی

شیخ نصیر الدین بن شیخ بدہ صدیقی اپنے وقت میں جامع شریعت وطریقت تھے، دس سال کی عمر میں بنارس آ کر شیخ فرید بنارسی کے حلقہ ارادت میں شامل ہو گئے تھے۔ اور اپنی خدا داصلاحیتوں کی بناء پر ابتدا ہی سے ان کی توجہات کے مرکز بن گئے۔ شیخ نے صرف ونحو کی چند کتابیں پڑھا کر انہیں اپنے برادر زادہ وتلمیذ وخلیفہ حضرت شاہ حسن بنارسی کے حوالہ کر دیا اور فرمایا کہ ''بابا ہوایں بار سعادت آثار حوالہ شمار نمودم در تربیت وے سعی کما ینبغی خواہد نمود'' شاہ صاحب نے شیخ ومرشد کے فرمان کے مطابق ان کی تعلیم وتربیت پر بطور خاص توجہ دی اور ایک عرصہ تک اپنی صحبت میں رکھ کر مختلف فنون کی تعلیم دی، پھر مزید تعلیم کے لئے جون پور بھیج دیا، وہاں حضرت شیخ چند محدث جونپوری کے حلقہ درس میں شامل ہو کر علوم متداولہ کی تحصیل کی جون پور کے زمانۂ قیام میں ایک بار حضرت شیخ کی طلب پر بنارس حاضر ہوئے، اتفاق سے جس وقت یہ مجلس میں پہنچے اسی وقت ایک نو وارد طالب علم بھی خانقاہ میں پہنچا اور نہایت بیباکی کے ساتھ دریافت کیا کہ ''شیخ فرید کجا است ازاں روز کہ در بنارس رسیدہ ام در و دیوار نام اومی گوید او را ببینم کہ چہ طور است''۔ یعنی جب سے بنارس آیا ہوں شیخ فرید کا شہرہ وآوازہ سن رہا ہوں، آخر میں بھی دیکھوں کہ وہ کس درجہ کے آدمی ہیں'' حاضرین کو اس کی یہ بے باکی وبے ادبی بہت شاق گذری، لیکن شیخ نے نہایت تواضع وانکساری کے ساتھ فرمایا کہ: ''فرید میں ہی ہوں فرمائیے کیا ضرورت ہے'' اس نے یہ سنتے ہی قریب پہنچ کر علمی مذاکرہ شروع کر دیا۔ شیخ نصیر نے آگے بڑھ کر اس کے ہر سوال کا تشفی بخش جواب دیا، پھر خود بھی چند سوالات کئے جس کے جوابات اس سے نہ بن پڑے اور شرمندہ ہو کر مجلس کے ایک گوشہ میں خاموش ہو کر بیٹھ گیا حضرت شیخ فرید کو شیخ نصیر کی حاضر دماغی اور جودت طبع سے بڑی خوشی ہوئی۔ اور اسی مجلس میں اسد العلماء کے خطاب سے سرفراز فرمایا۔ اور فرط مسرت میں فرمایا کہ میں تمہیں اپنے حلقہ ارادت میں داخل کر کے ذکر وظائف کی تلقین کرنا چاہتا ہوں۔ یہ سن کر شیخ نصیر نے عرض کیا کہ حضرت نے

جس وقت مجھے حضرت شاہ حسن کے سپرد فرمایا تھا اسی وقت سے میرا یہ خیال ہے کہ یہ نعمت و برکت مجھے شاہ صاحب کے واسطہ سے حاصل ہوگی، اس جواب سے انہیں مزید خوشی ہوئی اور اسی وقت خادم خاص کے ذریعہ شاہ صاحب کو علوی پورہ سے بلوا کر شیخ نصیر کا ہاتھ ان کے ہاتھ میں دے کر فرمایا:

بابا ہو ہر چہ شمار ازیں فقیر واز مردان غیب رسیدہ از شیخ نصیر الدین دریغ نخواہد داشت و ہمہ خواہند وتو۔

”اے بابا آپ کو اس فقیر اور مردان غیب سے جو نعمتیں حاصل ہوئی ہیں وہ سب شیخ نصیر کو بخش دیجئے گا۔“

اس گفتگو کے بعد شیخ نصیر شاہ صاحب کے ہمراہ ان کے حجرہ واقع علوی پورہ میں آئے اور چاہا کہ یہیں رہ کر سلوک وطریقت کے اشغال میں لگ جائیں، مگر خلاف توقع شاہ صاحب نے فرمایا جاؤ تعلیم مکمل کر کے درس وتدریس کی حدمت انجام دو، تمہارا حصہ وقت پر تمہیں مل جائے گا۔ چنانچہ شیخ نصیر پھر جون پور آئے اور علوم مروجہ کی تعلیم مکمل کر کے اپنے آبائی وطن مصطفیٰ آباد میں درس وافادہ کی محفل آراستہ کی، ایک عرصہ کے بعد جب شاہ صاحب سفر حج کیلئے نکلے تو مصطفیٰ آباد جا کر انہیں اپنی نوازشات اور توجہات سے نوازا اور تصرفات باطنی کے ذریعہ انہیں درجہ کمال پر پہنچا کر خلافت واجازت عطا کی اور ساتھ ہی مصطفیٰ آباد کے بجائے جوسی میں قیام کا حکم دیا۔ اسد العلماء نے شیخ کے حکم کو اس طرح پورا کیا کہ مر کر بھی وہیں رہے۔

خلافت حاصل ہو جانے کے بعد تمام علائق سے الگ ہو کر ریاضت ومجاہدہ میں ہمہ تن لگ گئے۔ شاہ یٰسین کا بیان ہے کہ دیگر مجاہدات کے علاوہ تقریباً تیس بار چلہ میں بیٹھے، کثرت عبادت وریاضت سے باطنی صفائی اس درجہ حاصل ہوگئی کہ کشف قلوب ومکاشفۂ ارواح کے درجہ پر فائز ہوئے۔

ان فضائل کے ساتھ داد ودہش اور جود وسخا میں بے نظیر تھے آپ کے در سے کبھی کوئی خالی ہاتھ واپس نہیں ہوا۔ آخر میں اکل وشرب سے بھی ایک حد تک بے نیازی ہوگئی تھی۔

صرف شوربا یا دودھ پی لیا کرتے تھے۔ وفات سے دو سال قبل دودھ پینا بھی ترک کر دیا تھا۔ اور فرماتے تھے کہ روح کی طرح معدہ کو بھی صاف رکھنا چاہیے۔

اتباع شریعت کا اس درجہ غلبہ تھا کہ وفات سے ایک روز قبل اپنے صاحبزادہ حضرت خواجہ کلاں کو حکم دیا کہ شرح وقایہ لاؤ تا کہ تمہیں تجہیز و تکفین کے مسائل سکھا دوں۔ انھوں نے ہر چند عرض کیا کہ آپ زحمت نہ فرمائیں۔ مجھے اس کے مسائل معلوم ہیں، لیکن اصرار کر کے کتاب منگوائی اور غسل و کفن کے جملہ مسائل نہایت شرح و بسط سے ان کے سامنے بیان کیا اور فرمایا کہ اسی طرح سے غسل و کفن دینا، اس کے بعد صاحبزادہ کو کچھ وصیتیں فرمائیں اور خرقہ خلافت عطا کیا۔

اسد العلماء کی یہ آخری گفتگو تھی، اس کے بعد پھر کسی سے کوئی بات چیت نہ کی اور ہمہ تن محبوب حقیقی کی جانب متوجہ ہو گئے۔ بالآخر شب پنجشنبہ ۲۰/ ربیع الاول ۹۸۰ھ کو عین ذکر کے وقت روح قفس عنصری سے پرواز کر کے جوار رحمت میں پہنچ گئی۔ ایام مرض میں احباب واعزہ دوا علاج کے لئے کہتے تو فرماتے تھے کہ اس مرض کی دوا لقائے حبیب کے سوا کچھ نہیں، لہٰذا مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ (مناقب از ص ۶۶ تا ۷۸)

حضرت شاہ حسن کی اولاد میں بالترتیب سب سے بڑے شیخ مسعود تھے۔ ان کے بعد شیخ معین الدین اور سب سے چھوٹے شیخ نصیر الدین تھے جو عین عالم شباب میں لاولد فوت ہو گئے۔

شیخ مسعود بن حسن بنارسی

ابھی یہ سن رشد کو بھی پہنچنے نہ پائے تھے کہ والد بزرگوار کے سایۂ عاطفت سے محروم ہو گئے۔ اس لئے ان سے استفادہ کا موقع نہ مل سکا۔ ان کی رحلت کے بعد شیخ فرید بن شیخ بدہ حقانی جون پوری کے حلقۂ درس میں شامل ہو کر علوم وفنون کی تحصیل کی اور انہیں سے بیعت بھی ہوئے۔ شیخ فرید نے ان کی تعلیم و تربیت مکمل کر کے انہیں حضرت شیخ عبد العزیز شکر بار جون پوری متوفی ۹۷۵ھ کی خدمت میں دہلی بھیج دیا، وہاں دو سال رہ کر سلوک کی

تکمیل کی اور خرقۂ خلافت سے مشرف ہوکر بنارس واپس آئے اور اپنے آباء واجداد کے طریق پر درس وتدریس اور ارشاد وتلقین میں پوری زندگی گذار دی۔ شیخ مسعود نے اپنی دینی سرگرمیوں کے لئے منڈواڈیہہ بنارس کو منتخب کیا جو آگے چل کران کے برادرزادہ شاہ طیب بن معین بنارسی کے طفیل رشد وہدایت اور تبلیغ وتلقین کا ایک عظیم مرکز بنا۔

شیخ مسعود کا قیام تاحیات منڈواڈیہہ ہی میں رہا جہاں وہ طالبین کی اصلاح وتربیت کے ساتھ ذکر وفکر اور عبادت وریاضت میں مشغول رہتے تھے۔ وفات کے وقت شاہ طیب کو بلایا مگر اتفاق سے وہ موجود نہیں تھے تو بڑی حسرت ویاس سے فرمایا کہ بندہ کی خواہش تھی کہ جو کچھ بزرگوں سے ملا ہے وہ اس فرزند کے حوالہ کردوں، اس کے چند گھنٹہ کے بعد وفات ہوگئی۔ منڈواڈیہہ میں بڑے روضہ کے احاطہ میں دفن ہوئے۔ تاریخ وفات اور تفصیلی حالات کا علم نہ ہوسکا۔ (مناقب ص ۸۵، ۸۶)

شیخ معین الدین بنارسی

حضرت شاہ حسن کے منجھلے صاحبزادے تھے، تعلیم وتحصیل اور بیعت وارادت کا تعلق شیخ فرید بن شیخ بدہ حقانی سے تھا، عبادت وریاضت اور جود وسخا میں یگانۂ وقت تھے طلباء وفقراء کے ساتھ خصوصی تعلق رکھتے تھے۔ بعالم شباب تیس سال کی عمر میں انتقال کرگئے۔ اور یادگار میں صرف ایک دس سالہ بچے کو چھوڑا جس نے اپنے فضل وکمال، زہد وورع، تقویٰ وتدین، اور ارشاد وتلقین کے ذریعہ خانوادۂ فریدی وداؤدی کے نام پر شہرت دوام کی مہر ثبت کردی۔ یہی وہ فخر خاندان ہے جسے دنیا شاہ طیب بن معین کے نام سے جانتی ہے۔ شیخ معین کا مزار بھی منڈواڈیہہ تالاب کے کنارے چبوترہ پر ہے اور عوام میں بڑی درگاہ کے نام سے مشہور ہے۔

شیخ المشائخ شاہ طیّب بنارسی

حضرت شاہ طیب بنارسی گیارہویں صدی کے علماء میں جامع شریعت وطریقت

تھے۔ انھوں نے اپنی علمی وروحانی سرگرمیوں سے مدرسہ وخانقاہ دونوں کو آباد رکھا۔ ان کے اصلاحی وتبلیغی کارنامے، آج بھی تاریخ کے صفحات میں نمایاں ہیں اور اپنے ہر تذکرہ نگار سے خراج تحسین وصول کرتے ہیں۔ چنانچہ شیخ یٰسین بنارسی نے ان الفاظ سے انہیں یاد کیا ہے:

''آں فرد یگانہ آں غوث زمانہ آں جامعِ معانی ودقائق آں منبع اسرار وحقائق آں نہنگ دریائے شریعت آں سیر بیشۂ طریقت آں شاہباز عالم ملکوت آں بلند پرواز بیضائے لاہوت آں متمکن در مقام تمکین حضرت بندگی شیخ طیب بن معین۔'' (مناقب ص ۳،۴)

شیخ وجیہہ الدین اشرف لکھنوی نے ان تاثرات کا اظہار کیا ہے:

''وے را کمالات عالی وحالات لازوال بودہ اند آخر آخر بدوام مشاہدہ رسیدہ بود۔''

(بحر ذخار ص ۱۰۰)

مولانا عبدالحیؒ حسنی نے یوں مدح سرائی کی ہے:

''الشیخ الصالح طیب بن معین۔ کان زاہداً متقللا متورعاً قنوعاً بشوشا طیب النفس''۔

(نزہہ ص ۱۹۱ ج ۵)

تعلیم وتحصیل اور ابتدائی حالات

شاہ صاحب کی تاریخ ولادت کی تصریح کہیں نہیں ملتی۔ شیخ یٰسین نے صرف اتنا لکھا ہے کہ ''والد شریف وے شیخ معین وے را دہ سالہ گذاشتہ خود بجوار رحمت حق پیوست۔'' یعنی ان کے والد انہیں دس سال کی عمر کا چھوڑ کر انتقال کر گئے، والد بزرگوار کی رحلت کے بعد اپنی پھوپھی کی جوار شفقت میں پرورش پائی۔ قرآن حکیم اور فارسی کی تعلیم گھر ہی پر ہوئی۔ عربی کی ابتداء استاذ الفضلاء شیخ نظام الدین بنارسی سے کی۔ عہد طالب علمی ہی سے شاہ صاحب کے اخلاق واطوار نہایت پسندیدہ تھے۔ صلاح وتقویٰ، عفت وپاکدامنی اسی وقت سے ان کے ہر قول وعمل سے ظاہر ہوتی تھی۔ ان اوصاف حمیدہ کے پیش نظر شیخ نظام نے ابتدا ہی میں یہ پیشین گوئی کر دی تھی۔

ازیں پسر بوئے مشیخت ومقتدائی می آید جہانے از برکات انفاس وے

نصیب خواہند یافت وایں خاندان از وروشن خواہد شد (مناقب ص ۴)

''اس بچے سے مشیخت و بزرگی کی بو آرہی ہے ایک جہاں اس کی برکت سے نفع حاصل کرے گا اور خاندان کا نام اس سے روشن ہوگا۔''

شیخ نظام الدین بنارسی کی درسگاہ میں صرف ونحو کی بعض کتابیں پڑھ کر جون پور کا علمی سفر کیا اور وہاں کے بعض اساتذہ سے نحو اور معانی کے فن کو مکمل کیا، پھر شیخ نور اللہ (۱) بن طلحہ جون پوری متوفی ۱۰۱۲ھ سے شرح وقایہ مکمل اور حسامی کے کچھ اجزاء کی تحصیل کی۔

دوران تعلیم میں ایک بار مکان تشریف لائے تو اہل خاندان کے اصرار پر رشتۂ ازدواج سے منسلک ہوگئے۔ جس کی بناء پر تعلیم وتحصیل کے سلسلے میں تقریباً تین سال کا وقفہ ہوگیا۔

شیخ یٰسین لکھتے ہیں:

پس بملازمت افضل العصر اعلم الدہر شیخ نور اللہ انصاری ہروی، شرح وقایہ
تمام خواند وجزوے حسامی بعد ازاں بتقریب کار خیر بخانہ آمد ومتاہل شد بعد
کدخدائی از خواندن باز ماند وسالے دو سہ در خواندن تفرقہ گداز ند (ص ۴)

''پھر افضل العصر اعلم الدہر شیخ نور اللہ انصاری ہروی کی خدمت میں شرح وقایہ مکمل اور حسامی کے چند اجزاء کی تحصیل کی اس کے بعد گھر آئے اور شادی کرلی۔ نکاح کے بعد سلسلۂ تعلیمی جاری نہ رکھ سکے اور دو تین سال کا وقفہ ہوگیا۔''

تین سال کے تعلیمی انقطاع کے بعد پھر جون پور تشریف لے گئے اور اس وقت کے مروجہ نصاب فقہ واصول فقہ کی تعلیم مکمل کرکے دینیات سے فراغت حاصل کی۔ (ص ۴)

تعلیم سے فراغت کے بعد مزید ایک سال اور جون پور میں مقیم رہے، شاہ صاحب

---

(۱) شیخ نور اللہ بن طلحہ جون پوری ہروی علماء جونپور میں شریعت وطریقت کے جامع تھے، علوم وفنون کی تحصیل وتکمیل اپنے برادر کلاں شیخ عبد الجلیل جونپوری سے کی درس وتدریس اور مطالعہ کتب میں بڑا انہماک تھا، علمی تبحر میں خاص شہرت کے مالک تھے عہد عالمگیری میں متعدد عہدوں پر بھی فائز ہوئے۔ ۱۰۱۲ھ میں وفات ہوئی۔ مزار شہر جونپور میں ہے۔ تجلی نور۔

کا یہ یک سالہ قیام کس مقصد کے تحت تھا اس کی کوئی تصریح نہیں ملتی۔ شیخ یٰسین مبہم طور پر لکھتے ہیں کہ: ''بعد ازاں قریب یکسال در جونپور بتقریب بعضے امور توقف فرمودہ بود۔'' یعنی تعلیم سے فراغت کے بعد ایک سال مزید بعض امور کے تحت جون پور میں ٹھہرے رہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ قیام بسلسلۂ ملازمت رہا ہوگا۔ کیونکہ اس سے پہلے عقد ہو گیا تھا۔ بیوی کے ساتھ بیوہ والدہ کی کفالت بھی انہیں کے ذمہ تھی۔ اس لئے تحصیل علم سے فراغت کے بعد تحصیل معاش کی غرض سے ملازمت کر لی ہوگی۔ واللہ اعلم۔

عرفان وطریقت

جون پور کے دوران قیام میں ایک دن کسی خانقاہ میں شیخ تاج الدین جھوسوی سے ملاقات ہوگئی۔ دونوں بزرگ ایک ہی درسگاہ واستاذ کے تربیت یافتہ تھے۔ اس لئے باہم بڑی یگانگت ومحبت تھی، دوران گفتگو شاہ صاحب نے بر سبیل تذکرہ شیخ تاج سے عرض کیا کہ ایک عرصہ سے میری خواہش ہے کہ جدامجد حضرت شیخ حسن بنارسی قدس سرہ کے سلسلہ کے کوئی بزرگ مل جاتے تو ان سے وابستہ ہو کر جد بزرگوار کے سلسلے میں داخل ہو جاتا۔ یہ سنتے ہی شیخ تاج نے فرمایا یہ آپ کی سعادت اور نیک بختی ہے کہ اس وقت شہر میں مولانا خواجہ کلاں خلیفہ کامل وخلف قابل شیخ نصیر الدین خلیفۂ مطلق حضرت شیخ حسن بنارسی تشریف فرما ہیں۔ یہ مژدۂ روح افزاء سنتے ہی شاہ طیب کا چہرہ مسرت سے دمک اٹھا، خود ان کا بیان ہے کہ:

چوں ایں حرف گوش بندہ رسید چناں خوش دم کہ گویا جان از سرنو یافتم و بآب
حیات رسیدم (ص ۵)

''اس جملہ کو سنتے ہی مجھے اس قدر خوشی ہوئی گویا نئی زندگی مل گئی اور چشمہ آب حیات پر پہنچ گیا۔''

اسی وقت شیخ تاج سے عرض کیا کہ مجھے خواجہ کی مجلس میں پہنچا دیں چنانچہ شیخ تاج انہیں لے کر خواجہ کلاں کی مجلس میں پہنچے۔ خواجہ انہیں دیکھتے ہی کھڑے ہو گئے اور مصافحہ و

معانقہ کے بعد فرمایا۔

’’مگر شما از اولاد حضرت شاہ ہستید کہ بمجرد دیدن شما صورت حضرت شاہ درنظر من آمدہ۔‘‘ شاید آپ حضرت شاہ حسن کی اولاد سے ہیں کیونکہ آپ کی صورت دیکھتے ہی شاہ صاحب کا حلیہ یاد آ گیا۔ شاہ طیب نے عرض کیا، حضرت شاہ صاحب بندہ کے جد امجد تھے۔ یہ سن کر خواجہ نے بڑی شفقت ونوازش فرمائی اور نہایت تواضع وانکساری کے ساتھ کہا ’’شما مخدوم زادہ ایں عاجز اید مارا نعمت از خاندان شما است‘‘ آپ تو ہمارے مخدوم زادہ ہیں، اس عاجز کو جو کچھ حاصل ہوا ہے وہ آپ ہی کے خاندان کا عطیہ ہے۔

اس تعارفی گفتگو کے بعد شاہ صاحب نے بیعت کی درخواست کی جو منظور ہوئی اور اسی مجلس میں خواجہ نے انہیں بیعت فرما کر اوراد و وظائف کی تلقین کی اور از راہ شفقت ونوازش کلاہ مبارک اپنے سر سے اتار کر ان کے سر پر رکھ دی۔ بیعت ہوتے ہی دنیا بدل گئی اور قلب میں سوز دروں کی کیفیت پیدا ہوگئی، ناچار جون پور کے مشاغل کو خیر باد کہہ کر مکان چلے آئے مگر یہاں بھی سکون نصیب نہ ہوسکا۔ عشق الٰہی کی سوزش بڑھتی ہی گئی، اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ بیتابی میں کبھی دشت و بیاباں کی خاک چھانتے اور کبھی گوشۂ محراب میں عافیت کی جستجو کرتے۔ اسی عالم حیرانی و پریشانی میں تنگی معاش نے بھی اپنی گرفت سخت کردی اور اہل خانہ پر فاقے گذرنے لگے، اس لئے مجبوراً اطراف بنارس کے کسی حاکم کی ملازمت کرلی۔ مگر شوریدگی اس حد تک بڑھ چکی تھی کہ اس سلسلہ کو تا دیر قائم نہ رکھ سکے اور سال کے اندر ہی اس سے کنارہ کش ہو گئے۔ شاہ صاحب کے گھر والے ان کے ان حالات سے نہایت پریشان ومتفکر تھے۔ چنانچہ شیخ شہاب الدین ترکمان کی خدمت میں جا کر دعاء کی درخواست کی کہ ان کی یہ اضطرابی کیفیت کسی طرح زائل ہو جائے۔ شیخ شہاب الدین روشن ضمیر صاحب دل بزرگ تھے وہ اپنی چشم بصیرت سے دیکھ رہے تھے کہ اس سوز دروں و اضطراب باطنی کی حقیقت کیا ہے۔ اس لئے شاہ صاحب کے گھر والوں کو مطمئن کرتے ہوئے فرمایا:

ایں فرزند بطلب حق سر درشدہ است خدائے تعالیٰ ہمہ را ایں سعادت

> نصیب گرداند مارا ہمت ازوے باید خواست امیدوار باشید کہ حق تعالیٰ خاندان حضرت شاہ راازبرکت انفاس ایں فرزند معمور خواہید کرد واز انوار اوخانوادہ روشن خواہد شد (مناقب ص۶)

’’یہ فرزند طلب حق میں دیوانہ ہوا ہے، اللہ تعالیٰ سب کو یہ سعادت نصیب فرمائیں ہمیں اس سے دعاء لینی چاہئے تم لوگ امیدوار رہو کہ اللہ تعالیٰ حضرت شاہ حسن کے خاندان کو اس فرزند کے برکات وانوار سے معمور فرمائیں گے اور خاندان کا نام اس کے ذریعہ روشن ہوگا۔‘‘

بالآخر شاہ صاحب کے دل میں یہ بات آئی کہ یہ آگ جس نے لگائی ہے وہی اسے بجھائے گا بھی، اس خیال کے آتے ہی والدہ ماجدہ سے اجازت لے کر شیخ پورہ کی راہ لی اور حضرت خواجہ کلاں کی خدمت میں جاکر اپنی باطنی کیفیات اور سوز دروں کا حال بیان کیا۔ خواجہ نے انہیں تسلی دی اور اس خوش آیند کیفیت پر مسرت کا اظہار فرمایا۔ چند دن خواجہ کی صحبت میں رہ کر گھر واپس ہوئے لیکن خواجہ کی روحانی مجلس کے کیف نے رہا سہا سکون بھی زائل کر دیا۔ اس لئے گھر پر صبر وقرار میسر نہ آسکا۔ اس لئے چند ہفتہ کے بعد دوبارہ خواجہ کلاں کی خدمت میں پہنچ گئے۔ اس بار طویل عرصہ تک وہاں قیام کیا، اور عبادت وریاضت کے ساتھ خواجہ کے فیوض و برکات سے بھرپور استفادہ کیا۔ اسی سفر میں یا اس کے بعد تیسرے سفر میں حضرت خواجہ نے انہیں رمضان کے عشرۂ اخیر کے اعتکاف کا حکم دیا اور اعتکاف کے اختتام پر عید کے دن خرقۂ خلافت سے نوازا اور بعض اذکار واوراد کی تلقین فرمائی۔ ساتھ ہی حضرت شاہ حسن بنارسی کے مخصوص وظائف بھی بتائے۔

مناقب میں ہے:

> باعتکاف عشرۂ اخیرہ رمضان مبارک امر نمودند وروز عید پیراہن حضرت خواجگان چشت بامثال اجازت عطا فرمودند وبعضے اذکار تلقین کردندن واوراد حضرت شاہ حوالہ نمودند۔ (ص۷)

’’رمضان مبارک کے اخیر عشرہ کے اعتکاف کا حکم دیا اور عید کے دن مشائخ چشت

کے پیراہن کے ساتھ خلافت واجازت دی اور بعضے اذکار کی تلقین فرمائی، نیز حضرت شاہ حسن کے اوراد بھی حوالہ کیئے۔ ''

عطائے خلافت کے بعد مزید تربیت وتکمیل کی غرض سے شاہ صاحب کو اپنے خلیفۂ خاص شیخ تاج الدین جھوسوی کے حوالے کردیا۔ شیخ تاج سے شاہ صاحب کے دور طالب علم ہی سے معاصرانہ ورفیقانہ تعلقات تھے۔ لیکن اس سپردگی کے بعد انھوں نے شیخ تاج کے ادب واحترام اور انقیاد واطاعت کا جو نمونہ پیش کیا۔ معاصرین کی باہمی تاریخ میں اس کی مثال کمتر ہی ملے گی۔ شاہ صاحب نے خود اپنے انقیاد واطاعت کی کیفیت کو بایں الفاظ بیان کیا ہے:

> دل خود بدست ایشاں سپرد واختیار خود از ایشاں برداشت تا دہ سال ابتداء گاہے بخدمت ایشاں ظاہر نکرد کہ مرا فلاں وظیفہ یا نماز بفرمائید یا ذکر تلقین کنید ہر چند سلوک ایشاں با بندہ یارانہ وبے تکلف بود امامن خود را از غلامان ایشاں کمتر دانستہ در خدمت مقید بودم۔ (ص ۷)

'' اپنے اختیار وخواہشات کو ان کے حوالہ کردیا ابتداءً دس سال تک کبھی بھی یہ نہیں کہا کہ مجھے فلاں وظیفہ یا نماز یا ذکر تلقین فرمادیں ہر چند کہ وہ میرے ساتھ دوستانہ اور بے تکلفانہ معاملہ فرماتے تھے لیکن میں اپنے آپ کو ان کے نوکروں سے بھی کمتر تصور کرتے ہوئے خدمت میں لگا رہا۔ ''

شاہ طیب نے اپنے مربی کے ساتھ گرویدگی وخود سپردگی میں حضرات صوفیاء کے اس اصول پر پورا پورا عمل کیا '' ینبغی للمرید ان یکون بین یدی الشیخ کالمیت بین یدی الغسال یقلّبه کیف یشاء '' یعنی مرید کے لئے مناسب یہی ہے کہ وہ شیخ کے حضور میں اس طرح رہے جیسے میت غسال کے ہاتھ میں ہوتا ہے کہ وہ جس طرف چاہتا ہے اسے الٹتا پلٹتا ہے۔

شاہ صاحب کو اس اطاعت شعاری کا پورا پورا نفع بھی حاصل ہوا کہ شیخ تاج نے اپنے عطاء وانعام کو ان پر نچھاور کردیا اور خلافت واجازت کے علاوہ متعدد بار اپنی خلعت

خاص سے نوازا اور مرض الموت میں ایک دن انہیں اپنے سینے سے چمٹا کر اپنی محبت وشفقت اور اتحاد و یگانگت کے اظہار کے لئے یہ شعر پڑھا۔

من تو شدم تو من شدی تو جاں شدی من تن شدم
تا کش نگوید بعد ازیں تو دیگرے من دیگرم

الحاصل تقریباً تیس سال کی طویل مدت تک شیخ خواجہ کلاں و شیخ تاج الدین کی صحبت میں رہ کر اصلاح باطن اور تزکیہ وتصفیہ میں مشغول رہے تا آنکہ مرتبۂ ارشاد و تکمیل پر فائز ہوئے اور پیرو مرشد کے حکم سے بنارس آکر عرفان وسلوک کی مسند کو زینت بخشی۔

شاہ صاحب کو ان دونوں بزرگوں کے علاوہ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی متوفی ۱۰۵۲ھ سے بھی سلسلہ قادریہ میں اجازت حاصل تھی۔

مناقب میں ہے:

> دراں زماں کہ بعد وفات ایشاں برائے زیارت پیران خویش بجانب دہلی رفتہ بود با شیخ الاسلام استاذ المفسرین حاجی الحرمین بندگی میاں شیخ عبدالحق الدہلوی البخاری کہ دراں وقت مقتدائے سلسلۂ قادریہ بود ملاقات واقع شد و وے را شیخ کامل و مکمل یافت ایں سلسلہ از وے گرفت و خرقۂ قادریہ از دست وے پوشید۔ (ص ۹)

’’شیخ تاج کی وفات کے بعد جس وقت شاہ صاحب پیران چشت کی زیارت کیلئے دہلی تشریف لے گئے تھے حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی بخاری سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا، اس وقت یہ سلسلۂ قادریہ کے مقتدا تھے محدث دہلوی کو شیخ کامل و مکمل پایا، چنانچہ ان سے سلسلۂ قادریہ کی تحصیل کی اور ان کے دست خاص سے خرقہ خلافت زیب تن کیا۔‘‘

بناء شریعت آباد

شیخ تاج الدین نے شاہ صاحب کو بنارس رخصت کرتے وقت فرمایا تھا کہ اب آپ کو یہاں آنے کی حاجت نہیں بنارس میں جم کر خلق خدا کی اصلاح وتربیت کی خدمت

انجام دیجئے۔ میں خود کبھی کبھی وہاں آکر ملاقات کرآؤں گا۔ چنانچہ ان کے حکم کے مطابق اپنے آبائی قیام گاہ منڈواڈیہہ میں ارشاد و تلقین کی محفل آراستہ کی، لیکن یہاں خانگی جھمیلوں کی بناء پر دلجمعی و یکسوئی حاصل نہ ہوسکی۔ اس لئے جد امجد حضرت شاہ حسن کے طریق پر آبادی سے باہر قلعہ راجہ بنارس کے خرابہ کے قریب ایک حجرہ بنا کر چند رفقاء کے ساتھ وہیں رہنے لگے۔ رفتہ رفتہ خلق کا رجوع شروع ہوا۔ طلباء و فقراء کی ایک جماعت آپ کے گرد جمع ہوگئی، جن کی رہائش کے لئے آپ کے قریبی عزیز و مرید باختصاص شیخ طاہر بن شیخ چاندہ نے ایک پختہ مکان حجرہ سے متصل تعمیر کرادیا۔ کچھ عرصہ کے بعد بہت سے تجار و امراء نے بطیّ حسن عقیدت میں آپ کے جوار میں اپنے لئے الگ الگ حجرے اور مکانات بنوا کر وہیں اقامت اختیار کرلی۔ پھر طلبہ و ارادت مندوں کی کثرت کی بناء پر حجرہ اور مکان ناکافی ہوگیا تو مستقل ایک خانقاہ اور اس سے متعلق ایک مسجد کی تعمیر عمل میں آئی، اس طرح آہستہ آہستہ یہ ویرانہ اچھی خاصی آبادی میں تبدیل ہوگیا، جسے شاہ صاحب نے شریعت آباد کے نام سے موسوم کیا۔

درس و تدریس وارشاد و تلقین

شاہ صاحب کا قیام مستقل طور سے شریعت آباد ہی میں تھا جہاں وہ سالکین کی اصلاح و تربیت کے ساتھ درس و تدریس کی خدمت بھی انجام دیتے تھے۔ طلبہ کی کثیر جماعت ہر وقت خدمت میں موجود رہتی تھی جن سے شاہ صاحب نہایت شفقت و محبت کا معاملہ فرماتے تھے۔

مناقب میں ہے:

> اکثر طلبہ در خدمت وے می بودند و ایں طائفہ را بسیار دوست داشتے و سبق شان گفتے۔ (مناقب ص۱۰)

”اکثر طلبہ ان کی خدمت میں موجود رہتے تھے جنہیں وہ بہت عزیز رکھتے تھے اور انہیں درس دیتے تھے۔“

سبق کا سلسلہ عام طور سے ظہر کے بعد شروع ہوتا تھا جو عصر تک جاری رہتا، اسی وقت کبھی کبھی کچھ تصنیف وتالیف کا کام بھی کرتے تھے۔

مناقب میں ہے:

وبعد نماز ظہر تا عصر جزوے قرآن می خواند بعد ازاں بعضے یاراں سبق گفتے وگاہے چیزے می نوشت (ص ۱۴)

''ظہر کے بعد عصر تک کچھ قرآن پاک کی تلاوت فرماتے پھر بعض لوگوں کو سبق پڑھاتے اور کبھی کبھی کچھ تحریر کرتے تھے۔''

تذکرہ نگار شاہ صاحب کے روحانی کمالات وتصرفات کے بیان وتفصیل میں اس درجہ محو ہو گئے ہیں کہ ان کے علمی کارناموں کی جانب کوئی توجہ نہیں دی۔ اس معاملہ میں تنہا شاہ صاحب ہی کے ساتھ یہ برتاؤ نہیں ہوا ہے بلکہ بالعموم مشائخ کے ساتھ یہی معاملہ پیش آیا ہے کہ ان کی کرامات وتصرفات کے انبار میں ان کے علمی کمالات اجاگر نہ ہو سکے اسلئے شاہ صاحب کے تلامذہ اور تصنیفات کے متعلق اب کوئی تحقیقی بات کہنا مشکل ہے۔ انتہائی تلاش وجستجو کے بعد ''اکثر طلبہ درخدمت وے بودند'' میں سے صرف دو کے ناموں کی تصریح مل چکی کہ انھوں نے شاہ صاحب کے آگے زانوئے تلمذ تہہ کیا اور علوم ظاہری کی تحصیل کی۔ ان میں ایک شاہ یٰسین بنارسی ہیں اور دوسرے شیخ ناصر الدین اور ایک تصنیف ''صلوٰۃ طیبی'' کا پتہ چل سکا جس کا ایک نسخہ مولانا رضا علی بنارسی متوفی ۱۳۱۲ھ کے کتب خانہ میں تھا۔ مولانا علی رضا صاحب نے اپنے فتاویٰ میں صلوٰۃ طیبی کا حوالہ اکثر مقامات پر دیا ہے ایک جگہ لکھتے ہیں ''قال العالم العارف الفقیہ المحقق المدقق الشیخ طیب بنارسی'' (تذکرہ مشائخ بنارس ص ۲۲)

طریق اصلاح وبیعت

شاہ صاحب بیعت کے سلسلے میں نہایت حزم واحتیاط فرماتے تھے، سلسلہ کو وسیع کرنے کی غرض سے ہر کس وناکس کو ہاتھ نہیں دیتے تھے۔ جب تک طالب بیعت کے حسن اعتقاد اور تقویٰ وتدین کو اچھی طرح جانچ نہیں لیتے، بیعت نہیں کرتے تھے۔ بیعت

کے بعد ابتداء میں صرف ایام بیض کے روزے اور چھ رکعت صلوٰۃ اوابین پر مداومت کا حکم دیتے۔ اس کے بعد بقدر استعداد نوافل و وظائف اور دیگر مجاہدات وریاضت کی اجازت دیتے تھے۔ ابتداء میں اوراد کی پابندی پر بہت تاکید فرماتے تھے۔ ان امور پر مکمل مداومت کے بعد ذکر جہری کی تلقین فرماتے اور اس پر استقامت حاصل ہو جانے پر مراقبہ کا حکم دیتے تھے۔ سالکین و مریدین کی اصلاح و تربیت کا ہمہ وقت خیال رکھتے تھے۔ جس کے اندر صلاحیت و استعداد پاتے اس کی جانب بطور خاص توجہ فرماتے تھے۔ (مناقب ص ۱۷)

امر بالمعروف ونہی عن المنکر

امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے بارے میں شاہ صاحب بلاخوف لومت لائم سعی بلیغ فرماتے تھے اور ابتداء میں تو مزاج میں اس قدر شدت تھی کہ خلاف شرع امر کو دیکھتے ہی بے قابو ہو جاتے تھے۔ اگر کہیں سے ڈھول یا نقارہ کی آواز کان میں پڑ جاتی تو اسے توڑے بغیر قرار نہ ہوتا تھا۔ نماز فجر کے وقت مسجد میں جاتے ہوئے اگر کسی کو سویا ہوا دیکھ لیتے تو اس کے اوپر پانی ڈال دیتے تھے۔ یا عصا سے کرید کر جگا دیتے اور نہ اٹھنے پر کبھی کبھی عصا سے مار بھی دیتے تھے، شادی، بیاہ کے سلسلے میں غیر قوموں کے اختلاط سے مسلمانوں میں اس وقت جو غلط رسمیں جاری ہو گئی تھیں، مثلاً جلوہ، نقارہ وغیرہ اسے اپنی اصلاحی کوششوں سے بالکل ختم کر دیا تھا۔

مناقب میں ہے:

> اکثر بدعتہا کہ دریں دیار شائع بود مثل نقارہ وجلوہ ورسوم نکاح ہمہ را دور ساختہ
> ورسم جاہلاں کہ در خلق پراگندہ بود جملہ را از میاں بر انداخت (ص ۱۳)

”اکثر بدعتیں جو اس دیار میں جاری تھیں جیسے جلوہ و نقارہ اور نکاح کی دیگر رسمیں سب کو ختم کر دیا اور جاہلانہ رسوم جو عوام میں پھیلی ہوئی تھیں ان سب کو بالکل دور کر دیا۔“

اس سلسلہ میں صاحب گنج ارشدی نے ایک عجیب واقعہ نقل کیا ہے جس سے شاہ صاحب کی ایمانی جرأت وصلابت کا اندازہ ہوتا ہے وہ لکھتے ہیں کہ شاہ صاحب شہر کی جامع

مسجد میں نماز جمعہ ادا کیا کرتے تھے ایک مرتبہ خطیب نے خطبہ میں شہنشاہ اکبر کا نام لیا۔ اس کا نام سنتے ہی شاہ صاحب کو جلال آ گیا، آگے بڑھ کر خطیب کو منبر سے کھینچ لیا اور فرمایا خطبہ میں کافر کا نام لیتا ہے۔ اتفاق سے شاہ صاحب کے ہمراہ اس وقت ان کے دونوں شیوخ حضرت مولانا خواجہ کلاں اور شیخ تاج الدین جھوسوی بھی تھے۔ شہر کے قاضی اور حاکم تو شاہ صاحب سے ان کے ہیبت وجلال کی بناء پر کچھ نہ کہہ سکے۔ البتہ ان دونوں بزرگوں سے عرض کیا کہ ہم بادشاہ کے نوکر ہیں اگر بادشاہ کو معلوم ہو جائے گا کہ خطبہ سے اس کے نام کو خارج کر دیا گیا ہے تو ملازمت تو جائے گی ہی ہمارے مکانات بھی مسمار کرا دے گا، اس لئے ہم خطبہ میں اس کے نام کو شامل کرنے میں مجبور ہیں۔ خواجہ کلاں نے اس دن سے شاہ صاحب کو ہدایت کر دی کہ نماز جمعہ بجائے جامع مسجد کے منڈواڈیہہ میں ادا کر لیا کریں۔ (گنج ارشدی ص ۱۷۳)

امراء واغنیا کے ساتھ اس بارے میں انتہائی متشدد تھے، ان کے ساتھ رفق ونرمی کا معاملہ کرنا تو گویا جانتے ہی نہ تھے۔

صاحب مناقب لکھتے ہیں:

> وے قدس سرہ با جماعت اغنیاء در کلام بسیار شدید بود وسخن ہرگز برفق نگفتے واگر خلاف شرع ازیں جماعت دیدے منع کردے وزجر فرمودے واگر کسے از ابنائے روزگار باسبلت دراز خدمت وے رسیدے سبلت وے بریدے۔ (ص ۱۲)

”حضرت شاہ صاحب قدس سرہ جماعت اغنیاء کے ساتھ گفتگو بڑی سخت فرماتے تھے، نرمی ہرگز نہ فرماتے، اگر کوئی دراز مونچھ والا خدمت میں آ جاتا تو اس کی مونچھ کٹوا دیتے تھے۔“

امراء وحکام کا شاہ صاحب کے ساتھ برتاؤ

شاہ صاحب امراء وحکام سے کوئی تعلق نہیں رکھتے تھے اور نہ کبھی اپنی ضرورت سے

ان کے دربار میں جاتے تھے، البتہ اگر کوئی ضرورت مند، صاحب احتیاج کسی حاکم کے پاس سفارش کی درخواست کرتا تو "من يشفع شفاعة حسنة يكن له نصيب منها" الآیۃ، کے پیش نظر ان کے پاس جانے میں دریغ نہ فرماتے تھے۔ امراء شاہ صاحب کا اس درجہ احترام کرتے تھے کہ ان کے مجلس میں پہنچتے ہی اگر خلاف شرع کوئی چیز ہوتی تھی مثلاً شطرنج، وغیرہ تو فوراً وہاں سے ہٹا کر کہیں چھپا دیتے تھے۔ بسا اوقات تو ان کے مجلس میں پہنچنے سے پہلے ہی ان چیزوں سے مجلس کو پاک وصاف کر دیتے تھے اور ہمہ تن گوش ہو کر شاہ صاحب کی باتوں کو سنتے اور فوراً اس پر عمل درآمد کرتے تھے۔

مدد معاش کے بارے میں شاہ صاحب کا نظریہ

شاہ صاحب امراء وسلاطین کی عطیات اور جاگیروں کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے اور نہ کبھی اسے قبول کیا۔ اکثر فرماتے تھے کہ "ایں مدد معاش مددمات است" اپنے متعلقین کو بھی اس سے احتراز کرنے اور بچنے کی سخت تاکید کرتے تھے۔ چنانچہ اپنے خادم خاص وخلیفہ با اختصاص شاہ یٰسین بنارسی کو مخاطب کر کے بارہا فرمایا کہ دیکھنا اس مدد معاش کو کبھی قبول نہ کرنا ایک غریب فقر و فاقہ کے باوجود اپنے گھر میں اطمینان وعافیت سے رہتا ہے لیکن جب اسے قبول کر لیتا ہے تو اسے حاکم، فوجدار، صوبہ دار اور دیوان کے دربار میں حاضر ہونا پڑتا ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس کی نگرانی کے لئے چوکیدار بٹھائے جاتے ہیں اور مقررہ حقوق کی عدم ادائیگی کی صورت میں اسے نظرانداز کر دیا جاتا ہے، جس سے اس کا اطمینان وسکون اور راحت وعافیت غارت ہو جاتا ہے اور انجام کار یہ مدد معاش اس کے حق میں مددمات ہو جاتی ہے۔ (مناقب ص ۱۲)

فتوحات کے سلسلہ میں طرز عمل

شریعت آباد کے ابتدائی زمانہ قیام میں معاش کی بڑی تنگی رہی، اکثر ایام فاقے میں گذرتے تھے، ساتھ میں رہنے والے طلبہ وفقراء جنگل کی گھاس یا جنگلی درختوں کے پھل

کھا کھا کر دن کاٹتے تھے، مگر بعد میں خدائی قانون ”من یتقی اللہ یجعلہ مخرجا و یرزقہ من حیث لا یحتسبُ“ کے مطابق فتوحات کے دروازے کھل گئے اور ہدایا و تحائف کثرت سے خدمت میں آنے لگے۔ قبول ہدایا کے بارے میں شاہ صاحب کا اصول یہ تھا کہ غریب ارادتمندوں اور مریدوں کے ہدیے تو بلا چون و چرا قبول کرلیا کرتے تھے اور اسے اپنی ضروریات میں صرف فرماتے تھے مگر امراء و رؤسا کی جانب سے پیش کئے گئے تحائف کو رد فرما دیتے تھے۔ البتہ اگر اس جماعت کا کوئی فرد حلقۂ ارادت میں داخل ہوجاتا تو اس کے ہدیہ کو شرف قبولیت عطا ہوجاتا تھا لیکن اسے اپنی ذات پر خرچ کرنے کے بجائے فقراء و غرباء پر تقسیم کردیتے تھے۔

مناقب میں ہے:

> روش او ہم چنیں بود کہ از اغنیاء چیزے نگرفتے تا کہ او داخل محباں نمی شد و محبت و اعتقاد او محکم نمی گشت بعد ازاں کہ او داخل معتقداں می شد و نیت او معلوم می گشت ہرچہ می فرستاد یا می آورد قبول می فرمود آں را صرف فقراء و مسافراں می نمود و خود ازاں گاہے نمی خورد و نمی پوشد (مناقب ص ۱۱)

”(قبول ہدایا کے بارے میں) شاہ صاحب کی روش یہ تھی کہ اغنیا کی کوئی چیز قبول نہ کرتے تھے تاوقتیکہ وہ حلقۂ محباں میں داخل نہ ہوجاتے اور ان کی نیت نہ معلوم ہوجائے، اس کے حلقۂ محباں میں شامل ہوجانے کے بعد جو کچھ وہ بھیجتا یا خود لاتا تو قبول فرمالیا کرتے تھے لیکن اسے کبھی اپنی ذات پر خرچ نہیں کرتے تھے۔“

عطیات و فتوحات کی تقسیم کے سلسلے میں شاہ صاحب کا عمل یہ تھا کہ انہیں دو حصوں پر تقسیم کر کے ایک حصہ اہل خانہ، خدام، اور خانقاہ کے طلبہ اور سالکین پر خرچ فرماتے تھے اور دوسرے حصہ کو شہر کے فقراء، غرباء اور سائلین پر صدقہ کردیا کرتے تھے۔

مناقب ہی میں شاہ یٰسین لکھتے ہیں:

> وطریق وے در باب قسمت فتوح عجیب بود کہ ہرچہ از غیب رسیدے نصف آں بارباب حقوق و فقراء شہر و محتاجان و ہمسائیگاں دادے و نصف بخادمان

خاص از جہۃ فقراء خانقاہ و مہماناں و مسافراں خرچ نمودے۔ (ص ۱۱)

”شاہ صاحب کا طریقہ فتوحات کی تقسیم میں عجیب تھا جو کچھ آتا اسے دو حصوں پر تقسیم کر کے ایک حصہ ارباب حقوق فقراء شہر، محتاجوں اور ہمسایوں کو دیدیتے تھے اور نصف حصہ کو خدام کے حوالہ کر دیتے تھے جسے خانقاہ کے فقراء مہمانوں پر خرچ کیا جاتا تھا۔“

معمولات

شاہ صاحب کا عام طور سے معمول یہ تھا کہ نماز تہجد کے بعد مراقب ہوجاتے جس کا سلسلہ نماز فجر تک جاری رہتا اور کبھی مراقبہ کے بجائے تلاوت قرآن پاک میں مشغول ہوجاتے اور کبھی ایسا بھی ہوتا کہ کسی خاص کیفیت کے تحت مندرج رباعی بار بار پڑھتے اور مسجد کے صحن میں بیتابانہ چکر لگاتے اور زار و قطار روتے۔ رباعی یہ ہے:

گر صد ہزار قرن ہمہ خلق کائنات   فکرت کنند در صفت و ذات اے خدا
آخر بعجز معترف آیند کہ اے الٰہ   دانستہ شد کہ ہیچ ندانستہ ایم ما

نماز فجر کے بعد چاشت تک تلاوت فرماتے اور صلوٰۃ چاشت پڑھ کر مسجد سے باہر آتے۔ زوال کے وقت تھوڑی دیر قیلولہ کرنے کا بھی معمول تھا۔ بعد زوال نماز ظہر باجماعت ادا کر کے کچھ دیر تلاوت کرتے قرآن کی تلاوت میں بڑا اہتمام تھا بالعموم ہفتہ عشرہ میں قرآن ختم کرلیا کرتے تھے، تلاوت کے بعد عصر تک طلبہ کا درس جاری رہتا اور کبھی کبھی درس کے بجائے کچھ تصنیف و تالیف کا کام بھی اسی وقت کرلیا کرتے تھے نماز عصر کے بعد مغرب تک مسجد ہی میں مراقب رہتے۔ مغرب و عشاء کے درمیان نوافل اور ذکر واذکار میں مشغول رہتے اور عشاء سے کچھ پہلے گھر آ کر کھانا تناول فرماتے، کچھ توقف کے بعد نماز عشاء ادا کر کے وظائف پورا کرتے اس سے فارغ ہو کر سو جاتے۔ دو ڈھائی گھنٹہ استراحت کرنے کے بعد بیدار ہوجاتے کبھی بستر پر اور کبھی مسجد میں جا کر ذکر واذکار میں منہمک رہتے۔

روزہ کے سلسلے میں معمول یہ تھا کہ ایام بیض، پنجشنبہ، جمعہ اور دوشنبہ کے روزوں کا

خاص طور سے اہتمام کرتے تھے ورنہ عام معمول صوم داؤدی کا تھا کہ ایک دن روزہ رکھتے اور ایک دن افطار کرتے۔ رمضان کے عشرہ اخیرہ کے اعتکاف کا بھی معمول تھا۔ ان معمولات میں زندگی کے آخر لمحہ تک فرق نہیں آنے پایا تھا حتیٰ کہ آخر عمر میں استغراق و حضور دوام کے باوجود ان میں سرمو فرق نہیں تھا۔ (مناقب ص ۱۴، ۱۵)

غناء وسماع کے بارہ میں رویہ

ابتدائی عہد میں دیگر مشائخ چشت کی طرح شاہ صاحب بھی وجد وسماع سے خاصا ذوق رکھتے تھے۔

مناقب میں ہے:

> وے قدس سرہ ابتداء وقت شغف برسماع بسیار داشت ووجد ورقص بسیار نمود وبعضے اوقات در جوش سماع در جنگل رفتے دو روز در جنگل ماندے وکسے ندانستے کہ کجا است (ص ۱۴)

’’شاہ صاحب قدس سرہ ابتداء وقت میں سماع سے بہت شوق رکھتے تھے اور وجد ورقص خوب فرماتے تھے، بعض اوقات جوش وجد میں جنگل میں بھاگ جاتے اور دو روز تک غائب رہتے تھے۔‘‘

لیکن جب مقام مشیخت پر پہنچے تو اس سے شدت کے ساتھ پرہیز کرنے لگے تھے اور فرماتے تھے۔

> دریں زمانہ سرود نباید شنید کہ بر ہیچ شرط باقی نماندہ وزمانہ فاسد شدہ ویاراں نماندہ موافق ودر قوالاں طمع جا گرفتہ دریں وقت سرود شنیدن مناسب طریقۂ فقراء نیست۔ (مناقب ص ۱۳)

’’اس زمانہ میں غناء نہیں سننا چاہئے کیونکہ کوئی شرط اب باقی نہیں رہ گئی ہے۔ زمانہ فاسد ہو چکا ہے یار موافق نہیں رہے اور قوالوں میں لالچ پیدا ہوگئی ہے اس وقت غنا سننا فقراء کے طریق کے مناسب نہیں ہے۔‘‘

اس بارے میں آپ کا حال بعینہٖ حضرت شیخ عبدالقادر بن محمد حسنی جیلانی ملقب بہ شیخ عبدالقادر ثانی متوفی ۹۳۹-۹۴۰ھ جیسا تھا کہ وہ جب مقام مشیخت پر پہنچے تو سماع وغناء سے بالکلیہ پرہیز کرنے لگے تھے اور مریدوں کو بھی شدت سے منع کرتے تھے۔

اسرار طریقت کے بیان سے احتراز

شاہ صاحب تصوف کے اسرار وحقائق کے بیان کرنے سے بالکلیہ پرہیز کرتے تھے اور اگر کبھی کوئی شخص اس بارے میں کوئی بات پوچھتا تو فرماتے:

"ایں سخنان حالی راا ور مرتبۂ قالی آوردن دور از ادب است"

ان حالی باتوں کو قول کے درجے میں لانا بے ادبی ہے۔

شاہ یٰسین لکھتے ہیں کہ میں چونکہ بہت بے تکلف تھا، اسلئے کبھی کبھی جرأت وہمت کر کے بعض اسرار کو دریافت کرتا تو مجھ سے بھی کچھ بیان نہ فرماتے اور ارشاد فرماتے کہ:

ایں سخن از جملہ واردات است تو در کار خویش مشغول باش ناپرسیدہ بر دل تو مثل آئینہ دار د خواہد شد۔

"یہ باتیں منجملہ واردات کے ہیں تم اپنے کام میں لگے رہو بغیر پوچھے قلب پر آئینہ کی طرح اس کا وارد ہو جائیگا۔"

لباس

لباس میں بھی مشائخ وعلماء کا اتباع کرتے تھے۔ موٹا اور کردرا گزینہ کا پیراہن عام طور سے زیب تن ہوتا اور سر پر پانچ یا سات گز کا عمامہ جس کا رنگ کبھی نیلگوں ہوتا اور کبھی سبز یہ دونوں رنگ شاہ صاحب کے نہایت دل پسند تھے، اس کے برخلاف پیلے رنگ سے بہت نفرت تھی، فرماتے تھے کہ یہ جوگیوں و سناسیوں کا لباس ہے جس سے پرہیز کرنا ضروری ہے۔

غرض جملہ امور میں ظاہر شریعت اور کتاب وسنت نمونۂ عمل تھے جن سے سرمو

انحراف بھی گوارا نہیں تھا، درحقیقت معیار ولایت کتاب وسنت کی پابندی ہی ہے۔ جیسا کہ بعض اکابر سے منقول ہے جو جتنا پابند سنت ہے اتنا ہی بڑا ولی وبزرگ ہے۔ اس معیار کے اعتبار سے شاہ صاحب ولایت وبزرگی کے مرتبۂ کمال پر فائز تھے۔ کیونکہ اتباع سنت ان کی طبیعت بن چکی تھی۔

شاہ یٰسین رقمطراز ہیں:

> دراقوال وافعال تابع سیرت نبوی ودرحرکات وسکنات متبع سنت مصطفوی بود ہرکارے کہ خواستی کرد اول میزان آں بعمل مسنون کردے اگر موافق آمد اختیار می فرمود والا ازاں حذر می کرددایں متابعت ملکہ طبیعت اوشدہ طریق اوطریق اصحاب بود۔ (مناقب ص ۱۵)

’’اقوال وافعال میں سیرت نبوی کے اور حرکات وسکنات میں سنت مصطفوی کے تابع تھے جس عمل کو کرنا چاہتے پہلے اسے میزان سنت پر تولتے اگر موافق سنت ہوتا تو اس پر عمل کرتے ورنہ اس سے پرہیز کرتے تھے اور یہ متابعت ان کی طبیعت راسخہ بن چکی تھی، حاصل یہ کہ آپ کا طریقہ اصحاب کرام رضی اللہ عنہم کا طریقہ تھا۔‘‘

وفات اور مدفن

شاہ صاحب کا وصال سلطان شہاب الدین بن محمد شاہجہاں متوفی ۱۶۶۷ء/ ۱۰۷۶ھ کے دور سلطنت میں شب دوشنبہ ۸؍شوال ۱۰۴۲ھ/ ۱۶۳۲ء کو ماہ پور ضلع غازی پور میں ہوا اور سہ شنبہ شوال کو منڈواڈیہہ بنارس میں اپنے آبائی مقبرہ میں سپرد خاک ہوئے۔

شاہ یٰسین بنارسی نے وفات کی تفصیل یوں بیان کی ہے:

شب دوشنبہ کو موضع ماہ پور کی مسجد میں وضو کر رہے تھے کہ اثناء وضو میں اچانک سیدھے کھڑے ہوگئے اور قبلہ رو ہوکر تحریمہ کے لئے ہاتھ اٹھا کر بلند آواز سے اللہ اکبر کہا اور اسی کے ساتھ جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔

وفات سے کچھ عرصہ قبل ہی سے دوپہر کا قیلولہ اور شب کی استراحت کو بالکل ترک

کر دیا تھا اور فرماتے تھے ’’وقت قیلولہ نبودہ وخفتن نماندہ‘‘ یعنی اب قیلولہ کرنے اور سونے کا وقت ختم ہو گیا۔ ہمہ وقت ذکر وفکر اور مراقبوں میں مشغول رہتے تھے۔

شریعت آباد سے جب ماہ پور کے لئے روانہ ہونے لگے تو خلاف معمول بیعت کے خواہشمندوں کو شہر سے بلا کر بیعت فرما کر داخل سلسلہ کیا اور فرمایا کہ اس کے بعد ’’وقت نخواہند یافت‘‘ یعنی پھر بیعت کا وقت نہیں پائیں گے۔

شاہ یٰسین یہ بھی لکھتے ہیں کہ وفات کے بعد حیرت انگیز طور پر نبض چلتی رہی اور جسم بدستور گرم رہا جس سے لوگوں کو حیات کا شبہ ہوا حالانکہ روح قفس عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔ وفات کی اطلاع ملتے ہی شیخ پورہ اور قرب وجوار کے اعزہ اور متعلقین رات ہی کو ماہ پور میں جمع ہو گئے، غسل وکفن کے بعد تدفین کا مسئلہ سامنے آیا۔ شیخ پورہ کے اکثر اصحاب کی رائے یہ تھی کہ جنازہ جھوسی میں دفن کیا جائے لیکن شیخ ناصر الدین خلیفہ حضرت شاہ صاحب کی رائے یہ ہوئی کہ تدفین منڈاوڈیہہ میں ہونی چاہئے۔ بالآخر انہیں کی رائے پر اتفاق ہو گیا اور رات کے آخر حصہ میں جنازہ ماہ پور سے اٹھایا گیا اور سہ شنبہ کو ایک پہر دن چڑھتے چڑھتے منڈواڈیہہ پہنچ گیا جہاں خاندانی مقبرہ میں تدفین عمل میں آئی۔ (ص ۳۹، ۳۰)

شیخ مسعود اسعدی بنارسی نے یہ تاریخ وصال کہی ہے:

شیخ روشن دل کہ اہل عرش وفرش   نام پاکے او بہ پاکی می برند
یافت تاریخ عروجش اسعدی   جلوہ گاہ او شدہ عرش بلند

۱ ۰ ۴ ۲
(مناقب ص ۳۱)

وفات کے چند ماہ بعد کسی معتقد نے مزار پر ایک بلند اور وسیع چبوترہ تعمیر کروایا، اور اس کے بارہ سال بعد ۱۰۵۴ھ میں شاہ صاحب کے ایک مرید خواجہ عبد الصمد نے اس پر ایک شاندار گنبد بنوا دیا جو اسی شان کے ساتھ آج بھی قائم ہے۔ مقبرہ کا احاطہ وسیع ہے جس میں شاہ صاحب کے خاندان اور متعلقین کے مزارات کے علاوہ ایک مسجد بھی ہے جسے شاہ غلام معین الدین جون پوری متوفی ۱۱۲۰ھ نے تعمیر کرائی تھی بعد میں ۱۳۰۵ھ میں اس کی جدید تعمیر ہوئی ہے۔ محراب میں یہ کتبہ نصب ہے جسے مولانا وکیل احمد سکندر پوری

نے نصب کیا ہے:

ازسرنو ساخت ایں مسجد معین دین حق   سالہا باشد برائے اہل ایماں یادگار
سال مسعود بنائش عاجز خستہ نوشت   مسجد درگاہ شاہ طیب والا تبار
۱ ۳ ۰ ۵

سالانہ ۸؍شوال کو خانقاہ رشیدیہ جون پور کے زیر اہتمام مزار پر قرآن خوانی ہوتی ہے اور فقراء اور غرباء کو کھانا تقسیم کیا جاتا ہے شاہ صاحب کی کوئی اولاد نہیں تھی، البتہ شاہ یٰسین کی آپ نے مثل فرزند کے پرورش وتربیت کی تھی۔ یہی آپ کے وصال کے بعد جانشین ہوئے۔

چند مریدین وخلفاء

شاہ صاحب نے تعلیم وتحصیل اور عرفان وسلوک میں تکمیل کے بعد پوری زندگی بنارس میں ارشاد وتلقین میں بسر کی اور ہندوستان کے مشائخ کی طرح آپ نے دیار پورب میں بڑا اصلاحی وتبلیغی کام کیا بقول صاحب مناقب ”اکثر طالبان ومصاحبان وے بدرجۂ کمال رسیدہ اند وخلفائے وے بمرتبۂ تکمیل دیگراں مرتقی شدہ“ یعنی ان کے اکثر متوسلین درجۂ کمال کو پہنچے اور خلفاء دوسروں کی اصلاح وتربیت کے مقام پر فائز ہوئے۔ ان اکثر طالبین وخلفاء میں سے جن چند بزرگوں کے حالات مل سکے ہیں وہ یہ ہیں:

(۱) دیوان محمد رشید جونپوری

گیارہویں صدی کے علماء ومشائخ میں دیوان صاحب شریعت وطریقت کے مسلم مقتداء اور امامت وعبقریت کے بلند مقام پر فائز تھے۔ ۱۰؍ذی قعدہ ۱۰۰۰ھ کو موضع برونہ ضلع اعظم گڈھ میں آپ کی ولادت ہوئی، چونکہ آپ کے والد شیخ مصطفیٰ نے اپنے شیخ ومرشد کے حکم سے برونہ سے ترک سکونت کر کے پورنیہ میں اقامت اختیار کرلی تھی، اس لئے دیوان صاحب کی پرورش وتربیت ان کے ماموں شیخ شمس الدین برونوی متوفی ۱۰۴۷ھ نے کی۔

استاذ الملک شیخ محمد افضل جونپوری متوفی ۱۰۶۲ھ مفتی شمس الدین برونوی، شیخ محمد لاہوری، شیخ نور محمد مداری جونپوری وغیرہ سے علوم فنون کی تکمیل کی اور علم حدیث شیخ نور الحق بن شیخ عبد الحق محدث دہلوی سے دہلی جا کر حاصل کیا۔ تعلیم وتحصیل سے فراغت کے بعد شاہ طیب بنارسی سے بیعت کی اور احسان وسلوک کے منازل طے کر کے ۱۰۴۰ھ میں شاہ صاحب سے سلسلۂ چشتیہ میں خلافت واجازت پائی اور چند مہینوں کے بعد شاہ صاحب ہی سے سلاسل سہروردیہ وقادریہ کی اجازت سے بھی مشرف ہوئے۔

دیوان صاحب کو شاہ طیب بنارسی کے علاوہ اس عہد کے دیگر مشائخ سے بھی خلافت واجازت حاصل تھی، جن میں شیخ تاج الدین جھوسوی متوفی ۱۰۷۳ھ، شیخ عبد القدوس قلندر جونپوری متوفی ۱۰۵۲ھ، شاہ راجی سید احمد مانکپوری متوفی .... اور شیخ شمس الدین کالپوری متوفی سنہ .... کے نامنامی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

دیوان صاحب پوری زندگی ارشاد وتلقین کے ساتھ درس وتدریس اور تصنیف و تالیف میں مشغول رہے۔ اور تلامذہ وخلفاء کی کثیر جماعت کے علاوہ متعدد اہم تصانیف یادگار چھوڑیں جن میں مناظرہ رشیدیہ عربی، شرح ہدایۃ الحکمت عربی، شرح اسرار المخلوقات، حاشیہ شرح مختصر عضدی، اپنے اپنے فن میں نہایت اہم ہیں۔ دیوان صاحب کے ذریعہ شاہ صاحب کے سلسلے کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ شاہ طیب قدس سرہ کے مفاخر ومحاسن کے لئے یہی کافی ہے کہ انھوں نے دیوان رشید جیسے امام وقت کو اپنی خانقاہ سے پیدا کیا۔

دیوان صاحب کے زیر تربیت رہ کر جن بزرگوں نے درجۂ کمال حاصل کیا اور شرف خلافت سے مشرف ہوئے، ان کی تعداد بارہ ہے جن میں آپ کے صاحبزادے شیخ محمد ارشد جونپوری، میر سید جعفر پٹنوی، میر سید قیام الدین گھورکھپوری، شیخ عبد الشکور ماہلی، شیخ نور الدین مداری، شیخ محی الدین جونپوری، شیخ حبیب اللہ بہاری، شیخ عبد اللہ بنگالی نے بڑی شہرت پائی اور ان کے ذریعہ سلسلہ کی خوب اشاعت ہوئی۔

دیوان صاحب کی وفات یوم جمعہ ۹ / رمضان المبارک ۱۰۸۳ھ کو بحالت سجدۂ نماز فجر

ہوئی۔ آپ کے تلمیذ خاص ومرید صالح شیخ محمد ماہ دیوگامی نے نماز جنازہ ادا کرائی اور محلّہ رشید آباد شہر جونپور میں ہمیشہ کے لئے یہ گنجینۂ علم ودانش اور مخزن رشد وہدایت مدفون ہوگیا۔

(۲) شیخ ناصر الدین جھوسوی

شیخ ناصر الدین بن خواجہ کلاں ابن اسد العلماء شیخ نصیر الدین جھوسوی اپنے وقت میں کبار مشائخ چشت میں شمار ہوتے تھے۔ اپنے والد کے ابن عم اور خلیفہ شیخ تاج الدین جھوسوی کے سایۂ عاطفت میں بچپن کے ایام گذار کر بنارس آئے اور حضرت شاہ طیب بنارسیؒ سے صرف ونحو کی تعلیم حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے جونپور گئے اور وہاں کے ممتاز اساتذہ سے فقہ، اصول فقہ اور معانی کی تعلیم مکمل کی۔ بعد ازاں کڑہ مانک پور جاکر حدیث وتفسیر کی تحصیل کی۔ جملہ علوم مروجہ میں کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ تعلیم وتحصیل سے فراغت کے بعد اپنے والد مولانا خواجہ کلاں اور شیخ تاج الدین کی صحبت میں رہ کر عرصۂ دراز تک اکتسابِ فیض کرتے رہے، پھر بنارس حضرت شاہ طیب بنارسی کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوگئے۔ اور انہیں کی خدمت میں رہ کر سلوک کی تکمیل کی اور خرقۂ خلافت سے سرفراز ہوئے، حضرت شاہ صاحب کے علاوہ انہیں شیخ تاج الدین جھوسوی سے بھی خلافت واجازت حاصل تھی۔

مجاہدہ وریاضت میں بڑا انہماک تھا، صفائی قلب کی بناء پر دوران ذکر عجیب وغریب امور کا مشاہدہ کرتے تھے، خود انہیں کا بیان ہے کہ ابتدائے وقت میں ایک دن دوران ذکر قلب کی جانب توجہ کی تو دیکھا کہ تمام قلب اسم پاک کے نقش سے مزین ہے یہ حالت دیکھ کر اس درجہ بہجت ومسرت حاصل ہوئی کہ یہ شعر پڑھ کر رقص کرنے لگا۔

در دل نگار دست چناں نقش بستہ اند
اما گذار نیست بپا بوس کونہم

اسی غلبۂ حال میں خیال ہوا کہ شاہ صاحب کی خدمت میں چل کر اس جاں بخش کیفیت سے انہیں مطلع کروں جب چلنے کا قصد کیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ زمین کے چپے چپے

پر اسم پاک کا نقش ابھرا ہوا ہے۔ شیخ تاج الدین جھوسوی کے وصال کے بعد خانقاہ جھوسی کے یہی سجادہ نشین ہوئے اور پوری زندگی اپنے بزرگوں کے طریق پر ارشاد و تلقین اور اصلاح و تبلیغ میں بسر کردی تفصیلی حالات اور سن وفات کا علم نہ ہو سکا۔

(۳) شاہ یٰسین بنارسیؒ

حضرت شاہ یٰسین بنارسیؒ کی ولادت ۱۰۲۰ھ میں جون پور میں ہوئی، نسلاً شیخ صدیقی ہیں۔ شجرۂ نسب یہ ہے: شاہ یٰسین بن شیخ احمد بن شیخ عبدالرحیم بن شیخ اوحد بن شیخ راولہ بن شیخ نجم الدین بن شیخ اسحاق بن صفی الدین ثانی بن عبدالسمیع بن عبدالرشید بن عبدالشہید بن ابوسعید بن ابوالمعالی بن عبدالولی بن عبدالعزیز بن شاہ اسماعیل بن مخدوم صفی الدین کبیر عربی بن عبدالسلام بن ابوالفضل بن ابوعبداللہ بن ابوجعفر بن ابوخلیل بن حضرت محمد بن حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہم (گنج ارشدی ورق ۲۴۳ جلد ا)

صاحب بحر ذخار نے شاہ یٰسین کے ذکر میں لکھا ہے کہ ”خلف و خلیفہ شاہ طیب بنارسی“ (ص ۱۰۰) خلیفہ کی حد تک تو ان کی بات درست ہے لیکن خلف لکھنا صحیح نہیں ہے۔ اس غلطی کی وجہ یہ ہے کہ شاہ یٰسین بچپن ہی میں شاہ صاحبؒ کی خدمت میں آ گئے تھے اور شاہ صاحب نے ان کی اپنے لڑکے کی طرح پرورش اور نگہداشت کی تھی، اس لئے لوگوں کو صحیح بات کا علم نہ ہو سکا۔

چنانچہ گنج ارشدی میں ہے:

> ہر چند وے پسر صلبی حضرت شیخ نبودہ اما وے را از طفلی در حجرہ خود تربیت فرمودہ کہ خاص و عام وے را پسر حضرت شیخ می دانستند کم کسے نام پدر وے میداند (ورق ۲۴۲ ج ا)

”ہر چند کہ شاہ یٰسین حضرت شاہ طیب کے پسر صلبی نہیں تھے لیکن انہیں بچپن ہی سے شاہ صاحب نے اپنی آغوش تربیت میں لے لیا تھا کہ خاص و عام انہیں حضرت کا لڑکا ہی سمجھتے رہے اور بہت کم لوگوں کو ان کے والد کا نام معلوم ہو سکا۔“

شاہ یٰسین نے ابتدائی صرف ونحو سے لے کر ارشاد (قاضی شہاب الدین دولت آبادی) وکنز الدقائق تک کی تعلیم شاہ صاحب سے ہی حاصل کی اس کے بعد شاہ صاحب کے حکم سے جون پور چلے گئے اور شیخ محمد افضل جونپوری متوفی ۱۰۶۲ھ اور دیوان محمد رشید جونپوری سے بقیہ نحو اور منطق، فلسفہ، فقہ اور اصول فقہ کی تحصیل کی۔ دوران تعلیم ہی میں جب کہ ان کی عمر کا انیسواں سال تھا۔ شاہ صاحب نے انہیں سلسلہ میں داخل فرما کر ذکر ووظائف کی تلقین کی بالخصوص نماز تہجد اور اوّابین پر مداومت کی تاکید کی اور ایک سال کے بعد یعنی ۱۰۴۰ھ میں عید کے دن خرقۂ خلافت سے نوازا۔ اس وقت شاہ یٰسینؒ اصول بزدوی پڑھ رہے تھے۔ جون پور و بنارس کے درمیان قرب مسافت کی بناء پر بنارس اکثر آنا ہوتا تھا جس کی وجہ سے تعلیمی نقصان ہوتا تھا، اس لئے شاہ صاحب نے جون پور کے بجائے انہیں کٹرہ شیخ جمال اولیاء کٹروی متوفی ۱۰۴۲ھ کی خدمت میں بھیج دیا۔

شاہ یٰسین نے شیخ جمال سے ہدایہ اور تفسیر بیضاوی کی تعلیم شروع کی لیکن ڈھائی ماہ بھی گذرنے نہیں پایا تھا کہ شاہ صاحب کا قاصد مکتوب لے کر پہنچ گیا جس میں تحریر تھا کہ خط دیکھتے ہی بلا تاخیر بنارس آجاؤ۔ خط رمضان شریف کی انتیسویں تاریخ کو ملا۔ اس لئے ایک دن رک کر نماز عید ادا کر کے کٹرا سے روانہ ہوگئے راستہ ہی میں جھوسی سے چند میل آگے پہنچے تھے کہ حضرت شاہ صاحب کے وصال کی خبر ملی۔ چنانچہ سرگرداں و پریشاں شب و روز قطع مسافت کرتے ہوئے ۱۰/ شوال المکرّم یوم چہارشنبہ کو منڈواڈیہہ پہنچے ان کے دو دن بعد دیوان محمد رشید بھی جون پور سے آگئے۔ چونکہ شاہ یٰسین بچپن ہی سے شاہ صاحب کے آغوش تربیت میں پلے تھے، اس لئے اس سانحہ کا ان پر خاص اثر تھا، ان کی دلجوئی وتسلی کی غرض سے دیوان محمد رشید اور شیخ ناصر الدین ایک ماہ تک منڈواڈیہہ میں قیام پذیر رہے اور شاہ یٰسین کی اچھی طرح دلجوئی وخاطر داری کر کے اپنے اپنے مقام پر واپس لوٹ آئے۔

شاہ صاحب کی وفات کے بعد شاہ یٰسین نے اپنا اصلاحی تعلق دیوان محمد رشید سے قائم کر لیا اور ان سے بھی خلافت واجازت حاصل کی بعد میں شاہ یٰسین صاحب ہی شاہ صاحب کے جانشین ہوئے اور پوری زندگی منڈواڈیہہ میں اصلاح وتبلیغ کی خدمت انجام

دیتے رہے۔ عبادت و ریاضت میں بڑا انہماک تھا۔ عام طور سے نصف شب کو بیدار ہوجاتے اور فجر تک نوافل اوراشغال میں مصروف رہتے تھے۔

گنج ارشدی میں ہے:

> وقریب نصف شب برمی خاست وضونمودہ تا فجر ادائے نوافل واشغال گذرانید بعداذان فجر نماز صبح ادا می فرمود۔ (ص ۲۵۴)

''نصف شب کے قریب بیدار ہوجاتے اور وضو کرکے فجر تک نوافل اوراشغال میں مصروف رہتے اور بعداذان فجر نماز فجر ادا کرتے تھے۔''

زندگی کے آخرایام میں جھوسی تشریف لے گئے تھے وہیں پیام اجل آپہنچا اور ۲۰/ربیع الثانی ۱۰۷۶ھ شب سہ شنبہ کو جان جان آفریں کے سپرد کردی۔ جوسی ہی میں اسدالعلماء شیخ نصیرالدین جھوسوی کے مقبرہ میں مدفون ہوئے (گنج ارشدی ص ۲۵۴)

مرقع بنارس میں ہے کہ ''مزارمنڈواڈیہہ میں ہے'' جودرست نہیں ہے۔

شاہ یٰسین کی علمی یادگارمیں آپ کی گراں قدراوراہم تصنیف ''مناقب العارفین'' ہے جس کا ایک قلمی نسخہ جامعہ مظہرالعلوم بنارس کی ملکیت میں ہے، یہی قلمی نسخہ اس مقالہ کا اصل ماخذ ہے۔ شاہ یٰسین نے اس تذکرہ کواپنے شیخ و مربی حضرت شاہ طیب بنارسی کی وفات کے دس سال بعد ۱۰۵۴ھ میں مرتب کیا تھا، کل صفحات ۲۴۰ ہیں۔ لیکن کتاب پر ۲۳۸ کی عدد لکھی ہے۔ ابتدائے کتاب سے ۱۲۰ صفحات تک شاہ طیبؒ اوران کے خاندان کے بزرگوں کے حالات ہیں جسے شاہ یٰسین نے اپنی ذاتی معلومات اورشاہ صاحب کے اعزہ و متعلقین سے دریافت کرکے لکھا ہے۔ اس کے بعد پھر دوسرے مشائخ چشت کا سلسلہ وارتذکرہ ہے۔ جس کا ماخذ عام طور سے اخبارالاخیاراورسیرالعارفین ہے۔

کتاب کے سرورق پرگوشہ میں یہ عبارت درج ہے:

''چند روزے بعاریت باماست کتبہ فقیر خیرالدین محمدؐ'' اوراس سے پہلے شیخ خیرالدین محمد ہی کے قلم سے ایک مختصر نوٹ ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ نسخہ کچھ دنوں تک شیخ خیرالدین محمدالہٰ آبادی کے مطالعہ میں رہ چکا ہے۔

(۴) شیخ عالم بنارسی

شیخ عالم بن شیخ الہ داد بن شیخ داؤد بنارسی شاہ صاحب کے خاندانی چچا تھے۔ صلاح و تقویٰ اور عبادت و ریاضت میں امتیازی شان رکھتے تھے یہ اگرچہ شیخ تاج الدین جھوسویؒ کے مجاز تھے۔ لیکن زندگی بھر اپنے آپ کو شاہ صاحب کا خادم و مرید شمار کرتے رہے۔ رشتہ میں چچا ہونے کے باوجود شاہ صاحب کا انتہائی ادب و احترام کرتے تھے اور ہمہ وقت خدمت بجالانے کی فکر میں رہتے تھے۔ شاہ صاحب بھی ان کا بہت احترام ولحاظ کرتے تھے۔ ان کا مستقل قیام منڈواڈیہہ میں تھا۔ لیکن بربنائے عقیدت ومحبت اکثر شریعت آباد تشریف لاتے اور شاہ صاحب کے فیض صحبت سے نفع اندوز ہوتے۔ ایک بار شاہ صاحب نے غلبۂ حال میں ان سے فرمایا: 'دریں ساعت ہرچہ بخواہی خواہ'' یعنی اس وقت جو مانگنا چاہو مانگ لو۔ انھوں نے عرض کیا صرف اتنی خواہش ہے کہ میری وفات آپ کی موجودگی میں ہو اور آپ اپنے ہاتھوں سے میری تجہیز و تکفین فرمائیں۔ ان کی یہ تمنا پوری ہوئی۔ شاہ صاحب کے وصال سے ایک سال قبل ۱۰۴۱ھ میں اس حال میں انتقال کیا کہ شاہ صاحب ان کے سرہانے بیٹھے تھے اور یہ دم توڑ رہے تھے۔ حسب وعدہ شاہ صاحب نے اپنے ہاتھوں غسل دیا اور تجہیز و تکفین کی مزار منڈواڈیہہ میں تالاب کے کنارہ اب بھی موجود ہے۔ (مناقب ص ۲۰)

(۵) شیخ عبدالمؤمن کشمیری

وطن مالوف کشمیر تھا، بنارس آکر شاہی ملازمت سے وابستہ ہوگئے، لیکن جب حضرت شاہ صاحب سے عقیدت ہوئی اور ان سے بیعت کرلی تو ملازمت کو خیرباد کہہ کر ہمہ تن عبادت و ریاضت میں مشغول ہوگئے، ان کے مفاخر ومحاسن میں اہم ترین چیز یہ ہے کہ شاہ صاحب سے ان کی گرویدگی محبت و عشق کے درجہ تک پہنچی ہوئی تھی۔ شاہ صاحب کے ادنیٰ اعراض سے بھی تڑپ اٹھتے تھے اور جب تک ان کی چشم عنایت کو اپنی جانب مائل نہ کرلیتے قرار نہ آتا تھا۔ شاہ صاحب کی خدمات انہیں سے متعلق تھیں جنہیں یہ تاحیات

بحسن وخوبی انجام دیتے رہے۔ ۲۸/ یا ۲۹/ ذی قعدہ ۱۰۳۰ھ میں وفات پائی، وفات سے کچھ دیر قبل فرمایا کہ قبر تیار کرلو۔ قبر تیار ہوجانے کے بعد تیمارداروں سے کہا پانی گرم کرو، جب پانی گرم ہوگیا تو تکیہ کے نیچے سے کفن نکال کر اوڑھ لیا اور جان مولائے حقیقی کے حوالہ کردی۔ (مناقب ص ۲۲)

(۶) شیخ فاضل محمد پھلتی

یہ قصبہ ضلع مظفرنگر پھلت کے باشندہ تھے۔ ابتداء میں انہیں کسی سے عشق ہوگیا تھا۔ محبوب کی مفارقت کے غم میں بحالت شوریدگی گھر سے نکل پڑے۔ دیوانہ وار در بدر کی ٹھوکریں کھاتے کھاتے خوش قسمتی سے شاہ صاحب کی خانقاہ میں پہنچ گئے۔ ان کی دیوانگی و پریشان حالی پر شاہ صاحب کو بڑا رحم آیا۔ بالآخر تصرفات باطنی کے ذریعہ ان کے عشق مجازی کو عشق حقیقی کی جانب پھیر دیا۔ انجام کار جمعیت کے ساتھ عبادت وریاضت میں مشغول ہوگئے۔ شاہ صاحب ان سے بہت محبت کرتے تھے اور یہ بھی شاہ صاحب پر جان چھڑکتے تھے۔ ایک لمحہ کی جدائی بھی برداشت نہیں تھی۔ چونکہ گھر سے بعالم دیوانگی غائب ہوئے تھے، اس لئے گھر والے اسی وقت سے تلاش میں تھے۔ تقریباً پانچ سال کے بعد ایک صاحب تلاش کرتے کرتے بنارس بھی پہنچے۔ شہر میں کسی سے معلوم ہوا کہ فاضل محمد نام کے ایک صاحب شریعت آباد میں شاہ طیب بنارسی کی خانقاہ میں رہتے ہیں۔ یہ خانقاہ میں حاضر ہوئے اور گھر والوں کی پریشانیاں بیان کرکے انہیں واپس لے جانے کی اجازت طلب کی، شاہ صاحب نے بخوشی اجازت دے دی۔ مگر یہ خود راضی نہ ہوئے۔ شاہ صاحب نے کسی طرح سے راضی کرکے رخصت کیا۔ پھلت میں انہیں خوب مقبولیت حاصل ہوئی اور ایک کثیر جماعت ان کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئی بالآخر چند سال کے بعد رہزنوں کے ہاتھوں شہید ہوگئے۔ تاریخ وفات کا علم نہ ہوسکا۔ (مناقب ص ۲۲، ۲۳)

(۷) شیخ حسن

یہ نومسلم تھے۔ شیخ محمد رہتکی متوفی سنہ ... کے ہاتھ پر مشرف باسلام ہوئے تھے

اورانہیں سے تعلیم حاصل کی تھی۔ بعد میں شاہ صاحب کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے اور سلوک کے منازل طے کر کے بلند مقام پر پہنچے۔ شاہ صاحب نے اپنے دست خاص سے انہیں خرقہ پہنایا۔

شاہ صاحب کی رحلت کے بعد شہر کے اکثر لوگوں نے انہیں کی جانب رجوع کر لیا تھا۔ ۱۰۴۹ھ میں انتقال کیا اور شریعت آباد میں اپنی تعمیر کردہ مسجد کے احاطے میں دفن ہوئے۔ (مناقب ص ۲۳)

(۸) شیخ طاہر بنارسی

شیخ طاہر بن شیخ چاندہ بن شیخ حافظ بن شیخ حبیب اللہ بن شیخ فرید بنارسی، شاہ صاحب کے خاندانی عزیز اور مرید خاص تھے۔ عرصۂ دراز تک شریعت آباد میں حجرہ بنا کر علائق دنیوی سے یکسو ہو کر عبادت و ریاضت میں مشغول رہے، لیکن جب تنگیٔ معاش نے بہت مجبور کر دیا اور فاقے پر فاقے گذرنے لگے تو ناچار شاہی ملازمت کر لی جس میں انہیں بڑا فروغ حاصل ہوا۔ دنیاوی ثروت و وجاہت کے باوجود فقراء سے خصوصی تعلق رکھتے تھے اور خود بھی ہر وقت ذکر الٰہی میں رطب اللسان رہا کرتے تھے۔ آنکھیں بھی اکثر یاد خداوندی میں اشکبار رہتی تھیں۔ انہیں بھی شاہ صاحب سے خصوصی تعلق و محبت تھی۔ شاہ یٰسین کا بیان ہے کہ شاہ صاحب کی وفات کے چند دن بعد برائے فاتحہ مزار پر حاضر ہوئے تو فرطِ غم سے روتے روتے ہچکیاں بندھ گئیں، اسی حال میں سسکیاں لیتے ہوئے کہا کہ بزرگوں کی جدائی کا صدمہ سہا نہیں جاتا۔ چنانچہ اس واقعہ کے تین ماہ کے اندر ہی ۱۰ رمحرم ۱۰۴۲ھ کو وفات پا کر بزرگوں کے پاس جا پہنچے۔ مزار محلہ بھدوؤں شہر بنارس میں خواجہ مبارک بنارسی کے خطیرہ میں ہے۔ (مناقب ۱۰۱)

شیخ طاہر کی یادگار میں ایک مسجد آج بھی گنگا، برنا سنگم پر چندن شہید کے مزار کے متصل موجود ہے (تذکرہ مشائخ بنارس)

☆ ☆ ☆

قطب الاقطاب دیوان محمد رشید عثمانی جونپوری

قدرت کا یہ عجیب نظام ہے کہ ایک کی بربادی دوسرے کی آبادی کا سبب ہوتی ہے، ایک جانب ایک شہر اجڑتا ہے تو دوسری طرف دوسرا آباد ہوتا ہے، یہی ہمیشہ سے ہوتا چلا آرہا ہے اسی قانون فطرت کے تحت جب فتنۂ تیموری کی ہلاکت خیزیوں سے مغرب میں دلی کی علمی، تمدنی اور معاشرتی دنیا میں بادخزاں کے تند جھونکے چل رہے تھے تو دوسری جانب دیار پورب کے شہر جونپور میں علم وفن اور تمدن ومعاشرت کے چمنستان میں بہار آئی ہوئی تھی، تاجدار سلطنت شرقیہ ابراہیم شاہ المتوفی ۱۴۴۰ءکے حسن انتظام علم دوستی، علماء نوازی اور فیاضی سے جونپور مرجع ارباب کمال بن گیا تھا، یہاں کے مواضعات وقصبات میں علم وفضل کی مسندیں بچھ گئی تھیں، اہل علم ودانش دور دراز مقامات سے کھنچے چلے آرہے تھے اور شہر جونپور یاتون من کل فج عمیق کا مصداق بنا ہوا تھا، اِن نو وارد اہل کمال میں ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی کی ذات گرامی بھی ہے، قاضی صاحب کے جونپور میں آتے ہی اس کے گلستان علم میں بہار نو آگئی، درحقیقت جونپور کی علمی تاریخ کا آغاز قاضی دولت آبادی کی ذات گرامی سے ہوتا ہے، اس میں سلطان الشرق ابراہیم شاہ بھی برابر شریک رہا، سلطنتِ شرقیہ اگرچہ اسّی (۸۰) برس کی قلیل مدّت میں ختم ہوگئی لیکن ملک العلماء اور ملک الشرق نے جس گلستانِ علم کی آبیاری کی تھی وہ تقریباً ساڑھے تین سو سال تک پھولتا پھلتا رہا۔ اور سرزمین جونپور سے ایسے ایسے باکمال افراد ابھرے جن کے کارناموں پر ملت اسلامیہ کو آج بھی فخر ہے۔

ان ہی باکمال افراد میں زبدۃ الاخیار، عمدۃ الابرار، استاذ العلماء، ملاذ الفضلاء، فرید العصر، وحید الدہر، صاحب الرشاد والسداد فی مقام الارشاد قدوۃ اہل العلم والتجرید ابوالبرکات الشیخ دیوان محمد رشید الجونپوری العثمانی کی ذات گرامی بھی ہے۔

علمی مقام و مرتبہ

گیارہویں صدی ہجری کے علماء میں دیوان صاحب امامت و عبقریت کے مقام پر فائز اور شریعت و طریقت کے مسلّم مقتدا تھے، آپ کے اساتذہ و معاصرین آپ کی جودت طبع، ذہانت، فطانت اور علمی و فنّی مہارت کے معترف تھے، آپ کے معاصر اور استاذ بھائی شیخ رکن الدین بحریا آبادی تلمیذ خاص شیخ مفتی شمس الدین بردنوی المتوفی ۱۰۴۷ھ کو جب کوئی علمی شبہہ وارد ہوتا تو اپنے تبحر علمی کے باوجود دیوان صاحب کی طرف مراجعت فرماتے اور تشفی بخش جواب سے مطمئن ہوتے۔ (۱)

استاذ الملک شیخ محمد افضل بن حمزہ عثمانی جونپوری المتوفی ۱۰۶۲ھ جو آپ کے استاذ ہیں ایام طالب علمی ہی سے آپ کی قابلیت و فطانت کے قائل تھے۔ ایک مرتبہ مختصر المعانی کے درس کے وقت ایک صاحب نے عرض کیا کہ یہ ''کان یکون'' کے معنی بھی سمجھتے ہیں یا یوں ہی پڑھ رہے ہیں، استاذ الملک نے برجستہ فرمایا کہ آپ ''کان، یکون'' کے معنی کے متعلق فرماتے ہیں یہ تو ''سیکون'' کے معنی بھی بیان کرتے ہیں، (۲) اسی اعتماد و وثوق کی بنا پر تحصیل و تکمیل سے فراغت کے بعد ایک مرتبہ آپ استاذ الملک کی خدمت میں حاضر ہوئے اس وقت استاذ شریفیہ کا جو فن مناظرہ میں اہم متن ہے کسی طالب علم کو درس دے رہے تھے، دیوان صاحب کی جانب متوجہ ہوکر فرمایا کہ

متن خوب است اگر کسے شرح ایں نویسد بہتر است۔ (۳)

یہ ایک بہترین متن ہے اگر کوئی اس کی شرح لکھ دیتا تو اچھا ہوتا۔

دیوان صاحب استاذ الملک کے اشارہ کو سمجھ گئے اور ایک ہفتہ کے بعد جب پھر حاضر خدمت ہوئے تو رشیدیہ شرح شریفیہ تالیف فرما کر استاذ عالی مقام کی خدمت میں پیش کردی استاذ الملک نے بیحد پسند فرمایا اور بہت تحسین فرمائی، رشیدیہ جیسی اہم تصنیف اور ایک ہفتہ کی قلیل مدت میں دیوان صاحب کی خداداد ذہانت و قابلیت ہی کا کرشمہ ہے

---

(۱) گنج ارشدی ورق ۱۴۔ (۲) ایضاً ص ۱۴۔ (۳) ایضاً ص ۱۴۔

ورنہ ایک ہفتہ میں اس کے مضامین کو حل اور اخذ کرنا بھی غیر معمولی بات ہے، چہ جائیکہ تصنیف کرنا، حاشیہ چلپی کی قرأت کے زمانہ میں دیوان صاحب کا یہ اعلان عام تھا کہ چلپی کے اقوال کو میں رد کرسکتا ہوں جس کا جی چاہے پیش کر کے دیکھ لے، چنانچہ کبھی کبھی ملا محمود جونپوری المتوفی ۱۰۶۲ھ یا کوئی دوسرا رفیق درس چلپی کے قول کو پیش کرتا تو دیوان صاحب اس کی ایسی مدلل تردید فرماتے کہ استاذ الملک بھی داد تحسین دیئے بغیر نہ رہتے۔ (۱)

زمانہ طالب علمی ہی کا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ ملا موہن الہ آبادی جو ایک متبحر عالم اور جید مناظر تھے۔ استاذ الملک کی ملاقات کی غرض سے تشریف لائے، استاذ الملک اس وقت دیوان صاحب کو درس دے رہے تھے، ملا موہن کی خاطر سے درس موقوف کر دینا چاہا، ملا موہن نے کہا کہ سبق جاری رکھا جائے تاکہ ان کی استعداد کا پتہ چلے، چنانچہ درس جاری رہا، دیوان صاحب قرأت کر رہے تھے، ملا موہن نے ایک اعتراض کیا، دیوان صاحب نے جواب دیا اور مباحثہ شروع ہوگیا۔ قریب تھا کہ ملا موہن لاجواب ہوکر خاموش ہوجاتے، یہ صورت دیکھ کر استاذ الملک نے تیز نگاہوں سے دیوان صاحب کی جانب دیکھا، آپ استاذ کا منشا سمجھ کر خاموش ہوگئے۔ (۲)

یوں تو دیوان صاحب جملہ علوم وفنون میں مہارت تامہ رکھتے تھے لیکن فقہ، اصول اور تصوف میں خاص امتیاز حاصل تھا، (۳) اسلئے استاذ الملک مقدمات اصول وفقہ دیوان صاحب سے پوچھتے تھے اور مبادیات حکمت وفلسفہ ملا محمود جونپوری سے۔ (۴)

۱- دیوان صاحب کے تذکرہ کے مآخذ ومراجع: گنج رشیدی قلمی میں دیوان صاحب اور ان کے خاندان کے بیشتر اصحاب کا تذکرہ ہے یہ کتاب دیوان صاحب کا بسیط ملفوظ ہے جس کو آپ کے تلمیذ خاص اور خلیفۂ اجل شیخ محمد نصرت جمال عرف شاہ ملتانی نے جمع کیا ہے، اِس میں ۱۰۷۲ھ سے ۱۰۸۳ھ تک کے ملفوظات درج ہیں، یہ دیوان صاحب کے حالات کا سب سے قدیم اور مستند ماخذ ہے۔

---

(۱) گنج ارشدی ورق ۱۳۔ (۲) ایضا ۱۴۔ (۳) نزھۃ الخواطر ج ۵ ص ۳۶۷۔

(۴) نزھۃ الخواطر ج ۵ ص ۳۶۷، گنج ارشدی ورق ۱۱۴۔

۲- گنج ارشدی قلمی: یہ شیخ محمد راشد بن شیخ محمد رشید دیوان کا ملفوظ ہے، جس کو شیخ ارشد کے خلیفہ شیخ شکر اللہ نے جمع اور شیخ غلام محمد رشید بن شیخ محبّ الدین بن شیخ ارشد نے مرتب کیا ہے، یہ کتاب اپنے حسن ترتیب وتفصیل کے اعتبار سے خاندان رشیدیہ کے حالات میں سب سے مفصل اور جامعیت وافادیت کے لحاظ سے اصل ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔

۳- مناقب العارفین مولفہ شیخ محمد یٰسین جانشین شیخ محمد طیب بنارسی، بزرگانِ چشتیہ کے ذیل میں مؤلف نے دیوان صاحب کا مفصل ومکمل تذکرہ لکھا ہے۔ اس کتاب پر خود دیوان صاحب کا لکھا ہوا حاشیہ بھی ہے، چونکہ یہ کتاب آپ کی حیات ہی میں مرتب ہوئی ہے، اس لئے یہ بھی قابل اعتماد ہے، یہ تینوں مذکور الصدر کتابیں خانقاہ رشیدیہ جونپور میں موجود ہیں۔

۴- بحرِ ذخار کے نہر دوم کے شعبۂ دوم میں بزرگان رشیدیہ کا مکمل تذکرہ ہے، یہ اولیاے کرام کے حالات میں بڑی مشہور کتاب ہے، مگر اپنی ضخامت وطوالت کی وجہ سے آج تک زیور طبع سے آراستہ نہ ہوسکی، اس کا ایک قلمی نسخہ مولانا فصیح الدین جونپوری استاذ مسلم انٹر کالج جونپور کے پاس موجود ہے۔ اور ایک نسخہ دائرۂ محمدی الہ آباد میں ہے جو اچھی حالت میں ہے، راقم السطور نے اس سے استفادہ کیا ہے، نیز دیگر نسخے بھی ہندوستان کے مختلف کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں۔

۵- تجلی نور: مؤلفہ ابوالبشارت نورالدین زیدی ظفرآبادی ص۷۲ و۷۱ میں دیوان صاحب کا تذکرہ ہے۔

۶- نزہۃ الخواطر جلد پنجم ص ۳۶۷، میں بھی دیوان صاحب کا مختصر مگر جامع تذکرہ ہے۔ ان کتابوں کے علاوہ (۷) سمات الاخیار، (۸) سبحۃ المرجان، (۹) تذکرہ علمائے ہند، (۱۰) حدائق حنفیہ، (۱۱) تحفۃ الابرار، (۱۲) تاریخ شیراز ہند وغیرہ میں بھی دیوان کا ذکر ہے، مگر ان میں کوئی نئی اور مزید باتیں نہیں ہیں۔ سب نے مذکورہ بالا چار کتابوں کی باتوں کو دہرایا ہے، البتہ سمات الاخبار میں دیوان صاحب کی اولاد اور تین خلفاء کا مفصل ذکر ہے، اس مضمون کی ترتیب کے سلسلے میں ان سب کتابوں سے مدد لی گئی ہے، مگر اصل

ماخذ کی حیثیت گنج ارشدی و گنج رشیدی ہی رکھتی ہیں۔

دیوان صاحب کے بارے میں اہل باطن کی پیشین گوئیاں

جس دن استاذ الملک شیخ محمد افضل جونپوری کی وفات ہوئی، اسی دن لاہور میں ملا خواجہ نے جو سلسلۂ قادریہ کے مشائخ میں ہیں، فرمایا کہ

امروز قطبِ جونپور وفات یافتہ و بعدے چند شیخ محمد رشید نامی خواہد گشت (۱)

(آج قطب جونپور کی وفات ہوگئی اور چند دن کے بعد اس مقام پر محمد رشید نامی فائز ہوں گے)

۲- شیخ عبد العزیز جونپوری دہلوی خلیفہ قاضی خاں ظفر آبادی نے اپنی آخری عمر میں فرمایا کہ

بعد ما مردے فقیر پیدا خواہد کہ نام وے محمد رشید خواہد بود۔ (گنج ارشدی ورق ۱۲۳)

(میرے بعد ایک مردِ فقیر پیدا ہوگا جس کا نام محمد رشید ہوگا)۔

شیخ عبد العزیز بڑے باکمال و صاحب حال وقال بزرگ تھے، ۹۷۵ھ میں آیت پاک سبحان الذی بیده ملکوت کل شیء والیه ترجعون کے سماع پر واصل بحق ہوگئے، دیوان صاحب کے ایام طفولیت میں ایک تقریب کے سلسلہ میں شیخ عبد الجلیل لکھنوی برونہ تشریف لائے، حصول برکت کے لئے آپ کو شیخ کی خدمت میں حاضر کیا گیا، شیخ نے آپ کو دیکھتے ہی فرمایا:

عارف کامل عالم و عامل خواہد بود و نیشکر بسیار تناول نمود (ایضاً ورق ۱۳)

(عالم باعمل و عارف اجل ہونگے اور گنا کثرت سے استعمال کریں گے)۔

ان پیشینگویوں سے پتہ چلتا ہے کہ دیوان صاحب کا مقام علم و ولایت کس درجہ کا تھا۔

پیدائش اور نشو نما

آپ دس ذیقعدہ ۱۰۰۰ھ موضع برونہ میں پیدا ہوئے، موضع برونہ شہر جونپور سے

---

(۱) گنج ارشدی ورق ۱۲۳۔

تقریباً چھ میل کی مسافت پر مشرق میں واقع ہے اور اس وقت حدود اعظم گڈھ میں ہے۔

دیوان صاحب نے چار بادشاہوں کا زمانہ پایا، جلال الدین اکبر ۱۰۰۰ھ کے عہد میں پیدا ہوئے، جب آپ کی عمر چودھویں سال کو پہنچی تو جہانگیر مسند آرائے سلطنت ہوا، آپ کے سینتیسویں سال میں شاہجہان تخت نشین ہوا اور جب آپ چھہتر (۷۶) سال کے ہوئے تو اورنگزیب عالمگیرؒ سریر آرائے حکومت ہوئے۔ آپ کے والد شیخ مصطفیٰ جمال نے آپ کی طفولیت ہی کے زمانہ میں اپنے مرشد کے ایماء پر پورنیہ (صوبہ بہار) میں مستقل سکونت اختیار کرلی تھی اس لئے آپ کی نشونما اپنے حقیقی ماموں شیخ شمس الدین ابن نورالدین برنوی کے زیر نگرانی ہوئی۔

شیخ شمس الدین بڑے عابد وزاہد اور خوش اوقات بزرگ تھے اور ساتھ ہی زیور علم سے بھی آراستہ تھے اپنے وقت کے مشاہیر علماء میں گنے جاتے تھے اوائل عمر میں ملازمت شاہی سے منسلک تھے، آخر میں ترک فرما کر عزلت گزیں ہوگئے تھے۔ ۱۰۴۷ھ میں وفات پائی آپ کا مزار محلہ مفتی شہر جونپور میں ہے رکن الدین بحر یابادی آپ کے شاگرد رشید تھے۔(۱)

نام ونسب اور آبائی وطن: محمد رشید نام، شمس الحق، فیاض اور دیوان لقب ہے، ابوالبرکات کنیت ہے، شمسی تخلص، آپ کی بعض تحریروں سے اسم گرامی عبدالرشید بھی ظاہر ہوتا ہے مگر محمد رشید ہی آپ کو پسند ومحبوب تھا آپ کے کمالات ظاہری وباطنی کو دیکھ کر مشائخ واہل اللہ قطب الاقطاب کہا کرتے تھے۔

سلسلۂ نسب باختلاف روایت اٹھارہویں یا بیسویں پشت میں شیخ سری بن مفلس سقطی عثمانی سے مل جاتا ہے(۲) آپ کی بارہویں پشت میں ایک بزرگ شیخ بخشی نامی ہیں انہی کے اجداد میں سے کسی نے عرب سے ہجرت کر کے کلدہ میں سکونت اختیار کرلی تھی، کلدہ ملک روم کا ایک مشہور مقام ہے اسی نسبت سے شیخ بخشی کو شیخ رومی کہا جاتا ہے، شیخ بخشی

---

(۱) سمات الاخیار۔

(۲) گنج ارشدی ص ۱۲، گنج رشیدی سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ سری تک کل اٹھارہ پشتیں ہیں، لیکن گنج ارشدی اور دوسرے تذکروں سے دو نام اور درمیان میں پائے جاتے ہیں۔

نے مرشد کامل کی تلاش میں ہندوستان کی طرف رخت سفر باندھا، اس وقت دلی میں سلطان المشائخ شیخ نظام الدین دہلوی کے فیوض وبرکات کا دریا بہ رہا تھا اس لئے شیخ رومی دہلی پہنچ کر سلطان المشائخ کے دامن سے وابستہ ہوگئے اور مدت دراز تک شیخ کی صحبت میں رہ کر کسب فیض کرتے رہے، اس سے فراغت کے بعد شیخ کے اشارے سے موضع سکلائی پرگنہ امیٹھی ضلع بارہ بنکی میں خلق خدا کی اصلاح وتربیت کی غرض سے مستقل سکونت اختیار کرلی، شیخ رومی کو سلطان المشائخ کے علاوہ شیخ نصیر الدین چراغ دہلی سے بھی اجازت وخلافت حاصل تھی، شیخ رومی نے سکلائی ہی میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئے۔ شیخ رومی کے بعد ان کی اولاد سکلائی میں مقیم رہی اور آج تک آپ کی نسل وہاں پائی جاتی ہے۔ (۱)

دیوان صاحب کے والد بزرگوار شیخ مصطفیٰ جمال بھی موضع سکلائی ہی میں متولد ہوئے، اور وہیں نشونما پائی، بڑے ہونے کے بعد انھیں طلب علم کا شوق پیدا ہوا اور وہ حصول علم کے لئے سکلائی سے جونپور آئے اور اپنی زاد یوم کو خیر باد کہہ کر جونپور میں مستقل سکونت اختیار کرلی اور یہاں کے اساتذہ ومشائخ سے علوم ظاہری وباطنی کی تکمیل فرمائی، شیخ نورالدین بن عبدالقادر برونوی کی صاحبزادی سے نکاح کیا جو آیندہ کے لئے سکلائی کے بجائے برونہ ضلع جونپور کی وطنیت کا سبب (۲) بنا، یہیں آپ کے تینوں صاحبزادے شیخ محمد سعید، شیخ محمد رشید (صاحب الترجمہ) اور شیخ محمد ولید پیدا ہوئے، شیخ مصطفیٰ جمال کا ابتدائی ایام ہی سے تدین وتقویٰ اور اصلاح باطن کی طرف میلان تھا، چنانچہ سکلائی کے قیام کے زمانہ ہی میں شیخ محمد بن نظام الدین عثمانی، امیٹھوی کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوگئے تھے اور وقتاً فوقتاً شیخ کی صحبت میں جاکر اکتساب فیض کرتے رہتے تھے۔

جونپور آنے کے بعد شیخ قیام الدین بن قطب الدین جونپوری کی جانب رجوع کیا اور انھیں سے اجازت وخلافت حاصل ہوئی، شیخ مصطفیٰ میں کمال درجہ کا زہد وتقویٰ، توکل

---

(۱) سمات الاخیار، ص۱۰۔

(۲) نزھۃ الخواطر کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ شیخ مصطفیٰ جونپوری کی سکونت کے زمانہ میں سکلائی بھی جاتے رہتے تھے لیکن گنج رشیدی وارشدی اس تفصیل سے خاموش ہیں۔

وورع تھا، مشتبہ چیزوں سے انتہائی پرہیز کرتے تھے، اپنے شیخ کے ایماء پر اہل وعیال کو برونہ چھوڑ کر پنڈوہ ضلع پورنیہ میں اقامت فرمالی تھی اور وہیں ۱۰/ ذی الحجہ ۱۰۷۶ھ میں وفات پائی اور پورنیہ محلّہ چمنی بازار میں مدفون ہوئے۔

دیوان صاحب نے اپنے ایک شعر میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔

چوں یار بہ بنگالہ کند مسکن وماویٰ　　　شمسی بہ بدخشاں نہ رود لعل بہ بنگ است

درس وتدریس

دیوان صاحب کے اساتذہ کی فہرست بہت طویل ہے، جہاں کوئی صاحب کمال ملا، اس کے سامنے زانوے ادب تہ کر دیا اور اس کے فیوض علمیہ سے استفادہ کیا، ذیل میں ان اساتذہ کی اجمالی فہرست پیش کی جارہی ہے جن سے دیوان صاحب نے بلاواسطہ استفادہ کیا ہے جس سے اقلیم علم وفن کے تاجدار اور آسمان علم کے آفتاب عالمتاب کے علمی شغف کا صحیح اندازہ ہو سکے گا۔

(۱) الشیخ محمد اخوند البرونوی (۲) الشیخ کبیر نور البرونوی (۳) الشیخ محی الدین السدھوروی (۴) الشیخ مخدوم عالم السدھوروی (۵) الشیخ محمد قاسم (۶) الشیخ مبارک مرتضی (۷) الشیخ نور محمد المداری (۸) الشیخ محمد محی الدین بن عبدالشکور (۹) الشیخ عبدالغفور بن عبدالشکور (۱۰) الشیخ حبیب اسحاق (۱۱) الشیخ محمد لاہوری (۱۲) الشیخ میر سید عبدالعزیز (۱۳) الشیخ میر سیّد عبداللہ برادر عبدالعزیز (۱۴) الشیخ المفتی شمس الدین البرونوی (۱۵) استاذ الملک الشیخ محمد افضل بن حمزہ الجونپوری العثمانی (۱۶) الشیخ المحدث الشاہ نور الحق بن الشاہ عبدالحق المحدث الدہلوی۔(۱)

جس لائق، ذکی، فطین شاگرد کی علمی تربیت مذکورۂ بالا باکمال اور اپنے عہد کے ماہر فنون اساتذہ کے دامن میں ہوئی ہو اس سے اسکے کمالات علم وفضل کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

ان اساتذۂ عظام میں دیوان صاحب کے علمی جوہر کے نکھارنے میں سب سے

---

(۱) نزہۃ الخواطر ج ۵ وسمات الاخیار ص ۱۵، وگنج ارشدی۔

زیادہ ہاتھ آپ کے حقیقی ماموں علامۂ عصر مفتی شیخ شمس الدین برونوی اور فرید دہر استاذ الملک شیخ محمد افضل جونپوری کا ہے، دیوان صاحب نے ان دونوں سے علمی استفادہ زیادہ کیا ہے، اور اکثر کتابیں ان ہی سے پڑھی ہیں۔

علوم متداولہ کی تحصیل و تکمیل کے بعد بھی شوق طلب کو سیری نہ ہوئی اور عہد شباب گذر جانے کے بعد پیرانہ سالی یعنی ساٹھ سال کی عمر میں کمر ہمت باندھی اور قدوۃ المحدثین شاہ عبدالحق محدث دہلوی کے فرزند و شاگرد شیخ نورالحق دہلوی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مشکوٰۃ اور بخاری کو شیخ سے پڑھ کر اجازت حاصل کی، شیخ نورالحق نے فراغت کے بعد جو سند اجازت عطا کی ہے اس کے لفظ لفظ سے دیوان صاحب کی علمی جلالت نمایاں ہوتی ہے، قارئین کی دلچسپی کیلئے اس کو نقل کیا جاتا ہے۔

نقل سند اجازت: ان الشیخ الاجل الاوحد الافضل جامع الکمالات الالوھیة المتوجه الی اللّٰہ خلیفة قدوۃ المتورعین الشیخ طبیب بن معین طلب منی الاجازه بسنن اھل الحدیث وحفظا لسند السلسلة الشریفة مع انی لست باھلھا وکان الاعتذار احری والیق من الاجازۃ ولکن لما کان امتثال امرہ واجبًا علی وکان اجری ھذا الطریق مما اوصٰی به الشیوخ اجیبت مسئوله واجزت، رفعه اللّٰہ .

اسکے نیچے یہ عبارت دیوان صاحب نے اپنے قلم سے تحریر فرمائی ہے۔

وانا العبد الاحقر المفتقر الی اللّٰہ الوحید المدعو بین الناس محمد رشید بن مصطفٰی الجونپوری موطنا والعثمانی نسبا والچشتی ارادۃ والقادری والقلندری والشطاری مشربا المرجو من الشیخ الاوحد ان لاینسانی من صالح دعائه لعل اللّٰہ یرزقنی صلاحا وکان ذلك فی ذی قعدہ سنة ستین والف من الھجرۃ النبویة. (۱)

دیوان صاحب کی اس تحریر سے صاحب سمات الاخیار کے اس قول کی پوری تردید

---

(۱) گنج ارشدی ۱۳۴۔

ہو جاتی ہے کہ دیوان صاحب جب دہلی پہنچے تو شیخ عبدالحق محدث دہلوی ضعف پیری کی وجہ سے درس دینا بند کر چکے تھے لیکن دیوان صاحب کی درخواست پر یہ منظور فرمالیا تھا کہ درس تو نورالحق دیں گے لیکن میں بھی درس میں موجود رہا کروں گا، کیونکہ دیوان صاحب نے ۱۰۶۰ھ میں اجازت حاصل کی ہے اور شاہ عبدالحق محدث دہلوی کی وفات خود صاحب سمات الاخیار کی تصریح کے مطابق ۱۰۵۱ھ میں ہوگئی، پھر محدث دہلوی کا درس میں حاضر رہنا چہ معنی دارد۔

دیوان صاحب بحیثیت استاذ

تحصیل و تکمیل کے بعد دیوان صاحب مسند تدریس پر رونق افروز ہوئے اور تشنگانِ علوم کو اپنے چشمۂ فیض سے سیراب کرنا شروع کر دیا، بیشمار بندگان خدا آپکے علمی فیوض سے مستفید ہوئے۔ طلبہ کے ساتھ انتہائی شفقت و محبت کا معاملہ فرماتے تھے اور ان کی تعظیم و تکریم میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ ہونے دیتے تھے، اس کا اندازہ اس سے ہوگا کہ وفات کے وقت وصیت فرمائی کہ جس پتھر پر طلبہ جوتیاں اتارتے تھے اس کو میری قبر میں تختہ کے طور پر رکھ دیا جائے۔ (۱)

آپ کے درس و تدریس کو علماء و مشایخ بڑی اہمیت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور اس شغل کو باقی رکھنے کی تاکید کرتے رہتے تھے، شیخ طیب بنارسی اپنے ایک مکتوب میں آپ کو خطاب فرماتے ہیں کہ،

> ہموارہ بدرس و تدریس بودہ بر رضائے رحمت چشم دارند کہ حق تعالیٰ را در روز
> شبی ہزار نعمت است کہ بر خلق نازل می شود تسع مایۃ و تسع تسعون للعلماء
> والمتعلمین و واحدۃ لجمیع الخلق ذلک فضل اللہ یوتیہ مین یشاء انتہی (۲)

ایک دوسرے مکتوب میں ارقام فرماتے ہیں۔

> بندہ می خواہد کی از برائے شما فرمان بوساطت نواب از بادشاہ طلب نماید کہ

---

(۱) گنج ارشدی ج ا ص ۱۳۴، وسمات الاخیار ص ۳۵۔ (۲) گنج ارشدی ج ا ص ۱۳۸۔

شما دریں بنارس استقامت نمود درس وتدریس فرمائید کہ دریں کان کفر رواج اسلام نمود۔(۱)

دیوان صاحب طلبہ یا مریدین سے خدمت لینا پسند نہ کرتے تھے اور ارادت مندوں کی خواہش کے باوجود اس کا موقع نہ دیتے تھے، ایک مرتبہ آپ کے تلمیذ خاص اور مرید جان نثار میاں شیخ اسماعیل برونوی نے شکایت آمیز لہجے میں کہا دیوان جیوتو کسی قسم کی خدمت کا موقع ہی نہیں دیتے کہ ہمارے لئے ذریعہ سعادت ہو، حضرت دیوان صاحب نے فرمایا کہ میرے استاذ شیخ محمد افضل بھی خدمت لینا پسند نہیں کرتے تھے، اپنا سارا کام خود ہی انجام دیا کرتے تھے، اسی لئے مجھے بھی اچھا معلوم ہوتا ہے کہ اپنی ضروریات خود ہی پوری کرلیا کروں، پھر فرمایا:

تا کار بدست خود تواں میکرد دیگرے گفتن خوب نیست درصحبت یار شاطر باید نہ بار خاطر۔(۲)

(جب تک اپنے ہاتھ سے کام ہوتا رہے دوسروں سے لینا بہتر نہیں، دوستوں کی صحبت میں چاق وچوبند رہنا چاہئے نہ کہ بوجھ بنا رہے)۔

دیوان صاحب کو طلبہ کا تعلیمی نقصان گوارا نہیں تھا ان کو مطالعہ اور ہمہ وقت درس کیلئے مستعد رہنے کی تاکید کرتے رہتے تھے اور اپنے آپ کو بھی اس کے لئے فارغ رکھتے تھے، لیکن آخری وقت میں جب عبادت اور ریاضت اور سیر الی اللہ میں انہماک بڑھ گیا اور اکثر جذب اور استغراق کی کیفیت طاری رہنے لگی اور درس میں ناغہ ہونے لگا تو تلامذہ کو اپنے تلمیذ رشید وخلیفہ اجل شیخ نورالدین مداری کے حوالہ کردیا، اور اس وقت سے تدریس کا کام موقوف ہوگیا۔(۳)

دیوان صاحب کے اکثر شاگرد علوم ظاہری کے ساتھ ساتھ علوم باطنی میں بھی دیوان صاحب ہی سے استفادہ کرتے تھے، اور ان میں اکثر خلعتِ خلافت سے بھی مشرف ہوئے۔

---

(۱) ایضاص ۱۲۸۔ (۲) گنج ارشدی، ۱۲۸، ج ۱۔ (۳) گنج ارشدی ونزہۃ الخواطر ومقصود الطالبین۔

عرفان وسلوک

دیوان صاحب جس طرح علوم ظاہری میں شہرۂ آفاق تھے، اسی طرح علوم باطنی میں بھی طاق تھے، نوبرس کی عمر میں جو کھیلنے کھانے کا زمانہ ہوتا ہے، کسی مرشد سے بیعت وارادت کا تعلق قائم کرنا تو در کنار اس کا تصور آنا بھی غیر معمولی بات ہے۔

دیوان صاحب اسی زمانہ میں اپنے والد شیخ مصطفیٰ جمال سے بیعت ہو گئے تھے، اور خرقۂ خلافت سے بھی مشرف ہوئے، صاحب مناقب العارفین رقمطراز ہیں:

''در مدتِ طفلی کلاہِ ارادت بلک خرقۂ اجازت وخلافت از دست والد شریف خود کہ مرشد دہر وشیخ عصر بودند، پوشند، واثر آن لباس در وکار ہا کرد۔'' انتہی (۱)

لیکن کم سنی اور تعلیم وتحصیل کی مشغولیت سے طریقۂ صوفیہ کے اخذ وکسب کی جانب پوری توجہ نہ ہو سکی تھی، تکمیل علوم وفنون کے بعد شیخ کامل ومرشد صادق کی تلاش وجستجو ہوئی، اتفاقاً اسی زمانہ میں شیخ طیب بنارسی جونپور تشریف لائے ہوئے تھے، خبر پاتے ہی شیخ کی خدمت میں حاضر ہوئے، مگر اس ملاقات میں قلب شیخ کی جانب مائل نہ ہوا، کچھ دنوں کے بعد ایک تقریب کے سلسلے میں شیخ طیب کی قیام گاہ منڈواڈیہہ ضلع بنارس جانا ہوا، اور چند دن کی صحبت بھی اٹھائی، اس صحبت نے اپنا اثر دکھایا، اور قلب میں شیخ طیب کی عقیدت ومحبت کا طوفان موجزن ہو گیا، چنانچہ سارے علائق دنیوی حتی کہ درس وتدریس کے مشغلے کو ترک کر کے مستقل قیام کے ارادہ سے شیخ طیب کی خدمت میں حاضر ہو گئے، مگر شیخ نے تدریس کے التوا کو پسند نہیں فرمایا، اور یہ کہہ کر جونپور واپس کر دیا کہ

''بجائے وظیفہ صبح درس طلبہ دانند، ایں ہم عبادت است'' (۲)

منڈواڈیہہ سے واپسی کے بعد حسب ارشاد مرشد پھر درس وتدریس میں مشغول ہو گئے اور وقتاً فوقتاً شیخ کی خدمت میں حاضر ہوتے رہتے، دو ایک دن کے بعد واپس آجاتے، رمضان میں چونکہ درس موقوف ہو جاتا تھا اس لئے پورا رمضان شیخ کی خدمت

---

(۱) مناقب العارفین ص ۱۲۵۔ (۲) گنج ارشدیص ۱۲۷، ج: اوّل ایضاً ج او: ص ۱۲۷۔

میں گذارنے کا ارادہ کیا شیخ نے اخیر عشرے کے اعتکاف کا حکم دیا، آپ نے اعتکاف کیا، عید کے دن ۱۰۴۰ھ میں شیخ طیب نے مجمع عام میں سلسلہ چشتیہ کے خرقۂ خلافت سے نوازا اور اس سلسلے کے اوراد واذکار کی تلقین فرما کر جونپور رخصت کیا۔

حصول اجازت کے بعد دیوان صاحب نے مجاہدہ اور ریاضت میں اور اضافہ کردیا اور چند ہی دنوں میں اتنی صلاحیت بہم فرمائی کہ طیب شاہ نے سلاسل قادریہ اور سہروردیہ کی اجازت وخلافت بھی عطا فرما کر اپنا خلیفۂ مطلق بنادیا۔(۱)

اس کے بعد دیوان صاحب نے سلسلۂ سہروردیہ میں شیخ تاج الدین سے بھی اجازت وخلافت حاصل کی۔ شیخ یٰسین جانشین طیب شاہ بنارسی لکھتے ہیں۔

> قطب الاقطاب در سلسلۂ سہروردیہ بلا واسطہ از قطب المتورعین حضرت شیخ تاج الحق والشرع والدین جھوسی مجاز است۔ (۲)

سلسلۂ قادریہ میں طیب شاہ کے علاوہ شیخ شمس الدین کالپی سے خلافت حاصل ہوئی، حصول خلافت کے واقعہ کا ذکر دلچسپی سے خالی نہیں ہے، اس واقعہ سے دیوان صاحب کی عظمت وجلالت کا کسی قدر اندازہ ہوتا ہے، شیخ شمس الدین بھی ایک مرتبہ جونپور آئے تو دیوان صاحب کی خانقاہ میں تشریف لائے، دیوان صاحب اس وقت درس میں مصروف تھے، جب درس سے فارغ ہوئے تو شیخ شمس الدین نے اپنے پاس بلا کر فرمایا۔

> خدائے تعالیٰ حوالہ نمودن نعمت مرا در پیش شما فرستادہ خدا مفت دادہ است بگیرید آنچہ داشتہ انتہی (۳)

ان سلاسل میں حصول خلافت پر ہی آپ نے قناعت نہیں کی بلکہ اشغال قلندریہ میں استفادہ کی غرض سے شیخ عبدالقدوس جونپوری نبیرۂ شیخ قطب بنیائے دل کی خدمت میں حاضری دینے لگے مگر پورے ایک سال تک نہ شیخ نے آنے کی غرض دریافت کی اور نہ آپ نے ازخود بتانا مناسب سمجھا، ایک سال گذرنے کے بعد ایک دن شیخ عبدالقدوس

---

(۱) گنج ارشدی ۱۲۷۔ (۲) مناقب العارفین۔

(۳) گنج ارشدی ج ۱ ص ۱۲۹۔

نے خود ہی فرمایا کہ نصف شب گذر جانے کے بعد آیا کرو۔

اس زمانہ میں نصف شب کے بعد پُل کا دروازہ بند ہوجاتا تھا اور شیخ کی خانقاہ دریا کے اس پار تھی مگر اس سے آپ کے پائے طلب میں لغزش تک نہ آتی اور آپ ہر روز آدھی رات کے بعد تیر کر دریا کے پار جاتے اور شیخ سے کسب فیض کرتے، آخر میں شیخ نے سلسلۂ قلندریہ کے ساتھ ساتھ سلسلۂ مداریہ قدوسیہ اور شطاریہ کی خلافت بھی عطا فرمائی، شیخ عبدالقدوس کو ان پر اتنا اعتماد تھا کہ جب شیخ عبدالقدوس کے پاس کوئی طالب آتا تو فرماتے کہ میں اب ضعیف ہوگیا ہوں میاں محمد رشید بہت اچھا ذکر کرتے ہیں ان کے پاس جاؤ۔(۱)

ان سلاسل میں تکمیل کے بعد بھی ذوق طلب نے چین نہیں لینے دیا اور خواہش پیدا ہوئی کہ سلسلہ قادریہ چشتیہ میں شیخ حسام الحق مانکپوری کے خاندان سے نسبت حاصل کرلینا چاہئے، چنانچہ شاہ راجی سید احمد مانکپوری کی خدمت میں حاضر ہوئے، شاہ راجی نے بکمال شفقت ومحبت چند دن اپنے پاس رکھ کر خلعتِ خلافت سے مشرف فرمایا۔(۲)

ان مشائخ کے علاوہ اس دور کے دوسرے مشائخ سے بھی آپ کو اجازت حاصل ہوئی بخوف طوالت ان کو نظر انداز کردیا گیا ہے۔

اب آخر میں مؤلف مناقب العارفین کی رائے جو دیوان صاحب کے متعلق ظاہر کی ہے نقل کی جاتی ہے، وہ لکھتے ہیں:

> (بحذف القاب) بندگی میاں شیخ عبدالرشید ابداللہ تعالیٰ ظلال عاطفتہ علی روس المعتقدین والمریدین کہ فرید عصر است دوحید و ہر در شریعت استادہ است دور طریقت صاحب الرشاد مخزنِ حقائق است ومنبع دقائق، طالب مجاہدہ است وصاحب مشاہدہ، قطب ولایت است ویگانۂ زماں، غوث وقت است وقبلۂ جہاں، باوجود ایں ہمہ کمالات اعتقاد بجماعت فقراء وصوفیہ آنقدر دارد کہ ہر کجا نام فقیرے می شنود بلاتوقف پیش وے می رود قصد ملاقات وے می کند وشدتِ مجاہدہ کہ وے دارد خارج طوق بشر است نفس امارہ را

---

(۱) سمات الاخیار ص ۴۰ (۲) گنج ارشدی ۱۲۴ ونزھۃ الخواطر، ج ۵۔

تابع و مطمئن ساختہ وے سلمہ اللہ قبل از اختیار ایں طریقہ مدتے در تحصیل علم می گذارند و بعد از تحصیل کتب متداولہ در درس می ماندند۔ انتہی بلفظہ

یہ تحریر دیوان صاحب کی زندگی کا صحیح و کامل مرقع ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ دیوان صاحب کا مقام خود ان کے معاصرین و متعلقین کی نگاہ میں کیا تھا۔

شعر و سخن

دیوان محمد رشید کو شعر و سخن میں بھی ید طولیٰ حاصل تھا، جس پر انکا دیوان شاہد ہے۔

انکے کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو:

گرد شو گرد تا گرد نہ گردی در راہ　　کے بدانی کہ درایں راہ سوارے باشد

اپنے والد ماجد کے جائے مدفن کے متعلق کتنا عمدہ شعر کہا ہے:

چوں یار بہ بنگالہ کند مسکن و ماویٰ　　شمسی بہ بدخشاں نہ رود لعل بہ بنگ است

غزل کا نمونہ

ہر نگاہ او دعاے دیگر است　　پیچشِ زلفش بلائے دیگر است
من بیکدم سیرِ عالم می کنم　　روح را دستے و پائے دیگر است
بر بدن صد زخمِ خنجر گر زنی　　کے بمیرم جاں بجاے دیگر است
از دل شمسی دمے تمکین مجوے　　ہر دمش چوں ہو و ہاے دیگر است (۱)

تصنیف و تالیف

دیوان صاحب درس و تدریس کے علاوہ تالیف و تصنیف میں بھی اپنے معاصرین میں ایک خاص امتیاز رکھتے تھے۔

سرعت تالیف میں آپ کے ہمعصروں میں آپ کا کوئی ثانی نہیں، آپ نے بعض

---

(۱) دیوان شمسی قلمی۔

ایسی اہم کتابیں لکھیں جو گیارہویں صدی کی علمی یادگار بن گئیں۔ ان کے ہر تذکرہ نگار نے اُن کے دوسرے کمالات کے ساتھ تصنیفی خدمات کا بھی ذکر کیا ہے اور اکثر کتابوں کا تعارف کرایا ہے مگر افسوس کہ ان کتابوں میں دو کے سوا اب تک کوئی کتاب بھی طبع نہ ہوسکی اور نہ آیندہ اس کی امید ہے۔

تلاش و جستجو سے دیوان صاحب کی مندرجۂ ذیل تصانیف کا پتہ چلتا ہے۔

(۱) رشیدیہ عربی: اس کے متعلق صاحب نزہۃ الخواطر رقمطراز ہیں:

ومن مصنفاته الرشيدية فى فن المناظرة وهى اشهر مصنفاته تلقاها العلماء بالقبول تعليقا وتدريساً (۱)

(آپ کی تصانیف میں رشیدیہ بہت مشہور ہے، علماء نے اس کی جانب خاص توجہ کی ہے اور اس پر حواشی و شروح لکھے ہیں اور درس میں داخل کرلیا ہے)۔

رشیدیہ دیوان صاحب کی حیات ہی میں بہت مشہور ہوگئی تھی اور اسی زمانہ میں ملا محمود کے ایک شاگرد ملا عبدالباقی جونپوری نے اس پر کچھ اعتراضات کئے تھے، اس کے جواب میں دیوان صاحب کے ایک شاگرد نے ردالباقیہ نامی ایک کتاب لکھی تھی جس میں ملا عبدالباقی کے اعتراضات کے جواب کے ساتھ رشیدیہ کے مغلقات کو بھی خوبی سے حل کیا ہے، یہ رشیدیہ کی بہترین شرح ہے، اس کا ایک قلمی نسخہ خانقاہ رشیدیہ جونپور کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

حافظ امان اللہ بنارسی المتوفی ۱۱۲۳ھ نے بھی رشیدیہ کی ایک مختصر شرح لکھی ہے، اس کے علاوہ اور علماء نے بھی شروح و حواشی سے اس کی اہمیت و افادیت کو دوبالا کردیا ہے، اس کتاب کو دیوان صاحب نے ایک ہفتہ کی قلیل مدت میں تصنیف کیا تھا جس کا واقعہ اوپر گذر چکا ہے۔

۲- تذکرۃ النحو: یہ مبادیات نحو میں مختصر سا رسالہ ہے، اسے دیوان صاحب نے اپنے منجھلے صاحبزادے شیخ ارشد کے لئے لکھا تھا۔ یہ رسالہ آج کل خلاصہ کے نام سے نحو میر کے

---

(۱) نزہۃ الخواطر ج ۵۔

آخر میں شائع ہوتا ہے، تقریباً دو صفحہ میں دیوان صاحب نے نحو کے جملہ عوامل کو بڑے دلنشیں انداز میں بیان کر دیا ہے۔

۳- ترجمہ معینیہ: یہ تذکرۃ النحو کی چار ورقی شرح ہے جو اپنے صاحبزادے معین الدین کے لئے لکھی تھی، یہ شرح عصر و عشا کے درمیانی قلیل وقفہ میں تحریر کی تھی۔

۴- ہدایۃ النحو: یہ بھی فن نحو میں ہے جیسا کہ نام ہی سے ظاہر ہے کہ یہ رسالہ خانقاہ رشیدیہ میں نہیں ہے۔

۵- شرح ہدایہ الحکمۃ (عربی)

۶- شرح اسرار المخلوقات (عربی): صاحب تجلی نور اس کتاب کے متعلق لکھتے ہیں۔ شرحی بعربی بغایت مستحسن و خوب، عربی میں نہایت عمدہ اور بہتر شرح ہے۔

۷- زاد السالکین: فن تصوف میں مختصر سا مگر جامع رسالہ ہے جس میں تصوف کے مسائل کو سلیس فارسی زبان میں قریب الفہم بنا کر پیش کیا گیا ہے۔

۸- مقصود الطالبین: اوراد و اذکار میں مختصر سا رسالہ ہے۔

۹- حاشیہ شرح مختصر عضدی (عربی)۔

۱۰- حاشیہ کافیہ ابن حاجب۔

۱۱- دیوان شمسی۔

۱۲- مکتوبات (۱)

ان کتابوں میں صرف رشیدیہ، تذکرۃ النحو، مکتوبات طبع ہو چکی ہیں، بقیہ کتب میں چند تو خانقاہ میں اب تک موجود ہیں اور اکثر معدوم ہو چکی ہیں، صرف کتابوں میں ان کا ذکر ملتا ہے۔

وفات

آپ کو شعبان کی آخری تاریخوں سے بخار آنا شروع ہوا، علاج معالجہ کے باوجود

---

(۱) تذکرہ علمائے ہند ص ۱۱۹ و نزھۃ الخواطر ج ۵، تجلی نور ص ۲۷ و سمات الاخیار ص ۵۴۔

حالت دن بدن بگڑتی گئی، نقاہت وضعف میں اضافہ ہوتا رہا، لیکن معمولات میں فرق نہیں آنے پایا، نماز باجماعت معمول کے مطابق ادا کرتے رہے، مگر رمضان کی آٹھویں تاریخ یوم پنجشنبہ کو کمزوری بے حد بڑھ گئی اور تیمّم کر کے پلنگ ہی پر نماز پڑھی رات کو حالت زیادہ خراب ہوگئی، لیکن نصف شب کے بعد کچھ افاقہ ہوا تو آپ نے تیمّم کیا اور تہجد میں مشغول ہوگئے، اس سے فراغت کے بعد معمول کے مطابق ذکر بالجہر میں مشغول ہوگئے، آواز اتنی بلند تھی کہ باہر والوں کو سنائی دیتی تھی ذکر پورا کرنے کے بعد فجر کیلئے تحریمہ باندھنا چاہا تو لوگوں نے بتایا کہ ابھی وقت نہیں ہوا ہے، فرمایا کہ میاں ہوگیا ہے اور لیٹ گئے، صبح صادق کے قریب اٹھے تیمّم کیا لیکن اس بار شدت ضعف سے تیمّم کرنے میں بھی دشواری پیش آئی مگر کسی طرح تیمّم کر کے فوراً لیٹ گئے، لوگ نماز پڑھنے مسجد چلے گئے اور آپ بھی تحریمہ باندھ کر نماز میں مصروف ہوگئے، دوسری رکعت کے سجدہ میں تھے کہ نویں رمضان ۱۰۸۳ھ یوم جمعہ کو روح مبارک قفس عنصری سے پرواز کرگئی۔

مرگ مجنوں پہ عقل گم ہے میر　　کیا دیوانے نے موت پائی ہے

آپ کے تلمیذ خاص وخلیفۂ اجل شیخ محمد ماہ دیوگامی اعظم گڈھی نے نماز جنازہ پڑھائی اور رشید آباد میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس گنجینۂ علم وفن اور مخزن رشد وہدایت کو سپرد خاک کردیا گیا۔(۱)

اخلاق وسیرت

مزاج میں حد درجہ قناعت واستغنا تھا، امراء وسلاطین کے دربار میں جانا قطعاً پسند نہ کرتے تھے، چنانچہ نواب سعد اللہ خاں جب شاہجہاں کی وزارت سے مستعفی ہوئے تو شاہجہاں نے ان سے کہا کہ اپنا قائم مقام تجویز کرلو، انھوں نے دیوان صاحب کا نام نامی پیش کیا شاہجہاں نے ایک شخص حاجی محمد سعید نامی کے ذریعہ دو ہزار روپئے زادراہ کے لئے

---

(۱) سمات الاخیار ص ٦۱ تجلی نور ص ۲۷ ج ۱، ونزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۲۷٦، تذکرہ علمائے ہند میں ہے کہ تحریمہ کے وقت وفات ہوئی۔

اور ایک عریضہ دیوان صاحب کی خدمت میں ارسال کیا اور اشتیاق ملاقات ظاہر کیا، دوسرا خط حاکم جونپور مرزا اکرم خاں کے نام روانہ کیا کہ جس طرح ہو سکے دیوان صاحب کو آمادہ کر کے میرے پاس دہلی بھیج دو لیکن زبردستی نہ کرنا، دیوان صاحب نے شاہجہاں کی پیشکش کو قبول نہیں کیا، بعد میں دو ہزار روپئے بطور نذرانہ پیش کیے مگر اسے بھی قبول نہیں فرمایا۔(۱)

سنت نبوی کو حتی الوسع ترک نہ فرماتے (۲)، جملہ امراض میں شہد اور کلونجی استعمال فرماتے اور شفایاب ہوتے، ایک مرتبہ بخار آیا ملا محمود جونپوری المتوفی ۱۰۶۲ھ نے علاج کیا مگر صحت نہ ہوئی تو آپ نے کلونجی اور شہد منگا کر استعمال کیا اور بخار زائل ہو گیا، ملا محمود نے تعجب کے لہجے میں فرمایا "کہ دوائے گرم در تپ صفراوی چگونہ مفید شد" دیوان صاحب نے ارشاد فرمایا کہ "شمارا بر قول حکماء اعتماد است و مرا بر قول خدا و رسول" (۳)

وضو، نماز اور مصلیٰ کی پاکی میں حد درجہ اہتمام تھا، جب تک دریا کا پانی ملتا کنویں کے پانی سے وضو اور غسل نہیں کرتے تھے۔(۴)

اکثر فرمایا کرتے تھے کہ

تا کسے بجمعیت خاطر باحتیاط وضو کند نماز او ہم بجمعیت میسر آید و چوں در وضو احتیاط نمی کند در نماز تفرقہ خاطر آید (۵)

مائے مستعمل اگر کپڑے میں لگ جاتا تو اسے دھوتے اور فرماتے کہ ہر چند موافق فتویٰ آب آن طاہر است اما تقویٰ شستن رامی خواہد۔(۶)

علمی کمالات کے ساتھ بڑے شجاع و دلیر تھے، تیر اندازی میں مہارت رکھتے تھے،

---

(۱) گنج ارشدی ج ا و: ۳۰۲ و نزھۃ الخواطر ج ۵ ص ۳۷۶ و سمات الاخیار ص: تذکرہ علمائے ہند ص: ۱۱۹۔

(۲) تجلی نور ص ۲۷ ج ا۔

(۳) سمات الاخیار، گنج ارشدی و: ۱۴۰۔

(۴) گنج ارشدی و ۱۳۷۔

(۵) گن ارشدی ۱۴۰۔

(۶) تجلی نور ج ا ص ۷۱ و گنج ارشدی ج ا و ۱۳۷۔

ایک مرتبہ سیر کو نکلے، آپ کے شاگرد شیخ عبد الشکور منیری بھی ہمراہ تھے، راستے میں نواب شاہ نواز خاں قلعہ کا محاصرہ کئے ہوئے تھا، آپ اس کے قریب پہنچے تو ایسے مقام پر بیٹھ گئے جو تیر کی آماجگاہ تھا اور شیخ عبد الشکور منیری سے فرمایا کتاب لاؤ، کچھ پڑھ پڑھا لیا جائے اور درس شروع کر دیا، اثنائے درس میں ایک تیر بالکل چہرے کے پاس سے گذر گیا مگر تقریر میں کسی طرح کا انتشار نہیں پیدا ہوا، نواب آپ کی اس جرأت و شجاعت پر متحیر ہو گیا۔ (۱)

زہد و بے نیازی کا یہ عالم تھا کہ پختہ تعمیر پسند نہ تھی، اگر کسی کو مضبوط عمارت بناتے ہوئے دیکھتے تو فرماتے کہ یہ کیا بے خبری ہے کہ شئی فانی کو باقی رکھنے کی کوشش میں لگا ہے، خانقاہ کا چھپر بہت معمولی تھا، ایک دفعہ کثرت بارش کی وجہ سے اس قدر پانی ٹپکا کہ گدّی میں پانی بھر گیا، ایک صاحب نے کہا کہ عمدہ قسم کا چھپر بنا دیا جائے تو آپ نے منع فرما دیا اور کہا

> چھپر برائے مانع آب نساختند برائے منع آفتاب است چرا کہ ایام بارش چہار ماہ است اول و آخر کم بارد و درمیان ہم شب و روز باستیعاب بارش نمی شود، اگر کسے حساب نماید پانزدہ شانزدہ روز خواہد بود پس کار عاقل نیست کہ برائے ایں قدر ایام خانہ سازد و آفتاب تمام روز می باشد خانہ برائے آنست۔ (۲)

پالکی کے مقابلہ میں گھوڑے کی سواری پسند تھی، اکثر پیدل چلتے تھے اور بہت تیز، چنانچہ نماز فجر کے بعد جونپور سے چلتے اور منڈواڈیہہ میں جو جونپور سے ۳۴ میل کے فاصلہ پر ہے ظہر کی نماز جماعت سے ادا کرتے۔ (۳)

وفات کے وقت وصیت فرمائی کہ کفن میں عمامہ نہ دیا جائے اور نہ ایصال ثواب کے لئے گوشت وغیرہ دعوت کی صورت میں پکایا جائے اور نہ تین دن سے زیادہ میرا سوگ منایا جائے، نہ قبر کو پختہ بنایا جائے۔ (۴)

---

(۱) گنج ارشدی ج ۱: ۱۵۔

(۲) گنج ارشدی ج ۱، ورق ۱۵۔

(۳) گنج ارشدی وسمات الاخیار۔

(۴) نزھۃ الخواطر ج ۵ ص ۲۷۷۔

اولاد

مبدأ فیاض نے دیوان صاحب کو جملہ نعمتوں کے ساتھ اولاد کی نعمت سے بھی نوازا تھا۔ آپ کے نو بچے پیدا ہوئے جن میں تین لڑکیاں اور دو لڑکے ایام رضاعت ہی میں فرط آخرت بن گئے۔ (۱)

چار لڑکے زندہ رہے اور اپنے باپ کے صحیح جانشین ہوئے، سب سے بڑے شیخ محمد حمید تھے اور سب سے چھوٹے شیخ غلام قطب الدین درمیان میں شیخ محمد ارشد و شیخ غلام معین الدین تھے، ان چاروں کے مختصر حالات درج کئے جاتے ہیں۔

(۱) **شیخ محمد حمید:** یہ ۱۰۳۷ھ میں پیدا ہوئے دیوان صاحب نے تاریخی نام ابوعضد محمد حمید تجویز فرمایا، اور اوائل عمر میں شاہی فوج میں داخل ہوئے اور فن سپہ گری کے جوہر دکھائے، لیکن آخر میں ملازمت ترک کر کے درس و تدریس و افادۂ خلق میں مشغول ہو گئے، چند کتب کے علاوہ جملہ کتابیں دیوان صاحب ہی سے پڑھی تھیں اور اجازت و خلافت بھی دیوان صاحب سے حاصل تھی (۲)، ان کی ذکاوت وفطانت اور مہارت علم پر خود دیوان صاحب کو پورا اعتماد تھا، ایک دفعہ ایک تقریب کے سلسلہ میں دیوان صاحب شیخ پورہ ضلع الہ آباد تشریف لے گئے، ساتھ میں شیخ محمد حمید بھی تھے، قاضی الہ آباد شیخ محمد آصف دیوان صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنی ایک تصنیف (حاشیہ تفسیر بیضاوی) ملاحظہ کیلئے پیش کی، دیوان صاحب نے شیخ حمید کو دیدیا، قاضی کو یہ بات گراں گذری کہ خود نہیں دیکھا اور صاحبزادے کو دے دیا وہ کیا دیکھیں گے، اور شیخ محمد حمید کا امتحان لینے کی غرض سے کہا کہ چند مقامات پر کچھ اشکال ہیں، اگر آپ رفع فرما دیں تو نوازش ہوگی اور چند سخت اشکالات پیش کر دئے، شیخ محمد حمید نے سنتے ہی مدلل تشفی بخش جواب دیا، قاضی صاحب اس حاضر دماغی اور تبحر علمی پر حیرت زدہ ہوئے۔ (۳)

---

(۱) گنج رشیدی۔

(۲) گنج ارشدی ج ۱، و ص ۱۵۔

(۳) گنج ارشدی ج ۱، و ۱۶۔

سرعت تحریر میں اپنے معاصرین میں ممتاز تھے ایک دفعہ ایک طالب علم نے درخواست کی کہ مجھے حسامی عنایت فرمادیں تو نوازش ہوگی، آپ نے اسی رات کو پوری حسامی لکھ کر اس طالب علم کے حوالہ کردی۔ (۱)

دیوان صاحب کے مرض الموت میں امامت آپ ہی کے سپرد تھی، دیوان صاحب کی وفات کے بعد شہر کے علماء ومشائخ نے دستار جانشینی آپ کے سر پر باندھ کر آپ کو دیوان صاحب کی جگہ پر بیٹھانا چاہا جس کے آپ مستحق بھی تھے لیکن آپ نے اسے قبول نہیں کیا اور مجلس کے اختتام پر فرمایا:

عزیزان خواستند کہ درمیان برادران منازعت پیدا نمایند الحمد اللہ کہ نشد، (۲)

اپنے جدامجد شیخ محمد مصطفیٰ کے مزار کی زیارت کے لئے پورنیہ تشریف لے گئے، واپسی پر راستے میں بحالت مسافرت ۲۴؍رمضان ۱۰۸۶ھ کو بعمر ۴۹ سال رحلت کی، نعش جونپور لاکر رشید آباد میں دیوان صاحب کے جوار میں دفن کی گئی۔ (۳)

(۲) شیخ محمد ارشد: ان کی ولادت ۱۰۴۱ھ میں ہوئی، دیوان صاحب نے ابی الکشف محمد ارشد سے تاریخ پیدایش نکالی اور بدر الحق لقب عنایت فرمایا، اکثر کتابیں دیوان صاحب سے پڑھیں اور چند استاذ الملک سے، بیس سال کی عمر میں علوم ظاہری کے ساتھ علوم باطنی میں بھی کمال حاصل کرلیا اور دیوان صاحب نے خرقۂ خلافت سے مشرف فرمایا (۴)، روزانہ کا معمول تھا کہ دوپہر تک درس وتدریس میں رہتے اور ظہر کی نماز اول وقت جماعت کے ساتھ ادا کر کے پھر افادۂ طلبہ میں منہمک ہوجاتے، اس مشغولیت کے باوجود وظائف اور اشراق وچاشت کی نماز کبھی قضا نہیں ہوتی تھی، ریاضت شاقہ کے برداشت کرنے میں بالکل دیوان صاحب کے مثیل تھے، سنت نبوی پر شدت کے ساتھ عمل

---

(۱) ایضاً ورق ۱۶۔

(۲) ایضاً ورق ۱۶۔

(۳) ایضاً ورق ۱۶۔

(۴) گنج ارشدی و ۱۰ اج ا۔

(۵) ایضاً و ۱۰۱، گنج ارشدی و ۱۱ و سمات الاخیار۔

تھا، بیماروں کی تیمارداری اور جنازوں میں پیدل شرکت کا خاص اہتمام تھا، توکل اتنا تھا کہ اگر کبھی فاقہ کی نوبت آجاتی تو بھی خوشی کا اظہار فرماتے، دیوان صاحب کو آپ کے زہد وتقویٰ پر اتنا اعتماد تھا کہ ایک مرتبہ پورنیہ کے سفر میں ایک صاحب نے عرض کیا کہ حضرت دستور ہے کہ جب دوست دوست کے پاس جاتا ہے تو کچھ نہ کچھ تحفہ پیش کرتا ہے آپ جب اللہ تعالیٰ کے دربار میں حاضر ہوں گے تو کیا ہدیہ پیش کریں گے، دیوان صاحب یہ سن کر آبدیدہ ہوگئے اور فرمایا کہ ارشد کو پیش کردوں گا۔

تذکرہ نگاروں کا اتفاق ہے کہ خاندان رشیدیہ میں شیخ محمد ارشد کا مقام دیوان صاحب کے بعد سب سے بلند ہے، آپ کو ۳۰ جمادی الاولیٰ ۱۱۱۳ھ کو بخار آنا شروع ہوا خاندانی طبیب کلمن مصراوید کا علاج ہوا لیکن کچھ فائدہ نہ ہوا، متعلقین نے دوسرے اطباء کی جانب رجوع کرنے کا مشورہ دیا لیکن آپ نے قبول نہیں فرمایا، بخار بدستور قائم رہا اور ضعف ونقاہت میں دن بدن اضافہ ہوتا گیا، دوران مرض ایک دن مفتی محمد جمیل صاحب عیادت کے لئے تشریف لائے اور حال دریافت کیا تو آپ نے یہ اشعار پڑھے۔

دل بعشق آں پری پیکر نمی دانم چہ شد — درد سر باقی بجاؤ سر نمی دانم چہ شد
ای کہ میگوی چرا آشفتہ خاطر کشتۂ — دل بزلفش بستہ ام دیگر نمی دانم چہ شد

غرض مرض بڑھتا گیا نقل وحرکت کی طاقت سلب ہوگئی ۲۴؍ جمادی الاخری کو عصر کی نماز شروع کی تو کمزوری اور ناتوانی کی وجہ سے ارکان پورے طور سے ادا نہ ہوسکے، یہ حالت دیکھ کر آپ کے جانشین اور خلیفہ شیخ غلام محمد رشید بن محبّ الدین بن ارشد رونے لگے اور عرض کی کہ جس ولی کی نماز میں دنیا میں فرق آجائے وہ دنیا میں باقی نہیں رہتا، ایسا ہی ہوا۔ ۲۴؍ جمادی الاخری ۱۱۱۳ھ کی شب میں کلمۂ لا الٰہ کا ورد کرتے ہوئے واصل بحق ہوگئے، پسماندگان میں تین صاحب زادے اور ایک صاحبزادی اور تقریباً ۳۰ خلفاء اور بے شمار تلامیذ وارادتمند چھوڑے۔ (۱)

(۳) **شیخ غلام معین الدین:** ان کی پیدائش ۲۴؍ شوال ۱۰۶۳ھ کو ہوئی ان کے اور شیخ

---

(۱) سمات الاخیار ص ۸۵۔

ارشد کے درمیان میں دیوان صاحب کے دولڑکے اور تین لڑکیاں پیدا ہوئیں مگر بچپنے ہی میں سب کے سب فوت ہوگئے۔

دیوان صاحب نے آپ کا تاریخی نام ابوالواعظ رکھا(۱)، دیوان صاحب کو اپنی اولاد میں سب سے زیادہ محبت انہی سے تھی، ان کی اکثر معروضات کو دیوان صاحب کے دربار میں قبولیت حاصل تھی (۲)، انھوں نے ابتدائی کتابیں دیوان صاحب سے پڑھیں اور متوسطات کو شیخ ارشد سے، ۲۹/رمضان ۱۰۸۰ھ کو جمعہ کے دن دیوان صاحب کے ہاتھ پر بیعت کی اور ۱۰۸۳ھ کو ان کی وفات سے چند ماہ پہلے خلعت خلافت سے مشرف ہوئے۔ (۳)

غلام معین الدین نے درس و تدریس کے بجائے سپہ گری کا پیشہ اختیار کیا لیکن اصلاح باطن وتزکیۂ نفس سے کبھی غافل نہیں ہوئے، تقویٰ، طہارت، عدل وانصاف کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹا، آپ فرماتے تھے کہ

> مرا در سپاہ گری از ہیچ کس شرمندگی نمی آید اما وقتی کہ کمالات قطب الاقطاب
> و نام پیر دستگیر مذکور می شود شرمسار می گردم کہ از اں بزرگان نسبت دارم و ہیچ
> وصف حضرات ایشان در خود نمی بینم۔ (۴)

شاہ عالم کے ہمراہ حیدرآباد کی مہم پر گئے ہوئے تھے، اثنائے راہ میں ۲۸/ذی قعدہ ۱۱۲۰ھ کو وفات پائی، تابوت جونپور لایا گیا اور اپنے آبائی قبرستان رشیدآباد میں شیخ ارشد کے بائیں دفن ہوئے، وفات کے وقت آپ کی عمر ۵۳ سال ایک ماہ ۳ دن تھی، آپ کے چھوٹے بھائی غلام قطب الدین نے یہ تاریخ وفات لکھی۔

حریف نفس را دولت قریں بس — شہید زہد را قصر بریں بس
فنا فی اللہ چوں گشتی رسالت — معین الدین ترا ایزد معیں بس (۵)

---

(۱) گنج ارشدی و۲۱۱۔ (۲) گنج ارشدی ج۱، و۲۱۔

(۳) ایضاً ۲۵۔ (۴) گنج ارشدی و۲۱۔

(۵) گنج ارشدی ۲۱، سمات الاخیار۔

(۴) شیخ غلام قطب الدین: ۱۱؍ربیع الثانی ۱۰۶۷ھ کو جمعہ کے دن پیدا ہوئے، اپنی تاریخ پیدائش آپ نے خود بیان کی ہے۔

روز آدینہ یازدہم ربیع الثانی (۱)
۱ ۰ ۶ ۷

۱۰۷۰ھ میں دیوان صاحب سے بیعت اور مشرف بخلافت ہوئے (۲)، ایک دن شیخ ارشد کی مجلس میں اہل تصوف کا لباس زیب تن کئے بیٹھے تھے، ملا محمد نصیب خلیفہ شیخ محمد ارشد نے عرض کیا کہ آپ درویش ہیں یا سپاہی، برجستہ جواب دیا کہ

نہ سپاہی نہ درویش من طالب علم ام

میں سپاہی ہوں نہ ولی بلکہ ایک طالب علم ہوں۔

شیخ ارشد یہ جواب سن کر بہت مسرور ہوئے اور فرمایا کہ سچ کہا۔ (۳)

صبح دو گھنٹہ تلاوت کے بعد ذکر واذکار میں مشغول ہوجاتے، اس سے فراغت کے بعد مطالعۂ کتب میں لگ جاتے فارسی اور ہندی کے اشعار بہت عمدہ کہتے تھے، تاریخ نویسی میں کمال حاصل تھا، جرأت وشجاعت میں یکتائے روزگار تھے۔

گنج رشیدی ملفوظات قطب الاقطاب (دیوان صاحب) اکثر مطالعہ میں رکھتے تھے اور کہتے تھے کہ

از مطالعہ ایں خود را در مجلس قطب الاقطاب می یابیم (۴)

(اس کے مطالعہ سے اپنے آپ کو دیوان صاحب کی مجلس میں پاتا ہوں)۔

اسّی (۸۰) برس کی عمر میں جمادی الاولیٰ ۱۱۴۷ھ کو چہارشنبہ کے دن رحلت فرمائی، شیخ غلام محمد رشید جانشین شیخ ارشد نے نماز جنازہ پڑھائی۔ (۵)

---

(۱) گنج ارشدی و۲۲۔

(۲) ایضاً و۲۲۔

(۳) گنج ارشدی ۲۲۔

(۴) گنج ارشدی و۲۳ وسمات الاخیار۔

(۵) سمات الاخیار بحوالہ گنج فیاضی قلمی، گنج ارشدی و۳۲۵۔

دیوان صاحب کے خلفا ومجازین: آپ کے خلفاء کی تعداد تقریباً چالیس ہے، انمیں مشاہیر کے نام یہ ہیں:

(۱) شیخ محمد ارشد: ان کا مفصل ترجمہ گذر چکا ہے۔

(۲) شیخ میر سید قیام الدین: یہ تحصیل سگڑی ضلع اعظم گڈھ کے باشندہ تھے لیکن گورکھپور میں سکونت اختیار کرلی تھی اسی لئے گورکھپوری کی نسبت سے مشہور ہوئے۔

(۳) شیخ میر سید جعفر پٹنوی: دیوان صاحب کے خلفاء میں آپ کا مقام بہت بلند ہے، دیوان صاحب فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ مجھے جعفر کے طفیل بخش دیں گے، آپ کا اور شیخ میر قیام الدین کا مفصل حال سمات الاخیار میں مذکور ہے۔

(۴) شیخ نصرت جمال عرف ملتانی شاہ جامع گنج رشیدی المتوفی ۱۰۹۰ھ

(۵) شیخ نور الدین مداری المتوفی ۱۰۹۳ھ آپ دیوان صاحب کے ارشد تلامذہ سے ہیں۔

(٦) شیخ عبد الشکور منیری المتوفی ۱۰۹۰ھ آپ کو بھی دیوان صاحب سے شرف تلمذ حاصل ہے۔

(۷) شیخ محمد ماہ دیوگامی دیوان صاحب کے خاص شاگرد ہیں، آپ ہی نے دیوان صاحب کی نماز جنازہ پڑھائی تھی۔

(۸) شیخ آیت اللہ المتوفی ۱۰۷۷ھ

(۹) شیخ محی الدین متوکل جونپوری۔

(۱۰) قاضی محمد مودود جونپوری تلك عشرة كاملة.

☆ ☆ ☆

مولانا سخاوت علی جونپوری

آٹھویں صدی ہجری کی ابتداء سے بارہویں صدی تک دیار پورب میں شہر جونپور اسلامی تہذیب وثقافت کا اہم ترین مرکز رہا ہے۔ اس سرزمین سے بیشمار علماء وفضلاء اور صوفیا پیدا ہوئے جنھوں نے مدرسہ اور خانقاہ، دونوں کو اپنی علمی وروحانی سرگرمیوں سے آباد کیا۔

حاجی معین الدین ندوی لکھتے ہیں:

وکانت جونپور من ارق مدن الهند فی ایام الدولة الشرقیه وخرج منها خلق من العلماء لایحصرهم عدد(۱)

> سلطنت شرقیہ کے دور میں جونپور ہندوستان کے شہروں میں بہت بارونق شہر تھا اور اس میں بے شمار علماء پیدا ہوئے۔

ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی المتوفی ۸۴۸ھ، شیخ ابوالفتح سون برلیس المتوفی ۸۵۸ھ، میر سید عبدالاول محدث المتوفی ۹۶۸ھ، مولا علاء الدین الہ داد المتوفی ۹۳۹ھ، استاذ الملک محمد افضل عثمانی متوفی ۱۰۶۸ھ، ملا محمود مصنف شمس بازغہ متوفی ۱۰۶۸ھ، دیوان رشید مصنف مناظرہ رشیدیہ متوفی ۱۰۸۲ھ، ملا محمد جمیل مرتب فتاویٰ عالمگیریہ متوفی ۱۱۲۳ھ وغیرہ اپنے اپنے عہد میں یہاں کے علمائے فحول اور مشائخ کبار میں گزرے ہیں۔

ان میں العالم النبیل والفاضل الجلیل مولانا سخاوت علی بن رعایت علی حنفی جونپوری اپنے معاصرین میں خاص شہرت اور مقام کے مالک تھے۔

تیرہویں صدی کے علماء مشرق میں مولانا شریعت وطریقت کے مسلم مقتدا

---

(۱) معجم الامکنہ ج۱ ص۶۱۔

اور امامت و عبقریت کے اعلا مقام پر نظر آتے ہیں۔ بالخصوص حدیث و فقہ میں کامل دستگاہ اور خاص مہارت رکھتے تھے۔ صاحب اتحاف نے فقہائے ہند کی فہرست میں آپ کا شمار نہایت شاندار اور پر شوکت الفاظ میں کیا ہے۔ آج کی صحبت میں جونپور کی تاریخ علمی سے آپ ہی کی داستان زیر عنوان ہے۔

نام ونسب اور خاندانی حالات

سخاوت علی بن رعایت علی بن درویش علی بن نذر علی عمری (۱) اس سے آگے سلسلۂ نسب تلاش و تتبع کے باوجود حاصل نہ ہوسکا۔ آپ نسلاً شیخ فاروقی ہیں اور شیخ محمد کوفی کی اولاد سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایک سوال کے جواب میں مولانا نے خود فرمایا از اولاد شیخ محمد کوفی ہستم پس محمدی نسبت است بہ یکی بطون فاروقی (۲)

خواجہ محمد (۳) نے کوفہ کب اور کن حالات میں چھوڑا۔ ہندوستان کی اقامت کو دوسرے اماکن پر کیوں ترجیح دی؟ اس کی تفصیل سے تمام تذکرہ نویس خاموش ہیں۔ راقم نے مولانا کے خاندان کے بعض اہل علم سے اس کی تفصیل جاننے کی کوشش کی مگر کامیابی نہ ہوئی بس اتنا معلوم ہوسکا کہ شیخ کوفی کوفہ سے ہرات آئے پھر وہاں سے ہندوستان آکر قصبہ منڈیاہوں، مضافات جونپور میں فروکش ہوگئے۔

شیخ کوفی کا ہندوستان کے مشہور شہروں کو چھوڑ کر ایک غیر معروف قصبہ کو جائے اقامت کے لیے انتخاب کرنا اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی آمد ہندوستان میں فتنۂ تیموری کے لگ بھگ ہے جبکہ دلی کی تمدنی و معاشرتی دنیا میں بادخزاں کے تیز وتند جھونکے چل رہے تھے اور دیار پورب میں شہر جونپور سلطان ابراہیم شاہ شرقی المتوفی ۸۴۴ھ کے حسن انتظام، علم دوستی اور علماء و فضلاء کے ساتھ داد و دہش اور فیاضانہ سلوک کی وجہ سے

---

(۱) نزھۃ الخواطر ج ۷ ص ۱۹۲۔

(۲) جواب سوالات تسعہ ص ۱۴۲۔

(۳) خواجہ محمد بن مخدوم شیخ اسد الدین آفتاب ہند کے خلفاء میں تھے اور انھیں کے ہمراہ دہلی سے ظفر آباد تشریف لائے پھر یہاں سے منڈیاہوں کو شرف وطنیت سے نوازا۔ (حبیب الرحمٰن)

مرجع خلائق بنا ہوا تھا اور اطراف عالم سے ارباب کمال دارالخیو رشہر جونپور کی جانب کھنچے چلے آرہے تھے۔ قرین قیاس ہے کہ انھیں وجوہ کی بناء پر شیخ کوفی نے بھی ہندوستان کے دوسرے بڑے شہروں کے بجائے یہاں کی سکونت اختیار کی۔

سن پیدائش وابتدائی حالات

آپ ۲۶ یا ۱۲۲۵ھ میں پیدا ہوئے اس وقت آپ کے خاندان میں علم وفضل کا خاص چرچا تھا اور خاندان کے اکثر لوگ بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے جس کی وجہ سے علم کے ساتھ گھر میں فراغت ورفاہیت بھی تھی اس لیے آپ کی پرورش بڑے ناز ونعم سے ہوئی۔ مبتداء فیاض نے ذہانت وفطانت سے بھی حصۂ وافر عطا فرمایا تھا جس کے آثار ایام طفولیت ہی سے نمایاں تھے (۱)

سن تمیز کو پہنچے تو خاندان کے طریق کے مطابق اولاً حفظ قرآن شروع کیا اور صرف چھ ماہ کی مدت میں حفظ سے فراغت حاصل کرلی۔ اس کے بعد فارسی اور عربی کی ابتدائی کتابیں مولانا قدرت علی ردولوی سے پڑھیں اور متوسطات مولانا احمد اللہ انّامی اور مولانا احمد علی چریاکوٹی کی خدمت میں ختم کیں اور تکمیل وقت کے عدیم المثال محدث اور مجاہد حضرت شاہ اسماعیل شہید اور مولانا عبدالحئ بڈھانوی کے زیر تربیت کی اور عمر کے مختصر سے حصہ میں آمد روزگار ہوگئے۔ (۲)

تبحر علمی

آپ کے تمام تذکرہ نگاروں نے آپ کے تبحر علمی کا نہایت شاندار الفاظ میں ذکر کیا ہے۔ زیدی لکھتے ہیں:

دراندک زمان فاضل جلیل وعالم نبیل گشت شہرہ فضیلش برسر آسماں رسید وعلم

---

(۱) تجلی نور ص ۱۰۶ ونزھۃ الخواطر ج ۷ ص ۱۹۲۔

(۲) القول الجلی ص ۱، وتجلی نور ص ۱۰۶، وتذکرہ علمائے ہند۔

> تفوق بہ اقران افراشت و سرد بازاریٔ علمائے وقت گردید ملک العلماء وقت و استاذ الملک زمانہ بود در دور آخری زندہ کنند علوم جونپور و زیبندہ مسند فضلائے گزشتہ شد(۱)

(قلیل مدت میں جلیل القدر عالم ہو گئے اور ان کی فضیلت کا چرچا بام آسمان تک پہنچ گیا۔ معاصرین میں سب سے آگے نکل گئے اور وقت کے ملک العلماء اور استاذ الملک قرار پائے۔ آخری دور میں جونپور کے علوم کو زندہ کرنے اور فضلائے گزشتہ کے مسند کو زینت بخشنے کا شرف آپ کی حصہ میں آیا)۔

مولانا سید عبدالحیٔ الحسنی تحریر فرماتے ہیں۔

> الشیخ العالم الکبیر المحدث احد العلماء المشھورین(۲)

بیعت وخلافت

تحصیل علوم ظاہری سے فراغت کے بعد علوم باطنی کی جانب متوجہ ہوئے اور مجدّد دین احمدیؐ حضرت سید احمد بریلوی قدس اسرارہم کی خدمت میں حاضر ہو کر طریقۂ مجددیہ نقشبندیہ میں شرف بیعت حاصل کیا۔

نزھۃ الخواطر میں ہے۔

> واخذ الطریقۃ عن السید الامام احمد بن عرفان الشھید البریلوی ولازمہ برھۃ من الزمان(۳)

> حضرت سید احمد بن عرفان شہید بریلوی سے سلوک اخذ کیا اور ایک زمانہ تک ان کی خدمت میں حاضر رہے۔

علوم ظاہری کی طرح علوم باطنی میں بھی کمال جدوجہد اور مجاہدہ وریاضت فرمائی

---

(۱) تجلی نور ص ۱۰۶۔

(۲) نزھۃ الخواطر ج ۷ ص ۱۹۲۔

(۳) نزھۃ الخواطر ج ۷ ص ۱۹۲۔

تا آں کہ حضرت سید صاحب نے خلافت سے سرفراز فرما دیا۔

مولانا خود لکھتے ہیں:

> اس فقیر کو بیعت طریقہ چشتیہ اور قادریہ اور نقشبندیہ اور مجددیہ اور محمدیہ، ہاتھ پر امیر المومنین سبط اکبر مجدد ثالث عشر امام اوحد سید احمد دامت برکاتہم الی یوم التناد ہے اور اجازت بیعت لینے کی بھی حاصل ہے الخ (۱)

تعلیم وتدریس

ان جملہ کمالات ظاہری و باطنی کی تحصیل کے بعد آپ نے مسند تدریس کو زینت بخشی اور ہر قسم کے علائق دنیوی سے کنارہ کش ہوکر اشاعت علوم میں مصروف ہو گئے۔ مولانا کی علمی حذاقت ومہارت اور زہد وتقویٰ کا آوازہ چہار سو پھیلا اور طلباء کا اتنا ہجوم ہوا کہ جونپور کی مجلس علمی میں نئے سرے سے جان آ گئی۔

> ہزار ہا طلبائے دیار وامصار فیض علوم چیدند وصدہا فارغ التحصیل گشتند در دور آخری زندہ کنندہ علوم جونپور شد (۲)

(دور نزدیک کے ہزاروں طلباء نے آپ کے فیض علم سے استفادہ کیا اور سیکڑوں فارغ التحصیل ہوئے اور اس طرح آخری دور میں جونپور کے علوم کو آپ کی ذات سے نئی زندگی ملی)

جونپور سے باندہ

شدہ شدہ آپ کے کمالات کی شہرت نواب ذوالفقار بہادر مرحوم باندہ تک پہنچی۔ نواب مرحوم چونکہ علم دوست، علماء نواز تھے اس لیے بہ ہزار اصرار مولانا کو باندہ بلایا۔ مولانا نے نواب کی خواہش کو قبول کر لیا اور کچھ دنوں کے لیے باندہ کی اقامت منظور کر لی۔

---

(۱) رسالہ وصول ص ۳۶۔

(۲) تجلی نور ج ۱ ص ۱۰۶۔

نواب باندہ نے ہر طرح سے آپ کی توقیر وتعظیم کا خیال کیا اور آپ کے فضل وکمال کو دیکھ کر انتظام مدارس اور افسریت علماء کے مناصب آپ کو تفویض کر دیے، اس وقت نواب کے دربار میں بڑے بڑے نامور علماء وفضلاء موجود تھے مگر جو قدر ومنزلت نواب کے دل میں مولانا کی تھی وہ کسی کو حاصل نہ تھی۔

اسی زمانہ میں مولانا عبدالحلیم فرنگی محلی بھی باندہ میں نواب کے دربار سے منسلک تھے۔ مولانا عبدالحلیم مولانا کی جلالت علمی سے اس قدر متاثر ہوئے کہ بہت سی کتابیں مولانا سے سبقاً سبقاً پڑھ کر حلقہ تلمذ میں داخل ہو گئے اور ساتھ ہی درس وتدریس، وعظ وافتاء کی تربیت بھی مولانا سے حاصل کی۔ (۱)

مولانا فطرتاً آزاد منش واقع ہوئے تھے اس لیے باندہ کے قیام کو زیادہ دنوں کے لیے برداشت نہ کر سکے اور بصد عزت ورفعت ایک سال بعد جونپور واپس چلے آئے۔

استخلاص الجامع الشرق وقیام مدرسہ قرآنیہ

اس زمانہ میں الجامع الشرق (بڑی مسجد شہر جونپور) پر شیعوں کا قبضہ تھا جس میں وہ تعزیہ داری اور اس کے سات تاشۂ نقارہ وغیرہ بجاتے۔ اس سے بھی آگے کی بات یہ تھی کہ مسجد کو بارات ٹھہرانے کا بنگلہ بنا دیا تھا جس میں باراتی ہر قسم کی رنگ رلیوں کا پروگرام مناتے۔ غرض اسی طرح کی اور بھی بہت سی شنیع حرکات سے مسجد کی عزت وحرمت کو بالکل پامال کر دیا تھا۔ (۲)

مولانا کی غیرتِ ایمانی خانۂ خدا کی اس بربادی کو کب برداشت کر سکتی تھی چنانچہ آپ نے ابتداء میں انھیں لوگوں کو مسجد کی عزت وحرمت کی جانب توجہ دلائی مگر ان لوگوں نے اس کا کچھ اثر نہیں لیا تو آپ نے حاکم وقت کے دربار میں استغاثہ پیش کر دیا اور بڑی جدوجہد اور سعی کوشش کے بعد مولانا کی دلی مراد بر آئی اور مسجد کو براءت حاصل ہوئی۔

---

(۱) القول الجلی ص ۳۔

(۲) القول الجلی ص ۳۔

آپ نے فوراً مسجد کو صاف کرایا اور اس میں نماز پنجگانہ اور جمعہ کا انتظام فرمایا۔

اس کے بعد مولانا کو یہ خیال ہوا کہ اس میں کوئی ایسا انتظام کیا جائے کہ ہمیشہ ہمیش کے لیے مسجد کی آبادی کا سبب ہو اس خیال کے ماتحت آپ نے حسبۃً للہ مدرسہ قرآنیہ کی بناء ڈالی اور سب سے پہلے حافظ امام الدین لاہوری کو جو ایک خدارسیدہ اور صاحب حال بزرگ تھے، مدرس مقرر فرمایا اور خود قیام ہندوستان تک مدرسہ کے انتظام وانصرام کی دیکھ ریکھ فرماتے رہے اور ہجرت کے وقت اہل جونپور اور دیگر مضافات کے علاقہ کے لوگوں کو مدرسہ کی بقاء وترقی کی وصیت بھی فرمائی۔ بحمداللہ مدرسہ آج تک جاری ہے اور علوم دینیہ بالخصوص حفظ قرآن کی خدمت انجام دے رہا ہے جس سے بے شمار علماء، فضلاء اور حفاظ نے فیض اٹھایا ہے اور اٹھا رہے ہیں۔ (۱)

مختصر تاریخ مسجد

ملک الشرق ابراہیم شاہ شرقی المتوفی ۸۴۴ھ کے نقشہ کے مطابق ان کے بڑے لڑکے سلطان محمود شاہ شرقی المتوفی ۸۶۲ھ نے اس مسجد کی بنیاد رکھی۔ اس مسجد کا اندرونی صحن ۲۱۷×۲۱۹ فٹ ہے اور پورا احاطہ ۳۲۰ فٹ پورب وپچھّم اور ۳۰۷ فٹ اتر دکھن ہے۔ اور بلندی ۲۰۰ فٹ سے زیادہ ہے۔

تاریخ تعمیر کے بارے میں مورخین کی آراء مختلف ہیں لیکن اس پر سب کا اتفاق ہے کہ ۱۴۳۸ء اور ۱۴۷۰ء کی درمیانی مدت میں اس کی تعمیر ہوئی ہے۔ (۲)

ہجرت مکہ معظّمہ

مولانا ۱۲۶۴ھ میں اپنے ماموں مفتی محمد غوث صدر الصدور کی معیت میں فریضۂ حج ادا کر چکے تھے اور اپنی نگاہوں سے تجلیات ربانی کے مظہر اتم کو دیکھ آئے تھے اس لیے دل

---

(۱) تذکرہ علمائے ہند ونزھۃ ج ۷ ص ۱۹۲، والقول الجلی ص ۳۔

(۲) تاریخ شیراز ہند۔

ہر وقت ادھر ہی لگا رہتا تھا۔ اور ادھر مولانا امیر علی شہید کے واقعہ شہادت نے ہندوستان سے مزید دل برداشتہ کردیا۔ بالآخر ۱۲۷۲ھ میں آپ نے ہجرت کا عزم مصمم کرلیا اور سفر کی تیاریاں شروع کردیں اس سلسلے میں آپ نے کسی سے کسی قسم کی کوئی اعانت لینا پسند نہیں فرمایا اس لیے زاد راہ کے لیے اپنی والدہ کا وظیفہ جو بنارس کلکٹری میں مقرر تھا، فروخت کردیا اور متوسلین ومعتقدین کے سدراہ ہونے کے باوجود اپنے اہل وعیال کو ہمراہ لے کر بذریعہ کشتی بنارس، غازی پور، بلیا اور عظیم آباد ہوتے ہوئے کلکتہ پہنچ گئے اور چند یوم مولانا بدیع الزماں کے یہاں قیام فرما کر مکہ معظّمہ کی جانب روانہ ہوگئے۔ اللہ تعالیٰ نے بغایت آرام واطمینان سے بلدۂ امین میں پہنچا دیا۔

صاحب نزھۃ لکھتے ہیں:

ثم سار الی الحرمین الشریفین مع خاله المفتی محمد غوث الجونفوری سنة اربع وستین و مأتین والف فحج وزار ورجع الی الهند ودرس وافاد مدة ثم هاجر الی المكة المباركة مع عیاله سنة اثنین وسبعین الخ(۱)

> بعد ازاں اپنے ماموں مفتی محمد غوث جونپوری کی معیت ۱۲۶۴ھ میں فریضۂ حج ادا فرما کر ہندوستان مراجعت کی اور درس وافادہ میں لگ گئے۔ پھر ایک مدت کے بعد مکہ معظّمہ کی جانب مع اہل وعیال کے ہجرت فرمائی....

وفات

ہجرت کے بعد کے حالات بالکل پردۂ خفا میں ہیں کسی تذکرہ نگار نے اس کی طرف کچھ اشارہ نہیں کیا۔ مولانا کے خاندان کے لوگ جو اس وقت ہندوستان میں موجود ہیں، ان سے بھی اس سلسلے میں کوئی معلومات حاصل نہ ہوسکیں۔

حاصل کلام اسی دار ہجرت میں وقت موعود آگیا اور ۶ رشوال ۱۲۷۴ھ کو جان جان آفریں کو تفویض فرما کر جوار رحمت میں داخل ہوگئے۔ مکہ معظّمہ کے مشہور قبرستان جنت

---

(۱) نزھۃ ج ۷ ص ۱۹۲، والقول الجلی ص ۴، وتجلی نور ج ۱، ص ۱۰۸۔

المعلی میں اس گنجینۂ علم و فضل کو دفن کیا گیا۔ (۱)

تاریخ وفات:

گفت زیدی از سر تاریخ سال ختم شد شور علوم جون پور

مولانا کا مسلک

مولانا مسلکاً حنفی تھے اور حنفی ہونے پر آپ کو فخر بھی تھا۔ چنانچہ مولانا نے ہجرت کے وقت جو وصیت نامہ تحریر فرمایا تھا اس میں بصراحت ارقام فرماتے ہیں کہ فقیر اب اس ملک سے سفر کرتا ہے ایسا نہیں کہ کم علم لوگ پیچھے لوگوں کو گمراہ کریں اور فقیر کی طرف نسبت کریں کہ حنفی ہونے کو بد سمجھتے تھے اور حالانکہ فقیر حنفی ہے یا تقلید صحیح کے منکر تھے یا اہل حدیث خواہ فقہ سے انکار تھا اور عمل حدیث (؟) خواہ فقہ پر نہ تھا جس کو شبہ ہو فقیر کے پاس آ کر رفع اشتباہ کر لے اور جس چیز سے غافل ہو ہوشیار ہو جائے اب زیادہ لکھنے کی حاجت نہیں والسلام (۲)

ایک سوال کے جواب میں ارشاد فرماتے ہیں کہ

> آنچہ اعتراضات متعصبین است بجواب آں پرداختن شان اہل حق نیست اگر فرضاً علماء اعلام حنفی نہ باشند چہ وجہ طعن ست حنفی و شافعی بودن خود واجب نیست چنانچہ در فواتح الرحموت شرح مسلم الثبوت مرقوم است و نسبت فقیر حاجت استفسار نیست حنفی ام و بہ حنفیت... حقہ اتباع امام اعظم رافخر میدانم الخ (۳)

(متعصبین جو اعتراضات کرتے ہیں اس کے جواب کی جانب متوجہ ہونا اہل حق کی شان نہیں ہے۔ بالفرض اگر بڑے بڑے علماء حنفی نہیں تھے تو اس میں وجہ طعن کچھ بھی نہیں کیونکہ حنفی و شافعی ہونا واجب نہیں جیسا کہ فتوح الرحموت شرح مسلم الثبوت میں ہے اور فقیر

---

(۱) تجلی نور ج ۱ ص ۱۰۸۔

(۲) رسالہ نصائح ص ۱۱۔

(۳) جواب سوالات تسعہ ص ۱۵۔

کے بارے میں پوچھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں حنفی ہوا ور حنفیت حقہ کے ساتھ امام اعظم کی اتباع کو اپنے لیے باعثِ فخر سمجھتا ہوں)

مولانا کی تحریروں کے بعد کسی کا اس بات پر اصرار کہ مولانا غیر مقلد تھے اور موجودہ اہل حدیث کے گروہ سے تعلق رکھتے تھے ان کے نزدیک کوئی مقام رکھتا ہو لیکن اہل تحقیق کے نزدیک اس کی کوئی حیثیت نہیں۔

تصانیف

مولانا کو درس و تدریس سے فرصت بہت کم ملتی تھی اس لیے تصنیف و تالیف کی جانب چنداں رجحان نہیں ہوا پھر بھی بہت سے رسائل آپ کے قلم فیض رقم سے پیکر تحریر میں آئے جو آپ کے تبحر علمی کی واضح دلیل ہے۔

ان رسائل میں سے اکثر اب ناپید ہیں۔ راقم الحروف کو بڑی تلاش و جستجو کے بعد مندرج رسائل دستیاب ہو سکے افادہ عام کے لیے ان کا تعارف درج ہے۔

(۱) رسالہ فقر: فن تصوف پر ایک مختصر سا رسالہ ہے جسے چار فائدوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ فائدہ اوّل تقویٰ کے بیان میں ہے۔ دوسرا اہل تصوف کی عادات میں، تیسرا قلوب کی بیماریوں اور اس کے علاج پر مشتمل ہے۔ چوتھے میں انقطاع دنیا و ترکِ خواہشات کا تذکرہ ہے۔

اس رسالہ کے مضامین خود مصنف کے بیان کے مطابق فتوح الغیب مصنفہ شیخ عبدالقادر جیلانی سے ماخوذ ہیں۔

(۲) رسالہ نصائح: یہ چند ورقی ایک کتابچہ ہے جس میں پندرہ بیش قیمت نصیحتیں نہایت مؤثر انداز میں بیان کی گئی ہیں دراصل مولانا کی پندرہ وصیتیں ہیں جو آپ نے سفر ہجرت کے موقع پر اپنے متعلقین کو تحریراً فرمائی تھیں۔

(۳) رسالہ عرفان الاوقات: جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ رسالہ نماز پنج گانہ کے اوقات کے متعلق ہے۔ یہ ایک جامع رسالہ ہے جس میں آیات و احادیث کی روشنی میں

مدلل طور پر فرائض خمسہ کے اوقات کی تجدید کی گئی ہے۔ اس رسالہ میں ہر قسم کے تعصّبات سے الگ ہو کر اوقات مختلفہ میں معتدل فیصلہ کیا گیا ہے۔

(۴) رسالہ وصول: یہ رسالہ بھی فن تصوف میں ہے۔

(۵) رسالہ در بیانِ کلماتِ کفر: یہ چھ ورقی رسالہ کلمات کفر کے بیان میں ہے اس رسالہ میں مصنف نے کلمات کفر کے ساتھ گناہ کبیرہ اور گناہ صغیرہ کو بھی بالتفصیل بیان کیا ہے اور اصل مقصد کے شروع کرنے سے پہلے ایک مقدمہ بھی تحریر فرمایا ہے، جس میں کلمات کفر اور گناہ کبیرہ و صغیرہ کو بڑے ستھرے انداز میں تحریر کیا ہے۔

(۶) رسالہ ناسخ و منسوخ: یہ رسالہ ایک مقدمہ دو فصل اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہے۔ مقدمہ میں نسخ کی تعریف اور اس کے لغوی و اصطلاحی معنی سے بحث کی گئی ہے اور دو فصلوں میں سے پہلی فصل میں آیات منسوخہ کو بیان کیا ہے اور دوسری فصل میں احادیث منسوخہ کو اور خاتمہ میں مسئلہ تقلید سے بحث کی گئی ہے۔ اثبات تقلید کو ایسے اچھوتے اور دلنشیں انداز سے بیان کیا ہے کہ طالب حق کے لیے کوئی اشکال باقی نہیں رہتا۔ یہ رسالہ اختصار کے باوجود بہت ہی مفید اور مولانا کی علمی عبقریت بالخصوص قرآن و حدیث پر آپ کی دقت نظر کے لیے کافی ثبوت ہے۔

(۷) رسالہ تقویٰ: اس رسالے میں پانچ فرقوں کا بیان ہے۔ مقدمہ میں مولانا رقمطراز ہیں کہ اس دیار میں پانچ قسم کے کلمہ گو موجود ہیں۔ ایک اہل سنت و جماعت، دوسرے شیعہ امامیہ۔ تیسرے صوفی روش، چوتھے منکر مذاہب۔ پانچویں جاہل تابعدار رسم و عادت و خواہش نفسانی۔ اس میں کتاب و سنت کی روشنی میں بہ دلائل یہ ثابت کیا ہے کہ ان فرقوں میں صحیح راستہ پر صرف اہل سنت والجماعت ہیں۔

(۸) قویم فی احادیث نبی الکریم: مولانا کی یہ سب سے اہم اور نادرۂ روزگار تصنیف ہے اس کتاب کو مولانا نے صحاح ستہ کے علاوہ تقریباً چالیس کتب احادیث و رجال کو سامنے رکھ کر مرتب فرمایا ہے۔

کتاب کی ترتیب ابواب فقہی پر ہے اور ہر باب میں احناف کے مستدلات کو حوالہ اور

درجۂ حدیث کے بیان کے ساتھ نقل کیا ہے۔ حقیقت میں یہ کتاب اس لائق ہے کہ احناف کے ہر ادارہ میں اس کو رکھا جائے اور اہل مدارس اپنے نصاف میں داخل کر لیں تا کہ طلبہ کی نظر سے مسائل کے ساتھ ساتھ دلائل بھی گزرتے جائیں اور تقلید محض کے بجائے تحقیق کا ذوق پیدا ہو۔ راقم کے پیش نظر جو نسخہ ہے وہ مترجم ہے اور پانچ سو بیس صفحات پر مشتمل ہے۔ سب سے پہلے کتاب الطہارت ہے اور سب سے آخر میں کتاب الفرائض۔

ان رسائل کے علاوہ رسالہ تصحیح فی مسئلہ تقلید صحیح، رسالہ اسرار، رسالہ تعداد لغات۔ اسلم فی المنطق، رسالہ علم الفرائض، رسالہ عرض نیک در رد شیعہ بھی آپ کی مشہور تصانیف ہیں مگر انتہائی کوشش کے باوجود یہ رسائل دستیاب نہ ہو سکے۔ لعل اللہ یحدث بعد ذلك امرا.

اولاد

مبدء فیاض نے مولانا کو علم و فضل کی دولتِ جاودانی کے ساتھ اولاد کی نعمت سے بھی شادمانی عطا فرمائی تھی۔ مولانا کے چھ بچے تھے جن میں دو لڑکیاں مریم، اور جویریہ نامی تھیں اور چار بیٹے تھے جن میں سب سے بڑے مولانا شیخ محمد اور سب سے چھوٹے مولانا ابوالخیر محمد مکی تھے۔ (۱)

(۱) شیخ محمد: یہ ہمیشہ اپنے والد ماجد کے ساتھ رہے۔ علم فضل، زہد و ورع، درس و افتاء اور تقریر و تحریر میں نادرۂ روزگار تھے۔ مولانا سلامت اللہ کانپوری سے ان کا ایک مناظرہ آج بھی اہل علم میں مشہور ہے۔ ایک رسالہ کتاب البیوع میں تحریر فرمایا جو اہل علم کے لیے ایک دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔

مگر افسوس کہ اس گنجینۂ علم و فضل کا عین شباب میں ۲؍ شوال ۱۲۷۳ھ کو انتقال ہو گیا۔

(۲) مولانا حکیم محمد جنید: سفر ہجرت میں یہ اپنے والد بزرگوار کے ہمراہ تھے اور ہر طرح کے فیضان علمی و عملی سے اکتساب کرتے رہے۔ مولانا کی وفات کے بعد جونپور

---

(۱) ازافادہ مولانا علی اعلیٰ نبیرۂ مولانا محمد شبلی۔

واپس تشریف لائے اور مولانا عبدالحلیم فرنگی محلی استاذ مدرسہ امام بخش سے متوسطات پڑھ کر مفتی محمد یوسف فرنگی محلی سے بقیہ کتابوں کی تکمیل کی۔ پھر طب کی طرف متوجہ ہوئے اور حکیم اولاد علی جونپوری کے مطب میں کچھ دنوں تک تحصیل کر کے اس فن میں بھی مہارت تامہ حاصل کی۔

یہ بھی ہر قسم کے محاسن صوری و معنوی سے آراستہ تھے۔ افتاء، درس و تدریس، وعظ و نصائح اور انتظام مدرسہ قرآنیہ کے ساتھ طبابت بھی کرتے تھے اور اس طرح سے بندگان خدا کی روحانی و جسمانی دونوں خدمتیں انجام دیتے تھے۔ یہ بھی زندگی کی بہاروں سے زیادہ متمتع نہ ہو سکے اور اپنے برادر کبیر کی طرح عالم شباب ہی میں ۱۲۸۱ھ میں واصل بحق ہو گئے۔ (۱)

(۳) مولانا محمد شبلی: یہ ۲۵ رشعبان ۱۲۶۳ھ کو پیدا ہوئے۔ مولانا کے سفر ہجرت کے وقت چونکہ صغیر سن تھے اس لیے ہمراہی کے شرف سے قاصر رہے اور اپنے نانا قاضی ضیاء اللہ صدر الصدور کی زیر نگرانی تعلیم کا آغاز کیا۔ خاندانی روایت کے مطابق سب سے پہلے حافظ نعمت اللہ سرائے میری سے حفظ قرآن کیا۔ پھر کتب فارسیہ متداولہ سے فراغت کے بعد مفتی محمد یوسف فرنگی محلی کے حلقہ تلمذ میں شامل ہو گئے اور انھیں کی خدمت میں درس نظامیہ کی تکمیل کی۔ مفتی صاحب نے فراغت کے موقع پر جو سند انھیں لکھ کر دی تھی وہ ان کے علمی کمال پر روشن دلیل ہے۔ طوالت کے خوف سے ہم یہاں سند نقل نہیں کر رہے ہیں۔

علوم ظاہری کی تحصیل و تکمیل کے بعد آپ نے علوم باطنی کی جانب توجہ کی اور اپنے والد ماجد کے تلمیذ رشید حضرت سید خواجہ احمد نصیر آبادی کی خدمت میں حاضر ہو کر شرفِ بیعت حاصل کیا اور مدت تک سید صاحب کی خدمت میں رہ کر فیضان روحانی سے مستفید ہوتے رہے۔ اسی زمانہ میں خواجہ احمد نے آپ کے دل میں حدیث کا شوق پیدا کر دیا چنانچہ اپنے مرشد کے حکم سے مولانا سید نذیر حسین دہلوی کی خدمت میں صحاح ستہ کے علاوہ دوسری کتب حدیث پڑھ کر سند فراغت حاصل کی۔ ان جملہ کمالات کے بعد ۱۲۸۶ھ میں اپنے شفیق مربی اور نانا قاضی ضیاء اللہ کی معیت میں زیارت حرمین شریفین سے مشرف ہوئے۔

---

(۱) القول الجلی ص ۸۔

اس مبارک سفر سے واپسی کے بعد علوم دینیہ کی خدمت میں اپنے اسلاف کی طرح مصروف ہوگئے۔ بالخصوص مدرسہ قرآنیہ کے انتظام وانصرام میں کافی دلچسپی لی اور جو مدرسہ اب تک صرف حفظ قرآن کی خدمت انجام دے رہا تھا اس میں اتنی ترقی ہوئی کہ درس نظامیہ کی مکمل تعلیم ہونے لگی۔

۲۱؍رمضان ۱۳۱۱ھ کو بعمر ۶۵ سال اس دار فانی سے رحلت فرمائی۔

(۴) مولانا ابوالخیر محمد مکی: ان کی ولادت ۱۹؍جمادی الثانی ۱۲۷۴ھ کو مکہ معظّمہ میں ہوئی والد مرحوم کی وفات کے بعد اپنی والدہ اور علاتی بھائی مولانا جنید کے ساتھ جونپور تشریف لائے۔ سن تمیز کو پہنچے تو حافظ نعمت اللہ سرائے میری سے حفظ کلام پاک شروع کیا اور حافظ احمد جونپوری سے تکمیل کی اسی زمانہ میں کتب فارسیہ سے فراغت حاصل کرلی۔ اس کے بعد اپنے برادر بزرگ مولانا محمد شبلی سے عربی کتابیں شروع کیں۔ مختصرات کو ان کی خدمت میں مکمل کر کے ۱۲۹۲ھ میں مولانا حکیم محمد عبداللہ چھراوتی تلمیذ رشید مفتی محمد یوسف سے متوسطات شروع کیں اور کچھ کتابیں مولانا سعادت حسین عظیم آبادی تلمیذ مولانا سخاوت علی اور محمد اکرم آروی سے پڑھیں اور تکمیل ابوحنفیہ وقت حضرت مولانا عبدالحیٔ فرنگی محلی کی خدمت میں کی۔

اس کے بعد حضرت سید ضیاء النبی بریلوی کی خدمت میں حاضر ہوکر سلوک کی راہ میں قدم رکھا اور ایک مدت تک ان کی خدمت میں رہ کر اس راہ کی بھی تکمیل فرمائی۔

بعد ازاں درس وتدریس وعظ وافتاء اور اپنے پیشرو بزرگوں کی طرح مدرسہ قرآنیہ کے انتظام میں ہمہ تن منہمک ہوگئے۔ مولانا کی حیات تک یہ مدرسہ علوم ظاہری وباطنی کا ایک سنگم تھا اور مدرسہ ہر اعتبار سے ترقی پذیر تھا اور ہندوستان کے مشہور مدارس میں اس کا شمار ہوتا تھا مگر مولانا کے بعد مدرسہ میں وہ رونق باقی نہ رہی۔

وہ دھوپ تھی جو سنگ گئی آفتاب کے

آپ نے ۱۳۲۲ھ میں وفات پائی۔(۱)

---

(۱) القول الجلی ص ۹، ونزھۃ الخواطر ج ۸ ص ۴۵۷۔

تلامذہ

یوں تو مولانا کے چشمۂ علم وفضل سے بے شمار تشنگان علوم سیراب ہوئے مگر ان میں مولانا عبدالحلیم فرنگی محلی، مولانا سید خواجہ احمد نصیر آبادی، مولانا کرامت علی اور ان کے برادر خورد مولانا رجب علی جونپوری، مولانا شاہ امید علی جونپوری، مولانا غلام جیلانی غازیپوری، مولانا فیض اللہ مئوی اعظمی، مولانا شیخ محمد محدث مچھلی شہری، مولانا محمد یعقوب بہاری، مولانا رحیم اللہ بستوی ارشد تلامذہ میں ہیں اور ان میں سے ہر ایک آسمان علم وفضل کا مہر درخشاں تھا۔

☆ ☆ ☆

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے سفر حرمین شریفین کی تفصیلی روداد

یہ روداد امام الہند شاہ ولی اللہ قدس سرہ کے تلمیذ رشید وخلیفہ اجل شیخ محمد عاشق پھلتی متوفی فی حدود ۱۱۸۷ھ نے قلمبند فرمائی ہے جو اس سفر میں حضرت شاہ صاحب کے رفیق سفر تھے اس لئے اس کے مندرجات شنیدہ نہیں بلکہ دیدہ پر مشتمل ہیں جسے شیخ پھلتیؒ نے اپنی نادرۂ روزگار تالیف ”القول الجلی فی ذکر آثار الولی“ میں صفحہ ۳۹ سے صفحہ ۴۹ تک میں تحریر فرمایا ہے چونکہ القول الجلی ایک مدت سے نایاب تھی اس لئے حضرت شاہ صاحب پر کام کرنے والے حضرات اس سے استفادہ نہیں کرسکے حالانکہ یہ روداد اس اعتبار سے نہایت اہم ہے کہ اس سے شاہ صاحب کی علمی وعرفانی منزلت اور عظمتِ شان نکھر کر سامنے آجاتی ہے اور ایک ایسے مستند ذریعہ سے جس پر خود شاہ صاحب نے بھی اعتماد کیا ہے۔

مدت ہوئی ایک مرتبہ محدث جلیل مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی نوراللہ مرقدہ سے سنا تھا کہ تکیہ کاکوری میں القول الجلیل کا ایک قلمی نسخہ ہے بعد میں معلوم ہوا کہ خدابخش لائبریری پٹنہ میں بھی اس کا ایک ناقص مخطوطہ ہے، ان دونسخوں کے علاوہ اب تک کسی تیسرے نسخہ کا علم نہیں ہوسکا اسی کاکوری نسخہ کا عکس لے کر شاہ ابوالخیر اکاڈمی شاہ ابوالخیر مارگ دہلی۔۶ نے ۱۴۰۹ھ/ ۱۹۸۹ء میں اس نایاب کتاب کو شائع کردیا ہے، میرے سامنے یہی مطبوعہ نسخہ ہے جو کاکوری والے نسخہ کا عکس ہے کاتب اس نسخہ کی کتابت سے جمعہ ۲۵؍شعبان ۱۲۲۹ھ مطابق ۱۲؍اگست ۱۸۱۳ء کو فارغ ہوئے ہیں، کتابت میں جابجا غلطیاں ہیں بالخصوص عربی عبارت میں غلطیاں بیحد ہیں جس کی وجہ سے استفادہ میں بڑی دشواری پیش آتی ہے پھر بھی شاہ صاحب پر ایک مستند ترین کتاب اہل علم کے ہاتھوں میں پہنچ گئی جسے ایک نعمت غیر مترقبہ ہی کہا جاسکتا ہے، اسی کتاب مستطاب سے سفر حرمین شریفین کی روداد کا ترجمہ ہدیۂ ناظرین ہے۔ (حبیب الرحمٰن قاسمی)

آغاز سفر

جب حرمین شریفین کے سفر اور اس کار کا داعیہ پختہ اور عزم مصمم ہو گیا تو ۸؍ربیع الثانی ۱۱۴۳ھ کو قدوۂ اصحاب معرفت و عمدۃ ارباب حقیقت شیخ عبید اللہ سلّمہم اللہ تعالیٰ (والد ماجد شیخ محمد عاشق پھلتی اور دیگر احباب و اصحاب جن میں ایک شیخ محمد پھلتی مؤلف القول الجلی بھی شامل تھے) کے ہمراہ براہ لاہور (وطن مالوف) دہلی سے کوچ کیا، راستے میں ''پانی پت'' سے گذر ہوا تو شاہ شرف الدین قلندر، شاہ شمس الدین ترک اور شاہ جلال الدین قدس اسرارہم کے مزارات پر برائے فاتحہ گئے، یہاں سے چل کر سرہند پہنچے اور شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی کے روضہ کی زیارت کی، اسی طرح لاہور ورود ہوا تو شیخ علی ہجویریؒ کے مزار پر فاتحہ کے لئے گئے، لاہور کے بعد ملتان پہنچے تو شیخ بہاء الدین سہروردی اور شیخ رکن الدین قدس اسرارہم کی تربت پر فاتحہ پڑھا، ملتان میں طلبہ و علماء کی ایک کثیر تعداد نے حضرت شاہ صاحب سے بیعت کی اور سلوک کے اوراد و اشغال حاصل کئے، یہاں سے روانگی کے وقت بہت سے لوگوں نے سفر میں رفاقت کی خواہش ظاہر کی، مگر حضرت شاہ صاحب نے بہ مصلحت وقت انھیں تسلی دی اور واپس کر دیا۔

جب دیار سندھ سے گذر ہوا تو آپ کی آمد کی خبر سن کر اپنے اپنے مقامات سے لوگ ملاقات کے لئے دوڑ پڑے، جن میں سے ایک جماعت شرف زیارت سے فیض یاب ہوئی اور کچھ لوگ تاخیر سے پہنچنے کی وجہ سے ملاقات سے محروم رہ گئے، شہر ٹھٹھ کے مضافاتی قصبہ نصر پور میں جب قافلہ پہنچا تو بہت سے علماء و فضلاء پانچ پانچ چھ چھ کوس سے مسافت طے کر کے رات کے وقت وہاں پہنچے اور اسی وقت خدمت میں باریابی حاصل کر کے سلسلۂ بیعت سے منسلک ہو گئے اور اپنی اپنی استعداد کے مطابق فیوض و برکات سے مستفیض ہوئے، نصر پور کے بعد شہر ٹھٹھ میں شرف نزول فرمایا وہاں بھی دیگر شہروں کی طرح تمام مقامی علماء اور صوفیاء خدمت میں حاضر ہوئے، جن میں سے ایک بڑی جماعت نے بیعت کی سعادت بھی حاصل کی، یہیں حضرت شاہ صاحب کے تلمیذ مخدوم محمد معین (جو اس دیار

کے علمائے کبار میں شمار ہوتے تھے اور کتاب وسنت وجمیع علوم منقول ومعقول میں تبحر تام رکھتے تھے، نیز قوم (یعنی صوفیا) کی اصطلاحات سے پوری واقفیت اور علم حقانی کے ادراک میں ذہن ثاقب کے مالک تھے اور حضرت شاہ صاحب کے جمال وکمال کے گرویدہ تھے) خدمت میں حاضر ہوئے اور اس صحبت کو غنیمتِ کبریٰ سمجھ کر خوب خوب فیوض و برکات حاصل کئے، اور بیعت وارشاد کی اجازت سے بہرہ یاب ہوئے۔

بندر سورت سے روانگی

چونکہ ہر مقام پر طلبہ وعلماء کے قافلے زیارت و ملاقات کے لئے حاضر خدمت ہوتے رہے جس کی بنا پر راستے میں بہت زیادہ توقف ہوا، اور جہازوں کی روانگی کا وقت بالکل قریب آ گیا، اس لئے ہم خدام کو اضطراب اور پریشانی لاحق ہوئی کہ مبادا ساحل پر پہنچنے سے پہلے ہی جہاز روانہ ہوجائیں اور ہم حج کی دولت سے محروم رہ جائیں، ہمارے اس اضطراب و بے چینی کو محسوس کر کے حضرت شاہ صاحب نے ہمیں اطمینان دلاتے ہوئے فرمایا (گھبراؤ نہیں) انشاء اللہ اسی سال حج سے مشرف ہوں گے، الحاصل ہمارا قافلہ بندر سورت پر پہنچا جب کہ جہازوں کی روانگی کا وقت تقریباً گذر چکا تھا اور سارے جہاز مسافروں کو لے کر روانہ ہو چکے تھے، صرف ایک جہاز باقی رہ گیا تھا مگر وہ بھی مسافروں سے بھر چکا تھا، اس بنا پر بہت سارے لوگ واپس لوٹ رہے تھے مگر بفضل الٰہی ہمیں جگہ مل گئی، حضرت شاہ صاحب نے اس جہاز پر سوار ہونے کا ارادہ فرمایا تو اکثر احباب نے عرض کیا کہ جہازوں کے سفر کا وقت ختم ہوگیا ہے (اس لئے اب سفر مخدوش ہوگا) پھر یہ جہاز بھی نہایت خستہ حال ہے اور سست رفتار بھی ہے، خود جہاز رانوں کی گفتگو سے ظاہر ہوتا تھا کہ انھیں بھی اس جہاز پر اطمینان نہیں ہے اس لئے مصلحت کا تقاضا یہ ہے کہ توقف کیا جائے، احباب کے ان خدشات کو حضرت شاہ صاحب نے کوئی اہمیت نہیں دی اور قافلہ کو لے کر جہاز میں سوار ہو گئے اور فرمایا ''انشاء اللہ امسال حج خواہم کرد'' انشاء اللہ ہم اسی سال حج کریں گے، بہر حال جیسے ہی لنگر اٹھا اور جہاز روانہ ہوا

(بفضلہٖ تعالیٰ) بادِ موافق چل پڑی (اور اپنی خستہ حالی وسست رفتاری کے باوجود) ۴۵ دن میں یہ جہاز جدہ پہنچ کر لنگر انداز ہوگیا، جہاز کی اس تیز رفتاری اور اس قدر جلد منزلِ مقصود پر پہنچ جانے سے دیگر جہاز رانوں کو حیرت ہوئی۔

مکہ معظّمہ میں حاضری اور وہاں کے علماء وفضلاء سے ملاقات

۱۵/ ذی قعدہ (۱۱۴۳ھ) کو مکہ معظّمہ میں داخل ہوئے اور عمرہ تمتع ادا فرمایا، پھر ذی الحجہ میں ادائیگی حج سے بہرہ یاب ہوئے، مکہ معظّمہ میں اقامت کے دوران وہاں کے علماء وفضلاء سے علمی مذاکرے اور تبادلۂ خیالات ہوتے رہے۔

بعض علماء نے حضرت شاہ صاحب کے علمی مقام ومرتبہ کو معلوم کرنے کی غرض سے کچھ اہم علمی سوالات بھی کیے، حضرت شاہ صاحب نے ان کا نہایت شافی جواب دیا جس سے وہ سمجھ گئے کہ یہ جمیع علوم منقول ومعقول میں سب پر فائق ہیں، تو ان کی جانب سے درس وافادہ کا اصرار ہوا، چنانچہ ان کے سوال واصرار پر حضرت شاہ صاحب نے مسجد حرام میں حنفی مصلیٰ کے قریب درس دینا شروع کردیا، مستفیدین کی اس قدر کثرت ہوئی کہ حضرت شاہ صاحب کا سارا وقت درس وافادہ میں مشغول ہوگیا، اور حل دقائق وکشف مغلقات میں آپ کی اس قدر شہرت ہوئی کہ وہاں کے علماء کبار علمی مشکلات میں آپ سے رجوع کرنے لگے، اور تھوڑے ہی دنوں میں وہاں کے علمی حلقوں میں آپ کی علمی عظمت ومرتبت کا سکہ ایسا بیٹھ گیا کہ وہاں کے اکابر علماء آپ کی صحبت کو غنیمت شمار کرنے لگے اور آپ کے ساتھ انتہائی توقیر وتعظیم کا معاملہ کرتے اور باہم کہتے کہ واللہ باللہ تمام اہل مکہ میں آپ کی علمی شان ومرتبہ کا کوئی نہیں ہے، بہت سے حضرات نے آپ سے گذارش کی کہ اب واپسی کا ارادہ فسخ کرکے یہیں توطن اختیار فرمالیں، اس وقت کے گورنر پاشا نے قیام کی ساری ضروریات کی کفالت کی ذمہ داری پر آمادگی کا اظہار بھی کیا مگر حضرت شاہ صاحب نے اسے قبول نہیں کیا، تو وہاں کے اکابر نے آخر میں یہاں تک فرمایا کہ اگر اللہ تعالیٰ اہل مکہ کے ساتھ خیر کا ارادہ رکھتے ہیں تو آپ کو اسی جگہ مقیم کردیں گے۔

مکہ معظّمہ کے دوران قیام میں ایک سوڈانی عالم نے جو ایک عرصہ سے مکہ میں مجاور تھے خواب دیکھا کہ ایک عزیز ان سے کہہ رہے ہیں کہ اگر عقیدۂ اقطاب سیکھنا چاہتے ہو تو شیخ ولی اللہ سے استفادہ کرو، اس خواب کے بعد وہ سوڈانی عالم حضرت شاہ صاحب سے بیعت ہو گئے، اور سلوک کی تعلیم حاصل کر کے بعض اسرار سے ہم کنار ہوئے، بعد ازاں حرمین کے بہت سے حضرات نے آپ سے بیعت کی اور طریقت کے اوراد و اشغال کی تعلیم حاصل کی۔

مدینہ منورہ کی حاضری

فریضۂ حج سے فراغت کے بعد دو ماہ مکہ معظّمہ میں قیام رہا، بعد ازاں زیارت نبوی ...... کی غرض سے مدینہ منورہ روانہ ہوئے، اس بابرکت سفر میں بہت سارے اسرار آپ پر منکشف ہوئے، اور جب مدینہ منورہ پہنچ کر روضۂ اقدس علی صاحبہا افضل الصلوات و اہمّ التسلیمات کی زیارت سے مشرف ہوئے تو اپنی جانب آنحضرت ...... کی بے غایت عنایات و کرامات مبذول پائی، روزانہ جب مواجہہ شریف میں مراقب ہوتے تو اسرار جدیدہ سے ہم کنار ہوتے، کوئی مجلس بھی اس فیضان سے خالی نہیں رہی۔

ایک بزرگ کا خواب

مدینہ منورہ حاضری سے پہلے ہی شیخ عبدالکریم انصاری نے (جو خادم رسول انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی اولاد میں تھے اور اہل مدینہ کے اکابر میں شمار ہوتے تھے) حضرت شاہ صاحب کو خواب میں دیکھا، علاوہ بریں مواجہہ شریفہ علی صاحبہا الصلوات اتمھا و من التسلیمات اکملہا میں بھی آپ کی کرامت و بزرگی معلوم کی تھی، اسی بناء پر وہ آپ کے منتظر تھے، چنانچہ جب آپ مدینہ پہنچ گئے تو قافلہ والوں سے معلومات کر کے آپ کی خدمت میں تشریف لائے اور اپنے خواب کا ذکر کیا اور اسی کے ساتھ اپنی سند سے حدیث مسلسل بالاولیۃ کی اجازت بھی روضۂ نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیم کے قریب مقام اصحاب صفہ میں عطا فرمائی۔

ایک عالم کی جانب سے دعوت طعام اور علمی سوالات

مسجد نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیم کے مدرسین میں سے شیخ طیب نے جن کا فضلاء مدینہ میں شمار تھا حضرت شاہ صاحب کی دعوت کی اور اس مناسبت سے شہر کے دیگر علماء وفضلاء کو بھی بلا رکھا تھا، چنانچہ حضرت شاہ صاحب وقت پر پہنچے شیخ طیب نے دوران گفتگو حضرت شاہ صاحب سے دریافت کیا، آنجناب عربی میں تقریر پر قابو یافتہ ہیں، شاہ صاحب نے ازراہ تواضع فرمایا ہاں ٹوٹے پھوٹے انداز میں کچھ بول لیتا ہوں اس کے بعد انھوں نے کہا بہت سے علماء علمی تبحر اور حل دقائق کا دعویٰ کرتے ہیں، لیکن بعض معقولی مسائل کی تشریح اچھی طرح نہیں کر پاتے کہ اعتراض اپنی جگہ باقی رہتا ہے، جیسے کہ ''مسئلہ تجدد امثال'' ہے کہ اشاعرہ اعراض میں اس کے قائل ہیں مگر جواہر میں اس کو جائز نہیں سمجھتے اس مسئلہ کی تحقیق اور دونوں صورتوں میں وجہ فرق کیا ہے؟

حضرت شاہ صاحب نے نہایت فصاحت و بلاغت کے ساتھ عربی میں اس مسئلہ پر تقریر فرمائی جسے سن کر مجلس میں موجود فضلاء عرب دنگ رہ گئے اور مسئلہ زیر گفتگو کی تحقیق میں ایسے دقیق نکات اور عمیق تدقیقات بیان فرمائیں کہ شیخ طیب نے اسے غنیمت کبریٰ خیال فرمایا۔ اور اس کے بعد پھر کبھی حضرت شاہ صاحب کے سامنے کسی علمی مسئلہ کو نہیں چھیڑا۔

ایک اور علمی سوال اور اس کا حل

مدینہ منورہ کے زمانہ قیام میں ایک عالم نے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہ کی تصنیف غنیۃ الطالبین کی ایک عبارت پر جو حنفیہ سے متعلق ہے اشکال پیش کیا اور اس کے حل کے طالب ہوئے، حضرت شاہ صاحب نے تحریری طور پر اس کا ایسا جواب دیا جسے وہاں کے سارے علماء نے پسندیدگی کی نظر سے دیکھا شاہ صاحب نے اس مسئلہ سے متعلق تحریر فرمایا:

تفصیل اشکال

ایک صاحب نے حضرت امام الطریقۃ قطب الحقیقۃ شیخ عبدالقادر جیلانی رضی اللہ عنہ کے قول کے بارے میں سوال کیا کہ شیخ جیلانی قدس سرہ نے غنیۃ الطالبین میں فرقہ غیرناجیہ کی قسمیں بیان کرتے ہوئے مرجیہ کے بارہ فرقوں کا ذکر کیا ہے جن میں احناف کو بھی شمار کیا ہے، پھر مرجیہ کے ان بارہ فرقوں کی تفصیل کے ضمن میں لکھتے ہیں کہ حنفیہ ابوحنیفہ نعمان کے متبع ہیں جو اس بات کے قائل ہیں کہ ایمان اقرار و تصدیق ہے یعنی اللہ اور اس کے رسول ...... اور رسول جو کچھ منجانب اللہ لاتے ہیں کو ماننا اور زبان سے اس کا اقرار کرنا جیسا کہ برہوتی نے کتاب الشجرہ میں لکھا ہے۔

حضرت شیخ جیلانی قدس سرہ کی اس عبارت پر دو اشکال وارد ہوتا ہے، اول یہ کہ جن حضرات علماء کے قول پر اعتماد کیا جاتا ہے ان سب کا اس بات پر اتفاق ہے کہ حنفیہ اہل سنت میں سے ہیں، لہٰذا انھیں فرقۂ مرجیہ میں شامل کرنا اور ان کی تضلیل وعدم نجات کا قائل ہونا کیونکر درست ہے؟

دوسرا اشکال یہ ہے کہ جس عقیدہ کی بنا پر فرقۂ مرجیہ کو مرجیۂ کہا جاتا ہے اسے بیان کرنے کے بعد شیخ نے احناف کو بھی مرجیۂ کے زمرہ میں شمار کیا ہے جس کا اقتضاء یہ ہے کہ حنفیہ بھی اسی عقیدہ کو مانتے ہیں جس کے مرجیۂ قائل ہیں جبکہ واقعہ ایسا نہیں ہے، چنانچہ خود شیخ جیلانی قدس سرہ نے لکھا ہے کہ مرجیۂ کا خیال ہے کہ جس مکلّف نے بھی لا الٰہ الا اللہ کا اقرار کرلیا اسے کوئی بھی گناہ ضرر نہیں پہنچا سکتا اور نہ وہ دوزخ میں جائے گا اور بلا ریب حنفیہ اس عقیدہ سے بری اور پاک ہیں۔

جواب اشکال

اس کے جواب میں ہم نے عرض کیا کہ ارجاء کی دو قسمیں ہیں، پہلی قسم کے ارجاء کا قائل اہل سنت سے خارج ہو جاتا ہے، دوسری قسم کے قائل ہونے سے اہل سنت سے خروج

نہیں ہوتا، پہلے ارجاء کی تعریف یہ ہے کہ اس بات کا اعتقاد رکھنا کہ جس نے بھی زبان سے اقرار اور دل سے تصدیق کرلی اسے کبھی گناہ نقصان نہیں پہنچا سکتا، دوسرے ارجاء کی تعریف یہ ہے کہ اس بات کا معتقد ہونا کہ عمل داخل ایمان نہیں ہے البتہ ثواب وعقاب اعمال پر مرتب ہونگے، اول ارجاء والوں کی تخطیہ و تضلیل پر صحابہ اور تابعین کا اجماع ہے، اور ارجاء ثانی کے تخطیہ پر سلف کا اجماع ظاہر نہیں ہوا، بلکہ اس باب میں دلائل متعارض ہیں بہت سی آیات واحادیث اور آثار اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ ایمان عمل سے الگ ایک شئی ہے اور بہت سے دلائل میں قول وعمل کے مجموعہ پر ایمان کا اطلاق ہوا ہے۔

اور درحقیقت یہ ایک لفظی نزاع ہے کیونکہ (جو حضرات عمل کو ایمان میں داخل نہیں مانتے اور جو حضرات قول وعمل کے مجموعہ کو ایمان کہتے ہیں) دونوں فریق کا اس پر اتفاق ہے کہ گنہ گار ایمان سے خارج نہیں ہوتا ہاں عقاب وعذاب کا مستحق ہے، پھر جن دلائل سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان قول وعمل کا مجموعہ ہے، ادنیٰ توجہ سے انھیں ظاہر معنی سے پھیرا جاسکتا ہے۔

امام ابوحنیفہ اسی دوسری قسم کے ارجاء کے قائل ہیں اور کبار اہل سنت میں ہیں بلکہ امام اہل سنت ہیں، البتہ ان کے متبعین اور اہل مذہب میں مختلف رائے کے لوگ پیدا ہوئے، بعض ان میں معتزلی عقیدہ کے تھے جیسے جبّائی، ابوہاشم، زمخشری وغیرہ اور بعض مرجیئہ تھے اور بعض ان کے علاوہ اور یہ سب صرف فروع میں امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کے تابع تھے اصول اعتقادیہ میں ان سے الگ تھے لیکن اپنے فاسد عقیدہ کو (اس کی تشہیر وتائید کی غرض سے) امام صاحب کی جانب منسوب کرتے تھے، نیز امام صاحب کے بعض اقوال سے (غلط طور پر) تمسک کرتے تھے جب حنفیہ میں سے اہل حق مثلاً طحاویؒ وغیرہ کو اس فتنہ کا ادراک ہوا تو انھوں نے اصول اعتقادیہ میں امام صاحب کے مذہب کو واضح کیا، اور مبتدعین نے جو غلط باتیں (تلبیساً) ان کی جانب منسوب کردی تھیں انھیں دفع کیا، ان امور سے وہ علماء واقف ہیں جن کے مطالعہ سے تمام مذاہب کی مصنفات گذر چکی ہیں۔

ان مقدمات کی تمہید کے بعد عرض ہے کہ شیخ جیلانی رحمہ اللہ نے فرقۂ ضالہ میں

(گمراہ فرقہ) ان اہل ارجاء کا ذکر کیا ہے جو اہل سنت سے خارج ہیں، اسی بناء پر ان کی وجہ تسمیہ میں ان کے عقائد کو بیان کیا ہے اور اس فرقہ میں حنفیہ میں سے ان لوگوں کو داخل کیا ہے جو فروع میں امام ابوحنیفہ کی اتباع کرتے ہیں اور (غلط) دعویٰ کرتے ہیں کہ امام صاحب ان کے ہم عقیدہ ہیں، اس کے بعد امام صاحب کے اقوال میں سے اس قول کو نقل کیا ہے جس سے یہ گمراہ لوگ (امام صاحب سے عقیدہ میں اپنی موافقت پر) استدلال اور تمسک کرتے ہیں، یعنی امام ابوحنیفہ کہتے ہیں کہ ایمان نام اقرار کا ہے۔

اس تقریر سے شیخ جیلانیؒ پر وارد دونوں اعتراض پادرہوا ہوگئے اور واضح ہوگیا کہ شیخ جیلانیؒ نے امام ابوحنیفہؒ کو (عقیدہ مرجیئہ سے) متہم نہیں کیا ہے بلکہ انھوں نے اس کی نسبت ان مرجیئوں کی جانب کی ہے جو فروع میں اپنے آپ کو امام صاحب کی طرف منسوب کرتے ہیں، اور ان کے ظاہر اقوال سے اپنے فاسد عقیدہ پر تمسک کرتے ہیں اور امام صاحب کے اقوال کو غلط معنی پہناتے ہیں، والحمد للہ علی ما انعم باظہار الحق۔

روایت حدیث کی اجازت

آغاز تعلیم و تحصیل ہی سے حضرت شاہ صاحب کو علم حدیث سے قلبی تعلق تھا، چونکہ مدینہ طیبہ حدیث پاک کا منبع و مرکز ہے اس لئے آپ کا ارادہ ہوا کہ کسی عالی سند شیخ سے کتب حدیث کی روایت اور سند حاصل کی جائے (اس وقت) شیخ ابوطاہر کردی مدنی (جو ایک معمر اور جامع علوم صوفی و محدث تھے) سے عالی سند مشائخ حرمین میں سے کوئی نہیں تھا اس لئے شاہ صاحب ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنی طلب و خواہش کا اظہار کیا اور مکمل صحیح بخاری پچاس مجلسوں میں کچھ قرأۃً اور کچھ سماعاً پوری کرلی اور کامل مسند دارمی مسجد نبوی میں محراب عثمانی کے قریب آٹھ مجلسوں میں سماعاً پڑھی اور بقیہ کتب حدیث کے اوائل پڑھ کر اجازت لی، اثناء درس میں (کبھی کبھی) شیخ مشکل و غامض احادیث کے معانی کی تحقیق شاہ صاحب سے دریافت کرتے تو بلا تامل فوراً شاہ صاحب ایسی عمدہ تحقیق بیان کرتے کہ شیخ حیرت میں پڑجاتے کہ اس نوعمری میں یہ علوم و معارف کس طرح سے حاصل ہوگئے۔

ختم بخاری کے دن شیخ نے خوشی میں اپنی جانب سے دعوت کا اہتمام کیا اور اس موقع پر شیخ نے شاہ صاحب کی بیحد عزت افزائی اور توقیر فرمائی، آخر میں جب شاہ صاحب کے بعض اسرار باطنی ان پر ظاہر ہوگئے تو اس وقت سے شاہ صاحب کے عقیدت مند ہوگئے اور استاذ و شیخ ہوتے ہوئے شاہ صاحب کے ساتھ شاگردوں جیسا معاملہ فرماتے اور تصوف وغیرہ کے بعض اشکالات جو ان کے والد سے (حالانکہ وہ یکے از علماء محققین تھے) بھی حل نہ ہوسکے تھے شیخ صاحب نے ان کے حل وکشف کی فرمائش کی جنھیں شاہ صاحب نے تشفی بخش طور پر حل کردیا (شاہ صاحب کے ان علمی واحسانی کمالات کے مشاہدہ اور تجربہ کی بناء پر شیخ غایت درجہ شاہ صاحب کا اکرام کرتے تھے) اور جب شاہ صاحب شیخ کی خدمت میں حاضر ہوتے تو ان پر نظر پڑتے ہی سروقامت کھڑے ہوجاتے خود اپنے ہاتھ سے فرش درست کرکے تکیہ رکھتے اور پورے جذبۂ توقیر وتعظیم کے ساتھ شاہ صاحب کو بٹھاتے اور خود شاگردوں کی طرح سامنے بیٹھتے۔

اظہارِ تواضع واعترافِ کمال

آخر میں جب شاہ صاحب نے شیخ سے تحریری اجازت نامہ کی درخواست کی تو فرمایا کہ میں اس قابل نہیں ہوں کہ آپ کو اجازت نامہ تحریر کروں، میں نے تو خود آپ سے استفادہ کیا ہے، لیکن جب شاہ صاحب کی شدّت اشتیاق کو محسوس فرمایا تو اجازت نامہ تحریر فرمادیا اور اس میں بھی واضح طور پر اسی پہلی بات کا اعتراف واظہار فرمایا، چنانچہ اجازت نامہ میں رقم بعض اشعار جو اس بات کے مظہر ہیں درج کیے جاتے ہیں:

(١) اجزتك لكن مثلكم من يجيزني   ولم تستفد منّی ولكن تفيدني
(٢) واكثرما استفادني انت في غنى   عنه بل في جلّه انت فقتني
(٣) فكم حكمة منكم تلقنتها ولم   تستفد معسار ما قد افدتني
(٤) وما كنت اهلا ان اجيزك انما   دعوت فلبيت النداء اذ دعوتني(١)

---

(١) ان اشعار کی کتابت میں بے پناہ غلطیاں ہیں غور وفکر کے بعد صحیح نقل کرنے کی کوشش کی گئی ہے، واللہ اعلم وعلمہ اتم۔

ترجمہ: (۱) میں نے آپ کو اجازت دی لیکن آپ جیسے (صاحب کمال) تو وہ ہیں جو مجھے اجازت دیتے ہیں، آپ نے مجھ سے استفادہ نہیں کیا ہے بلکہ مجھے فائدہ پہنچایا ہے۔

(۲) اکثر وہ علوم وآداب جو آپ نے مجھ سے حاصل کئے ہیں آپ کو ان کی چنداں احتیاج نہیں بلکہ ان کے اکثر میں آپ مجھ پر فائق ہیں۔

(۳) بہت ساری حکمتیں ہیں جنھیں میں نے آپ سے سیکھیں، آپ نے اس کا دسواں حصہ بھی مجھ سے حاصل نہیں کیا جس قدر فائدہ آپ نے مجھے پہنچایا۔

(۴) میں آپ کو اجازت دینے کا اہل نہیں تھا، بات تو صرف اتنی ہے کہ آپ نے مجھ کو آواز دی تو میں نے آپ کی آواز پر لبیک کہا۔

مختلف سلاسل تصوف کی اجازت

شیخ ابوطاہر کردیؒ نے متعدد سلسلۂ تصوف یعنی شطاریہ، سہروردیہ، شاذلیہ، رفاعیہ، حدادیہ وغیرہ کی اجازت سے بھی شاہ صاحب کو مشرف فرمایا (ان جملہ سلاسل میں شیخ اپنے والد شیخ ابراہیم کردی قدس سرہ سے مجاز تھے، شیخ ابراہیم کردیؒ اپنے زمانہ کے مشاہیر صوفیا اور محدثین میں سے تھے) اور منبر نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے قریب اپنے ہاتھوں سے شاہ صاحب کو خرقہ کلاہ پہنایا۔

ایک رسالہ کی تالیف

(قیام مدینہ کے زمانہ میں ایک دن شاہ صاحب نے حضرت مجدد الف ثانی کے رسالہ رد روافض فارسی کا تذکرہ اپنے شیخ حدیث شیخ ابوطاہر جمال الدین محمد مدنی کردی کورانی سے کیا تو شیخ نے اس کی تعریب کا حکم دیا) چنانچہ شیخ کی حسب مرضی شاہ صاحب نے ترجمہ کر کے مزید فوائد کا اضافہ کر کے ایک رسالہ بنام المقدمه السنية فى الانتصار للفرقه السنية مرتب کر دیا، جس کی فصاحت وبلاغت کو دیکھ کر علماء عرب متحیر رہ گئے، شیخ نے وہ رسالہ کاتب حروف (شیخ محمد عاشق پھلتی) سے نقل کرا کر اپنے پاس رکھ لیا۔

شاہ صاحب کا ایک دوسرا رسالہ بنام "القول الجلیل فی بیان سواء السبیل" جو سلسلۂ قادریہ، نقشبندیہ اور چشتیہ کے اشغال کے بیان میں ہے، علاوہ ازیں شاہ صاحب کو اس زمانہ میں حضرت رسالت مآب ...... کی جانب سے جو اسرار و مشاہدات حاصل ہوئے تھے، اور شاہ صاحب نے انھیں قلم بند کر لیا تھا، یہ دونوں رسالے شیخ نے خود اپنے قلم سے نقل کر کے حضرت کو سنایا۔

مدینہ منورہ سے مکہ معظّمہ کو واپسی اور بوقت واپسی شیخ کا اکرام

جب شاہ صاحب شیخ سے رخصت ہو کر عازم مکہ معظّمہ ہوئے تو شیخ نے گھر سے نکل کر کافی دور تک مشایعت فرمائی، شیخ کے فرزند اور دیگر اعزہ تین کوس تک حضرت شاہ صاحب کے ہم رکاب رہے، راستے میں شاہ صاحب جب کسی جگہ (برائے استراحت) بیٹھتے تو یہ حضرات اپنے کپڑے حضرت کے پیر پر ڈال دیتے اور بوقت رخصت فیضِ صحبت سے محرومی پر اظہار تاسف کیا۔

مکہ معظّمہ میں دوبارہ حاضری

مدینہ منورہ سے چل کر ۱۵/ شعبان ۱۱۴۴ھ کو دوبارہ مکہ معظّمہ پہنچے، سب سے پہلے عمرہ فرمایا، ماہ رمضان میں بھی متعدد عمرے کئے اور ماہ رمضان کے اخیر عشرہ میں مسجد حرام میں بمواجہ بیت اللہ اعتکاف فرمایا، مکہ معظّمہ میں جب تک قیام رہا وہاں کے لوگ آپ سے فیوض ظاہری و باطنی حاصل کرتے رہے، اسی وقفہ قیام میں رسالہ فیوض الحرمین تالیف فرمایا اور حرمین شریفین میں جو حقائق و دقائق اور غوامض و اسرار منکشف ہوئے تھے سب اس رسالہ میں درج کیا۔

بعض تصانیف کی شہرت و مقبولیت

شاہ صاحب کے دو رسالے "القول الجلیل فی بیان سواء السبیل"

اور "المقدمة السنيّه فی الانتصار للفرقة السُنيه" حرمین شریفین میں خوب مشتہر ہوئے، القول الجلیل کو دیار مغرب اور بصرہ مصر، فلاّن وغیرہ کے علماء نقل کر کے لے گئے اور شاہ صاحب سے اس کی اجازت بھی لی، المقدمۃ السنیہ تا تارتک پہنچا، رسالہ فیوض الحرمین بھی بعض مخصوص حضرات کو عنایت ہوا۔

شاہ صاحب کی والدہ محترمہ کی وفات

مجاورت بیت اللہ کے زمانہ میں بندہ سے کئی بار فرمایا کہ جب کبھی گھر کی جانب توجہ ہوتی ہے تو یک گونہ غم واندوہ کی تیرگی اور خانگی انتظام میں انتشار کی کیفیت محسوس ہوتی (اس گفتگو پر) چند ہی دن گذرے تھے کہ شاہ صاحب کی والدہ ماجدہ کی وفات کی خبر پہنچی، اس موقع پر اکابر مکہ نے مراسم تعزیت ادا کئے، بعد میں شاہ صاحب نے فرمایا وہ تیرگی جو محسوس ہو رہی تھی اس کا سبب یہی (والدہ کی وفات) تھا۔

وطن کی واپسی

(چودہ ماہ حرمین شریفین میں گذار کر وہاں کے فیوض ظاہری وباطنی سے مالا مال ہو کر) وطن واپسی کا ارادہ ہوا، جہاز پر سوار ہوئے تو پھر بفضلہٖ تعالیٰ ہوا موافق وسازگار رہی، اور صرف ۲۳ دن میں جدہ سے چل کر بندر سورت پر پہنچ گئے، چند دن سورت میں قیام فرما کر براہ دکن سوئے وطن روانہ ہوئے، راہ میں جس شہر سے بھی گذر ہوا وہاں کے علماء ومشائخ نے نہایت گرم جوشی کے ساتھ آپ کا استقبال کیا۔

گوالیار پہنچے تو شیخ خانون اور شیخ محمد غوث قدس سرہما کے مزارات پر گئے، اور ایصال ثواب کیا، اسی طرح جب اکبرآباد پہنچے تو شیخ امیر ابوالعلاؒ کے مزار پر حاضر ہوئے اور ان کے برکات وحسنات کا تذکرہ فرمایا، وہاں سے چل کر ۱۴/ رجب ۱۱۳۵ھ کو باخیر وخوبی دارالخلافہ شاہ جہاں آباد (دہلی) میں شرف نزول فرمایا، وطن سے روانگی اور واپسی دونوں کی تاریخیں خود شاہ صاحب نے یوں نظم کی ہے۔

تاریخ روانگی:

زدہلی برآمد ولی بہر حج ☆ بہشتم صباح از ربیع دویم
ہزار وصد وچہل وسہ سال بود ☆ کہ ایں داعیہ گشت بافعل ضم

تاریخ واپسی:

ولی چوں پس از حج بدہلی رسیدہ ☆ سرآمد سفر منقطع گشت رنج
بتاریخ رابع عشر از رجب ☆ نہ سال ہزار وصد وچہل وپنج

آپ کے برادر خورد شاہ اہل اللہ دہلوی نے پہلے حج کی تاریخ یوں نظم کی ہے۔

بدل می داشتم عمرے کہ دراحرام حج کوشم
بحمداللہ والمنۃ بداں مقصد ہم آغوشم
زہاتف سال تاریخش نخستیں طوف می جستم
قبلت منک طاعاتک رسید از غیب درگوشم

☆ ☆ ☆

قافلۂ فضل وکمال یعنی
حضرت عارف باللہ مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی
صدر مدرس اوّل دار العلوم دیوبند کے
مشاہیر تلامذہ

مولانا کی مختصر سوانح

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب بن مولانا مملوک علی ۱۳؍صفر ۱۲۴۹ھ کو نانوتہ ضلع سہارنپور میں پیدا ہوئے۔ قرآن کریم وطن ہی میں حفظ کیا محرم ۱۲۶۰ھ میں حضرت مولانا مملوک علی انھیں اور حضرت حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہٗ کو بغرض تعلیم وتحصیل دہلی لے گئے۔ دہلی کالج اور گھر پر اپنے والد بزرگوار سے علوم وفنون کی تحصیل کی اور حدیث حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوری اور حضرت مولانا شاہ عبدالغنی مجدّدی رحمہما اللہ سے پڑھ کر سند فراغت حاصل کی۔ فراغت کے بعد بھی ایک سال تک دہلی میں قیام رہا بعد ازاں بمشاہرہ چالیس روپئے ماہانہ گورنمنٹ کالج اجمیر میں ملازمت کرلی اور ۵ سال تک وہاں رہے۔ اس کے بعد سہارنپور میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس کے عہدہ پر فائز ہوئے، لیکن انقلاب ۱۸۵۷÷ کی بنا پر جلد ہی اس عہدہ سے مستعفی ہوکر میرٹھ میں منشی ممتاز علی صاحب کے مطبع میں ملازمت کرلی۔ جب ۱۵؍محرم ۱۲۸۳ھ کو دار العلوم دیوبند قائم ہوا تو مولانا اس کے صدر مدرس مقرر ہوئے۔ مولانا دار العلوم کے سب سے پہلے صدر مدرس اور شیخ الحدیث تھے۔ ۱۹ سال تک یہ خدمت جلیلہ انجام دیتے رہے۔ اس مدّت میں تقریباً ۱۵۱ طلبہ نے آپ سے علوم دینیہ کی تحصیل کی۔

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ حضرت سید الطائفہ حاجی امداد اللہ مہاجر مکّی سے بیعت تھے اور سلوک و تصوف کی راہیں انھیں کی زیر نگرانی طے کیں — مولانا پر بالعموم جذب و کیف کی حالت طاری رہتی تھی۔ سراپا عجز و انکسار تھے۔ دنیا اور علائق دنیا سے کوئی تعلق نہیں رکھتے تھے۔

حضرت تھانوی قدس سرہٗ نے مولانا کے حلقۂ درس کی تصویر یوں کھینچی ہے۔

حلقہ درس کیا ہوتا تھا حلقۂ توجہ ہوتا تھا یہ حال تھا کہ تفسیر کا سبق ہو رہا ہے۔ آیت کا مطلب بیان کر رہے ہیں اور آنکھوں سے زار و قطار آنسو جاری ہیں۔" (اشرف السوانح ج۱ ص۳۳)

اسباق میں عجیب و غریب مضامین اور لطائف بیان ہوتے تھے حضرت تھانویؒ نے زیادہ تر علوم عجیبہ و غریبہ مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ ہی سے اخذ کئے تھے اور نہایت لطف لے لے کر انھیں مولانا کے حوالہ سے بیان کرتے تھے۔

۳/ ربیع الاوّل ۱۳۰۲ھ مطابق ۲۱/ دسمبر ۱۸۸۴ء کو بمرض ہیضہ وطن مالوف نانوتہ میں وفات ہوئی اور وہیں دفن ہوئے (۱)

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کے ۱۵۱ تلامذہ کی فہرست میں جن حضرات کے حالات اس وقت تک دستیاب ہو سکے ہیں۔ سن وفات کی ترتیب کے ساتھ ہدیۂ ناظرین ہیں۔ اور اہل علم و نظر سے گذارش ہے کہ اس سلسلے میں وہ اپنی معلومات سے ہمیں مستفید فرمائیں۔

(۱) حضرت مولانا فخر الحسنؒ گنگوہی

حضرت مولانا فخر الحسن صاحبؒ کا وطن گنگوہ تھا ۱۲۸۴ھ میں دار العلوم میں داخل ہوئے اور ۱۳۹۰ھ میں حضرت مولانا احمد حسن امروہیؒ کی رفاقت میں تکمیل کی۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کے علاوہ انھوں نے حضرت حجۃ الاسلام مولانا نانوتویؒ سے بطور خاص استفادہ کیا۔ اور بالعموم سفر و حضر میں حضرت کے ساتھ رہتے تھے۔ مناظرہ سے خاص دلچسپی تھی۔ تقریر دلچسپ اور شیریں ہوتی تھی مزاج میں ظرافت تھی اس کے باوجود حق گوئی کا

---

(۱) مولانا محمد احسن نانوتوی ص ۱۸۸، تاریخ دیوبند ص ۴۴۴۔

دامن ہاتھ سے کبھی نہ جانے دیتے تھے۔ حکیم محمود خاں سے دہلی میں طب کی تحصیل کی۔

تعلیم سے فراغت کے بعد خورجہ کے مدرسہ میں صدر مدرس مقرر ہوئے۔ پھر مدرسہ عبدالرب دہلی میں منتقل ہوگئے۔ آخر میں کانپور میں سکونت اختیار کرلی تھی وہیں ۱۳۱۵ھ میں وفات پائی۔

مولانا فخر الحسن صاحب مطب کے ساتھ تصنیف وتالیف کا مشغلہ بھی رکھتے تھے۔ مباحثہ شاہجہانپور کے علاوہ التعلیق المحمود حاشیہ سنن ابی داؤد، حاشیہ ابن ماجہ، حاشیہ تلخیص المفتاح آپ کی علمی یادگار ہیں۔ آپ نے حضرت حجۃ الاسلام مولانا نانوتویؒ کی ایک مفصّل سوانح حیات بھی لکھی تھی مگر وہ کانپور میں نذر آتش ہوگئی۔ (۱)

(۲) مولانا فتح محمّد تھانوی

قیام دارالعلوم کے پہلے سال ۱۲۸۳ھ میں دارالعلوم میں داخل ہوئے اور ۱۲۸۵ھ میں فارغ ہوئے۔ مولانا دارالعلوم میں تعلیم وتحصیل کے ساتھ تدریس کا خدمت بھی انجام دیتے تھے۔ دارالعلوم سے فراغت کے بعد اپنے وطن مالوف میں مدرسہ حوض والی مسجد میں مدرس مقرر ہوئے۔ مولانا فتح محمد فضلاء دارالعلوم کی ممتاز شخصیتوں میں شمار ہوتے ہیں علوم ظاہری کے ساتھ علوم باطنی سے بھی حظِّ وافر رکھتے تھے اور صاحب کشف وکرامات بزرگ تھے حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ جیسا یگانۂ روزگار عالم ومجدد آپ کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہے۔ حضرت مولانا شیخ محمد تھانویؒ کی شرح حزب البحر فارسی کا آپ نے سلیس اُردو میں ترجمہ کیا تھا۔ ۱۳۲۲ھ میں آپ کی وفات ہوئی۔ (۲)

(۳) مولانا امیر بازخاں مظفرنگری

۱۷؍جمادی الآخر ۱۲۵۸ھ کو بھوج پور ضلع مظفرنگر میں پیدا ہوئے ۱۲۸۳ھ کی ابتداء میں داخل ہوئے۔ سال اوّل میں شرح وقایہ، نورالانوار، مسلم شریف، میبذی، شرح عقائد نسفی، مقامات حریری اور سبعہ معلقہ کی تحصیل کی۔

---

(۱) تاریخ دارالعلوم ج ۲ ص ۱۸۸ مطبوعہ ساہیوال پاکستان، نزہۃ الخواطر ج ۸ ص ۳۵۴۔

(۲) نزہۃ الخواطر ج ۸ ص ۵۳

تعلیم کے ساتھ دار العلوم میں ابتدائی کتابوں کا درس بھی دیتے رہے۔

شیخ عبدالرحیم سہارنپوری خلیفہ شیخ عبدالغفور صواتی المعروف بہ اخوند صاحب سے بیعت کا شرف حاصل تھا استدراک الامیر من الاسرار اللطیف الخبیر کے نام سے اپنے مکاشفات کو جمع کیا تھا جو ہلالی پریس ساڈھورہ میں طبع ہوا ہے۔ جامعہ سہارنپور میں بحیثیت واعظ کے مولانا کا تقرر ہو گیا تھا۔ حضرت مولانا محمد مظہر صدر مدرس مظاہر علوم سہارنپور کے زمانۂ صدارت میں دو مرتبہ قائم مقام صدر مدرس کے فرائض بھی انجام دیئے۔ ۹/ربیع الآخر ۱۳۲۵ھ کو راہیٔ عالم جاودانی ہوئے۔(۱)

(۴) مولانا منفعت علی دیوبندی

مولانا منفعت علی بن بلند بخش دیوبندی کی ولادت اور نشو ونما دیوبند میں ہوئی ۱۲۸۴ھ میں دارالعلوم میں داخل ہوکر ۸/سال میں تمام علوم متداولہ کی تحصیل کر کے ۱۲۹۲ھ میں سند فراغ حاصل کی حضرت مولانا یعقوب نانوتوی کے علاوہ مولانا سیّد احمد دہلوی اور دیگر اساتذۂ دارالعلوم سے بھی تحصیل علم کی۔ فراغت کے بعد دارالعلوم ہی میں مدرس ہوگئے اور ۱۳۱۸ھ تک دارالعلوم میں تدریسی خدمات انجام دے کر مدرسہ فتح پوری دہلی میں چلے گئے پھر وہاں سے مدرسہ جامع العلوم کان پور میں منتقل ہوگئے۔ ہیئت، ہندسہ، حساب، فقہ اور فرائض میں کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ فن فرائض میں بزبان اُردو آپ کا ایک مفصل رسالہ ہے۔ ۷/ذیقعدہ ۱۳۲۷ھ کو کانپور میں فوت ہوئے۔(۲)

(۵) مولانا احمد حسن امروھوی

امروہہ کے مشہور خاندان سادات سے تعلق تھا۔ ۱۲۶۷ھ میں ولادت ہوئی۔ عربی کی ابتدائی تعلیم امروہہ ہی میں حاصل کی اور طب بھی امروہہ ہی میں حکیم امجد علی خاں سے پڑھی پھر دارالعلوم میں داخلہ لیا اور مولانا یعقوب صاحب وغیرہ اساتذۂ دارالعلوم کے علاوہ خصوصی طور پر حضرت حجۃ الاسلام مولانا نانوتویؒ سے بھی استفادہ کیا۔ درس وتقریر

---

(۱) نزہۃ الخواطر ج ۸ ص ۴۷ وتاریخ دارالعلوم ج ۲ ص ۱۸۴۔

(۲) نزہۃ الخواطر ج ۸ ص ۴۸۲ ومختصر تاریخ دارالعلوم ص ۱۰۸، تاریخ دارالعلوم ج ۲ ص ۱۸۴۔

میں حضرت نانوتوی کے علوم و معارف نہایت دلنشین انداز میں بیان کرتے تھے۔ فراغت کے بعد اوّلاً خورجہ کے مدرسہ میں درس دیا پھر سنبھل اور دہلی کے مختلف مدارس میں صدر مدرس رہے اور جب ۱۲۹۶ھ میں مدرسہ قاسمیہ شاہی مسجد مراد آباد قائم ہوا تو اس کے صدر مدرس مقرر ہوئے۔ ۱۳۰۳ھ میں مدرسہ شاہی سے الگ ہوکر اپنے وطن امروہہ کے ایک قدیم مدرسہ جامع مسجد امروہہ کی نشأۃ ثانیہ کی اور اس سے اس درجہ تعلق خاطر ہوا کہ مرنے کے بعد بھی اس سے جدا نہیں ہوئے (۱)

مولانا امروہی کی درسی تقریر نہایت جامع، سلیس اور پُر مغز ہوتی تھی۔ قاسمی علوم کے امین اور مجسم تصویر تھے۔ سینکڑوں تشنگانِ علوم نبوی آپ کے چشمۂ علم سے سیراب ہوئے۔ مولانا امروہی کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ علم الادیان کے ساتھ علم الابدان کی بھی تعلیم دیتے تھے۔ یوں تو مولانا تمام علوم مروجہ میں کامل مہارت رکھتے تھے لیکن حدیث، تفسیر اور فقہ کی جانب رجحان طبع زیادہ تھا۔ ۱۳۲۹ھ میں مؤتمر الانصار (تنظیم فضلاء قدیم دارالعلوم) کا جو پہلا جلسہ مراد آباد میں ہوا وہ مولانا امروہوی ہی کی صدارت میں ہوا تھا۔

۲۸/ربیع الاوّل ۱۳۳۰ھ کی درمیانی شب میں بمرض طاعون انتقال فرمایا اور اپنے لگائے ہوئے چمنستانِ علم مدرسہ جامع امروہہ کے صحن کے جنوبی گوشے میں آسودۂ خواب ہیں۔ حضرت مولانا امروہیؒ کے قلمی آثار میں صرف مضامین کا مجموعہ افادات احمدی کے نام سے شائع ہوسکا ہے بقیہ تصانیف زیورِ طبع سے آراستہ نہ ہوسکیں۔

(۶) مولانا احمد ہزاروی

حضرت مولانا احمد بن مولانا عبداللہ بن شاہ ولی کالنجر تحصیل ہری پور ضلع ہزارہ میں پیدا ہوئے تاریخ پیدائش کا علم باوجود تلاش و جستجو کے نہ ہوسکا۔ درس نظامی کی اکثر کتابیں اپنے والد بزرگوار سے پڑھیں۔ اعلیٰ تعلیم کیلئے دیوبند حاضر ہوئے اور یہاں داخلہ لے کر ۱۲۹۷ھ میں حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی و دیگر اساتذۂ دارالعلوم سے دورۂ حدیث پڑھ کر سند فراغت حاصل کی۔ مسجد چھتہ میں حضرت حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم

---

(۱) نزہۃ الخواطر ۸ص ۴۱، تاریخ دارالعلوم دیوبند ج ۲ص ۱۸۹۔

صاحب نانوتوی صاحب سے بھی قدرے استفادہ کیا۔ ۱۷؍شوال ۱۲۹۸ھ کو حضرت مفتی اعظم مولانا عزیز الرحمٰن عثمانی دیوبندیؒ کے ساتھ آپ کی دستار بندی ہوئی۔

اساتذۂ دارالعلوم کے علاوہ مولانا احمد صاحب نے حضرت مولانا عبدالحئیؒ فرنگی محلی سے بھی کسبِ فیض کیا۔ تعلیم و تحصیل سے فراغت کے بعد تدریسی مشغلہ شروع کیا اوّلاً دارالعلوم دیوبند میں تقریباً چھ سال درس دیا، اس کے بعد وطن مالوف کی جانب مراجعت کی اور سکندر پور ضلع ہزارہ میں احمد المدارس کے نام سے ایک مدرسہ کی بنیاد رکھی اور تامدّت العمر اپنے لگائے اسی چمنستانِ علم کی آبیاری کرتے رہے ہزارہ کے اکثر قدیم علماء آپ کے شاگردوں میں شامل ہیں۔

۱۷؍صفر المظفر ۱۳۳۱ھ یوم یکشنبہ کو آپ کا وصال ہوا۔ اولاد میں ایک فرزند مولانا عبدالسلام صاحب اور تین صاحبزادیاں چھوڑیں(۱)

(۷) مولانا محمد مراد فاروقی مظفر نگری

حضرت مولانا محمد مراد فاروقیؒ ۱۲۶۲ھ/ ۱۸۴۵ء میں پاک پٹن کے ایک قریبی گاؤں امب میں پیدا ہوئے سلسلۂ نسب اٹھارہویں پشت میں حضرت خواجہ فریدالدین گنج شکرؒ سے مل جاتا ہے۔ عمر کے ابھی صرف چار سال گذرے تھے کہ والد کے سایۂ عاطفت سے محروم ہوگئے، ماموں نے یتیم بھانجے کو ان کی والدہ کے ساتھ اپنے گھر لے جاکر اپنی نگرانی اور کفالت میں رکھا۔ سن شعور کو پہنچے تو ایک دن تعلیم کی جانب سے بے توجہی پر ماموں کی سرزنش سے دلگیر ہوکر چپکے سے لاہور چلے آئے اور وہیں اُردو اور فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ پھر یہاں سے دہلی پہنچے اور حافظ غلام رسول ویراں سے عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ بعد ازاں علی گڈھ جاکر حضرت مولانا مفتی لطف اللہ صاحب کے حلقۂ درس میں شامل ہوگئے۔ پھر رام پور جاکر مولانا ارشاد حسین مجدّدیؒ سے بھی بعض کتابوں کی تحصیل کی۔ آخر میں دارالعلوم آئے اور یہاں پانچ سال رہ کر علوم مروجہ کی تکمیل کرکے ۱۲۸۸ھ میں فارغ التحصیل ہوئے۔

---

(۱) مشاہیر علماء دیوبند ص ۳۲ ج ۲ و نزہۃ الخواطر ص ۳۸ ج ۸۔

مولانا محمد مراد صاحب اپنی خداداد ذہانت وصلاحیت کی بنا پر اپنے معاصرین میں امتیازی حیثیت کے مالک تھے۔ حضرت حجۃ الاسلام مولانا نانوتویؒ سے بیعت وخلافت سے بھی مشرف تھے۔ ۱۲۹۴ھ میں جب جامع مسجد حوض والی مظفرنگر میں مدرسہ کا قیام عمل میں آیا تو آپ اس کے صدر مدرس منتخب ہوئے۔ اور اپنی پوری زندگی مدرسہ کی ترقی اور سربلندی کے لئے وقف کردی اور تقریباً ۴۰ سال تک مسلسل اسی مدرسہ میں درس وتدریس اور طلبہ کی تعلیم وتربیت میں گذار کر ۳/ رجب ۱۳۳۲ھ کو عین جمعہ کی اذان کے وقت راہی ملک بقاء ہوئے۔ (۱)

(۸) مولانا سیّد محمد عِرفان ٹونکی

مولانا سیّد محمد عرفان بن یوسف بن یعقوب بن ابراہیم حسنی بریلوی ثم ٹونکی امام المجاہدین سیّد احمد شہید بریلویؒ کے نواسے تھے۔ ۱۲۶۵ھ میں آپ کی ولادت ہوئی ابتدائی کتابیں اپنے دیار کے علماء مولانا عبدالغفور شیخ عبدالملک، شیخ عبدالمالک، اور قاضی امام الدین وغیرہ سے پڑھیں۔ پھر دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا اور حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن اور حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ کے حلقۂ درس میں شامل ہوکر اکتساب فیض کیا حدیث کی تحصیل مولانا مفتی عبدالقیوم بن عبدالحئ بڑھانوی سے کی — مولانا عامل بالحدیث تھے۔ لایعنی باتوں سے کلیتہً احتراز کرتے تھے۔ تلاوتِ قرآن حکیم سے خاص شغف تھا، ذی الحجہ ۱۳۳۲ھ میں وفات پائی (۲)

(۹) مولانا منصور علی خاں مرادآبادی

حضرت مولانا منصور علی بن مولانا حسن علی بن مولوی عبداللہ بن امان اللہ خاں مرادآبادی ہندوستان کے مشہور علماء میں سے تھے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی کے زمانہ صدارت ۱۲۹۵ھ میں دارالعلوم سے فراغت حاصل کی۔ دارالعلوم دیوبند کے علاوہ ایک عرصہ تک حضرت حجۃ الاسلام مولانا نانوتویؒ کے ساتھ سفر وحضر میں رہ کر

---

(۱) تاریخ دارالعلوم دیوبند ج ۲ ص ۱۸۶۔

(۲) مشاہیر دیوبند ص ۵۴۰، ج ۲۔

اکتساب فیض کرتے رہے۔ مولانا کا شمار حضرت نانوتویؒ کے مخصوص تلامذہ میں ہوتا ہے۔ حضرت مولانا احمد علی محدّث سہارنپوری سے بھی حدیث کی تعلیم حاصل کی تھی۔

تعلیم وتحصیل سے فراغت کے بعد جامعہ طبیہ حیدرآباد میں تدریس کی خدمت پر مامور ہوئے اور ایک مدّت تک نہایت حسن وخوبی سے اس خدمت کو انجام دیا۔ آخر میں مکہ معظّمہ ہجرت کر کے چلے گئے تھے اور وہیں ۱۳۳۷ھ میں وفات پائی۔ قلمی آثار میں مذہب منصور ۲ جلدیں، فتح المبین اور معیار الادویہ آپ کی یادگار ہیں۔ (۱)

(۱۰) حضرت شیخ الهند مولانا محمود حسن دیوبندی

حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن بن مولانا ذوالفقار علی دیوبندی قدس سرّہما کی ولادت ۱۲۶۸ھ/ ۱۸۱۵ء میں بریلی میں ہوئی۔ یہاں آپ کے والد ماجد سرکاری محکمہ تعلیم سے وابستہ تھے۔ چھ برس کی عمر سے تعلیم وتحصیل کی ابتداء ہوئی۔ میاں جی منگلوری، اور میاں جی عبداللطیف سے قرآن پاک اور فارسی کی کتابیں پڑھ کر اپنے چچا اور دیوبند کے مشہور معلّم مولانا مہتاب علیؒ کے حلقۂ درس میں شامل ہوگئے۔ ۱۵ر محرم ۱۲۸۳ھ کو جب دارالعلوم دیوبند کا قیام عمل میں آیا تو دارالعلوم میں داخل ہوگئے اور تین سال دارالعلوم میں رہ کر ملاّ محمود اور مولانا یعقوب نانوتوی سے فقہ، اصول فقہ، ادب، بلاغت، منطق، فلسفہ وغیرہ پڑھ کر ۱۲۸۶ھ میں صحاح ستّہ اور بعض دیگر کتابیں حضرت حجۃ الاسلام مولانا نانوتویؒ سے شروع کیں اور سفر وحضر میں ان کے ساتھ رہ کر دو سال میں تعلیم کو مکمل کیا۔

زمانۂ تعلیم ہی سے حضرت شیخ الہندؒ کا شمار حضرت نانوتوی کے ممتاز تلامذہ میں ہونے لگا تھا۔ چنانچہ ان کی اعلیٰ علمی وفکری صلاحیتوں کے پیش نظر ۱۲۹۱ھ میں مدرس چہارم کی حیثیت سے دارالعلوم میں آپ کا تقرر ہوگیا اور بتدریج ترقی کر کے ۱۳۰۸ھ میں شیخ الحدیث وصدارت تدریس کے منصب پر فائز ہوئے اور مسلسل ۱۳۳۳ھ تک حدیث نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیم کی تدریس وترویج کی مبارک خدمت انجام دی اس مدّت میں ۸۶۰ طلبہ نے آپ سے حدیث کی تحصیل کر کے سند واجازت حاصل کی۔

---

(۱) تاریخ دارالعلوم ص ۱۹۰ ج ۲ ومشاہیر دیوبند ص ۱۰۳، ج ۱۔

حضرت شیخ الہند کو تدریس سے انتہائی شغف تھا۔ صحت وسہولت سے بے نیاز ہوکر نہایت جانفشانی اور تندہی کے ساتھ درس وافادہ میں مصروف رہتے تھے اور حلقہ درس کیا ہوتا تھا سلف صالحین واکابر محدثین کا نمونہ ہوتا تھا۔

چونکہ ہوش سنبھالتے ہی آپ اس تحریک سے وابستہ ہوگئے تھے جس کی ضرورت کا احساس ۱۸۵۷ء کی جنگ شاملی کے بعد اکابر دیوبند کے قلوب میں منجانب اللہ پیدا ہو چکا تھا اور جس کا مظہر اتم دارالعلوم دیوبند کی صورت میں منصۂ شہود پر جلوہ آرا ہوا تھا۔ اس لئے انھیں تعلیم وتدریس کی مصروفیات کے ساتھ تحریک احیاء ملت کی قیادت کے فرائض بھی انجام دینے پڑتے تھے جس کے لئے کبھی آپ نے ثمرۃ التربیت قائم کی اور کبھی اپنے شاگرد رشید مولانا عبیداللہ سندھی کے ذریعہ جمعیۃ الانصار کی داغ بیل ڈالی۔ اور کبھی تحریک ریشمی رومال کے ذریعہ سامراجی طاقتوں کی صف میں ہلچل مچادی۔ یہ سرگرمیاں اس قدر دقت طلب بنیں کہ حضرت شیخ الہندؒ اطمینان ویکسوئی کے ساتھ تصنیف وتالیف کی طرف متوجہ نہ ہوسکے پھر بھی سیکڑوں تلامذہ اور یادگار زمانہ ملّی وسیاسی خدمات کے علاوہ تقریباً ایک درجن تالیفات بھی اپنی یادگار چھوڑیں جو یہ ہیں۔

(۱) ادلۂ کاملہ (۲) ایضاح الادلّہ (۳) احسن القریٰ (۴) الجہد المقل (۵) افاداتِ محمودیہ (۶) الابواب والتراجم (۷) کلیات شیخ الہند (۸) حاشیہ مختصر المعانی (۹) تصحیح ابی داؤد شریف (۱۰) ترجمہ قرآن پاک وحواشی (۱۱) تقریر ترمذی (۱۲) فتاویٰ[۱]

(۱۱) مولانا ناظر حسن دیوبندی

مولانا ناظر حسن ابن امیر بخش بن ظہور عالم دیوبندی اپنے عہد کے مشہور علماء میں سے تھے۔ آپ کی ولادت اور نشو ونما دیوبند میں ہوئی دارالعلوم کے اساتذہ مولانا محمد یعقوب وغیرہ سے پڑھ کر ۱۲۹۶ھ میں سند فراغت حاصل کی۔ دارالعلوم کے علاوہ حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوری سے بھی کسب فیض کیا۔ تعلیم وتحصیل سے فراغت کے بعد مدرسہ عالیہ کلکتہ

---

(۱) حضرت شیخ الہند کے تفصیلی حالات کے لئے دیکھئے حیات شیخ الہند، شیخ الہند حیات وکارنامے، اسیرانِ مالٹا، علماءِ حق وغیرہ۔

میں ایک مدّت تک تدریسی خدمات انجام دیں اس کے بعد ۱۳۳۸ھ میں ڈھاکہ یونیورسٹی میں آپ کا تقرر ہوا اور چند سال وہاں پڑھانے کے بعد مدرسہ عالیہ ڈھاکہ کے پرنسپل مقرر ہوئے ڈھاکہ ہی میں ۱۳۴۱ھ میں آپ کی وفات ہوئی۔ تصانیف میں الفرقان فی قرأۃ ام القرآن اور کشف انعطاء عن مسئلۃ الربوٰ، آپ کی علمی یادگار ہیں۔(۱)

(۱۲) مولانا عبدالحق پور قاضوی

پور قاضی مظفرنگر کے شمال میں شرفاء کی ایک قدیم بستی ہے وہیں تقریباً ۱۲۵۸ھ میں مولانا کی ولادت ہوئی ۱۲۸۳ھ میں دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے اور تین سال یہاں زیرِ تعلیم رہ کر ۱۲۸۶ھ میں فراغت حاصل کی ۱۲۹۰ھ میں دارالعلوم کے سب سے پہلے جلسۂ دستار بندی میں حضرت شیخ الہند وغیرہ ممتاز فضلاء کے ساتھ آپ کی دستار بندی ہوئی۔ فراغتِ تعلیم کے بعد ریاست رتلام میں کاؤنٹینٹ جنرل مقرر ہوئے اور تا دمِ واپسیں اسی عہدے پر فائز رہے۔ مولانا والیٔ ریاست کی نظر میں ہمیشہ معتمد اور قابل ستائش رہے، علماء سلف کا نمونہ تھے۔ آپ کی چھوٹی صاحبزادی کی شادی مولانا عبداللطیف صاحب سابق ناظم مظاہر علوم سہارنپور سے ہوئی تھی۔ صاحبزادی صاحبہ کو مولانا نے جو قیمتی نصیحتیں لکھ کر دی تھیں انھیں بعد میں حضرت حکیم الامت مولانا تھانویؒ نے بہترین ''جہیز'' کے نام سے اپنی مشہور تالیف ''بہشتی زیور'' میں شائع فرمادیا۔ ۸/صفر ۱۳۴۲ھ/۱۹۲۳ء کو رتلام میں وفات پائی(۲)

(۱۳) مولانا عبداللہ انبیٹھوی

مولانا عبداللہ صاحب انبیٹھہ ضلع سہارنپور کے باشندہ تھے تاریخ پیدائش معلوم نہ ہوسکی ۱۲۸۵ھ میں دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا۔ اور اپنے وقت کے جلیل القدر عالم حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب قدس سرہ وغیرہ سے پڑھ کر ۱۲۸۵ھ میں فارغ التحصیل ہوئے۔ فراغت کے بعد ایک مدت تک سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی قدس

---

(۱) نزہۃ الخواطر ج ۸ ص ۴۹۱۔

(۲) تاریخ دارالعلوم ص ۱۸۵، ج ۲۔

سرہ کی خدمت میں رہ کر روحانی فیوض وبرکات حاصل کیئے اور خلافت پائی۔

قصبہ گلاوٹھی ضلع بلند شہر میں جب منشی مہربان علی مرحوم نے مدرسہ منبع العلوم قائم کیا تو اس کے صدر مدرس منتخب ہوئے پھر ۱۳۱۱ھ میں سرسید مرحوم نے انھیں ایم، اے، او کالج (مسلم یونیورسٹی) میں کام کرنے کی دعوت دی جہاں وہ آخر عمر تک ناظم دینیات کی حیثیت سے تدریسی خدمات انجام دیتے رہے۔ مولانا کا صحیح سن وفات معلوم نہیں۔ البتہ اتنی بات یقینی ہے کہ ۱۳۴۴ھ سے پہلے آپ کی وفات ہوچکی تھی۔ حضرت مولانا عبدالحئ حسنیؒ نے نزہۃ الخواطر میں جو سن وفات تحریر فرمایا ہے وہ درست نہیں ہے۔ اپنے آبائی قبرستان انبیٹھہ میں آسودۂ خواب ہیں حضرت حجۃ الاسلام مولانا نانوتویؒ کی بڑی صاحبزادی اکرام النساء انھیں سے منسوب تھیں۔(۱)

(۱۴) مولانا حکیم محمد حسن دیوبندی

مولانا حکیم محمد حسن بن ذوالفقار علی دیوبندی حضرت شیخ الہندؒ کے برادر خورد تھے شروع سے آخر تک جملہ تعلیم دارالعلوم دیوبند میں حاصل کر کے حضرت مولانا یعقوب صاحب کے زمانۂ صدارت ۱۲۹۶ھ میں فراغت پائی۔ دینیات کی تحصیل کے بعد دہلی جا کر حکیم عبدالحمید خاں صاحب سے طب وحکمت کی تعلیم حاصل کی۔ حضرت گنگوہیؒ سے بیعت کا بھی شرف حاصل تھا۔ ۱۳۰۲ھ میں بحیثیت مدرس عربی وطبیب آپ کا دارالعلوم میں تقرر ہوا۔ اور طب کی تعلیم کے ساتھ تفسیر وحدیث وغیرہ کی اعلیٰ کتابیں بھی پڑھاتے تھے۔ دارالعلوم میں ۴۳ سال تک علمی وطبی خدمات انجام دینے کے بعد ۱۵؍ربیع الاوّل ۱۳۴۵ھ کو سفر آخرت فرمایا۔

(۱۵) حضرت مولانا خلیل احمد محدث سہارنپوری

حضرت الحاج الحافظ المحدث مولانا خلیل احمد قدس سرہ کا آبائی وطن انبیٹھہ تھا جو ضلع سہارنپور کا ایک تاریخی قصبہ ہے اور سہارنپور کے جنوب میں گنگوہ جانے والی سڑک پر واقع ہے ۱۲۶۹ھ/۱۵۵۲ء میں آپ کی ولادت ہوئی پانچ سال کی عمر میں اپنے نانا حضرت

---

(۱) تاریخ دارالعلوم ۸۶/ ۱۸۵، ج۲۔

استاذ الکل مولانا مملوک علی سے بسم اللہ کی۔ قرآن مجید اور فارسی کی تعلیم وطن انبیٹھہ اور نانیہال نانوتہ میں پائی۔ صرف ونحو کی ابتدائی کتابیں اپنے چچا مولانا انصار علی سے گوالیار میں پڑھیں پھر یہاں سے واپس آکر مولانا سخاوت علی انبیٹھوی سے کافیہ تک نصاب مروجہ کی تحصیل کی بعد ازاں ۱۲۸۵ھ میں دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوگئے۔ چنانچہ حضرت مولانا کو دارالعلوم دیوبند سے جو سند دی گئی ہے اس میں ہے۔

> ”مولانا خلیل احمد ساکن انبیٹھہ نبیہ جناب مولانا مملوک علی صاحب مرحوم ۱۲۸۵ھ میں اس مدرسہ میں داخل ہوئے اس وقت کافیہ پڑھتے تھے قریب ایک سال کے عرصہ میں کتب مفصّلہ ذیل تحصیل کیں، کافیہ، شرح ملا جامی، ایساغوجی، قال اقول، میزان منطق، مرقات، شرح تہذیب بعد اس کے بضرورت قرب وطن مدرسہ سہارنپور میں کتب درسیہ، حدیث، فقہ، تفسیر واصول وعقائد معانی ومنطق تکمیل کو پہنچائیں آخر ۱۲۸۹ھ میں پھر اسی مدرسہ میں آکر رسالہ میر زاہد شمس بازغہ، مقاماتِ حریری، دیوان متنبّی، حماسہ، وتاریخ یمنی میں کچھ پڑھا، استعداد درست اور ذہن وذکا خوب اور مناسب ہے۔ اخلاق واوضاع پسندیدہ اور مزاج سنجیدہ ہے الخ (۲۳؍جمادی الثانی ۱۲۸۹ھ)

تحصیل علوم سے فراغت کے بعد درس وافاضہ کی بزم سجائی اور منگلور، بھوپال، سکندرآباد، بھاول پور، بریلی، دارالعلوم دیوبند میں تدریسی خدمات انجام دینے کے بعد اپنے شیخ ومرشد قطب ارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کے ایماء پر مظاہر علوم سہارنپور تشریف لائے اور صدارتِ تدریس کے منصب پر فائز رہتے ہوئے پورے ۳۱ سال تدریس وتصنیف کے ذریعہ علوم دینیہ بالخصوص حدیث پاک کی گرانقدر خدمات انجام دیں۔

اس ۳۱ سالہ مدت میں ۳۹۱ طلبہ نے آپ سے حدیث کا درس لے کر سند واجازت حاصل کی جن میں مولانا عبدالرحمٰن صاحبؒ سابق صدر مدرس مظاہر علوم، مولانا عبداللطیف صاحب سابق ناظم مظاہر علوم، حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی، مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی، مولانا اشفاق الرحمٰن صاحب کاندھلوی وغیرہ

خاص شہرت و اہمیت کے حامل ہیں۔

محدث سہارنپوری کا حافظہ نہایت قوی تھا ہزاروں حدیثیں مع سند کے آپ کو زبانی یاد تھیں درس میں کسی مسئلہ سے متعلق تمام علمی و مذہبی معلومات اپنے حافظہ سے فراہم کر دیا کرتے تھے۔

علوم ظاہری کے ساتھ علوم باطن میں بھی آپ کو کامل دستگاہ حاصل تھی سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی اور حضرت قطب ارشاد مولانا گنگوہی دونوں اکابر سے خلافت و اجازت سے مشرف تھے۔ اور طالبین کی تزکیہ و تلقین میں مہارتِ تامّہ حاصل تھی۔ ان خدمات کے ساتھ تصنیف، تالیف کا بھی نہایت ستھرا ذوق رکھتے تھے۔ اور وقت کے اہم مسائل پر متعدد رسائل اور کتابیں تصنیف فرمائیں۔ جن کی فہرست یہ ہے۔

(۱) ہدایات الرشید فی افہام العنید (۲) مطرقۃ الکرامہ علی مرأۃ الامامہ (دو حصے) (۳) تنشیط الآذان فی تحقیق محل الاذان (۴) المہند علی المفند (۵) براہین قاطعہ علی ظلام الانوار الساطعہ (۶) اتمام النعم (۷) بذل المجہود فی شرح سنن ابی داؤد، محدث سہارنپوری کی یہ وہ شہرہ آفاق تصنیف ہے جس کی ابتداء ہندوستان میں ہوئی تھی۔ اور تکمیل حدیث کے منبع و مرکز مدینۃ الرسول علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں ہوئی۔ پوری کتاب پانچ جلدوں میں ہے جن کے صفحات ۱۹۳۸ ہیں۔ اس ضخیم کتاب کے اب تک تین ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں جس سے اس کی مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

آپ آخر عمر میں ہجرت کر کے مدینہ منورہ چلے گئے تھے اور تقریباً دو سال جوار رسول ...... میں رہ کر ۱۵/ربیع الثانی ۱۳۴۶ھ کو دار دنیا سے دار آخرت کو رحلت فرمایا اور دیرینہ خواہش کے مطابق جنت البقیع میں دفن کئے گئے (۱)

(۱۶) مولانا عبدالقدیر دیوبندی

مولانا عبدالقدیر صاحب کی ولادت اور نشو و نما دیوبند میں ہوئی۔ دیوبند کے مشہور

---

(۱) علماء دیوبند اور علم حدیث و تاریخ دار العلوم دیوبند ج ۲ ص ۱۸۶ وغیرہ تفصیلی حالات کے لئے تذکرۃ الخلیل ملاحظہ ہو۔

بزرگ حضرت شاہ رمزالدین متوفی ۱۱۲۲ھ کی اولاد میں سے تھے۔ ۱۲۸۷ھ میں بغرض تعلیم دارالعلوم میں داخلہ لیا اور حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی، حضرت مولانا سید احمد دہلوی، حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی وغیرہ اساتذہ دارالعلوم سے تعلیم حاصل کر کے ۱۲۹۳ھ میں فارغ ہوئے۔ پھر علم حدیث میں اختصار پیدا کرنے کی غرض سے مظاہر علوم پہنچے اور حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوری کے حلقہ درس میں شامل ہوگئے۔ سہارنپور میں آپ کے رفقاء درس میں حضرت مولانا منصور علی مرادآبادی اور حضرت مولانا محمد علی مونگیری خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

مولانا عبدالقدیر صاحب کی پوری زندگی دین اور علوم دین کی خدمات میں گذری۔ ۱۳۰۷ھ سے ۱۳۰۹ھ تک آپ دارالعلوم دیوبند کے نائب مہتمم بھی رہے۔ آخر میں منشی نولکشور لکھنؤ کے مطبع سے متعلق ہوگئے تھے جہاں کتابوں کے ایڈیٹ کرنے کے ساتھ عربی وفارسی کی اہم کتابوں کے ترجمہ کا کام بھی کرتے تھے۔ چنانچہ علم الحیوانات میں علامہ کمال الدین دمیری کی مشہور تالیف حیات الحیوان کا دوجلدوں میں ترجمہ اسی زمانہ کی آپ کی علمی یادگار ہے۔ لکھنؤ ہی کے قیام میں پیمانۂ عمر لبریز ہوگیا اور ۱۳۴۷ھ/ 1918ء میں راہئ ملک بقا ہوئے (۱)

(۱۷) مولانا عبدالمؤمن دیوبندی

قصبۂ دیوبند کے مشہور علمی خاندان شیوخ عثمانی کے رکن رکین اور حضرت شیخ الہند قدس سرہ کے برادر نسبتی تھے۔ ۱۲۹۲ھ میں دارالعلوم میں داخل ہوئے اور ۹ سال زیر تعلیم رہ کر ۱۲۹۹ھ میں حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی سے دورۂ حدیث پڑھا اور سند واجازت حاصل کی، چوتھے جلسۂ دستار بندی ۱۳۰۱ھ کے موقع پر حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی کے ساتھ حضرت قطب الارشاد مولانا گنگوہی کے دست مبارک سے آپ کو دستار فضیلت حاصل ہوئی۔

تعلیم وتحصیل سے فراغت کے بعد اہل میرٹھ کی طلب پر آپ میرٹھ تشریف لے گئے

---

(۱) تاریخ دارالعلوم ج ۲ص ۱۸۸ ونیادور کا منشی نول کشور نمبر۔

پھر یہ سرزمین اتنی پسند آئی کہ پوری زندگی وہیں گذار دی۔ کچھ دنوں مدرسہ قومیہ میں صدارت تدریس کے فرائض انجام دے کر دارالعلوم صدر میرٹھ کی مسند صدارت کو زینت بخشی۔

مولانا عبدالمومن صاحب مرحوم بڑے ذکی، ذہین اور وسیع النظر عالم تھے، تفسیر وحدیث اور فقہ کی اکثر کتابیں آپ کو ازبر تھیں۔ اپنے استاذ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب قدس سرہ کے طرز پر درس کی تقریر مختصر مگر جامع اور دلنشیں فرماتے تھے۔ بایں ہمہ جلالت علمی زندگی نہایت متوکلانہ گذارتے تھے، سلوک وتصوف میں بھی مولانا کو درجۂ کمال حاصل تھا۔

میرٹھ میں آپ سے علمی فیض خوب جاری ہوا، حضرت مولانا عاشق الٰہی میرٹھی مشہور عالم ومصنف نے از اوّل تا آخر مولانا عبدالمومن ہی سے اکتساب کیا تھا۔ حضرت شیخ الادب مولانا اعزاز علیؒ اور مولانا سراج احمد میرٹھی بھی آپ ہی کے شاگرد تھے۔ مولانا قاضی زین العابدین صاحب سجاد میرٹھی ناظم اعلیٰ عالمی مؤتمر ابناء قدیم دارالعلوم دیوبند کو بھی مولانا مرحوم سے شرف تلمذ حاصل ہے۔ ۱۳۴۷ھ میں دہلی میں جہاں بغرض علاج مقیم تھے وفات پائی اور درگاہ حضرت خواجہ باقی باللہ میں دفن ہوئے۔

(۱۸) مولانا مفتی عزیزالرحمن عثمانی

حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی بن حضرت مولانا فضل الرحمٰن دیوبندی ۱۲۷۵ھ میں دیوبند میں پیدا ہوئے ۹ رسال کی عمر میں دارالعلوم کے شعبہ تحفیظ القرآن میں داخل ہوکر حفظ کا آغاز کیا جس سے ۱۲۸۷ھ کو فراغت ہوئی اس کے بعد اُردو، فارسی وغیرہ کی تحصیل کر کے عربی تعلیم شروع کی اور از ابتداء تا انتہا دارالعلوم میں پڑھ کر ۱۲۹۵ھ میں فارغ التحصیل ہوئے۔ اساتذہ میں حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب صدر مدرس، حضرت مولانا سید احمد دہلوی، حضرت شیخ الہند اور حضرت مولانا عبدالعلی رحمہم اللہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ۱۲۹۸ھ کے جلسۂ دستار بندی میں حضرت قطب ارشاد مولانا گنگوہیؒ نے دستار فضیلت سے مشرف کیا۔

تحصیل علم سے فراغت کے بعد مادر علمی دارالعلوم میں معین مدرس مقرر ہوگئے اور

اسی کے ساتھ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کی نگرانی میں فتویٰ نویسی کی خدمت بھی انجام دیتے تھے دارالعلوم میں چند ماہ قیام کے بعد حضرات اساتذہ کی تجویز پر مدرسہ اسلامیہ اندرکوٹ ضلع میرٹھ تشریف لے گئے اور کئی سال تک وہاں تدریسی خدمات انجام دیں، ۱۳۰۹ھ میں دوبارہ دارالعلوم آئے اور نیابت اہتمام کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ ایک سال تک کارہائے نیابت انجام دینے کے بعد آپ کو شعبۂ تدریس میں لے لیا گیا اور اسی کے ساتھ افتاء کی ذمہ داری بھی آپ ہی سے متعلق تھی۔ اس وقت سے مسلسل ۱۳۴۷ھ تک دارالعلوم میں رہ کر درس وافتاء کی خدمات انجام دیتے رہے۔

حضرت مفتی صاحب کو فتوی نویسی میں بڑا اکمال حاصل تھا۔ بڑے بڑے معرکتہ الآراء، سوالوں کا جواب قلم برداشتہ لکھ دیا کرتے تھے۔ سفر میں بھی دارالافتاء کی ڈاک ساتھ رکھتے تھے اور بلا مراجعت کتب محض اپنی حذاقت ومہارت پر بے تکلف فتاویٰ تحریر فرماتے رہتے تھے۔ آپ کے فتاویٰ کی زبان نہایت سلیس اور عام فہم ہوتی تھی کہ کم پڑھے لکھے لوگ بھی سمجھ لیتے تھے۔ اس خصوصیت میں حضرت قطب ارشاد مولانا گنگوہی اور مفتی اعظم مولانا کفایت اللہ شاہجہاں پوری ثم دہلوی کے علاوہ کوئی شریک نہیں ہے۔

حضرت مفتی صاحب ایک عالم اور فقیہ ہی نہ تھے بلکہ عارف باللہ اور صاحب باطن بزرگ بھی تھے حضرت مولانا شاہ رفیع الدین صاحب مہتمم ثانی دارالعلوم دیوبند کے خلیفہ خاص تھے۔ اور خود بھی بیعت وارشاد کا شغل رکھتے تھے۔ ہزارہا طالب خدا آپ کی تلقین و تربیت سے منزلِ مقصود تک پہنچے۔

۱۳۴۶ھ کی مشہور اصلاحی تحریک کے موقع پر حضرت محدثِ عصر مولانا انورشاہ کشمیری کے ہمراہ آپ بھی بہت سے دیگر اساتذہ دارالعلوم کی طرح اس وقت کے نظام کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے دارالعلوم سے مستعفی ہوگئے تھے۔ ۱۳۴۷ھ میں جب حضرت محدث کشمیری علالت کی بناء پر ڈابھیل سے دیوبند چلے آئے تو ارباب جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کے اصرار پر حضرت مفتی صاحب وسط ربیع الثانی میں ڈابھیل تشریف لے گئے اور بخاری شریف کے باقی ماندہ حصہ کی تکمیل کرائی۔ وہاں سے واپسی پر راستے میں

طبیعت علیل ہوگئی۔ دیوبند پہنچنے پر علاج شروع ہوا مگر افاقہ نہ ہوا اور ۱۷ر جمادی الثانی ۱۳۴۷ھ/ ۱۹۲۸÷ کی شب میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ مولانا اصغر حسین محدث دیوبندی نے نماز جنازہ پڑھائی اور قبرستان قاسمی میں سپرد خاک ہوئے۔ حضرت مفتی صاحب کو مستقل تصانیف کا موقع کم ملا۔ جلالین شریف کا ترجمہ اور حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے ایک رسالہ میزان البلاغۃ کے حاشیہ کے علاوہ آپ کے لکھے ہوئے وہ فتاویٰ جو فتاویٰ دارالعلوم کے نام سے اب تک ۱۷ر ضخیم جلدوں میں شائع ہو چکے ہیں آپ کے قلمی آثار ہیں۔

(۱۹) مولانا حافظ محمد احمد قاسمی دیوبندی

حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب حضرت حجۃ الاسلام مولانا نانوتویؒ کے فرزند تھے ۱۲۷۹ھ/ ۱۸۶۲÷ میں نانوتہ میں پیدا ہوئے۔ حفظ قرآن کے بعد والد ماجد نے گلاوٹھی مدرسہ منبع العلوم میں پڑھنے کے لئے بھیج دیا۔ یہاں کے بعد مدرسہ شاہی مرادآباد میں داخل ہوئے اور حضرت نانوتوی کے تلمیذ رشید حضرت مولانا احمد حسن امروہی سے مختلف علوم وفنون کی کتابیں پڑھیں اس کے بعد دیوبند تشریف لائے اور حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب وحضرت شیخ الہند وغیرہ سے کتب حدیث کی تحصیل کی بعدازاں گنگوہ حاضر ہوکر حضرت قطب ارشاد مولانا گنگوہی سے دورۂ حدیث کی تحصیل وتکمیل کے بعد سند واجازت حاصل کی۔

تعلیم سے فراغت کے بعد ۱۳۰۳ھ/ ۱۸۸۵÷ میں بحیثیت مدرس کے دارالعلوم میں آپ کا تقرر ہوا ۱۳۱۳ھ میں اہتمام کی ذمہ داری آپ کو تفویض ہوئی۔ جو آخر عمر تک قائم رہی۔ حضرت حافظ صاحب کے دور اہتمام میں دارالعلوم نے خوب ترقی کی اور بقول مصنف تاریخ دارالعلوم ’’ہرچند دارالعلوم معنوی حیثیت سے دارالعلوم بن چکا تھا مگر اپنی عمارتوں اور ظاہری شکل وصورت کے لحاظ سے آپ ہی کے زمانۂ اہتمام میں مدرسہ سے دارالعلوم بنا‘‘ کار اہتمام کے ساتھ تدریس کا مشغلہ بھی آخر تک قائم رکھا بالعموم مشکوٰۃ شریف، جلالین، ابن ماجہ وغیرہ زیر درس رہتی تھیں — دینی ونسبی شرافت ووجاہت کے

ساتھ حافظ صاحب کو دنیاوی شان وشوکت بھی حاصل تھی۔ اور برطانوی گورنمنٹ کی طرف سے آپ کو شمس العلماء کا خطاب حاصل تھا۔ علاوہ ازیں ریاست حیدرآباد کے تقریباً تین برس تک مفتی اعظم بھی رہے جس کے صلہ میں حافظ صاحب کے ساتھ پورے خاندان کو ریاست کی جانب سے وظیفہ ملتا تھا۔

۱۳۴۷ھ/ ۱۹۲۸÷ میں نظام حیدرآباد دہلی آرہے تھے حافظ صاحب اس موقعہ پر انھیں دارالعلوم لانا چاہتے تھے چنانچہ اسی غرض سے حیدرآباد کا سفر کیا۔ سفر سے پہلے ہی سے طبیعت کچھ ناساز تھی حیدرآباد پہنچنے پر مرض شدت اختیار کر گیا اور نظام سے ملاقات کئے بغیر حالت کی نزاکت کے پیش نظر دیوبند واپسی کے ارادے سے وہاں سے چل پڑے مگرابھی ٹرین حیدرآباد کے حدود ہی میں تھی کہ نظام آباد اسٹیشن پر حافظ صاحب دیوبند کے بجائے سفر آخرت کو سدھار گئے۔ ۳ر جمادی الاولیٰ ۱۳۴۷ھ/ ۱۹۲۸÷ کو یہ حادثہ پیش آیا۔ اسٹیشن پر میت اتار لی گئی متعلقین اور نظامِ دکن کو بذریعہ تار حادثہ کی اطلاع دی گئی۔ اور نظام ہی کے حکم پر جنازہ دیوبند کے بجائے حیدرآباد لے جایا گیا۔ اور وہیں ایک مخصوص قبرستان ''خطّۂ صالحین'' میں سرکاری مصارف پر تجہیز وتکفین عمل میں آئی۔ حافظ صاحب نے کل ۳۵ سال اہتمام کے فرائض انجام دیئے۔

(۲۰) مولانا محمد صدیق صاحب مرادآبادیؒ

حضرت مولانا محمد صدیق بن مولانا محمد امین الدین صدیقی مرادآباد کے ایک علمی خانوادہ کے گل سرسبد تھے ۱۲۶۳ھ کے حدود میں آپ کی ولادت ہوئی۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد بزرگوار اور مولانا میر بشارت علی سنبھلی ومولانا محبوب علی سنبھلی سے حاصل کی اور فن طب کی تحصیل اپنے نانا حکیم محمد عطا حسین سے کی جو اپنے عہد کے نامور اطبّاء میں سے تھے۔

فارسی دینیات کی تکمیل کے بعد اپنے برادر خورد مولانا شمس الدین کے ہمراہ حضرت حجۃ الاسلام مولانا نانوتویؒ کی خدمت میں میرٹھ پہنچے اور چندے استفادہ کے بعد واپس مرادآباد آگئے اور کچھ عرصہ یہاں قیام کے بعد دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا اور حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب اور مولانا سید احمد دہلوی وغیرہ سے حلقہ درس میں شامل ہوکر

مروجہ کتابیں پڑھیں۔

تحصیل وتکمیل کے بعد ۱۴؍ربیع الاوّل ۱۲۸۹ھ کو میرٹھ میں حضرت حجۃ الاسلام قدس سرہ سے بیعت ہوئے اور ذکر وشغل کے ساتھ علمی استفادہ بھی کرتے رہے۔ تکمیل سلوک کے بعد حضرت نانوتویؒ نے انھیں خلافت سے مشرف فرمایا۔ حضرت نانوتوی کے علاوہ حضرت قطب ارشاد مولانا گنگوہی اور حضرت سیّد الطائفہ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی سے بھی آپ کو خلافت واجازت حاصل تھی۔ مولانا محمد صدیق صاحب علوم ظاہری وباطنی میں کمال کے ساتھ اُردو اور فارسی کے قادر الکلام شاعر بھی تھے قاسمی اور صدیق تخلص کرتے تھے۔ نمونہ کلام درج ذیل ہے۔

بسے چوں قاسم دیوانہ رافرزانہ می سازد   بہ بیں صدیق! فیض قاسم فرزانۂ مارا

فیض قاسم الخیرات راصدیق می نازم   رود دیوانہ گر در بزم اوفرزانہ می آید،

روحانی علاج کے ساتھ جسمانی علاج میں بھی مولانا کو یدطولیٰ حاصل تھا۔ نبض شناسی اور تشخیص امراض میں آپ کو حیرت انگیز کمال حاصل تھا۔

۳؍شوال ۱۳۴۷ھ کو شب جمعہ میں بعمر ۸۴ سال آپ کا وصال ہوا نماز جنازہ تلمیذ حضرت حجۃ الاسلام مولانا نواب محی الدین خاں فاروقی نے پڑھائی(۱)

(۲۱) مولانا حکیم رحیم اللہ بجنوری

مولانا حکیم رحیم اللہ بن مولانا علیم اللہ بجنور کے ایک اعلیٰ خاندان کے چشم وچراغ تھے آپ کے والد مولانا علیم اللہ صاحب حضرت حجۃ الاسلام مولانا نانوتوی کے رفقاء درس میں سے تھے۔

حکیم صاحب نے منطق، فلسفہ، کلام اور ریاضی کی کتابیں مولانا عبدالعلی رام پوری سے پڑھیں پھر دارالعلوم میں داخل ہوکر بقیہ کتبِ درس کی تکمیل کی اور ۱۲۹۵ھ میں حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب سے دورۂ حدیث پڑھ کر سند فراغت حاصل کی۔ فن

---

(۱) الفرقان لکھنؤ شمارہ مارچ ۱۹۷۶ء۔

طب کی کتابیں حکیم ابراہیم لکھنوی سے پڑھیں اور طویل مدّت تک ان کی خدمت میں رہ کر عملی تجربات کئے۔ حضرت حجۃ الاسلام مولانا نانوتوی سے بھی ان کی آخری عمر میں استفادہ کیا۔

حکیم صاحب کو عقائد و کلام اور مناظرے میں خاص دسترس حاصل تھی اور ان علوم میں ایک درجن سے زائد کتابیں اپنی تصنیفی یادگار چھوڑیں جن میں بعض یہ ہیں۔

(۱) الکافی للاعتقاد الصافی (۲) تہدید المنکرین بقدرۃ رب العٰلمین (۳) اظہار الحقیقہ (۴) ابطال اصول الشیعہ بدلائل العقلیہ والنقلیہ (۵) احسن الکلام فی اصول عقائد الاسلام (۶) اثبات القدرۃ الالٰہیہ باقامۃ الحجۃ الالہامیہ۔

حکیم صاحب خدمتِ خلق کے طور پر گھر پر مطب کرتے تھے اوراد و وظائف کے پابند اور بڑے باوضع بزرگ تھے۔ سفر حج کے موقع پر حضرت سیدۃ الطائفہ حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر بیعت سے مشرف ہوئے۔ آخر عمر میں ہجوم امراض کی بناء پر نہایت کمزور ہو گئے تھے۔ ۱۴راگست ۱۹۲۹ء مطابق ۱۳۴۷ھ کو ظہر کی نماز شدّتِ نقاہت سے بیٹھ کر ادا کی اور جیسے ہی سلام پھیرا روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔

مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب بجنوری موجودہ مہتمم دارالعلوم دیوبند جو بجنور کے ہر دلعزیز قومی رہنما اور با اثر شخصیت ہیں حکیم صاحب کے نواسے ہیں۔

(۲۲) مولانا حبیب الرحمن عثمانی مہتمم خامس دارالعلوم دیوبند

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن بن مولانا فضل الرحمٰن عثمانی دیوبندی ایک متبحر عالم اور عربی کے بہترین ادیب تھے، آپ کا تدبّر، سیاست، فراست، انتظام اور دوراندیشی حلقۂ دیوبند میں آج بھی ضرب المثل ہے از ابتداء تا انتہاء آپ نے دارالعلوم ہی میں پڑھا اور ۱۳۰۰ھ میں تحصیل علم سے فراغت حاصل کی ۱۳۲۵ھ میں حضرت حافظ احمد صاحب مہتمم دارالعلوم کے کثرت مشاغل و اسفار کے پیش نظر مجلس شوریٰ دارالعلوم نے دارالعلوم کے انتظامی امور کی انجام دہی کے لئے ایک منتظم اور لائق شخص کی ضرورت محسوس کی چنانچہ اس اہم خدمت کے لئے مجلس کی نگاہ انتخاب آپ ہی پر پڑی اور باوجود انکار کے آپ کو نیابت

اہتمام کا منصب سپرد کر دیا۔

مولانا عثمانی علیہ الرحمہ اگر چہ نحیف الجثہ اور پیدائشی طور پر کمزور تھے لیکن قدرت نے ضعف و کمزوری کے باوجود بے پناہ ہمت عطا کی تھی امور اہتمام میں شب و روز انہماک کے ساتھ مطالعہ کتب کا سلسلہ بھی جاری رہتا تھا۔ کتب بینی کے شوق نے آپ کی معلومات میں بڑی وسعت اور گہرائی پیدا کر دی تھی عربی ادب اور تاریخ سے خاص ذوق تھا آپ کی علمی یادگار میں عربی قصائد اور متعدد اہم علمی و تحقیقی تصنیفات ہیں جن میں درج ذیل مصنفات خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

(۱) حاشیہ مقامات حریری (۲) قصیدہ لامیۃ المعجزات (۳) اشاعتِ اسلام (۴) تعلیماتِ اسلام (۵) حاشیہ تفسیر جلالین۔

دار العلوم کے معاملات میں آپ مولانا حافظ محمد احمد صاحب مہتمم دار العلوم کے ہمیشہ دستِ راست بلکہ مختار مطلق رہے اور حضرت حافظ صاحب کے زمانہ کے دار العلوم کی ترقیات درحقیقت مولانا عثمانی کی رفاقت ہی کا نتیجہ ہیں حافظ صاحب مرحوم کی وفات کے بعد آپ دار العلوم دیوبند کے مہتمم قرار پائے مگر افسوس کہ عمر نے وفا نہیں کی اور اس منصب پر فائز ہونے کے ٹھیک چودہ ماہ بعد ۴/رجب ۱۳۴۸ھ کی شب میں اس جہان فانی سے رحلت فرما گئے۔

نوٹ: تدریسی مصروفیت کی وجہ سے مضمون مکمل نہیں ہو سکا۔

☆ ☆ ☆

حضرت شیخ الاسلام کے تین امتیازات

(۱) حضرت شیخ الہند سے کثرت استفادہ

(۲) مسجد نبوی میں تدریس

(۳) الجزائر کے جہاد آزادی میں رہنمائی

شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی بظاہر ایک شخصیت کا نام ہے، لیکن بباطن وہ اپنی جامعیت کے اعتبار سے "ان ابراهیم کان امة" کی تفسیر تھے، کیونکہ وہ بیک وقت علوم و معارف کے امام، مجلس ارشاد کے صدر نشین، عزیمت و استقامت کے جبل عظیم، فقر و تواضع کے بحر عمیق، بصائر و حکم کے سرچشمہ، زہد و قناعت کے مجسمہ، اخلاص و ایثار کے پیکر، سخاوت و شجاعت کے مخزن، میدان صبر و رضا کے شہ سوار، قافلۂ جہد و عمل کے تاجدار اور سلفِ صالحین کی مکمل و متحرک یادگار تھے "کثر اللہ امثالہ"

آپ نے سیاست کے بحرِ مواج میں اپنے سفینہ کی تختہ بندی کی، مگر اس بصیرت کے ساتھ کہ اس کی چھینٹیں آپ کے دامنِ حیات کو نمناک نہ کر سکیں آپ نے مذہب و سیاست کے جام و سندان کو باہم آمیز کر دیا، مگر اس کمال فراست کے ساتھ کہ دونوں کی نزاکتوں سے ایک لمحہ کیلئے بھی صرف نظر نہیں کیا۔

خدمات اور کارناموں پر ایک اجمالی نظر

۱۹/ شوال ۱۲۹۶ھ کو آپ کی ولادت ہوئی اور ۱۲/ جمادی الاولیٰ ۱۳۷۷ھ (۱۵/ دسمبر ۱۹۵۷ء) کو ساڑھے اکیاسی سال کی عمر میں اس جہان فانی کو چھوڑ کر رہ گرائے عالم جاودانی ہو گئے، اس اکیاسی سالہ حیات کے ۲۰ سال تعلیم و تحصیل میں بسر ہوئے اور

تقریباً ۸ر سال سے کچھ کم وبیش قید فرنگ کی نذر ہو گئے، زندگی کے باقی ۵۳ سال میں سے اگر کم ازکم ۱۰ برس خواب وخور اور دیگر حوائج بشریہ کی تکمیل کے لئے نکال دیئے جائیں تو کارکردگی کی مدت صرف ۴۳ سال رہ جاتی ہے، ان ۴۳ سال کے محدود ایام کو پیش نظر رکھ کر حضرت شیخ الاسلام کی تعلیمی تربیتی، تصنیفی اور سیاسی خدمات اور کارناموں کا جائزہ لیجئے کہ مدینۃ الرسول علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام، مدرسہ عالیہ کلکتہ، اور آسام کے علاوہ صرف دارالعلوم دیوبند میں چار ہزار سے زائد وہ تلامذہ ہیں جنھوں نے آپ کے شمع علم سے اکتساب نور کیا۔ لاکھوں سے زیادہ وہ طالبین حق ہیں جنھوں نے تربیت گاہ مدنی سے تصحیح عقائد، تحسین اخلاق وتزکیۂ باطن کا درس لیا جن میں ڈیڑھ سو سے اوپر وہ خوش بخت اور جوان ہمت بھی ہیں جو احسان وسلوک کی منزلیں طے کر کے سند اجازت وخلافت سے مشرف ہوئے، اصلاح معاشرہ اور تبلیغ دین کیلئے اس وسیع وعریض ملک کے چپے چپے کا دورہ، اسلامی عنوانات پر ہزاروں سے زائد خطبات وتقریریں، استخلاص وطن، حریت قومی اور ملت کی سربلندی اور اپنے عصر کی سب سے بڑی استعماری طاقت سے محاذ آرائی، علوم اسلامی کی اشاعت کی غرض سے ہزاروں مکاتیب دینیہ و مدارس اسلامیہ کی سرپرستی ونگرانی، پھر ان ہمہ جہت ومختلف النوع مشاغل کے ساتھ مختلف دینی، علمی، سیاسی اور تاریخی موضوعات پر کتب و رسائل کی تالیف وتصنیف، نیز ہزاروں صفحات پر پھیلے ہوئے ان مکاتیب کی تحریر جن میں تفسیر آیات، تشریح احادیث، تفصیل عقائد، توضیح مسائل فقہیہ، رموز احسان اور تاریخ وسیاست سے متعلق بیش بہا نادر معلومات کا ایک عظیم ذخیرہ جمع کر دیا ہے جس کے متعلق پورے اعتماد سے کہا جاسکتا ہے کہ مکتوبات وملفوظات کی طویل فہرست میں مخدوم شرف الدین احمد منیری متوفی ۷۸۲ھ اور مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی متوفی ۱۰۳۴ھ اور شیخ حسام الدین مانک پوری کے مجموعۂ مکاتیب کے بعد شیخ الاسلام کے مکتوبات اپنی افادیت، اپنی اثر آفرینی، کثیر معلومات اور جامعیت میں سب پر فوقیت رکھتے ہیں، اور جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ مکتوبات قلم برداشتہ اور بالعموم اسفار یا قید وبند کی حالت میں لکھے گئے ہیں جس سے حضرت شیخ الاسلام کے علمی استحضار وعبقریت کا کسی

قدر اندازہ لگایا جاسکتا ہے پھر تکمیل ذات کیلئے آہ نیم شبی کا مشغلہ اور رب کریم و آقائے بے نیاز سے عرض و نیاز جو زندگی کا ایک جز بن گیا تھا، بسا اوقات پورا دن ٹرین، تانگہ اور بیل گاڑیوں کے تکلیف دہ سفر میں گذر جاتا، اور رات کا بیشتر حصہ جلسہ اور وعظ میں، لیکن کیا مجال کہ رات کے اس محبوب معمول میں ذرا بھی فرق آجائے، الحاصل آپ کی زندگی فی اللیل رہبان وفی النہار فرسان کا مکمل نمونہ تھی۔

واقعہ یہ ہے کہ ایسی جامع کمالات اور گوناں گوں صفات کی حامل شخصیت پر قلم اٹھانے والا محامد و محاسن کے ہجوم میں متحیر ہوکر رہ جاتا ہے، وہ اگر مسجد نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام اور دار العلوم دیوبند میں آپ کے درس و تدریس، اصحاب عمل اور مردان کار کی تعلیم و تربیت کو موضوع سخن بنانا چاہتا ہے تو اسی لمحہ میدانِ جہاد میں آپ کے محیر العقول کارنامے اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لیتے ہیں، وہ اگر آپ کے صدارت جمعیۃ کے عہد پر لکھنے کا ارادہ کرتا ہے تو اسی آن عرفان و احسان کی وہ کیف آگیں بزم جس کے آپ صدر نشین تھے اس کے رہوار تخیل کی زمام اپنی سمت موڑ لیتی ہے، وہ اگر آپ کے تبلیغی مواعظ اور اصلاحی مکاتیب کے سلسلے میں اپنے تاثر بیان کرنا چاہتا ہے تو آپ کے خطبات صدارت اور کراچی کی عدالت میں سنگینوں کے زیر سایہ اعلان حق، تاریخ عزیمت کا ایک نیا باب اس کی نگاہوں کے سامنے کر دیتے ہیں وہ اگر آپ کے محاسن اخلاق اور بلندئ کردار کو اپنی بحث و تحقیق کا عنوان بنانا چاہتا ہے تو آپ کے بحر علم سے اسرار و حکم و علوم و معارف کی اٹھتی ہوئی موجیں اس کے اشہب فکر کو اپنی آغوش میں لے لیتی ہیں اور بالآخر فضائل و کمالات کی ان مسلسل اور بے پناہ جلوہ طرازیوں سے مبہوت ہوکر وہ پکار اٹھتا ہے۔

دامان نگہ تنگ گل حسن تو بسیار
گلچیں تو ز تنگی داماں گلہ دارد

یقین جانئے یہ شاعری یا عقیدت کی کرشمہ کاری نہیں ہے بلکہ ان مشکلات و کیفیات کا صحیح اظہار ہے جن سے ان سطور کو سپرد قلم کرتے ہوئے گذرنا پڑا ہے، ظاہر ہے اس پریشان خیالی میں کسی مرتب و مفصل تحریر کی ہوس بے سود تھی اس لئے یوسف کے خریداروں

میں نام لکھوانے کی غرض سے یہ بضاعۃ مزجاۃ بعنوان ''تین امتیازات'' لے کر حاضر ہوگیا ہوں — گر قبول افتد زہے عز و شرف۔

امتیاز (۱) شیخ الہندؒ سے طویل استفادہ

حضرت شیخ الاسلام ماہ صفر ۱۳۰۹ھ میں بغرض تحصیل علم دیوبند پہنچے اور آخر شعبان ۱۳۱۶ھ تک یہاں آپ کا قیام رہا، ساڑھے چھ سال کی اس مدت میں سترہ فنون پر مشتمل سرسٹھ درسی کتابیں اساتذۂ دارالعلوم سے پڑھیں جن میں ۲۴ کتابیں خود حضرت شیخ الہند نے پڑھائیں، اس اجمال کی تفصیل خود حضرت شیخ الاسلام کے الفاظ میں ملاحظہ کیجئے۔

خلاصہ یہ کہ صفر ۱۳۰۹ھ سے شعبان ۱۳۱۶ھ تک دیوبند میں قیام رہا، اس مدت میں مندرجہ ذیل کتابیں مندرجہ ذیل اساتذہ کے پاس ہوئیں۔

(۱) حضرت شیخ الہند قدس سرہ العزیز سے دستور المبتدی، زرّادی، زنجانی، مراح الارواح، قال اقول، مرقات، تہذیب، شرح تہذیب، قطبی تصورات، قطبی تصدیقات، میر قطبی، مفید الطالبین، نفحۃ الیمن، مطول، ہدایہ اخیرین، ترمذی شریف، بخاری شریف، ابوداؤد شریف، تفسیر بیضاوی شریف، نخبۃ الفکر، شرح عقائد نسفی حاشیہ خیالی، مؤطا امام مالک، موطا امام محمد رحمہما اللہ تعالیٰ۔

(۲) مولانا ذوالفقار علی (والد ماجد حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہما) = فصول اکبری۔

(۳) مولانا عبد العلی صاحب رحمۃ اللہ علیہ مدرس دوم دارالعلوم =
مسلم شریف، نسائی شریف، ابن ماجہ شریف، سبعہ معلقہ، حمد اللہ، صدرہ، شمس بازغہ، توضیح تلویح۔

(۴) مولانا خلیل احمد صاحب مرحوم مدرس دارالعلوم دیوبند = تلخیص المفتاح۔

(۵) مولانا الحکیم محمد حسن صاحب مرحوم مدرس دارالعلوم دیوبند = پنج گنج، صرف میر، مختصر المعانی، سلم العلوم، ملاحسن، جلالین شریف، ہدایہ اولین۔

(۶) مولانا المفتی عزیز الرحمٰن صاحب مرحوم مدرس دارالعلوم دیوبند = شرح جامی

بحث فعل، کافیہ، ہدایۃ النحو، منیۃ المصلی، کنز الدقائق، شرح وقایہ، مائۃ عامل، اصول الشاشی

(۷) مولانا غلام رسول صاحب مرحوم بغوی، مدرس دار العلوم دیوبند = نور الانوار، حسامی، قاضی مبارک، شمائل ترمذی۔

(۸) مولانا منفعت علی صاحب مرحوم = میر زاہد رسالہ، میر زاہد ملا جلال، میبذی، خلاصۃ الحساب، رشیدیہ، سراجی۔

(۹) مولانا الحافظ احمد صاحب مرحوم = شرح جامی بحث اسم۔

(۱۰) مولانا حبیب الرحمٰن صاحب = مقامات حریری، دیوان متنبّی۔

(۱۱) بڑے بھائی صاحب مرحوم (مولانا سید محمد صدیق صاحب) منشعب، ایساغوجی(۱)

(۱) تعلیم وتحصیل کا یہ ساڑھے چھ سالہ دور حضرت شیخ الہند کے زیر سایہ اور ملازمت میں بسر ہوا، کیونکہ اس پوری مدت میں آپ کا قیام حضرت کے مکان کے متصل ایک کوٹھی میں رہا، اس قربت مکانی کے علاوہ آپ کے بڑے بھائی مولانا محمد صدیق صاحب حضرت شیخ الہند کے خدام میں سے تھے، اس تقریب سے ابتدا ہی سے آپ کو حضرت شیخ الہند کا تقرب حاصل ہوگیا۔

(۲) فراغت تعلیم اور مدینہ منورہ میں اقامت پذیر ہوجانے کی بعد ۱۳۲۷ھ میں جب عارضی طور پر ہندوستان تشریف لائے تو تقریباً ایک سال مزید حضرت شیخ الہند کی خدمت میں رہ کر ترمذی و بخاری کو دوبارہ بحث و تحقیق سے پڑھا۔ لکھتے ہیں

> ۱۳۲۶ھ کے آخر میں (مدینہ منورہ) سے روانہ ہوکر ۱۳۲۷ھ میں دیوبند پہنچا اور ترمذی، بخاری میں شریک ہوگیا اور بالالتزام ان دونوں کتابوں کو پڑھا مسائل پر پوری بحث کرتا تھا، حضرت رحمۃ اللہ بھی اس مرتبہ غیر معمولی توجہ فرماتے تھے اور خلاف عادت تحقیقی جواب نہایت وضاحت سے دیتے تھے(۱)

(۳) علاوہ ازیں اسارت مالٹا کا پورا زمانہ حضرت شیخ الہند کی معیت وصحبت میں

---

(۱) نقش حیات ج ا ص ۴۵، ۴۶۔

گزرا، اور اس کنج تنہائی میں حضرت شیخ کے آفتاب فیض سے باطمینان خاطر علم وفکر کی روشنی اخذ کرتے رہے، اس طرح مجموعی طور پر دس گیارہ سال تک آپ کو حضرت شیخ الہند کی صحبت وملازمت کا شرف حاصل ہوا۔

حضرت شیخ الاسلام کا یہ ایسا امتیاز ہے جس میں ان کے رفقاء ومعاصرین میں کوئی بھی ان کا شریک وسہیم نہیں، علم وفکر کی پختگی میں شیخ سے طولِ ملازمت کا جو مقام ہے، اہل نظر سے مخفی نہیں، سچ پوچھئے تو اسی اتصال ویک نفسی نے حضرت شیخ الاسلام کی ذات کو ایک ایسا آئینہ بنادیا تھا جس میں شیخ الہند کے سراپا کو بخوبی دیکھا جاسکتا تھا۔

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا

امتیاز (۲) مسجد نبوی...... میں حلقۂ درس

شعبان ۱۳۱۶ھ میں آپ کو تعلیم وتحصیل سے فراغت حاصل ہوئی اور اسی سال ماہ شعبان میں آپ کے والد ماجد نے مدینہ طیبہ زادہا شرفا وتعظیما کی جانب ہجرت کے ارادہ سے رختِ سفر باندھا، والد محترم کے حکم سے حضرت شیخ الاسلام نے بھی انھیں کی معیت میں ہندوستان کے بجائے ارضِ رسول...... کو اپنا مسکن وماویٰ بنالیا، جیسا کہ خود رقم طراز ہیں:

> ”محرم ۱۳۱۷ھ کی ابتدائی تاریخوں میں مدینہ منورہ میں شرف حضور حاصل ہوا، حرم نبوی کے باب النساء کے قریب زقاق البدور کے کنارے پر ایک مکان کرایہ پر لے کر قیام کیا گیا۔“(۱)

مدینہ منورہ میں پہنچ کر رہائش وغیرہ کے معاملات سے مطمئن ہو جانے کے بعد آپ نے درس وتدریس کا سلسلہ شروع کردیا، اس اجمال کی تفصیل خود حضرت شیخ الاسلام کی زبانی سماعت کیجئے۔ فرماتے ہیں:

> ”درس وتدریس کی تفصیل یہ ہے کہ اواخر شعبان ۱۳۱۶ھ میں جبکہ ہم تینوں بھائی (حضرت شیخ الاسلام، مولانا صدیق صاحب ومولانا سید احمد صاحب)

---

(۱) نقش حیات ج ۱ ص ۱۵۱۔

> دیوبند سے آخری طور پر روانہ ہوئے، تو من جملہ رخصت کرنے والوں کے حضرت شیخ الہند قدس سرہ العزیز ساتھ ساتھ اسٹیشن دیوبند تک تشریف لائے تھے، راستہ میں پرزور طریقہ پر ہدایت فرمائی کہ ”پڑھانا ہرگز نہ چھوڑنا چاہیے دو ایک طالب علم ہی ہوں“ اس لئے تعلیمی مشغلہ کا خیال بہت زیادہ ہوگیا تھا مدینہ منورہ پہنچنے کے بعد بعض بعض طلبہ ہندوستان اور عرب بعض کتابوں کی تدریس کے خواستگار ہوئے (اور حسب ہدایت حضرت شیخ الہند قدس سرہ العزیز اس کام کو شروع کر دیا۔“ (۱)

چونکہ حضرت شیخ الاسلام کی عمر ابھی کم تھی اور یہاں کے نو وارد بھی تھے اور بقول سعدیؒ

تا مرد سخن نگفتہ باشد
عیب و ہنرش نہفتہ باشد

آپ کے علمی مقام و مرتبہ اور صلاحیتوں پر اجنبیت اور عدم واقفیت کا پردہ پڑا ہوا تھا اس لئے ابتدا میں تقریباً ایک سال تک طلبہ کا رجوع آپ کی طرف کم رہا، لیکن دو سال گذرتے گذرتے آپ کا نہال علم ایک تناور درخت ہوگیا جس کے سائے میں حجاز، ترکستان، بخاریٰ ہندوستان، کابل، الجزائر، قازان، مصر وغیرہ دور و نزدیک سے مسافران علم کے قافلے در قافلے اترنے لگے اور آپ کے تبحر علمی کے غلغلے سے مدینۃ الرسول ...... کے گلی کوچے پرشور ہوگئے، آپ کے درس کو اس درجہ مقبولیت حاصل ہوئی کہ قدیم اساتذۂ مسجد نبوی کے حلقہ ہائے درس سونے پڑ گئے اور ان کی ساری رونق سمٹ کر حضرت شیخ الاسلام کے قدموں میں نچھاور ہونے لگی۔

وہ آئے بزم میں اتنا تو میرؔ نے دیکھا
پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

ایک نو وارد اور وہ بھی ایک نوعمر کا اس قدر جلد شہرت و مقبولیت کے بام عروج پر پہنچ جانا عام حالات میں بڑے بڑے وسیع ظرف اور سیر چشموں کیلئے بھی رشک و رقابت اور حسد کا سبب ہوجاتا ہے کچھ اسی طرح کا معاملہ حضرت شیخ الاسلام کے ساتھ بھی پیش آیا کہ آپ کا علمی عروج دیکھ کر مسجد نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے قدیم اساتذہ کی رگِ حسد بھڑک

---

(۱) نقش حیات ج ۱ ص ۵۷۔

اٹھی، جس کی بنا پر آپ کو چندے مشکلات اور دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا، لیکن جس آقائے کریم نے سر پر مقبولیت کا تاج رکھ کر آپ کو سرفراز فرمایا تھا اسی نے ان مشکلات کا مداویٰ بھی کر دیا، اور آپ کی نیک نامی دن دونی رات چوگنی بڑھتی ہی رہی خود حضرت شیخ الاسلامؒ نے مدینہ منورہ میں اپنے مشاغل علمیہ پر ان الفاظ میں روشنی ڈالی ہے:

> ''۱۳۱۸ھ شوال تک ... میں ابتدائی کتابیں مختلف فنون کی دو دو چار چار طالب علم کو پڑھاتا رہا ۱۳۱۸ھ ذی قعدہ میں قطب عالم حضرت گنگوہی قدس سرہ العزیز کے ارشاد کے مطابق گنگوہ کا سفر کیا۔ اور ۱۳۲۰ھ محرم میں مدینہ منورہ واپس ہوا، یہاں پہنچنے کے بعد مدرسہ شمسیہ باغ معروف بہ توطیہ کے مدرسہ میں بعہدہ مدرسی ۳۵ روپے ماہوار ملازم ہو گیا چونکہ طلبہ کا ہجوم ہوا اس لئے خارج از مدرسہ اوقات میں حرم محترم میں کتابیں شروع کرا دیں، سمجھدار اور جدوجہد کرنے والے طلبہ کا اجتماع میرے پاس بہت زیادہ ہو گیا جس سے مدرسین حرم محترم کو حسد اور رقابت پیدا ہو گئی، طلبہ صرف اہل مدینہ نہ تھے بلکہ ترک، بخاریٰ، قازانی، قزق، ترکستان، کابلی، مصری وغیرہ بھی تھے (اس حسد کا نتیجہ یہ ظاہر ہوا کہ)....ناظر مدرسہ شمسیہ باغ کو اصرار ہوا کہ خارج از اوقات مدرسہ میں کہیں نہ پڑھایا جائے اس قسم کی چند باتیں اور پیش آئیں جن کی وجہ سے بہ مجبوری مدرسہ کی ملازمت سے استعفا دینا پڑا اور یہ ارادہ کر لیا گیا کہ لوجہ اللہ بلا معاوضہ حرم محترم میں اسباق پڑھائے جائیں اور رزق کو اس کے کفیل جناب باری عز اسمہ کی کفالت پر رکھا جائے، چنانچہ کتب درسیہ کا میدان وسیع کر دیا گیا، حضرت گنگوہی قدس سرہ کی بارگاہ میں ان اسباق کی فہرست اور مشاغل کی تفصیل لکھی... (کہ) طلبہ علوم کا اصرار بہت زیادہ ہے مجبور ہو کر میں نے دن رات کا اکثر حصہ اسی میں صرف کر رکھا ہے، جواب میں حضرت رحمہ اللہ نے ارشاد فرمایا ''پڑھاؤ خوب پڑھاؤ، اس سے ہمت زیادہ بڑھ گئی، روزانہ چودہ اسباق پڑھاتا تھا،

> پانچ صبح کو تین یا چار ظہر کے بعد دو عصر کے بعد، دو مغرب کے بعد ایک عشاء کے بعد۔ (۱)

آگے چل کر لکھتے ہیں:

> ’’۱۳۲۰ھ سے ۱۳۲۶ھ تک مسلسل طور پر میرا مشغلہ علمی مدینہ منورہ میں جاری رہا... چونکہ مدینہ منورہ میں منگل اور جمعہ کو تعطیل ہوتی ہے، تو ان تعطیل کے ایام میں بھی خصوصی دروس چار پانچ ہوتے تھے ...علوم میں جد و جہد کرنے والے طلبہ کا ہجوم اس قدر رہا کہ علماء و مدرسین کے حلقہ ہائے درس میں اس کی مثال نہیں تھی۔ (۲)

۱۳۲۷ھ میں آپ پھر ہندوستان وارد ہوئے اور ۱۳۲۹ھ تک ہندوستان ہی میں قیام پذیر رہے اسی سفر میں آپ نے حضرت شیخ الہند سے ترمذی و بخاری دوبارہ پڑھی جس کا تذکرہ اوپر گذر چکا ہے۔ نیز اس عارضی قیام کے زمانہ میں آپ کو اکابر دارالعلوم نے باقاعدہ طور پر دارالعلوم کا استاذ بھی منتخب کرلیا تھا اور اس تصریح کے ساتھ کہ یہ انتخاب دوامی ہے، درمیان میں وقفہ کے بعد جدید تقرر کی ضرورت نہیں ہوگی بلکہ یہی تجویز تقرر کافی سمجھی جائے گی، یہ حضرات اکابر رحمہم اللہ کی جانب سے آپ کی علمی لیاقت پر اعتماد اور وثوق کی ایسی گرانقدر سند ہے جو فضلائے دارالعلوم میں سب سے پہلے آپ ہی کو مرحمت ہوئی اور غالباً آپ ہی پر اس کا آخر بھی ہوگیا۔ ذلك فضل الله يعطيه من يشاء.

حضرت شیخ الاسلام نے بھی اس یادگار تجویز کا تذکرہ فرمایا ہے، چنانچہ لکھتے ہیں:

> ۱۳۲۷ھ شوال میں اکابر نے مجھ کو تدریس کا حکم دیا جلسہ اہل شوریٰ نے حضرات مہتممین رحمہما اللہ تعالیٰ کی خواہش پر تجویز پاس کردیا کہ حسین احمد کو بالفعل بمشاہرہ ۳۴ روپے ماہوار مدرس کردیا جائے اور اس کے بعد جب بھی وہ مدینہ منورہ سے ہندوستان آئے اس کو بغیر تجدید اجازت از مجلس

---

(۱) نقش حیات ج۱ ص ۵۷ تا ۶۴ باختصار۔

(۲) ایضاً ج۱ ص ۹۶ تا ۹۹ باختصار۔

شوریٰ مدرس کیا جائے۔(۱)

۱۳۲۹ھ میں آپ مدینہ منورہ واپس حاضر ہوگئے۔ **۱۳۳۱ھ** میں چند مہینوں کے لئے پھر ہندوستان آنا ہوا اس کے بعد مسلسل محرم **۱۳۳۵ھ** تک آپ کا قیام مدینہ ہی میں رہا اور مشاغل درس وتدریس برابر جاری رہے تا آنکہ صفر **۱۳۳۵ھ** میں حکومت برطانیہ کی سازش اور ایماء پر حضرت شیخ الہند (جو اس وقت حجاز مقدس ہی میں تھے) اور دیگر رفقاء کے ساتھ آپ کو گرفتار کرکے مالٹا جیل میں پہنچا دیا گیا، اس تفصیل سے واضح ہوتا ہے کہ آپ نے اپنی سترہ سالہ اقامت مدینہ کے دوران باستثناء وقفۂ قیام ہند کم وبیش ۱۲-۱۳ سال مسجد نبوی میں خود صاحب وحی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے زیر نظر کتاب وسنت اور دیگر فنون اسلامیہ کا کامیاب درس دیا، مجد وشرف کا یہ تاج جو حضرت شیخ الاسلام کے سر پر رکھا گیا بارگاہ صمدیت کا ایسا بیش بہا اور عظیم عطیہ ہے جو بندگان خاص ہی کو عطا کیا جاتا ہے، بغیر کسی خوفِ تردید کے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ حضرت شیخ الاسلامؒ کا یہ ایسا طرۂ امتیاز ہے جس میں وہ اپنے تمام ہم عصر علماء میں بالکل منفرد وممتاز ہیں،

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا“

اس خصوصی تربیت گاہ مدنی کے افق سے علم وفکر اور جہد وعمل کے کیسے کیسے ماہ واختر طلوع ہوئے افسوس کہ آپ کے سوانح نگاروں نے اپنی سہل انگاری اور سہولت پسندی کی بنا پر اس کی جانب کوئی توجہ ہی نہ کی، اس طرح حیات مدنی کا یہ زریں وروشن باب ہماری نگاہوں سے اوجھل ہوگیا اور اب اس پر ماہ وسال کے اس قدر دبیز پردے پڑ چکے ہیں کہ انھیں ہٹا کر حقیقت حال کو واضح کرنا غیر ممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے، لیکن اس مشکل کی وجہ سے اس اہم ترین موضوع سے آنکھ بند کرکے گذر جانا کسی طرح مناسب نہیں، اس لئے اس کی طرف مختصر طور پر ہی سہی کچھ اشارات ضروری ہیں، ممکن ہے آگے آنے والے مورخ کو انھیں اشاروں کی روشنی میں بحث ونظر کیلئے کوئی واضح شاہراہ مل جائے اور وہ اپنی تحقیق کے دائرے کو وسیع کرسکے۔ وما توفیق الا باللّٰہ علیہ توکلت والیہ انیب.

---

(۱) ایضاً ج۱ ص۱۳۲

”طلبہ کا اس قدر ہجوم ہوا کہ علماء و مدرسین کے حلقہ ہائے درس میں اسکی مثال نہیں تھی۔“

حضرت شیخ الاسلام کا یہ اشارہ بتا رہا ہے کہ شمع مدنی کے گرد اکٹھا ہونے والے پروانوں کی تعداد سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں میں رہی ہوگی، پھر خود حضرت ہی یہ اطلاع دے رہے ہیں کہ ”یہ طلبہ علم صرف مدینہ منورہ ہی کے نہیں تھے بلکہ اس ہجوم میں ہندوستان، ترک، بخارا، قازان، قزق، ترکستان، کابل، مصر وغیرہ کے طالبان علم بھی تھے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حلقہ درس و دائرہ تربیت نہایت وسیع تھا۔ مجلہ المنہل مدینہ منورہ کے بیان سے بعض تلامذہ کے ناموں کی تعیین بھی ہو جاتی ہے، اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کا ضروری اقتباس اس موقع پر پیش کر دیا جائے، مجلہ المنہل نے حضرت شیخ الاسلام کی وفات کے موقع پر جو تعزیتی مضمون شائع کیا تھا یہ اقتباس اسی مضمون سے ماخوذ ہے:

فتلقى عليه العلم الناس كثيرون وانتفع الطلاب من تعليمه وكان من تلاميذه مدرسون وقضاة وحكام مديرون ورؤساء يذكرون منهم المرحومين المشائخ عبدالحفيظ الكردى الكورانى عضو المحكمة الكبرى بالمدينة واحمد البساطى نائب القاضى بها سابقا ومفتى الاحناف بها ومحمود عبدالجواد رئيس بلدية المدينة المنورة وكذلك الشيخ محمد البشير الابراهيمى العالم الجزائرى المجاهد فى سبيل التطويح ببغاة الاستعمار من الجزائر العربية العريقه(۱)

بہت سے لوگوں نے آپ سے علم حاصل کیا اور کثیر طلبہ آپ کی تعلیم و تدریس سے منتفع ہوئے آپ کے تلامذہ میں مدرسین، قاضی و حکام، سرکاری محکموں کے سکریٹری اور رؤسا تھے ان میں حسب ذیل مرحومین مشائخ کا ذکر کیا جاتا ہے۔

(۱) الشیخ عبدالحفیظ الکردی الکورانی رکن محکمہ کبریٰ، مدینہ منورہ (۲) الشیخ احمد البساطی نائب قاضی و مفتی احناف مدینہ منورہ (۳) الشیخ محمود عبدالجواد صدر میونسپلٹی مدینہ منورہ (۴) محمد البشیر الابراہیمی الجزائری، جنھوں نے الجزائر سے استعماری باغیوں کو دور

---

(۱) نقش حیات

کرنے میں زبردست جہاد کیا۔

مجلّہ الوعی الاسلامی کویت سے مزید ایک اور الجزائری مجاہد کے نام کی تعیین ہوتی ہے الامام عبدالحمید بن بادیس المصلح الجزائری المعاصر کے عنوان سے الوعی الاسلامی نے ڈاکٹر محمود بن محمد قاسم کا ایک مقالہ شائع کیا ہے اس مقالہ میں ڈاکٹر صاحب موصوف شیخ عبدالحمید بن بادیس کے سفر حجاز کے ضمن میں لکھتے ہیں:

ثم سافر الی مکة لاداء فریضة الحج فی سنة ۱۹۱۳م وفی الحجاز لقی عددا من علماءِ مصر والشام وتتلمذ علی الشیخ حسین احمد الهندی الذی نصحه بالمعودة الی الجزائر، اذلاخیر فی علم لیس بعده عمل.

پھر شیخ عبدالحمید بن بادیس نے فریضۂ حج کی ادائیگی کی غرض سے مکہ معظّمہ کا سفر کیا اور حجاز میں متعدد علماء مصر وشام سے ملاقات کی اور شیخ حسین احمد ہندی سے (شرف) تلمذ حاصل کیا جنھوں نے شیخ عبدالحمید کو الجزائر واپس جانے کی نصیحت کی کیونکہ اس علم میں کوئی خوبی نہیں جس کے بعد عمل نہ ہو۔

ان مراجع سے درج ذیل تلامذہ کی نشاندہی ہوتی ہے جنھوں نے آپ سے قیام مدینہ منورہ کے زمانہ میں اخذ فیض کیا۔ شیخ عبدالحفیظ کردی کورانی (رکن محکمہ کبریٰ مدینہ منورہ)، شیخ احمد بساطی نائب قاضی ومفتی احناف مدینہ منورہ، شیخ محمود عبدالجواد (صدر میونسپلٹی مدینہ منورہ) شیخ محمد البشیر الابراہیمی جزائری، شیخ عبدالحمید بن بادیس الجزائری، آخرالذکر دونوں جزائری تلامذہ کے سلسلے میں ہم قدرے تفصیلی گفتگو کر رہے ہیں کیونکہ ہمارے موضوع کے آخری جز سے انھیں ہر دو حضرات کی خدمات وکارنامے متعلق ہیں اور آج تک اس پر کچھ لکھا بھی نہیں گیا ہے۔

امتیاز (۳) الجزائر کے جہاد حریت میں حضرت شیخ الاسلام کا حصہ

تفصیلات میں جانے سے پہلے اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ الجزائر میں شیخ ابن بادیس اور محمد بشیر ابراہیمی کو کیا مقام حاصل ہے تو مختصر طور پر یہ سمجھ لیجئے کہ ہندوستان

میں حکومت اور عوام کے نزدیک جو حیثیت گاندھی جی اور جواہر لال کی ہے علی الترتیب یہی درجہ و مرتبہ شیخ عبدالحمید بن بادیس اور شیخ محمد بشیر الابراہیمی کا الجزائر میں ہے۔

ایک الجزائری مصنف لکھتے ہیں ۱۹۴۰ء میں جس تاریخ کو شیخ ابن بادیس کی وفات ہوئی اس وقت میری عمر صرف دس سال کی تھی اور میں ایک مکتب (مدرسہ حیات الشباب) میں زیر تعلیم تھا، ہم درجے میں جانے کی تیاری کر رہے تھے کہ ہمارے درجہ کے استاذ نے آکر کہا ''اب سبق نہیں ہوگا شیخ عبدالحمید بن بادیس کا انتقال ہوگیا ہے'' ہم بچوں کو شیخ کے مقام و مرتبہ کی کیا خبر ہمیں تو اس غیر متوقع چھٹی مل جانے پر بڑی مسرت ہوئی، راستے میں کھیلتے کودتے گھر آئے میرے والد شیخ کی علالت کی اطلاع پر قسنطینہ ان کی عیادت کو گئے ہوئے تھے اور میری یہ عادت تھی کہ جب معلوم ہوتا کہ والد صاحب گھر میں نہیں ہیں تو دروازے کی کنڈی خوب زور زور سے بجاتا، چنانچہ حسب عادت آج بھی میں نے ایسا ہی کیا، اس کے بعد گھر میں داخل ہوا میری والدہ شام کا کھانا پکا رہی تھی، میں نے بے وقت آنے کی وجہ بتاتے ہوئے ان سے کہا کہ مدرسہ میں تعطیل ہوگئی ہے کیونکہ شیخ عبدالحمید بن بادیس کا انتقال ہوگیا ہے میرے منھ سے یہ جملہ نکلنا تھا کہ میری والدہ بے قابو ہوکر چیخ اٹھیں۔ ''أ صحيحٌ ما تقول'' کیا تم سچ کہہ رہے ہو، میں نے جب مؤکد طور پر یہی بات دہرائی اور انھیں اس کا یقین ہوگیا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں، اس وقت مجھے کچھ احساس ہوا کہ یہ کوئی غیر معمولی حادثہ ہے، دوسرے دن شیخ کی تجہیز و تکفین کے بعد میرے والد قسنطینہ سے واپس لوٹے، ان کی عادت تھی کہ جب بھی وہ کبھی شہر جاتے تو میرے لئے کھلونے وغیرہ ضرور لاتے، میں اس بار بھی منتظر تھا کہ عادت کے مطابق میرے لئے ضرور کھلونے لائیں گے، لیکن اس مرتبہ جب وہ گھر واپس آئے تو ان کی عجیب و غریب کیفیت تھی، گم سم، گویائی کی طاقت بالکل ناپید، بولنے کی کوشش کرتے بھی تو صرف ہونٹوں میں حرکت ہوجاتی آواز بالکل نہیں نکلتی تھی، شدّت غم سے تحیر کی یہ حالت ان پر کئی دن تک طاری رہی۔(۱)

---

(۱) محمد المیلی: ابن بادیس وعروبۃ الجزائر ص ۷، ۸۔

اس واقعہ سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ الجزائر میں شیخ ابن بادیس کو کیا مقام حاصل تھا اور الجزائری انھیں کس نگاہ سے دیکھتے تھے۔

ابن بادیس کا مختصر تذکرہ

الشیخ عبدالحمید بن بادیس ۴؍دسمبر ۱۸۸۹÷/ ۱۳۰۶ھ کو الجزائر کے مشہور شہر قسنطینہ میں پیدا ہوئے۔ ۱۳؍سال کی عمر میں حفظ قرآن سے فراغت کے بعد قسنطینہ ہی میں شیخ حمدان لونیسی سے علوم عربیہ کی تحصیل شروع کر دی اور پانچ سال تک انھیں کی خدمت میں رہ کر ابتدائی مرحلے کی تعلیم مکمل کی اور آگے کی تعلیم کے لئے ۱۹۰۸÷ میں جامعہ زیتونیہ تیونس میں داخل ہو گئے، چار سال وہاں رہ کر بقیہ تعلیم پوری کی اور ۱۹۱۲÷ میں عالمیت کی سند لے کر گھر واپس آ گئے، پھر ۱۹۱۳÷/۱۳۳۲ھ میں حج وزیارت کے ارادے سے مکہ معظّمہ کا سفر کیا، فریضۂ حج ادا کر کے مدینہ منورہ حاضر ہوئے اور تقریباً تین ماہ یہاں قیام کیا، اسی قیام کے دوران حضرت شیخ الاسلام سے استفادہ کیا، بعد از اں حضرت شیخ الاسلام ہی کے مشورہ پر وطن واپس آئے اور درس وتدریس اور وعظ وتذکیر میں مشغول ہو گئے، ۱۹۲۵÷ میں المنتقد کے نام سے اصلاحی ہفت روزہ جاری کیا، حکومت کی پابندی عائد کر دینے کی وجہ سے اس کے صرف ۱۸ شمارے نکل سکے، اس کے بند ہونے کے بعد دوسرا جریدہ الشہاب کے نام سے جاری کیا جو ابتدا میں ہفت روزہ تھا بعد میں ماہانہ ہو گیا تھا جس میں علمی اصلاحی اور سیاسی مضامین شائع ہوتے تھے اور پورے الجزائر میں بڑے ذوق وشوق سے پڑھا جاتا تھا۔ ۱۹۳۱÷ جمعیۃ علماء الجزائر قائم کی اور تاحیات اس کی صدارت کے منصب پر فائز رہے، اسی کے پلیٹ فارم سے الجزائر کی آزادی کی جنگ کا آغاز کیا، ۵۱ سال کی مختصر عمر میں بمرض کینسر ۸؍ربیع الاوّل ۱۳۵۹ھ مطابق ۱۶؍اپریل ۱۹۴۰÷ کو وفات پائی۔ (۱)

حضرت شیخ الاسلام کا مشورہ اور تحریک کی ابتدا

تعلیم وتحصیل سے فراغت کے بعد شیخ ابن بادیس حجاز پہنچے اس سے پانچ سال قبل

---

(۱) ماخوذ تر کی راجح: الشیخ عبدالحمید ابن بادیس باعث النہضۃ الاسلامیہ۔

ان کے استاذ شیخ حمدان استعماری جبر وتشدد سے تنگ ہوکر الجزائر سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ میں آباد ہوگئے تھے، چنانچہ ابن بادیس جب مدینہ منورہ پہنچے تو انھیں بھی یہی مشورہ دیا کہ الجزائر اب رہنے کی جگہ نہیں وہاں سے قطع تعلق کر کے جوار رسول …… میں مقیم ہوجائیں، لیکن ان کے برعکس حضرت شیخ الاسلامؒ انھیں الجزائر واپس جانے اور وہاں اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کرنے کی رائے دی، اس سلسلے میں تحریک الجزائر کے دوسرے لیڈر شیخ ابن بادیس کے رفیق کار تلمیذ شیخ الاسلام الشیخ محمد البشیر الابراہیمی کا درج ذیل بیان قابل ملاحظہ ہے۔

> ’’مولانا سید اسعد مدنی مدظلہ نے احقر سے بیان فرمایا کہ میں ۱۹۵۰÷ میں عم محترم الشیخ السید محمود رحمہ اللہ کی خدمت میں مدرسۃ الشرعیہ المدینۃ المنورہ میں بیٹھا تھا کہ ایک بزرگ تشریف لائے اور چچا سے مصافحہ ومعانقہ کے بعد دریافت کیا: ’’این شیخی وکیف‘‘ میرے شیخ کہاں اور کس حال میں ہیں، چچا نے بتایا کہ ہندوستان میں ہیں اور بحمد اللہ خیر وعافیت سے ہیں، پھر میری جانب اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ ان کے خلف اکبر ہیں، یہ سنتے ہی مجھ سے چمٹ گئے اور دیر تک مجھے گلے سے لگائے رکھا اس کے بعد اپنا تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ میں محمد البشیر الابراہیمی الجزائری ہوں اور آپ کے والد ماجد کا ایک ادنیٰ تلمیذ، ہمیں حضرت نے جہاد حریت کی ترغیب دے کر الجزائر واپس بھیجا تھا۔‘‘ (۱)

قریب قریب یہی بات شیخ ابراہیمی نے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب سے ایک ملاقات کے موقع پر بتائی تھی مولانا ندوی صاحب اپنے مکتوب بنام مولانا سید ارشد مدنی میں لکھتے ہیں:

> ’’میں ۱۹۵۶÷ میں جب دمشق محاضرات کے سلسلے میں گیا ہوا تھا تو الشیخ محمد بشیر الابراہیمی دمشق آئے تھے انھوں نے ذکر کیا تھا کہ الجزائر کی جنگ

---

(۱) روایت حضرت مولانا سید اسعد مدنی۔

وآزادیٔ جہاد کے قائد شیخ عبدالحمید کا خیال ہجرت اور مستقل قیام کا ہو رہا تھا، حضرت نے ان کو واپس جانے کا مشورہ دیا، وہ واپس گئے اور انھوں نے تحریک کی قیادت کی۔ (۱)

ان معتبر بیانات کے علاوہ خود ابن بادیس کی یہ تحریر ملاحظہ کیجئے۔

اذکر انی لما زرت المدینة المنورة واتصلت فیها بشیخی الاستاذ حمدان لونیسی المهاجر الجزائری وشیخی حسین احمد الهندی اشار علی الاول بالهجرة الی المدینة المنورة وقطع کل علاقة لی بالوطن واشار الثانی وکان عالمًا حکیمًا بالعودة الی الوطن وخدمة الاسلام فیه والعربیة بقدر جهد فحقق الله رائ الشیخ الثانی ورجعنا الی الوطن بقصد خدمته(۲)

مجھے خوب یاد ہے میں جب مدینہ منورہ حاضر ہوا اور وہاں میری ملاقات اپنے قدیمی استاذ شیخ حمدان مہاجر جزائری اور دوسرے استاذ شیخ حسین احمد ہندی سے ہوئی تو پہلے استاذ (شیخ حمدان) نے مجھے مشورہ دیا کہ الجزائر کو خیرآباد کہہ کر مدینہ منورہ ہی کو اپنا مسکن ومستقر بنالوں اور دوسرے استاذ (شیخ الاسلام) جو عالم محقق تھے کی رائے یہ ہوئی کہ میں الجزائر جاؤں اور وہاں اسلام وعربیت کی خدمت کروں، اللہ تعالیٰ نے شیخ ثانی کی رائے کو محقق فرمایا اور میں الجزائر کی خدمت کیلئے واپس آگیا۔

لیکن ان مصادر سے یہ بات بالکل نہیں واضح ہوتی کہ حضرت شیخ الاسلام نے اس عظیم خدمت کو انجام دینے کیلئے ابن بادیس کو کیا ہدایات دیں اور کن افکار اور طریقۂ عمل کے تحت انھیں کام کرنے کی ترغیب دی، ظاہر ہے کہ ایک ۲۴ سالہ نوجوان کو جس کی اب تک کی پوری زندگی گھر یا تعلیم گاہ کے ماحول میں گذری ہو جو تنظیم وتحریک کے تجربات سے بالکل ناآشنا ہو، اسے یکایک بغیر کسی تعلیم وتربیت کے ایسے اہم ترین صبرآزما اور دوررس

---

(۱) مکتوب حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی مورخہ ۸۶/۹/۲۷÷۔

(۲) ابن بادیس: الشہاب ج ۸ ص ۳۵۵ عدد اکتوبر ۱۹۳۷÷ بحوالہ ترکی رائح الشیخ عبدالحمید بن بادیس ص ۲۷۔

نتائج کی حامل خدمت پر مامور کر دیا جائے عقل اسے باور کرنے کیلئے تیار نہیں ہے اس لئے لازمی طور پر یہ ماننا پڑے گا کہ حضرت شیخ الاسلام نے ضروری اصول وضوابط سمجھانے کے بعد ہی انھیں اس جوکھم کام پر لگایا ہوگا، لیکن وہ اصول وضوابط کیا تھے کن افکار ونظریات کے تحت اس تحریک کا آغاز کرایا گیا تھا، نہ تو شیخ ابن بادیس کی تحریروں سے اس کا سراغ ملتا ہے اور نہ شیخ ابراہیمی کے بیانات ہی سے، اس وقت کے احوال وظروف کا تقاضہ یہی تھا کہ اس جہاد سے حضرت شیخ الاسلام کے براہ راست تعلق کو واضح نہ کیا جائے، ورنہ شیخ کے لئے مشکلات ومصائب پیش آسکتی تھیں، اور جب حالات سازگار ہوئے تو بیان کرنے والے ہی دنیا سے جا چکے تھے اس لئے یہ راز پردۂ راز ہی میں رہ گیا، لیکن علمی ومنطقی اعتبار سے اگر یہ درست ہے کہ تلمیذ وشیخ کے فکر وعمل میں یکسانیت اور توافق اس بات کی دلیل ہے کہ تلمیذ نے ان افکار واعمال کو اپنے شیخ سے اخذ وجذب کیا ہے تو بغیر کسی پس وپیش کے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ حضرت شیخ الاسلام نے قائد جہاد شیخ ابن بادیس کو مکمل طور پر اصول وضوابط کے کیل کانٹے سے لیس کر کے میدان عمل میں اتارا تھا، کیونکہ دونوں کے نظریات اور طریقۂ عمل میں اس قدر موافقت اور یکسانیت ہے کہ الجزائر کے جہاد حریت کی تاریخ کا مطالعہ کرنے والا ایک لمحہ کیلئے یہ سوچنے لگتا ہے کہ وہ الجزائر کی تاریخ آزادی کو پڑھ رہا ہے یا حضرت شیخ الہند کی تحریک ریشمی رومال اور جمعیۃ علماء ہند کی تاریخ اس کے پیش نظر ہے، اس موقع پر طوالت سے بچتے ہوئے چند نظائر پیش کئے جاتے ہیں۔

فکر وعمل میں یکسانیت

حضرت شیخ الاسلام کا نظریہ تھا کہ ہندوستان کی آزادی تنہا ہندوستان کی آزادی نہیں ہے بلکہ یہ ایشیا کی آزادی کا پیش خیمہ ہے، اور ایشیا کی آزادی مشرق کے کتنے ہی پسماندہ اور کمزور قوموں کی آزادی کا ذریعہ ہے، اپنے احوال وظروف کے مطابق اسی نظریہ کا اعلان شیخ ابن بادیس ان الفاظ میں کر رہے ہیں:

نعم ان لنا وراء هذا الوطن الخاص اوطانا اخریٰ عزيزة علينا هی دائما

علی بأل ونحن فیما نعمل لوطننا الخاص نعتقد انه لابد ان تکون قد خدمناها واوصلنا الیها النفع والخیر من طریق خدمتنا لوطننا الخاص واقرب هذه الاوطان الینا هو المغرب الاقصیٰ والمغرب الادنیٰ والمغرب الاوسط ثم الوطن العربی الاسلامی ثم الانسانیة العام. (۱)

> اس وطن خاص (الجزائر) کے علاوہ ہمارے اور بھی اوطان ہیں، جو ہمیں بہت محبوب ہیں جن کا خیال ہمہ وقت رہتا ہے اور ہم جو خدمات اپنے وطن کی انجام دے رہے ہیں ہمیں یقین ہے کہ اس راہ سے ہم ان اوطان کی بھی خدمت کر رہے ہیں اور انھیں بھی نفع و خیر پہنچا رہے ہیں، اور ان میں ہم سے سب سے قریب مغرب اقصیٰ، مغرب ادنیٰ اور مغرب اوسط ہیں، ان کے بعد یہ نفع وطن عربی اسلامی اور پھر وطن انسانیت کو پہنچے گا۔

(۲) حضرت شیخ الاسلام کا نظریہ تھا کہ مشرق کی ساری تباہی اور فساد کی جڑ مغربی اقتدار کا غلبہ ہے اگر مغرب کا یہ استعماری غلبہ ختم ہو جائے تو مشرق کے مزاج کی اصلاح ہو سکتی ہے۔ اس نظریہ کی بازگشت شیخ ابن بادیس کے کلام میں سنی جا سکتی ہے۔

اننا نفرق جیدا بین الروح الانسانیة والروح الاستعماریة فی کل امة فنحن بقدر ما نکره هذه و نقاومها نوالی تلك ونؤیدها لاننا نتیقن کل الیقین ان کل بلاء العالم هو من هذه وکل خیر یرجیٰ للبشریة انما یکون یوم تسود تلك فتسقط الروح الاستعماریة ولمتندحر ولترتفع الروح الانسانیة والنشر. (۲)

> ہم روح انسانیت اور روح استعماریت کے درمیان فرق کو اچھی طرح جانتے ہیں اور ہم اسی فرق کے مطابق استعماریت کو ناپسند کرتے اور اس کی مخالفت کرتے ہیں اور روح انسانیت کو دوست رکھتے اور اس کی تائید کرتے

---

(۱) ابن بادیس الشهاب بحوالہ محمد المیلی: ابن بادیس وعروبة الجزائر ص ۵۶۔

(۲) ابن بادیس: الشهاب ۱۹۳۸ء بحوالہ محمد المیلی: ابن بادیس وعروبة الجزائر ۵۳۔

ہیں، اس لئے کہ ہمیں یقین کامل ہے کہ عالم کی تمام تر مصیبت کا سبب یہی استعماریت ہے اور انسانیت کیلئے کسی خیر کی امید اسی وقت کی جاسکتی ہے جس وقت کہ انسانیت کی سیادت اور بالاتری حاصل ہوجائے، لہٰذا اس وقت روح استعماریت ساقط اور ختم ہوجائے گی اور روح انسانیت بلند اور چھاجائے گی۔

(۳) حضرت شیخ الاسلام کا نظریہ تھا کہ ہندوستانی مسلمان اپنی ملی حیثیت کے تحفظ کے ساتھ ہندوستانی قومیت کا ایک عنصر ہیں کیونکہ آج کل قومیت کا تشخص وطنیت کی بنیاد پر کیا جاتا ہے اور لفظ قوم اپنے معنی کے اعتبار سے اسی جماعت پر منطبق ہوتا ہے جس میں جامعیت کا کوئی سبب موجود ہو۔

شیخ ابن بادیس نے اس نظریہ کی تعبیر حسب ذیل الفاظ میں کی ہے۔

المسلم هو المتدين بالاسلام والاسلام عقائد واعمال واخلاق بها السعادة فی الدارين والجزائری انما ينسب للوطن افراده الذين ربطتهم ذكريات الماضی ومصالح الحاضر ومآل المستقبل فالذين يعمرون هذا القطر وتربطهم هذه الروابط هم الجزائريون. (۱)

مسلم وہ شخص ہے جو دین اسلام کا پابند ہے اور اسلام ایسے عقائد، اعمال اور اخلاق کو شامل ہے جس سے دارین کی سعادت متعلق ہے، اور جزائری تو صرف وطن کی جانب منسوب ہیں جس کے افراد کو ماضی کی تاریخ، حال کے مصالح اور مستقبل کی امیدوں نے باہم مربوط کررکھا ہے، لہٰذا جو لوگ اس ملک میں آباد اور ان مذکورہ روابط میں مربوط ہیں وہ جزائری ہیں۔

(۴) حضرت شیخ الاسلام کا نظریہ تھا حق وانصاف میں ذات و مذہب کی بنیاد پر امتیاز غلط ہے ملک کے تمام باشندے خواہ وہ کسی بھی ذات و مذہب سے تعلق رکھتے ہوں حق وانصاف میں سب کے حقوق یکساں ہیں۔

---

(۱) ابن بادیس: الشہاب ج ۱۰ عدد نومبر۔

شیخ ابن بادیس اس نظریہ کا اعلان یوں کرتے ہیں:

فنهضتنا نهضة بنيت على الدين اركانها فكانت سلاما على البشرية ... لايخشاها والله النصرانى لنصرانيته ولا اليهودى ليهوديته بل ولا مجوسى لمجوسيته ولكن يجب والله ان يخشاها الظالم بظلمه والدجال لدجله والخائن لخيانته. (۱)

> ہمارے اس انقلاب کی اساس دینی ہے جو انسانیت کی سلامتی کا ذریعہ ہے، اس میں نصرانی اپنی نصرانیت اور یہودی اپنی یہودیت کی وجہ سے خائف نہیں ہوگا بلکہ مجوسی کو بھی اپنی مجوسیت کی بنا پر کوئی اندیشہ نہ ہوگا۔ البتہ ظالم اپنے ظلم دجال اپنے دجل وفریب اور خائن اپنی خیانت کی بنیاد پر خوف زدہ ہوگا۔

نظریات میں اس وحدت کے بعد ایک سرسری جائزہ طریقۂ کار اور دستور العمل پر بھی ڈالتے چلئے۔ حضرت شیخ الہندؒ نے اپنی تحریک کی ابتدا درس وتدریس سے کی تھی۔ دورانِ درس جن تلامذہ میں صلاحیت پاتے تعلیم علوم کے ساتھ اس کی سیاسی تربیت بھی فرماتے تھے ایک عرصہ تک اس طرح کام کرنے کے بعد جب ملک کے اطراف وجوانب میں تلامذہ کی ایک جماعت منظّم طور پر کام کو آگے بڑھانے کے لئے تیار ہوگئی تو جمعیۃ الانصار کی داغ بیل ڈالی اور پھر دہلی میں مولانا عبید اللہ سندھی کے ذریعہ نظارۃ المعارف کے عنوان سے درس قرآن کا ایک حلقہ قائم کیا، اس طرح سے ملک کے ذہین، بیدار مغز، متحرک اور فعال افراد پر مشتمل ایک جماعت اپنے گرد اکٹھا کرلی اور پھر انھیں کے واسطے سے تحریک کا جال پورے ملک میں بچھا دیا، تحریک کی اسی ہمہ گیری کا نتیجہ تھا کہ حضرت شیخ الہند کی گرفتاری اور قید وبند کی وجہ سے کام کرنے والوں میں اضمحلال نہیں پیدا ہوا بلکہ انھوں نے خلافت کمیٹی اور جمعیۃ علماء کے نام سے ایک محاذ کے بجائے دو دو محاذ کھول دیئے اور بالآخر اسی جمعیۃ علماء کے پلیٹ فارم سے آزادی کی بھرپور جنگ لڑی گئی۔ اس پس منظر

---

(۱) ابن بادیس: الشہاب ۱۹۳۶ء بحوالہ سابق۔

کو ذہن میں رکھتے ہوئے شیخ ابن بادیس کی تاریخ جہد و عمل کا مطالعہ کیجئے۔

وہ ۱۹۱۳÷ میں حضرت شیخ الاسلام کی ہدایت پر الجزائر واپس آئے اور ہر مشغلہ سے بالکل یکسو ہو کر درس و تدریس وعظ و تذکیر میں لگ گئے اور ایک دو سال نہیں بلکہ پورے دس سال اس خالص علمی مشغلہ کو جاری رکھا وہ خود لکھتے ہیں:

قضينا عشر سنوات فى الدرس لتكوين نشأءِ العلمى لم تخلط به غيره من عمل آخر فلما كملت العشر وظهرت بحمد اللّٰه نتيجتها الخ

> ہم نے پورے دس سال (الجزائر) کی نشأۃ علمی میں گذار دیئے جن میں ترویج علوم کے علاوہ ہم نے کوئی کام نہیں کیا اور الحمدللہ اس کے اچھے نتائج بھی ظاہر ہوئے۔

طریقہ یہ تھا کہ رات کو قرآن حکیم کا مجموعی درس ہوتا تھا، جس کے ضمن میں اپنے سیاسی، اجتماعی اور اصلاحی نظریات کو بھی مدلل طور پر بیان کرتے رہتے تھے، اس درس کو اس درجہ مقبولیت ہوئی کہ شہر قسنطینہ کے علاوہ مضافات سے بھی بڑی جماعت اس میں شرکت کے لئے آتی تھی، اور دن کو خصوصی درس ہوتا تھا جس میں صرف طلبہ شریک ہوتے تھے، اس درس میں تفسیر قرآن، مؤطا امام مالک مقدمہ ابن خلدون اور بعض فقہ اور تاریخ کی کتابیں ہوتی تھیں، اس طرح سے دس سال کی مدت میں انھوں نے آگے کے کام کی زمین تیار کر لی اور اپنے تلامذہ اور مستفیدین کے ذریعے پورے ملک میں اپنے نظریات کو عام کر دیا اس کے بعد ۱۹۲۵÷ میں یکے بعد دیگرے علی الترتیب دو رسالے المنتقد اور الشہاب جاری کئے (ممکن ہے الشہاب نام حضرت شیخ الاسلام کی فاضلانہ کتاب ''الشہاب الثاقب'' کے نام سے اخذ کیا ہو، یہ کتاب اس وقت شائع ہو چکی تھی) جس میں اپنے سیاسی، اجتماعی اور اصلاحی نظریات پر کھل کر بحث کرتے تھے، اس کا اثر بھی ملک پر نہایت اچھا پڑا اور لوگوں میں سیاسی بیداری پیدا ہو گئی بعد ازاں ۱۹۳۱÷ میں جمعیۃ علماء الجزائر کی بنیاد رکھی جس کے خود ہی تاحیات صدر رہے، شیخ بادیس کے جانشین جمعیۃ علماء کے دوسرے شیخ محمد بشیر الابراہیمی جمعیۃ علماء کی اہمیت و ضرورت کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

لو تأخر ظهور جمعية العُلماء عشرين سنة لما وجدنا فى الجزائر من يسمع صوتنا“

اگر جمعیۃ علماء کی تاسیس میں دس بیس سال کی تاخیر اور ہو جاتی تو ہماری باتیں سننے کے لئے الجزائر میں ایک آدمی بھی نہ ملتا۔

پھر جمعیۃ علماء کے پلیٹ فارم سے کھل کر آزادی کی جنگ لڑی گئی۔

فکر وعمل کا یہ اتحاد بلاشبہ اس بات پر شاہد عدل ہے کہ الجزائر کی جنگ آزادی حضرت شیخ الاسلام کے متعین کردہ خطوط پر برپا کی گئی ورنہ اس طرح کا کلیتًا اتحاد ممکن نہیں تھا، اس لئے تاریخ کا طالب علم اگر یہ دعویٰ کرتا ہے کہ جس طرح ہندوستان کی تاریخ آزادی میں اگر حضرت شیخ الہندؒ کا تذکرہ نہ کیا جائے تو وہ تاریخ ناقص اور ادھوری ہوگی ٹھیک اسی طرح اگر الجزائر کے جہادِ حریت کی تاریخ میں شیخ الہند کے جانشین مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کا ذکر نہ ہو تو وہ تاریخ بھی غیر مکمل و نا تمام ہوگی، تو اس کا دعویٰ یقیناً مبنی برحق ہوگا، حضرت شیخ الاسلام کا یہ ایک ایسا عظیم اور بے مثال امتیاز ہے جس کی نظیر ہندوستان کے کسی بھی قومی لیڈر اور سیاسی رہنما میں تلاش کرنا بے سود ہے۔ ع

”یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا“

وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العٰلمين والصلوة والسلام على خاتم المرسلين وعلى آله واصحابه اجمعين.

☆ ☆ ☆

---

(۱) ابن بادیس کے جہد وعمل کی ترتیب کے لئے ترکی رابح الشیخ عبدالحمید بن بادیس باعث النہضۃ الاسلامیہ فی الجزائر کے صفحات ۴۷، ۵۷ اور ۵۳ ملاحظہ ہوں۔